هدایۃ القاری
شرح صحیح البُخاری
(اُردو)
1

سعودی عرب

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس:22743 الرّیاض:11416 سعودی عرب

فون :00966 1 4043432-4033962 فیکس:4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الرّیاض • العلیا۔فون :00966 1 4614483 فیکس :4644945 • الملز فون :00966 1 4735220 فیکس :4735221

• سویدی فون :00966 1 4286641 • سویلم فون/فیکس :00966 1 2860422

جدّہ فون :00966 2 6879254 فیکس:6336270 مدینہ منورہ فون :00966 4 8234446,8230038 فیکس:04 8151121

الخُبر فون:00966 3 8692900 فیکس :00966 3 8691551 خمیس مشیط فون /فیکس :00966 7 2207055

ینبع البحر فون :0500887341 فیکس :8691551 قصیم (بریدہ) فون :0503417156 فیکس :00966 6 3696124

امریکہ • نیویارک فون:001 718 625 5925 • ہوسٹن :001 713 722 0419 کینیڈا • نصیرالدین الخطاب فون :001 416 4186619

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لیمٹڈ فون :0044 20 77252246-0044 20 85394885 • دارکہ انٹرنیشنل :0044 0121 7739309

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون :00971 6 5632623 فیکس:5632624 فرانس فون :0033 01 480 52928 فیکس:0033 01 480 52997

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون :0091 44 45566249 موبائل :0091 98841 12041 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون :0091 22 2373 4180

• ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرز فون :0091 40 2451 4892 موبائل :0091 98493 30850 • ایم ایس براک انٹرپرائزز فون :0091 44 42157847

سری لنکا • دارالکتاب فون :0094 115 358712 • دارالایمان ٹرسٹ فون :0094 114 2669197

پاکستان

36- لوئر مال ، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون:372 324 00, 372 400 24, 0092 42 373 240 34 فیکس:042 373 540 72

www.darussalampk.com

اُردو بازار : غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون:0092 42 371 200 54 فیکس:042 373 207 03

ڈیفنس: Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان:2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون:0092 42 356 926 10

گلبرگ: دُکان نمبر2، گراؤنڈ فلور، بگ سٹی پلازہ لبرٹی گول چکر، گلبرگ III لاہور فون:0092 42 357 738 50

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دُوسری گلی، کراچی فون:0092 21 343 939 36 فیکس:0092 21 343 939 37

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر فون:0092 51 228 15 13 islamabad@darussalampk.com

---

ملتان 995- انکم ٹیکس آفیسر کالونی، بوسن روڈ۔ملتان فون:0092 61 622 00 24

فیصل آباد کوہ نور سٹی (پلازہ نمبر:1، دکان نمبر:15) جڑانوالہ روڈ، فیصل آباد فون:0092 41 850 19 44

سعودی عرب ہیڈ آفس

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • العلیا۔ فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• سویدی فون: 4286641 1 00966 • سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04

الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • نصیرالدین الخطاب فون: 4186619 416 001

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لیمیٹڈ فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • دارکہ انٹرنیشنل: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 4180 2373 22 0091

• ہُدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • ایم/ایس براک انٹرپرائزز فون: 42157847 44 0091

سری لنکا • دارالکتاب فون: 358712 115 0094 • دارالایمان ٹرسٹ فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 00 324 372 ,24 400 372 ,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

www.darussalampk.com

اُردو بازار: غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

ڈیفنس: Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

گلبرگ: دُکان نمبر 2، گراؤنڈ فلور، بگ سٹی پلازہ لبرٹی گول چکر، گلبرگ III لاہور فون: 50 738 357 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈالمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دُوسری گلی، کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، ایوب مارکیٹ، شاہ ویز سنٹر فون: 13 15 228 51 0092 islamabad@darussalampk.com

---

ملتان 995- انکم ٹیکس آفیسر کالونی، بوسن روڈ۔ ملتان فون: 24 00 622 61 0092

فیصل آباد کوہ نور سٹی (پلازہ نمبر: 1، دکان نمبر: 15) جڑانوالہ روڈ، فیصل آباد فون: 44 19 850 41 0092

هِدَايَةُ القَارِي
شَرح صَحِيح البُخَارِي

كتاب بدء الوحي ـــ كتاب الصلاة ✥ أحاديث: 1 ـــ 520

1

تالیف

امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ

194-256ھ

ترجمہ وشرح

شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ

فاضل مدینہ یونیورسٹی

نظرثانی، تصحیح وتنقیح اور اضافات

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ — مولانا ابوعبداللہ محمد عبدالجبار حفظہ اللہ — حافظ محمد آصف اقبال حفظہ اللہ

مولانا محمد عثمان منیب حفظہ اللہ — مولانا غلام مرتضیٰ حفظہ اللہ — مولانا مختار احمد ضیاء حفظہ اللہ

دارالسلام
DARUSSALAM

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

البخاري، ابو عبدالله محمد اسماعيل

هداية القاري بشرح صحيح البخاري مجلد (١) اردو /.

أبو عبدالله محمد اسماعيل البخاري: عبدالستار حماد ـ الرياض

ص:٨٤٤ مقاس:١٧×٢٤ سم

ردمك: ٢-٢٩٢-٠٠٥-٦٠٣-٩٧٨

١- الحديث الصحيح ٢-الحديث - شرح أ-الحماد، عبدالستار (محقق) ب. العنوان

ديوي ٢٣٥،١ ١٤٣٧/١٠٢٩١

رقم الإيداع:١٤٣٧/١٠٢٩١

ردمك:٣-٢٩٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨

ارشاد باری تعالیٰ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ﷺ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول (حضرت محمد ﷺ) کی اطاعت کرو اور (ان کی نافرمانی کرکے) اپنے اعمال باطل مت کرو۔ (محمد 33:47)

فرمانِ رسولِ مکرم

فمن اطاع محمدا فقد اطاع الله
ومن عصى محمدا فقد عصى الله
ومحمد ﷺ فرق بين الناس

جس نے محمد (ﷺ) کی اطاعت کی بلاشبہ اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔
اور جس نے محمد (ﷺ) کی نافرمانی کی، یقیناً اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔
اور محمد (ﷺ) لوگوں (مسلمانوں اور کافروں) کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔

(صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، حديث:7281)

فہرست مضامین (جلد اول)

٥ كتاب الغسل — غسل سے متعلق احکام و مسائل 487

۷ كتاب التيمم — تیمم سے متعلق احکام و مسائل 601

۸ كتاب الصلاة — نماز سے متعلق احکام و مسائل 629

عرض ناشر

اللہ کے رسول ﷺ کی بڑی مشہور حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس نے میری بات کو سنا اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔

قرآن کریم کے بعد حدیث رسول اور علم حدیث کی خدمت و اشاعت محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہے۔ ان اشخاص پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہوتا ہے جنہیں خالق کائنات اپنے دین کی خدمت کے لیے چن لیں۔ ہمارے مربی اور محسن ڈاکٹر محمد محسن خان مترجم قرآن کریم اور صحیح بخاری (انگلش) مجھے کہا کرتے ہیں کہ یہ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں چابی دی کہ یہ دروازہ کھولو اور حدیث کی خدمت کرو، قرآن کریم کے تراجم اور احادیث مبارکہ شائع کر کے لوگوں تک اللہ تعالیٰ اور نبیٔ اکرم ﷺ کے فرامین پہنچاؤ۔ یہ ضروری نہیں کہ جس کے پاس مال و دولت ہو وہی یہ خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔

علم حدیث حاصل کرنے اور حدیث کی تفہیم، ترویج اور توسیع کے لیے اپنی مساعی بروئے کار لانے کی توفیق اسی کو نصیب ہوتی ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ اس کام کے لیے چن لیتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے: ''اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے۔''

محترم قارئین! بعثت نبوی کے وقت لکھنے لکھانے کا زیادہ رواج نہ تھا، لوگوں کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ تمام معاملات میں وہ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وحیٔ الٰہی کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے قلمبند کرنے کا بھی مکمل اہتمام کیا۔ قرآن کریم کے علاوہ حدیث نبوی کو بھی ضبط تحریر میں لایا گیا جس کی دلیل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ صحیفے ہیں جن کا ذکر کتبِ حدیث میں جا بجا ملتا ہے۔ پھر عصرِ تابعین میں اس کام کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ جلیل القدر تابعی عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں حدیث کی باقاعدہ تدوین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دوسری صدی ہجری میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور نئے شہر آباد ہو گئے تو مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جہاں جہاں گئے

انھوں نے وہاں تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا۔ ان کے بعد تابعین نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ لوگ پیش آمدہ مسائل اپنے اپنے علاقے کے علماء سے دریافت کیا کرتے۔ وہ اس سلسلے میں قرآن مجید اور حدیثِ رسول ﷺ پر بھروسا کرتے، اگر ضرورت پیش آتی تو اجتہاد سے کام لیتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آبادی بڑھنے اور مختلف قوموں کے امتزاج کے باعث نت نئے مسائل جنم لینے لگے۔ جہاں سیاسی مشکلات نے جنم لیا وہیں دینی مشکلات بھی پیش آئیں۔ لوگوں کے پاس جو احادیث تھیں وہ انھی پر اکتفا کر کے تفصیلی مسائل میں رہنمائی کے لیے احادیث تلاش کرنے کے بجائے، اپنی رائے اور اجتہاد پر بھروسا کرنے لگے۔

دوسری طرف امت کے انتہائی ذمہ دار طبقے نے اہتمام کیا کہ وہ عالم اسلام کے قریہ قریہ اور شہر شہر کا سفر اختیار کر کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تربیت یافتہ، ان کے خاص شاگردوں کے پاس پہنچیں۔ ان سے احادیث مبارکہ اور آثار صحابہ کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اکٹھا کریں تاکہ ہر معاملے میں وحی پر مبنی رہنمائی میسر ہو۔ اس کے نتیجے میں امام مالک رحمہ اللہ کی موطأ اور امام احمد رحمہ اللہ کی مسند اور ان جیسی دوسری بنیادی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا۔ انھی محسنینِ امت کی سوچ درست اور سدید تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کارِ خیر کے لیے جس گروہ کا انتخاب کیا وہ اہل الحدیث اور محدثین کہلائے کیونکہ ان کی جانکاہیوں، کاوشوں اور محنتوں کا مرکزی نکتہ جمع و ترتیب اور تفہیم احادیث تھا۔ ان حضرات نے اپنی زندگیاں خدمت حدیث کے لیے وقف کر دیں۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء

محدثین کی مساعیٔ جمیلہ کا نکتۂ عروج امام بخاری رحمہ اللہ کی کاوشیں ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ شوال 194 ہجری از بکستان کے مشہور شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے ممتاز محدثین اور علماء سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت سارے شہروں میں تشریف لے گئے اور پھر انھوں نے نہ صرف صحت کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق ایک مجموعۂ حدیث تیار کیا بلکہ ہر قسم کی فکری اور عملی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سیکڑوں فقہی ابواب قائم کیے۔ ان کے تحت انھوں نے لطیف ترین انداز میں استدلال و استنباط کر کے زندگی کے ہر گوشے کے لیے براہ راست فرامینِ رسول سے رہنمائی مہیا کی۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ حقیقی تفقہ قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط کا نام ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عقائد، عبادات، احکام، معاملات غرض ہر شعبۂ زندگی سے متعلق براہ راست احادیث سے استنباط کیا۔ ان کے بعد یہی اسلوب کتب احادیث کے دیگر مؤلفین نے اختیار کیا۔ اسلامی تاریخ میں یہ صدی حدیث اور اہل الحدیث کی صدی کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔

جب فتوحات کا دائرہ مزید وسیع ہوا اور اسلام کی شعاعیں برصغیر پاک و ہند پر پڑنے لگیں تو ایک نیا منظر سامنے آیا۔

برصغیر کی نوعیت جزیرۂ عرب سے یکسر مختلف تھی۔ یہاں عوام کو تعلیم و تعلم سے واسطہ نہ تھا، زبان بھی غیر عربی تھی۔ صدیوں پرانی ہندو تہذیب کی جڑیں اس قدر مضبوط تھیں کہ اسے جنبش دینا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اسلام سے پہلے تمام دوسری تہذیبیں برصغیر میں آ کر ہندو تہذیب میں ضم ہوگئیں۔ اسلام نے اپنی غیر معمولی قوت کی بنا پر اپنا تشخص تو برقرار رکھا لیکن ہندو تہذیب نے اس پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہ اثرات تصوف کی صورت میں نمودار ہوئے۔ ہندی تصوف کے ذریعے سے ہندوانہ فکری الحاد بھی مسلمانوں میں داخل ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ برصغیر میں اسلام کی غریب الوطنی تھی۔ قرآن وحدیث کی تعلیمات کا جو تصور برصغیر میں پہنچا وہ دھندلا تھا، مسلم ارباب اقتدار نے بھی دین کی اشاعت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، زیادہ سے زیادہ علم الکلام اور فلسفہ ان کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

دوسری وجہ عربی زبان سے ناواقفیت تھی۔ مصادر اسلامیہ سے براہ راست استفادہ وہی شخص کرتا جو عربی سے واقف ہوتا اور ایسے لوگ معدودے چند تھے۔ فارسی زبان کا راج تھا۔ اس میں اور مقامی زبانوں میں علماء کے فتاویٰ کے علاوہ کوئی اور مواد دستیاب نہ تھا۔ عامۃ الناس انھی فتاویٰ پر اعتماد کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے تقلیدی افکار کو تقویت ملی۔ اس دوران میں بھی اگرچہ قرآن وحدیث کی خالص دعوت پیش کرنے والے لوگ موجود رہے، لیکن وہ تعداد میں بہت کم تھے۔ اس دعوت کا سلسلہ انفرادی تھا۔ اسے ارباب اقتدار کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔

برصغیر کے دینی اداروں میں رائج نظامِ تعلیم میں بھی احادیث کی تعلیم کے بجائے فقہ، فلسفہ اور منطق کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا رہا۔ اصل مآخذ عربی زبان میں تھے جن سے عام لوگ نابلد تھے۔ شاہ ولی اللہ ؒ نے اصل مآخذ کو برصغیر میں مسلمانوں کی رسمی زبان فارسی میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا، انھوں نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے علاوہ موطأ امام مالک کی ایک شرح فارسی میں لکھی۔ ان کے خاندان میں، جلد ہی اردو زبان میں دین کی ترویج کا احساس ابھر آیا۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین ؒ نے قرآنِ مجید کا اُردو میں ترجمہ کیا تاکہ عام لوگوں میں بھی قرآن کا نور پھیلے۔ عجمی تصوف کے اندھیرے اس قدر شدید تھے کہ ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے، لیکن حق وصداقت کا قافلہ روکا نہ جاسکا۔ دین کی دعوت اور حدیث کی تدریس کے ساتھ ساتھ تراجم کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑے عرصے بعد اس بات کی بھی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ احادیثِ نبوی اور تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالا جائے تاکہ عوام الناس اس سے براہ راست استفادہ کرسکیں۔ اس عظیم خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نواب سید صدیق حسن خاں ؒ جیسے مردِ جلیل کا انتخاب فرمایا۔ انھوں نے علامہ وحید الزمان ؒ کو اس کام کے لیے اپنے ساتھ ملایا جنھوں نے وقت کے تقاضوں کے عین مطابق کتب ستہ کا مستند اردو ترجمہ کیا جسے قبول عام حاصل ہوا۔ اس سے اُردو دان طبقے کو بالخصوص فائدہ ہوا۔ لوگوں

کو براہ راست حدیث سے استفادے کا موقع ملا اور ان کی بھی اصل دین تک رسائی ہونے لگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان تبدیلی اور ترقی کے مراحل سے گزرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف کئی الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ نئے الفاظ شامل ہوئے بلکہ اسلوب بھی بدل گیا۔ اس بنا پر علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ کے تراجم سے استفادے میں کچھ مشکل پیش آنے لگی۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کتب ستہ بالخصوص صحیح بخاری و صحیح مسلم کو اردو کے نئے قالب میں ڈھالا جائے اور ساتھ ہی جدید مسائل کا حل احادیث کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ کتب حدیث میں سے صحیح بخاری کو جو اعتبار اور قبولیت حاصل ہے وہ بیانِ محتاج نہیں، اس لیے اس پر بالخصوص تفصیلی اور عام فہم فوائد کی ضرورت تھی جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔

الحمد للہ دارالسلام نے اللہ کی توفیق سے اس کام کا بیڑا اٹھایا جو اتنے طویل عرصے سے تشنۂ تکمیل تھا۔ صحیح بخاری کے ترجمے اور شرح کی سعادت ممتاز عالم دین، محقق، مفتی اور شیخ الحدیث حافظ عبدالستار حماد، فاضل مدینہ یونیورسٹی حفظہ اللہ کے حصے میں آئی۔ مولانا موصوف نے ادارے کی استدعا پر گوناگوں علمی و تدریسی خدمات کے باوصف اس کام کو نہایت محنت اور جاں فشانی سے سرانجام دیا ہے۔ اس کی تفصیل، خود ان کے قلم سے، عرضِ مترجم میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔

ادارہ ان کا صمیم قلب سے شکر گزار ہے کہ انھوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود ادارے کی خواہش پر یہ گراں قدر خدمت سرانجام دی۔ انھوں نے بسط و تفصیل سے صحیح بخاری کی شرح و توضیح کا حق ادا کیا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اردو ترجمہ اور جامع ترین شرح صرف عوام ہی کے لیے نہیں بلکہ خواص (علماء) کے لیے بھی رہنمائی کا سنگ میل ثابت ہوگی۔ جزاه الله عن الإسلام والمسلمين خير الجزاء في الدنيا والآخرة

جہاں تک صحیح بخاری کی اہمیت اور اس کی امتیازی خصوصیات کا تعلق ہے، اس پر علمائے کرام ہی روشنی ڈال سکتے ہیں اور الحمد للہ ان کی وضاحت بھی فاضل شارح نے کر دی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کے مایۂ ناز محقق اور ممتاز عالم دین مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ نے بھی اپنے وقیع مقدمے میں صحیح بخاری سے متعلقہ بہت سے اہم گوشوں کی وضاحت کر دی ہے۔ ادارہ مولانا ممدوح کا بھی ممنون ہے کہ انھوں نے اپنے فاضلانہ مقدمے کے ذریعے سے صحیح بخاری کی عظمت و اہمیت کو اجاگر فرمایا ہے۔ شكر الله سعيه

عصر حاضر کے فاضل مفسر و مترجم اور مؤلف کتب کثیرہ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ مدیر شعبۂ تحقیق و تصنیف دارالسلام لاہور اور ان کے رفقاء مولانا ابوعبداللہ محمد عبدالجبار، مولانا حافظ محمد آصف اقبال، مولانا محمد عثمان منیب، مولانا غلام مرتضی اور مولانا مختار احمد ضیاء حفظہم اللہ نے دن رات کی اَن تھک محنت سے اس پر نظر ثانی کی، تصحیح و تنقیح

کا فریضہ سرانجام دیا اور بیش قیمت مفید اور علمی و تحقیقی فوائد و مسائل کا اضافہ کیا۔

شرح صحیح البخاری (اُردو) کے فنی مراحل کمپوزنگ، ڈیزائننگ میں محمد اسد، محمد رمضان شاؔد، عبدالجبار غازی اور اخلاص الحق ساجد نے اسے خوب سے خوب تر بنانے میں بھرپور محنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کی ساعی کو قبول فرمائے۔ آمین.

ان جملہ احباب کی شبانہ روز محنت کے باعث صحیح البخاری کی یہ شرح ان شاء اللہ العزیز اردو خواں حضرات، علمائے دین، قانون دان، اساتذہ، طلبہ اور عامۃ الناس میں مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس سلسلے میں برادر عزیز حافظ عبدالعظیم اسد (مدیر: دارالسلام، پاکستان) نے اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے لیے دن رات ایک کر کے جس محنت، انہماک اور ذمے داری کا مظاہرہ کیا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

خادم کتاب وسنت

عبدالمالك مجاهد

مدیر: دارالسلام، الریاض - لاہور۔

جولائی 2011ء / شعبان 1432ھ

عرض مترجم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وأصحابہ و أتباعہ و إخوانہ أجمعین، وبعد!

قرآن کریم ایک ایسی جامع کتاب ہے جس کے ایک ایک لفظ سے حقائق و معارف کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اس کی آیات کا یہ حال ہے کہ ان میں کوئی خفی ہے کوئی مجمل، کوئی مشکل ہے اور کوئی اپنے اندر رمز و اشارہ کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ ایسی کتاب کے معانی معلوم کرنا، اس سے مطالب اخذ کرنا، پھر اس کی مراد اور مقصد متعین کرنا صرف نبیِ اکرم ﷺ کا کام ہے جو وحیِ الٰہی کے حامل تھے۔ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اپنے فہم وعقل کے ذریعے سے کلامِ الٰہی کی مراد نہیں پا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کا منصب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾

”اور ہم نے آپ کی طرف یہ ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں۔“[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن اور اس کا بیان دونوں الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بیان قرآن کی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ﴾

”ہم نے آپ پر یہ کتاب اس لیے نازل کی ہے تاکہ آپ اس امر کی وضاحت کر دیں جس میں انھوں نے اختلاف کر رکھا ہے۔“[2]

ان آیات سے رسول اللہ ﷺ کے منصب کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ کی حیثیت محض ایک ڈاکیے یا چٹھی رساں کی نہیں ہے جو ایک بند لفافہ مکتوب الیہ تک پہنچا دے بلکہ آپ کا منصب اپنے عمل و کردار اور قول و گفتار سے اس آئین زندگی کی وضاحت کرنا ہے کیونکہ شاہی فرمان کا مطلب محرم راز سے زیادہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ

---

1 النحل 16:44. 2 النحل 16:64.

نے مجمل احکام کی تفسیر فرمائی اور اپنے عمل سے احکام الٰہی کی تعمیل کا طریقہ بتایا۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی تشریح و توضیح کے پیش نظر جو کچھ فرمایا اور کر کے دکھایا اسے ہم سنت یا حدیث سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے وجود کے اعتبار سے ایک علیحدہ چیز ہے مگر اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے قرآن ہی کا ایک حصہ ہے، اس سے زائد یا اس سے باہر کی کوئی چیز نہیں کہ قرآن کی جامعیت کے منافی ہو کیونکہ ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ اب ہم قرآن کریم کی جامعیت اور اس کے بیان (حدیث) کے ساتھ اس کے تعلق کی وضاحت چند مثالوں سے کرتے ہیں:

- قرآن کریم نے متعدد مقامات پر نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے مگر نماز کے تفصیلی احکام اور اوقات کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ نماز کے ارکان و فرائض، شرائط و واجبات، سنن و مستحباب اور ممنوعات و مکروہات کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے فرمائی، پھر آپ نے حکم دیا: ”نماز اس طرح ادا کرو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔“[1]
- اسی طرح روزے کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے لیکن اس کے تفصیلی احکام سے قرآن کریم خالی ہے۔ اس میں یہ صراحت نہیں کہ روزہ کن احوال و وجوہ کی بنا پر خراب ہو جاتا ہے اور کن صورتوں میں کفارہ لازم آتا ہے۔ فدیہ دینے کی اجازت کن لوگوں کو ہے؟ وہ کون سے حالات ہیں جن میں روزے دار کو از خود روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے؟ اس کی تمام تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے بیان کی ہیں۔
- قرآن میں حج کی ادائیگی کا حکم ہے لیکن حج ادا کرنے کا طریقہ، احرام کے کپڑوں کی تعداد، حدود و میقات کا تعین، طواف وسعی کے احکام، پھر آداب قربانی رسول اللہ ﷺ ہی نے بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”لوگو! مجھ سے احکام حج سیکھ لو، شاید میں اس سال کے بعد حج ادا نہ کر سکوں۔“[2]
- زکاۃ کے متعلق بھی قرآن کریم میں حکم موجود ہے لیکن زکاۃ کا نصاب، اس کی شرح، مدت، زرعی پیداوار کے احکام اور عشر و خراج کے مسائل رسول اللہ ﷺ ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تمام تفصیلات قرآن کریم سے الگ ہوتے ہوئے بھی قرآن کریم ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ قرآن نے جو احکام اپنی جامعیت کی وجہ سے مجمل طور پر بیان کیے تھے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔

یہ تو عبادات کے متعلق آپ کی ہدایات تھیں۔ معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ قرآن کریم نے صرف اتنا ذکر کیا ہے کہ چور، خواہ مرد ہو یا عورت اس کا ہاتھ کاٹ دو۔[3] لیکن ہاتھ کتنی مالیت کی چوری پر کاٹنا ہے اور کہاں سے کاٹنا ہے؟ یہ رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمایا ہے۔ اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ بیان کر دیا جائے کیونکہ اس کا اس موضوع سے بہت گہرا تعلق ہے:

---

① صحيح البخاري، الأذان، حديث: 631. ② سنن النسائي، مناسك الحج، حديث: 3064. ③ المآئدة 5: 38.

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ درس حدیث دے رہے تھے، اس دوران میں ایک شخص نے کہا: آپ قرآن کا درس دیا کریں کیونکہ آپ ہمیں ایسی احادیث سناتے ہیں جن کی بنیاد قرآن میں نہیں ہوتی۔ اس پر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا، فرمانے لگے: کیا تو اور تیرے ہم نوا قرآن پڑھتے ہیں؟ ذرا مجھے نماز کی تفصیلات سے آگاہ کرو کہ اس کے آداب و حقوق کیا ہیں؟ نیز سونے چاندی، اونٹ گائے اور دیگر اصناف مال کی زکاۃ کے متعلق بھی سناؤ کہ ان کا نصاب کیا ہے؟ آپ حضرات تو اس وقت موجود نہ تھے لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ کی مجالس میں شرکت کی ہے جن میں ہمیں ایسے مسائل سے آگاہی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز کے فرائض و واجبات اور زکاۃ کے نصاب و حقوق سے آگاہ فرمایا تھا۔ سائل نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر کہا: آج آپ نے میرا دل زندہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حیاتِ جاوداں بخشے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب وہ آدمی فوت ہوا تو مسلمانوں کے ہاں وہ بہت بڑا فقیہ تھا۔[1]

واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث و سنن دراصل قرآن کریم کا بیان ہیں جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ''پھر ہمارے ذمے اس کا بیان کرنا ہے۔''[2] اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ قرآن اور اس کا بیان دونوں اللہ کی طرف سے ہیں اور ان دونوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ ''ہم ہی نے یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''[3] اللہ تعالیٰ نے جس انداز سے ان کی حفاظت کی ہے ہم اسے تین مراحل میں تقسیم کرتے ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے الفاظ قرآن اور بیان قرآن، یعنی ان کی مراد کو اپنی حفاظت کے ساتھ سینۂ نبوت میں اتار کر انھیں محفوظ کیا۔

② رسول اللہ ﷺ نے اس حفاظت الٰہیہ کی مدد سے قرآنی الفاظ کو تلاوت کے ذریعے سے اور اس کے بیان کو اپنے افعال و اقوال اور تقریرات کے ذریعے سے اپنے صحابہ کو منتقل فرما دیا۔

③ اس کے بعد قرآن اور اس کا بیان دونوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین اور تبع تابعین تک، پھر سینہ بہ سینہ اور سفینہ در سفینہ ہم تک پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بیان کی حفاظت کے لیے مندرجہ ذیل تین ذرائع پیدا فرمائے:

* تعامل امت: قرآن کریم کے احکام کی تعمیل جس طرح رسول اللہ ﷺ کرتے تھے، آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کی اتباع کرتے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان کتاب اللہ اور اپنے

[1] المستدرك للحاكم:1/110,109، حديث:382. [2] القيمة 75:19. [3] الحجر15:9.

تشریحی اختیارات کے مطابق فیصلے کرتے اور لوگ ان فیصلوں کو ماننے کے پابند ہوتے۔ شریعت کے احکام کی بجا آوری کا دوسرا نام تعامل امت ہے، اس کے ذریعے سے سنت کو محفوظ کیا گیا۔

* حفظ وسماع: حفاظت حدیث کا دوسرا ذریعہ احادیث مبارکہ کا سننا، انھیں یاد رکھنا اور دوسروں تک پہنچانا تھا۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ایک خاص دعا کتب حدیث میں مروی ہے، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو خوش و خرم رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد رکھا، پھر اسے دوسروں تک پہنچایا کیونکہ جن لوگوں کو بات پہنچائی جاتی ہے، ان میں سے بہت سے ایسے ہو سکتے ہیں جو براہ راست سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوں۔''[1] صحابۂ کرام ﷺ نے اس نبوی دعا کا مصداق بننے کی خاطر حفاظت حدیث کے لیے ایک مثالی کردار ادا کیا۔

* کتابت حدیث: حفاظت حدیث کا تیسرا ذریعہ اس کی کتابت و تحریر ہے۔ یہ ذریعہ بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اختیار کیا گیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا تھا: ''ابوشاہ یمنی کو میرا خط لکھ دو۔''[2] اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ﷺ کو بطور خاص کتابت حدیث کی اجازت دی تھی۔[3] گویا رسول اللہ ﷺ نے احادیثِ مبارکہ لکھنے کا خود حکم دیا جو زمانۂ نبوت سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔

کتابت حدیث کو ہم تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

① دورِ رسالت اور عہد صحابہ میں احادیث کا بہت سا تحریری سرمایہ وجود میں آ گیا تھا۔

② حضرت عمر بن عبدالعزیز ﷫ نے اپنے دور خلافت میں زبانی اور تحریری احادیث کی جمع و تدوین کا حکم حضرت محمد بن مسلم زہری کو دیا جو اپنے دور کے بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔

③ یہ دور چوتھی صدی ہجری کے خاتمے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں مسند نویسی کا آغاز ہوا۔ ان مسانید میں محدثین کرام نے صحیح وضعیف روایات کو بلا امتیاز جمع کیا۔ بالآخر سلطان المحدثین ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری ﷫ نے سب سے پہلے ایسی کتاب لکھی جو صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی حامل تھی۔ پھر ان کے تلمیذ رشید امام مسلم بن حجاج نے صحیح مسلم ترتیب دی۔ اس کے بعد سنن اربعہ کی تدوین ہوئی۔ فن حدیث میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے ایک صحیح بخاری ہے جس کی شرح قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

* کچھ ترجمہ وفوائد کے بارے میں: مختصر صحیح بخاری کے ترجمہ وفوائد کے بعد دارالسلام کی طرف سے مکمل صحیح بخاری کے ترجمہ وفوائد کی ذمہ داری بھی مجھے سونپ دی گئی، لیکن صحیح بخاری علم وعرفان کا ایک ایسا بحر ذخار ہے جس کا

---

① جامع الترمذي، العلم، حديث: 2657. ② صحيح البخاري، اللقطة، حديث: 2434. ③ مسند أحمد: 162/2.

کنارہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ یہ کتاب جو امام بخاری رحمہ اللہ کی زندگی کا حاصل اور نچوڑ ہے، اس میں انھوں نے ایسے ایسے علمی جواہرات اور فقہی موتی بکھیرے ہیں کہ انھیں نکالنے کے لیے وہی باکمال شخص ہمت کر سکتا ہے جو اس سمندر میں غوطہ زنی کا ماہر ہو، جبکہ میری حقیقت تو ایک طفل مکتب کی تھی۔ میں اس عظیم ذمہ داری کے پیش نظر اسی کیفیت سے دوچار رہا جس کا اظہار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیا جب انھیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وہ فرمانے لگے:

''اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ حضرات کسی پہاڑ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو قرآن جمع کرنے کی نسبت یہ کام میرے لیے آسان تھا۔''[1]

علمی کم مائیگی کے علاوہ مجھے ہجوم مشاغل نے بھی گھیر رکھا تھا۔ مکتب الدعوۃ اسلام آباد کی طرف سے علاقہ بھر میں تدریسی، دعوتی خدمات، ہفت روزہ ''اہلحدیث'' میں فتاویٰ نویسی کا اہتمام، ماہنامہ ''شہادت'' کے لیے ''ایمان وعقیدہ'' کے عنوان سے مستقل کالم نگاری، اپنے ادارے ''مرکز الدراسات الاسلامیہ'' کو رواں دواں رکھنے کے لیے اعصاب شکن بھاگ دوڑ، ادارہ ''المشاریع الخیریہ'' کے تحت زیر تعمیر مراکز و مساجد کی نگرانی، مختلف مساجد میں دروس قرآن و حدیث، خطبۂ جمعہ کے لیے ملتان آمد و رفت، پھر عوام الناس کی دینی رہنمائی اور گھریلو مصروفیات اس کے علاوہ تھیں۔ ایسے حالات میں صحیح بخاری کی تفہیم وتشریح کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ بہر حال اگر اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور احباب کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو شاید یہ کٹھن کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکتا۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم.

○ **ایک بھیانک خواب:** جن دنوں مجھے دارالسلام کی طرف سے صحیح بخاری پر کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، ان دنوں مجھے ایک خواب نے بہت پریشان کیا اور کئی مہینوں تک میرے لیے سوہانِ روح بنا رہا، وہ یہ کہ ''میں خواب میں خود کو ایک میدان میں کھڑا دیکھتا ہوں، پھر سر پر ایک بھاری بھرکم گٹھڑی رکھ دی گئی جس کا بوجھ میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں، لیکن لڑکھڑانے کے باوجود میں نے اسے اٹھائے رکھا، بالآخر بے بس ہو کر اسے زمین پر پھینک دیا۔'' اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی لیکن طبیعت میں بہت بوجھ اور انقباض تھا۔ نفس اور شیطان دونوں کی ملی بھگت سے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ بھاری بھرکم گٹھڑی صحیح بخاری کے ترجمہ اور فوائد کا بوجھ ہے جو تم نہیں اٹھا سکو گے۔ اس کے بعد میں کئی دنوں تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا کہ اب کیا کیا جائے؟ انھی ایام فترت میں اصحابِ دارالسلام کی طرف سے جلد از جلد

---

1 صحيح البخاري، فضائل القرآن، حديث: 4986.

کام نمٹانے کا اصرار شروع ہوا۔ اس سلسلے میں عزیز القدر حافظ عبدالعظیم اسد سلمہ اللہ کے ہمراہ پروفیسر مولانا عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ اور مولانا حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ میاں چنوں غریب خانہ پر تشریف لائے لیکن مجھے جہاں ان کے قدوم میمنت لزوم سے خوشی ہوئی وہاں شرمندگی کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ میں ان حضرات کے حکم کی تعمیل میں ان کے حسبِ خواہش صحیح بخاری کا کام نہیں کر سکا تھا۔ آخر کار جب دارالسلام کی طرف سے اصرار مزید بڑھا تو میں نے خود لاہور جا کر اس سے معذرت کر لی اور بوجھل گٹھڑی کو اتار پھینکا، پھر ؎

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

لیکن بزعم خویش بوجھ اتار پھینکنے کے باوجود ذہنی تذبذب میں اضافہ ہوا کہ میں نے کوئی مخرب اخلاق ناول تو نہیں لکھنا تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات پر مشتمل ایک صحیح ترین مجموعے کا ترجمہ کرنا تھا، پھر اس کے متعلق شرح صدر کیوں نہیں ہو رہا؟ گھر آ کر پھر سے اس خواب پر غور کرنا شروع کر دیا کہ مبادا شیطان کی طرف سے ہو، بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ ''یہ ایک شیطانی حرکت ہے، بلاشبہ شیطان ایک صریح طور پر بہکانے والا دشمن ہے۔''[1] مزید سوچ بچار کرنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ ''یہ شیطان ہی تو ہے جو تمھیں اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، لہٰذا اگر تم مومن ہو تو اس سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے خوف کرو۔''[2]

بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ خواب شیطان کی طرف سے ایک ہتھکنڈا ہے جس کے ذریعے سے وہ ایک کارِ خیر میں رخنہ اندازی کرنا چاہتا ہے۔ اپنے آپ پر پھر سے غور کرنا شروع کیا کہ کوتاہی کہاں واقع ہوئی ہے تاکہ اس کا تدارک کیا جائے۔ مجھے رسول اللہ ﷺ کو پیش آنے والے واقعے سے کچھ سہارا ملا۔ حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی حیات طیبہ میں ایک دفعہ عجیب ذہنی تذبذب میں مبتلا ہوئے۔ آپ خیال کرتے کہ میں نے یہ کام کر لیا ہے، حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا حتی کہ جس دن میری باری تھی، آپ میرے پاس موجود تھے، آپ اٹھے، اللہ سے دعا کی، پھر دعا کی، پھر مجھے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: ''اے عائشہ! کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات سے آگاہ کر دیا ہے جس کے متعلق میں نے اللہ تعالیٰ سے بار بار پوچھا تھا؟''[3]

میں نے بھی رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک رات اللہ کے حضور خود کو پیش کر دیا، خوب دعا کی، عرض کیا: ''اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرا کام آسان کر دے۔''[4]

اللہ تعالیٰ نے میرے وساوس کو دور کر دیا اور اپنے دین حنیف کی خدمت کا کام لینے کے لیے پھر سے اسباب و وسائل

---

[1] القصص 28: 15. [2] آل عمران 3: 175. [3] صحيح البخاري، الطب، حديث: 5763. [4] طٰهٰ 20: 26.

پیدا فرمائے۔ احبابِ دارالسلام نے میری معذرت کو رد کر دیا اور اصرار کیا کہ صحیح بخاری کا یہ کام آپ ہی نے کرنا ہے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اللہ کا نام لے کر اس کام کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ بقول مولانا ظفر علی خاں ؎

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے   پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

میں نے نئے جذبے اور نئے ولولے سے صحیح بخاری پر کام کی منصوبہ بندی کی اور رات کے پچھلے حصے میں کام کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ نے بہت خیر و برکت رکھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا﴾ ''رات کا اٹھنا یقیناً نفس کو بہت زیر کرنے والا ہے اور دعا و ذکر کے لیے یہی وقت زیادہ موزوں ہے۔''[1] رسول اللہ ﷺ کی دعا بھی میرے سامنے تھی کہ ''اے اللہ! میری امت کے لیے سحری کے وقت میں خیر و برکت رکھ دے۔''[2] چنانچہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے درج ذیل نکات سامنے رکھ کر دوبارہ اس مبارک کام کا آغاز کر دیا:

(1) ہر بڑے عنوان کا مفہوم اور اس کے تحت آنے والے چھوٹے چھوٹے عنوانات کی روشنی میں اس کے مشمولات پر تعارفی نوٹ۔ (2) باب کی وضاحت اور اس میں آمدہ معلق روایات کی تخریج۔ (3) سلیس الفاظ میں حدیث کا اُردو ترجمہ۔ (4) دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق حدیث کی تشریح۔ (5) عنوان اور حدیث میں مطابقت۔ (6) حدیث کا پس منظر اور سبب ورود۔ (7) بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق۔ (8) دیگر روایات میں آمدہ اضافوں کی صراحت۔ (9) دیگر احادیث کی روشنی میں امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کی وضاحت۔ (10) امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراضات اور منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَه.

اس مجوزہ نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے دن کے ہنگامہ خیز اوقات کے بجائے رات کے پچھلے پہر بیدار ہوتا، وضو کر کے پرسکون ماحول میں بیٹھ جاتا، پھر امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان اور پیش کردہ حدیث پر غور کرتا، اس کے پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کو دیکھتا، حدیث کا مفہوم متعین کرنے کے لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تالیف ''فتح الباری'' پڑھتا، بوقت ضرورت علامہ عینی رحمہ اللہ کی ''عمدۃ القاری'' کو بھی دیکھتا، اس کے علاوہ عرب شیوخ، مثلاً: شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ناصر الدین البانی اور شیخ صالح العثیمین رحمہم اللہ کی تالیفات و رسائل سے استفادہ کرتا، پھر گھنٹوں غور و فکر کرنے کے بعد حدیث کے مفہوم اور اس سے اخذ کردہ فوائد کو نوک قلم پر لاتا۔ بہر حال جو کچھ لکھا وہ اندھیرے میں تیر چلانے کے بجائے علی وجہ البصیرت لکھا ہے۔ بعض مسائل کے متعلق ہم نے سیر حاصل بحث کی ہے جو شاید دوسری کسی کتاب میں دستیاب نہ ہو سکے۔

---

1 المزمل 73: 6. 2 مسند أحمد: 417/3.

صحیح بخاری کی کتاب التوحید کی تشریح کے لیے ہم نے شیخ عبداللہ الغنیمان رحمہ اللہ کی تالیف شرح کتاب التوحید کا انتخاب کیا تا کہ توحید الاسماء والصفات کے متعلق اسلاف کا منہج نکھر کر سامنے آ جائے۔ بہر حال صحیح بخاری کا ترجمہ اور فوائد کیا ہیں؟ اس کا فیصلہ تو قارئین اسے پڑھ کر ہی کریں گے لیکن میں نے اپنا خون جگر نچوڑ کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اس میں میری استعداد و لیاقت کو کوئی دخل نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ اس کی توفیق ہی سے میں ہمالیہ کی اس چوٹی کو سر کرنے کے قابل ہوا ہوں وگرنہ میں تو میرا نداز ہو چکا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: ''ہم پر اور تمام لوگوں پر یہ اللہ ہی کا فضل ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر نہیں کرتے۔''[1]

دعویٰ نہیں بلکہ اللہ کی رحمت پر بھروسا کرتے ہوئے تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ میں نے صحیح بخاری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے امید ہے کہ اس میں ایک طویل عرصے تک کوئی جوہری تبدیلی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ والعلم عنداللّٰہ.

* ابھی کام باقی ہے: صحیح بخاری امت پر ایک قرض ہے جو ابھی تک ادا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ہماری یہ حقیر سی کوشش ہے لیکن میرے نزدیک ابھی دو پہلوؤں پر کام کرنے کی شدید ضرورت ہے جو حسب ذیل ہیں:

① امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوانات کے متعلق یہ بات اہل علم کے ہاں مشہور ہے کہ ''بخاری کی فقاہت ان کے تراجم میں ہے۔'' اور یہ تراجم خاموش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ٹھوس ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تراجم پر غور وفکر کر کے کچھ اصول وضع کیے جائیں، پھر ان اصولوں کی روشنی میں پیش کردہ احادیث کا جائزہ لیا جائے اور مدارس میں ان کے مطابق صحیح بخاری کی تدریس کی جائے۔ ہمارے ہاں ایک سال میں جس انداز کے ساتھ بخاری پڑھائی جاتی ہے اس سے حق ادا نہیں ہوتا۔

② امین احسن اصلاحی نے محدثین کرام کے وضع کردہ اصول حدیث کو سبوتاژ کرنے کے لیے ''مبادئ تدبر حدیث'' اور صحیح بخاری کی ''اصلاح'' کے لیے ''تدبر حدیث'' کے نام سے کتب شائع کی ہیں، ان میں اس نے محدثین کرام بالخصوص امام بخاری رحمہ اللہ کے خلاف بہت زہر اگلا ہے، اس کا تریاق مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے آغاز میں اس کی کوشش کی تھی لیکن طوالت کے پیش نظر یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ ہمارا آئندہ مستقل طور پر ''اصلاح اصلاحی'' کا پروگرام ہے۔ باذن اللّٰہ تعالٰی.

آخر میں اپنے ممدوح حبیب مکرم مولانا عبدالمالک مجاہد حفظہ اللہ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے صحیح بخاری کے کام کا

---

[1] یوسف 12: 38.

جائزہ لینے کے لیے کمان اپنے ہاتھ میں لی اور مستقل طور پر فون کے ذریعے سے مجھے تازہ دم رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اگر ان کے محبت بھرے لہجے میں سرزنش نہ ہوتی تو شاید اتنی جلدی یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا۔ بہر حال میں نے صحیح بخاری پر کام عبادت سمجھ کر کیا ہے اور انھوں نے ایک محسن کی حیثیت سے میرے ساتھ علمی تعاون فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کی محنت اور کوشش کو اپنے ہاں ذریعۂ نجات بنائے اور ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز کر کے ہمیں قیامت کے دن خدام حدیث کے ساتھ اٹھائے۔ آمین. یا رب العالمین.

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾

وصلى الله على نبيه محمد و آله و أصحابه و أتباعه و إخوانه أجمعين.

طالب الدعوات

ابو محمد عبدالستار الحماد

مرکز الدراسات الاسلامیہ، میاں چنوں

جنوری 2011ء، محرم 1432ھ

حالات امام بخاری رحمہ اللہ

ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ

* پس منظر: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب سورۂ جمعہ نازل ہوئی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سوال کیا: اللہ کے رسول! سورۂ جمعہ کی اس آیت: ''اور انھی میں سے کچھ دوسرے لوگ ہیں جو ان سے نہیں ملے۔''[1] کا مصداق کون لوگ ہیں؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان (کی ران) پر رکھ کر فرمایا: ''اگر ایمان ثریا ستارے کی بلندی پر ہوتا تو ان لوگوں میں سے کئی لوگ وہاں تک پہنچ جاتے اور ایمان کو وہاں سے حاصل کرتے۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ کا مصداق اہل فارس کو ٹھہرایا ہے کہ یہ لوگ دوسروں سے بڑھ کر دین اسلام کی خدمت کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور کے بعد اسلام کی نشر و اشاعت کا جتنا کام اہل فارس نے سرانجام دیا، یہ سعادت دوسرے لوگوں کو نصیب نہ ہو سکی۔ بڑے بڑے محدثین اور فقہائے عظام کی اکثریت اسی علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ اس وقت بخارا شہر ملک فارس کا حصہ تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دین اسلام کی سربلندی کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے ہاں اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین.

* نام و نسب: ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ جعفی بخاری۔ بردزبہ، فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کاشتکار اور زراعت پیشہ کے ہیں، چونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کے جداعلیٰ کھیتی باڑی کرتے تھے، اس لیے بردزبہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ بزرگ اپنے آبائی مذہب کے مطابق مجوسی آتش پرست تھے۔ ان کے بیٹے اور ابراہیم کے والد مغیرہ، یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق جو شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا وہ اسی کے قبیلے کی طرف منسوب ہوتا تھا، اس بنا پر آپ جعفی کہلائے۔ کیونکہ عرب قبول اسلام کے ربط خاص کو ولائے اسلام سے تعبیر کرتے تھے اور پھر اس ولا کی شاخیں دور دور تک پھیلتی جاتی تھیں، اسی کے ساتھ وہ اپنی نسبتیں قائم کر لیتے تھے۔

---

[1] الجمعة 62:3. [2] صحيح البخاري، التفسير، حديث:4897.

امام بخاری رحمہ اللہ کو بھی ان کے جداعلیٰ کی نسبتِ ولا کی وجہ سے جعفی کہا جاتا ہے۔ چونکہ آپ بخارا میں پیدا ہوئے تھے، اس بنا پر آپ بخاری کہلائے۔ گویا آپ کی دو نسبتیں ہیں: ایک وطن بخارا کی وجہ سے بخاری اور دوسری ولائے اسلام کی بنا پر جعفی ہے۔[1]

* ولادت: آپ 13 شوال 194 ہجری بمطابق 21 جولائی 810ء بعد از نماز جمعہ بخارا شہر میں پیدا ہوئے۔ بخارا، روس کے علاقے ازبکستان میں ماوراء النہر کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے جو چین، ایران اور افغانستان کی سرحدوں کی شاہراہ پر واقع ہے۔ اس شہر میں ان تینوں ملکوں کے راستے آ کر آپس میں ملتے ہیں۔

* بچپن کے حالات: امام بخاری رحمہ اللہ ابھی چھوٹے تھے کہ ان کے والد اسماعیل بن ابراہیم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ پھر ان کی والدہ نے ان کی تربیت کی جو بہت صابرہ، حلیم الطبع، بہت عبادت گزار اور مستجاب الدعوات تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ بچپن میں کسی مرض کی وجہ سے دونوں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو گئے تو ان کی والدہ کو بہت صدمہ ہوا۔ اللہ کی بارگاہ میں رو رو کر دعائیں کیں کہ لختِ جگر کی بینائی واپس آ جائے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے شب خیزی کی دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا۔ آپ نے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، انھوں نے آپ کو بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے، تمھاری کثرت دعا کی وجہ سے آپ کے لختِ جگر کی بصارت واپس کر دی ہے، چنانچہ جب نیند سے بیدار ہوئیں تو دیکھا کہ بیٹے کی آنکھیں روشن ہیں۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی قرآن مجید حفظ کر رہا تھا کہ مجھے احادیث حفظ کرنے کا الہام ہوا۔ جب میں مکتب سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عمر تقریباً دس برس تھی۔ میں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لی تھیں۔ اس کے بعد میں نے مختلف اساتذہ کے پاس آنا جانا شروع کر دیا، چنانچہ میں ایک دن امام داخلی کے پاس حاضر ہوا تو وہ حاضرین کے سامنے احادیث بیان کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک حدیث کی سند بایں الفاظ پڑھی: سفیان عن أبي الزبیر عن إبراهیم میں نے عرض کیا کہ ابوالزبیر، ابراہیم سے روایت نہیں کرتا۔ اس پر امام داخلی نے مجھے ڈانٹ پلائی تو میں نے عرض کیا: اگر آپ کے پاس اصل نسخہ ہے تو ملاحظہ فرمالیں۔ وہ گھر تشریف لے گئے، اصل نسخہ دیکھا، پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے لڑکے! تو نے کیسے کہا تھا؟ میں نے انھیں بتایا کہ سفیان، زبیر سے روایت کرتے ہیں اور زبیر، عدی کے بیٹے ہیں، وہ ابراہیم سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد امام داخلی نے قلم پکڑا اور اپنی کتاب میں غلطی کی اصلاح کر لی کیونکہ وہاں ابوالزبیر ہی لکھا ہوا تھا جبکہ اصل زبیر بن عدی تھا۔ اس وقت کسی نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ جب آپ نے امام داخلی کی غلطی پکڑی تو اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ میری عمر اس

[1] مقدمة فتح الباري، ص: 669. [2] مقدمة فتح الباري، ص: 669.

وقت گیارہ سال تھی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ جب میں نے سولھویں سال میں قدم رکھا تو اس وقت میں نے عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابیں یاد کر لی تھیں اور اہل الرائے کے کلام کو بھی خوب سمجھنا شروع کر دیا تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے امام بخاری رحمہ اللہ کو بچپن ہی میں بے مثال قوتِ حافظہ سے نوازا تھا، چنانچہ حاشد بن اسماعیل بیان کرتے ہیں:

''امام بخاری رحمہ اللہ ہمارے ساتھ حدیث حاصل کرنے کے لیے مشائخ بصرہ کے پاس آتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ بچپن میں تھے۔ سولہ دن گزر گئے، آپ کے ساتھی تو احادیث لکھتے لیکن آپ انھیں قلمبند نہیں کرتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے آپ کو ملامت کی تو امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: اپنی اپنی کاپیاں لاؤ۔ ہم نے اپنی کاپیاں نکالیں جن میں پندرہ ہزار سے زیادہ احادیث لکھی ہوئی تھیں۔ آپ نے وہ سب کی سب زبانی پڑھ دیں حتی کہ ہم آپ کے حافظے سے اپنی کاپیوں کی اصلاح کرتے تھے۔''[2]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا حافظہ بچپن ہی سے بہت تیز تھا، نیز آپ چھوٹی عمر میں بہت سا علم حاصل کر چکے تھے۔

* امام بخاری رحمہ اللہ کی ذہانت: اللہ تعالیٰ نے امام بخاری رحمہ اللہ کو ذہن رسا اور قوی حافظہ عطا فرمایا تھا۔ آپ نے اسناد سمیت لاکھوں احادیث یاد کر رکھی تھیں۔ آپ کا اپنا بیان ہے: ''مجھے ایک لاکھ صحیح احادیث اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں۔'' بلکہ آپ فرماتے ہیں کہ سند میں کوئی تابعی ہو یا صحابی، میں ان کی ولدیت، جائے پیدائش اور سن وفات الغرض سب کچھ جانتا ہوں۔ ایک دفعہ امام بخاری رحمہ اللہ کے سامنے کسی نے ان کے شیخ امام اسحاق بن راہویہ کا یہ قول پیش کیا: میں اپنی کتاب میں ستر ہزار احادیث کو دیکھتا ہوں۔ یہ سن کر امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: شاید اس زمانے میں کوئی ایسا شخص بھی ہو جو دو لاکھ احادیث اپنی کتابوں میں دیکھتا ہو۔ امام بخاری نے اگرچہ اپنا نام نہیں لیا لیکن ان کی مراد اپنی ذات تھی۔[3]

ایک مرتبہ امام بخاری رحمہ اللہ بغداد تشریف لے گئے تو بغداد کے مشائخ نے جمع ہو کر امام بخاری کا امتحان لینے کا پروگرام بنایا۔ امتحان کا طریقہ یہ طے ہوا کہ دس علماء کو مقرر کیا گیا اور ہر عالم کو دس، دس احادیث دی گئیں، پھر انھوں نے سند اور متن میں تبدیلی کی، اس طرح کہ ایک حدیث کی سند کو دوسری حدیث کے متن کے ساتھ ملا دیا، دوسری حدیث کا متن کسی اور حدیث کی سند کے ساتھ ملا دیا، اس طرح انھوں نے سو کی تعداد میں مقلوب احادیث تیار کیں۔ ہر ایک عالم کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ جب مجلس خوب جم جائے تو باری باری ان احادیث کو امام بخاری رحمہ اللہ پر پیش کیا جائے۔ جب بغداد میں مجلس

---

1 مقدمة فتح الباري، ص: 669. 2 مقدمة فتح الباري، ص: 670. 3 مقدمة فتح الباري، ص: 681.

حدیث قائم ہوئی، جس میں مقامی اور بیرونی بے شمار لوگ موجود تھے، اور اہل مجلس مطمئن ہو کر بیٹھ گئے تو طے شدہ پروگرام کے مطابق ان دس علماء میں سے ایک عالم امام بخاری رحمہ اللہ کے سامنے آیا اور ایک مقلوب حدیث پیش کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: میں اسے نہیں پہچانتا۔ جب اس نے دوسری حدیث پیش کی تو امام بخاری رحمہ اللہ نے وہی جواب دیا کہ میں اسے نہیں جانتا، اس طرح اس نے اپنی دس احادیث پوری کر لیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ہر حدیث کے متعلق یہی کہتے تھے: میں اسے نہیں پہچانتا۔ پہلے شخص کے بعد دوسرا شخص کھڑا ہوا، اس نے بھی طے شدہ منصوبے کے مطابق دس مقلوب احادیث پیش کیں۔ اس طرح باقی علماء نے بھی باری باری احادیث کو الٹ پلٹ کر پیش کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ ہر ایک کو یہی جواب دیتے تھے: میں اس حدیث کو نہیں پہچانتا۔ اہل مجلس میں سے کچھ حضرات تو منصوبے کی تہہ تک پہنچ گئے اور کچھ تذبذب کا شکار ہونے لگے اور امام بخاری رحمہ اللہ کے حافظے اور ذہانت میں شک وشبہ کرنے لگے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے شخص کو بلایا اور اسے کہا کہ تو نے سب سے پہلے یہ حدیث اس طرح پڑھی جبکہ صحیح حدیث اپنے متن اور سند کے ساتھ اس طرح ہے۔ پھر اس کی پیش کردہ دوسری حدیث پڑھی اور حدیث کے اصل متن اور سند کی نشاندہی فرمائی۔ اسی طرح باقی آٹھ احادیث درست کر کے بتائیں۔ پھر آپ نے دوسرے شخص کو بلایا اور اس کی پیش کردہ مقلوب احادیث صحیح متن اور سند کے ساتھ بتائیں۔ اسی طرح ہر آدمی کو بلاتے رہے اور ہر ایک کی دس مقلوب احادیث کو صحیح سند اور متن کے ساتھ بتاتے رہے۔ اس واقعے کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے، اس کے بعد بایں الفاظ اس پر تبصرہ کیا ہے:

> ''اس واقعے کو سننے کے بعد انسان امام بخاری رحمہ اللہ کے حافظے کا سکہ تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس مجلس میں ایک سو صحیح احادیث کا بیان کر دینا کوئی تعجب انگیز بات نہیں بلکہ تعجب وحیرت اس بات پر ہے کہ آپ نے مقلوب شدہ سو احادیث کو صرف ایک دفعہ سن لینے کے بعد انھیں اسی ترتیب کے ساتھ یاد کر لیا اور اسی مجلس میں انھیں دہرا دیا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مذکورہ واقعے سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

> ''سمرقند میں چار صد محدث تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ شامی اسناد کو عراقی اسناد کے ساتھ اور عراقی اسناد کو شامی اسناد کے ساتھ ملایا، اسی طرح حجازی اسناد کو یمنی اسناد کے ساتھ خلط ملط کیا۔ یہ مجموعہ تیار کر کے انھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کے سامنے پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہم امام بخاری کی غلطی پکڑ لیں گے، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ انتہائی کوشش کے باوجود وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی ایک غلطی بھی نہ پکڑ سکے۔''[1]

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص: 680.

احید بن ابی جعفر والیٔ بخارا کہتے ہیں:

''ایک دن مجھے امام بخاری رحمہ اللہ فرمانے لگے: کتنی ہی احادیث میں نے بصرہ میں سنیں اور انھیں شام میں جا کر لکھا، نیز کتنی ہی احادیث میں نے شام میں سنیں اور انھیں مصر جا کر لکھا۔ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا: آپ مکمل احادیث اسی طرح لکھتے رہے؟ تو امام بخاری خاموش رہے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے خاموشی سے ہاں میں جواب دیا ہے کیونکہ دیگر واقعات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ ایک ہی دفعہ سننے سے اسے یاد کر لیتے تھے۔ حضرت قتیبہ آپ کے متعلق فرماتے ہیں: اگر محمد بن اسماعیل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتے تو ایک نشانی کی صورت اختیار کر جاتے۔[2] حافظ رجاء بن رجاء کہتے ہیں کہ محمد بن اسماعیل کی برتری دوسرے علماء پر اس طرح ہے جس طرح مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اور آپ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے جو روئے زمین پر چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔[3] بہرحال امام بخاری رحمہ اللہ حفظ احادیث، تیزیٔ ذہن، دقت نظر، کثرت فقاہت، علل حدیث کی وسیع معرفت، معرفت اسانید، قوتِ حافظہ اور ملکۂ اجتہاد و استنباط میں اپنی مثال آپ تھے۔

✱ **رحلات بخاری:** محدثین کی اصطلاح میں رحلہ اس سفر کو کہا جاتا ہے جو حدیث یا اس کی سند عالی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس مبارک سفر کا ذکر اس طرح ہے: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴾ ''پھر ہر گروہ میں سے کچھ لوگ دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے کیوں نہ نکلے، تاکہ جب وہ ان کی طرف واپس جائیں تو اپنے لوگوں کو ڈرائیں، شاید وہ اس طرح برے کاموں سے بچے رہیں۔''[4]

اس آیت کریمہ کے پیش نظر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کو اس قسم کے علمی سفر کا بہت شوق تھا۔ ایک حدیث کے حصول کے لیے مہینوں سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن بریدہ کہتے ہیں کہ ایک صحابی مدینہ طیبہ سے سفر کر کے مصر میں حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ جب ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ وہ اپنی اونٹنی کو گھاس کھلا رہے ہیں۔ صحابیٔ مذکور نے حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں آپ کے پاس ملاقات کی غرض سے نہیں آیا بلکہ میرے آنے کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے متعلق جاننا ہے جو مجھ تک پہنچی ہے۔ امید ہے آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں گے۔[5]

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی عمر کے سولہویں برس تک اپنے ہی ملک کے اساتذہ سے تحصیل علم کرتے رہے کیونکہ علمی سفر کے

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص: 681. [2] مقدمة فتح الباري، ص: 674. [3] مقدمة فتح الباري، ص: 676. [4] التوبة 9: 122.
[5] مسند أحمد: 6/22.

لیے محدثین کے ہاں یہ شرط ہے کہ جب علمی سفر کا قصد ہو تو اپنے وطن کے شیوخ سے جس قدر احادیث مل سکیں انھیں حاصل کر لیا جائے اگرچہ وہ قلیل تعداد میں ہوں۔

- امام بخاری رحمہ اللہ نے سب سے پہلے علاقۂ حجاز کا ارادہ کیا جو کہ علوم شریعت کا ماویٰ اور رسول اللہ ﷺ کا مسکن اور نزول وحی کا مقام تھا، نیز وہ مرکز اسلام اور جملہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جائے سکونت تھا، لہٰذا آپ 210 ہجری میں اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ پہنچے۔ اس سفر میں آپ کے بڑے بھائی احمد بھی ہمراہ تھے۔ آپ کی والدہ اور آپ کے بھائی حج سے فراغت کے بعد واپس بخارا آ گئے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے تحصیل علم کے لیے مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کر لی اور شیوخ مکہ کی درس گاہوں میں حاضری شروع کی۔ اس وقت مکہ مکرمہ میں جن شیوخ کی درس گاہیں ممتاز تھیں اور جو لوگ امام فن و مرجع خلائق تھے وہ حسب ذیل ہیں: ابو الولید احمد بن الازرقی، عبداللہ بن یزید، اسماعیل بن سالم صائغ، ابوبکر عبداللہ بن زبیر، علامہ حمیدی۔ ان کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی کسب فیض کیا جن کا مکہ مکرمہ میں قیام تھا۔
- مکہ مکرمہ میں حصولِ علم سے فراغت کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا اور 212 ہجری میں مدینہ طیبہ پہنچے۔ وہاں جن اہل علم کا چرچا تھا اور جو لوگ درس حدیث دیتے تھے ان میں سرفہرست حسب ذیل شیوخ ہیں جن سے امام بخاری رحمہ اللہ نے علم حدیث حاصل کیا: ابراہیم بن منذر، مطرف بن عبداللہ، ابراہیم بن حمزہ، ابوثابت محمد بن عبیداللہ اور عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسی۔ واضح رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے مدینہ طیبہ میں دوران اقامت اپنی کتاب تاریخ کبیر کا مسودہ چاندنی راتوں میں لکھا۔
- مدینہ طیبہ میں تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے بصرہ کا قصد کیا جو ان دنوں وسعت علم اور اشاعت حدیث کے اعتبار سے بہت ترقی پر تھا۔ آپ نے بصرہ کا سفر چار مرتبہ کیا اور حسب ذیل شیوخ سے علم حاصل کیا: امام ابوعاصم النبیل، صفوان بن عیسیٰ، بدل بن محبر، حرمی بن عمارہ، عفان بن مسلم، محمد بن عرعرہ، سلیمان بن حرب، ابو الولید الطیالسی اور محمد بن سنان۔
- بصرہ کے بعد آپ نے کوفہ کا رخ کیا جو ان دنوں علم و عرفان کا گہوارہ تھا۔ وہاں کے چند مشاہیر شیوخ حسب ذیل ہیں: عبداللہ بن موسیٰ، ابونعیم، احمد بن یعقوب، اسماعیل بن ابان، الحسن بن الربیع، خالد بن مخلد، سعید بن حفص، طلق بن غنام، عمر بن حفص، قبیصہ بن عقبہ اور ابوغسان۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کوفہ میں ان حضرات سے روایات لیں۔
- بغداد، سلطنت عباسیہ کا دارالحکومت تھا۔ سرکاری طور پر علماء و مشائخ کی قدر افزائی نے بغداد کو مرجع علوم بنا دیا تھا۔ وہاں ہر طرف سے اہل کمال جمع ہو گئے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حصول علم کے لیے بغداد کا کئی مرتبہ سفر کیا۔ بغداد

کے شیوخ مندرجہ ذیل ہیں: امام احمد بن حنبل، محمد بن عیسیٰ الصباغ، محمد بن سائق اور سریج بن نعمان۔ امام بخاری رحمہ اللہ جب آخری مرتبہ بغداد سے واپس آنے لگے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ملاقات کرنے کے لیے گئے تو امام موصوف نے انھیں بڑے دردناک لہجے میں فرمایا: آپ لوگوں، اہل زمانہ اور علم کو چھوڑ کر خراسان جا رہے ہیں۔ جب حاکم بخارا ابوطاہر نے امام بخاری رحمہ اللہ پر بہتان لگا کر بخارا بدر کرنے کا منصوبہ بنایا تو آپ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذکورہ مقولے کو یاد کر کے بہت افسوس کرتے تھے، فرماتے تھے: اب مجھے ان کی بات یاد آتی ہے۔

- امام بخاری رحمہ اللہ نے شام کا بھی سفر کیا، وہاں حسب ذیل مشائخ سے علم حاصل کیا: امام یوسف فریابی، ابونصر اسحاق بن ابراہیم، آدم بن ابی ایاس، ابوالیمان الحکم بن نافع اور حیوہ بن شریح۔ ان کے علاوہ دوسرے اہل علم معاصرین سے بھی تکمیل علم کی۔

- امام بخاری رحمہ اللہ حصول علم کے لیے مصر بھی گئے اور وہاں عثمان بن سعید صائغ، سعید بن ابی مریم، عبداللہ بن صالح، احمد بن صالح، احمد بن شبیب، اصبغ بن فرج، سعید بن ابی عیسیٰ، سعید بن کثیر اور یحییٰ بن عبداللہ سے احادیث حاصل کیں۔

- اسی طرح آپ نے جزیرہ کا سفر کیا۔ وہاں احمد بن عبدالملک الحرانی، احمد بن یزید الحرانی، عمرو بن خلف اور اسماعیل بن عبداللہ الرقی سے خوب خوب استفادہ کیا۔
- آپ نے مرو میں علی بن حسن، عبدان، محمد بن مقاتل
- بلخ میں مکی بن ابراہیم، یحییٰ بن بشر، محمد بن ابان، حسن بن شجاع، یحییٰ بن موسی، امام قتیبہ
- ہراۃ میں احمد بن ابوالولید الحنفی
- نیشاپور میں یحییٰ بن یحییٰ، بشر بن حکم، اسحاق بن راہویہ، محمد بن رافع
- ری میں ابراہیم بن موسیٰ
- واسط میں حسان بن حسان، حسان بن عبداللہ اور سعید بن عبداللہ سے احادیث حاصل کیں ...... رحمہم اللہ ......

امام بخاری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے صرف انھی شیوخ سے احادیث لیں ہیں جو ایمان میں کمی بیشی کے قائل تھے اور اعمال کو جزو ایمان خیال کرتے تھے جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کا موقف تھا۔[1]

* **طبقات شیوخ امام بخاری رحمہ اللہ:** امام بخاری نے بے شمار مشائخ سے کسب فیض کیا، وہ خود فرماتے ہیں: ''میں

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص:670.

نے ایک ہزار اَسّی شیوخ سے احادیث لکھی ہیں اور وہ سب کے سب محدث تھے۔''[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری کے اساتذہ کو پانچ طبقات میں تقسیم کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

- پہلا طبقہ: اس طبقے میں وہ شیوخ شامل ہیں جنھوں نے آپ کو تابعین کے واسطے سے احادیث سنائیں جیسا کہ امام بخاری کے استاد محمد بن عبداللہ انصاری ہیں۔ انھوں نے حمید الطّویل سے احادیث لیں جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردِ خاص ہیں۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد مکی بن ابراہیم ہیں جنھوں نے یزید بن ابی عبید سے احادیث روایت کیں اور یہ حضرت بھی تابعین عظام سے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ مکی بن ابرہیم سے تین واسطوں کے ذریعے سے حدیث بیان کرتے ہیں، یعنی ایک مکی بن ابراہیم دوسرے تابعین اور تیسرے صحابی، ان روایات کو ''ثلاثیات'' کہا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے ایک استاد ابونعیم فضل بن دکین ہیں۔ انھوں نے حضرت سلیمان بن مہران اعمش سے احادیث بیان کی ہیں اور اعمش تابعی ہیں۔ الغرض امام بخاری رحمہ اللہ کے بہت سے اساتذہ ایسے ہیں جو تابعین سے احادیث بیان کرتے ہیں، مشائخ بخاری میں یہ اعلیٰ طبقہ ہے۔
- دوسرا طبقہ: اس طبقے میں امام بخاری رحمہ اللہ کے وہ شیوخ شامل ہیں جو طبقۂ اولیٰ کے ہم عصر تو ہیں لیکن ثقات تابعین سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے، مثلاً: آدم بن ابی ایاس، ابومسہر عبدالاعلیٰ بن مسہر، سعید بن ابی مریم اور ایوب بن سلیمان وغیرہ، یہ تمام حضرات طبقۂ ثانیہ سے ہیں جن سے امام بخاری رحمہ اللہ نے احادیث بیان کی ہیں۔
- تیسرا طبقہ: اس طبقے میں امام بخاری رحمہ اللہ کے وہ اساتذہ شامل ہیں جن کی کسی تابعی سے ملاقات ثابت نہیں ہے، مثلاً: سلیمان بن حرب، قتیبہ بن سعید، نعیم بن حماد، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ، ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ۔ اس طبقے سے روایت کرنے میں امام مسلم رحمہ اللہ بھی امام بخاری کے ساتھ شریک ہیں۔
- چوتھا طبقہ: اس طبقے میں امام بخاری رحمہ اللہ کے وہ مشائخ شامل ہیں جو طلب حدیث میں امام بخاری کے ساتھی تھے یا انھوں نے ان سے کچھ عرصہ قبل علم حدیث پڑھا، مثلاً: محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوحاتم رازی، عبد بن حمید، احمد بن نصر اور محمد بن عبدالرحیم وغیرہ۔ ان اساتذہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے وہ احادیث روایت کی ہیں جو آپ کو پہلے تین طبقات سے نہ مل سکیں۔
- پانچواں طبقہ: اس طبقے میں وہ اساتذہ شامل ہیں جو عمر اور استاد کے اعتبار سے امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ہیں، مثلاً: عبداللہ بن حماد الآملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی اور حسین بن محمد قبانی وغیرہ۔

---

1 مقدمة فتح الباري، ص: 670.

امام بخاری ؒ نے خاص فائدے کے تحت ان سے احادیث بیان کی ہیں، مثلاً: ایک حدیث اپنے اساتذہ اور ساتھیوں سے نہ مل سکی تو وہ اپنے شاگردوں سے بیان کریں گے۔ ایسا کرنے میں امام بخاری ؒ نے امام وکیع کی بات پر عمل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: آدمی اس وقت تک عالم نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے سے اعلیٰ، اپنے ہم عمر اور اپنے سے نیچے والے سے احادیث بیان نہیں کرتا بلکہ امام بخاری ؒ خود فرماتے ہیں کہ انسان محدث کامل اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے سے اعلیٰ، اپنے ہم عمر اور اپنے سے کم درجے والے سے احادیث بیان نہ کرے۔''[1]

* **تلامذۂ بخاری:** امام بخاری ؒ کے تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ امام بخاری کے شاگرد فربری کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ سے صحیح بخاری کا سماع کیا ہے، ان کی تعداد نوے ہزار ہے۔[2] امام بخاری ؒ سے روایت کرنے والوں کو ہم تین طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- **پہلا طبقہ:** اس طبقے میں وہ مشائخ شامل ہیں جن سے امام بخاری ؒ نے کسب فیض کیا۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: عبداللہ بن محمد مسندی، عبداللہ بن منیر، اسحاق بن احمد سرماری، محمد بن خلف بن قتیبہ۔
- **دوسرا طبقہ:** یہ طبقہ امام بخاری ؒ کے ہم عصر مشائخ پر مشتمل ہے جو آپ سے احادیث بیان کرتے ہیں۔ اس طبقے میں مشہور مشہور تلامذہ یہ ہیں: ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی، ابراہیم حربی، ابوبکر بن ابی عاصم، موسیٰ بن ہارون، محمد بن عبداللہ بن مطین، اسحاق بن احمد بن زیرک فارسی، محمد بن قتیبہ بخاری، ابوبکر اعین۔
- **تیسرا طبقہ:** اس طبقے میں وہ تلامذہ شامل ہیں جن کا شمار بڑے بڑے حفاظ میں ہوتا ہے۔ چند ایک کے نام یہ ہیں: صالح بن محمد جزرہ، ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری، ابوالفضل احمد بن سلمہ، ابوبکر بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، ابوعبدالرحمٰن النسائی، ابوعیسیٰ الترمذی، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر البزار، حاشد بن اسماعیل، ابوالقاسم بغوی، حسین بن اسماعیل المحاملی۔[3]

یہ وہ تلامذہ ہیں جنھوں نے براہ راست امام بخاری ؒ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیے، بالواسطہ تلامذہ کی تعداد میں قیامت تک اضافہ اور آپ کے لیے صدقۂ جاریہ کا سامان پیدا ہوتا رہے گا۔ ذلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء واللّٰه ذو الفضل العظيم.

* **امام بخاری ؒ کا مسلک:** امام بخاری فقہی فروع اور اجتہادی مسائل میں مروجہ مسالک سے بالکل آزاد ہیں۔ مذاہب اربعہ میں سے کسی کی مخالفت یا موافقت کا انحصار تعصب یا عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ دلیل پر ہے جیسا کہ صحیح بخاری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے پاس آپ کا مسلک معلوم کرنے کا واحد ذریعہ آپ کی تالیف صحیح

---

(1) مقدمة فتح الباري، ص 671,670. (2) مقدمة فتح الباري، ص: 686. (3) مقدمة فتح الباري، ص: 687.

بخاری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مسلک درج ذیل آیت کریمہ کا آئینہ دار ہے: ﴿اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ﴾ ”جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تمھاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو، اس کے سوا اور دوستوں کی پیروی نہ کرو۔“[1] اگرچہ کچھ حضرات نے امام بخاری رحمہ اللہ کو شافعی یا حنبلی لکھا ہے لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ آپ مجتہد مطلق، امام الفقہ اور تحریک آزادئ فکر کے علمبردار ہیں جیسا کہ درج ذیل مثالوں سے معلوم ہوتا ہے:

- شوافع کے نزدیک جمعہ کی ادائیگی کے لیے کم از کم چالیس آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے بایں طور عنوان قائم کیا ہے: ”جب لوگ نماز جمعہ کے وقت امام کو چھوڑ کر چلے جائیں تو امام اور باقی ماندہ آدمیوں کی نماز صحیح ہے۔“ (كتاب الجمعة، باب:38) پھر اس کے تحت حدیث ذکر فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ آدمیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا فرمائی جبکہ تجارتی قافلہ آنے کی وجہ سے لوگ دورانِ جمعہ چلے گئے تھے۔ (كتاب الجمعة، حديث:936)
- احناف کے ہاں جمعہ کی ادائیگی کے لیے متعدد شرائط ہیں۔ ان کے ہاں عام دیہاتوں میں جمعہ جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس موقف کی تردید میں بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ”دیہاتوں اور شہروں میں جمعہ کی ادائیگی۔“ (كتاب الجمعة، باب:11) پھر ایک حدیث کا حوالہ دیا کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا جمعہ عبدالقیس کی ایک جواثی نامی بستی میں شروع ہوا جو بحرین کے علاقے میں تھی۔ (كتاب الجمعة، حديث:892)
- حنابلہ کا مشہور مسلک ہے کہ زوال آفتاب سے پہلے جمعہ جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے صراحت فرمائی کہ یہ موقف صحیح نہیں ہے اور ان کی تردید میں ایک عنوان قائم کیا ہے: ”جب سورج ڈھل جائے تو جمعہ کا وقت ہوتا ہے۔“ (كتاب الجمعة، باب:16) پھر آپ نے اس کے تحت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ زوال آفتاب کے بعد جمعہ پڑھتے تھے۔ (كتاب الجمعة، حديث:904)
- مالکی حضرات کے نزدیک بارش کی وجہ سے جمعہ چھوڑ دینا جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کی تردید میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ”بارش کی وجہ سے جمعہ میں حاضر نہ ہونے کی رخصت ہے۔“ (كتاب الجمعة، باب:14) اس کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا کہ اگرچہ جمعہ کی ادائیگی بہت ضروری ہے، تاہم بارش کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ تمھیں مشقت میں ڈالوں اور تم مٹی اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے مسجد میں آؤ۔ (كتاب الجمعة، حديث:901)

---

1. الأعراف 3:7.

مولانا انور شاہ کاشمیری نے امام بخاری رحمہ اللہ کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کسی مسلک کی تقلید نہیں کی بلکہ اجتہاد کا راستہ اختیار کیا ہے، ان کی فہم وبصیرت نے جو فیصلہ کیا، انھوں نے اسے آزادی کے ساتھ اپنایا ہے۔[1] مسائل میں ایک مجتہد کا دوسرے مجتہد کے ساتھ موافق ہونا چیزے دیگر است، یہ بات مجتہد کے مقلد ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

* **تالیفات امام بخاری رحمہ اللہ:** امام بخاری نے متعدد تالیفات کی صورت میں اپنا علمی ترکہ امت کے سپرد کیا ہے۔ ان تصانیف کی دو اقسام ہیں: ① جو آج دستیاب ہیں۔ ② جن کا ذکر صرف مؤرخین نے کیا ہے۔ دستیاب تالیفات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

١- **الجامع الصحيح:** جس کا تفصیلی تذکرہ ہم آئندہ اوراق میں کریں گے۔

٢- **الأدب المفرد:** یہ کتاب اخلاق وآداب اور معاشرتی مسائل پر مشتمل احادیث کا مجموعہ ہے۔

٣- **جزء رفع اليدين:** اسے استادمکرم جناب علامہ بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ کے حواشی کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

٤- **جزء القراءة:** یہ بھی آپ کی تالیف ہے۔

٥- **كتاب الضعفاء:** یہ بھی آپ کی تالیف ہے۔

٦- **خلق أفعال العباد:** اس کتاب کو امام بخاری رحمہ اللہ سے یوسف بن ریحان اور فربری روایت کرتے ہیں۔

٧- **بر الوالدين:** اس رسالے میں والدین سے حسن سلوک کے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہے۔

٨- **التاريخ الكبير:** اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے چاندنی راتوں میں تصنیف کیا اور یہ متعدد جلدوں پر مشتمل ہے۔

٩- **التاريخ الأوسط:** یہ بھی آپ کی تالیف ہے۔

١٠- **التاريخ الصغير:** یہ بھی آپ کی تالیف ہے۔

ان کے علاوہ کچھ تالیفات کا مؤرخین نے ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں: ۞ **الجامع الكبير** ۞ **المسند الكبير** ۞ **التفسير الكبير** ۞ **كتاب الهبة** ۞ **كتاب الأشربة** ۞ **كتاب الوحدان** ۞ **كتاب أسامي الصحابة** ۞ **كتاب المبسوط** ۞ **كتاب العلل** ۞ **كتاب الكنى** ۞ **كتاب الفوائد**[2]

ابوحاتم وراق کہتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے عرض کیا: آپ نے اپنی تمام تصانیف میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ آپ کو یاد ہے؟ تو امام بخاری رحمہ اللہ نے جواب دیا: ان تصانیف میں جو کچھ ہے، ان میں سے کوئی چیز مجھ پر مخفی نہیں ہے، نیز میں نے تمام کتابوں کو تین تین مرتبہ تصنیف کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے ان تصانیف میں دو

---

① فيض الباري:335/1. ② مقدمة فتح الباري، ص:686.

لاکھ سے زیادہ احادیث جمع کی ہیں۔ آپ اپنی تالیفات کے متعلق فرماتے تھے: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے ان تصانیف میں برکت عطا فرمائے گا۔[1]

ان تمام تصانیف میں جو قبولیت اور شہرت دوام صحیح بخاری کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے وہ دوسری کسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امام بخاری رحمہ اللہ کو اتنی عظیم محنت کا اپنے ہاں اجر جزیل عطا فرمائے اور ہمیں قیامت کے دن خدامِ حدیث میں اٹھائے۔ آمين يا رب العالمين.

* **وفات:** آپ نے 30 رمضان المبارک 256 ہجری بمطابق 31 اگست 870ء عید الفطر کی رات بوقت نماز عشاء 62 سال کی عمر میں وفات پائی اور عید کے روز ہی بعد از نماز ظہر بستی خرتنگ میں دفن ہوئے جو سمرقند سے چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ چونکہ آپ کے جنازے پر لوگ بکثرت آئے جس کی بنا پر سواری کی تنگی پیش آئی، اسی دن سے اس بستی کا نام خرتنگ مشہور ہو گیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کو دفن کرنے کے لیے جب قبر میں رکھا گیا تو مٹی سے کستوری کی طرح خوشبو آنے لگی، یہ خوشبو کئی دن تک آتی رہی۔ لوگ آپ کی قبر سے خوشبو والی مٹی اٹھا کر لے جاتے تھے حتی کہ قبر کے اردگرد لکڑی کا جنگلا لگا دیا گیا تاکہ وہ محفوظ رہے۔ عبدالواحد بن آدم طواویسی کہتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ایک مقام پر کھڑے ہیں گویا آپ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ یہاں کس کے انتظار میں ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''میں محمد بن اسماعیل بخاری کا انتظار کر رہا ہوں۔'' مجھے چند دنوں کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ کی وفات کا پتہ چلا تو میں نے دیکھا کہ ان کی وفات کا وہی وقت تھا جس وقت میں نے نبی ﷺ کو خواب میں کسی کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔[2]

1 مقدمة فتح الباري، ص:681. 2 مقدمة فتح الباري، ص:688.

تعارف صحیح بخاری

ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد ﷾

کتب احادیث میں جو مرتبہ اور مقام صحیح بخاری کو حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کو نہیں مل سکا۔ محدثین کرام کے ہاں یہ مقولہ مشہور ہے: ''اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب، صحیح بخاری ہے۔'' سنن نسائی کے مؤلف امام ابوعبدالرحمٰن نسائی ﷫ فرماتے ہیں: کتب احادیث میں محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ﷫ لکھتے ہیں کہ جو انسان اس کتاب کی عظمت تسلیم نہ کرے وہ بدعتی ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہے۔[2] اس عظیم کتاب کا تعارف پیش خدمت ہے:

✱ صحیح بخاری کا نام: الجامع الصحیح المسند المختصر من أمور رسول اللہ ﷺ و سننه و أيامه.

اس نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کا موضوع صحیح اور مسند احادیث کو جمع کرنا ہے۔ امام بخاری ﷫ نے خود فرمایا ہے: میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کو درج کیا ہے۔[3] اس میں احادیث معلقہ اور آثار موقوفہ اصل مقصود نہیں ہیں بلکہ انھیں محض متابعت اور تائید کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اب ہم اس نام کی مختصر وضاحت کرتے ہیں:

1) **الجامع:** محدثین کی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جو مندرجہ ذیل آٹھ قسم کی احادیث پر مشتمل ہو: احکام، مناقب، سیر، آداب، تفسیر، فتن، رقاق اور عقائد۔ امام بخاری ﷫ نے اس کتاب میں حدیث کے متعلق کسی ایک صنف کو خاص نہیں کیا بلکہ انواع ثمانیہ کے متعلق احادیث بیان کی ہیں۔

2) **الصحیح:** اصول حدیث کے اعتبار سے صحیح حدیث کی پانچ شرائط ہیں: ① اتصال سند۔ ② عدل رواۃ۔ ③ ضبط رواۃ۔ ④ عدم شذوذ۔ ⑤ عدم علت۔ امام بخاری ﷫ نے اس کتاب میں بنیادی احادیث کے لیے صحیح ہونے کا پورا پورا التزام کیا ہے، چنانچہ انھوں نے خود تصریح کی ہے کہ میں نے اپنی جامع میں صحیح احادیث ہی ذکر کی ہیں۔

3) **المسند:** اس سے مراد وہ مرفوع حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، خواہ وہ حدیث قولی ہو، فعلی ہو یا تقریری۔ اگر کسی

---

① تاريخ بغداد: 9/2. ② حجة الله البالغة: 134/1. ③ مقدمة فتح الباري، ص: 10.

موقع پر احادیث معلقہ اور آثار موقوفہ بیان ہوئے ہیں تو وہ اصل مقصود نہیں بلکہ انھیں صرف متابعت اور تائید و استشہاد کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اصل مقصود احادیث مرفوعہ متصلہ بیان کرنا ہے۔

4) **المختصر**: امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ لاکھ احادیث سے اس کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں مکررات و معلقات کی مجموعی تعداد نو ہزار اناسی ہے، ان میں ایک ہزار تین صد اکتالیس معلقات، تین صد اکتالیس متابعات اور باقی سات ہزار تین صد ستانوے احادیث موصول ہیں۔

5) **من أمور رسول الله ﷺ**: اس سے مسند کی وضاحت مقصود ہے، یعنی اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور تقریرات کا بیان ہوگا۔

6) **سننه**: اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جاری ہونے والے فقہی احکام ہیں، یعنی ضابطۂ زندگی اور اس کی تفصیل جو آپ سے منقول ہے، اسے بیان کیا جائے گا۔

7) **أيامه**: اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کو پیش آنے والے شب و روز کے حوادث و واقعات ہیں، یعنی اس کتاب میں ابواب جہاد اور غزوات کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

* **سبب تالیف صحیح بخاری**: امام بخاری رحمہ اللہ کی صحیح بخاری سے پہلے کتب حدیث لکھی گئی تھیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک ہی میں اس کی تدوین شروع ہو چکی تھی جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صحیفہ مدون کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بھی رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے الصحيفة الصادقة مرتب کر رکھا تھا، نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے الصحيفة الصحيحة کا بھی تاریخ میں حوالہ ملتا ہے۔ حضرت ابن جریج اور سعید بن عروبہ کے مجموعے بھی مرتب ہوئے تھے لیکن ان میں صرف احادیث کو جمع کیا گیا تھا۔ ان کی عنوان بندی نہیں تھی۔ اس کے بعد سفیان ثوری، امام مالک اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے اپنے مجموعوں کو کتب و ابواب کے ساتھ مرتب فرمایا لیکن ان میں صحیح اور معتمد احادیث جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا لیکن عام لوگوں کو اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسا مجموعہ ہو جس پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا جائے، جس کی ہر حدیث قابل حجت ہو اور اطمینان ہو کہ اس کی ہر حدیث واقعی رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاد امام اسحاق بن راہویہ نے ایک دفعہ اپنی علمی مجلس میں اس امر کا اظہار کیا کہ صحیح احادیث پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہیے جو نہ صرف قابل عمل بلکہ واجب العمل ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استاد محترم کی یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ انھی دنوں امام بخاری نے ایک خواب میں دیکھا کہ وہ مورچھل کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے مکھیاں اڑا رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر یوں کی گئی کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ کے کلام مبارک سے کذب و افترا کی مکھیاں دور فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ

آپ سے رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کے متعلق کوئی عظیم خدمت لے گا، چنانچہ صحیح بخاری کی تالیف دراصل آپ کے استاد محترم کی خواہش کی تکمیل اور آپ کے خواب کی تعبیر ہے۔[1] اس مبارک تالیف کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد ہیں:

① **مختلف فنون کا بیان:** صحیح بخاری کی تالیف سے پہلے مختلف جوامع اور مسانید مرتب ہو چکی تھیں اور مصنفات کے نام سے بھی مجموعے تیار ہو چکے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جب دیکھا کہ متقدمین نے بہت سے اسلامی علوم اور دینی فنون کو اپنی تالیفات میں جمع کر دیا ہے جیسا کہ امام مالک اور سفیان ثوری نے فقہ میں، ابن جریج نے تفسیر میں، ابوعبیدہ نے غریب القرآن میں، محمد بن اسحاق اور موسیٰ بن عقبہ نے سیرت میں، ابن مبارک نے زہد و رقاق میں، امام کسائی نے ابتدائے آفرینش اور قصص انبیاء میں، یحییٰ بن معین نے مناقب صحابہ میں اور دیگر علماء نے تعبیر رویاء، ادب و شمائل، اصول حدیث اور احوال قیامت کے متعلق لکھا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان مدونہ علوم وفنون پر طائرانہ نظر ڈالی تو ان کے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ان تمام علوم وفنون کو ایک مختصر مگر جامع کتاب میں جمع کر دیا جائے، چنانچہ آپ نے چون (54) کے قریب مختلف فنون پر قلم اٹھایا اور ان کا حق ادا کر دیا۔

② **تحریک آزادئ فکر کا احیاء:** تیسری صدی میں محدثین کرام نے جب مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھا کہ وہ اپنے علماء اور فقہاء کے استنباطات اور فتاویٰ جات کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کے استخراجات کو آسمانی وحی خیال کرتے ہیں تو محدثین عظام نے فقہ الرائے کے بجائے فقہ الحدیث کی داغ بیل ڈالی۔ ان محدثین میں امام بخاری رحمہ اللہ امیر قافلہ ہیں۔ آپ نے اپنی الجامع الصحیح میں صرف صحیح احادیث ہی کو جمع نہیں فرمایا بلکہ اس میں استخراج مسائل کو موضوع بنایا اور اس کی تکمیل کے لیے تمام قوتیں صرف کر دیں، چنانچہ آپ نے تراجم ابواب میں جو فقہ مرتب کی ہے وہ تقلیدی انداز کی نہیں بلکہ وہ آپ کے اجتہاد و استنباط کا حاصل ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوانات کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ انھوں نے ضروریات زندگی کا کوئی مسئلہ نہیں چھوڑا جس کا براہ راست حدیث سے استخراج نہ کیا ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ فقہی فروع اور اجتہادی مسائل میں مروجہ تقلیدی مسالک سے بالکل آزاد ہیں۔ مسائل میں توافق کو تقلید کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے رجحان کے مطابق امام بخاری رحمہ اللہ تحریک آزادئ فکر کے علمبردار ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ امر واقعہ ہے کہ فقه البخاري في تراجمه، یعنی امام بخاری کی فقہ ان کے قائم کردہ عنوانات میں ہے۔ تراجم کے متعلق ہم ایک مستقل عنوان کے تحت آئندہ گفتگو کریں گے۔

③ **مختلف فتنوں کی روک تھام:** امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الجامع الصحیح میں ان نظریاتی تحریکات کا بھی جائزہ لیا ہے جو اس دور میں اسلامی معاشرے کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں، چنانچہ معتزلہ اور جہمیہ نے صفات باری تعالیٰ

[1] مقدمة فتح الباري، ص:9.

کی نفی کر کے ایک بہت بڑے فتنے کو جنم دے رکھا تھا جبکہ خوارج اور مرجئہ نے ایمان و کفر کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے، اسی طرح فقہی جمود کی تباہ کاریاں حدِ اعتدال سے تجاوز کر چکی تھیں۔ ان کے علاوہ شیعہ اور روافض نے نظریۂ خلافت و حکومت کے متعلق انتشار پھیلا رکھا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان تمام نظریات و تحریکات کو سامنے رکھ کر متعدد فتنوں کی سرکوبی اپنی ''الجامع الصحیح'' میں کی ہے جسے ہم درج ذیل سطور میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

- فتنۂ انکارِ حدیث: قرآن اور حدیث دونوں کی بنیاد وحی پر ہے۔ منکرین حدیث صرف قرآن کو وحی مانتے ہیں اور حدیث کو وحی تسلیم نہیں کرتے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی الجامع الصحیح کے آغاز میں بدء الوحی کا عنوان قائم کر کے وحی کی عظمت و حقانیت کو ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن اور اس کا بیان، یعنی حدیث دونوں کی بنیاد وحیٔ الٰہی ہے، ایک کو ماننا اور دوسرے کا انکار کرنا عقل و نقل کے خلاف ہے۔
- فتنۂ ارجاء (بے عملی): کچھ لوگ ایمان کی موجودگی میں عمل کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک ایمان لانے کے بعد عمل کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان میں عمل کی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ احادیث میں مختلف اعمال کو ان کی اہمیت کے پیش نظر ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً: جہاد کرنا ایمان کا حصہ ہے، زکاۃ دینا اسلام کا جز ہے، رسول اللہ ﷺ سے محبت کرنا ایمان کا تقاضا ہے، نماز پڑھنا عین ایمان ہے اور کھانا کھلانا اسلام کا حصہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔
- فتنۂ تکفیر: معمولی بدعملی کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا انتہائی خطرناک عمل ہے۔ خوارج کے ہاں یہ فتنہ بڑے عروج پر تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی حدود و قیود کی وضاحت کرتے ہوئے ''الجامع الصحیح'' میں حسب ذیل دو عنوان قائم کیے ہیں: * باب من أكفر أخاه بغير تأويل فهو كما قال (الأدب، باب:73) ''جس نے کسی کو بلاوجہ کافر کہا وہ اپنے کہنے کے مطابق کافر ہو جاتا ہے۔'' * باب من لم ير إكفار من قال ذلك متأولًا أو جاهلًا (الأدب، باب:74) ''جو کسی کو جہالت یا تاویل کی بنیاد پر کافر کہتا ہے وہ خود کافر نہیں ہوتا۔''
- فتنۂ تقلید: امام بخاری رحمہ اللہ کے دور میں ایک ایسا گروہ وجود میں آ چکا تھا جو رائے اور اقوال علماء کو فتوے کی بنیاد بناتا تھا۔ احبار و رہبان کو حضرات انبیاء علیہم السلام کے مقام پر فائز کر کے نصوصِ شریعت کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ آپ نے اپنی الجامع الصحیح میں کتاب الاعتصام بالكتاب والسنة جیسا ایک بڑا عنوان قائم کر کے اس فتنے کو ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور بتایا ہے کہ شریعت سازی میں ان احبار و رہبان کا کوئی حصہ نہیں۔ شریعت صرف اللہ کا قرآن اور اس کے رسول ﷺ کا بیان ہے۔ ان دونوں کا اتباع ہی ذریعۂ نجات ہے، اندھی تقلید کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے فتنۂ روافض کا کتاب الاحکام میں، فتنۂ قیاس بالرائے کا کتاب الحیل میں اور فتنۂ اعتزال

کا کتاب التوحید میں مدلل رد کر کے اصل حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

④ وسعت نظری کی ترویج: شریعت نے جہاں امت پر کشادگی رکھی ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے برقرار رکھا ہے اور اسے فقہی موشگافیوں سے تنگ نہیں کیا، مثلاً: ران کا ڈھانپنا ضروری ہے یا نہیں؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مسئلے کے متعلق روایات معلق ذکر کیں اور کچھ روایات کا مع سند حوالہ دیا، پھر دونوں میں فیصلہ کیا: حدیث أنس أسند و حدیث جرهد أحوط (الصلاۃ، باب:12) یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں ہے کہ ران کو ڈھانپنا ضروری نہیں سند کے لحاظ سے مضبوط ہے اور حدیث جرہد جس میں ہے کہ ران ستر ہے اس میں احتیاط کا پہلو نمایاں ہے۔ الغرض! آپ نے تمام پہلوؤں پر نہایت حزم و احتیاط سے گفتگو فرمائی اور اپنے فیصلے میں وسعت نظری کو برقرار رکھا۔

⑤ مصالح عباد پر نظر: امام بخاری رحمہ اللہ استنباط مسائل میں مصالح عباد پر گہری نظر رکھتے ہیں، ساتھ ساتھ وہ نصوص کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے: باب من قال لانكاح إلا بولي (النکاح، باب:37) یعنی ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ دوسری روایات کے پیش نظر ایسا نکاح باطل ہے جو ولی کی اجازت کے بغیر ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ آگے چل کر ایک دوسرا عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں: لاينكح الأب وغيره البكر والثيب إلا برضاهما (النکاح، باب:42) اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ ان دونوں ابواب سے مقصود یہ ہے کہ نہ تو عورت مطلق العنان ہے کہ جب چاہے، جہاں چاہے اپنی شادی رچالے اور نہ وہ اس قدر مجبور و مقہور ہی ہے کہ اس کا سرپرست اس کی مرضی کے بغیر جب چاہے، جس سے چاہے اس کا عقد کر دے اور وہ مجبور ہو کر خاموش رہے بلکہ اس امر کی وضاحت کے لیے ایک مزید عنوان بایں الفاظ قائم کیا: إذا زوج الرجل ابنته، وهي كارهة فنكاحه مردود (النکاح، باب:43) جب باپ اپنی بیٹی کا نکاح زبردستی کر دے جبکہ وہ اسے ناپسند کرتی ہو تو ایسا نکاح مردود ہے۔

درحقیقت شریعت کا منشا بھی یہی ہے کہ اعتدال اور عدل و انصاف کو قائم کیا جائے۔ اب ہمارے مجتہدین کرام کو دیکھیں، ایک طرف تو انھوں نے بالغہ کو مطلق العنان کر دیا کہ وہ جب چاہے جس سے چاہے اپنا عقد کرے، اسے کسی سرپرست کی ضرورت نہیں۔ اور دوسری طرف یہ اندھیر نگری کہ اگر کوئی شخص دھوکے سے ایجاب وقبول کے الفاظ کہلوائے جسے عورت نہ سمجھتی ہو تو وہ قید نکاح میں آ جائے گی اور اسے اس سے آزادی کا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اس افراط و تفریط کے بین بین اعتدال کا پہلو اختیار کیا ہے اور اس اعتدال کو احادیث سے

ثابت کیا ہے۔

⑥ فقہ الحدیث کی داغ بیل: امام بخاری رحمہ اللہ اس نظریے کے پرزور حامی ہیں کہ کتاب وسنت میں ہر مسئلہ موجود ہے، لہٰذا قیاس ورائے کا بے دریغ استعمال درست نہیں۔ آپ نے ''الجامع الصحیح'' میں عملاً اس بات کا مظاہرہ کیا ہے اور ایک ایک حدیث پر متعدد عنوانات قائم کر کے فقہ الحدیث کا دروازہ کھولا ہے جیسا کہ درج ذیل امثلہ سے واضح ہوتا ہے: ○ حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا پر بیس سے زیادہ عنوان قائم کر کے متعدد مسائل کا استخراج کیا ہے۔ ○ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اونٹ لینے کے واقعے پر آپ نے متعدد عنوان قائم کیے ہیں۔ ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے چند وسق جو خریدے اور اپنی زرہ اس کے پاس گروی رکھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو گیارہ مرتبہ بیان کر کے متعدد احکام ثابت کیے ہیں۔ ○ حدیث کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے بے شمار مسائل اخذ کیے ہیں۔ ○ حدیث کسوف متعدد مرتبہ لائے ہیں اور اس سے مختلف احکام کا استنباط کیا ہے۔

⑦ قیاس میں افراط وتفریط پر پابندی: قیاس کے متعلق فقہائے کوفہ اور علمائے ظواہر افراط وتفریط کا شکار ہیں، چنانچہ امام داود ظاہری اور امام ابن حزم نے حجیت قیاس کا سرے سے انکار کر دیا جس کا درج ذیل مسئلے سے اظہار ہوتا ہے:

''اگر کتا برتن سے کچھ کھالے اور اس میں منہ ڈال کر کچھ پینے کی نوبت نہ آئے یا اپنا پاؤں یا اپنی دم برتن میں ڈال دے یا وہ خود اس میں گر پڑے لیکن اس میں منہ نہ ڈالے تو ان تمام صورتوں میں برتن کا دھونا ضروری نہیں اور نہ اس میں پڑی چیز کو باہر پھینکنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ حلال اور پاکیزہ ہے، نیز اگر زمین کے گڑھے میں کھڑے پانی کے اندر منہ ڈال دے یا کسی انسان کے ہاتھ میں پانی تھا یا کوئی چیز جسے برتن نہیں کہا جاتا اس میں منہ ڈال کر کچھ پی لے تو ایسی صورت میں بھی اسے دھونے اور اندر پڑی چیز کو پھینکنے کی ضرورت نہیں کیونکہ "وُلُوغ" صرف برتن میں منہ ڈال کر پینے کو کہتے ہیں۔''[1]

احناف نے جس طرح بے دریغ قیاس کا استعمال کیا اس کا اندازہ درج ذیل مسئلے سے کیا جاسکتا ہے:

''اگر جسم کے کسی عضو کو نجاست لگ جائے تو اگر زبان سے چاٹ کر اس کے اثرات کو زائل کر دیا جائے تو وہ عضو پاک ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر چھری کو نجاست لگ جائے اور اسے زبان سے چاٹ کر زائل کر دیا جائے تو وہ چھری پاک ہو جائے گی۔ اور اگر کپڑے کو نجاست لگ جائے اور اسے زبان سے چاٹ کر صاف کر دیا جائے یہاں تک کہ اس کے اثرات ختم ہو جائیں تو وہ کپڑا پاک ہو جائے گا۔''[2]

---

① محلی ابن حزم:1/109. ② فتاوٰی عالمگیری:1/45.

ایسے حالات میں قیاس میں افراط وتفریط پر پابندی لگانا ضروری ہو گیا تھا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے سدباب کے لیے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة کے نام سے ''الجامع الصحیح'' میں ایک مستقل عنوان قائم کیا، پھر تیس کے قریب ذیلی عنوانات قائم کر کے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو سب سے پہلے واضح نصوص کی اتباع کرنی چاہیے، اسے خواہ مخواہ قیاس کی تلاش میں مارا مارا نہیں پھرنا چاہیے۔ اگر قیاس ناگزیر ہو تو ضروری ہے کہ مقیس علیہ واضح اور معلوم ہو، اسی طرح علت اور حکم بھی واضح اور نمایاں ہو، چنانچہ آپ نے الجامع الصحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: من شبه أصلا معلومًا بأصل مبين قد بين النبي ﷺ حكمهما ليفهم السائل (كتاب الاعتصام، باب:12)

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیاس میں اصل اور علت کو بین اور واضح ہونا چاہیے، محض ظن وتخمین پر انحصار نہ کیا جائے، چنانچہ اس کی روک تھام کے لیے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب مايذكر من ذم الرأي و تكلف القياس (كتاب الاعتصام، باب:7) قیاس میں تکلف اور رائے کا استعمال انتہائی قابل مذمت ہے، پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے فرضی قیاسات کو درج ذیل آیت کریمہ میں داخل فرما کر ان کا بودا پن واضح کیا ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ﴾ ''اور ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔''[1]

واضح رہے کہ عام طور پر تالیف صحیح بخاری کی درج ذیل چار اغراض بیان کی جاتی ہیں:

① بنیادی غرض تو یہ ہے کہ اس کتاب میں صرف احادیث صحیحہ مرفوعہ کو بیان کیا جائے جن میں کوئی سقم یا ضعف نہ ہو، معلق روایات اور آثار موقوفہ اصل مقصود نہیں ہیں۔

② صحیح احادیث سے احکام ومسائل کا استنباط کیا جائے، چنانچہ ''الجامع الصحیح'' میں بے شمار فقہی احکام اور بدیع فوائد بیان ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

③ استنباط مسائل کی تعلیم دینا بھی امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ہے، چنانچہ نصوص سے فقہی احکام ثابت کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، یعنی دلالت نص، عبارت نص اور اشارات نص وغیرہ ان تمام طرق استخراج کی ''الجامع الصحیح'' میں عملی تعلیم دی گئی ہے۔

④ حدیث وفقہ کو جمع کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''الجامع الصحیح'' صرف فن حدیث ہی پر مشتمل نہیں بلکہ اس میں کتاب و سنت پر مبنی فقہ کا بھی بیان ہے جسے فقہ الحدیث کہا جاتا ہے۔

---

① بني إسرآئيل 36:17.

٭ شرائط صحیح بخاری: امام بخاری رحمہ اللہ نے اخذ روایات کے سلسلے میں اپنی کسی کتاب میں شرائط وغیرہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان کے بعد آنے والے علماء حضرات نے ان کی تالیفات کا مطالعہ کیا، خاص طور پر ان کی تالیف ''الجامع الصحیح'' پر غور و خوض کیا تو تتبع وتلاش کے بعد ان شرائط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے اخذ روایات کے سلسلے میں ملحوظ رکھی ہیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الجامع الصحیح'' میں روایات ذکر کرنے میں جن شرائط کا اعتبار کیا ہے وہ امام مسلم کی شرائط سے زیادہ سخت ہیں کیونکہ ہر روایت میں دو چیزوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(ا) راوی کی ذاتی حیثیت، یعنی اس کا عادل وضابط اور ثقہ ہونا۔ (ب) اس راوی کا اپنے شیخ سے کس طرح کا تعلق ہے اور ملاقات وسماع کس پائے کا ہے؟ ان دونوں حیثیتوں سے راویوں کو ہم پانچ طبقات میں تقسیم کرتے ہیں:

- پہلا طبقہ: جن راویوں کا ضبط واتقان زیادہ ہے اور وہ اپنے استاد کے پاس بھی تادیر ٹھہرے رہے، یعنی سفر وحضر میں ان کے ساتھ رہے۔ اس کی مثال امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں یونس بن یزید ایلی، عقیل بن خالد ایلی، امام مالک بن انس اصبحی اور سفیان بن عیینہ وغیرہ ہیں۔ یہ حضرات کثیر الضبط اور کثیر الملازمہ ہیں۔
- دوسرا طبقہ: جن راویوں کا ضبط واتقان تو بہت ہے لیکن وہ اپنے استاد کے ساتھ زیادہ عرصہ نہیں رہے۔ امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں اس کی مثال ابو عمرو عبدالرحمٰن اوزاعی، لیث بن سعد مصری، عبدالرحمٰن بن خالد اور ابن ابی ذئب ہیں۔ یہ حضرات کثیر الضبط اور کثیر الاتقان ہیں لیکن امام زہری کے ہاں ان کا قیام بہت تھوڑا رہا ہے، گویا یہ حضرات کثیر الضبط اور قلیل الملازمہ ہیں۔
- تیسرا طبقہ: وہ راوی جن میں ضبط واتقان کم ہے لیکن اپنے استاد کے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں ان کی مثال جعفر بن برقان، سفیان بن حسین اور اسحاق بن یحییٰ الکلبی ہیں۔ یہ سب حضرات امام زہری کے ہاں دیر تک رہے لیکن ضبط واتقان ان میں کم ہے، گویا یہ حضرات قلیل الضبط بھی ہیں اور کثیر الملازمہ بھی۔
- چوتھا طبقہ: وہ راوی جن میں ضبط واتقان بھی کم ہے اور انھوں نے اپنے استاد کے ہاں قیام بھی بہت کم کیا۔ امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں ان کی مثال زمعہ بن صالح، معاویہ بن یحییٰ اور مثنیٰ بن صباح ہیں۔ ان حضرات کا ضبط واتقان بھی زیادہ نہیں اور اپنے استاد کے ہاں بھی بہت کم عرصہ ٹھہرے ہیں، گویا یہ قلیل الضبط اور قلیل الملازمہ ہیں۔
- پانچواں طبقہ: وہ راوی جن کا حفظ وضبط بھی تھوڑا ہے اور وہ اپنے شیخ کے پاس بھی بہت کم وقت ٹھہرے، اس کے ساتھ ساتھ ان پر جرح بھی کی گئی۔ امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں ان کی مثال عبدالقدوس بن حبیب اور محمد بن سعید مصلوب ہیں۔ یہ حضرات حفظ واتقان بھی تھوڑا رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنے شیخ کے ہاں بھی بہت کم عرصہ قیام کیا، پھر ان پر جرح بھی ہوئی ہے۔ گویا یہ حضرات قلیل الضبط اور قلیل الملازمہ مع غوائل الجرح ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ پہلے طبقے کے راویوں کی روایت اپنی تالیف "الجامع الصحیح" میں لائے ہیں اور ان کی بیان کردہ روایت اصول میں بھی لاتے ہیں اور دوسرے مقامات میں بھی ان کی مرویات کو بیان کرتے ہیں۔ دوسرے طبقے سے راویوں کا انتخاب کرتے ہیں اور ان کی روایات کو اصول میں درج کرنے کے بجائے شواہد و متابعات میں لاتے ہیں جبکہ امام مسلم پہلے اور دوسرے طبقے کے تمام راویوں کی احادیث بیان کرتے ہیں اور تیسرے طبقے سے انتخاب کرتے ہیں۔ امام ابوداود اور نسائی پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے طبقے کی روایات ذکر کرتے ہیں اور امام ترمذی پانچویں طبقے کی احادیث بھی لے آتے ہیں۔ [1]

بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ اس راوی سے روایت لیتے ہیں جو عادل، ثقہ اور ضابط ہو اور اپنے شیخ سے اس کی ملاقات بالفعل ثابت ہو، وہ سفر و حضر میں اپنے شیخ کے ساتھ رہا ہو یا کم از کم حضر میں تو اس کی ملاقات بکثرت ہو کیونکہ جو آدمی سفر و حضر میں کسی کا ساتھی ہوگا، اس سے غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے جبکہ امام مسلم پہلی شرط میں تو امام بخاری کے ساتھ ہیں، البتہ دوسری شرط بالفعل ملاقات کو وہ ضروری خیال نہیں کرتے بلکہ اخذ روایت میں وہ امکان لقا ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ امام ابوداود اور امام نسائی دونوں امام بخاری رحمہ اللہ کے ساتھ شرط ثانی میں شریک ہیں، شرط اوّل کا ان کے ہاں اتنا اہتمام نہیں ہے۔ ترمذی میں دونوں شرائط کا اتنا خیال نہیں رکھا گیا۔ یہی وہ شرائط و وجوہات ہیں جن کی بنا پر علمائے حدیث کا متفقہ فیصلہ ہے کہ "الجامع الصحیح" کو باقی کتب حدیث پر ترجیح ہے، خواہ یہ ترجیح باعتبار صحت کے ہو یا جودت فقاہت کی وجہ سے ہو اور اسی بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ کو امیر المومنین فی الحدیث اور سید المحدثین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ واللہ أعلم.

* **تراجم صحیح بخاری:** لفظ تراجم، ترجمہ کی جمع ہے اور یہ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے: * کسی بات کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنا جیسا کہ عربی زبان کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔ * کسی آدمی کے حالات اور سیرت و اخلاق کو بیان کرنا جیسا کہ تراجم علمائے مصر میں مصری علماء کے حالات بیان ہوتے ہیں۔ * کسی چیز کے آغاز اور ابتدائی حصے کو بھی ترجمہ کہا جاتا ہے جسے دوسرے لفظوں میں عنوان کہتے ہیں۔ تراجم صحیح بخاری سے یہ آخری معنی مراد ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے "الجامع الصحیح" کے تراجم میں بہت سے علمی، فقہی، اصولی اور لغوی حقائق بیان کیے ہیں۔ بڑے بڑے علماء ان تراجم کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں، مولانا انور شاہ کاشمیری لکھتے ہیں:

"امام بخاری رحمہ اللہ سے پہلے کسی نے اس قسم کے تراجم قائم نہیں کیے اور نہ ان کے بعد ہی اس قسم کے تراجم وجود

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص:12.

میں آئے، گویا امام بخاری رحمہ اللہ اس دروازے کو کھولنے والے تھے اور خود ہی اس دروازے کو بند کر دینے والے ہیں۔"[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ تراجم سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں حدیث، تفسیر، لغت اور علم کلام پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ یہ بات تو اہل علم میں مشہور ہے: [فقه البخاري في تراجمه] "یعنی امام بخاری رحمہ اللہ کی فقہ ان کے قائم کردہ تراجم میں ہے۔" تراجم بخاری کی دقت و اہمیت کے پیش نظر علمائے حدیث نے انھیں حل کرنے کے لیے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اب ہم تراجم صحیح بخاری کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان تراجم کے ذریعے احادیث سے مسائل کے استنباط میں اپنی پوری توانائیاں صرف کی ہیں، اس بنا پر ہم آپ کے تراجم کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

① "الجامع الصحیح" کے اکثر تراجم دعویٰ کے طور پر ہیں اور احادیث کو بطور دلیل پیش کر کے انھیں ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک ایک حدیث سے کئی کئی مسائل کا استنباط کیا ہے، مثلاً: وہ حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "ان دو قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے۔"[2] اس پر مندرجہ ذیل عنوان قائم کیے ہیں اور متعدد احکام ومسائل اخذ کیے ہیں: ○من الكبائر أن لا يستتر من بوله (كتاب الوضوء، باب:55) "یہ کبیرہ گناہ ہے کہ انسان اپنے پیشاب سے پرہیز نہ کرے۔" ○ما جاء في غسل البول (كتاب الوضوء، باب:56) "پیشاب کی جگہ دھونی چاہیے۔" ○عذاب القبر من الغيبة والبول (كتاب الجنائز، باب:88) "غیبت اور پیشاب سے عذاب قبر ہوتا ہے۔" ○النميمة من الكبائر (كتاب الادب، باب:49) "چغلی اور غیبت کرنا کبیرہ گناہ ہے۔" ایک مقام پر مذکورہ حدیث ذکر کی ہے۔ (صحيح البخاري، حديث:218) لیکن اس پر کوئی عنوان قائم نہیں کیا تاکہ طالب علم خود غور وفکر کر کے کوئی مناسب عنوان قائم کرے، چنانچہ مناسب عنوان یہ ہے: كون البول موجبًا لعذاب القبر.

② تراجم میں کسی مسئلے کا استخراج نہیں بلکہ حدیث کی وضاحت مقصود ہوتی ہے، مثلاً: ○باب الذكر بعد الصلاة (كتاب الأذان، باب:155) حدیث میں دبر الصلاة (حدیث:844) آیا تھا جس سے بعض حضرات نے یہ اخذ کیا کہ مذکورہ ادعیہ کو تشہد میں پڑھنا چاہیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے لفظ دبر کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد نماز کے بعد کا وقت ہے۔ ○باب بركة السحور من غير إيجاب (كتاب الصوم، باب:20) حدیث میں ہے کہ تم سحری کھاؤ کیونکہ اس میں برکت ہے۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ حدیث میں صیغۂ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ

---

1 مقدمة فيض الباري، ص:40. 2 صحيح البخاري، حديث:216. 3 صحيح البخاري، حديث:1923.

استحباب کے لیے ہے۔ ○ باب رفع معرفة ليلة القدر لتلاحي الناس (كتاب فضل ليلة القدر' باب:4) حدیث میں لیلۃ القدر کے متعلق رُفِعَتْ کے الفاظ آتے تھے۔[1] جس سے بعض حضرات کو شبہ ہوا کہ شاید شب قدر ہی کو اٹھا لیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی کہ اس کی تعیین کو اٹھا لیا گیا ہے۔

③ بعض اوقات ایک حدیث متعدد اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتی ہے تو امام بخاری رحمہ اللہ ہر امر اور ہر نہی پر الگ الگ عنوان قائم کرتے ہیں تا کہ ان کی مستقل حیثیت واضح ہو جائے۔ ○ اوامر کی مثال: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم غلے، جو، کھجور، پنیر اور منقی سے ایک صاع بطور فطرانہ دیتے تھے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ''الجامع الصحیح'' میں چار عنوان قائم کیے ہیں: (۱) باب صدقة الفطر صاع من شعيرٍ (كتاب الزكاة، باب:72) (۲) باب صدقة الفطر صاع من طعام (باب:73) (۳) باب صدقة الفطر صاعا من تمر (باب:74) (٤) باب صاع من زبيب (باب:75) لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے صدقة الفطر صاعا من أقط کا عنوان قائم نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک دوسری اشیاء کی موجودگی میں اس کی ادائیگی جائز نہیں ہے۔ واللّٰه أعلم. ○ نواہی کی مثال: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ہم میں سے نہیں جو مصیبت کے وقت رخسار پیٹتا ہے، کپڑے پھاڑتا ہے یا جاہلیت کی باتیں کرتا ہے۔''[3] اس حدیث پر امام بخاری نے حسب ذیل تین عنوان قائم کیے ہیں: (۱) ليس منا من شق الجيوب (۲) ليس منا من ضرب الخدود (۳) ما ينهى من الويل و دعوى عند المصيبة.

④ امام بخاری رحمہ اللہ بعض اوقات عنوان میں کسی لفظ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس اضافے سے مقصود دو متعارض احادیث کے درمیان تطبیق دینا ہوتا ہے، مثلاً: ○ ایک عنوان ہے: لاتستقبل القبلة ببول ولا غائط إلا عند البناء جدارٍ أو نحوه (كتاب الوضوء، باب:11) امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صحراء سے متعلق اور آپ کا عمل عمارات کے متعلق ہے۔ اس طرح آپ نے دو متعارض احادیث میں تطبیق دی ہے۔ ○ قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم يعذب الميت ببعض بكاء أهله عليه إذا كان النوح من سنته (الجنائز، باب:32) اس اسلوب سے امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ابن عمر اور حدیث عائشہ کے درمیان تطبیق دی ہے کہ جب میت پر رونا دھونا اس خاندان کی عادت ہو اور مرنے والا انھیں نوحہ اور بین وغیرہ نہ کرنے کی وصیت نہ کر کے گیا ہو تو اہل خانہ کے رونے سے میت کو باز پرس ہو گی جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے اور جب وہ ممانعت کی وصیت کر کے گیا ہو تو وہ بے قصور ہے۔ اسے اہل خانہ کے رونے سے کچھ نہیں کہا جائے گا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ○ امام بخاری رحمہ اللہ نے

---

① صحيح البخاري، حديث:2023. ② صحيح البخاري، حديث:1506. ③ صحيح البخاري، حديث:1294.

ایک عنوان قائم کیا ہے: باب النَوم قبل العشاء لمن غُلِبَ. ''اگر کوئی نیند کے ہاتھوں مغلوب ہو جائے تو عشاء سے پہلے سونا جائز ہے۔'' (کتاب المواقیت، الصلاۃ، باب:24) جبکہ ایک حدیث میں عشاء سے پہلے سونے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے اضافے سے معلوم ہوا کہ نیند کے ہاتھوں مغلوب ہونے کی صورت میں اس کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صراحت کی ہے۔[1]

⑤ امام بخاری رحمہ اللہ ''الجامع الصحیح'' میں ایک بڑے عنوان کے تحت اضداد کا ذکر کر دیتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس بڑے عنوان کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے کیونکہ گرمی کا احساس دلانے کے لیے اس کی ضد سردی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ عرب کا ایک محاورہ ہے: تعرف الأشياء بأضدادها ''اضداد کے ذکر سے اشیاء کی پہچان ہوتی ہے۔'' جیسا کہ آپ نے کتاب الایمان میں درج ذیل عنوان کو پیش کیا ہے، حالانکہ ان کا ایمان سے تعلق نہیں ہے: ○باب کفران العشير وكفر دون كفر (كتاب الإيمان، باب:21) ○باب المعاصي من أمر الجاهلية...... (باب:22) ○باب علامات المنافق (باب:24) کتاب الاستسقاء میں درج ذیل عنوان بھی اسی قبیل سے ہے: ○ باب دعاء النبي ﷺ: اجعلها سنين كسني يوسف: (كتاب الاستسقاء، باب:2)

⑥ بعض دفعہ عنوان کے تحت ذکر کردہ حدیث قطعی طور پر عنوان کے مطابق نہیں ہوتی لیکن اس حدیث کے دیگر طرق کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مذکورہ حدیث ذکر کرنے سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس عنوان کی بنیاد ضرور ہے اور مذکورہ حدیث سے اس کی بنیاد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں: (ا) وہ طریق خود ''الجامع الصحیح'' میں ہوتا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب السمر في العلم (كتاب العلم، باب:41) اس کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ذکر کی ہے کہ انھوں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات بسر کی۔ لیکن اس میں علمی باتوں کا کوئی ذکر نہیں جس کے متعلق عنوان قائم کیا گیا ہے، البتہ ایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ کے ساتھ گفتگو فرمائی۔[2] (ب) وہ طریق صحیح بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہوتا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک عنوان قائم کیا ہے: باب طول القيام في صلاة الليل (كتاب التهجد، باب:9) پھر اس کے تحت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث لائے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ جب رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو اپنے منہ کو مسواک سے صاف کرتے۔''[3] اس حدیث میں طول قیام کا ذکر نہیں ہے، البتہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی حدیث میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے نماز تہجد میں

---

1 صحيح البخاري، المواقيت، حديث:569. ② صحيح البخاري، التفسير، حديث:4569. ③ صحيح البخاري، التهجد، حديث:1136.

سورۂ بقرہ، آل عمران اور نساء کی تلاوت فرمائی۔[1]

⑦ امام بخاری رحمہ اللہ بعض اوقات اپنے عنوان میں کسی مسئلے کو جزم و وثوق سے بیان نہیں کرتے جس کی حسب ذیل وجوہات ہوتی ہیں: (ا) مسئلے میں وسعت کا پہلو برقرار رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ کتاب الوتر میں پہلا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب ماجاء في الوتر (کتاب الوتر، باب:1) اس کے تحت آپ نے متعدد احادیث ذکر کی ہیں تاکہ وتروں کی وسعت کا پہلو برقرار رہے کہ وتر ایک ہے یا تین، انھیں فصل سے پڑھنا چاہیے یا وصل سے ادا کرنے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں امام قاسم کا قول بیان کیا ہے: ''جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ہم نے لوگوں کو تین وتر پڑھتے پایا ہے اور اس میں وسعت ہے، امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' (کتاب، الوتر، حدیث:993) (ب) روایات میں اختلاف کی وجہ سے کوئی فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے درج ذیل عنوان کے متعلق اسلوب اختیار کیا ہے: باب الصلاة على الشهيد (کتاب الجنائز، باب:72) اس عنوان کے تحت دو احادیث ذکر کی ہیں: ایک میں ہے کہ آپ نے شہدائے احد کا جنازہ نہیں پڑھا۔ (حدیث:1343) دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن باہر تشریف لے گئے اور اہل احد پر اسی طرح نماز پڑھی جس طرح میت پر پڑھی جاتی ہے۔ (حدیث:1344) (ج) ایک مسئلے میں اہل علم کا اختلاف ہوتا ہے اس بنا پر آپ وہاں کوئی فیصلہ کن موقف اختیار نہیں کرتے جیسا کہ آپ نے اپنی ''الجامع الصحیح'' میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: إذا دعت الأم ولدها في الصلاة. اس عنوان کو كتاب العمل في الصلاة (باب:7) کے تحت بیان کیا ہے، پھر حدیث جریج ذکر کی ہے۔ چونکہ اس مسئلے میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ دوران نماز میں اگر والدہ اپنی کسی ضرورت کے لیے بیٹے کو بلائے تو وہ حاضر ہو جائے یا نماز جاری رکھے، اس قوتِ اختلاف کے پیش نظر امام بخاری رحمہ اللہ نے جزم و وثوق سے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

⑧ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ اختلافی ہوتا ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اپنے اختیار کردہ موقف کے متعلق بڑے مضبوط دلائل رکھتے ہیں، اس لیے عنوان میں اس مسئلے کو بڑے وثوق اور جزم سے بیان کرتے ہیں۔ درج ذیل عنوانات اسی قبیل سے ہیں: ○باب وجوب صلاة الجماعة (کتاب الأذان، باب:29) ○باب التيمم للوجه والكفين (کتاب التيمم، باب:5) ○باب وقت الجمعة إذا زالت الشمس (کتاب الجمعة، باب: 16) ○باب التكبير على الجنازة أربعًا (کتاب الجنائز، باب:64) حالانکہ ان مسائل کے متعلق ائمہ اور فقہاء میں بہت اختلاف ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے دلائل و براہین کی وجہ سے ان کے متعلق بڑے جزم و وثوق سے فیصلہ کن موقف اختیار کیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، صلاة المسافرین، حدیث: 1814(772).

⑨ امام بخاری ﷫ بعض اوقات عنوان میں ایک مرفوع حدیث لاتے ہیں جو ان کی شرط کے مطابق نہیں ہوتی لیکن اس کے معنی صحیح ہوتے ہیں، پھر اس معنی کو ثابت کرنے کے لیے تائید کے طور پر دیگر احادیث پیش کرتے ہیں جو ان کی شرائط کے مطابق ہوتی ہیں۔ درج ذیل ابواب میں یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے: ○باب الصعید الطیب وضوء المسلم...... (کتاب التیمم، باب:6) ○باب سترة الإمام سترة من خلفه (کتاب الصلاة، باب:90) ○باب الإقامة واحدة ...... (کتاب الأذان، باب:3) ○باب من قال: لایقطع الصلاة شيئ (کتاب الصلاة، باب: 105) ○باب اثنان فما فوقھا جماعة (کتاب الأذان، باب:35) ○الأمراء من قریش (کتاب الأحکام، باب:2) مذکورہ بالا احادیث امام بخاری ﷫ کی شرط کے مطابق نہیں تھیں، اس لیے انھیں عنوانات میں ذکر کیا ہے اور ان کے معنی صحیح تھے، لہٰذا دیگر احادیث سے انھیں ثابت کیا ہے۔

⑩ کبھی عنوان کی عبارت کا ظاہر مدلول مقصود نہیں ہوتا بلکہ دلالت التزامی سے ثابت ہونے والا امر مقصود ہوتا ہے جو عنوان کے تحت پیش کردہ احادیث میں کافی غور وفکر کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے، مثلاً: باب کیف کان بدء الوحي میں آغاز وحی کا تذکرہ ہی مقصود نہیں بلکہ وحی کے جملہ مبادی، یعنی وحی، اس کی اقسام، اس کی عظمت وصداقت، مقام وحی، زمانِ وحی اور موحی الیہ رسول اللہ ﷺ کے حالات واخلاق، نیز صاحب وحی حضرت جبریل ﷤ کے حالات وغیرہ بیان کرنا بھی مقصود ہے۔ یہ تمام باتیں اس عنوان کے تحت پیش کردہ احادیث سے معلوم ہوتی ہیں، صرف نزول وحی کی کیفیت بیان کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے امام بخاری ﷫ نے آئندہ کتاب فضائل القرآن میں ایک عنوان قائم کیا ہے، مثلاً: باب کیف نزل الوحي و أول ما نزل؟ (کتاب فضائل القرآن، باب:1)

⑪ امام بخاری ﷫ نے "الجامع الصحیح" میں بعض مقامات پر باب کا لفظ لکھا ہے لیکن وہاں عنوان ندارد، یعنی وہ باب بلاعنوان ہوتا ہے۔ امام بخاری کی اس قسم کے عنوان سے تین اغراض ہوتی ہیں: (ا) اس قسم کے باب کا تعلق پہلے عنوان سے ہوتا ہے، گویا بلاعنوان باب کی حیثیت ایک "فصل" کی ہوتی ہے جیسا کہ کتاب الصلاۃ میں باب الصلاة بین السواري کے بعد ایک باب بلاعنوان ہے، گویا کہ یہ پہلے باب کا تتمہ اور تکملہ ہے۔ (ب) قارئین علم اور طلبہ کو اس امر پر آمادہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ ازخود غور وفکر کر کے اس مقام پر کوئی عنوان قائم کریں جو موقع ومحل کے مطابق ہو جیسا کہ کتاب التیمم کے آخر میں باب بلاعنوان ہے جس کے تحت حضرت عمران بن حصین ﷠ سے مروی ایک حدیث بیان کی گئی ہے کہ ایک جنبی آدمی نماز میں شامل نہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے تیمم کر کے نماز پڑھنے کی تعلیم دی۔ اس مقام پر حسب حال درج ذیل عنوان مناسب معلوم ہوتا ہے: الجنب إذا لم یجد ماءً یتیمم "جب جنبی کو پانی نہ ملے تو تیمم

کر لے۔" (ج) ایسے عنوان کے تحت ذکر کردہ حدیث سے بے شمار احکام و مسائل ثابت ہوتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ تکثیر فوائد کے پیش نظر اس حدیث پر کوئی عنوان بندی نہیں کرتے تا کہ اس سے مسائل کثیرہ کے استنباط کی گنجائش برقرار رہے، مثلاً: کتاب الایمان میں ایک عنوان: باب سؤال جبریل النبي ﷺ عن الإیمان...... ہے۔ اس کے بعد ایک باب بلاعنوان (باب: 38) ہے اور اس کے تحت حدیث ہرقل بیان کی گئی ہے جس سے متعدد مسائل ثابت ہوتے ہیں، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقام پر باب "بلاعنوان" رکھا ہے تا کہ تکثیر مسائل کی وسعت برقرار رہے۔

⑫ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ عنوان موجود ہے لیکن اس کے تحت کسی آیت یا حدیث کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق شارحین نے درج ذیل دو موقف اختیار کیے ہیں: ○ راویوں کے تصرف سے ایسا ہوا ہے، اصل کتاب میں ایسا نہیں تھا۔ ○ امام بخاری رحمہ اللہ نے بیاض چھوڑ دی تھی لیکن اس کے بعد حدیث ذکر کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن ہمارے رجحان کے مطابق یہ دونوں موقف محل نظر ہیں کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کو تالیف کرنے کے بعد اس کی تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ تقریباً نوے ہزار شاگردوں نے اس کتاب کو براہ راست امام بخاری سے پڑھا ہے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ ایسے حالات میں راویوں کو تصرف کا موقع ملا ہو یا آپ نے بیاض چھوڑ دی ہو لیکن بعد میں وہاں حدیث لانے کا اتفاق نہ ہو سکا ہو۔ ہمارے نزدیک اس کی حسب ذیل دو توجیہیں ہیں: (ا) امام بخاری رحمہ اللہ اپنے شاگردوں میں اجتہاد کا ملکہ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسے مقامات پر خود کسی آیت یا حدیث کا انتخاب کریں۔ (ب) امام بخاری نے دانستہ طور پر ایسا کیا ہے کیونکہ اس قسم کے باب سے پہلے یا بعد ضرور ایسی حدیث ہوتی ہے جو اس عنوان کو ثابت کرتی ہے، خواہ وہ حدیث قریب ہو یا دور، ہوتی ضرور ہے، مثلاً: کتاب الحج میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: باب قصر الخطبة بعرفة (باب: 90) اس کے بعد ایک دوسرا عنوان ہے: باب التعجیل إلی الموقف. اس عنوان کے تحت کوئی آیت یا حدیث نہیں ہے۔ چونکہ اس عنوان سے پہلے درج کردہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں: "حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حجاج بن یوسف سے کہا: اگر تو سنت کے مطابق حج کرنا چاہتا ہے تو خطبہ مختصر کر اور وقوف عرفات کے لیے جلدی کر۔[1] مذکورہ عنوان کی، یہی حدیث دلیل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے تکرار سے بچنے کے لیے اسے یہاں نقل نہیں فرمایا، نیز آپ کا یہ بھی مقصود ہے کہ طلبہ کا ذہن پختہ ہو جائے اور انھیں استنباط مسائل اور محنت کی عادت پڑے۔ بہرحال اس طرح کے ابواب بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

⑬ ایک عنوان کے تحت متعدد احادیث جمع کی جاتی ہیں جو عنوان کے لیے بطور دلیل ہوتی ہیں، پھر کسی حدیث میں ایک خاص فائدہ ہوتا ہے تو عنوان کے ضمن میں ایک اور عنوان قائم کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ پہلا

---

① صحیح البخاري، الحج، حدیث: 1663.

عنوان ختم ہو گیا ہے اور اب نئے عنوان کی احادیث پیش ہوں گی بلکہ اضافی فائدے کے طور پر عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اسے باب فی الباب کہا جاتا ہے جیسا کہ کتاب الصلاۃ میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: باب الأسير أو الغريم يربط في المسجد (باب:75) اس کے بعد ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب الاغتسال إذا أسْلم ...... (باب:76) اس کے تحت حضرت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے انھیں مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا، آخر کار انھیں چھوڑ دیا گیا تو وہ مسجد کے قریب ایک باغ میں گئے۔ وہاں غسل کیا، واپس آ کر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے۔[1] چونکہ اس حدیث میں ایک اضافی فائدہ تھا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے لیے ایک نیا عنوان قائم کیا جو بابٌ في الباب کی قسم سے ہے جبکہ مذکورہ حدیث کا تعلق بنیادی طور پر پہلے عنوان سے ہے۔ اسی طرح امام بخاری نے کتاب الاذان میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب فضل صلاة الجماعة (باب:30) اس کے آگے ایک عنوان باب فضل صلاة الفجر في جماعة (باب:31) قائم کیا ہے۔ یہ بھی باب در باب کی قسم سے ہے۔

⑭ امام بخاری رحمہ اللہ کے کچھ عنوانات بادیٔ النظر میں غیر اہم اور بظاہر بے فائدہ معلوم ہوتے ہیں، مثلاً: کتاب الأذان میں دو عنوان بایں الفاظ ہیں: باب قول الرجل: فاتتنا الصلاة (باب:20) اور باب قول الرجل للنبي ﷺ: ما صلينا (باب:26) دراصل ائمۂ متقدمین سے اس طرح کی تصریحات منقول ہیں کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ان عنوانات سے ان حضرات کی تردید کرنا ہے کہ ایسا کہنے میں چنداں حرج نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ اس طرح کے آثار مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بکثرت ملتے ہیں۔ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بعض متقدمین کے ایسے اقوال بھی منقول ہیں جو کتاب وسنت کے منافی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے کچھ عنوانات ان کی تردید کے لیے ہیں، مثلاً: کتاب الصلاۃ میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: باب السترة بمكة و غيرها (باب:94) اس عنوان سے مصنف عبدالرزاق کے ایک عنوان کی تردید مقصود ہے جو اس طرح ہے: باب لايقطع الصلاة شيئ بمكة.

⑮ امام بخاری رحمہ اللہ بعض اوقات قائم کردہ عنوانات کے ذریعے سے ایسے اخلاق و آداب کا استنباط کرتے ہیں جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے، یعنی عقل انھیں مستحسن خیال کرتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ایسے عنوانات کے ذریعے سے کتاب و سنت سے ایسے اخلاق و آداب کو بنیاد فراہم کرتے ہیں لیکن اس قسم کے استنباط کا ادراک اس شخص کو ہوتا ہے جو اخلاق و آداب پر مشتمل کتب کو زیر مطالعہ لانے کا عادی ہو۔ کتاب العلم کے درج ذیل عنوانات اسی قبیل سے ہیں: ○باب من

---

1 صحيح البخاري، حديث:462.

رفع صوته بالعلم(باب:3)○باب طرح الإمام المسئلة على أصحابه...... (باب:5)○باب من برك على ركبتيه عندالإمام...... (باب:29)○باب الغضب في الموعظة...... (باب:28)○باب من أجاب الفتيا بإشارة اليد والرأس(باب:24)، كتاب النكاح، كتاب الأطعمة اور كتاب الأدب کے اکثر عنوانات اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

⑯ امام بخاری رحمہ اللہ بعض اوقات عنوان میں کسی حکم کو ذکر نہیں کرتے، البتہ اس کے تحت ذکر کردہ احادیث و آثار سے ان کا رجحان اخذ کیا جا سکتا ہے، مثلاً: کتاب الوضوء میں ایک عنوان: أبوال الإبل والدواب...... (باب:66) ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے ان کی طہارت یا نجاست کا حکم بیان نہیں کیا، البتہ اس کے تحت جو حدیث عرنیین:(233) ذکر کی ہے اس سے ان کا رجحان معلوم ہوتا ہے کہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب ان کے نزدیک نجس نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب الأذان میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: باب وجوب صلاة الجماعة (باب:29) اس میں نماز باجماعت کا وجوب بیان کیا ہے، لیکن یہ وضاحت نہیں کہ یہ وجوب عینی ہے یا وجوب کفائی، البتہ حسن بصری رحمہ اللہ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مختار مذہب وجوب عین کا ہے۔

⑰ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوانات اور پیش کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ متعدد ایسی روایات لاتے ہیں جن سے متعدد احکام ثابت ہوتے ہیں لیکن ان پر عنوان قائم کرتے وقت اپنے رجحان کا خیال رکھتے ہیں جیسا کہ کتاب الزکاۃ میں صدقۂ فطر سے متعلقہ روایات پر صرف وہی عنوانات قائم کیے ہیں جو ان کے ہاں مختار تھے، مثلاً: ○صدقة الفطر صاع من شعير(باب:72)○صدقة الفطر صاعٌ من طعام(باب:75)○صدقة الفطر صاعًا من تمر(باب:74)○باب صاع من زبيب (باب:75) لیکن آپ نے أقط (پنیر) کے متعلق کوئی عنوان قائم نہیں کیا کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک دوسری اشیاء کی موجودگی میں أقط (پنیر) سے صدقۂ فطر ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

⑱ عنوانات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ ایک عنوان قائم کرتے ہیں، اس کے بعد متعدد عنوانات اس سابقہ عنوان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے قائم کرتے ہیں، مثلاً: کتاب الأذان میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات كلها في الحضر والسفر وما يجهر فيها وما يخافت (باب:95) اس عنوان کے بعد متعدد عنوانات اس کی تفصیل کے لیے ہیں، مثلاً: ○باب القراءة في الظهر (باب:96)○باب القراءة في العصر (باب:97)○باب الجهر في المغرب (باب:99) ○باب الجهر في العشاء (باب:100)○باب الجهر بقراءة صلاة الصبح (باب:105) ان ابواب پر یہ اعتراض

کرنا کہ ایک مسئلے کے ثبوت کے لیے اوپر جب ایک عنوان قائم کیا جا چکا ہے تو پھر نیچے مزید عنوانات قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی، بے معنی ہے کیونکہ مقصد مزید تفصیل بیان کرنا ہے۔ اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الحج میں ایک عنوان قائم کیا ہے: باب فرض مواقيت الحج والعمرة (باب:5) اس کے بعد متعدد عنوانات اس کی تفصیل کے لیے ہیں۔ اس بنا پر یہ اعتراض بے معنی ہے کہ جب حج یا عمرے کے لیے میقات بیان ہوئی ہیں تو نجد، مدینہ، یمن اور عراق کے لیے الگ الگ عنوان قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

⑲ امام بخاری رحمہ اللہ بعض اوقات عنوانات قائم کرتے وقت ترتیب وجودی کے خلاف کرتے ہیں اور ایسا کسی خاص نکتے کے پیش نظر کیا جاتا ہے، مثلاً: کتاب الأذان میں باب الأذان بعد الفجر (باب:12) کو باب الأذان قبل الفجر (باب:13) پر مقدم کیا ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ فجر کے بعد اذان دی جائے جو نماز کے لیے دخولِ وقت کا اعلان ہے جبکہ فجر کی پہلی اذان کا نماز فجر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ پہلی اذان کسی اور مقصد کے پیش نظر ہے، اس بنا پر اصل کو مقدم کیا اگرچہ اس کے لیے ترتیب وجودی میں تبدیلی کرنا پڑی کیونکہ ترتیب کے اعتبار سے سحری کی اذان پہلے اور نماز فجر کی اذان بعد میں دی جاتی ہے۔ اسی طرح کتاب الصلاۃ میں باب نوم المرأة في المسجد (باب:57) کو نوم الرجال في المسجد (باب:58) سے پہلے لائے ہیں، حالانکہ مردوں کی فضیلت کے اعتبار سے اس باب کو پہلے لانا چاہیے تھا۔ یہ تقدیم کسی خاص نکتے کی وجہ سے ہے، وہ یہ کہ عورت کا مسجد میں سونا باعث فتنہ اور اس سے تلویث مسجد کا بھی اندیشہ ہے، اس لیے اس کا مسجد میں سونا متبادر نہیں تھا، لہٰذا اسے پہلے ثابت کر دیا۔

الغرض امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تالیف ''الجامع الصحیح'' میں بہت سے فنون کو سمو دیا ہے، خاص طور پر عنوانات میں بڑے بڑے اعلیٰ مقاصد پیش نظر رکھے ہیں جن کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے گہری نظر اور فہم ثاقب کی ضرورت ہے۔ سطحی فکر کا حامل انسان ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ وہ امام بخاری رحمہ اللہ اور صحیح بخاری کی اصلاح کرنے پر وقت ضائع کرتا ہے اور ''الجامع الصحیح'' کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے کہ اس کے عنوانات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، حالانکہ وہ خود فہم سقیم میں مبتلا ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلًا صَحِيحًا وَآفَتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيمِ

امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ تراجم کے متعلق تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے صرف انیس انواع کا ذکر کیا ہے، کاش! ہمارے ممدوح تھوڑی سی مزید مہلت دے دیتے تو تراجم بخاری پر مزید لکھا جاتا، بہرحال ماشاء اللہ کان وما لم يشأ لم يكن وكان أمر الله قدرًا مقدورًا.

٭ نسخہائے صحیح بخاری: امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد رشید فربری نے ذکر کیا ہے کہ "الجامع الصحیح" کو نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاری سے براہ راست سنا [1] لیکن ہم تک صحیح بخاری کے جو نسخے متصل سند سے پہنچے ہیں وہ صرف چار ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❁ پہلا نسخہ: یہ حافظ فربری کا نسخہ ہے۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے صحیح بخاری کو امام بخاری رحمہ اللہ سے دو مرتبہ سنا ہے: ایک مرتبہ بخارا میں اور دوسری مرتبہ فربر میں۔ بخارا کے قریب دریائے جیحون کے کنارے پر فربر نامی ایک شہر آباد ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کے ہونہار شاگرد اسی مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر فربری ہے۔ صحیح بخاری کے متعدد مقامات پر قال الفربري موجود ہے۔ صحیح بخاری کا یہ نسخہ باقی تینوں نسخوں سے زیادہ شہرت یافتہ ہے۔

❁ دوسرا نسخہ: یہ حافظ نسفی کا نسخہ ہے۔ ان کا نام ابراہیم بن معقل بن حجاج نسفی ہے۔ انھوں نے "الجامع الصحیح" کو امام بخاری رحمہ اللہ سے براہ راست سنا۔ حافظ نسفی نے پوری کتاب امام بخاری سے نہیں سنی، چند اوراق رہ گئے تھے، اس طرح اس نسخے میں معمولی سا نقص رہ گیا۔ اس بنا پر فربری کا نسخہ زیادہ عمدہ ہے کیونکہ انھوں نے پوری کتاب امام بخاری رحمہ اللہ سے سنی ہے۔ حافظ نسفی کے نسخے کو وہ شہرت نہ مل سکی جو نسخۂ فربری کو حاصل ہوئی۔

❁ تیسرا نسخہ: یہ نسخہ حافظ نسوی کا ہے۔ ان کا نام حماد بن شاکر نسوی ہے۔ انھوں نے "الجامع الصحیح" کو امام بخاری رحمہ اللہ سے سماعت کیا لیکن کچھ مقامات کی سماعت ان سے بھی رہ گئی۔ اس نسخے کو آگے بیان کرنے والا صرف ایک شخص ہے جبکہ فربری کے نسخے کو نقل کرنے والے نو تلامذہ ہیں۔ اس بنا پر حماد بن شاکر کے نسخے کو بھی وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو نسخۂ فربری کو حاصل ہوئی۔

❁ چوتھا نسخہ: یہ نسخہ حافظ بزدوی کا ہے۔ ان کا پورا نام ابوطلحہ منصور بن محمد بن علی بزدوی ہے۔ انھوں نے 329 ہجری میں وفات پائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے آخر میں فوت ہونے والے ہیں۔ اس نسخے کو بھی صرف ایک آدمی نقل کرتا ہے، اس لیے نسخۂ فربری کے مقابلے میں اس کی شہرت کم ہے۔

بعض حضرات حافظ محاملی کو بھی صاحب نسخہ کہتے ہیں لیکن ان کے پاس صحیح بخاری کا کوئی نسخہ نہیں تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ جب آخری مرتبہ بغداد گئے تو حافظ محاملی وہاں امام بخاری کی چند مجالس میں شریک ہوئے، بہر حال ہمارے ہندو پاک میں حافظ فربری کا نسخہ ہی مدارِ روایت ہے۔ واللہ أعلم.

---

(1) مقدمة فتح الباري، ص:686.

* ترتیب صحیح بخاری: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمۂ فتح الباری میں شیخ الاسلام ابوحفص عمر بلقینی کے حوالے سے ''الجامع الصحیح'' کی ترتیب بیان کی ہے۔ ہم اپنے الفاظ میں اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

صحیح بخاری ایک ایسی کتاب ہے جس پر صحیح اور جامع دونوں صفات کا اطلاق ہوتا ہے۔ جامعیت کا یہ عالم ہے کہ یہ شریعت کے تمام فنون، یعنی عقائد و عبادات، جہاد و غزوات، آداب و معاملات، سیر و اخلاقیات، حدود و تعزیرات، تفسیر و فضائل، طب و علاج اور رقاق و توحید جیسے چون (54) فنونِ اسلامیہ پر مشتمل ہے۔ ملکی سیاسی قوانین کے علاوہ روزمرہ کے جزوی معاملات بڑے صاف اور روشن دلائل سے مستنبط کیے ہیں۔ الغرض اللہ کی کتاب کے بعد یہ ایک ایسی کتاب ہے جو دین و دنیا کے معاملات بڑے اچھے انداز میں حل کرتی ہے اور مصنف کے متعلق تمام فنون میں قابلیت کی شہادت دیتی ہے۔

مصنف نے اپنی کتاب کا آغاز بدء الوحي سے کیا ہے کیونکہ دین اسلام کی بنیاد وحی پر ہے اور وحی کی دونوں اقسام مَتْلُوّ، یعنی کتاب اللہ اور غیر متلو، یعنی سنت رسول اللہ ﷺ میں عملی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کے بعد كتاب الإيمان لائے ہیں تاکہ بتایا جائے کہ وحی پر ایمان لانا ہی نجات کا باعث ہے، اس کے بغیر انسان کی کوئی محنت بھی ثمر آور نہیں ہوسکتی۔ پھر كتاب العلم کو بیان کیا۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ ایمان کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے علم انتہائی ضروری ہے۔ چونکہ علم کا تقاضا عمل ہے اور عملی میدان میں سب سے زیادہ اہم عبادات ہیں، اور عبادات کی بجا آوری کے لیے طہارت ظاہری شرط ہے، لہٰذا اس کے بعد كتاب الوضوء، كتاب الغسل، كتاب الحيض اور كتاب التيمم کو بیان فرمایا۔ عبادات کچھ ایسی بھی ہیں جن کے ثواب کا پیمانہ مقرر ہے، پھر ان میں سے کچھ خالص بدنی ہیں اور قیامت کے دن سب سے پہلے ان کے متعلق باز پرس ہو گی، لہٰذا كتاب الصلاة کا اہتمام کیا، پھر وہ عبادات ہیں جو محض مالی ہیں، كتاب الزكاة اسی اہمیت کے پیش نظر بیان کی گئی ہے، پھر وہ عبادات جو مالی اور بدنی دونوں سے مرکب ہیں، چنانچہ كتاب العمرة، كتاب المحصر اور كتاب جزاء الصيد بیان فرمائیں، پھر حج کی مناسبت سے كتاب فضائل المدينة لائے ہیں۔

پھر وہ عبادات جن کے اجر و ثواب کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہے۔ اگر اسے پورے آداب و شرائط سے ادا کیا جائے تو اللہ کے ہاں بلا حد و حساب اجر و ثواب ملے گا، چنانچہ كتاب الصوم تا كتاب الاعتكاف اسی حکمت کے پیش نظر بیان کی ہیں۔ اس کے بعد معاملات کا آغاز فرمایا، خاص طور پر وہ شخصی معاملات جن کا تعلق انسانی معیشت سے ہے، كتاب البيوع سے كتاب الوصايا تک اسی مقصد کو پورا کیا گیا ہے۔ پھر بین الاقوامی معاملات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ سرکشوں کی سرکوبی کے لیے جہاد اور ان سے حاصل شدہ اموال کی تقسیم اور جزیہ و ٹیکس کو بیان فرمایا۔ پھر ان کے

سامنے دعوت اسلام پیش کرنے کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے اصحاب کے فضائل ومناقب، آسمانی کتابیں، خاص طور پر قرآن اور اس کی تفسیر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے کتاب الجهاد سے فضائل قرآن تک طویل سلسلہ بیان کیا۔ یہ سلسلہ بین الاقوامی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد عائلی قوانین اور نظام کو بیان کرنے کے لیے کتاب النكاح سے کتاب النفقات لائے۔ اس کے بعد معاشرے کی تشکیل نو کے لیے کھانے پینے کے آداب کتاب الأطعمة سے کتاب الأشربة تک اور اس میں بے اعتدالی کی وجہ سے بیماری پھر علاج معالجے کی اہمیت کو کتاب المرضى اور کتاب الطب میں اجاگر کیا گیا ہے۔ متمدن اقوام کھانے پینے کے بعد ستر پوشی کو اہمیت دیتی ہیں، اس لیے الناس باللباس کے پیش نظر کتاب اللباس کو بیان کیا، پھر اخلاقیات کا آغاز فرمایا، چنانچہ کتاب الأدب اور کتاب الاستئذان میں اسی قسم کے معاشرتی آداب وحقوق کو بیان کیا گیا ہے، پھر اللہ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرنے کے لیے کتاب الدعوات اور کتاب الرقاق کو بیان کیا ہے۔ موت کے حوالے سے کتاب القدر، کتاب الأيمان والنذور اور کتاب الفرائض کا ذکر بھی ازبس ضروری تھا۔

بعض اوقات انسان اپنی موت سے بے خبر ہو کر دوسروں کے حقوق پر شبخون مارتا ہے، کتاب الحدود اور کتاب الديات میں ان جرائم کی روک تھام کے لیے مختلف سزاؤں کو بیان فرمایا۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں کی سرکشی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ مذکورہ سزائیں انھیں سیدھا نہیں کر سکتیں تو ان کے لیے کتاب استتابة المرتدين والمعاندين و قتالهم قائم کیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہو کر کلمۂ کفر کہہ دیتا ہے، اس کے حل کے لیے کتاب الإكراه لائے ہیں۔ اس عالم رنگ و بو میں بے شمار ایسے فتنے ہیں جو انسان کے ایمان واخلاق کو غارت کر دیتے ہیں۔ بعض فتنے مذہب کی آڑ میں برپا کیے جاتے ہیں یا کسی خواب کو بنیاد بنا کر انھیں ہوا دی جاتی ہے، چنانچہ کتاب الحيل، کتاب التعبير اور کتاب الفتن میں اسی قسم کے فتنوں کا سدباب کیا گیا ہے۔ پھر اسلامی حکومت کا خاکہ کتاب الأحكام میں بیان کیا۔ آخر میں مختلف تحریکات اور نظریات کا جائزہ کتاب التمني اور کتاب أخبار الآحاد کی صورت میں لیا گیا۔ پھر باطل تحریکات سے بچاؤ کے لیے کتاب الاعتصام بالكتاب والسنة کا عنوان قائم کیا ہے۔ آخر میں توحید باری تعالیٰ کے متعلق مختلف لوگوں اور گروہوں نے جو شکوک وشبہات پھیلا رکھے تھے انھیں کتاب التوحيد میں خوب خوب صاف کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے آغاز کتاب میں وحی اور آخر میں توحید کو بیان کیا کیونکہ توحید کی اصل وحی اور وحی کا ثمرہ توحید ہے اور درمیان میں اس کا تقاضا عمل ہے۔ آپ نے واضح کیا کہ جس نے دنیا میں اس پھل کو پا لیا وہ آخرت میں

کامیاب ہوگا اور جنت میں اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔ آمین.

* **مقام صحیح بخاری:** امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''الجامع الصحیح'' کو حسن نیت اور اخلاص سے تالیف فرمایا اور اس کی تالیف میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ آپ فرماتے ہیں: ''میں نے اپنی صحیح میں کوئی بھی حدیث غسل کرنے، دو رکعت پڑھنے اور استخارہ کرنے کے بغیر نہیں لکھی۔''[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عظیم کتاب کو لکھنے کے بعد اس وقت کے جلیل القدر علمائے کرام کی خدمت میں پیش کیا۔ تمام محدثین اور شیوخ نے اسے بنظر تحسین دیکھا۔ ابوجعفر عقیلی کا بیان ہے: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس تالیف کو امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی اور دیگر علمائے وقت کی خدمت میں پیش کیا تو سب نے اس کی تعریف کی اور اس کے صحیح ہونے کی شہادت دی مگر چار احادیث کے متعلق معمولی سا اختلاف کیا۔ ان چار احادیث کے متعلق عقیلی کا بیان ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی بات ہی صحیح ہے اور وہ احادیث بھی صحیح ہیں۔[2]

اب گویا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ خود اس تالیف کے متعلق فرماتے ہیں: میں نے سولہ برس کی محنت شاقہ سے اپنی اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور چھ لاکھ احادیث سے اس کا انتخاب کر کے اپنے اور اللہ کے درمیان اسے حجت قرار دیا ہے۔[3] امام حاکم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ امام بخاری پر رحم فرمائے! انھوں نے اپنی صحیح کو تالیف کر کے اس میں اصول جمع کیے اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے اس میں احادیث بیان کیں، ان کے بعد جتنے بھی مؤلفین آئے انھوں نے اسی کتاب سے مواد لیا۔[4] اس کتاب کے متعلق حافظ ابونصر وائلی کہتے ہیں: تمام اہل علم اور فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ قسم اٹھائے کہ ''بخاری کی وہ تمام مرفوع روایات جو رسول اللہ ﷺ سے بیان کی گئی ہیں وہ صحیح ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق ہو جائے۔'' اس طرح کی قسم اٹھانے سے اس کی بیوی کو طلاق نہیں ہوگی اور وہ عورت اس کی بیوی رہے گی۔[5] چونکہ صحیح بخاری کی تمام متصل مرفوع روایات صحیح ہیں، اس لیے اس کی بیوی پر طلاق نہیں پڑے گی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق تمام محدثین کرام کا اتفاق ہے کہ ان میں مذکور تمام کی تمام متصل اور مرفوع روایات یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک تواتر کے ساتھ پہنچی ہیں۔ جو انسان ان کی تعظیم نہ بجالائے وہ بدعتی، ملحد اور مسلمانوں کے راستے کے خلاف چلتا ہے۔[6]

صحیح بخاری کے متعلق ابوزید مروزی فرماتے ہیں: میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا، اس دوران

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص:9. [2] مقدمة فتح الباري، ص:9. [3] مقدمة فتح الباري، ص:683. [4] مقدمة فتح الباري، ص:14. [5] علوم الحديث لابن الصلاح، ص:39. [6] حجة الله البالغة:134/1.

میں میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ نے مجھ سے فرمایا: ابوزید! تم کب تک شافعی کی کتاب پڑھتے رہو گے؟ میری کتاب تم کیوں نہیں پڑھتے؟ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ کی کتاب کون سی ہے؟ آپ نے فرمایا: محمد بن اسماعیل کی جامع صحیح میری کتاب ہے۔[1] بہر حال اللہ تعالیٰ نے امام بخاری رحمہ اللہ کی تالیف ''الجامع الصحیح'' کو شرف قبولیت سے نوازا کہ کوئی بھی عامی یا اہل علم اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

(1) مقدمة فتح الباري، ص:683.

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء و المرسلین وعلٰی آلہ و صحبہ و من تبعھم بإحسان إلٰی یوم الدین. أما بعد:

ذخیرۂ کتب احادیث میں سب سے ممتاز اور سب سے افضل کتاب امیر امراء المحدثین، سید الفقہاء، امام الدنیا، جبل الحفظ والاتقان، محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بخاری رحمہ اللہ کی کتاب ہے جس کا نام نامی ہے: اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِیحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ أُمُورِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ وَ سُنَنِہٖ وَ أَیَّامِہٖ.

کتاب کا یہ نام اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ''الجامع'' محدثین کرام کی اصطلاح میں وہ کتاب ہوتی ہے جو تمام مضامین احادیث پر مشتمل ہو، یعنی جس میں عقائد، احکام، الزہد و الرقاق، الآداب و الاخلاق، التفسیر، التاریخ والسیر، الفتن، المناقب اور امور الآخرۃ کی روایات کو جمع کیا گیا ہو۔ اسلام چونکہ ایک کامل اور مکمل دین ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے دین سے متعلقہ تمام بنیادی مسائل کا خلاصہ امت کے سامنے پیش کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف تھا کہ دین کے حوالے سے ایک مسلمان کو جس مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے اس کا جواب کتاب و سنت میں موجود ہے، چنانچہ ان کے شاگرد محمد بن ابی حاتم الوراق کا بیان ہے کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا، آپ فرماتے تھے:

[لَا أَعْلَمُ شَیْئًا یُحْتَاجُ إِلَیْہِ إِلَّا وَھُوَ فِي الْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ - قَالَ: فَقُلْتُ لَہُ: یُمْکِنُ مَعْرِفَۃُ ذٰلِکَ؟ قَالَ: نَعَمْ]

''میری دانست میں ضرورت کی جتنی چیزیں ہیں ان تمام کا حل کتاب و سنت میں موجود ہے۔ میں نے پوچھا: کیا ان تمام کی معرفت ممکن ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں ممکن ہے۔''[1]

گویا انھوں نے اپنی اسی فکر کی تعبیر اپنی اس کتاب میں پیش کی ہے۔ ذیل میں ہم کتاب کے نام کی وضاحت کرتے ہیں:

۞ المسند: وہ حدیث جسے صحابی مرفوعاً بیان کرے اور اس کی سند میں ظاہراً اتصال پایا جائے۔ گویا کتاب کا موضوع

---

1 مقدمة فتح الباري، ص:488.

مرفوع متصل روایات ہیں مرسل، منقطع، معضل روایات اور اقوال و آراء نہیں۔ گو اس میں فقہی اقوال و فتاویٰ، لغوی و فقہی فوائد ہیں مگر وہ اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود و موضوع صرف مسند احادیث ہیں۔

۞ **الصحیح:** وہ مرفوع احادیث سب صحیح ہوں گی، ضعیف نہیں۔ خود امام بخاری رحمہ اللہ کا بیان ہے: [لَمْ أُخْرِجْ فِي هٰذَا الْكِتَابِ إِلَّا صَحِيحًا] ''میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کو درج کیا ہے۔''[1]

۞ **المختصر:** یہ کتاب مختصر ہے۔ تمام صحیح احادیث کا مجموعہ نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد ابراہیم بن معقل فرماتے ہیں کہ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا، فرماتے تھے کہ میں نے اس میں صرف صحیح احادیث جمع کی ہیں۔ تمام صحیح احادیث جمع نہیں کیں کہ کتاب لمبی نہ ہو جائے۔[2]

۞ **أمور رسول الله ﷺ:** جس میں رسول اللہ ﷺ کے فرامین و اقوال ہیں۔ گویا اس میں قولی احادیث ہیں۔

۞ **و سننه:** اور آپ ﷺ کی سنن و معمولات ہیں۔ گویا اس میں فعلی احادیث ہیں۔

۞ **و أيامه:** اور آپ ﷺ کے ایام حیات اور سیرت کا بیان ہے جس میں تقریری احادیث بھی ہیں اور اسلام کے ابتدائی انقلابی عہد کی صحیح ترین تاریخ بھی ہے۔ یہ ہے اس عظیم الشان کتاب کا نام جو بجائے خود اس کی گہرائی و گیرائی کی بیّن دلیل ہے۔

✱ **سبب تالیف:** تابعین عظام کے دور میں جب باقاعدہ تدوینِ احادیث کا آغاز ہوا تو ائمۂ کرام نے ہر باب کی احادیث و آثار کو علیحدہ علیحدہ اجزاء میں جمع کیا۔ اس کے بعد ایک کتاب میں ابواب پر مشتمل احادیث و آثار کو جمع کرنے کی طرح ڈالی اور اسی دور میں بعض لوگوں نے صرف احادیث نبوی پر مشتمل تصانیف مرتب کیں اور انھیں محدثین کرام کی اصطلاح میں ''مسند'' کا نام دیا گیا۔ مگر ان کتابوں میں اکثر و بیشتر صحیح، ضعیف، مرسل و منقطع روایات ملی جلی تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے ایک جلیل القدر استاد امام اسحاق بن راہویہ، جنھوں نے خود ایک مسند لکھی ہے، نے ایک بار اپنے تلامذہ کی مجلس میں فرمایا: [لَوْ جَمَعْتُمْ كِتَابًا مُخْتَصَرًا لِصَحِيحِ سُنَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ] ''کاش! تم رسول اللہ ﷺ کی صحیح سنن ایک مختصر کتاب میں جمع کر دو۔''[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ بات مقدمہ میں اپنی سند سے خطیب بغدادی کے طریق سے بیان کی ہے اور فرمایا ہے کہ امام اسحاق کی یہی ترغیب امام بخاری رحمہ اللہ کی تشجیع کا باعث بنی۔ مگر اسی سند سے انھوں نے تغلیق التعلیق میں ذکر کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: امام اسحاق کی مجلس میں ہمارے بعض اصحاب نے یہ بات فرمائی تھی، چنانچہ ان کے الفاظ

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص:7. [2] تاريخ بغداد:9/2. [3] مقدمة فتح الباري، ص:9.

ہیں:[كُنْتُ عِنْدَ إِسْحَاقَ بْنِ رَاهَوَيْهِ فَقَالَ لَنَا بَعْضُ أَصْحَابِنَا: لَوْ جَمَعْتُمْ كِتَابًا مُخْتَصَرًا لِسُنَنِ النَّبِيِّ ﷺ][1] بلکہ تاریخ بغداد (8/2) وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے اسی وقت سے اس کتاب کو جمع کرنا شروع کر دیا۔

انھی ایام میں امام بخاری رحمہ اللہ نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں، میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ میں پنکھا ہے جس سے میں آپ ﷺ کے اوپر سے مکھیاں اڑا رہا ہوں۔ میں نے معبرین سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جن جھوٹی روایات کی نسبت کی جاتی ہے، تم انھیں رفع کرو گے۔ امام صاحب فرماتے ہیں: اس خواب نے مجھے ''الجامع الصحیح'' لکھنے پر آمادہ کیا۔[2] اس خواب اور امام اسحاق یا ان کے رفقاء میں سے کسی رفیق کے مشورے سے امام صاحب کے دل میں ''الجامع الصحیح'' کے مُدَوَّن کرنے کا شوق پیدا ہوا اور آپ ہمہ تن اس کی تدوین و ترتیب میں مصروف ہو گئے۔

* **مدتِ تالیف اور کیفیتِ تالیف:** حافظ ابوالفضل بن طاہر نے کہا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''الجامع الصحیح'' سے پہلے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام ''المبسوط'' تھا جس میں انھوں نے تمام ابواب میں اپنی تمام مرویات کو جمع کیا، پھر اس میں سے صحیح احادیث کو منتخب کیا۔[3] خطیب بغدادی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے سولہ سال میں ''الصحیح'' کو مرتب کیا اور چھ لاکھ احادیث میں سے ان احادیث کا انتخاب کیا ہے اور میں نے اسے اپنی ذات اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے مابین (نجات کے لیے) حجت بنایا ہے۔[4]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تدوین میں جس اخلاص اور للّٰہیت کا اہتمام فرمایا ہے دورِ تدوینِ حدیث میں اس کی مثال مشکل ہے۔ امام بخاری کا بیان ہے کہ ''الجامع الصحیح'' میں حدیث درج کرنے سے پہلے میں غسل کرتا، دو رکعت نماز پڑھتا، دعائے استخارہ پڑھتا، جب ہر طرح سے صحت حدیث کا یقین ہو جاتا تو اسے اس کتاب کی زینت بنا دیتا۔ کتاب کا آغاز مکہ مکرمہ میں کیا اور اس کے ابواب و تراجم مدینہ طیبہ میں منبرِ نبوی اور قبرِ اطہر کے درمیان بیٹھ کر مرتب کیے۔[5]

* **قبولیت صحیح بخاری:** امام بخاری رحمہ اللہ کے اس تتبع اور اخلاص کا نتیجہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن مجید فرقان حمید کے بعد سب سے زیادہ پذیرائی اور قبولیت صحیح بخاری کو عطا فرمائی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ سے براہ راست اس عظیم الشان کتاب کا سماع کرنے والوں کی تعداد نوّے ہزار ہے۔[6]

☜ جرح و تعدیل کے امام، امام نسائی رحمہ اللہ نے فرمایا:

---

1 تغليق التعليق: 419/5. 2 مقدمة فتح الباري، ص:9. 3 تغليق التعليق: 419/5. 4 تاريخ بغداد: 14/2، وتهذيب الأسماء: 74/1. 5 مقدمة فتح الباري، ص:9. 6 مقدمة فتح الباري، ص:686.

[فَمَا فِي هٰذِهِ الْكُتُبِ كُلِّهَا أَجْوَدُ مِنْ كِتَابِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيِّ]

''ان تمام ذخیرۂ کتب میں امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کی کتاب سے زیادہ بہتر کوئی کتاب نہیں۔''[1]

یہی بات علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ سے نقل کی ہے۔[2]

- امام دارقطنی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الالزامات والتتبع'' میں فرماتے ہیں:

[مَعَ هٰذَا فَمَا فِي هٰذِهِ الْكُتُبِ خَيْرٌ وَ أَفْضَلُ مِنْ كِتَابِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيِّ رَحِمَهُ اللّٰهُ]

''اس کے باوجود ان تمام کتابوں میں امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ کی کتاب سے زیادہ بہتر اور افضل کوئی کتاب نہیں۔''[3]

- امام ابواحمد الحاکم الکبیر محمد بن محمد بن احمد النیسابوری رحمہ اللہ (المتوفیٰ 378 ہجری) فرماتے ہیں:

[رَحِمَ اللّٰهُ الْإِمَامَ مُحَمَّدَ بْنَ إِسْمَاعِيلَ فَإِنَّهُ الَّذِي أَلَّفَ الْأُصُولَ وَ بَيَّنَ لِلنَّاسِ، وَ كُلُّ مَنْ عَمِلَ بَعْدَهُ فَإِنَّمَا أَخَذَهُ مِنْ كِتَابِهِ ...... الخ]

''اللہ سبحانہ وتعالیٰ امام محمد بن اسماعیل پر رحمت فرمائے! انھوں نے (احکام کے) اصول ترتیب دیے اور لوگوں کو ان سے آگاہ کیا ہے۔ ان کے بعد جو آیا ہے اس نے انھی کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔''[4]

- حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی مقدمہ فتح الباری (ص:14) میں اور دیگر کئی حضرات نے امام ابواحمد کا یہ قول نقل کیا ہے۔ اور امام ابو احمد کی کتاب ''الأسامي والکنیٰ'' (274/2) میں یہ عبارت ابوبشر عبداللہ بن الدیلمی کے ترجمے میں ہے مگر عبارت میں اکثر تصحیفات پائی جاتی ہیں۔ مکمل عبارت الإرشاد اور السنن الأبین میں دیکھی جاسکتی ہے۔

- امام ابواحمد رحمہ اللہ نے مزید فرمایا:

[كَانَ أَحَدَ الْأَئِمَّةِ فِي مَعْرِفَةِ الْحَدِيثِ وَ جَمْعِهِ وَلَوْ قُلْتُ أَنِّي لَمْ أَرَتَصْنِيفَ أَحَدٍ يُشْبِهُ تَصْنِيفَهُ فِي الْحُسْنِ ...... لَمْ أَكُنْ بَالَغْتُ]

''امام بخاری رحمہ اللہ حدیث کی معرفت اور اسے جمع کرنے والے ائمہ میں سے ایک تھے۔ اگر میں کہوں کہ میں نے ان کی خوبصورت کتاب جیسی کوئی کتاب نہیں دیکھی تو میری اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔''[5]

- امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد اسفرائینی (المتوفیٰ 408 ہجری) فرماتے ہیں:

---

1 تاريخ بغداد:8/2. 2 تدريب الراوي:102/1. 3 مقدمة أطراف الغرائب للمقدسي:46/1. 4 الإرشاد للخليلي، ص:967، و السنن الأبين، ص:147. 5 توجيه النظر، ص:124.

[أَهْلُ الصِّنَاعَةِ مَجْمَعُونَ عَلٰى أَنَّ الْأَخْبَارَ الَّتِي اشْتَمَلَ عَلَيْهَا الصَّحِيحَانِ مَقْطُوعٌ بِصِحَّةِ أُصُولِهَا وَ مُتُونِهَا وَلَا يَحْصُلُ الْخِلَافُ فِيهَا بِحَالٍ، وَ إِنْ حَصَلَ فَذَاكَ اخْتِلَافٌ فِي طُرُقِهَا وَ رُوَاتِهَا]

''فنِ حدیث کے ماہرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ صحیحین کے سبھی اصول و متون قطعاً صحیح ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو وہ احادیث کی سندوں اور راویوں کے اعتبار سے ہے۔'' [1]

☜ علامہ ابن الصلاح، جن کی علوم الحدیث پر مشتمل کتاب کی جامعیت کے سبھی متاخرین معترف اور اس کے خوشہ چین ہیں، صحیح بخاری و صحیح مسلم کا تعارف کرواتے ہوئے رقمطراز ہیں:

[وَكِتَابَاهُمَا أَصَحُّ الْكِتَابِ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ ثُمَّ إِنَّ كِتَابَ الْبُخَارِيِّ أَصَحُّ الْكِتَابَيْنِ صَحِيحًا وَ أَكْثَرُهَا فَوَائِدَ]

''اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بعد امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ پھر ان دونوں میں امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب صحت کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور زیادہ فوائد کی حامل ہے۔'' [2]

اپنے اسی دعویٰ پر دلائل اور صحیح بخاری کی افضلیت بیان کرتے ہوئے انھوں نے مزید فرمایا:

[وَكَذٰلِكَ مُطْلَقُ قَوْلِ الْحَافِظِ أَبِي نَصْرٍ الْوَايِلِيِّ السَّجْزِيِّ: أَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ الْفُقَهَاءُ وَغَيْرُهُمْ، عَلٰى أَنَّ رَجُلًا لَوْحَلَفَ بِالطَّلَاقِ أَنَّ جَمِيعَ مَا فِي كِتَابِ الْبُخَارِيِّ مِمَّا رُوِيَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَدْ صَحَّ عَنْهُ وَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَالَهُ لَاشَكَّ فِيهِ أَنَّهُ لَايَحْنَثُ وَالْمَرْأَةُ بِحَالِهَا فِي حِبَالَتِهِ]

''اسی طرح حافظ ابونصر الوائلی السجزی کا مطلق قول (صحیح بخاری کی افضلیت پر دلالت کرتا ہے) کہ اہل علم فقہاء وغیرہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی طلاق کی قسم کھائے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب میں جو کچھ نبیٔ اکرم ﷺ سے روایت ہوا ہے وہ آپ سے صحیح ثابت ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے (اگر ایسا نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق) تو وہ آدمی بلا ریب حانث (قسم توڑنے والا) نہیں ہوگا اور اس کی بیوی بدستور اس کے عقد میں رہے گی۔'' [3]

علامہ ابن الصلاح رحمہ اللہ نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں مزید فرمایا:

[وَ كَذٰلِكَ مَا ذَكَرَهُ أَبُو عَبْدِاللّٰهِ الْحُمَيْدِيُّ فِي كِتَابِهِ الْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيحَيْنِ مِنْ قَوْلِهِ: لَمْ نَجِدْ مِنَ الْأَئِمَّةِ الْمَاضِينَ رضي الله عنهم مَنْ أَنْصَحَ لَنَا فِي جَمِيعِ مَاجَمَعَهُ بِالصِّحَّةِ إِلَّا هٰذَيْنِ الْإِمَامَيْنِ]

''اسی طرح امام ابوعبداللہ حمیدی نے (جو) اپنی کتاب الجمع بين الصحيحين میں ذکر فرمایا ہے (وہ بھی

---

1 النکت: 377/1. 2 مقدمة ابن الصلاح، ص:14. 3 مقدمة ابن الصلاح، ص:22.

صحیح بخاری کی برتری پر دلالت کرتا ہے) کہ گزشتہ ائمۂ حدیث رحمہم اللہ میں سے ہم کسی کو نہیں پاتے جس نے وضاحت کی ہو کہ اس نے جو کچھ جمع کیا ہے وہ صحیح ہے سوائے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے۔"[1]

علامہ ابن الصلاح نے حافظ ابوالنصر السجزی کا جو قول نقل کیا یہی قول انھوں نے شرح مسلم میں امام عبدالملک الجوینی امام الحرمین سے بھی نقل کیا ہے۔ علامہ العراقی اسی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ امام الحرمین رحمہ اللہ نے فرمایا:

[أَنَّهُ لَوْ حَلَفَ إِنْسَانٌ بِطَلَاقِ امْرَأَتِهِ أَنَّ فِي كِتَابِ الْبُخَارِيِّ وَ مُسْلِمٍ مِمَّا حُكِمَ بِصِحَّتِهِ مِنْ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَمَا الْتَزَمْتُهُ الطَّلَاقُ وَلَا حَنِثَهُ لِإِجْمَاعِ عُلَمَاءِ الْمُسْلِمِينَ عَلٰى صِحَّتِهِمَا]

"اگر کوئی انسان طلاق کی قسم اٹھائے کہ امام بخاری اور مسلم کی کتاب میں جس حدیث پر صحت کا حکم لگایا گیا ہے وہ نبی ﷺ کا فرمودہ ہے (اگر یہ صحیح نہ ہو تو میری بیوی کو طلاق) تو نہ اس کی بیوی کو طلاق ہوگی اور نہ وہ حانث ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے علماء کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتابیں صحیح ہیں۔"[2]

امام الحرمین کا یہ قول علامہ نووی نے بھی مقدمۂ شرح مسلم میں نقل کیا ہے۔

- علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

[اِتَّفَقَ عُلَمَاءُ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ عَلٰى أَنَّهُ لَيْسَ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى أَصَحُّ مِنْ صَحِيحَيِ الْبُخَارِيِّ وَ مُسْلِمٍ...... وَالْجُمْهُورُ عَلٰى تَرْجِيحِ الْبُخَارِيِّ عَلٰى مُسْلِمٍ]

"شرق و غرب کے علماء کا اتفاق ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں......اور جمہور نے صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی ہے۔"[3]

- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

[وَ أَمَّا الصَّحِيحَانِ فَقَدِ اتَّفَقَ الْمُحَدِّثُونَ عَلٰى أَنَّ جَمِيعَ مَا فِيهِمَا مِنَ الْمُتَّصِلِ الْمَرْفُوعِ صَحِيحٌ بِالْقَطْعِ وَ أَنَّهُمَا مُتَوَاتِرَانِ إِلٰى مُصَنِّفَيْهِمَا وَ أَنَّهُ كُلُّ مَنْ يُهَوِّنُ أَمْرَهُمَا فَهُوَ مُبْتَدِعٌ مُتَّبِعٌ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ]

"اور رہی صحیح بخاری اور صحیح مسلم تو محدثین کا اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جو متصل مرفوع احادیث ہیں وہ قطعی طور پر صحیح ہیں۔ اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک تواتر سے پہنچتی ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو ان دونوں کتابوں کی توہین کرتا ہے وہ بدعتی ہے اور اہلِ ایمان کی راہ کے خلاف چلنے والا ہے۔"[4]

---

(1) مقدمة ابن الصلاح، ص:22. (2) التقييد و الإيضاح،ص:39. (3) عمدة القاري:24/1. (4) حجة الله البالغة:134/1.

- مولانا احمد علی سہارن پوری رحمہ اللہ، جن کا حاشیہ صحیح بخاری متداول اور مدارس میں درسی نسخے کی حیثیت سے پڑھا پڑھایا جاتا ہے، اس نسخے کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

[وَهُوَ أَوَّلُ مُصَنَّفٍ فِي الصَّحِيحِ الْمُجَرَّدِ، وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلٰى أَنَّ أَصَحَّ الْكُتُبِ الْمُصَنَّفَةِ صَحِيحًا الْبُخَارِيُّ وَ مُسْلِمٌ وَاتَّفَقَ الْجُمْهُورُ عَلٰى أَنَّ صَحِيحَ الْبُخَارِيِّ أَصَحُّهُمَا صَحِيحًا وَّ أَكْثَرُهُمَا فَوَائِدَ]

''صحیح بخاری پہلی تصنیف ہے جو صرف صحیح احادیث پر مرتب کی گئی ہے۔ اور علماء کا اتفاق ہے کہ تمام کتب احادیث میں صحت کے اعتبار سے سب سے صحیح، بخاری اور مسلم ہیں۔ اور جمہور کا اتفاق ہے کہ ان دونوں میں صحت کے اعتبار سے صحیح بخاری زیادہ صحیح اور زیادہ فوائد پر مشتمل ہے۔''[1]

- علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ اپنی املائی تقریر میں فرماتے ہیں:

[وَاعْلَمْ أَنَّهُ انْعَقَدَ الْإِجْمَاعُ عَلٰى صِحَّةِ الْبُخَارِيِّ وَ مُسْلِمٍ إِلَّا أَنَّ مُسْلِمًا يَشْتَمِلُ عِنْدِي عَلَى الْحِسَانِ أَيْضًا]

''اور خوب جان لو کہ صحیح بخاری اور مسلم کے صحیح ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے مگر میرے نزدیک مسلم میں حسن احادیث بھی ہیں۔''[2]

بلکہ انھوں نے صحیح بخاری کی احادیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ قطعی ہیں، ان کے الفاظ ہیں:

[اِخْتَلَفُوا فِي أَنَّ أَحَادِيثَ الصَّحِيحِ هَلْ تُفِيدُ الْقَطْعَ أَمْ لَا، فَالْجُمْهُورُ إِلٰى أَنَّهَا لَا تُفِيدُ الْقَطْعَ، وَ ذَهَبَ الْحَافِظُ رحمه الله إِلٰى أَنَّهَا تُفِيدُ الْقَطْعَ وَ إِلَيْهِ جَنَحَ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ السَّرْخَسِيُّ رحمه الله مِنَ الْحَنَفِيَّةِ وَالْحَافِظُ ابْنُ تَيْمِيَّةَ مِنَ الْحَنَابِلَةِ وَالشَّيْخُ عَمْرُو بْنُ الصَّلَاحِ رحمه الله وَهٰؤُلَاءِ وَ إِنْ كَانُوا أَقَلَّ عَدَدًا إِلَّا أَنَّ رَأْيَهُمْ هُوَ الرَّأْيُ وَ قَدْ سَبَقَ فِي مَثَلٍ سَائِرٍ]

تُعَيِّرُنَا أَنَّا قَلِيلٌ عَدِيدُنَا

فَقُلْتُ لَهَا إِنَّ الْكِرَامَ قَلِيلٌ[3]

''اس میں اختلاف ہے کہ صحیح بخاری کی احادیث قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں یا نہیں۔ جمہور کا خیال ہے کہ قطعیت کا فائدہ نہیں دیتیں۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں۔ یہی رائے حنفیہ میں سے شمس الائمہ سرخسی، حنابلہ میں حافظ ابن تیمیہ اور شیخ ابن الصلاح کی ہے۔ یہ حضرات تعداد میں گو کم ہیں مگر

---

1 مقدمة صحيح البخاري، ص:4. 2 فيض الباري:57/1. 3 فيض الباري:45/1.

رائے انھی کی رائے ہے۔ ایسے ہی موقع کے بارے میں پہلے سے کہا گیا ہے: وہ ہمیں عار دلاتی ہے کہ ہماری تعداد کم ہے۔ میں اسے کہتا ہوں بلاریب مکرم و محترم لوگ کم ہی ہوتے ہیں۔"

بلکہ انھوں نے یہ بات بھی بڑی حقیقت آمیز کہی ہے:

[أَنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ عُلَمَاءَ الْمَذَاهِبِ كُلِّهِمْ يَتَفَاخَرُونَ بِمُوَافَقَةِ حَدِيثِ الْبُخَارِيِّ إِيَّاهُمْ لِكَوْنِهِ أَصَحُّ عِنْدَهُمْ]

"آپ جانتے ہیں کہ تمام مذاہب کے علماء صحیح بخاری کی حدیث سے اپنی موافقت پر فخر کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔"[1]

صحیح بخاری کی صحت اور عظمت پر ہم انھی اقوال پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ اگر اس موضوع سے متعلق تمام اقوال کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ بن سکتا ہے۔ صحیحین اور بالخصوص صحیح بخاری کے بارے میں علمائے امت کی یہ رائے بلادلیل نہیں۔ احادیث مبارکہ کا ذخیرہ امام بخاری رحمہ اللہ کے دور میں اکثر و بیشتر مدون ہو چکا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے چھ لاکھ اسانید میں سے صحیح اسانید کا انتخاب کیا۔ ایک ایک سند اور ایک ایک متن کی خوب چھان پھٹک کی۔ تحقیق و تدقیق کے بعد استخارہ کیا۔ القائے ربانی کے بعد مزید صحت کا یقین ہوا تو "الجامع الصحیح" کے نام سے امت کے سامنے یہ مجموعہ پیش کیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے بعد بھی سیکڑوں محدثین کی نظریں اس پر مرتکز رہیں۔ انھوں نے ان کے معیار صحت کو پرکھا، ایک ایک سند کو جانچا، ہر سند کے راویوں کی تحقیق و تنقیح کی، حدیث کے ایک ایک لفظ کی تفتیش کی، پھر کہیں جا کر علی وجہ البصیرت تصحیح حدیث میں ان کی تصدیق کی اور اس احقاقِ حق کا اظہار کیا کہ کتاب اللہ کے بعد دین کا سب سے صحیح ترین مجموعہ "الجامع الصحیح" ہے۔

٭ **الجامع الصحیح پر نقد کا جائزہ:** بعض محدثین نے اس کی بعض احادیث کو فنی نقطۂ نظر سے صحت کے بلند ترین معیار کے مطابق قرار نہیں دیا۔ یا ان پر کوئی نقد کیا ہے تو اس کے قطعاً یہ معنیٰ نہیں کہ وہ روایات ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں۔ علامہ ابن الوزیر الیمانی نے انھی روایات کے بارے میں واشگاف الفاظ میں کہا ہے:

[اِعْلَمْ أَنَّ الْمُخْتَلَفَ فِيهِ مِنْ حَدِيثِهِمَا هُوَ الْيَسِيرُ، وَلَيْسَ فِي ذٰلِكَ الْيَسِيرُ مَاهُوَ مَرْدُودٌ بِطَرِيقٍ قَطْعِيَّةٍ وَلَا إِجْمَاعِيَّةٍ، بَلْ غَايَةَ مَا فِيهِ أَنَّهُ لَمْ يَنْعَقِدْ عَلَيْهِ الْإِجْمَاعُ]

"خوب جان لو کہ بخاری و مسلم کی یہ تھوڑی سی مختلف فیہ احادیث نہ قطعی طور پر مردود ہیں اور نہ اجماعی طور پر، بلکہ زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ان کی صحت پر اجماع نہیں ہوا۔"[2]

---

1 فیض الباري: 478/2. 2 الروض الباسم: 79/1.

امام دارقطنی رحمہ اللہ، جن کے حوالے سے بعض معترضین اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے بات بناتے ہیں اور ان کے انتقادات سے حجت پکڑتے ہیں، خود ان کا قول پہلے صحیح بخاری کی عظمت کے حوالے سے گزرا ہے مگر دیکھیے کہ علامہ انور شاہ کشمیری مرحوم ان کے انتقادات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، ان کے الفاظ ہیں:

[إِنَّ الدَّارَقُطْنِيَّ يَمْشِي عَلَى الْقَوَاعِدِ الْمُمَهَّدَةِ عِنْدَهُمْ فَيُنَازِعُهُ مِنَ الْقَواعِدِ وَ شَأْنُ الْبُخَارِيِّ أَرْفَعُ مِنْ ذٰلِكَ فَإِنَّهُ يَمْشِي عَلَى اجْتِهَادِهِ]

''امام دارقطنی اہل فن کے قواعد مصطلحہ پر چلتے ہیں اور انھی کی بنیاد پر امام بخاری رحمہ اللہ سے اختلاف کرتے ہیں مگر امام بخاری رحمہ اللہ کا مقام اس سے کہیں بلند ہے وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے ہیں۔''[1]

گویا امام بخاری رحمہ اللہ بجائے خود امام و مجتہد اور صاحب فن ہیں۔ وہ جو طریقہ اختیار کریں اور جو بات کہیں بذات خود ایک اتھارٹی ہیں، اس لیے امام دارقطنی وغیرہ نے جو ان احادیث کو قواعد ممہدہ کی بنیاد پر تولنا اور پرکھنا چاہا ہے وہ بجائے خود محل نظر ہے۔ پھر اس حقیقت کا کس صاحب علم کو انکار ہے کہ امام دارقطنی وغیرہ کے اعتراضات کا جواب علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمۂ فتح الباری اور فتح الباری میں دیا ہے۔

حافظ زین الدین عراقی (المتوفی 806 ہجری) نے بھی ایک مستقل کتاب صحیحین کی منتقدہ روایات کے جواب میں رقم فرمائی جس کا نام ''الأحاديث المخرجة في الصحيحين التي تكلم فيها بضعف أو انقطاع'' ہے۔ جس کے بارے میں خود انھوں نے فرمایا ہے: [فِيهِ فَوَائِدُ مُهِمَّاتٌ] ''اس میں بڑے اہم فوائد ہیں۔''[2] اس کتاب کی طرف اشارہ انھوں نے التقييد و الإيضاح (ص:42) میں بھی کیا ہے مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کا مسودہ ضائع ہوگیا ہے۔[3]

علامہ عراقی کے فرزند ارجمند حافظ ولی الدین ابوزرعہ، احمد بن عبدالرحیم (المتوفی 826 ہجری) نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے ان راویوں کے بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں ضعف اور جرح پائی جاتی ہے۔ جس کا نام انھوں نے ''البيان و التوضيح لمن خرج له في الصحيح و ليس بضرب من التجريح'' رکھا، جو زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔

حافظ ابومسعود ابراہیم بن محمد الدمشقی نے امام دارقطنی کے صحیح مسلم کی احادیث پر بعض اعتراضات کا جواب دیا جو کتاب الأجوبة کے نام سے مطبوع ہے۔ اسی طرح حافظ ابوالحسن رشید الدین یحییٰ بن علی بن عبداللہ القرشی النابلسی

---

1 فيض الباري:57/1. 2 التبصرة والتذكرة:71/1. 3 النكت:380/1.

(المتوفی 662 ہجری) نے غرر الفوائد المجموعة فِي بيان ما وقع فِي صحيح مسلم من الأحاديث المقطوعة کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں صحیح مسلم کی بعض ان روایات کا جواب ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں انقطاع وغیرہ پایا جاتا ہے۔ حافظ سیوطی نے بھی فرمایا ہے:

[وَقَدْ أَلَّفَ الرَّشِيدُ الْعَطَّارُ كِتَابًا فِي الرَّدِّ عَلَيْهِ وَالْجَوَابَ عَنْهَا حَدِيثًا حَدِيثًا وَقَفْتُ عَلَيْهِ وَ سَيَأْتِي نَقْلُ مَا فِيهِ مُلَخَّصًا مُفَرَّقًا فِي الْمَوَاضِعِ اللَّائِقَةِ بِهِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ]

''رشید عطار نے اس کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے اور ایک ایک حدیث کا جواب دیا ہے۔ میں نے یہ کتاب دیکھی ہے اور ان شاء اللہ مناسب مقامات پر اختصاراً اس سے نقل کیا جائے گا۔''[1]

علامہ عراقی نے التقیید والإیضاح، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے النکت اور علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ کتاب صحیح مسلم کی احادیث پر اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہے۔

✱ **حافظ قرشی کی غلط بیانی:** مگر کیا کیا جائے کہ اس حقیقت کے بالکل برعکس حافظ عبدالقادر بن ابی رفاعہ قرشی نے یہ تأثر دیا ہے کہ علامہ رشید الدین نے اس کتاب میں صحیح مسلم کی منقطع روایات کو جمع کیا ہے، چنانچہ صحیح مسلم پر اعتراض کے حوالے سے لکھتے ہیں:

[فَقَدْ وَضَعَ الْحَافِظُ الرَّشِيدُ الْعَطَّارُ كِتَابًا عَلَى الْأَحَادِيثِ الْمَقْطُوعَةِ الْمُخَرَّجَةِ فِي مُسْلِمٍ سَمَّاهُ: الفوائد المجموعة فِي شأن [بيان] ما وقع فِي مسلم من الأحاديث المقطوعة]

''یعنی حافظ رشید الدین العطار نے مسلم کی مقطوع روایات پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام انھوں نے الفوائد المجموعہ رکھا ہے۔''[2]

افسوس! کہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے انہاء السکن، جسے بعد میں قواعد علوم الحدیث کا نام دیا گیا، میں اور شیخ ابوغدہ نے شروط الائمۃ الخمسۃ للحازمي کے حواشی میں مکھی پہ مکھی ماری ہے۔ ملاحظہ ہو: (قواعد، ص: 463، 467) حالانکہ یہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ علامہ سیوطی وغیرہ کی وضاحت کے علاوہ یہ دیکھیے کہ حافظ رشید الدین کی یہ کتاب مکتبہ الرشد الریاض سے شیخ صلاح الامین محمد احمد بلال کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مقدمے میں خود حافظ رشید الدین رقمطراز ہیں:

[فَهٰذِهِ أَحَادِيثُ مُخَرَّجَةٌ مِّنْ صَحِيحِ الْإِمَامِ أَبِي الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الْحَجَّاجِ الْقُشَيْرِيِّ الْحَافِظِ ﷺ وَقَعَتْ شَاذَّةً عَنْ رَسْمِهِ فِيهِ، ذَكَرَهَا الْإِمَامُ أَبُو عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ التَّمِيمِيُّ الْمَازِرِيُّ

---

[1] تدريب الراوي: 135/1. [2] كتاب الجامع مع الجواهر المضية: 428/2.

رَحِمَهُ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ الْمُسَمّٰى بِالْمُعْلِمْ وَ نَصَّ عَلٰى أَنَّهَا وَقَعَتْ فِي كِتَابِ مُسْلِمٍ مَقْطُوعَةُ الْأَسَانِيدِ وَعَدَّهَا أَرْبَعَةَ عشَرَ حَدِيْثًا وَ نَبَّهَ عَلٰى أَكْثَرِهَا فِي مَوَاضِعِهَا مِنْ كِتَابِهٖ إِلَّا أَنَّهٗ لَمْ يُبَيِّنْ صِفَةَ انْقِطَاعِهَا وَلَا ذَكَرَ مَنْ وَصَلَهَا كُلَّهَا مِنْ أَئِمَّةِ الرُّوَاةِ فَرُبَمَا تَوَهَّمَ النَّاظِرُ فِي كِتَابِهٖ مِمَّنْ لَيْسَ لَهٗ عِنَايَةٌ بِالْحَدِيثِ وَلَا مَعْرِفَةٌ بِجَمْعِ طُرُقِهٖ أَنَّهَا مِنَ الْأَحَادِيثِ الَّتِي لَا تَتَّصِلُ بِوَجْهٍ وَلَا يَصِحُّ الْاِحْتِجَاجُ بِهَا لِانْقِطَاعِهَا وَقَدْ رَأَيْتُ غَيْرَ وَاحِدٍ يُلْهِجُ بِذِكْرِهَا وَ يَظُنُّهَا عَلٰى هٰذِهِ الصِّفَةِ وَلَيْسَ الْأَمْرُ كَذٰلِكَ بَلْ هِيَ مُتَّصِلَةٌ كُلُّهَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ مِنَ الْوُجُوهِ الثَّابِتَةِ ...... الخ]

’’یہ امام مسلم کی الصحیح کی وہ احادیث ہیں جو ان کے اسلوب سے ہٹ کر ہیں، جنھیں امام ابوعبداللہ محمد بن علی تمیمی مازری نے اپنی کتاب ”المعلم بفوائد شرح مسلم“ میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ صحیح مسلم میں چودہ احادیث منقطع وارد ہوئی ہیں۔ جن کی اکثر نشاندہی انھوں نے اپنی کتاب کے مختلف مقامات میں کی ہے۔ مگر انھوں نے انقطاع کی نوعیت کو بیان نہیں کیا اور نہ ان ائمہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے انھیں موصول بیان کیا ہے۔ جسے علم حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں اور جمع طرق کی معرفت سے بھی وہ بے خبر ہے، بسا اوقات اس کتاب کو دیکھ کر اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ صحیح مسلم کی یہ وہ روایات ہیں جو متصل نہیں، اور ان کے انقطاع کی وجہ سے ان سے استدلال درست نہیں بلکہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا جو ان احادیث کے ذکر کرنے میں خوش اور فریفتہ ہوتے ہیں اور انھیں منقطع تصور کرتے ہیں، حالانکہ معاملہ یوں نہیں بلکہ یہ بحمداللہ تمام صحیح اسانید سے متصل ہیں۔‘‘[1]

یہاں یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ صحیح مسلم میں چودہ احادیث کے منقطع ہونے کا دعویٰ علامہ المازری سے پہلے حافظ ابوعلی الحسین بن محمد الغسانی الجیانی (المتوفی 498 ہجری) نے کیا ہے۔ البتہ انھوں نے بعض روایات میں اتصال ثابت کیا۔ تمام روایات پر بحث نہیں کی۔ مگر علامہ المازری نے ان روایات میں اتصال سے صرف نظر کر کے صرف انقطاع کی بات نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ حافظ رشیدالدین نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے مزید فرمایا ہے کہ ان چودہ روایات کے علاوہ بھی اس نوعیت کی جتنی روایات ہیں ان تمام میں اتصال ثابت ہے اور میں نے قابل اعتماد ثقہ راویوں اور ائمۂ حدیث کی کتابوں سے ان کا متصل ہونا بیان کیا ہے۔[2]

علامہ رشیدالدین کی اس وضاحت کے بعد بتلایئے کہ علامہ قرشی نے محض مسلکی تعصب کے نتیجے میں اور عجلت میں غرر الفوائد المجموعة کو کیا سے کیا بنا دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ انھوں نے علامہ رشیدالدین کی طرف ایک اور بات

[1] غرر الفوائد المجموعة، ص: 140,139۔ [2] غرر الفوائد المجموعة، ص:141۔

بھی منسوب کر دی۔ وہ یہ کہ صحیح مسلم کے دفاع میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف راویوں سے روایت بطور اعتبار، شواہد اور متابعات میں آئی ہیں تو یہ کوئی مضبوط دفاع نہیں کیونکہ حافظ رشید الدین نے کہا ہے:

[اَلْاِعْتِبَارُ وَالشَّوَاهِدُ وَالْمُتَابَعَاتُ أُمُورٌ يَتعَرَّفُونَ بِهَا حَالَ الْحَدِيثِ، وَ كِتَابُ مُسْلِمٍ الْتُزِمَ فِيهِ الصَّحِيحُ فَكَيْفَ يَتعَرَّفُ حَالَ الْحَدِيثِ الَّذِي فِيهِ بِطُرُقٍ ضَعِيفَةٍ]

''اعتبار، شواہد اور متابعات تو ایسے امور ہیں جن سے کسی حدیث کا حال معلوم کیا جاتا ہے مگر کتاب مسلم تو ایسی کتاب ہے جس میں صحیح کا التزام کیا گیا ہے، لہٰذا جو اس میں ضعیف اسانید سے مروی ہے اس کا حال کیونکر معلوم ہوگا۔''[1]

حالانکہ یہ اور اس نوعیت کی کوئی عبارت علامہ رشید الدین العطار کی اس کتاب میں نہیں بلکہ انھوں نے متعدد مقامات پر فرمایا کہ یہ اور یہ روایت امام مسلم نے متابعت یا شواہد میں ذکر کی ہے۔ ہم یہاں ایسے صرف ایک مقام کی نشاندہی پر اکتفا کرتے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم کی کتاب فضائل الصحابة رضی اللہ عنہم کے آخر میں [بَابُ بيان معنى قَوْلِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَلٰى رَأْسِ مِائَةِ سَنَةٍ لَا يَبْقٰى نَفْسٌ مَنْفُوسَةٌ فَمَنْ هُوَ مَوْجُودٌ الْآنَ] امام مسلم رحمہ اللہ پہلے متصل سند سے بواسطہ معمر عن الزهري عن سالم و أبي بكر بن سليمان بن أبي حثمة عن ابن عمر حدیث لائے ہیں، پھر فرمایا ہے: حدثني عبدالله بن عبدالرحمٰن الدارمي: اخبرنا أبو اليمان اخبرنا شعيب، یعنی یہی روایت شعيب عن الزهري کی سند سے بھی مروی ہے۔ پھر فرماتے ہیں: [وَ رَوَاهُ اللَّيْثُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ خَالِدِ بْنِ مُسَافِرٍ، كِلَاهُمَا عَنِ الزُّهْرِيِّ، بِإِسْنَادِ مَعْمَرٍ، كَمِثْلِ حَدِيثِهِ] ظاہر ہے کہ امام مسلم اور امام لیث بن سعد کے مابین واسطہ ساقط ہے کیونکہ امام مسلم، امام لیث سے براہ راست قطعاً روایت نہیں کرتے اور اس سند کو بھی منقطع قرار دیا گیا ہے جس کے جواب میں علامہ رشید الدین العطار فرماتے ہیں:

[وَهٰذَا لَايَخْفٰى عَلٰى ذِي مَعْرِفَةٍ بِالنَّقْلِ أَنَّهُ مُتَّصِلٌ مِّنْ طَرِيقَيْنِ عَنِ الزُّهْرِيِّ بِإِسْنَادِهِ الْمَذْكُورِ وَهِيَ طَرِيقُ مَعْمَرٍ وَطَرِيقُ شُعَيْبٍ، وَ قَوْلُ مُسْلِمٍ فِي بَعْضِ طُرُقِهِ عَلٰى وَجْهِ الْمُتَابَعَةِ وَ رَوَاهُ اللَّيْثُ ابْنُ سَعْدٍ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ خَالِدٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ لَايُؤَثِّرُ فِي اتِّصَالِ هٰذَا الْحَدِيثِ بَلْ يَزِيدُهُ ثُبُوتًا وَّ قُوَّةً، عَلٰى أَنَّ عَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ خَالِدٍ هٰذَا لَيْسَ مِنْ شَرْطِ مُسْلِمٍ فَلَا يَلْزَمُ إِخْرَاجُ حَدِيثِهِ]

''نقل حدیث کی معرفت رکھنے والے پر یہ بات مخفی نہیں کہ سند مذکور میں دو سندوں کے ساتھ زہری سے یہ حدیث متصل ہے: ایک معمر کا اور دوسرا شعیب کا طریق ہے۔ اور امام مسلم کا قول بعض طرق کے بارے میں

[1] كتاب الجامع ذيل الجواهر المضية: 428/2.

متابعتاً ہے۔ لیث، عبدالرحمٰن بن خالد عن الزہري والا طریق اس حدیث کے متصل ہونے پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کرتا بلکہ اس کو مزید ثابت اور قوی کرتا ہے کیونکہ عبدالرحمٰن بن خالد مسلم کی شرط پر نہیں، اس لیے اس کی حدیث کی تخریج ہی امام مسلم پر لازم نہیں۔''[1]

غور فرمایئے علامہ العطار اس منقطع سند کے بارے میں کیا فرماتے ہیں یہی کہ یہ متابعتاً ہے اور عبدالرحمٰن بن خالد سے امام مسلم نے احتجاجاً کوئی روایت نہیں لی بلکہ متابعت اور شواہد میں روایت لی ہے، لہٰذا اس کو امام مسلم نے متصل سند سے روایت نہیں کیا تو اس کے منقطع بیان کرنے پر اعتراض ہی درست نہیں، اس لیے علامہ رشید الدین کی طرف جس بات کا انتساب علامہ قرشی نے کیا یہ بالکل اسی طرح غلط اور بے بنیاد ہے جیسے انھوں نے علامہ رشید الدین کی غرر الفوائد المجموعة کو صحیح مسلم پر اعتراضات پر مبنی کتاب قرار دیا ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُون.

پھر متابعات و شواہد کے حوالے سے جو اعتراض انھوں نے نقل کیا، کیا وہ نفس الامر میں درست اور امام مسلم کے منہج اور اسلوب کے واقعتاً منافی ہے؟ جبکہ امر واقع یہ ہے کہ خود امام مسلم نے ''الصحیح'' کے مقدمے میں راویوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ میں سب سے پہلے [أهل استقامة في الحديث و الإتقان] ''حدیث اور اتقان میں استقامت والوں'' کی احادیث لاؤں گا جو توثیق و تعدیل کے اعتبار سے طبقۂ اولیٰ میں شمار ہوتے ہیں، پھر ان راویوں کی روایات ذکر کروں گا جو صدوق ہوں گے مگر حفظ و اتقان میں پہلے درجے کے راویوں سے کم تر ہوں گے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ انھی طبقات کی تقسیم پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں:

[وَيَأْتِي بِأَحَادِيثَ الطَّبَقَتَيْنِ، فَيَبْدَأُ بِالْأُولٰى ثُمَّ يَأْتِي بِالثَّانِيَةِ عَلٰى طَرِيقِ الْاِسْتِشْهَادِ وَ الْإِتْبَاعِ]

''امام مسلم دونوں طبقوں کے راویوں سے روایات لائے ہیں۔ پہلے طبقۂ اولیٰ سے پھر استشہاد و متابعت میں دوسرے طبقہ سے۔''[2]

اس کے چند سطور بعد صحیح مسلم میں متکلم فیہ راویوں پر اعتراض کے جواب میں بھی علامہ ابن الصلاح سے ذکر کرتے ہیں:

[أَنْ يَّكُونَ ذٰلِكَ وَاقِعًا فِي الْمُتَابَعَاتِ وَالشَّوَاهِدِ لَا فِي الْأُصُولِ، وَذٰلِكَ بِأَنْ يَّذْكُرَ الْحَدِيثَ أَوَّلًا بِإِسْنَادٍ نَظِيفٍ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ وَ يَجْعَلُهُ أَصْلًا ثُمَّ يَتْبَعُهُ بِإِسْنَادٍ آخَرَ أَوْ أَسَانِيدَ فِيهَا بَعْضُ الضُّعَفَاءِ عَلٰى وَجْهِ التَّأْكِيدِ بِالْمُتَابَعَةِ]

''ایسے متکلم فیہ راوی متابعت اور شواہد میں ہیں اصول میں نہیں کیونکہ پہلے وہ ثقہ راویوں کی صاف ستھری سند سے روایت لاتے ہیں، اور اسے اصل قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی اور سند یا ایسی سند جس میں بعض راوی

---

1. غرر الفوائد، ص:224، حدیث:10. 2. مقدمة شرح مسلم:15/1.

ضعیف ہوتے ہیں بطور تاکید و تائید لاتے ہیں۔"[1]

علامہ نووی رحمہ اللہ کی اس وضاحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ متابعت اور شواہد میں متکلم فیہ راویوں سے روایت امام مسلم رحمہ اللہ کے منہج کے مطابق ہے، مخالف نہیں جیسا کہ علامہ قرشی، حافظ رشید الدین کے بے بنیاد سہارے پر باور کروا رہے ہیں۔ علامہ قرشی نے اس بحث کے ضمن میں مزید جو کچھ فرمایا اور صحیح مسلم کی احادیث پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے اس حوالے سے ہماری معروضات تطویل کا باعث ہوں گی، تاہم اتنی سی بات کی وضاحت سے قارئین کرام علامہ قرشی کی تنگ ظرفی یا حقیقت سے نا آشنائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو انھوں نے امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ کے ایک حوالے سے بیان کی ہے۔ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ امام مسلم نے جب اپنی یہ کتاب امام ابوزرعہ رازی کو ملاحظے کے لیے پیش کی تو انھوں نے اس پر انکار کیا اور ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

[سَمَّيْتَهُ الصَّحِيحَ فَجَعَلْتَ سُلَّمًا لِأَهْلِ الْبِدَعِ وَغَيْرِهِمْ فَإِذَا رَوٰى لَهُمُ الْمُخَالِفُ حَدِيثًا يَقُولُونَ هٰذَا لَيْسَ فِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ فَرَحِمَ اللّٰهُ أَبَا زُرْعَةَ فَقَدْ نَطَقَ بِالصَّوَابِ ......]

"آپ نے اس کا نام "الصحیح" رکھا ہے اور اہل بدعت وغیرہ کے لیے آپ نے سیڑھی بنا دی ہے کہ جب ان کے خلاف حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہیں گے کہ یہ صحیح مسلم میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ امام ابوزرعہ پر رحمت فرمائے، انھوں نے بالکل درست فرمایا۔"[2]

بلاشبہ یہ بات امام ابوزرعہ نے فرمائی تھی بلکہ اسی قصے میں ساتھ ہی یہ بھی بیان ہوا کہ بالکل یہی بات امام محمد بن مسلم بن وارہ نے بھی کہی تھی۔ راوی کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس کے جواب میں یہ عذر بیان کیا:

[إِنَّمَا أَخْرَجْتُ هٰذَا الْكِتَابَ وَ قُلْتُ هُوَ صِحَاحٌ وَ لَمْ أَقُلْ إِنَّ مَالَمْ أُخْرِجْهُ مِنَ الْحَدِيثِ فِي هٰذَا الْكِتَابِ ضَعِيفٌ]

"میں نے یہ کتاب تیار کی ہے اور کہا ہے کہ یہ احادیث صحیح ہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ جس حدیث کو میں اس کتاب میں نہیں لایا وہ ضعیف ہے۔"[3] (امام محمد بن مسلم نے ان کا عذر قبول کیا۔)

یہی تفصیل علامہ نووی رحمہ اللہ نے مقدمۂ صحیح مسلم (16/1) میں ذکر کی ہے۔ علامہ الجزائری بھی اسے ذکر کر کے فرماتے ہیں: [فَرُفِعَ ذٰلِكَ الْعَتَبُ] کہ "ان کی یہ ناراضی دور ہو گئی۔"[4]

قارئین کرام! غور فرمائیے جس بات کا خدشہ علامہ قرشی نے امام ابوزرعہ سے نقل کیا اسی واقعے میں اس کی مزید

---

① مقدمة شرح مسلم: 16/1. ② كتاب الجامع مع الجواهر: 430/2. ③ تاريخ بغداد: 274/4، والسير: 571/12.
④ توجيه النظر، ص: 91.

تفصیل موجود ہے مگر علامہ قرشی نے اولاً تو اسے ادھورا نقل کیا، ثانیاً امام مسلم کا عذر ان کے معاصرین نے تو قبول کر لیا مگر علامہ قرشی اپنے مسلکی تحفظ میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار.

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ علامہ نووی اور حافظ ذہبی رحمہما اللہ وغیرہما نے ذکر کیا ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے اپنی یہ ''المسند'' امام ابوزرعہ پر پیش کی، انھوں نے اس میں سے جس حدیث میں کسی علت کا اشارہ کیا، میں نے اسے اس میں سے نکال دیا اور جس جس کو صحیح قرار دیا، میں نے اس میں ذکر کیا۔[1] امام مسلم کا یہ بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ امام ابوزرعہ کی صحیح مسلم کے حوالے سے ناراضی کافور ہوگئی تھی بلکہ وہ تو اس کی جمع و تدوین میں معاون بن گئے تھے، مگر افسوس کہ علامہ قرشی کو یا تو اس حقیقت کا علم نہیں ہوا یا اپنے مخصوص رجحانات کی بنا پر اس سے صرف نظر کر گئے ہیں۔

* آمدم برسر مطلب: علامہ قرشی کے حوالے سے بات اختصار کے باوجود اور ان کی صحیح مسلم پر تمام تر ''عنایتوں'' سے صرف نظر کے باوصف طویل ہوگئی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ صحیح مسلم میں جن جن روایات کے بارے میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ ان میں انقطاع پایا جاتا ہے، حافظ رشید الدین العطار نے اس شبہ کا دفاع کیا اور ثابت کیا کہ ان اسانید میں بھی اتصال ثابت ہے اور ان کا وجود صحیح مسلم کی صحت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہے۔ علامہ العطار کے علاوہ علامہ ابن الصلاح نے بھی "صيانة صحيح مسلم من الإخلال والغلط وحمايته من الإسقاط والسقط" کے نام سے ایک مستقل کتاب اسی قسم کے دعویٰ کے جواب میں لکھی جو زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہے۔ علامہ نووی نے بھی مقدمۂ شرح مسلم (ص:14) میں اس کا دفاع کیا، مگر افسوس کہ علامہ قرشی نے حافظ رشید الدین العطار کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں یہ بھی فرمایا: [بَيَّنَهَا الشَّيْخُ مُحِيُّ الدِّينِ فِي أَوَّلِ شَرْحِ صَحِيحِ مُسْلِمٍ] ''ان روایات کو شیخ محی الدین نووی نے شرح صحیح مسلم کی ابتدا میں بیان کیا ہے۔''[2]

اہل علم سے التماس ہے کہ وہ خود شرح صحیح مسلم کا مقدمہ (14/1) ملاحظہ فرمائیں کہ کہیں علامہ نووی رحمہ اللہ نے ان اعتراضات کا تذکرہ ہی کیا ہے یا ان کا جواب بھی دیا ہے؟ امام نووی رحمہ اللہ نے تو صاف طور پر لکھا ہے: [وَهٰنَا يُوهِمُ خَلَلًا فِي ذٰلِكَ، لَيْسَ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ] ''اس سے صحیح مسلم میں خلل کا وہم ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں۔'' مگر اس کے باوجود بھی علامہ قرشی، امام نووی رحمہ اللہ کے کلام کو حافظ رشید الدین العطار کی ہم نوائی میں صحیح مسلم پر ''اعتراض'' کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُون.

---

[1] السير: 568/14. [2] كتاب الجامع: 428/2.

امام دارقطنی کی "الإلزامات والتتبع" کا صحیحین پر اعتراضات کے حوالے سے اکثر ذکر آتا ہے لیکن معترضین امام دارقطنی کی امام بخاری رحمہ اللہ اور الجامع الصحیح کے بارے میں رائے سے یا تو بے خبر ہیں یا دانستہ اس سے اغماض کرتے ہیں۔ پھر وہ شاید اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ ان اعتراضات کا تعلق اکثر و بیشتر اسانید کی فنی نوعیت سے ہے متن حدیث کے حوالے سے بہت کم اعتراضات ہیں۔ "الإلزامات والتتبع" شیخ ابوعبدالرحمٰن مقبل بن ہادی الوادعی رحمہ اللہ کی تحقیق و مراجعت سے عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔ انھوں نے بھی ان اعتراضات کے حوالے سے فرمایا ہے:

[إِنَّ غَالِبَ هٰذِهِ الْاِسْتِدْرَاكَاتِ فِي الصِّنَاعَةِ الْحَدِيثِيَّةِ لَيْسَتْ فِي أَصْلِ الْمَتْنِ]

"یہ استدراکات اکثر حدیث کی فنی نوعیت پر ہیں، اصل متن کے بارے میں نہیں۔"[1]

اسی طرح علامہ محمد انور شاہ کشمیری نے بھی فرمایا:

[ثُمَّ إِنَّ الدَّارَقُطْنِيَّ تَتَبَّعَ عَلَى الْبُخَارِيِّ فِي أَزْيَدَ مِنْ مِائَةِ مَوَاضِعَ وَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يَّتَكَلَّمَ إِلَّا فِي الْإِسْنَادِ بِالْوَصْلِ وَالْإِرْسَالِ غَيْرَ مَوْضِعٍ وَاحِدٍ]

"پھر یہ بات خوب جان لو کہ امام دارقطنی نے بخاری کی سو سے زائد احادیث پر اعتراض کیا ہے مگر وہ متن کے اعتبار سے صرف ایک حدیث پر اعتراض کر پائے باقی اسانید میں اعتراض وصل و ارسال کے اعتبار سے ہے۔"[2]

مگر امر واقع یہ ہے کہ یہ ایک مقام جس کی نشاندہی علامہ کشمیری نے کی ہے، اس میں بھی امام دارقطنی کا اعتراض ہی درست نہیں مگر سر دست ہم یہاں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

ماضی قریب میں شارح سنن ابی داود مولانا شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ نے امام دارقطنی کے اعتراضات کا جواب لکھا جس کا ذکر مولانا ابوالقاسم بنارسی مرحوم نے حل مشکلات البخاری (ص:56، 57) میں کیا ہے۔ مولوی عمر کریم پٹنوی حنفی نے امام بخاری رحمہ اللہ اور الجامع الصحیح کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے میں مستشرقین اور ان کی ذریت منکرین حدیث سے کوئی کم کردار ادا نہیں کیا۔ اس سلسلے کا آغاز اس نے اشتہارات سے کیا۔ پھر "اہل فقہ" امرتسر اور "سراج الاخبار" جہلم میں سلسلہ وار مضامین لکھے، جنھیں 1330ھ/1912ء اور 1332ھ/1914ء میں "الجرح علی البخاري" کے نام سے دو حصوں میں شائع کیا۔ ایک مستقل کتاب الکلام المحکم کے نام سے لکھی اور 1329ھ/1911ء میں شائع کی جس میں صحیح بخاری کے 175 راویوں پر نقد و تبصرہ کیا۔ ان تمام کا جواب مولانا ابوالقاسم بنارسی رحمہ اللہ نے مختلف ناموں

---

1 مقدمة الإلزامات، ص:6. 2 فيض الباري:75/1.

سے سات کتابوں میں دیا۔ ان تمام کتابوں کو ''دفاع صحیح بخاری'' کے نام سے 2009ء میں ہمارے فاضل دوست مولانا حافظ شاہد محمود، فاضل مدینہ یونیورسٹی نے تحقیق و تعلیق سے ام القریٰ پبلی کیشنز گوجراں والا سے شائع کر دیا ہے جو ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بارے میں اگر کہا جائے کہ یہ کتاب صحیح بخاری کے بارے میں جدید و قدیم تمام اعتراضات کے جواب میں کافی و شافی ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اسی طرح مستشرقین اور ان کی معنوی ذریت نے بھی جن احادیث کو تختۂ مشق بنایا علمائے حق نے ان کے ایک ایک اعتراض کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا جس کی داستان طویل ہے۔

○ **ایک غلط فہمی کا ازالہ:** امام دارقطنی وغیرہ کے صحیح بخاری پر اعتراضات کا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمۂ فتح الباری میں دیا ہے مگر کہا جاتا ہے کہ بعض مقامات پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس اعتراض کا جواب مشکل ہے، چنانچہ کتاب الذبائح کے تحت مقدمۂ فتح الباری (ص:376) میں حدیث 83 کے تحت امام دارقطنی کا اعتراض کہ اس کی سند میں اضطراب ہے، نقل کر کے فرمایا ہے: [وَ عِلَّتُهُ ظَاهِرَةٌ وَالْجَوَابُ عَنْهُ فِيهِ تَكَلُّفٌ وَ تَعَسُّفٌ] ''اس کی علت ظاہر ہے اور اس کا جواب تکلف و تعسف ہے۔''

شیخ مقبل بن ہادی الوادعی نے بھی "مقدمة الإلزامات والتتبع" (ص:11) میں کہا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام دارقطنی کے اعتراض کو درست قرار دیا ہے۔ بلاشبہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمۂ فتح الباری میں اس اعتراض کے جواب کو تکلف قرار دیا ہے مگر حقیقت الامر میں اس اضطراب کے جواب میں کوئی تکلف نہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ فتح الباری، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمۂ فتح الباری کے بعد تصنیف کی تھی اور فتح الباری (633،632/9) میں اس اضطراب کا صحیح حل بیان کر دیا ہے جس میں تکلف کا کوئی شائبہ نہیں۔ ہم اس کی وضاحت اپنی مطبوع ''امام بخاری رحمہ اللہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ (ص:121،119) میں بیان کر چکے ہیں۔ والحمد لِله على ذلك.

شیخ محمد بن الحسن الحجری نے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی ان سات روایات پر اعتراضات کا جواب دیا ہے جنھیں بعض عقل و درایت کے منافی قرار دیتے ہیں اور اس کا نام "الدفاع عن الصحيحين دفاع عن الإسلام" رکھا ہے۔ اسی طرح شیخ ابوسفیان مصطفیٰ باحو نے "الأحاديث المنتقدة في الصحيحين" کے عنوان سے صحیحین کی 396 احادیث پر بحث کی ہے اور ان پر عائد شدہ اعتراضات کا جواب دیا ہے، البتہ انھوں نے فرمایا ہے کہ ان تمام روایات میں سے 15 احادیث ایسی ہیں جو معلول ہیں اور میں ان کی تقریب میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان 15 احادیث میں تین صحیح بخاری کی اور باقی صحیح مسلم کی ہیں۔

صحیح بخاری کی جن تین روایات کے بارے میں انھوں نے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے ان میں ایک حدیث معراج ہے جو شریک بن عبداللہ بن ابی نمر عن انس سے مروی ہے، دوسری ابوحازم عن سہل بن سعد سے: [رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰه] کے الفاظ سے اور تیسری ابی بن عباس بن سہل عن ابیہ عن جدہ سے کہ [كَانَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فِي حَائِطِنَا فَرَسٌ] یہاں ان تینوں روایات کے بارے میں کچھ وضاحت قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

پہلی حدیث: یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے كِتَابُ التَّوْحِيدِ، بَابُ مَاجَاءَ فِي قَوْلِهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا﴾ میں ذکر کی ہے، یعنی اس باب میں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ اس کے ثبوت میں پہلی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں اور دوسری اسی دعویٰ کی تائید میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اور تیسرے نمبر پر یہی شریک بن عبداللہ بن ابی نمر کی حدیث لائے ہیں جس میں موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں [بِفَضْلِ كَلَامِهِ لِلّٰهِ] اور بعض روایات میں [بِتَفْضِيلِ كَلَامِ اللّٰهِ] کے الفاظ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی فضیلت حاصل ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [هِيَ مُرَادُ التَّرْجَمَةِ] ترجمۃ الباب میں یہی جملہ اصل مراد ہے۔[1]

اس روایت کے بعض الفاظ میں تفرد کی بنا پر بعض حضرات نے اس پر کلام کیا ہے، تاہم یہ بات قطعاً نہیں کہ پوری روایت پر تنقید کی گئی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ جس نے یہ سمجھا بہرحال غلط سمجھا۔ انھوں نے شریک بن عبداللہ کو بلاجواز مجروح قرار دیا۔ اس کی دلچسپ تفصیل ہم عرصہ ہوا ''احادیث صحیح بخاری و مسلم میں پرویزی تشکیک کا علمی محاسبہ'' میں بیان کر چکے ہیں۔ علامہ ابن حزم وغیرہ نے اگر اس روایت کے بعض اجزاء پر اعتراض کیا ہے تو اس کا جواب علامہ ابوالفضل ابن طاہر نے ایک مستقل رسالہ ''الانتصار لائمة الأمصار'' میں دیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس سے نقل کیا ہے:

> ''شریک کے تفرد کی بنا پر اسے معلول قرار دینا اور ابن حزم کا کہنا کہ آفت اسی کی جانب سے ہے، ایسی بات ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی۔ شریک کو ائمۂ جرح و تعدیل نے قبول کیا ہے اور اسے ثقہ کہا ہے، اس سے روایت کی ہے، اپنی تصانیف میں اس کی احادیث ذکر کی ہیں اور اس سے استدلال کیا ہے۔ امام یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ لَابَأْسَ بِهِ۔ ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ اہل مدینہ کے مشاہیر میں سے ہے اور اس سے امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ ثقات نے حدیث لی ہے اور جب اس سے ثقہ روایت کرے تو اس کی حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ حدیث اس سے سلیمان بن بلال نے بیان کی ہے جو ثقہ ہے۔ اگر ہم اس کا تفرد تسلیم

[1] فتح الباري: 482/13.

بھی کر لیں تو اس کا تقاضا یہ نہیں کہ اس کی حدیث ترک کر دی جائے کیونکہ ثقہ کا کسی حدیث میں وہم اس کی پوری حدیث کو ساقط قرار دینے کا باعث نہیں بالخصوص جبکہ وہم سے کوئی ارتکاب محذور لازم نہ آئے۔ اگر ثقہ راوی کے وہم کی بنا پر پوری حدیث ترک کر دی جائے تو ائمۂ مسلمین کی ایک جماعت کی حدیث ترک کرنی پڑے گی......'' الخ.[1]

امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ امام مسلم نے بھی مختصراً یہ روایت ''المسند الصحیح'' میں بیان کی اور فرمایا: [قَدَّمَ فِيهِ شَيْئًا وَّ أَخَّرَ وَزَادَ وَ نَقَصَ] ''راوی نے اس میں کچھ چیزوں کو آگے پیچھے ذکر کیا ہے اور بعض چیزوں کا اضافہ اور بعض میں کمی کی ہے۔'' گویا امام مسلم رحمہ اللہ نے تو خود ہی اس کے بعض حصوں میں کمی بیشی کا اظہار کیا ہے لیکن ان کی بنا پر پوری روایت کو معلول قرار نہیں دیا۔ یہی بات حافظ ابوالفضل ابن طاہر نے فرمائی ہے۔

* امام بخاری رحمہ اللہ کا اسلوب: امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود بھی اس روایت سے جیسا کہ ہم عرض کر آئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنے کا ثبوت ہے۔ اور وہ بھی اسے ترجمۃ الباب میں نہیں بلکہ شواہد کے طور پر لائے ہیں۔ معراج کا پورا قصہ اور اس کا اثبات امام بخاری رحمہ اللہ کا یہاں قطعاً مقصود نہیں۔ قصۂ معراج کے لیے تو کتاب مناقب الأنصار کے تحت بَابُ الْمِعْرَاجِ میں قتادہ عن انس بن مالک سے حضرت مالک بن صعصعہ کی حدیث لائے ہیں جس میں کوئی اشکال نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اسلوب یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت کے جس حصے میں راوی کا وہم ہوتا ہے اسے بطورِ استدلال ذکر نہیں کرتے۔ وہ روایت بحیثیت مجموعی صحیح ہوتی ہے اور وہی ان کا مقصود اور مطلوب ہوتی ہے جیسا کہ اس حدیث میں شریک کے بارے میں ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح بَابُ مَنَاقِبِ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث (3696) میں ولید بن عقبہ کو حد شراب کے اَسّی کوڑے لگانے کا ذکر ہے اور بَابُ هِجْرَةِ الْحَبَشَةِ میں اسی روایت میں چالیس کوڑوں کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ اَسّی کوڑوں کے ذکر میں شعیب بن سعید کا وہم ہے۔[2] دونوں ابواب میں ظاہر ہے حد کا بیان کرنا قطعاً مقصود نہیں۔ اس حدیث کا تعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی منقبت سے ہے اور اس میں چونکہ دو ہجرتوں کا ذکر ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ اسے بَابُ هِجْرَةِ الْحَبَشَةِ میں بھی لائے ہیں۔ ''حدود'' میں روایت کے اختلاف کی وجہ سے نہیں لائے بلکہ وہاں بَابُ مَاجَاءَ فِي ضَرْبِ شَارِبِ الْخَمْرِ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرب خمر میں چھڑی اور جوتے سے مارا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چالیس کوڑے لگوائے۔ (حدیث: 6773)

---

[1] فتح الباري:13/485. [2] فتح الباري:7/57.

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مسيء صلاۃ والی حدیث:(757) بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ میں لائے ہیں۔ یہی روایت کِتَابُ الْاِسْتِئْذَان، بَابُ مَنْ رَدَّ فَقَالَ عَلَيْكَ السَّلَامُ میں مختصراً بھی لائے ہیں جس میں [ثُمَّ ارْفَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا] کا ذکر ہے (رقم:6252) اور خود امام صاحب نے اس میں راوی کے تفرد کا اشارہ کیا ہے۔ اسی لیے جلسۂ استراحت کے لیے اسے ذکر نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ کے لیے بَابُ مَنِ اسْتَوٰى قَاعِدًا فِي وِتْرٍ میں حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں۔ (رقم:823)

مزید دیکھیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث (755) ذکر کی ہے جس میں اہل کوفہ کا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر اعتراض حتی کہ ان کی نماز کے بارے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کا ذکر ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے استفسار پر نماز کے متعلق حضرت سعد نے فرمایا: [أُصَلِّي صَلَاةَ الْعِشَاءِ] ''میں انھیں عشاء کی نماز پڑھاتا ہوں۔'' مگر یہی روایت امام بخاری رحمہ اللہ اختصار سے بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الظُّهْرِ (حدیث:758) کے تحت بھی لائے ہیں جس میں [صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ] کا ذکر ہے کہ میں انھیں ظہر وعصر کی نماز پڑھاتا تھا۔'' دونوں روایتیں "أبو عوانه قال نا عبدالملك بن عمير عن جابر" کی سند سے ہیں، البتہ پہلے باب میں ابوعوانہ سے روایت کرنے والے موسیٰ بن اسماعیل ہیں جبکہ دوسرے میں ابونعمان ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ راجح صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ کے الفاظ ہیں کیونکہ امام ابوداود طیالسی نے بھی ''ابوعوانہ'' سے یہی الفاظ نقل کیے ہیں بلکہ معمر اور زائدہ بھی عبدالملک بن عمیر سے یہی نقل کرتے ہیں۔[1] یہی بات علامہ عینی نے بھی عمدة القاری (6/6) میں کہی ہے۔

ضروری تنبیہ: یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ فتح الباری کا جو نسخہ المطبعة السلفية سے طبع ہوا ہے اس میں حتی کہ مطبوعۂ دارالسلام میں بھی یہ دوسری حدیث پہلے باب میں ہی درج ہو گئی ہے، حالانکہ پہلے باب کی حدیث (755) کی شرح میں صَلَاةَ الْعِشَاءِ کے تحت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صاف طور پر لکھا ہے: [وَفِي الْبَابِ الَّذِي بَعْدَهُ: صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ] کہ ''اس باب کے بعد والے باب میں "صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ" ہے۔'' اس لیے فتح الباری کے ان نسخوں میں دوسری حدیث سے پہلے بَابُ الْقِرَاءَةِ فِي الظُّهْرِ کا باب ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس سے بعد کی حدیث (759) سے پہلے لکھا گیا ہے۔

غور فرمائیے یہاں بھی وہی معاملہ ہے جس کا اشارہ ہم نے پہلے کیا ہے۔ امام صاحب نے دوسرے باب میں ظہر

---

① فتح الباري:238/2.

کی نماز میں قراءت کے ثبوت کے لیے راجح الفاظ صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ ہی ذکر کیے ہیں۔ پہلے باب میں امام اور مقتدی کی قراءت کے ثبوت میں اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور اس میں صَلَاۃَ الْعِشَاءِ کے الفاظ مدار استدلال نہیں ہیں۔ فَتَدَبَّرْ.

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب المناقب کے آخری باب میں، جو بلاعنوان ہے، حضرت عروہ البارقی کی ایک حدیث (3642) ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دینار دیا تاکہ میں بکری خرید لاؤں...... الخ۔ یہ روایت انھوں نے شَبِیب بن غرقدة قال: سمعت الحي يتحدثون عن عروة کی سند سے ذکر کی ہے۔ اس کے بعد سفیان سے بیان کرتے ہیں کہ حسن بن عمارہ [1] ہمارے پاس آئے تو انھوں نے یہ حدیث بیان کی اور شبیب کے عروہ سے براہ راست سماع کا ذکر کیا، مگر میں شبیب سے ملا تو انھوں نے فرمایا: میں نے یہ حدیث عروہ سے نہیں سنی بلکہ قبیلے کے افراد کے واسطے سے سنی ہے۔ البتہ میں نے عروہ سے یہ سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [اَلْخَيْرُ مَعْقُودٌ بِنَوَاصِي الْخَيْلِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ] امام شافعی، بیہقی، خطابی، ابن قطان وغیرہ نے کہا ہے کہ بکری کے خریدنے سے متعلق روایت صحیح نہیں کیونکہ یہ متصل نہیں، قبیلے کے افراد کا نام مذکور نہیں۔

علامہ منذری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود بکری کی خرید سے متعلق حصہ نہیں بلکہ آخری حصہ ان کا مقصود ہے جو متصل ہے اور وہ [اَلْخَيْرُ مَعْقُودٌ بِنَوَاصِي الْخَيْلِ] ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد یہ حصہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر، انس بن مالک اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے امام علی بن مدینی رحمہ اللہ سے جیسے یہ مکمل طور پر سنی اسی طرح بیان کر دی۔ اگر بکری کی خرید و فروخت سے متعلقہ حصہ ان کا مقصود ہوتا تو اسے کتاب البیوع اور کتاب الوکالہ میں ذکر کرتے۔ [2]

یہی بات علامہ ابن قطان نے کہی ہے۔ علامہ زیلعی نے بھی نصب الرایہ (92,91/4) میں علامہ منذری اور علامہ ابن القطان کا کلام ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے گو فتح الباری میں اس کے دفاع کی کوشش کی ہے مگر تہذیب (307/4) میں ان کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ابن القطان سے متفق ہیں۔ اس روایت کے بارے میں علامہ منذری اور علامہ ابن قطان کی یہ تصریحات اس بات کا ثبوت ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے شیوخ سے جیسے سنا ہوتا اسی طرح روایت ذکر کر دیتے گو اس میں بعض الفاظ ان کے نزدیک درست نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ وہ الفاظ امام

---

1 حسن بن عمارہ پر علامہ المزی کی متابعت میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب میں ''خت'' کی علامت لگائی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً اس سے روایت لی ہے، حالانکہ تہذیب (ص:307/2) میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ [لَمْ يُعَلِّقْ لَهُ الْبُخَارِيُّ شَيْئًا] ''امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے کچھ بھی تعلیقاً روایت نہیں کیا۔'' مگر افسوس ہے تقریب التہذیب میں اس کے برعکس پھر ''خت'' کی علامت ذکر کر دی گئی ہے۔ 2 مختصر السنن: 51/5.

بخاری رحمہ اللہ کا مقصود نہیں ہوتے ہیں اور نہ انھیں معرض استدلال ہی میں لاتے ہیں۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے تفسیر سورۂ قٓ (حدیث:4850) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے جس میں آیا ہے: ''جنت کو بھرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کرے گا۔'' مگر صحیح بخاری ہی میں ایک اور سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جہنم نہیں بھرے گی تا آنکہ اللہ تعالیٰ نئی مخلوق پیدا کرے گا اور اسے جہنم میں ڈالے گا۔[وَإِنَّهُ يُنْشِيءُ لِلنَّارِ مَنْ يَشَاءُ فَيُلْقَوْنَ فِيهَا.] (صحيح البخاري، التوحيد، حديث:7449) ظاہر ہے کہ یہ حدیث پہلی حدیث کے مخالف ہے۔ پہلی حدیث میں جنت کو بھرنے کے لیے مزید مخلوق پیدا کرنے کا ذکر ہے جبکہ دوسری حدیث میں جہنم کے لیے مزید مخلوق پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ یہ حدیث معنوی اعتبار سے بھی محل نظر ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے عدل کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی پر ظلم نہیں کرتا تو ایک مخلوق کو پیدا کر کے بلا جرم جہنم میں ڈال دینا کیونکر ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ اگر بلا جرم سزا دے تو وہ اس پر قادر ہے۔ ایسا کرنے سے بھی کوئی اس سے سوال کی جرأت نہیں کر سکتا، مگر یہ محض امکان کی حد تک ہے۔ اہل سنت اس کے وقوع کے قائل نہیں۔ اہل علم نے اس اشکال کا ایک سیدھا سا جواب یہ دیا ہے کہ اس دوسری روایت میں راوی سے خطا ہوئی اور روایت میں قلب ہو گیا۔ اصول حدیث کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مقلوب کہتے ہیں۔ اصل روایت میں تو جنت کے لیے نئی مخلوق پیدا کر کے اسے جنت میں داخل کرنے کا ذکر ہے مگر راوی کی غلطی سے اس کا ذکر جہنم کے بارے میں ہو گیا۔ مزید تفصیل فتح الباری (437/13) میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس دوسری روایت میں آپ قلب کہیں یا راوی کی غلطی، بہر حال یہ غلطی ہے اور صحیح بخاری میں ہے، مگر امام بخاری رحمہ اللہ کے جس اسلوب کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس اعتبار سے یہ اعتراض کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ امام صاحب نے یہ حدیث بَابُ إِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ میں ذکر کی ہے اور حدیث میں: [فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى لِلْجَنَّةِ أَنْتِ رَحْمَتِي] ''اللہ تعالیٰ جنت سے فرمائے گا کہ تو میری رحمت ہے۔'' اللہ تعالیٰ کی رحمت پر استدلال ہے، جبکہ حدیث کا قابل اعتراض جملہ امام صاحب کی غرض اور مقصود کے منافی نہیں ہے۔ انھوں نے یہ جیسے شیوخ سے سنا بیان کر دیا، اس سے ان کا کوئی استدلال ہوتا تو سورۂ قٓ کی تفسیر میں بَابُ قَوْلِهِ: ﴿وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کے تحت ذکر کرتے جس میں جہنم کی وسعت کا ذکر ہے کہ جہنم میں سب مجرموں کو ڈال دیا جائے گا، وہ نہیں بھرے گی تو مزید مخلوق پیدا کر کے جہنم میں ڈالی جائے گی۔ وہاں اس جملے کو ذکر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جملہ امام صاحب کا قطعاً مطلوب استدلال نہیں، اس لیے یہی حدیث ایک اور باب میں لائے جہاں مقصود اللہ کی رحمت کا بیان ہے۔

امام صاحب کے اس اسلوب کو نہ سمجھنے والے حضرات بعض ایسی روایات پر جو اعتراض کرتے ہیں، وہ بہر حال عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ یہی حقیقت شریک بن عبداللہ بن ابی نمر کی حدیث معراج سے متعلق ہے۔ بلاشبہ اس کے بعض الفاظ میں اس سے وہم ہوا مگر امام صاحب کا یہ مطلوب نہیں اور نہ اس سے قصۂ معراج بیان کرنا مقصود ہے۔ انھی جیسی روایات کے بارے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: [فَإِنَّهُ أَبْعَدُ الْكِتَابَيْنِ عَنِ الْإِنْتِقَادِ، وَلَا يَكَادُ يَرْوِي لَفْظًا فِيهِ انْتِقَادٌ إِلَّا وَيَرْوِي اللَّفْظَ الْآخَرَ الَّذِي يُبَيِّنُ أَنَّهُ مُنْتَقَدٌ فَمَا فِي كِتَابِهِ لَفْظٌ مُنْتَقَدٌ إِلَّا وَفِي كِتَابِهِ مَايُبَيِّنُ أَنَّهُ مُنْتَقَدٌ] ''صحیح بخاری، دونوں کتابوں (بخاری و مسلم) میں سے تنقید سے بعید تر ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کوئی ایسا لفظ روایت نہیں کرتے جس میں تنقید ہوئی مگر دوسرا لفظ بھی روایت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس پر تنقید ہوئی ہے، چنانچہ اس میں کوئی لفظ تنقید والا ایسا نہیں مگر اسی کتاب میں ہی اس کی وضاحت ہے کہ اس پر تنقید ہے۔''[1]

لہٰذا اگر کسی ثقہ یا صدوق راوی سے کوئی حدیث بیان کرتے ہوئے کسی لفظ یا جملے میں خطا ہوئی ہے تو وہی لفظ ناقابل اعتماد قرار پائے گا۔ ایسا نہیں کہ مکمل روایت ہی کو ضعیف اور ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے، لہٰذا شریک بن عبداللہ کی حدیث معراج کو علی الاطلاق ضعیف قرار دینا قطعاً صحیح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے شریک کے وہم کا اشارہ کرنے کے باوجود اسے کتاب میں درج کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی اس میں کلام درست نہیں۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد بھی اس سے واقعۂ معراج کی تفصیل بیان کرنا قطعاً نہیں، اس لیے اس پر اعتراض بہر نوع درست نہیں۔ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر صحیح بخاری میں صرف اسی حدیث کا راوی نہیں بلکہ ڈیڑھ درجن مقامات کے قریب امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی روایات لی ہیں بلکہ ان میں بعض وہ روایات بھی ہیں جنھیں ترجمۃ الباب کے تحت بطور استدلال امام بخاری رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے، اس لیے شریک کے بارے میں مجروح ہونے کا تأثر جہاں غلط ہے وہاں اس کی روایت کو ناقابل استدلال سمجھنا بھی قطعاً غلط ہے۔ اس سے اگر کسی روایت میں غلطی ہوئی ہے تو اس کا یہ نتیجہ بالکل درست نہیں کہ اس کی دیگر روایات پر بھی خط نسخ کھینچ دیا جائے۔

دوسری حدیث: دوسری حدیث جس کے بارے میں شیخ ابوسفیان مصطفیٰ باحو نے فرمایا ہے کہ اس میں علت قادحہ پائی جاتی ہے، وہ صحیح بخاری كِتَابُ الْجِهَادِ، بَابُ فَضْلِ رِبَاطِ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ میں حدیث نمبر: 2892 کے تحت ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار عن أبي حازم، عن سهل بن سعد کی سند سے نقل کیا ہے جس کے الفاظ ہیں:

---

1 منهاج السنة: 59/4.

[رِباطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَمَوْضِعُ سَوْطِ أَحَدِكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا...... الخ)

''اللہ کے راستے میں ایک دن پہرہ دینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور تم میں سے کسی کے کوڑے کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔''

امام دارقطنی ؒ نے اس روایت کے بارے میں الإلزامات و التتبع میں فرمایا ہے:

[رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَ مَا فِيهَا» لَمْ يَقُلْ هٰذَا غَيْرُ عَبْدِالرَّحمٰنِ، وَغَيْرُهُ أَثْبَتُ، وَ بَاقِي الْحَدِيثِ صَحِيحٌ]

''رباط يوم...... کے الفاظ عبدالرحمٰن کے علاوہ اور کسی نے نہیں کہے، دوسرے راوی اس سے أثبت ہیں۔ اور باقی حدیث صحیح ہے۔''[1]

عبدالرحمٰن کے علاوہ سفیان اور عبدالعزیز بن ابی حازم کی احادیث صحیح بخاری (رقم: 2794, 3250, 6415) میں ہی ہیں اور ان میں ابتدائی حصہ نہیں۔ اسے بیان کرنے میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ متفرد ہے اور وہ متکلم فیہ ہے۔ یہ ہے اعتراض کا خلاصہ۔ اب حقیقت حال ملاحظہ فرمائیے

① امام بخاری ؒ کے علاوہ یہی حدیث عبدالرحمٰن بن عبداللہ سے امام ترمذی ؒ نے بھی اپنی الجامع (رقم:1664) میں ذکر کی ہے اور اسے ''حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ تنہا امام بخاری ؒ کا اس سے استدلال ہی اس کی صحت کے لیے کافی دلیل ہے، تاہم امام ترمذی کی تحسین و تصحیح سے امام بخاری ؒ کی تائید ہوتی ہے۔

② رہے اس روایت کے راوی تو اس کے بارے میں جو جرح بیان کی جاتی ہے وہ حسب ذیل ہے: ○ امام ابن معین نے فرمایا ہے: [فِي حَدِيثِهِ عِنْدِي ضُعْفٌ] ''میرے نزدیک اس کی حدیث میں ضعف ہے۔'' ○ امام ابوحاتم نے کہا ہے: [فِيهِ لِينٌ يُكْتَبُ حَدِيثُهُ وَلَا يُحْتَجُّ بِهِ] ''اس میں کمزوری ہے، اس کی حدیث لکھی جائے گی لیکن اس سے حجت نہیں پکڑی جائے گی۔'' ○ دارقطنی نے کہا ہے: [خَالَفَ فِيهِ الْبُخَارِيُّ النَّاسَ وَلَيْسَ بِمَتْرُوكٍ] ''اس میں بخاری نے لوگوں کی مخالفت کی ہے لیکن یہ متروک نہیں ہے۔'' ○ ابن عدی نے کہا ہے: [بَعْضُ مَايَرْوِيهِ مُنْكَرٌ لَا يُتَابَعُ عَلَيْهِ وَهُوَ فِي الْجُمْلَةِ مَنْ يُكْتَبُ حَدِيثُهُ مِنَ الضُّعَفَاءِ] ''اس کی بعض مرویات منکر ہیں جن کی متابعت نہیں ہے، مختصراً یہ ان ضعیف راویوں میں سے ہے جن کی حدیث لکھی جائے گی۔'' ○ امام الحربی نے کہا ہے: [غَيْرُهُ أَوْثَقُ مِنْهُ] ''اس

① الإلزامات و التتبع، ص:201، رقم:71.

کے دیگر ساتھی اس سے زیادہ ثقہ ہیں۔'' یہ ہے وہ جرح جو عموماً عبدالرحمٰن کے بارے میں منقول ہے، مگر یہ جرح ایسی نہیں جس سے اس کی حدیث مردود اور ضعیف قرار دی جائے۔

* امام ابن معین کی جرح کے بارے میں تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: [أَنَّ قَوْلَ ابْنِ مَعِينٍ فَلَمْ يُفَسِّرْهُ وَ لَعَلَّهُ عَنٰى حَدِيثًا مُعَيَّنًا] ''امام ابن معین کی جرح مفسر نہیں، شاید انھوں نے کوئی معین حدیث مراد لی ہے۔''[1] جس کے بارے میں انھوں نے فرمایا ہے کہ اس کی حدیث میرے نزدیک ضعیف ہے، لہٰذا جب یہ جرح ہی مفسر نہیں تو تعدیل کے مقابلے میں اس کا اعتبار اصولاً درست نہیں ہے، بالخصوص جبکہ وہ متشدد بھی ہیں۔

* رہا امام ابوحاتم کا یہ فرمانا: [فِيهِ لِينٌ يُكْتَبُ حَدِيثُهُ وَلَا يُحْتَجُّ بِهٖ] تو اولاً یہ جرح بھی مفسر نہیں۔ امام ابوحاتم کا تشدد اپنی جگہ معروف ہے۔ يُكْتَبُ حَدِيثُهُ وَلَا يُحْتَجُّ بِهٖ کے الفاظ تو وہ ثقہ صدوق راویوں کے بارے میں بھی کہہ دیتے ہیں۔ علامہ زیلعی نے ذکر کیا ہے:

[قَوْلُ أَبِي حَاتِمٍ: "لَا يُحْتَجُّ بِهٖ" غَيْرُ قَادِحٍ فَإِنَّهٗ لَمْ يَذْكُرِ السَّبَبَ، وَقَدْ تَكَرَّرَتْ هٰذِهِ اللَّفْظَةُ مِنْهُ فِي رِجَالٍ كَثِيرِينَ مِنْ أَصْحَابِ الصَّحِيحِ الثِّقَاتِ الْأَثْبَاتِ مِنْ غَيْرِ بَيَانِ السَّبَبِ كَخَالِدِ الْحَذَّاءِ وَغَيْرِهٖ]
''امام ابوحاتم کا لا يحتج به کہنا قادح نہیں کیونکہ انھوں نے سبب ذکر نہیں کیا۔ یہ لفظ ان سے بہت سے اصحاب الصحیح کے ثقہ راویوں پر بلا سبب وارد ہوا ہے جیسا کہ خالد الحذاء وغیرہ پر۔''[2]

تقریباً یہی بات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ ملاحظہ ہو: مجموع الفتاویٰ (350/24)۔ علامہ زیلعی ایک اور مقام پر بہز بن حکیم کے بارے میں امام ابوحاتم کے انھی الفاظ کے متعلق لکھتے ہیں: [وَقَوْلُ أَبِي حَاتِمٍ "لَا يُحْتَجُّ بِهٖ" لَا يَنْبَغِي أَنْ يُقْبَلَ عَنْهُ إِلَّا بِحُجَّةٍ] ''ابوحاتم کا لا يحتج به کہنا بلا دلیل قبول کرنا مناسب نہیں۔''[3] اس لیے توثیق کے مقابلے یہ قول بھی مرجوح ہے۔

* امام دارقطنی کا فرمانا: ''امام بخاری نے اس (عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار سے روایت لینے) میں لوگوں کی مخالفت کی ہے، البتہ وہ متروک نہیں۔'' یہ قول ابوعبدالرحمٰن السلمی کے واسطے سے منقول ہے۔ سوالات الحاکم، رقم: 379 میں امام دارقطنی کے الفاظ ہیں: [إِنَّمَا حَدَّثَ بِأَحَادِيثَ يَسِيرَةٍ وَ قَدِ احْتَجَّ الْبُخَارِيُّ بِهٖ وَ غَمَزَهٗ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ] ''اس نے صرف چند ایک احادیث بیان کی ہیں۔ بخاری نے اس سے حجت پکڑی ہے جبکہ یحییٰ بن سعید نے اس پر نقد کیا ہے۔'' جبکہ سوالات البرقانی (رقم: 275) میں ان کے الفاظ ہیں: [أَخْرَجَ عَنْهُ الْبُخَارِيُّ وَهُوَ عِنْدَ غَيْرِهٖ

---

1 فتح الباري: 430/12. 2 نصب الرايه: 179/1. 3 نصب الرايه: 310/3.

ضَعِيفٌ فَيُعْتَبَرُ بِهِ] ''بخاری نے اس سے روایات لی ہیں۔ بخاری کے علاوہ دوسروں کے نزدیک یہ ضعیف ہے، لہٰذا اعتباراً اسی سے روایت لی جائے گی۔'' ان تینوں روایات میں ان کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دارقطنی عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار سے استدلال کو درست نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ جو انھوں نے فرمایا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر محدثین کے نزدیک وہ ضعیف ہے اور امام یحییٰ بن سعید نے اس پر نقد کیا ہے، محل نظر ہے، جبکہ امام یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت لی ہے، اور اسی سے بعض ائمۂ کرام نے عبدالرحمٰن کی توثیق سمجھی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر ائمۂ محدثین نے بھی اس کی توثیق کی ہے اور اس کی حدیث سے استدلال کیا ہے جیسا کہ کلماتِ توثیق میں ہم ذکر کریں گے۔ إن شاء اللّٰه.

یہاں یہ بات بجائے خود غور طلب ہے کہ امام دارقطنی کی یہ رائے امام یحییٰ بن سعید کے نقد کے تناظر میں ہے جیسا کہ انھوں نے غمزه يحيى بن سعيد، فرمایا ہے، یا یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے؟ امام یحییٰ بن سعید کے قول کی بنا پر اگر ان کی رائے ہے تو پھر یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ بنیاد ہی بے بنیاد ہے جیسا کہ آئندہ ہم عرض کریں گے۔ اگر یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے تو پھر امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ کا اجتہاد ان سے بہرحال مقدم اور راجح ہے۔

✱ امام ابن عدی کی جرح میں عبدالرحمٰن کے تفردات اور اس کے ضعیف ہونے کا اشارہ ہے۔

✱ امام حربی کا کہنا کہ [غَيْرُهُ أَوْثَقُ مِنْهُ] جرح میں صریح نہیں کیونکہ اس جملے کا اطلاق کبھی ثقہ اور راوی "أوثق منه" کے تقابل میں بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد تضعیف نہیں ہوتی ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تہذیب (76/6) میں عبداللہ بن واقد کے ترجمے میں کہا ہے کہ امام الجریری جب یہ جملہ بولتے ہیں تو اس سے شدید ضعف مراد ہوتا ہے۔ تہذیب میں ان الفاظ جرح کے علاوہ امام بن حبان نے اسے فَاحِشُ الخطأ اور ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔[1] اور امام ابوزرعہ نے بھی لَيْسَ بِذَاكَ کہا ہے (سؤالات البرذعي لأبي زرعة:443/2) جس میں قلت حفظ وضبط کا اشارہ ہے۔ اس جرح کے برعکس عبدالرحمٰن کی توثیق حسب ذیل محدثین سے منقول ہے:

○ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی احادیث سے استدلال کیا ہے جیسا کہ امام دارقطنی کے کلام میں گزرا ہے۔ امام حاکم نے بھی المدخل إلى الصحيح (215/4) میں کہا ہے کہ امام بخاری نے اس سے وضو، جہاد اور دیگر کئی مقامات میں استدلال کیا ہے۔

○ امام یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت لی ہے جیسا کہ المجروحین (51/2) میں ہے کہ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: [قَدْ حَدَّثَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْقَطَّانُ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ...... فَحَسْبُهُ أَنْ يُحَدِّثَ عَنْهُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ]

---

[1] المجروحین: 51/2.

''عبدالرحمٰن سے یحییٰ بن سعید نے روایت لی ہے۔ عبدالرحمٰن کے لیے یہی کافی ہے کہ یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت لی ہے۔''[1] یہ قول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی تہذیب (206/2) میں ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام یحییٰ بن معین اس سے عبدالرحمٰن کی توثیق مراد لیتے ہیں، اس لیے انھوں نے جو عبدالرحمٰن کے بارے میں کہا ہے کہ [فِي حَدِيثِهٖ عِنْدِي ضُعْفٌ] اس سے کوئی خاص حدیث مراد ہو سکتی ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے ہم نقل کر آئے ہیں۔

- علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [حَدَّثَ عَنْهُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ مَعَ تَعَنُّتِهٖ فِي الرِّجَالِ] راویوں کے بارے میں تشدد کے باوجود یحییٰ بن سعید نے اس سے روایت لی ہے۔''[2] اسی سے امام دارقطنی کے اس قول کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ''غَمَزَهٗ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ'' حالانکہ جرح نہیں بلکہ عبدالرحمٰن سے امام یحییٰ نے روایت لی ہے اور امام ابن معین وغیرہ نے اسی کو عبدالرحمٰن کے قابل اعتماد ہونے کے لیے کافی قرار دیا ہے۔
- امام علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (صَدُوقٌ)[3]
- امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [لَا بَأْسَ بِهٖ مُقَارِبُ الْحَدِيثِ][4]
- الآجری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے امام ابوداود سے عبدالرحمٰن کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: [حَدَّثَ عَنْهُ يَحْيَى الْقَطَّانُ] ''اس سے یحییٰ قطان نے روایت لی ہے۔''[5] ظاہر ہے امام ابوداود نے بھی اس سے توثیق مراد لی ہے۔ امام ابوداود کا سنن، (رقم:2858) میں اس کی روایت سے استدلال بھی اس کا مؤید ہے۔
- امام ترمذی رحمہ اللہ نے الجامع (رقم:1664) میں اسی زیر بحث روایت کو حسن صحیح قرار دیا ہے جو عبدالرحمٰن کی توثیق پر دال ہے۔
- امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی السنن میں (حدیث: 5245,2484) اس سے استدلال کیا ہے جو ان کے نزدیک عبدالرحمٰن کی توثیق کی علامت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے: [اِحتَجَّ بِهِ الْبُخَارِيُّ وَ أَبُودَاوُدَ وَ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ] ''امام بخاری، ابوداود، نسائی اور ترمذی رحمہم اللہ نے اس سے حجت پکڑی ہے۔''[6]
- امام ابوالقاسم البغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''وہ صالح الحدیث ہے۔''[7]
- علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''صالح الحدیث'' قرار دیا ہے۔[8] اور ذِكْرُ مَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ وَهُوَ مُوَثَّقٌ (رقم:207)

---

1 ميزان الاعتدال: 572/2. 2 تاريخ ابن معين برواية الدوري، رقم: 4544. 3 تهذيب: 207/6. 4 سوالات أبي داود، للإمام أحمد، ص: 216. 5 سوالات الآجري: 266/1. 6 مقدمة فتح الباري، ص: 591. 7 تهذيب التهذيب: 217/6.
8 ميزان الاعتدال: 572/2.

میں بھی ذکر کر کے وضاحت کر دی ہے کہ اس کی حدیث حسن درجے سے کم نہیں ہے۔

- حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں صَدُوقٌ يُخْطِىءُ کہا اور فتح الباری میں امام ابن معین کی جرح کا جواب دیا ہے۔ ان تمام اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار کی حدیث حسن صحیح اور قابل استدلال ہے۔
- امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ امام علی بن مدینی، امام احمد کی توثیق، امام یحییٰ بن سعید کا اس سے روایت لینا، نیز امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابوداود رحمہم اللہ کا اس کی حدیث سے استدلال کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام دارقطنی نے جو فرمایا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر ائمہ نے اس کو ضعیف کہا ہے، محل نظر اور حقیقت الامر کے خلاف ہے۔
- امام دارقطنی رحمہ اللہ کا فرمانا کہ رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ میں عبدالرحمٰن متفرد ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بھی مقدمے کی الفصل الثامن کے تحت اسی حدیث (39) کے بارے میں اعتراف کرنا کہ تَفَرَّدَ بِهٰذِهِ الزِّيَادَةِ، تو ثقہ یا صدوق کا محض تفرد قابل ضعف نہیں۔
- امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ امام ترمذی نے بھی اسے حسن صحیح کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوعبدالرحمٰن مقبل بن ہادی الوادعی نے امام دارقطنی کے اعتراض کے حوالے سے عبدالرحمٰن کے بارے میں بالآخر کہا ہے: [فَالظَّاهِرُ أَنَّ حَدِيثَهُ فِي رُتْبَةِ الْحَسَنِ] ''ظاہر بات یہی ہے کہ اس کی حدیث حسن درجے کی ہے۔''[1] بلکہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی صحیح الترغیب (64/2) اور الجامع الصحیح، رقم (3482) میں اسے صحیح کہا ہے، اس لیے شیخ ابوسفیان کی رائے اگر اس کے برعکس ہے تو اس میں اس کے ضعیف ہونے کی کوئی وزنی دلیل موجود نہیں۔

ایک ضروری وضاحت: یاد ش بخیر! علامہ البانی رحمہ اللہ نے سلسلة الأحاديث الضعيفة میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ کو امام یحییٰ بن معین، ابو حاتم، ابن حبان، ابن عدی، دارقطنی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ کے اقوال کی بنا پر ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

[وَبِالْجُمْلَةِ ضُعْفُ هٰذَا الرَّاوِي بَعْدَ اتِّفَاقِ أُولٰئِكَ الْأَئِمَّةِ عَلَيْهِ أَمْرٌ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَتَوَقَّفَ فِيهِ بَاحِثٌ، أَوْ يَرْتَابَ فِيهِ مُنْصِفٌ]

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان ائمہ کے اتفاق کے بعد اس راوی کا ضعف ایسی حقیقت ہے کہ کسی بحث کرنے والے کے لیے اس میں توقف اور کسی منصف کے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں۔''[2]

---

[1] حاشية الإلزامات والتتبع، ص: 202. [2] الضعيفة: 464/3، رقم: 1299.

اسی جرح کی بنا پر انھوں نے صحیح بخاری کی حدیث (6478)[إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَاتٍ] کو ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے ضعیف ہونے کے دو سبب ہیں: ایک عبدالرحمٰن بن عبداللہ کا ضعیف ہونا اور دوسرا اس کا مرفوع بیان ہونا کیونکہ موطا میں امام مالک نے اسے موقوف روایت کیا ہے۔

اس حوالے سے عرض ہے کہ جہاں تک ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال ہیں تو ان کی وضاحت ہم پہلے کر آئے ہیں جس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ رہی وہ بات جو انھوں نے علامہ ذہبی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کی ہے:[أَوْرَدَهُ الذَّهْبِيُّ فِي الضُّعَفَاءِ وَقَالَ: وُثِّقَ، وَقَالَ ابْنُ مَعِينٍ: فِي حَدِيثِهِ ضُعْفٌ. وَ تَبْنِي فِي الْكَاشِفِ قَوْلُ أَبِي حَاتِمٍ فِي تَلْيِينِهِ] ”امام ذہبی نے اس کو ضعفاء میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی توثیق کی گئی ہے، اور ابن معین فرماتے ہیں: اس کی حدیث میں ضعف ہے اور الکاشف میں ابوحاتم کا قول اس کے کمزور ہونے میں بنیاد ہے۔“ تو اس بارے میں اولاً عرض ہے کہ علامہ ذہبی نے بلاشبہ ”المغنی“ میں یہی کچھ فرمایا ہے مگر اس کے علاوہ انھوں نے کسی اور کتاب میں بھی کچھ کہا ہے یا یہی بات حتمی اور فیصلہ کن ہے؟ حالانکہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے المیزان اور دیوان الضعفاء میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اسے آخر نظر انداز کر دینا ”بحّاث“ اور ”منصف“ کے لیے مناسب ہے؟

ثانیاً: میزان میں المغنی کی طرح ”وثق“ پر اکتفا نہیں بلکہ اس سے پہلے ”صالح الحدیث“ بھی کہا ہے۔ معلوم نہیں یہاں اس کی طرف علامہ البانی رحمہ اللہ کی نظر کیوں ملتفت نہیں ہوئی۔ حالانکہ الصحیحة(734/2) میں خود انھوں نے میزان کے حوالے سے ”صالح الحدیث وقد وثق“ نقل کیا ہے۔

ثالثاً: میزان میں اس کے بعد علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ایک اور بات بھی کہی ہے، وہ یہ کہ [حَدَّثَ عَنْهُ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ مَعَ تَعَنُّتِهِ فِي الرِّجَالِ] ”عبدالرحمٰن سے امام یحییٰ بن سعید قطان نے اپنے تشدد کے باوجود روایت لی ہے۔“ کیا یہ جملہ بھی علامہ ذہبی کی طرف سے عبدالرحمٰن کی توثیق کا مشعر نہیں؟

رابعاً: عبدالرحمٰن کو علامہ ذہبی نے دیوان الضعفاء (ص:188) میں بھی ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے:[ثِقَةٌ، قَالَ ابْنُ مَعِينٍ فِي حَدِيثِهِ ضُعْفٌ] غور کیجیے خود علامہ ذہبی کا مختار قول یہاں کیا ہے؟

خامساً: علامہ ذہبی نے عبدالرحمٰن کو [مَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ وَهُوَ مُوَثَّقٌ] میں ذکر کیا ہے اور مقدمے میں فرمایا ہے کہ ان راویوں کی حدیث حسن درجے سے کم نہیں، اس لیے البانی رحمہ اللہ کا محض ”الضعفاء“ کے حوالے سے عبدالرحمٰن کے بارے میں یہ تأثر کہ علامہ ذہبی نے اسے ضعیف کہا ہے، قطعاً درست نہیں۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب میں جو اسے صَدُوقٌ یُخْطِئُ کہا ہے، اسے بھی علامہ البانی نے اپنی تائید میں پیش کیا ہے، حالانکہ خود علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسی عبدالرحمٰن کے بارے میں تقریب سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہی کلام نقل کر کے یہ بھی فرمایا ہے: [صَدُوقٌ یُخْطِئُ فَحَسْبُ مِثْلُهُ أَنْ یُّحَسَّنَ حَدِیثُهُ] ''صدوق ہے، غلطی کر جاتا ہے۔ ایسے راوی کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کی حدیث حسن ہوتی ہے۔''[1] اسی طرح عبدالرحمٰن ہی کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں: [حَسَنُ الْحَدِیثِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ][2]

مگر صحیح بخاری کی اس روایت میں عبدالرحمٰن کے ضعیف ہونے میں کسی باحث کے لیے شک و ریب کی کوئی گنجائش نہیں ہے، عجیب بات ہے۔ إنا للّٰه و إنا إلیه راجعون.

اس ضمن میں شیخ البانی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا تو بجا ہے کہ امام علی بن مدینی کا قول صَدُوق اور امام بغوی کا قول صَالِحُ الْحَدِیْث ائمۂ جارحین کے قول کے خلاف نہیں کیونکہ صدق، سوءِ حفظ کے منافی نہیں، مگر یہ فرق بہرحال ملحوظ رہنا چاہیے کہ جنھوں نے صَدُوق، صَالِحُ الْحَدِیْثِ، لَابَأْسَ بِهٖ کہا ہے انھوں نے سوءِ حفظ کی اس کی طرف نسبت نہیں کی۔ امام بخاری، امام نسائی، امام ابوداود اور امام ترمذی رحمہم اللہ کا اس سے استدلال کرنا اس پر مستزاد ہے۔ اسی طرح شیخ مرحوم کا فرمانا کہ امام بغوی کا قول شاذ ہے، درست نہیں کیونکہ علامہ ذہبی نے بھی میزان میں صَالِحُ الْحَدِیثِ کہا ہے۔ شیخ صاحب کا یہ فرمانا بھی محل نظر ہے کہ جارحین [أَكْثَرُ وَ أَعْلَمُ] ''زیادہ ہیں اور زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔'' حالانکہ امام بخاری، علی بن مدینی، احمد بن حنبل اعلم ہیں اور معتدل بھی، جبکہ جارحین عموماً متشددین میں شمار ہوتے ہیں۔ اور جرح و تعدیل کرنے والوں کی تعداد کا تقابل بھی آپ کے سامنے ہے۔ اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ کہی گئی کہ ''حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام دارقطنی وغیرہ کی جرح کے جواب میں بس یہی کچھ کہا ہے کہ ''اس سے یحییٰ القطان کا روایت لینا (توثیق کے لیے) کافی ہے۔'' حالانکہ انھوں نے اس کے علاوہ فرمایا ہے: وَقَالَ ابْنُ الْمَدِینِيِّ صَدُوقٌ[3] اور یہ بھی کہا ہے: [اِحْتَجَّ بِهِ الْبُخَارِيُّ وَ أَبُودَاوٗدَ وَ النَّسَائِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ]. یہ بھی کیا جواب ہے یا نہیں؟ اور خود فتح الباری (278/1) میں فرماتے ہیں: [تَكَلَّمَ فِیهِ بَعْضُهُمْ لٰكِنَّهٗ صَدُوقٌ] غور فرمائیے کیا کہا گیا ہے کہ بعض نے کلام کیا ہے (اکثر نے نہیں) لیکن یہ صدوق ہے اور فتح الباری (430/12) میں فرماتے ہیں: عُمْدَةُ الْبُخَارِيِّ فِیهِ كَلَامُ شَیْخِهٖ عَلِيٍّ۔ کہ ''امام بخاری رحمہ اللہ کا اعتماد ان کے اپنے شیخ امام علی بن مدینی کے قول پر ہے کہ عبدالرحمٰن صدوق ہے۔'' اس کے ساتھ انھوں نے ابن معین کی جرح کا جواب بھی دیا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں، مگر اس کے باوجود کہنا کہ حافظ ابن حجر

[1] الصحیحة: 15/3. [2] الصحیحة: 736/2. [3] مقدمة فتح الباري، ص: 591.

جرح کا جواب نہیں دے سکے، محل نظر ہے۔ آخری بات یہ بھی کہی گئی کہ امام دارقطنی نے صحیح بخاری کی ایک روایت میں عبدالرحمٰن کی زیادت پر تفرد کی بنا پر تنقید کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ اس اعتراض کا اعتراف کیا ہے۔

قارئین کرام! یہ وہی حدیث ہے جس پر (نمبر:2 کے تحت) بحث کے ضمن میں ہم یہ سب عرض کر رہے ہیں۔

اولاً: عرض ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک عبدالرحمٰن صدوق ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ ائمہ حدیث نے اس سے استدلال کیا ہے۔ ایسے ثقہ وصدوق راوی کی زیادت جب اوثق کے منافی نہ ہو تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک مقبول ہے جیسا کہ انھوں نے شرح نخبۃ الفکر میں اور مقدمہ فتح الباری کی آٹھویں فصل میں ذکر کیا ہے۔ حافظ صاحب نے امام دارقطنی کے اعتراض کے جواب میں یہ لطیف بات کہی ہے: [عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ يَأْتِي الْكَلَامُ عَلَيْهِ] ''عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار پر کلام آگے آ رہا ہے۔'' اس کے بعد اس کے ترجمہ سے مترشح ہو جاتا ہے کہ وہ اسے اس درجے کا راوی قرار نہیں دیتے جس کی زیادت مردود ہو۔

یہاں یہ بات مزید وضاحت طلب ہے کہ خود شیخ البانی رحمہ اللہ اس جملہ کے تفرد کے باوجود اس روایت کو صحیح الجامع اور صحیح الترغیب میں ذکر کرتے ہیں اور اسے صحیح قرار دیتے ہیں۔ تو عبدالرحمٰن کا ''بلاریب'' ضعیف ہونا کیا ہوا؟

دوسری بات: شیخ البانی رحمہ اللہ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ یہ روایت اس لیے بھی ضعیف ہے کہ امام مالک نے موطا (رقم:1992) میں یہی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ذکر کی ہے، مرفوعاً نہیں، لہٰذا امام مالک کے مقابلے میں عبدالرحمٰن کی بیان کردہ مرفوع روایت ضعیف ہے۔

عرض ہے کہ بلاریب موطا امام مالک میں یہ روایت موقوف ہے۔ وہ عبدالرحمٰن کی طرح عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نہیں کہتے، مگر موطا میں موقوف حکماً مرفوع ہے۔ مرفوع وموقوف کے الفاظ ایک ہیں، فرق حقیقتاً مرفوع اور حکماً مرفوع ہونے کا ہے۔ کیونکہ اس میں کلمۂ خیر پر ثواب اور کلمۂ شر پر اللہ کی ناراضی اور جہنم میں جانے کا ذکر ہے، اس لیے موقوف بھی حکماً مرفوع ہے۔

ثانیاً: امام بخاری رحمہ اللہ اسے متابعاً ترجمۃ الباب کے تحت پانچویں نمبر پر لائے ہیں اور اس سے پہلے اسی مفہوم کی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ذکر کی ہے اور اس کی متابعت میں یہ روایت ہے جسے شیخ البانی ضعیف قرار دے رہے ہیں۔

ثالثاً: علامہ ابن عبدالبر نے موطا کی اسی روایت پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام مالک سے ایک راوی نے، جس

کی توثیق نہیں کی گئی، اسے مرفوع بیان کیا ہے۔ اس کی تغلیط بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: [وَقَدْ رَوَاهُ عَبْدُالرَّحْمٰنِ ابْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِيهِ مَرْفُوعًا] ''اسے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار اپنے باپ سے مرفوع بیان کرتے ہیں۔'' اس کے بعد اپنے اسلوب کے مطابق اسے اپنی سند سے ذکر کیا ہے اور کوئی نقد و تبصرہ نہیں کیا۔ ان کی اس طرح خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسے صحیح سمجھتے ہیں، بالخصوص موطا میں ایسی موقوف مرفوع حکمی روایت کو مرفوع حقیقی کے ثبوت کے بعد دونوں کو درست قرار دیتے ہیں، مثلاً: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: [تُعْرَضُ أَعْمَالُ النَّاسِ فِي كُلِّ جُمُعَةٍ] لوگوں کے اعمال ہر جمعہ کو پیش کیے جاتے ہیں۔'' جو موطا میں موقوف ہے، امام دارقطنی نے اس کے بارے میں العلل (10/87-89) میں فرمایا ہے کہ اس کا موقوف ہونا اثبت راویوں سے ہے ان کی نسبت جو اسے مرفوع بیان کرتے ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے بھی کہا ہے کہ امام مالک کے جمہور تلامذہ موقوف بیان کرتے ہیں، البتہ ابن وہب امام مالک سے مرفوع بیان کرتے ہیں۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اس قسم کی بات رائے اور قیاس سے نہیں کہی جا سکتی اور امام مالک کے اجل اصحاب میں سے ابن وہب اسے مرفوع بیان کرتے ہیں۔[1]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت جو موطا میں [نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ] ''بہت سی لباس پہننے والی عورتیں قیامت کے دن برہنہ ہوں گی۔'' کے الفاظ سے موقوفاً مروی ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ امام مالک کے تمام تلامذہ سوائے عبداللہ بن نافع کے موقوف ہی بیان کرتے ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ تو ممکن نہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی رائے سے یہ بات کہیں۔ یہ توقیفی ہے۔[2] گو اسناد کے اعتبار سے اس نوعیت کا اختلاف ذکر کرنے کی گنجائش ہے لیکن متن کے اعتبار سے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حیرت ہے علامہ البانی رحمہ اللہ نے معنوی طور پر اس کے صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ابوسلمہ عن ابی ہریرہ کی حدیث سے اختلاف کو بھی عبدالرحمٰن کے ضعف کی دلیل بنایا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا کہ تقریباً وہی لفظ تو موطا کی روایت میں بھی ہیں۔ اس میں کیا وہم امام مالک کا ہے؟ امام مالک کی روایت موقوف سہی مگر ہے تو بہرحال توقیفی، اس میں رائے و قیاس کا کوئی دخل نہیں، مگر افسوس اس حقیقت کو علامہ مرحوم نے نظر انداز کر دیا ہے۔

قارئین کرام! عبدالرحمٰن بن عبداللہ اور اس کی روایت پر بحث طویل ہوگئی لیکن اس کی ایک دوسری روایت پر نقد کا تقاضا تھا کہ اس کے متعلق بھی حقیقت واضح کر دی جائے۔ ہماری ان گزارشات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن کی یہ دونوں احادیث صحیح ہیں اور ان پر نقد کسی مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔

---

1. التمهيد:13/198،199. 2. التمهيد:13/202.

عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی ایک اور روایت کے بارے میں بھی رفع و وقف کا اختلاف ہے، چنانچہ حدیث:1402 کو امام دارقطنی رحمہ اللہ نے موقوف کہا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جس کی تفصیل مزید تطویل کا باعث بنے گی، سابقہ تفصیل کے تناظر میں اہل علم اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

تیسری حدیث: تیسری حدیث جس کے بارے میں شیخ ابوسفیان مصطفیٰ باحو نے فرمایا ہے کہ وہ حضرت سہل بن سعد کی حدیث ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے: أُبَيُّ بْنُ عَبَّاسِ بْنِ سَهْلٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ کی سند سے كِتَابُ الْجِهَادِ، بَابُ اِسْمِ الْفَرَسِ وَالْحِمَارِ میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھوڑے کا نام اللُّحَيْف تھا۔ (حدیث: 2855) امام دارقطنی نے الإلزامات و التتبع (ص:203) میں فرمایا ہے: "أُبَيٌّ هٰذَا ضَعِيفٌ"۔ ابن معین فرماتے ہیں: "ضعیف" امام احمد فرماتے ہیں: "منکر الحدیث" امام نسائی، دولابی حتی کہ امام بخاری نے "لَيْسَ بِالْقَوِيِّ" کہا ہے۔ یہ ہے وہ جرح جو اُبی بن عباس کے بارے میں ہے۔[1]

ابی بن عباس پر بلاشبہ جرح ہے مگر وہ ایسا نہیں کہ اسے بالکل مردود قرار دیا جائے۔ امام ابن حبان نے اسے الثقات (51/4) میں ذکر کیا ہے۔ امام ابن عدی نے "يُكْتَبُ حَدِيثُهُ" کہا ہے۔[2] علامہ مغلطائی اور حافظ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ [قَوَّاهُ الدَّارَقُطْنِيُّ] "امام دارقطنی نے اسے قوی کہا ہے۔"[3] ممکن ہے یہ دوسرا قول بھی امام دارقطنی سے منقول ہو ورنہ ان کا معروف قول یہی ہے کہ وہ ضعیف ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی ایک حدیث ذکر کر کے اسے "حسن غریب" قرار دیا ہے۔[4] علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے جرح نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے: [أُبَيٌّ إِنْ لَّمْ يَكُنْ بِالثَّبْتِ فَهُوَ حَسَنُ الْحَدِيثِ] "اگرچہ وہ ثبت نہیں، تاہم "حسن الحدیث" ہے۔"[5] مَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ وَهُوَ مُوَثَّقٌ، (ص:30) میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے جس سے ان کے میزان والے قول کی تائید ہوتی ہے۔

غور فرمائیے کہ جرح کے باوجود حافظ ذہبی رحمہ اللہ اسے حسن الحدیث قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ جرح میں ایسا کوئی لفظ نہیں کہ اسے بالکل ضعیف قرار دے دیا جائے کیونکہ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کے لفظ سے جرح میں صرف درجۂ کاملہ کی نفی مراد ہوتی ہے۔ علامہ ذہبی ہی رقمطراز ہیں:

[وَقَدْ قِيلَ فِي جَمَاعَاتٍ "لَيْسَ بِالْقَوِيِّ" وَاحْتُجَّ بِهِ، وَهٰذَا النَّسَائِيُّ قَدْ قَالَ فِي عِدَّةٍ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ وَ يُخْرِجُ لَهُمْ فِي كِتَابِهِ، قَالَ: قَوْلُنَا: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ- لَيْسَ بِجَرْحٍ مُفْسِدٍ]

"ایک جماعت کے بارے میں لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کہا گیا ہے اور ان سے حجت پکڑی گئی ہے۔ یہ امام نسائی ہیں،

---

1 تهذيب التهذيب:186/1، و ميزان الاعتدال:78/1. 2 الكامل:411/1. 3 إكمال:5/2، و مَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ وَهُوَ مُوَثَّقٌ، ص:30. 4 جامع الترمذى، الرؤيا، حديث:2297. 5 ميزان الاعتدال:78/1.

انھوں نے متعدد راویوں کے بارے میں لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کہا ہے اور ان سے اپنی کتاب میں احادیث لی ہیں۔ فرمایا کہ ہمارا لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کہنا جرح مفسد نہیں ہے۔"[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [لَمْ يَكُنْ بِالْقَوِيِّ، جَرْحٌ مَرْدُودٌ غيرُ مُبَيِّنِ السَّبَبِ] "لَمْ يَكُنْ بِالْقَوِيِّ مردود جرح ہے (کیونکہ اس میں) سبب جرح بیان نہیں ہے۔"[2]

بلکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الفتاوی الکبریٰ (243/3) میں ذکر کیا ہے کہ عتبہ بن حمید ضبی کے بارے میں جو منقول ہے کہ وہ ضَعِيفٌ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کی حدیث کو صحیح نہیں بلکہ حسن کہا جائے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ سخاوی نے ذکر کیا ہے کہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے سعید بن یحییٰ بن ابی سفیان الحمیری کے بارے میں کہا ہے: [مُتَوَسِّطُ الْحَالِ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ] "درمیانے درجے کا ہے، قوی نہیں ہے۔"[3] بلکہ مولانا امیر علی نے تو کہا ہے: [يُطْلَقُ لَيْسَ بِالْقَوِيِّ عَلَى الصَّدُوقِ] "لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کا اطلاق صدوق کے لیے کرتے ہیں۔"[4]

رہا امام احمد کا فرمان کہ وہ "منکر الحدیث" ہے تو امام صاحب اس کا اطلاق تفرد راوی پر بھی کرتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مقدمہ فتح الباری میں محمد بن ابراہیم تیمی کے ترجمہ میں فرمایا ہے۔ اور امام ابن معین اور دارقطنی کا "ضعیف" کہنا جرح مبہم ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التہذیب میں فِيهِ ضُعْفٌ کہا ہے۔ "ضعیف" انھوں نے بھی نہیں کہا، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ابی بن عباس حسن الحدیث ہے اور اس کی حدیث حسن درجے سے کم نہیں۔ وہ روایت کرنے میں تنہا نہیں بلکہ اس کا بھائی عبدالمہیمن اس کا متابع ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ابی بن عباس کی روایت ذکر کر کے فرمایا ہے: [وَقَالَ بَعْضُهُمُ اللُّخَيْفُ] کہ ابی ابن عباس نے گھوڑے کا نام اَللُّحَيْف بتلایا ہے اور بعض نے اَللُّخَيْف کہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (59/6) میں کہا ہے کہ یہ عبدالمہیمن کی روایت میں ہے۔ عبدالمہیمن بلاشبہ ابی بن عباس سے زیادہ ضعیف ہے مگر یوں نہیں کہ اس کے ترک پر اتفاق ہے۔ اگر وہ بالکل متروک درجے کا ہوتا تو امام بخاری رحمہ اللہ اس کے حوالے سے اختلاف کا تکلف نہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسے اعتضاد کے قابل قرار دیا ہے اور مزید فرمایا ہے:

[وَانْضَافَ إِلَى ذٰلِكَ أَنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَحَادِيثِ الْأَحْكَامِ، فَلِهٰذِهِ الصُّورَةِ الْمَجْمُوعَةِ حَكَمَ الْبُخَارِيُّ بِصِحَّتِهِ]

---

1 الموقظة، ص:319. 2 هدي الساري، ص:416. 3 فتح المغيث:293/2. 4 التذنيب، ص:14.

''مزید یہ بھی کہ یہ حدیث احکام میں سے نہیں، اسی مجموعی صورت کے اعتبار سے امام بخاری نے اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔''[1]

اہل مغازی کے ہاں یہ معروف ہے کہ یہ گھوڑا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ربیعہ بن ابی البراء نے پیش کیا تھا، چنانچہ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: [ذَكَرَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِّنْ أَهْلِ الْمَغَازِي أَنَّهُ أُهْدِيَ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ] ''بہت سے اہل مغازی نے ذکر کیا ہے کہ یہ گھوڑا رسول اللہ ﷺ کو تحفہ دیا گیا تھا۔''[2] بعض نے کہا ہے کہ فروہ بن عمرو نے تحفتاً دیا تھا۔[3] انھی وجوہ کی بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ نے ابی بن عباس کی روایت الصحیح میں ذکر کی ہے۔ اسے ضعیف کہنا درست نہیں۔ یہ ہے حقیقت ان تین روایات کی جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان پر صحت کا حکم مشکل ہے۔

* صحیح بخاری اور متکلم فیہ راوی: صحیح بخاری میں بعض ایسے راوی بھی ہیں جن پر ائمۂ جرح وتعدیل نے جرح کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس جرح کا جائزہ مقدمۂ فتح الباری میں پیش کیا ہے اور اسباب جرح کے تناظر میں بھی معقول جوابات دیے ہیں۔ اس ساری بحث سے قطع نظر دیکھیے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا ایسے راویوں کے بارے میں طرز عمل کیا ہے۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے بارے میں اہل علم جانتے ہیں وہ صَدُوقٌ، سَيِّئُ الْحِفْظِ جِدًّا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے کوئی روایت نہیں لی جس کا سبب خود انھوں نے یہ بیان فرمایا:

[لِأَنَّهُ لَايُدْرٰى صَحِيحُ حَدِيثِهِ مِنْ سَقِيمِهِ، وَكُلُّ مَنْ كَانَ مِثْلَ هٰذَا فَلَا أَرْوِي عَنْهُ شَيْئًا]

''اس لیے کہ اس کی صحیح احادیث کا اس کی ضعیف احادیث میں سے علم نہیں ہوتا۔ جو اس قسم کا راوی ہو میں اس سے روایت نہیں لیتا۔''[4] یہی بات امام ترمذی نے العلل الکبیر (973/2) میں بھی نقل کی ہے۔

اسی طرح امام بخاری ابومعشر نجیح مولی بنی ہاشم کے بارے میں فرماتے ہیں:

[ضَعِيفٌ لَا أَرْوِي عَنْهُ شَيْئًا وَلَا أَكْتُبُ حَدِيثَهُ وَكُلُّ رَجُلٍ لَا أَعْرِفُ صَحِيحَ حَدِيثِهِ مِنْ سَقِيمِهِ لَا أَرْوِي عَنْهُ وَلَا أَكْتُبُ حَدِيثَهُ]

''وہ ضعیف ہے۔ میں اس سے کوئی چیز روایت نہیں کرتا اور نہ اس کی حدیث لکھتا ہوں۔ میں جس راوی کی ضعیف حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو نہیں پہچانتا میں اس سے روایت نہیں لیتا، نہ اس کی حدیث لکھتا ہوں۔''[5]

بالکل یہی بات امام بخاری سے امام ترمذی نے العلل الکبیر (967/2) میں زمعہ بن صالح کے بارے میں بھی نقل

---

[1] النكت:418/1. [2] الإصابة:104/1. [3] فتح الباري:59/6. [4] جامع الترمذي، باب ماجاء في الإمام ينهض في الركعتين ناسيا، مع التحفة:290/1، حديث:364. [5] العلل الكبير للترمذي:978/2.

کی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے اس قول کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ وہ جس راوی سے بھی روایت لیں اس کی روایت صحیح ہو گی۔ لیکن الجامع الصحیح میں جس راوی کی روایت ذکر کریں گے وہ بہر حال صحیح ہو گی کیونکہ انھوں نے خود فرمایا ہے: [لَمْ أُخْرِجْ فِي هٰذَا الْكِتَابِ إِلَّا صَحِيحًا] ''میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث کو درج کیا ہے۔'' نیز فرمایا: [خَرَّجْتُ الصَّحِيحَ مِنْ سِتِّمِائَةِ أَلْفِ حَدِيثٍ] ''میں نے ''الجامع الصحیح'' چھ لاکھ احادیث سے منتخب کی ہے۔''[1] اور نام بھی ''الجامع الصحیح'' رکھا ہے جس سے یہ حقیقت نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے متکلم فیہ راویوں کی انھی روایات کو ''الجامع الصحیح'' کی زینت بنایا ہے جسے وہ اس کی صحیح روایات سمجھتے تھے۔ جب ان کے ہاں اصول یہ ٹھہرا کہ وہ ایسے راویوں ہی کی روایات لیتے ہیں جن کی صحیح اور ضعیف روایات کو وہ سمجھتے اور جانتے تھے کہ اس کی کتنی اور کون کون سی روایات صحیح اور کتنی اور کون کون سی ضعیف ہیں۔ اس کے بعد یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ ایسے متکلم فیہ راویوں کی ضعیف احادیث کی بھرتی انھوں نے الجامع الصحیح میں کی ہو گی؟ اس لیے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار ہوں یا ابی بن عباس یا ایسے ہی دوسرے راوی، ان کے بارے میں ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال سر آنکھوں پر مگر محض انھی اقوال کے تناظر میں روایت کے ضعف کا فیصلہ وہاں تو تسلیم کیا جا سکتا ہے جہاں امام بخاری جیسا حزم و اہتمام نہیں پایا جاتا، امام بخاری کی توضیحات کے بعد صرف انھی اقوال کی بنیاد پر فیصلہ حقیقت سے نا آشنائی اور امام بخاری رحمہ اللہ کی عظمت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ علامہ زیلعی صحیح بخاری و صحیح مسلم میں متکلم فیہ راویوں کی احادیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:

[صَاحِبَا الصَّحِيحِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ إِذَا أَخْرَجَا لِمَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ فَإِنَّهُمْ يَنْتَقُونَ مِنْ حَدِيثِهِ مَا تُوبِعَ عَلَيْهِ، وَ ظَهَرَتْ شَوَاهِدُهُ، وَعُلِمَ أَنَّ لَهُ أَصْلًا وَلَا يَرْوُونَ مَا تَفَرَّدَ بِهِ سِيَمَا إِذَا خَالَفَهُ الثِّقَاتُ]

''امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ جب متکلم فیہ راوی سے روایت لیتے ہیں تو وہ ان کی انھی روایات کو منتخب کرتے ہیں جن میں اس کی متابعت ہوتی ہے اور اس کے شواہد ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی اصل ہے۔ جس میں وہ منفرد ہوتا ہے وہ روایت نہیں لیتے بالخصوص جب اس کی ثقات نے مخالفت کی ہو۔''[2]

اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

[وَ أَصْحَابُ الصَّحِيحِ إِذَا رَوَوْا لِمَنْ تُكُلِّمَ فِيهِ فَإِنَّهُمْ يَدَعُونَ مِنْ حَدِيثِهِ مَا تَفَرَّدَ بِهِ، وَيَنْتَقُونَ مَا وَافَقَ الثِّقَاتَ وَقَامَتْ شَوَاهِدُهُ عِنْدَهُمْ]

''امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ جب متکلم فیہ راوی سے روایت کرتے ہیں تو وہ اس کی منفرد روایت کو نظر انداز

---

[1] مقدمة فتح الباري، ص:7. [2] نصب الراية:341/1.

کر دیتے ہیں اور جو ثقات کے موافق اور جس کے ان کے نزدیک شواہد ہوتے ہیں وہ روایت منتخب کر لیتے ہیں۔“[1]

اسی نوعیت کی بات بڑی تفصیل سے علامہ ابن عبدالہادی نے الصارم المنكي (ص:256-259) میں کہی ہے۔

علامہ ابن قطان نے مطر الوراق کے سوء حفظ کی بنا پر اس کی احادیث صحیح مسلم میں لانے کی وجہ سے امام مسلم پر اعتراض کیا جس کے جواب میں حافظ ابن قیم فرماتے ہیں:

[لَاعَيْبَ عَلٰى مُسْلِمٍ فِي إِخْرَاجِ حَدِيثِهٖ لِأَنَّهٗ يَنْتَقِي مِنْ أَحَادِيثِ هٰذَا الضَّرْبِ مَا يَعْلَمُ أَنَّهٗ حَفِظَهٗ، كَمَا يُطْرَحُ مِنْ أَحَادِيثِ الثِّقَةِ مَا يُعْلَمُ أَنَّهٗ غَلَطٌ فِيهِ، فَغَلَطَ فِي هٰذَا الْمَقَامِ مَنِ اسْتَدْرَكَ عَلَيْهِ إِخْرَاجَ جَمِيعِ أَحَادِيثِ الثِّقَاتِ وَمَنْ ضَعَّفَ جَمِيعَ حَدِيثِ سَيِّءِ الْحِفْظِ]

”اس کی حدیث لانے کی بنا پر امام مسلم پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ انھوں نے اس قسم کے راویوں کی ان روایات کا انتخاب کیا ہے جن کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ وہ اسے یاد ہیں، جیسے ثقہ کی ان روایات کو ترک کر دیا جاتا ہے جن کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس نے اس میں غلطی کی ہے، لہٰذا اس مقام پر جس نے ثقات کی تمام احادیث لانے میں استدراک کیا ہے اور سیئ الحفظ راوی کی تمام احادیث کو ضعیف کہا ہے اس نے غلطی کی ہے۔“[2] (کیونکہ ثقہ راوی کی کوئی حدیث ضعیف اور سیئ الحفظ کی کوئی حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔)

یہی بات بڑی تفصیل سے انھوں نے تہذیب السنن (5/ 326,325) میں کہی ہے۔ شائقین اس کی طرف مراجعت فرمائیں۔

بعض نے ایک روایت پر عبداللہ بن المثنی کی بنا پر اعتراض کیا تو اس کے جواب میں امام بیہقی رحمہ اللہ نے فرمایا:

[وَلَا نَعْلَمُ مِنَ الْحُفَّاظِ أَحَدًا اِسْتَقْصٰى فِي انْتِقَادِ الرُّوَاةِ مَا اسْتَقْصَاهُ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيُّ رحمه الله، مَعَ إِمَامَتِهٖ وَ تَقَدُّمِهٖ فِي مَعْرِفَةِ الرِّجَالِ وَ عِلَلِ الْأَحَادِيثِ، ثُمَّ إِنَّهُ اعْتَمَدَ فِي هٰذَا الْبَابِ عَلٰى حَدِيثِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْمُثَنّٰى عَنْ ثُمَامَةَ، عَنْ أَنَسٍ وَ ذٰلِكَ لِكَثْرَةِ الشَّوَاهِدِ لِحَدِيثِهٖ هٰذَا بِالصِّحَّةِ]

”حفاظِ حدیث میں سے ہم کسی کو نہیں جانتے کہ اس نے راویوں کی تحقیق و تنقید کا اس قدر اہتمام کیا ہو جس

---

1 نصب الراية: 480/2. 2 زادالمعاد، في هديه ﷺ في سجود القرآن:96/1.

قدر محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ علل احادیث اور راویوں کی معرفت میں ان کی امامت اس پر مستزاد ہے۔ انھوں نے اس باب میں عبداللہ بن مثنیٰ کی حدیث پر اعتماد کیا ہے اور اسے الصحیح میں درج کیا ہے، اس لیے کہ اس کی صحت پر بہت سے شواہد ہیں۔'' [1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اسی عبداللہ بن المثنیٰ کے بارے میں كِتَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا لِيُفْهَمَ عَنْهُ کے تحت لکھتے ہیں:

[وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ، إِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْمُثَنّٰى. انتهى. وَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ الْمُثَنّٰى مِمَّنْ تَفَرَّدَ الْبُخَارِيُّ بِإِخْرَاجِ حَدِيثِهٖ دُونَ مُسْلِمٍ، وَقَدْ وَثَّقَهُ الْعِجْلِيُّ وَالتِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ أَبُو زُرْعَةَ وَ أَبُو حَاتِمٍ: صَالِحٌ، وَقَالَ ابْنُ أَبِي خَيْثَمَةَ عَنِ ابْنِ مَعِينٍ: لَيْسَ بِشَيْءٍ، وَقَالَ النَّسَائِيُّ: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ. قُلْتُ: لَعَلَّهُ أَرَادَ فِي بَعْضِ حَدِيثِهٖ، وَقَدْ تَقَرَّرَ أَنَّ الْبُخَارِيَّ حَيْثُ يُخْرِجُ لِبَعْضِ مَنْ فِيهِ مَقَالٌ لَا يُخْرِجُ شَيْئًا مِمَّا أُنْكِرَ عَلَيْهِ، وَقَوْلُ ابْنِ مَعِينٍ لَيْسَ بِشَيْءٍ أَرَادَ بِهٖ فِي حَدِيثٍ بِعَيْنِهٖ سُئِلَ عَنْهُ، وَقَدْ قَوَّاهُ فِي رِوَايَةِ إِسْحَاقَ بْنِ مَنْصُورٍ عَنْهُ. وَ فِي الْجُمْلَةِ فَالرَّجُلُ إِذَا ثَبَتَتْ عَدَالَتُهُ لَمْ يُقْبَلْ فِيهِ الْجَرْحُ إِلَّا إِذَا كَانَ مُفَسَّرًا بِأَمْرٍ قَادِحٍ، وَ ذٰلِكَ غَيْرُ مَوْجُودٍ فِي عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْمُثَنّٰى هٰذَا. وَقَدْ قَالَ ابْنُ حِبَّانَ لَمَّا ذَكَرَهُ فِي الثِّقَاتِ: رُبَّمَا أَخْطَأَ وَالَّذِي أُنْكِرَ عَلَيْهِ إِنَّمَا هُوَ مِنْ رِوَايَتِهٖ عَنْ غَيْرِ عَمِّهٖ ثُمَامَةَ، وَالْبُخَارِيُّ إِنَّمَا أَخْرَجَ لَهُ عَنْ عَمِّهٖ هٰذَا الْحَدِيثَ وَغَيْرَهُ، وَلَا شَكَّ أَنَّ الرَّجُلَ أَضْبَطُ لِحَدِيثِ آلِ بَيْتِهٖ مِنْ غَيْرِهٖ]

''امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ اسے ہم عبداللہ بن المثنیٰ کی سند سے ہی جانتے ہیں۔ عبداللہ بن المثنیٰ سے امام بخاری نے روایت لی ہے، امام مسلم نے نہیں لی۔ امام عجلی اور ترمذی نے اسے ثقہ کہا ہے۔ ابوزرعہ اور ابوحاتم نے صالح کہا ہے۔ ابن معین نے ابن ابی خیثمہ کی روایت میں لَيْسَ بِشَيْءٍ اور نسائی نے لَيْسَ بِالْقَوِيِّ کہا ہے۔ میں کہتا ہوں: شاید انھوں نے اس کی بعض حدیث کے بارے میں ایسا کہا ہے۔ امام بخاری کے بارے میں طے شدہ بات ہے کہ جس راوی کے بارے میں کلام ہوتا ہے وہ اس کی کوئی ایسی روایت نہیں لاتے جس میں نکارت ہو۔ امام ابن معین کا قول لَيْسَ بِشَيْءٍ کسی ایسی معین روایت کے بارے میں ہے جس کے متعلق ان سے سوال کیا گیا ہے کیونکہ اسحاق بن منصور، امام ابن معین سے اس کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جب راوی کی عدالت ثابت ہو تو اس کے بارے میں جرح مفسر ہی، جو

---

[1] المعرفة: 217/3، و نصب الراية: 337/2.

واقعی باعثِ جرح ہو، قبول کی جائے گی اور ایسی جرح عبداللہ بن مثنیٰ کے بارے میں موجود نہیں۔ ابن حبان نے ثقات میں جب اس کا ذکر کیا تو بس رُبَّمَا أَخْطَأَ کہا ہے، نیز کہا کہ اس پر انھی روایات کے بارے میں انکار ہے جو وہ اپنے چچا ''ثمامہ'' کے علاوہ دوسروں سے نقل کرتا ہے مگر امام بخاری وغیرہ نے یہ اور دیگر روایات ثمامہ سے روایت کی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی اپنے گھر والوں کی بیان کی ہوئی روایت کو، دوسروں کی نسبت زیادہ محفوظ کرنے والا ہوتا ہے۔''[1]

مقدمۂ فتح الباری (ص:416) میں بھی انھوں نے فرمایا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بطورِ استدلال عبداللہ بن مثنیٰ کی وہی احادیث ذکر کی ہیں جو ثمامہ سے ہیں اور بعض مقامات پر ثمامہ کے علاوہ جو روایات لائے ہیں ان میں وہ منفرد نہیں۔

متکلم فیہ راویوں میں یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر بھی ہیں جن پر امام نسائی رحمہ اللہ نے تو سخت جرح کی ہے مگر امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی روایت کو منتخب کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [فَهٰذَا يَدُلُّكَ عَلٰى أَنَّهُ يَنْتَقِي حَدِيثَ شُيُوخِهِ ......] ''اس میں تمھارے لیے یہ دلیل ہے کہ وہ اپنے شیوخ کی احادیث منتخب کرتے اور انھیں چنتے جاتے ہیں۔ جن میں کوئی نکارت ہوتی ہے انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں اور جو صحیح ہوتی ہیں انھیں محفوظ کر لیتے ہیں۔''

ولید بن مسلم کا بھی تدلیس کی وجہ سے متکلم فیہ راویوں میں شمار ہوتا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری اور مسلم نے اس سے استدلالاً روایت لی ہے کیونکہ وہ اس کی روایت میں سے منتخب روایات لیتے اور منکرات سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کے الفاظ ہیں: [قَدِ احْتَجَّا بِهِ لٰكِنَّهُمَا يَنْتَقِيَانِ حَدِيثَهُ وَ يَجْتَنِبَانِ مَا يُنْكَرُ لَهُ][2]

حافظ اسماعیلی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ امام بخاری پر تعجب ہے کہ وہ عبداللہ بن صالح کاتب اللیث کی تعلیقاً روایات کو بطور استدلال ذکر کرتے ہیں، اس کی موصول روایات سے استدلال نہیں کرتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

[إِنَّمَا صَنَعَ ذٰلِكَ لِمَا قَرَّرْنَاهُ أَنَّ الَّذِي يُورِدُهُ مِنْ أَحَادِيثِهِ صَحِيحٌ عِنْدَهُ قَدِ انْتَقَاهُ مِنْ حَدِيثِهِ لٰكِنَّهُ لَايَكُونُ عَلٰى شَرْطِهِ الَّذِي هُوَ أَعْلٰى شُرُوطِ الصِّحَّةِ فَلِهٰذَا لَا يَسُوقُهُ مَسَاقَ أَصْلِ الْكِتَابِ، هٰذَا اصْطِلَاحٌ لَهُ قَدْ عُرِفَ بِالْاِسْتِقْرَاءِ مِنْ صَنِيعِهِ]

''امام بخاری رحمہ اللہ ایسا اس بنا پر کرتے ہیں جس کو ہم نے ثابت کیا ہے کہ جس کسی کی احادیث میں سے حدیث لاتے ہیں ان کے نزدیک وہ صحیح ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کی حدیث کو منتخب کیا ہوتا ہے لیکن وہ صحت کے اعلیٰ

---

[1] فتح الباري:189/1. [2] السير:216/9.

معیار پر نہیں ہوتی، اس لیے اسے اصولِ کتاب میں ذکر نہیں کرتے۔ یہ امام بخاری رحمہ اللہ کی اصطلاح ہے جو ان کے طریقۂ عمل کے تتبع سے معلوم ہوتی ہے۔'' [1]

امام بخاری رحمہ اللہ کے اس اسلوب انتقاء کا ذکر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اور مقامات پر بھی کیا ہے، مگر یہاں اس کا استقصاء مطلوب نہیں ہے۔ علامہ ابوبکر الحازمی صحیحین میں فلیح بن سلیمان، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن دینار، اسماعیل بن ابی اویس وغیرہ جیسے متکلم فیہ راویوں پر اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

[أَمَّا إِيدَاعُ الْبُخَارِيِّ وَ مُسْلِمٍ كِتَابَيْهِمَا حَدِيثَ نَفَرٍ نُسِبُوا إِلٰى نَوْعٍ مِنَ الضُّعْفِ فَظَاهِرٌ، غَيْرَ أَنَّهُ لَمْ يَبْلُغْ ضُعْفُهُمْ حَدًّا يُرَدُّ بِهِ حَدِيثُهُمْ، مَعَ أَنَّا لَا نُقِرُّ بِأَنَّ الْبُخَارِيَّ كَانَ يَرٰى تَخْرِيجَ حَدِيثِ مَنْ يُنْسَبُ إِلٰى نَوْعٍ مِّنْ أَنْوَاعِ الضُّعْفِ وَلَوْ كَانَ ضُعْفُ هٰؤُلَآءِ قَدْ ثَبَتَ عِنْدَهُ لَمَا خَرَّجَ حَدِيثَهُمْ]

''امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ کا اپنی کتابوں میں ایسی جماعت کی حدیث لانا جن کے بارے میں کسی نوعیت کا ضعف منسوب ہے، ایک ظاہر امر ہے، مگر ان کا ضعف اس حد تک نہیں کہ ان کی حدیث رد کر دی جائے۔ اس کے ساتھ ہم اس بات کا اقرار نہیں کرتے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی حدیث کی تخریج کی ہو جن کے بارے میں کسی قسم کا (قابلِ رد) ضعف منسوب ہے۔ اگر ان کے نزدیک ان راویوں کا ضعیف ہونا ثابت ہوتا تو وہ ان کی احادیث ذکر نہ کرتے۔'' [2]

اسی نوعیت کی بات علامہ ذہبی نے کہی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جس راوی سے امام بخاری اور امام مسلم نے یا دونوں میں سے کسی ایک نے روایت لی ہے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن سے انھوں نے استدلال کیا ہے اور دوسرے وہ جن سے متابعتاً، استشہاداً اور اعتباراً روایت لی ہے۔ جن سے انھوں نے استدلال کیا ہے اور اس کی نہ توثیق کی گئی ہے، نہ تضعیف، تو وہ ثقہ ہیں اور ان کی حدیث قوی ہے۔ اور جن سے انھوں نے استدلال کیا ہے اور وہ متکلم فیہ ہیں تو بسا اوقات ان میں کلام تعنت و تشدد کا نتیجہ ہے اور جمہور انھیں ثقہ کہتے ہیں، ان کی حدیث بھی قوی ہے۔ کبھی ایسا ہے کہ اس میں کمزوری اور ضعفِ حفظ قابلِ اعتبار ہے تو اس کی حدیث حسن درجے سے کم نہیں۔ اسے ہم صحیح کا ادنیٰ درجہ کہتے ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے بخاری و مسلم کے اصول میں کوئی راوی ایسا نہیں جس کی روایات ضعیف ہوں بلکہ وہ حسن ہیں یا صحیح ہیں۔ رہے وہ جن کی امام بخاری و مسلم نے شواہد و متابعات میں روایات لی ہیں تو ان میں بعض وہ

1 مقدمة فتح الباري، ص:415. 2 شروط الأئمة الخمسة، ص:172.

ہیں جن کے حفظ میں کلام ہے اور ان کی توثیق میں تردد ہے، لہٰذا صحیحین میں جن کی حدیث لی گئی ہے وہ پل پر سے گزر گیا ہے، سوائے واضح برہان کے اس سے انحراف کی گنجائش نہیں۔ ہاں صحیح احادیث کے مراتب میں اور ثقہ راویوں کے طبقات میں، جسے علی الاطلاق ثقہ کہا گیا ہے وہ اس جیسا نہیں جس میں کلام کیا گیا ہے۔ اور جس (صدوق وثقہ) میں سوء حفظ اور طلب روایات میں کمی کے باعث کلام ہے اس جیسا نہیں جسے ضعیف کہا گیا ہے، اور نہ وہ جسے انھوں نے ضعیف کہا اور اس سے روایت لی اس جیسا ہے جس کو انھوں نے ترک کر دیا ہے، اور نہ وہ متروک اس جیسا ہے جسے متہم بالکذب اور کذاب کہا گیا ہے۔''[1]

راوی کے ضعف کا ایک سبب اس کا اختلاط ہے اور کتب اصول میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ مختلط کی حالتِ اختلاط میں بیان کی ہوئی روایت ضعیف ہوتی ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ایسے ثقہ راوی موجود ہیں جو اختلاط کے عارضے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایسے راویوں کے بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ صحیحین میں ان کے انھی قدماء تلامذہ سے روایات مروی ہیں جنھوں نے ان کے اختلاط سے پہلے ان سے سماع کیا ہے۔ یہ رائے علامہ ابن الصلاح اور علامہ عراقی وغیرہ کی ہے۔[2] یہی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے هدي الساري (ص:431) میں کہی ہے، مگر امر واقع یہ ہے کہ صحیحین میں مختلط راویوں کی وہی روایات نہیں جو ان کے قدماء اصحاب روایت کرتے ہیں بلکہ ان کی روایات بھی ہیں جنھوں نے اختلاط کے بعد سماع کیا، چنانچہ صحیحین میں متکلم فیہ راویوں کے جواب کی طرح یہاں بھی اہل علم نے یہ بات کہی ہے کہ شیخین نے ایسے راویوں کی روایات کے انتخاب کا طریقہ اختیار کیا ہے یا انھی روایات کو درج کیا ہے جو ان کی توثیق وتتبع میں ان کی قدیم روایات میں شمار ہوتی ہیں۔ حافظ سخاوی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

[وَمَا يَقَعُ فِي الصَّحِيحَيْنِ أَوْ أَحَدِهِمَا مِنَ التَّخْرِيجِ لِمَنْ وُصِفَ بِالْاِخْتِلَاطِ مِنْ طَرِيقِ مَنْ لَّمْ يَسْمَعْ مِنْهُ إِلَّا بَعْدَهُ فَإِنَّا نَعْرِفُ عَلَى الْجُمْلَةِ أَنَّ ذٰلِكَ مِمَّا ثَبَتَ عِنْدَ الْمَخْرَجِ أَنَّهُ مِنْ قَدِيمِ حَدِيثِهِ ...... الخ)

''صحیحین یا ان میں سے کسی ایک میں مختلط راویوں کی ایسی روایات ہیں جنھیں مختلطین کے تلامذہ نے ان سے اختلاط کے بعد سنا ہے۔ ان کے بارے میں فی الجملہ ہم یہی جانتے ہیں کہ یہ تخریج کرنے والے (امام بخاری یا مسلم) کے نزدیک ان کی قدیم روایات میں سے ہیں۔''[3]

یہی بات علامہ ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ (ص:357) میں اور دیگر حضرات نے بھی کہی ہے۔ مختلط راویوں

---

1 الموقظة، ص:316,306. 2 علوم الحديث، ص:365، و التقييد والإيضاح، ص:442. 3 فتح المغيث:372/2.

میں ایک سعید بن ابی عروبہ ہیں جن سے محمد بن عبداللہ انصاری، روح بن عبادہ اور ابن ابی عدی نے بعد از اختلاط سماع کیا ہے اوران کی روروایات صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کی روایات کے جواب میں لکھتے ہیں:

[وَ أَخْرَجَ عَمَّنْ سَمِعَ مِنْهُ بَعْدَ الْاِخْتِلَاطِ قَلِيلًا كَمُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْأَنْصَارِيِّ وَ رَوْحِ بْنِ عُبَادَةَ وَ ابْنِ أَبِي عَدِيٍّ فَإِذَا أَخْرَجَ مِنْ هٰؤُلَآءِ انْتَقٰى مِنْهُ مَا تَوَافَقُوا عَلَيْهِ]

''......ان جیسے راویوں سے جب امام روایت لیتے ہیں تو ان کی اسی روایت کو منتخب کرتے ہیں جس کی دوسروں نے موافقت کی ہوتی ہے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حصین بن عبدالرحمٰن سے روایت لی ہے اور وہ بھی مختلط ہے اور حصین بن نمیر نے اس سے اختلاط کے بعد روایت کی ہے۔ اس کی سند سے صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حصین بن نمیر کی متابعت ہشیم اور محمد بن فضیل نے کی ہے۔ اور ہشیم نے حصین بن عبدالرحمٰن سے اختلاط سے پہلے روایت لی ہے۔[2]

امام ابن حبان نے اپنی صحیح کے مقدمے میں مختلط راویوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''وہ راوی جو آخر عمر میں اختلاط میں مبتلا ہوگئے تھے ہم نے ان کی انھی احادیث سے استدلال کیا ہے جو ان سے ان کے قدماء تلامذہ نے بیان کی ہیں یا انھوں نے دیگر ثقات کی موافقت کی ہے جن کی صحت اور جن کے ثبوت میں ہمیں کوئی شک نہیں۔''[3] لہٰذا جب یہ اہتمام امام ابن حبان نے اپنی ''الصحیح'' میں کیا ہے تو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے کہ انھوں نے اس کا اہتمام نہیں کیا ہوگا؟ کیوں نہیں جبکہ انھوں نے بھی صحت کا اہتمام کیا ہے بلکہ ایسا اہتمام کہ ان کے بعد آنے والے حضرات ایسا اہتمام نہیں کر سکے۔ کیوں نہیں جبکہ وہ امام ابن حبان رحمہ اللہ وغیرہ سے بہرنوع مقدم ہیں اور ان کے بعد سبھی حضرات ان کے خوشہ چین ہیں۔

ہماری ان گزارشات سے نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری میں متکلم فیہ راویوں کو دیکھ کر جو حضرات صحیح بخاری میں ان سے مروی روایات پر حرف گیری کی جسارت کرتے ہیں ان کا یہ طریقۂ عمل قطعاً درست نہیں۔ وہ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ کے اسلوب اور طریقۂ کار کو نظرانداز کر دیتے ہیں، یا پھر عصبیت و عقل پرستی کا شکار ہیں۔ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جن حضرات نے یہ شغل اختیار کیا، ہر دور میں اہل علم نے اس کا ایسا جواب دیا کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دکھایا۔ مستقبل میں بھی جو کوئی سستی شہرت کے لیے عقلیت پرستی میں صحیح بخاری پر معترض ہوگا وہ بھی منہ کی کھائے گا۔ إن شاء اللّٰه.

---

① هدي الساري، ص:406. ② هدي الساري، ص:398. ③ الإحسان:90/1.

صحیح بخاری کو کتب حدیث میں اصل الاصول اور ام امہات الکتب کا درجہ حاصل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سے نفع عام کیا جائے اور اس کی تعلیم وتفہیم کا فیضان ہر سو پھیلایا جائے۔ صحیح بخاری کا ترجمہ تو عرصہ ہوا شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے۔ اس کی تفہیم اور توضیح کی بھی بعض حضرات نے کوشش کی جس کے حسن و قبح سے اہل علم واقف ہیں۔ ضرورت تھی کہ عمیق علمی موشگافیوں سے بچ کے اردو دان طبقے کے لیے اس عظیم الشان کتاب کو، جو حقیقت میں اسلام کی مختصر مگر جامع تعبیر ہے اور دین کا انسائیکلوپیڈیا ہے، اسی حسن وخوبصورتی سے توضیح وتشریح کے ساتھ شائع کیا جائے جس کی یہ مستحق ہے، چنانچہ اس کے لیے عالمی شہرت یافتہ ادارے دارالسلام نے اپنے روایتی انداز میں اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے ترجمہ اور تشریح کا فریضہ پاکستان کے معروف عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی ابو محمد حافظ عبدالستار حماد ﷾ نے سرانجام دیا۔ جَزَاهُ اللّٰهُ أَحْسَنَ الْجَزَاءِ.

دارالسلام کے مدیر محترم جناب عبدالمالک مجاہد صاحب ﷾، جنھوں نے علمی دنیا میں دارالسلام کے ذریعے سے واقعی ایک مجاہد فی سبیل اللہ کا کردار ادا کیا ہے، کو دین حنیف سے جس اخلاص کی سعادت حاصل ہوئی اسی کی برکت ہے کہ انھوں نے قرآن مجید سے لے کر دین کے ہر اہم پہلو پر اردو، عربی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں پر مشتمل کتابوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ انھوں نے پہلی بار مکمل صحاح ستہ کو ایک جلد میں شائع کیا، پھر یہ سیٹ علیحدہ علیحدہ بھی طبع کروایا۔ صحیح بخاری کی سب سے بڑی شرح جو اہل علم کے ہاں لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ کی مصداق ہے، زیور طبع سے آراستہ کر کے شائع کی۔ اب وہ اُردو دان حضرات کے ہاتھوں میں بخاری شریف کی شرح تھما دینا چاہتے ہیں تاکہ حدیث کے سب سے صحیح ترین مجموعۂ حدیث سے وہ استفادہ کریں اور آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کر کے جنت کی راہ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دینی جذبے کو بلکہ تمام رفقائے دارالسلام کی مساعیٔ حسنہ کو قبول فرمائے اور انھیں ہمیشہ اپنی مرضیات سے نوازتا رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

خادم العلم والعلماء

ارشاد الحق اثري عفي عنه

محرم الحرام 1432ھ

ارشاد باری تعالیٰ
وما ینطق عن الھوی
ان ھو الا وحی یوحی
اور وہ (نبی کریم ﷺ) اپنی خواہش سے نہیں بولتے۔
وہ تو وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔
(النجم 53: 4،3)

تعارفِ وحی

وحی کے لغوی معنی پوشیدہ طور پر کسی کو بات بتانا ہیں اور اصطلاح شرع میں اس کلام و پیغام کو وحی کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کا آغاز وحی کے بیان سے فرمایا کیونکہ انسانی رشد و ہدایت کے لیے جو ضابطۂ حیات اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کا تمام تر انحصار وحی پر ہے، نیز اس نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے جن شخصیات کا انتخاب کیا ان کی صداقت بھی وحی پر موقوف ہے، لہٰذا جب تک وحی کی عظمت سامنے نہ آئے اس وقت تک اسلام کی حقانیت اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی صداقت مشکوک رہے گی۔ مزید برآں یہ بتانا مقصود ہے کہ دین حنیف لوگوں کے جذبات و قیاسات کا مجموعہ نہیں بلکہ اللہ کی مرضیات پر مبنی شرعی احکام کا نام ہے اور اس عالم رنگ و بو میں منشائے الٰہی معلوم کرنے کے لیے انسانوں کو جس قطعی اور یقینی چیز کی ضرورت ہے وہ وحی الٰہی ہے جو سب سے زیادہ قابل اعتبار اور لائق وثوق ہے جس کے اندر نہ تو تغیر کا امکان ہے اور نہ سہو و نسیان ہی کا شائبہ ہے۔

اس وحی کی عظمت و شوکت کا کیا حال ہوگا جس کا بھیجنے والا مالک ارض و سما، لانے والے قدسی صفات کے حامل حضرت جبریل علیہ السلام اور وصول کرنے والے جامع الکمالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایسی عظیم الشان اور جلیل القدر وحی کہاں سے، کس طرح، کس کے پاس، کون لایا؟ کن حالات میں، کس مقام پر اس کا آغاز ہوا؟ اس کتاب بَدْءُ الْوَحْيِ میں انھی سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے مخصوص تالیفی اسلوب کے اعتبار سے اس مضمون کو دیگر مضامین سے پہلے بیان کر کے غالباً اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میری اس کتاب میں جو کچھ بیان ہوگا وہ عقائد ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا اخلاقیات، اصول ہوں یا فروع، ان سب کا ماخذ وحی الٰہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

1 - كِتَابُ بَدْءِ الْوَحْيِ

وحی کے آغاز کا بیان

قَالَ الشَّيْخُ الْإِمَامُ الْحَافِظُ أَبُو عَبْدِ اللهِ مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ بْنِ إِبْرَاهِيمَ بْنِ الْمُغِيرَةِ الْبُخَارِيُّ - رَحِمَهُ اللهُ تَعَالَى آمِين - :

شیخ، امام، حافظ ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

(١) [بَابٌ] : كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ، وَقَوْلُ اللهِ جَلَّ ذِكْرُهُ ﴿إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ﴾ [النساء: ١٦٣].

باب:1 - رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز کیونکر ہوا؟ نیز اللہ عزوجل کے فرمان (کی وضاحت): ''ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل فرمائی ہے جیسے حضرت نوح (علیہ السلام) اور ان کے بعد آنے والے تمام انبیاء (علیہم السلام) کی طرف نازل کی تھی۔''

وضاحت: وحی کا لفظ عام ہے۔ وحی متلو ہو یا غیر متلو، حضرت جبریل علیہ السلام اسے بصورت فرشتہ لائیں یا بشکل انسان، پھر وحی بحالت خواب ہو یا بصورت الہام، لفظ وحی تمام صورتوں پر محیط ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس مقام پر صرف وحی کے آغاز کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ وحی کے جملہ مبادی، یعنی وحی، اس کی اقسام، عظمت وصداقت، مقام وحی اور زمان وحی بھی ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ کیفیت بیان نہیں کرنا چاہتے کیونکہ انھوں نے وحی کی کیفیت بیان کرنے کے لیے کتاب فضائل قرآن میں ایک الگ عنوان كَيْفَ نَزَلَ الْوَحْيُ قائم کیا ہے، پھر جو آیت کریمہ لائے ہیں اس سے بھی مذکورہ امور ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کی باریک بینی اور دقت فہم کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ایک ایسی آیت کا انتخاب کیا ہے جس میں وحی، مبدء وحی اور حاملین وحی کے متعلق اتنی تاکیدات ہیں جو کسی دوسری آیت میں نہیں ہیں۔

١ - حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ [عَبْدُاللهِ بْنُ الزُّبَيْرِ] قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيِّ

[1] حضرت علقمہ بن وقاص لیثی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ کہتے سنا کہ میں نے

قَالَ: أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّيْمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ: سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلٰى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ».

[انظر: ٥٤، ٢٥٢٩، ٣٨٩٨، ٥٠٧٠، ٦٦٨٩، ٦٩٥٣]

رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملے گا، پھر جس شخص نے دنیا کمانے یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لیے وطن چھوڑا تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو نیت کی اہمیت یا اس کے احکام و مسائل بیان کرنے کے لیے پیش نہیں کیا کیونکہ انھوں نے اس مقصد کے لیے کتاب الایمان کے آخر میں ایک الگ باب بعنوان باب ماجاء أن الأعمال بالنية والحسبة قائم کیا ہے۔ حضرت امام غالبًا اس مقام پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عمل کا تعلق وحی کے ساتھ بھی ہے اور عامل کی نیت کے ساتھ بھی، وہ اس طرح کہ انسان کو اس عالم رنگ و بو میں ایسے اعمال کے بجا لانے کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے جن کا اچھا یا برا ہونا وحی الٰہی پر موقوف ہے۔ پھر اللہ کے ہاں ان اعمال کا اعتبار کیا جائے گا جو خلوص نیت پر مبنی ہوں گے، یعنی نہ تو کوئی انسان وحی کے بغیر اچھے اعمال اختیار کر سکتا ہے اور نہ نیت کے بغیر اچھے اعمال لائق اعتبار ہی ہو سکتے ہیں۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ آیت کریمہ سے بھی عظمت وحی کو ثابت کرتے ہیں، ان کا استدلال آیت کے ان الفاظ سے ہے: ﴿اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ﴾ یعنی ہم نے وحی بھیجی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کسی معمولی ذات نے وحی کا نزول نہیں کیا کہ اس کی عظمت و تقدیس میں کچھ قصور (کمی) ہو۔ پھر حدیث نیت لا کر یہ اشارہ فرمایا کہ اتنی عظیم الشان وحی کے نزول کا سبب رسول اللہ ﷺ میں اعلیٰ درجے کا اخلاص نیت ہی ہے۔ ③ اس حدیث کی مذکورہ بالا عنوان سے بایں طور مطابقت بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ نبوت و رسالت ایسی چیز نہیں ہے جسے محنت و ریاضت کے بل بوتے پر حاصل کیا جا سکے بلکہ یہ خاص عنایات ربانی کا نتیجہ ہے، تاہم اہل دنیا سے کٹ کر اللہ کی طرف ہجرت کر کے غار حرا میں خلوت گزیں ہونا عطیۂ نبوت ملنے کا سبب ضرور بنا ہے۔ اور یہ خلوت گزینی بھی اللہ کے فضل اور احسان ہی سے نصیب ہوئی۔ گویا رسول اللہ ﷺ کا اپنے گھر سے غار حرا تک ہجرت کرنا نزول وحی کا مقدمہ اور مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کرنا ظہور وحی کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوا کیونکہ مکے میں کفار کی مخالفت کی وجہ سے وحی کو عام کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ہجرت مدینہ کے بعد اس وحی کا خوب چرچا ہوا۔[1] ④ اس حدیث میں اعمال سے مراد انسان کے وہ اختیاری افعال ہیں جو عبادات کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ عبادات ہی میں اخلاص اور حسن نیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فسادِ نیت سے عبادات کی ادائیگی نہ صرف ثواب سے محرومی کا باعث ہے بلکہ اللہ کے ہاں اس پر سخت سزا کا بھی اندیشہ ہے۔ اس کے برعکس عادات و معاملات نیت کے بغیر بھی وقوع پذیر ہو جاتے ہیں، مثلاً: کوئی شخص کسی کو ہزار روپے دیتا ہے تو دوسرے کی ملکیت ثابت ہو جائے گی، البتہ اگر وہ اس میں نیت اللہ کی رضا

[1] المتواري على تراجم أبواب البخاري، ص:49.

کر لے تو پھر اخلاص آ جانے سے اسے بھی عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے جس پر اللہ کے ہاں اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔
⑤ چونکہ نیت دل کا فعل ہے، اس لیے زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا تکلف محض ہے، نیز جن عبادات و اعمال کا تعلق ہی دل سے ہے، مثلاً: خشیت و انابت اور خوف و رجا وغیرہ، ان میں سرے سے نیت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بہر حال حج اور عمرے کی نیت کے علاوہ کسی بھی عمل کی نیت کے لیے زبان سے نیت کے الفاظ بولنا بدعت ہے۔ ہر عمل کے لیے دل میں جو نیت ہوتی ہے، وہی کافی ہے۔

٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصَمُ عَنِّي، وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ، وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِي فَأَعِي مَا يَقُولُ» - قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا: وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا.
[انظر: ٣٢١٥]

[2] ام المومنین حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضرت حارث بن ہشام ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کبھی تو وحی آنے کی کیفیت گھنٹی کی ٹن ٹن کی طرح ہوتی ہے اور یہ کیفیت مجھ پر بہت گراں گزرتی ہے، پھر جب فرشتے کا پیغام مجھے یاد ہو جاتا ہے تو یہ موقوف ہو جاتی ہے۔ اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آ کر مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں۔'' حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے: میں نے سخت سردی کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب وحی آتی تو اس کے موقوف ہونے پر آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ نکلتا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے عظمت وحی کا پتہ چلتا ہے کہ نزول وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ کی حالت بدل جاتی، آپ کا چہرۂ انور متغیر ہو جاتا۔ پھر یہ معاملہ ایک دو بار پیش نہیں آیا بلکہ زندگی میں سیکڑوں مرتبہ آپ کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑا، اس سے جہاں عظمت وحی کا پتہ چلتا ہے وہاں رسول اللہ ﷺ کی صداقت و عصمت بھی معلوم ہوتی ہے۔ ② اس سوال میں کہ وحی کیسے آتی تھی؟ تین چیزیں آتی ہیں: * نفس وحی کی کیفیت۔ * حامل وحی حضرت جبریل ؑ کی کیفیت۔ * خود رسول اللہ ﷺ کی کیفیت۔ جواب میں ان تینوں چیزوں کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ③ حدیث کے الفاظ: ''وہ مجھ پر بہت گراں گزرتی ہے'' سے معلوم ہوا کہ وحیٔ الٰہی کلام نفسی کی کوئی صورت نہ تھی کیونکہ کلام نفسی کا حامل دماغی فتور کی وجہ سے ''غیبی باتیں'' کرتا ہے اور اس کو تکلیف و مشقت اور پریشانی اور گھبراہٹ بالکل نہیں ہوتی جبکہ رسول اللہ ﷺ کسی غیبی طاقت کے دباؤ اور کلام الٰہی کی گراں باری کی وجہ سے نزول وحی کے وقت پسینے سے شرابور ہو جاتے اور گھبراہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔ ④ اس حدیث میں

وحی کی ان دو صورتوں کو بیان کیا گیا ہے جو عام طور پر آپ کو پیش آتی تھیں۔ ان کے علاوہ کبھی خواب کی صورت میں اور کبھی بذریعۂ الہام والقاء بھی وحی آتی اور بسا اوقات حضرت جبریل علیہ السلام اپنے اصل روپ میں وحی لے کر تشریف لاتے۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ کے پس پردہ بذاتِ خود کلام فرمانے سے بھی وحی کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ حدیث معراج اس کی صریح دلیل ہے۔ ④ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گھنٹی کی آواز سے نبی ﷺ کو سخت نفرت تھی، ایسے حالات میں نزول وحی کو ایسی آواز سے تشبیہ کیوں دی گئی ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا جواب بایں الفاظ دیتے ہیں کہ جرس (گھنٹی) میں دو چیزیں ہوتی ہیں: ایک موسیقی وترنم جو قابل نفرت ہے، دوسری آواز کی شدت وقوت۔ وحی کو جرس کی دوسری صفت سے تشبیہ دی گئی ہے جو قابل نفرت نہیں۔ اسی شدت کی وجہ سے وحی کو ''قول ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کا اعصابی نظام اس حد تک متاثر ہوتا کہ سخت سردی کے موسم میں بھی آپ پسینے سے شرابور ہو جاتے۔ ⑤ ایک روایت میں ہے کہ نزول وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنائی دیتی تھی۔ آواز کی یہ کیفیت سامعین کے اعتبار سے تھی، البتہ رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ آواز گھنٹی بجنے کی طرح ہوتی تھی تاکہ خارجی شور وغل سماع وحی میں دخل انداز نہ ہو۔[1] ⑥ یہ بھی معلوم ہوا کہ اطمینان قلب کے لیے سوال کرنا یقین کے منافی نہیں جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے احیائے موتیٰ کے متعلق سوال کیا تھا، نیز حضرات انبیاء علیہم السلام سے ان پر گزرنے والے احوال وواقعات کے متعلق سوال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[2]

٣ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّهَا قَالَتْ: أَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ، فَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ، ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ - وَهُوَ التَّعَبُّدُ - اللَّيَالِيَ ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدُ لِذَلِكَ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا، حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاءٍ، فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ: اقْرَأْ، قَالَ: «مَا أَنَا بِقَارِئٍ»، قَالَ: «فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اقْرَأْ، قُلْتُ:

[3] ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں کی صورت میں ہوئی۔ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہو جاتا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی، چنانچہ آپ غار حرا میں خلوت اختیار فرماتے اور کئی کئی رات گھر تشریف لائے بغیر مصروف عبادت رہتے۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے اور تقریباً اتنے ہی دنوں کے لیے پھر توشہ لے جاتے۔ یہاں تک کہ ایک روز جبکہ آپ غار حرا میں تھے، (یکایک) آپ کے پاس حق آ گیا اور ایک فرشتے نے آ کر آپ سے کہا: پڑھو! آپ نے فرمایا: ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' آپ کا فرمان ہے: ''اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر خوب بھینچا، یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی، پھر اس نے

[1] فتح الباري :19/1. [2] فتح الباري :22/1.

مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اِقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ○ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ [العلق: ١-٣] فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ يَرْجُفُ فُؤَادُهُ، فَدَخَلَ عَلٰى خَدِيجَةَ بِنْتِ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ: «زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي». فَزَمَّلُوهُ حَتّٰى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ، فَقَالَ لِخَدِيجَةَ - وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ -: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي»، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: كَلَّا، وَاللهِ! مَا يُخْزِيكَ اللهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتُعِينُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ، فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتّٰى أَتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزّٰى - اِبْنَ عَمِّ خَدِيجَةَ - وَكَانَ امْرَءًا قَدْ تَنَصَّرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ، فَيَكْتُبُ مِنَ الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَكْتُبَ، وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ، فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: يَا ابْنَ عَمِّ! اِسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرٰى؟ فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَبَرَ مَا رَأٰى، فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ: هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَّلَ اللهُ عَلٰى مُوسٰى، يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعٌ، لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ»؟ قَالَ: نَعَمْ، لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِيَ، وَإِنْ

مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھو! میں نے کہا: میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ مجھے پکڑ کر دبوچا، یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی، پھر چھوڑ کر کہا: پڑھو! میں نے پھر کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار مجھے پکڑ کر بھینچا، پھر چھوڑ کر کہا: ''پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھو! اور تمھارا رب تو نہایت کریم ہے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ ان آیات کو لے کر واپس آئے اور آپ کا دل (خوف سے) دھڑک رہا تھا، چنانچہ آپ (اپنی بیوی) حضرت خدیجہ بنت خویلد ؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔'' انھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی، یہاں تک کہ آپ سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہوگئی۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ ؓ کو واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے فرمایا: ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔'' حضرت خدیجہ ؓ نے کہا: قطعاً نہیں، اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رنجیدہ نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، درماندوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، فقیروں، محتاجوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمانوں کی میزبانی کرتے ہیں اور حق کے سلسلے میں پیش آنے والے مصائب میں مدد کرتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہ ؓ رسول اللہ ﷺ کو ساتھ لے کر اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزی کے پاس آئیں۔ ورقہ دور جہالت میں عیسائی ہوگئے تھے اور عبرانی زبان بھی لکھنا جانتے تھے، چنانچہ عبرانی زبان میں حسب توفیق الٰہی انجیل لکھتے تھے۔ اس وقت بہت بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہ ؓ نے کہا: بھائی جان! اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔ ورقہ نے پوچھا: بھتیجے کیا دیکھتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا، بیان فرما

يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ أَنْصُرْكَ نَصْرًا مُؤَزَّرًا، ثُمَّ لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوُفِّيَ وَفَتَرَ الْوَحْيُ. [انظر: ٣٣٩٢، ٤٩٥٣، ٤٩٥٥، ٤٩٥٦، ٤٩٥٧، ٦٩٨٢]

دیا۔ اس پر ورقہ نے آپ سے کہا: یہ تو وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں توانا ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا تو کیا وہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ہاں! جب بھی کوئی آدمی اس طرح کا پیغام لایا جیسا آپ لائے ہیں تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی۔ اور اگر مجھے آپ کا زمانہ نصیب ہوا تو آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔ اس کے بعد ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی رک گئی۔

فوائد و مسائل: ① اچھے اور سچے خواب نبوت کا حصہ ہیں۔ وحی الٰہی سے مشرف اور مانوس کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو کچھ عرصے تک سچے خواب دکھائے گئے، چنانچہ آپ جو خواب بھی دیکھتے عالم شہادت، یعنی دنیا میں اس کا ظہور بلا کم و کاست ہو جاتا تھا۔ اس طرح آپ کا رابطہ عالمِ مثال سے کرا دیا گیا جو عالم غیب، یعنی منبع وحی سے تعلق کا پیش خیمہ ثابت ہوا، گویا سچے خوابوں کے ذریعے حقائق نبوت سے آپ کو آگہی کرا دی گئی۔ ② خواب میں ہم مادی امور سے ایک حد تک قطع تعلق ہو جاتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے خوابوں کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کے لیے بیداری میں بھی خلوت گزینی محبوب بنا دی، چنانچہ غار حرا کا انتخاب اسی روحانی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ③ عرصۂ وحی 23 برس پر محیط ہے، ان میں چھ ماہ سچے خوابوں پر مشتمل ہیں، غالباً اسی لیے حدیث میں سچے خوابوں کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔[1] لیکن حصہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی آدمی محض رؤیائے صادقہ کے بل بوتے پر نبی بن جائے، جیسے اذان کے کسی کلمے کو باآواز بلند کہنے والے کو مؤذن نہیں کہا جا سکتا اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر سچے خواب دیکھنے والا نبی ہو۔ اس کے علاوہ بعض روایات میں وضاحت ہے کہ نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ میرے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا، البتہ مبشرات، یعنی رؤیائے صادقہ باقی ہیں۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ نبوت اور چیز ہے اور مبشرات چیزے دیگر است۔ ④ اس روایت میں کچھ اختصار ہے۔ صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں [تَصْدُقُ الْحَدِيثَ] کے الفاظ بھی ہیں، یعنی آپ گفتار میں سچے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے متعلق اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کر کے آپ کے اخلاق فاضلہ کی بہترین تصویر کشی فرمائی ہے۔ یقیناً یہ چھ خصلتیں مکارم اخلاق کی بنیاد ہیں اور ان کا حامل انسان معاشرے میں باعزت اور اس کا مستقبل انتہائی تابناک ہوتا ہے۔ ⑤ ناموس وحی نے رسول اللہ ﷺ کو تین دفعہ بھینچا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھینچنے سے عموماً جذبات برانگیختہ ہوتے اور خفتہ قوتیں جاگ اٹھتی ہیں، غالباً اسی بنا پر آپ کو بھینچا گیا کہ آپ کے قوائے

---

[1] صحيح البخاري، التعبير، حديث: 6989. [2] جامع الترمذي، الرؤيا، حديث: 2272، ومسند الإمام أحمد: 267/3. والخبر صحيح.

نبوت بیدار ہو جائیں اور آپ پوری یکسوئی سے وحیٔ الٰہی کی سماعت فرمائیں۔ یا اس وجہ سے کہ سینے سے لگا کر بھینچنے سے باہم موانست پیدا ہوتی ہے اور وحشت و بیگانگی کافور ہو جاتی ہے۔ ⑥ وحی کے موقوف ہونے کے زمانے میں صرف نزول قرآن موقوف ہوا تھا، تاہم جبریل علیہ السلام کا رسول اکرم ﷺ سے رابطہ منقطع نہیں ہوا تھا، چنانچہ جب آپ توقف وحی سے پریشان ہوئے تو جبریل علیہ السلام نے بارہا تسلی دی اور آپ کو نبیٔ برحق ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا۔[1] ⑦ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان جب کسی اہم حادثے سے دوچار ہو تو کسی قابل اعتماد ساتھی، خواہ وہ خاتون خانہ ہی ہو، سے اس کا ذکر کرے، اور مخلص ساتھی کو بھی چاہیے کہ وہ حوصلہ افزائی اور تسلی کا انداز اپنائے تاکہ حادثے سے دوچار شخص کے دل سے خوف اور گھبراہٹ کے اثرات دور ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ایسے موقع پر کسی تجربہ کار اور سمجھ دار بزرگ سے رابطہ کرنا بھی مفید ہے تاکہ وہ صحیح مشورہ دے سکے۔[2]

٤ - قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَأَخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ الْأَنْصَارِيَّ قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فَتْرَةِ الْوَحْيِ فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ: «بَيْنَا أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ: زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنذِرْ﴾ إِلٰى قَوْلِهِ: ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ [المدثر: ١-٥] فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَوَاتَرَ». تَابَعَهُ عَبْدُاللهِ بْنُ يُوسُفَ وَأَبُو صَالِحٍ، وَتَابَعَهُ هِلَالُ ابْنُ رَدَّادٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ، وَقَالَ يُونُسُ وَمَعْمَرٌ: بَوَادِرُهُ. [انظر: ٣٢٣٨، ٤٩٢٢، ٤٩٢٣، ٤٩٢٤، ٤٩٢٥، ٤٩٢٦، ٤٩٥٤، ٦٢١٤]

[4] حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی زبانی بندش وحی کا واقعہ سنا، آپ نے بیان فرمایا: ''ایک بار میں (کہیں) جا رہا تھا کہ مجھے اچانک آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حرا میں آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اسے دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا۔ گھر لوٹ کر میں نے اہل خانہ سے کہا: مجھے چادر اوڑھاؤ، مجھے چادر اوڑھاؤ۔ (انھوں نے مجھے چادر اوڑھا دی۔) اس وقت اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی: ''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو، اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو، اور اپنے کپڑے پاک رکھو، اور گندگی سے دور رہو۔'' پھر نزول وحی میں تیزی آ گئی اور لگاتار نازل ہونے لگی۔''

اس حدیث کو (لیث بن سعد سے یحییٰ بن بکیر کے علاوہ) عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح (عبداللہ بن صالح) نے بھی روایت کیا ہے۔ اور ابن شہاب زہری سے (عقیل کے علاوہ) ہلال بن رداد نے بھی بیان کیا ہے، نیز یونس اور معمر نے (گزشتہ حدیث میں مذکور فُؤَادُهُ کے بجائے) بَوَادِرُهُ کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔

① صحيح البخاري، التعبير، حديث:6982. ② فتح الباري:25/1.

فوائد و مسائل: ① یہ روایت پہلی روایت ہی کا تتمہ ہے جسے ایک دوسری سند سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی سند حضرت عائشہ ؓ تک حضرت عروہ کے واسطے سے پہنچتی ہے جبکہ اس روایت کی سند حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے واسطے سے حضرت جابر ؓ تک پہنچتی ہے۔ پہلی روایت میں ابن شہاب زہری نے بواسطۂ عروہ عن عائشہ ؓ بندش وحی تک کا واقعہ بیان کیا تھا اور اس روایت میں بواسطۂ ابوسلمہ عن جابر ؓ اس کا نتیجہ ذکر کیا ہے۔ ② امام بخاری ؒ کی عادت ہے کہ جہاں تفرد یا خفا کی وجہ سے حدیث میں شک وشبہ یا تردد کا اندیشہ ہو وہاں الفاظ حدیث کی تائید میں مزید شواہد پیش کرتے ہیں۔ اسے محدثین کی اصطلاح میں متابعت کہا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک متابعت تامہ اور دوسری متابعت ناقصہ یا قاصرہ۔ ○ جب راوی کسی دوسرے کی موافقت کرتے وقت اسی استاد سے بیان کرے جس سے پہلا راوی بیان کر رہا ہے تو یہ متابعت تامہ ہوگی۔ ○ اور اگر دوران سند میں دادا استاد یا اس سے اوپر موافقت ہو تو وہ متابعت قاصرہ ہوگی۔ یہاں بھی امام بخاری ؒ نے متابعت بیان فرمائی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ لیث بن سعد سے یحییٰ بن بکیر کے علاوہ عبداللہ بن یوسف اور ابوصالح عبداللہ بن صالح کا اس روایت کو بیان کرنا متابعت تامہ ہے اور ابن شہاب زہری سے عقیل کے علاوہ ہلال بن ردّاد کا اس روایت کی تخریج کرنا متابعت ناقصہ ہے۔ پھر آپ نے یونس اور معمر کے حوالے سے الفاظ حدیث کے اختلاف کو بیان کیا ہے کہ ان دونوں نے ابن شہاب زہری سے فؤادہ کے بجائے بوادرہ کا لفظ بیان کیا ہے۔[1] بوادر، بادرۃ کی جمع ہے۔ اس سے مراد گردن اور کندھے کا درمیانی حصہ ہے جو شدت خوف کے وقت اسی طرح پھڑکنے لگتا ہے جیسے دل کانپتا ہے۔ گویا دونوں روایتیں اصل معنی کے اعتبار سے برابر ہیں کیونکہ دونوں ہی گھبراہٹ پر دلالت کرتی ہیں۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی [يَآيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ......] ہے جبکہ حدیث سابق سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی وحی [اِقْرَأْ بِاسْمِ ......] ہے۔ دونوں ہی باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ [يَآيُّهَا الْمُدَّثِّرُ] اس اعتبار سے پہلی وحی ہے کہ بندش وحی کے بعد دوبارہ وحی کے نزول کا آغاز سورۂ مدثر سے ہوا، یعنی پہلی وحی [اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ] کے بعد وحی کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔ ④ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کمبل اوڑھانے کا مطالبہ کیا۔ اس کی وجہ شاید آپ کی گھبراہٹ تھی جس کی وجہ سے آپ پر کپکپی طاری ہوئی اور آپ نے اہل خانہ سے کپڑا اوڑھا دینے کی فرمائش کی کیونکہ بسااوقات گھبراہٹ کی وجہ سے بھی کپڑا اوڑھا جاتا ہے۔ اور ایسا صرف پہلی بار ہوا۔ بعدازاں جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو بوجھ پڑنے سے آپ کو سخت پسینہ آ جاتا لیکن گھبراہٹ طاری نہیں ہوتی تھی اور نہ آپ کپڑا اوڑھانے ہی کا مطالبہ کرتے تھے۔ ⑤ [حَمِيَ الْوَحْيُ] کے لغوی معنی ہیں: ''وحی گرم ہوگئی۔'' جب کوئی چیز گرم ہو جائے تو کچھ دیر کے بعد ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ تو تَوَاتَرَ کے لفظ سے یہ اشتباہ ختم ہو گیا، یعنی وحی کا معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ پہلے سے زیادہ تسلسل کے ساتھ اس کا آغاز ہو گیا۔

٥ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ أَبِي عَائِشَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِي

[5] حضرت ابن عباس ؓ فرمان الٰہی: ''(اے پیغمبر!) آپ وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4953، والتعبير، حديث: 6982.

قَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِۦ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِۦٓ﴾ [القيامة:١٦] قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً، وَكَانَ مِمَّا يُحَرِّكُ شَفَتَيْهِ - فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَأَنَا أُحَرِّكُهُمَا لَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُحَرِّكُهُمَا. وَقَالَ سَعِيدٌ: أَنَا أُحَرِّكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يُحَرِّكُهُمَا، فَحَرَّكَ شَفَتَيْهِ - فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِۦ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِۦٓ ۞ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُۥ وَقُرْءَانَهُۥ﴾ قَالَ: جَمْعَهُ لَكَ صَدْرُكَ وَتَقْرَأُهُ ﴿فَإِذَا قَرَأْنَٰهُ فَٱتَّبِعْ قُرْءَانَهُۥ﴾ قَالَ: فَاسْتَمِعْ لَهُ وَأَنْصِتْ ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُۥ﴾ [القيامة:١٦-١٩] ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ، فَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَعْدَ ذٰلِكَ إِذَا أَتَاهُ جِبْرِيلُ اِسْتَمَعَ، فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ ﷺ كَمَا كَانَ قَرَأَ. [انظر: ٤٩٢٧، ٤٩٢٨، ٤٩٢٩، ٥٠٤٤، ٧٥٢٤]

رسول اللہ ﷺ نزول وحی کے وقت بہت مشقت برداشت کرتے تھے۔ اور آپ (اکثر) اپنے لب ہائے مبارک کو حرکت دیا کرتے تھے...... حضرت ابن عباس ؓ نے کہا: میں آپ کے سامنے اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ ہلاتے تھے۔ (آپ کے شاگرد) حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ میں اپنے ہونٹ ہلاتا ہوں جس طرح میں نے حضرت ابن عباس ؓ کو ہلاتے ہوئے دیکھا، پھر انھوں نے اپنے ہونٹ ہلائے...... (حضرت ابن عباس ؓ نے کہا:) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ''(اے نبی!) اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اسے جمع کرنا اور پڑھا دینا ہماری ذمے داری ہے۔'' یعنی آپ کا سینہ اسے محفوظ رکھے گا اور آپ اسے پڑھیں گے۔ پھر ارشاد الٰہی: ''چنانچہ جب ہم پڑھ چکیں تو ہمارے پڑھنے کی پیروی کرو۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: خاموشی سے کان لگا کر سنتے رہو۔ پھر فرمان الٰہی: ''اس کا بیان کرنا بھی ہمارا کام ہے۔'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ ان آیات کے نزول کے بعد جب جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آ کر قرآن سناتے تو آپ کان لگا کر سنتے رہتے۔ جب وہ چلے جاتے تو آپ (وعدۂ الٰہی کے مطابق) اس طرح پڑھتے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام نے پڑھا ہوتا۔

فوائد و مسائل: ① وحی کی عظمت و جلالت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نزول وحی کے وقت ہی جلدی جلدی پڑھنے میں مشغول ہو جاتے مبادا اس عظیم اور بابرکت کلام کا کچھ حصہ یاد کرنے سے رہ جائے۔ اس بات سے بھی وحی کی عظمت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر وحی کی حفاظت کے لیے کسی انسان کو ذمے دار بنایا جاتا تو نسیان کا احتمال اور غلطی کا امکان باقی رہتا لیکن رب العالمین نے اس کی حفاظت، یعنی قراءت و حفظ اور بیان معانی کی ذمہ داری خود اٹھائی ہے۔ ② نزول وحی کے وقت آپ ﷺ تین طرح کی مشقتیں برداشت کرتے تھے: ایک یہ کہ آپ قول ثقیل سن رہے ہوتے۔ دوسرے زبان مبارک کو جلدی جلدی حرکت دیتے۔ تیسرے اس کے مطالب و معانی بھی محفوظ فرما رہے ہوتے تھے۔ پھر محبوب اپنے محب کو اپنی صفت کلام عطا

فرما رہا ہے، گویا آپ فرط اشتیاق اور حفاظت کلام کے باعث یہ مشقتیں برداشت کرتے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کی ذمہ داری قبول فرمالی تو آپ کا حافظہ اتنا قوی ہو گیا کہ حضرت جبریل علیہ السلام لمبی لمبی سورتیں پڑھتے، رسول اللہ ﷺ انھیں اطمینان اور سکون سے سماعت فرماتے اور حضرت جبریل علیہ السلام کے رخصت ہونے کے بعد آپ انھیں اسی طرح پڑھ لیتے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام نے پڑھی ہوتیں۔ ③ اس حدیث میں قرآن مجید کے متعلق تین مراحل کا ذکر ہے: پہلا مرحلہ ہے رسول اللہ ﷺ کے سینۂ مبارک میں محفوظ طریقے سے وحی کو اتارنا۔ دوسرا مرحلہ ہے قلب مبارک میں جمع شدہ قرآن کو زبان سے پڑھنے کی توفیق دینا۔ آخری مرحلہ قرآن کے مجملات کی تشریح اور مشکلات کی توضیح ہے جو احادیث صحیحہ کی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ ان تمام مراحل کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے۔ ④ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ﴾ سے امام بخاری رحمہ اللہ ایک ناقابل تردید حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی اور اپنے عمل سے سکھائی ہے، سب اللہ کی وحی کے تحت ہے، اس لیے جو لوگ حدیث نبوی کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں ان کی جملہ کوششیں مذموم اور تمام خیالات بے سروپا اور غلط ہیں۔ ⑤ قرآنی آیات کا یہ کتنا بڑا اعجاز ہے کہ وہ ایک معصوم بچے کو بھی یاد ہو جاتی ہیں جبکہ دوسری طرف مذہبی کتابیں مختصر ہونے کے باوجود بڑا آدمی بھی انھیں یاد نہیں کر سکتا۔ ⑥ آیت کریمہ میں زبان کو حرکت دینے کا ذکر ہے جبکہ حدیث شریف میں ہونٹ ہلانے کا تذکرہ ہے، مناسب تھا کہ آیت کی مناسبت سے حدیث میں بھی زبان کا ذکر ہوتا لیکن راوی نے اس مقام پر اختصار سے کام لیا ہے، چنانچہ کتاب التفسیر میں ہونٹوں کے ساتھ زبان کا بھی ذکر ہے۔[1]

٦ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ؛ [ح:] قَالَ: وَحَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ وَمَعْمَرٌ نَحْوَهُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ، وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ، وَكَانَ يَلْقَاهُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ، فَلَرَسُولُ اللهِ أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ.

[انظر: ١٩٠٢، ٣٢٢٠، ٣٥٥٤، ٤٩٩٧]

[6] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے، خصوصاً رمضان میں جب حضرت جبریل علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوتی تو بہت سخاوت کرتے۔ اور حضرت جبریل علیہ السلام رمضان المبارک میں ہر رات آپ سے ملاقات کرتے اور آپ ان کے ساتھ قرآن مجید کا دور فرماتے۔ الغرض رسول اللہ ﷺ صدقہ کرنے میں کھلی (تیز) ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوتے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث کا عنوان سے تعلق اس طرح ہے کہ پہلی حدیث میں نزول وحی کی جگہ کا تعین تھا کہ وحی کا آغاز غار حرا میں ہوا اور اس حدیث میں ابتدائے وحی کا وقت بتایا گیا ہے کہ وہ ماہ رمضان المبارک ہے۔ اس سے وحی کی عظمت

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4929.

بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کسی معمولی چیز کے لیے زمان و مکان کا تعین نہیں کیا جاتا بلکہ اس قسم کا اہتمام کسی اہم اور بلند پایہ چیز ہی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ② سخاوت کسی کے سوال کرنے پر دل کے نرم ہونے کی وجہ سے کوئی چیز دینے کا نام ہے جبکہ جُود کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جس کے لیے مناسب ہو، اس کے مانگے بغیر ہی اسے دے دینا۔ بعض نے اس کا فرق یہ کیا ہے کہ سخاوت کا مطلب کچھ دے دینا اور کچھ اپنے لیے رکھ لینا ہے جبکہ جود کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ دے دینا اور تھوڑا بہت اپنے لیے رکھنا۔ [1] رسول اللہ ﷺ واقعی اَجْوَدُ النَّاس تھے کیونکہ ہر شخص کو وہی کچھ دیتے جو اس کے مناسب حال ہوتا، چنانچہ فقیروں کو مال دیتے، تشنگان علوم کی علمی پیاس بجھاتے اور گم کردہ راہوں کو سیدھا راستہ دکھاتے، الغرض حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جُود کے تین درجے تھے: ✱ عام طور پر بھی آپ تمام لوگوں سے زیادہ صاحب جود وسخا تھے۔ ✱ رمضان المبارک میں یہ جودوکرم اور بڑھ جاتا تھا۔ ✱ رمضان کی راتیں مزید اس شان جود وکرم میں اضافے کا باعث ہوتیں جبکہ آپ جبریل علیہ السلام سے ملاقات فرماتے۔ اس دوران میں کسی سائل کو تہی دامن اور مایوس واپس نہ کرتے حتیٰ کہ اگر قرض بھی لینا پڑتا تو بھی خیرات کا فیض عام جاری رکھنے کے لیے ایسا کر گزرتے تھے۔ ③ اَلرِّيحُ الْمُرْسَلَة اس ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی تیز چلتی ہے اور بارش کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جودوسخا کو اس قسم کی بارش لانے والی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے، جو کہ بہت ہی مناسب ہے، چنانچہ جس طرح بارانِ رحمت سے بنجر اور بے آباد زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے اسی طرح آپ کے جودوسخا سے بنی نوع انسان کی اجڑی ہوئی دنیا آباد ہوئی اور ہر طرف رشد و ہدایت کے دریا موج زن ہوئے۔ الغرض آپ کے روحانی کمالات سے تمام کائنات فیض یاب ہوئی اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ④ اس حدیث میں سخاوت کے متعلق شوق دلایا گیا ہے، خاص طور پر رمضان المبارک میں دل کھول کر اپنا مال خرچ کرنا چاہیے، نیز جب نیکوکار اور اہل خیر سے ملاقات ہو تو بھی فیاضی اور دریا دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رمضان المبارک میں قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت کرنی چاہیے اور یہ تلاوت تمام اوراد واذکار سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ [2] ⑤ مُدَارَسَه یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام رمضان میں نازل شدہ قرآن پڑھتے اور رسول اللہ ﷺ اسے سنتے، پھر رسول اللہ ﷺ تلاوت فرماتے اور حضرت جبریل علیہ السلام اس کا سماع فرماتے۔ گویا باری باری قرآن مجید پڑھتے جسے ہمارے ہاں دَور کرنا کہا جاتا ہے۔ آخری سال رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے دو مرتبہ دور کیا تاکہ مجموعی طور پر پورے قرآن کی یاد دہانی ہو جائے، نیز یاد رہے کہ یہ آخری دور اسی ترتیب سے ہوا تھا جس ترتیب سے آج ہمارے ہاں قرآن موجود ہے کیونکہ اس آخری دور کے وقت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انھوں نے بعد میں اسی ترتیب سے لکھا جس ترتیب سے انھوں نے سنا تھا۔ واضح رہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ترتیب نزولی کے مطابق قرآن جمع کیا تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ترتیب ان کے علاوہ ہے۔

٧ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي

[7] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے ان سے بیان

① الفروق اللغوية، ص: 196. ② فتح الباري: 31/1.

عُبَيْدُاللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ: أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ بْنَ حَرْبٍ أَخْبَرَهُ: أَنَّ هِرَقْلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ فِي رَكْبٍ مِّنْ قُرَيْشٍ، وَكَانُوا تُجَّارًا بِالشَّامِ فِي الْمُدَّةِ الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَادَّ فِيهَا أَبَا سُفْيَانَ وَكُفَّارَ قُرَيْشٍ، فَأَتَوْهُ وَهُوَ بِإِيلِيَاءَ، فَدَعَاهُمْ فِي مَجْلِسِهِ وَحَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّومِ، ثُمَّ دَعَاهُمْ وَدَعَا تَرْجُمَانَهُ فَقَالَ: أَيُّكُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِهٰذَا الرَّجُلِ الَّذِي يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ؟ فَقَالَ أَبُو سُفْيَانَ: قُلْتُ: أَنَا أَقْرَبُهُمْ نَسَبًا، قَالَ: أَدْنُوهُ مِنِّي، وَقَرِّبُوا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهِ، ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهِ:

کیا کہ ہرقل (شاہ روم) نے انھیں قریش کی ایک جماعت سمیت بلوایا۔ یہ جماعت (صلح حدیبیہ کے تحت) رسول اللہ ﷺ، ابوسفیان اور کفار قریش کے درمیان طے شدہ عرصۂ امن میں ملک شام بغرض تجارت گئی ہوئی تھی۔ یہ لوگ ایلیاء (بیت المقدس) میں اس کے پاس حاضر ہو گئے۔ ہرقل نے انھیں اپنے دربار میں بلایا۔ اس وقت اس کے اردگرد روم کے رئیس بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ان کو اور اپنے ترجمان کو بلا کر کہا: یہ شخص جو اپنے آپ کو نبی سمجھتا ہے تم میں سے کون اس کا قریبی رشتہ دار ہے؟ ابوسفیان نے کہا: میں اس کا سب سے زیادہ قریب النسب ہوں۔ تب ہرقل نے کہا: اسے میرے قریب کر دو اور اس کے ساتھیوں کو بھی قریب کر کے اس کے پس پشت بٹھا دو۔ اس کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا:

قُلْ لَّهُمْ: إِنِّي سَائِلٌ هٰذَا عَنْ هٰذَا الرَّجُلِ، فَإِنْ كَذَبَنِي فَكَذِّبُوهُ.

ان سے کہو کہ میں اس شخص سے اس آدمی (نبی ﷺ) کے متعلق سوالات کروں گا، اگر یہ مجھ سے غلط بیانی کرے تو تم لوگوں نے اسے جھٹلا دینا ہے۔

قَالَ: فَوَاللهِ لَوْلَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَّأْثِرُوا عَلَيَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَلَيْهِ.

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم! اگر جھوٹ بولنے کی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً میں آپ کے متعلق جھوٹ بولتا۔

ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِي عَنْهُ أَنْ قَالَ: كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ؟ قُلْتُ: هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ، قَالَ: فَهَلْ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَّلِكٍ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ؟ قُلْتُ: بَلْ ضُعَفَاؤُهُمْ، قَالَ: أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ؟ قُلْتُ: بَلْ يَزِيدُونَ، قَالَ: فَهَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِّنْهُمْ سَخْطَةً لِّدِينِهِ بَعْدَ أَنْ

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس کے بعد پہلا سوال جو ہرقل نے مجھ سے آپ کے بارے میں کیا، یہ تھا کہ تم لوگوں میں اس کا نسب کیسا ہے؟ میں نے کہا: وہ ہم میں اونچے نسب والا ہے۔ پھر کہنے لگا: اچھا! تو کیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کبھی کہی تھی؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا: اچھا اس کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا: اچھا یہ بتاؤ کہ بڑے لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے یا غریبوں نے؟ میں نے کہا: بلکہ کمزوروں

يَّدْخُلَ فِيهِ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَهَلْ يَغْدِرُ؟ قُلْتُ: لَا، وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا - قَالَ: وَلَمْ يُمْكِنِّي كَلِمَةٌ أُدْخِلُ فِيهَا شَيْئًا غَيْرُ هٰذِهِ الْكَلِمَةِ - قَالَ: فَهَلْ قَاتَلْتُمُوهُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: فَكَيْفَ كَانَ قِتَالُكُمْ إِيَّاهُ؟ قُلْتُ: اَلْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ، قَالَ: مَاذَا يَأْمُرُكُمْ؟ قُلْتُ: يَقُولُ: اُعْبُدُوا اللهَ وَحْدَهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاؤُكُمْ، وَيَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ.

نے۔ کہنے لگا: اس کے پیروکار (دن بدن) بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں؟ میں نے کہا: بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگا: کیا اس دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اس دین سے برگشتہ ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا: اس نے جو بات کہی ہے، کیا اس (دعوائے نبوت) سے پہلے تم لوگ اسے جھوٹ سے متہم کرتے تھے؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہنے لگا: کیا وہ بدعہدی کرتا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، البتہ ہم لوگ اس وقت اس کے ساتھ صلح کی ایک مدت گزار رہے ہیں، نہ معلوم اس میں وہ کیا کرے گا......؟ ابوسفیان کہتے ہیں: اس فقرے کے سوا مجھے اور کہیں (اپنی طرف سے) بات داخل کرنے کا موقع نہیں ملا...... کہنے لگا: کیا تم لوگوں نے اس سے جنگ لڑی ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں! اس نے کہا: پھر تمھاری اور اس کی جنگ کیسی رہی؟ میں نے کہا: جنگ ہم دونوں کے درمیان برابر کی چوٹ ہے۔ کبھی وہ ہمیں زک پہنچا لیتا ہے اور کبھی ہم اسے نقصان سے دوچار کر دیتے ہیں۔ کہنے لگا: وہ تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ میں نے کہا: وہ کہتا ہے: صرف اکیلے اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور اپنے باپ دادا کی (شرکیہ) باتیں چھوڑ دو۔ اور وہ ہمیں نماز، سچائی، پرہیزگاری، پاکدامنی اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے۔

فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ: قُلْ لَهُ: سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُو نَسَبٍ، فَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ تُبْعَثُ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ هٰذَا الْقَوْلَ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا، فَقُلْتُ: لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هٰذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ: رَجُلٌ يَتَأَسّٰى بِقَوْلٍ قِيلَ قَبْلَهُ،

اس کے بعد ہرقل نے اپنے ترجمان سے کہا: تم اس شخص (ابوسفیان) سے کہو کہ میں نے تم سے اس شخص (نبی ﷺ) کا نسب پوچھا تو تم نے بتایا کہ وہ اونچے نسب کا ہے۔ اور دستور یہی ہے کہ پیغمبر (ہمیشہ) اپنی قوم کے اونچے نسب والے ہی بھیجے جاتے ہیں۔ اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ آیا یہ بات اس سے پہلے بھی تم میں سے کسی نے کہی تھی؟ تم نے

وَسَأَلْتُكَ : هَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَّلِكٍ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَّا ، قُلْتُ : فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَّلِكٍ ، قُلْتُ : رَجُلٌ يَّطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ ، وَسَأَلْتُكَ : هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهِمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَّقُولَ مَا قَالَ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَّا ، فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللهِ ، وَسَأَلْتُكَ : أَشْرَافُ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضُعَفَاؤُهُمْ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضُعَفَاءَهُمُ اتَّبَعُوهُ ، وَهُمْ أَتْبَاعُ الرُّسُلِ ، وَسَأَلْتُكَ : أَيَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذٰلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ حَتّٰى يَتِمَّ ، وَسَأَلْتُكَ : أَيَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِّدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَّدْخُلَ فِيهِ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَّا ، وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ يُخَالِطُ بَشَاشَةَ الْقُلُوبِ ، وَسَأَلْتُكَ : هَلْ يَغْدِرُ؟ فَذَكَرْتَ أَنْ لَّا ، وَكَذٰلِكَ الرُّسُلُ لَا تَغْدِرُ ، وَسَأَلْتُكَ : بِمَا يَأْمُرُكُمْ؟ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ، وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ ، وَيَأْمُرُكُمْ بِالصَّلَاةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ ، فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ ، وَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ ، لَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ ، فَلَوْ أَنِّي أَعْلَمُ أَنِّي أَخْلُصُ إِلَيْهِ لَتَجَشَّمْتُ لِقَاءَهُ ، وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ .

بتلایا کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں: اگر یہ بات اس سے پہلے کسی اور نے کہی ہوتی تو میں کہتا کہ یہ شخص ایک ایسی بات کی نقالی کر رہا ہے جو اس سے پہلے کہی جا چکی ہے۔ اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ اس کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں۔ میں کہتا ہوں: اگر اس کے بزرگوں میں سے کوئی بادشاہ گزرا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ شخص اپنے باپ کی بادشاہت کا طالب ہے۔ اور میں نے تم سے دریافت کیا کہ جو بات اس نے کہی ہے، اس (دعوائے نبوت) سے پہلے تم نے کبھی اس پر جھوٹ بولنے کا الزام عائد کیا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں پر جھوٹ باندھنے سے تو پرہیز کرے لیکن اللہ پر جھوٹ بولے۔ میں نے تم سے (یہ بھی) دریافت کیا کہ بڑے لوگ اس کی پیروی کر رہے ہیں یا کمزور؟ تو تم نے بتلایا کہ ناتواں لوگوں نے اس کی پیروی کی ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ ہی پیغمبروں کے پیروکار ہوتے ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا: وہ بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں؟ تو تم نے بتلایا کہ ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ درحقیقت ایمان کا یہی حال ہوتا ہے تا آنکہ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا: کیا اس دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص متنفر ہو کر مرتد بھی ہوتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں۔ اور ایمان کا حال یہی ہوتا ہے کہ اس کی بشاشت (خوشی) جب دل میں سما جاتی ہے (تو پھر نکلتی نہیں)۔ اور میں نے تم سے دریافت کیا: کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ نہیں۔ اور رسول ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ دھوکا نہیں کرتے۔ میں نے تم سے (یہ بھی) پوچھا: وہ تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ تو تم نے بتلایا کہ وہ اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو

شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیتا ہے، تمھیں بت پرستی سے منع کرتا ہے اور نماز، سچائی (اور پرہیزگاری) اور پاکدامنی اختیار کرنے کے متعلق کہتا ہے، لہٰذا جو کچھ تم نے بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ شخص بہت جلد اس جگہ کا مالک ہو جائے گا جہاں میرے یہ دونوں قدم ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ نبی آنے والا ہے لیکن میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ میں اس کے پاس پہنچ سکوں گا تو اس سے ملاقات کی زحمت ضرور اٹھاتا اور اگر میں اس کے پاس (مدینے میں) ہوتا تو ضرور اس کے پاؤں دھوتا۔

ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ الَّذِي بَعَثَ بِهِ دِحْيَةَ إِلٰى عَظِيمِ بُصْرٰى فَدَفَعَهُ إِلٰى هِرَقْلَ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيهِ:

اس کے بعد ہرقل نے رسول اکرم ﷺ کا وہ خط منگوایا جو آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے حاکم بصریٰ کے پاس بھیجا تھا اور اس نے وہ خط ہرقل کو پہنچا دیا تھا۔ ہرقل نے اسے پڑھا، اس میں لکھا تھا:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُّحَمَّدٍ عَبْدِ اللهِ وَرَسُولِهِ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ [الْأَرِيسِيِّينَ]، وَ: ﴿يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: ٦٤].

"شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد (ﷺ) کی طرف سے ہرقل عظیم (شاہِ) روم کے نام۔ اس شخص پر سلام جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اس کے بعد میں تجھے کلمۂ اسلام (لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ) کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جا تو محفوظ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر دے گا۔ اگر تو یہ بات نہ مانے تو تیری رعایا کا گناہ بھی تجھی پر ہوگا۔ اور "اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے: ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا ایک دوسرے کو اپنا کارساز نہ سمجھے۔ چنانچہ اگر یہ لوگ اعراض کریں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو فرمانبردار ہیں۔"

قَالَ أَبُو سُفْيَانَ: فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ مِنْ

ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: جب ہرقل جو کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا

قِرَاءَةِ الْكِتَابِ، كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ وَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَأُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي حِينَ أُخْرِجْنَا: لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ابْنِ أَبِي كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ، فَمَا زِلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ سَيَظْهَرُ حَتَّى أَدْخَلَ اللهُ عَلَيَّ الْإِسْلَامَ.

اور خط پڑھ کر فارغ ہوا تو وہاں آوازیں بلند ہوئیں اور بہت شور مچا اور ہم باہر نکال دیے گئے۔ میں نے باہر آ کر اپنے ساتھیوں سے کہا: ابو کبشہ کے بیٹے کا معاملہ بڑا زور پکڑ گیا ہے، اس سے تو رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ اس روز کے بعد مجھے برابر یقین رہا کہ اس (رسول) کا دین غالب آ کر رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اندر اسلام جاگزیں کر دیا۔

وَكَانَ ابْنُ النَّاطُورِ - صَاحِبُ إِيلِيَاءَ - وَهِرَقْلَ [أُسْقُفًّا] عَلَى نَصَارَى الشَّأْمِ، يُحَدِّثُ: أَنَّ هِرَقْلَ حِينَ قَدِمَ إِيلِيَاءَ أَصْبَحَ خَبِيثَ النَّفْسِ، فَقَالَ بَعْضُ بَطَارِقَتِهِ: قَدِ اسْتَنْكَرْنَا هَيْئَتَكَ، قَالَ ابْنُ النَّاطُورِ: وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَّاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُومِ. فَقَالَ لَهُمْ حِينَ سَأَلُوهُ: إِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِينَ نَظَرْتُ فِي النُّجُومِ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ، فَمَنْ يَخْتَتِنُ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ؟ قَالُوا: لَيْسَ يَخْتَتِنُ إِلَّا الْيَهُودُ فَلَا يُهِمَّنَّكَ شَأْنُهُمْ، وَاكْتُبْ إِلَى مَدَائِنِ مُلْكِكَ فَيَقْتُلُوا مَنْ فِيهِمْ مِّنَ الْيَهُودِ.

ابن ناطور، جو ایلیاء کا گورنر، ہرقل کا مصاحب اور شام کے عیسائیوں کا پادری تھا، بیان کرتا ہے کہ ہرقل جب ایلیاء (بیت المقدس) آیا تو ایک روز صبح کے وقت رنجیدہ خاطر بیدار ہوا۔ اس کے کچھ مصاحب کہنے لگے: ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی طبیعت کچھ بجھی بجھی سی ہے؟ ابن ناطور نے کہا: ہرقل ماہر نجومی اور ستارہ شناس تھا۔ جب لوگوں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا: میں نے آج رات تاروں پر ایک نگاہ ڈالی تو دیکھتا ہوں کہ ختنہ کرنے والوں کے بادشاہ کا ظہور ہو چکا ہے۔ (بتاؤ) ان دنوں کون لوگ ختنہ کرتے ہیں؟ مصاحب کہنے لگے: یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا، ان سے فکر مند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ اپنے اہل علاقہ کو پروانہ بھیج دیں کہ وہاں کے تمام یہودیوں کو مار ڈالیں۔

فَبَيْنَمَا هُمْ عَلَى أَمْرِهِمْ أُتِيَ هِرَقْلُ بِرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ غَسَّانَ يُخْبِرُ عَنْ خَبَرِ رَسُولِ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا اسْتَخْبَرَهُ هِرَقْلُ قَالَ: اذْهَبُوا فَانْظُرُوا أَمُخْتَتِنٌ هُوَ أَمْ لَا؟ فَنَظَرُوا إِلَيْهِ فَحَدَّثُوهُ أَنَّهُ مُخْتَتِنٌ، وَسَأَلَهُ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ: هُمْ يَخْتَتِنُونَ، فَقَالَ هِرَقْلُ: هٰذَا مَلِكُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ، ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ إِلَى صَاحِبٍ لَّهُ بِرُومِيَةَ

اس گفتگو کے دوران میں ہرقل کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جسے شاہ غسان نے بھیجا تھا اور وہ رسول اللہ ﷺ کا حال بیان کرتا تھا۔ جب ہرقل نے اس سے تمام معلومات حاصل کر لیں تو کہنے لگا: اسے لے جاؤ اور دیکھو کہ اس کا ختنہ ہوا ہے یا نہیں؟ لوگوں نے اسے دیکھا اور ہرقل کو بتایا کہ اس کا ختنہ ہوا ہے۔ ہرقل نے اس سے دریافت کیا: عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، وہ ختنہ کرتے ہیں۔ تب ہرقل نے کہا: یہی شخص (پیغمبر) اس امت کا بادشاہ ہے جس

وَكَانَ نَظِيرَهُ فِي الْعِلْمِ، وَسَارَ هِرَقْلُ إِلٰى حِمْصَ فَلَمْ يَرِمْ حِمْصَ حَتّٰى أَتَاهُ كِتَابٌ مِّنْ صَاحِبِهِ يُوَافِقُ رَأْيَ هِرَقْلَ عَلٰى خُرُوجِ النَّبِيِّ ﷺ وَأَنَّهُ نَبِيٌّ، فَأَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَاءِ الرُّومِ فِي دَسْكَرَةٍ لَّهُ بِحِمْصَ، ثُمَّ أَمَرَ بِأَبْوَابِهَا فَغُلِّقَتْ، ثُمَّ اطَّلَعَ فَقَالَ:

يَا مَعْشَرَ الرُّومِ هَلْ لَّكُمْ فِي الْفَلَاحِ وَالرُّشْدِ وَأَنْ يَّثْبُتَ مُلْكُكُمْ فَتُبَايِعُوا لِهٰذَا النَّبِيِّ؟ فَحَاصُوا حَيْصَةَ حُمُرِ الْوَحْشِ إِلَى الْأَبْوَابِ، فَوَجَدُوهَا قَدْ غُلِّقَتْ، فَلَمَّا رَأٰى هِرَقْلُ نَفْرَتَهُمْ وَأَيِسَ مِنَ الْإِيمَانِ قَالَ: رُدُّوهُمْ عَلَيَّ، وَقَالَ: إِنِّي قُلْتُ مَقَالَتِي آنِفًا أَخْتَبِرُ بِهَا شِدَّتَكُمْ عَلٰى دِينِكُمْ فَقَدْ رَأَيْتُ، فَسَجَدُوا لَهُ وَرَضُوا عَنْهُ، فَكَانَ ذٰلِكَ آخِرَ شَأْنِ هِرَقْلَ.

کا ظہور ہو چکا ہے۔ پھر ہرقل نے اپنے علم میں ہم پلہ ایک دوست کو رومیہ میں خط لکھا اور خود حمص روانہ ہوگیا۔ ابھی حمص نہیں پہنچا تھا کہ اسے اپنے دوست کا جواب موصول ہوگیا۔ اس کی رائے بھی رسول اللہ ﷺ کے ظاہر ہونے میں ہرقل کے موافق تھی کہ آپ نبی برحق ہیں۔ آخر حمص پہنچ کر اس نے روم کے سرداروں کو اپنے محل آنے کی دعوت دی۔ (جب وہ آ گئے تو) پھر اس نے حکم دے کر دروازے بند کروا دیے۔ پھر بالا خانے (بالکونی) سے انھیں دیکھا اور کہنے لگا: روم کے لوگو! اگر تم اپنی کامیابی، بھلائی اور بادشاہت پر قائم رہنا چاہتے ہو تو اس پیغمبر کی بیعت کر لو۔ یہ (اعلان حق) سنتے ہی وہ لوگ جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف دوڑے، دیکھا تو وہ بند تھے۔ جب ہرقل نے ان کی نفرت کو دیکھا اور ان کے ایمان لانے سے مایوس ہوا تو کہنے لگا: ان سرداروں کو میرے پاس لاؤ۔ (جب وہ آئے تو) کہنے لگا: میں نے ابھی جو بات تمھیں کہی تھی، وہ صرف آزمانے کے لیے تھی کہ دیکھوں تم اپنے دین پر کس قدر مضبوط ہو، اب میں وہ دیکھ چکا۔ تب تمام حاضرین نے اسے سجدہ کیا اور اس سے راضی ہوگئے۔ یہ ہرقل (کے ایمان لانے) کے متعلق آخری حالات ہیں۔

رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُونُسُ وَمَعْمَرٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ. [انظر: ٥١، ٢٦٨١، ٢٨٠٤، ٢٩٤١، ٢٩٧٨، ٣١٧٤، ٤٥٥٣، ٥٩٨٠، ٦٢٦٠، ٧١٩٦، ٧٥٤١]

یہ روایت صالح بن کیسان، یونس اور معمر نے بھی زہری سے بیان کی ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے پہلے وحی، نزول وحی، اقسام وحی، مقام وحی اور زمانۂ وحی سے متعلقہ احادیث بیان کی ہیں۔ اب ضرورت تھی کہ جس شخصیت پر وحی کا نزول ہوا ہے اس مبارک ہستی کا بھی تعارف کرایا جائے، چنانچہ اس حدیث میں موحیٰ الیہ، یعنی رسول اللہ ﷺ کے احوال و اعمال اور آپ کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے، نیز اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دو زبردست اور ناقابل تردید شہادتیں موجود ہیں: ایک ابوسفیان کا بیان، جو اس وقت آپ کا

سخت دشمن تھا، دوسرے ہرقل کی تصدیق، جو اس وقت ایک عظیم سلطنت کا فرمانروا اور مستند عالم اہل کتاب تھا۔ اس کے علاوہ باب کی غرض عظمت وحی کو بیان کرنا بھی ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ان اوصاف عالیہ کو بیان کیا گیا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کی ذات ستودہ صفات وحی الٰہی کی حق دار تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی اس عظمت سے وحی الٰہی کی عظمت خود ظاہر ہے۔ ② ہرقل روم کے بادشاہ کا نام تھا اور اس ملک کے بادشاہ کو قیصر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ حدیث اس مناسبت سے حدیث ہرقل کہلاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کفار کی طرف سے بیرونی خلفشار اور اندرونی محاذ آرائی سے فارغ ہوئے تو آپ نے مختلف ملوک و سلاطین کو دعوتی خطوط ارسال کیے، چنانچہ آپ نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک خط قیصر روم کو بھی روانہ کیا جو ان دنوں ایفائے نذر کے لیے بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ اس وقت دنیا کی دو بڑی حکومتیں فارس اور روم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آ رہی تھیں، بالآخر فارس نے روم کو ایک فیصلہ کن شکست سے دوچار کر دیا اور شام، مصر اور ایشیائے کوچک کے تمام ملک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایسے حالات میں قرآن کریم نے پیشین گوئی فرمائی کہ بلاشبہ رومی اہل فارس سے مغلوب ہو چکے ہیں لیکن چند سالوں کے اندر اندر وہ فاتح بن کر ابھریں گے، چنانچہ ہرقل ایسے مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات میں اپنا زائل شدہ اقتدار واپس لینے کے لیے سرگرم ہو گیا اور اس وقت نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے فتح و کامرانی دی تو حمص سے پیدل چل کر بیت المقدس پہنچوں گا اور اللہ کا شکر ادا کروں گا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے رومی اہل کتاب کو ایرانی مجوسیوں پر غالب کر دیا، چنانچہ ان دنوں ایفائے نذر کے لیے ہرقل بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ ③ ہرقل کے حوالے سے اس حدیث کا تعلق گویا کتاب بدء الوحی اور کتاب الایمان دونوں سے ہے۔ وحی کے ساتھ تعلق بایں طور ہے کہ ہرقل جو عیسائی مذہب کا حامل تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کیا جو وحی کا نتیجہ ہے۔ اور اس حدیث کا مابعد کتاب، کتاب الایمان سے تعلق اس طرح ہے کہ ایمان کی امتیازی علامت عمل و متابعت ہے جو ہرقل میں نہ تھی، تصدیق جلی اور اقرار موجود ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہ کرنے سے کافر ہی رہا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب کو حدیث نیت سے شروع کیا تھا، گویا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر ہرقل کی نیت درست تھی تو اسے کچھ فائدہ پہنچنے کی امید ہے، بصورت دیگر اس کے مقدر میں ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔[1] ④ ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ کو ابو کبشہ کی طرف منسوب کیا ہے کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا ہے۔ دراصل عرب کا یہ طریقہ ہے کہ کسی کی تحقیر و استہزا کے پیش نظر اسے ایسے شخص کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جو گمنام ہو، لیکن اس مقام پر اصل بات یہ ہے کہ عرب میں ابو کبشہ نامی ایک شخص بھی گزرا تھا جس نے اپنا آبائی دین چھوڑ کر شعریٰ ستارے کی پرستش شروع کر دی تھی۔ چونکہ ابو کبشہ نے ایک نیا دین اختیار کیا تھا، اس لیے ہر وہ شخص جو عرب کے آبائی دین سے ہٹ کر کوئی نیا دین اختیار کرتا، اسے ابن ابی کبشہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[2] اس سلسلے میں کچھ اور تاویلات بھی کی گئی ہیں، ان تمام میں قدر مشترک یہی ہے کہ ابوسفیان نے مذاق اور حقارت سے یہ اسلوب اختیار کیا۔ ⑤ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کافر کسی لقب سے معروف و مشہور ہو تو مسلمانوں کے لیے اسے اس کے لقب سے پکارنا جائز ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ہرقل کو عظیم الروم کے لقب سے یاد کیا۔ اسلام، دشمنوں کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا طریقہ سکھاتا ہے، اس لیے کسی قوم کے معزز و

---

1 فتح الباري:61/1. 2 فتح الباري:57/1.

مکرم شخص کے لیے اونچے القاب استعمال کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں۔ اس کا کم از کم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دشمن اگر دوستی پر آمادہ نہ ہو تو دشمنی میں کمی ضرور آجاتی ہے۔ ہرقل چونکہ رومیوں کی نظر میں باعظمت تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے مروجہ لقب ہی سے یاد کیا ہے۔ ⑥ امام بخاری رحمہ اللہ اختتام پر ایسے الفاظ لاتے ہیں جن سے پڑھنے والے کے لیے اپنی آخرت کے متعلق غوروفکر کرنے کی راہیں کھلتی ہیں۔ وقت گزر جاتا ہے، عمر ختم ہو جاتی ہے لیکن انسان کے اچھے یا برے اعمال کے اثرات ختم نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھائی یا برائی کا معاملہ اس کے خاتمے سے ہوتا ہے۔ ہرقل کا معاملہ بھی ایسا ہی رہا، وہ ایمان نہ لاسکا، حالانکہ اسے بہترین مواقع میسر آئے تھے۔ بہرحال امام بخاری رحمہ اللہ لوگوں کو انجام اور خاتمے کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ ہرقل کا انجام جنت ہوگا یا دوزخ؟ اس سے قطع نظر، تم اپنے خاتمے پر غوروفکر کرو اور آخری حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تیاری میں اپنے آپ کو مصروف کرو۔ ⑦ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کی چھ احادیث سے یہ سمجھایا ہے کہ آگے کتاب میں جس قدر احکام ومسائل آئیں گے وہ سب وحی الٰہی سے ماخوذ ہیں جو محفوظ عن الخطا اور نہایت ہی عظیم الشان ہیں۔ اور وحی کی عظمت بیان کرنے کے بعد سب سے پہلے کتاب الایمان لائے ہیں جو دین اسلام کی خشتِ اول ہے اور اسی ایمان پر آخرت میں نجات کا مدار ہے۔

ایمان کا مفہوم اور اس کی حقیقت

امام بخاری رحمہ اللہ نے وحی کی عظمت و صداقت ثابت کرنے کے بعد ضروری خیال کیا کہ اب اساسِ دین، یعنی ایمان کی وضاحت کی جائے جو عبادات کی صحت و قبولیت کے لیے مدار اور اخروی نجات کے لیے شرط اول ہے، چنانچہ کتاب الایمان میں ایمان ہی سے متعلقہ احادیث ہوں گی۔ لفظ ایمان، امن سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی امن واطمینان ہیں، اسی لغوی معنی کے پیش نظر مومن اسے کہا جاتا ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کے متعلق سکون و اطمینان محسوس کریں۔ حدیث میں ہے: [...... مَنْ أَمِنَهُ الْمُؤْمِنُونَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ] ''(مومن وہ ہے)...... جس سے دوسرے مومن اپنی جان اور مال کے متعلق بے خوف ہوں۔''[1] اسی طرح یہ تصدیق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾[2] ''ہم اس کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔'' کسی کی بات پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے اپنی تکذیب کی طرف سے مطمئن کرتے ہیں اور اس کی امانت و دیانت پر اپنے اعتماد و وثوق کا اظہار کرتے ہیں۔

ایمان کی شرعی تعریف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو کچھ بھی اپنے رب کی طرف سے اصول وارکان اور احکام ومسائل لے کر آئے ہیں، ان کی تصدیق کی جائے اور ان کی سچائی کو دل میں بٹھایا جائے، پھر زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اپنے دیگر اعضاء سے اس کا عملی ثبوت مہیا کیا جائے۔ گویا اس کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے: دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور دیگر اعضاء سے التزامِ عمل و متابعت۔ یہود کو رسول اللہ ﷺ کی معرفت و تصدیق تھی، اور منافقین میں بظاہر التزام عمل و متابعت بھی موجود تھا اس کے باوجود مومن نہیں ہیں، لہٰذا تصدیق میں کوتاہی کا مرتکب منافق اور اقرار سے پہلوتہی کفر کا باعث ہے جبکہ عملی کوتاہی کا مرتکب فاسق ہے۔ اگر انکار کی وجہ سے بدعملی کا شکار ہے تو بھی اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں، ایسے حالات میں تصدیق و اقرار کا کوئی فائدہ نہیں۔

سلف صالحین کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے کہ ایمان کے متعلق جو آیات واحادیث وارد ہیں ان کی اتباع کو کافی خیال

---

1 مسند أحمد:206/2. 2 المؤمنون 38:23.

کیا جائے۔ان مباحث کلامیہ کی طرف قطعی التفات نہ کیا جائے جو متأخرین کے ''دست ہنرشناس'' کا کرشمہ ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ چونکہ سررشتۂ محدثین سے منسلک ہیں، اس لیے انھوں نے ایمان سے متعلق وارد شدہ قرآنی آیات اور احادیث و آثار کے پیش نظر اس موقف کو اختیار کیا ہے کہ ایمان بسیط نہیں بلکہ تصدیق قلبی، اقرار لسانی اور عمل بدنی سے مرکب ہے۔تکون کے یہ تینوں زاویے اس قدر لازم ملزوم اور باہم مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو الگ کر دیا جائے تو ایسا حقیقی ایمان باقی نہیں رہتا جس سے اخروی نجات کا حصول ممکن ہو۔اس کے بعض اجزاء اساسی اور بنیادی ہیں جنھیں امام بخاری رحمہ اللہ نے ارکان اسلام کے نام سے تعبیر کر کے انھیں اولیت دی ہے اور کچھ اجزاء کمال ہیں جنھیں ''امور ایمان'' کا عنوان دے کر آخر میں بیان کیا ہے۔قارئین کرام اس تفصیل کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتاب الایمان کا مطالعہ کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

2 - كِتَابُ الْإِيمَانِ

ایمانیات کا بیان

(١) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ»

وَهُوَ: قَوْلٌ وَّفِعْلٌ وَّيَزِيدُ وَيَنْقُصُ، قَالَ اللهُ تَعَالٰى: ﴿لِيَزْدَادُوٓا إِيمَٰنًا مَّعَ إِيمَٰنِهِمْ﴾ [الفتح: ٤] ﴿وَزِدْنَٰهُمْ هُدًى﴾ [الكهف: ١٣] ﴿وَيَزِيدُ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ٱهْتَدَوْا۟ هُدًى﴾ [مريم: ٧٦] وَقَالَ: ﴿وَٱلَّذِينَ ٱهْتَدَوْا۟ زَادَهُمْ هُدًى وَءَاتَىٰهُمْ تَقْوَىٰهُمْ﴾ [محمد: ١٧] ﴿وَيَزْدَادَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِيمَٰنًا﴾ [المدثر: ٣١] وَقَوْلُهُ: ﴿أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا﴾ [التوبة: ١٢٤] وَقَوْلُهُ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿فَٱخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَٰنًا﴾ [آل عمران: ١٧٣] وَقَوْلُهُ تَعَالٰى: ﴿وَمَا زَادَهُمْ إِلَّآ إِيمَٰنًا وَتَسْلِيمًا﴾ [الأحزاب: ٢٢]

باب:1- نبی ﷺ کے ارشاد گرامی: ”اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے“ (کی وضاحت)

اور وہ (ایمان) قول و فعل (دونوں) پر مشتمل ہے، نیز وہ زیادتی اور کمی کو قبول کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”(وہی ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں طمانیت اتاری) تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو۔“ ”(وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے) اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔“ ”اور جو لوگ راہ راست اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے۔“ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت قبول کی اللہ نے ان کو (اور زیادہ) ہدایت میں بڑھا دیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔“ ”اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ”(اور جب کوئی سورت اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو پوچھتے ہیں کہ) اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟ تو جو حقیقی اہل ایمان ہوتے ہیں، وہ سورت ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔“ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ مِنَ الْإِيمَانِ، وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلٰى عَدِيِّ ابْنِ عَدِيٍّ: إِنَّ لِلْإِيمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُودًا وَّسُنَنًا، فَمَنِ اسْتَكْمَلَهَا، اِسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَكْمِلْهَا، لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْإِيمَانَ، فَإِنْ أَعِشْ فَسَأُبَيِّنُهَا لَكُمْ حَتّٰى تَعْمَلُوا بِهَا، وَإِنْ أَمُتْ فَمَا أَنَا عَلٰى صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيصٍ. وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ: ﴿وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ [البقرة:٢٦٠] وَقَالَ مُعَاذٌ: اِجْلِسْ بِنَا نُؤْمِنْ سَاعَةً. وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: اَلْيَقِينُ، اَلْإِيمَانُ كُلُّهُ. وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوٰى حَتّٰى يَدَعَ مَاحَاكَ فِي الصَّدْرِ، وَقَالَ مُجَاهِدٌ: ﴿شَرَعَ لَكُم﴾ [الشورٰى:١٣] أَوْصَيْنَاكَ يَامُحَمَّدُ وَإِيَّاهُ دِينًا وَّاحِدًا، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: ﴿شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ [المائدة:٤٨] سَبِيلًا وَّسُنَّةً.

"(اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہیں) ان سے ڈرو تو (یہ سن کر) ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔" نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: "اور اس چیز نے ان کے ایمان واطاعت میں اور اضافہ کر دیا۔"

اور اللہ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور بغض رکھنا داخل ایمان ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (اپنے گورنر) حضرت عدی بن عدی رحمہ اللہ کو لکھا کہ ایمان کے لیے فرائض و احکام، نیز حدود اور سنن ہیں جس نے ان کو پورا کیا اس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا اور جس نے ان تمام کو پورا نہ کیا اس نے اپنے ایمان کو ناقص رکھا۔ اگر میں زندہ رہا تو تمھارے لیے ان تمام چیزوں کو ضرور بیان کروں گا تاکہ تم ان پر عمل کر سکو اور اگر مجھے زندگی نہ ملی تو مجھے بھی تمھارے پاس رہنے کا اتنا شوق نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول (قرآن میں نقل ہوا) ہے: "لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔" حضرت معاذ (بن جبل) رضی اللہ عنہ نے (حضرت اسود بن ہلال سے) کہا: ہمارے ساتھ بیٹھ تاکہ چند لمحات کے لیے اپنے ایمان کو تازہ کر لیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یقین پورا ایمان ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: انسان اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک ایسی چیزوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہوں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ (اس ارشاد باری کی تفسیر میں) فرماتے ہیں: "اللہ نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے (جس کے قائم کرنے کا نوح کو حکم دیا تھا)۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! ہم نے تمھیں اور نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا] کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: شرعۃ سے مراد قانون الٰہی اور منہاجًا سے مراد اس قانون پر عمل کرنے کا طریقہ ہے۔

وضاحت: اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے تین مقاصد کو متعین فرمایا ہے: ○ ایمان اور اسلام باہم مربوط ہیں۔ ○ قول وفعل داخل ایمان ہیں۔ ○ ایمان میں کمی بیشی ممکن ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے متعین کردہ ہر سہ مقاصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حقیقتِ ایمان کے متعلق متقدمین کے اختلاف کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔

پہلا اختلاف تو ایمان کے مرکب (کئی اعمال کا مجموعہ) اور بسیط (صرف اقرار) ہونے کے متعلق ہے۔ ایک جماعت کا موقف ہے کہ ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، اعمال و اقرار ایمان کی حقیقت سے خارج ہیں۔ اس موقف کے حاملین کو مرجیہ کہا جاتا ہے، پھر اس جماعت کے داخلی اختلاف کی وجہ سے اس کی دو قسمیں ہیں: * مرجیہ اہل بدعت: ان کے نزدیک تصدیق قلبی کے بعد اعمال بالکل لغو اور اقرار سراسر فضول چیز ہے۔ تصدیق کے بعد نماز پڑھنا اور کھانا تناول کرنا ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ ایمان کے بعد کوئی گناہ نقصان دہ اور کوئی نیکی سود مند نہیں ہے۔ * مرجیہ اہل سنت: ان کے نزدیک ایمان اگرچہ تصدیق ہی کا نام ہے، تاہم اس کی ترقی اور اس کے پھلنے پھولنے کے لیے اعمال انتہائی ضروری ہیں۔ اس جماعت کا دوسرا نام احناف ہے۔ ایمان کو بسیط ماننے والوں کا دوسرا گروہ کرامیہ کا ہے۔ ان کے نزدیک ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے، دل سے تصدیق اور دیگر اعمال اس کا جز نہیں ہیں۔

ایمان کو مرکب کہنے والوں کا مطلب یہ ہے کہ ایمان، تصدیق و اقرار اور اعمال کا نام ہے۔ پھر ان میں اختلاف ہے کہ آیا ان تمام اجزائے ایمان کی جزئیت ایک ہی شان رکھتی ہے یا اس میں کچھ تفاوت ہے، چنانچہ اہل حق کا موقف ہے کہ تصدیق، اقرار اور اعمال کے بعد مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، جبکہ اہل باطل مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج مانتے ہیں، پھر اس خروج ایمان کے متعلق اختلاف ہے۔ خوارج مرتکب کبیرہ کو ایمان سے بایں معنی خارج مانتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ہے، جبکہ معتزلہ کا موقف ہے کہ ایسا شخص ایمان سے تو خارج ہے لیکن تصدیق کی وجہ سے کفر میں داخل نہیں ہوتا لیکن انجام کے لحاظ سے دونوں کا اتفاق ہے کہ ایسا شخص ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ خلاصہ یہ ہے:

1. ایمان بسیط ہے۔ صرف دل سے تصدیق کافی ہے، اس کے بعد کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا اور نہ کوئی نیکی ہی کارگر ہوتی ہے۔ (مرجیۂ اہل بدعت)
2. ایمان بسیط ہے۔ اس کے لیے صرف دل کی تصدیق ضروری ہے، اعمال اس میں داخل نہیں ہیں، البتہ ایمان کی ترقی کے لیے اعمال انتہائی ضروری ہیں۔ (مرجیہ اہل سنت، احناف)
3. ایمان بسیط ہے۔ اس کے لیے صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی ہے۔ اخروی نجات کے لیے تصدیق کی چنداں ضرورت نہیں، صرف اقرار سے نجات ممکن ہے۔ (کرامیہ)
4. ایمان، اعتقاد اور اعمال و اقرار کا ایک ایسا مجموعہ ہے جسے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا بایں طور کہ تصدیق کے بعد مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہے۔ (خوارج)
5. ایمان، اعتقاد اور اقرار کا نام ہے جسے الگ الگ تو نہیں کیا جا سکتا، تاہم مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج اور کفر میں داخل نہیں ہوگا۔ (معتزلہ)

⑥ ایمان، اعتقاد اور اعمال و اقرار کے مجموعے کا نام ہے جس کے لیے تصدیق جنان (دل)، اقرار زبان اور اعمال ارکان ضروری ہیں، اور اس ایمان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ مرتکب کبیرہ بشرط صحت ایمان، کافر نہیں ہے۔ اس کا انجام اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اگر چاہے تو اسے معاف کر کے جنت میں داخل فرما دے اور اگر چاہے تو جہنم میں سزا دے کر پھر اسے جنت کا حقدار قرار دے۔ (محدثین کرام)

مقصد ترجمہ: امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الإیمان کو رسول اللہ ﷺ کی ایک مشہور حدیث سے شروع فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ معاملہ ایمانیات کا ہے لیکن ترجمۃ الباب کا آغاز ارکان اسلام کے ذکر سے کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لغوی طور پر اگرچہ ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں لیکن مصداق اور اخروی نجات کے اعتبار سے دونوں لازم ملزوم ہیں کہ ایمان، اسلام کے بغیر قبول نہیں اور اسی طرح اسلام، ایمان کے بغیر معتبر نہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بقول ایمان اور اسلام باہم مربوط ہیں اور وہ ایک ہی چیز کی طرح ہیں کیونکہ جو اسلام کا پابند نہیں اس کا دعوائے ایمان غلط ہے اور جو دولت ایمان سے خالی ہے اس کا اسلام غیر معتبر ہے۔ حقیقی مسلمان کبھی ایمان سے خالی نہیں ہوسکتا اور حقیقی مومن اسلام کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ اس سے اس کا ایمان متحقق (ثابت) ہوگا۔ (کتاب الإیمان)

امام بیہقی رحمہ اللہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: اس بات کی دلیل کہ مطلق طور پر ایمان و اسلام دین واحد کی دو تعبیریں ہیں۔[1] پھر کتاب و سنت سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے۔ ایمان اور اسلام کے متعلق یہ مباحث لائق مطالعہ ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایمان کے متعلق دوسرا جملہ بایں الفاظ استعمال فرمایا: ''وہ قول و فعل کا نام ہے۔'' امام صاحب کا کہنا ہے کہ میں ہزار سے زیادہ علماء و مشائخ سے ملا ہوں، ایمان کے متعلق ان تمام کا متفقہ موقف یہ ہے کہ ایمان قول و عمل کا نام ہے جو کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ انھوں نے سلف کے اس قول میں کس لیے ترمیم کی ہے کہ عمل کے بجائے لفظ فعل استعمال کیا ہے جبکہ عمل اور فعل میں حسب ذیل فرق ہے: * عمل میں ارادہ و قصد شرط ہے جبکہ فعل میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ غیر اختیاری کام کو بھی فعل کہہ دیا جاتا ہے۔ * عمل میں علم اور فکر و نظر شرط ہے جبکہ فعل میں شرط نہیں۔ * عمل میں دوام و استمرار پر دلالت ہوتی ہے جبکہ فعل کا اطلاق ایسے کام پر ہوتا ہے جو ایک ہی مرتبہ کیا گیا ہو۔ * عمل صرف کام پر بولا جاتا ہے اور فعل، کام اور اس کی تاثیر دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ * عمل کا اطلاق اقوال پر بھی ہوتا ہے جبکہ فعل کا اطلاق اقوال پر نہیں ہوتا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اس مقام پر قول و فعل دونوں میں عموم پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کی درج ذیل صورتیں ہیں: * قول کو قولِ لسانی اور قول قلبی دونوں پر عام کر دیا جائے۔ اگرچہ عرف عام میں قول کا لفظ صرف قول لسانی ہی پر بولا جاتا ہے لیکن بایں معنی قول قلبی پر عام کیا جا سکتا ہے کہ دل میں تصدیق کا پیدا ہو جانا ایمان نہیں بلکہ پیدا کرنا ایمان ہے۔ * لفظ فعل میں عموم پیدا کر دیا جائے کہ اس سے فعل قلبی اور فعل جوارح دونوں مراد ہیں۔ اس صورت میں قول کو صرف قول

---

[1] شعب الإیمان:133/1.

لسانی پر محدود کر دیا جائے گا۔

امام صاحب نے سلف سے منقول ایمان کی تعریف میں وارد لفظِ نیت کو حذف کر دیا ہے، وہ اس لیے کہ ایمان میں نیت کا داخل ہونا بالکل ظاہر ہے، بنابریں اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں، نیز ایمان میں نیت کے داخل ہونے پر کسی کو اختلاف نہیں، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا۔

امام صاحب نے اس عنوان میں تیسرا دعویٰ یہ کیا ہے: ''ایمان زیادہ بھی ہوتا ہے اور کم بھی ہو جاتا ہے۔'' چونکہ ایمان ایک ذی اجزاء چیز ہے اور تین چیزوں سے مرکب ہے، اس لیے اس میں کمی بیشی کی ضرور قابلیت ہونی چاہیے۔ امام رحمہ اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے یہی اسلاف امت کا مسلک ہے۔ صحابہ و تابعین اور ائمۂ دین یہی عقیدہ رکھتے تھے، البتہ مرجیہ، کرامیہ، جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور روافض کو ان سے اختلاف ہے۔ اس عنوان سے انہی بدعتی فرقوں کی تردید مقصود ہے۔ ضرورت تھی کہ اپنے دعاوی کو پہلے کتاب اللہ سے ثابت کیا جاتا، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے مندرجہ ذیل آیات کو نقل فرمایا ہے جن میں ایمان کو ہدایت و دعا وغیرہ سے تعبیر کرتے ہوئے ایمان کے زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔

* قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿لِيَزْدَادُوْٓا إِيْمَانًا مَّعَ إِيْمَانِهِمْ﴾ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''(وہی ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں طمانیت اتاری) تاکہ ان کے ایمان میں مزید ایمان کی افزونی ہو۔'' یہ آیت صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایمان تو وہ تھا جو مسلمانوں کو حدیبیہ کی مہم سے پہلے حاصل تھا اور اس پر مزید ایمان اس وجہ سے حاصل ہوا کہ اس مہم کے سر کرنے میں جتنی شدید آزمائشیں انھیں پیش آئیں، وہ ان میں اخلاص، تقویٰ اور اطاعت کی روش پر ثابت قدم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد مومن کو مرتے دم تک قدم قدم پر امتحانات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسے کٹھن حالات میں اپنے مفادات، جذبات، اوقات بلکہ اپنی خواہشات تک کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے تو اس کے ایمان کو ترقی اور بالیدگی نصیب ہوتی ہے اور اگر وہ روگردانی کا رویہ اختیار کرے تو اس کا ایمان ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے، بالآخر ایک ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ اس کا ابتدائی سرمایۂ ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے جسے لے کر وہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اس آیت کریمہ سے حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ ایمان کوئی جامد یا ساکن چیز نہیں بلکہ اس میں ترقی بھی ہوتی ہے اور کمی بھی آتی ہے۔ اگر ایمان کوئی جامد شے ہوتی تو اس طرح کے امتحانات کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور جن لوگوں کو امام صاحب کے مبنی برحقیقت موقف سے اتفاق نہیں ہے ان کی خوب صورت توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان کے نزدیک ایمان سے مراد قانونی ایمان ہے جس پر ایک اسلامی ریاست میں ایک مسلمان کے شہری حقوق قائم ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام ماننے والے جو ضروریات دین کے قائل ہیں، بدوی اور شہری حقوق و واجبات میں برابر ہوں گے، خواہ ان کے درمیان ماننے کے مراتب کے لحاظ سے کتنا ہی تفاوت ہو، اور نہ ماننے والے ایک ہی رتبے میں ذمی، حربی یا معاہد قرار دیے جائیں گے، خواہ ان میں کفر کے اعتبار سے مراتب میں کتنا ہی فرق ہو۔ رہا وہ ایمان جس پر آخرت کے مدارج و مقامات مبنی ہیں جس کا انحصار حقیقی ایمان پر ہے، اس میں کمی بیشی کی گنجائش بہر حال رہتی ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔

* ﴿وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى﴾ ''(وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے) اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی

تھی۔'' یہ آیت اصحاب کہف سے متعلق ہے کہ جب وہ سچے دل سے ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت (نور ایمان) میں اور اضافہ کیا جس کی بدولت انھیں حق وصداقت کے راستے پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ملی۔ انھوں نے خود کو خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیا مگر وہ باطل کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے۔ اگلی آیت میں اس نورِ ایمان میں اضافے کی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ ہر چند حالات بہت ہی سخت تھے، کلمۂ حق کہنا اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے کے مترادف تھا لیکن برکتِ ایمان کا اثر یہ ہوا کہ وہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر دعوت توحید کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قوت و عزیمت بخشی۔ انھوں نے اپنی قوم میں عام منادی کر دی کہ ہمارا رب صرف وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی اور کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم نے ایسے حالات میں کسی اور کو رب تسلیم کر لیا تو ہماری یہ حرکت حق سے بہت دور ہٹی ہوئی ہوگی۔ اس آیت کریمہ سے بھی امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف ثابت ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ممکن ہے کیونکہ اصحاب کہف کے ایمان کے بعد، بطور نص اس میں اضافے کا ذکر ہے۔

٭﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ ''اور جو لوگ راہ راست اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو راست روی میں ترقی عطا فرماتا ہے۔'' یہ آیت سابقہ آیت کے مقابل میں ہے، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ہدایت پر ضلالت کو ترجیح دینے والوں کی رسی دراز کرتا ہے اسی طرح ہدایت کا راستہ اختیار کرنے والوں کی ہدایت میں بھی برابر اضافے پر اضافہ فرماتا ہے۔ اس مقام پر بھی ہدایت نور ایمانی کے معنی میں ہے جس کی بدولت اہل ایمان کو ہر آزمائش کے موقع پر صحیح فیصلے کرنے اور صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ اس آیت میں بھی نور ایمان میں مسلسل اضافے کا ذکر ہے جسے امام بخاری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

٭وَقَالَ: ﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّآتَاهُمْ تَقْوٰهُمْ﴾ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور وہ لوگ جنھوں نے ہدایت قبول کی اللہ نے ان کو (اور زیادہ) ہدایت میں بڑھا دیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔'' یہاں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ جن لوگوں کا نور فطرت بجھا نہیں تھا بلکہ انھوں نے اسے محفوظ رکھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی محبت سے ان کے نور ایمان میں اضافہ فرمایا اور ان کی استعداد اور طلب کے اعتبار سے ان کے تقویٰ میں برکت بخشی۔ رہے وہ لوگ جو اپنے اندر نفاق کی پرورش کرتے رہے تو ان سے وہ نور بھی چھن گیا جو انھیں بخشا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے یہ بدنصیب اپنا وقت ضائع کر کے اٹھتے۔ اس کے برعکس اہل ایمان اس مجلس سے علم وعرفان کا ایک نیا خزانہ حاصل کر کے پلٹتے تھے۔ اس آیت کریمہ میں بھی ایمان کے اضافے کا ذکر ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ ثابت فرما رہے ہیں۔

٭﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِيْمَانًا﴾ ''اور ایمان لانے والوں کا ایمان بڑھے۔'' جب بندۂ مومن ہر آزمائش کے موقع پر ثابت قدم رہتا ہے اور شک و انکار یا اطاعت سے فرار یا دین سے بے وفائی کا راستہ چھوڑ کر یقین و اعتماد، فرمانبرداری اور دین سے وفاداری کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے ایمان کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے، کیونکہ ایسے حالات میں اس کا ایمان تقلیدی نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت ہوتا ہے۔ اس طرح کا حقیقی ایمان جب پورے جزم و وثوق کے ساتھ اختیار کیا جائے تو ہر آزمائش اس میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ اس کے برعکس جو تقلیدی (دیکھا دیکھی) ایمان ہوتا ہے اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی بلکہ معمولی سی باد مخالف اسے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ اس آیت میں بھی ایمان کی افزونی کا ذکر ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کا مدعا ہے۔

✱ وَقَوْلُهٗ: ﴿اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب کوئی سورت اترتی ہے تو ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو پوچھتے ہیں کہ) اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟ تو جو حقیقی اہل ایمان ہوتے ہیں، وہ سورت ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے (اور وہ اس سے دلشاد ہیں)۔'' آیت کے پہلے حصے میں منافقین کے زہر آلود طنزیہ فقرے کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں اس کا جواب ہے کہ جب سچے اہل ایمان قرآن مجید کی کسی نئی سورت کو سنتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ رحمت الٰہی کی ایک اور گھٹا برسی۔ درحقیقت قرآن کریم کا ہر حکم ان کے لیے ایک میدان مسابقت کھول دیتا ہے۔ جب وہ اس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو ان کی قوت ایمان میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہوتا ہے تاآنکہ وہ درجہ بدرجہ سعادت و خوش بختی کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اہل نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی ذلتیں سہتے سہتے ایمان و یقین کی آخری رمق سے بھی بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں بھی ایمان کے اضافے کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف ہے۔

✱ وَقَوْلُهٗ جَلَّ ذِكْرُهٗ: ﴿فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ اور جل شانہ کا فرمان ہے: ''(اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہیں) ان سے ڈرو تو (یہ سن کر) ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔'' جب منافقین نے اہل ایمان کو ہراساں کرنے کے لیے بدر صغریٰ کے موقع پر یہ افواہ پھیلائی کہ قریش نئے ساز و سامان کے ساتھ حملے کی دوبارہ تیاریاں کر رہے ہیں تو خبر بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتی، ان کے عزم و ایمان کو بڑھانے کا سبب بن گئی۔ یہ آیت بھی بصراحت اس موقف کو ثابت کرتی ہے کہ ایمان ایک متحرک چیز ہے جس میں اضافہ اور زیادتی ہوتی رہتی ہے، اسی کو امام بخاری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

✱ وَقَوْلُهٗ تَعَالٰى: ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا﴾ اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اس چیز نے ان کے ایمان و اطاعت میں اور اضافہ کر دیا۔'' آیت کا پہلا حصہ بایں الفاظ شروع ہوتا ہے: ''جب اہل ایمان نے لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا، اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا۔'' یہ اہل ایمان کا رویہ بیان ہوا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقین اور حاسدین کے کردار کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے دشمنوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو وعدے ہم سے کیے گئے تھے وہ سب فریب اور پادر ہوا ثابت ہوئے لیکن ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا تأثر چیزے دیگر است کہ جب انھوں نے خود کو دشمنوں کے نرغے میں دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو تسلی دی کہ یہ تو وہی امتحان ہمیں درپیش ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں پہلے خبر دے دی تھی، پھر اس امتحان نے ان کے اندر کوئی کمزوری پیدا کرنے کی بجائے ان کے ایمان و اطاعت کے جذبے میں مزید قوت پیدا کی۔ بلاشبہ راہ حق میں جو بھی آزمائش آتی ہے وہ جس طرح کمزوری کے کھوٹ کو نمایاں کرتی ہے، اسی طرح صادقین کے صدق کو بھی جلا بخشتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن یا جامد چیز نہیں ہے کہ اس کی تصدیق و اقرار یا تکذیب و انکار کا ایک ہی مرتبہ ہو بلکہ اس میں انحطاط و ارتقا کی صلاحیت موجود رہتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے قرآنی آیات کے بعد اب سنت رسول ﷺ سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے، اس سلسلے میں آپ نے ایک مشہور حدیث کا حوالہ دیا ہے۔

٭﴿وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ مِنَ الْإِيمَانِ﴾ ''اللہ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور بغض رکھنا داخل ایمان ہے۔'' اسی مفہوم میں رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین عمل یہ ہے کہ اللہ کے لیے محبت کی جائے اور اللہ کے لیے کسی سے بغض رکھا جائے۔''[1] اسی طرح آپ کا فرمان ہے: ''جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھا، اللہ ہی کے لیے کسی کو دیا اور اللہ ہی کے لیے کسی سے روکا، اس نے اپنے ایمان کو مکمل کر لیا۔''[2] امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال یہ ہے کہ جب محبت اور عداوت دونوں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے اور حدیث کی رو سے یہ دونوں ایمان کا حصہ ہیں تو حسب مراتب، ایمان بھی گھٹتا بڑھتا رہے گا۔ وَهُوَ الْمَقْصُودُ.

٭ امام بخاری رحمہ اللہ قرآن وسنت کے بعد خلیفۂ خامس حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا ایک قول بطور استدلال نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان بسیط نہیں جو کمی بیشی کو قبول نہ کرتا ہو بلکہ عقائد ونظریات اور اعمال واحکام سے مرکب ہے اور ارتقا وانحطاط کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس معلق روایت کو امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے کتاب الإیمان میں باسند بیان کیا ہے۔[3] عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس اثر سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی فرائض وشرائع اور حدود وسنن کو داخل ایمان سمجھا جاتا تھا اور ایمان کے کامل یا ناقص ہونے کا تصور ان کی ادائیگی یا عدم ادائیگی پر موقوف خیال کیا جاتا تھا، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلاف میں بھی ایمان کے مرکب ہونے اور اس میں کمی بیشی کی اصطلاحات مروج تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اس مقولے میں صاف بیان کیا گیا ہے کہ تکمیل ایمان کے لیے بیان کردہ چیزوں کا ادا کرنا ضروری ہے اور ان کی عدم ادائیگی سے ایمان میں نقصان آ جاتا ہے۔ اس سے مرجیہ کی بھی تردید ہوتی ہے جو ایمان کے معاملے میں اعمال کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، حالانکہ تکمیل ایمان کے لیے ان اعمال کا ہونا ضروری ہے۔ اور اعمال سے متعلق اس عقیدے کی قرآن وحدیث اور اقوال سلف سے تائید ہوتی ہے۔

٭ وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ: ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول (قرآن میں نقل ہوا) ہے: ''لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔'' اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے احیائے موتیٰ کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ کیا تمھیں یقین نہیں ہے؟ عرض کیا: کیوں نہیں، بلکہ میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔ چونکہ کیف (کیسے) میں کبھی سوال ذات سے متعلق ہوتا ہے اور کبھی صفات سے، اس لیے شبہ ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شاید احیائے موتیٰ کے متعلق تردد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے جواب دلا کر اس تردد کو رفع فرمایا، یعنی احیائے موتیٰ کے متعلق مجھے پورا یقین ہے مگر میں علم الیقین سے عین الیقین تک عروج چاہتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں علم استدلال (علم الیقین) تو مجھے حاصل ہے، مشاہدہ (عین الیقین) حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ امام بخاری کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مدارج ہیں۔ وہی اطمینان علم الیقین کے درجے میں ہے، اور وہی اطمینان مشاہدے کے بعد عین الیقین ہو جاتا ہے۔ اور اگر اپنی ذات پر تجربہ ہو جائے تو اس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر ایمان کے لیے اطمینان کا لفظ بولا گیا ہے جس کے مختلف درجات ہیں، لہٰذا ایمان میں کمی بیشی ممکن ہے۔ واضح رہے کہ ان مختلف درجات کو سمجھنے کے لیے شنیدہ، دیدہ اور چشیدہ کے الفاظ

---

[1] سنن أبي داود، السنة، حديث: 4599. [2] سنن أبي داود، السنة، حديث: 4681. [3] المصنف لابن أبي شيبة: 318/10 (طبع مكتبة الرشد).

بڑے معنی خیز ہیں۔

واضح رہے کہ اس آیت کو سابقہ آیات کے ساتھ اس لیے ذکر نہیں کیا کہ پہلی آیات عبارۃ النص کے درجے میں مقصد پر دلالت کرتی تھیں جبکہ یہ آیت اشارۃ النص کے درجے میں دلالت کرتی ہے، اس لیے حضرت امام نے اسے الگ بیان فرمایا۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ کا تذکرہ کر کے فرمایا: ''ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے حق دار ہیں۔''[1] اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سلسلے میں شک کا شکار ہوئے تھے، لہٰذا ہمیں ان سے زیادہ شک کرنے کا حق پہنچتا ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی کرنا مقصود ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی احیائے موتٰی کے بارے میں شک نہیں کیا، اگر انھوں نے شک کا اظہار کیا ہوتا تو ہم شک کرنے میں ان سے زیادہ حق دار ہوتے۔

* وَقَالَ مُعَاذٌ: [اِجْلِسْ بِنَانُؤْمِنْ سَاعَةً] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے (حضرت اسود بن ہلال سے) کہا: ''ہمارے ساتھ بیٹھو، تاکہ چند لمحات کے لیے اپنے ایمان کو تازہ کر لیں۔'' اس روایت کو امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے موصولاً بیان کیا ہے۔[2] ایک روایت میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنے شاگردوں کو کہتے کہ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو تاکہ ہم کچھ لمحات کے لیے اپنے ایمان کو تازہ کریں، پھر وہ بیٹھ کر اللہ کی حمد وثنا اور اس کا ذکر کرتے۔[3] اس سے مراد اصل ایمان کا حصول نہیں بلکہ اللہ کے ذکر سے اس میں اضافہ مقصود تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود اس روایت سے ایمان میں ترقی ثابت کرنا ہے جو روز روشن کی طرح واضح ہے۔[4]

* وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: [اَلْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یقین پورا ایمان ہے۔'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس معلق اثر کو امام بیہقی نے باسند بیان کیا ہے جس کے شروع میں یہ الفاظ ہیں: ''صبر نصف ایمان ہے۔''[5] استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ لفظ کل کی اضافت ایسی شے کی طرف کی جاتی ہے جو اجزاء والی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بھی اجزاء والا ہے اور کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔ بیہقی کی مذکورہ روایت میں تو ایمان کے نصف کی بھی صراحت ہے۔ دوسرا استدلال اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ یقین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں، مثلاً: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین وغیرہ، اس وجہ سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے کیونکہ ایمان یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کا یہی مطلب ہے کہ ایمان میں یقین کا درجہ ضروری ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ طاعات سہولت سے ادا ہوتی ہیں۔ ایمان میں کمی بیشی کے متعلق اس سے واضح روایت حضرت عبداللہ بن مسعود کی دعا ہے: ''اے اللہ! تو ہمارے ایمان و یقین اور فقاہت میں اضافہ فرما۔''[6] لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت اسے ذکر نہیں فرمایا۔

* وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: [لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوٰى حَتَّى يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: انسان اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتا جب تک ایسی چیزوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہوں۔ تقویٰ کے

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4537. [2] المصنف لابن أبي شيبة: 300/10 (طبع مكتبة الرشد). [3] المصنف لابن أبي شيبة: 314/10 (طبع مكتبة الرشد). [4] فتح الباري: 67/1. [5] شعب الإيمان للبيهقي: 123/7 و المطالب العالية، حديث: 2905. [6] المعجم الكبير للطبراني: 105/9.

مختلف مدارج ہیں: اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان ایسی چیزوں سے کنارہ کش ہو جائے جن کے متعلق اسے شرح صدر نہ ہو۔ اسی طرح صرف شرک سے اجتناب بھی تقویٰ ہے لیکن یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے۔ بعض روایات میں تقویٰ کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بھی مراتب ہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ جب تقویٰ کے درجات ہیں تو ایمان بھی کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔ تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو نیک اعمال پر لگائے رکھنا اور اسے شرک، نیز برے اعمال سے بچائے رکھنا۔ روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل ایمان تقویٰ کی حقیقت کو پہنچ جاتے ہیں اور کچھ نہیں پہنچتے۔ اس سے بھی امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ ایک روایت میں تقویٰ کی حقیقت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے کہ انسان اس وقت تک صاحب تقویٰ نہیں ہوسکتا جب تک حلال کو بھی اندیشۂ حرام کی بنا پر نہ چھوڑ دے۔[1] اس سے مرجیہ اہل بدعت کی بھی تردید ہوتی ہے جو اعمال کو ایمان کے سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ دین اسلام میں تو چھوٹے چھوٹے اعمال کو تقویٰ سے تعبیر کیا جارہا ہے، نیز اگر تقویٰ عین ایمان ہے تو اس کے مراتب ہیں اور اگر متعلقات ایمان سے ہے تو تقویٰ ایمان میں مطلوب ہے جس طرح دیگر اعمال مطلوب ہیں، لہٰذا اعمال صالحہ کو ایمان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

* وَقَالَ مُجَاهِدٌ: ﴿شَرَعَ لَكُمْ﴾ [أَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ وَإِيَّاهُ دِينًا وَّاحِدًا] امام مجاہد اس ارشاد باری کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے (جس کے قائم کرنے کا حضرت نوح کو حکم دیا تھا)۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد! ہم نے تمھیں اور نوح کو ایک ہی دین کے لیے وصیت کی تھی۔ اسلاف کے اس حوالے سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال بایں طور ہے کہ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا دین مجموعۂ اصول و فروع ہے جو اعمال پر بھی مشتمل ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے دین میں بھی اعمال داخل ہیں، لہٰذا ایمان میں کمی بیشی آئے گی جس کے نتیجے میں قوت و ضعف بھی آئے گا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اختلاف جزئیات کے باوجود دین کو ایک ٹھہرا رہا ہے اسی طرح ایمان، اختلاف اجزاء کے باوجود ایک ہی حقیقت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہے اور اس آیت میں ہمیں اقامت دین کا حکم دیا گیا ہے اور اقامت دین کے مراتب مختلف ہیں۔ جب دین اور ایمان ایک ہی چیز ہیں تو ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے جس سے کمی بیشی کا ثبوت ملتا ہے۔

* وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: ﴿شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ [سَبِيْلًا وَّ سُنَّةً] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''شِرْعَةً'' سے مراد قانون الٰہی اور ''مِنْهَاجًا'' سے مراد اس قانون پر عمل کرنے کا طریقہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی ہے۔''[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ سب نبیوں کا دین ایک ہے، البتہ شریعتیں مختلف ہیں۔ اسی اختلاف سے ایمان کا مرکب ہونا ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مراتب اور اجزاء ہیں اور یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تفسیری مضمون کو ایک حدیث میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے: ''انبیاء آپس میں مادری بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔''[3] مادری بھائی وہ ہوتے ہیں جن کے باپ تو مختلف ہوں لیکن ماں ایک ہو۔ مطلب یہ ہے

---

[1] جامع الترمذي، صفة القيامة، حديث: 2451. [2] المائدة 48:5. [3] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، حديث: 3443.

کہ تمام انبیاء ﷺ کا دین ایک ہی تھا اور شریعتیں (دستور اور طریقے) مختلف تھیں لیکن ہمارے لیے اب دین بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان میں اعمال کے داخل ہونے کی زبردست دلیل مندرجہ ذیل آیت ہے: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ ''انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ یکسو ہو کر دین کو خالص رکھتے ہوئے صرف اللہ کی عبادت کریں، نماز قائم رکھیں اور زکاۃ دیتے رہیں۔ یہی سیدھی ملت کا دین ہے۔''[1] بہرحال اعمال صالحہ جزو ایمان ہیں اور ایمان میں کمی بیشی کی صلاحیت ہے، یہ کوئی جامد چیز نہیں جس میں کمی بیشی نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے جو مبنی برحقیقت ہے، نیز ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ تفسیر، تفسیر عبدالرزاق میں موصولاً صحیح سند سے مذکور ہے۔[2]

(٢) [بَابٌ] : دُعَاؤُكُمْ إِيمَانُكُمْ، لِقَوْلِهِ تَعَالٰى : ﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ﴾ [الفرقان: ٧٧] وَمَعْنَى الدُّعَاءِ فِي اللُّغَةِ : اَلْإِيمَانُ

باب:2- تمھاری دعا سے مراد تمھارا ایمان ہے
ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے: اگر تمھاری دعا نہ ہوتی تو میرا رب تمھاری مطلق پروا نہ کرتا۔'' اور عربی لغت میں دعا کے معنی ایمان بھی ہیں

وضاحت: صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں اس مقام پر باب کا لفظ نہیں ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باب کا لفظ یہاں فاش غلطی ہے کیونکہ اس کا سیاق وسباق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شارح بخاری کرمانی فرماتے ہیں کہ میں نے بچشم خود وہ نسخہ دیکھا ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کے شاگرد خاص فربری کے سامنے پڑھا گیا تھا، اس میں لفظ باب کا اضافہ نہیں ہے۔[3] اس بنا پر یہ الفاظ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سابقہ قول ہی سے منسلک ہیں۔ انھوں نے دُعَاءُ كُمْ کے معنی إِيمَانُكُمْ کیے ہیں جسے امام طبری نے موصولاً بیان کیا ہے۔[4] امام بخاری رحمہ اللہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت میں ایمان کو دعا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چونکہ دعا ایک عمل ہے، اس لیے اعمال ایمان کا جز قرار پائے، نیز دعا میں کمی بیشی بھی ہوتی ہے، اس لیے ایمان میں بھی کمی بیشی ممکن ہے۔[5] وَهُوَ الْمَقْصُودُ. بعض نے اس آیت کے معنی بایں طور کیے ہیں کہ اگر انبیائے کرام کا لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا مدنظر نہ ہوتا تو اللہ تمھاری مطلق پروا نہ کرتا۔ چونکہ تم نے اس دعوت کو جھٹلا دیا ہے، لہٰذا اس کی سزا تمھیں لازماً بھگتنی ہوگی۔ اس آیت کا مفہوم بایں طور پر بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمھارا مقصد تخلیق، اللہ کی عبادت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اللہ کو تمھاری کوئی پروا نہ ہو، یعنی اللہ کے ہاں انسان کی قدر و قیمت اس کے اللہ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی وجہ سے ہے۔ بہرحال ان تمام آیات و احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایمان ترقی بھی کرتا ہے اور کم بھی ہوتا ہے، اور اس میں کمی بیشی کا دارومدار اعمال پر ہے، اس لیے جو لوگ اس میں کمی بیشی کے قائل نہیں ہیں، ان کا موقف صحیح نہیں ہے، نیز مرجیۂ اہل بدعت کا اعمال کو ایمان کے سلسلے

1 البينة 98:5. 2 تفسير عبدالرزاق:22/2، رقم:721. 3 شرح الكرماني:76/1. 4 تفسير الطبري:66/19. 5 فتح الباري:69/1.

میں بے تعلق اور غیر مؤثر کہنا بھی درست نہیں ہے۔

٨ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسٰى قَالَ: أَخْبَرَنَا حَنْظَلَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ عَنْ عِكْرِمَةَ بْنِ خَالِدٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ».

[8] حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور یہ کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس حدیث سے ایمان کی کمی بیشی پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں پانچ چیزوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اور یہ پانچوں چیزیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں، کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی زکاۃ نہیں دیتا، کوئی حج کے معاملے میں کوتاہی کرتا ہے اور کسی سے روزوں کے متعلق تساہل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مراتب ایمان میں بھی تفاوت آ جاتا ہے۔ کسی کا اسلام ناقص ہے اور کسی میں یہ علامتیں پورے طور پر موجود ہوتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں لگن ہے۔ اگر ان اعمال کی پابندی نہیں ہے تو یہ اس کے نقصان دین کی علامت ہے۔ واضح رہے کہ محدثین کے ہاں اسلام اور ایمان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، گویا ان پانچ چیزوں پر ایمان کا اطلاق بھی ہوتا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ ایمان مرکب ہے اور اس میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ ② اس مقام پر ارکان خمسہ میں جہاد کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ اس کی دین اسلام میں بہت اہمیت ہے؟ یہ اس لیے کہ جہاد فرض کفایہ ہے جو مخصوص حالات میں فرض عین قرار دیا جاتا ہے، نیز اس حدیث میں کلمۂ شہادت کے ساتھ دیگر انبیاء اور ملائکہ پر ایمان لانے کا ذکر بھی نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق ہی تمام انبیاء کی تصدیق ہے اور دیگر اصول ایمان کی بنیاد یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو دل وجان سے تسلیم کیا جائے۔[1] ③ اس حدیث کا سبب ورود بھی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابن عمر ؓ نے حکیم نامی ایک آدمی کے اعتراض پر اس حدیث کو بیان فرمایا۔ اس کی وضاحت بایں طور ہے کہ وہ حضرت ابن عمر ؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے ابوعبدالرحمٰن! کیا وجہ ہے کہ آپ ایک سال حج پر جاتے ہیں تو دوسرے سال عمرہ کرتے ہیں لیکن آپ نے جہاد کو چھوڑ رکھا ہے، حالانکہ آپ کو اس کی اہمیت کا بخوبی علم ہے؟ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد تو پانچ چیزوں پر ہے اور اس میں جہاد کا ذکر نہیں ہے۔[2] ④ حدیث میں اگرچہ تصدیق قلب کا ذکر نہیں ہے، تاہم لفظ شہادت اس کو مستلزم ہے، کیونکہ شہادت اس قول کو کہا جاتا ہے جو قلب کے مطابق ہو۔ شہادت کے بعد چند اعمال کو ذکر فرمایا۔ ان میں سے نماز اور زکاۃ اللہ تعالیٰ کی صفت جلال پر متفرع ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں انتہائی ادب سے ادا کیا جائے، معمولی سی کوتاہی سے یہ آبگینہ سبوتاژ ہوسکتا ہے، نیز حج اور روزہ اللہ تعالیٰ کی صفت جمال کے آئینہ دار ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ انھیں فریفتگی اور دیوانہ وار ادا کرے، نیز اس حیثیت کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ غیر سے اعراض کرتے ہوئے مقصود کی طرف

① فتح الباري:29/1. ② صحيح البخاري، التفسير، حديث:4514.

کامل توجہ ہو۔ حج میں توجہ الی اللہ اور روزے میں اعراض عن الغیر ہے۔ (5) اس روایت میں حج کو صوم رمضان پر مقدم کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو اصل قرار دیتے ہوئے اپنی اس کتاب میں ابواب حج کو ابواب صیام سے پہلے ذکر فرمایا ہے جبکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے مروی بعض روایات میں صوم رمضان کو حج پر مقدم لائے ہیں۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی مذکورہ روایت کو اصل قرار دے کر صحیح بخاری کی روایت کو نقل بالمعنیٰ کہا ہے کیونکہ مسلم کی ایک روایت میں جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حضرت سعد بن عبیدہ بیان کرتے ہیں تو اس میں صوم رمضان کو حج پر مقدم لایا گیا ہے۔ اس میں مزید وضاحت ہے کہ مجلس میں ایک آدمی نے ترتیب بدل کر جب یوں کہا کہ "حج وصوم رمضان" تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب دیا نہیں، بلکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ صیام رمضان، حج کے ذکر سے پہلے ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح سنا ہے۔[2] صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں صیام رمضان کو حج سے پہلے لایا گیا ہے بلکہ اسے ادائے زکاۃ سے بھی پہلے ذکر کیا گیا ہے۔[3] بخاری کی ایک روایت کے مطابق حنظلہ سے جب عبیداللہ بن موسیٰ بیان کرتے ہیں تو حج کو صوم رمضان سے پہلے لاتے ہیں لیکن صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جب ان سے عبداللہ بن نمیر بیان کرتے ہیں تو صوم رمضان کو حج سے پہلے ذکر کرتے ہیں۔[4] جب صحیح مسلم کی روایت میں تصریح سماع ہے اور حنظلہ کی یہ روایت اس بنیادی روایت کے بھی موافق ہے تو صحیح بخاری کی روایت کو نقل بالمعنی کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ یہ جواب امام بخاری رحمہ اللہ کی جلالت شان کے خلاف ضرور ہے کیونکہ انھوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اسی روایت کو بنیاد قرار دے کر ابواب حج کو ابواب صیام سے پہلے بیان کیا ہے، نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب ان کے بیٹے زید بن عبداللہ بیان کرتے ہیں تو وہ بھی حج البیت کو صوم رمضان سے پہلے ذکر کرتے ہیں جیسا کہ صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:16 میں ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سعد بن عبیدہ سے جب سعد بن طارق بیان کرتے ہیں تو وہ بھی حج کو صوم رمضان پر مقدم کرتے ہیں۔[5] یہ بھی ممکن ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دونوں طرح رسول اللہ ﷺ سے سنا ہو لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس موقف کی تردید کی ہے۔[6]

(٣) بَـابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ

باب:3-امور ایمان کا بیان

وَقَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿لَّيْسَ ٱلْبِرَّ أَن تُوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ قِبَلَ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلْكِتَٰبِ وَٱلنَّبِيِّۦنَ وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینے ہی میں نہیں بلکہ حقیقت کے اعتبار سے اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر، اور انبیاء پر ایمان رکھنے والا ہو۔ اور مال

(1) صحيح مسلم، الإيمان، حديث:111(16). (2) صحيح مسلم، الإيمان، حديث:111(16). (3) صحيح البخاري، التفسير، حديث:4514. (4) صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 114(16). (5) صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 112(16). (6) فتح الباري:71/1.

وَٱلْمَسَٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَٰهَدُوا۟ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِى ٱلْبَأْسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلْبَأْسِ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ وَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُتَّقُونَ﴾ [البقرة: ١٧٧]
﴿قَدْ أَفْلَحَ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ ٱلْآيَةَ [المؤمنون: ١]

سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکاۃ کی ادائیگی کرے۔ جب وعدہ کرے تو اسے پورا کرے۔ تنگدستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں۔" (نیز فرمایا:) "یقیناً ان مومنوں نے فلاح پائی (جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں)...... الخ۔"

وضاحت: اسلام میں کچھ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں جنھیں پہلے باب میں بیان کیا گیا ہے اور کچھ چیزوں کو فروع کی حیثیت دی گئی ہے جنھیں اس باب میں بیان کیا جائے گا۔ امام بخاری ؒ نے ان کے لیے لفظ امور استعمال فرمایا ہے، نیز اس باب سے ایک شبہے کا ازالہ بھی مقصود ہے کہ شاید اسلام صرف ان پانچ بنیادی چیزوں ہی کا نام ہے جو پہلے باب میں بیان ہوئی ہیں باقی چیزیں داخل اسلام نہیں ہیں، حالانکہ تمام اوامر و نواہی اسلام کا جز ہیں اور ان پر عمل کرنے سے ایمان میں بالیدگی آتی ہے۔ امام بخاری ؒ نے اس باب میں اس حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ اسلام صرف ان پانچ چیزوں کا نام نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور چیزیں بھی اسلام میں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ امام صاحب نے پہلے باب میں مرجیہ کی اجمالاً تردید فرمائی تھی اب اس باب میں واضح طور پر بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان چند امور کے مجموعے کا نام ہے۔ امور ایمان میں امام بخاری ؒ نے دو طرح کے امور بیان کیے ہیں: ○ وہ امور جو عین ایمان ہیں۔ ○ وہ امور جو عین ایمان تو نہیں مگر ایمان کی تکمیل اور اس کے نور میں اضافے کا باعث ہیں۔ اور اس میں اطاعت والا ہر فعل داخل ہے۔ اہل علم کی زبان میں پہلی صورت میں پائی جانے والی اضافت (نسبت) کو "اضافت بیانیہ" اور دوسری صورت کی اضافت کو "اضافت لامیہ" کہتے ہیں۔ امام بخاری ؒ نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے دو آیات کا حوالہ دیا ہے۔ پہلی آیت میں امور ایمان بیان کیے گئے ہیں جبکہ دوسری آیت میں مومن کی چند صفات کا بیان ہے لیکن آپ نے اس آیت کو پہلے بیان کیا ہے جس میں ایمان کو "بِرّ" سے تعبیر کیا گیا ہے، حالانکہ دوسری آیت میں مومن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو امام بخاری ؒ کے مدعا کے لیے بہت واضح اور صاف ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور "بِرّ" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوذر ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ایمان کے متعلق سوال کیا تو آپ نے اس آیت بِرّ کو تلاوت فرمایا۔[1] آیت بر سے مرجیہ کی تردید مقصود ہے جو ایمان کے بعد اعمال کو کوئی حیثیت نہیں دیتے جبکہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں بہت سی چیزیں داخل ہیں، کیونکہ مجموعی اعتبار سے انسانی کمالات کے تین شعبے ہیں: (ا) انسان کے عقائد صحیح ہوں۔ ان اعتقادیات کی "مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ...... الخ" سے وضاحت کر دی گئی ہے۔ (ب) انسان کی معاشرتی زندگی مثالی ہو۔ اس کے متعلق وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ...... الخ میں وضاحت کر دی گئی ہے۔ (ج) انسان ہمیشہ تہذیب نفس میں لگا رہے۔ اس تہذیب نفس کے دو پہلو ہیں: ○ فرائض کی ادائیگی، اسے ﴿اَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ﴾ میں بیان فرمایا ہے۔

---

(1) المصنف لعبدالرزاق: 128/11، والمطالب العالية، حديث: 3533.

○ حسن اخلاق، اس کے متعلق ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ میں ذکر کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اہل ایمان کی صفات کے متعلق جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے: ''یقیناً ایمان والوں نے فلاح پالی، جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو لغویات سے منہ موڑ لیتے ہیں، جو زکاۃ ادا کرنے والے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے، کیونکہ ان کے متعلق انھیں کوئی ملامت نہیں ہوگی، جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں، جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرنے والے ہیں، یہی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

آیت میں مذکوران صفات سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مومن کا اہل ایمان ہونا کن باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں مذکور دونوں آیات میں کوئی فاصلہ نہیں رکھا اگرچہ بخاری کے بعض نسخوں میں واؤ عاطفہ اور بعض میں ''وَقَوْلُ اللّٰه'' کا اضافہ ملتا ہے۔ یہ انداز شاید اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ پہلی آیت کے آخر میں ''المتقون'' کا لفظ ہے، اس کی تفسیر ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ سے کی گئی ہے، گویا کہ امام بخاری رحمہ اللہ ان دونوں آیات کے ذریعے سے امورِ ایمان، یعنی ایمان کی شاخوں کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔[2]

٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ: حَدَّثَنَا أَبُو عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَّسِتُّونَ شُعْبَةً، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيمَانِ».

[9] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''ایمان کی ساٹھ سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے امور ایمان کی وضاحت کے لیے پہلے قرآنی آیات کا حوالہ دیا، پھر حدیث نبوی کا ذکر فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امور ایمان وہ چیزیں ہو سکتی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوں، نیز اس حدیث میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دے کر اس کی ساٹھ سے کچھ اوپر شاخوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس درخت کی جڑ کلمۂ طیبہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ہے، اس کے علاوہ دیگر امور ایمان اس کی شاخیں ہیں۔ اس سے مرجیہ کی تردید مقصود ہے جو ایمان سے اعمال صالحہ کو بے تعلق قرار دیتے ہیں، حالانکہ درخت کی جڑ اور اس کی ٹہنیوں کے درمیان ایک قدرتی ربط ہوتا ہے کہ ان کو باہمی طور پر بے جوڑ نہیں کہا جا سکتا۔ جڑ قائم ہے تو پتے اور ٹہنیاں بھی قائم ہیں، اگر جڑ تازہ نہیں تو پتے اور ٹہنیاں بھی مرجھا جاتی ہیں۔ شجر ایمان کی جڑ عقیدۂ توحید ہے اور اعمال صالحہ و اخلاق فاضلہ اس کے برگ و بار ہیں۔ اس حدیث سے ایمان اور اعمال صالحہ کا باہمی تعلق اور ایمان کی کمی بیشی ہر دو امور ثابت ہوتے ہیں۔ ② ایک روایت میں ہے کہ ان شعبوں میں سب سے اعلیٰ شعبہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ، راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے۔[3] اس روایت سے ادنیٰ اور اعلیٰ کی تعیین تو ہوگئی لیکن

1 المؤمنون 23:1-11. 2 فتح الباري:1/72. 3 صحيح مسلم، الإيمان، حديث:153(35).

فروع ایمان کی اصل تعداد متعین نہیں ہوئی۔ اس کے متعلق امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ (مذکورہ) حدیث کا معنی سمجھنا چاہا اور میں نے طاعات کو شمار کرنا شروع کیا تو وہ حدیث میں بیان کردہ تعداد سے زائد تھیں، پھر میں نے احادیث کے اعتبار سے نظر ڈالی اور صرف ان اعمال کو شمار کیا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا تھا تو تعداد کم رہی، پھر قرآن کریم میں بیان کردہ ان اعمال کو گنا جن پر ایمان کا لفظ بولا گیا تھا تو تعداد پھر بھی کم رہی، آخر کار قرآن وحدیث کی وہ نیکیاں شمار کیں جو ایمان کے ساتھ مذکور تھیں اور مکررات کو حذف کر دیا تو تعداد 69 نکلی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔[1] ③ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مستقل ایک کتاب "شعب الإیمان" کو مرتب فرمایا ہے جو مطبوع ہے۔ اس میں انھوں نے امور ایمان کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امور ایمان کو اعمال قلب، اعمال لسان اور اعمال بدن پر تقسیم کرتے ہوئے اعمال قلب کی چوبیس (24) شاخیں، اعمال لسان کی سات (7) اور اعمال بدن کی اڑتیس (38) شاخیں تفصیل سے بیان فرمائی ہیں جن کا مجموعہ 69 بن جاتا ہے۔[2] لیکن ان تمام شاخوں کی بنیاد ایک ہی چیز ہے، یعنی علم وعمل سے اپنے نفس کی تہذیب بایں طور کی جائے کہ اس کی دنیا وآخرت باعث رشک ہو، وہ اس طرح کہ صداقت حق کا عقیدہ رکھے اور عمل وکردار میں سلامت روی اور مستقل مزاجی اختیار کرے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ ''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔''[3] حدیث میں ہے کہ سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ مجھے کوئی ایسی جامع بات بتائیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا: ''کہہ: میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر استقامت اختیار کر۔''[4] ④ حیا، طبیعت کے انکسار کا نام ہے جو کسی ایسے خیال یا فعل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے جو عرفاً یا شرعاً مذموم سمجھا جاتا ہو، یعنی ایسا کام نہ کیا جائے جس کے کرنے سے شرعاً سبکی ہو۔ یہی وہ شرعی حیا ہے، جو انسان کو اللہ کی بندگی اور حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی حیا انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حیا خیر کی چیز ہے اور خیر ہی کو لاتی ہے۔[5] حدیث میں اس قسم کی حیا کو ایمان کی شاخ قرار دیا گیا ہے۔ ⑤ رسول اللہ ﷺ نے حیا کا خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ جو اخلاق حسنہ ایمان کے لیے مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں حیا بھی ہے بلکہ حیا ایمان کا سرچشمہ ہے کیونکہ انسان جب اپنے وجود اور اپنی صفات کمال پر غور کرتا ہے تو اسے اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اگر انسان ان انعامات واحسانات کے باوجود، جو اللہ نے اس پر فرمائے ہیں، اللہ کی ذات پر ایمان نہیں لاتا تو یہ اس کی بہت بڑی بے حیائی ہے، گویا ان احسانات کے پیش نظر اللہ پر ایمان لانا حیا ہی کا نتیجہ ہے، یعنی حیا پہلے ایمان کا سبب بنی، ایمان لانے کے بعد پھر ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ ثابت ہوئی کیونکہ انعامات کا مسلسل شکریہ ادا کرتے رہنا بھی حیا ہی کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر صفت حیا کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا، نیز [شُعْبَةٌ] میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، گویا عبارت یوں ہے: اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ عَظِيمَةٌ حیا ایمان کا بہت بڑا شعبہ ہے۔'' یعنی حیا ایک ایسا شعبہ ہے جس پر بہت سے شعبے مرتب ہوتے ہیں بلکہ یہ حیا ان کے وجود کا سبب بنتی

---

① شرح الكرماني: 84/1. ② فتح الباري: 73/1. ③ الأحقاف 46: 13. ④ صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 159(38). ⑤ صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 156(37).

ہے۔ حدیث میں اس کی افادیت کو ایک دوسرے انداز سے بھی بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "جب تم میں حیا نہیں ہے تو جو چاہو کرتے رہو۔"[1]

"بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن۔"

(٤) بَابٌ : اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ

باب:4- مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں

١٠ - حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي السَّفَرِ وَإِسْمَاعِيلَ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللهُ عَنْهُ».

[10] حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان کاموں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔"

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَقَالَ أَبُو مُعَاوِيَةَ: حَدَّثَنَا دَاوُدُ عَنْ عَامِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَاللهِ بْنَ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى: عَنْ دَاوُدَ، عَنْ عَامِرٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. [انظر: ٦٤٨٤]

ابوعبداللہ (امام بخاری ؒ) نے فرمایا: اور ابومعاویہ نے کہا: ہمیں (یہ) حدیث داود نے بیان کی، ان کو عامر (شعبی) نے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے سنا، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔ اور عبدالاعلیٰ نے داود سے بیان کی، انھوں نے عامر (شعبی) سے، انھوں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص سے، انھوں نے نبی ﷺ سے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ اس حدیث سے اس بے عملی یا بدعملی کے طوفان کو روکنا چاہتے ہیں جو مرجیہ کے موقف کی وجہ سے لوگوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ مرجیہ کے نزدیک ایمان صرف تصدیق قلبی کا نام ہے، اس کی موجودگی میں اعمال صالحہ کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ مومن صرف تصدیق ہی سے ان بشارتوں کا حقدار بن جاتا ہے جو اس کے لیے قرآن و حدیث میں موجود ہیں، نیز آپ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد اگرچہ پانچ چیزوں پر ہے لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ نیک عادات اور پاکیزہ خصائل ایسے ہیں جن کے بغیر انسان حقیقی مسلمان نہیں بن سکتا۔ حدیث کا مطلب ہے کہ مسلمان میں اسلام کی کوئی شان تو نمایاں ہونی چاہیے، کم از کم مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلامت روی اور سلامت جوئی تو ضرور ہو۔ اگر کسی شخص میں ادعائے اسلام کے باوجود یہ شان موجود نہیں تو اسے یہ دعویٰ زیب نہیں دیتا۔ ② اس حدیث میں زبان اور ہاتھ سے ایذا نہ پہنچانے کا حکم ہے کیونکہ ایذا کا تعلق اکثر انھی دو سے ہوتا ہے بصورت دیگر یہ مطلب نہیں کہ پاؤں سے ایذا رسانی جائز ہے، بلکہ

[1] صحیح البخاري، الأدب، حدیث:6120.

مطلق طور پر ایذا رسانی جرم ہے۔ پھر ان دونوں میں زبان کو ہاتھ پر اس لیے مقدم کیا ہے کہ نقصان کا تعلق ہاتھ کے مقابلے میں زبان سے زیادہ ہوتا ہے، اس لیے کہ اس میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی، صرف اسے حرکت دینا ہوتی ہے اور نقصان زیادہ ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی کلمے سے پوری قوم یا پوری انسانیت کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے، جبکہ ہاتھ سے صرف اسے نقصان پہنچایا جا سکتا ہے جو سامنے موجود ہو، نیز زبان سے سب و شتم پہلے ہوتا ہے اور ہاتھ استعمال کرنے کی نوبت بعد میں آتی ہے۔ ③ زبان کی برائی سے سب و شتم، غیبت، بدگوئی وغیرہ اور ہاتھ کی برائی سے چوری، ڈاکا زنی، لوٹ مار، مار پیٹ وغیرہ مراد ہیں۔ ④ ''المسلمون'' کی قید سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غیر مسلم کو زبان اور ہاتھ سے تکلیف دینا جائز ہے بلکہ مسلمان تو تمام لوگوں کا خیر اندیش ہوتا ہے، وہ نسب یا رنگ و نسل یا مذہب کو تلاش نہیں کرتا، اگر کسی کے ساتھ مذہبی یا نسلی رشتہ نہیں ہے تو انسانی تعلق ہی مراعات کے لیے کافی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ مسلمان وہ ہے جس سے تمام لوگ محفوظ رہیں۔[1] الغرض اسلام کا ہم سے مطالبہ ہے کہ بلا وجہ کسی غیر مسلم پر بھی دست درازی نہ کریں بلکہ اس کے ساتھ بھی انسانی رشتے کی بنا پر رواداری سے پیش آئیں۔ ⑤ ہجرت صرف ترک وطن کا نام نہیں بلکہ ان چیزوں کو چھوڑ دینے کا نام ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ ترک وطن اس لیے ہوتا ہے کہ ہم اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہیں کر سکتے کیونکہ جس وطن میں احکام الٰہی کی تعمیل نہ ہو، اسے خیر باد کہنا ہی بہتر ہے۔ گویا ہجرت کی دو قسمیں ہیں: ظاہری اور باطنی۔ ظاہری ہجرت ترک وطن ہے اور باطنی ہجرت منہیات سے اجتناب ہے۔ اس حدیث کی دو اغراض ہیں: (ا) مہاجرین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ تمھارا صرف ہجرت کر لینا کافی نہیں بلکہ ہجرت کے بعد گناہوں سے احتراز کرنا ہی اللہ کی رضا کا باعث ہوگا۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ ہجرت کے بعد ہمیں کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں۔[2]

(ب) ان لوگوں کو تسلی دینا مقصود ہے جو کسی وجہ سے ہجرت نہیں کر سکے کہ اصل ہجرت یہ نہیں بلکہ ہجرت یہ ہے کہ آدمی گناہ اور ہر قسم کی منہیات سے باز رہے، یہ فضیلت تو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''تیرا بھلا ہو ہجرت کا معاملہ بہت سخت ہے۔'' پھر آپ نے اس سے پوچھا: ''کیا تیرے پاس اونٹ ہیں اور ان کی زکاۃ دیتا ہے؟'' (اس نے) عرض کیا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''سمندر پار رہتے ہوئے عمل خیر کرتے رہو۔ تجھے وہی اجر ملے گا۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔''[3] ⑥ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث کے اختتام پر دو تعلیقات بھی ذکر کی ہیں: پہلی تعلیق کا مقصد یہ ہے کہ امام شعبی نے، جن کا نام عامر ہے، اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرو سے براہ راست سنا ہے کیونکہ اس تعلیق میں تصریح سماع ہے جبکہ مذکورہ روایت میں ان کے سماع کی وضاحت نہ تھی۔ ابو معاویہ کے اس طریق سے اس شبہے کو دور فرمایا ہے۔ دوسری تعلیق میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس میں عبداللہ نامی راوی سے مراد، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پڑی کہ طبقۂ صحابہ میں جب عبداللہ مطلق ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہوتے ہیں جیسا کہ طبقۂ تابعین میں مطلق عبداللہ سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ مراد ہوتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ تنبیہ فرمانے کے لیے دوسری تعلیق کو ذکر کیا ہے۔ ⑦ اگر کسی کو اقامت حد کے پیش نظر سزا دی جائے اگرچہ بظاہر یہ ایذا رسانی ہے، تو جائز ہوگا کیونکہ اس سے مقصد تکلیف دینا نہیں بلکہ فساد و فواحش اور منکرات کا انسداد مقصود ہے۔[4]

---

① مسند أحمد:2/379. ② فتح الباري:1/74. ③ صحيح البخاري، الزكاة، حديث:1452. ④ فتح الباري:1/75.

(٥) بَابٌ: أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟

باب:5-کون سا (صاحب) اسلام افضل ہے؟

وضاحت: امام بخاری ؒ کے نزدیک اسلام اور ایمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جب اسلام میں درجات کا تفاوت ثابت ہوگا تو ایمان میں بھی ان درجات کا ثبوت ہو جائے گا جو اس کے کم وبیش ہونے پر واضح دلیل ہے، نیز اس میں مرجیہ کی بھی تردید مقصود ہے کہ ایمان میں اعمال کی تاثیر ثابت ہو رہی ہے۔

١١ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ الْقُرَشِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو بُرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللهِ ابْنِ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ».

[11] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کون سا (صاحب) اسلام افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ”جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔“

فوائد و مسائل: ① ”أَيُّ“ کا مضاف الیہ وہ چیز ہوتی ہے جس میں تعدد ہو لیکن اسلام مفرد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حذف مضاف ہے۔ اصل عبارت کو ہم نے ترجمہ کرتے وقت ظاہر کر دیا ہے، یعنی [أَيُّ صَاحِبِ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ] گویا سوال، ذات سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جواب بھی ذات سے دیا جا رہا ہے۔ اس کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ”کون سا مسلمان افضل ہے۔“[1] ایسا کرنے سے سوال و جواب میں مطابقت ہو جاتی ہے۔ ② صحیح مسلم کی اسی روایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے والے خود راویٔ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ ہیں۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا سوال حضرت ابوذر غفاری اور حضرت عمیر بن قتادہ نے بھی کیا تھا۔ ان روایات میں تضاد نہیں ہے کیونکہ کبھی انھوں نے نام کی صراحت کر دی اور کبھی اس سوال کو دوسرے لوگوں کی طرف منسوب کیا کیونکہ وہ اس سوال سے متفق تھے اور کسی کا متفق ہونا گویا خود اس کا سوال کرنا ہے۔[2] ③ اس روایت سے پہلی حدیث کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حصر باعتبار حقیقت کے ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حصر باعتبار حقیقت کے نہیں بلکہ کمال کے لحاظ سے ہے، یعنی مسلمانوں کے مراتب میں فرق ہے، کچھ اکمل ہیں اور کچھ کامل ہیں، یعنی وہ مسلمان جو دیگر اسلامی شعائر کے ساتھ روایت میں ذکر کردہ وصف کا بھی حامل ہو، وہ افضل اور اکمل ہے۔ واللہ أعلم.

(٦) بَابٌ: إِطْعَامُ الطَّعَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

باب:6-کھانا کھلانا، اسلام کا حصہ ہے

1 صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:163(42). 2 فتح الباري:77/1.

وضاحت: امور ایمان کو بیان کیا جا رہا ہے تاکہ اس میں کمی بیشی کا اثبات ہو، نیز مرجیہ کی بھی تردید ہو جائے جو ایمان میں اعمال کی تاثیر کے قائل نہیں ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانا کھلانا اور سلام پھیلانا بھی امور ایمان سے ہیں۔

١٢ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ، عَنْ أَبِي الْخَيْرِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ فَقَالَ: «تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ». [انظر: ٢٨، ٦٢٣٦]

[12] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی ﷺ سے سوال کیا: کون سا اسلام بہتر ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''تم کھانا کھلاؤ اور سب کو سلام کرو، (عام اس سے کہ) تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں پہچانتے ہو۔''

فوائد و مسائل: اس سے پہلے مسلمان کی شان یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ تمام اہل اسلام کا خیر خواہ ہوتا ہے اور اپنی زبان اور ہاتھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ اس حدیث میں ایصال نفع کا ذکر ہے۔ کھانا کھلانا ہاتھ سے اور سلام کرنا زبان سے نفع پہنچانا ہے۔ ایک مسلمان کی یہی شان ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ ② اطعام طعام میں کھانا کھلانا، پانی پلانا اور کسی کی ضیافت کرنا شامل ہیں۔ اس کا تعلق مالی مکارم سے ہے۔ اسی طرح مسلمان کو سلام کرنا، خواہ آشنا ہو یا بیگانہ، بدنی مکارم سے متعلق ہے، گویا مالی اور بدنی طور پر جس قدر بھی مکارم اخلاق ہیں ان سب کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام اور ایمان نتیجے کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے، نیز جس انسان میں مکارم اخلاق، خواہ مالی ہوں یا بدنی، زیادہ ہوں گے اس کا ایمان اتنا ہی ترقی یافتہ ہوگا۔ اس سے مرجیہ کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں، نہ ان سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے اور نہ ان کے چھوڑنے سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے۔ ③ اطعام طعام میں مسلم یا غیر مسلم کی تخصیص نہیں ہے بلکہ جانوروں تک کے کھلانے میں اجر و ثواب ہوتا ہے جیسا کہ بکثرت احادیث میں اس کی صراحت ہے، البتہ مسلمان کو کھلانے میں اجر زیادہ ہوگا، ہاں سلام کرنے میں مسلمان کی تخصیص کی جائے گی، کیونکہ کفار اور منکرین حق کو سلام کہنا درست نہیں ہے۔ اہل کتاب کو پہلے سلام نہیں کہنا چاہیے۔ اگر وہ سلام کہیں تو صرف وعلیکم سے جواب دیا جائے۔ ④ ایک ہی سوال کے مختلف جوابات اس بنا پر ہیں کہ سائل کے احوال مختلف ہوتے ہیں، اس کی ضرورت کو دیکھ کر جواب دیا جاتا ہے، مثلاً: ایک شخص نماز کا پابند ہے، روزے بھی رکھتا ہے لیکن طبیعت میں ذرا بخل ہے تو اس شخص کو ایسا عمل بتایا جائے گا جو اس کی کمی کا علاج کر سکے۔ اس طرح ایک شخص مہمان نواز ہے، رحمدل بھی ہے لیکن نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو اسے نماز کے متعلق تلقین کی جائے گی کہ یہ افضل عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ روحانی مربی ہیں، اس لیے جس عمل کی کمی دیکھتے ہیں اسی کی ترغیب دلائی ہے۔ ⑤ [أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ] اور [أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ] میں افضل اور خیر اگرچہ دونوں اسم تفضیل کے صیغے ہیں، تاہم افضل کے معنی کثرت ثواب کے ہیں جو قلت کے مقابلے میں ہے اور خیر کے معنی نفع ہیں جو شر کے مقابلے میں ہے۔ پہلا سوال مقدار سے

متعلق ہے جبکہ دوسرے سوال کا تعلق معیار سے ہے۔[1]

(٧) بَابٌ: مِنَ الْإِيمَانِ أَنْ يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

باب: 7- اپنی پسندیدہ چیز کو اپنے بھائی کے لیے پسند کرنا ایمان کا حصہ ہے

١٣ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. وَعَنْ حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ».

[13] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، وہ نبئ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں ایمان کی نفی سے مراد کمال ایمان کی نفی مقصود ہے جیسا کہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے: [فُلَانٌ لَيْسَ بِإِنْسَانٍ] ”فلاں شخص انسان نہیں ہے۔“ اس سے مراد کامل انسان ہونے کی نفی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمان دیگر ارکان اسلام کا خیال رکھتے ہوئے اس مبارک خصلت کو عمل میں لائے گا وہ مومن کامل ہوگا بصورت دیگر اس کا ایمان ناقص ہوگا۔ امام بخاری کا مقصود بھی یہی ہے کہ ایمان کم وبیش ہوتا رہتا ہے۔[2] ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسلمان جو چیز اپنے لیے ناپسند کرتا ہے وہ دوسرے بھائی کے لیے بھی ناپسند کرے۔ اگرچہ حدیث میں یہ الفاظ نہیں ہیں، تاہم اس کا متبادر مفہوم یہی ہے کیونکہ کسی چیز سے محبت رکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی نقیض سے بغض ہو۔[3] ③ اس خصلت کے کئی ایک فوائد ہیں: * تکبر ختم ہوگا۔ * اسلامی اخوت پختہ ہوگی۔ * شفقت ورحمت کا جذبہ پیدا ہوگا۔ * حسد کی بیخ کنی ہوگی۔ * دوسروں کے عیوب کی پردہ پوشی کا خوگر ہوگا۔ ④ امام بخاری ؒ نے اس سے پہلے عنوانات میں اسلام کا لفظ استعمال کیا تھا کیونکہ بیان کردہ امور کا تعلق ظاہری افعال سے تھا جیسا کہ اطعام طعام اور افشائے سلام وغیرہ، لیکن اس باب میں ”ایمان“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ محبت دل کا فعل ہے، اس لیے اس کی تعبیر میں ایمان ہی کا لفظ موزوں ہے کیونکہ اس کا تعلق بھی دل سے ہے۔ ⑤ یہ حدیث اصلاح معاشرہ کے لیے بہت کیمیا اثر ہے۔ اگر اس حدیث پر عمل کر لیا جائے تو ان تمام فسادات کی جڑ کٹ جائے جو آج یہاں رونما ہو رہے ہیں کیونکہ جب بھی کوئی کسی کے ساتھ کوئی بھی معاملہ کرنا چاہتا ہے، اس وقت سوچ لیا جائے کہ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کیا میں اسے پسند کرتا جو خود میں اس کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں؟ اگر اتنی سی سوچ پیدا ہو جائے تو دنیا کا تمام فساد نیست ونابود ہو جائے۔ ⑥ مصنف نے اس حدیث کی دو سندیں ذکر کی ہیں: پہلی سند میں شعبہ نے قتادہ سے بصیغۂ عن بیان کیا ہے جبکہ دوسری سند میں حسین معلم نے قتادہ سے بیان کرتے ہوئے صیغۂ تحدیث (حَدَّثَنَا) استعمال کیا ہے، اس لیے امام بخاری ؒ نے دونوں کو جمع نہیں کیا بلکہ الگ الگ ذکر فرمایا ہے۔ اور چونکہ ان کے شیخ نے بھی ایسے ہی ذکر کیا تھا۔

---

1 شرح الكرماني:1/92. 2 فتح الباري:1/80. 3 شرح الكرماني:1/95.

(٨) بَابٌ: حُبُّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الْإِيمَانِ

باب: 8- رسول اللہ ﷺ سے محبت بھی ایمان کا حصہ ہے

١٤ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهِ وَوَلَدِهِ».

[14] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ایمان دار نہیں ہوسکتا تاآنکہ میں اسے اس کے والد اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔''

فوائد و مسائل: ① دیگر عناوین کے برعکس اس عنوان میں ادباً رسول اللہ ﷺ کا ذکر مقدم فرمایا ہے، نیز ایمانیات کے معاملے میں آپ کی محبت اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جس مسلمان کو رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوگی وہی دیگر احکام کی تعمیل کر سکے گا، اور اسی محبت رسول ہی سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ اگر یہ محبت موجود ہے تو ایمان ہے بصورت دیگر ایمان سے وہ محروم ہے۔ اس سے ایمان کی کمی بیشی پر بھی روشنی پڑتی ہے کیونکہ محبت ایک ایسا عمل ہے جس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ② محبت کی دو قسمیں ہیں: ایک طبعی جو غیر اختیاری ہوتی ہے۔ اس قسم کی محبت معیار ایمان نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا خواجہ ابوطالب کو آپ سے طبعی محبت تھی لیکن اس کے باوجود انھیں مسلمان شمار نہیں کیا جاتا۔ دوسری محبت شرعی اور عقلی ہے جس میں انسان اپنے ارادے اور اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ ایمان کا مدار اسی شرعی محبت پر ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب کسی سے شرعی محبت ہوتی ہے تو محبت طبعی بھی آجاتی ہے، البتہ محبت شرعی کا تقاضا ہے کہ ٹکراؤ کی صورت میں شرعی محبت غالب آنی چاہیے۔ ③ اس حدیث میں اپنے نفس کی محبت کا ذکر نہیں کیونکہ یہاں ذکر باعتبار ظہور کے ہے اور اپنے نفس سے محبت کا ظہور نہیں ہوتا، پھر دوسری روایت میں تمام لوگوں کی محبت کا ذکر ہے، اس کے عموم میں اپنا نفس بھی شامل ہے، نیز حدیث میں نفس کی محبت کا تذکرہ موجود ہے، چنانچہ حضرت عمر ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ایک دفعہ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کی محبت میرے دل میں ہر چیز سے زیادہ ہے مگر میں اپنے نفس کی محبت اور بھی زیادہ پارہا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''عمر! ابھی کمی باقی ہے۔'' پھر حضرت عمر ؓ نے غور کیا، پھر عرض کرنے لگے کہ اب آپ کی محبت میرے دل میں میرے نفس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: [اَلْآنَ یَا عُمَرُ] یعنی اب ایمان کی تکمیل ہوئی ہے۔[1] ④ اس روایت میں والد کو ولد پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ وہ اصل ہونے کی بنا پر قابل تعظیم ہے اور تعظیم کا تقاضا ہے کہ اسے ذکر میں مقدم کیا جائے۔ پھر ہر شخص کے لیے والد کا ہونا تو ضروری ہے لیکن اس کے لیے اولاد کا ہونا ضروری نہیں، پھر باپ کی محبت اور رسول اکرم ﷺ کی محبت میں مناسبت بھی زیادہ ہے کیونکہ آپ بمنزلہ والد کے ہیں۔ بعض روایات میں ولد کو والد پر مقدم رکھا گیا ہے۔[2] یہ رحمت والفت کے اعتبار سے ہے کہ انسان کو شفقت و رحمت

---

① صحيح البخاري، الأيمان والنذور، حديث: 6632. ② صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 169(44).

اولاد پر زیادہ ہوتی ہے۔⑤ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی سنت کی تائید ونصرت، اس کا دفاع اور منکرین منکرین سنت کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کے لائے ہوئے طریقے پر عمل کیا جائے۔ اس کے لیے وقت، صلاحیت اور مال وغیرہ خرچ کیا جائے، حقیقی ایمان انھی باتوں سے مکمل ہوگا۔ اس سلسلے میں جو چیز بھی رکاوٹ بنے، اسے قربان کر دیا جائے۔ اگر مومن اپنے اندر اس معیار کو محسوس کرتا ہے تو حقیقی مومن ہے بصورت دیگر اسے اپنے ایمان کے متعلق غوروفکر کرنا چاہیے۔[1]
واللہ المستعان.

١٥ - حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُلَيَّةَ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ، عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ؛ ح: وَحَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ».

[15] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

فوائد ومسائل: ① محبت کی تین اقسام ہیں: * محبت تعظیم، جیسے والد اور استاد سے محبت کی جاتی ہے۔ * محبت شفقت، جیسے اولاد اور شاگردوں سے کی جاتی ہے۔ * محبت استحسان، جو عام انسانوں سے کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں تمام اصناف محبت کو جمع کر دیا ہے کہ اس وقت تک ایمان کی تکمیل نہیں ہوگی جب تک ان تمام اقسام سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ سے جو انسان (اس حدیث میں مذکور محبت کی طرح) محبت کرے گا، وہ آپ کے ساتھ جنت میں جائے گا۔[2] رسول اللہ ﷺ اس امت کے محسن اعظم ہیں، اس لیے آپ تمام مذکورہ اقسام سے محبت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ آپ نے ہمیں دنیا میں عزت وشرف اور آخرت میں راحت ونجات کا راستہ بتایا ہے۔[3] ② محبت کے چار اسباب ہیں: * جمال، یعنی انسان خوبصورت ہو اور اس کے اعضاء میں تناسب اور اعتدال ہو۔ * کمال، اسے باطنی خوبصورتی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان میں اعلیٰ درجے کے اخلاق جمع ہوں۔ بڑے بڑے سرکش بھی اس کی خوش اخلاقی کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہوں۔ * قرابت، اس سے مراد جسمانی اور روحانی تعلق داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے روحانی باپ ہیں۔ * احسان، رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے محسن اعظم ہیں۔ اس عالم رنگ و بو میں جس قدر بھی محبت کی وجوہات ہوسکتی ہیں، وہ سب آپ کی ذات میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں، اس لیے آپ کے ساتھ محبت کا وہ تعلق ہونا چاہیے جو کسی اور انسان یا مخلوق کے ساتھ نہ ہو۔ ③ ایک حدیث میں مومن کو نکیل دار سدھائے ہوئے اونٹ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اسے جب کھینچا جائے، چل پڑتا ہے اور جہاں بٹھایا جائے، بیٹھ جاتا ہے۔[4] رسول اللہ ﷺ سے محبت کے متعلق مومن کی یہی شان ہونی چاہیے کہ جہاں اللہ کا رسول اسے کھینچے، چل پڑے اور جہاں بٹھائے وہاں بیٹھ جائے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ، اللہ کے فرستادہ

1 شرح الكرماني:99/1. 2 صحيح البخاري، الأدب، حديث:6171. 3 شرح الكرماني:99/1. 4 مسند أحمد:126/4.

ہیں، اس لیے آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ”جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔“[1]

(٩) بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

باب: 9-ایمان کی مٹھاس کا بیان

وضاحت: اس مقام پر مرجیہ کی تردید مقصود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب کے تحت مذکور حدیث سے ایمان کی کمی بیشی اور ایمان پر اعمال کے اثر انداز ہونے پر استدلال کیا ہے، نیز یہ بھی بتایا ہے کہ حلاوت ایمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے حقیقی محبت، اللہ والوں سے مخلصانہ تعلقات اور ایمان میں استقامت انتہائی ضروری ہے۔

١٦ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا أَيُّوبُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَكُونَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَّكْرَهَ أَنْ يَّعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ». [انظر: ٢١، ٦٠٤١، ٦٩٤١]

[16] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ”تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں یہ پیدا ہو جائیں اس نے ایمان کی شیرینی کو پالیا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ اور جس شخص سے بھی محبت رکھے محض اللہ کے لیے محبت رکھے۔ اور وہ کفر میں لوٹ جانے کو ایسا برا خیال کرے جیسا کہ آگ میں گرائے جانے کو برا سمجھتا ہے۔“

فوائد و مسائل: ① حلاوت ایمان کی صورت یہ ہے کہ عبادت اور نیکی میں لذت اور سرور آئے، دینی معاملات میں مشقت برداشت کرنا آسان ہو جائے اور امور دین کو دنیاوی ساز و سامان پر ترجیح دے۔[2] ② اس حدیث میں ایمان کے لیے لفظ حلاوت بطور استعارہ استعمال فرما کر مومن کی ایمانی کیفیت کو میٹھی چیز سے تشبیہ دی ہے جیسا کہ شہد ہوتا ہے، اس میں مٹھاس اور اندرونی امراض کا علاج بھی ہے، اسی طرح ایمان میں لذت بھی ہے اور شفا بھی۔ جب ایمان کے لیے حلاوت ثابت ہوگئی تو ظاہر ہے کہ مٹھاس کسی کو کم اور کسی کو زیادہ محسوس ہوتی ہے، صفراوی مریض کو مٹھاس کا احساس کم ہوتا ہے بلکہ اسے میٹھی چیز کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں تندرست کو مٹھاس کی لذت کا ادراک ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی کو ایمان میں حلاوت کا احساس نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کا صفراء اس کے مزاج پر غالب آ چکا ہے۔ بس اس لذت کی کمی بیشی سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایمان کی کمی بیشی اور ایمان پر اعمال کے اثر انداز ہونے کو ثابت کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا استدلال نہایت واضح اور قوی ہے۔[3] ③ اس حدیث میں تین چیزیں بیان ہوئی ہیں: پہلے اللہ کی محبت، وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے اور اس کے رسول کی محبت، وہ اس بنا پر کہ اللہ کے رسول محسن حقیقی ہیں۔ جب اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا یہ درجہ حاصل ہوگیا تو دوسری چیز

---

[1] النساء 4:80. [2] فتح الباري:1/85. [3] فتح الباري:1/84.

یہ ہے کہ مخلوقات میں جس سے محبت ہو وہ لوجہ اللہ ہو۔ اس میں ضرر رسانی کے جذبات یکسر ختم ہو جائیں۔ جب انسان اس درجے تک پہنچ جائے تو اسے محبوب کی ناپسندیدہ باتوں سے انتہائی نفرت ہونی چاہیے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ اسے کفر سے اس قدر نفرت ہو کہ اس کے لیے آگ میں گرنا کفر اختیار کرنے سے آسان ہو۔ ④ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان صرف ان پانچ چیزوں میں منحصر نہیں جو پہلے بیان ہوئی ہیں بلکہ اس کی تکمیل کے لیے ان چیزوں کو اختیار کرنا ہوگا جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ بھی ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مومن کو حلاوت ایمان پیدا کرنے کے لیے ان خصائل کو اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ اس حدیث میں اشارہ ہے کہ نیکیوں سے خود کو آراستہ کرنا اور برائیوں سے دور رہنا تکمیل ایمان کے لیے ضروری ہے۔[1] ⑤ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''اس شخص (کی فضیلت) کا بیان جس نے مار پیٹ، قتل اور ذلت و رسوائی کو کفر پر ترجیح دی۔''[2] اگرچہ ایمان ایسی چیز نہیں جسے زبان سے چکھا جا سکے، تاہم اس میں غیر مرئی مٹھاس اور لذت ہوتی ہے اور یہ اس شخص کو محسوس ہوتی ہے جو حدیث میں مذکور معیار پر پورا اتر آتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ چاشنی اس حد تک محسوس ہوتی ہے کہ بندۂ مومن ایمان پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اسے نیکی اور اطاعت کے کاموں میں لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے۔

(١٠) بَابٌ : عَلَامَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ

باب: 10- انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے

١٧ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَبْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ، وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ». [انظر: ٣٧٨٤]

[17] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''ایمان کی نشانی انصار سے محبت رکھنا اور نفاق کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے۔''

فوائد و مسائل: ① انصار، مدینہ منورہ کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے ہاں پناہ دی اور ایسے وقت میں آپ کا ساتھ دیا جب اور کوئی قوم آپ کی مدد کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نازک وقت میں اگر اہل مدینہ اسلام کی مدد کے لیے کھڑے نہ ہوتے تو عرب میں اسلام کے ابھرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ پہلے یہ لوگ بنوقیلہ کے نام سے مشہور تھے۔ دین اسلام اور اہل اسلام کی مدد کرنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے ان کا لقب انصار رکھا۔ اس حدیث میں انصار سے آپ کے مددگار اور معاون کی حیثیت سے محبت کرنا مراد ہے، شخصی طور پر کسی سے اختلاف اور جھگڑا اس محبت کے منافی نہیں ہے۔ ② مہاجرین نے اسلام کے لیے اپنے مالوف وطن کو قربان کیا، اموال و املاک کی پروا نہ کی اور تمام آرائش و آسائش سے روگردانی کی۔ خود ہجرت کی اتنی

1 شرح الكرماني:1/101. 2 صحيح البخاري، الإكراه، حديث:6941.

فضیلت ہے کہ دوسری کوئی فضیلت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں اپنا شمار انصار میں کراتا۔[1] اس لیے اتنی قربانیاں دینے والوں کے متعلق تو کوئی بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ ان کی محبت میں کوئی ابہام نہیں، البتہ انصار کے متعلق غیریت کا خیال کیا جا سکتا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے، یعنی انصار سے اس اعتبار سے محبت کرنا کہ انھوں نے دین اسلام کی نصرت وتائید کی ہے۔ ایسے حالات میں ان سے وہی محبت رکھ سکتا ہے جسے دین اور صاحب دین سے محبت ہوگی، اور اسی طرح ان سے بغض وہی رکھے گا جسے دین اور صاحب دین سے بغض ہوگا۔ واضح رہے کہ انصار سے محبت و بغض کے متعلق ان کی سرفروشانہ خدمات اور شان نصرت کو ضرور ملحوظ رکھا جائے۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ تصدیق قلبی کے ساتھ اس کے اثرات اور دیگر اعمال بھی ضروری ہیں، اخروی نجات کے لیے ان کا ہونا ضروری ہے، ان میں ایک حب انصار بھی ہے۔ اس حدیث سے "اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ" والی حدیث کی بھی تائید ہوتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے انصار کی محبت کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے، چنانچہ مناقب انصار میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: [حُبُّ الْأَنْصَارِ مِنَ الْإِيمَانِ] "انصار کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔" حدیث میں ہے کہ جو انصار سے محبت کرے گا، اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا، اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا۔[2]

(۱۱) بَابٌ :	باب: 11- بلاعنوان

وضاحت: عام طور پر بلاعنوان ابواب کی تین اغراض ہوتی ہیں: * اس کا تعلق پہلے باب سے ہوتا ہے۔ یہ گویا اس کا تتمہ اور تکملہ یا بمنزلہ فصل کے ہوتا ہے۔ * قارئین کی ذہنی استعداد بڑھانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ حدیث کے مندرجات پر غور وفکر کر کے خود کوئی عنوان قائم کریں۔ * بعض اوقات یہ اشارہ بھی ہوتا ہے کہ باب بلاعنوان کے تحت آنے والی حدیث کو کسی ایک فائدے پر منحصر نہ کر دیا جائے بلکہ جس قدر بھی مسائل ثابت ہو رہے ہیں ان سب کی گنجائش رہے، چنانچہ یہ بلاعنوان باب پہلے باب کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں انصار کی محبت کو ایمان کی علامت بتایا گیا تھا اور یہاں انصار کے اس لقب کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے، نیز ذہنی استعداد بڑھانا بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ دیکھو اس حدیث میں متعدد ایسی چیزیں ہیں جن کا چھوڑنا ایمان میں داخل ہے اور جن کے اختیار کرنے سے ایمان کمزور ہو جاتا ہے، اب تمھیں اختیار ہے جو چاہو عنوان بندی کر لو۔ تیسری غرض کے پیش نظر اس حدیث پر متعدد عنوان قائم ہو سکتے ہیں، مثلاً: [الاجتناب عن القتل من الإيمان] اور [من الإيمان ترك البهتان] وغیرہ۔

١٨ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُو إِدْرِيسَ عَائِذُ اللهِ ابْنُ عَبْدِ اللهِ: أَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ

[18] حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، اور یہ بدری صحابی اور عقبہ والی رات کے نقباء میں سے ایک نقیب ہیں، رسول اللہ ﷺ نے، جب کہ آپ کے اردگرد صحابہ کی

---

① صحيح البخاري، أخبار الآحاد، حديث: 7244. ② صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث: 3783.

عَنْهُ - وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَّهُوَ أَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ -:أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ - وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِّنْ أَصْحَابِهِ -: «بَايِعُونِي عَلٰى أَنْ لَّاتُشْرِكُوا بِاللهِ شَيْئًا، وَّلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللهُ فَهُوَ إِلَى اللهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ، وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ» فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ. [انظر: ٣٨٩٢، ٣٨٩٣، ٣٩٩٩، ٤٨٩٤، ٦٧٨٤، ٦٨٠١، ٦٨٧٣، ٧٠٥٥، ٧١٩٩، ٧٢١٣، ٧٤٦٨]

ایک جماعت تھی، فرمایا: ''تم سب مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے۔ اپنے ہاتھ اور پاؤں کے سامنے (دیدہ دانستہ) کسی پر افترا پردازی نہیں کرو گے اور اچھے کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے۔ پھر جو کوئی تم میں سے یہ عہد پورا کرے گا، اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے اور جو کوئی ان گناہوں میں سے کچھ کر بیٹھے اور اسے دنیا میں اس کی سزا مل جائے تو اس کا گناہ اتر جائے گا۔ اور جو کوئی ان جرائم میں سے کسی کا ارتکاب کرے، پھر اللہ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائی تو وہ اللہ کے حوالے ہے کہ چاہے تو (قیامت کے دن) اسے سزا دے یا معاف کر دے۔'' ہم نے ان سب شرطوں پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کر لی۔

فوائد و مسائل: ① یہ بیعت، بیعتِ اسلام ہے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے دین اسلام پر کاربند رہنے، ہجرت کرنے، میدان جہاد میں ثابت قدم رہنے، فواحش و منکرات کو چھوڑنے، سنت پر عمل کرنے اور بدعات و رسوم سے دور رہنے کی بیعت لیتے تھے۔ انصار سے اسی قسم کی بیعت لی گئی اور وہ اس پر کاربند رہنے کی بنا پر انصار کہلانے کے حق دار ٹھہرے۔ اس کے علاوہ بیعتِ تصوف کا اسلام میں کوئی وجود نہیں، یہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''حدود گناہوں کا کفارہ ہیں۔''[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ حد شرعی قائم ہونے سے گناہ معاف ہو جاتا ہے قرآن کریم کی بعض آیات میں اس بات کی صراحت ہے کہ حدود میں گناہ کی گندگی کو صاف کر دینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔[2] اس کے برعکس مستدرک حاکم وغیرہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدود کا کفارہ بننا معلوم نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: [...... وَمَا أَدْرِي الْحُدُودُ كَفَّارَاتٌ أَمْ لَا؟] ''مجھے معلوم نہیں کہ حدود گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں یا نہیں؟''[3] علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے ان میں یوں تطبیق دی ہے کہ ممکن ہے آپ نے یہ بات اس وقت کہی ہو جب آپ کو علم نہ ہو اور بعد میں علم ہو گیا ہو کہ حدود کفارہ بن جاتی ہیں تو پھر آپ نے اس کی وضاحت کر دی ہو جیسا کہ حدیث باب سے ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھیے: (الصحيحة للألباني:252/5) پھر مذکورہ حدیث میں اس شخص سے تقابل کیا گیا ہے جس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، خواہ معاف کر دے، خواہ سزا دے۔ اس تقابل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کو سزا دی گئی وہ بری ہو گیا۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ

1 صحيح البخاري، الحدود، حديث: 6784. 2 النساء 92:4. 3 المستدرك للحاكم: 36/1، والصحيحة للألباني، حديث: 2217.

کا اس حدیث سے مرجیہ اور خوارج کی تردید کرنا مقصود ہے۔ اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ اعمال مطلوب ہیں اور ایمان کی کمی بیشی پر اثر انداز ہوتے ہیں، نیز اعمال کی جزئیت اس درجے کی بھی نہیں جس کا دعویٰ معتزلہ اور خوارج نے کیا کہ گناہ کرنے سے مومن ایمان سے خارج ہو جاتا ہے جبکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خارج نہیں ہوتا بلکہ گناہ کے باوجود بھی مغفرت کا معاملہ اللہ کی مشیت کے تحت رہتا ہے۔ اگر اس کی رحمت دستگیری فرمائے تو مغفرت بھی ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ مرجیہ کے مقابلے میں معتزلہ اور خوارج کی تردید کم ہے کیونکہ ان کا موقف دنیاوی لحاظ سے چنداں نقصان دہ نہیں۔ ان کے ہاں اعمال کے متعلق بہت شدت پائی جاتی ہے۔ وہ اعمال کو اس لیے ترک نہیں کرتے کہ مبادا اسلام سے خارج ہو جائیں۔ ④ گناہ کبیرہ کا مرتکب اگر توبہ کیے بغیر مر جائے تو اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، چاہے تو ایمان کی برکت سے سزا دیے بغیر اسے جنت میں داخل کر دے یا سزا دے کر جنت میں پہنچا دے لیکن اس سے شرک مستثنیٰ ہے۔ اس کے متعلق ضابطہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرے گا اور مشرک ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہے گا۔[1] واضح رہے کہ کبیرہ گناہوں میں قتل ناحق بھی بہت گھناؤنا جرم ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اس جرم کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔[2] اسی طرح حقوق العباد کا معاملہ بھی بہت سنگین ہے، متعدد احادیث کے مطابق حقوق العباد کو جب تک بندے معاف نہیں کریں گے، معافی نہیں ہوگی، تاہم اہل سنت کے عقیدے کے مطابق ان دونوں جرموں کے مرتکبین کے لیے جہنم کی سزا دائمی نہیں ہوگی۔ سزا بھگتنے کے بعد بالآخر یہ بھی جنت میں جانے کے مستحق قرار پائیں گے۔ ⑤ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جرم کی سزا دے اسی طرح اللہ تعالیٰ پر کسی نیکی کی جزا دینا بھی ضروری نہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ نیکی کا بدلہ دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا گناہ معاف کرنے یا سزا دینے اور نیکی کا بدلہ دینے کا ضابطہ ایک نہیں ہے۔ گناہوں کے بارے میں اس کا قانون یہ ہے کہ اس کی سزا دے لیکن اپنے فضل و احسان سے معاف بھی کر دے گا جبکہ نیکی کے بارے میں اس کا قانون اور ضابطہ یہ ہے کہ وہ، اگر موانع نہ ہوں تو، ضرور قبول فرماتا ہے اور اس کا بدلہ عطا فرماتا ہے۔ یہ اس ذات عالی نے اپنی رحمت سے خود اپنے اوپر لازم کیا ہے کسی انسان نے فرض قرار نہیں دیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ ”اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔“[3] نیز فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ”بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“[4] واللہ اعلم.

(١٢) بَابٌ: مِنَ الدِّينِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

باب: 12- فتنوں سے فرار بھی دین کا حصہ ہے

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے پہلے ان امور کو بیان فرمایا جنھیں حاصل کرنا چاہیے۔ اب ان امور کا ذکر کرتے ہیں جن سے بچنا چاہیے کیونکہ قاعدہ ہے کہ اضداد کے بیان سے اشیاء کی معرفت زیادہ ہوتی ہے، نیز آپ نے یہاں لفظ دین استعمال فرمایا جبکہ قبل ازیں ایمان یا اسلام استعمال فرمایا تھا، یہ اشارہ ہے کہ تینوں ایک ہی حقیقت کے نام ہیں۔

---

① النسآء 4:116. ② النسآء 4:93. ③ البقرة 2:143. ④ التوبة 9:120.

١٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتْبَعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ، وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ، يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ». [انظر: ٣٣٠٠، ٣٦٠٠، ٦٤٩٥، ٧٠٨٨]

[19] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ زمانہ قریب ہے جب مسلمان کا بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات کی طرف نکل جائے گا اور فتنوں سے راہ فرار اختیار کر کے اپنے دین کو بچا لے گا۔''

فوائد و مسائل: ① فتنے سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان گمراہ ہو کر اللہ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے غافل ہو جائے۔ ہمارے اس دور میں ایسے فتنوں کا ہجوم ہے جو گمراہی اور دین سے بے زاری کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے حالات میں گوشۂ تنہائی اختیار کرنا بہتر ہے۔ اگر انسان میں ایسے دجالی فتنوں کا مقابلہ کرنے کی علمی، عملی اور اخلاقی ہمت ہو تو معاشرے میں رہتے ہوئے ان کی روک تھام میں کوشاں رہنا افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے پُرفتن دور میں مکہ مکرمہ، اس کے بعد مدینہ منورہ میں اقامت اختیار فرمائی۔ واضح رہے کہ فرار کے تین مرتبے ہیں: (١) فرار من دار الكفر. (٢) فرار من دار الفسق. (٣) فرار من مجلس المعاصي. ② امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے دین کو بچانے کے لیے تمام لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنا اچھا عمل ہے اور ایسا کرنا ایمان کا حصہ ہے۔ جو لوگ اس طرح کے اعمال صالحہ کو ایمان سے جدا قرار دیتے ہیں ان کا موقف صحیح نہیں ہے۔ ③ اس حدیث میں بکریوں کو بہترین مال قرار دیا گیا ہے کیونکہ ان کی پرورش بہت آسان ہوتی ہے لیکن ان سے نفع بہت ہوتا ہے، ان کا دودھ حفظان صحت کے لیے بہت مفید ہے، اس کے استعمال سے گرانی پیدا نہیں ہوتی۔ بکری کی نسل بہت بڑھتی ہے، جنگلات میں اس کی خوراک کے لیے انتظام کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنا پیٹ خود بھر لیتی ہے، بآسانی پہاڑوں پر چڑھ جاتی ہے، اس بنا پر پُرفتن دور میں پہاڑوں اور جنگلات میں تنہائی اختیار کر کے اس مفید ترین جانور کی پرورش سے گزر اوقات کرنا مناسب ہے۔[1]

(١٣) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللهِ»، وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فِعْلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ [البقرة:٢٢٥].

باب:13- فرمان نبوی (کی وضاحت) کہ ''اللہ کے متعلق میں تم سے زیادہ جاننے والا ہوں۔'' اور اس بات کا ثبوت کہ معرفت دل کا فعل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اس کی پکڑ اس چیز پر ہوگی جو تمھارے دلوں کا فعل ہے۔''

[1] شرح الكرماني:1/110.

وضاحت: ہر شخص کا ایمان اس کے علم اور معرفت کے بقدر ہوتا ہے۔ جس قدر اللہ کی معرفت زیادہ ہوگی، اسی قدر ایمان بھی قوی ہوگا اور جتنی معرفت میں کمزوری ہوگی اسی قدر ایمان بھی کمزور ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی معرفت اور آپ کا علم سب سے قوی تھی، اس بنا پر آپ کا ایمان بھی سب سے قوی تھا، لیکن بقول امام بخاری ایمان تو قول وفعل سے عبارت ہے اور معرفت نہ قول ہے، نہ فعل۔ پھر اس میں کمی بیشی کیسے ہوگی؟ اس اشکال کو دور کرنے کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ معرفت، دل کا فعل ہے۔ اس پر اعتراض ہوسکتا تھا کہ قول وفعل تو جوارح کا عمل ہے ہم دل کے فعل کے متعلق معلومات نہیں رکھتے، لہٰذا امام صاحب نے ایک آیت کا حوالہ دیا جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فعل قلب پر مؤاخذہ فرمائے گا۔ مذکورہ آیت میں صراحت کے ساتھ قلب کی طرف کسب کی نسبت کی گئی ہے جو فعل وعمل کے معنی میں ہے۔

٢٠ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ الْبِيكَنْدِيُّ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ، قَالُوا: إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ اللهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ ثُمَّ يَقُولُ: «إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللهِ أَنَا».

[20] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیتے تو انھی کاموں کا حکم دیتے جن کو وہ بآسانی کر سکتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارا حال آپ جیسا نہیں ہے۔ اللہ نے آپ کی اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمایا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ اس قدر ناراض ہوئے کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر غصے کا اثر ظاہر ہوا، پھر آپ نے فرمایا: ''میں تم سب سے زیادہ پرہیزگار اور اللہ کو جاننے والا ہوں۔''

فوائد ومسائل: ① رسول اللہ ﷺ اس لیے ناراض ہوئے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ''آسان کاموں'' کو رفع درجات اور غفران ذنوب کے لیے ناکافی خیال کیا۔ ان کے گمان کے مطابق بلند مراتب کے حصول کے لیے ایسے کٹھن اعمال ہونے چاہییں جن کی ادائیگی میں تکلیف ومشقت اٹھانی پڑے۔ اس پر آپ نے تنبیہ فرمائی کہ شریعت میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں بلکہ جو اور جیسا ارشاد ہو، اس پر اکتفا کیا جائے۔ ② فرائض کی ادائیگی کے متعلق یہ حکم نہیں ہے کہ جتنا بوجھ اٹھا سکتا ہو اتنا اٹھا لے کیونکہ فرائض اپنی جگہ شروع ہی سے انسانی طاقت سے زیادہ نہیں ہیں، البتہ نوافل کے متعلق یہ حکم ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق ادا کیے جائیں۔ استطاعت میں ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ان پر تادم آخر عمل کیا جاسکے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: [أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى أَدْوَمُهَا وَ إِنْ قَلَّ] ''اللہ کے نزدیک محبوب اعمال وہ ہیں جن میں دوام ہو، مقدار میں اگرچہ وہ کم ہوں۔''[1] ③ امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے فرقۂ کرامیہ کی تردید کرنا چاہتے ہیں جن کا موقف ہے کہ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے، لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان معرفت رب کا نام ہے اور اس کا تعلق دل سے ہے۔ اس بنا پر محض زبانی اقرار کو ایمان نہیں کہا جاسکتا، اس کے لیے معرفت قلب بھی ضروری ہے، نیز اس سے ایمان کی کمی بیشی بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ایمان کا تعلق

[1] صحیح مسلم، صلاة المسافرین، حدیث: 1830 (783).

دل سے ہے اور دل کا یہ فعل ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کی ایمانی کیفیت تمام صحابۂ کرام بلکہ جملہ مخلوقات سے بڑھ کر تھی کیونکہ حدیث میں آپ کا خطاب صرف حاضرین ہی سے نہیں بلکہ اس کا تعلق پورے عالم سے ہے جس میں دوسرے انبیاء کرام اور ملائکہ عظام بھی شامل ہیں۔[1] ④ صحابۂ کرام ﷺ کو خیال ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تو مغفور الذنب (بخشے بخشائے) ہیں، لہٰذا آپ کو زیادہ عمل کرنے کی ضرورت نہیں لیکن ہمیں اعمال میں بہت زیادہ محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔ اس پر آپ نے غصے کے انداز میں فرمایا: ''میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں۔'' اس تقویٰ اور علم کا تقاضا ہے کہ میں ہمہ وقت کام میں لگا رہوں، یعنی تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ مجھے عمل کی ضرورت نہیں۔ مغفرت تو ادنیٰ درجہ ہے، اس کے بعد اور بھی درجات ہیں جن کے حصول کی مجھے ضرورت ہے۔ ⑤ ایسے وساوس و خیالات جو دل میں آئیں اور استقرار کے بجائے نکل جائیں، ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، البتہ انھیں زبان پر لانے یا ان کے مطابق عمل کرنے پر مؤاخذہ ہوگا لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسے برے خیالات جو دل میں جم جائیں اور وہ عزم کی صورت اختیار کر لیں وہ قابل مؤاخذہ ہیں اگرچہ انھیں زبان پر نہ لایا جائے یا ان کے مطابق عمل نہ کیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ ''مگر اس کی پکڑ اس چیز پر ہوگی جو تمھارے دلوں کا فعل ہو۔''[2]

(١٤) بَابٌ: مَنْ كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ، مِنَ الْإِيمَانِ

باب: 14- جو کفر میں جانا اس طرح ناپسند کرتا ہو جیسے آگ میں پھینکا جانا، تو یہ ایمان ہی سے ہے

٢١ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ اللهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ». [راجع: ١٦]

[21] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، وہ نبیٔ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جس شخص میں خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی شیرینی پا لے گا: جس شخص کو اللہ اور اس کا رسول پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہوں اور جو شخص کسی بندے سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے کرے اور جو شخص کفر سے نکلنے کے بعد کفر کی طرف لوٹنے کو اس طرح برا سمجھے گویا اسے آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے بھی مرجیہ کی تردید مقصود ہے۔ ان کے موقف کا حاصل یہ ہے کہ تصدیق کے بعد کسی قسم کی اطاعت کی ضرورت نہیں اور نہ معصیت اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ ان کی تردید بایں طور ہے کہ ایمان کو طاقت کی ضرورت ہے اور اس کی حلاوت بھی مطلوب ہے۔ یہ دونوں، اعمال کے راستے سے حاصل ہوتی ہیں۔ جب اعمال میں تفاوت ہوگا تو

---

1 شرح الكرماني:1/113. 2 البقرة 2:225، وفتح الباري:1/97.

مراتب حلاوت وطاقت میں بھی اسی نسبت سے تفاوت ہوگا۔ جب ایمان کی طاقت وحلاوت کا مدار اعمال ہیں تو یقیناً ان کا ترک ایمان کو بے لطف اور کمزور کردے گا کیونکہ جس چیز میں لذت نہیں ہوتی اس کی طرف رغبت بھی کم ہوتی ہے اور بے رغبتی کا عمل بے جان ہوتا ہے۔ اگر عمل بے جان ہے تو اس کا اثر ایمان کی طاقت پر پڑے گا اور یہ کھلا ضرر ہے۔ ② کفر سے نکلنے کے بعد کفر کی طرف لوٹنے کی دو صورتیں ہیں: * پہلے مسلمان نہ تھا اب اسلام میں داخل ہوا تو اسے آگ میں ڈالے جانے کی طرح کفر کی طرف لوٹنا برا محسوس ہو۔ * پہلے سے مسلمان تھا لیکن اب اعمال اس قدر مزیدار معلوم ہوتے ہیں کہ کفر کے خیال سے بھی بھاگتا ہے۔ ③ حلاوت ایمان کے متعلق ایک اور حدیث اسی معنی میں مروی ہے: [ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَّ بِمُحَمَّدٍ ﷺ رَسُولًا] ''اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ سے از روئے رب ہونے کے راضی ہوگیا، جس نے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کرلیا اور حضرت محمد ﷺ کو بحیثیت رسول کے مان لیا۔''[1] واضح رہے کہ یہ نعمت اس خوش نصیب کو ملتی ہے جس کے ایمان نے اس کے یقین کو طاقتور کردیا ہو اور اس کا نفس مطمئن ہوگیا ہو، اس کا سینہ کھل گیا ہو اور ایمان ویقین اس کے گوشت پوست اور خون میں داخل ہوگیا ہو۔ اس قسم کے باکمال خوش نصیب حلاوت ایمانی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

(١٥) بَابُ تَفَاضُلِ أَهْلِ الْإِيمَانِ فِي الْأَعْمَالِ

باب: 15- اہل ایمان کا اعمال کے لحاظ سے ایک دوسرے سے افضل ہونا

٢٢ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُولُ اللهُ تَعَالَى: أَخْرِجُوا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِّنْ إِيمَانٍ، فَيُخْرَجُونَ مِنْهَا قَدِ اسْوَدُّوا فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَا - أَوِ الْحَيَاةِ، شَكَّ مَالِكٌ - فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّةُ فِي جَانِبِ السَّيْلِ، أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً؟».

[22] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جس شخص کے دل میں رائی کے دانے برابر ایمان ہو، اسے جہنم سے نکال لاؤ۔ تو ایسے لوگوں کو جہنم سے نکالا جائے گا جو کہ جل کر سیاہ ہوچکے ہوں گے۔ پھر انھیں پانی یا زندگی کی نہر میں ڈالا جائے گا۔ (راویٔ حدیث) مالک کو شک ہے (کہ ان کے استاذ نے کون سا لفظ بولا)۔ وہ از سر نو یوں اگیں گے جیسے دانہ لب جو اگتا ہے۔ کیا تو دیکھتا نہیں وہ کیسے زرد زرد لپٹا ہوا نمودار ہوتا ہے؟''

قَالَ وُهَيْبٌ: حَدَّثَنَا عَمْرٌو: «اَلْحَيَاةِ». وَقَالَ:

(عمرو بن یحییٰ مازنی کے شاگرد) وہیب نے (عن عمرو کی

---

① صحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 151(34).

«خَرْدَلٍ مِّنْ خَيْرٍ». [انظر: ٤٥٨١، ٤٩١٩، ٦٥٦٠، ٦٥٧٤، ٧٤٣٨، ٧٤٣٩]

جگہ) حدثنا عمرو اور (شک کے بغیر نَهْرِ) الْحَيَاةِ کہا ہے، نیز (خردل من ایمان کی بجائے) خَرْدَلٍ مِّن خَيْرٍ بیان کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے وہیب کی روایت بیان کر کے اس شک کو دور کر دیا جو مالک کو ہوا، یعنی روایت میں ''زندگی کی نہر'' صحیح ہے۔ ② اس حدیث سے مرجیہ کی تردید مقصود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تصدیق کے بعد اعمال کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے کہ اعمال کا کوئی اثر نہیں تو گناہ گاروں کو اعمال بد کی وجہ سے جہنم میں کیوں دھکیلا گیا؟ اسی طرح خوارج کی تردید ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور اس نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔ اگر یہ موقف صحیح ہے تو حدیث کے مضمون کے مطابق اہل جہنم کو جہنم سے کیوں نکالا گیا؟[1] ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل ایمان میں دنیاوی اور اخروی اعتبار سے فرق مراتب ہوگا۔ دنیا میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک شخص کو نیک اعمال کرنے کی توفیق ملتی ہے جبکہ دوسرا اس سے محروم رہتا ہے، اخروی اعتبار سے اس طرح کہ جن کے اعمال اونچے درجے کے تھے وہ جہنم سے محفوظ رہ گئے اور جن کے اعمال میں کمی یا کوتاہی تھی انھیں جہنم کی ہوا کھلا کر اس سے نکال لیا جائے گا۔ پھر اس اخراج کے بھی مراتب ہوں گے: ○ اعمال جوارح کی وجہ سے ○ اعمال قلب کی وجہ سے ○ آثار ایمان اور انوار ایمان کی وجہ سے۔ ○ نفس ایمان کی وجہ سے۔ یہ آخری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہوگی جن کے پاس عمل اور خیر کا ادنیٰ حصہ بھی نہ ہوگا اور ایمان بھی اس قدر دھندلا ہوگا کہ سید الانبیاء کی عمیق نظر بھی اس کو نہ دیکھ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان لوگوں کو نکالے گا۔[2] ④ اہل کفر پر عذاب انتقاماً ہوگا جبکہ اہل ایمان کو اس لیے جہنم میں ڈالا جائے گا تاکہ انھیں گناہوں کے میل کچیل سے صاف کیا جائے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انھیں دنیا میں مصائب و آلام سے دوچار کیا جاتا ہے یا سکرات الموت کی تکالیف ان کی تطہیر کا باعث بنتی ہیں۔ اگر گناہ اس سے بھی زیادہ ہوں تو میدان حشر کی ہولناکیوں سے تدارک کیا جاتا ہے۔ اگر معاصی اس سے بھی زیادہ ہوں تو دوزخ میں ڈال کر انھیں پاک کر دیا جائے گا۔

٢٣ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلٍ: أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُونَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمُصٌ مِّنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ، وَمِنْهَا مَا دُونَ ذٰلِكَ، وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجُرُّهُ»، قَالُوا: فَمَا أَوَّلْتَ ذٰلِكَ يَارَسُولَ

[23] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک مرتبہ سو رہا تھا کہ بحالت خواب لوگوں کو دیکھا، وہ میرے سامنے لائے جاتے ہیں اور وہ کرتے پہنے ہوئے ہیں۔ بعض کے کرتے چھاتیوں تک ہیں اور کچھ لوگوں کے اس سے بھی کم۔ اور عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کو میرے سامنے اس حالت میں لایا گیا کہ وہ کرتا پہنے ہوئے ہیں اور اسے زمین پر گھسیٹ رہے ہیں۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی کیا

[1] شرح الكرماني: 117/1. [2] صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 454 (183).

اللهِ؟ قَالَ: «اَلدِّينَ». [انظر: ٣٦٩١، ٧٠٠٨، ٧٠٠٩]

تعبیر کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''دین۔''

فوائد و مسائل: ① دین اور کرتے میں مناسبت یہ ہے کہ کرتے کے ذریعے سے انسان اپنے باہر کی حفاظت کرتا ہے، یہ بدن کو گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتا ہے، اس کے علاوہ زیبائش بدن کا کام بھی دیتا ہے۔ اسی طرح دین بھی انسان کا محافظ ہے، اس کے لیے اعلیٰ زینت و زیبائش ہے، جہنم کی گرمی و سردی سے انسان کو بچاتا ہے۔ جب دین حاصل ہو جائے تو ہر چیز کی طرف قدم بڑھانے میں سہولت رہتی ہے۔ انسان دینداری کی بدولت اللہ کے ہاں معزز و مقبول ہو جاتا ہے، اس بنا پر اہل دنیا بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ ② اس حدیث میں قمیص کے متعلق تین مراتب بیان ہوئے ہیں، یعنی چھاتیوں تک، اس سے بھی کم اور زمین پر گھسیٹتے ہوئے۔ پھر اس کی تعبیر دین سے کی گئی ہے، گویا یہ ثابت ہوا کہ اہل ایمان میں دین کے اعتبار سے تفاضل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود بھی یہی ہے کہ دین، یعنی ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔[1] ③ اس حدیث کے پیش نظر اہل تعبیر کہتے ہیں کہ خواب میں قمیص دیکھنا دینداری کی علامت ہے اور اپنی قمیص کو گھسیٹتے ہوئے دیکھنا، اس بات کی علامت ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کے دینی اثرات تا دیر باقی رہیں گے، نیز اس کی باقیات صالحات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں دیکھنے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کفر کے اثرات مٹائیں گے اور ان کے ایمانی اثرات تا دیر باقی رہیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زندہ کارناموں نے اس خواب کو سچا کر دکھایا۔[2] ④ اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک جزوی فضیلت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کے عہد میں فتوحات کی کثرت ہوگی [عَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجُرُّهُ] میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہ جزوی فضیلت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ ان کی افضلیت پر امت عادلہ کا اجماع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فتوحات کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے راستہ ہموار کیا تھا۔ فاروق اعظم نے ان کی صاف کی ہوئی شاہراہ پر چلنا شروع کیا تو فتوحات کا ایک طویل و عریض سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے بڑے دیندار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ ہے۔

(١٦) بَابٌ: اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:16- حیا جزو ایمان ہے

٢٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِيهِ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ، فَقَالَ

[24] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری مرد کے پاس سے گزرے جبکہ وہ اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا کہ تو اتنی شرم کیوں کرتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ''اسے (اس کے حال

① فتح الباري:101/1. ② شرح الكرماني:119/1.

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ». پر) چھوڑ دے کیونکہ شرم تو ایمان کا حصہ ہے۔"

[انظر: ٦١١٨]

فوائد و مسائل: ① انسانی اخلاق و عادات میں حیا کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ وہ خصلت ہے جو انسان کو بہت سے جرائم سے باز رکھتی ہے۔ حیا صرف لوگوں ہی سے نہیں بلکہ سب سے زیادہ حیا تو اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہیے۔ اس بنا پر سب سے بڑا بے حیا وہ بدبخت انسان ہے جو گناہ کرتے وقت اللہ سے نہیں شرماتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان اور حیا کے درمیان بہت گہرا رشتہ ہے۔ ② حیا اس تأثر کا نام ہے جو کسی برے کام کے خیال سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کی تعریف یہ ہے کہ جو خصلت انسان کو بھلائی پر آمادہ کرے اور برائی سے روکے، وہ حیا ہے۔ اس میں ایک طرح بزدلی اور عفت دونوں ہوتی ہیں اور اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔ بزدلی برائیوں سے روکتی ہے اور عفت اسے نیک کاموں کی طرف لاتی ہے۔ اس وضاحت سے پتہ چلا کہ جو لوگ شرعی امور میں حیا سے کام لیتے ہیں اس کا نام حیا رکھنا غلط ہے بلکہ یہ ان کی طبیعت کی کمزوری ہے جسے حیا کا نام دے کر چھپانا درست نہیں۔ یہ ایسا جُبُن (بزدلی) ہے جس سے رسول اللہ ﷺ پناہ مانگا کرتے تھے۔[1] حیا اور جبن میں بہت بڑا فرق ہے۔ ③ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیا ایک ناپسندیدہ اور مکروہ خصلت ہے جیسا کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ایک مسئلہ دریافت کرتے وقت کہا کہ اللہ حق سے نہیں شرماتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اخلاق فاضلہ کو اگر اپنے محل میں نہ رکھا جائے تو ان میں قباحت آ جاتی ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسائل ضروریہ میں حیا سے کام نہیں لینا چاہیے۔ حیا تو ہر لحاظ سے خیر ہی خیر ہے بشرطیکہ اسے اپنے محل میں استعمال کیا جائے۔ اگر اسے اپنے محل کے علاوہ استعمال کیا جائے گا تو یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ ④ حیا کا ذکر پہلے بھی آیا تھا لیکن ضمنی طور پر تھا۔ اس مقام پر حیا کی اہمیت کو مستقل بیان کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے، یعنی ایمان کے لیے اعمال و اخلاق کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ایمان کمزور رہے گا۔ اس حدیث سے ایمان میں حیا کی مطلوبیت ثابت ہوتی ہے، اسی طرح ترک حیا سے ایمان میں نقص ہوگا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اعمال و اخلاق ایمان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(١٧) بَابٌ: ﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾ [التوبة: ٥]

باب: 17- (فرمان الٰہی کی وضاحت:) "پھر اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔"

٢٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ [الْمُسْنَدِيُّ] قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ:

[25] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے

1 صحيح البخاري، الدعوات، حديث: 6365.

حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاقِدِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي يُحَدِّثُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ».

جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ پورے آداب سے نماز ادا کریں اور زکاۃ دیں۔ جب وہ یہ کرنے لگیں تو انھوں نے اپنے مال و جان کو مجھ سے بچا لیا، سوائے حق اسلام کے۔ اور ان کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان کے باب میں طاعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے ایمان قوی ہوتا ہے اور معاصی کے ارتکاب سے ایمان کمزور ہو جاتا ہے، لہٰذا مرجیہ کا یہ کہنا کہ ایمان کے لیے اعمال کی ضرورت نہیں، بالکل باطل اور لغو ہے کیونکہ آیت کریمہ میں کفار کا راستہ چھوڑنے کے لیے توبہ اور اعمال کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ توبہ سے مراد کفر و شرک سے باز رہنا ہے جسے حدیث میں ''ادائے شہادتین'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ پھر محض شہادتین کا اقرار کافی نہیں بلکہ اقامت صلاۃ اور ایتائے زکاۃ کو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ جب دنیا میں ان اعمال کی حیثیت تسلیم شدہ ہے تو آخرت میں ان کے بغیر عذاب سے رہائی کیونکر ہوگی۔ ② کفار سے جنگ لڑنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام قبول کر کے صرف اللہ کی عبادت کریں۔ اگرچہ اسلام میں جزیے اور مناسب شرائط کے ساتھ مصالحت پر بھی جنگ ختم ہو جاتی ہے، تاہم جنگ بندی کی یہ صورت اسلامی جنگ کی اصل غایت نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے ذریعے سے اصل مقصد کے لیے ایک پرامن راستہ کھل جاتا ہے، لہٰذا ان پر بھی جنگ روک دی جاتی ہے۔ ③ جب ایک شخص نے شہادتین (توحید و رسالت کی گواہی) کا اقرار کر کے اپنے عمل و کردار سے اپنے مومن ہونے کی تصدیق کر دی تو ہم اسے مسلمان شمار کریں گے اور اسلامی حقوق میں اسے برابر کا شریک رکھیں گے۔ رہا دل کا معاملہ، تو وہ اللہ کے ہاں معلوم ہوگا۔ ہم اس کے مکلف نہیں ہیں کہ دل چیر کر دیکھیں اور معلوم کریں کہ اس کا یہ اقرار اور عمل حقیقی ہے یا نمائشی، یعنی آخرت کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمارا ایسے انسان سے دنیوی مساوات کا معاملہ اس امر کی ضمانت نہیں ہوگا کہ آخرت میں بھی یہ شخص مسلمانوں کے برابر ہی رہے گا۔ وہاں کے معاملات اس کے ضمیر کے مطابق ہوں گے۔ اگر یہ شخص ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے مسلمان ہوگا تو جنت کا حقدار ہوگا بصورت دیگر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اہل بدعت جو شہادتین کا اقرار یا شرائع اسلام کا التزام کرنے والے ہیں ان کی تکفیر نہ کی جائے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کافر کی توبہ قبول کی جائے اور اس قسم کی تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ توبہ ظاہری کر رہا ہے یا اس کے دل سے بھی اس کا تعلق ہے کیونکہ یہ معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔[1]

[1] فتح الباري:105/1.

(۱۸) بَابُ مَنْ قَالَ : إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

لِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى : ﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ [الزخرف: ٧٢] وَقَالَ عِدَّةٌ مِّنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالٰى : ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [الحجر: ٩٢، ٩٣]: عَنْ [قَوْلِ] لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ . وَقَالَ : ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُونَ﴾ . [الصافات: ٦١].

باب:18- اس شخص کی دلیل جو کہتا ہے کہ ایمان عمل ہی کا نام ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور یہ جنت ہے جس کے تم اپنے عمل کے بدلے میں وارث بنے ہو۔'' نیز قرآن مجید میں ہے: ''قسم ہے تیرے رب کی! ہم ان سے ضرور باز پرس کریں گے ہر اس چیز کی جو وہ کرتے رہے ہیں۔'' اس آیت کے متعلق اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ اس سے مراد [لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ] کے متعلق سوال ہونا ہے، نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔''

وضاحت: اس سے پہلے امام بخاری رحمہ اللہ نے بتایا تھا کہ ایمان کے ساتھ اعمال کا خاص ربط ہے، یعنی اعمال ہی سے ایمان کی حفاظت اور ترقی ہوتی ہے۔ ترک اعمال سے ایمان بے جان اور مردہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ ایمان عمل ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لیے امام صاحب نے تین آیات کا انتخاب کیا ہے۔ پہلی آیت سے استدلال بایں طور ہے کہ دخول جنت کا مدار ایمان پر ہے۔ اگر ایمان کے بغیر اعمال ہوں تو جنت نہیں ملے گی اور اگر اعمال نہ ہوں، صرف ایمان ہو تو جنت مل سکتی ہے، اس لیے آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم اہل ایمان ہونے کی وجہ سے جنت کے وارث بنے ہو۔ البتہ ایمان کی جگہ عمل اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ایمان ایک ایسا عمل ہے جس پر دیگر تمام اعمال موقوف ہیں۔ دوسری آیت کے متعلق امام بخاری نے فرمایا ہے کہ اہل علم نے [يَعْمَلُوْنَ] کی تفسیر لا إله إلا الله سے کی ہے جو ایمان سے عبارت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان عمل ہے، صرف زبان سے اقرار کافی نہیں۔ اہل علم سے مراد حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔ اسی طرح امام مجاہد سے بھی یہی منقول ہے۔[1] تیسری آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ یہ آیت ذکر جنت کے بعد لائی گئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ایسی چیز کے حصول کے لیے عمل کیا جائے، یعنی جنت کے حصول کے لیے عمل کی ترغیب دی گئی ہے۔ اب اگر ایمان عمل کے علاوہ کچھ اور چیز ہے تو صرف عمل ہی دخول جنت کے لیے کافی ہونا چاہیے، حالانکہ ایمان کے بغیر عمل کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ سب سے پہلے ایمان کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں ایمان پر عمل کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اور یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ہے۔ اس میں مرجیہ کا رد ہے کہ عمل بے کار نہیں بلکہ اس قدر اہم ہے کہ ایمان جیسے قیمتی جوہر پر عمل کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس رد کی مندرجہ ذیل اسلوب سے وضاحت ہو سکتی ہے: * ایمان لفظ عمل میں عام معنی کے لحاظ سے داخل ہے۔ * ایمان ایک ایسا

[1] فتح الباري: 106/1.

اعلیٰ عمل ہے کہ اس کے بغیر دیگر اعمال معتبر نہیں ہوتے۔ * ایمان ایسا عمل ہے جس میں اختیار بھی ضروری ہے۔ ایمان کو عمل میں اس لیے داخل کیا گیا ہے کہ عمل میں اختیار ہوتا ہے، اور ایمان بھی اختیاری ہی معتبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معرفت غیر اختیاریہ کو ایمان نہیں کہا جاتا۔

٢٦ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَا: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ: حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ: أَيُّ الْعَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: «إِيمَانٌ بِاللهِ وَرَسُولِهِ» قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: «اَلْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ» قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: «حَجٌّ مَّبْرُورٌ». [انظر: ١٥١٩]

[26] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا۔'' سوال کیا گیا: پھر کون سا؟ فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔'' پوچھا گیا: پھر کون سا؟ فرمایا: ''وہ حج جو قبول ہو۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یعنی دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی جگہ ایمان پر عمل کا اور کسی جگہ عمل پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے۔ مذکورہ حدیث میں سوال تھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بھی ایک عمل ہے، اس کی صراحت حدیث میں موجود ہے جس میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی۔ دوسرے اعمال کو اہمیت کے پیش نظر ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ایمانی طاقت کے ساتھ ایک مرد مومن میدان جہاد میں اترتا ہے۔ حج مبرور سے مراد وہ حج ہے جو ریاکاری اور گناہوں کی آلائش سے پاک ہو۔ اس کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے معمولات پہلے سے بہتر بنا لے۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے والے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے، نیز اس حدیث میں ایمان کے بعد جہاد کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حج کا ذکر نہیں بلکہ اس کی جگہ عتق ہے۔ ان احادیث میں کوئی تضاد نہیں بلکہ یہ فرق سائل کی حالت وضرورت اور موقع ومحل کے لحاظ سے ہے۔[1] ③ اس روایت میں جہاد کو مقدم کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ارکان خمسہ سے نہیں ہے اور حج کو مؤخر کیا جو ارکان خمسہ سے ہے، اس لیے کہ جہاد کا نفع پوری ملت کو حاصل ہوسکتا ہے جبکہ حج کا نفع ایک حاجی کی ذات تک منحصر ہے۔[2] والله أعلم. ④ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر عمل کا عطف ایمان پر ڈالا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل ایک دوسرے سے مغایر ہیں، اور یہ امام بخاری کے موقف کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عطف ہر جگہ مغایرت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بعض مقامات پر خاص کا عطف عام پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ ''جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو، ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے۔''[3] اس آیت میں فرشتوں کے بعد بذریعۂ عطف جبریل اور

① فتح الباري:108/1. ② فتح الباري:108/1. ③ البقرة2:98.

میکائیل کا ذکر بطور اہمیت کے ہے، مغایرت کے لیے نہیں۔ اسی طرح ایمان کے بعد عمل کا ذکر، یا عمل کا ایمان پر عطف، کسی خاص اہمیت کے پیش نظر ہے، ان دونوں میں کوئی مغایرت نہیں ہے۔

(۱۹) بَابٌ: إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَكَانَ عَلَى الْاِسْتِسْلَامِ أَوِ الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ

باب: 19- اگر اسلام سے اس کے حقیقی (شرعی) معنی مراد نہ ہوں بلکہ ظاہری اطاعت مراد ہو یا قتل کے خوف سے (کوئی شخص) مسلمان کہلوائے (تو لغوی حیثیت سے یہ اطلاق درست ہے)

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿قَالَتِ ٱلْأَعْرَابُ ءَامَنَّا ۖ قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا۟ وَلَٰكِن قُولُوٓا۟ أَسْلَمْنَا﴾ [الحجرات: ١٤] فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ﴾ [آل عمران: ١٩] ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ٨٥].

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ آپ کہہ دیجیے! تم درحقیقت ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں (مخالفت چھوڑ کر اطاعت گزار ہوگئے ہیں)۔'' بعض اوقات اسلام اپنے حقیقی (شرعی) معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یقیناً اللہ کے ہاں دین تو اسلام ہی ہے۔'' ''اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا متلاشی ہوگا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

وضاحت: مرجیہ کے نزدیک تصدیق کے بعد کسی عمل کی ضرورت نہیں رہتی جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ اس موقف کی شدت سے تردید فرماتے ہیں۔ ان کی تردید کا مدار اس بات پر ہے کہ ایمان اور اسلام کے درمیان اتحاد یا تلازم ہے۔ مرجیہ بعض آیات کا سہارا لے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان اور اسلام میں اتحاد یا تلازم نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں مرجیہ کے دلائل کا جواب دینا چاہتے ہیں، وہ اس طرح کہ لفظ اسلام دو معنوں میں مستعمل ہے: ایک، شرعی حقیقی اسلام اور دوسرا رسمی نمائشی اسلام۔ شرعی اسلام تو ایمان کے ساتھ متحد ہے لیکن رسمی نمائشی اسلام ایمان سے متحد نہیں۔ اس تقسیم کا مقصد یہ ہے کہ مرجیہ جن دلائل کو ایمان و اسلام کے درمیان منافات کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں، ان کا تعلق اس اسلام سے ہے جو نمائشی اور رسمی ہے، چنانچہ سورۃ الحجرات کی آیت میں اسلام کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ درحقیقت قبیلۂ بنو اسد کے کچھ لوگوں نے بطور احسان کہا کہ ہم نے آپ سے مقابلہ کیے بغیر ایمان قبول کر لیا ہے، اس لیے ہماری مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ تمھارا یہ آمَنَّا کہنا درست نہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے اطاعت گزاری اختیار کی۔ ابھی ایمان تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا، البتہ اس نے تمھارے دلوں کے دروازوں پر دستک ضرور دی ہے۔ اس قسم کا ظاہری اسلام دنیاوی معاملات میں تو مفید ہوسکتا ہے لیکن اخروی نجات کے لیے تو وہ اسلام درکار ہے جو دل کی گہرائی سے قبول کیا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ

الدِّيْنَ عِنْدَاللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ''یقیناً دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔''[1] سورۂ آل عمران کی دوسری آیت میں بھی اسلام کا یہی مفہوم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ان آیات میں شرعی اسلام ہے جو ایمان کے مترادف ہے۔ قرآنی آیات کے بعد اب ایک حدیث بیان فرماتے ہیں جس میں اسلام اپنے ظاہری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

٢٧ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، عَنْ سَعْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَعْطَى رَهْطًا وَّسَعْدٌ جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلًا هُوَ أَعْجَبُهُمْ إِلَيَّ، فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ؟ فَوَاللهِ إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا؟ فَقَالَ: «أَوْ مُسْلِمًا»، فَسَكَتُّ قَلِيلًا ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي فَقُلْتُ: مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ؟ فَوَاللهِ! إِنِّي لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا. فَقَالَ: «أَوْ مُسْلِمًا»، فَسَكَتُّ قَلِيلًا، ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي، وَعَادَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ: «يَا سَعْدُ! إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُلَ، وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ خَشْيَةَ أَنْ يَكُبَّهُ اللهُ فِي النَّارِ».

[27] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چند لوگوں کو کچھ مال دیا اور (وہ) سعد رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے تھے۔ آپ نے ایک شخص کو چھوڑ دیا، یعنی اسے کچھ نہ دیا، حالانکہ وہ تمام لوگوں میں سے مجھے زیادہ پسند تھا۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں شخص کو چھوڑ دیا، اللہ کی قسم! میں تو اسے مومن سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''(مومن) یا مسلمان!'' میں تھوڑی دیر خاموش رہا، پھر اس کے متعلق میں جو جانتا تھا اس نے مجھے بولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دوبارہ عرض کیا: آپ نے فلاں شخص کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ اللہ کی قسم! میں تو اسے مومن خیال کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ''(مومن) یا مسلمان!'' میں پھر تھوڑی دیر چپ رہا، پھر اس کے متعلق جو میں جانتا تھا، اس نے مجھے مجبور کیا تو میں نے تیسری مرتبہ وہی عرض کیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی وہی فرمایا۔ اس کے بعد آپ گویا ہوئے: ''اے سعد! میں ایک شخص کو کچھ دیتا ہوں، حالانکہ دوسرا شخص مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ یہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ (وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے اسلام سے پھر جائے اور) اللہ تعالیٰ اسے اوندھے منہ دوزخ میں ڈال دے۔''

وَرَوَاهُ يُونُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرٌ وَابْنُ أَخِي الزُّهْرِيِّ، عَنِ الزُّهْرِيِّ. [انظر: ١٤٧٨]

اس حدیث کو یونس، صالح، معمر اور زہری کے بھتیجے نے بھی زہری سے روایت کیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس کے اندرونی حالات کا علم نہ ہو اسے مسلم تو کہہ سکتے ہیں کیونکہ اسلام

---

[1] آل عمران 19:3.

کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے، لیکن اسے مومن نہیں کہنا چاہیے کیونکہ یہ باطن کا معاملہ ہے، اس پر اللہ کے سوا اور کون مطلع ہوسکتا ہے؟ یا پھر یہ پیغمبر کا منصب ہے کہ وہ بذریعۂ وحی باطنی احوال سے واقف ہوسکتا ہے۔ دوسرے اس کی تعبیر یوں بھی ہوسکتی ہے کہ ہر مسلمان کے دو احوال ہیں: ایک کا تعلق باطن سے ہے اور دوسرے کا ظاہر سے۔ ایمان، یہ باطنی امر ہے جس کا واقعی علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ہوسکتا، وہی کسی کو بتا دے تو دوسری بات ہے۔ البتہ کسی کے ظاہری احوال کو دیکھ کر کہ وہ متشرع ہے، نماز روزے کا پابند ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ پکا مسلمان ہے۔ ② یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹوں کو بڑوں کی خدمت میں سفارش کرنے کا حق ہے، بڑوں کو اختیار ہے کہ وہ قبول کریں یا رَد کر دیں، نیز اگر سفارش کا طریق قابل اصلاح ہو تو اس مجلس میں مناسب طریقے سے بتا دینا چاہیے اور سفارش کنندہ کی تسلی اور اطمینان خاطر کے لیے وجہ بھی بیان کر دینی چاہیے۔ ③ امام بخاری ؒ اللہ کے ہاں نجات دہندہ اور غیر نجات دہندہ اسلام کی تفریق کرنا چاہتے ہیں کہ باعث نجات وہ اسلام ہے جو دل کی گہرائی اور سچی نیت سے ہو اور ایمان کے مترادف ہو۔ جو اسلام محض نمائشی ہوگا وہ دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے تو کام آسکتا ہے مگر آخرت میں نجات کا باعث نہیں ہوسکتا۔ حاصل یہ ہے کہ امام بخاری ؒ نے اسلام کے دو معنی بتا کر، اسلام اور ایمان کے متعلق جو مغایرت معلوم ہوتی تھی، اس کی وضاحت کر دی ہے کہ اسلام شرعی اور ایمان حقیقی میں کوئی مغایرت نہیں، البتہ وہ اسلام جو محض نمائشی ہو اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(٢٠) بَابٌ : [إِفْشَاءُ] السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

باب:20-سلام کی اشاعت بھی اسلام کا حصہ ہے

وَقَالَ عَمَّارٌ: ثَلَاثٌ مَّنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الْإِيمَانَ: اَلْإِنْصَافُ مِنْ نَّفْسِكَ، وَبَذْلُ السَّلَامِ لِلْعَالَمِ، وَالْإِنْفَاقُ مِنَ الْإِقْتَارِ.

حضرت عمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تین خصلتیں ایسی ہیں جس نے انھیں جمع کر لیا اس نے ایمان مکمل کر لیا: اپنے نفس سے انصاف کرنا، دنیا میں سلام پھیلانا اور تنگ دستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

وضاحت: اس باب سے بھی مرجیہ کی تردید مقصود ہے کیونکہ یہ حضرات تو بڑے بڑے اعمال کو بھی ایمان سے خارج سمجھتے ہیں لیکن یہاں معمولی عمل کو بھی ایمان میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاری ؒ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے اقوال زریں کو بطور دلیل پیش کیا ہے جنھیں امام احمد بن حنبل ؒ نے کتاب الایمان میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں موصولاً بیان کیا ہے۔[1] ان باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل ایمان کا دارومدار انھی پر ہے کیونکہ جو انسان اپنے ساتھ انصاف کرنے کا خوگر ہوگا وہ اپنے آقا کے حقوق سے آگاہ ہوگا اور انھیں ادا کرنے میں لذت محسوس کرے گا۔ پھر اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ اور سلام کی اشاعت بھی اچھی عادتوں اور پسندیدہ خصلتوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس سے باہمی الفت و محبت اور یگانگت پیدا ہوتی ہے۔ تنگی کے وقت اللہ کی راہ میں دینا، اس سے اللہ پر

1 المصنف لابن أبي شيبة: 317/10 (طبع مكتبة الرشد).

اعتماد اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ایسی جامع باتیں ہیں جو ارشاداتِ رسول کے مشابہ ہیں جن کو جوامع الکلم سے نوازا گیا تھا۔[1]

٢٨ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ ابْنِ أَبِي حَبِيبٍ، عَنْ أَبِي الْخَيْرِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عَمْرٍو: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: «تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ».

[راجع: ١٢]

[28] حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت ہے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: کون سا اسلام بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تم کھانا کھلاؤ، آشنا اور ناآشنا، سب کو سلام کرو۔''

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں حقیقی اسلام کی علامت اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ مسلمان سلام کی کثرت کرتا ہو، یعنی سلام کو تعارف یا کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہ کرے بلکہ ہر سامنے آنے والے کو سلام کرے، لیکن اس میں مسلمان کی تخصیص کی جائے گی، نیز جو اپنی بدکرداری کی وجہ سے خود کو دعائے سلامتی کا مستحق نہ بنائے، اسے بھی سلام کرنا درست نہیں، جیسے کوئی شخص علانیہ زنا کرتا ہو اور شراب پیتا ہو تو وہ مستحق سلام نہیں ہے۔ اگر فاسق صاحب اقتدار ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر میں نے اسے سلام نہ کیا تو یہ میرے پیچھے پڑ جائے گا تو ایسی صورت میں سلام کی اجازت ہے۔

(٢١) بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَكُفْرٍ دُوْنَ كُفْرٍ

باب:21- خاوند کی ناشکری بھی کفر ہے، لیکن کفر کفر میں فرق ہے

فِيهِ أَبُو سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ.

اور اس باب میں ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے جسے وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔

وضاحت: امام بخاری ؒ نے ایمان اور اس کے اثرات بیان کرنے کے بعد اس کی ضد، یعنی کفر اور اس کی اقسام کو بیان کرنا شروع کیا ہے۔ فرمایا کہ کفر کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے کہ اس کے ارتکاب سے انسان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ دوسرا کفر وہ ہے جس کا مرتکب گناہ گار تو ضرور ہوتا ہے لیکن خارج از اسلام نہیں ہوتا۔ اس عنوان میں دوسری قسم کا کفر مراد ہے۔ واضح رہے کہ كُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ، حضرت ابن عباس ؓ کا قول ہے جو انھوں نے درج ذیل آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے موافق فیصلے نہ کریں ایسے لوگ کافر ہیں۔''[2] امام بخاری ؒ نے مذکورہ باب میں حضرت ابوسعید خدری ؓ کی حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے جو انھوں نے کتاب الحیض (حدیث:304) میں بیان فرمائی ہے جس میں عورت کے ''ناقصة العقل والدین'' ہونے کا ذکر

① فتح الباري:113/1. ② المائدة 44:5.

ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آگے آنے والی حدیث متعدد طرق سے مروی ہے جن میں ایک طریق حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ہے۔

٢٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «وَرَأَيْتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ»، قِيلَ: أَيَكْفُرْنَ بِاللهِ؟ قَالَ: «يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ، لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ». [انظر: ٤٣١، ٧٤٨، ١٠٥٢، ٣٢٠٢، ٥١٩٧]

[29] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے دوزخ دیکھی تو وہاں اکثر عورتیں تھیں (کیونکہ) وہ کفر کرتی ہیں۔'' لوگوں نے کہا: کیا وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ وہ اپنے خاوند کا کفر کرتی ہیں، یعنی ناشکری کرتی ہیں اور احسان فراموش ہیں۔ وہ یوں کہ اگر تو ساری عمر عورت سے اچھا سلوک کرے پھر وہ معمولی سی (ناگوار) بات تجھ میں دیکھے تو کہنے لگتی ہے کہ مجھے تجھ سے کبھی آرام نہیں ملا۔''

فوائد و مسائل: ① ''عشیر'' سے مراد خاوند ہے کیونکہ عورت کی عشرت اس سے متعلق ہوتی ہے اور وہی اس کی تمام ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ اگر اسے اپنے عموم پر رکھا جائے تو اس سے مراد ہر وہ شخص ہوسکتا ہے جس سے عورت کا میل جول رہتا ہے، جیسے باپ، بھائی وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ جنس کسی کا احسان نہیں مانتی بلکہ جہاں کوئی بات خلاف طبع سامنے آتی ہے تو تمام کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے، اسی ناسپاسی کی وجہ سے جہنم کا زیادہ حصہ ان سے بھرا ہوا دکھایا گیا۔[1] ② کفر کی مندرجہ ذیل چار اقسام ہیں۔ اگر کسی نے ان میں سے ایک کا بھی ارتکاب کیا اور توبہ کے بغیر مر گیا تو اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں فرمائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ * کفر انکار: دل اور زبان سے اللہ کی وحدانیت کا انکار کرے اور توحید کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ * کفر جحود: دل سے حقیقت کو پہچان لے لیکن زبان سے اس کا معترف نہ ہو جیسا کہ ابلیس لعین نے کفر کیا تھا۔ * کفر عناد: دل اور زبان سے حقیقت توحید کا معترف ہو لیکن اسے قبول نہ کرے جیسا کہ خواجہ ابوطالب نے کیا۔ * کفر نفاق: زبان سے اعتراف کرے اور اس کے مطابق احکام بھی بجا لائے لیکن دل میں اس سے نفرت ہو جیسا کہ منافقین کا کفر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان چار اقسام کے علاوہ ایک اور قسم بھی ہے جس کا نام کفر الحقوق ہے جس کے اثبات کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان قائم کیا ہے اور جس کا مرتکب دین اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ ③ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کفران نعمت سے ایمان میں کمی ہو جاتی ہے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، نیز ایمان پر انسانی اعمال اثر انداز ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اسی بنا پر ناقصات الدین کہا گیا ہے۔[2] ④ امام بخاری رحمہ اللہ اس باب اور آئندہ چند ابواب سے ایمانیات کو مزید منقح کرنا چاہتے ہیں کیونکہ جس طرح کفر کے مراتب ہیں اسی طرح ایمان میں بھی فرق مراتب ہے۔ ایمان کا ایک ایسا درجہ بھی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ہمیشہ کے لیے اس پر جنت حرام ہو جاتی ہے اور اگر وہ موجود ہو تو خلود فی النار کے لیے سدِ راہ بن جاتا ہے۔ ٹھیک اسی

1 شرح الكرماني:136/1. 2 شرح الكرماني:137/1.

طرح مراتب کفر میں ایک ایسا درجہ ہے کہ معاذ اللہ اگر وہ انسان میں آجائے تو دخولِ جنت اس کے لیے شجرۂ ممنوعہ بن جاتا ہے اوراس حالت میں مرنا خلود فی النار کا باعث ہے۔اس سے یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ معاصی ایمان کے لیے نقصان دہ ہیں اور طاعات سے ایمان کی نشوونما ہوتی ہے۔

(٢٢) بَابٌ: اَلْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا يُكَفَّرُ صَاحِبُهَا بِارْتِكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ

باب:22- گناہ، جاہلیت کے کام ہیں اور ان کا مرتکب کافر نہیں ہوتا، البتہ شرک کا مرتکب (یا کفر کا معتقد) ضرور کافر ہو جاتا ہے

لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ» وَقَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ [النساء:٤٨].

فرمان نبوی ہے:"(اے ابوذر!) تیرے اندر ابھی جاہلیت کی خوبو باقی ہے۔" اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:"اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا، اس کے علاوہ جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔"

وضاحت: عنوانِ بالا دو اجزاء پر مشتمل ہے: ○ معاصی دور کفر کی باقیات ہیں۔ اس سے مرجیہ کی تردید مقصود ہے کہ معاصی کا مضر ایمان ہونا یقینی ہے۔ ○ شرک کا مرتکب دین اسلام سے خارج ہے۔اس سے معتزلہ اور خوارج کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ ہر مرتکب کبیرہ دین اسلام سے خارج ہے۔ایسا نہیں ہے بلکہ صرف شرک کا مرتکب خارج ہوگا۔

٣٠ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاصِلٍ، عَنِ الْمَعْرُورِ قَالَ: لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَّعَلَى غُلَامِهِ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذٰلِكَ. فَقَالَ: إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «يَا أَبَا ذَرٍّ! أَعَيَّرْتَهُ بِأُمِّهِ؟ إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ، إِخْوَانُكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ، فَمَنْ كَانَ أَخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَّا يَغْلِبُهُمْ، فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ». [انظر: ٢٥٤٥، ٦٠٥٠]

[30] حضرت معرور ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ربذہ (جگہ) میں حضرت ابوذر غفاری ؓ سے ملا، دیکھا تو انھوں نے اور ان کے غلام نے ایک جیسا جوڑا زیب تن کیا ہوا ہے۔ میں نے ان سے اس کی بابت پوچھا تو انھوں نے فرمایا: میں نے ایک شخص کو بایں طور گالی دی کہ اسے ماں کی عار دلائی۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے (یہ سن کر) فرمایا:"تو نے اسے اس کی ماں سے عار دلائی ہے؟ ابھی تک تجھ میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔تمھارے غلام تمھارے بھائی ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے تمھارے تصرف میں رکھا ہے، چنانچہ جس شخص کا بھائی اس کے قبضے میں ہو، اسے چاہیے کہ اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے اور اسے وہی لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے۔اور ان سے وہ کام نہ لو جوان کی طاقت سے

زیادہ ہو۔ اور اگر ایسے کام کی انھیں زحمت دو تو خود بھی ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

فوائد ومسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو صرف اتنا کہا تھا کہ اے سیاہ فام عورت کے بیٹے! حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو عمر رسیدگی کے باوجود اس کی سنگینی کا علم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری سے بطور تعجب فرمایا: "اے ابوذر! عمر کے اس دور میں بھی تیرے اندر اس قسم کی جاہلانہ عادات باقی ہیں؟"[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خصلت شرعاً کس قدر مذموم ہے۔[2] ہمارے معاشرے میں اس قسم کی بات گالی تو شمار ہی نہیں ہوتی بلکہ صرف مذاق کی ایک قسم سمجھی جاتی ہے جبکہ شریعت نے اسے دور جاہلیت کی یادگار سے تعبیر فرمایا ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد "معاصی امور جاہلیت سے ہیں" کو ثابت کرنا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو تنبیہ فرمائی کہ ابوذر! تیرے اندر ابھی جاہلیت کی بو باقی ہے لیکن اسے ایمان سے خارج نہیں بتلایا اور نہ اسے تجدید ایمان ہی کے لیے کہا۔ واضح رہے کہ اس حدیث میں مساوات کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ماتحت لوگوں کے ساتھ مساوات کی تلقین کی گئی ہے، جس سے ماتحتوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کی فضیلت کا اثبات ہوتا ہے۔

بَابٌ: ﴿وَإِن طَآئِفَتَانِ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ ٱقْتَتَلُوا۟ فَأَصْلِحُوا۟ بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات: ٩]. فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ.

باب: ......"اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں قتال کریں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔" اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے جنگ وقتال کے باوجود دونوں گروہوں کے لیے لفظ مومن استعمال فرمایا ہے

وضاحت: معتزلہ اور خوارج کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی تردید فرمائی ہے۔ حدیث میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔[3] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باہم ایک دوسرے کو مارنا کفر ہے لیکن اس کے باوجود آیت کریمہ میں ایمان کا نام ان سے الگ نہیں ہوا۔ اگر قتال کرنے والے اس عمل کی وجہ سے کافر ہو گئے ہوتے تو اللہ تعالیٰ انھیں اس شریف لقب سے نہ نوازتا اور نہ ان میں صلح کرانے کا حکم دیتا بلکہ انھیں لڑ کر ختم ہونے دیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ "قِتَالُهُ كُفْرٌ" میں اس عمل کی سنگینی کا اظہار مقصود ہے، اس کے کفر کا اعلان پیش نظر نہیں ہے۔ اس سے کفر، کفر میں فرق ہوتا ہے، والا مسئلہ بھی مزید صاف ہو جاتا ہے کہ یہ کفر اس کفر سے کم درجے کا ہے جس کے لیے خلود فی النار لازم ہے۔

٣١ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ: حَدَّثَنَا أَيُّوبُ وَيُونُسُ عَنِ

[31] احنف بن قیس کا بیان ہے کہ میں اس شخص (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی مدد کے لیے چلا۔ راستے میں مجھے حضرت ابوبکرہ

[1] صحيح البخاري، الأدب، حديث:6050. [2] فتح الباري:118/1. [3] صحيح البخاري، الإيمان، حديث:48.

الْحَسَنِ، عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ، قَالَ: ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هٰذَا الرَّجُلَ فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ: أَيْنَ تُرِيدُ؟ قُلْتُ: أَنْصُرُ هٰذَا الرَّجُلَ، قَالَ: ارْجِعْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ»، فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُولِ؟ قَالَ: «إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلٰى قَتْلِ صَاحِبِهِ». [انظر: ٦٨٧٥، ٧٠٨٣]

ؓ ملے۔ انھوں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا: میرا ارادہ اس شخص کی مدد کرنے کا ہے۔ انھوں نے فرمایا: واپس ہو جاؤ، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جب دو مسلمان اپنی اپنی تلواریں لے کر آپس میں لڑ پڑیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔“ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے (اس کا جہنمی ہونا سمجھ میں آتا ہے) لیکن مقتول کا کیا جرم ہے؟ آپ نے فرمایا: ”اس کی خواہش بھی دوسرے ساتھی کو قتل کرنے کی تھی۔“

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے بھی خوارج کی تردید ہوتی ہے کہ عمل قتال کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے انھیں ”مسلمان“ کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں بایں حالت اسلام سے خارج نہیں ہوئے۔ حدیث کے آخری حصے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دلی ارادہ جب مصمم ہو جائے تو اس پر بھی مؤاخذہ ہوگا، جبکہ دوسری روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلی خیالات کو معاف کر دیا ہے جب تک اس کے مطابق عمل نہ کریں۔ ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں کیونکہ ایسے خیالات پر مؤاخذہ نہیں ہوگا جو پختہ نہ ہوں، یعنی آئیں اور گزر جائیں، البتہ مصمم ارادے اور پختہ عزم پر ضرور مؤاخذہ ہوگا اگرچہ اس کے مطابق عمل نہ کیا جا سکے۔[1] ② حضرت ابوبکرہ ؓ نے اس حدیث کو مطلق رکھا، اس بنا پر خود بھی جنگ جمل میں شریک نہ ہوئے اور حضرت احنف بن قیس کو بھی شرکت سے روک دیا، حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جب لڑنے کے لیے نکل آئیں اور جنگ حق کی بنا پر نہ ہو بلکہ ہوس ملک گیری یا عصبیت وغیرہ اس کی محرک ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ اور اگر منشا صحیح ہو اور لڑنے والے حق کی حمایت میں جا رہے ہوں اور ہر مسلمان اپنی پوری احتیاط اور تحقیق کے ساتھ خود کو حق پر سمجھتے ہوئے اس میں شریک ہو رہا ہو تو دونوں جنتی ہیں کیونکہ حق پر لڑنے کی قرآن نے خود اجازت دی ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ حضرت احنف بن قیس اس وقت تو حضرت ابوبکرہ کے کہنے پر واپس ہو گئے لیکن جب غور وفکر کیا تو اپنی رائے سے رجوع کر کے حضرت علی ؓ کا ساتھ دیا، البتہ حضرت ابوبکرہ ؓ کی نصیحت اخلاص و احتیاط کے ساتھ لڑائی کی شدت کم کرنے کی کوشش پر مبنی تھی۔[3] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث نبوی کو پیش کرتے وقت اس کا موقع محل بھی ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔ ③ جنگ جمل کی تفصیلات آئندہ بیان ہوں گی، البتہ عنوان کی مناسبت سے اس مقام پر اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ جو لوگ حضرت علی ؓ کو حق پر سمجھتے ہوئے اس جنگ میں شریک ہوئے، وہ خواہ قاتل ہوں یا مقتول، وہ حدیث میں مذکور وعید سے خارج ہیں اور جن لوگوں کا مقصد محض فساد برپا کرنا تھا، وہ قاتل ہوں یا مقتول، ازروئے حدیث جہنمی ہیں۔ اسی طرح سیدہ عائشہ ؓ کی طرف جو لوگ حق کی حمایت کے لیے کھڑے ہوئے، وہ بإذن اللہ جنت میں جائیں گے لیکن جن لوگوں کا مقصد حصول اقتدار، عہدہ طلبی، عصبیت یا اور کوئی دنیاوی غرض تھی، ان

[1] شرح الكرماني:1/144. [2] الحجرات 49:9. [3] فتح الباري:1/117.

کے متعلق حدیث نبوی ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ عصبیت کا مفہوم یہ ہے کہ حالات کی تحقیق کیے بغیر صرف یہ سمجھ کر کسی کی مدد کی جائے کہ یہ اپنا آدمی ہے۔

(٢٣) بَابٌ: ظُلْمٌ دُونَ ظُلْمٍ

باب: 23- ایک ظلم کا دوسرے ظلم سے کم تر ہونا

٣٢ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ؛ ح: قَالَ: وَحَدَّثَنِي بِشْرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ: لَمَّا نَزَلَتْ: ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَلَمْ يَلْبِسُوٓا۟ إِيمَـٰنَهُم بِظُلْمٍ أُو۟لَـٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾ [الأنعام:٨٢] قَالَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ: أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ؟ فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿إِنَّ ٱلشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [لقمان:١٣]. [انظر: ٣٣٦٠، ٣٤٢٨، ٣٤٢٩، ٤٦٢٩، ٤٧٧٦، ٦٩١٨، ٦٩٣٧]

[32] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت اتری: ''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔'' تو نبی ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: (اے اللہ کے رسول!) ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے ظلم نہیں کیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ''یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔''

فوائد و مسائل: ① یہ عنوان بھی مرجیہ کی تردید اور ایمان کی کمی بیشی کے اثبات کے لیے ہے کیونکہ آیت کریمہ میں کفر و شرک کو ظلم کا ایک فرد بتایا گیا ہے۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کے مختلف مراتب ہیں، کوئی ادنیٰ اور کوئی عظیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک و کفر میں بھی مراتب تسلیم کرنا پڑیں گے کیونکہ وہ ظلم ہی کے افراد ہیں۔ چونکہ کفر ضد ایمان ہے، اس لیے اس کے مراتب خود بخود ثابت ہوگئے کیونکہ اشیاء اپنی ضد سے واضح ہوتی ہیں۔ یہی مقصود عنوان ہے۔ ② آیت کریمہ میں لفظ ظلم عام ہے جو کفر و شرک اور معاصی کو شامل ہے، اس لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اشکال پیدا ہوا، جو لفظ ظلم سے متعلق ہے اور رسول اللہ ﷺ کے جواب کا تعلق لفظ ﴿لَمْ يَلْبِسُوْا﴾ سے ہے ''لَبْس'' کے لغوی معنی، اختلاط ہیں اور یہ وہاں ممکن ہوتا ہے جہاں دونوں چیزوں کا ظرف ایک ہو۔ اب ظلم سے مراد اعمال جوارح، یعنی معاصی نہیں ہوسکتے کیونکہ معاصی کا محل جوارح ہیں اور ایمان کا محل دل ہے، ہاں کفر و شرک اور ایمان کا محل ایک ہے، لہٰذا ایمان سے اسی ظلم کا اختلاط ہوگا جو ایمان کے ظرف میں پہنچ سکتا ہو اور وہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ ③ اس حدیث سے دور حاضر کے معتزلہ (منکرین حدیث) کی بھی تردید ہوتی ہے جو قرآن فہمی کے لیے صرف عربی لغت کو کافی سمجھتے ہیں اور صاحب قرآن رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کو اہمیت نہیں دیتے۔ اگر ان کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کے سمجھنے میں کسی قسم کی الجھن کا شکار نہ ہوتے، لہٰذا قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے صاحب قرآن ﷺ کے ارشادات و معمولات کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ یہی وہ بیان ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود

اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ''پھر اس قرآن کی وضاحت ہمارے ذمے ہے۔''[1]

(٢٤) بَابُ عَلَامَاتِ الْمُنَافِقِ

باب:24- منافق کی نشانیاں

٣٣ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعُ بْنُ مَالِكِ ابْنِ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سُهَيْلٍ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ». [انظر: ٢٦٨٢، ٢٧٤٩، ٦٠٩٥]

[33] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔''

٣٤ - حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُرَّةَ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَرْبَعٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ». تَابَعَهُ شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ. [انظر: ٢٤٥٩، ٣١٧٨]

[34] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''چار باتیں جس میں ہوں گی وہ تو خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بھی ہوگی، اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اسے ترک کردے: جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو دغابازی کرے اور جھگڑے تو بے ہودہ بکواس کرے۔''
اس حدیث کو شعبہ نے بھی اعمش سے روایت کرنے میں (سفیان کی) متابعت کی ہے۔

فوائد ومسائل: ① شرک، ظلم کا فرد اعلیٰ ہے اور نفاق، کفر کا فرد اعلیٰ ہے۔ اس میں کفر باللہ کے ساتھ مسلمانوں کو دھوکا دینا بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام کفار کے مقابلے میں اس کی سزا بھی سخت رکھی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ ''بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔''[2] اسی مناسبت کی بنا پر کفر سے متعلقہ ابواب کے اختتام پر اسے ذکر کیا گیا ہے۔ پھر نفاق کی دو قسمیں ہیں: ایک نفاق تو ایمان وعقیدے کا ہوتا ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے جس کی نشاندہی صرف وحی سے ممکن ہے۔ دوسرا عملی نفاق ہے جسے سیرت وکردار کا نفاق بھی کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ نفاق میں بھی کفر اور ظلم کی طرح مراتب ہیں۔ بعض ادنیٰ ہیں اور بعض اعلیٰ۔ اعلیٰ مرتبہ تو نفاق اعتقادی کا ہے جس کا کفر ہونا محتاج بیان نہیں، باقی مراتب عملی نفاق کے ہیں اور ان میں درجات کا تفاوت ہے۔ جب ایمان کے اضداد میں یہ مراتب قائم ہیں

① القیامة 19:75. ② النساء 145:4.

تو ایمان میں بھی ضرور ہونے چاہییں، لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد واضح ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اور معاصی ایمان کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور نقصان کیا ہوسکتا ہے کہ احادیث میں بیان کردہ افعال قبیحہ کے ارتکاب سے انسان زمرۂ منافقین میں آ جاتا ہے۔ (2) نفاق کے معنی ظاہر و باطن کے اختلاف کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل نافقاء سے لیا گیا ہے جو چوہے کی طرح ایک جانور کے بل کے پوشیدہ دروازے کا نام ہے جو بظاہر ہموار زمین کی طرح نظر آتا ہے۔ منافق بھی بظاہر مسلمان نظر آتا ہے مگر اندرونی طور پر اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، محض دھوکا دینے کے لیے یہ روپ اختیار کرتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ﴾ ''اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے، حالانکہ وہ کفر لیے آئے تھے اور اس کفر کے ساتھ ہی واپس ہوگئے۔ اور جو کچھ یہ چھپا رہے ہیں، اسے اللہ خوب جانتا ہے۔''[1] (3) امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ موقف نہیں ہے کہ ان خصائل کے اختیار کرنے سے ایک مومن انسان منافق بن جاتا ہے بلکہ ان کا مرتکب اس انسان کے اعتبار سے منافق ہے جس کے ساتھ نقض عہد کیا ہے، جس سے وعدہ خلافی کی ہے، جس کی امانت میں خیانت کی ہے کیونکہ امام بخاری یہاں اصطلاح نفاق کو بیان نہیں فرما رہے بلکہ وہ ایمان میں کمی بیشی کے اثبات کے لیے کفر وظلم میں کمی بیشی کا اثبات کر چکے ہیں اور اب نفاق میں اس کی بیشی کا اثبات چاہتے ہیں تاکہ نفاق کے درجات کے اثبات سے ایمان میں بھی درجات کا اثبات کیا جائے، نیز ان چیزوں کو نفاق کی علت نہیں کہا گیا کہ جس کی موجودگی میں معلول کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے بلکہ یہاں انھیں صرف علامت قرار دیا گیا ہے اور ضروری نہیں کہ جہاں علامت موجود ہو وہاں اصل شئے بھی پائی جائے، جیسے نبض کی تیزی بخار کی علامت ہے مگر کبھی قوت نفس کی بنا پر بھی نبض تیز ہو جاتی ہے۔ (4) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں نفاق کی تین علامتیں بیان ہوئی ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نفاق کی چار علامتیں ہیں۔ ان چار میں دو علامتیں تو پہلی روایت کی ہیں اور دو علامتیں مزید ہیں۔ اس طرح کل پانچ علامتیں ہو جاتی ہیں: ○ دروغ گوئی ○ خیانت ○ وعدہ خلافی ○ عہد شکنی ○ فجور۔ اگر غور کیا جائے تو ان پانچوں کو تین ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں مصداق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح فجور بھی دروغ گوئی کے تحت آ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تین ہی خصلتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے اسلوب بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ علاماتِ نفاق کا انحصار تین ہی میں ہے۔ کذب بیانی سے فساد قول، خیانت سے فساد عمل اور وعدہ خلافی سے فساد نیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فساد نیت پر استدلال اس طرح ہے کہ وعدہ خلافی وہی معیوب ہے جس میں وعدہ کرتے وقت یہ نیت کر لی گئی ہو کہ اسے پورا نہیں کرنا ہے اور اگر پورا کرنے کی نیت ہو اور کوشش کے باوجود اس کا ایفا نہ ہوسکے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔[2] (5) روایت کے آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اعمش سے بیان کرنے میں شعبہ نے سفیان ثوری کی متابعت کی ہے۔ اس متابعت کے بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قبیصہ عن سفیان کے طریق کو امام یحییٰ بن معین نے ضعیف قرار دیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ جب اس کی متابعت موجود ہے تو اس طریق کو ضعیف قرار دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، چنانچہ امام مسلم نے قبیصہ کے طریق کے علاوہ وکیع حَدَّثَنَا سفیان کا طریق بیان کیا ہے۔[3]

---

1 المائدة 61:5، وشرح الكرماني:147/1. 2 فتح الباري:122/1 3 صحيح مسلم، الإيمان، حديث:210 (58).

پھر اعمش سے سفیان ثوری کے علاوہ شعبہ نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے جسے خود امام بخاری رشاللہ نے کتاب المظالم میں ذکر کیا ہے۔ (دیکھیے، حدیث نمبر:2459)، لہٰذا اس روایت کے قابل حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔[1]

(٢٥) بَابٌ: قِيَامُ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:25- شب قدر کا قیام بھی جزو ایمان ہے

٣٥ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [انظر: ٣٧، ٣٨، ١٩٠١، ٢٠٠٨، ٢٠٠٩، ٢٠١٤]

[35] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ایمان کا تقاضا سمجھ کر ثواب کی نیت سے شب قدر کا قیام کرے گا، اس کے سابقہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

فوائد ومسائل: ① کفر ونفاق کی اقسام ذکر کرنے کے بعد امام بخاری رشاللہ اصل کی طرف رجوع فرماتے ہیں، یعنی ایمان اور اس کے متعلقات کو پھر شروع کیا تاکہ مرجیہ، کرامیہ اور خوارج وغیرہ کے عقائد وخیالات کا بطلان پورے طور پر ثابت ہو جائے۔ اس سے پہلے ایسے اعمال کا ذکر تھا جن سے نفاق کا اندازہ ہوتا ہے، اب ایسی علامتوں کو بیان کیا جاتا ہے جن سے ایمان اور اخلاص کا پتہ چلتا ہے، نیز لیلۃ القدر کا معاملہ بڑی محنت وکاوش کا ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اخلاص اور جسے دین سے بے پناہ تعلق اور لگاؤ ہو۔ اس باب سے بھی ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتاتے ہیں، حالانکہ ایمان کی حفاظت کے لیے اعمال کی قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے حتیٰ کہ شب قدر کے قیام کی تاکید کی جا رہی ہے۔ ② اس حدیث میں ایمان واحتساب کے الفاظ بطور خاص ذکر کیے گئے ہیں۔ لفظ ایمان میں تنبیہ ہے کہ اس رات کا قیام ایمانی تقاضے کے تحت ہونا چاہیے، کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو۔ اس قسم کے ایمانی تقاضوں سے ایمان میں ترقی ہوگی اور جس ایمان میں اس قسم کے تقاضے شامل نہیں ہوں گے، وہ ایمان کمزور ہوگا۔ اسی طرح لفظ احتساب جس کے معنی نیت کا استحضار ہیں، یہ اصل نیت سے زائد شئے ہے۔ عمل کے وقت استحضار نیت اجر میں ترقی کا باعث ہے، مثلاً: ایک شخص بیدار ہے اور عمل خیر میں مشغول ہے تو یقیناً یہ بڑی سعادت ہے لیکن اگر شب بیداری کے ساتھ نیت کا استحضار بھی ہو جائے تو درجات ثواب میں بہت زیادتی ہو جاتی ہے۔ ③ لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ کے متعلق مندرجہ ذیل اقوال ہیں: ○ قدر کے معنی عزت وشرف کے ہیں، یعنی عزت کی رات۔ یہ عزت رات سے بھی متعلق ہو سکتی ہے، یعنی جو رات دیگر تمام راتوں میں خاص امتیاز اور وزن رکھتی ہے۔ اور عابدین سے بھی یہ عزت متعلق ہو سکتی ہے، یعنی وہ رات جس میں عبادت کرنے والوں کی بڑی قدر ومنزلت ہے، نیز یہ عزت عبادت سے بھی متعلق ہو سکتی ہے، یعنی اس رات میں کی گئی عبادت دوسری راتوں کے مقابلے میں بڑی قدر ومنزلت کی حامل ہے۔ ○ قدر کا لفظ تقدیر سے ہے تو اس سے مراد وہ رات ہے جس میں فرشتوں کو اس سال سے متعلق تقدیرات کا علم دیا جاتا ہے۔ اس میں سال بھر

① فتح الباري:123/1.

کے لیے فیصلے کیے جاتے ہیں، اس لیے اسے لیلة الحکم بھی کہتے ہیں۔ ○ قدر کے معنی تنگی کے بھی ہیں، یعنی اس رات اتنی کثرت سے فرشتے زمین پر اترتے ہیں کہ زمین ان کی وجہ سے تنگ ہو جاتی ہے۔ اس رات کی تعیین میں خاصا اختلاف ہے، تاہم احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے۔ اس کو مبہم رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ لوگ طاق راتوں میں اس کی فضیلت حاصل کرنے کے شوق میں اللہ کی خوب عبادت کریں۔

(٢٦) بَابٌ : اَلْجِهَادُ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:26- جہاد ایمان کا حصہ ہے

٣٦ - حَدَّثَنَا حَرَمِيُّ بْنُ حَفْصٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ: حَدَّثَنَا عُمَارَةُ: حَدَّثَنَا أَبُو زُرْعَةَ بْنُ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اِنْتَدَبَ اللهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيمَانٌ بِي وَتَصْدِيقٌ بِرُسُلِي أَنْ أُرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ، أَوْ غَنِيمَةٍ، أَوْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَلَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ، وَلَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللهِ، ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ».

[انظر: ٢٧٨٧، ٢٧٩٧، ٢٩٧٢، ٣١٢٣، ٧٢٢٦، ٧٢٢٧، ٧٤٥٧، ٧٤٦٣]

[36] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے ذمے داری لیتا ہے جو اس کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلے۔ اسے گھر سے صرف اس بات نے نکالا کہ وہ مجھ (اللہ) پر ایمان رکھتا ہے اور میرے رسولوں کی تصدیق کرتا ہے، تو میں اسے اس ثواب یا مال غنیمت کے ساتھ واپس کروں گا جو اس نے جہاد میں پایا، یا اسے (شہید بنا کر) جنت میں داخل کروں گا۔ اور (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) اگر میں اپنی امت کے لیے اسے دشوار نہ سمجھتا تو کبھی چھوٹے سے چھوٹے لشکر سے بھی پیچھے نہ بیٹھ رہتا۔ اور میری یہ آرزو ہے کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں۔''

فوائد و مسائل: ① اس سے پہلے شب قدر کا بیان تھا اور آئندہ باب، قیام رمضان سے متعلق ہے۔ دونوں ابواب میں گہری مناسبت تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے درمیان میں جہاد کا باب قائم کر دیا، یہ اس لیے کہ جہاد دو قسم کا ہوتا ہے: ایک جہاد مع النفس اور دوسرا جہاد مع الکفار، پھر جہاد مع الکفار، جہاد مع النفس پر موقوف ہے۔ پہلے اپنے نفس سے جہاد کر کے اسے احکام شریعت کے تابع بنا لیا جائے، اس کے بعد جہاد مع الکفار ہوگا۔ قیام لیلۃ القدر میں جہاد مع النفس تھا، اس مناسبت سے جہاد مع الکفار کا ذکر کیا ہے۔ ② مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کی ذمے داری لی ہے: اگر شہادت مل گئی تو سیدھا جنت میں جائے گا۔ اگر شہادت کا منصب نہ مل سکا تو اس کی دو صورتیں ہیں: ○ غنیمت ملنے کی صورت میں دنیا کا متاع اور آخرت کا اجر ملے گا۔ ○ اگر غنیمت نہ مل سکی تو اجر تام کے ساتھ واپس ہوگا۔ اجر اور غنیمت دونوں جمع ہو سکتے ہیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مجاہد فی سبیل اللہ دونوں سے محروم رہے۔ ابوداود کی روایت میں ہے کہ اگر مجاہد فی سبیل اللہ کو غنیمت ملی تو اسے دو ثلث اجر مل گیا، باقی

ایک ثلث قیامت کے دن کے لیے محفوظ ہے۔ اگر غنیمت نہیں ملی تو پورا اجر محفوظ رہے گا۔[1] ③ رمضان کے ابواب کے درمیان باب جہاد کو بیان کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ جہاد اگر رمضان میں ہو تو ثواب میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر شہادت مل جائے تو نورٌ علی نور۔ ④ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کو ایمان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اس میں کمی بیشی بھی ممکن ہے کیونکہ اللہ پر ایمان ہی جہاد کے لیے نکلنے کا باعث ہے، اس لیے یہ نکلنا دراصل ایمان باللہ ہی ہے کیونکہ مسبب کو سبب کا نام دینا عرب کے ہاں معروف ومتداول ہے۔[2]

(٢٧) بَابٌ: تَطَوُّعُ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:27- رمضان میں تراویح پڑھنا بھی ایمان کا حصہ ہے

وضاحت: محدثین کے ہاں ایمان مرکب ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ فرائض ونوافل دونوں ایمان کا حصہ ہیں یا صرف فرائض ہی ایمان میں داخل ہیں۔ امام بخاری ؒ کا رجحان یہ ہے کہ فرائض ونوافل دونوں اجزائے ایمان ہیں، غالباً اسی لیے انھوں نے تطوع قیام رمضان کی قید لگائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کے لیے اعمال کی ضرورت اور جزئیت صرف فرائض تک محدود نہیں بلکہ نوافل بھی ایمان کا حصہ ہیں۔

٣٧ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [راجع: ٣٥]

[37] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص رمضان میں ایماندار ہو کر حصول ثواب کے لیے رات کے وقت قیام کرے گا تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔“

فوائد ومسائل: ① گناہوں کی معافی میں حقوق العباد شامل نہیں ہیں کیونکہ اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ حقوق العباد، حقداروں کی رضامندی ہی سے ساقط ہو سکتے ہیں۔ قیامت کے دن حق داروں کی برائیاں لے کر اور اپنی نیکیاں دے کر ان کی تلافی ممکن ہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے ثواب دے کر راضی کر دے۔ ② غفران ذنوب اس طرح کے اعمال کا خاصہ ہے، تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مانع موجود نہ ہو۔ اگر کوئی مانع پایا گیا تو یہ اعمال اپنا خاصہ نہیں دکھا سکیں گے۔ جب بہت سے اعمال خیر اس خاصے میں شریک ہوں تو مغفرت کسی ایک عمل سے حاصل ہو جائے گی، باقی اعمال کا کیا فائدہ ہوگا؟ مغفرت ذنوب کے لیے بقائے ذنوب ضروری ہے، جب ذنوب ختم ہو گئے تو مغفرت کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت کے کئی ایک درجات ہیں: جب ذنوب نہیں ہوں گے تو یہ مغفرت ترقیٔ درجات اور قرب منزلت کا باعث بن جائے گی، نیز اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ایسے اعمال کی طرف خاص رغبت پیدا ہوگی اور ان کے اضداد سے بچنے کا اہتمام ہوگا۔[3] ③ قیام رمضان سے مراد نماز

① سنن أبي داود، الجهاد، حديث: 2497. ② شرح الكرماني: 1/157. ③ شرح الكرماني: 1/158.

تراویح ہے۔ وتر سمیت اس کی مقدار گیارہ رکعات ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ ؓ سے رسول اللہ ﷺ کی نماز تراویح کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: آپ رمضان یا غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زائد نہیں پڑھا کرتے تھے۔[1] حضرت عمر ؓ نے بھی اپنے عہد خلافت میں تراویح کی آٹھ رکعات کو باجماعت ادا کرنے کا اہتمام فرمایا تھا۔[2] ④ شب قدر کے باب میں حدیث کے الفاظ مضارع کے صیغے سے تھے اور قیام رمضان وصوم رمضان میں بصیغۂ ماضی ہیں، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ شب قدر کا پانا یقینی نہیں ہے، بنابریں صیغۂ مضارع استعمال ہوا ہے اور قیام رمضان و صیام رمضان یقینی ہیں، اس لیے ان کے مناسب، ماضی کا صیغہ ہے۔

(٢٨) بَابٌ: صَوْمُ رَمَضَانَ احْتِسَابًا مِنَ الْإِيمَانِ

باب:28-ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھنا ایمان کا حصہ ہے

٣٨ - حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [راجع: ٣٥]

[38] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنے ایمان کے پیش نظر حصول ثواب کے لیے ماہ رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام گزشتہ گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

فوائد و مسائل: ① صوم رمضان فرض ہے اور قیام رمضان نفل، اس کے باوجود امام بخاری ؒ نے تطوع قیام رمضان کے باب کو مقدم کیا ہے، اس کی کئی ایک وجوہات ہیں: ○ رمضان کے اعمال میں پہلا عمل قیام رمضان ہے جو چاند دیکھتے ہی شروع ہو جاتا ہے، روزہ بعد میں رکھا جاتا ہے۔ ○ قیام رمضان، صیام رمضان کی تمہید ہے اور تمہید ہمیشہ اصل سے پہلے ذکر کی جاتی ہے۔ ○ اس میں اشارہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی سنت کے راستے سے ہونی چاہیے، یہی قبولیت کا راستہ ہے۔ ○ قیام رمضان فعلی عبادت ہے اور ہمیشہ فعلی عبادات کو مقدم کیا جاتا ہے جبکہ صیام رمضان میں کچھ چیزوں کو چھوڑنا ہوتا ہے، اس لیے روزہ فعلی عبادت نہیں ہے۔ ② امام صاحب نے تطوع قیام رمضان کے ساتھ عنوان قائم کرتے وقت احتساب کی قید ذکر نہیں کی کیونکہ یہ عمل ہی استحضارِ نیت کے لیے کافی ہے لیکن صوم رمضان میں ایسی کوئی صورت نہ تھی جو تذکیر کا کام دیتی، اس لیے آپ نے عنوان ہی میں احتساب کا اضافہ کر دیا اگرچہ حدیث میں دونوں کے لیے احتساب کی شرط مذکور ہے۔ ③ ایمان اور احتساب لازم ملزوم نہیں کہ ایک کا ذکر دوسرے کے لیے کافی ہو کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ عمل تو ایمان کا ہے مگر فاعل کی نیت میں اخلاص نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عمل بڑے اخلاص سے ادا کیا جاتا ہے مگر یہ ایمان کے پیش نظر نہیں، بلکہ عامل کا اپنا طبعی رجحان ہوتا ہے۔ ④ احتساب کے معنی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا ہیں۔ عبادت کی قبولیت کے لیے احتساب کا ہونا ضروری ہے۔ امام بخاری ؒ نے عنوان میں

---

1 صحيح البخاري، صلاة التراويح، حديث: 2013. 2 الموطأ للإمام مالك: 120/1، حديث: 256، طبع دار المعرفة.

احتساب کا اضافہ فرما کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایسی اشیاء ایمان میں اس وقت شمار ہوں گی جب مع الاحتساب ہوں، اس کے بغیر ان کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (5) امام بخاری رحمہ اللہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اعمال صالحہ ایمان میں داخل ہیں۔ ان سے ایمان کی نشوونما ہوتی ہے اور ان میں کمی بیشی سے ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

(٢٩) بَابٌ: اَلدِّينُ يُسْرٌ

باب:29- دین آسان ہے

وَقَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ: «أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ».

فرمان نبوی ہے: ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب دین، دین حنیف ہے، جس کی بنیاد سہولت پر رکھی گئی ہے۔''

وضاحت: اعمال مذکورہ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دین میں بڑی مشقت ہے، جیسے روزہ، رات کا قیام اور لیلۃ القدر کی تلاش وغیرہ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں مشقت مطلوب ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اعمال میں سختی مطلوب نہیں بلکہ اعتدال کی رعایت ملحوظ ہے، اس لیے اللہ کے نزدیک وہ دین پسندیدہ ہے جس میں اللہ سے خالص تعلق کی تعلیم ہو اور جس کے اعمال میں یُسر اور سہولت ہو، اور یہ صرف دین اسلام میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ﴾ ''اس نے دین میں تم پر کوئی سختی نہیں رکھی بلکہ یہ تو تمھارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔''[1] باب میں مذکورہ حدیث کو امام بخاری نے اپنی کتاب ''الأدب المفرد'' میں موصولاً بیان کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے بھی مسند میں بیان کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہ تھی، اس لیے عنوان میں اسے ذکر فرمایا۔[3]

٣٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْغِفَارِيِّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَّلَنْ يُّشَادَّ الدِّينَ [أَحَدٌ] إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ». [انظر: ٥٦٧٣، ٦٤٦٣، ٧٢٣٥]

[39] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''بے شک دین اسلام بہت آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آ جائے گا، اس لیے میانہ روی اختیار کرو اور (اعتدال کے ساتھ) قریب رہو اور خوش ہو جاؤ۔ صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے مدد حاصل کرو۔''

فوائد ومسائل: (1) سابقہ ادیان کے مقابلے میں یہ دین انتہائی آسان ہے۔ اس میں ان پابندیوں کو اٹھا لیا گیا ہے جو پہلے لوگوں پر عائد تھیں، جیسا کہ بنی اسرائیل میں توبہ کی قبولیت خود کو قتل کرنے پر منحصر تھی، لیکن اس امت کی توبہ دل کی شرمندگی اور

---

(1) الحج 22:78. (2) الأدب المفرد، حديث: 287، و مسند احمد: 233/6. (3) فتح الباري: 127/1.

اعمال صالحہ کے عزم پر مبنی ہے۔[1] ② اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کو راحت وسکون کے اوقات میں نہایت نشاط اور مستقل مزاجی سے فریضۂ عبادت ادا کرنا چاہیے تاکہ اس کا عمل مستقل بنیادوں پر قائم رہے کیونکہ تھوڑا سا عمل استقلال وثبات سے کرنا اس عمل کثیر سے کہیں بڑھ کر ہے جس میں انقطاع آ جائے۔[2] ③ عزیمت اور رخصت دونوں چیزیں دین میں شامل ہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ دونوں پر عمل ہو۔ عزیمت کی حالت میں عزیمت پر عمل کیا جائے اور رخصت کے موقع پر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہر ہر موقع پر رخصت کی تلاش بے دینی ہے جبکہ ہر وقت عزیمت کی تمنا بھی حد سے تجاوز ہے، ایسا کرنے میں ناکامی کا اندیشہ اور نامرادی کا خطرہ رہتا ہے جیسا کہ پانی کے استعمال پر کوئی عذر مانع ہو تو تیمّم کی اجازت ہے، ایسے موقع پر پانی کے استعمال پر اصرار کرنا دین میں تشدد ہے جسے اسلام نے پسند نہیں کیا۔ اس حدیث میں میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہے۔[3] ④ استقامت اور میانہ روی کا راستہ بھی انتہائی دشوار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔''[4] کیونکہ اس سورت کی آیت نمبر:112 میں آپ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ایسی ذمے داری تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔'' اس لیے حدیث میں ایک دوسری صورت بتائی گئی ہے کہ اگر پورے طور پر سداد اور استقامت حاصل نہ ہو تو کم از کم اس کے قریب قریب تو رہو۔ اسی طرح عمل کی توفیق پر خوش ہو جاؤ اور یہ خوشی صرف استقامت ہی میں نہیں بلکہ اس کے قریب رہنے سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بشارت حوصلہ بڑھانے کا ایک طریق ہے۔ اس سے عابد کی ہمت بلند ہوتی ہے اور اس کے عزم میں ایک نیا ولولہ اور نئی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ ⑤ مشکل کام کو آسان بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے مختلف اوقات نشاط پر تقسیم کر دیا جائے، مثلاً: اس کا کچھ حصہ صبح، کچھ بعد از زوال آفتاب اور کچھ رات کے آخری حصے میں سرانجام دیا جائے کیونکہ یہ اوقات اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل کرنے کے ہیں۔ ان کاموں کے بجالانے سے دل میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ دل انسانی اعضاء کا بادشاہ ہے، اگر اس میں طاقت ہوگی تو دیگر اعضاء اپنے اپنے کام میں چست رہیں گے۔ اس طرح کئی اور مشکل کام کرنے میں آسانی رہتی ہے۔[5]

(٣٠) بَابٌ : اَلصَّلَاةُ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:30- نماز بھی ایمان کا جز ہے

وَقَوْلُ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَـٰنَكُمْ﴾ [البقرة:١٤٣]. يَعْنِي صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ.

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمھارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔'' اس سے مراد بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی نمازیں ہیں۔

وضاحت: جب بیت کا لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد بیت اللہ ہوتا ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ کا صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ فرمانا محل نظر ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری نے إِلَى الْبَيْتِ نہیں فرمایا کہ اس سے مراد بیت اللہ کی

---

1 فتح الباري:126/1. 2 شرح الكرماني:162/1. 3 فتح الباري:128/1. 4 جامع الترمذي، تفسير القرآن، حديث:3297.

5 فتح الباري:128/1.

طرف منہ کر کے ادا کی گئی نمازیں مراد ہوں بلکہ عندالبیت کہا ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ بیت اللہ کے نزدیک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی نمازوں کو اللہ تعالیٰ ضائع کرنے والا نہیں۔[1]

٤٠ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ - أَوْ قَالَ: أَخْوَالِهِ - مِنَ الْأَنْصَارِ، وَأَنَّهُ صَلَّى قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا - أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا - وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبْلَتُهُ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَأَنَّهُ صَلَّى - أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا - صَلَاةَ الْعَصْرِ وَصَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ، فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ صَلَّى مَعَهُ فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُونَ فَقَالَ: أَشْهَدُ بِاللهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ قِبَلَ مَكَّةَ فَدَارُوا كَمَا هُمْ قِبَلَ الْبَيْتِ، وَكَانَتِ الْيَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ يُصَلِّي قِبَلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَهْلُ الْكِتَابِ، فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوا ذٰلِكَ.

[40] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب (ہجرت کر کے) مدینہ تشریف لائے تو پہلے اپنے ددھیال یا ننھیال، جو انصار سے تھے، کے ہاں اترے اور (مدینے میں) سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، البتہ آپ چاہتے تھے کہ آپ کا قبلہ کعبے کی طرف ہو جائے (چنانچہ ہو گیا)۔ اور پہلی نماز جو آپ نے (کعبے کی طرف) پڑھی، وہ عصر کی نماز تھی اور آپ کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے، پھر ان میں سے ایک شخص نکلا اور کسی مسجد والوں کے پاس سے اس کا گزر ہوا، وہ (بیت المقدس کی طرف منہ کیے ہوئے) رکوع کی حالت میں تھے تو اس نے کہا: میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مکے کی طرف نماز پڑھی ہے۔ (یہ سنتے ہی) وہ لوگ جس حالت میں تھے اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔ اور جب آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے تو یہودی اور دوسرے اہل کتاب (نصاریٰ) بہت خوش ہوتے تھے لیکن جب آپ نے اپنا منہ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا تو یہ انھیں بہت ناگوار گزرا۔

قَالَ زُهَيْرٌ: حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ فِي حَدِيثِهِ هٰذَا، أَنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ - قَبْلَ أَنْ تُحَوَّلَ - رِجَالٌ وَقُتِلُوا فَلَمْ نَدْرِ مَا نَقُولُ فِيهِمْ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمْ﴾ [البقرة:١٤٣]. [انظر: ٣٩٩، ٤٤٨٦، ٤٤٩٢، ٧٢٥٢]

اسی حدیث میں زہیر (راوی) نے بواسطۂ ابو اسحاق، براء سے یہ بھی بیان کیا کہ تحویل قبلہ سے پہلے کچھ لوگ فوت اور شہید ہو چکے تھے۔ ان کے متعلق ہمیں معلوم نہ تھا کہ انھیں نمازوں کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ''ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا ایمان (نمازیں) ضائع کر دے۔''

فوائد و مسائل: [1] اس سے مراد ان لوگوں کی تردید کرنا ہے جو کہتے ہیں کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ایمان

[1] فتح الباري:1/129.

میں کمی بیشی ہوتی ہے، حالانکہ قرآن کریم میں نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور نماز کا خصوصی تعلق ہے کیونکہ نماز ایمان کا عظیم شعار ہے، بندے اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے، دین کا مستحکم ستون ہے، اس تعلق کی وجہ سے صلاۃ گویا عین ایمان ہے۔ جب یہ عمل عین ایمان ٹھہرا تو اس میں کمی بیشی بھی ممکن ہے۔ نماز پر ایمان کا اطلاق، اطلاق الکل علی الجزء ہے، لہٰذا ایمان کے لیے نماز ایک جز ثابت ہوئی۔ ھذا ھو المقصود۔ ② اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وہ نماز جو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی، نماز عصر تھی، بعض روایات کی رُو سے وہ نماز ظہر تھی۔ دراصل واقعات یہ ہیں کہ بنوسلمہ جو مسجد نبوی سے تین میل کے فاصلے پر رہائش پذیر تھے، وہاں حضرت بشر بن براء کی وفات ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ وہاں جنازے کے لیے تشریف لے گئے۔ وہیں نماز ظہر کا وقت ہوگیا تو آپ نے ظہر کی نماز مسجد بنوسلمہ میں ادا فرمائی، دو رکعت پڑھنے کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آ گیا۔ آپ اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی حالت میں بیت اللہ کی جانب متوجہ ہوگئے۔ اس مسجد کا نام مسجد قبلتین ہے۔ آج بھی اس مسجد میں دو محرابیں ہیں۔ اس کے بعد وہ پہلی نماز جو پوری کی پوری بیت اللہ کی طرف منہ کر کے ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی جو مسجد نبوی میں ادا ہوئی، پھر ان کی وساطت سے دوسری مساجد تک اطلاع پہنچی، چنانچہ ایک آدمی مسجد بنی حارثہ کے پاس سے گزرا تو وہ ابھی نماز عصر پڑھ رہے تھے، انھیں دوران نماز میں تحویل قبلہ کی اطلاع دی گئی، وہ بلا تردد گھوم گئے۔ پھر اگلے دن مدینے سے باہر اہل قباء کو نماز فجر کے وقت اطلاع ملی۔ اب ان مختلف روایات (ظہر، عصر اور فجر) میں تطبیق دی جا سکتی ہے۔[1] ③ روایت کے آخر میں زہیر راوی کا ایک طریق ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التفسیر (حدیث نمبر:4486) میں متصلاً ذکر فرمایا ہے۔ اس میں تحویل قبلہ سے پہلے چند صحابہ کے مقتول ہونے کا ذکر ہے، حالانکہ اس وقت تک کوئی جنگ وغیرہ نہیں ہوئی تھی، لیکن ضروری نہیں کہ جنگ ہی سے قتل کا واقعہ پیش آئے، کفار سے دشمنی کی وجہ سے بھی قتل کی نوبت آ سکتی ہے۔ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد جو تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہوئے دس ہے، تین مکہ مکرمہ میں: عبداللہ بن شہاب، مطلب بن ازہر اور سکران بن عمرو عامری اور پانچ حبشہ میں: حطاب بن حارث، عمرو بن امیہ، عبداللہ بن حارث، عروہ بن عبدالعزی اور عدی بن نضلہ اور مدینہ منورہ میں براء بن معرور اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہم، ان حضرات کے متعلق تشویش تھی جس کا روایت میں ذکر ہے، چنانچہ آیت کے نزول سے تسلی ہوگئی۔[2] ④ اس حدیث سے خبر واحد کی حجیت کا بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک قطعی چیز کو محض ایک صحابی کے حلفیہ بیان سے بدل دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بعض اوقات خبر واحد بھی قطعیت کا فائدہ دیتی ہے بالخصوص جب مقرون بالقرائن ہو۔ اگرچہ یقین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں، تاہم فقہاء کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ خبر واحد ہر وقت ظن کا فائدہ دیتی ہے۔ یہ حدیث فقہاء کے اس خودساختہ اصول کی تردید کرتی ہے۔

(٣١) بَابُ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ

باب:31- آدمی کے اسلام کی خوبی

٤١ - [قَالَ] مَالِكٌ : أَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ أَنَّ

[41] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں

1 فتح الباري:131/1، 651. 2 فتح الباري:132/1.

عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ: أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ أَخْبَرَهُ: أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلَامُهُ يُكَفِّرُ اللهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا، وَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ: اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا إِلَّا أَنْ يَّتَجَاوَزَ اللهُ عَنْهَا».

نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''جب کوئی بندہ مسلمان ہو جاتا ہے، پھر اسلام پر اچھی طرح کاربند رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے جن کا اس نے قبل از اسلام ارتکاب کیا تھا۔ اور اس کے بعد پھر قصاص کا اصول چلتا ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ اور برائی کا بدلہ تو برائی کے مطابق ہی دیا جاتا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمالے۔''

٤٢ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَّعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا».

[42] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو اچھا کرے تو ہر وہ اچھائی جس کو وہ بجالائے گا، دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جائے گی اور ہر وہ برا کام جو وہ کرتا ہے تو وہ اتنا ہی لکھا جاتا ہے (جتنا اس نے کیا ہے)۔''

فوائد و مسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ حسن، اسلام کی ایک صفت ہے اور حسن میں مراتب قائم ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں بھی مراتب قائم ہوں گے، اس بنا پر اس میں کمی بیشی بھی ہوگی، نیز اس سے ان لوگوں کی تردید بھی مقصود ہے جو ایمان کے لیے اعمال کی ضرورت کا یکسر انکار کرتے ہیں کیونکہ اسلام کا حسن، اعمال کا مرہون منت ہے، جب ان کا اختیار کرنا وجہ حسن ہے تو ان کا ترک باعث نقصان ہوگا۔ پھر اس باب کی ماقبل سے مناسبت یہ ہے کہ پہلے باب میں [الصلاة من الإيمان] فرمایا اور اس باب سے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام میں حسن بھی نماز سے آتا ہے۔[1] ② ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کافر اگر سچے دل سے مسلمان ہو جائے تو ایام کفر کی نیکیاں بھی اس کے بطاقۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ کافر اگر مسلمان ہو جائے تو زمانۂ کفر کی نیکیوں کا بھی اسے ثواب ملے گا۔ اس کی تائید حضرت حکیم بن حزام کی روایت سے بھی ہوتی ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ مجھے ایام جاہلیت کے اچھے کاموں کا کچھ فائدہ ہوگا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے سابقہ اعمال خیر کو ساتھ لیے ہوئے مسلمان ہوئے ہو، یعنی اسلام کی برکت سے تمھارے جملہ اعمال خیر قائم ہیں۔''[3] ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو طاعات زمانۂ کفر میں کی گئی ہیں، ان کی دو اقسام ہیں: ○ جن کے لیے نیت شرط ہے، اور

---

① عمدة القاري: 369/1. ② سنن النسائي، الإيمان، حديث: 5001، و الصحيحة للألباني، حديث: 247. ③ صحيح البخاري، الزكاة، حديث: 1436.

نیت کی شرط اسلام ہے، اس لیے کافر کا کوئی عمل عبادت نہیں بن سکتا۔ ○ قربات: عبادت کے علاوہ دیگر امور خیر قربات میں شامل ہیں۔ یہ دنیا میں اس کی نیک نامی کا باعث ہو سکتے ہیں اور آخرت میں تخفیف عذاب کا سبب بن سکتے ہیں کیونکہ عذاب سے نجات کے لیے تو ایمان شرط ہے جیسا کہ ابوطالب کے متعلق احادیث میں آیا ہے۔ بہر حال کافر کی طاعات وقربات عذاب میں تخفیف پیدا کر دیتی ہیں جبکہ وہ کفر پر مرا ہو، اگر اسلام پر خاتمہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسلام کی برکت سے بطور احسان ان اعمال خیر پر بھی ثواب عطا فرمائے گا جو بحالت کفر کیے ہوں گے۔[1] ④ اصول قصاص کا مطلب یہ ہے کہ اگر نیکی کا عمل ہے تو اس پر ثواب کم از کم دس گنا کر دیا جائے گا اور یہ آخری حد نہیں بلکہ بقدر اخلاص درجات بڑھتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ اضافہ سات سو تک پہنچ جاتا ہے بلکہ معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا بدلہ دس سے لے کر سات سو تک بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ عطا فرماتا ہے۔''[2] اس میں شرط یہ ہے کہ نمائش مقصود نہ ہو بلکہ اخلاص کے ساتھ حسنات کی جائیں اور جہاں تک سیئات (برائیوں) کا تعلق ہے تو انھیں بڑھا کر نہیں لکھا جاتا بلکہ جس درجے کی سیئہ (برائی) ہوگی، اسی قدر اس کی جزا لکھی جاتی ہے۔ ⑤ اسلام کے بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اوامر ونواہی کو ہر وقت سامنے رکھا جائے، حلال وحرام میں پورے طور پر تمیز کی جائے، اللہ کا خوف رکھا جائے، جنت کی طلب کی جائے، جہنم سے پناہ مانگی جائے، اپنے اعتقاد وعمل اور اخلاق وکردار سے اسلام کا سچا نمونہ پیش کیا جائے۔ اس حالت میں جو نیکی کی جائے گی اس کا ثواب سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تک دیا جائے گا۔

(٣٢) بَابٌ: أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهُ

باب: 32- اللہ تعالیٰ کو دین (کا) وہ (عمل) بہت پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے

٤٣ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ هِشَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ فَقَالَ: «مَنْ هٰذِهِ؟» قَالَتْ: فُلَانَةُ، تَذْكُرُ مِنْ صَلَاتِهَا قَالَ: «مَهْ، عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ، فَوَاللهِ! لَا يَمَلُّ اللهُ حَتّٰى تَمَلُّوا» وَكَانَ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَيْهِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ. [انظر: ١١٥١]

[43] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، نبی اکرم ﷺ ایک مرتبہ ان کے پاس تشریف لائے، وہاں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' حضرت عائشہ ؓ نے کہا: یہ فلاں عورت ہے اور اس کی (کثرت) نماز کا حال بیان کرنے لگیں۔ آپ نے فرمایا: ''رک جاؤ! تم اپنے ذمے صرف وہی کام لو جو (ہمیشہ) کر سکتے ہو۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے نہیں اکتاتا، تم ہی عبادت کرنے سے تھک جاؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب، اطاعت کا وہ کام ہے جس کا کرنے والا اس پر ہمیشگی کرے۔''

---

1 فتح الباري: 134/1. 2 صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 338 (131).

فوائد و مسائل: ① پہلے باب میں تھا کہ حسن اسلام مطلوب ہے اور اس باب میں فرمایا کہ وہ حسن مطلوب، دوام عمل میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں حسن، اعمال سے آتا ہے مگر وہ اعمال اس درجے میں نہ ہوں کہ ان میں زبردستی کی جائے بلکہ اس حد تک مطلوب ہیں کہ ان پر دوام ہو سکے۔ اعمال اتنے زیادہ نہ ہوں کہ دل کی تنگی کی بنا پر ان کے چھوڑنے تک نوبت پہنچ جائے۔ اللہ کے ہاں مقدار نہیں، معیار کی قدر و قیمت ہے۔ ② اس سے مراد بھی مرجیہ کی تردید ہے کہ یہاں اعمال پر دین کا اطلاق کیا گیا ہے، پھر اعمال کی مطلوبیت تو مسلم ہے، لیکن مزید ان اعمال پر دوام و استمرار بھی مطلوب ہے۔ اب جو عمل ہی کو دین نہ مانتا ہو، وہ دوام عمل کو کیا مانے گا۔ ③ عمل خیر پر مداومت دو لحاظ سے پسندیدہ ہے: ○ اس سے انسان کی بندگی اور غلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر جوش میں آ کر بڑا کام شروع کر دیا لیکن چند دنوں کے بعد اسے ترک کر دیا تو اس میں آقا کی ناراضی کا اندیشہ ہے۔ گویا غلام نے آقا سے روگردانی کی ہے۔ ○ اس سے خدمت گزاری کا اظہار بھی ہوتا ہے، جیسے ایک شخص روزانہ شاہی دربار میں حاضری دیتا ہے، وہ ایک نہ ایک دن آقا کے ہاں لائق التفات ہوگا، برعکس اس انسان کے جو صرف ایک دن آیا اور دربار میں پورا وقت حاضر رہا، وہ آقا کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔[1] ④ معلوم ہوا کہ شدید مجاہدات کا انجام اچھا نہیں ہوگا کیونکہ چند دنوں کے بعد تھکاوٹ محسوس ہونے لگے گی جو بوقت عمل گھبراہٹ اور تنگی دل کا باعث ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ عمل خیر کو چھوڑ دیا جائے گا یا بددلی اور بے رغبتی سے جاری رکھے گا۔ یہ دونوں حالتیں ہی مذموم ہیں، اس لیے حدیث میں ہے کہ اللہ کے ہاں وہی عمل پسندیدہ ہے جس پر مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔[2] ⑤ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر صبح کی نماز باجماعت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تہجد پر اصرار درست نہیں ہے۔ جمہور نے اسی بنا پر تمام رات نوافل پڑھنے کو مکروہ خیال کیا ہے اگرچہ سلف کی ایک جماعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو دیکھتے ہوئے اگر نماز صبح کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو اس قسم کے عمل خیر سے اجتناب کرنا چاہیے۔[3]

(٣٣) بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَزِدْنَٰهُمْ هُدًى﴾ [الكهف: ١٣]. ﴿وَيَزْدَادَ الَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِيمَٰنًا﴾ [المدثر: ٣١] وَقَالَ: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ [المائدة: ٣]. فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِّنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ.

باب: 33- ایمان میں کمی بیشی کا بیان

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”(یہ چند نوجوان (اصحاب کہف) اپنے رب پر ایمان لائے تھے) اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی دی تھی۔“ ”اور تاکہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے۔“ نیز فرمایا: ”آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے۔“ اور جب کمال میں سے کوئی چیز باقی رہ جائے تو اس کو کمی کہا جاتا ہے۔

وضاحت: ایمان کی کمی بیشی کئی اعتبار سے ہے: ایک کمی بیشی تصدیق کے لحاظ سے ہے۔ ایک کمی بیشی عمل سے متعلق ہے۔

---

① فتح الباري: 138/1. ② صحيح البخاري، الرقاق، حديث: 6464. ③ عمدة القاري: 380/1.

اور تیسری کمی بیشی مُؤمَن بہ (جس پر ایمان لایا جائے) کے اعتبار سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ایمان ہر لحاظ سے کمی بیشی کو قبول کرتا ہے۔ اس باب میں مُؤمَن بہ کے لحاظ سے کمی بیشی کا اثبات مقصود ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاری نے تین آیات کا حوالہ دیا ہے: ✱ ﴿وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى﴾ ''(یہ چند نوجوان (اصحاب کہف) اپنے رب پر ایمان لائے تھے) اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی دی تھی۔'' اس آیت میں ہدایت، ایمان کے معنی میں ہے کیونکہ اس سے پہلے ایمان کا ذکر ہے، یا پھر ہدایت اپنے اصطلاحی معنی میں ہے، یعنی ایسی رہنمائی جو منزل مقصود تک پہنچا دے۔ یہ ایسی ہدایت ہے جو ایمان کو لازم ہے۔ ایمان کے بغیر رہنمائی نہیں ہوسکتی۔[1] ✱ ﴿وَ يَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِيْمَانًا﴾ ''اور تا کہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے۔'' یہ آیت اپنے مفہوم میں واضح ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ ✱ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا ہے۔'' امام بخاری رحمہ اللہ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب کمال میں سے کوئی چیز باقی رہ جائے تو اس کو کمی کہا جاتا ہے۔ یہ آیت ایمان کی کمی بیشی کے متعلق ایک زبردست دلیل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ اس دن نازل ہوئی جب دین اسلام کے فرائض اور سنن مکمل ہو چکے تھے۔ اب دین کا کمال اسی صورت میں حاصل ہوگا کہ پوری شریعت پر عمل کیا جائے۔ اگر شرائع اسلام پر عمل کرنے میں کوتاہی ہوگی تو ایمان ناقص رہے گا۔ اور جو ان کی حفاظت کرے گا، اس کا ایمان مکمل ہوگا۔[2]

٤٤ - حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ شَعِيرَةٍ مِّنْ خَيْرٍ، وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ بُرَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ، وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَفِي قَلْبِهِ وَزْنُ ذَرَّةٍ مِّنْ خَيْرٍ» قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: قَالَ أَبَانُ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ: حَدَّثَنَا أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: «مِنْ إِيمَانٍ» مَكَانَ «خَيْرٍ».

[انظر: ٤٤٧٦، ٦٥٦٥، ٧٤١٠، ٧٤٤٠، ٧٥٠٩، ٧٥١٠، ٧٥١٦]

[44] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبیٔ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جس نے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا اور اس کے دل میں ایک جَو کے برابر نیکی (ایمان) ہو، وہ دوزخ سے (ضرور) نکلے گا۔ اور جس نے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا اور اس کے دل میں گیہوں کے دانے کے برابر بھلائی (ایمان) ہو، وہ دوزخ سے ضرور نکلے گا۔ اور جس نے ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہا اور اس کے دل میں ایک ذرہ برابر نیکی (ایمان) ہو، وہ بھی دوزخ سے (ضرور) نکلے گا۔''

حضرت امام ابوعبداللہ بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابان نے بروایت قتادہ بواسطۂ حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے لفظ خیر کی جگہ ایمان کا لفظ نقل کیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① عنوان، ایمان کی کمی بیشی کے متعلق تھا لیکن حدیث میں خیر کی کمی بیشی کا ثبوت ہے اور یہ ایک عمل

---

1 عمدة القاري:381/1. 2 عمدة القاري:381/1.

ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمی بیشی نفس ایمان کی نہیں بلکہ شرائع و احکام کی ہے، لیکن امام بخاری نے حدیث کے آخر میں ایک متابعت سے ثابت فرمایا کہ خیر سے مراد ایمان ہے، گویا متابعت کا ایک فائدہ تعیین مراد ہے۔ اس کے دو فائدے اور بھی ہیں: ایک یہ کہ قتادہ مدلس ہیں۔ اگر سماع کی تصریح نہ ہو تو اس کی روایت قبول نہیں ہوتی۔ امام صاحب نے متابعت سے تحدیث (حَدَّثَنَا) کی تصریح کر دی، گویا دوسرا فائدہ تصریح سماع کا ہوا۔ اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ابان اور ہشام اگر چہ دونوں ثقہ ہیں لیکن ہشام کا درجہ، ثقاہت کے لحاظ سے ابان سے بہت اونچا ہے، اس لیے امام صاحب نے ہشام کی روایت کو اصل قرار دیا اور اس کی خامی کو متابعت ذکر کر کے دور کر دیا، یعنی تیسرا فائدہ تقویت روایت ہے۔ ② سورج کی شعاعوں میں سوئی کی نوک کے برابر بے شمار ذرے اڑتے نظر آتے ہیں، چار ذرے ایک رائی کے دانے کے برابر ہوتے ہیں اور سو ذرات ایک جو کے دانے کے برابر وزن رکھتے ہیں۔ حدیث کا یہ اسلوب ایمان کی کمی بیشی پر روز روشن کی طرح واضح ہے، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض بدعمل موحدین جہنم میں داخل ہوں گے، پھر اپنی سزا پانے کے بعد انھیں وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ اس میں خوارج کے مسلک کے برعکس اس بات کا اثبات ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا اور نہ وہ ہمیشہ کے لیے جہنم ہی میں رہے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان کے لیے صرف معرفت ناکافی ہے بلکہ زبان سے اقرار اور وہ بھی دلی یقین کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔[1]

٤٥ - حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ ابْنَ عَوْنٍ: حَدَّثَنَا أَبُو الْعُمَيْسِ قَالَ، أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْيَهُودِ قَالَ لَهُ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرَؤُونَهَا لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ نَزَلَتْ لَاتَّخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيدًا، قَالَ: أَيُّ آيَةٍ؟ قَالَ: ﴿ٱلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلْإِسْلَٰمَ دِينًا﴾ [المائدة:٣]. قَالَ عُمَرُ: قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ. [انظر: ٤٤٠٧، ٤٦٠٦، ٧٢٦٨]

[45] حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک یہودی نے ان سے کہا: اے امیر المومنین! تمھاری کتاب (قرآن) میں ایک ایسی آیت ہے جسے تم پڑھتے رہتے ہو، اگر وہ آیت ہم یہودیوں پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن ٹھہرا لیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟ یہودی بولا یہ آیت: ''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین اسلام کو تمھارے لیے پسند کر لیا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم اس دن اور اس مقام کو جانتے ہیں جس میں یہ آیت نبی ﷺ پر نازل ہوئی۔ یہ آیت جمعے کے دن اتری جب آپ عرفات میں کھڑے تھے۔

فوائد و مسائل: ① یہودی دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ مسلمان اس آیت کی اہمیت سے نابلد ہیں۔ اگر ہم پر یہ آیت نازل ہوتی تو ہم مارے خوشی کے اس کے یوم نزول کو عید کے طور پر مناتے اور ہر سال اس دن خوشی کا اظہار کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

① شرح الكرماني:176/1.

جواب کا مطلب یہ ہے کہ تمھاری عید تو خود ساختہ ہوتی لیکن ہمارے نزدیک تو اس کا نزول ہی عید کے دن ہوا اور ایسی جگہ پر نزول ہوا جو بہت تاریخی اور انتہائی تقدیس کا حامل ہے، یعنی جمعے کا دن، ذوالحجہ کی نویں تاریخ اور میدان عرفات، اب فیصلہ کیا جائے کہ کون سی خوشی، درحقیقت خوشی کہلانے کا حق رکھتی ہے؟ ایک وہ خوشی ہے جسے خود انسان مقرر کرتا ہے اور ایک وہ جس کی تعیین اللہ کی طرف سے ہو، جبکہ اصل خوشی تو وہی ہے جو اللہ کی مقرر کردہ ہو۔ طبرانی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ اس طرح منقول ہیں کہ یہ آیت جمعے اور عرفے کے دن نازل ہوئی اور یہ دونوں دن ہمارے لیے عید کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1] غرض یہ دونوں عیدیں وقتی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ ② آیت کریمہ میں دین کے متعلق لفظ اکمال استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کمال کو قبول کرتا ہے اور جو چیز کمال کو قبول کرتی ہے وہ نقصان کو بھی قبول کر سکتی ہے۔ اس سے دین میں کمی بیشی کا اثبات ہوا، یعنی عمل کے اعتبار سے، نہ کہ انسانوں کو دین میں کمی بیشی کا اختیار ہے جیسے اہل بدعت کا شیوہ ہے۔ وہ اپنی طرف سے دین میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، حالانکہ جس دین کو اللہ نے مکمل کر دیا، اس میں اضافے کی گنجائش کس طرح ہو سکتی ہے یا اس کا مجاز کون ہو سکتا ہے؟ ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکمال سے پہلے کمی کا تصور لازم آتا ہے تو کیا شروع میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اور دین کامل نہیں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کمی صرف مومن بہ (امور ایمان) کے اعتبار سے ہے، ورنہ جس زمانے میں اسلام کے جتنے احکام نازل شدہ تھے ان کو ماننا ہی کامل ایمان تھا۔ شریعت کے دور اول اور دور کمال کا اعتبار کر کے کسی کے دین کو ناقص نہیں کہا جا سکتا۔ ③ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ساختہ عیدوں کی بھی تردید کرتے ہیں کہ ہم ایسے نہیں ہیں کہ اپنی طرف سے جو دن چاہیں عید کے لیے مقرر کر لیں بلکہ ہم تو اس سلسلے میں اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے محتاج ہیں۔ ہمارے نزدیک جمعہ تو عید المومنین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطور عید مقرر کیا ہے، نہ کہ ہم نے اپنی طرف سے یوم عید قرار دیا ہے۔

(٣٤) بَابٌ : اَلزَّكَاةُ مِنَ الْإِسْلَامِ

باب:34- زکاۃ، اسلام کا حصہ (رکن) ہے

وَقَوْلُهُ: ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلْقَيِّمَةِ﴾ [البيّنة: ٥].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "انھیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ یکسو ہو کر عبادت اللہ کے لیے خاص رکھیں، نماز قائم کریں، زکاۃ دیتے رہیں، یہی مضبوط دین ہے۔"

وضاحت: اللہ تعالیٰ نے جس ملت کو مستقیم قرار دیا ہے، وہ یہی دین ہے جس میں زکاۃ بھی شامل ہے۔ اس سے ایک تو مرجیہ کی تردید ہوگئی جو ایمان کے بعد اعمال کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ دوسری طرف اعمال کے جزو ایمان ہونے کا مسئلہ بھی واضح ہو گیا کیونکہ جب ایمان و اسلام میں اتحاد ہے تو ایک چیز جب اسلام کا جز بنتی ہے تو لامحالہ وہ ایمان کا بھی جز ہوگی۔ وھو المقصود۔

٤٦ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ أَبِيهِ

[46] حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اہل نجد سے ایک شخص پراگندہ مو (بال) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

1 المعجم الأوسط للطبراني:1/460، حديث: 834، وفتح الباري:1/142.

أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللهِ يَقُولُ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ حَتَّى دَنَا فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ»، فَقَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: «لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ»، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَصِيَامُ رَمَضَانَ»، قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ؟ قَالَ: «لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ» قَالَ: وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ الزَّكَاةَ، قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: «لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ»، قَالَ: فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ: وَاللهِ لَا أَزِيدُ عَلَى هٰذَا وَلَا أَنْقُصُ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ». [انظر: ١٨٩١، ٢٦٧٨، ٦٩٥٦]

آیا۔ ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ سن رہے تھے مگر یہ نہ سمجھتے تھے کہ کیا کہتا ہے تا آنکہ وہ نزدیک آ پہنچا۔ تب معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دن رات میں پانچ نمازیں ہیں۔'' اس نے کہا: ان کے علاوہ (بھی) مجھ پر کوئی نماز فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تو اپنی خوشی سے پڑھے۔'' (پھر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور رمضان کے روزے رکھنا۔'' اس نے عرض کیا: اور تو کوئی روزہ مجھ پر فرض نہیں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تو اپنی خوشی سے رکھے۔'' حضرت طلحہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اس سے زکاۃ کا بھی ذکر کیا۔ اس نے کہا: مجھ پر اس کے علاوہ (کوئی اور صدقہ بھی) فرض ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تو اپنی خوشی سے دے۔'' حضرت طلحہ نے کہا: پھر وہ شخص یہ کہتا ہوا پیچھے ہٹا: اللہ کی قسم! میں اس سے زیادہ یا کم نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو کامیاب ہو گیا۔''

فوائد و مسائل: ① جن اعمال سے ایمان کی کمی بیشی کا تعلق ہے، وہ دو طرح کے ہیں: ○ بدنی ○ مالی۔ اب تک امام بخاری رحمہ اللہ نے بدنی اعمال کا ذکر فرمایا اور اب مالی اعمال کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے عنوان قائم کیا ہے ''زکاۃ، اسلام کا حصہ (رکن) ہے۔'' ترجمۃ الباب میں مذکور آیت کریمہ میں نماز کا بھی ذکر ہے لیکن امام بخاری نے صرف زکاۃ کے متعلق عنوان قائم کیا ہے کیونکہ آیت کے دوسرے اجزاء کے متعلق پہلے تراجم قائم کر چکے ہیں۔ جب آیت کریمہ سے زکاۃ، دین کا حصہ معلوم ہوئی تو اسلام اور ایمان کا حصہ خود بخود ثابت ہو گئی۔ ② اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو ایمان کی نشوونما کے لیے اعمال کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں جبکہ حدیث میں اخروی فلاح کا مدار اس بات کو بتایا گیا ہے کہ اس میں بیان کردہ اعمال و فرائض میں کمی نہ کی جائے۔[1] ③ اس روایت میں اقرار شہادتین کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی چند ایک وجوہات ہیں: ○ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم تھا کہ یہ مسلمان ہے اور دخول اسلام کے لیے اقرار شہادتین ضروری ہے۔ ○ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا ذکر کیا ہو لیکن شہرت کی بنا پر راوی نے اسے بیان نہ کیا ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے شرائع اسلام کے متعلق بتایا۔[2] ④ حدیث میں ہے کہ سائل پراگندہ بالوں کی صورت میں حاضر خدمت ہوا۔ اس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ طالب علم کی عادات و اطوار میں سادگی ہونی چاہیے۔ اسے بناؤ سنگھار میں وقت

---

① عمدة القاري:396/1. ② فتح الباري:143/1.

ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے اندر حصول علم کی ایک دھن ہو۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی اسے خبر نہ ہو۔ ⑤ دینی معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا، پھر اہل علم کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنا ایک پسندیدہ عادت ہے۔ ایک طالب علم کے لیے حصول علم کی خاطر اپنا شہر چھوڑنا باعث برکت ہے۔[1]

(٣٥) بَابٌ: اِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب: 35- جنازے کے ساتھ جانا ایمان کا حصہ ہے

٤٧ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُوفِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا رَوْحٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ وَمُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا وَّكَانَ مَعَهُ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَيُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيرَاطٍ مِّثْلُ أُحُدٍ، وَمَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطٍ». تَابَعَهُ عُثْمَانُ الْمُؤَذِّنُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَحْوَهُ. [انظر: ١٣٢٣، ١٣٢٥]

[47] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی ایماندار ہو کر حصول ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور نماز اور دفن سے فارغ ہونے تک اس کے ساتھ رہے تو وہ دو قیراط ثواب لے کر واپس آتا ہے۔ ہر قیراط اُحد پہاڑ کے برابر ہے۔ اور جو شخص جنازہ پڑھ کر دفن سے پہلے لوٹ آئے تو وہ ایک قیراط ثواب لے کر لوٹتا ہے۔''

عثمان المؤذن (راوی) نے عوف سے بیان کرنے میں رَوح (راوی) کی متابعت کی ہے، چنانچہ اس نے کہا: ہمیں عوف نے محمد سے، انھوں نے حضرت ابو ہریرہ سے، انھوں نے نبی ﷺ سے اسی کی طرح بیان کیا۔

فوائد و مسائل: ① عام طور پر آج کل ایک رسم کے طور پر جنازے میں شرکت کی جاتی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا عزیز یا دوست ہے۔ بعض اوقات سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے بھی جنازہ پڑھا جاتا ہے، ثواب تک نظر نہیں جاتی۔ شریعت نے احتساب کا لفظ بڑھا کر اس جانب توجہ دلائی ہے کہ اگر اس عمل خیر کے ساتھ یہ نیت کر لیں کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کا آخری حق ادا کر رہے ہیں اور مخلصانہ دعاؤں کے ساتھ اسے الوداع کر رہے ہیں تو اس سے اجر و ثواب میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ ② اس سے مقصود بھی مرجیہ کی تردید ہے جنھوں نے طاعات کو ایمان سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ حدیث میں تو جنازے میں شرکت کو داخل ایمان بتایا جا رہا ہے، پھر اجر میں کمی بیشی کا بھی ذکر ہے کہ اگر صرف نماز میں شرکت ہوگی تو ایک قیراط، دفن میں بھی شریک ہوں گے تو دو قیراط ملیں گے۔ ③ دنیا کے پیمانے کے لحاظ سے ایک قیراط بارہ درہم کا ہوتا ہے، البتہ آخرت میں اجر و ثواب کے لحاظ سے ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہے، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے۔[2] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی

---

[1] عمدة القاري:1/395. [2] صحيح البخاري، الجنائز، حديث:1325.

بیان کردہ روایت کی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تصدیق کی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمانے لگے کہ ہم نے تو بہت قیراط ضائع کر دیے۔[1] ④ جنازے کے متعلق تین چیزیں ہیں: میت کے ساتھ رہنا، نماز میں شرکت کرنا، دفن تک ساتھ رہنا۔ اگر صرف دفن میں شریک ہوا تو اسے اجر تو ملے گا لیکن اجر موعود (جس کا وعدہ کیا گیا ہے) سے محروم ہوگا، یعنی اسے دو قیراط نہیں ملیں گے۔ صرف نماز کی شرکت یا صرف دفن کی شرکت سے ایک قیراط ملتا ہے۔[2] آخر میں امام بخاری نے اس روایت کی متابعت بیان کی ہے، یعنی عثمان مؤذن نے رَوح کی موافقت کی ہے لیکن اس متابعت میں دو لحاظ سے فرق ہے: ○ روح کی روایت میں عوف راوی حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین سے نقل کرتا ہے جبکہ عثمان مؤذن کی روایت میں عوف صرف محمد بن سیرین سے بیان کرتا ہے۔ ○ روح کی روایت باللفظ ہے جبکہ عثمان مؤذن کی روایت بالمعنی ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے مثلہ کے بجائے نحوہ سے تعبیر کیا ہے۔

(٣٦) بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ

باب:36- مومن کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کے اعمال بے خبری میں ضائع نہ ہو جائیں

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّيْمِيُّ: مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي إِلَّا خَشِيتُ أَنْ أَكُونَ مُكَذَّبًا. وَقَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ: أَدْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ، مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ إِنَّهُ عَلَى إِيمَانِ جِبْرِيلَ وَمِيكَائِيلَ. وَيُذْكَرُ عَنِ الْحَسَنِ: مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ. وَمَا يُحْذَرُ مِنَ الْإِصْرَارِ عَلَى التَّقَاتُلِ وَالْعِصْيَانِ مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ لِقَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: ﴿وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [آل عمران: ١٣٥].

حضرت ابراہیم تیمی کہتے ہیں: جب بھی میں نے اپنے قول و فعل کا تقابل کیا تو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں میری تکذیب نہ کر دی جائے۔ اور ابن ابی ملیکہ نے کہا: میری ملاقات رسول اللہ ﷺ کے تیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ہوئی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے متعلق نفاق کا اندیشہ تھا۔ ان میں سے کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل و میکائیل جیسا ہے۔ حسن بصری سے منقول ہے کہ نفاق سے مومن کے علاوہ اور کوئی نہیں ڈرتا اور اس سے منافق کے علاوہ اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔ اس باب میں باہمی جنگ و جدال اور گناہوں پر اصرار، نیز توبہ نہ کرنے سے بھی ڈرایا گیا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مومن دانستہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔''

وضاحت: قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز کمال کو پہنچ جاتی ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ اس کمال کو زوال نہ آئے۔ اس مقام پر امام بخاری رحمہ اللہ تکمیلاتِ ایمان بیان کرنے کے بعد اس کے مضرات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرجیہ کی تردید بھی مقصود ہے جو

① صحيح البخاري، الجنائز، حديث:1324. 2 فتح الباري:146/1.

ایمان کے لیے کسی بھی عمل کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مقصد یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد مومن کو نڈر نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ وہ اپنے ایمان کے متعلق ہمہ وقت خائف رہے اور اس کی حفاظت کی تدبیر کرتا رہے اور ایمان کی حفاظت نیک اعمال سے ہوتی ہے جن کی مرجیہ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اعمال کے ضائع ہونے کے دو معنی ہیں: ○ نیک اعمال محو ہو جائیں اور کیا دھرا سوخت ہو جائے، کفر و ارتداد وغیرہ کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ ○ عمل میں کمزوری کی وجہ سے وہ ماند پڑ جائے یا اس کی تاثیر باقی نہ رہے، یعنی میزان حسنات میں اس کا کوئی وزن نہ ہو۔ اس مقام پر دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، لہٰذا مومن کو دونوں باتوں سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ مبادا شیطان غفلت میں کوئی ایسا کام کرا دے جو تمام اعمال کی بربادی یا ان کے بے وزن ہونے کا باعث ہو۔ اس عنوان کے دو حصے ہیں: ○ مومن کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں اس کے اعمال غیر دانستہ طور پر ضائع نہ ہو جائیں۔ ○ بغیر توبہ کے جنگ و جدال اور نافرمانی پر اصرار سے ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان کے ہر دو حصوں کی احادیث مبارکہ اور اقوال سلف کی روشنی میں وضاحت کی ہے۔

○ حضرت ابراہیم تیمی بڑے عابد، زاہد اور واعظ تھے۔ جب وعظ و نصیحت کرتے تو دیکھتے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں خود اس پر میرا عمل بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے قول و فعل میں تضاد ہو۔ انھیں ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا کہ میری تکذیب نہ کر دی جائے۔ لوگ میرا وعظ سن کر کہیں گے کہ جناب آپ کا عمل آپ کی باتوں کو جھٹلا رہا ہے۔ [مکذبا] کی ذال کو کسرہ سے پڑھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کہیں میں دین کی تکذیب کرنے والوں میں نہ ہو جاؤں، یعنی منافقین میں، جن کی زبان تو بہت تیز ہوتی ہے لیکن عملی میدان میں وہ صفر ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس تعلیق کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب التاریخ الکبیر اور امام احمد بن حنبل نے کتاب الزھد میں موصولاً بیان کیا ہے۔ ○ ابن ابی ملیکہ نے متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے جن میں حضرت عائشہ، حضرت اسماء، حضرت ام سلمہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عتبہ بن حارث اور حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ان میں سے کسی کو بھی اپنے ایمان کے متعلق مطمئن نہیں پایا بلکہ ہر شخص اپنے ایمان کے متعلق نفاق کا اندیشہ ظاہر کرتا تھا، حالانکہ ان کے کمال ایمان کی شہادت خود قرآن کریم اور متعدد احادیث میں موجود ہے۔ یہ ان حضرات کے تقویٰ کی انتہا ہے۔ ○ مرجیہ کا عقیدہ ہے کہ صدیقین، شہداء اور عام انسانوں کے ایمان میں کوئی فرق نہیں بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے فرمایا: میرا ایمان حضرت جبرئیل کے ایمان کی طرح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان کی تردید فرماتے ہیں کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسے بلند مرتبہ حضرات اس قسم کے دعاوی سے اجتناب کرتے تھے تو دوسرے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے ایمان کو حضرت جبرئیل کے ایمان جیسا قرار دیں کیونکہ حضرت جبرئیل کا ایمان یقینی ہے اور ان کا خاتمہ علی الایمان بھی یقینی۔ ان کے علاوہ کسی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ دنیا میں اپنے حسن خاتمہ کا ڈھنڈورا پیٹے۔ ○ امام حسن بصری کے قول کو امام احمد بن حنبل نے کتاب الایمان میں موصولاً بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مومن کو اپنے اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا ڈر رہتا ہے بلکہ ایمان ان دونوں کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔ مومن کی تو شان یہ ہے کہ اسے کبھی اپنے اعمال پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمہ وقت اسے نفاق سے خائف رہنا چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صیغۂ مجہول کا استعمال

امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً کمزوری کی علامت نہیں بلکہ بعض اوقات اختصار یا نقل بالمعنی میں صیغۂ مجہول استعمال کرتے ہیں۔[1] عنوان کے دوسرے حصے کے متعلق وضاحت بایں طور ہے کہ گناہوں پر اصرار سے بھی مومن کو ڈرنا چاہیے کیونکہ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ اس کے لیے بطور دلیل امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ آیت پیش کی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَافَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ ''جب ان (محسنین) سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کا ذکر اور اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں۔ درحقیقت اللہ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے اور وہ لوگ اپنے فعل ناروا پر دانستہ اصرار نہیں کرتے۔''[2] اس سے بھی مرجیہ کی تردید مقصود ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان کی موجودگی میں کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا اور نہ کوئی نیک عمل ہی اس میں برگ وبار پیدا کر سکتا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس گروہ کی واضح طور پر تردید کرتی ہے کیونکہ گناہوں سے استغفار اور ان پر عدم اصرار کی بنا پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو گناہوں پر اصرار کرے گا اور ان کی معافی طلب نہیں کرے گا وہ اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں ہے۔ وھو المقصود.

٤٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ زُبَيْدٍ قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ الْمُرْجِئَةِ، فَقَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ اللهِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ».

[انظر: ٦٠٤٤، ٧٠٧٦]

[48] زبید بن حارث سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت ابووائل سے مرجیہ کے متعلق دریافت کیا (کہ ان کا عقیدہ ہے کہ گناہ سے آدمی فاسق نہیں ہوتا) انھوں نے اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا تعلق عنوان کے دوسرے حصے سے ہے۔ اس میں مرجیہ کی تردید ہے جن کے ہاں اہل طاعت اور اہل معصیت کا کوئی فرق نہیں۔ ان کے نزدیک ایمان کے بعد نہ اطاعت کا کوئی فائدہ ہے اور نہ معصیت سے کوئی ضرر۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض معاصی انسان کو کفر تک پہنچا دیتے ہیں جبکہ کچھ گناہ انسان کو فاسق بنا دیتے ہیں۔ کفر اور فسق دونوں ہی ایمان کے لیے نقصان دہ ہیں۔ کفر تو ایمان ہی کی ضد ہے، اسی طرح فسق کا نقصان بھی ظاہر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ﴾ ''لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمھارے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کر دیا ہے اور کفر کو، گناہ کو اور نافرمانی کو تمھاری نگاہوں میں ناپسندیدہ بنا دیا ہے۔''[3] ② واضح رہے کہ اس کفر سے مراد کفر حقیقی نہیں ہے کہ اس کا مرتکب دین اسلام سے خارج ہو جائے جیسا کہ خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے بلکہ اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے۔ اس کی سنگینی کے پیش نظر اس پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ ہاں اگر اس جرم کو حلال سمجھتا ہو تو اس کا مرتکب کفر حقیقی کا حامل ہوگا۔[4] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ بھی ثابت

① فتح الباري:148/1. ② آل عمران 3:135. ③ الحجرات 49:7. ④ فتح الباري:150/1.

کیا ہے کہ آپس میں گالی گلوچ اور لعن طعن ایک مسلمان کے شایان شان نہیں، نیز ایک دوسرے کی ناحق گردنیں مارنے سے ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

٤٩ - أَخْبَرَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ: حَدَّثَنِي إِسْمَاعِيلُ ابْنُ جَعْفَرٍ عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ يُخْبِرُ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ: «إِنِّي خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ، وَإِنَّهُ تَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَّكُمْ، اِلْتَمِسُوهَا فِي السَّبْعِ وَالتِّسْعِ وَالْخَمْسِ». [انظر: ٢٠٢٣، ٦٠٤٩]

[49] حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ شب قدر بتانے کے لیے (اپنے حجرے سے) نکلے۔ اتنے میں دو مسلمان آپس میں جھگڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا: ''میں تو اس لیے باہر نکلا تھا کہ تمھیں شب قدر بتاؤں، مگر فلاں فلاں آدمی جھگڑ پڑے، اس لیے وہ (میرے دل سے) اٹھالی گئی اور شاید یہی تمھارے حق میں مفید ہو۔ اب تم شب قدر کو رمضان کی ستائیسویں، انتیسویں اور پچیسویں رات میں تلاش کرو۔''

فوائد ومسائل: ① اس حدیث کا تعلق عنوان کے پہلے حصے سے ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر عموماً آوازیں بلند ہو جاتی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں رفع صوت پر حبط اعمال کا خطرہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔[1] پہلے تو لڑائی جھگڑا خود ہی ایک مذموم فعل ہے۔ پھر اگر یہ فعل مسجد میں ہو تو اس کی شناعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ پھر یہ واقعہ خود مسجد نبوی میں پیش آیا جہاں ایک نماز پڑھنے سے ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے، مزید برآں وہاں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ یہ تمام چیزیں ایک برائی کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہیں۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر تو حبط اعمال کا خطرہ ہی خطرہ ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک سے اس کی تعیین کا علم محو کر دینے میں امت کے لیے یہ تنبیہ ہے کہ یہ بھی احباط ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا ہمیں حبط کے تمام اسباب سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ② اس حدیث کا عنوان کے دوسرے حصے سے بھی تعلق ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں باہمی جنگ و جدال پر اصرار سے اجتناب کا امر تھا۔ اس حدیث میں تقاتل (باہم لڑائی) کی خرابی اور اس کا انجام بتایا گیا ہے کہ اس خصومت کی نحوست سے شب قدر کی تعیین جیسی عظیم دولت سے ہمیں محروم کر دیا گیا اگرچہ اس میں یہ حکمت تھی کہ اس کی تلاش میں لوگ زیادہ عبادت کریں۔ عنوان کے آخری حصے سے اس حدیث کی مناسبت بایں طور بھی بیان کی گئی ہے کہ باہمی جنگ و جدال بسا اوقات گالی گلوچ تک پہنچا دیتا ہے جو فسق ہے جو رفتہ رفتہ ایمان کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ ③ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کی آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ایک رات ہے اور وہ ہر سال انھی تاریخوں میں آتی ہے۔ جو لوگ اس کو ستائیسویں رات کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں، ان کا خیال درست نہیں ہے۔

1. الحجرات 2:49.

(٣٧) بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنِ الْإِيمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ، وَعِلْمِ السَّاعَةِ

باب:37- حضرت جبریل کا نبی ﷺ سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے علم کے متعلق دریافت کرنا

وَبَيَانِ النَّبِيِّ ﷺ لَهُ، ثُمَّ قَالَ: «جَاءَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ» فَجَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهُ دِينًا، وَمَا بَيَّنَ النَّبِيُّ ﷺ لِوَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ٨٥].

پھر نبی ﷺ کا جبریل کے لیے ان امور کا بیان فرمانا۔ پھر آپ نے فرمایا: ”حضرت جبریل علیہ السلام تمھیں، تمھارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔“ اس مقام پر آپ نے ان تمام چیزوں کو دین شمار فرمایا ہے، نیز ان باتوں کے بیان میں جو رسول اللہ ﷺ نے وفد عبدالقیس کے سامنے بیان فرمائی تھیں اور ارشاد باری تعالیٰ: ”جو اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔“

وضاحت: اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے تین ذیلی عنوان قائم کیے ہیں: پہلا عنوان سوال جبریل سے متعلق ہے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق سوالات کیے اور آپ نے ان کے جوابات عنایت فرمائے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ حضرت جبریل تمھیں تمھارا دین سکھانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس سے آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ دین، ایمان و اسلام اور احسان سب پر مشتمل ہے۔ دوسرے عنوان میں ان چیزوں کا بیان ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے وفد عبدالقیس کے لیے ایمان کے سلسلے میں واضح فرمایا تھا۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ایمان کے اندر اعمال داخل ہیں کیونکہ اس وفد کو ایمان کے سلسلے میں اعمال ہی کی تعلیم دی گئی تھی۔ تیسرا عنوان آیت کریمہ سے شروع ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اصل دین، دین اسلام ہے، نیز دین اور اسلام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے وفد عبدالقیس کو ایمان کے متعلق جو چیزیں ارشاد فرمائیں، وہی اشیاء حضرت جبریل کو اسلام کے جواب میں ارشاد فرمائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام بھی ایک ہی چیز کی دو تعبیریں ہیں۔ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام، ایمان اور دین تینوں الفاظ معنی کے لحاظ سے متحد ہیں۔ اس اتحاد کے اثبات سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ان مختلف تعبیرات کو صحیح ثابت کرنا ہے جو آپ نے اعمال کو ایمان کا حصہ ثابت کرنے کے لیے سابقہ ابواب میں اختیار فرمائی تھیں جیسا کہ آپ نے بعض اعمال کے متعلق من الایمان، من الاسلام اور من الدین کا اسلوب اختیار کیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر ایمان اور اسلام کے الفاظ ایک ہی جگہ استعمال ہوں تو ان کا مدلول مختلف ہوگا اور دونوں کا استعمال الگ الگ ہو تو وہاں یہ ایک دوسرے کو لازم ہوں گے۔ امام صاحب کے نزدیک اسلام شرعی اور ایمان شرعی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کا لغوی مفہوم کیا ہے۔

٥٠ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ

[50] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبئ اکرم

إِبْرَاهِيمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو حَيَّانَ التَّيْمِيُّ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ بَارِزًا يَوْمًا لِّلنَّاسِ فَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: مَا الْإِيمَانُ؟ قَالَ: «اَلْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَبِلِقَائِهِ، وَرُسُلِهِ، وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ». قَالَ: مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ: «اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللهَ وَلَاتُشْرِكَ بِهِ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ». قَالَ: مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ». قَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ: «مَا الْمَسْؤُولُ [عَنْهَا] بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، وَسَأُخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا: إِذَا وَلَدَتِ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَإِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْإِبِلِ الْبُهْمُ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللهُ»، ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ ﴿إِنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥ عِلْمُ ٱلسَّاعَةِ﴾ [اَلْآيَةَ] [لقمان: ٣٤]. ثُمَّ أَدْبَرَ فَقَالَ: «رُدُّوهُ»، فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا، فَقَالَ: «هٰذَا جِبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ». قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: جَعَلَ ذٰلِكَ كُلَّهُ مِنَ الْإِيمَانِ. [انظر: ٤٧٧٧]

ﷺ لوگوں کے سامنے تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھنے لگا: ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اور روز حشر اللہ کے حضور پیش ہونے پر، اور اللہ کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور قیامت کا یقین کرو۔'' اس نے مزید سوال کیا: اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم محض اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ نماز ٹھیک طور پر ادا کرو اور فرض زکاۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔'' پھر اس نے پوچھا: احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔'' اس نے کہا: قیامت کب برپا ہوگی؟ آپ نے فرمایا: ''جس سے سوال کیا گیا ہے وہ بھی سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، البتہ میں تمھیں قیامت برپا ہونے کی کچھ نشانیاں بتائے دیتا ہوں: جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی اور جب اونٹوں کے غیر معروف سیاہ فام چرواہے فلک بوس عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں گے (تو قیامت قریب ہوگی)۔ دراصل قیامت ان پانچ باتوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''بے شک اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے......'' اس کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا، تو آپ نے فرمایا: ''اسے میرے پاس لاؤ۔'' چنانچہ لوگوں نے اسے تلاش کیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا تو آپ نے فرمایا: ''یہ جبریل تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔''

ابو عبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ان تمام چیزوں کو ایمان قرار دیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① کسی چیز کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنا ہو تو ما کے ذریعے سے سوال کیا جاتا ہے، حدیث میں حقیقت ایمان کے متعلق سوال کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے چند ایک ایسی چیزوں کی تصدیق کے متعلق، جن کا تعلق مغیبات سے ہے اور انھیں اصول ایمان کہا جاتا ہے، بیان فرمایا۔ اس حدیث میں پانچ چیزیں بیان ہوئی ہیں: اللہ پر ایمان، قیامت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، تقدیر پر ایمان۔ بعض روایات میں چھٹی چیز کتابوں پر ایمان کا بھی ذکر ہے۔[1] ان تمام اصول ایمان پر مکمل بحث ہم نے اپنی تالیف ''مسئلہ ایمان و کفر'' میں کی ہے۔ ② ارکان اسلام پانچ ہیں: ○ ادائے شہادتین (توحید و رسالت کی گواہی) ○ اقامت صلاۃ ○ ایتائے زکاۃ ○ صوم رمضان ○ حج بیت اللہ۔ اس روایت میں اگرچہ حج کا ذکر نہیں ہے، تاہم دیگر روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔[2] یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا کیونکہ روایات میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے آخری ایام میں حاضر ہوئے تھے۔[3] ③ احسان کے معنی، عمل میں نکھار اور خوبصورتی ہیں۔ عمل میں نکھار اس وقت آتا ہے جب وہ ظاہر و باطن میں پوری طرح درست ہو۔ ظاہر میں عمل کے تمام آداب و شرائط داخل ہیں جبکہ باطن میں اخلاص نیت اور خشوع و خضوع شامل ہے۔ احسان کی تعریف میں اخلاص کے دو درجے بیان ہوئے ہیں: ○ مشاهده: یہ اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت بایں طور کی جائے گویا باری تعالیٰ نگاہوں کے سامنے ہے، یعنی قلب و نظر اس طرف لگ جائیں۔ ○ مراقبہ: عبادت گزار عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ اگر میں اللہ کو نہیں دیکھ سکتا تو اللہ تعالیٰ مجھے ہر آن دیکھ رہا ہے، جس عابد کو یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی پورے اخلاص کے ساتھ اپنا اپنا کام کرتا ہے۔[4] ④ بعض غالی قسم کے صوفیاء نے اپنے مذاق کے مطابق اس مقام پر ایک عجیب تاویل کی ہے کہ [فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ] میں كَانَ تامہ ہے، معنی یہ ہیں کہ اگر تم اپنی ہستی فنا کر دو اور ''لم تکن'' بن جاؤ تو اللہ کو دیکھ سکتے ہو۔ یہ تاویل عقل و نقل کے لحاظ سے باطل بلکہ قواعد عربی سے نابلد ہونے کی علامت ہے کیونکہ اس صورت میں تراہ کا الف جواب شرط ہونے کی بنا پر حذف ہونا چاہیے تھا جبکہ حدیث کے تمام طرق میں الف موجود ہے، پھر حدیث میں صراحت ہے کہ مرنے سے پہلے پہلے تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔[5] اس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء کے ہاں مقام مَحْو و فنا خود ساختہ ہے۔[6] ⑤ امام نووی رحمہ اللہ نے ان دونوں کو ایک ہی درجہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک دوسرے جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو پھر بھی احسان پر قائم رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔ گویا دوسرا جملہ پہلے جملے کی علت ہے، یعنی دارومدار تمھارے دیکھنے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیکھنے پر ہے۔ وہ تو بہر حال دیکھ ہی رہا ہے تم دیکھو یا نہ دیکھو، لہٰذا عبادت کو ہمیشہ اچھے طریقے سے کرنا چاہیے۔ (شرح نووی) ⑥ ''لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی۔'' شارحین نے اس کے کئی ایک مطالب بیان کیے ہیں: ○ والدین کی نافرمانی عام ہو جائے گی۔ اولاد والدین کو ذلیل اور خوار کر کے، ان سے اس طرح کام لے گی جس طرح خاوند اپنی بیوی سے لیتا ہے بالخصوص بیٹی جو ماں سے بہت محبت کرتی ہے وہ بھی نافرمانی پر اتر آئے گی۔ آج اس کا اکثر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ○ باندیوں کے بچے برسر اقتدار آ جائیں گے، جن کے اخلاق و عادات اور اطوار فطری طور پر خراب ہوتے ہیں، یعنی اقتدار پر ایسے لوگ قابض ہو جائیں گے جو اس کے اہل نہیں

---

[1] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:93(8). [2] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:93(8). [3] کتاب الإیمان لابن منده:144/1 (طبع دار الفضیلة)، وفتح الباري:159/1. [4] فتح الباري:159/1. [5] صحیح مسلم، الفتن، حدیث:7356(2931). [6] فتح الباري:160/1.

ہوں گے بلکہ نالائق، درشت مزاج اور انصاف کے تقاضوں سے ناآشنا ہوں گے۔ ○ فتوحات زیادہ ہوں گی جس کے نتیجے میں لونڈیاں زیادہ آئیں گی اور وہ ام ولد بنیں گی، ام ولد بننا گویا اپنے آقا کو جنم دینا ہے۔ اس تفسیر پر یہ علامت بالکل ابتدائی نشانی ہوئی کیونکہ فتوحات کی کثرت تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہو چکی ہے۔ ○ قرب قیامت کے وقت جہالت عام ہوگی جس کی بنا پر ہر طرف بے عملی اور بے راہ روی کا دور دورہ ہوگا، معاملہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ ام ولد جس کی خرید و فروخت ناجائز ہے، کھلے عام فروخت ہوگی اور وہ فروخت ہوتے ہوتے ایسے آقا کے پاس پہنچ جائے گی جس کو اس نے جنم دیا ہوگا اور وہ لاشعوری طور پر اس کا مالک بن جائے گا۔[1] ⑦ اس حدیث میں قیامت کی ایک علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جب سیاہ فام سیاہ اونٹوں کے چرواہے عمارتوں پر فخر کرنے لگیں یا دست درازی کریں تو اس وقت قیامت قریب آ لگے گی۔ اونٹوں کے چرواہے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اونٹوں کے پاس رہنے سے انسان میں سنگدلی اور بدمزاجی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ درشت خو اور کینہ پرور لوگ ہوں گے، انھیں تہذیب و تمدن اور باہمی رواداری سے کوئی سروکار نہیں ہوگا، ایسے لوگ جب عمارتوں پر فخر کریں یا شہر کی عمارتوں پر دست درازی کریں، یعنی انھیں مسمار کر کے نئی عمارتیں کھڑی کریں تو سمجھ لینا کہ اس عالم کی بساط الٹ دی جانے والی ہے۔ ⑧ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے قریب حکومتی معاملات غیر مہذب، گنوار اور نالائق لوگوں کے سپرد ہو جائیں گے۔[2] ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب عنانِ اقتدار نالائق اور رذیل لوگ سنبھال لیں گے جن میں علمی، عملی، اخلاقی اور سیاسی شعور نہ ہوگا تو قیامت کے آنے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔[3] اس علامت کا تو آج مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ آج کل اقتدار پر کس قسم کے لوگ قابض ہیں۔[4] ⑨ پانچ چیزوں کے متعلق اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، یعنی قیامت کا آنا، بارش کا آنا، رحم مادر میں کیا ہے، کل کیا ہوگا اور کہاں موت آئے گی؟ انھیں مفاتیح الغیب قرار دیا گیا ہے، یعنی علم غیب تو درکنار علم غیب کی کنجیاں بھی کسی کو معلوم نہیں جن کے ذریعے سے علوم تک پہنچا جا سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے متعلق علم غیب کا دعویٰ کرتے ہیں وہ کس قدر ضلالت اور گمراہی میں ہیں۔ ہاں بذریعۂ وحی نبی ﷺ کسی چیز کی خبر دے دیں تو یہ نبی کا منصب ہے۔ اسے غیب کا علم جاننا نہیں کہا جا سکتا۔ ⑩ آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایمان، اسلام، احسان اور علاماتِ قیامت کو رسول اللہ ﷺ نے دین سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کا نام ایمان کامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بسیط نہیں بلکہ مرکب ہے اور اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(٣٨) بَابٌ :

باب: 38- بلاعنوان

٥١ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ حَمْزَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ،

[51] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: مجھے ابوسفیان نے بتایا کہ ہرقل نے ان سے یہ کہا: میں نے تم سے دریافت کیا

[1] فتح الباري:1/ 162. [2] صحيح البخاري، كتاب التفسير، حديث: 4777. [3] صحيح البخاري، العلم، حديث: 59. [4] فتح الباري: 1/164.

عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُوسُفْيَانَ: أَنَّ هِرَقْلَ قَالَ: سَأَلْتُكَ: هَلْ يَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ، فَزَعَمْتَ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ، وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ حَتّٰى يَتِمَّ، وَسَأَلْتُكَ: هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخْطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ، فَزَعَمْتَ أَنْ لَّا، وَكَذٰلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُهُ الْقُلُوبَ لَايَسْخَطُهُ أَحَدٌ. [راجع: ٧]

تھا کہ اس کے پیروکار ترقی پذیر ہیں یا روبہ انحطاط؟ تو تم نے بتایا کہ وہ دن بدن زیادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یقیناً ایمان کا معاملہ اسی طرح ہوتا ہے، تاآنکہ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا: اس کے متبعین میں سے کوئی دین میں داخل ہونے کے بعد اسے برا سمجھتے ہوئے مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ تو تم نے جواب دیا: نہیں۔ اور ایمان کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب اس کی بشاشت دلوں میں سرایت کر جاتی ہے، تو پھر کوئی شخص اس سے ناراض نہیں ہوتا۔

فوائد ومسائل: ① یہ باب بلاعنوان ہے۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کے بالعموم تین مقاصد ہوتے ہیں: ○ اس کا پہلے باب سے تعلق ہو، اور یہاں تعلق اس طرح ہے کہ پہلے باب میں دین، اسلام اور ایمان کے اتحاد پر حضرت جبرئیل کی شہادت پیش کی گئی اور اس باب میں اہل کتاب کے زبردست عالم اور رومی سلطنت کے فرمانروا ہرقل کی گواہی کو نقل کیا ہے کیونکہ اس کا دوسرا سوال یہ تھا کہ اس دین سے ناراض ہو کر کوئی مرتد تو نہیں ہوتا۔ پھر ایمان کی شان بیان کی ہے، یعنی اس نے دین کو ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ ○ اس سے قارئین کرام کو آمادہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ از خود اس حدیث پر کوئی عنوان قائم کریں، چنانچہ پہلے باب میں تھا کہ مومن کو کسی وقت بھی اپنے اعمال سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں اس کی تلافی کر دی ہے کہ جس کے دل میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے اسے کوئی طاقت دین سے بے زار نہیں کر سکتی۔ گویا یوں باب قائم کیا جا سکتا ہے: باب من يهده الله فلا مضل له. وغیرہ۔ ○ تکثیر فوائد بھی ترک عنوان کا باعث ہو سکتا ہے، یعنی امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک مختلف فوائد وعنوانات قائم کیے جا سکتے ہوں، اس لیے کوئی ایک عنوان قائم کر کے اسے مقید نہیں کیا گیا۔ ② حدیث کی تقطیع کرنے کے متعلق محدثین کا اختلاف ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ اگر تقطیع (حدیث کا کوئی ایک ٹکڑا بیان) کرنے سے معنی سمجھ میں آتے ہوں اور اس میں کوئی خرابی واقع نہ ہوتی ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقام پر کیا ہے کیونکہ حدیث ہرقل بہت لمبی ہے اس کا ایک ٹکڑا یہاں بیان کیا ہے۔[1]

(٣٩) بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ

باب: 39- اپنے دین کی خاطر گناہوں سے الگ ہو جانے والے کی فضیلت

٥٢ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ

[52] حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں

[1] شرح الكرماني: 202/1.

عَامِرٍ، قَالَ: سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ، اِسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَّقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَّرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى، يُوشِكُ أَنْ يُّوَاقِعَهُ، أَلَا وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلَا إِنَّ حِمَى اللهِ مَحَارِمُهُ، أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ». [انظر: ۲۰۵۱]

نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''حلال ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنھیں اکثر لوگ نہیں جانتے، چنانچہ جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لیا اور جو کوئی ان مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہو گیا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو شاہی چراگاہ کے آس پاس (اپنے جانوروں کو) چرائے، قریب ہے کہ چراگاہ کے اندر اس کا جانور گھس جائے۔ آگاہ رہو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے۔ خبردار! اللہ کی چراگاہ اس کی زمین میں حرام کردہ چیزیں ہیں۔ سن لو! بدن میں ایک ٹکڑا (گوشت کا) ہے، جب وہ سنور جاتا ہے تو سارا بدن سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ آگاہ رہو! وہ ٹکڑا دل ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس سے پہلے ابواب میں معاصی پر اصرار اور حبط اعمال سے ڈرایا گیا ہے۔ اب امام بخاری رحمہ اللہ ایک ایسے طریقے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جس کے اختیار کرنے سے انسان حبط اعمال سے محفوظ رہ سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اپنے دین کی حفاظت کے لیے تقویٰ اختیار کرنا اور مشتبہات سے اجتناب کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ اور ورع بھی ایمان کا حصہ ہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ دشوار ہوتا ہے۔ یہ مشتبہات میں داخل ہیں۔ ان سے اجتناب کرنے میں دین اور آبرو کی حفاظت ہے۔ اہل تقویٰ مشتبہات کو محرمات کا زینہ خیال کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مشتبہ چیزوں سے مراد وہ پیچیدہ معاملات ہیں کہ ان پر یقینی طور پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اگرچہ اہل علم کسی حد تک ان سے باخبر ہوتے ہیں، تاہم یہ شکوک و شبہات سے خالی نہیں ہوتے۔ ② علماء کا اتفاق ہے کہ اسلام کا دارومدار تین احادیث پر ہے: ایک مذکورہ حدیث، دوسری نیت سے متعلقہ اور تیسری وہ جس میں ہے کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کاموں اور فضول باتوں سے پرہیز کرے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ نے ایک چوتھی حدیث کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک اپنے بھائی کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ حدیث میں خورونوش، لباس و نکاح کے حلال ہونے کی وضاحت ہے، پھر اسے مشتبہات سے الگ رہنے کے متعلق کہا گیا ہے کیونکہ اس سے اس کا دین اور آبرو محفوظ رہتی ہے، پھر اسے ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے۔[1] عرب کے ہاں یہ دستور تھا کہ وہ بڑے بڑے زرخیز خطے اپنے جانوروں کے لیے مخصوص کر لیتے تھے۔ انھی خطوں کو حمیٰ کہا جاتا تھا۔ سرکاری حمیٰ محرمات ہیں اور ان کا ماحول (اردگرد) مشتبہات ہیں

1. شرح الكرماني: 203/1.

جو بہت پر فریب ہوتی ہیں۔ حدیث میں اس کو بطور مثال بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان نے اپنے نفس کو مشتبہات کے لیے آزاد چھوڑ دیا تو وہ یقیناً محرمات میں جا سکتا ہے۔ ان سے بچنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں اتنی گنجائش رکھ دی ہے کہ محرمات کی طرف آنے کی ضرورت نہیں۔ اب اتنی چیزوں کی حلت کے باوجود کوئی ان کی طرف جاتا ہے تو خباثتِ نفس انتہا ہے۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باطنی صلاح وفساد کا دارومدار انسان کے دل پر ہے۔ جس شخص کے دل میں بگاڑ ہوگا اس کے دیگر اعضاء سے صادر ہونے والے اعمال بھی اس کے آئینہ دار ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان کا تعلق ہے اور یہی محل نیت ہے۔ حلال وحرام اور مشتبہات میں فیصلے کے لیے بھی دل ہی رہنمائی کرتا ہے، لہٰذا اسے درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر دل درست ہے تو اس سے پیچیدہ معاملات میں فتویٰ لینے کی تلقین کی گئی ہے۔ طبی لحاظ سے بھی اعضاء کی صحت وسقم کا مدار دل پر ہے۔ اگر اس میں بگاڑ آ جائے تو پورا نظام جسم بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ④ صلاح قلب کی صورت یہ ہے کہ اس میں مندرجہ ذیل چیزیں پیدا ہو جائیں: اللہ کی محبت، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، صبر وشکر، رجا وخوف، فکر آخرت، توبہ وانابت اور قناعت و تواضع۔ فساد قلب کی صورت یہ ہے کہ اس میں درج ذیل اشیاء آ جائیں: تکبر وغرور، خود پسندی، حسد وحقد، حب مال وجاہ، بخل و حرص، طول امل (لمبی امیدیں) اور لایعنی گفتگو۔ ⑤ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ورع و پرہیز گاری بھی ایمان کو کامل کرنے والے اعمال میں سے ہے اور اس میں مراتب ہیں، لہٰذا ایمان ودین میں بھی مراتب ہیں، ایمان کے لیے ان کا بجالانا اس کے ثمر آور ہونے کا باعث ہے اور ان کا ترک کر دینا ایمان کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

٤٠ - بَابٌ: أَدَاءُ الْخُمُسِ مِنَ الْإِيمَانِ

باب:40- خمس کا ادا کرنا جزو ایمان ہے

٥٣ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي جَمْرَةَ قَالَ: كُنْتُ أَقْعُدُ مَعَ ابْنِ عَبَّاسٍ يُجْلِسُنِي عَلٰى سَرِيرِهِ فَقَالَ: أَقِمْ عِنْدِي حَتّٰى أَجْعَلَ لَكَ سَهْمًا مِّنْ مَّالِي، فَأَقَمْتُ مَعَهُ شَهْرَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا أَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنِ الْقَوْمُ أَوْ مَنِ الْوَفْدُ؟» قَالُوا: رَبِيعَةُ، قَالَ: «مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ، أَوْ بِالْوَفْدِ، غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى»، فَقَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّا لَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَّأْتِيَكَ إِلَّا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ، فَمُرْنَا بِأَمْرٍ فَصْلٍ نُّخْبِرْ بِهِ مَنْ وَّرَآءَنَا وَنَدْخُلْ بِهِ

[53] حضرت ابو جمرہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا کرتا تھا۔ وہ مجھے خاص اپنے تخت پر بٹھاتے۔ ایک دفعہ کہنے لگے: تم میرے پاس کچھ روز اقامت کرو، میں تمھارے لیے اپنے مال میں سے کچھ حصہ مقرر کر دوں گا۔ تو میں ان کے ہاں دو ماہ تک اقامت پذیر رہا۔ پھر انھوں نے فرمایا: جب وفد عبدالقیس نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ کون لوگ ہیں یا کون سے نمائندے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ہم خاندان ربیعہ کے لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تم آرام کی جگہ آئے ہو، نہ ذلیل ہو گے اور نہ شرمندہ!'' پھر ان لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم ماہ حرام کے علاوہ دوسرے دنوں

الْجَنَّةَ، وَسَأَلُوهُ عَنِ الْأَشْرِبَةِ. فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللهِ وَحْدَهُ، قَالَ: «أَتَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللهِ وَحْدَهُ؟» قَالُوا: اَللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ، وَصِيَامُ رَمَضَانَ، وَأَنْ تُعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ»، وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ: عَنِ الْحَنْتَمِ وَالدُّبَّاءِ وَالنَّقِيرِ وَالْمُزَفَّتِ، - وَرُبَّمَا قَالَ: الْمُقَيَّرِ - وَقَالَ: «اِحْفَظُوهُنَّ وَأَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَّرَاءَكُمْ».

[انظر: ٨٧، ٥٢٣، ١٣٩٨، ٣٠٩٥، ٣٥١٠، ٤٣٦٨، ٤٣٦٩، ٦١٧٦، ٧٢٦٦، ٧٥٥٦]

میں آپ کے پاس نہیں آ سکتے کیونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا قبیلہ رہتا ہے، لہٰذا آپ خلاصے کے طور پر ہمیں کوئی ایسی بات بتا دیں کہ ہم اپنے پیچھے والوں کو اس کی اطلاع کر دیں اور ہم سب اس (پر عمل کرنے) سے جنت میں داخل ہو جائیں۔ اور انھوں نے آپ سے مشروبات کے متعلق بھی پوچھا تو آپ نے انھیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع کیا: آپ نے انھیں ایک اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''تم جانتے ہو، اکیلے اللہ پر ایمان لانا کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا اور کوئی لائق عبادت نہیں اور حضرت محمد ﷺ اس کے رسول ہیں، نماز ٹھیک طریقے سے ادا کرنا، زکاۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت سے پانچواں حصہ ادا کرنا۔'' اور (شراب سازی کے) چار برتنوں، یعنی بڑے مٹکوں، کدو سے تیار کردہ پیالوں، لکڑی سے تراشے ہوئے لگن اور تارکول سے رنگے ہوئے روغنی برتنوں سے انھیں منع کیا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''ان باتوں کو یاد رکھو اور اپنے پیچھے والوں کو ان سے مطلع کر دو۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ جو اشیاء اجزائے ایمان ہیں، ان کے لیے ضروری نہیں کہ ان کا تعلق ایمان کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو کیونکہ ادائے خمس ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق مستقل نہیں بلکہ جب مال غنیمت ہوگا تو اس سے خمس ادا کرنے کی ضرورت پڑے گی، نیز حدیث وفد عبدالقیس میں ایمان کے متعلق جو اجزاء بیان ہوئے ہیں ان پر امام بخاری جستہ جستہ عنوان قائم کر چکے ہیں، صرف ادائے خمس باقی تھا جس پر اب عنوان قائم کیا ہے۔ ② اس حدیث میں کچھ مامورات ہیں اور کچھ منہیات ہیں۔ مامورات کے متعلق اجمالاً چار چیزوں کا حکم ہے لیکن شمار کرنے میں پانچ ہیں، یعنی شہادت، نماز، زکاۃ، روزہ اور ادائے خمس۔ دراصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چار چیزوں کا حکم دیا اور چار ہی سے منع فرمایا اور ان دونوں کے دو دو درجے قائم کیے، ایک اجمال کا دوسرا تفصیل کا۔ امر کے سلسلے میں اجمال کا درجہ شہادت ہے جس کی تفصیل میں چار امر ذکر کیے گئے اور نہی کے سلسلے میں اجمال یہ ہے کہ آپ نے مسکرات سے منع فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل میں ان چار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا جن میں شراب کشید کی جاتی تھی یا ان میں اسے محفوظ کیا جاتا تھا۔ ③ حدیث جبرئیل میں جو چیزیں اسلام کے متعلق بیان

فرمائیں وہی چیزیں حدیث عبدالقیس میں ایمان کے متعلق ذکر کیں جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں اسلام اور ایمان ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ سب چیزیں داخل ایمان ہیں، ان کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ مال غنیمت سے خمس ادا کرنا بھی جزو ایمان ہے۔ اس سے مرجیہ کی تردید ہوتی ہے جو ایمان وتصدیق کے بعد اعمال کو کوئی حیثیت نہیں دیتے۔ ④ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو جمرہ کو اپنے ہاں قیام کرنے کی پیش کش فرمائی، پھر انھیں وظیفہ دینے کا وعدہ فرمایا، اس اعزاز واکرام کی چند ایک وجوہات تھیں: ○ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بصرے کے گورنر تھے اور ان کے پاس ہر قسم کے مقدمات آتے تھے۔ انھیں اس سلسلے میں فارسی زبان میں سماعت کی بھی ضرورت رہتی تھی۔ حضرت ابو جمرہ فارسی جانتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان سے ترجمان کا کام لینا چاہتے تھے۔ ○ خود ابو جمرہ بیان کرتے ہیں کہ اس شفقت ومہربانی کی وجہ ایک خواب تھا، فرماتے ہیں کہ میں نے حج تمتع کا احرام باندھا، لوگوں نے اعتراض کیا تو میں نے اس کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فتویٰ دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ درست ہے، پھر میں نے خواب میں یہ آواز سنی کہ حج مبرور اور عمرۂ مقبول۔ میں نے اس کا تذکرہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کیا تو آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس بنا پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے ہاں اقامت اور وظیفے کی پیش کش فرمائی۔ [1] ⑤ قبیلہ عبدالقیس بحرین میں آباد تھا، وہاں منقذ بن حبان کے ذریعے سے اسلام پہنچا جو بحرین سے مدینہ منورہ بغرض تجارت کپڑا لائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے، بحرین اور اہل بحرین کے حالات دریافت کیے، آپ نے اسلام پیش کیا، وہ مسلمان ہوگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ فاتحہ اور اقرأ باسم ربك الذي خلق سیکھیں اور آپ نے قبیلۂ عبدالقیس کے نام ایک خط بھی دیا، گھر واپس پہنچے، چند دن ایمان کو چھپائے رکھا، نماز کا وقت ہوتا تو گھر میں پڑھ لیتے، ان کی بیوی نے اپنے باپ منذر بن عائذ الاشج سے ان کا ذکر کیا، جب سسر نے اپنے داماد سے حقیقت حال دریافت کی تو پوری داستان سنا دی۔ یہ بھی مسلمان ہوگئے، پھر ان کی تبلیغ سے ایک جماعت نے اسلام قبول کرلیا اور 6 ہجری میں بارہ حضرات کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، پھر 8 ہجری میں چالیس افراد پر مشتمل دوسرا وفد حاضر ہوا جن کا واقعہ متعلقہ حدیث میں مذکور ہے۔ [2] مسجد نبوی میں اقامت جمعہ کے بعد پہلا جمعہ جواثی نامی گاؤں میں شروع کیا گیا جو بحرین میں واقع تھا اور یہ مسجد عبدالقیس ہی میں شروع ہوا تھا۔ [3] ⑥ حرمت والے مہینوں سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ کفار ان کی بے حد تعظیم کرتے تھے اور ان مہینوں میں کسی دوسرے پر دست درازی کرنے سے باز رہتے تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنے والے مہمان کو خوش آمدید کہنا اور خندہ پیشانی سے ملنا اسلامی ادب ہے، نیز ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایمان وعلم کی باتوں کو اپنے سینے میں محفوظ کرکے اسے دوسروں تک پہنچائے۔ [4] ⑦ جن برتنوں میں شراب سازی منع تھی وہ یہ ہیں: حنتم: سبز مٹکا۔ دُبا: کدو کو اندر سے صاف کرکے پیالہ سا بنا لیا جاتا تھا۔ نقیر: لکڑی کے کھودے ہوئے لگن۔ مزفت: تارکول سے روغن کیے ہوئے برتن۔ یہ امتناعی حکم پہلے پہلے تھا بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ فرمان نبوی ہے: ''میں نے تمھیں مخصوص برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع کیا تھا۔ اب تم ہر برتن میں نبیذ بنا سکتے ہو، لیکن نشہ آور سے اجتناب کرنا ہے۔'' [5]

---

① صحيح البخاري، الحج، حديث:1567. ② فتح الباري:173/1. ③ صحيح البخاري، الجمعة، حديث:892. ④ صحيح البخاري، العلم، حديث:87. ⑤ صحيح مسلم، الأشربة، حديث:5207 (977 بعد 1999)

(٤١) بَابُ مَا جَاءَ: أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

باب:41- اعمال کا مدار نیت اور احتساب پر ہے

وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَدَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ، وَالْوُضُوءُ، وَالصَّلَاةُ، وَالزَّكَاةُ، وَالْحَجُّ، وَالصَّوْمُ، وَالْأَحْكَامُ، وَقَالَ اللهُ تَعَالٰى: ﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ﴾ [الإسراء: ٨٤] عَلٰى نِيَّتِهِ، وَنَفَقَةُ الرَّجُلِ عَلٰى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا، صَدَقَةٌ، وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ».

اور ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ اس میں ایمان، وضو، نماز، زکاۃ، حج، روزہ اور دوسرے احکام بھی شامل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہہ دیجیے: ہر شخص اپنی نیت کے مطابق عمل پیرا ہے۔'' شاکلہ کے معنی نیت ہیں۔ اور انسان کا اپنے اہل وعیال پر بہ نیت ثواب خرچ کرنا صدقہ ہے۔ اور نبی ﷺ نے فرمایا: ''لیکن جہاد اور نیت باقی ہیں۔''

وضاحت: بعض مرجیہ کا موقف ہے کہ زبانی اقرار، ایمان کی ایک شکل ہے اور اخروی نجات کے لیے کافی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نیت کے بغیر کوئی عمل ثمر آور نہیں۔ زبانی اقرار اگرچہ ایک عمل ہے لیکن نیت کے بغیر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس عنوان کے تین حصے ہیں: * نیت اعمال کے لیے ضروری ہے۔ *احتساب کے ساتھ نیت کرنا ثواب میں اضافے کا موجب ہے۔ * ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ نتیجے کے طور پر امام بخاری نے فرمایا کہ نیت کے بغیر جب کوئی عمل معتبر نہیں ہوتا تو ایمان، وضو، نماز، زکاۃ وغیرہ میں بھی نیت ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ایمان بھی ایک عمل ہے، اس کے لیے بھی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اب ان دعاوی کے ثبوت کے لیے ایک قرآن کی آیت اور دو اطراف حدیث پیش کی ہیں، پھر تین احادیث ذکر کی ہیں۔

[﴿قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهِ﴾ [علی نيته ......] ہر شخص کا عمل اس کی نیت کے مطابق ہوتا ہے۔ معاملات میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اچھی نیت سے کام کرتا ہے تو ثواب اور اگر بری نیت سے کرتا ہے تو عتاب۔ بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ جنھیں اپنے طبعی تقاضوں کی وجہ سے سرانجام دیا جاتا ہے، پس ان میں ثواب وعتاب کا کوئی تصور شامل نہیں ہوتا۔ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا انسان کی ذمے داری ہے لیکن اگر ثواب کی نیت کر لی جائے تو اس میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اگر نیت اچھی ہے تو خود اپنے آپ پر خرچ کر کے بھی ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔* جہاد اور نیت کے باقی رہنے کی بات رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد ارشاد فرمائی، یعنی اس فتح کے بعد ہجرت ختم ہو چکی ہے لیکن ثواب حاصل کرنے والوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ جہاد اور نیت قیامت تک رہنے والی چیزیں ہیں، اس راستے سے ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

٥٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَقَّاصٍ، عَنْ عُمَرَ: أَنَّ

[54] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ ہر انسان کو وہی ملے گا جو اس نے نیت کی۔ اگر کوئی اپنا وطن اللہ اور اس کے رسول

رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ». [راجع: ١]

کے لیے چھوڑتا ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی۔ اگر کسی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لیے ہو، تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی ہے۔“

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو نیت کی اہمیت اور اس کے مسائل واحکام بتانے کے لیے یہاں لائے ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان بھی عمل کی ایک صورت ہے، لہٰذا اس کے لیے بھی نیت کی ضرورت ہے بصورت دیگر اگر ایمان، تصدیق کے معنی میں ہو تو اس کے لیے نیت کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ دل کا فعل ہے، جیسے خشیت وانابت اور خوف ورجا کے لیے نیت نہیں ہوتی، یہ تو اللہ ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ نیت اس لیے ہوتی ہے کہ اعمال میں امتیاز ہو جائے کہ یہ عمل اللہ کے لیے ہے۔ یا مراتب اعمال کی تمیز کے لیے نیت کام آتی ہے کہ یہ فرض ہے اور یہ مستحب ہے۔ یا نیت اس لیے ہوتی ہے کہ عبادت، عادت سے ممتاز ہو جائے، مثلاً: ایک آدمی کسی طبیب کے کہنے سے صبح سے شام تک کھانا پینا بند کر دیتا ہے، یہ روزہ نہیں ہوگا، وغیرہ۔[1] ② نیت اور ارادے کے لحاظ سے احکام شریعت کی چار اقسام ہیں: ○ عمل شریعت کے مطابق اور نیت بھی شریعت کے موافق ہو، مثلاً: نماز اللہ نے اس لیے فرض کی ہے کہ اس کے ادا کرنے سے اس کی رضا حاصل ہو، نماز پڑھتے وقت یہی مقصد نمازی کا ہونا چاہیے۔ اگر نمازی اپنی نماز شریعت کے مطابق پڑھتا ہے اور نیت بھی اللہ کی رضا کا حصول ہے تو اس کی نماز صحیح اور باعث نجات ہے۔ ○ عمل شریعت کے مخالف اور نیت بھی شریعت کی خلاف ورزی کرنا ہو، مثلاً: چوری کرنا شریعت کی مخالفت ہے اور چوری کرتے وقت ارادہ بھی شریعت کی مخالفت کا ہے تو ایسے انسان کا عمل باطل اور قیامت کے دن باعث عتاب ہے۔ ○ عمل شریعت کے مطابق لیکن نیت شریعت کے مخالف ہو، مثلاً: نماز صحیح پڑھتا ہے لیکن مقصد ریا کاری ہے جو شریعت کے مقصد کے خلاف ہے، ارادے کے خراب ہونے سے عمل بھی خراب اور قیامت کے دن باعث سزا ہوگا۔ ○ عمل شریعت کے مخالف لیکن نیت نیک ہو، مثلاً: جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ واللہ أکبر کی بجائے چاروں قل حصول ثواب کی خاطر پڑھ کر چھری پھیرتا ہے، تو جانور حلال نہ ہوگا کیونکہ نیت اگرچہ نیک ہے لیکن یہ عمل مشروع نہیں۔ ③ نیت کے شرعی معنی یہ ہیں کہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کسی کام کا ارادہ کیا جائے۔ اس شرعی معنی کے اعتبار سے صرف عبادات ہیں جن میں نیت، یعنی اخلاص کی ضرورت ہوتی ہے، باقی چیزوں میں اخلاص کی ضرورت نہیں، مثلاً: کھانا، پینا اور سونا وغیرہ یہ کام کرنے سے دنیاوی مقاصد حاصل ہوتے ہیں، البتہ اخلاص اور حسن نیت سے ایسے کاموں کو عبادت میں شامل کیا جاسکتا ہے اور ان کی بجا آوری باعث ثواب ہوسکتی ہے۔

٥٥ - حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ: حَدَّثَنَا

[55] حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ

[1] فتح الباري:1/179.

شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ يَزِيدَ، عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ». [انظر: ٤٠٠٦، ٥٣٥١]

سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جب مرد اپنے اہل و عیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے حق میں صدقہ بن جاتا ہے۔''

فوائد و مسائل: ① بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر طاعت نہیں ہوتے، انسان انھیں اپنی طبیعت کے تقاضے سے کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ انھیں حسن معاشرت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن اگر نیت کا استحضار ہو جائے، یعنی اخلاص پیدا ہو جائے تو یہ عمل طاعت کا عمل بن جاتا ہے۔ اپنے اہل وعیال پر ثواب کی نیت سے خرچ کرنا باعث ثواب ہے، اگر نیت کا استحضار نہیں بلکہ ویسے ہی خوش دلی سے خرچ کرتا ہے، حصول ثواب کی نیت نہیں ہے، اس طرح ذمے داری تو ادا ہو جائے گی لیکن ثواب نہیں ملے گا۔ ② زیرک اور دانا وہ شخص ہے جو ہر وقت اللہ کی رضا کا طالب ہو، اس طرح نیت کے استحضار سے اس کا سونا بھی موجب قربت ہے، مثلاً: رات کو سوتے وقت یہ نیت کی کہ صبح جلدی اٹھوں گا اور نماز فجر باجماعت ادا کروں گا، اس نیت سے سونا مقدمۂ عبادت ہونے کی وجہ سے باعث اجر و ثواب ہے۔

٥٦ - حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ». [انظر: ١٢٩٥، ٢٧٤٢، ٢٧٤٤، ٣٩٣٦، ٤٤٠٩، ٥٣٥٤، ٥٦٥٩، ٥٦٦٨، ٦٣٧٣، ٦٧٣٣]

[56] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں اس نفقے پر ضرور اجر دیا جائے گا جس سے تمھارا مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہو حتی کہ اس لقمے پر بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو۔''

فوائد و مسائل: ① واقعہ یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس قدر بیمار ہوئے کہ زندگی سے مایوسی ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ جب تیمارداری کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت سعد نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال زیادہ ہے بیٹی ایک ہے، سارے مال کی وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام مال کی وصیت سے روک دیا، اس مال سے صلہ رحمی اور اقربا پروری کی تلقین فرمائی۔ مذکورہ حدیث بھی اسی ضمن میں ارشاد فرمائی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ بال بچوں پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ صدقہ صرف وہی نہیں جو غیر کو دیا جائے بلکہ خود اپنے اوپر خرچ کر کے بھی ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے حتی کہ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالنا بھی باعث اجر و ثواب ہے اگر نیت ثواب کی ہو، اگرچہ اس میں لذت کا پہلو اور طبیعت کا تقاضا بھی ہے۔ ② علامہ نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے جائز طور پر نفسانی خواہشات کی تکمیل سے بھی ثواب ملتا

ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا قضائے شہوت میں بھی اجر ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اگر اس کا غلط استعمال کیا جاتا تو گناہ گار نہ ہوتا؟''[1] اندریں حالات اپنے محل میں یہ عمل باعث اجر کیوں نہ ہو۔[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے تینوں احادیث کی ترتیب میں بھی عجیب اسلوب اختیار کیا ہے: پہلی حدیث کا مرکزی اصول یہ ہے کہ شرعی عبادات میں نیت کا اعتبار ہوگا۔ اگر اخلاص ہے تو ثواب، اگر نہیں تو عتاب۔ دوسری حدیث میں ہے کہ عام معاشرتی عادات کو حسن نیت سے عبادات میں تبدیل کیا جاسکتا ہے جس پر اجر وثواب بھی ملے گا۔ تیسری حدیث میں ہے کہ خواہشات نفسانی کی تکمیل اگر جائز طریقے سے ہو تو اس میں اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے، گو اس میں حصول لذت بھی ہے اور طبیعت کا تقاضا بھی موجود ہے۔

(٤٢) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «اَلدِّينُ النَّصِيحَةُ . . . لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ»

باب:42- نبیٔ اکرم ﷺ کا فرمان: ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ خیر خواہی اللہ، اس کے رسول، اہل اسلام حکمرانوں اور عام مسلمانوں کے ساتھ ہونی چاہیے۔''

وَقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِۦ﴾ [التوبة: ٩١].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیر خواہی کا تعلق رکھیں۔''

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ دین وایمان کا اتحاد پہلے ثابت کر چکے ہیں، لہٰذا الدين النصيحة سے الإيمان النصيحة ہوگیا، یعنی ایمان خیر خواہی کا نام ہے۔ یہ اس بنا پر بھی کہ ایمان اور نصیحت میں بہت گہرا تعلق ہے۔ چونکہ نصیحت کے درجات مختلف ہیں، اس لیے ایمان کے درجات بھی مختلف ہوگئے۔ اس سے ایمان کی کمی بیشی کا مسئلہ بھی صاف ہوگیا۔ امام بخاری نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کو بطور عنوان رکھا ہے۔ یہ حدیث چونکہ ان کی شرط کے مطابق نہ تھی، اس لیے متن میں اسے نہیں لائے اور اس کمی کی تلافی قرآنی آیت سے فرما دی۔ آیت کریمہ میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو غزوۂ تبوک میں کسی شرعی عذر کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ اللہ نے فرمایا: اگر ایسے محسنین جہاد میں شرکت کرنے سے معذور ہوں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کا سابقہ کردار اللہ اور اس کے رسول سے خیر خواہی کا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں جہاد کی تڑپ، مجاہدین سے محبت، دشمنانِ اسلام سے عداوت ہو اور حتی المقدور احکام شریعت کی اطاعت کرتے رہے ہوں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان کے آخر میں یہ عنوان اس لیے قائم کیا ہے کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض مسلمانوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کے پیش نظر ہے۔ اس کے پس منظر میں ہرگز کسی سے عناد یا تعصب نہیں۔ ہماری نیت میں اخلاص ہے اور اصلاح احوال مقصود ہے۔ والله أعلم.

اللہ کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اور اوامر ونواہی

① صحيح مسلم، الزكاة، حديث: 2329 (1006). ② فتح الباري:181/1.

فرمانبرداری کی جائے۔ رسول سے خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی انتہائی تعظیم و تکریم کی جائے، اسے اللہ کا نمائندہ خیال کرتے ہوئے اس کی بات کو آخری اتھارٹی کے طور پر مانا جائے۔ اہل اسلام حکمرانوں سے خیر خواہی یہ ہے کہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کا کہا مانا جائے، کفر بواح کے علاوہ کسی صورت میں بھی ان سے بغاوت نہ کی جائے۔ عامۃ المسلمین سے خیر خواہی یہ ہے کہ انھیں دین سکھایا جائے، ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو رواج دیا جائے، نیز ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔

٥٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ إِسْمَاعِيلَ، قَالَ: حَدَّثَنِي قَيْسُ بْنُ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: بَايَعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلٰى إِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ. [انظر: ٥٢٤، ١٤٠١، ٢١٥٧، ٢٧١٤، ٢٧١٥، ٧٢٠٤]

[57] حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز پڑھنے، زکاۃ دینے اور ہر مسلمان سے خیر خواہی کرنے (کے اقرار) پر بیعت کی۔

فوائد و مسائل: ① عربی زبان میں پھٹے ہوئے کپڑے کو سوئی سے پیوند لگانے کو نصیحت کہتے ہیں، نیز جب شہد سے موم کو الگ کیا جائے تو اس وقت بھی نصیحت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شرعی طور پر کسی انسان کو اس کے عیوب پر اخلاص کے ساتھ مطلع کرنے کو نصیحت کہتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی پردہ دری نہ کی جائے۔ اگر خیر خواہی میں اخلاص نہ ہو تو دھوکا دہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں توبۂ نصوح کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ گناہوں کی وجہ سے انسان کا دین پارہ پارہ ہو جاتا ہے، توبہ سے اس کی پیوند کاری کر کے صحیح کیا جاسکتا ہے۔ ② بعض روایات میں بیعت جریر رضی اللہ عنہ کے موقع پر ادائے شہادتین اور سمع و اطاعت کا بھی ذکر ہے۔[1] بعض روایات میں ہے کہ بیعت لیتے وقت رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ تلقین کیے کہ میں ان باتوں پر حتی المقدور عمل کروں گا۔[2] دین کے دیگر احکام سمع و اطاعت میں آجاتے ہیں۔[3]

٥٨ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ: سَمِعْتُ جَرِيرَ بْنَ عَبْدِاللهِ يَقُولُ - يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ - قَامَ فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ وَقَالَ: عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ اللهِ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ، وَالْوَقَارِ، وَالسَّكِينَةِ حَتّٰى يَأْتِيَكُمْ أَمِيرٌ، فَإِنَّمَا يَأْتِيكُمُ الْآنَ، ثُمَّ قَالَ: اِسْتَعْفُوا لِأَمِيرِكُمْ فَإِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ قُلْتُ:

[58] زیاد بن علاقہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے سنا، جس دن حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو وہ خطبے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا کی اور کہا: تمھیں صرف ایک اللہ سے ڈرنا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں، نیز تمھیں دوسرے امیر کے آنے تک تحمل و اطمینان سے رہنا چاہیے، بس وہ عنقریب ہی آجائیں گے۔ پھر فرمایا: اپنے امیر کے لیے دعائے مغفرت کرو کیونکہ وہ خود بھی معاف کرنے کو پسند کرتا

1 صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2157. 2 صحيح البخاري، الأحكام، حديث: 7204. 3 فتح الباري: 183/1.

يَارَسُولَ اللهِ! أُبَايِعُكَ عَلَى الْإِسْلَامِ، فَشَرَطَ عَلَيَّ: «وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ»، فَبَايَعْتُهُ عَلٰى هٰذَا، وَرَبِّ هٰذَا الْمَسْجِدِ! إِنِّي لَنَاصِحٌ لَّكُمْ، ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ.

تھا۔ پھر کہا: تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ایک دفعہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں آپ سے اسلام پر بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ نے مجھ سے ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے کا عہد لیا، پھر اسی شرط پر میں نے آپ سے بیعت کر لی۔ مجھے اس مسجد کے رب کی قسم! میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔ پھر آپ نے استغفار کیا اور منبر سے نیچے اتر آئے۔

فوائد و مسائل: ① حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوفے کے گورنر تھے۔ جب حضرت مغیرہ کی وفات ہونے لگی تو انھوں نے حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور حالات پر کنٹرول کرنے کی وصیت فرمائی کیونکہ عام طور پر عوام الناس حکمران کی وفات پر خلفشار کا شکار ہو جاتے ہیں خاص طور پر کوفے کی سرزمین جو فتنوں کی آماجگاہ تھی۔[1] ② خیر خواہی کے لیے مسلمان کی پابندی اغلبیت کے لحاظ سے ہے، ویسے کافروں کے ساتھ بھی خیر خواہی کرنی چاہیے، انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور جب وہ مشورہ لیں تو ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، البتہ بیعت کا سلسلہ صرف اہل اسلام کے لیے ہے۔[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو کتاب الایمان کے آخر میں لا کر اشارہ کیا ہے کہ میں نے اس کتاب کی جمع و تدوین میں لوگوں کی خیر خواہی کی ہے۔ صرف ان احادیث کو جمع کیا ہے جو معیار محدثین پر پوری اترتی ہیں تاکہ عمل کرنے میں سہولت رہے۔

① فتح الباري:1/184. ② فتح الباري:1/184.

علم کی فضیلت واہمیت

امام بخاری ؒ نے علم کی طرف توجہ دلائی ہے کیونکہ علم، جہالت کی ضد ہے اور جہالت تاریکی کا نام ہے جس میں واضح چیزیں بھی چھپی رہتی ہیں اور جب علم کی روشنی نمودار ہوتی ہے تو چھپی چیزیں بھی واضح ہونے لگتی ہیں۔ انھوں نے علم کی تعریف سے تعرض نہیں کیا، اس لیے کہ علم کو تعریف کی ضرورت نہیں۔

عطر آں باشد کہ خود بوید، نہ کہ عطار بگوید

نیز اشیاء کی حقیقت و ماہیت بیان کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ ایمانیات کے بعد کتاب العلم کا افتتاح کیا کیونکہ ایمان کے بعد دوسرا درجہ علم کا ہے۔ اس کا اشارہ کلام الٰہی سے بھی ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ ''اللہ تعالیٰ تم میں سے اہل ایمان اور اہل علم کے درجات بلند کر دے گا۔''[1] اس آیت کریمہ میں پہلے اہل ایمان اور پھر اہل علم کا تذکرہ ہے۔ چونکہ ایمان کی پابندی ہر مکلف پر سب سے پہلے عائد ہوتی ہے، نیز ایمان سب سے افضل و اعلیٰ اور ہر علمی اور عملی خیر کا اساسی پتھر ہے، اس لیے علم سے پہلے ایمان کا تذکرہ ضروری تھا۔ ایمانیات کے بعد کتاب العلم لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو چیزیں ایمان میں مطلوب ہیں اور جن پر عمل کرنے سے ایمان میں کمال پیدا ہوتا ہے، ان کا حصول علم کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر ایمان اور علم میں ایک گہرا رشتہ بھی ہے، وہ یہ کہ علم کے بغیر ایمان میں روشنی اور بالیدگی پیدا نہیں ہوتی اور نہ ایمان کے بغیر علوم و معارف ہی لائق اعتنا ہیں۔ کتاب العلم کو دیگر ابواب سے پہلے بیان کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دیگر ابواب کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے اور اللہ کے ہاں اس عمل کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوگا جو علی وجہ البصیرت کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ امام بخاری ؒ کے نزدیک دنیاوی علوم میں مہارت پیدا کرنا کوئی پسندیدہ اور کارآمد مشغلہ نہیں کیونکہ ان کا فائدہ عارضی اور چند روزہ ہے۔ ان کے نزدیک اصل علم قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پھر ان دونوں کے

---

[1] المجادلة 58:11.

متعلق اللہ کی عطا کردہ فہم و فراست ہے کیونکہ ایسے معارف کا نفع مستقل اور پائیدار ہے، پھر اگر اس علم کو اخلاص وعمل سے آراستہ کرلیا جائے تو آخرت میں ذریعۂ نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی اکثریت کے متعلق بایں الفاظ شکوہ کیا ہے: ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ''وہ تو دنیاوی زندگی کے ظاہر ہی کو جانتے ہیں اور اخروی معاملات سے تو بالکل ہی بے خبر ہیں۔''[1]

اس بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب العلم میں حقیقی علم کی اہمیت وحیثیت، افادیت وفضیلت، علم حدیث، اس کے آداب وفضائل، اس کی حدود وشرائط، آداب تحمُّلِ حدیث، آداب تحدیث، صیغ ادا، رحلات علمیہ، کتابت حدیث، آداب طالب، آداب شیخ، فتویٰ، شرائط فتویٰ، آداب فتوی اور ان کے علاوہ بے شمار علمی حقائق ومعارف کو بیان کیا ہے جن کی مکمل تفصیل اس تمہیدی گفتگو میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ آئندہ صفحات میں موقع ومحل کے مطابق ایسے علمی جواہرات کی وضاحت کی جائے گی۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ ان تمہیدی گزارشات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتاب العلم کا مطالعہ کریں۔

---

1. الروم 7:30.

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

3 - كِتَابُ الْعِلْمِ

علم اور اس کے متعلقات کا بیان

(۱) بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: ﴿يَرۡفَعِ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنكُمۡ وَٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡعِلۡمَ دَرَجَٰتٖۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٞ﴾ [المجادلة: ١١]. وَقَوْلِهِ: ﴿رَّبِّ زِدۡنِي عِلۡمٗا﴾ [طه: ١١٤].

باب: 1- علم کی فضیلت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو درجات کے اعتبار سے بلندی عطا فرمائے گا جو ایمان لائے اور جنھیں علم دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔'' اس کے علاوہ فرمان الٰہی ہے: ''(آپ کہہ دیجیے:) میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

وضاحت: ① بخاری کے بعض نسخوں میں اس عنوان کا ذکر نہیں، اس بنا پر قرآنی آیات کتاب العلم سے متعلق ہیں، کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ جب کوئی کتاب شروع کرتے ہیں تو پہلے کوئی مناسب آیت لاتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آئندہ ابواب کی بنیاد یہی آیت کریمہ ہے، لیکن ہمارے نسخے میں اس عنوان کا ذکر ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ علم کی فضیلت معلوم ہو جائے، کیونکہ جب تک کسی چیز کی فضیلت معلوم نہ ہو، اس کی طرف شوق و رغبت کا پیدا ہونا مشکل ہوتا ہے، اس لیے توجہ دلانے کے لیے سب سے پہلے علم کی فضیلت بیان فرمائی۔ ② پہلی آیت سے علم کی فضیلت اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ آیت کریمہ میں ترقیٔ درجات کے متعلق دو امر مذکور ہیں: ایمان اور علم۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے درجات بلند ہوں گے اور اہل ایمان میں سے وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں خصوصی اعزاز کے حامل ہوں گے۔ دوسری آیت سے فضیلت علم اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اعلم الخلائق ہیں اس کے باوجود انھیں مزید علم طلب کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو کسی چیز کے متعلق طلب زیادت کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کی بڑی فضیلت ہے۔ ③ مصنف نے فضیلت علم کے متعلق کسی حدیث کا استخراج نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انھیں کوئی ایسی حدیث دستیاب نہیں ہو سکی جو ان کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری

اترتی ہو، یا انھیں حدیث کے اندراج کا موقع ہی نہ ملا، یہ بے سروپا باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ دلائل کی دنیا میں قرآنی آیات سب سے قوی دلیلیں ہیں، احادیث کے مقابلے میں ان کا وزن زیادہ ہے، ویسے فضیلت علم کے متعلق بے شمار صحیح احادیث ہیں جن میں سے ایک یہ ہے: ''جو شخص تلاش علم کے لیے کوئی راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے۔''[1]

④ فضیلت دو طرح کی ہوتی ہے: معیار کے لحاظ سے اور مقدار کے اعتبار سے۔ اس باب میں فضیلت معیار کے لحاظ سے بیان کی گئی ہے، چند ابواب کے بعد ایک اور باب فضل العلم سے متعلق ہے وہاں ایک حدیث کا حوالہ بھی ہے جو فضیلت علم پر دلالت کرتی ہے۔ آئندہ باب میں مقدار کے اعتبار سے فضیلت علم کا بیان ہے، گویا پہلا باب فضل بمعنی فضیلت اور دوسرا باب فضل بمعنی فاضل (زائد) ہے، لہٰذا ان دونوں ابواب کو تکرار کا نام نہیں دینا چاہیے بلکہ اس تفنن پر امام بخاری رحمہ اللہ داد و تعریف کے حقدار ہیں۔[2]

(٢) بَابُ مَنْ سُئِلَ عِلْمًا وَّهُوَ مُشْتَغِلٌ فِي حَدِيثِهِ فَأَتَمَّ الْحَدِيثَ ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

باب:2- جس شخص سے کوئی علمی مسئلہ دریافت کیا جائے اور وہ کسی بات میں مصروف ہو تو (اسے چاہیے کہ) وہ اپنی بات پوری کرے پھر جواب دے

٥٩ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ: حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ؛ ح: وَحَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي قَالَ: حَدَّثَنِي هِلَالُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: بَيْنَمَا النَّبِيُّ ﷺ فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ فَمَضَى رَسُولُ اللهِ ﷺ يُحَدِّثُ، فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا قَالَ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ لَّمْ يَسْمَعْ، حَتَّى إِذَا قَضَى حَدِيثَهُ قَالَ: «أَيْنَ - أُرَاهُ - السَّائِلُ عَنِ السَّاعَةِ؟» قَالَ: هَا أَنَا يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «فَإِذَا ضُيِّعَتِ الْأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ»، قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا؟ قَالَ: «إِذَا وُسِّدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ». [انظر: ٦٤٩٦]

[59] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک مرتبہ نبی ﷺ مجلس میں لوگوں سے کچھ بیان کر رہے تھے کہ ایک دیہاتی آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: قیامت کب آئے گی؟ رسول اللہ ﷺ (اسے کوئی جواب دیے بغیر) اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ (حاضرین میں سے) کچھ لوگ کہنے لگے: آپ نے دیہاتی کی بات کو سن تو لیا ہے لیکن اسے پسند نہیں فرمایا۔ اور بعض کہنے لگے: ایسا نہیں ہے بلکہ آپ نے سنا ہی نہیں۔ جب آپ اپنی گفتگو ختم کر چکے تو فرمایا: ''قیامت کے متعلق پوچھنے والا کہاں ہے؟'' دیہاتی نے کہا: ہاں، یارسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو۔'' اس نے دریافت کیا: امانت کس طرح ضائع ہوگی؟ آپ نے فرمایا: ''جب (ذمے داری کے) کام نااہل لوگوں کے سپرد کر دیے جائیں تو قیامت کا انتظار کرنا۔''

---

[1] مسند أحمد:2/252، و فتح الباري:1/187. [2] فتح الباري:1/237.

فوائد ومسائل: ① پہلے باب میں علم کے متعلق طلب زیادت کا حکم تھا، اس باب میں اس کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو، اس کے متعلق اہل علم سے دریافت کر لینا چاہیے، نیز اس حدیث میں معلم کے کچھ آداب ہیں: ○ اسے طلباء کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ○ کسی ضرورت ومصلحت کے پیش نظر اسے کسی سوال کے جواب کو مؤخر کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح کچھ آداب طالب علم سے متعلق ہیں: ○ اگر استاد کسی سے گفتگو میں مصروف ہو تو خواہ مخواہ اس میں دخل انداز نہ ہو۔ ○ اگر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے متعلق استفسار کرنے کی اجازت ہے۔[1] ② ہنگامی قسم کے سوالات کے متعلق اصل بات یہ ہے کہ سوال کی نوعیت، سائل اور مفتی کے حالات پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی ہنگامی سوال عقیدے کے متعلق ہے تو خطبہ چھوڑ کر بھی اس کا جواب دیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی نے دین کے متعلق سوال کیا تو آپ نے خطبہ چھوڑ کر اسے جواب دیا۔[2] ③ ضروریات زندگی سے متعلق اہم سوالات کرنے چاہئیں، ان کا جواب بھی پہلے دینا چاہیے، جن سوالات کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے نہیں ہے، ان سے صرف نظر کرنا عین مصلحت ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی نے قیامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''تو نے اس کے متعلق کیا تیاری کی ہے؟'' یعنی سوال اس کی تیاری کے متعلق کرنا چاہیے تھا۔[3] ④ اگر مفتی مصروف ہو اور کوئی جلد باز دوران مصروفیت میں سوال کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ اسی وقت جواب دیا جائے بلکہ اپنی مصروفیات سے فراغت کے بعد اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتمان علم نہیں جس پر قرآن میں وعید آئی ہے۔ ⑤ حدیث میں ''امر'' سے مراد دینی معاملات ہیں، جیسے خلافت، قضا اور افتا وغیرہ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دینی ضروریات کے لیے علمی لحاظ سے مضبوطی کے لیے علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ علماء حضرات کی ذمے داری ہے کہ وہ طالبان حق کی تسلی کرائیں۔ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے علم کی تلاش جاہلوں کے ہاں کی جائے گی، جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو قیامت قریب ہوگی۔[4]

(٣) بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

باب:3- علمی باتیں بہ آواز بلند کہنا

٦٠ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بِشْرٍ، عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ: تَخَلَّفَ النَّبِيُّ ﷺ فِي سَفْرَةٍ سَافَرْنَاهَا، فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقَتْنَا الصَّلَاةُ وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ، فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلَى أَرْجُلِنَا، فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ: «وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» مَرَّتَيْنِ

[60] حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک سفر میں نبی ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے تھے۔ پھر آپ ہمیں اس حالت میں ملے کہ ہم سے نماز میں دیر ہو گئی تھی اور ہم (جلدی جلدی) وضو کر رہے تھے۔ ہم اپنے پاؤں (خوب دھونے کی بجائے ان) پر مسح کی طرح تر ہاتھ پھیرنے لگے۔ یہ دیکھ کر آپ نے بآواز بلند دو یا

---

1 فتح الباري:288/1. 2 صحيح مسلم، الجمعة، حديث: 2025(876). 3 صحيح البخاري، الأدب، حديث:6171.
4 فتح الباري:189/1.

أَوْ ثَلَاثًا . [انظر : ٩٦، ١٦٣]

تین مرتبہ فرمایا: ''دوزخ میں جانے والی ایڑیوں پر افسوس!''

فوائد ومسائل: ① پہلے باب میں سوال کرنے کا طریقہ تھا، اس باب میں جواب دینے کا طریقہ بتایا ہے کہ ازالۂ غفلت یا کسی اور مصلحت کے پیش نظر جواب دیتے وقت اپنی آواز کو اونچا کرنا مستحسن ہے۔ احادیث میں رسول اللہ ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت بایں الفاظ بیان ہوئی ہے کہ آپ شوروغل نہ فرماتے تھے کیونکہ ضرورت سے زیادہ آواز کا بلند کرنا پیغمبرانہ وقار کے منافی اور آپ کی علمی شان کے بھی خلاف ہے۔ شاید کوئی تعلیم دیتے وقت ضرورت پڑنے پر آواز بلند کرنا قابل اعتراض خیال کرتا ہو، حدیث سے اس خیال کی تردید مقصود ہے کہ اس میں کچھ اندیشہ نہیں، البتہ تکبر یا بے پروائی کی وجہ سے رفع صوت ہو تو قابل مذمت ہے۔ ضرورت کے مواقع حسب ذیل ہیں: ○ سننے والا دور ہے۔ ○ مجمع کثیر ہے۔ ○ مضمون کی اہمیت کا تقاضا ایسا ہے۔ ○ کسی طالب علم کو ڈانٹنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ○ حدیث میں ہے کہ جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، آواز بلند ہو جاتی اور آپ کا غصہ تیز ہو جاتا۔[1] ② امام بخاری ؒ کے رمز شناس یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس عنوان سے امام بخاری نے اشارہ فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں احادیث لکھتے وقت بڑی محنت اٹھائی ہے، ان کی جمع و تدوین اور حسن ترتیب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔[2] ③ رسول اللہ ﷺ کا مقصد لوگوں کو آگاہ کرنا تھا کہ جلدی میں وضو کرتے وقت اپنی ایڑیوں کو خشک نہ رہنے دیں جیسا کہ عام طور پر جلدی میں پاؤں کا کچھ حصہ خشک رہ جاتا ہے، یہ خشکی ان ایڑیوں کو دوزخ میں لے جائے گی، نیز اعقاب سے مراد صاحب اعقاب ہیں، یعنی وضو کرتے وقت جن کی ایڑیاں خشک رہیں گی، انھیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔

(٤) بَابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ : حَدَّثَنَا ، وَأَخْبَرَنَا ، وَأَنْبَأَنَا

باب:4- محدث کا حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا اور أَنْبَأَنَا جیسے الفاظ استعمال کرنا

وَقَالَ الْحُمَيْدِيُّ: كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ «حَدَّثَنَا» وَ«أَخْبَرَنَا» وَ«أَنْبَأَنَا» وَ«سَمِعْتُ» وَاحِدًا، وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ، وَقَالَ شَقِيقٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ كَلِمَةً، وَقَالَ حُذَيْفَةُ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ حَدِيثَيْنِ، وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا

ہمیں امام حمیدی نے بتایا کہ محدث ابن عیینہ کے نزدیک حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَنْبَأَنَا اور سَمِعْتُ برابر حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیث بیان فرمائی اور آپ صادق ومصدوق ہیں۔ حضرت شقیق نے حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت کیا کہ میں نے نبی ﷺ سے ایک بات سنی۔ حضرت حذیفہ ؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے دو

[1] صحيح مسلم، الجمعة، حديث:2005(867). [2] فتح الباري:190/1 .

يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ، وَقَالَ أَنَسٌ: عَنِ النَّبِيِّ ﷺ يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّهِ عَزَّوَجَلَّ، وَقَالَ أَبُوهُرَيْرَةَ: عَنِ النَّبِيِّ ﷺ يَرْوِيهِ عَنْ رَبِّكُمْ عَزَّوَجَلَّ.

حدیثیں بیان فرمائیں۔ حضرت ابوالعالیہ نے روایت کیا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، انھوں نے نبی ﷺ سے اور آپ نے اپنے بزرگ و برتر پروردگار سے بیان کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی، انھوں نے اپنے رب سے بیان فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کیا اور کہا: رسول اللہ ﷺ اسے تمھارے رب عزوجل سے بیان کرتے ہیں۔

وضاحت: اس باب کے انعقاد کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں: ○ محدثین کی نظر میں سند کی بہت اہمیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسناد داخل دین ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ محدثین کے ہاں سند میں جو نقل روایت کے لیے الفاظ استعمال ہوئے ہیں یہ ان کی اپنی ایجاد ہے یا رسول اللہ ﷺ سے ان الفاظ کے استعمال کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ محدثین نے نقل روایت کے متعلق جو الفاظ مخصوص کر رکھے ہیں، یہ طریقۂ نقل اسلاف سے ثابت ہے۔ اس کے متعلق امام بخاری نے قطعات حدیثیہ کو ذکر فرما کر ثابت کر دیا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلکہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ کا استعمال فرمایا ہے۔ ① محدثین کے ہاں نقل روایت کے متعلق مختلف الفاظ کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ الفاظ برابر کے ہیں یا ان میں قوت وضعف کا فرق ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ بیشتر محدثین کے نزدیک ان الفاظ کی حیثیت برابر ہے۔ ان میں مراتب کا فرق نہیں ہے۔ محدث کو اختیار ہے چاہے لفظ حَدَّثَنَا استعمال کرے چاہے سَمِعْتُ کا صیغہ لائے۔ اگرچہ بعض محدثین نے أَنْبَأَنَا کے صیغے کو کمزور یا ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، تاہم امام بخاری کے نزدیک یہ تمام طریقے جائز اور قابل استناد ہیں۔ واضح رہے کہ محدثین کے ہاں نقل روایت کے مختلف طریقے ہیں، مثلاً: سَمِعْتُ، حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَنْبَأَنَا وغیرہ۔ یہ طریقے حدیث کی تمام کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ تحدیث، إخبار اور إنباء تو قرآنی آیات سے ثابت ہیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ بعض محدثین کی نظر میں فرق مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہاں یہ چھ روایات سند کے بغیر لائے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر ان کی اسناد موجود ہیں: ② قال ابن مسعود ...... اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب القدر (6594) میں موصولاً بیان کیا ہے۔ ③ قال شقیق ...... مصنف نے سند کے ساتھ کتاب الجنائز (1238) اور کتاب التفسیر (4497) میں ذکر کیا ہے۔ لیکن اس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے رسول اکرم ﷺ سے سَمِعْتُ کے صیغے سے روایت کرنے کا ذکر نہیں بلکہ قال رسول اللہ ﷺ کے الفاظ ہیں، البتہ امام مسلم رحمہ اللہ نے سماع کی صراحت کے ساتھ موصولاً بیان کیا ہے۔[1] ④ حدیث ابی حذیفہ بھی کتاب الرقاق (6497) میں باسند موجود ہے۔ باقی احادیث قدسیہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت انس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، بھی کتاب التوحید میں موصولاً ذکر فرمائی ہیں۔[2] اس سے واضح ہوتا ہے کہ محدثین کی نظر

1 صحيح مسلم، الإيمان، حديث:268(92). 2 فتح الباري:191/1.

میں سند کی کتنی اہمیت ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے: [اَلْإِسْنَادُ مِنَ الدِّينِ، لَوْلَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَاشَاءَ] ''اسناد دین کا حصہ ہے، اگر سلسلۂ سند نہ ہوتا تو ہر شخص جو چاہتا کہتا۔''

٦١ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ فَحَدِّثُونِي مَا هِيَ؟» فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ عَبْدُ اللهِ: وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ، فَاسْتَحْيَيْتُ، ثُمَّ قَالُوا: حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟! قَالَ: «هِيَ النَّخْلَةُ». [انظر: ٦٢، ٧٢، ١٣١، ٢٢٠٩، ٤٦٩٨، ٥٤٤٤، ٥٤٤٨، ٦١٢٢، ٦١٤٤]

[61] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''درختوں میں ایک ایسا درخت بھی ہے جو کبھی پت جھڑ نہیں ہوتا اور مسلمان کو اس سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟'' یہ سن کر صحابۂ کرام کے خیالات جنگل کے درختوں کی طرف گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میرے دل میں خیال آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، مگر میں (کہتے ہوئے) شرما گیا۔ پھر صحابۂ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ فرمائیں وہ کون سا درخت ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ کھجور کا درخت ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس روایت میں حَدِّثُونِي اور حَدِّثْنَا کے الفاظ موجود ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاحات ایجاد بندہ نہیں بلکہ یہ عہد نبوی میں رائج تھیں بلکہ أَنْبَأَ اور نَبَّأَ کا ثبوت تو قرآن مجید میں ہے: ﴿قَالَتْ مَنْ اَنْبَأَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾[1] ''اس عورت نے کہا کہ آپ کو اس کے متعلق کس نے بتایا؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے علیم وخبیر نے خبر دی ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ منکرین حدیث کی یہ ہفوات ہیں کہ علم حدیث عہد نبوی کے بعد کی ایجاد ہے اور عجمی سازش کا شاخسانہ ہے۔ قاتلهم الله أنّى يؤفكون. ② اس روایت کے مختلف طرق کو جمع کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تحدیث، إخبار اور إنباء کا استعمال قوت وضعف میں برابر ہے کیونکہ اس روایت میں حَدِّثُونِي کا لفظ ہے، کتاب التفسیر میں أَخْبِرُونِي ہے، علامہ اسماعیلی نے أَنْبِئُونِي کے الفاظ نقل کیے ہیں، پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے صیغۂ اخبار استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام طرق کو جمع کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں الفاظ کا مرتبہ ایک ہی ہے کیونکہ تحدیث کی جگہ پر إِخْبَار اور إخبار کی جگہ پر تحدیث اسی طرح إنباء کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر ان میں کوئی خاص فرق ہوتا تو اہل زبان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو اس قسم کا رد و بدل نہ کرتے۔[2] ③ اس حدیث کے فوائد ہم آئندہ ذکر کریں گے البتہ چند ایک یہاں بیان کر دیتے ہیں: * حیا ایک پسندیدہ خصلت ہے بشرطیکہ کسی مصلحت کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ * کھجور اور اس کا پھل بابرکت چیز ہے۔ * علم اللہ کا عطیہ ہے۔ بعض دفعہ اکابر علماء سے ایسی چیزیں مخفی رہ جاتی ہیں جو اصاغر اہل علم کو معلوم ہوتی ہیں۔

---

[1] التحريم 66:3. [2] فتح الباري:191/1.

(٥) بَابُ طَرْحِ الْإِمَامِ الْمَسْأَلَةَ عَلٰى أَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

باب:5- علم و صلاحیت کا جائزہ لینے کے لیے استاد کا شاگردوں کے سامنے کوئی مسئلہ پیش کرنا

٦٢ - حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ دِينَارٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: «إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُونِي مَا هِيَ؟» قَالَ: فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي، قَالَ: فَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ، ثُمَّ قَالُوا: حَدِّثْنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللهِ؟! قَالَ: «هِيَ النَّخْلَةُ». [راجع: ٦١]

[62] حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کے مشابہ ہے۔ مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے؟“ اس پر لوگوں نے صحرائی درختوں کا خیال کیا۔ عبداللہ بن عمر ؓ کہتے ہیں: میرے دل میں آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے (لیکن بزرگوں کی موجودگی میں بتانے سے مجھے شرم آئی۔) آخر صحابۂ کرام ؓ نے کہا: اللہ کے رسول! آپ ہی بتا دیجیے وہ کون سا درخت ہے؟ آپ نے فرمایا: ”وہ کھجور کا درخت ہے۔“

فوائد و مسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ استاد، طلباء کو بیدار رکھنے اور ان کی توجہ سبق میں رکھنے کے لیے ان سے وقتاً فوقتاً سوالات کرتا رہے۔ اس کے دو فائدے ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ طلباء ہر وقت ہوشیار اور بیدار رہتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ استاد کو طالب علم کے مرتبۂ علم کا اندازہ ہو جاتا ہے تاکہ اس کے مرتبے کے مطابق اس سے گفتگو کی جائے، اگر انفرادی توجہ کی ضرورت ہے تو اس سے بھی بخل نہ کیا جائے۔ ② اس سے طریقۂ امتحان کا بھی پتہ چلتا ہے کہ طالب علم کے سامنے کوئی ایسی چیز پیش کی جائے جس میں کچھ پیچیدگی ہو، نہ تو اتنی آسان ہو کہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہی نہ پڑے اور نہ اس درجہ مشکل ہی ہو کہ قوت نظر و فکر کے صرف کرنے کے بعد بھی وہ حل نہ ہو سکے، نیز امتحان ایسی چیزوں سے لیا جائے جو مسؤل کی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں اور جس چیز کے متعلق سوال کیا جائے اس کا کچھ اتا پتا بھی دیا جائے تاکہ ان اشارات کی مدد سے طالب علم اس کا حل تلاش کر سکے۔ ③ اس حدیث میں کھجور کو مسلمان سے تشبیہ دی گئی ہے، وجہ تشبیہ یہ ہے کہ اس کی برکت مسلمان کی برکت جیسی ہے۔ ایک روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے۔[1] مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں دوسروں کے لیے سرچشمۂ خیر ہوتا ہے، اسی طرح کسی بھی حالت میں بے کار نہیں۔ کھجور کے پھل کچے پکے ہر طرح کارآمد ہیں، اس کے پتے بھی کام آتے ہیں، اس کا تنا بھی نفع بخش ہوتا ہے، اس کے چھاگل سے رسیاں بنائی جاتی ہیں اور اسے تکیوں میں بھرا جاتا ہے، اس کی گٹھلیاں انسانوں اور حیوانوں کے کام آتی ہیں۔ کھجور کے بے شمار طبی فوائد ہیں جو ہمارے موضوع سے خارج ہیں، البتہ دو مجرب

1 صحيح البخاري، الأطعمة، حديث: 5444.

فوائد ذکر کیے جاتے ہیں: * رسول اللہ ﷺ خود انھیں بکثرت استعمال کرتے تھے، نیز آپ نے جادو سے بچاؤ کے لیے عجوہ کھجوروں کے استعمال کی تلقین فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ تجربہ کار کہنہ مشق اطباء مردانگی کے زیور کی حفاظت یا بحالی کے لیے چھوہاروں اور معجون آردخرما تجویز کرتے ہیں۔ * بچے کی ولادت کے وقت بیشتر خواتین موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہیں، ایسے موقع پر تازہ کھجوروں کا استعمال جادو اثر رکھتا ہے، اس کا اشارہ سورۂ مریم آیت:25 میں واضح طور پر ملتا ہے۔④ اس سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی زیرکی اور دانائی کا بھی پتہ چلتا ہے اگرچہ اس وقت دو واضح اشارے موجود تھے، شاید ان اشاروں کی مدد سے آپ کی جواب تک رسائی ہوئی ہو * آپ کے پاس جمار (کھجور کا گودا) لایا گیا اور آپ اسے تناول فرمانے لگے، اسی اثنا میں آپ نے یہ سوال کیا۔ * آپ نے دوران سوال میں اس کا فائدہ بایں الفاظ بتایا کہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا ہے، قرآن کریم میں یہ وصف شجرۂ طیبہ کا بیان ہوا ہے۔[1] اور اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔

(٦) بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعِلْمِ

باب:6- طریقۂ تعلیم کا بیان

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: ﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ [طه: ١١٤].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ کہہ دیجیے! میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

وضاحت: رسول اللہ ﷺ پر جو احکام شریعت نازل ہوتے تھے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بتانے کا طریقہ یہ ہوتا کہ آپ خود انھیں سناتے۔ محدثین کی اصطلاح میں اسے ''سماع من الشیخ'' کہا جاتا ہے، اس پر اتفاق ہے۔ محدثین کے ہاں طریقۂ تعلیم یہ بھی ہے کہ طالب علم پڑھتا ہے اور استاد سنتا ہے۔ اسے ''قراءۃ علی الشیخ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے اس طریقۂ تعلیم کو درست نہیں کہا، اسی لیے آئندہ امام بخاری رحمہ اللہ اس طریقۂ تعلیم کی وضاحت اور اس کے جواز کا اثبات فرماتے ہیں، گویا مذکورہ دونوں طریقے جائز ہیں۔

ملحوظہ: صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں باب ماجاء في العلم کا باب نہیں ہے اور بعض میں ذیل کا باب نہیں ہے، بلکہ اس کو لفظ باب کے بغیر پہلے باب کے ساتھ ہی بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نسخے میں اس پر بھی باب کا لفظ ہے۔ زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دو نہیں ایک ہی باب ہے اور وہ بھی پہلا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ذیل کے باب پر نمبر نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدِّثِ

باب: شاگرد کا استاد کے سامنے پڑھنا اور پیش کرنا

وَرَأَى الْحَسَنُ، وَسُفْيَانُ، وَمَالِكٌ الْقِرَاءَةَ

اس کے متعلق حضرت حسن بصری، سفیان ثوری اور امام

[1] ابراهیم 14:25.

جَائِزَةٌ. قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: سَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَذْكُرُ عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَمَالِكٍ الْإِمَامِ أَنَّهُمَا كَانَا يَرَيَانِ الْقِرَاءَةَ وَالسَّمَاعَ جَائِزَةً. حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ: إِذَا قُرِئَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ: حَدَّثَنِي وَسَمِعْتُ. وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ بِحَدِيثِ ضِمَامِ بْنِ ثَعْلَبَةَ أَنَّهُ قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: آللّٰهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ؟ قَالَ: «نَعَمْ»، قَالَ: فَهٰذِهِ قِرَاءَةٌ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، أَخْبَرَ ضِمَامٌ قَوْمَهُ بِذٰلِكَ فَأَجَازُوهُ. وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِالصَّكِّ يُقْرَأُ عَلَى الْقَوْمِ فَيَقُولُونَ: أَشْهَدَنَا فُلَانٌ، وَيُقْرَأُ ذٰلِكَ قِرَاءَةً عَلَيْهِمْ، وَيُقْرَأُ عَلَى الْمُقْرِئِ فَيَقُولُ الْقَارِئُ: أَقْرَأَنِي فُلَانٌ. حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيُّ عَنْ عَوْفٍ، عَنِ الْحَسَنِ قَالَ: لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَى الْعَالِمِ. حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ: وَأَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ الْفِرَبْرِيُّ وَحَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْبُخَارِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ ابْنُ مُوسَى بْنُ بَاذَامَ عَنْ سُفْيَانَ قَالَ: إِذَا قُرِئَ عَلَى الْمُحَدِّثِ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ: حَدَّثَنِي، قَالَ: وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُولُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ: اَلْقِرَاءَةُ عَلَى الْعَالِمِ وَقِرَاءَتُهُ سَوَاءٌ.

مالک کی رائے ہے کہ قراءت علی الشیخ بھی جائز ہے۔ امام ابوعبداللہ (بخاری) نے فرمایا: میں نے ابوعاصم سے سنا، وہ سفیان ثوری اور امام مالک کے متعلق ذکر کرتے تھے کہ یہ حضرات قراءت علی الشیخ اور سماع من الشیخ دونوں طریقوں کو جائز اور معتبر قرار دیتے تھے۔ عبیداللہ بن موسیٰ حضرت سفیان ثوری سے روایت کرتے ہیں کہ جب محدث کے سامنے پڑھا جائے تو حَدَّثَنِي اور سَمِعْتُ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اور بعض محدثین نے عالم کے سامنے قراءت کرنے پر حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نمازوں کی ادائیگی کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا تھا: ''ہاں۔'' یہ قراءۃ علی النبی ﷺ ہے۔ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو خبر دی اور ان لوگوں نے اسے جائز قرار دیا۔ اور حضرت امام مالک نے اسٹام (دستاویز شہادت) سے استدلال کیا ہے جو قوم کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں فلاں نے گواہ بنایا، حالانکہ یہ صرف ان کے سامنے پڑھا گیا تھا، نیز پڑھنے والا اپنے استاد کے سامنے پڑھتا ہے پھر کہتا ہے کہ مجھے فلاں نے پڑھایا۔ حضرت عوف، حسن بصری سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: عالم کے سامنے قراءت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نیز عبیداللہ بن موسیٰ حضرت سفیان سے نقل کرتے ہیں، انھوں نے کہا: جب محدث کے سامنے حدیث پڑھی جائے تو پھر حدثني کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ابوعاصم حضرت امام مالک اور حضرت سفیان سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: (شاگردوں کا) عالم کے سامنے پڑھنا یا عالم کا (شاگردوں کے سامنے) پڑھنا، دونوں برابر ہیں۔

وضاحت: اس طویل عبارت میں امام بخاری رحمہ اللہ نے طریقۂ تعلیم کے دو انداز بیان کیے ہیں: * طریقۂ قراءت: طالب علم حدیث پڑھے اور استاد اسے سنے۔ * طریقۂ عرض: طالب علم کے پاس استاد کی کوئی کتاب پہلے سے موجود ہے، وہ اپنے استاد کو سنا کر اس کی اجازت چاہتا ہے۔ طریقۂ قراءت کے لیے عرض کا ہونا ضروری نہیں، البتہ عرض کے لیے قراءت کا ہونا ضروری ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ طریقۂ قراءت اور طریقۂ عرض میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ محدثین کے ہاں یہ دونوں طریقے رائج ہیں، البتہ ان کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقۂ قراءت راجح ہے کیونکہ اگر شیخ پڑھنے میں مشغول ہو تو ممکن ہے کہ سبقت لسانی سے الفاظ میں ردوبدل ہو جائے، پھر اس کا اثر معنی پر پڑے۔ ایسے حالات میں شاگرد ہیبت کی وجہ سے اپنے استاد کو ٹوک نہیں سکے گا۔ اس کے برعکس اگر شاگرد پڑھے گا تو استاد اس کی غلطی پر تنبیہ کرتا رہے گا یا پھر اس کی تصدیق کرتا رہے گا۔ محتاط محدثین کا فیصلہ ہے کہ اگر استاد حفظ سے بیان کرے تو طریقۂ تحدیث بہتر ہے اور اگر کتاب سامنے ہو تو طریقۂ قراءت وعرض راجح ہے۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں طریقے برابر ہیں اور اس کے اثبات کے لیے امام بخاری نے متعدد اکابر محدثین کے اقوال مختلف سندوں سے پیش کیے ہیں، پھر اس عبارت میں تکرار نہیں، بلکہ پہلے انھوں نے محدثین کے سادہ اقوال پیش کیے، اس کے بعد انھیں باقاعدہ سند سے پیش فرمایا۔ امام مالک نے طریقۂ قراءت کے حجت ہونے پر عجیب انداز سے استدلال فرمایا ہے، اس کے دو طریقے ہیں: * کاتب، متعاقدین کا کوئی معاملہ تحریر کر کے انھیں گواہوں کی موجودگی میں سنا دیتا ہے، وہ دونوں اسے تسلیم کرتے ہیں۔ وہ گواہوں کے سامنے خود اس کی قراءت نہیں کرتے لیکن بوقت ضرورت عدالت میں وہ گواہ پیش ہو جائیں تو عدالت ان کی گواہی کا اعتبار کرتی ہے۔ * طالب علم اپنے استاد کے سامنے قرآن مجید کی قراءت کرتا ہے اور مقری، یعنی استاد سن کر اس کی اصلاح کرتا ہے، پھر یہ قاری، یعنی شاگرد دوسرے کے سامنے یوں کہتا ہے کہ مجھے فلاں استاد نے اس طرح پڑھایا، حالانکہ استاد نے تو سنا تھا، پڑھایا نہیں تھا۔ جب قرآن کے متعلق یہ طریقۂ قراءت معتبر ہے تو حدیث کے معاملے میں اسے بالاولی معتبر ہونا چاہیے۔

٦٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ شَرِيكِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ أَبِي نَمِرٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ: بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى جَمَلٍ فَأَنَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ، ثُمَّ قَالَ لَهُمْ: أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ؟ وَالنَّبِيُّ ﷺ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ، فَقُلْنَا: هٰذَا الرَّجُلُ الْأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ، فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ: اِبْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ! فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: «قَدْ أَجَبْتُكَ»،

[63] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک مرتبہ ہم مسجد میں نبی ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک اونٹ سوار آیا اور اپنے اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر باندھ دیا، پھر پوچھنے لگا: تم میں محمد (ﷺ) کون ہیں؟ نبی ﷺ اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم میں تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ہم نے کہا: یہ سفید رنگ والے، تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ سے کہنے لگا: اے فرزند عبدالمطلب! نبی ﷺ نے فرمایا: ''(پوچھ) میں تجھے جواب دیتا ہوں۔'' اس نے نبی ﷺ سے کہا: میں آپ سے کچھ دریافت کرنے والا ہوں اور اس

فَقَالَ الرَّجُلُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: إِنِّي سَائِلُكَ فَمُشَدِّدٌ عَلَيْكَ فِي الْمَسْأَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِي نَفْسِكَ، فَقَالَ: «سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ»، فَقَالَ: أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مَنْ قَبْلَكَ، آللهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ؟ فَقَالَ: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ»، قَالَ: أَنْشُدُكَ بِاللهِ، آللهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ؟ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ» قَالَ: أَنْشُدُكَ بِاللهِ، آللهُ أَمَرَكَ أَنْ تَصُومَ هٰذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ؟ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ»، قَالَ: أَنْشُدُكَ بِاللهِ، آللهُ أَمَرَكَ أَنْ تَأْخُذَ هٰذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَائِنَا فَتَقْسِمَهَا عَلٰى فُقَرَائِنَا؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ»، فَقَالَ الرَّجُلُ: آمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهِ، وَأَنَا رَسُولُ مَنْ وَّرَائِي مِنْ قَوْمِي وَأَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ. رَوَاهُ مُوسٰى وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِهٰذَا.

میں سختی کروں گا، آپ دل میں مجھ پر ناراض نہ ہوں۔ آپ نے فرمایا: ”(کوئی بات نہیں) جو چاہے پوچھ!“ اس نے پوچھا: میں آپ کو آپ کے پروردگار اور آپ سے پہلے لوگوں کے مالک کی قسم دے کر پوچھتا ہوں: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں، اللہ گواہ ہے۔“ پھر اس نے پوچھا: میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں، اللہ شاہد ہے۔“ پھر اس نے کہا: میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں، اللہ گواہ ہے۔“ پھر کہنے لگا: میں آپ کو قسم دیتا ہوں، کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے امراء سے صدقہ لے کر ہمارے فقراء پر تقسیم کریں؟ آپ نے فرمایا: ”ہاں، اللہ گواہ ہے۔“ اس کے بعد وہ شخص کہنے لگا: میں اس (شریعت) پر ایمان لاتا ہوں جو آپ لائے ہیں۔ میں اپنی قوم کا نمائندہ بن کر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور قبیلۂ سعد بن بکر سے تعلق رکھتا ہوں۔

اس حدیث کو موسیٰ اور علی بن عبدالحمید نے بھی سلیمان اور ثابت کے واسطے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں حج کا ذکر نہیں ہے کیونکہ روایت میں اختصار ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں حج کا ذکر بایں الفاظ ہوا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص پر حج فرض ہے جو زاد سفر کی استطاعت رکھتا ہو۔[1] نیز حضرت ضمام کی آمد 9 ھ میں ہوئی تو اس وقت حج فرض ہو چکا تھا کیونکہ ان کا تعلق بنو سعد سے ہے جو قبیلۂ ہوازن کا ایک بطن (حصہ) ہے اور قبیلۂ ہوازن غزوۂ حنین کے بعد مسلمان ہوا تھا۔[2] ② اس حدیث سے خبر واحد کے حجت ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے کیونکہ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے اپنی آپ

---

[1] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:102(12). [2] فتح الباري:201/1.

بتی قوم کے سامنے بیان کی تو انھوں نے اس کا اعتبار کیا اور مسلمان ہو گئے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر دادا کی شہرت زیادہ ہو تو اس کی طرف نسبت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[1] ③ امام حاکم نے اس روایت سے عالی سند کے افضل ہونے پر استدلال کیا ہے، نیز اس کا حصول ایک بہترین مشغلہ ہے کیونکہ حضرت ضمام نے اپنی آمد سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے قاصد سے یہ تمام باتیں معلوم کر رکھی تھیں لیکن خود حاضر ہو کر دریافت کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس کوئی روایت چند واسطوں سے ہے اور کسی دوسرے شیخ سے روایت لینے سے ان واسطوں میں کمی آ سکتی ہے تو ملاقات کر کے عالی سند حاصل کر لینی چاہیے۔[2] ④ امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ عرض وقراءت کا طریقہ بھی معتبر ہے، اس میں کوئی خامی نہیں کہ اس کا اعتبار نہ کیا جائے جیسا کہ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے بہت سی دینی باتیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیں اور آپ نے ان کی تصدیق وتصویب فرمائی، پھر حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے پاس گئے تو انھوں نے ان کا اعتبار کیا اور سب کے سب ایمان لے آئے۔

نوٹ: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ ابو محمد بن صغانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بخاری کے نسخۂ بغدادیہ میں حضرت انس سے مروی ایک حدیث درج ہے، دیگر کسی نسخے میں اس حدیث کا وجود نہیں ملتا، لہٰذا ہم نے بھی اسے قلم زد کر دیا ہے۔[3] یاد رہے کہ ہمارے ہندی مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔

(٧) بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ وَكِتَابِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى الْبُلْدَانِ

باب:7- مناولہ کا بیان، نیز اہل علم کا علمی باتیں لکھ کر دیگر شہروں میں بھیجنے کا ذکر

وَقَالَ أَنَسٌ: نَسَخَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الْآفَاقِ، وَرَأَى عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ، وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ وَمَالِكٌ ذٰلِكَ جَائِزًا، وَاحْتَجَّ بَعْضُ أَهْلِ الْحِجَازِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيثِ النَّبِيِّ ﷺ حَيْثُ كَتَبَ لِأَمِيرِ السَّرِيَّةِ كِتَابًا وَقَالَ: لَا تَقْرَأْهُ حَتّٰى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا وَكَذَا، فَلَمَّا بَلَغَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ قَرَأَهُ عَلَى النَّاسِ وَأَخْبَرَهُمْ بِأَمْرِ النَّبِيِّ ﷺ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی کتابت کرائی اور انھیں چاروں طرف بھیج دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، یحییٰ بن سعید اور امام مالک کے نزدیک یہ مکاتبہ جائز ہے۔ بعض اہل حجاز نے مناولہ کے جواز پر نبی ﷺ کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے جبکہ آپ نے امیر لشکر کو ایک مکتوب دیا اور تاکید فرمائی کہ فلاں مقام تک پہنچنے سے قبل تم نے اسے پڑھنا نہیں، جب وہ اس مقام پر پہنچ گئے تو انھوں نے وہ مکتوب لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور انھیں آپ کے حکم کی اطلاع دی۔

وضاحت: علم حدیث کئی ایک طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے جن میں سماع من الشیخ (استاد سے سننا) اور قراءت علی الشیخ

---

① فتح الباري:202/1. ② فتح الباري:201/1. 3 فتح الباري:203/1.

(استاد کو سنانا) کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب مناولہ اور مکاتبہ کا اثبات فرماتے ہیں۔ مناولہ یہ ہے کہ شیخ اپنی مرویات پر مشتمل کوئی کتاب اپنے شاگرد کو دے دے اور اسے کتاب میں درج شدہ روایات بیان کرنے کی اجازت بھی دے دے۔ اگر اجازت نہ دے تو حَدَّثَنِي یا أَخْبَرَنِي کے صیغے سے بیان کرنا جائز نہیں۔ مُکَاتَبَہ یہ ہے کہ شیخ اپنے شاگرد کے پاس چند احادیث پر مشتمل ایک تحریر بھیجتا ہے اور اجازت دیتا ہے کہ تم ان مرویات کو میری سند سے بیان کر سکتے ہو۔ ان میں سے بعض محدثین نے مناولہ کو راجح قرار دیا ہے کہ یہ آمنے سامنے کا معاملہ ہے، جبکہ مکاتبہ میں مکتوب الیہ غائب ہوتا ہے، اور بعض محدثین کے نزدیک مکاتبہ ترجیح یافتہ ہے کیونکہ اس میں ایک استاد اپنے شاگرد ہی کے لیے مرویات لکھتا ہے، اس لیے وہ راجح ہے۔ واضح رہے کہ امام بخاری کے ہاں مناولۂ اصطلاحی کے اثبات کے لیے کوئی صریح دلیل نہیں ہے، اس لیے استدلال کے دائرے کو وسیع کرنے کے لیے مکاتبہ کا ذکر کیا ہے۔ جو مسند احادیث ذکر فرمائی ہیں وہ مکاتبہ کے لیے صریح دلیل ہیں، اصل مقصود ان سے مناولہ کا اثبات ہے۔ واللہ أعلم.

اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے مناولہ اور مکاتبہ کے جواز پر چند دلائل ذکر کیے ہیں: ① ایک یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کی چند ایک نقلیں تیار کر کے مختلف بلاد میں ارسال فرمائیں اور ہدایات دیں کہ انھی کے مطابق تلاوت کی جائے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ارسال کتب بھی ایک معتبر طریقہ ہے۔ جب قرآن مجید کے متعلق مکاتبت کا طریقہ حجت ہو سکتا ہے تو حدیث کے بارے میں تو بدرجۂ اولیٰ معتبر ہونا چاہیے۔ ② دوسری دلیل یہ ہے کہ اسلاف میں بعض نامور حضرات اس کے قائل ہیں، ان میں حضرت عبداللہ بن عمر، یحییٰ بن سعید اور امام مالک رحمہم اللہ سرفہرست ہیں۔ ③ تیسری دلیل یہ ہے کہ بعض اہل حجاز (امام حمیدی) نے مناولہ کے متعلق ایک روایت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقۂ مناولت جائز ہے۔ یہ روایت یہاں مختصر ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اسے آئندہ مفصل بیان کریں گے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے امیر لشکر کو ایک خط دیا تھا اور ہدایت فرمائی تھی کہ فلاں مقام پر پہنچ کر اسے کھولنا ہے اور ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا ہے، چنانچہ وہاں پہنچ کر جب خط کھولا گیا تو اس میں لکھا تھا: سرزمین نخلہ جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے، میں اتر کر قریش کا حال معلوم کر کے ہمیں اس سے مطلع کیا جائے۔ اس سے مناولہ کا اثبات ہو گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امیر لشکر کو صرف تحریر دی، اسے نہ پڑھ کر سنایا اور نہ اس کا مضمون ہی بتایا، البتہ ہدایات دیں، لہٰذا یہ مناولہ مقرون بالاجازہ ہے، نیز اس میں مکاتبہ کا بھی اثبات ہے۔

٦٤ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ بَعَثَ بِكِتَابِهِ رَجُلًا، وَأَمَرَهُ أَنْ يَدْفَعَهُ إِلَى عَظِيمِ الْبَحْرَيْنِ، فَدَفَعَهُ عَظِيمُ الْبَحْرَيْنِ إِلَى كِسْرَى، فَلَمَّا قَرَأَهُ مَزَّقَهُ، فَحَسِبْتُ أَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ

[64] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا خط ایک شخص کے ہمراہ بھیجا اور اس سے فرمایا: ''یہ خط بحرین کے گورنر کو پہنچا دے۔'' پھر حاکم بحرین نے اس کو کسریٰ تک پہنچا دیا۔ کسریٰ نے اسے پڑھ کر چاک کر دیا۔ راوی (ابن شہاب) نے کہا: میرا خیال ہے کہ ابن مسیّب نے کہا: (اس واقعے کو سن کر) رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے بددعا کی کہ وہ ہر طرح ریزہ ریزہ کر دیے جائیں۔

قَالَ : فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُّمَزَّقُوا كُلَّ مُمَزَّقٍ . [انظر : ٢٩٣٩، ٤٤٢٤، ٧٢٦٤]

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اقسام تحمل حدیث بیان فرمانے کے لیے مختلف عنوان قائم کیے ہیں۔ یہ باب مناولہ اور مکاتبہ کے اثبات کے لیے ہے۔ اس حدیث سے مناولہ بایں طور ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کو مکتوب گرامی دیا اور فرمایا کہ یہ خط بحرین کے گورنر کو پہنچا دیں اور اسے بتائیں کہ اسے ایران کے بادشاہ کسریٰ تک پہنچا دے، حالانکہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نہ خود مکتوب پڑھا اور نہ سنا ہی۔ یہ اگرچہ اصطلاحی مناولہ نہیں، تاہم امام بخاری کو اثبات کے لیے معمولی سی مناسبت بھی کافی ہوتی ہے اور مکاتبہ کا انطباق تو بالکل ظاہر ہے۔[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصنف نے عنوان میں دو امور کا ذکر کیا تھا: مناولہ اور مکاتبہ، پھر پیش کردہ حدیث سے عنوان کا دوسرا جز ثابت کیا جس سے جز اول کا ثبوت بطریق اولیٰ نکل آیا ہے۔ ② رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد شاہان عالم کے نام دعوتی خطوط روانہ فرمائے، حدیث میں مذکورہ خط بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس خط کو آپ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا تاکہ وہ بحرین کے گورنر کے ذریعے سے شاہ فارس کسریٰ کو پہنچا دیں۔ یہ زمانہ خسرو پرویز کا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بددعا حرف بحرف پوری ہوئی، چنانچہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا اور وہ خود خطرناک زہر کھانے کے بعد ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سلطنت کے معاملات اس کی بیٹی کے سپرد کیے گئے، وہ اس وسیع سلطنت کا انتظام نہ کر سکی، بالآخر طوائف الملوکی شروع ہو گئی اور سلطنت کا نام ونشان تک مٹ گیا۔[2] ③ اس حدیث سے اہل علم کی علمی باتوں کو تحریر کر کے دیگر ممالک ارسال کرنے کا ثبوت ملتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر مسلم حکومت سے اعلان جنگ سے پہلے اسے دین اسلام کی دعوت دی جائے، اگر وہ بے ادبی اور گستاخی کریں تو ان کے خلاف بددعا کی جائے۔ خبر واحد کی حجیت کا ثبوت بھی اس حدیث سے ملتا ہے۔[3]

٦٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَتَبَ النَّبِيُّ ﷺ كِتَابًا أَوْ أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ فَقِيلَ لَهُ: إِنَّهُمْ لَا يَقْرَؤُنَ كِتَابًا إِلَّا مَخْتُومًا، فَاتَّخَذَ خَاتَمًا مِّنْ فِضَّةٍ نَقْشُهُ: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ، كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِهِ فِي يَدِهِ، فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ: مَنْ قَالَ: نَقْشُهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ؟ قَالَ: أَنَسٌ. [انظر: ٢٩٣٨، ٥٨٧٠، ٥٨٧٢، ٥٨٧٤، ٥٨٧٥، ٥٨٧٧، ٧١٦٢]

[65] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے ایک خط لکھا، یا لکھنے کا ارادہ فرمایا، تو آپ سے کہا گیا: وہ لوگ بغیر مہر لگا خط نہیں پڑھتے۔ تب آپ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کے الفاظ کندہ تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (اس کی خوب صورتی میری نظر میں کھب گئی) گویا میں اب بھی آپ کے ہاتھ میں اس کی سفیدی کو دیکھ رہا ہوں۔

(شعبہ کہتے ہیں) میں نے قتادہ سے پوچھا: اس پر ''محمد

① فتح الباري:205/1. ② شرح الكرماني:22/2. ③ شرح الكرماني:22/2.

رسول اللہ'' کے الفاظ کندہ تھے، یہ الفاظ کس کے بیان کردہ ہیں؟ انھوں نے کہا: حضرت انس رضی اللہ عنہ کے۔

فوائد ومسائل: ① صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اہل عجم کو مکتوب لکھنے کا ارادہ فرمایا (حدیث:5872)، دوسری روایت کے مطابق اہل روم کو خط لکھنے کا پروگرام بنایا (حدیث:5875)، بہرحال جب آپ نے سلاطین عالم کے نام دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو آپ کو بتایا گیا کہ جس خط پر مہر نہ ہو، یہ لوگ اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ چونکہ مقصد ان لوگوں تک دعوت اسلام پہنچانا تھا، اس لیے آپ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بنیاد بنا کر یہ تنبیہ کی ہے کہ مکاتبہ وہ معتبر ہوگا جس پر مہر ہو۔ یہ بھی اعتماد کے لیے ہے۔ اگر مکتوب الیہ تحریر پہچانتا ہو اور اسے اعتماد ہو تو غیر مختوم تحریر پر عمل بھی درست ہے۔ اگر مکتوب الیہ تحریر نہیں پہچانتا اور اسے اعتماد بھی نہیں تو صرف مہر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ مہر بھی جعلی ہو سکتی ہے۔ اس حدیث سے اتنا تو معلوم ہوا کہ علم کے سلسلے میں مکاتبت کا اعتبار ہے لیکن شرط یہی ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک انتقال میں کوئی کمزوری نہ آئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مکاتبت کی صورت بھی مشافہت (رُو در رُو) کی طرح لائق استناد ہے۔ ② آپ نے چاندی کی انگوٹھی اس لیے بنوائی تھی تاکہ آپ کے خطوط کا اعتبار کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ انگوٹھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے پاس رکھا، بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس رہی حتیٰ کہ بئر اریس میں گر گئی اور تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکی۔ انگوٹھی کے متعلق مفصل گفتگو کتاب اللباس میں کی جائے گی۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اقسام تحمل حدیث سے صرف چار کا ذکر کیا ہے: * سماع من الشیخ * قراءۃ علی الشیخ * مناولہ * مکاتبہ۔ باقی اقسام: وجادہ، اعلام، وصیہ، جن میں اجازت نہیں ہوتی، کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ امام بخاری کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔[1]

(٨) بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ، وَمَنْ رَأَى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا

باب:8- علمی مجالس میں جو شخص مجلس کے آخر ہی میں بیٹھ گیا اور جس نے حلقے کے اندر جگہ دیکھی اور وہاں جا کر بیٹھا

وضاحت: اقسام تحمل حدیث بیان کرنے کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ علمی مجالس میں شرکت کے آداب بیان کرتے ہیں کہ علمی مجلس میں جہاں جگہ میسر ہو وہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ ان مجالس سے روگردانی کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اگر تکبر کی وجہ سے اعراض ہے تو حرام، اگر بے پروائی کی بنا پر ایسا ہو تو اگرچہ حرام نہیں، تاہم علم سے محرومی تو ہے۔

٦٦ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ: إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ: أَنَّ أَبَا مُرَّةَ

[66] حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں لوگوں کے ہمراہ بیٹھے ہوئے

1 فتح الباري:1/205.

مَوْلٰى عَقِيلِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ إِذْ أَقْبَلَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ، فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَذَهَبَ وَاحِدٌ قَالَ: فَوَقَفَا عَلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأٰى فُرْجَةً فِي الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا، وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَأَمَّا الثَّالِثُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ: أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوٰى إِلَى اللهِ تَعَالٰى فَآوَاهُ اللهُ إِلَيْهِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَا فَاسْتَحْيَا اللهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ». [انظر: ٤٧٤]

تھے، اتنے میں تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آ گئے اور ایک واپس چلا گیا۔ راوی نے کہا کہ وہ دونوں کچھ دیر رسول اللہ ﷺ کے پاس ٹھہرے رہے۔ ان میں سے ایک نے حلقے میں گنجائش دیکھی تو بیٹھ گیا اور دوسرا سب سے پیچھے بیٹھ گیا، تیسرا تو واپس ہی جا چکا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ (وعظ سے) فارغ ہوئے تو فرمایا: ''کیا میں تمھیں ان تینوں آدمیوں کا حال نہ بتاؤں؟ ان میں سے ایک نے اللہ کی طرف پناہ لی تو اللہ نے بھی اسے اپنی طرف جگہ دے دی اور دوسرا شرمایا تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی اور تیسرے نے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض فرمایا۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے علمی مجلس کے آداب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی طالب علم یا کوئی دوسرا خواہشمند شیخ کے نزدیک بیٹھنا چاہتا ہے تو اسے بروقت آنا چاہیے۔ اسے اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اہل مجلس کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے بہتر ہے کہ سب سے آخر میں بیٹھ جائے۔ مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے کسی ایک کی دوسرے پر برتری ثابت کرنا مقصود نہیں۔ فیوض و برکات کے اعتبار سے تمام اہل مجلس برابر ہیں۔ ایسی مجالس پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ② اگر بعد میں آنے والا دیکھتا ہے کہ شیخ کے پاس جگہ خالی ہے تو اسے اجازت ہے کہ وہ حاضرین کے پاس سے گزر کر خالی جگہ میں بیٹھ جائے۔ یہ تخطیٔ رقاب (گردنیں پھلانگ کر جانا) نہیں جو شرعاً ممنوع ہے۔ یہ اس لیے جائز ہے کہ پہلے سے بیٹھنے والوں نے بدنظمی کی ہے اور آگے جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ اس سے آگے بیٹھنے والے کے شوق اور رغبت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس بنا پر وہ پیچھے بیٹھنے والے سے افضل ہوگا کیونکہ اسے حصول خیر کا شوق زیادہ ہے۔[1] ③ حدیث میں ہے کہ دوسرے شخص نے حیا کا معاملہ کیا۔ اس کے دو معنی ہیں: (ا) شرم کی وجہ سے اس نے اہل مجلس سے مزاحمت نہیں کی بلکہ جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا، مقصد تو علمی مجلس میں شریک ہونا تھا، اہل مجلس کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ؟ (ب) بیٹھنے کا خیال تو نہ تھا مگر اہل مجلس سے شرم کرتے ہوئے پیچھے بیٹھ گیا۔ حدیث میں یہی معنی مقصود ہیں کیونکہ دوسری روایت میں ہے کہ یہ شخص مجلس سے آگے نکل چکا تھا مگر اسے شرم دامن گیر ہوئی تو واپس آیا اور بیٹھ گیا۔[2] ایسی صورت میں لَايَشْقٰى جَلِيسُهُمْ کے تحت معاملہ ہوگا۔ ④ اس حدیث سے اللہ تعالیٰ کی صفت حیا کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض اہل علم نے اس کی تاویل کی ہے کہ اس سے مراد رحم کرنا اور کسی کو عذاب نہ دینا ہے لیکن محققین

---

① فتح الباري:207/1. ② المستدرك للحاكم:255/4.

اسلاف نے اس انداز کو پسند نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک قابل تعریف موقف یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جوں کا توں تسلیم کیا جائے۔
⑤ تیسرے شخص کے بے رخی کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ منافق تھا، کیونکہ اخلاص کے باوجود بعض اوقات انسان اپنی ضروریات کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے، اتنی بات ضرور ہے کہ وہ خاص رحمت جو اہل حلقہ پر ہورہی تھی، اس سے وہ محروم رہ گیا۔

(٩) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «رُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى [مِنْ] سَامِعٍ»

باب: 9- ارشاد نبوی: ''بسا اوقات وہ شخص جسے حدیث پہنچائی جائے، وہ سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے'' کا بیان

وضاحت: اس سے امام بخاری کا مقصد تبلیغ کی ضرورت واہمیت اور اس کے فوائد کا اثبات ہے۔

٦٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا بِشْرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ أَبِي بَكْرَةَ، عَنْ أَبِيهِ: ذَكَرَ النَّبِيَّ ﷺ قَعَدَ عَلٰى بَعِيرِهِ وَأَمْسَكَ إِنْسَانٌ بِخِطَامِهِ أَوْ بِزِمَامِهِ ثُمَّ قَالَ: «أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟» فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ سِوَى اسْمِهِ، قَالَ: «أَلَيْسَ يَوْمَ النَّحْرِ؟» قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: «فَأَيُّ شَهْرٍ هٰذَا؟» فَسَكَتْنَا حَتّٰى ظَنَنَّا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ فَقَالَ: «أَلَيْسَ بِذِي الْحِجَّةِ؟» قُلْنَا: بَلٰى، قَالَ: «فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا، لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسٰى أَنْ يُبَلِّغَ مَنْ هُوَ أَوْعٰى لَهُ مِنْهُ».
[انظر: ١٠٥، ١٧٤١، ٣١٩٧، ٤٤٠٦، ٤٦٦٢، ٥٥٥٠، ٧٠٧٨، ٧٤٤٧]

[67] حضرت ابوبکرہ ؓ سے روایت ہے، ایک دفعہ نبی ﷺ اپنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک شخص اس کی نکیل یا باگ تھامے ہوئے تھا، آپ نے فرمایا: ''یہ کون سا دن ہے؟'' ہم لوگ اس خیال سے خاموش رہے کہ شاید آپ اس کے اصل نام کے علاوہ کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ نے فرمایا: ''یہ قربانی کا دن نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''یہ کون سا مہینہ ہے؟'' ہم پھر اس خیال سے چپ رہے کہ شاید آپ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا یہ ماہ ذوالحجہ نہیں؟'' ہم نے کہا: کیوں نہیں۔ تب آپ نے فرمایا: ''تمھارے خون، تمھارے مال اور تمھاری آبروئیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسا کہ تمھارے ہاں اس شہر اور اس مہینے میں اس دن کی حرمت ہے۔ چاہیے کہ جو یہاں حاضر ہے وہ غائب کو یہ خبر پہنچا دے، اس لیے کہ شاید حاضر ایسے شخص کو خبر کر دے جو اس بات کو اس سے زیادہ یاد رکھے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے دو مقاصد کے پیش نظر اس حدیث کو بیان فرمایا ہے: ٭ تبلیغ کی اہمیت سے ہمیں آگاہ کرنا، یعنی اگر کوئی شخص حدیث کے معانی کو نہ سمجھتا ہو بلکہ اس نے صرف الفاظ ہی یاد کر رکھے ہوں تو اسے چاہیے کہ وہ ان

الفاظ کو دوسروں تک پہنچا دے، ممکن ہے کہ کوئی شاگرد یا سامع اس سے زیادہ سمجھدار ہو اور وہ اس حدیث سے مسائل کا استخراج و استنباط کرے۔ * اس بات پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ اگر کوئی طالب علم ہونہار اور سمجھدار ہو اور استاد اتنا ذہین و فطین نہ ہو تو طالب علم کو اس سے تحصیل علم کے متعلق کوئی شرم یا عار نہیں ہونی چاہیے۔ خود امام بخاری رحمہ اللہ کو لیجیے کہ ان کے اساتذہ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، اس لیے یہ تصور غلط ہے کہ شاگرد استاد کے مقابلے میں ہمیشہ ادنیٰ اور کمزور ہی ہوتا ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بوقت ضرورت امام، خطیب یا محدث سواری پر بیٹھے ہوئے بھی وعظ کر سکتا ہے، خطبہ بھی دے سکتا ہے، شاگردوں سے سوال و جواب بھی کر سکتا ہے، نیز شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاد کی تشریح اور تفصیل کا انتظار کرے اور خود جواب دینے میں جلدی نہ کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض شاگرد فہم و حفظ میں اپنے اساتذہ سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ③ رسول اللہ ﷺ نے یہ خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر دسویں تاریخ کو جمرات کے پاس کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔[1] ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حاضرین سے دریافت فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے خاموشی اختیار کی۔ اور صحیح بخاری ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ آج یوم النحر ہے۔ (حدیث: 1739) ان روایات میں تعارض نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے حضرت ابوبکرہ کے قریب جو لوگ تھے وہ خاموش رہے ہوں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھیوں نے جواب دیا ہو اور ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق روایت بیان کر دی۔[2]

(١٠) بَابٌ: اَلْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

لِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: ﴿فَٱعْلَمْ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا ٱللَّهُ﴾ [محمد: ١٩] فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ، وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَرَّثُوا الْعِلْمَ، مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ، وَقَالَ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَٰٓؤُا۟﴾ [فاطر: ٢٨] وَقَالَ: ﴿وَمَا يَعْقِلُهَآ إِلَّا ٱلْعَٰلِمُونَ﴾ [العنكبوت: ٤٣]، ﴿وَقَالُوا۟ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىٓ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ﴾ [الملك: ١٠] وَقَالَ: ﴿هَلْ يَسْتَوِى ٱلَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [الزمر: ٩] وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ»

باب: 10 - علم کا مرتبہ گفتار و کردار سے پہلے ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ جان لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں (اور اپنے گناہوں سے استغفار کریں۔'') اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتدا کی ہے اور علماء، حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ ان انبیاء نے وراثت میں علم چھوڑا ہے۔ جس نے اس علم کو حاصل کیا، اس نے انبیاء کی میراث کا وافر حصہ حاصل کر لیا اور جو شخص حصول علم کے لیے کسی راستے پر گامزن ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دے گا، نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ''قرآن کی بیان کردہ مثالوں کو صرف علماء ہی سمجھتے ہیں۔'' ''اہل جہنم کہیں گے: اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو

① صحيح البخاري، الحج، حديث: 1742. ② فتح الباري: 210/1.

وَ«إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ» وَقَالَ أَبُو ذَرٍّ: لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصَامَةَ عَلٰى هٰذِهِ - وَأَشَارَ إِلٰى قَفَاهُ - ثُمَّ ظَنَنْتُ أَنِّي أُنْفِذُ كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ أَنْ تُجِيزُوا عَلَيَّ لَأَنْفَذْتُهَا، وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: ﴿كُونُوا رَبَّٰنِيِّـۧنَ﴾ [آل عمران:٧٩]: حُلَمَاءَ، فُقَهَاءَ، عُلَمَاءَ، وَيُقَالُ: اَلرَّبَّانِيُّ الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ.

دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔" نیز فرمایا: "کیا جاہل اور عالم برابر ہو سکتے ہیں؟" نبی ﷺ نے فرمایا: "جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے، اسے دینی معاملات میں بصیرت عطا کر دیتا ہے۔" اور "علم تو سیکھنے ہی سے آتا ہے۔"

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی گدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اگر تم شمشیر براں میری گردن پر رکھ دو اور مجھے گمان ہو کہ میں گردن الگ ہونے سے پہلے پہلے اپنی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بیان کر سکوں گا جسے میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے، تو میں ضرور اس کلمے کو ادا کروں گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کُوْنُوْا رَبَّانِیّٖنَ کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: دانشور، اہل علم اور فقہاء بن جاؤ۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ربانی وہ ہے جو بڑے مسائل سے قبل چھوٹے چھوٹے مسائل سے لوگوں کی تربیت کرے۔

وضاحت: اسلام میں علم اور عمل دونوں پر زور دیا گیا ہے کیونکہ عمل صحیح کے لیے قرآن و حدیث کا علم ضروری ہے اور علم صحیح کے بغیر عمل ممکن نہیں، اس لیے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم علم کو عمل پر تقدم حاصل ہے، یعنی پہلے علم ہوگا تو عمل ہوگا لیکن اس تقدم کا مطلب یہ نہیں کہ عمل کی خاص اہمیت نہیں۔ * حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام سفیان بن عیینہ نے مذکورہ آیت ﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ......﴾ سے علم کی فضیلت پر استدلال کیا ہے کہ آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں: ایک علم دوسرا عمل، یعنی استغفار۔ گویا پہلے علم کا حکم ہے پھر استغفار، یعنی عمل کا۔ علاوہ ازیں آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے لیکن یہ حکم پوری امت کو شامل ہے۔[1] * علماء، حضرات انبیاء کے وارث ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے ارشاد نبوی کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا اگرچہ ابوداود اور ترمذی میں حدیث کے طور پر اس کا ذکر ہے لیکن اس میں اضطراب کی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی طرف التفات نہیں فرمایا، تاہم ان کا عنوان میں ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کی کوئی بنیاد ضرور ہے، علاوہ ازیں شواہد کی وجہ سے اس کو تقویت مل جاتی ہے۔ اسی لیے شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔[2] اس کا عنوان سے بایں طور تعلق ہے کہ وارث، مورِث کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس کا مقام اور مرتبے کے لحاظ سے مورث کا حکم ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: "اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔" اس کا مطلب ہے کہ علم شرط خشیت ہے، یہ نہیں

[1] فتح الباري:211/1. [2] صحيح سنن أبي داود، العلم، حديث:3641.

کہ جو عالم بنا اس میں خشیت ضرور ہی آ جائے گی، نیز علماء سے مراد علمائے آخرت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو صحیح معنوں میں طلب آخرت کی نیت سے علم حاصل کرتے ہیں، انھیں خشیت کی دولت ضرور نصیب ہو جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ﴾ کا مطلب ہے کہ قرآن مجید میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے مثالیں دی گئی ہیں۔ ان سے فوائد حاصل کرنا اہل علم ہی کا کام ہے، یعنی عالم ہی سمجھ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے یہ مثال موزوں ہے۔ اہل جہنم کے دخول نار کا سبب علم کا نہ ہونا بتایا گیا ہے کیونکہ حصول علم کے دو طریقے، سمع اور عقل ہیں۔ اہل جہنم نے دونوں طریقوں سے روگردانی کی، نہ دلائل سننے کی کوشش کی اور نہ عقل سے کام لیا۔

''علم پڑھنے پڑھانے سے آتا ہے۔'' یہ امام بخاری کا قول نہیں بلکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث کا حصہ ہے جسے امام طبرانی اور ابن ابی عاصم نے بیان کیا ہے۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ کتب کے مطالعہ سے وقتی طور پر معلومات میں اضافہ تو ہو سکتا ہے لیکن حقیقی علم اساتذہ کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے ہی سے آتا ہے، اس کی بقا پڑھنے اور پڑھانے سے ہے، نیز جس علم کے فضائل بیان کیے جا رہے ہیں اس کا مدار تعلم (سیکھنے) پر ہے۔ * ''اگر شمشیر براں میری گردن پر رکھ دو......'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی صاف گو طبیعت میں کچھ تشدد تھا، اس بنا پر انھیں فتویٰ دینے سے روک دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ موسم حج میں جمرۂ وسطیٰ کے پاس تشریف فرما تھے، لوگ آپ سے سوال کرتے، آپ انھیں جواب دیتے، اس اثنا میں کسی نے کہا کہ آپ کو تو فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہے؟ تو اس وقت آپ نے فرمایا کہ جب تک میری گردن صحیح ہے کوئی آدمی مجھے حق گوئی سے نہیں روک سکتا۔ اسے مسند داری میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔[2] اس میں بھی فضیلت تبلیغ کی طرف اشارہ ہے جو مقصود بالذات ہے۔

رَبَّانِيِّين کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عالمین کو کوئی مقام نہیں دیا بلکہ علم کے درجات بیان کیے ہیں۔ امام بخاری نے ربانی کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ بھی علم ہی سے متعلق ہے، یعنی جو علمی تربیت میں ترتیب کا خیال رکھے، پہلے چھوٹی باتیں بتائے اور پھر بڑی باتیں کہے، یعنی جزئیات سے شروع کر کے کلیات تک پہنچا دے، یا پہلے مقدمات کی تعلیم دے پھر مقاصد سکھائے۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں کوئی موصول مرفوع حدیث ذکر نہیں کی بلکہ قرآنی آیات سے استدلال پر اکتفا کیا ہے۔ ان ارشادات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم خود صاحب فضیلت ہے، اس کے حاصل کرنے میں انتہائی کوشش کرنی چاہیے۔ اور یہ خیال صحیح نہیں کہ اس کے ساتھ اگر عمل نہ ہو تو اس کا کوئی شرف نہیں ہے۔ یقیناً عمل کی بھی اگرچہ بہت بڑی اہمیت ہے، تاہم اس کی جو کچھ بھی اہمیت ہے، علم کے بعد ہی ہے، علم کو بہر حال تقدم کا درجہ حاصل ہے۔ امام صاحب اسی نکتے کو واضح فرما رہے ہیں، عمل کی اہمیت سے انکار مقصود نہیں۔ واللہ أعلم.

---

(1) المعجم الكبير للطبراني: 19/392، والسلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث:342. (2) مسند الدارمي، حديث:572.

(3) فتح الباري:1/213.

(١١) بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْ لَا يَنْفِرُوا

باب:11- نبی ﷺ وعظ و تعلیم میں (موقع و محل کا) خیال رکھتے تا کہ لوگ متنفر نہ ہو جائیں

وضاحت: پہلے ابواب میں تبلیغ اور حصول علم کی اہمیت بیان کی گئی تھی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر وقت تبلیغ و تعلیم ہی میں لگا رہے بلکہ ان کے لیے ایسا طریقۂ کار وضع کیا جائے جو لوگوں کے لیے باعث کشش ہو کیونکہ ہر وقت ایک ہی کام کرنے سے دل اکتا جاتا ہے اور طبیعت میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

٦٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. [انظر: ٧٠، ٦٤١١]

[68] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ ہمارے اکتا جانے کے اندیشے سے ہمیں وعظ و نصیحت کرنے کے لیے وقت اور موقع و محل کا خیال رکھتے تھے۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و تعلیم کے لیے کچھ ایسے اوقات مقرر کیے جائیں جن میں سامعین اور متعلمین فراغت اور اطمینان کے ساتھ اسے جاری رکھ سکیں اور خوش دلی کے ساتھ اس کے سننے اور اس سے مستفید ہونے میں لگے رہیں۔ اگر ہر وقت تبلیغ ہوتی رہے یا تعلیم دی جاتی رہے تو اس سے سامعین اور متعلمین اکتا کر کوتاہی کرنے لگ جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نشاط و ملال اور حوائج و فراغت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی صرف جمعرات کے دن وعظ و تبلیغ کرتے، لوگوں کے اصرار کے باوجود روزانہ تذکیر و تبلیغ سے احتراز کرتے تھے۔[1]

٦٩ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبُو التَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا». [انظر: ٦١٢٥]

[69] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''(دین میں) آسانی کرو، سختی نہ کرو اور لوگوں کو خوشخبری سناؤ، انھیں (ڈرا ڈرا کر) متنفر نہ کرو۔''

فوائد و مسائل: ① اصول تعلیم یہ ہے کہ تعلیم کے لیے نشاط اور دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔ اس میں زیادہ شدت صحیح نہیں کہ طلباء کے دماغ تھک جائیں اور بالآخر وہ اپنے اندر بے دلی اور کم ہمتی محسوس کرنے لگیں۔ حدیث بالا میں اسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابتدائی طور پر ڈرانے دھمکانے کا عمل نفرت کا باعث ہوتا ہے، اس لیے خوشخبری کے مقابلے

---

1 فتح الباري:214/1.

میں نفرت کو بیان کیا گیا ہے، حالانکہ خوشخبری کے مقابلے میں ڈرانا ہوتا ہے، اس لیے ایک مبلغ اور معلم کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرے، ڈرانے دھمکانے سے نفرت پیدا ہوگی، نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ گھبرا کر ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے۔[1] ② واعظین کو چاہیے کہ وہ وعظ کرتے وقت ایسا پرکشش اور جاذب نظر اسلوب اختیار کریں جس سے لوگوں کے دلوں میں رغبت و محبت پیدا ہو، صرف قرآن وحدیث میں آمدہ وعیدوں ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ قرآن کریم کے طرز پر بشارت و انذار کو ساتھ ساتھ رکھا جائے۔ اگر ہمیشہ بشارت ہی دی جائے گی تو لوگ رحمت پر بھروسہ کر کے بے خوف ہو جائیں گے، اور اگر وعید ہی وعید پر زور ہوگا تو لوگ رحمت سے مایوس ہو جائیں گے اور یہ دونوں چیزیں ایک متلاشیٔ حق کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ مذکورہ حدیث میں تعلیم و تبلیغ کے لیے ایک درمیانی راہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(١٢) بَابُ مَنْ جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَعْلُومَةً

باب: 12- اہل علم کے لیے تعلیمی اوقات کی تعیین کرنا

وضاحت: علم ایک ایسی عظیم الشان چیز ہے جس کے لیے تقسیم کار اور تعلیمی اوقات کا ہونا ضروری ہے تاکہ تعلیم و تعلم کے عمل میں سہولت رہے۔

٧٠ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: كَانَ عَبْدُ اللهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَاأَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَوْمٍ، قَالَ: أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذٰلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. [راجع: ٦٨].

[70] حضرت ابووائل سے روایت ہے، انھوں نے کہا: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات لوگوں کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ و نصیحت فرمایا کریں۔ آپ نے فرمایا: مجھے اس کام سے یہ چیز مانع ہے کہ میں تمھیں اکتاہٹ میں نہیں ڈالنا چاہتا اور میں پند و نصیحت میں تمھارے جذبات کا خیال رکھتا ہوں جس طرح نبی ﷺ وعظ کرتے وقت ہمارے جذبات کا خیال رکھتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔

فوائد و مسائل: ① تعلیمی نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے اوقات تعلیم کی تقسیم اور تعیین ضروری ہے، اسی طرح وعظ و نصیحت کے لیے اگر کوئی دن مقرر کر لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ اسے بدعت ہی کہا جا سکتا ہے، بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے تاکہ معلمین اور متعلمین کا تعلیمی وقت ضائع نہ ہو۔ اگر اوقات کی تعیین نہ ہو تو ممکن ہے کہ استاد تو موجود ہو لیکن طلباء لاپتہ ہوں، یا

① فتح الباري:1/215.

طلباء تو حاضر ہوں لیکن معلم حضرات غائب ہوں، لہٰذا تعلیمی انتظام کے لیے ایام کی تعیین میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی بنیاد تو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں قائم ہو چکی تھی اور اعیان صحابہ بھی اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے مدعا ثابت کرنے کے لیے ایک موقوف حدیث کا سہارا لیا ہے لیکن چونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک عمل کے لیے رسول اللہ ﷺ کے فعل سے استنباط کیا ہے، اس لیے دن کی تعیین کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(١٣) بَابُ مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

باب: 13- جس کے ساتھ اللہ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے

وضاحت: دینی معاملات میں تفقہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان قرآن وحدیث کا شوق سے مطالعہ کرے تاکہ وہ دینی امور میں صحیح چھان بین اور اصل ونقل کے فرق کو سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ دینی بصیرت سے نابلد مدعیانِ جبہ و دستار کے متعلق کہا گیا ہے: نیم حکیم خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمَا.

٧١ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: قَالَ حُمَيْدُ ابْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ: سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ خَطِيبًا يَقُولُ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللهُ يُعْطِي، وَلَنْ تَزَالَ هٰذِهِ الْأُمَّةُ قَائِمَةً عَلٰى أَمْرِ اللهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ».

[انظر: ٣١١٦، ٣٦٤١، ٧٣١٢، ٧٤٦٠]

[71] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے دوران خطبہ میں کہا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عنایت کر دیتا ہے۔ اور میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور دینے والا تو اللہ ہی ہے۔ اور (اسلام کی) یہ جماعت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی، جو ان کا مخالف ہوگا انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم، یعنی قیامت آ جائے۔''

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں تین باتیں بیان ہوئی ہیں: ○ فقہ فی الدین کی عظمت۔ ○ تفقہ فی الدین عطیۂ الٰہی ہے۔ ○ اس کے حاملین قیامت تک رہیں گے۔ جہاں تک اس کی عظمت کا تعلق ہے وہ تو محتاج بیان نہیں کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو انسان دینی معاملات سے بے بہرہ اور قواعد اسلام سے نابلد ہے، وہ خیر و برکت سے تہی دست ہے۔ ② ایک حدیث میں ہے کہ جو انسان دینی امور میں تفقہ حاصل نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی پروا نہیں۔ اگرچہ اس کی سند کمزور ہے، تاہم اس کے معنی صحیح ہیں، نیز تفقہ فی الدین عطیۂ الٰہی ہے، صرف محنت اور کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔ خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے جو علوم دیے گئے ہیں، میں انھیں تقسیم کرنے والا ہوں۔ میری طرف سے کوئی روک یا بخل نہیں ہے۔ جس قدر کسی کے دل میں اس کے حصول کی تڑپ ہوگی وہ اتنا ہی ان علوم سے بہرہ ور ہوگا۔ ③ اس کی عظمت بایں طور بھی ہے کہ ان علوم سے فیض یاب

ہونے والے تا قیامت رہیں گے۔ امام احمد بن حنبل ؒ فرماتے ہیں کہ اگر طائفۂ منصورہ سے مراد اہل حدیث نہیں ہیں تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سا گروہ ہوسکتا ہے۔ اس سے بھی محدثین عظام کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔[1] امر اللہ سے مراد وہ ہوا ہے جو قرب قیامت کے وقت چلے گی اور اہل ایمان کی ارواح کو قبض کر لے گی۔ اس کے بعد صرف اشرار و کفار باقی رہ جائیں گے، پھر انھی پر قیامت قائم ہوگی۔

(١٤) بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

باب:14- علم میں فہم و بصیرت کا بیان

وضاحت: پہلا باب دینی معاملات میں تفقہ سے متعلق تھا، اب مطلق فہم و بصیرت کا بیان ہے۔

٧٢ - حَدَّثَنَا عَلِيٌّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ أَبِي نَجِيحٍ: عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ: صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَمْ أَسْمَعْهُ يُحَدِّثُ عَنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ إِلَّا حَدِيثًا وَّاحِدًا قَالَ: كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَأُتِيَ بِجُمَّارٍ فَقَالَ: «إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً مَثَلُهَا كَمَثَلِ الْمُسْلِمِ»، فَأَرَدْتُ أَنْ أَقُولَ: هِيَ النَّخْلَةُ، فَإِذَا أَنَا أَصْغَرُ الْقَوْمِ فَسَكَتُّ. قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «هِيَ النَّخْلَةُ».

[راجع: ٦١]

[72] حضرت مجاہد کہتے ہیں: میں حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے ساتھ مدینے تک رہا لیکن میں نے انھیں ایک حدیث کے سوا اور کوئی چیز رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہوئے نہیں سنا۔ انھوں نے کہا: ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ کی خدمت میں کھجور کا گودا لایا گیا۔ آپ نے فرمایا: ''درختوں میں ایک ایسا درخت ہے جس کی مثال مسلمان کی طرح ہے۔'' میں نے ارادہ کیا کہ بتاؤں وہ کھجور ہے لیکن میں لوگوں میں سب سے چھوٹا تھا، اس لیے خاموش رہا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''وہ کھجور کا درخت ہے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس سے پہلے تفقہ فی الدین کی فضیلت بیان کی تھی اور اس باب میں فہم مطلق کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ اگرچہ اس حدیث میں کسی فضیلت کا ذکر نہیں ہے لیکن حدیث نمبر 131 جو مفصل ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ نے اپنے والد گرامی سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقصد کو میں سمجھ گیا تھا لیکن بڑوں کو خاموش دیکھ کر میں بھی خاموش رہا، مبادا آپ کو ناگوار گزرے۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا: اگر تم اس وقت اس کا اظہار کر دیتے تو مجھے اس قدر خوشی ہوتی کہ سرخ اونٹ بھی اس خوشی کے مقابلے میں کم تر ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم میں فہم بھی ایک فضیلت کی چیز ہے۔ ② حضرت ابن عمر ؓ کی ذہانت و فطانت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں خوشۂ کھجور سے نکلنے والا مغز لایا گیا اور آپ نے اسے تناول فرمانا شروع کیا۔ اس کے بعد آپ نے حاضرین کے سامنے سوال پیش کیا۔ اس مجموعی

① فتح الباري:1/216.

صورت حال سے انھوں نے اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ کھجور کا درخت ہے لیکن حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر اصحاب کی موجودگی میں لب کشائی کو نامناسب خیال کرتے ہوئے آپ خاموش رہے۔ رضی اللہ عنہ۔③ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ طالب علم کو مطالعہ کرنے کی عادت پیدا کرنی چاہیے اور قوت مطالعہ بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کا طریقہ بھی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مناسبات کو مدنظر رکھا جائے اور بوقت مطالعہ اوپر نیچے سب طرف نظر رکھی جائے اور غور وفکر کیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب نخلہ (کھجور کے درخت) کے متعلق سوال کیا تو اس وقت آپ اس کا گودا کھا رہے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مناسبات کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال کی تہ تک پہنچ گئے کہ وہ تو کھجور کا درخت ہے۔

(١٥) بَابُ الْاِغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

باب:15- علم وحکمت میں رشک کرنا

وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: تَفَقَّهُوا قَبْلَ أَنْ تُسَوَّدُوا - [قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَبَعْدَ أَنْ تُسَوَّدُوا] - وَقَدْ تَعَلَّمَ أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ فِي كِبَرِ سِنِّهِمْ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرو۔ ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: سردار بننے کے بعد بھی علم حاصل کرو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی عمر میں علم حاصل کیا۔

وضاحت: علم بہت قابل قدر دولت ہے۔ جس شخص کے پاس یہ نعمت ہو تو وہ قابل رشک ہے۔ جب علم اتنی بڑی نعمت ہے تو ذمے داریوں کا بوجھ پڑنے سے پہلے پہلے اسے حاصل کرنا چاہیے کیونکہ سیادت جیسی ذمے داری کے بعد تحصیل علم میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کے متعلقہ حقوق وفرائض میں اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھی وجوہات کے پیش نظر فرمایا کہ سیادت سے قبل علم حاصل کرو۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ سیادت کے بعد علم حاصل کرنے سے منع فرما رہے ہیں کیونکہ آپ کا یہ فرمان حصر کے لیے نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جاہل کی سیادت بربادی کا باعث ہوتی ہے، اس لیے سیادت کے بعد بھی علم حاصل کرنا چاہیے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بڑی عمر میں علم دین سیکھا، باوجود اس کے کہ وہ اپنے گھروں میں سرداری کرتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ (727/8) وغیرہ میں موصولاً مروی ہے۔

٧٣ - حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنِي إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي خَالِدٍ عَلَى غَيْرِ مَا حَدَّثَنَاهُ الزُّهْرِيُّ قَالَ: سَمِعْتُ قَيْسَ بْنَ أَبِي حَازِمٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٍ آتَاهُ اللهُ مَالًا فَسُلِّطَ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٍ

[73] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ''رشک جائز نہیں مگر دو (آدمیوں کی) خصلتوں پر: ایک اس شخص (کی عادت) پر جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اسے راہ حق میں خرچ کرتا ہو۔ اور دوسرے اس شخص (کی عادت) پر جسے اللہ نے (قرآن وحدیث کا) علم دے رکھا ہو اور وہ اس کے مطابق

آتَاهُ اللهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا». فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتا ہو۔"

[انظر: ١٤٠٩، ٧١٤١، ٧٣١٦]

فوائد و مسائل: ① رشک یہ ہے کہ کسی میں اچھی صفت یا نعمت دیکھ کر انسان خوش ہو اور اپنے لیے اس کی تمنا کرے۔ اگر مقصود یہ ہو کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے تو اسے حسد کہتے ہیں اور یہ قابل مذمت ہے، نیز حسد ہمیشہ کسی خوبی اور کمال ہی پر ہوا کرتا ہے، خواہ کمال علمی ہو یا عملی۔ حدیث کے پہلے جملے کا تعلق کمال عملی سے ہے اور دوسرے کا کمال علمی سے۔ اسی طرح فضائل بھی دو طرح کے ہوتے ہیں: ظاہری اور باطنی۔ ظاہری فضائل میں اصل اصول مالداری ہے اور باطنی فضائل میں اصل اصول علم ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں لفظ غبطہ بڑھا دیا جس کے معنی رشک کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں لفظ حسد اپنے معنی میں استعمال نہیں ہوا بلکہ وہ غبطہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث میں یہ اضافہ موجود ہے کہ جب اس کا پڑوسی اس کا قرآن پڑھنا پڑھانا دیکھتا ہے تو کہتا ہے: کاش مجھے بھی قرآن کی یہ دولت ملے تو میں بھی اسی طرح کروں جس طرح وہ کرتا ہے۔[1] اور جب اس کی جود و سخا کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ مجھے بھی اس جیسی مال کی فراوانی ملے تو میں بھی اسی طرح خرچ کروں جس طرح وہ خرچ کرتا ہے۔[2] اس حدیث میں جس طرح پڑوسی نے اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے یہ صرف غبطے میں ہو سکتا ہے، حسد میں یہ انداز نہیں ہوتا۔[3] ③ حدیث میں حسد کو اپنے حقیقی معنی میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا، یعنی اگر کوئی چیز قابل حسد ہو سکتی تو وہ صرف دو تھیں: ایک کمال علمی اور دوسرا کمال عملی جو جود و سخا سے متعلق ہے، لیکن جب یہ بھی جائز نہیں تو باقی چیزوں میں تو یقینی طور پر حرام ہے۔[4] ④ حسد حرام اور ناجائز ہے لیکن علمائے امت نے ایک مقام پر حسد کو جائز رکھا ہے، وہ یہ کہ اگر کسی کافر یا فاسق کے پاس علم اور مال کی دولت ہو اور وہ اسے اللہ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہو اور لوگوں کو ان کے ذریعے سے گمراہ کرتا ہو تو ایسے حالات میں اس سے اس نعمت کے چھن جانے کی تمنا جائز ہی نہیں بلکہ باعث ثواب بھی ہے۔[5] ⑤ مال دار کا عموماً یہ حال ہوتا ہے کہ مال اس کے دل پر حاوی ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس کی کمزوری بن جاتا ہے، لیکن اگر وہ اسے پورے طور پر خرچ کرتا ہے تو دنیا و آخرت میں اس کی عزت کا باعث ہے۔ اس میں فِي الْحَقِّ کی قید اس لیے لگائی ہے تاکہ اسراف و تبذیر کا گمان نہ ہو۔[6]

(١٦) بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي الْبَحْرِ إِلَى الْخَضِرِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ

باب: 16- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا میں حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جانے کا بیان

وَقَوْلِهِ تَعَالٰى: ﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰى أَنْ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: "(موسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا:) کیا

---

① صحيح البخاري، فضائل القرآن، حديث:5026. ② صحيح البخاري، التمني، حديث:7232. ③ فتح الباري:220/1.

④ فتح الباري:220/1. ⑤ فتح الباري:219/1. ⑥ فتح الباري:219/1.

تُعَلِّمَنِي﴾ اَلْآيَةُ [الكهف: ٦٦].

(اس شرط پر) میں تیرا اتباع کرسکتا ہوں کہ تو مجھے اس میں سے سکھائے جو تجھے بھلائی سکھائی گئی ہے۔"

وضاحت: حصول علم کے لیے سیادت کو رکاوٹ نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ مشکلات ہی کی پروا کرنی چاہیے بلکہ اس کے حصول کے لیے اگر بحری (لمبا اور پرخطر) سفر بھی کرنا پڑے تو اس سے گریز نہ کیا جائے۔

٧٤ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غُرَيْرٍ الزُّهْرِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، حَدَّثَهُ أَنَّ عُبَيْدَ اللهِ بْنَ عَبْدِ اللهِ، أَخْبَرَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارٰى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ فِي صَاحِبِ مُوسٰى: فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: هُوَ خَضِرٌ، فَمَرَّ بِهِمَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ، فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: إِنِّي تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هٰذَا فِي صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي سَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلٰى لُقِيِّهِ: هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَذْكُرُ شَأْنَهُ؟ قَالَ: نَعَمْ، سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «بَيْنَمَا مُوسٰى فِي مَلَإٍ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، جَاءَهُ رَجُلٌ، فَقَالَ: هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ؟ قَالَ مُوسٰى: لَا، فَأَوْحَى اللهُ إِلٰى مُوسٰى: بَلٰى عَبْدُنَا خَضِرٌ، فَسَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلَيْهِ، فَجَعَلَ اللهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً وَّقِيلَ لَهُ: إِذَا فَقَدْتَّ الْحُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، وَكَانَ يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ لِمُوسٰى فَتَاهُ: أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ، قَالَ: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِي، فَارْتَدَّا عَلٰى آثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا الَّذِي قَصَّ اللهُ عَزَّوَجَلَّ فِي

[74] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کا اور حضرت حر بن قیس بن حصن الفزاری رضی اللہ عنہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے متعلق اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ ساتھی حضرت خضر ہیں۔ اسی اثنا میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ان کے پاس سے گزر ہوا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں بلایا اور کہا کہ میرا اور میرے اس ساتھی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ہم نشین کے متعلق باہمی اختلاف ہو گیا ہے جس کی ملاقات کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے راستہ دریافت کیا تھا۔ کیا آپ نے نبی ﷺ سے اس کے متعلق کچھ سنا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے، اتنے میں ایک آدمی آیا اور آپ سے دریافت کیا کہ آپ کسی شخص کو اپنے سے زیادہ عالم جانتے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: کیوں نہیں! ہمارا بندہ خضر (تم سے زیادہ دانا ہے۔) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی: اس سے ملنے کی کیا صورت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی کو ان سے ملاقات کی علامت قرار دیا اور ان سے کہہ دیا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو فوراً واپس لوٹ پڑنا کیونکہ وہاں قریب ہی تمھاری اس سے ملاقات ہو گی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام چلے اور دریا میں مچھلی کی علامت تلاش کرتے رہے۔ پھر (ایک

كِتَابِهِ». [انظر: ٧٨، ١٢٢، ٢٢٦٧، ٢٧٢٨، ٣٢٧٨، ٣٤٠٠، ٣٤٠١، ٤٧٢٥، ٤٧٢٦، ٤٧٢٧، ٦٦٧٢، ٧٤٧٨]

مقام پر) موسیٰ علیہ السلام سے ان کے خادم نے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ جب ہم پتھر کے پاس بیٹھے تھے تو میں (وہیں) مچھلی کو بھول گیا اور شیطان ہی نے مجھے اس کا ذکر بھلایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہی تو وہ چیز تھی جس کے ہم متلاشی تھے، چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش ہائے قدم تلاش کرتے ہوئے ان پر واپس ہوئے تو حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی۔ پھر ان دونوں کا وہی قصہ ہے جو اللہ عزوجل نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔"

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد قصہ بیان کرنا نہیں بلکہ کتاب العلم میں اس واقعے کو اس لیے بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے وطن میں رہتے ہوئے شرف علم کے حصول میں کامیابی نہ ہو تو اس کے لیے ہر قسم کی مشکلات اور صعوبتوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ اگر اسے بحری سفر بھی کرنا پڑے تو بھی اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجود اس کے کہ آپ جلیل القدر اور صاحب کتاب پیغمبر ہیں، بحری سفر کیا جس کا مقصد ایک زائد از ضرورت علم کا حصول تھا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ضروری علوم تو پورے طور پر موجود تھے۔ ② حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے علم و فضل کی وجہ سے انھیں اپنی مجلس مشاورت میں شامل کیا تھا۔ اس مقام پر ان کا حضرت ابن عباس سے یہ اختلاف ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی حضرت خضر ہیں یا کوئی اور۔ حضرت حر بن قیس کے موقف کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ حضرت خضر کے علاوہ کس کا نام لیتے تھے؟ واضح رہے کہ اس واقعے کے متعلق ایک اور اختلاف بھی ہوا کہ اس موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ بن عمران ہیں جو بنی اسرائیل کے رسول اور صاحب کتاب تھے یا کوئی اور موسیٰ ہیں؟ یہ اختلاف حضرت سعید بن جبیر اور ایک واعظ نوف البکالی کے درمیان ہوا۔ نوف البکالی کا موقف تھا کہ یہ کوئی اور موسیٰ ہیں کیونکہ اتنا بڑا نبی حضرت خضر کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے جائے، یہ ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تردید فرمائی۔[1] اس کی تفصیل کتاب التفسیر میں بیان کی جائے گی۔ ③ ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ سمندری سفر حاجی، عمرہ کرنے والے اور غازی کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں ہے۔[2] اس صحیح حدیث سے اس ضعیف حدیث کی تردید بھی ہو جاتی ہے کہ سمندری سفر طالب علم کے لیے صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب البیوع میں التجارة في البحر عنوان قائم کر کے اسے مزید واضح فرمایا ہے۔ ④ حضرت خضر زندہ ہیں یا فوت ہو چکے ہیں؟ وہ نبی تھے یا ولی؟ نیز ان کے علم کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس حیثیت سے ان کی شاگردی اختیار فرمائی؟ یہ تمام مباحث کتاب التفسیر میں ذکر ہوں گے۔ بإذن الله.

① صحيح البخاري، كتاب العلم، حديث:122. ② سنن أبي داود، الجهاد، حديث:2489.

(۱۷) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ»

باب:17- دعائے نبوی: ”اے اللہ! اسے قرآن کا علم دے۔“

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں رسول اللہ ﷺ کے دعائیہ کلمات بیان فرمائے ہیں لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ ان کا مصداق کون ہے؟ اس میں اشارہ ہے کہ ان الفاظ کا استعمال کسی دوسرے کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے عَلِّمْهُ میں ضمیر کا مرجع کوئی مخصوص شخص نہ ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرجع ضمیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہوں جن کا ذکر باب سابق میں آچکا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حر بن قیس رضی اللہ عنہ کے مقابلے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کامیابی رسول اللہ ﷺ کی اس دعا کا اثر تھا۔[1]

٧٥ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدٌ عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: ضَمَّنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَقَالَ: «اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ». [انظر: ١٤٣، ٣٧٥٦، ٧٢٧٠]

[75] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؟ انھوں نے کہا: مجھے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سینے سے لگایا اور دعا دی: ”اے اللہ! اسے اپنی کتاب کا علم عطا فرما۔“

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ حصول علم میں جہاں طالب علم کی کاوش ضروری ہے، وہاں اس سے زیادہ انابت الی اللہ کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر مقصد میں کامیابی دشوار ہے۔ تحصیل علم کے متعلق انسان کو اپنی ذہانت وفطانت پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ عطیۂ الٰہی اس کی مہربانی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس کی مہربانی صالحین کی دعا سے ہوتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ طالب علم بزرگوں کی خدمت میں حاضری دے اور پورے آداب واحترام کے ساتھ ان کے احکام کی بجا آوری کرے۔ ② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کی خاص شفقت حاصل ہونے کے متعلق دو واقعات کتب حدیث میں ملتے ہیں: ان میں سے ایک کا تعلق خدمت سے ہے جبکہ دوسرا واقعہ رسول اللہ ﷺ کے آداب واحترام کی بجا آوری سے متعلق ہے۔ ③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا تشریف لے گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خدمت کے طور پر آپ کی سہولت کے لیے پانی بھر کے رکھ دیا۔ جب آپ باہر سے تشریف لائے تو دریافت فرمایا کہ پانی کس نے رکھا تھا؟ معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ خدمت انجام دی ہے۔ آپ خوش ہوئے اور مذکورہ دعا فرمائی۔[2] ④ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تہجد کی نماز میں اپنے برابر دائیں جانب کھڑا کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پیچھے ہٹ گئے۔ آپ نے دوبارہ انھیں اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ وہ پھر پیچھے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمھیں کیا ہے؟ میں تمھیں بار بار اپنے برابر کھڑا کرتا ہوں اور تم پیچھے ہو جاتے ہو؟“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا: کسی

---

1 فتح الباري: 223/1. ② صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 143.

شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ آپ کے برابر کھڑا ہو جبکہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور رسول کے برابر کھڑا ہونا بے ادبی ہے۔ آپ اس جواب سے خوش ہوئے اور دعا فرمائی۔[1] ان واقعات سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی خدمت اور ان کا ادب واحترام ان کی دعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔

(١٨) بَابُ مَتٰى يَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِيرِ

باب: 18- نابالغ لڑکے کا کس عمر میں سماع حدیث درست ہے؟

وضاحت: سماع حدیث کے لیے بلوغت شرط نہیں، البتہ ادائے حدیث کے لیے بالغ ہونا ضروری ہے۔

٧٦ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلٰى حِمَارٍ أَتَانٍ، وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي بِمِنًى إِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ، فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ، وَأَرْسَلْتُ الْأَتَانَ تَرْتَعُ، وَدَخَلْتُ الصَّفَّ، فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ أَحَدٌ. [انظر: ٤٩٣، ٨٦١، ١٨٥٧، ٤٤١٢]

[76] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں ایک دن گدھی پر سوار ہو کر آیا۔ اس وقت میں قریب البلوغ تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ منیٰ میں کسی دیوار کو سامنے کیے بغیر نماز پڑھا رہے تھے۔ میں ایک صف کے آگے سے گزرا اور گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود صف میں شامل ہو گیا۔ مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

فائدہ: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب بچہ سمجھ دار اور ہوشیار ہو جائے تو حامل حدیث ہو سکتا ہے لیکن ادائے حدیث کے لیے اس کا بالغ ہونا شرط ہے۔ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ تحمل حدیث کے لیے راوی کی عمر کم از کم پندرہ سال ہونی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو احد کے دن جنگ میں شریک نہیں ہونے دیا تھا۔ اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو بھی جنگ بدر کے موقع پر واپس کر دیا تھا، کیونکہ ان دونوں کی عمریں پندرہ سال سے کم تھیں۔ لیکن امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ تحمل حدیث کے لیے سمجھدار اور ہوشیار ہونا تو ضروری ہے لیکن عمر کی قید نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جن صحابہ کو جنگ میں شریک نہیں کیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ میں قوت اور معاملہ فہمی کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے آپ نے چھوٹی عمر والوں کو واپس کر دیا تھا، البتہ تحمل حدیث کے لیے طاقت درکار نہیں ہوتی بلکہ اس کا مدار صرف ہوشیاری اور سمجھداری پر ہے۔ سمجھدار بچہ اگر بچپن کی کوئی بات بالغ ہونے کے بعد نقل کرتا ہے تو وہ معتبر ہوگی، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے محدثین نے کئی ایک مسائل کا استنباط کیا ہے۔[2]

---

1 مسند أحمد: 330/1، و الصحيحة للألباني، حديث: 606. 2 فتح الباري: 225/1.

٧٧ - حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُسْهِرٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ قَالَ: عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ مَجَّةً مَجَّهَا فِي وَجْهِي - وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِينَ - مِنْ دَلْوٍ.

[انظر: ١٨٩، ٨٣٩، ١١٨٥، ٦٣٥٤، ٦٤٢٢]

[77] حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: مجھے (اب تک) نبی ﷺ کی ایک کلی یاد ہے جو آپ نے ایک ڈول سے پانی لے کر میرے چہرے پر کی تھی۔ اس وقت میں پانچ برس کا تھا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سمجھدار بچے مجلس علم میں حاضر ہو سکتے ہیں اور اہل علم ان سے خوش طبعی بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ لعاب دہن ناپاک نہیں ہے۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقام پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا واقعہ نقل نہیں فرمایا کہ انھوں نے جنگ احزاب کے موقع پر اپنے والد گرامی کو دیکھا کہ وہ بڑی تیزی سے بنوقریظہ کی طرف جا رہے ہیں اور اس وقت ان کی عمر صرف تین سال کی تھی۔ نقل نہ کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس واقعہ سے کوئی مسئلہ یا سنت ثابت نہیں ہوتی، جن روایات سے کوئی مسئلہ ثابت ہوتا تھا انھیں نقل فرمایا ہے۔[2] البتہ اس واقعے کو مناقب زبیر میں ذکر ضرور کیا ہے۔[3]

(١٩) بَابُ الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ

باب: 19- حصول علم کے لیے سفر کرنا

وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ أُنَيْسٍ فِي حَدِيثٍ وَاحِدٍ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے ایک حدیث کے لیے حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی طرف ایک ماہ کی مسافت کا سفر کیا۔

وضاحت: حدیث میں ہے کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے۔[4] اس روایت کے پیش نظر تحصیل علم کے لیے سفر کرنا مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تردید کرنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ علمی تشنگی دور کرنے کے لیے اگر سفر کرنا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے لیے امام بخاری نے عہد صحابہ کے ایک واقعے سے استدلال کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے ایک حدیث سننے کے لیے ایک ماہ کا سفر کیا تاکہ سند عالی ہو جائے۔ اس سفر کی تفصیل کچھ یوں ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بالواسطہ پہنچی۔ میں نے اس صحابی سے براہ راست سننے کے لیے سفر کا ارادہ کیا۔ میں نے اس سفر کے لیے ایک اونٹ خریدا اور ایک ماہ کی مسافت طے کر کے شام پہنچا۔ لوگوں سے حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا

---

① فتح الباري:227/1. ② فتح الباري:227/1. ③ صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث:3720. ④ صحيح البخاري، العمرة، حديث:1804.

مکان دریافت کیا، دستک دی، خادم باہر آیا تو اس سے کہا کہ میرا پیغام پہنچا دو: جابر بن عبداللہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن اُنیس اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، ملاقات ہوئی، معانقہ کیا اور قیام کرنے پر اصرار کیا لیکن میں نے کہا: حدیث سنا دو۔ میرے آنے کا مقصد یہی ہے کہ مرنے سے پہلے پہلے براہ راست حدیث سن لوں۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا: ''قیامت کے دن لوگ مادر زاد ننگے اٹھائے جائیں گے۔'' (الحدیث)[1] جب علو سند کے لیے سفر جائز ہے تو اصل علم کی تحصیل کے لیے ناجائز کیوں؟ دوسرا استدلال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر سے ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

٧٨ - حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خَلِيٍّ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ: قَالَ الْأَوْزَاعِيُّ: أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ تَمَارٰى هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنٍ الْفَزَارِيُّ فِي صَاحِبِ مُوسٰى، فَمَرَّ بِهِمَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، فَقَالَ: إِنِّي تَمَارَيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هٰذَا فِي صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي سَأَلَ السَّبِيلَ إِلٰى لُقِيِّهِ: هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَذْكُرُ شَأْنَهُ؟ فَقَالَ أُبَيٌّ: نَعَمْ، سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَذْكُرُ شَأْنَهُ، يَقُولُ: «بَيْنَمَا مُوسٰى فِي مَلَإٍ مِّنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: أَتَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ؟ قَالَ مُوسٰى: لَا، فَأَوْحَى اللهُ تَعَالٰى إِلٰى مُوسٰى: بَلٰى، عَبْدُنَا خَضِرٌ، فَسَأَلَ السَّبِيلَ إِلٰى لُقِيِّهِ، فَجَعَلَ اللهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً، وَقِيلَ لَهُ: إِذَا فَقَدْتَّ الْحُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ، فَكَانَ مُوسٰى يَتَّبِعُ أَثَرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ، فَقَالَ فَتٰى مُوسٰى لِمُوسٰى: أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ. قَالَ مُوسٰى: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِي، فَارْتَدَّا

[78] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کا اور حضرت حر بن قیس بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم نشین کے متعلق اختلاف ہو گیا۔ دریں اثنا ان کے پاس سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ گزرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انھیں بلا لیا اور فرمایا کہ میرا اور میرے اس ساتھی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم نشین کے متعلق اختلاف ہو گیا ہے جن سے ملاقات کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے راستہ پوچھا تھا۔ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے ان کے حالات کے متعلق کچھ سنا ہے؟ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، میں نے نبی ﷺ کو ان کے حالات بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے: ''ایک مرتبہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تھے۔ اچانک ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: کیا آپ کسی کو اپنے سے زیادہ عالم جانتے ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی: کیوں نہیں! ہمارا بندہ خضر (آپ سے زیادہ عالم ہے۔) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے ان کی ملاقات کا راستہ پوچھا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو ان کے لیے نشان مقرر کر دیا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو واپس لوٹ آنا، قریب ہی کہیں تمھاری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دریا

[1] مسند أحمد: 495/3.

عَلٰى آثَارِهِمَا قَصَصًا ، فَوَجَدَا خَضِرًا ، فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللهُ فِي كِتَابِهِ». [راجع: ٧٤]

میں مچھلی کی علامات تلاش کرتے رہے۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم نے ان سے عرض کی: کیا آپ نے دیکھا تھا جب ہم پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں (وہیں) مچھلی کو بھول گیا اور مجھے شیطان ہی نے بتانے سے غافل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہی تو وہ چیز تھی جس کے ہم متلاشی تھے، چنانچہ وہ دونوں اپنے نقش ہائے قدم تلاش کرتے ہوئے ان پر واپس ہوئے تو وہاں حضرت خضر سے ملاقات ہوگئی۔ پھر آگے ان کا قصہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے طلب علم کے لیے ہر طرح کے سفر کا جواز بلکہ استحباب ثابت کیا ہے، یعنی اگر طلب علم یا تجارت کی ضرورت ہے تو سفر کرنے کی اجازت ہے۔ جب دنیوی ضرورت کے لیے سفر کیا جا سکتا ہے تو دینی ضرورت کے لیے اس کی ممانعت چہ معنی دارد؟ ② حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب کی بنیاد یہ تھی کہ آپ نبی تھے اور انبیاء کا علم دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے لیکن چونکہ انانیت اللہ کو پسند نہیں بلکہ اللہ کے حضور عاجزی اور تواضع محبوب ہے، اس لیے عتاب ہوا کہ ہاں ہمارا بندہ خضر تم سے زیادہ جاننے والا ہے اور اس سے مراد خاص جزئیات ہیں۔ یقیناً اہل علم کو علم کی قدر ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے خضر سے ملنے کی خواہش کی۔

(٢٠) بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلِمَ وَعَلَّمَ

باب: 20- علم سیکھنے اور سکھانے والے کی فضیلت

٧٩ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ ابْنُ أُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسٰى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللهُ مِنَ الْهُدٰى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا، فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ، قَبِلَتِ الْمَاءَ، فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ، أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرٰى، إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً

[79] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت و علم مجھے دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال تیز بارش کی سی ہے جو زمین پر برسے۔ صاف اور عمدہ زمین تو پانی کو جذب کر لیتی ہے اور بہت سا گھاس اور سبزہ اگاتی ہے، جبکہ سخت زمین پانی کو روکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ لوگ خود بھی پیتے ہیں اور جانوروں کو بھی سیراب کرتے ہیں اور اس کے ذریعے سے کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ اور کچھ بارش ایسے حصے پر برسی جو صاف اور چٹیل

وَلَا تُنْبِتُ كَلأً ، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللهِ وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللهُ بِهِ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَّلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ».

میدان تھا۔ وہ نہ تو پانی کو روکتا ہے اور نہ سبزہ ہی اگاتا ہے۔ پس یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور جو تعلیمات دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے، ان سے اسے فائدہ ہوا، یعنی اس نے انھیں خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا۔ اور یہی اس شخص کی مثال ہے جس نے سر تک نہ اٹھایا اور اللہ کی ہدایت کو جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں، قبول نہ کیا۔''

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: قَالَ إِسْحَاقُ: وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَيَّلَتِ الْمَاءَ، قَاعٌ يَعْلُوهُ الْمَاءُ، وَالصَّفْصَفُ الْمُسْتَوِي مِنَ الْأَرْضِ.

ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) فرماتے ہیں: امام اسحاق بن راہویہ نے جب اس حدیث کو بیان کیا تو انھوں نے [وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَيَّلَتِ الْمَاءَ] کے الفاظ نقل کیے ہیں، نیز قَاع (جس کی جمع قیعان ہے) اس زمین کو کہتے ہیں جس پر پانی چڑھتا ہوا گزر جائے اور صفصف اس زمین کو کہتے ہیں جو برابر اور ہموار ہو۔

وضاحت: ① امام بخاری رحمہ اللہ عنوان بالا کو بایں طور ثابت کرتے ہیں کہ جس طرح زمین کی سب سے بہترین قسم وہ ہے جو خود بھی نفع اندوز ہو اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائے، اسی طرح وہ عالم سب سے افضل ہے جو خود بھی علم کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع اٹھانے کے مواقع فراہم کرے۔[1] ② اس حدیث میں زمین کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: ایک وہ جو پانی جذب کرے اور روئیدگی لائے۔ دوسری وہ جو پانی کو جذب کرنے کی بجائے اسے محفوظ کرے جس سے جانور اور انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیسری وہ جو نہ پانی جذب کرے اور نہ اسے اپنے اندر محفوظ ہی رکھے۔ اسی طرح اہل علم کی بھی تین اقسام ہیں: بعض وہ حضرات ہیں جنھوں نے احادیث کو سنا اور ان سے مسائل کا استنباط کیا، جیسے امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ۔ دوسرے وہ جنھوں نے احادیث کو سننے کے بعد ان کو محفوظ کیا لیکن ان سے استنباط نہیں کیا، جیسے ناقلین حدیث۔ تیسرے وہ جنھوں نے احادیث کو نہ محفوظ کیا اور نہ اس پر عمل ہی کیا، جیسے امراء اور جہلاء وغیرہ۔ اس طرح مثالیں بھی تین اور اس کے مصداق بھی تین، یعنی ان میں پوری مطابقت ہے۔ ③ اس تشبیہ میں وجہ شبہ احیاء ہے، یعنی جس طرح عالم اسباب میں زمین کی زندگی اور موت کا تعلق پانی سے ہے کہ بارش ہوگئی تو زمین کو نئی زندگی مل گئی، سرسبزی اور شادابی چھا گئی، اسی طرح جب علوم کا فیضان دلوں پر ہوتا ہے تو انھیں بھی نئی زندگی مل جاتی ہے۔[2] ④ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر افادہ اور استفادہ تھا، اس لیے آخر میں پہلی دو قسموں کو، یعنی جس نے پانی جذب کیا اور جس نے جذب کرنے کے بجائے اسے محفوظ کر لیا، ایک ہی شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں افادے میں برابر ہیں،

① شرح الكرماني:2/59. ② فتح الباري:1/232.

اگر چہ پہلی قسم میں افادہ اور استفادہ دونوں ہیں، کیونکہ علمی بارش سے دونوں سیراب ہوتے ہیں لیکن نفع کی نوعیت مختلف ہے۔ اور تیسری قسم میں نہ افادہ ہے اور نہ استفادہ، اس لیے آخر میں اسے مستقل طور پر بیان فرمایا اور اس سے مراد کافر اور جاہل لوگ ہیں۔

(۲۱) بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ

باب: 21-علم کا اٹھ جانا اور جہالت کا عام ہو جانا

وَقَالَ رَبِيعَةُ: لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ عِنْدَهُ شَيْءٌ مِّنَ الْعِلْمِ أَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ.

ربیعہ رائے کا ارشاد ہے کہ کسی ایسے شخص کے لیے جس کے پاس علم کا کچھ بھی حصہ ہے، یہ درست نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ضائع کر دے

وضاحت: رفع علم سے جہالت کا پھیل جانا لازم ہے لیکن جہالت کے مفاسد پر تنبیہ کرنے کے لیے اسے مستقل طور پر بیان فرمایا۔

٨٠ - حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ، وَيَثْبُتَ الْجَهْلُ، وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ، وَيَظْهَرَ الزِّنَا». [انظر: ٨١، ٥٢٣١، ٥٥٧٧، ٦٨٠٨]

[80] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ قیامت کی علامتوں میں سے ہے کہ علم اٹھ جائے گا اور جہالت پھیل جائے گی۔ شراب بکثرت نوش کی جائے گی اور زنا کاری عام ہو جائے گی۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد تعلیم وتبلیغ کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے، اس لیے علماء کو چاہیے کہ وہ تعلیم وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ اگر کوئی علم رکھنے کے باوجود اسے آگے نہیں پھیلاتا تو وہ علم پر بھی ظلم کرتا ہے، کیونکہ اس کے انتقال کے بعد بیش بہا ذخیرہ تلف ہو جائے گا۔ حضرت ربیعہ رائے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ ایسے اسباب اختیار نہ کرے جس سے اس کا علم محدود ہو کر رہ جائے۔ ② علامات قیامت کا انسداد بقدر طاقت ہر عالم کا فرض ہے، اس لیے رفع علم اور ظہور جہل کے انسداد کی یہی صورت ہے کہ اشاعت علم کے لیے تبلیغ وتعلیم کا سلسلہ جاری رہے۔ ظہور جہل کی یہ صورت ہوگی کہ اہل علم ختم ہو جائیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں علم کی بے قدری ہو وہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ علماء کو رہنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جہاں ان کے علوم سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ③ ہمیں قیامت کا وقت نہیں بتایا گیا، البتہ رفع علم اور ظہور جہل کو اس کی آمد کا پیش خیمہ ضرور قرار دیا گیا ہے، اس لیے ہم علماء کا فرض ہے کہ ہم علم کو فروغ دیں اور جہل کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ ④ ہمارا فرض ہے کہ ہم زنا روکیں، شراب پینے اور پلانے کا ماحول پیدا نہ ہونے دیں، کوشش کے باوجود اگر زنا پھیلتا ہے یا شراب نوشی کا دور چلتا ہے تو اس پر ہم سے باز پرس نہ ہوگی۔ اسی طرح ظہور جہل اور علم کے اٹھ جانے کو روکنا ہمارا فریضہ ہے جو تعلیم وتبلیغ سے ادا ہو سکتا ہے۔

٨١ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: لَأُحَدِّثَنَّكُمْ حَدِيثًا لَا يُحَدِّثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِي، سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ: أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ، وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ، وَيَظْهَرَ الزِّنَا، وَتَكْثُرَ النِّسَاءُ، وَيَقِلَّ الرِّجَالُ، حَتّٰى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً اَلْقَيِّمُ الْوَاحِدُ». [راجع: ٨٠]

[81] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں تمھیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میرے بعد تمھیں کوئی نہیں سنائے گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ علم دین کم ہو جائے گا اور جہالت غالب ہو جائے گی۔ زنا کاری عام ہو جائے گی۔ عورتیں زیادہ اور مرد کم ہوں گے یہاں تک کہ ایک مرد پچاس عورتوں کا کفیل ہوگا۔''

فوائد و مسائل: ① حضرت انس رضی اللہ عنہ کا خطاب اہل بصرہ سے ہے اور بصرہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد ہوئی ہے، اس لیے انھوں نے فرمایا کہ اس حدیث کو میرے بعد سنانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ پہلی حدیث میں رفع علم کو قیامت کی علامت قرار دیا گیا تھا اور اس میں قلت علم بتایا گیا ہے۔ اس میں تضاد نہیں ہے کیونکہ کم ہونا ابتدائی مرحلہ ہے اور اس کا ختم ہو جانا آخری مرحلہ ہوگا، یعنی قیامت کے قریب آہستہ آہستہ علم کم ہونا شروع ہو جائے گا، بالآخر ختم ہو جائے گا، اس لیے علم باقی رکھنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ سلسلۂ تعلیم کو مضبوط کیا جائے تاکہ ایک عالم اٹھے تو دوسرا اس کے مقام کو سنبھال لے۔[1] ② قرب قیامت کے وقت مردوں کے کم اور عورتوں کے بکثرت ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایسے حالات میں لڑائیاں بہت ہوں گی۔ ایک حکومت دوسری حکومت پر چڑھائی کرے گی جیسا کہ امریکہ نے پہلے افغانستان پر حملہ کیا اور آج عراق پر چڑھائی کیے ہوئے ہے، کل کسی اور ملک کی باری آجائے گی۔ ان لڑائیوں میں مرد مارے جائیں گے اور عورتیں بکثرت رہ جائیں گی۔ یہ تعداد اس درجہ بڑھے گی کہ ایک ایک مرد کی نگرانی میں پچاس پچاس عورتیں ہو جائیں گی۔ یہ مفہوم نہیں کہ ایک مرد جائز و ناجائز پچاس پچاس عورتوں کو گھر میں ڈال لے گا۔[2] ③ ان احادیث میں مندرجہ ذیل علامات قیامت بیان ہوئی ہیں: * فقدان علم، شراب خوری، زنا کاری، کثرت نسواں، قلت مرداں۔ دراصل دنیا کے نظام کا تعلق پانچ چیزوں سے ہے: دین، عقل، نسب، مال اور نفس۔ جب یہ پانچوں زوال پذیر ہونے لگیں تو قیامت قریب آ لگے گی۔ دین کا محافظ علم ہے۔ شراب عقل کی دشمن ہے۔ زنا نسب کے لیے زہر قاتل ہے۔ باہمی جنگ و جدال سے مال اور نفس کا اتلاف ہوتا ہے۔ ان سب علامتوں میں پہلے رفع علم ہوگا جس کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔[3]

(٢٢) بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

باب: 22- فضیلت علم کا بیان

٨٢ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنِي اللَّيْثُ

[82] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے

① فتح الباري:236/1. ② فتح الباري:236/1. 3 فتح الباري:236/1.

قَالَ: حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حَمْزَةَ ابْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ أُتِيتُ بِقَدَحِ لَبَنٍ، فَشَرِبْتُ حَتَّى إِنِّي لَأَرَى الرِّيَّ يَخْرُجُ فِي أَظْفَارِي، ثُمَّ أَعْطَيْتُ فَضْلِي عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ». قَالُوا: فَمَا أَوَّلْتَهُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «اَلْعِلْمَ».

[انظر: ٣٦٨١، ٧٠٠٦، ٧٠٠٧، ٧٠٢٧، ٧٠٣٢]

کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''میں ایک مرتبہ سو رہا تھا کہ میرے سامنے دودھ کا پیالہ لایا گیا۔ میں نے اسے پی لیا یہاں تک کہ سیرابی میرے ناخنوں سے ظاہر ہونے لگی۔ پھر میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر کی؟ آپ نے فرمایا: ''اس کی تعبیر ''علم'' ہے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ ضرورت سے زائد علوم کا سیکھنا تضییع اوقات نہیں بلکہ فضیلت کی چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان وہی کچھ سیکھے جو اس کی ذاتی عملی زندگی کے لیے کارآمد ہو بلکہ وہ احکام و مسائل سیکھنے بھی ضروری ہیں جو مکلّف کی اپنی ذات سے متعلق نہ ہوں تاکہ دوسروں کی دینی ضروریات کو پورا کر کے ثواب دارین حاصل کیا جائے، اس لیے ضرورت سے زائد علم کی تحصیل کے لیے وقت صرف کرنا قابل مدح فعل ہے اور اس کے لیے سفر کرنا بھی ممدوح ہے۔ ② اس سے معلوم ہوا کہ خواب میں دودھ پینے کی تعبیر علم کا حصول ہے، نیز اگر دودھ کی سیرابی ناخنوں میں دیکھے تو اس سے علم کی سیرابی مراد لی جاسکتی ہے۔ بھرے ہوئے دودھ کے پیالے سے مراد علم تام ہے۔ دودھ سے شکم سیری سے مراد مجسمۂ علم و عرفان بن جانا ہے۔ ③ فاضل از حاجت کے ساتھ وہی عمل کرنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ علم جس قدر حاصل کر سکتے ہو کرو کیونکہ یہ اللہ کا انعام و فضل ہے۔ بقدر ضرورت خود فائدہ اٹھاؤ اور زائد کو دوسروں کی ضروریات میں صرف کرو۔ تعلیم کا سلسلہ شروع کرو، علاقے میں تبلیغ کا فیضان جاری کرو، لوگوں کے جھگڑے شریعت کے مطابق نمٹاؤ، ہنگامی مسائل کے لیے فتاویٰ دو۔ الغرض بے شمار مقاصد ہیں جن کے لیے زائد علم کی ضرورت ہے۔ جس قدر علم زائد ہوگا اسی قدر قلب میں بصیرت اور روح میں تازگی ہوگی۔ ④ رسول اللہ ﷺ نے اپنا بچا ہوا دودھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمایا اور اس کی تعبیر بھی علم سے فرما دی۔ شاید ہی دین کا کوئی باب ایسا ہو جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت یا اثر نہ ملتا ہو۔ مسائل و احکام، فضائل و آداب تک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے علوم حاوی ہیں۔ بعض لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس فضیلت کا توڑ کرنے کے لیے ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے'' جیسی خود ساختہ حدیث بنا ڈالی۔ اس مقام پر یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو صدیق اکبر ہی ہیں، ان سے کسی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ رضی اللہ عنہم۔

(٢٣) بَابُ الْفُتْيَا وَهُوَ وَاقِفٌ عَلَى الدَّابَّةِ وَغَيْرِهَا

باب: 23- سواری وغیرہ پر سوار رہ کر فتویٰ دینا

٨٣ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ

[83] حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت

ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عِيسَى بْنِ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَقَفَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ بِمِنًى لِلنَّاسِ يَسْأَلُونَهُ، فَجَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ فَحَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ؟ فَقَالَ: «اِذْبَحْ وَلَا حَرَجَ»، فَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ: لَمْ أَشْعُرْ فَنَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ؟ قَالَ: «اِرْمِ وَلَا حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ: «اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ». [انظر: ١٢٤، ١٧٣٦، ١٧٣٧، ١٧٣٨، ٦٦٦٥]

ہے کہ رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں ان لوگوں کے لیے کھڑے تھے جو آپ سے مسائل پوچھ رہے تھے۔ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: مجھے خیال نہیں رہا، میں نے قربانی سے پہلے اپنا سر منڈوا لیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اب ذبح کر لو کچھ مضائقہ نہیں۔'' پھر ایک شخص آیا اور عرض کیا: لاعلمی سے میں نے رمی سے پہلے قربانی کر لی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اب رمی کر لو، کوئی حرج نہیں۔'' (عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں:) اس دن آپ سے جس بات کی بابت بھی پوچھا گیا جو کسی نے پہلے کر لی یا بعد میں، تو آپ نے فرمایا: ''اب کر لو کچھ حرج نہیں۔''

فوائد و مسائل: ① ایک حدیث میں ہے کہ جانوروں کی پشت سے منبر کا کام نہ لو۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحالت سواری وعظ کہنا، فتویٰ دینا درست نہیں۔ دونوں روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اسے عادت نہیں بنانا چاہیے کہ خواہ مخواہ جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر تقریر کی جائے، اس سے بچنا افضل ہے، تاہم ضرورت کے وقت اس کا جواز ہے۔ اگرچہ فتویٰ دینے کے لیے مفتی کا کسی مقام پر اطمینان کے ساتھ بیٹھنا بہتر ہے اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے لیکن کھڑے کھڑے یا چلتے پھرتے کسی سائل کو مسئلہ بتا دینا بھی جائز ہے، البتہ چلتے پھرتے یا سواری پر بیٹھے ہوئے درس و تدریس کا جواز کشید نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تعلیم و تدریس کی شان فتویٰ وغیرہ سے بالکل الگ ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان ثابت کرنے کے لیے جو حدیث پیش کی ہے اس میں دابة (جانور) کا ذکر نہیں ہے، البتہ اس عنوان کی دوسری روایات میں یہ لفظ موجود ہے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ بکثرت ایسا کرتے ہیں کہ غیر مذکور الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں۔ ③ یوم نحر میں چار اعمال ہیں: رمی، ذبح، حلق اور طواف زیارت، خلاف ترتیب عمل کی صورت میں نہ کفارہ دینا ضروری ہے اور نہ اخروی نقصان اور گناہ ہی ہے۔ آخر حدیث میں راوی کا بیان ہے کہ تقدیم و تاخیر کے متعلق جس قدر بھی سوالات ہوئے، سب کا رسول اللہ ﷺ نے یہی جواب دیا کہ جو عمل رہ گیا ہے، اسے اب بجا لاؤ، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مکمل بحث کتاب الحج میں آئے گی۔ ④ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان کے دو اجزاء ہیں: * وقوف علی الدابة۔ * وقوف علی غیر دابة۔ اس حدیث سے دوسرا جز ثابت ہو گیا۔ اس سے امام مالک رحمہ اللہ کے موقف کا اثبات ہوتا ہے کہ علم کو وقار اور اطمینان سے پڑھانا چاہیے۔ اسی طرح راستہ چلتے ہوئے فتویٰ نہیں دینا چاہیے، لیکن امام بخاری کا موقف ہے کہ اتنی شرائط نہ لگائی جائیں کہ کوئی سائل ہنگامی مسئلہ دریافت ہی نہ کر سکے۔

---

① سنن أبي داود، الجهاد، حديث:2567. ② صحيح البخاري، الحج، حديث:1738.

(٢٤) بَابُ مَنْ أَجَابَ الْفُتْيَا بِإِشَارَةِ الْيَدِ وَالرَّأْسِ

باب:24- جس نے ہاتھ یا سر کے اشارے سے فتویٰ کا جواب دیا

وضاحت: فتویٰ ایک قسم کی تعلیم ہے جس میں وضاحت اور صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشارہ اگرچہ تصریح سے بہت کمزور ہے، تاہم بوقت ضرورت اشارہ جائز ہے بشرطیکہ اشارہ مفہمہ ہو اور اس سے کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہ ہو۔

٨٤ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَيُّوبُ عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ فِي حَجَّتِهِ فَقَالَ: ذَبَحْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ؟ فَأَوْمَأَ بِيَدِهِ، قَالَ: «لَا حَرَجَ»، وَقَالَ: حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَذْبَحَ؟ فَأَوْمَأَ بِيَدِهِ: «وَلَا حَرَجَ». [انظر: ١٧٢١، ١٧٢٢، ١٧٢٣، ١٧٣٤، ١٧٣٥، ٦٦٦٦]

[84] حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ سے پوچھا گیا: میں نے رمی سے پہلے ذبح کر لیا ہے؟ آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا: ''کوئی گناہ نہیں۔'' پھر کسی نے کہا: میں نے ذبح سے پہلے اپنا سر منڈوا لیا ہے؟ آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا: ''کوئی گناہ نہیں ہے۔''

فائدہ: تعلیم و تبلیغ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ خوب کھول کھول کر ارشاد فرماتے تاکہ حاضرین کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ہاتھ کے اشارے میں وہ صراحت نہیں ہوتی، نہ ہر انسان اسے سمجھ ہی سکتا ہے۔ ان تمام اشتباہات کے پیش نظر امام بخاری ؒ نے بوقت ضرورت ہی اس کا جواز ثابت کیا ہے، عام حالات میں نہیں۔

٨٥ - حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا حَنْظَلَةُ عَنْ سَالِمٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «يُقْبَضُ الْعِلْمُ، وَيَظْهَرُ الْجَهْلُ وَالْفِتَنُ، وَيَكْثُرُ الْهَرْجُ»، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا الْهَرْجُ؟ فَقَالَ هٰكَذَا بِيَدِهِ، فَحَرَّفَهَا كَأَنَّهُ يُرِيدُ الْقَتْلَ. [انظر: ١٠٣٦، ١٤١٢، ٣٦٠٨، ٤٦٣٥، ٤٦٣٦، ٦٠٣٧، ٦٥٠٦، ٦٩٣٥، ٧٠٦١، ٧١١٥، ٧١٢١]

[85] حضرت ابو ہریرہ ؓ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''آئندہ زمانے میں علم اٹھا لیا جائے گا، جہالت اور فتنے عام ہوں گے اور ہرج زیادہ ہوگا۔'' عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! ہرج کیا چیز ہے؟ آپ نے اپنے دست مبارک سے اس طرح ترچھا اشارہ کر کے فرمایا، گویا آپ کی مراد قتل تھی۔

فائدہ: شارح کرمانی کہتے ہیں کہ ہرج کے معنی فتنہ و فساد ہیں اور اس سے قتل مراد لینا مجازی طور پر ہے کیونکہ فتنہ و فساد کو قتل وغیرہ لازم ہے۔[1] لیکن یہ ان کا تسامح ہے کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ حبشہ کی زبان میں ہرج کے معنی قتل ہیں۔[2] رسول اللہ

[1] شرح الكرماني: 66/2. [2] صحيح البخاري، الفتن، حديث: 7065.

ﷺ نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے اشارہ فرمایا کیونکہ تلوار جب تک ترچھی نہ کی جائے اس وقت تک کاٹتی نہیں۔

٨٦ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ فَاطِمَةَ، عَنْ أَسْمَاءَ قَالَتْ: أَتَيْتُ عَائِشَةَ وَهِيَ تُصَلِّي فَقُلْتُ: مَا شَأْنُ النَّاسِ؟ فَأَشَارَتْ إِلَى السَّمَاءِ، فَإِذَا النَّاسُ قِيَامٌ، فَقَالَتْ: سُبْحَانَ اللهِ! قُلْتُ: آيَةٌ؟ فَأَشَارَتْ بِرَأْسِهَا أَيْ: نَعَمْ، فَقُمْتُ حَتّٰى عَلَانِيَ الْغَشْيُ فَجَعَلْتُ أَصُبُّ عَلٰى رَأْسِي الْمَاءَ، فَحَمِدَ اللهَ عَزَّوَجَلَّ النَّبِيُّ ﷺ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «مَا مِنْ شَيْءٍ لَمْ أَكُنْ أُرِيتُهُ إِلَّا رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ، فَأُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُونَ فِي قُبُورِكُمْ - مِثْلَ أَوْ قَرِيبًا لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ: يُقَالُ: مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُوقِنُ - لَا أَدْرِي بِأَيِّهِمَا قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُولُ: هُوَ مُحَمَّدٌ هُوَ رَسُولُ اللهِ، جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى، فَأَجَبْنَا وَاتَّبَعْنَا، هُوَ مُحَمَّدٌ، ثَلَاثًا، فَيُقَالُ: نَمْ صَالِحًا، قَدْ عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُوقِنًا بِهِ، وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ - لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي، سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ».

[انظر: ١٨٤، ٩٢٢، ١٠٥٣، ١٠٥٤، ١٠٦١، ١٢٣٥، ١٣٧٣، ٢٥١٩، ٢٥٢٠، ٧٢٨٧]

[86] حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی جبکہ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے کہا: لوگوں کا کیا حال ہے، یعنی وہ پریشان کیوں ہیں؟ انھوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، (یعنی دیکھو سورج کو گرہن لگا ہوا ہے۔) اتنے میں لوگ (نماز کسوف کے لیے) کھڑے ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: سبحان اللہ! میں نے پوچھا (یہ گرہن) کیا کوئی (عذاب یا قیامت کی) علامت ہے؟ انھوں نے سر سے اشارہ کیا: ہاں۔ پھر میں بھی (نماز کے لیے) کھڑی ہوگئی حتیٰ کہ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی، تو میں نے اپنے سر پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ پھر (جب نماز ختم ہوچکی تو) نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور فرمایا: ''جو چیزیں اب تک مجھے نہیں دکھائی گئی تھیں، انھیں میں نے اپنی اس جگہ سے دیکھ لیا ہے حتی کہ جنت اور دوزخ کو بھی۔ اور میری طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ قبروں میں تمھاری آزمائش ہوگی، جیسے مسیح دجال یا اس کے قریب قریب فتنے سے آزمائے جاؤ گے...... (راویۂ حدیث فاطمہ نے کہا:) مجھے یاد نہیں کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان (لفظ مثل اور قریب) میں سے کون سا کلمہ کہا تھا...... اور کہا جائے گا کہ تجھے اس شخص، یعنی رسول اللہ ﷺ سے کیا واقفیت ہے؟ ایمان دار یا یقین رکھنے والا ...... (فاطمہ نے کہا:) مجھے یاد نہیں کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ان دونوں (مومن اور موقن) میں سے کون سا کلمہ کہا تھا...... کہے گا کہ وہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو ہمارے پاس کھلی نشانیاں اور ہدایت لے کر آئے تھے۔ ہم نے ان کا کہا مانا اور ان کی پیروی کی۔ وہ محمد ﷺ ہیں۔ تین بار ایسا ہی کہے

گا، چنانچہ اس سے کہا جائے گا: تو مزے سے سو جا، بے شک ہم نے جان لیا کہ تو محمد ﷺ پر ایمان رکھتا ہے۔ اور منافق یا شک کرنے والا ...... (فاطمہ نے کہا:) مجھے یاد نہیں کہ حضرت اسماء ؓ نے ان (لفظِ منافق اور مُرتاب) میں سے کون سا کلمہ کہا تھا...... کہے گا: میں کچھ نہیں جانتا، ہاں لوگوں کو جو کہتے سنا، میں بھی وہی کہنے لگا۔“

فوائد و مسائل: ① اس طویل حدیث سے امام بخاری ؒ نے صرف یہ ثابت کیا ہے کہ اشارے کا اعتبار ہے۔ حضرت عائشہ ؓ نے حضرت اسماء ؓ کے سوال کا جواب اشارے سے دیا۔ اس کی تردید نہیں کی گئی، لہٰذا مسئلہ ثابت ہوگیا کہ سر اور ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اشارہ سمجھ میں آجائے اور مقصد پر دلالت کررہا ہو۔ امام بخاری ؒ نے اشارے کو فتویٰ کے ساتھ خاص کرکے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ تعلیم وتقریر میں اشارہ کافی نہیں ہوتا، البتہ فتوے کے موقع پر نفی یا اثبات کے لیے اشارہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ② اس حدیث سے عذاب قبر اور اس میں فرشتوں کا سوال کرنا بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو انسان رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر شک کرتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ ہلکی غشی پڑنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[1] ③ دجال کا فتنہ یہ ہوگا کہ وہ الوہیت کا دعویٰ کرے گا اور بطور ثبوت قبروں پر جاکر اہل قبور کو کہے گا کہ میرے حکم سے اٹھو تو وہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ درحقیقت معاملہ یہ ہوگا کہ جو شیاطین اس کے تابع ہوں گے، وہ مردوں کی شکل میں قبروں سے برآمد ہوں گے جن کی صورت مردوں کی ہوگی۔ لوگوں کے لیے یہ زبردست امتحان ہوگا۔ اس سے زیادہ سنگین حالات قبر میں ہوں گے۔ ممتحن خوفناک اور سخت مزاج، پھر تنہائی، ایسے موقع پر بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوجائے گا۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

(٢٥) بَابُ تَحْرِيضِ النَّبِيِّ ﷺ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلَى أَنْ يَحْفَظُوا الْإِيمَانَ وَالْعِلْمَ وَيُخْبِرُوا بِهِ مَنْ وَرَاءَهُمْ

باب:25- نبی ﷺ کا وفد عبدالقیس کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ ایمان اور علم کی حفاظت کریں اور ان سے ان لوگوں کو مطلع کریں جو ان کے پیچھے ہیں

وَقَالَ مَالِكُ بْنُ الْحُوَيْرِثِ: قَالَ لَنَا النَّبِيُّ ﷺ: «اِرْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ فَعَلِّمُوهُمْ».

حضرت مالک بن حویرث ؓ نے کہا: نبی ﷺ نے ہم سے فرمایا: ”اب تم لوگ اپنے اہل خانہ کی طرف واپس لوٹ جاؤ اور انھیں تعلیم دو۔“

[1] عمدة القاري:2/137، 138.

وضاحت: تعلیم کو اپنی ذات کی حد تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے دوسروں تک پہنچانا چاہیے۔

٨٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي جَمْرَةَ قَالَ: كُنْتُ أُتَرْجِمُ بَيْنَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبَيْنَ النَّاسِ، فَقَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ أَتَوُا النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: «مَنِ الْوَفْدُ؟ أَوْ مَنِ الْقَوْمُ؟» قَالُوا: رَبِيعَةُ، فَقَالَ: «مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ أَوْ بِالْوَفْدِ، غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى»، قَالُوا: إِنَّا نَأْتِيكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيدَةٍ، وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ، وَلَا نَسْتَطِيعُ أَنْ نَأْتِيَكَ إِلَّا فِي شَهْرٍ حَرَامٍ، فَمُرْنَا بِأَمْرٍ نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَنَا، نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ، فَأَمَرَهُمْ بِأَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ أَرْبَعٍ، أَمَرَهُمْ بِالْإِيمَانِ بِاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَحْدَهُ، قَالَ: «هَلْ تَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ؟» قَالُوا: اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: «شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ، وَصَوْمُ رَمَضَانَ، وَتُعْطُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ»، وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ، وَالْحَنْتَمِ، وَالْمُزَفَّتِ - قَالَ شُعْبَةُ: رُبَّمَا قَالَ: «اَلنَّقِيرِ»، وَرُبَّمَا قَالَ: «اَلْمُقَيَّرِ» - قَالَ: «اِحْفَظُوهُ وَأَخْبِرُوهُ مَنْ وَّرَاءَكُمْ». [راجع: ٥٣]

[87] حضرت ابو جمرہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قبیلۂ عبدالقیس کا وفد نبی ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ نے فرمایا: ''کون سا وفد ہے یا یہ کون لوگ ہیں؟'' انھوں نے کہا: ربیعہ خاندان سے۔ آپ نے قوم یا وفد کو کہا: ''خوش آمدید، نہ رسوا ہوئے اور نہ ندامت ہی کی کوئی بات ہے۔'' انھوں نے عرض کیا: ہم بہت دور دراز کی مسافت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا یہ قبیلہ حائل ہے، اس لیے ہم حرمت والے مہینوں کے علاوہ کسی اور مہینے میں آپ کے پاس نہیں آ سکتے، لہٰذا آپ ہمیں کوئی ایسا کام بتا دیجیے کہ ہم اپنے پیچھے والوں کو اس سے مطلع کر دیں اور اس کے سبب ہم جنت میں داخل ہو جائیں۔ آپ نے انھیں چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع فرمایا۔ آپ نے انھیں ایک اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا: ''تم جانتے ہو ایک اللہ پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا ہے۔'' اور انھیں دباء، حنتم اور مزفت کے استعمال سے منع فرمایا۔ شعبہ کا بیان ہے کہ کبھی کبھی ابو جمرہ نے ان کے ساتھ نقیر کا بھی ذکر کیا اور کبھی مزفت کی جگہ مقیر کہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم انھیں خوب یاد رکھو اور ان لوگوں کو مطلع کرو جو تمھارے پیچھے رہ گئے ہیں۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کو اپنی ذات کی حد تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے دوسروں تک پہنچانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے دو حدیثیں بیان فرمائی ہیں: ایک حضرت مالک بن حویرث کا بیان جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے موصولاً بھی بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تقریباً بیس دن تک آپ کے ہاں قیام کیا۔ جب ہم نے کہا کہ ہم گھر جانا چاہتے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''جاؤ، اپنے گھر والوں کو نماز کی تعلیم دو، نیز اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''[1] دوسری حدیث وفد عبدالقیس والی ہے جس کی تفصیلات پہلے بھی حدیث: 53 کے تحت گزر چکی ہیں۔ آپ نے مامورات اور منہیات کی تعلیم دینے کے بعد فرمایا کہ ایمان کی باتوں کو اچھی طرح یاد رکھیں اور انھیں اپنے پس ماندگان تک پہنچا دیں۔ ② رسول اللہ ﷺ نے شراب سازی کے چار برتنوں کے استعمال سے انھیں منع فرمایا جن کی تفصیل یہ ہے: دباء: کدو سے تیار کردہ پیالے۔ حنتم: بڑے بڑے مٹکے۔ مزفت: تارکول سے رنگے ہوئے روغنی برتن۔ نقیر: لکڑی سے تراشے ہوئے لگن۔ حدیث میں تین برتنوں کا ذکر ہوا ہے، اس لیے شعبہ کا بیان ہے کہ ابوجمرہ کبھی کبھی ان کے ساتھ نقیر کا بھی ذکر کرتے تھے۔ مزید وضاحت فرمائی کہ ابوجمرہ کبھی لفظ مزفت استعمال کرتے اور کبھی اس کے بجائے مقیر کہتے۔ دونوں کے معنی میں کوئی فرق نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دونوں الفاظ ترک کر دیے ہوں۔ ایسا صرف نقیر میں ہوا کہ کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ③ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے پورا عالم دین ہونا ضروری نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کو تبلیغ کا حکم دیا تھا وہ تمام دینی باتوں سے واقف نہ تھے بلکہ انھیں صرف چار باتوں کا حکم دیا تھا اور چار ہی باتوں سے منع کیا تھا۔ ایک حدیث میں تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے، خواہ وہ ایک قرآنی آیت ہی ہو۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید آیات قرآنی ہی کی تبلیغ مقصود ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس موقف کی تردید کی اور فرمایا کہ ہر چیز کی تبلیغ کرو، خواہ قرآنی آیت ہو یا حدیث نبوی۔ ④ واضح رہے کہ جن برتنوں کے استعمال کے متعلق یہاں پابندی کا ذکر ہے، اسے بعد میں رسول اللہ ﷺ نے ختم کر دیا تھا۔[2]

(٢٦) بَابُ الرِّحْلَةِ فِي الْمَسْأَلَةِ النَّازِلَةِ [وَتَعْلِيمِ أَهْلِهِ]

باب: 26- درپیش مسئلے کے لیے سفر کرنا (اور اپنے اہل کو تعلیم دینا)

وضاحت: اگر ہنگامی طور پر کوئی مسئلہ سامنے آجائے جس کا حکم معلوم نہ ہو اور وہاں کوئی بتانے والا بھی موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں اپنے گمان کے مطابق عمل کرے یا دریافت طلب امر کے لیے سفر کرے؟ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان ہے کہ ایسے حالات میں سفر کرنا ہوگا۔

٨٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا عُمَرُ بْنُ سَعِيدِ بْنِ أَبِي

[88] حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے ابواہاب بن عزیز کی بیٹی سے نکاح کیا تو ایک

[1] صحيح البخاري، الأذان، حديث:631. [2] صحيح مسلم، الأشربة، حديث:5207(977).

حُسَيْنٍ قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ الْحَارِثِ، أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابْنَةً لِأَبِي إِهَابِ ابْنِ عَزِيزٍ، فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَقَالَتْ: إِنِّي قَدْ أَرْضَعْتُ عُقْبَةَ، وَالَّتِي تَزَوَّجَ بِهَا، فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ: مَا أَعْلَمُ أَنَّكِ أَرْضَعْتِنِي، وَلَا أَخْبَرْتِنِي، فَرَكِبَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ بِالْمَدِينَةِ فَسَأَلَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَيْفَ وَقَدْ قِيلَ؟» فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجًا غَيْرَهُ. [انظر: ٢٠٥٢، ٢٦٤٠، ٢٦٥٩، ٢٦٦٠، ٥١٠٤]

عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے عقبہ اور اس کی بیوی کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عقبہ نے کہا: مجھے تو علم نہیں کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ پہلے تو نے اس کی خبر دی۔ پھر حضرت عقبہ سوار ہو کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ منورہ آ گئے اور آپ سے مسئلہ پوچھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''(تو اس عورت سے) کیسے (صحبت کرے گا) جب کہ ایسی بات کہی گئی ہے؟'' آخر عقبہ نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور اس نے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔

فوائد و مسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی ایسی صورت حال سامنے آ جائے جس کا حکم معلوم نہ ہو تو اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنا اور اس کے لیے سفر کرنا ضروری ہے، اپنے نظریے کے مطابق عمل کر لینا درست نہیں۔ ② اس حدیث سے ان شبہات کی وضاحت ہوتی ہے جن سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق شبہ پڑ جائے تو اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ احتیاط کا پہلو بہر حال مقدم رکھنا چاہیے۔ بعض حضرات نے اس مقام پر فتویٰ اور تقویٰ کی بحث کو چھیڑا ہے، یعنی فتویٰ تو یہی ہے کہ ایک عورت کی گواہی سے بیوی خاوند کے درمیان تفریق نہ کرائی جائے، البتہ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ اب انھیں اکٹھا نہیں رہنا چاہیے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کی گواہی سے تفریق کا فتویٰ صادر فرمایا۔ اس کی مکمل وضاحت کتاب الرضاعہ میں آئے گی۔ ③ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے جس عورت سے شادی کی تھی اس کا نام ام یحییٰ غنیّہ تھا جو ابواہاب بن عزیز کی بیٹی تھی اور تفریق کے بعد اس نے ظریب بن حارث سے شادی کر لی تھی اور جس عورت نے دودھ کے متعلق گواہی دی اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔[1]

(٢٧) بَابُ التَّنَاوُبِ فِي الْعِلْمِ

باب: 27- تحصیل علم کے لیے باری مقرر کرنا

٨٩ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ؛ ح: قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَقَالَ ابْنُ وَهْبٍ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي ثَوْرٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ عُمَرَ قَالَ: كُنْتُ أَنَا وَجَارٌ لِي مِنَ الْأَنْصَارِ

[89] حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی بنوامیہ بن زید کے گاؤں میں رہا کرتے تھے جو مدینے کی (مشرقی جانب) بلندی کی طرف تھا۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باری باری آتے تھے۔ ایک دن وہ آتا اور ایک دن میں۔ جس

[1] فتح الباري:244/1.

فِي بَنِي أُمَيَّةَ بْنِ زَيْدٍ، وَهِيَ مِنْ عَوَالِي الْمَدِينَةِ، وَكُنَّا نَتَنَاوَبُ النُّزُولَ عَلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ يَنْزِلُ يَوْمًا وَّأَنْزِلُ يَوْمًا، فَإِذَا نَزَلْتُ جِئْتُهُ بِخَبَرِ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مِنَ الْوَحْيِ وَغَيْرِهِ، وَإِذَا نَزَلَ فَعَلَ مِثْلَ ذٰلِكَ، فَنَزَلَ صَاحِبِي الْأَنْصَارِيُّ يَوْمَ نَوْبَتِهِ، فَضَرَبَ بَابِي ضَرْبًا شَدِيدًا فَقَالَ: أَثَمَّ هُوَ؟ فَفَزِعْتُ فَخَرَجْتُ إِلَيْهِ، فَقَالَ: قَدْ حَدَثَ أَمْرٌ عَظِيمٌ، فَدَخَلْتُ عَلٰى حَفْصَةَ فَإِذَا هِيَ تَبْكِي، فَقُلْتُ: أَطَلَّقَكُنَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ؟ قَالَتْ: لَا أَدْرِي، ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقُلْتُ وَأَنَا قَائِمٌ: أَطَلَّقْتَ نِسَاءَكَ؟ قَالَ: لَا، فَقُلْتُ: اَللهُ أَكْبَرُ. [انظر: ٢٤٦٨، ٤٩١٣، ٤٩١٥، ٥١٩١، ٥٢١٨، ٥٨٤٣، ٧٢٥٦، ٧٢٦٣]

دن میں آتا، اس روز کی وحی وغیرہ کا حال میں اسے بتا دیتا اور جس دن وہ آتا وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میرا انصاری دوست اپنی باری پر گیا۔ (جب واپس آیا تو) اس نے میرے دروازے پر زور سے دستک دی اور کہنے لگا کہ وہ (عمر) یہاں ہیں؟ میں گھبرا کر باہر آیا تو وہ بولا: آج ایک بہت بڑا سانحہ ہوا ہے۔ (رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے۔) میں حفصہ ؓ کے پاس گیا تو وہ رو رہی تھیں۔ میں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے تمھیں طلاق دے دی ہے؟ وہ بولیں: مجھے علم نہیں ہے۔ پھر میں نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کھڑے کھڑے عرض کی: آیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' تو میں نے (مارے خوشی کے) اللہ اکبر کہا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو دینی اور دنیوی ضروریات کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی مصروفیات میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ اسے حصول علم کے لیے وقت نہیں ملتا۔ ایسے حالات میں ضروری ہے کہ چند ساتھی مل کر ایک کمیٹی بنا لیں اور تقسیم کار کر لیں، ایک دن ایک شخص عالم دین کی خدمت میں حاضری دے اور دینی باتیں سیکھ کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو سنائے، دوسرے دن دوسرا حاضری دے اور پہلا کاروباری مصروفیات انجام دے۔ اس طرح بآسانی یہ لوگ علم دین حاصل کر سکیں گے۔ مذکورہ حدیث میں اسی طریقے کا ذکر ہے۔ آج کل تو دینی علوم پر مشتمل بہترین کتابیں مارکیٹ میں دستیاب ہیں، ان کتابوں کو مہیا کرنے میں عالمی ادارہ دارالسلام سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ خطباء، واعظین گاؤں گاؤں قریہ قریہ جا کر اہل دیہہ کو تعلیم دیتے ہیں، لہٰذا اس دور میں جہالت کا کوئی عذر باقی نہیں رہنا چاہیے۔ ② اس حدیث سے خبر واحد کی حجیت اور مراسیل صحابہ پر عمل کرنے کا پتہ چلتا ہے، نیز طالب علم کے لیے ہدایت ہے کہ وہ اپنے معاشی حالات پر بھی نظر رکھے اور جس دن مجلس علم میں حاضر نہ ہو سکے اس دن کی دینی معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی کوتاہی کو اپنے پاس نہ آنے دے۔[1] ③ اہل مکہ کی عورتیں اپنے خاوندوں سے مرعوب رہتی تھیں جبکہ مدینے میں اس کے برعکس عورتوں کا غلبہ تھا۔ ایک دن حضرت عمر ؓ متفکر بیٹھے تھے کہ ان کی بیوی نے اس کی وجہ پوچھی۔ حضرت عمر ؓ نے کہا: میں اس لیے پریشان ہوں کہ تم ہر کام میں دخل دیتی ہو۔ بیوی نے جواب دیا: آپ خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے، ازواج

2 فتح الباري:245/1.

مطہرات بھی رسول اللہ ﷺ کے معاملات میں مداخلت کرتی ہیں۔ اس سے آپ کو تکلیف پہنچی، فوراً تیاری کر کے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو سمجھانے کے لیے تشریف لے گئے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ اپنی بیٹیوں کو خاوند کی اطاعت اور فرمانبرداری کی نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ دیگر تفصیلات کتاب النکاح میں ذکر کی جائیں گی۔

(٢٨) بَابُ الْغَضَبِ فِي الْمَوْعِظَةِ وَالتَّعْلِيمِ إِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ

باب: 28- کسی ناپسندیدہ بات پر وعظ وتعلیم کے وقت اظہار ناراضی کرنا

٩٠ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيرٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ عَنِ ابْنِ أَبِي خَالِدٍ، عَنْ قَيْسِ بْنِ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُولَ اللهِ! لَا أَكَادُ أُدْرِكُ الصَّلَاةَ مِمَّا يُطَوِّلُ بِنَا فُلَانٌ، فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي مَوْعِظَةٍ أَشَدَّ غَضَبًا مِنْ يَوْمِئِذٍ، فَقَالَ: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّكُمْ مُنَفِّرُونَ، فَمَنْ صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الْمَرِيضَ وَالضَّعِيفَ وَذَا الْحَاجَةِ».

[انظر: ٧٠٢، ٧٠٤، ٦١١٠، ٧١٥٩]

[90] حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے لیے نماز باجماعت پڑھنا مشکل ہوگیا ہے کیونکہ فلاں صاحب نماز بہت لمبی پڑھاتے ہیں۔ (ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:) میں نے نبی ﷺ کو نصیحت کے وقت اس دن سے زیادہ کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا: ''لوگو! تم دین سے نفرت دلانے والے ہو، دیکھو جو کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے، اسے چاہیے کہ تخفیف کرے کیونکہ ان (مقتدیوں) میں بیمار، ناتواں اور صاحبِ حاجت بھی ہوتے ہیں۔''

فوائد و مسائل: ① اسلامی تعلیمات میں غصے، ناراضی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا کیونکہ اس سے نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور اخوت و مودت کی فضا قائم نہیں رہتی، لیکن استاد کا غصہ مختلف حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ استاد کا مقصود تعلیم دینا ہوتا ہے، تو اس میں بعض دفعہ سختی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے استاد کا غصہ مقصد تعلیم کے خلاف نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان احادیث کے پیش نظر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے موقع پر اگر ضرورت ہو تو غصے سے بھی کام لیا جاسکتا ہے بلکہ بعض اوقات مستحسن ہے، مثلاً: کوئی طالب علم غیرحاضری کرتا ہے یا گستاخی اور بے ادبی کا ارتکاب کرتا ہے یا حاضری کے باوجود اسباق میں توجہ نہیں دیتا تو استاد کو ڈانٹنے اور غصے ہونے کا حق ہے۔ شفقت و مہربانی اپنی جگہ مطلوب ہے اور غصے کا اظہار اپنے محل پر۔ ② اصلاح معاشرہ کے لیے طریق نبوی یہ ہے کہ وعظ و ارشاد میں کسی خاص شخص کا نام لے کر اسے نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ ایک اصولی بات کہہ دی جائے جس سے مقصد بھی حاصل ہو جائے اور مخاطب کو شرمندگی بھی نہ ہو، یا کسی وقت الگ اسے غلطی پر تنبیہ کر دی جائے کیونکہ بھرے مجمع میں کسی کو نشانہ بنانے سے بعض اوقات وہ ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے۔ ③ اس سے یہ بھی معلوم

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث:4913.

ہوا کہ ائمہ مساجد کو اپنے مقتدی حضرات کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ امام کا اس قدر لمبی قراءت کرنا جس میں بیماروں، کمزوروں اور ضرورت مندوں کا لحاظ نہ ہو، شان امامت اور موضوع امامت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے موقع پر بہت سختی سے نوٹس لیا اور فرمایا کہ تم لوگوں کو نماز باجماعت سے نفرت دلانے والے ہو۔ ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں وعظ و تعلیم کے مواقع پر غصہ کرنے کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ کرتے وقت غضبناک ہونا جائز نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جج کو بحالت غصہ فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، البتہ رسول اللہ ﷺ بحالت غصہ بھی فتویٰ دینے یا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے کیونکہ یہ آپ کا خاصہ تھا۔ آپ کسی حالت میں بھی حق سے انحراف نہیں فرماتے تھے۔[1] ⑤ اس حدیث میں شکایت کنندہ نے کہا: میرے لیے نماز باجماعت پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نماز باجماعت کے قریب نہیں جاتا بلکہ بعض اوقات دانستہ اس سے دیر کرتا ہوں کیونکہ جماعت میں قراءت بہت طویل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سخت ناراض اس لیے ہوئے کہ شاید آپ پہلے بھی اس سے منع فرما چکے تھے۔[2]

٩١ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَامِرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ بِلَالٍ [الْمَدَنِيُّ] عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ يَزِيدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَأَلَهُ رَجُلٌ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ: «اِعْرِفْ وِكَاءَهَا - أَوْ قَالَ: وِعَاءَهَا - وَعِفَاصَهَا، ثُمَّ عَرِّفْهَا سَنَةً ثُمَّ اسْتَمْتِعْ بِهَا، فَإِنْ جَاءَ رَبُّهَا فَأَدِّهَا إِلَيْهِ»، قَالَ: فَضَالَّةُ الْإِبِلِ؟ فَغَضِبَ حَتَّى احْمَرَّتْ وَجْنَتَاهُ - أَوْ قَالَ: احْمَرَّ وَجْهُهُ - فَقَالَ: «وَمَا لَكَ وَلَهَا؟ مَعَهَا سِقَاؤُهَا وَحِذَاؤُهَا، تَرِدُ الْمَاءَ وَتَرْعَى الشَّجَرَ، فَذَرْهَا حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا»، قَالَ: فَضَالَّةُ الْغَنَمِ؟ قَالَ: «لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ». [انظر: ٢٣٧٢، ٢٤٢٧، ٢٤٢٨، ٢٤٢٩، ٢٤٣٦، ٢٤٣٨، ٥٢٩٢، ٦١١٢]

[91] حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے گری ہوئی چیز کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: ''اس کے بندھن یا برتن اور تھیلی کی پہچان رکھ اور ایک سال تک لوگوں سے پوچھتا رہ، پھر اس سے فائدہ اٹھا۔ اس دوران میں اگر اس کا مالک آ جائے تو اس کے حوالے کر دے۔'' پھر اس شخص نے پوچھا کہ گمشدہ اونٹ کا کیا حکم ہے؟ یہ سن کر آپ اس قدر غصے ہوئے کہ آپ کے رخسار مبارک سرخ ہو گئے، یا آپ کا چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا (راوی کو شک ہے۔) اور فرمایا: ''تجھے اونٹ سے کیا غرض ہے؟ اس کی مشک اور اس کا موزہ اس کے ساتھ ہے، جب پانی پر پہنچے گا، پانی پی لے گا اور درخت سے چر لے گا، اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کا مالک اسے ڈھونڈ لے۔'' پھر اس شخص نے کہا: اچھا، گمشدہ بکری؟ آپ نے فرمایا: ''وہ تمھاری یا تمھارے بھائی (مالک) کی یا بھیڑیے کی ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے ناراض ہونے کا ذکر ہے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ اونٹ کے متعلق

[1] صحیح البخاري، الأحکام، حدیث: 7160، و فتح الباري: 247/1. [2] فتح الباري: 246/1.

سوال کرنا ہی فضول اور بے محل تھا کیونکہ لقطہ کو اٹھا کر محفوظ کر لینے کا مقصد مال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے، لیکن اونٹ کے ضیاع کا اندیشہ نہیں ہے کہ اسے حفاظت کے لیے پکڑا جائے۔ اونٹ بھوک، پیاس اور تھکن کی وجہ سے تو مر نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ مشکیزہ ہے، کئی دن تک پانی پیے بغیر گزارہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی گردن اتنی اونچی بنائی ہے کہ اونچے درخت کے پتے بھی کھا سکتا ہے۔ اسے چلنے میں تھکن نہیں ہوتی کیونکہ اس کے پاؤں میں جوتا ہے۔ طاقتور اتنا ہے کہ کسی جانور کا لقمہ نہیں بن سکتا۔ ایسے حالات میں اسے پکڑنے کا کیا فائدہ؟ اگر سائل نے تدبر سے کام لیا ہوتا تو اس کے متعلق سوال نہ کرتا، اس لیے کہ اس کا مالک اسے ڈھونڈتے ہوئے خود اس تک پہنچ جائے گا۔ ہاں! اگر اونٹ ایسی جگہ نظر آئے جہاں ڈاکو یا چور رہتے ہوں یا اس مقام پر خونخوار درندے ہوں تو ایسی صورت میں اندیشہ ہے کہ اگر اسے پکڑا نہ گیا تو کوئی خونخوار درندہ پھاڑ کھائے گا یا کسی شر پسند کی بھینٹ چڑھ جائے گا اور مالک اس سے محروم ہو جائے گا، تو ایسے حالات میں اسے پکڑ لینا چاہیے۔ اونٹ کے متعلق آپ کا جواب زمانۂ نبوی کے ماحول کے پیش نظر تھا مگر آج کل ماحول بہت بگڑا ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاگردوں کے نامناسب سوال کرنے پر استاد کی ناراضی بجا تسلیم کی جائے گی، اس لیے شاگردوں کو سوال کرنے سے پہلے خود سوال کی اہمیت پر غور کر لینا چاہیے۔ ② گرے پڑے سامان کو اٹھا کر بعد از تشہیر اس سے فائدہ اٹھانے کی دو صورتیں ہیں: ✸ اگر اٹھانے والا مال دار ہے تو کسی نادار کو صدقے کے طور پر دے کر ثواب کمائے۔ ✸ اگر خود غریب ہے تو مالک کی طرف سے اسے خود پر بطور صدقہ صرف کرے۔ دونوں صورتوں میں نیت یہ ہو کہ مالک کے آنے پر اگر وہ صدقہ منظور نہ کرے تو مطالبے پر اس کی قیمت ادا کر دوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گری پڑی چیز کو اٹھانے والا اس کا مالک نہیں بن جاتا بلکہ مالک کی طرف سے اس مال کا امین ہو جاتا ہے اور امانت کا اصول یہ ہے کہ مالک کے مطالبے پر اس کا واپس کرنا ضروری ہے۔ اس کے متعلق دیگر مسائل کتاب اللقطہ میں بیان کیے جائیں گے۔

٩٢ - **حَدَّثَنَا** مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسٰى قَالَ: سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ أَشْيَاءَ كَرِهَهَا، فَلَمَّا أُكْثِرَ عَلَيْهِ غَضِبَ ثُمَّ قَالَ لِلنَّاسِ: «سَلُونِي عَمَّا شِئْتُمْ»، قَالَ رَجُلٌ: مَنْ أَبِي؟ قَالَ: «أَبُوكَ حُذَافَةُ»، فَقَامَ آخَرُ فَقَالَ: مَنْ أَبِي يَا رَسُولَ اللهِ؟ فَقَالَ: «أَبُوكَ سَالِمٌ مَوْلَى شَيْبَةَ»، فَلَمَّا رَأَى عُمَرُ مَا فِي وَجْهِهِ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّا نَتُوبُ إِلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ. [انظر: ٧٢٩١]

[92] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ سے چند ایسی باتیں پوچھی گئیں جو آپ کے مزاج کے خلاف تھیں۔ جب اس قسم کے سوالات کی آپ کے سامنے تکرار کی گئی تو آپ کو غصہ آ گیا، پھر لوگوں سے فرمایا: ''اچھا جو چاہو مجھ سے پوچھو۔'' اس پر ایک شخص نے عرض کیا: میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تیرا باپ حذافہ ہے۔'' پھر دوسرے شخص نے کھڑے ہو کر کہا: یارسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تیرا باپ سالم ہے جو شیبہ کا غلام ہے۔'' پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار غضب دیکھے تو کہنے لگے:

یا رسول اللہ! ہم اللہ عزوجل کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں منافقین بھی ہوتے تھے۔ وہ آپ سے ناگفتہ بہ سوالات کرتے۔ ایک دن بے تکے سوالات شروع ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ آج تمھیں جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ آپ نے یہ بات غصے میں فرمائی، اس لیے ہر سوال پر غصہ بڑھتا گیا۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ کو لوگ ان کے نسب کے متعلق بہت چڑایا کرتے تھے۔ انھوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے سوال کر دیا کہ میرا باپ کون ہے؟ پھر حضرت سعد بن سالم مولی شیبہ نے بھی اس قسم کا سوال کر ڈالا۔ اگرچہ بشر ہونے کی حیثیت سے آپ غیب دان نہیں تھے لیکن اللہ کے برگزیدہ رسول ہونے کی حیثیت سے وحی کے ذریعے سے ایسے احوال سے آگاہی ہو جاتی جن کی آپ کو ضرورت پیش آتی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرۂ انور سے غصے کا اندازہ لگایا تو دیگر حاضرین کی نمائندگی کرتے ہوئے ایسے سوالات سے باز رہنے کا وعدہ فرمایا۔ ② حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو بحالت غصہ دیکھ کر دو زانو بیٹھ گئے اور کہنے لگے: ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔[1] ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت کی جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے اور دو زانو بیٹھ کر مذکورہ الفاظ بھی کہے جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔[2] ③ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کثرت سوالات اور لایعنی تکلفات ایک مکروہ عمل ہے، نیز کسی صاحب علم سے لغو اور بے ہودہ سوالات کرنا سراسر نادانی اور جہالت ہے کیونکہ اس قسم کے سوالات کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(٢٩) بَابُ مَنْ بَرَكَ عَلَى رُكْبَتَيْهِ عِنْدَ الْإِمَامِ أَوِ الْمُحَدِّثِ

باب: 29- محدث یا امام کے سامنے دو زانو بیٹھنے کا بیان

٩٣ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ خَرَجَ فَقَامَ عَبْدُ اللهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ: مَنْ أَبِي؟ فَقَالَ: «أَبُوكَ حُذَافَةُ»، ثُمَّ أَكْثَرَ أَنْ يَقُولَ: «سَلُونِي»، فَبَرَكَ عُمَرُ عَلَى رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ: رَضِينَا بِاللهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيًّا، فَسَكَتَ. [انظر: ٥٤٠، ٧٤٩، ٤٦٢١، ٦٣٦٢، ٦٤٦٨، ٦٤٨٦، ٧٠٨٩، ٧٠٩٠، ٧٠٩١، ٧٢٩٤، ٧٢٩٥]

[93] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر سوال کیا: میرے والد کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: ”تمھارے والد حذافہ ہیں۔“ پھر آپ نے بار بار فرمایا: ”مجھ سے دریافت کرو۔“ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دو زانو بیٹھ گئے اور کہنے لگے: ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے پر خوش ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔

---

1 صحيح البخاري، العلم، حديث:93. 2 فتح الباري:247/1.

فوائد و مسائل: ① حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کو بعض لوگ کسی اور کا بیٹا کہا کرتے تھے، اس لیے انھوں نے تسلی کے لیے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے حقیقت حال کی وضاحت فرما دی۔ اس طرح مجلس میں بہت سے بے تکے سوالات ہوئے جن سے رسول اللہ ﷺ کا غصہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے دو چیزیں اختیار کیں۔ ایک کا تعلق قول سے ہے اور دوسری کا فعل سے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کی ربوبیت، رسول ﷺ کی رسالت اور اسلام کی حقانیت کا اقرار کیا اور عملاً یہ کیا کہ دو زانو بیٹھنے کی نشست اختیار فرمائی تاکہ اس عاجزانہ اور مؤدبانہ طریقے سے آپ کا غصہ فرو ہو۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ② دو زانو بیٹھنا تشہد بیٹھنے کی کیفیت ہے۔ شاید کوئی غیر نماز میں اس طرح بیٹھنے کو ناجائز کہہ دے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے بتایا کہ اس طرح بیٹھنا نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ بھی ہے کیونکہ اس میں تواضع ہے، نیز اس طرح بیٹھنا استاد کی توجہات کو بھی کھینچتا ہے، اس لیے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یہی نشست موزوں اور مناسب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاگرد کو اپنے استاد کا احترام ہمہ وقت ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ مشہور مقولہ ہے:

با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب

(٣٠) بَابُ مَنْ أَعَادَ الْحَدِيثَ ثَلَاثًا لِيُفْهَمَ عَنْهُ

باب: 30- خوب سمجھانے کے لیے ایک بات کو تین مرتبہ دہرانا

فَقَالَ: «أَلَا وَقَوْلُ الزُّورِ» فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا. وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «هَلْ بَلَّغْتُ»؟ ثَلَاثًا.

آپ نے فرمایا: ”آگاہ رہو اور جھوٹ بولنا......“ ان کلمات کو بار بار دہراتے رہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے: نبی ﷺ نے تین مرتبہ یہ فرمایا: ”کیا میں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا؟“

٩٤ - حَدَّثَنَا عَبْدَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا ثُمَامَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّهُ كَانَ إِذَا سَلَّمَ سَلَّمَ ثَلَاثًا، وَإِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا. [انظر: ٩٥، ٦٢٤٤]

[94] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ جب سلام کرتے تو تین بار سلام کرتے اور جب کوئی بات فرماتے تو اسے تین مرتبہ دہراتے (تاآنکہ اسے خوب سمجھ لیا جاتا۔)

فائدہ: رسول اللہ ﷺ کا خاص اوقات میں تین دفعہ سلام کرنے کا معمول تھا، مثلاً: کسی کے گھر آنے کی اجازت طلب کرتے تو ایسا ہوتا تھا۔ یا ایک مرتبہ اجازت کے لیے، دوسرا جب ان کے پاس جاتے اور تیسرا جب ان سے رخصت ہوتے۔ عام

حالات میں تین مرتبہ سلام کرنا آپ کے معمولات سے ثابت نہیں۔[1] ''آگاہ رہو اور جھوٹ بولنا'' پوری حدیث اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں بڑے بڑے گناہوں کی خبر نہ دوں؟'' ہم نے کہا: کیوں نہیں! آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا۔'' (اس کے بعد) آپ سنبھل کر بیٹھ گئے جب کہ پہلے آپ نے ٹیک لگائی ہوئی تھی (اور فرمایا) ''آگاہ رہو، اور جھوٹ بولنا۔'' اس پر آپ نے اس قدر زور دیا کہ بار بار تکرار کرتے رہے حتی کہ ہم نے کہا: کاش آپ خاموشی اختیار فرمالیں۔[2] اس مخصوص طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تکرار کی یہ صورت ہر موقع پر نہ ہوتی تھی بلکہ کسی چیز کی اہمیت کے پیش نظر بار بار اعادہ ہوتا تھا، غالباً اسی لیے آگے روایت میں ثَلَاثًا کی قید لگی ہوئی ہے، یعنی جب آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ضروری نصیحتیں فرمائیں تو آخر میں تین مرتبہ فرمایا: ''کیا میں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا؟''

٩٥ - حَدَّثَنَا عَبْدَةُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ: حَدَّثَنَا ثُمَامَةُ بْنُ عَبْدِ اللهِ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّهُ كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلَاثًا حَتّٰى تُفْهَمَ، وَإِذَا أَتٰى عَلٰى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلَاثًا. [راجع: ٩٤]

[95] حضرت انس ؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب کوئی اہم بات فرماتے تو اسے تین بار دہراتے تاکہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اور جب کسی قوم کے پاس تشریف لاتے تو انھیں تین مرتبہ سلام کہتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس عنوان سے ان لوگوں کی تردید کی ہے جو حدیث کے دہرانے اور دہرا دینے کی طلب کو معیوب خیال کرتے ہیں۔ بات کو دہرانا طلبہ کی طبائع کے اختلاف کے پیش نظر ہوتا ہے: بعض طلباء ایک ہی مرتبہ سمجھ لیتے ہیں اور بعض حضرات کو کئی کئی بار دہرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر طالب علم کند ذہن ہو تو اس کے لیے زیادہ سے زیادہ تین دفعہ دہرایا جاسکتا ہے اور جو تین بار دہرانے کے باوجود سمجھنے سے قاصر رہے، اس کا کوئی علاج نہیں۔[3] ② تین دفعہ سلام کرنے کی ایک توجیہ تو سابق حدیث میں بیان ہو چکی ہے، کچھ توجیہات حسب ذیل ہیں: * یہ سلام، سلام اجازت ہے جو زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ امام بخاری ؒ کا یہی مقصد ہو، کیونکہ آپ نے کتاب الاستئذان میں اس حدیث کو حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کے واقعے کے ساتھ بیان کیا ہے جو سلام اجازت کے متعلق حضرت عمر ؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔[4] * جب مجمع کثیر ہوتا اور لوگ منتشر ہوتے تو سب کو سلام پہنچانے کے لیے تین مرتبہ سلام کرتے: ایک سامنے، دوسرا دائیں جانب اور تیسرا بائیں طرف، کیونکہ آپ کے سلام کے تمام حاضرین مشتاق ہوتے تھے۔ * جب آپ بڑے مجمع میں شریک ہوتے تو ایک سلام داخل ہوتے ہی کرتے، دوسرا وسط میں پہنچ کر اور تیسرا سلام مجلس کے آخر میں پہنچ کر کرتے تھے۔

---

1 شرح الكرماني:86/2. 2 صحيح البخاري، الشهادات، حديث:2654. 3 فتح الباري:249/1. 4 صحيح البخاري، الاستئذان، حديث:6245.

٩٦ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بِشْرٍ، عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ: تَخَلَّفَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي سَفَرٍ سَافَرْنَاهُ، فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الصَّلَاةَ، صَلَاةَ الْعَصْرِ، وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ، فَجَعَلْنَا نَمْسَحُ عَلٰى أَرْجُلِنَا، فَنَادٰى بِأَعْلٰى صَوْتِهِ: «وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا. [راجع: ٦٠]

[96] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے ایک سفر میں پیچھے رہ گئے۔ پھر آپ ہمیں آ ملے جبکہ عصر کا وقت ہو چکا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے، چنانچہ ہم اپنے پیروں پر پانی کا ہاتھ پھیرنے لگے تو آپ نے بآواز بلند دو یا تین مرتبہ فرمایا: ''ایڑیوں کے لیے آگ سے خرابی ہے۔''

فائدہ: بوقت وضو ایڑیوں کے خشک رہ جانے کو رسول اللہ ﷺ نے اتنی اہمیت دی کہ ان کے متعلق وعید کو تین مرتبہ دہرایا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ کسی اہم بات کو کئی دفعہ دہرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(٣١) بَابُ تَعْلِيمِ الرَّجُلِ أَمَتَهُ وَأَهْلَهُ

باب:31- اپنی لونڈی اور اہل خانہ کو تعلیم دینا

٩٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْمُحَارِبِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا صَالِحُ بْنُ حَيَّانَ قَالَ: قَالَ عَامِرٌ الشَّعْبِيُّ: حَدَّثَنِي أَبُو بُرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ ﷺ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَدّٰى حَقَّ اللهِ تَعَالٰى وَحَقَّ مَوَالِيهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ».

[97] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین شخص ایسے ہیں جنھیں دوگنا ثواب ملے گا: ایک وہ شخص جو اہل کتاب میں سے اپنے نبی پر اور پھر محمد ﷺ پر ایمان لایا، اور دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا اور اپنے مالکان کا حق ادا کرتا رہا، اور (تیسرا) وہ شخص جس کے پاس اس کی لونڈی ہو، پھر وہ اسے اچھی طرح تعلیم وادب سے آراستہ کرکے آزاد کر دے، بعد ازاں اس سے نکاح کر لے، تو اسے دوہرا ثواب ملے گا۔

ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ: أَعْطَيْنَاكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ، قَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيمَا دُونَهَا إِلَى الْمَدِينَةِ. [انظر: ٢٥٤٤، ٢٥٤٧، ٢٥٥١، ٣٠١١، ٣٤٤٦، ٥٠٨٣]

پھر عامر نے کہا: یہ حدیث ہم نے تمھیں کسی چیز کے بغیر ہی دے دی ہے ورنہ اس سے کم تر مسئلے کے لیے مدینے تک کا سفر کیا جاتا تھا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم انتہائی ضروری ہے، پھر یہ مردوں ہی کے لیے خاص نہیں بلکہ عورتوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہیے، پھر عورتوں میں سے باندیوں کو بھی اس کا ضروری حصہ ملنا چاہیے۔ حدیث میں چونکہ

لونڈی کا ذکر ہے، اس لیے عنوان میں لونڈی کو مقدم کیا۔ اس سے اہل کی تعلیم بایں طور ثابت ہوئی کہ جب لونڈی کی تعلیم ضروری ہے تو آزاد اور دیگر اہل وعیال کی تعلیم تو بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگی۔ حدیث میں تعلیم کے ساتھ تادیب کا بھی ذکر ہے، یعنی ادب سکھانا اور عمدہ تربیت کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر علم کے ساتھ تربیت نہ ہو تو ایسے علم سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مستدل حدیث میں مذکور تیسرا شخص ہے جو لونڈی کا مالک ہونے کی حیثیت سے ہر قسم کی خدمت لیتا ہے حتیٰ کہ اپنی جنسی خواہشات کی تسکین بھی کرسکتا ہے، اس کے باوجود وہ اللہ سے اجر لینے کے لیے اس کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرتا ہے اور وہ سلیقہ شعار اور معاملہ فہم لونڈی بن جاتی ہے، پھر اسے آزاد کر دیتا ہے، پھر اس پر بس نہیں بلکہ کسی مطالبے کے بغیر اپنے برابر قرار دے کر اس سے نکاح کر لیتا ہے۔ الغرض یہ تعلیم دین کے ثمرات وفوائد ہیں۔ ② یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے اسلاف ایک ایک حدیث کے لیے دور دراز کا سفر کرتے اور بے پناہ مشقتیں اٹھایا کرتے تھے، اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس گوہر نایاب کی قدر ومنزلت کو پہچانیں اور اسے اہتمام کے ساتھ حرز جان بنائیں۔

(٣٢) بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَاءَ وَتَعْلِيمِهِنَّ

باب: 32- امام کا عورتوں کو نصیحت کرنا اور انھیں تعلیم دینا

٩٨ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَيُّوبَ قَالَ: سَمِعْتُ عَطَاءً، قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ: أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ - أَوْ قَالَ عَطَاءٌ أَشْهَدُ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ - خَرَجَ وَمَعَهُ بِلَالٌ فَظَنَّ أَنَّهُ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَاءَ فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ، فَجَعَلَتِ الْمَرْأَةُ تُلْقِي الْقُرْطَ وَالْخَاتَمَ، وَبِلَالٌ يَأْخُذُ فِي طَرَفِ ثَوْبِهِ. وَقَالَ إِسْمَاعِيلُ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ عَطَاءٍ. وَقَالَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَشْهَدُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ. [انظر: ٨٦٣، ٩٦٢، ٩٦٤، ٩٧٥، ٩٧٧، ٩٧٩، ٩٨٩، ١٤٣١، ١٤٤٩، ٤٨٩٥، ٥٢٤٩، ٥٨٨٠، ٥٨٨١، ٥٨٨٣، ٧٣٢٥]

[98] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ (عید کے دن مردوں کی صف سے عورتوں کی جانب) نکلے اور آپ کے ہمراہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے، آپ کو خیال ہوا کہ شاید عورتوں تک میری آواز نہیں پہنچی، اس لیے آپ نے انھیں نصیحت فرمائی اور صدقہ وخیرات دینے کا حکم دیا، تو کوئی عورت اپنی بالی اور کوئی اپنی انگوٹھی ڈالنے لگی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ (ان زیورات کو) اپنے کپڑے میں جمع کرنے لگے۔

اس حدیث کو اسماعیل (ابن علیہ) نے ایوب سے، انھوں نے عطاء سے، انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نبی ﷺ پر گواہی دیتا ہوں۔

فوائد ومسائل: ① مرد گھر کا نگران ہونے کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کا ذمے دار ہے لیکن اس کے

باوجود تعلیم نسواں کے متعلق امام کی ذمے داری ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ اول تو ہر شخص اصول تعلیم سے واقف نہیں ہوتا، اگر وہ تعلیم یافتہ ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے کن کن باتوں کا ہونا ضروری ہے، اس لیے امام کو چاہیے کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ درسگاہ کا اہتمام کرے۔ ان کی ضروریات کے پیش نظر نصاب تعلیم مرتب کرے، پھر اس نصاب کو پڑھانے کے لیے قابل اساتذہ کا اہتمام کرے۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ چادر و چار دیواری کے تحفظ کا پورا اہتمام ہو اور مردوں کا داخلہ ممنوع ہو، نیز تعلیم مخلوط نہ ہو کیونکہ مخلوط تعلیم میں فتنہ و فساد کے اتنے دروازے کھلتے ہیں کہ تعلیم کا مفاد اس کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ ③ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو وعظ فرمایا جس کی تفصیل دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں نے تمھاری اکثریت باہمی لعن طعن اور کفران عشیر کی وجہ سے جہنم میں دیکھی ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ صدقہ و خیرات کثرت سے کیا کرو۔''[1] ④ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صدقہ و خیرات کے لیے شوق دلانا اور سفارش کرنا بڑے ثواب کا کام ہے، نیز عورتوں کے لیے انگوٹھی، چھلا، ہار، گلوبند اور بالیاں وغیرہ پہننے کا جواز ہے۔ ⑤ آج کل چونکہ لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے ہیں، امام کے وعظ و نصیحت کو مرد و عورتیں برابر سنتے ہیں، اس لیے مستقل طور پر عورتوں کے پاس آنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ⑥ اس حدیث سے عورتوں کا عیدگاہ جانا بھی ثابت ہوا لیکن پردے اور سادگی کے احکام کے ساتھ جانا چاہیے۔ نمود و نمائش سے ثواب ضائع اور گناہ لازم ہو جاتا ہے۔ جو حضرات اس سنت (عورتوں کے عیدگاہ جانے) کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

(٣٣) بَابُ الْحِرْصِ عَلَى الْحَدِيثِ

باب :33- حدیث نبوی کے حصول کے لیے حرص کرنا

٩٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ عَنْ عَمْرِو بْنِ أَبِي عَمْرٍو، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ: قِيلَ: يَارَسُولَ اللهِ! مَنْ أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَقَدْ ظَنَنْتُ يَاأَبَا هُرَيْرَةَ! أَنْ لَّا يَسْأَلَنِي عَنْ هٰذَا الْحَدِيثِ أَحَدٌ أَوَّلَ مِنْكَ لِمَا رَأَيْتُ مِنْ حِرْصِكَ عَلَى الْحَدِيثِ، أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ خَالِصًا مِّنْ قَلْبِهِ

[99] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قیامت کے دن آپ کی سفارش سے کون زیادہ حصہ پائے گا؟ تو آپ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! مجھے یقین تھا کہ تجھ سے پہلے کوئی مجھ سے یہ بات نہیں پوچھے گا، کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تجھے حدیث کی بڑی حرص ہے۔ قیامت کے دن میری شفاعت سے سب سے زیادہ بہرہ ور وہ شخص ہوگا جس نے اپنے دل یا خلوص نیت سے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہا ہوگا۔''

[1] صحيح البخاري، الإيمان، حديث:29.

أَوْ نَفْسِهِ» . [انظر : ٦٥٧٠]

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے مطلق علم کی ترغیب کے متعلق بیان کیا تھا، اب علم حدیث کی فضیلت کے متعلق حدیث لائے ہیں۔ حدیث لغوی طور پر نئی چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم چونکہ قدیم ہے، اس کے مقابلے میں حدیث نئی چیز ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی تعریف یہ ہے: ہر وہ قول و فعل اور اقرار و اخلاق جس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو علم حدیث سے خصوصی شغف تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ میرے انصاری بھائی کھیتی باڑی میں مصروف رہتے اور مہاجرین اپنے کاروبار میں مشغول رہتے اور میں ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہتا، مبادا آپ کی کوئی بات یا اُدا رہ جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے نسیان کی شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر بچھائی، اس پر کچھ پڑھا، پھر فرمایا: ''ابو ہریرہ اسے اپنے سینے سے لگا لو۔'' جس سے ان کا سینہ گنجینۂ احادیث بن گیا۔[1] ② قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی سفارش مختلف انداز سے ہوگی: ○ ترقیٔ درجات و رفع منازل کی سفارش۔ ○ بلا حساب و کتاب دخول جنت کی سفارش۔ ○ عذاب جہنم سے تخفیف کی سفارش۔ ○ دوزخ سے بعض اہل ایمان کو نکالنے کی سفارش۔ ○ مستحق نار کو عذاب سے نجات کی سفارش۔ ○ محشر کی ہولناکی سے نجات کی سفارش۔ ③ دل سے کلمۂ اخلاص کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے، کیونکہ جو شخص شرک کرتا ہے اس کا محض زبانی دعویٰ ہے، دل سے اس کا اقرار نہیں کرتا، ان میں سفارش کا زیادہ حقدار وہ ہوگا جس نے اخلاص کے ساتھ کلمہ پڑھا ہوگا۔

(٣٤) بَابٌ : كَيْفَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ؟

باب: 34- علم کس طرح اٹھالیا جائے گا؟

وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى أَبِي بَكْرِ بْنِ حَزْمٍ: أُنْظُرْ مَا كَانَ مِنْ حَدِيثِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاكْتُبْهُ، فَإِنِّي خِفْتُ دُرُوسَ الْعِلْمِ وَذَهَابَ الْعُلَمَاءِ، وَلَا [تَقْبَلْ] إِلَّا حَدِيثَ النَّبِيِّ ﷺ، وَلْيُفْشُوا الْعِلْمَ، وَلْيَجْلِسُوا حَتَّى يُعَلَّمَ مَنْ لَّا يَعْلَمُ، فَإِنَّ الْعِلْمَ لَا يَهْلِكُ حَتَّى يَكُونَ سِرًّا .

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ابوبکر بن حزم کو لکھا: دیکھو! جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں انھیں لکھ لو، اس لیے کہ مجھے علم مٹ جانے اور علماء کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلے میں صرف نبی ﷺ کی احادیث ہی قبول کرنا۔ علماء کو چاہیے کہ وہ علم کو پھیلائیں اور علمی مجالس کا اہتمام کریں تاکہ جاہل بھی جان لیں، اس لیے کہ علم چھپانے ہی سے ضائع ہوتا ہے۔

وضاحت: اس عنوان میں علم کے بقا کی صورتیں بیان کی گئی ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے ضبط تحریر میں لایا جائے، چنانچہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے مدینے کے گورنر ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ تمھیں جس قدر بھی رسول اللہ ﷺ کی مستند طریق سے

[1] صحیح البخاري، العلم، حدیث:119.

روایات ملیں انھیں لکھ لو، کیونکہ اگر یہ احادیث سینوں میں محفوظ رہیں تو یہ حفاظ حدیث کب تک زندہ رہیں گے؟ خطرہ ہے کہ ان کی موت کے ساتھ یہ علم بھی دفن ہو جائے گا۔ گردش ایام ہر چیز پر اثر انداز ہوتی ہے۔ علم پر بھی اس کا اثر ہوگا، اس لیے فنا سے بچانے کے لیے اسے لکھ لینا ضروری ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک طرف تو کتابت حدیث کی ترغیب دلائی، دوسری طرف بقائے علم کے لیے مزید تجاویز دیں: پہلی تجویز یہ ہے کہ علم کو پھیلایا جائے جس کی صورت وعظ و تبلیغ ہے۔ دوسری تجویز مجالس علمیہ کا انعقاد ہے۔ اس سے مدارس میں درس و تدریس کا اہتمام کرنا مراد ہے۔ علم کی ہلاکت اس کو راز بنا کر رکھنے میں ہے، لہٰذا تعلیم دین کو عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تعلیمات کو غیر ضروری پابندیوں سے آزاد رکھا جائے۔

نوٹ: بخاری کے بعض نسخوں میں کچھ عبارت زائد ہے۔ اس میں سند کے حوالے سے امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات صرف "ذهاب العلماء" تک پہنچی ہے۔ اب ان الفاظ کے بعد جو ارشادات ہیں ممکن ہے کہ امام بخاری نے انھیں دوسری روایات سے لے کر شامل کر دیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے خود ہی ان کا اضافہ کر دیا ہو کیونکہ یہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ارشادات ہی کا نتیجہ ہیں۔ ابونعیم نے اپنی کتاب تاریخ أصبهان: 311/1 میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس اثر کو موصولاً بیان کیا ہے۔

١٠٠ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ اللهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا».

[100] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: "اللہ تعالیٰ دین کے علم کو ایسے نہیں اٹھائے گا کہ بندوں کے سینوں سے نکال لے بلکہ اہل علم کو موت دے کر علم کو اٹھائے گا۔ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنا لیں گے۔ ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

قَالَ الْفِرَبْرِيُّ: حَدَّثَنَا عَبَّاسٌ قَالَ: حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ هِشَامٍ نَحْوَهُ.

فربری نے اس حدیث کے مضمون کو ہشام سے ایک دوسری سند سے بھی حاصل کیا ہے۔

[انظر: ٧٣٠٧]

فائدہ: اللہ تعالیٰ علوم و فنون کو سینوں سے محو کر دینے پر قادر ہے لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ قبض علم کی یہ صورت ہوگی کہ خود علماء ختم ہو جائیں گے اور دوسرے علماء پیدا نہ ہوں گے۔ اس حدیث میں علم کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے۔ ہر عالم کا فریضہ ہے کہ اپنے بعد کچھ علماء چھوڑے، بصورت دیگر جہلاء، علماء کی جگہ بیٹھیں گے اور گمراہی پھیلائیں گے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم حدیث کی بنیاد پر فتویٰ دینا ہی حقیقی ریاست ہے۔[1]

(1) فتح الباري: 258/1.

(٣٥) بَابٌ: هَلْ يَجْعَلُ لِلنِّسَاءِ يَوْمًا عَلَى حِدَةٍ فِي الْعِلْمِ؟

باب:35- کیا عورتوں کی تعلیم کے لیے علیحدہ دن مقرر کیا جا سکتا ہے؟

١٠١ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا صَالِحٍ ذَكْوَانَ يُحَدِّثُ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ النِّسَاءُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: غَلَبَنَا عَلَيْكَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِّنْ نَّفْسِكَ، فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيهِ فَوَعَظَهُنَّ وَأَمَرَهُنَّ، فَكَانَ فِيمَا قَالَ لَهُنَّ «مَا مِنْكُنَّ امْرَأَةٌ تُقَدِّمُ ثَلَاثَةً مِّنْ وَلَدِهَا إِلَّا كَانَ لَهَا حِجَابًا مِّنَ النَّارِ». فَقَالَتِ امْرَأَةٌ: وَاثْنَيْنِ؟ فَقَالَ: «وَاثْنَيْنِ». [انظر: ١٢٤٩، ٧٣١٠]

[101] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چند عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: مرد آپ سے فائدہ اٹھانے میں ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں، اس لیے آپ اپنی طرف سے ہمارے لیے کوئی دن مقرر فرما دیں۔ آپ نے ان کی ملاقات کے لیے ایک دن کا وعدہ کر لیا، چنانچہ اس دن آپ نے انھیں نصیحت فرمائی اور شریعت کے احکام بتائے۔ آپ نے انھیں جو باتیں تلقین فرمائیں، ان میں ایک یہ بھی تھی: ''تم میں سے جو عورت اپنے تین بچے آگے بھیج دے گی تو وہ اس کے لیے دوزخ کی آگ سے حجاب بن جائیں گے۔'' ایک عورت نے عرض کیا: اگر کوئی دو بھیجے تو؟ آپ نے فرمایا: ''دو کا بھی یہی حکم ہے۔''

١٠٢ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ، عَنْ ذَكْوَانَ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِهٰذَا.

وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَصْبَهَانِيِّ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا حَازِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: «ثَلَاثَةٌ لَمْ يَبْلُغُوا الْحِنْثَ». [انظر: ١٢٥٠]

[102] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ تین بچے جو گناہ کی عمر، یعنی بلوغ تک نہ پہنچے ہوں۔''

فوائد و مسائل: ① دنیوی زندگی میں مردوں کے مسائل بے شمار ہیں اور انھیں اپنے مردانہ فرائض سے سبکدوشی کے لیے علم کی زیادہ ضرورت ہے، لیکن بہت سے امور عورتوں سے متعلق ہیں اور ان کے خاص مسائل بھی کم نہیں ہیں، مثلاً: طہارت ونظافت، حقوق خاوند، تربیت اولاد وغیرہ۔ اگرچہ عورتوں کو مردوں کی مجالس میں پردے کے ساتھ شمولیت کی اجازت ہے لیکن اس قسم کی حاضری میں تکلف ہوتا ہے اور عورتیں اپنے مخصوص مسائل دریافت کرنے میں حجاب محسوس کرتی ہیں، اس لیے امام بخاری

ؒ زنانہ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ امام کو عورتوں کی تعلیم کا مستقل طور پر انتظام کرنا چاہیے جس میں مردوں کا داخلہ ممنوع ہو جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ عورتوں کو مردوں کی مجلس میں آنے کا حکم دے سکتے تھے، اس میں وقت کی بھی بچت تھی، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کے شوق اور مطالبے پر انھیں مستقل طور پر خاص وقت عنایت فرمایا۔ ② انسان کے لیے دو وقت بڑی آزمائش کے ہوتے ہیں: * شدت سرور۔ * شدت غم۔ جب انسان پر غیر معمولی خوشی کا غلبہ ہوتا ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے بے نیاز خیال کرتا ہے، اسی طرح غمزدہ انسان بھی شدت غم میں شکوہ وشکایت اور آہ و بکا کو اپنا وظیفہ بنا لیتا ہے، بعض دفعہ تو شانِ ربوبیت کے متعلق نازیبا الفاظ تک کہہ جاتا ہے، خاص طور پر عورت کے لیے بچے کی وفات کا صدمہ تو بہت سنگین اور جانکاہ ثابت ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ اس غم سے نڈھال ہو کر کپڑے پھاڑتی اور رخسار پیٹتی ہے حتی کہ اول فول بکنا شروع کر دیتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا۔ ③ والدہ جب چھوٹے بچے سے طبعی محبت کے باوجود اس کی وفات پر صرف اللہ کے فیصلے پر راضی ہو کر صبر کرتی ہے، وہ بھی جب دل سے مصیبت کا تصادم ہو، یعنی صدمے کی پہلی چوٹ ہو تو گویا خود اس بچے کو اللہ کے حضور پیش کرتی ہے۔ اگرچہ بڑے بچے کی وفات کا صدمہ بھی ہوتا ہے لیکن اس پر حجاب نار کی فضیلت نہیں ہے کیونکہ بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس سے طبعی محبت کے ساتھ عقلی محبت بھی ہو جاتی ہے، نیز اس سے کچھ اغراض بھی وابستہ ہو جاتی ہیں، مثلاً: یہ بڑھاپے کا سہارا یا کم از کم بقائے نسل کا ذریعہ ثابت ہوگا، پھر ماں بچے کے لیے مشقتیں بہت اٹھاتی ہے، حمل و ولادت کی مشقت کا ذکر تو قرآن کریم نے بھی کیا ہے۔[1] ④ امام بخاری ؒ نے حضرت ابو ہریرہ ؓ کی روایت کا حوالہ دو فوائد کے پیش نظر دیا ہے۔ * پہلی روایت کی سند میں ایک راوی ابن اصبہانی تھا، اس روایت میں اس کے نام عبدالرحمٰن کی صراحت کر دی۔ * پہلی روایت میں مطلق بچوں کا ذکر تھا، اس روایت میں ان کے نابالغ ہونے کا ذکر فرمایا جو مدار حکم ہے۔ اگرچہ بڑے کی وفات پر صبر کرنا بھی باعث ثواب ہے لیکن حجاب نار صرف نابالغ بچے ہوں گے۔ اس کا حجاب نار ہونا اس لیے ہے کہ والدین کی محبت ان سے بے غرض ہوتی ہے اور ان کی وفات پر صبر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس حدیث سے متعلقہ دیگر مباحث کتاب الجنائز میں ذکر کیے جائیں گے۔

(٣٦) بَابُ مَنْ سَمِعَ شَيْئًا فَرَاجَعَ حَتَّى يَعْرِفَهُ

باب:36- ایک مسئلہ سننے کے بعد سمجھنے کے لیے دوبارہ پوچھنا

١٠٣ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا نَافِعُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ أَنَّ

[103] ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ سیدہ عائشہ ؓ جب کوئی ایسی بات سنتیں جسے

① الأحقاف 15:46

عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ كَانَتْ لَا تَسْمَعُ شَيْئًا لَا تَعْرِفُهُ إِلَّا رَاجَعَتْ فِيهِ حَتَّى تَعْرِفَهُ، وَأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ» قَالَتْ عَائِشَةُ: فَقُلْتُ: أَوَلَيْسَ يَقُولُ اللهُ تَعَالَى: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾؟ [الانشقاق:٨] قَالَتْ: فَقَالَ: «إِنَّمَا ذٰلِكِ الْعَرْضُ، وَلٰكِنْ مَّنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ يَهْلِكْ». [انظر: ٤٩٣٩، ٦٥٣٦، ٦٥٣٧]

سمجھ نہ پاتیں تو دوبارہ پوچھتیں تاکہ سمجھ لیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن جس سے محاسبہ ہوا، اسے عذاب دیا جائے گا۔'' تو اس پر حضرت عائشہ ؓ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: ''اس کا حساب آسانی سے لیا جائے گا۔'' آپ نے فرمایا: ''(یہ حساب نہیں ہے) بلکہ اس سے مراد اعمال کی پیشی ہے، لیکن جس سے حساب میں جانچ پڑتال کی گئی وہ یقیناً ہلاک ہو جائے گا۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ تعلیم دین کی افادیت ایک اور پہلو سے اجاگر فرماتے ہیں کہ اگر شاگرد اپنے استاد کی بات اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی تسلی کے لیے دوبارہ پوچھ لے، مقاصد کے پیش نظر ایسا کرنا قابل تحسین ہے۔ اس میں استاد کے متعلق سوء ادبی کا پہلو نہیں نکلتا اور نہ اس سے کوئی ناگواری ہونی چاہیے، نیز اس میں شاگرد کی تحقیر بھی نہیں، اس لیے دوبارہ پوچھنے سے حیا کرنا مناسب نہیں۔ سیدہ عائشہ ؓ کی عادت تھی کہ اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو اسے دوبارہ پوچھ لیا کرتی تھیں اور جب تک سمجھ نہیں لیتی تھیں برابر پوچھتی رہتیں۔ اس سے دوبارہ سوال کرنے کا مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کا استفسار صرف اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہے۔ تعنت کے طور پر (بال کی کھال اتارنے کے لیے) سوال کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں ہے۔ ② صدیقۂ کائنات کے سوال اور رسول اللہ ﷺ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حساب کی دو اقسام ہیں: ایک حساب مناقشہ جس کا دوسرا نام حساب عرفی ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ بندے کی کوتاہیوں کو پیش کرنے کے بعد اسے یہ بھی کہا جائے گا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ یہ باز پرس خود اتنا بڑا عذاب اور اس قدر سخت مرحلہ ہوگا کہ رب کائنات کے مناقشے کے بعد انسان کے دل و دماغ کی تمام قوتیں معطل ہو جائیں گی، یہی اس کی تباہی و بربادی اور حشر سامانی ہوگی، اس کے لیے عذاب نار ضروری نہیں ہے۔ حساب کی دوسری قسم حساب یسیر ہے جس کا دوسرا نام حساب لغوی ہے۔ اس میں بندے کے گناہوں کو صرف پیش کیا جائے گا اور ساتھ ہی اسے معافی کا پروانہ دے دیا جائے گا جس کی وجہ سے بندہ اپنے اہل خانہ کی طرف خوش و خرم لوٹے گا۔[1] ③ رسول اللہ ﷺ کے بیان کا عموم صدیقۂ کائنات ؓ کے سوال کا باعث ہوا۔ اسی طرح کا ایک اشکال حضرت حفصہ ؓ کو بھی پیش آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اہل بدر اور اہل حدیبیہ میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ حضرت حفصہ ؓ نے دریافت فرمایا کہ قرآن کریم سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہنم سے ہر ایک کو واسطہ پڑے گا؟ پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی ''تم میں سے کوئی نہیں جس کا اس (جہنم) پر سے گزر نہ ہو۔''[2] اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کا اگلا حصہ پڑھ کر سنا دیا: ''پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو ڈر گئے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل اس میں گرا رہنے دیں گے۔''[3] اس سے معلوم ہوا کہ رشد و ہدایت کے لیے عربی دانی یا صاحب قرآن سے بالا بالا قرآن فہمی کافی نہیں بلکہ یہ انداز سراسر ضلالت

1 الانشقاق 9:84. 2 مریم 71:19. 3 مسند أحمد: 362,258/6.

پر مبنی ہے۔[1] مزید برآں یہ کہ اگر دینی مسئلے میں کسی کو اشکال ہو تو سوال کے ذریعے سے اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

(٣٧) بَابٌ: لِيُبَلِّغِ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ

باب:37- حاضرین کو چاہیے کہ وہ غیر حاضر لوگوں کو علمی باتیں پہنچا دیں

قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ.

یہ بات حضرت ابن عباس ؓ نے نبی ﷺ سے بیان کی ہے۔

وضاحت: پہلے باب میں اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے مراجعت کا ذکر تھا، اب دوسروں کو سمجھانے کے لیے مراجعت کا بیان ہے۔ امام بخاری ؒ کا مقصد ہے کہ دعوت و تبلیغ علماء کی ذمے داری ہے۔ اس کے لیے علوم وفنون کی تکمیل ضروری نہیں۔ جس قدر دینی معلومات حاصل ہوں انھیں آگے پہنچا دیا جائے۔ حضرت ابن عباس ؓ کی مذکورہ معلق روایت کو امام بخاری ؒ نے آگے موصولاً بھی بیان کیا ہے۔[2]

١٠٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنِي اللَّيْثُ قَالَ: حَدَّثَنِي سَعِيدٌ عَنْ أَبِي شُرَيْحٍ أَنَّهُ قَالَ لِعَمْرِو بْنِ سَعِيدٍ - وَهُوَ يَبْعَثُ الْبُعُوثَ إِلَى مَكَّةَ -: اِئْذَنْ لِي أَيُّهَا الْأَمِيرُ! أُحَدِّثْكَ قَوْلًا قَامَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ الْغَدَ مِنْ يَوْمِ الْفَتْحِ سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ، وَوَعَاهُ قَلْبِي، وَأَبْصَرَتْهُ عَيْنَايَ، حِينَ تَكَلَّمَ بِهِ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ مَكَّةَ حَرَّمَهَا اللهُ، وَلَمْ يُحَرِّمْهَا النَّاسُ، فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَسْفِكَ بِهَا دَمًا، وَلَا يَعْضِدَ بِهَا شَجَرَةً، فَإِنْ أَحَدٌ تَرَخَّصَ لِقِتَالِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِيهَا فَقُولُوا: إِنَّ اللهَ قَدْ أَذِنَ لِرَسُولِهِ وَلَمْ يَأْذَنْ لَكُمْ، وَإِنَّمَا أَذِنَ لِي فِيهَا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ، ثُمَّ عَادَتْ حُرْمَتُهَا الْيَوْمَ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ، وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ»،

[104] حضرت ابوشریح ؓ سے روایت ہے، انھوں نے (گورنر مدینہ) عمرو بن سعید سے کہا جب کہ وہ مکے کی طرف فوج بھیج رہا تھا: امیر (گورنر) صاحب! مجھے اجازت دے کہ میں تجھے وہ حدیث سناؤں جو نبی ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے دن بیان فرمائی تھی۔ جسے میرے کانوں نے سنا، دل نے یاد رکھا اور میری دونوں آنکھوں نے آپ کو دیکھا جب آپ نے یہ حدیث بیان فرمائی۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: ''مکے (میں جنگ و جدال کرنے) کو اللہ نے حرام کیا ہے لوگوں نے اسے حرام نہیں کیا، لہٰذا اگر کوئی شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ مکے میں خون ریزی کرے، یا وہاں سے کوئی درخت کاٹے۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے قتال سے جواز پیدا کرے تو اس سے کہہ دینا کہ اللہ نے اپنے رسول کو تو اجازت دی تھی لیکن تمھیں نہیں دی

[1] فتح الباري:260/1. [2] صحيح البخاري، الحج، حديث:1739.

فَقِيلَ لِأَبِي شُرَيْحٍ: مَا قَالَ عَمْرٌو؟ قَالَ: أَنَا أَعْلَمُ مِنْكَ يَاأَبَا شُرَيْحٍ! إِنَّ مَكَّةَ لَا تُعِيذُ عَاصِيًا وَّلَا فَارًّا بِدَمٍ وَّلَا فَارًّا بِخَرْبَةٍ. [انظر: ١٨٣٢، ٤٢٩٥]

ہے۔ اور مجھے بھی دن میں کچھ وقت کے لیے اجازت تھی اور آج اس کی حرمت پھر ویسی ہی ہوگئی جیسے کل تھی۔ جو شخص یہاں حاضر ہے، اسے چاہیے کہ غائب کو یہ خبر پہنچا دے۔''

حضرت ابوشریح سے پوچھا گیا: عمرو بن سعید نے (حدیث سن کر) کیا کہا؟ (انھوں نے فرمایا:) عمرو نے کہا: ابوشریح! میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ بلاشبہ مکہ کسی گناہ گار کو پناہ نہیں دیتا، نہ کسی کو قتل کر کے فرار ہونے والے کو اور نہ چوری کر کے بھاگنے والے کو۔

فوائد ومسائل: ① رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ''جو شخص یہاں حاضر ہے اسے چاہیے کہ غائب کو یہ خبر پہنچا دے'' ہمیں خبردار کرتا ہے کہ اگر علمی مجلس میں کوئی دین کی بات کسی کے کان میں پڑے اور وہ اسے محفوظ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا ہو تو اسے چاہیے کہ مجلس سے غیر حاضر کو وہ بات پہنچا دے تاکہ اس ذریعے سے عمل وکردار کی اصلاح ہوتی رہے۔ ② حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر نمائندگان بلاد کی مشاورت سے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کر لیا تھا، ان میں انتظامی صلاحیت اور امور خلافت کی قابلیت موجود تھی، پھر بلاد اسلامیہ کے گورنروں کے ذریعے سے باشندگان سے بیعت لی گئی لیکن حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے بیعت نہ کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کی دعوت پر مدینہ منورہ چھوڑ گئے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ مکرمہ پہنچ کر وہاں کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ یزید نے مدینے کے گورنر عمرو بن سعید کو لکھا کہ مکے میں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے قتال کے لیے لشکر کشی کی جائے۔ جب انھوں نے مدینے سے مکہ مکرمہ لشکر بھیجنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ نے فریضۂ تبلیغ ادا کیا جس کا حدیث میں ذکر ہے۔ ③ حضرت ابوشریح رضی اللہ عنہ کی حق وصداقت پر مبنی باتیں سن کر عمرو بن سعید نے جو جواب دیا وہ [كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيدَ بِهَا الْبَاطِلُ] ''بات صحیح مگر مقاصد برے'' کا آئینہ دار ہے، کیونکہ دو مسئلے ہیں: ایک ہے حرم مکہ پر فوج کشی اور دوسرا، حدود حرم میں مجرم کو سزا دینا۔ اس کا جواب اس لیے غلط تھا کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما ایک جلیل القدر اور صاحب منقبت صحابی ہیں، وہ نہ تو خون ناحق کرنے کے بعد مکہ میں روپوش ہوئے تھے اور نہ انھوں نے چوری ہی کا ارتکاب کر کے یہاں پناہ لی تھی، بہرحال گورنر مدینہ عمرو بن سعید کا یہ اقدام فوج کشی کسی طرح بھی درست نہ تھا۔[1]

١٠٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ مُّحَمَّدٍ، عَنِ ابْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ: ذُكِرَ النَّبِيُّ ﷺ قَالَ:

[105] حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کا ذکر کیا کہ آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ تمھاری جانیں، تمھارے اموال، محمد بن سیرین کہتے ہیں: آپ نے یہ بھی فرمایا: تمھاری عزتیں، تم

1 فتح الباري: 263/1.

«فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ - قَالَ مُحَمَّدٌ: وَأَحْسِبُهُ قَالَ: وَأَعْرَاضَكُمْ - عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، أَلَا لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ»، وَكَانَ مُحَمَّدٌ يَقُولُ: صَدَقَ رَسُولُ اللهِ ﷺ كَانَ ذٰلِكَ «أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟» مَرَّتَيْنِ. [راجع: ٦٧]

پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمھارے آج کے دن کی حرمت تمھارے اس مہینے میں ہے۔ خبردار! حاضر، غائب تک یہ بات پہنچا دے۔" محمد بن سیرین فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا، ایسا ہی ہوا۔ "آگاہ رہو! جواب دو، کیا میں نے فریضۂ تبلیغ ادا کر دیا؟" آپ نے ایسا دو بار فرمایا۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ نے یہ خطاب حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ بقیہ مباحث پر تفصیلی گفتگو کتاب الحج میں آئے گی۔ محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ آپ کا ارشاد صحیح ثابت ہوا۔ حاضر صحابۂ کرام ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کو غائبین تک پہنچانے میں پوری پوری کوشش کی اور اپنی تمام تر توانائیوں کو صرف کیا، پھر غائب محدثین و مجتہدین نے رسول اللہ ﷺ کے کلمات طیبات سے بے شمار مسائل کا استنباط کیا۔

(٣٨) بَابُ إِثْمِ مَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ

باب: 38- نبی ﷺ پر جھوٹ بولنے کا گناہ

١٠٦ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي مَنْصُورٌ قَالَ: سَمِعْتُ رِبْعِيَّ ابْنَ حِرَاشٍ يَقُولُ: سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَكْذِبُوا عَلَيَّ فَإِنَّهُ مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَلِجِ النَّارَ».

[106] حضرت علی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(دیکھو!) مجھ پر جھوٹ نہ باندھنا کیونکہ جو شخص مجھ پر جھوٹ باندھے گا، وہ یقیناً دوزخ میں جائے گا۔"

فوائد و مسائل: ① خطباء حضرات جوش خطابت میں بعض دفعہ کئی ایسی باتیں کہہ دیتے ہیں جو سراسر غلط ہوتی ہیں، پھر ان کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کر دیتے ہیں، یعنی ان غلط باتوں کو حدیث کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی چیز کے انتساب میں کامل یقین، پورے احتیاط اور تثبت کی ضرورت ہے۔ اگر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا تو نیکی برباد گناہ لازم کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں حضرت علی ؓ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے والے کے لیے جہنم ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے کے مقابلے میں آگ میں داخل ہونا گوارا کر لیا جائے لیکن آپ پر جھوٹ نہ بولا جائے۔ واللہ أعلم۔ ② اس وعید میں ہر طرح کا جھوٹ آ جاتا ہے۔ جو لوگ ترغیب و ترہیب کے باب میں بے اصل روایات بیان کرتے ہیں، وہ بھی اس وعید کی زد میں آتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اس باب میں توسع کے قائل ہیں کہ اگر کوئی شخص دین کو فروغ دینے اور فائدہ پہنچانے کی

غرض سے جھوٹی روایت بیان کرتا ہے تو اس کے لیے صرف اجازت ہی نہیں بلکہ یہ ایک مستحسن عمل ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں كَذَبَ عَلَيَّ ہے، كَذَبَ کے بعد عَلٰی کا صلہ نقصان کے لیے آتا ہے، اگر نقصان کے بجائے فائدہ پہنچانا مقصود ہو تو چنداں حرج کی بات نہیں۔ لیکن یہ عربی زبان سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ کیا انھیں علم نہیں ہے کہ دینی معاملات میں جھوٹ دراصل کذب علی اللہ ہی کی ایک شکل ہے اور اللہ پر جھوٹ بولنا مطلقاً حرام ہے، خواہ وہ ترغیب وترہیب سے متعلق ہو یا اصل احکام دین کے بارے میں۔ یہ حضرات ایک روایت کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''جس شخص نے گمراہ کرنے کے لیے جھوٹ بولا۔'' اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر جھوٹ بولنے کا مقصد گمراہی پھیلانا ہے تو اس کے لیے وعید ہے لیکن اگر مقصد گمراہی پھیلانا نہیں تو وعید کا مصداق نہیں ہے۔ یہ استدلال کئی وجوہ سے درست نہیں: * محدثین کرام نے اس حدیث بزار کے موصول اور مرسل ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ دارقطنی اور امام حاکم نے اس کے مرسل ہونے ہی کو ترجیح دی ہے اور مرسل روایت قابل حجت نہیں ہے۔ * لِيُضِلَّ کا لام علت کے لیے نہیں بلکہ عاقبت کے لیے ہے جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ ''اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا تاکہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے۔''[1] * اس آیت میں لِيُضِلَّ کا لام بھی انجام کار پر تنبیہ کے لیے لایا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ پر افترا کا نتیجہ گمراہی پھیلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں، لہٰذا جس طرح اللہ پر جھوٹ باندھنا حرام ہے، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ پر افترا بھی ناجائز ہے۔[2]

١٠٧ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ جَامِعِ بْنِ شَدَّادٍ، عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ: إِنِّي لَا أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ كَمَا يُحَدِّثُ فُلَانٌ وَّفُلَانٌ، قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أُفَارِقْهُ وَلٰكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: «مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ».

[107] حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد زبیر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: (والد محترم!) میں آپ کو رسول اللہ ﷺ سے احادیث بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھتا ہوں جس طرح فلاں فلاں بیان کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: میں کبھی رسول اللہ ﷺ سے الگ نہیں ہوا، لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو کوئی مجھ پر جھوٹ باندھے گا، وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔''

فوائد ومسائل: ① حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے جواب کہ میں رسول اللہ ﷺ سے الگ نہیں ہوا، کا مطلب یہ نہیں کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے بالکل الگ نہیں ہوئے، الگ تو یقیناً ہوئے ہیں جیسا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے، پھر رسول اللہ ﷺ نے جب مدینے کی طرف ہجرت فرمائی، اس وقت بھی آپ ساتھ نہیں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اکثر اوقات میں آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ جب صحبت طویل ہے تو سماع بھی زیادہ ہے اور زیادہ سماع کا تقاضا ہے کہ میں کثرت سے آپ کی احادیث بیان

[1] الأنعام 144:6. [2] فتح الباري 264/1.

کروں، لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں غلطی سے کوئی ایسی بات آپ کی طرف منسوب نہ کر بیٹھوں جو آپ کی فرمودہ نہ ہو۔[1] ② ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بایں الفاظ جواب دیا: اے میرے لخت جگر! تجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی میرے ساتھ قرابت داری بھی زیادہ ہے: رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی میری والدہ ہیں، آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا میری پھوپھی ہیں، تیری والدہ (حضرت اسماء رضی اللہ عنہا) میری بیوی ہے۔ اور ان (اسماء رضی اللہ عنہا) کی بہن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں، لیکن کثرت روایات سے مذکورہ احتیاط ہی روک رہی ہے......[2] ③ اس روایت میں "دیدہ دانستہ" کی شرط بھی نہیں لیکن بے احتیاطی بہرحال درست نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بلا ارادہ بھی غلط نسبت ہوگئی تو خطرے سے خالی نہیں۔ ایسے حالات میں احتیاط سے کام نہ لینا ایک اختیاری چیز سے غیر اختیاری چیز کو پیدا ہونے کی گنجائش دینا ہے۔ اس بنا پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نہ کثرت سے بیان کرتا ہوں اور نہ میں خطرہ مول لیتا ہوں۔

١٠٨ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ قَالَ: قَالَ أَنَسٌ: إِنَّهُ لَيَمْنَعُنِي أَنْ أُحَدِّثَكُمْ حَدِيثًا كَثِيرًا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِبًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ».

[108] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: مجھے زیادہ حدیثیں بیان کرنے سے یہ بات روکتی ہے کہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔"

فوائد و مسائل: ① حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال تک سفر و حضر، عسر و یسر، خلوت و جلوت میں آپ کے ساتھ رہے۔ کثرت صحبت کے نتیجے میں جس قدر روایات ان سے منقول ہونی چاہیے تھیں، اس قدر نہیں ہیں۔ حدیث بالا میں انھوں نے اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ ان جیسے محتاط صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل یہ نہ تھا کہ روایات بیان ہی نہ کرتے تھے بلکہ کثرت روایات سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ اس میں بے احتیاطی کا اندیشہ تھا۔ چونکہ کتمان علم پر سخت وعید ہے کہ ایسے لوگوں کو قیامت کے دن آگ کی لگام ڈالی جائے گی، اس بنا پر جہاں ضرورت ہوتی وہاں بیان فرما دیتے۔ اس احتیاط کے باوجود حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بکثرت روایات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔ وہ شاید اس وجہ سے ہے کہ آپ نے طویل عمر پائی اور اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ سے پہلے رخصت ہو چکے تھے۔ لوگ مسائل پوچھنے کے لیے آپ کی طرف رجوع کرتے تھے، اس لیے روایات کی کثرت ہوئی اگرچہ یہ کثرت بھی ان کے مجموعہ معلومات کے مقابلے میں اقل قلیل ہے۔[3] ② حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے بیان حدیث میں غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو میں بکثرت احادیث بیان کروں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جس کے متعلق آپ کو یقین ہوتا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اگر کہیں شک پڑ جاتا تو اسے بیان کرنے سے اجتناب کرتے۔ بعض حضرات نے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ روایت باللفظ کا بہت خیال رکھتے تھے، حالانکہ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بالمعنی ثابت ہے جیسا کہ قراءت فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے، تکثیر طعام اور وضو کے وقت پانی کے زیادہ ہونے کے متعلق روایات ہیں۔[4]

---

① فتح الباري:265/1. ② فتح الباري:265/1. ③ فتح الباري:266/1. ④ فتح الباري:266/1.

١٠٩ - حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ».

[109] حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص میری طرف وہ بات منسوب کرے جو میں نے نہیں کہی، وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جو باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں، خواہ وہ ترغیب وترہیب سے متعلق ہوں یا احکام ومسائل سے، ان کا بیان کرنا جہنم میں جانے کا پیش خیمہ ہے، لہٰذا روایات قولی ہوں یا فعلی، قائل کو پورے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ خاص طور پر موضوع اور خودساختہ روایات کا بیان کرنا کسی صورت میں جائز نہیں، صرف بتانے کے لیے نقل کی جاسکتی ہیں کہ یہ بے اصل اور بے بنیاد ہیں۔ اسی طرح ضعیف روایات کو بھی ایسے انداز میں پیش کرنا کہ سننے والے انھیں صحیح سمجھ بیٹھیں اوران پر عمل کرنا ضروری قرار دے لیں، یہ انداز بھی درست نہیں ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ حدیث پہلی ثلاثی حدیث ہے۔ ثلاثی حدیث وہ ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ اور امام یا محدث کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ صحیح بخاری کی جن روایات میں رسول اللہ ﷺ اور امام بخاری تک تین راوی ہیں انھیں ثلاثیات بخاری کہا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں ان کی تعداد تئیس ہے۔ یہ فضیلت امام بخاری کے علاوہ اور کسی ہم عصر کو نصیب نہیں ہوئی۔ بعض لوگ ثنائیات ابی حنیفہ کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ فن حدیث میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی کوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم.

١١٠ - حَدَّثَنَا مُوسَى قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي حَصِينٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «تَسَمَّوْا بِاسْمِي وَلَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي، وَمَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ». [انظر: ٣٥٣٩، ٦١٨٨، ٦١٩٧، ٦٩٩٣]

[110] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''میرے نام (محمد اور احمد) پر نام رکھو مگر میری کنیت (ابوالقاسم) پر کنیت نہ رکھو۔ اور یقین کرو جس نے مجھے خواب میں دیکھا، اس نے یقیناً مجھ ہی کو دیکھا ہے، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا۔ اور جو دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنا ہر صورت میں حرام ہے، خواہ اس کا تعلق بیداری سے ہو یا نیند سے۔ نیند میں جھوٹ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص نہ دیکھنے کے باوجود کہے کہ میں نے آپ کو خواب میں دیکھا ہے۔ اول تو جھوٹ کسی معاملے میں جائز ہی نہیں، اگراس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے ہو تو اس کی سنگینیٔ حرمت اور بڑھ جاتی ہے۔ احادیث میں ہے کہ جھوٹے خواب بیان کرنے والے کے سامنے قیامت کے دن جَو ڈالے جائیں گے اوراس سے کہا جائے گا کہ ان میں

لگاؤ۔[1] أعاذنا الله منه. خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کی سعادت ایسی صورت میں بابرکت ہو سکتی ہے جبکہ خواب میں دیکھا ہوا حلیہ کتب حدیث میں موجود آپ کے حلیہ مُبارکہ کے مطابق ہو۔ آپ کے حلیہ مُبارکہ کے متعلق مستند کتاب: الرسول كأنك تراه بہت مفید ہے، جس کا اردو ترجمہ راقم کے قلم سے ''آئینۂ جمال نبوت'' کے نام سے دارالسلام نے شائع کیا ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث کے بیان کرنے میں ایک خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے: پہلی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ بولنے کی سنگینی کو بیان کیا گیا ہے اور یہ امام بخاری کے قائم کردہ عنوان کے عین مطابق ہے۔ دوسری حدیث حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حدیث کو نقل کرنے میں کس قدر احتیاط کرتے تھے۔ تیسری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس میں احتیاط کی تشریح کی گئی ہے کہ صحابۂ کرام کثرت سے بیان کرنے میں احتیاط کرتے تھے، بالکل بیان نہ کرنا ان کا مقصود نہ تھا۔ آخری حدیث جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں اشارہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنا ہر صورت میں حرام ہے، خواہ اس کا تعلق بیداری سے ہو یا نیند سے۔[2]

(٣٩) بَابُ كِتَابَةِ الْعِلْمِ

باب:39-علمی باتیں تحریر کرنا

وضاحت: کتابت چونکہ علم کی حفاظت کا سب سے قوی، تبلیغ کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش اور اشاعت علم کا سب سے آسان طریقہ ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ اس طریق عمل کو احادیث کی روشنی میں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

١١١ - حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا وَكِيعٌ عَنْ سُفْيَانَ، عَنْ مُطَرِّفٍ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: قُلْتُ لِعَلِيٍّ: هَلْ عِنْدَكُمْ كِتَابٌ؟ قَالَ: لَا، إِلَّا كِتَابُ اللهِ، أَوْ فَهْمٌ أُعْطِيَهُ رَجُلٌ مُسْلِمٌ، أَوْ مَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ، قَالَ: قُلْتُ: وَمَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ؟ قَالَ: اَلْعَقْلُ، وَفَكَاكُ الْأَسِيرِ، وَلَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ. [انظر: ١٨٧٠، ٣٠٤٧، ٣١٧٢، ٣١٧٩، ٦٧٥٥، ٦٩٠٣، ٦٩١٥، ٧٣٠٠]

[111] حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: آیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے؟ انھوں نے فرمایا: ''نہیں، ہاں ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور وہ فہم ہے جو ایک مسلمان مرد کو دی جاتی ہے یا جو کچھ اس صحیفے میں ہے موجود ہے۔ میں نے پوچھا: اس صحیفے میں کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: دیت کے احکام، قیدی کو چھڑانے کا بیان اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہ کیا جائے۔

فوائد و مسائل: ① کتابت حدیث کے متعلق سلف کی آراء مختلف ہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اجمال سے کام لیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مختلف فیہ مسائل میں امام بخاری کا طریق کار یہ ہے کہ وہ عنوان میں کوئی قطعی

① صحيح البخاري، التعبير، حديث:7042. ② فتح الباري:268/1.

فیصلہ نہیں کرتے، البتہ اس کے تحت احادیث و آثار پیش کر کے اپنا رجحان ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس مقام پر بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، اگرچہ بعد میں اجماع سے کتابت حدیث کا جواز بلکہ استحباب ثابت ہو چکا ہے بلکہ اندیشۂ نسیان کے پیش نظر اس کا وجوب بھی بعید نہیں۔[1] ③ کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا کتابت حدیث کے متعلق ایک حکم امتناعی بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ''میری کوئی بات نہ لکھا کرو اور جس نے قرآن کے علاوہ میری باتوں کو لکھا ہے، اسے چاہیے کہ وہ مٹا دے۔''[2] اس میں کتابت حدیث سے منع کیا گیا ہے جبکہ اس کے برعکس بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کتابت حدیث کی اجازت تھی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا عمل منقول ہے۔ اس تعارض کو دور کرنے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: * حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت موقوف ہے، اسے موقوف ماننے والوں میں امام بخاری سرفہرست ہیں، اس بنا پر تعارض کا قصہ ہی ختم ہے۔[3] * نہی کا معاملہ زمانۂ نزول قرآن کے ساتھ خاص ہے تاکہ قرآن و حدیث کا اختلاط نہ ہو۔ * نہی کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں چیزوں کو ایک ہی صحیفے میں نہ لکھا جائے۔ * ابتدا میں کتابت حدیث سے منع کیا گیا، اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کتابت کی اجازت دینے سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ * نہی اس شخص کے لیے تھی جو صرف کتابت پر اعتماد کرتا ہے، حفظ کی طرف توجہ نہیں دیتا۔[4] * ممانعت اس لیے تھی تاکہ کتاب اللہ کے مقابلے میں کوئی دوسری کتاب نہ تیار کر لی جائے۔ * صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت فن کتابت سے نا آشنا تھی، اس لیے انھیں لکھنے سے منع کر دیا اور جو صحیح لکھ سکتے تھے انھیں اجازت دے دی۔[5]

منکرین حدیث بھی اس ممانعت کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کو احادیث پر اعتماد ہی نہیں۔ یہ عجیب منطق ہے کہ اگر حدیث کتب حدیث میں ہو تو عجمی سازش کا ایک حصہ، اگر اسے بطور دلیل پیش کرنا ہو تو قابل حجت۔ اگر احادیث کی عدم کتابت کے لیے بطور ثبوت اسے پیش کیا جا سکتا ہے تو کتابت حدیث کے ثبوت کے لیے ان روایات سے استشہاد کیوں نہیں کیا جا سکتا جو سند کے لحاظ سے کہیں بالاتر ہیں۔ ④ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی سے روافض کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان کی جانب سے یہ بات عام کی جا رہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ خصوصی علوم عطا فرمائے ہیں جن کا دوسرے لوگوں کو علم نہیں ہے۔ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر حضرت ابوجحیفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کے علاوہ کوئی اور نوشتہ بھی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میرے پاس کتاب اللہ ہے، فہم ہے اور یہ صحیفہ ہے اور یہ تینوں چیزیں میرے ساتھ خاص نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ''صحیفہ'' سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کتابت حدیث دور نبوی میں شروع ہو چکی تھی، یہ بعد کی پیداوار نہیں۔ ⑤ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فہم کو الگ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے ظاہری معانی کے علاوہ کلام کے سیاق و سباق سے جو مسائل و احکام معلوم ہوتے ہیں، ان کا ذکر کرنا چاہتے تھے، یعنی ایک تو وہ مسائل ہیں جو ظاہر النص سے ہر ایک کو سمجھ میں آ جاتے ہیں، دوسرے وہ جو ظاہر النص سے نہیں بلکہ وہ فحوائے کلام، قیاسات اور طرق استنباط سے

---

1 فتح الباري:269/1. 2 صحيح مسلم، الزهد، حديث:7510(3004). 3 فتح الباري:275/1. 4 فتح الباري:275/1.
5 مشكل الحديث لابن قتيبة.

معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر یہ روایت بایں الفاظ موجود ہے: ہمارے پاس وہی ہے جو قرآن میں ہے، ہاں فہم بھی ہے جو اس کتاب پر غور وفکر کرنے کے لیے آدمی کو دی جاتی ہے۔[1] یعنی اگر اللہ تعالیٰ آدمی کو قرآن مجید میں غور وفکر کرنے کا سلیقہ عطا کر دے تو وہ مسائل کے استخراج پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ دوسروں سے فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے۔ طارق بن شہاب کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ فرماتے دیکھا: واللہ! ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں جسے ہم تمھیں پڑھ کر سنائیں مگر اللہ کی کتاب اور یہ صحیفہ۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ استخراج کردہ مسائل کا مجموعہ تحریری شکل میں آپ کے پاس موجود تھا جیسا کہ صحیح بخاری کے بعض شراح نے لکھا ہے۔[3] ⑥ صحیفے کے مندرجات اور اس کے متعلقہ مسائل واحکام کتاب الدیات میں ذکر کیے جائیں گے۔

١١٢ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ خُزَاعَةَ قَتَلُوا رَجُلًا مِّنْ بَنِي لَيْثٍ عَامَ فَتْحِ مَكَّةَ بِقَتِيلٍ مِّنْهُمْ قَتَلُوهُ، فَأُخْبِرَ بِذٰلِكَ النَّبِيُّ ﷺ فَرَكِبَ رَاحِلَتَهُ فَخَطَبَ فَقَالَ: «إِنَّ اللهَ حَبَسَ عَنْ مَّكَّةَ الْقَتْلَ - أَوِ الْفِيلَ، قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ كَذَا - قَالَ أَبُو نُعَيْمٍ: وَسُلِّطَ عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَالْمُؤْمِنُونَ، أَلَا وَإِنَّهَا لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي، وَلَا تَحِلُّ لِأَحَدٍ بَعْدِي، أَلَا وَإِنَّهَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ، أَلَا وَإِنَّهَا سَاعَتِي هٰذِهِ حَرَامٌ، لَّا يُخْتَلٰى شَوْكُهَا، وَلَا يُعْضَدُ شَجَرُهَا، وَلَا تُلْتَقَطُ سَاقِطَتُهَا إِلَّا لِمُنْشِدٍ، فَمَنْ قُتِلَ فَهُوَ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ: إِمَّا أَنْ يُّعْقَلَ وَإِمَّا أَنْ يُّقَادَ أَهْلُ الْقَتِيلِ»، فَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْيَمَنِ فَقَالَ: أُكْتُبْ لِي يَا رَسُولَ اللهِ! فَقَالَ: «أُكْتُبُوا لِأَبِي فُلَانٍ»، فَقَالَ رَجُلٌ مِّنْ قُرَيْشٍ: إِلَّا الْإِذْخِرَ إِلَّا الْإِذْخِرَ يَا رَسُولَ اللهِ! فَإِنَّا نَجْعَلُهُ فِي بُيُوتِنَا وَقُبُورِنَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ:

[112] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے سال خزاعہ نے بنولیث کے ایک شخص کو اپنے اس مقتول کے بدلے میں قتل کر دیا جسے بنولیث نے قتل کیا تھا۔ نبی ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی، آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور ایک خطبہ دیا: ''اللہ تعالیٰ نے مکے سے قتل یا فیل (ہاتھی) کو روک دیا۔ امام بخاری نے کہا: ابونعیم نے ایسے ہی (شک کے ساتھ) کہا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو ان (کافروں) پر غالب کر دیا گیا۔ خبردار! مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا۔ آگاہ رہو! یہ میرے لیے بھی دن میں ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا تھا۔ خبردار! وہ اس وقت بھی حرام ہے۔ وہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں، نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں، اعلان کرنے والے کے علاوہ وہاں کی گری ہوئی چیز کوئی نہ اٹھائے۔ اور جس کا کوئی عزیز مارا جائے، اسے دو میں سے ایک کا اختیار ہے: دیت قبول کر لے یا قصاص دلوایا جائے۔'' اتنے میں ایک یمنی شخص آیا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (یہ مسائل) مجھے لکھ دیجیے۔ آپ نے فرمایا: ''اچھا ابوفلاں کو لکھ دو۔'' قریش کے ایک شخص نے

① صحيح البخاري، الديات، حديث:6903. ② مسند أحمد:100/1. ③ فتح الباري:270/1.

«إِلَّا الْإِذْخِرَ». [انظر: ٢٤٣٤، ٦٨٨٠]

عرض کیا: یا رسول اللہ! اِذخِر اِذخِر، (خوشبودار گھاس، یعنی اس کے کاٹنے کی اجازت دیجیے)، اس لیے کہ ہم اسے اپنے گھروں اور قبروں میں استعمال کرتے ہیں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہاں مگر اذخر۔'' یعنی وہ کاٹ سکتے ہو۔

فوائد و مسائل: ① دور جاہلیت میں عرب کے دو مشہور قبائل خزاعہ اور بنولیث میں عداوت تھی جس کے نتیجے میں بنولیث کے ایک آدمی نے خزاعہ کے ایک احمر نامی شخص کو قتل کر دیا تھا، پھر فتح مکہ کے وقت اعلان امن کے بعد خزاعہ کے ایک خراش بن امیہ نامی آدمی نے بنولیث کے جندب بن اقرع نامی شخص کو موقع پا کر قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت کی گئی کہ اعلان امن کے بعد خزاعیوں کی طرف سے یہ حرکت ہوئی ہے جس سے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، چنانچہ آپ فوراً تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ ② اس روایت میں امام بخاری ؒ فرماتے ہیں کہ میرے استاد ابونعیم نے القتل یا الفیل کو تردد کے ساتھ پیش کیا ہے جبکہ اس روایت کے دوسرے راوی عبیداللہ بن موسیٰ وغیرہ متعین طور پر الفیل کہتے ہیں جیسا کہ امام بخاری نے کتاب الدیات (حدیث 6880) میں اس کی وضاحت کی ہے۔ متعین طور پر بیان کرنے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ سے اصحاب فیل کو روکا ہے، یعنی جب شاہ حبشہ نے ہاتھیوں سے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے سے ان کے دماغ درست کر دیے تھے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب مکہ بیت الاصنام تھا۔ اب جبکہ وہ دارالسلام بن چکا ہے تو اس میں قتل و غارت اور امن شکنی کو کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔[1] ③ یمنی قبیلہ بنوکلب کے شخص نے کیا لکھنے کی درخواست کی؟ اس کی یہاں وضاحت نہیں جس سے اشکال پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسری روایت کے آخر میں وضاحت ہے کہ آپ نے اسے خطبہ لکھ کر دینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اس حدیث کے راوی ولید بن مسلم نے اپنے استاد الاوزاعی سے دریافت کیا: رسول اللہ ﷺ سے کیا چیز لکھنے کی درخواست کی گئی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا: پندو نصائح پر مبنی خطبہ لکھنے کی درخواست کی گئی تھی۔[2] امام بخاری ؒ کے قائم کردہ عنوان سے حدیث کا یہی حصہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کتابت حدیث کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں آپ کی اجازت سے شروع ہو چکا تھا۔[3] اس کا مطلب یہ ہے کہ تدوین احادیث کی بنیاد خود زمانۂ نبوی سے رکھی جا چکی تھی جسے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے زمانے میں نہایت اہتمام سے ترقی دی گئی۔ اب جو لوگ اسے عجمی سازش قرار دیتے ہیں اور اس میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں وہ دشمن اسلام ہیں، ان کی باتیں قابل التفات نہیں ہیں۔ ④ جب مکے کی سرزمین باعث حرمت ہے تو اس کا درخت کاٹنا، کانٹا توڑنا جائز نہیں ہے، البتہ وہ کانٹے جو گزرنے والوں کے لیے باعث تکلیف ہوں کاٹے جا سکتے ہیں کیونکہ حدود حرم میں اذیت ناک چیزوں کو ختم کرنا ضروری ہے جیسا کہ پانچ موذی جانوروں کو مارنے کی وضاحت ہے۔ جب کانٹوں کے متعلق اتنی پابندی ہے تو گھاس کاٹنے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی، اسی بنا پر حضرت عباس ؓ نے درخواست پیش کی کہ اذخر (خوشبودار گھاس) کاٹنے کی اجازت دی جائے کیونکہ ہم اسے

1 فتح الباري:272/1. 2 صحيح البخاري، اللقطة، حديث:2434. 3 فتح الباري:273/1.

اپنے گھروں میں بچھاتے اور چھتوں پر ڈالتے ہیں، نیز قبروں میں لحد اور ان کے فرجات بند کرنے میں کام آتی ہے، یعنی زندوں اور مردوں دونوں ہی کو اس کی ضرورت رہتی ہے، چنانچہ آپ نے اسے کاٹنے کی اجازت دے دی۔

نوٹ: حرم اور غیر حرم میں گری پڑی چیز اٹھانے کے مسائل اور قتل ناحق کے احکام کتاب اللقطہ اور کتاب الدیات میں بیان کیے جائیں گے۔

١١٣ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرٌو قَالَ: أَخْبَرَنِي وَهْبُ ابْنُ مُنَبِّهٍ عَنْ أَخِيهِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: مَا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ أَحَدٌ أَكْثَرَ حَدِيثًا عَنْهُ مِنِّي إِلَّا مَا كَانَ مِنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، فَإِنَّهُ كَانَ يَكْتُبُ وَلَا أَكْتُبُ. تَابَعَهُ مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ.

[113] حضرت ہمام بن منبہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے علاوہ اور کوئی مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا نہیں، کیونکہ وہ لکھا کرتے تھے میں لکھتا نہیں تھا۔ دوسری سند سے حضرت معمر نے وہب بن منبہ کی متابعت کی ہے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بواسطۂ ہمام بن منبہ روایت کرتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ نبوی میں کتابت احادیث کا عمل جاری ہو چکا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی درخواست پر انھیں احادیث لکھنے کی اجازت دی تھی، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم آپ کی بہت سی احادیث سنتے ہیں لیکن یاد نہیں کر پاتے، کیا ہم انھیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، ضرور لکھ لیا کرو۔''[1] ایک روایت میں ہے، انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ کی خوشی اور غصہ دونوں حالتوں کی باتیں لکھ لیا کروں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں۔ میں دونوں حالتوں میں حق اور درست بات ہی کہتا ہوں۔''[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو آپ کی ہر بات لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے ان سے کہا: آپ جو کچھ سنتے ہیں لکھ لیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ ایک بشر ہیں، آپ کبھی غصے میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں، حضرت عبداللہ بن عمرو نے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری اس زبان سے حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی، لہٰذا تم لکھتے رہو۔''[3] ② حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر جو مجموعۂ احادیث تیار کیا تھا، اس کا نام [الصحيفة الصادقة] تجویز کیا تھا۔ اس کی تائید درج ذیل واقعے سے بھی ہوتی ہے: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کچھ لوگوں نے سوال کیا کہ کون سا شہر

① مسند أحمد:215/2 ② مسند أحمد:207/2 ③ مسند أحمد:162/2.

پہلے فتح ہوگا: قسطنطنیہ یا رومیہ؟ اس پر انھوں نے ایک پرانا صندوق منگوایا، اس سے ایک کتاب نکال کر اس پر ایک نظر ڈالی، پھر فرمایا: ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے اور جو کچھ آپ فرما رہے تھے، ہم لکھتے جا رہے تھے۔ اس اثنا میں آپ سے سوال ہوا کہ کون سا شہر پہلے فتح ہوگا: قسطنطنیہ یا رومیہ؟ اس پر آپ نے فرمایا: ''ہرقل کا شہر، یعنی قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا۔''[1] یہ نسخہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے خاندان کے پاس عرصے تک محفوظ رہا، چنانچہ ان کے پوتے حضرت عمرو بن شعیب اس صحیفے کو ہاتھ میں رکھ کر روایت کرتے اور درس دیتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس نسخے کو اپنی مسند میں مدغم فرما کر ہمارے لیے محفوظ فرما دیا جسے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تفصیل سے منکرین حدیث کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ حدیث کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد ہوئی ہے، اس بنا پر قابل وثوق نہیں۔ یہ ان حضرات کی خام خیالی ہے۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ احادیث لکھا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے حافظے میں انھیں محفوظ کر لیتے تھے، جبکہ حسن بن عمرو بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث ذکر کی تو انھوں نے کچھ تردد کا اظہار کیا، چنانچہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھر لے گئے اور ہمیں بہت سی کتابیں دکھائیں جو انھوں نے احادیث سے مرتب کی تھیں، کتابیں دیکھنے کے بعد وہ حدیث مل گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ احادیث لکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کتابت حدیث کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد شروع کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے کسی دوسرے شخص سے مرتب کرائی ہوں۔[2] ④ اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے ان کے ایک ہونہار شاگرد حضرت ہمام بن منبہ ہیں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے وطن مالوف یمن ہی کے باشندے تھے۔ جب وہ حصول تعلیم کے لیے مدینہ منورہ آئے تو اپنے ممتاز ہم وطن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس نوجوان ہم وطن کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ڈیڑھ سو احادیث کا انتخاب کیا جو تربیت اخلاق سے متعلق تھیں۔ ان احادیث کو مرتب کر کے اپنے شاگرد حضرت ہمام کو لکھوا دیا اور اس کا نام الصحیفة الصحیحة تجویز کیا۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اگر کسی صحابی کی حدیث دانی پر رشک تھا تو وہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص تھے جنھوں نے الصحیفة الصادقة کے نام سے احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ ممکن ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ان کی دیکھا دیکھی اپنی تالیف کا نام الصحیفة الصحیحة رکھا ہو۔ بہرحال حضرت ہمام بن منبہ نے اپنے استاد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے احادیث کا جو مجموعہ حاصل کیا تھا، اسے نہ تو ضائع کیا اور نہ اپنی ذات تک محدود رکھا بلکہ اپنی پیرانہ سالی تک اس کی روایت و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ خوش قسمتی سے انھیں ایک صاحب ذوق شاگرد معمر بن راشد یمنی مل گئے جنھوں نے اس رسالے کو اپنے شاگردوں تک پہنچایا، پھر انھیں بھی ایک شاگرد حضرت عبدالرزاق بن ہمام حمیری مل گئے جنھوں نے المصنف نامی ایک ضخیم کتاب مرتب فرمائی۔ انھوں نے اس کی روایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے لیے دو شاگرد صدقۂ جاریہ ثابت ہوئے: ایک امام احمد بن حنبل اور دوسرے ابوالحسن احمد بن یوسف السلمی۔ ان دونوں حضرات نے صحیفۂ ہمام کی بڑی خدمت انجام دی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی عظیم کتاب ''المسند'' میں اس صحیفے کو شامل کر لیا۔ جب تک مسند امام احمد بن حنبل دنیا میں باقی ہے یہ صحیفہ بھی باقی رہے گا۔ یہ صحیفہ دستیاب نہ تھا، بالآخر دستیاب ہو گیا جس پر ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے بڑی عرق ریزی سے کام

---

[1] مسند أحمد: 176/2. [2] فتح الباري: 274/1.

کر کے اسے شائع کر دیا۔ اب جو لوگ محدثین کرام کو جعلساز قرار دیتے ہیں، ان کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ یہ لوگ اس صحیفے کے مندرجات پر غور وفکر کی زحمت گوارا کریں، شاید انھیں توبہ کی توفیق مل جائے۔ امام بخاری ؒ نے حدیث کے آخر میں ایک دوسری سند کا حوالہ دیا ہے۔ دراصل انھوں نے رائی سے پہاڑ کی طرف اشارہ دیا ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر تنگئ دامن کی وجہ سے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ⑥ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور تالیف کا بھی کتب حدیث سے سراغ ملتا ہے۔ ان کے شاگرد حضرت نہیک بن بشیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو کچھ سنتا تھا اسے تحریر کر لیتا تھا۔ جب میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور ان سے رخصت ہونا چاہا تو ان کے پاس ان کی کتاب لایا اور انھیں پڑھ کر سنائی اور ان سے عرض کیا: یہ وہی چیز ہے جو میں نے آپ سے سنی ہے۔ انھوں نے اس کی تصدیق فرمائی۔[1] ⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے احادیث کے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا، وہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی کتابت حدیث کی وجہ سے تھا کیونکہ استاد کے ارشادات لکھنے والے کے پاس عام طور پر ارشادات کا ذخیرہ زیادہ جمع ہو جاتا ہے لیکن جب محدثین کرام نے جانچ پڑتال کی تو معاملہ بالکل اس کے برعکس نکلا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے کہیں زیادہ ہیں۔ حضرت امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے تقریباً آٹھ سو تلامذہ نے کسب فیض کیا ہے اور یہ علمی برتری ان کے علاوہ کسی اور صحابی کو نہیں ملی۔ محدثین کرام نے اس کے مختلف اسباب ذکر فرمائے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

* حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرکز علم وعرفان مدینہ منورہ میں اپنے آپ کو تعلیم وتعلم کے لیے وقف کر رکھا تھا جبکہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ سے مصر چلے گئے تھے جسے علمی لحاظ سے مرکزیت حاصل نہ تھی، اس لیے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بہت کم روایات منقول ہیں۔

* حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا رجحان طبعی طور پر کثرت عبادت کی طرف رہا۔ آپ عبادت زیادہ کرتے تھے اور تعلیم و تدریس میں مشغولیت بہت کم ہوتی تھی جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا رجحان تعلیم وتدریس کی طرف تھا۔ حصول تعلیم کے ایام میں بھی آپ کا یہی حال تھا۔ اسی بنا پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات بہت زیادہ ہیں۔

* شام میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو اہل کتاب کی کتابوں کا ایک ذخیرہ مل گیا تھا، آپ انھی کے مطالعے میں مصروف رہتے اور ان سے روایات بھی بیان کرتے تھے۔ اسی بنا پر بہت سے تابعین نے ان سے روایات لینے کا سلسلہ بند کر دیا۔

* حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی دعا حاصل تھی جس کی برکت سے ان کے علوم اور ان کی روایات کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا اور یہ شرف حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو حاصل نہ ہو سکا۔[2] مختصر یہ کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حصول تعلیم اور اشاعت تعلیم پر زیادہ وقت لگایا اور اپنے قیام کے لیے مرکزی جگہ کا انتخاب کیا جبکہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا رجحان تعلیم وتدریس کی طرف زیادہ نہ تھا اور نہ انھوں نے مرکزی جگہ پر قیام ہی اختیار فرمایا۔ اس بنا پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات زیادہ ہیں جن کی تعداد 5 ہزار سے زیادہ ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایات تعداد میں

---

① سنن الدارمي، حديث:498، ورجاله ثقات. 2 فتح الباري:274/1.

اس درجے کو نہ پہنچ سکیں۔ (ان کی روایات 700 سے زائد نہیں۔) واللہ أعلم.

١١٤ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ يَحْيَى قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا اشْتَدَّ بِالنَّبِيِّ ﷺ وَجَعُهُ قَالَ: «اِئْتُونِي بِكِتَابٍ أَكْتُبْ لَكُمْ كِتَابًا لَّاتَضِلُّوا بَعْدَهُ»، قَالَ عُمَرُ: إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ غَلَبَهُ الْوَجَعُ وَعِنْدَنَا كِتَابُ اللهِ حَسْبُنَا، فَاخْتَلَفُوا وَكَثُرَ اللَّغَطُ، قَالَ: قُومُوا عَنِّي وَلَا يَنْبَغِي عِنْدِي التَّنَازُعُ، فَخَرَجَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَقُولُ: إِنَّ الرَّزِيئَةَ كُلَّ الرَّزِيئَةِ مَا حَالَ بَيْنَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَبَيْنَ كِتَابِهِ. [انظر: ٣٠٥٣، ٣١٦٨، ٤٤٣١، ٤٤٣٢، ٥٦٦٩، ٧٣٦٦]

[114] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب نبی ﷺ بہت بیمار ہو گئے تو آپ نے فرمایا: ''لکھنے کا سامان لاؤ تا کہ میں تمھارے لیے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی ﷺ پر بیماری کا غلبہ ہے اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، وہ ہمیں کافی ہے۔ لوگوں نے اختلاف شروع کر دیا اور شور و غل مچ گیا۔ تب آپ نے فرمایا: ''میرے پاس سے اٹھ جاؤ، میرے ہاں لڑائی جھگڑے کا کیا کام ہے؟''

پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نکلے، فرماتے تھے: تمام مصائب سے بڑی مصیبت وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی تحریر کے درمیان حائل ہو گئی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کتابت حدیث در دور نبوی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر کے بالکل آخری حصے میں کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ فرمایا لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلاف کی وجہ سے اسے عملی شکل دینے کی نوبت نہ آئی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقصد کے اثبات کے لیے چار حدیثیں پیش کی ہیں: پہلی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں کچھ احکام لکھے ہوئے تھے لیکن اس میں بدرجۂ امکان یہ احتمال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ نوشتہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تحریر فرمایا ہو یا انھیں نہی کی حدیث نہ پہنچی ہو، اس لیے دوسری حدیث پیش کی جس میں ابوشاہ یمنی کی درخواست پر آپ نے خطبہ لکھنے کی اجازت دی، مگر اس میں بھی خصوصیت کا یہ احتمال موجود ہے کہ شاید نابینا اور امی حضرات کے لیے یہ حکم ہو، اس لیے تیسری حدیث لائے جس میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا عمل کتابت منقول ہے جو آپ کی اجازت سے ہوا۔ اس میں خصوصیت نہیں بلکہ عموم ہے۔ لیکن ان تینوں احادیث میں کہیں بھی رسول اللہ ﷺ کے قصد کتابت کا ذکر نہیں، اس لیے یہ آخری روایت پیش کر کے آپ کے ارادۂ کتابت کا بھی ثبوت فراہم کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کا ارادہ حق اور درست ہی ہو سکتا ہے، اس لیے بہترین دلائل کے ساتھ کتابت حدیث کا عمل ثابت ہو گیا۔[1] ② یہ حدیث، حدیث قرطاس کے نام سے مشہور ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے چار دن قبل جمعرات کے دن یہ واقعہ ہوا۔ مسند امام احمد میں ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شانے کی ہڈی لائیں تا کہ میں اس پر امت کی گمراہی کے تدارک کے لیے کچھ لکھوا دوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد

1 فتح الباري:1/277.

آپ کے حکم سے گریز نہ تھا بلکہ آپ نے ایسا ازراہ محبت فرمایا، ورنہ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد چار روز تک زندہ رہے اور دوسرے احکام نافذ فرماتے رہے، جبکہ تحریر کے متعلق آپ نے سکوت اختیار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے آپ کو اتفاق تھا۔ بنیادی طور پر یہ حکم تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا، کم ازکم ان سے اس کوتاہی کی توقع نہ تھی۔ اگر یہ حکم ضروری ہوتا تو رسول اللہ ﷺ لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے اسے ترک نہ فرماتے۔ ③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ تحریر کی نوبت ہی نہ آئی اور باہمی اختلاف اس سے محرومی کا باعث ہوا۔ اس گفتگو سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس واقعہ کے وقت وہاں شریک مجلس تھے اور وہاں سے نکلتے ہوئے ان کلمات افسوس کا اظہار فرمایا، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ مختلف شواہد کی بنا پر اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب اپنے تلامذہ کے سامنے حدیث بیان فرماتے تو آخر میں یہ کلمات کہتے تھے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔[1] ④ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس تحریر کو مؤخر کرانے میں اکیلے نہ تھے بلکہ متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ تھے۔ ان حضرات کو اس بات کا یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات واجب التعمیل ہیں لیکن یہ حضرات اس بات سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ منافقین کو باتیں بنانے کے لیے ایک ثبوت مل جائے گا کہ خاکم بدہن، لیجیے شدت مرض کے ایام میں جبکہ ہوش وحواس میں اختلال کا امکان تھا، ایک تحریر لکھوالی۔ منافقین کی اس زبان بندی اور یاوہ گوئی کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا۔[2] ⑤ رسول اللہ ﷺ نے آخر میں فرمایا کہ میرے پاس سے اٹھ جاؤ، میرے ہاں لڑائی جھگڑے کا کیا کام ہے؟ آپ کا یہ خطاب تمام شرکائے مجلس کو تھا جس میں حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ اس حکم کی تعمیل میں سب لوگ گھروں کو چلے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مطابق تھی، بصورت دیگر وہی کاغذ وغیرہ لے آتے، پھر آپ تو رسول اللہ ﷺ کے داماد بھی تھے، گھر آنا جانا رہتا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر چلے جانے کے بعد یہ کام بخوبی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ان کی رائے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ واللہ أعلم.

نوٹ: دیگر مباحث کتاب المغازی کے آخر اور کتاب الاعتصام میں تفصیل سے ذکر کیے جائیں گے۔

(٤٠) بَابُ الْعِلْمِ وَالْعِظَةِ بِاللَّيْلِ

باب: 40- رات کو علم ونصیحت کی باتیں کرنا

١١٥ - حَدَّثَنَا صَدَقَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ هِنْدٍ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ. وَعَمْرٍو وَيَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ هِنْدٍ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: اِسْتَيْقَظَ النَّبِيُّ ﷺ

[115] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ ایک رات بیدار ہوئے تو فرمایا: "سبحان اللہ! آج رات کتنے فتنے نازل کیے گئے اور کتنے خزانے کھولے گئے۔ ان حجروں میں سونے والیوں کو جگاؤ، کیونکہ دنیا میں

① فتح الباري:277/1. ② فتح الباري:276/1.

ذَاتَ لَيْلَةٍ فَقَالَ: «سُبْحَانَ اللهِ! مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ، وَمَاذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ، أَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ، فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِي الْآخِرَةِ». [انظر: ١١٢٦، ٣٥٩٩، ٥٨٤٤، ٦٢١٨، ٧٠٦٩]

بہت سی کپڑے پہننے والیاں ایسی ہیں جو آخرت میں برہنہ ہوں گی۔"

فوائد و مسائل: ① قرآن کریم کی صراحت کے مطابق رات کو آرام کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ رات کے وقت تعلیم اور وعظ و نصیحت جائز نہیں، پھر دن بھر کا تھکا ماندہ انسان رات میں آرام کا خواہش مند ہوتا ہے، لہٰذا اس وقت کی تعلیم بے آرامی کے علاوہ وضع لیل کے بھی خلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اگر رات کے وقت وعظ و نصیحت اور تعلیم کی ضرورت ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ پیش کردہ حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات علمی باتیں سنانے کے لیے سوئے ہوؤں کو بھی بیدار کیا جا سکتا ہے۔ عنوان میں دو قسم کی ضروریات کا ذکر ہے: ایک تعلیم و تعلم جس کی دلیل [مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ] ہے۔ دوسری ضرورت وعظ و نصیحت ہے جس کی دلیل [أَيْقِظُوا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ] "حجروں میں رہنے والیوں کو جگاؤ" ہے۔ ② حدیث میں دو چیزیں بطور خاص ذکر کی گئی ہیں، یعنی آج رات کتنے فتنے اتارے گئے اور کتنے خزانوں کے منہ کھول دیے گئے۔ پہلی چیز کا تعلق انذار سے ہے اور دوسری چیز کا تعلق تبشیر سے ہے۔ قرآن کریم میں بھی اکثر و بیشتر انذار کے ساتھ تبشیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر تم فتنوں میں ثابت قدم رہے تو ہر قسم کی رحمتیں تمھارے لیے ہیں۔ اس صورت میں خزائن سے مراد، خزائن رحمت ہیں، یعنی فتنے بھی اتارے گئے اور رحمت کے دروازے بھی کھول دیے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خزائن سے مراد دنیوی خزائن ہوں۔ اس صورت میں ماقبل کی تفصیل ہوگی کیونکہ یہ دنیوی خزائن بھی فتنہ ہی ہیں، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دور ہی میں دنیا کی دو حکومتیں فارس اور روم مسلمانوں کے زیرنگین آگئیں، لیکن سیاق و سباق کا تقاضا یہ ہے کہ خزائن اور فتن دونوں الگ الگ ہوں کیونکہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھیں دنیا کے خزانے تو ملے لیکن وہ فتنوں سے بالکل محفوظ رہے۔[1] ③ قرآن کریم نے لباس کے دو فائدے بتائے ہیں: ایک ستر پوشی اور دوسرا باعث زینت۔ اگر کوئی لباس پہننے کے باوجود ننگا رہتا ہے تو قیامت کے دن اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اس کی دو صورتیں ہیں: * لباس اتنا باریک ہو کہ بدن کی جھلک نمایاں نظر آئے۔ * سلائی اتنی چست ہو کہ جسم کا ابھار واضح معلوم ہو۔ حدیث میں اس حقیقت سے خبردار کیا گیا ہے کہ بہت سی کپڑے پہننے والی ایسی ہیں جو آخرت میں برہنہ ہوں گی۔

(٤١) بَابُ السَّمَرِ فِي الْعِلْمِ

باب: 41- رات کو علمی باتیں کرنا

١١٦ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنِي

[116] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے،

1 فتح الباري: 278/1.

اللَّيْثُ قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ خَالِدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَالِمٍ، وَأَبِي بَكْرِ بْنِ سُلَيْمَانَ ابْنِ أَبِي حَثْمَةَ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ قَالَ: صَلّٰى بِنَا النَّبِيُّ ﷺ الْعِشَاءَ فِي آخِرِ حَيَاتِهِ، فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ فَقَالَ: «أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ، فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِّنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ». [انظر: ٥٦٤، ٦٠١]

انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے اپنی آخری عمر میں ہمیں نماز عشاء پڑھائی۔ سلام کے بعد جب کھڑے ہوئے تو فرمایا: ”تم اس رات کی اہمیت کو جانتے ہو، آج کی رات سے سو برس بعد کوئی شخص، جواب زمین پر موجود ہے، زندہ نہیں رہے گا۔“

فوائد ومسائل: ① سمر کے معنی چاند کی روشنی ہیں، پھر رات کی گفتگو کو سمر کہا جانے لگا۔ چونکہ اہل عرب دور جاہلیت میں چاند کے طلوع ہونے کے بعد کھلے میدان میں خاندانی مفاخر، قصہ گوئی، اشعار اور بے ہودہ باتوں میں وقت گزارتے تھے، جب چاند غروب ہو جاتا تو گھر واپس آتے۔ ان تمام خرافات کو بھی سمر کہتے ہیں۔ شریعت میں یہ ناجائز اور حرام ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر علمی مشاغل میں رات کا کچھ حصہ گزر جائے تو منع نہیں ہے۔ پہلے باب میں علمی مسائل کا ذکر تھا، اب علمی مناظروں اور چٹکلوں کا بیان ہے، نیز پہلے باب میں سونے کے بعد علمی گفتگو کا اثبات فرمایا تھا اور اس باب میں نماز عشاء کے بعد سونے سے قبل اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صلاۃ عشاء کے بعد سمر نہیں ہونا چاہیے، اگر کیا جائے تو علم اور خیر کا سمر ہو، نہ کہ جاہلیت والا سمر کیونکہ اس کی ممانعت ہے۔ ② رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ہمیں خبردار کیا ہے کہ سابقہ امتوں کے مقابلے میں تمھاری عمریں بہت کم ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہیں۔[1] عمروں کے اس فرق کے ساتھ ذمے داری میں بھی بڑا فرق ہے۔ ان کے لیے لمبی عمروں میں کام مختصر ہوتا تھا جبکہ اس امت کی مختصر عمر میں کام بہت طویل ہے۔ اس بنا پر ہمیں اپنی ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ تن مشغول ہونا چاہیے۔[2] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت خضر اب زندہ نہیں ہیں، کیونکہ اس حدیث کے مطابق سو سال بعد رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پانے والا کوئی بھی زندہ نہیں رہا۔ واللہ أعلم.

١١٧ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا الْحَكَمُ قَالَ: سَمِعْتُ سَعِيدَ بْنَ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: بِتُّ فِي بَيْتِ خَالَتِي مَيْمُونَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ عِنْدَهَا فِي لَيْلَتِهَا، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الْعِشَاءَ ثُمَّ جَاءَ إِلٰى مَنْزِلِهِ فَصَلّٰى أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ نَامَ، ثُمَّ

[117] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے ایک رات نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ، اپنی خالہ حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے ہاں بسر کی۔ اس رات نبی ﷺ بھی انھی کے پاس تھے۔ نبی ﷺ نے عشاء (مسجد میں) ادا کی، پھر اپنے گھر تشریف لائے اور چار رکعت پڑھ کر سو رہے۔ پھر بیدار ہوئے اور فرمایا: ”کیا بچہ سو

① جامع الترمذي، الزهد، حديث:2331. ② فتح الباري:280/1.

قَامَ، ثُمَّ قَالَ: «نَامَ الْغُلَيِّمُ»، أَوْ كَلِمَةً تُشْبِهُهَا، ثُمَّ قَامَ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ فَصَلَّى خَمْسَ رَكَعَاتٍ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ حَتَّى سَمِعْتُ غَطِيطَهُ - أَوْ خَطِيطَهُ - ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ. [انظر: ١٣٨، ١٨٣، ٦٩٧، ٦٩٨، ٦٩٩، ٧٢٦، ٧٢٨، ٨٥٩، ١١٩٨، ٤٥٦٩، ٤٥٧٠، ٤٥٧١، ٤٥٧٢، ٥٩١٩، ٦٢١٥، ٦٣١٦، ٧٤٥٢]

گیا ہے؟'' یا اس سے ملتی جلتی بات فرمائی۔ اور پھر نماز پڑھنے لگے، میں بھی آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپ نے مجھے اپنی دائیں جانب کر لیا اور پانچ رکعات پڑھیں۔ اس کے بعد دو رکعت (سنت فجر) ادا کیں۔ پھر سو گئے، یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے بھرنے کی آواز سنی۔ پھر (صبح کی) نماز کے لیے باہر تشریف لے گئے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث کا عنوان سے تعلق ظاہر کرنے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں۔ * رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچہ سو گیا ہے؟'' اس سے عنوان ثابت ہوتا ہے کیونکہ آپ نے حضرت میمونہ ؓ سے خطاب فرماتے ہوئے یہ کلمہ کہا تھا۔ * حضرت ابن عباس ؓ کا ساری رات بیدار رہ کر رسول اللہ ﷺ کے معمولات کو دیکھنا اور سیکھنا سمر بالعلم ہے، گویا ان کے عمل سے عنوان ثابت ہو گیا۔ * جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس ؓ کو بائیں جانب سے ہٹا کر دائیں جانب کھڑا کیا تو گویا آپ نے ابن عباس سے کہا کہ میری دائیں جانب کھڑے ہو جاؤ، اس سے عنوان ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب تکلفات ہیں۔ دراصل امام بخاری ؒ کی عادت یہ ہے کہ وہ طالب علم کے ذہن کو تیز کرتے ہیں اور حدیث کے مختلف طرق پر نظر رکھنے کے لیے بسا اوقات ایسا کرتے ہیں اور دوسرے طریق سے عنوان ثابت کرتے ہیں جو کسی دوسری جگہ پر بیان ہوتا ہے۔ یہی روایت ایک دوسرے مقام پر بایں الفاظ ہے کہ آپ نے کچھ وقت اپنی اہلیہ کے ساتھ گفتگو کی۔[1] ان الفاظ سے عنوان کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے کوئی تکلف یا دقت بھی نہیں ہوتی اور نہ اس میں کوئی خلاف عقل بات ہی ہے۔[2] ② ایک حدیث میں ہے کہ سمر (رات کو گفتگو) کی اجازت صرف نماز پڑھنے والے اور راستہ طے کرنے والے کو ہے۔[3] اس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے ماسوا کے لیے سمر جائز نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سمر فی العلم، سمر فی الصلاۃ کے ساتھ ملحق ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ رات بھر علمی مذاکرے میں مصروف رہے۔ حضرت ابو موسیٰ ؓ نے جب نماز کے متعلق کہا تو حضرت عمر ؓ نے فرمایا کہ ہم پہلے بھی نماز ہی میں تھے، اس لیے یہ حدیث رات کو علمی گفتگو کرنے کے خلاف نہیں۔[4]

(٤٢) بَابُ حِفْظِ الْعِلْمِ

باب: 42- علمی باتوں کو یاد رکھنا

١١٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنِ الْأَعْرَجِ،

[118] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: لوگ کہتے ہیں: ابو ہریرہ نے بہت احادیث بیان

1 صحيح البخاري، التفسير، حديث:4569. 2 فتح الباري:282/1. 3 مسند أحمد:444/1. 4 فتح الباري:282/1.

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: إِنَّ النَّاسَ يَقُولُونَ: أَكْثَرَ أَبُو هُرَيْرَةَ وَلَوْلَا آيَتَانِ فِي كِتَابِ اللهِ مَا حَدَّثْتُ حَدِيثًا ثُمَّ يَتْلُو ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلْهُدَىٰ﴾ إِلَى قَوْلِهِ: ﴿ٱلرَّحِيمُ﴾ [البقرة: ١٥٩، ١٦٠] إِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الصَّفْقُ بِالْأَسْوَاقِ، وَإِنَّ إِخْوَانَنَا مِنَ الْأَنْصَارِ كَانَ يَشْغَلُهُمُ الْعَمَلُ فِي أَمْوَالِهِمْ، وَإِنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَلْزَمُ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِشِبَعِ بَطْنِهِ وَيَحْضُرُ مَا لَا يَحْضُرُونَ، وَيَحْفَظُ مَا لَا يَحْفَظُونَ. [انظر: ١١٩، ٢٠٤٧، ٢٣٥٠، ٣٦٤٨، ٧٣٥٤]

کی ہیں۔ اگر کتاب اللہ میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں ایک بھی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر انھوں نے ان آیات کو تلاوت کیا: ''جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے نازل کیں...... '' الرحیم تک۔ بے شک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بازار میں خرید و فروخت کا شغل رہتا تھا اور ہمارے انصاری بھائی اموال و زراعت کے شغل میں لگے رہتے تھے لیکن ابوہریرہ تو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس موجود رہتا تھا اور ایسے موقع پر حاضر رہتا جہاں لوگ حاضر نہ رہتے اور وہ باتیں یاد کر لیتا جو دوسرے لوگ یاد نہ کر سکتے تھے۔

١١٩ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ أَبُو مُصْعَبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ بْنِ دِينَارٍ عَنِ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَسْمَعُ مِنْكَ حَدِيثًا كَثِيرًا أَنْسَاهُ، قَالَ: «ابْسُطْ رِدَاءَكَ»، فَبَسَطْتُهُ، قَالَ: فَغَرَفَ بِيَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «ضُمَّ»، فَضَمَمْتُهُ، فَمَا نَسِيتُ شَيْئًا بَعْدُ. [راجع: ١١٨]

حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ أَبِي فُدَيْكٍ بِهٰذَا، أَوْ قَالَ: غَرَفَ بِيَدِهِ فِيهِ.

[119] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں لیکن بھول جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''اپنی چادر پھیلاؤ۔'' میں نے چادر پھیلائی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چلو سا بنایا (اور چادر میں ڈال دیا)، پھر فرمایا: ''اسے اپنے اوپر لپیٹ لو۔'' میں نے اسے لپیٹ لیا، اس کے بعد میں کوئی چیز نہیں بھولا۔

١٢٠ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي أَخِي عَنِ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: حَفِظْتُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وِعَاءَيْنِ، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُومُ.

[120] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے (علم کے) دو ظرف (برتن) یاد کیے۔ ان میں سے ایک تو میں نے ظاہر کر دیا ہے۔ اگر دوسرے کو بھی ظاہر کر دوں تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں حفاظت علم کی اہمیت اور اس کے اسباب کو بیان کیا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ علم سیکھنے کے بعد اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے کیونکہ علم کے ساتھ بے اعتنائی کفران نعمت ہے، نیز تعلیم و تبلیغ اور عمل بھی اسی بات پر موقوف ہے کہ معلومات کو محفوظ رکھا جائے۔ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان علم کے ساتھ جس قدر شغف اور مشغولیت رکھے گا، اسی قدر یاد داشت تیز اور قوت حافظہ میں ترقی ہوگی، نیز دنیا کے تمام دھندوں سے الگ ہو کر علم حدیث کی خدمت میں مصروف ہو جائے۔ سیدنا راویٔ اسلام حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی علم حدیث کے حصول کے لیے دنیا کی ہر آسائش کو قربان کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے وابستہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور رفاقت صرف ساڑھے تین سال تک رہی لیکن سماع حدیث میں کوئی دوسرا صحابی ان کا ہم پلہ نہیں ہے۔ آپ کو نہ تنخواہ کی ضرورت اور نہ وظیفے کی طلب، آپ کے میزبان خود رسول اللہ ﷺ تھے، پیٹ بھر کر کھانا مل جاتا اور علم حدیث کے حصول میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی تین روایات پیش کی ہیں کیونکہ آپ کو تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب ان کے جنازے میں شریک ہوئے تو ان کی اس خصوصیت کو بایں الفاظ بیان کیا: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اہل اسلام کے لیے رسول اللہ ﷺ کی احادیث کو محفوظ رکھنے والے تھے۔ اگرچہ آپ نے اپنی تمام معلومات کو بیان نہیں کیا، اس کے باوجود آپ کی مرویات دیگر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ ہیں۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی بات کو مزید وضاحت سے نقل کیا ہے: تم کہتے ہو کہ ابو ہریرہ نبی ﷺ کی احادیث بکثرت بیان کرتا ہے اور انصار و مہاجرین حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح زیادہ احادیث کیوں نہیں بیان کرتے؟[2] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان حدیث کے سلسلے میں اپنی احتیاط بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی دو آیات نہ ہوتیں تو میں کبھی کچھ بیان نہ کرتا، وہ آیات یہ ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ ”جو لوگ چھپاتے ہیں ان کھلی نشانیوں اور ہدایت کی باتوں کو جو ہم نے نازل کیں اس کے بعد کہ ہم انھیں کتاب میں لوگوں کے لیے صاف بیان کر چکے ہیں، انھی پر اللہ لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے لوگ بھی ان پر لعنت کرتے ہیں مگر جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور صاف بیان کر دیا تو میں انھیں معاف کر دیتا ہوں اور میں تو بڑا معاف کرنے والا مہربان ہوں۔“[3] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو نہ تجارت کی مشغولیات تھیں اور نہ کاشتکاری کی مصروفیات، بلکہ آپ معاشی مشکلات سے بھی بے پروا تھے، بلکہ خود بیان کرتے ہیں کہ صفہ کے مساکین کی طرح میں بھی ایک مسکین آدمی تھا اور ہر وقت رسول اللہ ﷺ سے وابستہ رہتا تھا۔[4] اس کی تائید حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے، فرماتے ہیں: اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں سنیں جو ہم نے نہیں سنیں، کیونکہ آپ ایک مسکین آدمی تھے، کوئی گھر بار نہ تھا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی کھاتے اور آپ کے ساتھ ہی رہتے۔[5] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے وابستہ رہتے

---

1 فتح الباري: 282/1. 2 صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2047. 3 البقرة 2: 160,159. 4 صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2047. 5 المستدرك للحاكم: 511/3.

اور آپ کی احادیث کو ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔[1] ③ امام بخاری ؒ کی پیش کردہ دوسری حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ قوت حافظہ ایک عطیۂ ربانی ہے مگر اس کے کچھ ظاہری اسباب بھی ہوتے ہیں جو عطائے ربانی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان میں سے ایک صالحین کی خصوصی توجہ اور ان کی دعائیں ہیں جو ان کی مخلصانہ خدمت گزاری اور اطاعت شعاری سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی قوت یادداشت کے متعلق ایک حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ میں نے اپنے حافظے کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے مخصوص دعا بھی حاصل کی ہے۔ الغرض جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، وہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت ہے۔ ④ اس دوسری حدیث کے عموم کا تقاضا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نسیان کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ حدیث اور دیگر معاملات میں آپ اس کا شکار نہ ہوتے تھے۔ لیکن صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دعائے نبوی کے بعد مجھے احادیث کے سلسلے میں کبھی نسیان لاحق نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے متعلق آپ کا نسیان ختم کر دیا گیا، جبکہ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مجلس دعا میں رسول اللہ ﷺ نے جو احادیث بیان فرمائیں وہ ہمیشہ کے لیے یاد رہیں، ان کے متعلق نسیان نہیں ہوا۔ ان روایات میں کچھ تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی دعا کے بعد احادیث کے متعلق کبھی نسیان لاحق نہیں ہوا۔ اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ایک شاگرد حضرت ابوسلمہ نے جب آپ کے سامنے [لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ] حدیث بیان کی تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے یاد نہیں ہے۔ اور محدثین اس روایت کو نَسِيَ بَعْدَ مَاحَدَّثَ کے باب میں بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھار ایسا ہوسکتا ہے، نیز یہ کیا ضروری ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی بھولے ہوں بلکہ حضرت ابوسلمہ جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں خود ہی بھول گئے ہوں، انھوں نے کسی اور سے حدیث سنی ہو اور اس کی نسبت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف کر دی ہو۔ ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت بھولے نہیں تھے بلکہ انھوں نے جب شاگرد کو دیکھا کہ کم فہم ہے اور روایات میں ٹکراؤ پیدا کرتا ہے تو انکار کر دیا۔ ⑤ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا کہ آپ کی دعا سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نسیان کو ختم کر دیا گیا، حالانکہ یہ انسانی لوازمات سے ہے۔ ⑥ تیسری حدیث میں یہ راہنمائی ہے کہ جن علوم کی اشاعت سے عوام میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو، انھیں لوگوں میں نہیں پھیلانا چاہیے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس منافقین کے متعلق معلومات تھیں جسے انھوں نے نہیں پھیلایا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھی کچھ حوادثات اور فتن کے متعلق علوم تھے جن کی اشاعت فتنے فساد کا باعث ہوسکتی تھی، اس لیے آپ نے ان کی اشاعت نہیں فرمائی۔ اس کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن یاد کیے: ایک برتن کے علوم کو میں نے عام کر دیا جو حلال و حرام، عقائد و نظریات سے متعلق تھے، لیکن دوسرے برتن کے علوم عام طور پر پھیلانے کے نہیں ہیں۔ بعض روایات میں تین برتنوں کے علوم کی صراحت ہے۔ ان میں بظاہر تعارض ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ حلت و حرمت کے متعلقہ علوم دوسرے علوم کے مقابلے میں دوگنا ہیں، جہاں ان کے دوگنا ہونے کی رعایت فرمائی، وہاں تین برتن کہا اور جہاں ان

---

[1] فتح الباري:1/283.

کی رعایت نہیں کی، وہاں دو برتن کہہ دیا۔[1] ⑦ جن علوم کو آپ نے نہیں پھیلایا، ان سے مراد ایسی احادیث ہیں جن میں نام بنام ظالم و جابر حکام کے حق میں وعیدیں ہیں اور ان میں حوادثات اور فتنوں کی پیشین گوئیاں بھی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کبھی کبھار اشارے کے طور پر ان کا ذکر بھی کر دیتے تھے جیسا کہ آپ نے فرمایا: اے اللہ! میں 60 ہجری کے شر اور بچوں کی حکومت سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اس سال امت میں بہت فتنے برپا ہوئے اور مسلمانوں کی جماعت میں انتشار پیدا ہوا۔ یہ سال بنوامیہ کی حکومت کا ہے۔ اگرچہ ان کی اسلامی خدمات بہت ہیں لیکن ان کے کردار میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ اس پرفتن دور میں ایسی احادیث بیان کرنے سے جان کو خطرہ تھا، لہٰذا مصلحتاً آپ نے خاموشی اختیار کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دعا کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبولیت سے نوازا اور آپ 59 ہجری میں فوت ہو گئے۔[2]

ملحوظہ: صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں تیسری حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: امام بخاری نے فرمایا: بلعوم، گلے کا وہ حصہ ہے جس سے کھانا نیچے اترتا ہے۔

(٤٣) بَابُ الْإِنْصَاتِ لِلْعُلَمَاءِ

باب: 43- علماء کی باتیں سننے کے لیے خاموش رہنا

١٢١ - حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ مُدْرِكٍ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ جَرِيرٍ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَهُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اِسْتَنْصِتِ النَّاسَ، فَقَالَ: «لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ». [انظر: ٤٤٠٥، ٦٨٦٩، ٧٠٨٠]

[121] حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ان سے فرمایا: ''لوگوں کو خاموش کراؤ۔'' اس کے بعد آپ نے فرمایا: ''اے لوگو! میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں مار کے، پھر کافر نہ بن جانا۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ حصول علم کی صورت اور حفظ حدیث کے طریقے سے آگاہ فرماتے ہیں کہ جب استاد احادیث بیان کرے تو پوری توجہ اور انہماک سے سننا چاہیے تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے، نیز یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ طلباء کے لیے اساتذہ کی توقیر و تعظیم انتہائی ضروری ہے۔ اسی طرح دیگر علماء کی باتیں بھی پورے اطمینان و سکون سے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنی جائیں کیونکہ یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ورثاء، آپ کی سنتوں کے محافظ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کے امین ہیں۔ اگرچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے لیے لوگوں کو خاموش کرانے کا ذکر ہے، تاہم امام بخاری نے عنوان قائم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حدیث میں مذکور واقعہ گو رسول اللہ ﷺ سے متعلق ہے، تاہم اس کا حکم عام ہے۔ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالم دین کو لوگوں کی خاموشی کا انتظار کرنا چاہیے، اگر جلدی یا ضروری کام ہو تو انھیں خاموش بھی کرایا جا سکتا ہے۔ بہرحال

---

1 فتح الباري:286/1. 2 فتح الباري:286/1.

عوام الناس کے لیے ضروری ہے کہ وہ علماء کی باتوں کو پوری توجہ سے سنیں اور انھیں یاد بھی رکھیں۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب سننے والا توجہ سے سنے اور اسے سمجھے۔ اگر سنتے وقت بے پروائی سے کام لیا تو اسے یاد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ امام ثوری علم کے تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: علم کے لیے پہلے توجہ، پھر خاموشی، اس کے بعد یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا، پھر اسے دوسروں تک پہنچانا ہے۔[1] ② رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تم پھر کافر مت ہو جانا، محدثین نے اس کے دو مفہوم بیان کیے ہیں: ✱ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مل جل کر بھائیوں کی طرح رہیں۔ اگر مسلمان باہم دست و گریباں ہوں گے اور ایک دوسرے کو قتل کریں گے تو گویا انھوں نے کافروں کا شعار اپنا لیا ہے کیونکہ یہ کافروں کا کام ہے کہ وہ خواہ مخواہ مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس صورت میں کفر اپنے حقیقی معنی میں نہیں ہوگا بلکہ کبیرہ گناہ کے معنی میں ہوگا۔ ✱ ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے بعد ایسا نہ ہو کہ تم اپنی راہ تبدیل کر لو اور مرتد ہو کر ایک دوسرے کے قتل کو حلال سمجھنے لگو۔ اس صورت میں کفر اپنے حقیقی معنوں میں ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے قتل کو اپنے لیے حلال سمجھنے والا بلا شبہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس کہ جن مسلمانوں کو اخوت و ہمدردی کا سبق دیا گیا تھا، وہ آج افتراق و انتشار کا شکار ہیں اور آپس میں اس طرح لڑتے ہیں گویا ان سب کا دین جدا جدا ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد

(٤٤) بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَيَكِلُ الْعِلْمَ إِلَى اللهِ

باب: 44- جب عالم سے پوچھا جائے کہ لوگوں میں کون زیادہ جاننے والا ہے؟ تو بہتر ہے کہ وہ اپنے علم کو اللہ کے حوالے کر دے، یعنی اَللّٰهُ أَعْلَمُ کہہ دے

١٢٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرٌو قَالَ: أَخْبَرَنِي سَعِيدُ ابْنُ جُبَيْرٍ قَالَ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: إِنَّ نَوْفًا الْبَكَالِيَّ يَزْعُمُ أَنَّ مُوسٰى لَيْسَ بِمُوسٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ، إِنَّمَا هُوَ مُوسٰى آخَرُ فَقَالَ: كَذَبَ عَدُوُّ اللهِ، حَدَّثَنَا أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «قَامَ مُوسَى النَّبِيُّ ﷺ خَطِيبًا فِي بَنِي

[122] حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت ابن عباس ؓ سے عرض کیا: نوف بکالی یہ کہتا ہے کہ موسیٰ، موسیٰ بنی اسرائیل نہیں تھے بلکہ وہ کوئی اور موسیٰ تھے۔ انھوں نے فرمایا: غلط کہتا ہے اللہ کا دشمن۔ فرمایا: حضرت ابی بن کعب ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نبی موسیٰ ؑ ایک دن بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان سے پوچھا گیا:

[1] فتح الباري: 287/1.

إِسْرَائِيلَ، فَسُئِلَ: أَيُّ النَّاسِ أَعْلَمُ؟ فَقَالَ: أَنَا أَعْلَمُ، فَعَتَبَ اللهُ عَلَيْهِ، إِذْ لَمْ يَرُدَّ الْعِلْمَ إِلَيْهِ، فَأَوْحَى اللهُ إِلَيْهِ أَنَّ عَبْدًا مِّنْ عِبَادِي بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ، قَالَ: رَبِّ، وَكَيْفَ لِي بِهِ؟ فَقِيلَ لَهُ: اِحْمِلْ حُوتًا فِي مِكْتَلٍ فَإِذَا فَقَدْتَّهُ فَهُوَ ثَمَّ، فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقَ بِفَتَاهُ يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَّحَمَلَا حُوتًا فِي مِكْتَلٍ حَتّٰى كَانَا عِنْدَ الصَّخْرَةِ وَضَعَا رُؤُسَهُمَا وَنَامَا، فَانْسَلَّ الْحُوتُ مِنَ الْمِكْتَلِ فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا، وَكَانَ لِمُوسٰى وَفَتَاهُ عَجَبًا، فَانْطَلَقَا بَقِيَّةَ لَيْلَتِهِمَا وَيَوْمَهُمَا، فَلَمَّا أَصْبَحَ قَالَ مُوسٰى لِفَتَاهُ: آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا، وَلَمْ يَجِدْ مُوسٰى مَسًّا مِّنَ النَّصَبِ حَتّٰى جَاوَزَ الْمَكَانَ الَّذِي أُمِرَ بِهِ، فَقَالَ لَهُ فَتَاهُ: أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ، قَالَ مُوسٰى: ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِي، فَارْتَدَّا عَلٰى آثَارِهِمَا قَصَصًا، فَلَمَّا أَتَيَا إِلَى الصَّخْرَةِ إِذَا رَجُلٌ مُّسَجًّى بِثَوْبٍ، أَوْ قَالَ: تَسَجّٰى بِثَوْبِهِ، فَسَلَّمَ مُوسٰى فَقَالَ الْخَضِرُ: وَأَنّٰى بِأَرْضِكَ السَّلَامُ؟ فَقَالَ: أَنَا مُوسٰى، فَقَالَ: مُوسٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلٰى أَنْ تُعَلِّمَنِي مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا، قَالَ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا، يَا مُوسٰى! إِنِّي عَلٰى عِلْمٍ مِّنْ عِلْمِ اللهِ عَلَّمَنِيهِ، لَا تَعْلَمُهُ أَنْتَ، وَأَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللهُ لَا أَعْلَمُهُ، قَالَ: سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللهُ صَابِرًا وَّلَا أَعْصِي

سب لوگوں میں بڑا عالم کون ہے؟ انھوں نے کہا: میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اللہ نے ان پر عتاب فرمایا کیونکہ انھوں نے علم کو اللہ کے حوالے نہ کیا۔ پھر اللہ نے ان پر وحی بھیجی کہ میرے بندوں میں ایک بندہ، دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر، ایسا ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے پروردگار! میری ان سے کیونکر ملاقات ہوگی؟ حکم ہوا: ایک مچھلی کو تھیلے میں رکھو۔ جہاں وہ گم ہو جائے، وہی اس کا ٹھکانا ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام روانہ ہوئے اور ان کا خادم یوشع بن نون بھی ساتھ تھا۔ ان دونوں نے ایک مچھلی کو تھیلے میں رکھ لیا۔ جب ایک پتھر کے پاس پہنچے تو دونوں اپنے سر اس پر رکھ کر سو گئے۔ اس دوران میں مچھلی تھیلے سے نکل کر دریا میں چلی گئی جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے خادم کو تعجب ہوا۔ پھر دونوں بقیہ دن اور ایک رات چلتے رہے۔ صبح کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا: ناشتہ لاؤ! ہم تو اس سفر سے تھک گئے ہیں۔ موسیٰ جب تک اس جگہ سے آگے نہیں نکل گئے جس کا انھیں حکم دیا گیا تھا، اس وقت تک انھوں نے کچھ تھکاوٹ محسوس نہ کی۔ اس وقت ان کے خادم نے کہا: کیا آپ نے دیکھا کہ جب ہم پتھر کے پاس بیٹھے تھے تو مچھلی (نکل بھاگی تھی اور میں اس کا ذکر کرنا) بھول گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم تو اس کی تلاش میں تھے۔ آخر وہ دونوں کھوج لگاتے ہوئے اپنے پاؤں کے نشانوں پر واپس لوٹے۔ جب اس پتھر کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی کپڑا لپیٹے ہوئے یا اپنے کپڑے میں لپٹا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے سلام کیا۔ حضرت خضر نے کہا: تیرے ملک میں سلام کہاں سے آیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: (میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں بلکہ) میں موسیٰ ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا بنی اسرائیل کے موسیٰ ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔

لَكَ أَمْرًا ، فَانْطَلَقَا يَمْشِيَانِ عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ ، لَيْسَ لَهُمَا سَفِينَةٌ فَمَرَّتْ بِهِمَا سَفِينَةٌ ، فَكَلَّمُوهُمْ أَنْ يَّحْمِلُوهُمَا فَعُرِفَ الْخَضِرُ فَحَمَلُوهُمَا بِغَيْرِ نَوْلٍ ، فَجَاءَ عُصْفُورٌ فَوَقَعَ عَلٰى حَرْفِ السَّفِينَةِ فَنَقَرَ نَقْرَةً أَوْ نَقْرَتَيْنِ فِي الْبَحْرِ ، فَقَالَ الْخَضِرُ: يَا مُوسٰى! مَا نَقَصَ عِلْمِي وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللهِ إِلَّا كَنَقْرَةِ هٰذَا الْعُصْفُورِ فِي الْبَحْرِ، فَعَمَدَ الْخَضِرُ إِلٰى لَوْحٍ مِّنْ أَلْوَاحِ السَّفِينَةِ فَنَزَعَهُ، فَقَالَ مُوسٰى: قَوْمٌ حَمَلُونَا بِغَيْرِ نَوْلٍ عَمَدْتَّ إِلٰى سَفِينَتِهِمْ فَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا؟ قَالَ: أَلَمْ أَقُلْ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا؟ قَالَ: لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ - فَكَانَتِ الْأُولٰى مِنْ مُّوسٰى نِسْيَانًا - فَانْطَلَقَا فَإِذَا غُلَامٌ يَّلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ فَأَخَذَ الْخَضِرُ بِرَأْسِهِ مِنْ أَعْلَاهُ فَاقْتَلَعَ رَأْسَهُ بِيَدِهِ فَقَالَ مُوسٰى: أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ؟ قَالَ: أَلَمْ أَقُلْ لَّكَ: إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا؟» قَالَ ابْنُ عُيَيْنَةَ: وَهٰذَا أَوْكَدُ، «فَانْطَلَقَا حَتّٰى أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَنْ يُّضَيِّفُوهُمَا ، فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيدُ أَنْ يَّنْقَضَّ، قَالَ الْخَضِرُ بِيَدِهِ، فَأَقَامَهُ، قَالَ مُوسٰى: لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا؟ قَالَ: هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ»، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «يَرْحَمُ اللهُ مُوسٰى ، لَوَدِدْنَا لَوْ صَبَرَ حَتّٰى يُقَصَّ عَلَيْنَا مِنْ أَمْرِهِمَا» . [راجع: ٧٤]

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا میں اس امید پر تمھارے ہمراہ ہو جاؤں جو کچھ ہدایت کی تمھیں تعلیم دی گئی ہے، وہ مجھے بھی سکھا دو گے۔ خضر علیہ السلام نے کہا: تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔ موسیٰ! بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک (قسم کا) علم مجھے دیا ہے جو تمھارے پاس نہیں ہے اور تم کو ایک قسم کا علم دیا ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان شاء اللہ تم مجھے صابر پاؤ گے اور میں کسی کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ پھر وہ دونوں سمندر کے کنارے چلے، ان کے پاس کوئی کشتی نہ تھی، اتنے میں ایک کشتی گزری، انھوں نے کشتی والوں سے کہا: ہمیں سوار کر لو۔ حضرت خضر علیہ السلام پہچان لیے گئے، اس لیے کشتی والوں نے بغیر اجرت کے بٹھا لیا۔ اتنے میں ایک چڑیا آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ کر اس نے سمندر میں ایک دو چونچیں ماریں۔ حضرت خضر علیہ السلام گویا ہوئے: اے موسیٰ! میرے اور تمھارے علم نے اللہ کے علم سے صرف چڑیا کی چونچ کی بقدر حصہ لیا ہے۔ پھر حضرت خضر نے کشتی کے تختوں میں سے ایک تختہ اکھاڑ ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے: ان لوگوں نے تو ہمیں بغیر کرائے کے سوار کیا اور آپ نے یہ کام کیا کہ ان کی کشتی میں چھید کر ڈالا تاکہ اہل کشتی کو غرق کر دو۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: کیا میں نے نہ کہہ دیا تھا کہ تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔ موسیٰ نے جواب دیا: میری بھول چوک پر مؤاخذہ نہ کریں۔ (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) موسیٰ کا پہلا اعتراض بھول کی وجہ سے تھا۔ پھر دونوں (کشتی سے اتر کر) چلے، ایک لڑکا ملا جو دوسرے لڑکوں سے کھیل رہا تھا۔ خضر نے اس کا سر پکڑ کر الگ کر دیا۔ موسیٰ نے کہا: آپ نے ایک معصوم جان کو ناحق قتل کیا۔ خضر نے کہا: میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے

ساتھ صبر نہیں ہو سکے گا؟'' ابن عیینہ نے کہا: یہ زیادہ تاکیدی الفاظ ہیں (کیونکہ اس میں لَكَ کا اضافہ ہے۔)''پھر دونوں چلتے چلتے ایک گاؤں کے پاس پہنچے۔ وہاں کے باشندوں سے انھوں نے کھانا مانگا تو انھوں نے ان کی مہمانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی دوران میں دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی۔ حضرت خضر نے اسے اپنے ہاتھ سے سہارا دے کر سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اگر تم چاہتے تو اس پر اجرت لے لیتے؟ حضرت خضر بولے: بس یہاں سے ہمارے تمھارے درمیان جدائی کی گھڑی آ پہنچی ہے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے! ہم چاہتے تھے، کاش موسیٰ صبر کرتے تو ان کے اور حالات بھی ہم سے بیان کیے جاتے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ بڑائی، تفاخر اور خود پسندی کے اسباب علماء کو زیادہ میسر آتے ہیں، اس لیے یہ حضرات اپنی وجاہت اور شہرت کو بچانے کے لیے ہر بات کا جواب دینا ضروری خیال کرتے ہیں، مبادا ان کے متعلق کوئی بدگمانی پیدا ہو جائے کہ اسے اس سوال کا جواب نہیں آیا، یہ کیسا عالم ہے؟ علماء کو بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ جب ایک جلیل القدر پیغمبر کو معتوب ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے واللہ أعلم نہیں کہا تو عام علماء کس طرح نظر انداز کیے جاسکتے ہیں؟ علماء کو چاہیے کہ ہر وقت اپنا جہل پیش نظر رکھیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ ''اور تمھیں علم بہت ہی کم دیا گیا ہے۔''[1] نیز فرمایا: ﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾[2] ''ہر جاننے والے کے اوپر ایک جاننے والا ہے۔'' قرآن کی اس وضاحت کے پیش نظر علمائے کرام کی معلومات بہر حال محدود اور ان کی مجہولات غیر محدود ہیں۔ اپنی معلومات کو سامنے رکھتے ہوئے مجہولات کو نظر انداز کر دینا دانشمندی نہیں۔ جب کسی عالم دین کے سامنے اپنی مجہولات ہوں گی تو دماغ میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ میں سب سے بڑا ہوں۔ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کا جواب اس اعتبار سے صحیح تھا کہ آپ صاحب کتاب، جلیل القدر پیغمبر تھے، انھیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، اس بنا پر جو علوم و معارف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہو سکتے تھے، وہ کسی دوسرے کے پاس کیسے ہو سکتے تھے؟ لیکن اللہ کی جناب میں ان کا یہ جواب ان کی شایان شان نہ تھا۔ انھیں اپنے علم کو اللہ کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس تناظر میں علماء حضرات کی تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ اَعْلَمُ النَّاسِ کون ہے؟ تو اپنے آپ کو پیش نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس طرح بھی نہ کہے کہ لوگوں کی نظر تو مجھ پر ہی پڑتی ہے۔ اگر

[1] بنی اسرائیل 85:17. [2] یوسف 76:12.

سوال نہ بھی کیا جائے تب بھی خود کو اونچا نہ خیال کیا جائے۔ علماء کو چاہیے کہ وہ ہر حالت میں تواضع کو پیش نظر رکھیں اور اپنے نقص اور اللہ کے کمال کے معترف رہیں۔ ② موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعے میں دو چیزوں کے متعلق اختلاف ہوا:

* حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن سے ملاقات کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا اور اپنے گھر سے رخت سفر باندھا وہ حضرت خضر ہیں یا کوئی اور صاحب؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ وہ حضرت خضر علیہ السلام ہیں جبکہ حضرت حر بن قیس رضی اللہ عنہ کا موقف کچھ اور تھا۔ اس اختلاف کا فیصلہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی موافقت میں دیا۔ * دوسرا اختلاف یہ تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جانے والے حضرت موسیٰ بن عمران پیغمبر ہیں یا موسیٰ بن میشا؟ حضرت ابویزید نوف بن فضالہ بکالی جو دمشق کے بہت بڑے عالم دین اور جلیل القدر تابعی ہیں، ان کا موقف تھا کہ وہ موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر نہیں بلکہ میشا کے بیٹے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ واضح رہے کہ انھیں یہ معلومات جناب کعب احبار سے ملی تھیں کیونکہ نوف بکالی کعب احبار کی بیوی کے بیٹے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس موقف کی بڑی سختی سے تردید فرمائی۔ فرمایا کہ اللہ کا دشمن غلط کہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حقیقتاً اسے اللہ کا دشمن سمجھتے تھے بلکہ بات یہ ہے کہ حضرت نوف بکالی بہت بڑے واعظ تھے اور واعظین حضرات کا وقار عوام الناس میں بہت ہوتا ہے۔ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پرزور انداز میں تردید نہ فرماتے تو اندیشہ تھا کہ عقیدت مند حضرات اس موقف سے دستبردار نہیں ہوں گے۔[1] ③ حضرت خضر اس اعتبار سے زیادہ عالم تھے کہ انھیں تکوینیات سے کچھ معلومات دی گئی تھیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس نہ تھیں۔ ان کے پاس علم تشریعی تھا جس کا کچھ حصہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس ضرور تھا کیونکہ حضرت خضر، خواہ نبی ہوں یا ولی، کسی نہ کسی شریعت کے ضرور پابند تھے۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تشریعی علوم کے مقابلے میں ان کے تکوینی علوم کی کوئی حیثیت نہیں ہے جس کا اعتراف حضرت خضر نے بایں الفاظ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کا علم مجھے دیا ہے جو تمھارے پاس نہیں اور تمھیں ایک قسم کا علم دیا ہے جو میرے پاس نہیں۔ دراصل حضرت خضر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میرے علوم آپ کے پاس نہیں اور آپ کے علوم میرے پاس نہیں، اس لیے اَعْلَمْ میں ہوں نہ آپ، بلکہ اَعْلَم وہ ذات اقدس ہے جس نے ہم دونوں کو علم سے بہرہ ور کیا ہے۔ ④ اس واقعے کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ موسیٰ پر رحم کرے انھوں نے صبر نہ کیا بلکہ جلدی سے کام لیا، اگر حضرت خضر کے ساتھ رہتے تو ان کے مزید حالات سے ہمیں آگاہی ہوتی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ تکوینی علوم آپ کے پاس بھی نہ تھے، وہ صرف حضرت خضر کے پاس تھے، لیکن یہ کوئی وجہ فضیلت نہیں، کیونکہ تکوینی علوم خالق کائنات کے لیے باعث کمال ہیں، کسی مخلوق کے لیے نہیں۔ اس بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کا تکوینی علوم سے ناواقف ہونا کمی کی دلیل ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ⑤ حضرت خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہ تھے لیکن آپ کا یہ کہنا کہ میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ انھیں چاہیے تھا کہ اس بات کو اللہ کے حوالے کر دیتے، چنانچہ ان کا مقابلہ ایسے انسان سے کرایا گیا جو ان سے درجے میں کہیں کم تھا تاکہ اس قسم کا دعویٰ نہ کریں۔ ⑥ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوا کہ ایک عالم دین کو خلاف شرع کام دیکھ کر خاموش نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس کا انکار کرنا

---

① عمدة القاري: 2/272.

ضروری ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہی تقاضا ہے۔ خلاف شریعت کام دیکھ کر علم کے باوجود انھیں ٹھنڈے پیٹ برداشت کر لینا اور حق بات نہ کہنا، ضعف ایمان کی علامت ہے جو ایک عالم کی شان کے خلاف ہے۔ ہمیں صحابۂ کرام ؓ کے بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری وقت بھی انھوں نے یہ فریضہ ادا کیا اور اس میں ذرہ بھر کوتاہی کو روا نہ رکھا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ.

(٤٥) بَابُ مَنْ سَأَلَ وَهُوَ قَائِمٌ عَالِمًا جَالِسًا

باب:45- جو عالم بیٹھا ہو، اس سے کھڑے کھڑے سوال کرنا

١٢٣ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ: أَخْبَرَنِي جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ أَبِي مُوسٰى قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! مَا الْقِتَالُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ؟ فَإِنَّ أَحَدَنَا يُقَاتِلُ غَضَبًا، وَيُقَاتِلُ حَمِيَّةً، فَرَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ قَالَ: وَمَا رَفَعَ إِلَيْهِ رَأْسَهُ إِلَّا أَنَّهُ كَانَ قَائِمًا فَقَالَ: «مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ». [انظر: ٢٨١٠، ٣١٢٦، ٧٤٥٨]

[123] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا: یا رسول اللہ! اللہ کی راہ میں لڑنا کسے کہتے ہیں؟ کیونکہ ہم میں سے کوئی غصے کی وجہ سے لڑتا ہے اور کوئی حمیت کے سبب جنگ کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف اپنا سر مبارک اٹھایا۔ ابوموسیٰ کہتے ہیں: آپ نے اپنا سر مبارک اس لیے اٹھایا تھا کہ وہ کھڑا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''جو شخص اس لیے لڑے کہ اللہ کا بول بالا ہو تو ایسی لڑائی اللہ عزوجل کی راہ میں ہے۔''

فوائد ومسائل: ① حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنے لیے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے تعظیماً کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔[1] نیز آپ نے فرمایا کہ عجمیوں کی طرح مت کھڑے ہوا کرو، کیونکہ وہ تعظیم کی خاطر ایک دوسرے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔[2] امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ اگر بیٹھے ہوئے عالم سے کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال کرتا ہے تو وہ احادیث مذکورہ کے عموم میں داخل نہیں ہے بشرطیکہ خود پسندی اور تکبر کی بنا پر ایسا نہ ہو۔ ہاں، اگر عالم دین سائل کو بیٹھنے کی اجازت نہ دے اور وہ چاہے کہ سائل کھڑا ہی رہے، ایسا کرنے سے اس کے جذبات کو تسکین ہوتی ہو تو ایسا کرنا درست نہیں، لیکن اگر سائل خود بیٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ جلدی کے پیش نظر فوراً جانا چاہتا ہے تو وہ اس وعید کے تحت نہیں آتا جو احادیث میں مذکور ہے۔[3]
② امام بخاری ؒ نے گزشتہ ایک باب بایں الفاظ قائم کیا تھا ''امام یا محدث کے آگے دوزانو بیٹھنا'' جس کا مفہوم یہ ہے کہ سوال یا تحصیل علم کے لیے اطمینان کی نشست اختیار کرنی چاہیے۔ اس عنوان کے پیش نظر گمان ہوسکتا تھا کہ شاید کھڑے ہو کر سوال کرنا

1 جامع الترمذي، الأدب، حديث:2755. 2 مسند أحمد:253/5. 3 فتح الباري:292/1.

درست نہ ہو، آپ نے مذکورہ حدیث سے کھڑے ہو کر سوال کرنے کا جواز ثابت فرما دیا۔ اس جواز کی بنیاد راوی کا یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر اس لیے اٹھایا تھا کہ سائل کھڑا تھا، بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں یہ وضاحت کرنے والے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اپنا مشاہدہ نقل کیا ہے۔ اگر کوئی اور راوی ہے تو بھی استدلال صحیح ہے کیونکہ اس نے مشاہدے کی بنا پر ایسا کہا ہے۔ ③ اس حدیث میں لڑائی کے محرکات کا ذکر ہے۔ مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے کہ محرکات مندرجہ ذیل ہوسکتے ہیں: * اعلائے کلمۃ اللہ، انتقامی جذبہ، قومی عصبیت۔ یہ تو اسی حدیث سے معلوم ہوتے ہیں، نیز حصول مال و دولت، شہرت و ناموری اور شجاعت و بہادری بھی لڑائی کا سبب ہوتے ہیں۔[1] اس کے علاوہ ہوس ملک گیری اور قیمتی وسائل پر قبضہ جمانا بھی ہوسکتا ہے۔ ان سب میں قتال فی سبیل اللہ وہ ہوگا جس کے پیش نظر صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین اسلام ہو۔ امام صاحب نے اس حدیث پر کئی ایک عنوان قائم کیے ہیں جو ان کی ذکاوتِ فہم اور قوت استنباط پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً: کتاب الجہاد میں ایک عنوان بایں الفاظ ہے: جو اس لیے لڑتا ہے تاکہ اللہ کا بول بالا ہو۔ ایک دوسرا عنوان یوں قائم کیا: جو حصول غنیمت کے لیے لڑائی کرتا ہے کیا اس سے اجر کم ہو جائے گا۔؟ کتاب التوحید میں کلمة الله کی تفسیر میں اس حدیث کو پیش کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ عنوان بندی کے وقت ذخیرۂ احادیث پر بھی نظر رکھتے ہیں اور مسائل و احکام کی نزاکتوں کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کو امام بخاری کی وسعت نظر اور دقت نظر سے حسد و بغض ہے، اس لیے انھیں جب موقع ملتا ہے تو وہ برملا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ امین احسن اصلاحی نے کہا ہے: ''امام صاحب نے اتنی اہم روایت کو ایک بے معنی باب سے ڈھانک دیا ہے۔''[2] اسے کہتے ہیں: ''اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی۔''

(٤٦) بَابُ السُّؤَالِ وَالْفُتْيَا عِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ

باب:46- رمی جمار کے وقت سوال کرنا اور فتویٰ دینا

١٢٤ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ ابْنُ أَبِي سَلَمَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عِيسَى بْنِ طَلْحَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ عِنْدَ الْجَمْرَةِ وَهُوَ يُسْأَلُ فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُولَ اللهِ! نَحَرْتُ قَبْلَ أَنْ أَرْمِيَ؟ قَالَ: «اِرْمِ وَلَا حَرَجَ»، قَالَ آخَرُ: يَارَسُولَ اللهِ! حَلَقْتُ قَبْلَ أَنْ أَنْحَرَ؟ قَالَ: «اِنْحَرْ وَلَا حَرَجَ»، فَمَا سُئِلَ عَنْ شَيْءٍ قُدِّمَ وَلَا أُخِّرَ إِلَّا قَالَ: «اِفْعَلْ وَلَا

[124] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو جمرے کے قریب بایں حالت دیکھا کہ آپ سے سوالات کیے جا رہے ہیں، چنانچہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! میں نے رمی سے پہلے قربانی کر لی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اب رمی کر لو، کوئی حرج نہیں۔'' دوسرے نے دریافت کیا: یارسول اللہ! میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا لیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اب قربانی کر لو، کوئی حرج نہیں۔'' الغرض کسی بھی چیز کی تقدیم و

① صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث:2810. 2 تدبر حديث:223/1.

حَرَجَ». [راجع: ٨٣]

تاخیر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے اس کا جواب دیا: ''اب کرلو، کوئی حرج نہیں۔''

فوائد و مسائل: ① حدیث میں ہے کہ بیت اللہ کا طواف، صفا مروہ کی سعی اور رمی جمار ذکر اللہ کی اقامت کے لیے ہیں۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر رمی جمار کے وقت ایک آدمی اللہ کے ذکر میں مصروف ہے، ایسی حالت میں سوال و جواب کی اجازت ہے یا نہیں؟ امام بخاری نے مذکورہ حدیث سے اس کا جواز ثابت فرمایا ہے۔ دراصل ذکر کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اس میں مشغولیت کے وقت دوسری کسی چیز کی طرف توجہ دینا جائز نہیں جیسا کہ نماز وغیرہ۔ اور دوسری قسم ایسی ہے کہ اس میں مصروفیت کے دوران میں نہ گفتگو کی ممانعت ہے اور نہ دوسری طرف توجہ دینا ہی ناجائز ہے، جیسے رمی جمار اور طواف وغیرہ۔ اس مقام پر حج کے مسائل بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ وہ کتاب الحج میں بیان ہوں گے۔ اسے کتاب العلم میں اس غرض سے بیان کیا گیا ہے تاکہ علم کا مقام اور مرتبہ واضح کیا جائے، یعنی علم کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ کا ذکر قطع کرکے علمی سوالات کا جواب دیا جاسکتا ہے، لیکن حدیث میں راوی کا بیان بایں الفاظ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمرے کے پاس دیکھا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت رمی جمار کررہے تھے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جمرے کے پاس تشریف فرما ہونا دو صورتوں میں ممکن ہے: یا تو آپ رمی فرمارہے ہوں گے یا رمی کے بعد دعا میں مشغول ہوں گے اور دعا بھی عبادت ہے، اس لیے آپ سے سوال کسی بھی صورت میں کیا گیا ہو، دوران عبادت میں کیا گیا ہے اور آپ نے سوال کرنے والوں سے یہ نہیں فرمایا کہ میں اس وقت عبادت میں مصروف ہوں، بلکہ آپ نے ان کے جوابات دیے ہیں، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ جن عبادات میں گفتگو کی اجازت ہے اگر اس دوران میں عالم سے سوال کیا جائے تو اسے جواب دینے کی اجازت ہے۔ ② اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے علم میں کس قدر گیرائی اور گہرائی ہے اور ثقاہت وفقاہت میں آپ کا مقام کس قدر اونچا ہے! لیکن حسد وبغض کا ستیاناس ہو، یہ انسان کو بالکل اندھا کردیتا ہے چنانچہ امین احسن اصلاحی نے تدبر حدیث کی آڑ میں اپنے خبث باطن کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے: ''یہ باب ایسا ہے کہ جس پر ہمارے محدثین حضرات نے بھی سر پیٹا ہے کہ یہ باب بالکل فضول باندھا گیا ہے۔''[2] البتہ علامہ اسماعیلی نے امام بخاری پر اعتراض کیا ہے کہ اگر اتنی اتنی بات پر عنوان قائم کرنا ہے تو پھر اس حدیث پر تین عنوان ہونے چاہیے تھے۔ * باب السؤال عند رمي الجمار * باب السؤال والمسؤول على الراحلة * باب السؤال يوم النحر۔ اس اعتراض کا جواب حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دیا ہے کہ ان تین تراجم میں سے ایک عنوان تو پہلے آچکا ہے، یعنی سواری وغیرہ پر سوار رہ کر فتویٰ دینا (باب رقم:23) وہاں بھی یہی حدیث پیش فرمائی تھی۔ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے مکان سے صرف نظر کرتے ہوئے زمان و وقت کا لحاظ رکھا اور عنوان قائم کردیا۔ اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ عید کا دن ہے۔ اس مناسبت سے کسی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید عید کے دن لہو ولعب کی وجہ سے علمی سوال کرنے کی اجازت نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اس دن بھی سوالات و جوابات کا سلسلہ قائم کیا جاسکتا ہے۔[3] ہماری وضاحت

1 سنن أبي داود، المناسك، حديث:1888. 2 تدبر حديث:223/1. 3 فتح الباري:297/1.

کے بعد بھی اگر کسی نے سر پیٹنا ہے تو اپنا پیٹے، اپنی عقل و دانش کا ماتم کرے، محدثین کرام پر الزام تراشی یا تہمت زنی کی کیا ضرورت ہے۔

(٤٧) بَابُ قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [الإسراء: ٨٥]

١٢٥ - حَدَّثَنَا قَيْسُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ سُلَيْمَانُ عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: بَيْنَا أَنَا أَمْشِي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي خَرِبِ الْمَدِينَةِ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلَى عَسِيبٍ مَّعَهُ فَمَرَّ بِنَفَرٍ مِّنَ الْيَهُودِ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: سَلُوهُ عَنِ الرُّوحِ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَا تَسْأَلُوهُ لَا يَجِيءُ فِيهِ بِشَيْءٍ تَكْرَهُونَهُ، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: لَنَسْأَلَنَّهُ، فَقَامَ رَجُلٌ مِّنْهُمْ، فَقَالَ: يَا أَبَا الْقَاسِمِ! مَا الرُّوحُ؟ فَسَكَتَ، فَقُلْتُ: إِنَّهُ يُوحٰى إِلَيْهِ، فَقُمْتُ، فَلَمَّا انْجَلٰى عَنْهُ، فَقَالَ: (وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا) قَالَ الْأَعْمَشُ: هِيَ كَذَا فِي قِرَاءَتِنَا.

[انظر: ٤٧٢١، ٧٢٩٧، ٧٤٥٦، ٧٤٦٢]

باب:47- ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر ''تمھیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے''

[125] حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے: میں نبی ﷺ کے ساتھ مدینے کے ویرانے میں چل رہا تھا اور آپ کھجور کی چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ راستے میں چند یہودیوں کے پاس سے گزر ہوا۔ انھوں نے آپس میں کہا: ان سے روح کے متعلق سوال کرو۔ ان میں سے ایک نے کہا: تم ان سے ایسا سوال نہ کرو کہ جس کے جواب میں وہ ایسی بات کہیں جو تمھیں ناگوار گزرے۔ بعض نے کہا: ہم تو ضرور پوچھیں گے۔ آخر ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اے ابوالقاسم! روح کیا چیز ہے؟ آپ خاموش رہے۔ میں نے (دل میں) کہا کہ آپ پر وحی اتر رہی ہے، چنانچہ میں کھڑا ہو گیا۔ جب وحی کی کیفیت ختم ہو گئی تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی: ''(اے پیغمبر!) یہ لوگ آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے مالک کا حکم ہے۔ اور انھیں بہت کم علم عطا کیا گیا ہے۔''

امام اعمش نے کہا کہ ہماری قراءت میں ایسا (بصیغۂ غائب) ہی ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد پیش کردہ آیت کا شان نزول بیان کرنا نہیں، کیونکہ وہ اس حیثیت سے کتاب التفسیر میں اسے بیان کریں گے، یہاں کتاب العلم میں غالباً اس لیے لائے ہیں کہ ہمیں جو علم ملا ہے اس پر قطعاً مغرور نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہماری مجہولات، معلومات سے کہیں زیادہ ہیں، اس لیے سائل کو چاہیے کہ اسے جب کوئی علمی ضرورت درپیش ہو تو سوال کرنے میں کوئی حجاب نہ ہو اور نہ عالم ہی کو اس کا جواب دینے میں کوئی تکلف مانع ہو، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف

اللہ کے پاس ہے۔ اس کے سوا کوئی نبی، فرشتہ یا ولی عالم الغیب نہیں۔ ② قرآن مجید میں لفظ روح کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے، مثلاً: ❁ حضرت جبرئیل کے لیے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ [1] ❁ قرآن مجید کے لیے: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [2] ❁ روح انسانی کے لیے: ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ [3] متعلقہ آیت میں روح سے مراد روح انسانی ہے جو پورے بدن میں پھیلی ہوئی ہے اور بدن کی حرکت اس روح کی مرہون منت ہے۔ اس کی حقیقت اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، لہٰذا ہمیں بھی اس کے متعلق لب کشائی سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ③ اس روایت کے آخر میں امام اعمش کی ایک قراءت کا ذکر ہے کہ انھوں نے اسے غائب کے صیغے سے پڑھا ہے۔ امام اعمش کے ایک شاگرد عبدالواحد اس طرح نقل کرتے ہیں، جبکہ متواتر قراءت مخاطب کے صیغے کے ساتھ ہے۔ حضرت اعمش کے باقی شاگردوں نے جمہور کی قراءت کے مطابق ہی نقل کیا ہے۔ [4] امام اعمش کی مذکورہ قراءت شاذ ہے۔ امام سیوطی نے قراءت کی چند اقسام ذکر کی ہیں: متواتر، مشہور، آحاد، شاذ، موضوع اور مدرج وغیرہ۔ انھوں نے قراءت شاذ کے سلسلے میں امام اعمش اور یحییٰ بن وثاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ [5] ④ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کی شان نزول یہود کا سوال ہے جبکہ امام ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار قریش کے سوال کرنے پر یہ آیت نازل ہوئی: جو حضرات علوم قرآن سے شغف رکھتے ہیں انھوں نے اسباب نزول کے متعلق بہت نادر اور قیمتی مباحث نقل کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے: ✱ سبب نزول کے متعلق اگر مختلف روایات ہیں تو صحیح روایت کا اعتبار ہوگا۔ ✱ اگر متعدد صحیح روایات منقول ہیں تو وجوہ ترجیح کی بنیاد پر کسی ایک کو راجح قرار دیا جائے گا۔ ✱ اگر صحت اور سبب ترجیح میں مساوی ہوں تو وہاں انھیں جمع کرنے کی کوئی صورت پیدا کی جائے گی۔ ✱ اگر جمع ممکن نہ ہو تو تعدد نزول پر محمول کیا جائے گا۔ [6]

مذکورہ روایت میں اس آیت کی شان نزول یہود کا سوال بیان ہوا ہے اور یہی راجح ہے، کیونکہ صحیح بخاری کا مقام جامع ترمذی کے مقابلے میں بلند وبالا ہے، لیکن اصحاب ''تدبر'' کے ہاں قرآن فہمی کے لیے احادیث کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ان کے نزدیک احادیث وحی الٰہی ہی ہیں، بالخصوص صحیح بخاری کی احادیث کے ساتھ مذاق واستخفاف ان کا محبوب مشغلہ ہے، چنانچہ ان حضرات نے ''تدبر حدیث'' کی آڑ میں پہلے تو شان نزول کی اہمیت کو کم کیا، پھر سورۂ بنی اسرائیل کے مکی یا مدنی ہونے کا شاخسانہ کھڑا کیا، بعدازیں امام اعمش کی قراءت کا مذاق اڑایا، آخر میں اس روایت پر بے سروپا ہونے کی پھبتی کسی اور بایں الفاظ اس حدیث کے متعلق زہر اگلا ''البتہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسی بے سروپا روایت بخاری نے اپنی صحیح میں کیوں لے لی۔'' [7]

(٤٨) بَابُ مَنْ تَرَكَ بَعْضَ الْاِخْتِيَارِ مَخَافَةَ أَنْ يَّقْصُرَ فَهْمُ بَعْضِ النَّاسِ عَنْهُ فَيَقَعُوا فِي أَشَدَّ مِنْهُ

باب:48- اندیشۂ کوتاہ فہمی کے پیش نظر کچھ پسندیدہ چیزیں ترک کر دینا تاکہ لوگ کسی سنگین غلطی میں مبتلا نہ ہو جائیں

1 الشعرآء26:193. 2 الشورٰی42:52. 3 تحریم66:12. 4 صحیح البخاري، التفسیر، حدیث:4721، و التوحید، حدیث: 7456. 5 الإتقان:2/75،77. 6 مباحث في علوم القرآن، ص:90-91. 7 تدبر حدیث:1/225.

وضاحت: اگر کسی کے مختار مسلک کی اشاعت سے عوام الناس میں ہیجان پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو اس سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ علماء کے متعلق لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو۔

١٢٦ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسٰى عَنْ إِسْرَائِيلَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْأَسْوَدِ قَالَ: قَالَ لِي ابْنُ الزُّبَيْرِ: كَانَتْ عَائِشَةُ تُسِرُّ إِلَيْكَ كَثِيرًا! فَمَا حَدَّثَتْكَ فِي الْكَعْبَةِ؟ فَقُلْتُ: قَالَتْ لِي: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «يَا عَائِشَةُ! لَوْلَا قَوْمُكِ حَدِيثٌ عَهْدُهُمْ - قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ: بِكُفْرٍ - لَنَقَضْتُ الْكَعْبَةَ فَجَعَلْتُ لَهَا بَابَيْنِ: بَابًا يَدْخُلُ النَّاسُ وَبَابًا يَخْرُجُونَ» فَفَعَلَهُ ابْنُ الزُّبَيْرِ. [انظر: ١٥٨٣، ١٥٨٤، ١٥٨٥، ١٥٨٦، ٣٣٦٨، ٤٤٨٤، ٧٢٤٣]

[126] حضرت اسود سے روایت ہے، انھوں نے کہا: مجھ سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تجھ سے بہت راز کی باتیں فرمایا کرتی تھیں تو کعبے کے متعلق انھوں نے تجھ سے کیا حدیث بیان کی ہے؟ میں نے کہا: مجھ سے انھوں نے یہ کہا تھا: نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! اگر تیری قوم کے لوگوں کا زمانہ قریب نہ ہوتا...... ابن زبیر نے کہا: یعنی کفر (جاہلیت) کے قریب نہ ہوتا (نئے نئے اسلام میں داخل نہ ہوئے ہوتے)...... تو میں کعبے کی اس تعمیر کو منہدم کر دیتا اور اس کے دو دروازے بنا دیتا: ایک سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے دروازے سے نکل جاتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے (اپنے دور حکومت میں) ایسا ہی کر دیا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود علمائے کرام کو تنبیہ فرمانا ہے کہ ان حضرات کو عوام کے سامنے ہر اس جائز عمل سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہو، ممکن ہے کہ جس عمل کو جائز اور مستحب خیال کر کے کیا جا رہا ہو، وہ مصلحت عامہ کے خلاف ہو اور اس عمل کے اختیار کرنے میں بجائے فائدے کے نقصان ہو، وہ علماء سے متنفر ہو جائیں اور ان کے قریب آنے کے بجائے ان سے دور ہو جائیں، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے ان کی ذہن سازی کی جائے، مثلاً: جوتے سمیت نماز پڑھنا سنت ہے لیکن اگر کسی جگہ لوگ جاہل ہوں اور ایسا کام کرنے سے اختلاف اور فساد کا اندیشہ ہو تو ایسی سنت پر عمل کرنے کو آئندہ کے لیے مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حکیمانہ انداز سے انھیں اس کی اہمیت بتاتے رہنا ایک داعی کا اہم فریضہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دین کے ضروری کام عوام کے ردعمل کے ڈر سے مؤخر کیے جا سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقعے پر بت شکنی کے عمل کو کسی ردعمل کے ڈر سے مؤخر نہیں کیا، یعنی ہر بات اور ہر کام کے کرنے کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے لیکن یہ کلیہ فرائض و واجبات کے لیے نہیں، انھیں بروقت ہی بجالانا ضروری ہے۔ ② واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو تعمیر کیا تھا، اس کی سطح زمین کے برابر تھی اور اس کے دو دروازے تھے: ایک سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے تھے تاکہ بھیڑ نہ ہو۔ لیکن جب قریش نے اس کی از سر نو تعمیر کی تو اپنے امتیازات اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے دو تصرف کیے: * اسے سطح زمین سے کافی اونچا کر دیا تاکہ سیڑھی کے بغیر کوئی اندر داخل نہ ہو سکے، اس کے لیے ان کا محتاج رہے۔ * اس کا دروازہ ایک کر دیا اور

اس پر بھی اپنا آدمی بٹھا دیا تاکہ کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر اندر نہ جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ اسے بنائے ابراہیمی کے مطابق کر دیا جائے، لیکن اندیشہ تھا کہ قریش کے نومسلم حضرات اسے کہیں اپنے وقار کا مسئلہ نہ بنا لیں اور آپ پر ناموری و تفاخر کا شبہ کریں کہ آپ نے قریش کے مشترکہ حق کو اپنی ذات کے لیے خاص کر لیا ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کی اس خواہش کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے دور حکومت میں بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مطابق کر دیا لیکن حجاج بن یوسف نے دوبارہ پھر اسی قریشی نقشے کے مطابق کر دیا۔ ③ تاریخی اعتبار سے بیت اللہ کی تعمیر سات مرتبہ ہوئی ہے: سب سے پہلے فرشتوں نے اسے تعمیر کیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ فضیلت حاصل کی۔ اس کے بعد عمالقہ، پھر جرہم، پھر قریش نے تعمیر کیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کشف ستر (جسم سے چادر کے اتر جانے) کا واقعہ پیش آیا جس پر آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ شرف حاصل کیا۔ آخر میں حجاج بن یوسف نے اسے قریش کی تعمیر کے مطابق کر دیا۔ اب بیت اللہ اسی آخری تعمیر پر قائم ہے۔[1] ④ صحیح مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے جب بیت اللہ کو دوبارہ تعمیر کیا تو اخراجات کے لیے وافر رقم مہیا نہ ہو سکی، اس بنا پر انھوں نے حطیم کا حصہ کھلا چھوڑ دیا، باقی حصے پر چھت ڈال دی۔ رسول اللہ ﷺ بھی چاہتے تھے کہ پانچ چھ ہاتھ حطیم کے حصے پر بھی چھت ڈال دی جائے لیکن آپ کے پاس ان اخراجات کے لیے رقم نہ تھی اور نئے نئے مسلمانوں کے جذبات کا بھی خیال تھا۔ اس بنا پر آپ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ بیت اللہ کی تعمیر کا مسئلہ نہ چھیڑا جائے۔[2]

(٤٩) بَابُ مَنْ خَصَّ بِالْعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ كَرَاهِيَةَ أَنْ لَّا يَفْهَمُوا

باب:49- علمی باتیں کچھ لوگوں کو بتلانا اور کچھ کو نہ بتلانا، اس اندیشے سے کہ وہ نہ سمجھ پائیں گے

وَقَالَ عَلِيٌّ: حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللهُ وَرَسُولُهُ؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کے سامنے ایسی باتیں بیان کرو جنھیں وہ پہچانتے ہیں، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے؟

١٢٧ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسَى عَنْ مَعْرُوفِ ابْنِ خَرَّبُوذَ، عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ، عَنْ عَلِيٍّ بِذٰلِكَ.

[127] حضرت ابوطفیل سے روایت ہے، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی ارشاد بیان کرتے ہیں۔

١٢٨ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ قَتَادَةَ

[128] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دفعہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ

[1] عمدة القاري: 2/288. [2] صحيح مسلم، الحج، حديث: 3245(1333).

قَالَ: حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ - وَمُعَاذٌ رَدِيفُهُ عَلَى الرَّحْلِ - قَالَ: «يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ!»، قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ، قَالَ: «يَا مُعَاذُ!»، قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ، ثَلَاثًا، قَالَ: «مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ، صِدْقًا مِّنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ». قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَفَلَا أُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوا؟ قَالَ: «إِذًا يَتَّكِلُوا» وَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّمًا. [انظر: ١٢٩]

سواری پر پیچھے بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا: ''اے معاذ بن جبل!'' انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سعادت مندی کے ساتھ حاضر ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''اے معاذ!'' انھوں نے پھر عرض کیا: یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ پھر آپ نے فرمایا: ''جو کوئی سچے دل سے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے۔'' حضرت معاذ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں لوگوں میں اس کی تشہیر نہ کروں تاکہ وہ خوش ہو جائیں؟ آپ نے فرمایا: ''ایسا کرے گا تو انھیں اسی پر بھروسا ہو جائے گا۔'' پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے (اپنی وفات کے قریب، کتمان علم کے) گناہ سے بچنے کے لیے یہ حدیث لوگوں کو بیان کی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم وتبلیغ کے وقت حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ سامعین کی ذہنی سطح کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔ ہر بات مجمع عام میں بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کچھ حضرات سمجھ سکتے ہیں جبکہ وہی باتیں دوسروں کی ذہنی سطح سے اونچی ہوتی ہیں، ایسا کرنے سے دو نقصان ہوتے ہیں: * علم کا ضیاع * اندیشۂ انکار وتکذیب۔ جہلاء کی عادت ہے کہ جس بات کو وہ نہیں سمجھتے، اس کا انکار کر دیتے ہیں اور بات کہنے والے کو جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ قائل کی تکذیب گویا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب ہے۔ اس طرح انسان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہی مطلب ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ جب بھی تم کسی قوم کے سامنے کوئی ایسی بات کرو گے جوان کی عقل سے بالاتر ہوگی تو وہ بعض کے لیے فتنے کا باعث بن جائے گی۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے طریقۂ تالیف کے خلاف پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول پیش کیا، اس کے بعد سند کا حوالہ دیا ہے۔ شراح بخاری نے اس کی کئی ایک توجیہات بیان کی ہیں: * امام بخاری کا یہ تفنن ہے۔ * سند بعد میں دستیاب ہوئی۔ * حدیث رسول اور اثر صحابہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ایسا کیا ہے، یعنی حدیث رسول کے لیے سند پہلے اور متن بعد میں اور آثار صحابہ کے لیے اسناد بعد میں لاتے ہیں لیکن اس قانون کا اہتمام ہر جگہ نہیں کیا بلکہ بعض مقامات پر ایسا کرتے ہیں۔[2] پہلا اور دوسرا جواب زیادہ قرین قیاس ہے۔ واللہ أعلم۔ ③ حدیث میں ہے کہ جو شخص بھی توحید و رسالت کی اس طرح شہادت دے کہ زبان کے ساتھ دل بھی مخلصانہ طور پر

1 صحيح مسلم، المقدمة: (14). 2 عمدة القاري: 290/2.

اس کا معترف ہو تو اللہ تعالیٰ اسے آگ پر حرام کر دے گا۔ اس پر اشکال ہے کہ بے شمار روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فساق مومنین آگ میں جائیں گے، تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اس اشکال کے درج ذیل جوابات ہیں: * یہ بشارت ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے ایمان کی شہادت کے ساتھ اعمال صالحہ بھی کیے ہوں، چنانچہ ترمذی میں اقرار شہادتین کے ساتھ نماز، روزہ اور حج کا بھی ذکر ہے۔ * یہ بشارت ان حضرات کے لیے ہے جنھوں نے آخری وقت شہادتین کا اقرار کیا، پھر موت آگئی۔ ایسی صورت میں برے اعمال توبہ سے معاف ہو گئے، پھر ان کو موقع ہی نہیں ملا کہ موت نے آلیا۔ * اس سے مخصوص آگ مراد ہے، یعنی وہ آگ جو عذاب کفار کے لیے تیار کی گئی ہے اور جس میں گرنے کے بعد دوبارہ نکلنے کا موقع نہیں ملے گا، ایسے شخص کا جنت میں داخلہ ناممکن ہے۔ رہی وہ آگ جو اہل ایمان کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کے لیے ہے تاکہ انھیں دخول جنت کے قابل بنایا جائے، وہ الگ آگ ہے۔ حدیث میں مذکور آگ سے مراد کفار کے لیے تیار کی گئی آگ ہے۔ * اس تحریم سے مراد تحریم مؤبد ہے، یعنی ایسا شخص ہمیشہ آگ میں نہیں رہے گا، کچھ دنوں کے لیے جا سکتا ہے۔ * حدیث میں کلمۂ شہادت کی ایک تاثیر بیان ہوئی ہے لیکن اس تاثیر کے لیے کچھ شرائط اور موانع ہیں، اگر شرائط پائی گئیں اور رکاوٹیں حائل نہ ہوئیں تو کلمۂ شہادت لازمی طور پر اپنی تاثیر دکھائے گا، اس کے برعکس اگر شرائط کا لحاظ نہ رکھا یا رکاوٹیں حائل ہو گئیں تو کلمۂ شہادت کا یہ اثر کمزور یا ختم ہو سکتا ہے۔ (4) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے احکام امتناعی کی دو قسمیں ہیں: ○ نہی تحریم ○ نہی تنزیہ۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اس نہی کو نہی تنزیہ پر محمول کیا، اگر نہی تحریم ہوتی تو حضرت معاذ اس کی بالکل خبر نہ دیتے۔ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مجھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اس تأثر کی خبر ایسے شخص نے دی جو ان کی موت کے وقت وہاں موجود تھا۔[1] چلتے چلتے صاحبان ''تدبر'' کی بھی سنتے جائیں، فرماتے ہیں: باقی رہ گئی یہ بات کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے یہ بات اپنی موت کے قریب کتمان علم کے گناہ سے بچنے کے لیے بتائی تو یہ راوی کا اپنا تأثر ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے حکم کے مطابق اس کا عام چرچا نہ کیا لیکن اہل علم میں وہ اس کو بیان کرتے رہے ہوں گے۔ اتنی بڑی بات آخر معاذ بن جبل کیسے راز رکھ سکتے تھے۔[2] یعنی اصلاحی صاحب ہر جگہ اپنے قیاس و تأثر کی دخل اندازی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ إن هذا إلّا لشيءٌ عجاب.

١٢٩ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا قَالَ: ذُكِرَ لِي أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لِمُعَاذٍ: «مَنْ لَقِيَ اللهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ»، فَقَالَ: أَلَا أُبَشِّرُ النَّاسَ؟ قَالَ: «لَا، [إِنِّي] أَخَافُ أَنْ يَتَّكِلُوا».
[راجع: ١٢٨]

[129] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے کہا: مجھ سے بیان کیا گیا کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جو شخص اللہ سے بایں حالت ملے گا کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ہوگا تو وہ یقیناً جنت میں داخل ہوگا۔'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بولے: یارسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ

[1] فتح الباري:1/300. [2] تدبر حديث:1/229.

سنا دوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہ، مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس پر بھروسا کر بیٹھیں گے۔''

فوائد و مسائل: ① حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس شخص کا نام نہیں بتایا جس نے آپ کو اس واقعے کی خبر دی۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت میں بھی اس شخص کے نام کی صراحت نہیں ہے کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو وفات کے وقت بیان کیا جبکہ آپ شام میں تھے۔ حضرت انس اور حضرت جابر دونوں مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ یہ دونوں حضرات وفات کے وقت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس نہ تھے۔ حضرت عمرو بن میمون یا عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے انھیں خبر دی ہوگی کیونکہ اول الذکر وفات کے وقت وہاں موجود تھے اور ثانی الذکر بھی اس روایت کو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔[1] حضرت عمرو بن میمون بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں۔[2] ② اس حدیث میں صرف توحید کا ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو شاید راوی نے حذف کر دیا ہے۔ مرجیہ اس روایت کو اپنے موقف کے اثبات کے لیے پیش کرتے ہیں کہ ایمان کے بعد کسی قول و فعل کی ضرورت نہیں، حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آخری وقت صدق دل سے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہے گا، وہ ضرور جنت میں جائے گا اور جہنم اس پر حرام ہوگی۔ مشہور حدیث بطاقہ کا بھی یہی محمل ہے۔ یا اس کا وہ مطلب ہے جو وہب بن منبہ نے بیان فرمایا ہے کہ کلمۂ توحید لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ جنت کی چابی ہے لیکن چابی کے دندانے ہوتے ہیں جن کے ذریعے سے تالا کھولا جاتا ہے۔ دندانوں کے بغیر تالا نہیں کھولا جا سکتا۔ کلمۂ توحید کے لیے اعمال صالحہ دندانے ہیں۔[3] بشارت دینے کا معاملہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، انھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا تھا۔[4]

(٥٠) بَابُ الْحَيَاءِ فِي الْعِلْمِ

باب: 50- علم کے لیے شرم سے کام لینا (درست نہیں)

وَقَالَ مُجَاهِدٌ: لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَّلَا مُسْتَكْبِرٌ. وَقَالَتْ عَائِشَةُ: نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْأَنْصَارِ لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَّتَفَقَّهْنَ فِي الدِّينِ.

حضرت مجاہد کہتے ہیں: حیا کرنے والا اور تکبر کرنے والا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: انصار کی عورتیں کیا خوب ہیں، انھیں دین میں سمجھ حاصل کرنے میں شرم دامن گیر نہیں ہوتی۔

١٣٠ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ

[130] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ام سلیم رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ!

① فتح الباري: 300/1. ② صحيح البخاري، الجهاد، حديث: 2856. ③ صحيح البخاري، الجنائز، باب: 1. ④ صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 147.

زَيْنَبَ ابْنَةِ أُمِّ سَلَمَةَ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: جَاءَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ» فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ - تَعْنِي وَجْهَهَا - وَقَالَتْ: يَارَسُولَ اللهِ! وَتَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ؟ قَالَ: «نَعَمْ، تَرِبَتْ يَمِينُكِ، فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا؟». [انظر: ٢٨٢، ٣٣٢٨، ٦٠٩١، ٦١٢١]

تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا، کیا عورت کو احتلام ہو تو اسے غسل کرنا چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں جبکہ (اپنے کپڑے پر) پانی دیکھے۔'' ام سلمہ ؓ نے (شرم سے) اپنا منہ چھپا لیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں تیرا ہاتھ خاک آلود ہو، پھر بچے کی صورت ماں سے کیوں کر ملتی ہے؟''

فوائد و مسائل: ① اخلاقیات کے باب میں حیا ایک قابل تعریف وصف ہے۔ احادیث میں اسے ایمان کا شعبہ قرار دیا گیا ہے، نیز یہ کل خیر و برکت ہے۔[1] اس کے نتائج بھی اچھے ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات انسان اچھی چیز کا استعمال غلط کرتا ہے اور استعمال کی غلطی برے نتائج پیدا کر دیتی ہے، مثلاً: حیا کو بہانہ بنا کر بعض اوقات علم سے محروم رہتا ہے، اس لیے حیا کا دامن تھامتے ہوئے سوال کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بے حیا بن کر سوال نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجاہد ؒ کا اثر ابونعیم نے الحلیۃ (328/3) میں موصولاً ذکر کیا اور اس کا مطلب ہے کہ حیا کو بطور بہانہ استعمال کرنے والا علم سے محروم رہتا ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کے ارشاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیا اور طلب علم دونوں برقرار رہنے چاہئیں۔ انصار کی عورتیں اسی طرز عمل کو اپنائے ہوئے تھیں، یعنی حیا کا دامن بھی برقرار اور علم کا حصول بھی اپنی جگہ۔ سیدہ عائشہ ؓ کی یہ حدیث صحیح مسلم وغیرہ میں موصولاً مروی ہے۔[2] امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ حیا، طالب علم کے لیے محرومیٔ علم کا سبب نہیں بنی چاہیے، نیز شرم پر مبنی مسائل دریافت کرنے میں حیاداری کو برقرار رکھنا چاہیے۔ گویا حیا بھی باقی رہے اور مقصد بر آری بھی ہو جائے۔ ② حضرت ام سلمہ ؓ کے اندر حضرت ام سلیم ؓ سے زیادہ حیا تھی کہ انھوں نے مارے شرم کے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ جب عورت کو یہ حالت پیش آ جائے تو یہ تقویٰ اور دینداری کے خلاف تو نہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے بھی مکمل حیاداری کو برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا کہ عورت اور مرد کے اندر اللہ تعالیٰ نے جوہر رکھا ہے، اس کے اشتراک سے اولاد ہوتی ہے اور اولاد ماں پر یا باپ پر یا دونوں پر جاتی ہے۔ بے شمار بچے ایسے ہوتے ہیں جو رنگ ماں کا رکھتے ہیں لیکن حلیہ باپ کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے جواب سے معلوم ہوا کہ احتلام ہونا ایک فطری حالت ہے، تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے۔

١٣١ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ:

[131] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''درختوں میں ایک درخت ایسا

1 صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 157(37). 2 صحيح مسلم، الحيض، حديث: 748(332).

أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَّا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُونِي مَا هِيَ؟» فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَادِيَةِ، وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ، قَالَ عَبْدُ اللهِ: فَاسْتَحْيَيْتُ، فَقَالُوا: يَارَسُولَ اللهِ! أَخْبِرْنَا بِهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «هِيَ النَّخْلَةُ» قَالَ عَبْدُ اللهِ: فَحَدَّثْتُ أَبِي بِمَا وَقَعَ فِي نَفْسِي فَقَالَ: لَأَنْ تَكُونَ قُلْتَهَا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَّكُونَ لِي كَذَا وَكَذَا. [راجع: ٦١]

ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے۔ اس کی شان مسلمان کی طرح ہے۔ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟'' یہ سن کر لوگوں کے خیالات جنگل کے درختوں کی طرف گئے، لیکن میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں: (لیکن) مجھے شرم دامن گیر ہوگئی۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ ہی بتائیں وہ کون سا درخت ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ کھجور کا درخت ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے اپنے والد گرامی (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) سے وہ بات بیان کی جو میرے دل میں آئی تھی تو انھوں نے کہا: کاش! تم نے یہ بات کہہ دی ہوتی تو یہ میرے لیے بڑی دولت ہوتی۔

فائدہ: امام بخاری رحمہ اللہ نے حیا کے متعلق جو عنوان قائم کیا ہے، وہ مجمل ہے۔ اس سلسلے میں کوئی صریح حکم بیان نہیں کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں: اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ سائل کو علمی مسائل دریافت کرنے کے لیے حیاداری کو قائم رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں جرأت و دلیری اور بے باکی مستحسن اقدام نہیں ہے۔ حضرات انصار کی خواتین، حضرت ام سلیم اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مکمل شرم وحیا کے ساتھ سوالات کر کے تفقہ فی الدین حاصل کیا۔ دوسرا منفی پہلو یہ ہے کہ صفت حیا جو سراسر محمود ہے، اسے غلط استعمال کر کے علم سے محرومی کا سامان نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت مجاہد کے ارشاد کا یہی مطلب ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ طلب علم کے سلسلے میں حیا کو مستحسن قرار نہیں دیتے اور مذکورہ حدیث سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اظہار افسوس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اگر اکابر کی موجودگی کو اپنے بیان کے لیے رکاوٹ خیال کرتے تھے تو وہ کسی دوسرے کو بتا دیتے تاکہ وہ ان کی طرف سے ترجمانی کر دیتا۔ آئندہ باب قائم کر کے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔[1] لیکن حافظ ابن حجر کی وضاحت پر دل مطمئن نہیں ہے کیونکہ امام بخاری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حیا کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے حصول علم کے لیے سوال کرنے میں حیا کا استعمال نہیں کیا بلکہ جواب دینے میں حیاداری سے کام لیا ہے، اس لیے کہ بزرگوں کا احترام بھی ہمارے اسلامی آداب کا ایک اہم حصہ ہے۔ جہاں تک علمی بات معلوم کرنے کا تعلق ہے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یقینی طور پر جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ خود اس پہیلی کا جواب دیں گے۔ باقی رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اظہار افسوس، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھوں نے ان کی خاموشی کو برا محسوس کیا ہو۔ بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خاموشی غیر مستحسن نہیں ہے۔ واللہ أعلم.

[1] فتح الباري:303/1.

(٥١) بَابُ مَنِ اسْتَحْيَا فَأَمَرَ غَيْرَهُ بِالسُّؤَالِ

باب: 51- شرم کی وجہ سے دوسروں کے ذریعے سے مسئلہ دریافت کرنا

وضاحت: اگر کوئی پوچھنے کی بات ہو اور آدمی خود شرم کی وجہ سے دریافت کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو کسی دوسرے کی معرفت تحقیق کر کے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

١٣٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ دَاوُدَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُنْذِرٍ الثَّوْرِيِّ، عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً، فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ فَسَأَلَهُ فَقَالَ: «فِيهِ الْوُضُوءُ». [انظر: ١٧٨، ٢٦٩]

[132] حضرت علی ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میری مذی بہت نکلا کرتی تھی۔ میں نے حضرت مقداد ؓ سے کہا کہ وہ نبی ﷺ سے اس کا حکم پوچھیں، چنانچہ انھوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ”مذی کے لیے وضو کرنا چاہیے۔“

فوائد و مسائل: ① دوسری روایت میں ہے کہ حضرت علی ؓ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے یہ مسئلہ دریافت نہ کر سکے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ ؓ آپ کے نکاح میں تھیں۔[1] اس خاص رشتے داری کی وجہ سے خود پوچھنا مناسب خیال نہ کیا۔ اس طرح کی شرم میں کوئی قباحت نہیں جبکہ کسی دوسرے کے ذریعے سے مسئلہ دریافت کر لیا جائے، چنانچہ آپ نے پہلے حضرت عمار کو کہا، پھر مقداد کو حکم دیا کہ وہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کریں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت علی ؓ کی موجودگی میں یہ مسئلہ دریافت کیا۔[2] ② بیوی کے ساتھ بوس و کنار کی صورت میں عضو مخصوص سے رطوبت خارج ہوتی ہے، اسے مذی کہا جاتا ہے۔ یہ پیشاب کی طرح ناقض وضو ہے۔ اس کے خارج ہونے سے غسل ضروری نہیں بلکہ صرف وضو ہی کافی ہے۔ اس حدیث سے متعلق دیگر احکام و مسائل کتاب الوضوء اور کتاب الغسل میں بیان ہوں گے۔

(٥٢) بَابُ ذِكْرِ الْعِلْمِ وَالْفُتْيَا فِي الْمَسْجِدِ

باب: 52- مسجد میں علم کی باتیں کرنا اور فتویٰ دینا

١٣٣ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ بْنُ

[133] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے، ایک

1. صحیح البخاري، الغسل، حدیث:269. 2. فتح الباري:1/493.

سَعْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعٌ مَّوْلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَجُلًا قَامَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! مِنْ أَيْنَ تَأْمُرُنَا أَنْ نُّهِلَّ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يُهِلُّ أَهْلُ الْمَدِينَةِ مِنْ ذِي الْحُلَيْفَةِ، وَيُهِلُّ أَهْلُ الشَّامِ مِنَ الْجُحْفَةِ، وَيُهِلُّ أَهْلُ نَجْدٍ مِّنْ قَرْنٍ» وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: وَيَزْعُمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «وَيُهِلُّ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ يَلَمْلَمَ»، وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ: لَمْ أَفْقَهْ هٰذِهِ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ. [انظر: ١٥٢٢، ١٥٢٥، ١٥٢٧، ١٥٢٨]

شخص مسجد میں کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! آپ ہمیں کس مقام سے احرام باندھنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اہل مدینہ ذوالحلیفہ سے، شام کے لوگ جحفہ سے اور نجد کے باشندے قرن سے احرام باندھیں۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: لوگ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''یمن والے یلملم سے احرام باندھیں۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: میں رسول اللہ ﷺ سے یہ (آخری) بات اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی اہمیت و مقصدیت کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''مساجد بول و براز یا گندگی پھیلانے کے لیے نہیں، بلکہ ان کی تعمیر کا ایک خاص مقصد ہے۔ بے شک وہ مقصد اللہ کا ذکر، نماز اور تلاوت قرآن ہے۔''[1] رسول اللہ ﷺ نے مساجد کے اغراض و مقاصد کو کلمۂ حصر إِنَّمَا سے بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں یہی کام ہو سکتے ہیں، ان کے علاوہ دوسرے کسی شغل کی حیثیت مشتبہ ہو جاتی ہے، خواہ وہ تعلیم و افتا ہی سے متعلق ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان سے ثابت کیا ہے کہ مذکورہ حصر حقیقی نہیں بلکہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد میں علمی باتیں اور فتاویٰ وغیرہ کا شغل بھی درست ہے، بلکہ مقدمات کا فیصلہ کرنا اور دینی مباحثہ کرنا بھی جائز ہے، ہاں مساجد میں دنیوی باتیں کرنا اور انھیں بازار کی حیثیت دینا کسی طرح بھی درست نہیں۔ یہ تھا امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد! اب ''امام تدبر'' کی بھی سنیے جو امام بخاری کی مخالفت کے لیے ادھار کھائے بیٹھے ہیں: ''امام صاحب ہر چیز کو نکتہ بنانے کے عادی ہیں ورنہ کس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم دین اور فتویٰ کے لیے مسجد موزوں مقام ہے یا نہیں؟ مسجد ہی تو مسلمانوں کے دین کا مرکز ہے...... مناسک حج کے سلسلہ کی یہ ایک اہم روایت ہے لیکن امام صاحب نے اس سے بس یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علمی سوال مسجد میں بھی ہو سکتا ہے۔''[2] امام تدبر تو اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں، ہم ان کے تیار کردہ تلامذہ سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے مسجد میں علمی سوال کا جواز ہی ثابت نہیں کیا بلکہ کتاب الحج میں اس پر مزید تین عنوان قائم کیے ہیں: ○ حج اور عمرہ کے لیے میقات کا تعین[3] ○ اہل مدینہ کا میقات[4] ○ اہل نجد کے لیے جائے احرام۔[5] اس حدیث پر تفصیلی بحث کتاب الحج میں آئے گی۔

---

[1] صحیح مسلم، المساجد، حدیث:1505(661). [2] تدبر حدیث:234,233/1. [3] صحیح البخاري، الحج، حدیث:1522.
[4] صحیح البخاري، الحج، حدیث:1525. [5] صحیح البخاري، الحج، حدیث:1528.

(٥٣) بَابُ مَنْ أَجَابَ السَّائِلَ بِأَكْثَرَ مِمَّا سَأَلَهُ

باب:53- سوال سے زیادہ جواب دینے کا بیان

١٣٤ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ عَنْ نَّافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. وَابْنُ أَبِي ذِئْبٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ: مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ؟ فَقَالَ: «لَا يَلْبَسُ الْقَمِيصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَلَا السَّرَاوِيلَ وَلَا الْبُرْنُسَ وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ الْوَرْسُ أَوِ الزَّعْفَرَانُ، فَإِنْ لَّمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَا تَحْتَ الْكَعْبَيْنِ».

[انظر: ٣٦٦، ١٥٤٢، ١٨٣٨، ١٨٤٢، ٥٧٩٤، ٥٨٠٣، ٥٨٠٥، ٥٨٠٦، ٥٨٤٧، ٥٨٥٢]

[134] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے، نبی ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا: جو شخص احرام باندھے وہ کیا پہنے؟ آپ نے فرمایا: ''نہ کرتا، نہ پگڑی، نہ پاجامہ، نہ ٹوپی اور نہ وہ کپڑا جس میں ورس یا زعفران لگی ہو۔ اور اگر جوتی نہ ہو تو موزے پہن لے اور انھیں اوپر سے کاٹ لے تاکہ وہ ٹخنوں سے نیچے ہو جائیں۔''

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر، ابن المنیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے جو عنوان قائم کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ جواب کا، سوال کے حرف بحرف مطابق ہونا ضروری نہیں بلکہ اگر سوال میں کسی خاص سبب کا ذکر ہے تو جواب میں بیان کیے گئے حکم کا عام ہونا جائز ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی سائل مفتی سے کسی مخصوص واقعے کے متعلق سوال کرے اور مفتی کو اندیشہ ہو کہ سائل اس جواب سے کوئی غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے تو جواب میں اختصار کا طریقہ اختیار نہ کرے بلکہ ایسی تفصیل پیش کرے جس میں دوسرے معنی کا سد باب ہو جائے، جیسا کہ حدیث میں جوتا نہ ملنے کی صورت میں موزے پہننے کا حکم ہے۔ سائل نے آپ سے اختیاری حالت کا سوال کیا تھا آپ نے اضطراری حالت کا حکم بھی بتا دیا۔ حالت سفر کے لحاظ سے یہ اضطراری حکم کوئی اجنبی چیز نہیں، کیونکہ سفر کی حالت میں ایسی مشکلات پیش آ سکتی ہیں، نیز ارباب اصول اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ جواب کا سوال کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس مطابقت سے یہ مراد نہیں کہ جواب کے ساتھ کسی مفید امر کا اضافہ نہ ہو۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جواب میں سوال کا پورا پورا حل ہونا چاہیے۔[1] ② سوال یہ تھا کہ محرم کے لیے مباح ملبوسات کیا ہیں؟ لیکن جواب میں ان ملبوسات کا ذکر ہے جو محرم کے لیے ناجائز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممنوع ملبوسات محدود ہیں جبکہ مباح ملبوسات کی فہرست بہت طویل ہے۔ اگر انھیں بیان کیا جاتا تو جواب بھی طویل ہو جاتا۔ اس کے ساتھ یہ شبہ بھی پیدا ہو سکتا

1 فتح الباري:304/1.

تھا کہ شاید یہ ملبوسات صرف محرم پہن سکتا ہے، غیر محرم کے لیے ان ملبوسات کا استعمال ناجائز ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے جواب میں وہ طریقہ اختیار فرمایا جو آسان تھا اور اس میں کسی قسم کے اشتباہ کا اندیشہ نہیں تھا۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ سوال سے زیادہ جواب دیا جاسکتا ہے جبکہ اس کی ضرورت ہو۔ سائل نے اپنے سوال میں اختیاری حالت کا ذکر کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے جواب میں اختیاری حالت کے ساتھ ساتھ اضطراری حالت کا بھی ذکر کر دیا کہ دوران سفر میں جوتے نہ مل سکیں تو ننگے پاؤں چلنے کے بجائے موزے پہن لیے جائیں۔ اس میں سائل کو تنبیہ بھی ہے کہ تمھیں ان پابندیوں کے متعلق سوال کرنا چاہیے تھا جو احرام کی وجہ سے محرم پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ کے جواب کا خلاصہ یہ ہے: ○ سلا ہوا کپڑا استعمال نہ کیا جائے۔ ○ اپنے سر کو کھلا رکھا جائے۔ ○ خوشبو استعمال نہ کی جائے۔ اس حکم میں مرد و عورتیں تمام شامل ہیں۔ ○ پاؤں میں کھلا جوتا پہنا جائے۔ دیگر مسائل و احکام کتاب الحج میں بیان کیے جائیں گے۔ ③ حدیث میں مطلق طور پر رنگین کپڑوں کی ممانعت نہیں ہے جیسا کہ ''امام تدبر'' نے سمجھا ہے بلکہ صرف ورس اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑوں کی ممانعت ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں خوشبودار ہیں۔ اگر انھیں اچھی طرح دھو کر خوشبو کے اثرات زائل کر دیے جائیں تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ آخر میں ''امام تدبر'' نے امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض جڑ دیا ہے کہ ''امام صاحب کی رائے میں نبی ﷺ نے یہ جواب سائل کے سوال کی ضرورت سے زائد دیا ہے، حالانکہ یہ بات درست نہیں۔''[2] یہ اعتراض بھی اصلاحی صاحب کا خود ان کی اپنی نافہمی یا پندارِ علم کا نتیجہ ہے ورنہ امام بخاری کی زیر نظر حدیث پر تبویب روز روشن کی طرح واضح ہے۔

ع دیدۂ کور کو کیا آئے نظر، کیا دیکھے؟

[1] فتح الباري:304/1. [2] تدبر حديث:234/1.

وضو کے احکام وآداب اور فضیلت واہمیت

ہر مکلّف پر سب سے پہلے ایمان کی پابندی عائد ہوتی ہے، پھر وہ چیزیں جو ایمان کے لیے مطلوب ہیں اور جن پر عمل پیرا ہونے سے ایمان میں کمال پیدا ہوتا ہے۔ان کا حصول، علم کے بغیر ممکن نہیں۔ ایمان کے بعد اعمال کی ضرورت ہے کیونکہ اعمال ہی ایمان کے لیے سیڑھی کا کام دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ ''صاف ستھرے کلمات اللہ کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل انھیں بلند کرتے ہیں۔''[1] اعمال میں سب سے افضل عمل، نماز ہے کیونکہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ارکان اسلام میں سے نماز کی ادائیگی کے متعلق قرآن مجید نے بہت زور دیا ہے۔نماز کی قبولیت طہارت پر موقوف ہے اور طہارت نماز کے لیے شرط ہے اور شرط ہمیشہ مشروط پر مقدم ہوتی ہے، اس لیے عبادات سے پہلے کتاب الوضو کو بیان کیا گیا ہے۔

لفظ وضو، وضاءۃ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی خوبصورتی اور چمک ہیں۔شرعی اصطلاح میں ایک خاص طریقے سے مخصوص اعضاء کو دھونا وضو کہلاتا ہے۔لغوی معنی سے اس کی مطابقت یہ ہے کہ وضو کرنے والا ابھی پانی کے استعمال کرنے سے صاف ستھرا اور خوبصورت ہو جاتا ہے، نیز قیامت کے دن اعضائے وضو خوبصورت ہوں گے اور ان پر چمک ہوگی۔لفظ وضو کی واؤ پر اگر پیش پڑھی جائے تو معنی اصطلاحی وضو، ہوتے ہیں۔ واؤ فتحہ کے ساتھ ہو تو وہ پانی مراد ہوتا ہے جو اس عمل کا ذریعہ ہے۔اور واؤ کو کسرے کے ساتھ پڑھنے سے وہ برتن مراد ہوتا ہے جس میں وضو کے لیے پانی ڈالا جاتا ہے۔

وَضو، در وِضو، وُضو تازہ دار

''وضو کا پانی، وضو کے برتن میں، وضو تازہ کرو''

عبادتِ نماز کے لیے وضو کا عمل، ان خصوصیات اسلام میں سے ہے جن کی نظیر دیگر مذاہب عالم میں نہیں ملتی، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بڑے عنوان کے تحت وضو سے متعلق چھوٹے چھوٹے 75 ذیلی عنوان قائم کیے ہیں جن میں اس

---

[1] فاطر 10:35.

کا وجوب، علت وجوب، اہمیت و افادیت، فضیلت و خصوصیت، شرائط و واجبات، صفات و مقدمات اور احکام و آداب بیان فرمائے ہیں۔ چونکہ وضو سے پہلے انسانی حاجات سے فارغ ہونا ضروری ہے، اس لیے گھر اور باہر، اس سے فراغت کے آداب و احکام اور حدود و شرائط بیان کی ہیں، پھر جس پانی سے وضو کیا جاتا ہے اور جس برتن میں پانی ڈالا جاتا ہے اس کی طہارت، نجاست آلود ہونے کی صورت میں اس کا طریقۂ طہارت، پھر وضو کے لیے مقدار پانی اور نواقض وضو کی وضاحت کی ہے۔ وضو سے بچا ہوا پانی، اس کا استعمال، کن چیزوں کے استعمال کے بعد وضو ضروری ہے یا ضروری نہیں؟ اس مناسبت سے پیشاب کے احکام، حیوانات کے بول و براز کے مسائل، پھر مسواک کے فوائد بیان کیے ہیں۔ آخر میں ہمیشہ باوضو رہنے کی فضیلت بیان کرکے اس قسم کے پاکیزہ عمل کو اپنانے کی تلقین فرمائی ہے۔ الغرض امام بخاری ؒ نے اس کتاب الوضوء میں بے شمار معارف و حقائق اور لطائف و دقائق بیان کیے ہیں۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ اس مختصر تمہید کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کا مطالعہ کریں تاکہ ہمیں حضرت امام بخاری ؒ کی درایت و فقاہت کا عملی تجربہ ہو۔ واللّٰہ ولي التوفيق وهو الهادي من يشاء إلى صراط مستقيم.

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

4 - كِتَابُ الْوُضُوءِ

وضو سے متعلق احکام و مسائل

(١) بَابُ مَا جَاءَ فِي [الْوُضُوءِ، وَ]

قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ فَٱغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى ٱلْمَرَافِقِ وَٱمْسَحُواْ بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى ٱلْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدة:٦]، قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَبَيَّنَ النَّبِيُّ ﷺ أَنَّ فَرْضَ الْوُضُوءِ مَرَّةً مَرَّةً، وَتَوَضَّأَ أَيْضًا مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ وَثَلَاثًا، وَلَمْ يَزِدْ عَلَى ثَلَاثٍ، وَكَرِهَ أَهْلُ الْعِلْمِ الْإِسْرَافَ فِيهِ، وَأَنْ يُجَاوِزُوا فِعْلَ النَّبِيِّ ﷺ.

باب: 1- وضو کے متعلق کیا وارد ہے؟

نیز ارشاد باری تعالیٰ (کی وضاحت): ’’اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک (دھولو)۔‘‘

ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) کہتے ہیں: نبی ﷺ نے بیان فرمایا: اعضائے وضو کا ایک ایک مرتبہ دھونا فرض ہے، نیز آپ نے ان اعضاء کو دو، دوبار اور تین، تین بار بھی دھویا ہے، ہاں تین مرتبہ سے زیادہ نہیں دھویا۔ اور اہل علم نے وضو میں پانی کا حد سے زیادہ استعمال ناپسند کیا ہے اور اسے بھی مکروہ قرار دیا ہے کہ لوگ نبی ﷺ کے فعل سے تجاوز کریں۔

وضاحت: اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے کسی موصول حدیث کو بیان نہیں فرمایا۔ اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام بخاری نے پہلے عنوانات قائم کیے، بعد میں ان کے مناسب احادیث لکھیں، اس عنوان کے تحت حدیث پیش کرنے کا موقع نہیں ملا جیسا کہ ’’امام تدبر‘‘ لکھتے ہیں کہ ’’ان کو اپنی کتاب پر نظر ثانی کرنے کا موقع نہیں ملا اور اس کے بغیر ہی کتاب کی روایت شروع ہوگئی۔‘‘ [1] صحیح بخاری کے متعلق یہ بہت خطرناک موقف ہے جو ان حضرات نے اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت امام بخاری کی حیاتِ طیبہ میں نوے ہزار اشخاص نے براہ راست آپ سے اس عظیم کتاب کا درس لیا اور بلا واسطہ ان کی سند سے اس عظیم کتاب کو روایت کیا ہے، نیز امام بخاری جب اس کی جمع و تالیف سے فارغ ہوئے تو آپ

1 تدبر حدیث: 239/1. از امین احسن اصلاحی۔

نے اسے امام احمد بن حنبل، امام یحییٰ بن معین، امام علی بن مدینی رحمہم اللہ اور دیگر اکابر امت کے سامنے پیش کیا، سب نے متفقہ طور پر اس کتاب کو مستحسن قرار دیا اور اس کی صحت کے متعلق گواہی دی۔[1] ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کو اس پر نظر ثانی کا موقع نہیں ملا اور اس کے بغیر ہی اس کی روایت شروع ہوگئی؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی حدیث نہیں ملی لیکن ان حضرات کو سوچنا چاہیے کہ آیت کریمہ کے بعد حدیث کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اس مقام پر علامہ عینی نے اس اعتراض کا بہت عمدہ جواب دیا ہے کہ ہم اس دعوے کو تسلیم ہی نہیں کرتے کہ امام بخاری نے یہاں کوئی حدیث پیش نہیں کی ہے کیونکہ امام بخاری نے اعضائے وضو کا ایک ایک دفعہ دھونا بطور حدیث پیش کیا ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے دو، دو اور تین تین مرتبہ بھی ان اعضاء کو دھویا ہے، یہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔[2]

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت کتاب الوضو کا آغاز ایک قرآنی آیت سے کیا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آئندہ ابواب میں وضو کے متعلق جو تشریحات مذکور ہوں گی، وہ اسی آیت کی تفصیل ہوں گی۔ وضو چونکہ نماز کا مقدمہ ہے، اس لیے قرآنی آیت میں اس کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں چار اعضاء کا ذکر ہے جن میں تین، یعنی چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کا دھونا اور ایک، یعنی سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔ ان چاروں اعضاء کی طہارت اس لیے ضروری ہے کہ عام طور پر گناہوں کا تعلق بھی انھی اعضاء سے ہوتا ہے، یعنی ان چار راستوں سے گناہوں کی نجاست دل تک پہنچتی ہے، اس لیے شریعت نے انھی راستوں کو طہارت کے لیے ذریعہ بنایا۔ ② اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موجب وضو، یعنی وضو کا سبب قیام الی الصلاۃ ہے، یعنی نماز کی تیاری کے لیے وضو کرنا ضروری ہے، خواہ پہلے حدث (حالت بے وضو) ہو یا نہ ہو۔ لیکن دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر پہلے سے وضو موجود ہے تو ہر نماز کے لیے نئے وضو کی ضرورت نہیں جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک وضو سے کئی نمازیں ادا کیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جو اس سے پہلے نہیں کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا: ''اے عمر! میں نے عمداً ایسا کیا ہے۔''[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے لیے تجدید وضو ضروری نہیں۔ ③ آیت کریمہ میں تین اعضاء کے دھونے اور ایک کا مسح کرنے کے لیے صیغۂ امر استعمال ہوا ہے، قواعد کی رو سے امر میں تکرار داخل نہیں ہوتا۔ امام بخاری نے اس کا بھی فیصلہ فرمایا ہے کہ ان اعضاء کو ایک ایک بار دھونے سے فرض ادا ہو جائے گا۔ اس کے لیے آگے ایک مستقل عنوان بھی قائم کریں گے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ مذکورہ اعضائے ثلاثہ کو ایک ایک مرتبہ ہی دھو لینے سے فرض ادا ہو جاتا ہے، باقی رہا تکرار کا عمل تو وہ سنت سے ماخوذ ہے جس کی آخری حد تین، تین مرتبہ دھونا ہے۔ دو، دو مرتبہ دھونے سے بھی سنت ادا ہو جاتی ہے مگر سنت کا اعلیٰ درجہ تین، تین مرتبہ دھونے سے حاصل ہوگا۔ ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے عبارت کے آخر میں دو چیزیں ذکر کی ہیں: ایک اسراف اور دوسری مقرر کردہ حدود سے تجاوز۔ اسراف کا تعلق پانی اور وقت سے ہے۔ جس طرح زائد پانی استعمال کرنا منع ہے اسی طرح زائد وقت لگانا بھی اسراف میں شامل ہے۔ وضو چونکہ ایک اعلیٰ مقصود کا پیش خیمہ ہے، اس لیے اس پر کم از کم وقت صرف کرنا چاہیے اسی طرح تین سے زیادہ کا عدد احادیث سے ثابت نہیں، اس لیے جو

---

① مقدمة فتح الباري، ص: 684-686. ② عمدة القاري: 345/2. ③ صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 642 (277).

شخص اس تحدید پر زیادتی کرتا ہے، وہ حد سے تجاوز کا ارتکاب کرتا ہے۔ جس کی مذمت احادیث میں آئی ہے۔ ہاں اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ تین دفعہ دھونے کے باوجود میرے عضو کا کوئی حصہ خشک رہ گیا ہے تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہوگا، البتہ اگر کسی شخص پر وہم کا غلبہ ہے اور اسے کسی صورت میں اطمینان نہیں ہوتا تو ایسے وہمی انسان کو دفع وہم کے لیے شریعت تکرار کی اجازت نہیں دیتی۔[1]

(٢) بَابٌ : لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ

باب:2- وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی

وضاحت: یہ عنوان بجائے خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے[2] لیکن یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ کی شرائط صحت کے مطابق نہ تھی، اس لیے اسے عنوان میں ذکر کر دیا، اصل کتاب کا حصہ نہیں بنایا۔

١٣٥ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ الْحَنْظَلِيُّ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتَّى يَتَوَضَّأَ»، قَالَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ: مَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ.

[انظر: ٦٩٥٤]

[135] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کا وضو ٹوٹ جائے (اسے حدث ہو جائے) اس کی نماز قبول نہیں ہوتی جب تک وضو نہ کرے۔'' ایک حضرمی نے پوچھا: اے ابو ہریرہ! حدث کیا ہے؟ انھوں نے کہا: فساء یا ضراط (یعنی وہ ہوا جو پاخانے کے مقام سے خارج ہو)۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ نماز کے لیے طہارت شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی نماز درست نہ ہوگی، خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل یا نماز جنازہ، دوران اقامت میں ادا کی جائے یا اثنائے سفر میں، اگر طہارت نہیں تو قبولیت کا ادنیٰ درجہ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ ادنیٰ درجے سے مراد یہ ہے کہ فرض ادا ہو جائے، خواہ ثواب ملے یا نہ ملے۔ اگر طہارت کے ساتھ نماز شروع کی تھی پھر دوران نماز میں وضو ٹوٹ گیا تو بھی ناقابل قبول ہے۔ گویا نماز کا کوئی حصہ بھی طہارت کے بغیر درست نہیں۔ بعض لوگ بنا کے قائل ہیں، یعنی وہ کہتے ہیں کہ جہاں سے نماز ٹوٹی تھی، وضو کر کے وہیں سے نماز پڑھ کر نماز پوری کر لے، لیکن اس کی کوئی صحیح دلیل نہیں۔ ایک ضعیف حدیث اس مسئلۂ بنا کی بنیاد ہے جب کہ ضعیف حدیث سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ ② حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا جواب دوران نماز میں حدث پیش آنے سے متعلق ہے کہ اس سے مراد فساء، یعنی ریح کا بغیر آواز کے خارج ہونا، یا ضراط، یعنی ریح کا آواز کے ساتھ خارج ہونا ہے۔ کیونکہ دوران نماز میں عام طور پر خروج ریح کی صورت ہی پیش آتی ہے بصورت دیگر نواقض وضو تو اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو کتاب الحیل (6954) میں بھی

---

1. فتح الباري:309/1. 2. جامع الترمذي، الطهارة، حديث:1.

بیان کیا ہے۔ وہاں حیلہ گری کی تردید مقصود ہے۔ لیکن وہاں کسی حیلے کی وضاحت نہیں کی جس پر اس حدیث کا انطباق ہوتا ہو۔ بخاری کے شارح ابن بطال نے اس کی تشریح بایں الفاظ کی ہے کہ اس سے ان حضرات کی تردید مقصود ہے جنھوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آخری تشہد میں ہوا نکلنے کا اندیشہ ہو تو سلام پھیرنے کے بجائے اگر قصداً ہوا خارج کر دی جائے تو نماز صحیح ہے۔ یہ موقف اس لیے غلط ہے کہ نماز کی تکمیل سلام ہی سے ہوتی ہے اور بزور ہوا کا خارج کرنا یا ہونا، کسی صورت میں سلام کا بدل نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسی نماز باطل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ہے کہ اس قسم کی حیلہ گری اسلام میں ناجائز اور حرام ہے۔[1]

(٣) بَابٌ: فَضْلُ الْوُضُوءِ وَالْغُرُّ الْمُحَجَّلُونَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ

باب: 3- وضو کی فضیلت اور ان لوگوں کا بیان جن کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں وضو کے اثرات کی وجہ سے چمک دار ہوں گے

١٣٦ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ خَالِدٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي هِلَالٍ، عَنْ نُعَيْمٍ الْمُجْمِرِ قَالَ: رَقِيتُ مَعَ أَبِي هُرَيْرَةَ عَلَى ظَهْرِ الْمَسْجِدِ فَتَوَضَّأَ فَقَالَ: إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ. فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ».

[136] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''میری امت کے لوگ قیامت کے دن بلائے جائیں گے جبکہ وضو کے نشانات کی وجہ سے ان کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ اب جو کوئی تم میں سے اپنی چمک بڑھانا چاہے تو اسے بڑھائے۔''

فوائد و مسائل: ① صحیح بخاری کے اکثر نسخوں میں [الغر المحجلون] رفع کے ساتھ ہے جبکہ مستملی نے اصیلی کی تصریح کے مطابق اسے [الغر المحجلين] پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس جملے کا عطف الوضوء پر ہوگا، یعنی اس عنوان کا مقصد دو فضیلتوں کا بیان ہے: ایک وضو کی فضیلت، دوسرے [الغر المحجلون] کی فضیلت۔ وضو کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی برکت سے چہرہ اور دیگر اعضائے وضو روشن ہوں گے۔ اور ''الغر المحجلون'' کی فضیلت یہ ہے کہ یہ اس امت کا امتیازی نشان ہوگا جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے۔[2] رفع کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں اس کی دو توجیہات ہیں: ✱ یہ اعراب حکایت کے طور پر ہے، حدیث میں ہے: [أَنْتُمُ الْغُرُّ الْمُحَجَّلُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ] ''قیامت کے دن تمھارے چہرے اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔''[3] ✱ یہ الفاظ مبتدا اور اس کی خبر مقدم فیہ محذوف ہے، یعنی امام بخاری نے وضو کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے صحیح مسلم کی روایت کی طرف اشارہ فرمایا کیونکہ وہ روایت ان کی شرط کے مطابق نہ تھی۔ اس وضاحت کے بعد ''امام تدبر'' کے اس

---

① شرح البخاري، لابن بطال:312/8. ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث:581(247). ③ صحيح مسلم، الطهارة، حديث:579(246).

اعتراض کی کیا حیثیت ہے جوانھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ پر کیا ہے۔"میرے نزدیک عنوان باب امام صاحب کا ایک ناتمام نوٹ ہے۔"[1] ② حدیث کے آخر میں جو الفاظ ہیں کہ تم میں سے جو شخص چمک بڑھانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ بڑھا لے، یہ ارشاد نبوی ہے یا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا حدیث سے استخراج؟ اس کی بابت اکثر محقق علماء اور محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ الفاظ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہیں جنھیں اصطلاح میں مدرج کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ رسول اللہ ﷺ کے نہیں۔ البتہ حضرت ابو ہریرہ کا یہ عمل ملتا ہے کہ وہ ہاتھوں کو کندھوں تک اور پیروں کو گھٹنوں تک دھوتے تھے، لیکن یہ ان کا اجتہاد تھا، رسول اللہ ﷺ کا عمل نہیں تھا۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ اس طرح دھوئے کہ کہنیوں سے تھوڑا اوپر تک کا حصہ اس میں شامل کیا، اسی طرح پیروں کو اس طرح دھویا کہ پنڈلیوں کا کچھ حصہ اس میں شامل کر لیا۔ پھر فرمایا: [هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ، وَقَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: «أَنْتُمُ الْغُرُّ الْمُحَجَّلُونَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ إِسْبَاغِ الْوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ فَلْيُطِلْ غُرَّتَهُ وَتَحْجِيلَهُ»][2] "میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کمال وضو کی وجہ سے قیامت کے روز تمھارے ہاتھ پاؤں اور پیشانی چمک دار ہوں گی، لہٰذا تم میں سے جو اپنی چمک اور سفیدی کو لمبا کر سکتا ہے تو وہ کرے۔" اس روایت سے بھی بعض حضرات کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ لیکن اس روایت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، اس میں صرف کہنیوں سے تھوڑا سا اوپر کا حصہ اور اسی طرح ٹخنوں سے تھوڑا اوپر پنڈلیوں کا حصہ شامل کیے جانے کا ذکر ہے اور اس کی بابت کہا گیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ اس میں کندھوں تک اور گھٹنوں تک دھونے کا ذکر نہیں ہے۔ بہر حال کندھوں اور گھٹنوں تک اعضائے وضو کو دھونا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا اجتہادی عمل ہے۔ ایک اثر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہ عمل بتلایا گیا ہے لیکن وہ صحیح سند سے ثابت نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (إرواء الغليل: 1/132، و الضعيفة للألباني، رقم: 1003)

(٤) بَابُ: لَا يَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّكِّ حَتّٰى يَسْتَيْقِنَ

باب:4- شک کی بنیاد پر وضو نہ کرے جب تک (بے وضو ہونے کا) یقین نہ ہو جائے

١٣٧ - حَدَّثَنَا عَلِيٌّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، عَنْ عَمِّهِ، أَنَّهُ شَكَا إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: اَلرَّجُلُ الَّذِي يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ يَجِدُ الشَّيْءَ فِي الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ: «لَا يَنْفَتِلْ -أَوْ: لَا يَنْصَرِفْ- حَتّٰى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». [انظر: ١٧٧، ٢٠٥٦]

[137] حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک ایسے شخص کا حال بیان کیا جسے یہ خیال ہو جاتا تھا کہ وہ دوران نماز میں کسی چیز (ہوا نکلنے) کو محسوس کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: "وہ نماز سے اس وقت تک نہ پھرے جب تک ہوا نکلنے کی آواز یا بو نہ پائے۔"

---

[1] تدبر حدیث: 1/240. [2] صحیح مسلم، الطهارة، حدیث: 579 (246).

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ ایک اصل کو ثابت کرتے ہیں کہ جب کوئی عمل یقین و اعتماد سے شروع کیا گیا ہو تو جب تک اس کی جانب مخالف میں بھی یقین کی کیفیت پیدا نہ ہو جائے، اس وقت تک وہ عمل قائم رکھا جائے گا، صرف تردد اور شک سے اس عمل میں نقصان نہیں آنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک خاص واقعے کا حوالہ دیا ہے کہ ایک شخص کو دوران نماز میں وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کو اس وقت تک نماز پڑھتے رہنا چاہیے جب تک اسے نقض وضو کے متعلق اس درجے کا یقین نہ ہو جس درجے کا یقین وضو کے متعلق تھا کیونکہ صرف وسوسے اور شبہے کی وجہ سے نماز ختم کرنا درست نہیں۔ ابن حبان کی روایت میں ہے کہ جب شیطان دل میں اس طرح کا وسوسہ ڈالے تو دل ہی دل میں شیطان کے اس وسوسے کی تکذیب کر دے۔ صحیح ابن خزیمہ میں ہے کہ اگر ناک سے اس کی بدبو محسوس کرے یا کان سے اس کی آواز سنے تو نماز کو ختم کر دے۔[1] ② علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بے وضو ہونے کا حکم صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ اس کی آواز سنے یا بدبو پائے کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہوا کے خروج کا یقین ہوتا ہے لیکن نہ اس کی آواز سنی جاتی ہے اور نہ اس کی بو ہی کا احساس ہوتا ہے، مثلاً: ایک آدمی بہرا ہے یا مرض زکام کی وجہ سے اس کی قوت شامہ مفلوج ہو چکی ہے جس کی بنا پر وہ آواز یا بو کا احساس نہیں کر پاتا، ایسی صورت میں اسے وضو کرنا ہوگا کیونکہ اسے بے وضو ہونے کا یقین ہو چکا ہے۔[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: [بَابُ مَنْ لَّمْ يَرَالْوَسَاوِسَ وَ نَحْوَهَا مِنَ الشُّبُهَاتِ] ''وساوس کو شبہات کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔''[3] لہٰذا اس حدیث سے یہ قاعدہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی یقینی معاملہ صرف شک کی وجہ سے مشکوک نہیں ہوتا اور نہ معاملات کو وساوس کی وجہ سے شبہات ہی میں تبدیل کرنا درست ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بلاوجہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا جائز نہیں۔ واللہ أعلم.

(٥) بَابُ التَّخْفِيفِ فِي الْوُضُوءِ

باب:5- وضو میں تخفیف کا بیان

١٣٨ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَمْرٍو قَالَ: أَخْبَرَنِي كُرَيْبٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَامَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ صَلّٰى، وَرُبَّمَا قَالَ: اِضْطَجَعَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى، ثُمَّ حَدَّثَنَا بِهِ سُفْيَانُ مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ عَنْ عَمْرٍو، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: بِتُّ عِنْدَ خَالَتِي مَيْمُونَةَ لَيْلَةً فَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ مِنَ اللَّيْلِ، فَلَمَّا كَانَ فِي بَعْضِ اللَّيْلِ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ فَتَوَضَّأَ

[138] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی ﷺ سوئے، یہاں تک کہ خراٹے بھرنے لگے، پھر آپ نے (بیدار ہو کر) نماز پڑھی۔ کبھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی ﷺ کروٹ پر لیٹے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، پھر بیدار ہو کر آپ نے نماز پڑھی۔ پھر حضرت سفیان نے اس روایت کو دوبارہ تفصیل سے بیان کیا کہ ابن عباس نے فرمایا: میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات گزاری۔ نبی ﷺ رات کے کسی حصے میں بیدار ہوئے۔

① عمدة القاري: 2/358. ② عمدة القاري: 2/359. ③ صحيح البخاري، البيوع، باب:5.

مِنْ شَنٍّ مُعَلَّقٍ وُضُوءًا خَفِيفًا، يُخَفِّفُهُ عَمْرٌو وَيُقَلِّلُهُ، وَقَامَ يُصَلِّي، فَتَوَضَّأْتُ نَحْوًا مِمَّا تَوَضَّأَ، ثُمَّ جِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ - وَرُبَّمَا قَالَ سُفْيَانُ: عَنْ شِمَالِهِ - فَحَوَّلَنِي فَجَعَلَنِي عَنْ يَمِينِهِ، ثُمَّ صَلَّى مَا شَاءَ اللهُ، ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتَّى نَفَخَ ثُمَّ أَتَاهُ الْمُنَادِي فَآذَنَهُ بِالصَّلَاةِ، فَقَامَ مَعَهُ إِلَى الصَّلَاةِ، فَصَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ، قُلْنَا لِعَمْرٍو: إِنَّ نَاسًا يَقُولُونَ إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ تَنَامُ عَيْنُهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ قَالَ عَمْرٌو: سَمِعْتُ عُبَيْدَ بْنَ عُمَيْرٍ يَقُولُ: رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنِّىٓ أَرَىٰ فِى ٱلْمَنَامِ أَنِّىٓ أَذْبَحُكَ﴾ [الصافات: ١٠٢]. [راجع: ١١٧]

جب کچھ رات گزر گئی تو آپ کھڑے ہوئے اور لٹکتے ہوئے مشکیزے سے ہلکا وضو فرمایا۔ عمرو (راوی) اس (وضو) کا ہلکا پن اور معمولی ہونا بیان کرتا ہے۔ اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ میں نے بھی آپ ہی کی طرح وضو کیا، پھر میں آ کر آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا...... سفیان نے کبھی یسار کے بجائے شمال کا لفظ استعمال کیا...... آپ نے مجھے پھیرا اور اپنی دائیں جانب کھڑا کر لیا۔ پھر آپ نے جس قدر اللہ کی توفیق میسر آئی، (تہجد کی) نماز ادا فرمائی، پھر کروٹ کے بل لیٹ کر سو گئے حتیٰ کہ خراٹے بھرنے لگے۔ پھر مؤذن آیا اور اس نے آپ کو نماز کی اطلاع دی۔ آپ اس کے ساتھ نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے نماز پڑھی اور وضو نہیں فرمایا۔ (سفیان کہتے ہیں) ہم نے (اپنے استاد) عمرو سے کہا: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نیند کا اثر رسول اللہ ﷺ کے دل پر نہیں، بلکہ صرف آنکھ پر ہوتا تھا۔ عمرو نے جواب دیا: میں نے عبید بن عمیر کو یہ کہتے سنا ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں، پھر درج ذیل آیت کو بطور دلیل تلاوت فرمایا: ''میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے وضو کی دو اقسام بیان کی ہیں: ① وضوئے خفیف ② وضوئے تام۔ وضوئے خفیف کی دو صورتیں ہیں: * اعضائے وضو کا ایک ایک بار دھونا۔ یہ وضو کا ادنیٰ درجہ ہے۔ * اعضائے وضو کو اچھی طرح دھونے کے بجائے صرف پانی بہا لیا جائے۔ وضوئے طعام اور وضوئے نوم کو بھی ہلکا وضو کہا جاتا ہے۔ وضوئے تام کی ایک ہی صورت ہے کہ اعضائے وضو کو تین تین بار اچھی طرح دھویا جائے۔ اس کی تفصیل آئندہ باب میں بیان ہوگی، نیز راویٔ حدیث نے وضوئے خفیف کے لیے دو لفظ استعمال کیے ہیں: * تخفیف: اس سے کیفیت، یعنی معیار کی طرف اشارہ ہے۔ پانی کے خرچ کے اعتبار سے تخفیف ہے۔ * تقلیل: اس سے کمیت، یعنی مقدار کی طرف اشارہ ہے، یعنی ایک ایک مرتبہ دھونا، تقلیل ہے۔ لیکن وضوئے خفیف کی تفسیر احادیث میں بایں طور ہے کہ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں، آپ نے بہترین وضو فرمایا۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے درمیانی طریقے سے وضو فرمایا، بکثرت پانی بھی نہیں بہایا، تمام اعضاء تک پانی بھی اچھی طرح پہنچایا۔[2] ان احادیث

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4571. [2] صحيح البخاري، الدعوات، حديث: 6316.

سے وضوئے خفیف کی تفسیر ہوتی ہے۔ ② جب حدیث میں یہ ذکر ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے نیند سے بیدار ہو کر وضو کیے بغیر نماز ادا کی تو تلامذہ میں سے کسی نے راویٔ حدیث حضرت عمرو سے پوچھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی چشم مبارک سوتی ہیں لیکن دل مبارک بیدار رہتا ہے، تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ انھوں نے کہا: جب انبیاء ﷩ کے خواب وحی ہوتے ہیں اور وحی کا یاد رکھنا اور اس کی حفاظت دل کی بیداری پر موقوف ہے، اگر دل بیدار نہ ہوگا تو پھر وحی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ جب وحی محفوظ نہ رہی ہو تو وہ شریعت کا مدار بھی نہیں بن سکے گی تو معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء ﷩ کے قلوب نیند میں بھی بیدار رہتے ہیں اور جب دل بیدار رہتا ہے تو وہ بدستور نیند کی حالت میں بھی ادراک کرتا رہے گا، لہٰذا محض نیند کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، البتہ اگر ریح کا خروج ہو تو وضو جاتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے نیند کے بعد وضو فرمایا۔ اور مدار نقض بحالت نیند حقیقی خروج ہے، نہ کہ صرف مظنۂ خروج کیونکہ یہ عام لوگوں کے حق میں ہے۔ اس کی تائید میں حضرت ابراہیم ؑ کا ایک خواب اور اس کے مطابق عملی اقدام پیش کیا گیا ہے، یعنی اگر انبیاء ﷩ کے خواب وحی کے حکم میں نہ ہوتے تو حضرت ابراہیم ؑ خواب کی بنیاد پر ایک ایسے اقدام کے لیے تیار نہ ہوتے جس میں بظاہر قتل نفس اور قطع رحم ہے۔

(٦) بَابُ إِسْبَاغِ الْوُضُوءِ

باب: 6- مکمل وضو کرنا

وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ الْإِنْقَاءُ.

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا ارشاد ہے: وضو پورا کرنے کا مطلب، اچھی طرح صاف کرنا ہے۔

١٣٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ، أَنَّهُ سَمِعَهُ يَقُولُ: دَفَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ عَرَفَةَ حَتَّى إِذَا كَانَ بِالشِّعْبِ نَزَلَ فَبَالَ، ثُمَّ تَوَضَّأَ وَلَمْ يُسْبِغِ الْوُضُوءَ فَقُلْتُ: اَلصَّلَاةَ يَا رَسُولَ اللهِ! فَقَالَ: «اَلصَّلَاةُ أَمَامَكَ»، فَرَكِبَ فَلَمَّا جَاءَ الْمُزْدَلِفَةَ نَزَلَ فَتَوَضَّأَ فَأَسْبَغَ الْوُضُوءَ، ثُمَّ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ ثُمَّ أَنَاخَ كُلُّ إِنْسَانٍ بَعِيرَهُ فِي مَنْزِلِهِ، ثُمَّ أُقِيمَتِ الْعِشَاءُ فَصَلَّى وَلَمْ يُصَلِّ بَيْنَهُمَا. [انظر: ١٨١، ١٦٦٧، ١٦٦٩، ١٦٧٢]

[139] حضرت اسامہ بن زید ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ عرفات سے لوٹے، جب گھاٹی میں پہنچے تو آپ اترے، پیشاب کیا، پھر وضو فرمایا لیکن وضو پورا نہ کیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! نماز کا وقت قریب ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نماز آگے چل کر پڑھیں گے۔'' پھر آپ سوار ہوئے، جب مزدلفہ آئے تو اترے اور پورا وضو کیا، پھر نماز کی تکبیر کہی گئی اور آپ نے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد ہر شخص نے اپنا اونٹ اپنے مقام پر بٹھایا، پھر عشاء کی تکبیر ہوئی اور آپ نے نماز پڑھی اور دونوں کے درمیان نفل وغیرہ نہیں پڑھے۔

فوائد و مسائل: ① مکمل وضو سے مراد وہ وضو ہے جس میں تمام فرائض و واجبات اور آداب وسنن کا خیال رکھا گیا ہو۔ دوسرے الفاظ میں مرات کے اعتبار سے تثلیث اور عمل کے لحاظ سے اعضائے وضو کو خوب مل کر دھونا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسباغ کی تفسیر انقاء سے کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اعضائے وضو کو خوب مل کر دھونا چاہیے تاکہ وہ اچھی طرح صاف ہو جائیں۔ اس سے اسراف سے اجتناب کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کیونکہ مقصد انقاء اور صفائی ہے۔ تکرار اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ اسراف کی حد میں پہنچ جائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اس تعلیق کو مصنف عبدالرزاق میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق مروی ہے کہ اپنے پاؤں کو سات مرتبہ دھویا کرتے تھے[1] کیونکہ اہل عرب عام احوال میں ننگے پاؤں رہنے کے عادی تھے، اس لیے پاؤں کا دیگر اعضاء کے مقابلے میں زیادہ میلا ہو جانا ایک طبعی چیز ہے۔[2] ② رسول اللہ ﷺ نے پہلے وضو کے بعد نماز ادا نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیشہ باوضو رہنے کے عادی تھے۔ اس سے ان حضرات کی بھی تردید ہوتی ہے جو اس وضو سے استنجا مراد لیتے ہیں کیونکہ دوسری روایت میں ہے کہ میں دوران وضو میں آپ کے اعضاء شریفہ پر پانی ڈالتا تھا، نیز مسند امام احمد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمزم کے پانی سے وضو فرمایا۔[3] اس سے معلوم ہوا کہ زمزم کا پانی پینے کے علاوہ دوسرے کاموں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔[4] اس حدیث سے متعلقہ دیگر مباحث کتاب الحج میں بیان ہوں گے۔

(٧) بَابُ غَسْلِ الْوَجْهِ بِالْيَدَيْنِ مِنْ غَرْفَةٍ وَّاحِدَةٍ

باب: 7- چلو بھر کر دونوں ہاتھوں سے منہ دھونا

١٤٠ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيمِ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو سَلَمَةَ الْخُزَاعِيُّ مَنْصُورُ بْنُ سَلَمَةَ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ بِلَالٍ - يَعْنِي سُلَيْمَانَ - عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّهُ تَوَضَّأَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ، أَخَذَ غَرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَمَضْمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَجَعَلَ بِهَا هٰكَذَا أَضَافَهَا إِلٰى يَدِهِ الْأُخْرٰى، فَغَسَلَ بِهَا وَجْهَهُ ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُمْنٰى، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَغَسَلَ بِهَا يَدَهُ الْيُسْرٰى، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً مِّنْ مَّاءٍ فَرَشَّ عَلٰى رِجْلِهِ الْيُمْنٰى

[140] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے وضو کیا اور اپنا منہ دھویا۔ اس طرح کہ پانی کا ایک چلو لے کر اس سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، پھر ایک اور چلو پانی لیا، ہاتھ ملا کر اس سے منہ دھویا، پھر ایک چلو پانی سے اپنا دایاں ہاتھ دھویا، پھر ایک اور چلو پانی لیا اور اس سے اپنا بایاں ہاتھ دھویا، پھر اپنے سر کا مسح کیا۔ بعدازاں ایک چلو پانی اپنے دائیں پاؤں پر ڈالا اور اسے دھویا، پھر دوسرا چلو پانی لے کر اپنا بایاں پاؤں دھویا۔ اس کے بعد کہنے لگے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

1 الأوسط لابن المنذر، حديث:401. 2 فتح الباري:1/ 316. 3 زوائد مسند أحمد:1/ 76. 4 فتح الباري:1/316.

حَتّٰى غَسَلَهَا، ثُمَّ أَخَذَ غَرْفَةً أُخْرٰى فَغَسَلَ بِهَا رِجْلَهُ يَعْنِي الْيُسْرٰى، ثُمَّ قَالَ: هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ.

فوائد ومسائل: ① اس سے معلوم ہوا کہ وضو کے لیے دونوں ہاتھوں سے چلو بھرنا ضروری نہیں، نیز ان روایات کے ضعف کی طرف اشارہ ہے جن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی ہاتھ سے اپنے چہرے کو دھوتے تھے۔ اگرچہ بعض حضرات نے ان احادیث کو جمع کرنے کی ایک صورت پیدا کی ہے لیکن سیاق وسباق سے اس جمع کی تائید نہیں ہوتی۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پانی کا ایک چلو لے کر آدھے پانی سے کلی کی جائے اور آدھا چلو ناک صاف کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔[1] دراصل وضو کرنے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، ان تمام میں وضو کی ایک شکل نہیں ہوگی، مثلاً: بعض اوقات حوض یا ندی کے کنارے بیٹھ کر وضو کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی برتن سے پانی لے کر وضو کیا جاتا ہے اور کبھی مسجد میں ٹونٹی وغیرہ سے وضو کرنے کی نوبت آسکتی ہے، بہرحال پانی کے استعمال میں اسراف نہیں ہونا چاہیے۔ ② عربی زبان میں ایک ہاتھ سے پانی لینے کو غَرْفَة اور دونوں ہاتھوں سے پانی لینے کو حَفْنَه کہا جاتا ہے۔ اردو میں ان دونوں کے لیے علی الترتیب چلو اور لپ کے الفاظ مستعمل ہیں۔ اس وضاحت کے بعد معلوم ہونا چاہیے کہ عنوان کے دو جز ہیں: * منہ دھوتے وقت دونوں ہاتھوں کا استعمال * پانی ایک چلو سے لیا جائے۔ اس سے مسنون طریقے کی طرف اشارہ ہے کہ منہ دھونے کے لیے چلو بھر پانی کو دونوں ہاتھوں سے استعمال کرنا چاہیے۔

(٨) بَابُ التَّسْمِيَةِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ وَّعِنْدَ الْوِقَاعِ

باب: 8- ہر کام کے وقت بسم اللہ کہنا حتیٰ کہ جماع کے وقت بھی اللہ کا نام لیا جائے

١٤١ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: يَبْلُغُ بِهِ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَتٰى أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا، فَقُضِيَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ لَمْ يَضُرَّهُ».
[انظر: ٣٢٧١، ٣٢٨٣، ٥١٦٥، ٦٣٨٨، ٧٣٩٦]

[141] حضرت ابن عباس ؓ ہی سے روایت ہے، وہ اس حدیث کو نبی ﷺ تک پہنچاتے تھے، آپ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو کہے: ”اللہ کے نام سے، اے اللہ! ہمیں شیطان سے محفوظ رکھ اور اسے بھی شیطان سے محفوظ رکھ جو تو ہمیں عنایت فرمائے۔“ پھر ان دونوں کو اگر کوئی اولاد نصیب ہو تو شیطان اسے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“

فوائد ومسائل: ① ایک روایت میں ہے کہ جو وضو میں اللہ کا نام نہیں لیتا، اس کا وضو نہیں ہے۔[2] چونکہ یہ روایت

① فتح الباري:317/1. ② جامع الترمذي، الطهارة، حديث:25.

امام بخاری ؒ کی شرط کے مطابق نہ تھی، اس لیے انھوں نے اس کے اثبات کے لیے ایک نئی راہ نکالی جو ان کی دقت نظر اور جلالت قدر کی ایک واضح دلیل ہے، فرماتے ہیں کہ تسمیہ (بسم اللہ پڑھنا) تو ہر حال میں مطلوب ہے اور انھی حالات میں ایک حالت جماع بھی ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ مختلف وجوہات کی بناء پر اس وقت اللہ کا نام لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو برہنگی کی صورت ہے، پھر خالص قضاء شہوت کا شغل ہے لیکن شریعت میں اس حالت کے لیے بھی ایک مخصوص دعا منقول ہے۔ جب اس حالت میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو وضو سے پہلے تو بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیے کیونکہ وضو خود بھی عبادت ہے اور ایک بڑی عبادت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ دعا کو بوقت جماع پڑھنا چاہیے۔ بعض طرق میں صراحت ہے کہ جماع کا ارادہ کرتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے۔[1] صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں ہے کہ امام بخاری سے سوال ہوا، اگر کوئی عربی زبان میں یہ دعا نہ پڑھ سکتا ہو تو کیا اسے فارسی میں یہ کلمات کہنے کی اجازت ہے؟ امام بخاری نے جواب دیا: ''ہاں۔''[2] ③ عام طور پر بیوی سے صحبت کے بعد استنجا کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے آگے آداب خلا (قضائے حاجت) بیان کیے جا رہے ہیں، جس طرح جماع کرتے وقت اللہ کا نام لینے سے بچہ شیطانی ضرر سے محفوظ رہتا ہے، اسی طرح بیت الخلا جاتے وقت تسمیہ کا عمل انسان کے پوشیدہ اعضاء کو شیاطین کے شر سے محفوظ کر دیتا ہے۔ اس سے علامہ کرمانی کا اعتراض بھی ختم ہو جاتا ہے کہ بخاری ابواب قائم کرنے میں حسن ترتیب کی رعایت نہیں کرتے، وہ فن حدیث میں مہارت رکھتے ہیں اور ان کی کوشش کا محور صرف صحیح احادیث کا جمع کر دینا ہے۔[3]

(٩) بَابُ مَا يَقُولُ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب:9- بیت الخلا جانے کی دعا

١٤٢ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُولُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ». تَابَعَهُ ابْنُ عَرْعَرَةَ، عَنْ شُعْبَةَ، وَقَالَ غُنْدَرٌ، عَنْ شُعْبَةَ: «إِذَا أَتَى الْخَلَاءَ». وَقَالَ مُوسٰى عَنْ حَمَّادٍ: «إِذَا دَخَلَ»، وَقَالَ سَعِيدُ بْنُ زَيْدٍ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ: «إِذَا أَرَادَ أَنْ يَدْخُلَ». [انظر: ٦٣٢٢]

[142] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب بیت الخلا جاتے تو فرماتے: ''اے اللہ! میں ناپاک چیزوں اور ناپاکیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''

ابن عرعرہ نے اس حدیث کی شعبہ سے بیان کرنے میں متابعت کی ہے۔ اور غندر نے شعبہ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں: جب آپ بیت الخلا کے لیے آتے۔ (دَخَلَ کے بجائے أَتٰی کا لفظ استعمال کیا۔) اور موسیٰ نے حماد کے واسطے سے بیان کیا: جب داخل ہوتے۔ اور سعید بن زید نے کہا: ہمیں عبدالعزیز نے بیان کیا کہ جب آپ بیت الخلا جانے کا ارادہ فرماتے (تو مذکورہ دعا پڑھتے)۔

1 فتح الباري:318/1. 2 شرح الكرماني:2/ 183. 3 شرح الكرماني:2/ 183.

فوائد ومسائل: ① اس دعا کا دوسرا ترجمہ یہ ہے: ”اے اللہ میں خبیث جنوں اور جنیوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔“ واضح رہے کہ یہ الفاظ کہنے میں کچھ تفصیل ہے: اگر قضائے حاجت کے لیے بیت الخلا جانا ہے تو جانے سے پہلے اس دعا کو پڑھنا چاہیے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث کے بعد متابعت میں اس کی صراحت کر دی ہے، نیز الادب المفرد میں بھی ”جب بیت الخلا میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے“ کی صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ پھر اگر کھلے میدان میں اس کی نوبت آئے تو چونکہ وہاں گندگی نہیں ہوتی اور نہ وہاں شیاطین ہی کا اجتماع ہوتا ہے، اس لیے وہاں بیٹھتے وقت کپڑا اٹھانے سے پہلے پڑھنا چاہیے، البتہ جب انسان قضائے حاجت میں مصروف ہو جائے تو دعائیہ کلمات نہیں پڑھنے چاہییں۔ [1] ② بیت الخلا میں داخل ہونے سے پہلے اگر دعا پڑھنا بھول جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ دل میں پڑھے؟ زبان سے پڑھ لے یا کچھ نہ پڑھے؟ اس بارے میں اہل علم کی مختلف آراء ہیں: سیدنا ابن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم اور امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ قضائے حاجت کی جگہ ذکر کرنے کے جواز کے قائل ہیں، گویا ان کے نزدیک زبان سے بھی دعا پڑھنی جائز ہو گی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاء اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ کے نزدیک قضائے حاجت کے وقت اور جگہ پر اللہ کا ذکر کرنا ناپسندیدہ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دل میں پڑھے، زبان سے ادا نہ کرے۔ [2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قول کو جمہور کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن دلائل سے اس کی تائید نہیں ہوتی اور ہمیں تلاش بسیار کے بعد سلف میں سے اس قول کا قائل عکرمہ رحمہ اللہ کے علاوہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہمارے نزدیک راجح موقف یہ ہے کہ اگر بھول کی تلافی ممکن ہو تو باہر نکل کر دعا پڑھ کر دوبارہ داخل ہو جائے، ورنہ اسے بھول کی بنا پر معذور سمجھا جائے گا۔ وجۂ ترجیح یہ ہے کہ ایسی جگہ اور وقت میں اللہ کا ذکر بہر صورت ناپسندیدہ ضرور ہے۔ اور جہاں تک دل میں استحضار کا تعلق ہے تو ادعیہ ماثورہ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اذکار اور دعاؤں کا تعلق زبان سے ادا کرنے کا ہے اور کوئی بھی دعا ایسی نہیں جسے محض دل میں استحضار کا حکم ہو۔ هذا ماعندنا والله أعلم بالصواب.

(١٠) بَابُ وَضْعِ الْمَاءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ

باب: 10- بیت الخلا کے پاس پانی رکھنا

١٤٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هَاشِمُ بْنُ الْقَاسِمِ قَالَ: حَدَّثَنَا وَرْقَاءُ عَنْ عُبَيْدِاللهِ بْنِ أَبِي يَزِيدَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ الْخَلَاءَ فَوَضَعْتُ لَهُ وَضُوءًا، قَالَ: مَنْ وَضَعَ هٰذَا؟ فَأُخْبِرَ، فَقَالَ: «اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ». [راجع: ٧٥]

[143] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ایک دفعہ نبی ﷺ بیت الخلا گئے تو میں نے آپ کے لیے وضو کا پانی رکھ دیا۔ آپ نے (باہر نکل کر) پوچھا: ”یہ پانی کس نے رکھا ہے؟“ آپ کو بتایا گیا، تو آپ نے فرمایا: ”اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما۔“

فائدہ: عرب کے ہاں استنجا کا عمل عموماً ڈھیلوں سے ہوتا تھا۔ وہاں سے الگ ہو کر پھر پانی استعمال کرتے تھے۔ قضائے

[1] فتح الباري:321/1. [2] عمدة القاري:384/2، و مصنف ابن ابي شيبه:209/1.

حاجت کے وقت پانی ساتھ لے جانا یا پانی اپنے نزدیک رکھ لینا، دونوں ہی درست ہیں۔ اس سے پانی پاک ہی رہتا ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ نے کمال ادب کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس پانی رکھ دیا۔ آپ کے سامنے اس کے متعلق تین راستے تھے: * بیت الخلا میں داخل ہو کر رسول اللہ ﷺ کو پانی دے آتے۔ * سرے سے پانی ہی نہ دیتے۔ * پانی بیت الخلا کے قریب رکھ دیتے تاکہ اس کے حصول میں سہولت رہے۔ پہلی دو صورتیں تو مناسب نہ تھیں کیونکہ اگر پانی دینے کے لیے بیت الخلا میں جاتے، تو یہ درست نہیں تھا، بالکل نہ دیتے تو یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ آپ کو پانی لینے میں دقت ہوتی، اس لیے سب سے بہتر صورت یہی تھی کہ دروازے پر پانی رکھ دیا جائے چونکہ حضرت ابن عباس ؓ نے یہ خدمت بجا لا کر عقلمندی کا ثبوت دیا تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ویسی ہی دعا فرمائی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت سے نوازا اور حضرت ابن عباس ؓ حبر الامۃ اور ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور ہوئے۔[1]

(١١) بَابٌ: لَا تُسْتَقْبَلُ الْقِبْلَةُ بِبَوْلٍ وَّلَا غَائِطٍ إِلَّا عِنْدَ الْبِنَاءِ، جِدَارٍ أَوْ نَحْوِهِ

باب: 11- قضائے حاجت کے وقت قبلہ رخ نہ بیٹھا جائے الا یہ کہ کوئی عمارت ہو، جیسے دیوار وغیرہ

١٤٤ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ قَالَ: حَدَّثَنِي الزُّهْرِيُّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيدَ اللَّيْثِيِّ، عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَتَى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يُوَلِّهَا ظَهْرَهُ، شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا». [انظر: ٣٩٤]

[144] حضرت ابو ایوب انصاری ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی قضائے حاجت کے لیے جائے تو قبلے کی طرف نہ منہ کرے اور نہ پشت، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو۔''

فوائد ومسائل: ① عنوان بندی کے متعلق امام بخاری کی یہ عادت ہے کہ وہ ان کے ذریعے سے بظاہر دو متعارض احادیث کے درمیان تطبیق کی صورت بیان کرتے ہیں۔ یہی صورت حال اس جگہ ہے۔ مذکورہ روایت تحریم پر دلالت کرتی ہے کہ کسی صورت میں کعبے کی طرف قضائے حاجت کے وقت نہ منہ کرنا جائز ہے اور نہ اس کی طرف پشت ہی کرنا جائز ہے اور اگلی روایت، جو حضرت ابن عمر ؓ سے مروی ہے، اس میں تفریق ہے کہ اگر صحرا میں قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو کعبے کی طرف منہ اور پشت کرنا منع ہے لیکن عمارات یا چار دیواری کے اندر جائز ہے۔ امام بخاری ؒ نے اس عنوان میں تعارض بایں طور ختم کیا ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری کی روایت کو فضا کے ساتھ خاص کر دیا ہے کہ جنگلات یا میدان میں کعبے کی طرف منہ اور پشت کرنا دونوں ہی منع ہیں، البتہ اگر دیوار کی آڑ ہو یا بیت الخلا کسی عمارت میں ہو تو کوئی حرج نہیں۔ ② قبلے کی طرف منہ یا پشت کر کے قضائے حاجت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ یہ مسئلہ سلف صالحین سے مختلف فیہ چلا آ رہا ہے اور اس کی وجہ جواز اور عدم جواز کے دلائل کا بظاہر متعارض

1. فتح الباري:1/322.

ہونا ہے۔ جہاں تک کھلی فضا میں قضائے حاجت کا تعلق ہے تو اس صورت میں بالاتفاق منہ اور پشت کرنا دونوں ممنوع ہیں، تاہم اگر قضائے حاجت کرنے والا کسی عمارت وغیرہ میں ہو تو اس صورت میں اختلاف ہے۔ علماء کی اس بارے میں درج ذیل چار رائے ہیں: ✱ منہ اور پشت دونوں ممنوع ہیں، خواہ صحرا ہو یا عمارت۔ ان کی دلیل ابوایوب انصاری کی درج بالا روایت ہے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو نبی ﷺ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں۔ ✱ کھلی فضا اور عمارات میں قبلے کی طرف منہ اور پشت کرنا دونوں امر جائز ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ناسخ اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث منسوخ ہے۔ اور بعض نے اس کے برعکس بھی کہا ہے۔ ✱ قبلہ رخ منہ کرنا صحرا اور عمارت دونوں میں منع ہے، البتہ عمارت میں پشت کی جا سکتی ہے، اس موقف کی دلیل بھی حدیث ابن عمر ہے۔ ان حضرات کے نزدیک کیونکہ حدیث ابن عمر میں کعبے کی طرف صرف پشت کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے پشت کرنا عمارت میں جائز ہے۔ ✱ کھلی فضا میں قبلے کی طرف منہ اور پشت کرنا، دونوں ممنوع ہیں اور عمارات وغیرہ میں دونوں کا جواز ہے، البتہ بچنا افضل ہے۔ ان کی دلیل ابن عمر رضی اللہ عنہما کی آئندہ حدیث اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی سنن ابی داود وغیرہ (حدیث:13) کی احادیث ہیں جن میں عمارات میں استقبال اور استدبار دونوں کا جواز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ باب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہی چوتھا موقف راجح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر محدثین کے قائم کردہ ابواب سے ان کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس موقف کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ پہلا موقف اس لیے درست نہیں کہ کسی بھی فعل میں اصل عدم تخصیص ہے، خصوصیت قرار دینے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو یہاں نہیں ہے۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم نے اس سے عموم ہی سمجھا ہے، اسے آپ کی خصوصیت قرار نہیں دیا۔ دوسرا موقف اس لیے مرجوح ہے کہ بظاہر تاہم متعارض احادیث میں سب سے پہلے تطبیق دی جاتی ہے نہ کہ ناسخ و منسوخ دیکھا جاتا ہے۔ جب تطبیق ممکن ہو تو پھر ناسخ و منسوخ نہیں دیکھا جاتا اور یہاں تطبیق ممکن ہے۔ تیسرا موقف، جس میں منہ اور پشت کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، بھی مرجوح ہے کیونکہ استقبال اور استدبار ایک ہی چیز ہے، پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو وفات سے ایک سال پہلے دیکھا کہ آپ قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت کر رہے تھے۔[1] اس لیے استقبال اور استدبار کا فرق بھی درست نہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں وارد ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے گا اور ابن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم کی احادیث میں مذکور آپ کا فعل بیان جواز کے لیے ہو گا کہ بہتر اور افضل یہی ہے کہ میدانی علاقہ ہو یا عمارت ہر دو صورتوں میں قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت سے اجتناب کیا جائے، تاہم اگر عمارت میں کوئی ایسا کر لے تو وہ گنا گار نہ ہو گا۔ اس کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: [مَنْ لَّمْ يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَمْ يَسْتَدْبِرْهَا فِي الْغَائِطِ كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةٌ وَ مُحِيَ عَنْهُ سَيِّئَةٌ] ''جو شخص قضائے حاجت کرتے وقت قبلے کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کرے اس کے لیے (ہر بار) ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اس کی ایک برائی مٹا دی جاتی ہے۔''[2] ③ قضائے حاجت کے وقت مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرنے کا خطاب اہل مدینہ سے ہے کیونکہ مدینہ منورہ کے اعتبار سے قبلہ جنوب کی طرف ہے۔ برصغیر میں رہنے والوں کے لیے قبلہ مغرب کی طرف ہے،

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث:13. ② المعجم الأوسط للطبراني:362/1، حديث:1321، و الصحيحة للألباني:88/3.

لہٰذا ہمارے لیے جنوب اور شمال کی طرف منہ کرنے کی ہدایت ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الصلاۃ، باب: 29 میں وضاحت کی ہے کہ مشرق ومغرب میں کوئی قبلہ نہیں ہے، شاید اس سے ان لوگوں کا قبلہ مراد ہے جو مکے سے جنوب یا شمال میں رہتے ہیں۔[1]

(١٢) بَابُ مَنْ تَبَرَّزَ عَلٰى لَبِنَتَيْنِ

باب: 12- اینٹوں پر بیٹھ کر قضائے حاجت کرنا

١٤٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَمِّهِ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ: إِنَّ نَاسًا يَقُولُونَ: إِذَا قَعَدْتَ عَلٰى حَاجَتِكَ فَلَا تَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا بَيْتَ الْمَقْدِسِ، فَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ: لَقَدِ ارْتَقَيْتُ يَوْمًا عَلٰى ظَهْرِ بَيْتٍ لَنَا فَرَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلٰى لَبِنَتَيْنِ مُسْتَقْبِلًا بَيْتَ الْمَقْدِسِ لِحَاجَتِهِ، وَقَالَ: لَعَلَّكَ مِنَ الَّذِينَ يُصَلُّونَ عَلٰى أَوْرَاكِهِمْ، فَقُلْتُ: لَا أَدْرِي وَاللهِ، قَالَ مَالِكٌ: يَعْنِي الَّذِي يُصَلِّي وَلَا يَرْتَفِعُ عَنِ الْأَرْضِ يَسْجُدُ وَهُوَ لَاصِقٌ بِالْأَرْضِ. [انظر: ١٤٨، ١٤٩، ٣١٠٢]

[145] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جب تم قضائے حاجت کے لیے بیٹھو تو بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف منہ نہ کرو، حالانکہ میں ایک دن اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے دو کچی اینٹوں پر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے واسع بن حبان سے کہا: شاید تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنی سرینوں پر نماز پڑھتے ہیں۔ (یعنی زمین سے چمٹ کر) واسع نے کہا: واللہ! میں نہیں جانتا (کہ آپ کا مطلب کیا ہے؟)۔ مالک کہتے ہیں: (ابن عمر) اس سے وہ شخص مراد لیتے ہیں جو نماز پڑھے اور زمین سے اونچا نہ ہو، سجدہ اس طرح کرے کہ زمین سے لگا رہے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کی تراجم کے متعلق ایک اور عادت ہے کہ آپ کسی عنوان کے تحت متعدد احادیث لاتے ہیں، پھر ان احادیث میں سے کوئی ایک حدیث کسی فائدے پر دلالت کرتی ہے تو امام بخاری اس فائدے سے آگاہ کرنے کے لیے ایک دوسرا عنوان قائم کر دیتے ہیں جو مستقل نہیں ہوتا بلکہ باب در باب کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث بنیادی طور پر پہلے عنوان سے متعلق ہے لیکن اس میں ایک مزید فائدہ مذکور تھا، اس لیے آپ نے اس پر عنوان قائم کر دیا۔ دراصل عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ قضائے حاجت کے لیے باہر میدانی علاقے کا رخ کرتے تھے، پھر وہاں بھی ایسے مقام کی تلاش کرتے جو گڑھے (الغائط) کی شکل میں ہوتا تاکہ قضائے حاجت کرنے والا لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ اس بنا پر آبادی میں اینٹوں

---

1 فتح الباري: 324/1.

پر بیٹھ کر قضائے حاجت کرنے کا مسئلہ دو لحاظ سے قابل بحث تھا: ✱ ایسا کرنا عرب کی عام عادت کے خلاف ہے۔ ✱ اینٹوں کے اونچا ہونے کی وجہ سے پردہ پوشی کے برعکس ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے جواز کے لیے یہ حدیث پیش کی ہے اور اس پر ایک عنوان قائم کیا ہے۔ ② آخر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے واسع بن حبان کو تنبیہ کے طور پر جو بات کہی ہے، اس کا مفہوم کئی طرح سے بیان کیا گیا ہے: صحیح مسلم کی روایت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت واسع بن حبان رحمہ اللہ نے مسجد میں نماز پڑھی جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ انھیں شک گزرا کہ واسع زمین کے ساتھ چمٹ کر سجدہ کرتے ہیں۔ اور شاید یہ ایسا اس وجہ سے کرتے ہیں کہ پورے طور پر سجدہ کرنے سے عضو مستور کا رخ قبلے کی طرف ہو جاتا ہے۔ جب واسع بن حبان نماز سے فارغ ہو کر ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس گئے تو انھوں نے پہلے مرفوع حدیث بیان کر کے ان لوگوں کی تردید کی جو عمارت میں بھی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے قضائے حاجت کو ناجائز سمجھتے تھے۔ بعدازاں ان سے پوچھا کہ شاید تم بھی انھی لوگوں میں سے ہو جن کا یہ موقف ہے اور شاید اسی وجہ سے تم سجدہ بھی اس انداز سے کرتے ہو؟ اس پر واسع بن حبان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ایسے سجدہ کیا ہو۔ شاید لاشعوری طور پر ایسا ہو گیا ہو، تاہم میرا یہ موقف نہیں۔ [1] ③ مذکورہ حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ گھر میں بنائے گئے بیت الخلا میں قضائے حاجت درست ہے کیونکہ اس میں پردہ پوشی کے ساتھ ساتھ نجاست سے بُعد بھی ہے۔ زمین سے متصل بیٹھ کر پیشاب کریں تو اس کے چھینٹوں سے بدن اور کپڑوں کے آلودہ ہونے کا اندیشہ ہے جبکہ بیت الخلا میں پردے کے ساتھ اس خطرے کا سدباب بھی ہے۔ واللہ أعلم.

(١٣) بَابُ خُرُوجِ النِّسَاءِ إِلَى الْبَرَازِ

باب: 13- عورتوں کا قضائے حاجت کے لیے باہر جانا

١٤٦ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ: حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ ﷺ كُنَّ يَخْرُجْنَ بِاللَّيْلِ إِذَا تَبَرَّزْنَ إِلَى الْمَنَاصِعِ، وَهُوَ صَعِيدٌ أَفْيَحُ فَكَانَ عُمَرُ يَقُولُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: أُحْجُبْ نِسَاءَكَ، فَلَمْ يَكُنْ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَفْعَلُ، فَخَرَجَتْ سَوْدَةُ بِنْتُ زَمْعَةَ زَوْجُ النَّبِيِّ ﷺ لَيْلَةً مِّنَ اللَّيَالِي عِشَاءً، وَكَانَتِ امْرَأَةً طَوِيلَةً، فَنَادَاهَا عُمَرُ: أَلَا قَدْ عَرَفْنَاكِ يَا سَوْدَةُ!

[146] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی ازواج مطہرات رات کو قضائے حاجت کے لیے مناصع کی طرف جاتی تھیں، اس سے مراد کھلا میدان ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ آپ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دیں، لیکن رسول اللہ ﷺ ایسا نہ فرماتے، چنانچہ ایک رات عشاء کے وقت نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت سودہ بنت زمعہ (قضائے حاجت کے لیے) باہر نکلیں اور وہ قد آور تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں آواز دی اور کہا: اے سودہ! ہم نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ (حضرت

① شرح صحيح البخاري، محمد بن صالح العثيمين رحمه الله: 1/294-295.

حِرْصًا عَلَى أَنْ يَنْزِلَ الْحِجَابُ، فَأَنْزَلَ اللهُ الْحِجَابَ. [انظر: ١٤٧، ٤٧٩٥، ٥٢٣٧، ٦٢٤٠]

عمر نے یہ اس لیے کہا) ان کی خواہش تھی کہ پردے کا حکم نازل ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پردے کا حکم نازل فرما دیا۔

١٤٧ - حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «قَدْ أُذِنَ [لَكُنَّ] أَنْ تَخْرُجْنَ فِي حَاجَتِكُنَّ» قَالَ هِشَامٌ: تَعْنِي الْبَرَازَ. [راجع: ١٤٦]

[147] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں: آپ نے (اپنی ازواج مطہرات ؓ سے) فرمایا: ''(اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تمھیں اپنی حاجت کے لیے باہر نکلنے کی اجازت مرحمت فرما دی گئی ہے۔'' ہشام کہتے ہیں: اس سے قضائے حاجت کے لیے گھر سے نکلنا مراد ہے۔

فوائد و مسائل: ① عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ قضائے حاجت کے لیے باہر میدانی علاقوں کا رخ کرتے تھے حتیٰ کہ ازواج مطہرات ؓ بھی اس مقصد کے لیے باہر جانے کی عادی تھیں۔ عربوں کے ہاں مکانات میں قضائے حاجت کے انتظام کو ناپسند خیال کیا جاتا تھا۔ اس عنوان میں بتایا گیا ہے کہ ازواج مطہرات اگر اپنی ضرورت کے پیش نظر باہر جائیں تو اس کی کیا صورت ہو؟ اگر دن کے وقت جائیں یا بے حجاب نکلیں تو یہ ان کے خلاف شان ہے، چنانچہ اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ عورتیں ایک الگ میدان میں رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے جاتی تھیں اور انھوں نے اپنی عادت بھی کچھ ایسی بنالی تھی کہ دن کے اوقات میں اس کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ امام بخاری ؒ نے اس حدیث سے اسی صورت کا جواز ثابت فرمایا ہے۔ ② پردے سے متعلقہ آیات کے نزول میں کچھ تعارض ہے۔ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک آیت حجاب نازل نہیں ہوئی تھی جبکہ حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت حجاب نازل ہو چکی تھی،[1] نیز اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول آیت سے حضرت عمر ؓ کا مقصد پورا ہو گیا، جبکہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر ؓ کا منشا پورا نہ ہو سکا اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمھیں قضائے حاجت کے لیے باہر جانے کی اجازت ہے۔ یہ حضرت عمر ؓ کے منشا کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سودہ ؓ کا واقعہ آیت حجاب کے نزول کا سبب بنا جبکہ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت حجاب کا نزول سیدہ زینب بنت جحش ؓ کے ولیمے کے دن ہوا، چنانچہ صحیح بخاری میں اس کی صراحت موجود ہے۔[2] دراصل حجاب کی دو قسمیں ہیں: حجاب وجوہ: (چہرے کا پردہ) عورت جب غیر محرم کے سامنے آئے تو اپنا چہرہ ڈھانپ کر آئے۔ حجاب اشخاص: (پورے وجود کا پردہ) عورت کی شخصیت ہی نظر نہ آئے، یعنی گھر سے باہر نہ نکلے۔ حضرت عمر ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: آپ کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، آپ اپنی ازواج مطہرات ؓ کو پردے کا حکم فرما دیں، تو آیت حجاب نازل ہوئی۔ اس سے ان کی خواہش پوری ہو گئی۔[3] آیت حجاب سورۃ الاحزاب: 53 ہے اور یہ حضرت زینب ؓ کے ولیمے کے موقع پر نازل ہوئی جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے، یہ حجاب وجوہ ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر ؓ کی

1 صحیح البخاري، التفسیر، حدیث:4795. 2 صحیح البخاري، التفسیر، حدیث:4791. 3 صحیح البخاري، التفسیر، حدیث:4790.

دوسری خواہش تھی کہ حجاب وجوہ کی طرح حجاب اشخاص کا حکم بھی آ جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو راستے میں ٹوکنا، اسی تناظر میں تھا لیکن اس سلسلے میں ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی بلکہ بذریعۂ وحی بتایا گیا کہ عورتوں کو قضائے حاجت کے لیے باہر جانے کی اجازت ہے۔ اس تفصیل سے تضاد کی تمام صورتیں ختم ہو جاتی ہیں، تاہم اس کے بعد گھروں میں قضائے حاجت کے لیے بندوبست کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ غیرت تھی بلکہ آپ کے اندر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہیں زیادہ غیرت تھی، لیکن آپ اللہ کی وحی کے بغیر کسی مصلحت پر عمل نہیں فرمانا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے ضرورت محسوس کرنے کے باوجود وحی کے آنے تک پردے کی بابت کوئی حکم نہیں دیا۔①

(١٤) بَابُ التَّبَرُّزِ فِي الْبُيُوتِ

باب:14- گھروں میں قضائے حاجت کا انتظام کرنا

١٤٨ - حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ عِيَاضٍ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى بْنِ حَبَّانَ، عَنْ وَاسِعِ بْنِ حَبَّانَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: ارْتَقَيْتُ فَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ حَفْصَةَ لِبَعْضِ حَاجَتِي، فَرَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقْضِي حَاجَتَهُ مُسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةِ مُسْتَقْبِلَ الشَّامِ. [راجع: ١٤٥]

[148] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں ایک دن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی چھت پر اپنی کسی حاجت کے پیش نظر چڑھا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ قبلے کی طرف پشت اور شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کیے ہوئے قضائے حاجت کر رہے ہیں۔

١٤٩ - حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ قَالَ: أَخْبَرَنَا يَحْيَى عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ يَحْيَى ابْنِ حَبَّانَ: أَنَّ عَمَّهُ وَاسِعَ بْنَ حَبَّانَ أَخْبَرَهُ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ أَخْبَرَهُ، قَالَ: لَقَدْ ظَهَرْتُ ذَاتَ يَوْمٍ عَلَى ظَهْرِ بَيْتِنَا فَرَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَاعِدًا عَلَى لَبِنَتَيْنِ، مُسْتَقْبِلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ. [راجع: ١٤٥]

[149] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں ایک دن اپنے گھر کی چھت پر چڑھا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ دو اینٹوں پر بیٹھے بیت المقدس کی طرف منہ کیے قضائے حاجت کر رہے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے باب میں ثابت کیا تھا کہ بوقت ضرورت عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا جائز ہے بالخصوص قضائے حاجت کے لیے رات کے وقت میدانی علاقے میں جانے میں چنداں حرج نہیں۔ اس باب میں بیان فرمایا ہے کہ قضائے حاجت کے لیے عورتوں کا باہر جانا ایک ہنگامی ضرورت کے پیش نظر تھا جس کو بدل دیا گیا اور گھروں میں اس کے

① فتح الباري:1/327-328.

انتظامات کر دیے گئے،[1] نیز شیاطین کو گندگی سے طبعی مناسبت ہوتی ہے، اس لیے جو مقام انسانی قضائے حاجت کے لیے ہوتے ہیں وہاں شیاطین کا ہجوم رہتا ہے تو گویا گھروں میں بیت الخلا تعمیر کرنا، وہاں شیاطین کے جمع ہونے کا مرکز قائم کرنا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت احادیث لا کر اس کا جواز ثابت کیا ہے کہ مکان میں ایک جانب بیت الخلا تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں، شیاطین تو اس گوشے میں جمع رہیں گے، البتہ ان کے برے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس دعا کی تلقین فرمادی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق احادیث میں ہے کہ قضائے حاجت کے لیے بہت دور جانا پسند کرتے تھے تاکہ آپ کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ دور جانا بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ مقصد پردہ ہے۔ اگر قریب ہی میں پردے کا اہتمام ہو جائے تو دور جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ گھر میں قضائے حاجت کے لیے بنائے گئے بیت الخلا سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہو جاتی ہے۔ ② اس عنوان کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے دو احادیث پیش فرمائی ہیں: پہلی حدیث میں شام کی طرف منہ کرنے کا ذکر ہے اور دوسری روایت میں بیت المقدس کے الفاظ ہیں، چونکہ یہ دونوں ایک ہی جہت میں واقع ہیں، اس لیے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے، نیز پہلی روایت میں استقبال شام کے ساتھ استدبار کعبہ کی بھی تصریح ہے۔[2] ③ مذکورہ دونوں روایات میں واقعہ تو ایک ہی بیان ہوا ہے، لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس گھر کو ایک روایت میں اپنی ہمشیرہ حضرت حفصہ (زوجۂ رسول ﷺ) کا گھر بتایا ہے اور دوسری روایت میں اسے اپنا گھر کہا ہے۔ اس کی توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ گھر تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تھا، لیکن ان کی وفات کے بعد ورثے میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آ گیا تھا، اس لیے دونوں ہی باتیں درست ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ گھروں کے اندر قبلے کی طرف منہ یا پیٹھ کا رخ کرنا جائز ہے۔

(١٥) بَابُ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْمَاءِ

باب:15- پانی سے استنجا کرنا

١٥٠ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي مُعَاذٍ، وَاسْمُهُ عَطَاءُ ابْنُ أَبِي مَيْمُونَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ أَجِيءُ أَنَا وَغُلَامٌ مَّعَنَا إِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ، يَعْنِي يَسْتَنْجِي بِهِ. [انظر: ١٥١، ١٥٢، ٢١٧، ٥٠٠]

[150] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے نکلتے تو میں اور ایک اور لڑکا اپنے ساتھ پانی کا ایک برتن لے کر آتے، (راویٔ حدیث ہشام کہتے ہیں) یعنی رسول اللہ ﷺ اس سے استنجا کرتے۔

فوائد و مسائل: ① پانی سے استنجا کرنے کے متعلق کچھ اختلاف ہوا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ پانی سے استنجا نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے ہاتھ میں بدبو باقی رہ جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق بھی روایت میں ہے کہ وہ پانی سے استنجا نہیں کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں کرتے تھے۔ بعض حضرات نے پانی سے استنجا

1 فتح الباري:329/1. 2 فتح الباري:325/1.

اس لیے درست نہیں خیال کیا کہ یہ پانی مشروبات سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کر کے اس موقف کی تردید فرمائی ہے۔[1] ② بعض لوگوں نے امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ عنوان کا ثبوت حدیث سے نہیں ملتا کیونکہ حدیث کے جس حصے سے عنوان کا تعلق ہے، وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان نہیں بلکہ وہ نیچے کے راوی ابوالولید ہشام کی وضاحت ہے۔ لیکن یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ روایات میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس بات کی صراحت ہے کہ یہ پانی استنجا کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے علاوہ بھی روایت کا حوالہ دیا ہے۔[3] ③ امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان سے یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پانی کے بجائے مٹی کے ڈھیلے بھی بطور استنجا استعمال کیے جا سکتے ہیں، لیکن پانی کا استعمال بہتر ہے کیونکہ مٹی کے ڈھیلوں سے عین نجاست تو دور ہو جاتی ہے لیکن اس کے اثرات باقی رہتے ہیں، جبکہ پانی کے استعمال سے نجاست اور اس کے اثرات و نشانات بھی زائل ہو جاتے ہیں۔ پانی اور ڈھیلوں کا جمع کرنا تو بالاتفاق افضل ہے۔ واللہ اعلم وعلمه أتم.

(١٦) بَابُ مَنْ حُمِلَ مَعَهُ الْمَاءُ لِطُهُورِهِ

باب: 16- دوسرے شخص کی طہارت کے لیے پانی ہمراہ لے جانا

وَقَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: أَلَيْسَ فِيكُمْ صَاحِبُ النَّعْلَيْنِ وَالطَّهُورِ وَالْوِسَادِ؟

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمھارے ہاں نعلین مبارک، آب طہارت اور تکیہ اٹھانے والا خادم موجود نہیں ہے؟

١٥١ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي مَيْمُونَةَ، قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُولُ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ تَبِعْتُهُ أَنَا وَغُلَامٌ مِّنَّا مَعَنَا إِدَاوَةٌ مِّنْ مَّاءٍ. [راجع: ١٥٠]

[151] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے باہر جاتے تو میں اور ہم میں سے ایک لڑکا آپ کے ساتھ ہو جاتے تھے اور ہمارے ساتھ پانی کی چھاگل ہوتی تھی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ استنجا کے سلسلے میں دوسرے سے مدد لینا جائز ہے، مثلاً: پانی کی ضرورت ہو تو خدمت گزار سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنا نہ تو مخدوم کے لیے استکبار ہے اور نہ خادم ہی کے لیے عار ہے۔ چھوٹوں کا بڑوں کی خدمت کرنا یا بڑوں کا چھوٹوں سے خدمت لینا، دونوں باتیں جائز ہیں۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کیا ہے جس کی وضاحت کچھ یوں ہے: حضرت علقمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں جب سرزمین شام گیا تو مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: اے اللہ! مجھے کسی نیک آدمی کی صحبت عطا فرما، چنانچہ مجھے سامنے سے ایک بزرگ آتے ہوئے نظر آئے، جب وہ میرے قریب ہوئے تو میں نے اپنے دل میں کہا شاید میری دعا قبول

---

① فتح الباري:329/1. ② صحيح البخاري، الوضوء، حديث:152. ③ فتح الباري:330/1.

ہوگئی ہے۔ انھوں نے پوچھا: تم کہاں سے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: کوفے کا رہنے والا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: کیا تمھارے ہاں رسول اللہ ﷺ کے نعلین مبارک، آب طہارت اور تکیہ وغیرہ اٹھانے والے نہیں ہیں؟[1] یعنی جب تمھارے پاس رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے والے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے حضرات موجود ہیں تو تمھیں یہ تمنا کیوں پیدا ہوئی کہ مجھے کسی اچھے آدمی کی صحبت میسر آئے۔ ② حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ جس لڑکے کا ذکر ہے، حضرت ابوالدرداء کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، یہ ضروری نہیں کہ چھوٹی عمر والے ہی پر لفظ ''غلام'' کا اطلاق ہوتا ہو، بلکہ مجازی طور پر بڑے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک مرتبہ عبداللہ بن مسعود کو فرمایا تھا کہ تو ایک عقلمند ''غلام'' ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔[2] بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طہارت کے لیے پانی وغیرہ کا اہتمام حضرت ابوہریرہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ روایت میں ''غلام'' سے مراد ان حضرات میں سے کوئی ہو۔[3]

(۱۷) بَابُ حَمْلِ الْعَنَزَةِ مَعَ الْمَاءِ فِي الْاِسْتِنْجَاءِ

باب: 17- استنجا کے لیے پانی کے ساتھ برچھی لے جانا

۱۵۲ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَطَاءِ ابْنِ أَبِي مَيْمُونَةَ، سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَدْخُلُ الْخَلَاءَ فَأَحْمِلُ أَنَا وَغُلَامٌ إِدَاوَةً مِّنْ مَّاءٍ وَّعَنَزَةً يَّسْتَنْجِي بِالْمَاءِ. تَابَعَهُ النَّضْرُ وَشَاذَانُ عَنْ شُعْبَةَ، اَلْعَنَزَةُ: عَصًا عَلَيْهِ زُجٌّ. [راجع: ۱۵۰]

[152] حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے جاتے تو میں اور ایک لڑکا پانی کی چھاگل اور ایک برچھی لے کر آپ کے ساتھ ہو جاتے۔ آپ پانی سے استنجا کرتے تھے۔

نضر اور شاذان نے حضرت شعبہ سے اس (محمد بن جعفر) کی متابعت کی ہے۔ عنزہ اس لاٹھی کو کہتے ہیں جس کے آگے لوہے کا پھل لگا ہو۔

فوائد و مسائل: ① پانی اور برچھی دونوں کا تعلق استنجا سے ہے: پانی کا تعلق تو ظاہر ہے اور اسے حدیث کے آخر میں بیان بھی کر دیا گیا ہے اور برچھی اس لیے ساتھ لے جاتے تاکہ سخت جگہ کو نرم کر کے پیشاب کے چھینٹوں سے بچا جا سکے، نیز سخت زمین سے ڈھیلے حاصل کرنے کے لیے بھی اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس سے اور بھی کام لیے جاتے تھے، مثلاً: ✱ موذی جانوروں اور دشمنوں کے شر سے بچنے کے لیے اسے کام میں لایا جاتا۔ ✱ اسے بوقت نماز بطور سترہ آگے گاڑ دیا جاتا۔ لیکن پانی کے ساتھ اسے لے جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس سے زمین کو نرم کیا جائے اور اس سے ڈھیلے حاصل کیے جائیں۔

1 صحيح البخاري، فضائل اصحاب النبي ﷺ، حديث:3761. ② صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث :3207. ③ فتح الباري:331/1.

رسول اللہ ﷺ کو پانی اور مٹی کے ڈھیلے استعمال کرنا پسند تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے پانی اور ڈھیلوں کا جمع کرنا ثابت فرمایا ہے۔ اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اس باب کو ''استنجا کے لیے پانی ہمراہ لے جانا،، اور ''پتھروں سے استنجا کرنا۔'' (جو آگے آ رہا ہے) ان دونوں کے درمیان بیان کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک پانی اور ڈھیلوں کا جمع کرنا سب سے بہتر عمل ہے۔ ② اس سے پہلے ہشام بن عبدالملک اور سلیمان بن حرب نے اسی روایت کو حضرت شعبہ سے بیان کیا ہے۔ ان کی بیان کردہ روایت میں عَنَزَة کا اضافہ نہیں ہے، اس بنا پر شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مذکورہ روایت میں شعبہ سے بیان کرنے والے محمد بن جعفر کے یہ الفاظ درست نہ ہوں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے متابعت بیان کر کے اس شبہے کا ازالہ فرمایا ہے کہ یہ اضافہ درست ہے، چنانچہ نضر بن شمیل کی روایت سنن نسائی (الطهارة، حديث:45) میں اور شاذان بن عامر کی روایت صحیح بخاری (الصلاة، حديث:500) میں ہے۔ ان روایات میں عَنَزَة کی صراحت ہے، نیز آخری روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب آپ قضائے حاجت سے فارغ ہو جاتے تو ہم پانی کا برتن آپ کو دے دیتے۔ ③ "يدخل الخلاء" سے مراد خلوت کی جگہ میدان وغیرہ ہے۔ گھروں میں بنے ہوئے بیت الخلا مراد نہیں کیونکہ گھر میں اس قسم کی خدمت اہل خانہ بجا لاتے تھے، نیز گھروں میں برچھی وغیرہ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی، پھر گزشتہ روایت میں اس کی وضاحت بایں الفاظ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اپنی حاجت کے لیے باہر جاتے۔

(١٨) بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْيَمِينِ

باب:18- دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے کی ممانعت

١٥٣ - حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ - هُوَ الدَّسْتَوَائِيُّ - عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ، وَإِذَا أَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمَسَّ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ، وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِينِهِ». [انظر: ١٥٤، ٥٦٣٠]

[153] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص کوئی چیز نوش کرے تو برتن میں سانس نہ لے، نیز جب بیت الخلا آئے تو دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو نہ چھوئے اور نہ اس سے استنجا کرے۔''

فوائد و مسائل: ① قضائے حاجت کے آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ استنجا کے لیے دایاں ہاتھ استعمال نہ کیا جائے کیونکہ قدرت نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر فضیلت دی ہے، اس لیے اس کی شرافت کا تقاضا ہے کہ اس سے ادنیٰ اور ارذل کام نہ لیے جائیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کھانے کے وقت دایاں ہاتھ استعمال ہوتا ہے، جب کھانا کھاتے وقت استنجا سے متعلقہ بات یاد آئے گی تو طبیعت میں تکدر اور ناگواری پیدا ہوگی۔ اہل ظاہر کے نزدیک یہ نہی حرمت کے لیے ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر دائیں ہاتھ سے استنجا کیا تو اس سے طہارت نہیں ہوگی جبکہ جمہور کے نزدیک یہ نہی تنزیہی ہے کیونکہ اس کا تعلق

آداب سے ہے۔[1] ② حدیث میں استنجا کے متعلق دو جملے استعمال ہوئے ہیں: پہلا یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے عضو مستور کو نہ چھوئے۔ اس کا تعلق پیشاب سے ہے۔ اور دوسرا جملہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرے۔ اس سے مراد ہے فراغت کے بعد دائیں ہاتھ کو اس کام کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ پیشاب کرتے وقت کبھی کبھی چھینٹوں سے بچنے کے لیے اس کی ضرورت پڑتی ہے اور فراغت کے بعد استنجا میں ڈھیلے یا پانی استعمال کرتے وقت ہاتھ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ حدیث نے وضاحت سے بتا دیا کہ ایسی چیزوں میں دائیں ہاتھ کا استعمال نامناسب ہے۔ یہ اس ہاتھ کی شرافت و منزلت کے خلاف ہے۔[2] ③ پانی پیتے وقت بھی برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے کیونکہ اس کا نقصان یہ ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی گندی بھاپ پانی کو مکدر کر دیتی ہے اور پانی دوسروں کے پینے کے قابل نہیں رہتا، نیز سانس لینے سے ممکن ہے کہ لعاب دہن یا ناک کی رطوبت پانی میں گر جائے۔ اس کے علاوہ یہ حیوانوں کی عادت ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ پانی کے برتن میں منہ ڈال دیتے ہیں تو پھر پانی بھی پیتے رہتے ہیں اور سانس بھی لیتے رہتے ہیں، لہٰذا شریعت نے پانی پیتے وقت برتن میں سانس لینے سے منع فرما دیا۔ اسلامی ادب یہ ہے کہ سانس لینے کے لیے برتن کو منہ سے الگ کر دیا جائے اور تین سانس لے کر پانی پیا جائے۔[3]

(١٩) بَابٌ: لَا يُمْسِكُ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ إِذَا بَالَ

باب: 19- پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے عضو مستور کو نہ پکڑے

١٥٤ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَوْزَاعِيُّ عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي قَتَادَةَ، عَنْ أَبِيهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَأْخُذَنَّ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ، وَلَا يَسْتَنْجِ بِيَمِينِهِ وَلَا يَتَنَفَّسْ فِي الْإِنَاءِ». [راجع: ١٥٣]

[154] حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے جب کوئی پیشاب کرے تو اپنے عضو مستور کو دائیں ہاتھ سے نہ تھامے اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے اور نہ برتن میں سانس ہی لے۔“

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرنا تو دور کی بات ہے، پیشاب کرتے وقت عضو مستور کو بھی دائیں ہاتھ سے نہیں چھونا چاہیے۔ دائیں ہاتھ کی قدر و منزلت کا تقاضا ہے کہ اسے ہر حالت میں عضو مستور سے الگ رکھا جائے اور اسے صرف اچھے کاموں میں استعمال کیا جائے۔ نامناسب اور مکروہ کاموں کے لیے بائیں ہاتھ کو کام میں لایا جائے۔ ② رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ پیشاب کرنے کے بعد وضو فرماتے اور وضو سے بچا ہوا پانی بھی بسا اوقات نوش فرما لیتے، ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز پیشاب کے آداب کے ساتھ پینے کے آداب سے آگاہ کیا گیا ہے، اس لیے فرمایا کہ برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے۔ یہ حکم بھی پانی پینے کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی

1 عمدة القاري:420/2. 2 عمدة القاري:420/2. 3 فتح الباري:333/1.

وضاحت ہے۔ جب تم میں سے کوئی برتن میں پانی پیے تو اسے برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے۔"[1] ③ ابوداود کی روایت میں ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہی سانس میں نہیں پینا چاہیے۔[2] صحیح بخاری کی روایت کا تقاضا ہے کہ انسان جب پانی نوش کرے تو برتن میں سانس نہ لے تا کہ سانس کے ذریعے سے جو جراثیم وغیرہ خارج ہوتے ہیں وہ پانی میں سرایت نہ کر جائیں اور ابوداود کی روایت میں پانی پینے کا ایک دوسرا ادب بیان کیا گیا ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہی سانس میں نہیں پینا چاہیے کیونکہ ایسا کرنا حیوانوں کا کام ہے بلکہ اپنی پیاس کو تین سانسوں میں بجھانا چاہیے۔ واللہ اعلم.

(٢٠) بَابُ الْاِسْتِنْجَاءِ بِالْحِجَارَةِ

١٥٥ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمَكِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدِ بْنِ عَمْرٍو الْمَكِّيُّ عَنْ جَدِّهِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: اِتَّبَعْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَخَرَجَ لِحَاجَتِهِ فَكَانَ لَا يَلْتَفِتُ، فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَقَالَ: «اِبْغِنِي أَحْجَارًا أَسْتَنْفِضْ بِهَا - أَوْ نَحْوَهُ - وَلَا تَأْتِنِي بِعَظْمٍ وَّلَا رَوْثٍ»، فَأَتَيْتُهُ بِأَحْجَارٍ بِطَرَفِ ثِيَابِي فَوَضَعْتُهَا إِلَى جَنْبِهِ وَأَعْرَضْتُ عَنْهُ، فَلَمَّا قَضَى أَتْبَعَهُ بِهِنَّ. [انظر: ٣٨٦٠]

باب:20-ڈھیلوں سے استنجا کرنا

[155] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دن نبی ﷺ قضائے حاجت کے لیے باہر گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے ہولیا۔ آپ (کی عادت مبارکہ تھی کہ چلتے وقت) دائیں بائیں نہ دیکھتے تھے۔ جب میں آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے فرمایا: "مجھے ڈھیلے تلاش کر دو، میں ان سے استنجا کروں گا...... یا اس کی مثل کوئی اور لفظ استعمال فرمایا...... لیکن ہڈی اور گوبر نہ لانا۔" چنانچہ میں اپنے کپڑے کے کنارے میں کئی ڈھیلے لے کر آیا اور انھیں آپ کے پاس رکھ دیا اور خود ایک طرف ہٹ گیا۔ پھر جب آپ قضائے حاجت سے فارغ ہوئے تو ڈھیلوں سے استنجا فرمایا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ان لوگوں کی تردید کرنا ہے جو ڈھیلوں سے استنجا کرنے کو ناجائز کہتے ہیں، یا پانی کی موجودگی میں ان کے استعمال کو ناروا خیال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا عمل پیش فرمایا ہے۔ آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ہدایت فرمائی کہ ہڈی اور گوبر مت لانا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہڈی اور گوبر کے علاوہ ہر جذب کرنے والی چیز جو کسی جاندار کی غذا نہ ہو، استنجا میں استعمال کی جاسکتی ہے۔ مٹی کے ڈھیلوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ ان میں رطوبت جذب ہو جاتی ہے۔[3] آج کل ٹشو پیپر صفائی کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی جاذب ہونے کی وجہ سے اس مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ ② ہڈی اور گوبر سے طہارت نہ کرنے کی دو وجہیں بیان ہوئی ہیں: ✱ ان دونوں سے تطہیر نہیں ہوتی، بعض روایات میں اس کی وضاحت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہڈی اور گوبر کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر وہ چیز جو تطہیر کے قابل نہ ہو، استنجا کے لیے بے کار ہے۔ لید کی نجاست تو ظاہر ہے۔ اس سے طہارت حاصل نہیں ہوتی بلکہ رطوبت کے ملنے سے اس کی نجاست دو چند ہو

① فتح الباري:834/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث:31. ③ فتح الباري:335/1.

جائے گی۔ ہڈی سے بھی تطہیر کا مقصد حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس میں جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی بلکہ چکنی ہونے کی وجہ سے نجاست کا ازالہ نہیں کرسکتی۔ * بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں جنات کی غذا ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس جن آئے اور انھوں نے زاد سفر کی درخواست کی تو میں نے انھیں ہڈی اور گوبر کا زاد دیا۔ وہ انھیں کھاتے نہیں بلکہ ان پر گوشت اور چارہ پیدا کر دیا جاتا ہے، یعنی ان کے ساتھ جنات کی غذا کا تعلق ہے۔ آپ نے اس لیے منع فرمایا تاکہ انھیں استنجا سے خراب نہ کیا جائے۔[1] ③ بعض روایات میں ہے کہ جنات نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ اپنی امت کو فرما دیں کہ وہ ہڈی، گوبر اور کوئلے سے استنجا نہ کیا کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں ہمارے لیے غذا رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استنجا میں مطعومات کا استعمال درست نہیں ہے اور یہ غذا کے احترام کی وجہ سے ہے، لہٰذا ہر وہ چیز جو کسی بھی حیثیت سے قابل احترام ہو، استنجا میں استعمال نہیں ہوگی۔ الغرض ہر وہ غیر محترم پاک چیز جو نجاست کے ازالے کی صلاحیت رکھتی ہو، استنجا کے لیے استعمال ہو سکتی ہے اور جس چیز میں جذب کی صلاحیت نہ ہو، خواہ وہ بے ضرر ہو اور قابل احترام بھی نہ ہو، اسے استنجا کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا، جیسے شیشہ وغیرہ کیونکہ اس سے نجاست کا ازالہ نہیں ہوتا۔[2] ④ خدام کی تین اقسام ہیں: * وہ خدام جو اپنے مخدومین کے رمز شناس ہوں اور ان کے کہنے کے بغیر ہی اپنے آقاؤں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوں۔ * وہ خدام جب انھیں اپنے مخدوم کی خدمت کا کہا جائے تو اس کی بجا آوری کو اپنے لیے سعادت مندی خیال کرتے ہوں۔ * وہ خدام جو کہنے کے باوجود بھی اس کی بجا آوری میں سست روی کا مظاہرہ کریں۔ عام طور پر مساجد کے خدام اسی طرح کے ہوتے ہیں، بقول شخصے، زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے خدام آپ کی خدمت میں پیش پیش رہنے کو اپنی سعادت خیال کرتے تھے اور آپ کے سامان طہارت کو قبل از استعمال تیار رکھتے تھے تاکہ آپ کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(٢١) بَابٌ: لَا يُسْتَنْجَى بِرَوْثٍ

باب: 21- لید وغیرہ سے استنجا نہ کیا جائے

١٥٦ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ: لَيْسَ أَبُو عُبَيْدَةَ ذَكَرَهُ، وَلٰكِنْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ الْأَسْوَدِ عَنْ أَبِيهِ: أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللهِ يَقُولُ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ الْغَائِطَ فَأَمَرَنِي أَنْ آتِيَهُ بِثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ، فَوَجَدْتُ حَجَرَيْنِ، وَالْتَمَسْتُ الثَّالِثَ فَلَمْ أَجِدْ، فَأَخَذْتُ رَوْثَةً فَأَتَيْتُهُ

[156] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ ایک دفعہ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے اور مجھے تین پتھر لانے کا حکم دیا، چنانچہ مجھے دو پتھر تو مل گئے۔ تلاش بسیار کے باوجود تیسرا نہ مل سکا تو میں نے (خشک) لید لی اور وہ آپ کے پاس لے آیا۔ آپ نے دونوں پتھر تو لے لیے اور لید کو پھینک دیا اور فرمایا:

---

1 فتح الباري:336/1. 2 فتح الباري:336/1.

بِهَا فَأَخَذَ الْحَجَرَيْنِ وَأَلْقَى الرَّوْثَةَ، وَقَالَ: هٰذَا رِكْسٌ. وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ بْنُ يُوسُفَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ الرَّحْمٰنِ.

''یہ پلید ہے۔''

امام بخاری ؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابراہیم بن یوسف نے بھی بیان کیا، وہ اپنے باپ یوسف سے، وہ ابواسحاق سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: مجھے یہ حدیث عبدالرحمٰن بن اسود نے بیان کی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ لید وغیرہ سے طہارت حاصل نہیں ہوتی، لہٰذا انھیں استنجا کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح ابن خزیمہ کی روایت میں وضاحت ہے کہ جو لید حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ اٹھا کر لائے تھے، وہ گدھے کی لید تھی، اس سے طہارت حاصل نہیں ہوتی بلکہ رطوبت کے ملنے سے اس کی نجاست دو چند ہو جاتی ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے جنات کو غذا میسر آتی ہے، اس لیے اسے بطور استنجا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ دراصل امام بخاری نے یہاں ایک فقہی اختلاف کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ڈھیلوں سے استنجا کا مقصد تطہیر نجاست ہے یا تقلیل نجاست؟ جن حضرات کے نزدیک تطہیر نجاست ہے ان کے نزدیک ہڈی یا لید وغیرہ سے استنجا نہیں ہوگا۔ امام بخاری کا رجحان اسی طرف ہے اور جن حضرات کے نزدیک اس سے مراد تقلیل نجاست ہے، ان کے نزدیک ہڈی اور خشک لید سے استنجا صحیح ہے اگرچہ خلاف سنت ہے۔ ② استنجا کے متعلق تین باتیں قابل غور ہیں: ✱ انقائے محل ✱ تثلیث ✱ ایتار۔ انقائے محل سے مراد بول و براز کے محل کو صاف کرنا ہے اور اس کے لیے کم از کم تین ڈھیلے استعمال کرنا تثلیث ہے۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو طاق تعداد میں استعمال کیے جائیں۔ اسے ایتار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حدیث میں صراحت ہے کہ تم میں سے کوئی تین ڈھیلوں سے کم تعداد میں استنجا نہ کرے۔[1] اور اگر تین ڈھیلوں سے انقائے محل کا مقصد حاصل نہ ہو تو تین سے زیادہ ڈھیلے استعمال ہو سکتے ہیں لیکن ان میں طاق تعداد کا لحاظ رکھنا ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ تم میں سے جب کوئی طہارت کے لیے ڈھیلے استعمال کرے تو طاق تعداد (وتر) کا لحاظ رکھے۔[2] لیکن امام طحاوی نے امام بخاری ؒ کی پیش کردہ حدیث سے ثابت کیا ہے کہ تین پتھروں کی رعایت ضروری نہیں، اگر صفائی دو پتھروں سے ہو جائے تو کافی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے۔[3] یہ استدلال اس لیے محل نظر ہے کہ بعض روایات میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کو تیسرا پتھر لانے کا حکم دیا۔[4] یہ صراحت دارقطنی (55/1) میں بھی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ طہارت کے لیے کم از کم تین پتھر ہونے ضروری ہیں اگرچہ ایک یا دو کے استعمال سے صفائی ہو جائے جیسا کہ عدت کے لیے تین حیض کا عدد مطلوب ہے اگرچہ استبرائے رحم کا مقصد ایک مرتبہ حیض آنے سے پورا ہو جاتا ہے۔[6] ③ امام بخاری نے ابواسحاق کے حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابوعبیدہ کے واسطے سے نہیں بلکہ عبدالرحمٰن بن اسود کے طریق سے ہے۔ دراصل امام ترمذی نے اس حدیث کے متعلق اپنے استاد حضرت امام بخاری ؒ سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے یہ روایت بایں سند ذکر کی ہے: [إسرائيل عن أبي إسحاق عن أبي عبيدة ......] اور اس

---

① صحيح مسلم، الطهارة، حديث:606(262). ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث:565(239). ③ شرح معاني الآثار:73/1.
④ مسند أحمد:450/1. ⑥ فتح الباري:337/1.

پر اعتماد کیا ہے، اور امام بخاری کی نقل کردہ مذکورہ روایت پر اعتراض کیا ہے۔ امام بخاری کی روایت بایں سند ہے: [زهير عن أبي إسحاق عن عبدالرحمن بن الأسود عن الأسود] امام ترمذی کی بیان کردہ روایت سند کے لحاظ سے عالی ہے لیکن امام بخاری نے اسے مرجوح قرار دیا ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہیں: ✱ زہیر، اسرائیل کے مقابلے میں زیادہ بلند مرتبہ ہے جیسا کہ امام ابوداود سے ابواسحاق سے روایت کرنے میں زہیر اور اسرائیل کا مرتبہ پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ زہیر، اسرائیل سے بہت زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ ✱ شریک قاضی اس روایت کی تائید میں زہیر کی متابعت کرتا ہے اور یہ متابعت قوی ہے۔ ✱ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسرائیل نے ابواسحاق سے عمر کے اس حصے میں سماع کیا ہے جبکہ انھیں اختلاط ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے خود صراحت کی ہے کہ ابوعبیدہ نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن مسعود سے کچھ نہیں سنا جبکہ زہیر کا طریق متصل ہے جیسا کہ خود امام بخاری نے بیان کیا ہے۔ ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے آخر میں ابراہیم بن یوسف کی متابعت ذکر کی ہے۔ دراصل سلیمان شاذکونی نے اس روایت کے پیش نظر ابواسحاق کو تدلیس کا الزام دیا ہے کہ اس روایت میں عبدالرحمٰن بن اسود سے بیان کرنے میں تحدیث یا اخبار کی صراحت نہیں ہے۔ امام بخاری نے اس الزام کا جواب دیا ہے کہ ابراہیم بن یوسف نے جب اس روایت کو بیان کیا ہے تو انھوں نے تحدیث کے صیغے سے نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابواسحاق پر تدلیس کا الزام غلط ہے اور امام بخاری پر مدلس سے روایت نقل کرنے کا اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔[1] ⑤ قضائے حاجت کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے وقت استنجا فرماتے تو اس کے بعد مٹی سے مل کر ہاتھوں کو پانی سے خوب صاف کرتے۔[2] مٹی کے بجائے ہاتھوں کو صابن وغیرہ سے بھی صاف کیا جا سکتا ہے۔

(٢٢) بَابُ الْوُضُوءِ مَرَّةً مَرَّةً

باب: 22- وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھونا

١٥٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: تَوَضَّأَ النَّبِيُّ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً.

[157] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے وضو میں اعضاء کو ایک ایک بار دھویا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے وضو کے آغاز میں اللہ کا نام لینے کے لیے بطور ثبوت جماع کے وقت دعا پڑھنے کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ جماع کے بعد استنجا کیا جاتا ہے، اس لیے استطراد کے طور پر قضائے حاجت کے آداب شروع کر دیے۔ ان سے فراغت کے بعد دوبارہ اصل مقصود، یعنی آداب وضو کی طرف رجوع فرمایا۔ وضو کے متعلق یہ مضمون کہ اعضائے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا جائے، آغاز میں سند کے بغیر بیان ہو چکا ہے، یعنی ایک ایک مرتبہ اعضاء دھونے سے فرض کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔ چونکہ ایک مسلمان کے لیے ہر وقت باوضو رہنا مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے، اس لیے استنجا کرنے کے بعد وضو کرتے وقت اعضائے وضو کے ایک ایک مرتبہ دھونے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عام حالات میں رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے وضو کرتے وقت

---

① فتح الباري:338/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث:45.

اعضاء کو تین تین مرتبہ دھوتے تھے۔ ایک ایک مرتبہ دھونے کی تین صورتیں ممکن ہیں: ٭ بیان جواز کے لیے۔ ٭ پانی کم ہونے کے پیش نظر۔ ٭ ہنگامی حالات کے وقت۔ بہر حال یہ بات ثابت شدہ ہے کہ نماز کی ادائیگی کے لیے وضو کرتے وقت اعضائے وضو کو کم از کم ایک ایک مرتبہ دھونا ضروری ہے، نیز یہ روایت مجمل ہے تفصیلی روایت پہلے بیان ہو چکی ہے۔[1] اس وضاحت کے بعد ''امام تدبر'' کی بھی سنیے جو امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ گویا امام صاحب کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ''قضائے حاجت کے مضمون کو طہارت اور وضو کے تحت بیان کرنا مناسب نہیں تھا۔ امام صاحب کو چاہیے تھا کہ اس مقصد کے لیے الگ عنوان قائم کرتے۔''[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''امام تدبر'' کے نزدیک آداب قضائے حاجت کا طہارت اور وضو سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل مزعومہ تدبر کی آڑ میں حدیث اور اصحاب الحدیث کا استخفاف مقصود ہے جو ان حضرات کی تالیفات میں بکثرت موجود ہے۔

(٢٣) بَابُ الْوُضُوءِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ

باب: 23- وضو میں اعضاء کو دو، دو بار دھونا

١٥٨ - حَدَّثَنَا الْحُسَيْنُ بْنُ عِيسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا يُونُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ.

[158] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے اعضائے وضو کو دو، دو بار دھویا۔

فوائد و مسائل: ① ابن عیینہ نے بیان کیا ہے کہ راوئ حدیث وہی عبداللہ بن زید ہیں جنھوں نے حدیث اذان کو بیان کیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں کیونکہ وہ عبداللہ بن زید بن عبد ربہ قبیلۂ بنو حارثہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری قبیلۂ بنو مازن سے متعلق ہیں، البتہ دونوں خزرجی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے خود اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[3] راوئ حدیث سے کتب حدیث میں 42 احادیث مروی ہیں جبکہ صاحب اذان سے حدیث اذان کے علاوہ کوئی حدیث مروی نہیں۔[4] ② اعضاء کا دو، دو مرتبہ دھونا سنت کا دوسرا درجہ ہے اور ایسا کرنا حدیث سے ثابت ہے۔ اگرچہ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ امام بخاری نے خود بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا، کلی اور ناک میں تین تین مرتبہ پانی ڈالا اور چہرے کو بھی تین مرتبہ دھویا، پھر کلائیوں کو کہنیوں تک دو دو مرتبہ دھویا۔[5] لہذا باب اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ وضو کرتے وقت بعض اعضاء دو، دو مرتبہ اور بعض کو تین، تین دفعہ دھونے کا بیان۔ لیکن اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ راوئ حدیث اپنا مشاہدہ بیان کر رہا ہے کہ انھوں نے ایک شاگرد (عباد بن تمیم) کو ایک، ایک مرتبہ دھونے کا مشاہدہ بیان فرمایا اور دوسرے شاگرد

① صحيح البخاري، الطهارة، حديث:140. ② تدبر حدیث:259/1. ③ صحيح البخاري، الاستسقاء، حديث:1012. ④ عمدة القاري:356/2. ⑤ صحيح البخاري، الوضوء، حديث:191.

(یحییٰ المازنی) کو دو دو یا تین تین دفعہ دھونے کا ذکر کر دیا۔[1]

(٢٤) بَابُ الْوُضُوءِ ثَلَاثًا ثَلَاثًا

١٥٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ الْأُوَيْسِيُّ قَالَ: حَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيدَ أَخْبَرَهُ أَنَّ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا بِإِنَاءٍ، فَأَفْرَغَ عَلَى كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِينَهُ فِي الْإِنَاءِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثَ مِرَارٍ، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ إِلَى الْكَعْبَيْنِ، ثُمَّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [انظر: ١٦٠، ١٦٤، ١٩٣٤، ٦٤٣٣]

١٦٠ - وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: قَالَ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ: قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: وَلٰكِنْ عُرْوَةُ يُحَدِّثُ عَنْ حُمْرَانَ: فَلَمَّا تَوَضَّأَ عُثْمَانُ قَالَ: أَلَا أُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا لَوْلَا آيَةٌ مَا حَدَّثْتُكُمُوهُ، سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «لَا يَتَوَضَّأُ رَجُلٌ يُحْسِنُ وُضُوءَهُ، وَيُصَلِّي الصَّلَاةَ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الصَّلَاةِ حَتَّى يُصَلِّيَهَا». قَالَ عُرْوَةُ: الْآيَةَ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا﴾ [البقرة: ١٥٩].

[راجع: ١٥٩]

باب: 24- وضو میں اعضاء کو تین، تین بار دھونا

[159] حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مولیٰ حمران سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ پانی کا برتن منگوایا اور اپنے ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈال کر انھیں دھویا، پھر دائیں ہاتھ کو برتن میں ڈال کر پانی لیا، کلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور اسے صاف کیا۔ پھر اپنے منہ اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت تین دفعہ دھویا۔ بعد ازاں سر کا مسح کیا، پھر اپنے پاؤں ٹخنوں سمیت تین بار دھوئے۔ پھر کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی میرے اس وضو کی طرح وضو کرے اور اس کے بعد دو رکعت ادا کرے اور ان کی ادائیگی کے دوران میں کوئی خیال دل میں نہ لائے تو اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔''

[160] جناب حمران ہی سے روایت ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کر لیا تو فرمایا: میں تمھیں ایک حدیث نہ سناؤں؟ اگر قرآن میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تمھیں وہ حدیث نہ سناتا۔ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو شخص اچھی طرح وضو کرے اور نماز پڑھے، تو جتنے گناہ اس نماز سے دوسری نماز تک ہوں گے، وہ بخش دیے جائیں گے۔'' حضرت عروہ نے کہا: وہ آیت یہ ہے: ''بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کردہ کھلی آیات اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، اس کے بعد کہ ہم کتاب میں انھیں لوگوں کے لیے صاف بیان کر چکے ہیں، ان پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

---

1 عمدة القاري:436/2.

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اعضائے وضو کو تین تین بار دھونا بھی مستحب و مسنون ہے لیکن اس روایت میں ہاتھ اور چہرے کو تین تین دفعہ دھونے کا ذکر ہے لیکن کلی کے لیے منہ میں اور ناک میں پانی ڈالنے کے متعلق مرات کا ذکر نہیں لیکن چونکہ یہ دونوں چہرے میں شامل ہیں اور چہرے ہی کے باطن کے ساتھ ان کا تعلق ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا عمل بھی تین تین بار ہوگا۔ سر کے مسح کے ساتھ بھی مرات کا ذکر نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ آئندہ ایک مستقل عنوان قائم کر کے ثابت کریں گے کہ سر کا مسح ایک ہی بار ہے۔ اگرچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضرت عطاء اور حضرت ابراہیم التیمی سے سر کا مسح تین دفعہ کرنا منقول ہے لیکن صحیح موقف یہی ہے کہ سر کا مسح ایک مرتبہ ہی ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن شہاب زہری سے دو روایات نقل کی ہیں۔ دراصل امام زہری کے دو استاذ ہیں: ایک حضرت عطاء بن ابی یزید، جس میں ہے کہ وضو کے بعد اخلاص کے ساتھ دو رکعت ادا کرنے سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے استاذ حضرت عروہ بن زبیر ہیں جس میں وضو کے بعد مطلق طور پر نماز پڑھنے کا ذکر ہے اور اس میں ان گناہوں کی تحدید کی گئی ہے جو اس عمل مبارک سے معاف ہو جائیں گے، یعنی جو اس نماز سے دوسری نماز تک ہوں گے، نیز اس آخری روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی ایک آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ حدیث بیان فرمائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کا ذکر نہیں فرمایا، البتہ حضرت عروہ نے آیت کریمہ کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اس بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں: ● اس حدیث میں معمولی سے عمل پر غیر معمولی اجر وثواب کا وعدہ ہے، ممکن ہے کہ کوئی سننے والا اسے مبالغہ یا کسی راوی کے سہو و نسیان پر محمول کرے، پھر میرے اس بیان کی تکذیب کر ڈالے جو دراصل رسول اللہ ﷺ کی تکذیب ہوگی، اس اندیشۂ تکذیب کے پیش نظر میں اسے بیان نہیں کرنا چاہتا لیکن قرآن کریم کی اس آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کرتا ہوں جس میں کتمانِ علم پر وعید ہے۔ ● اس عمل پر جو غیر معمولی اجر وثواب کا وعدہ ہے، اس پر انسان فریب اور دھوکے میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اب گناہ معاف ہو گئے ہیں مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کی اس فریب خوردگی کی بنا پر دل نہیں چاہتا کہ اسے بیان کروں لیکن مجھے کتمانِ علم کی وعید کا خوف ہے، اس لیے بیان کرتا ہوں۔ اس اندیشے کا خود رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا ہے، چنانچہ امام بخاری نے رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ بھی نقل فرمائے ہیں: ''اس قدر اجر وثواب ملنے پر دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔''[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ سہل پسند لوگوں کو اس بات پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے کہ پروانۂ مغفرت ملنے کے بعد اب دیگر اعمال کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ انہیں سوچنا چاہیے کہ جب اس معمولی کام پر اس قدر ثواب کی بشارت ہے تو بڑے بڑے کاموں کے بجالانے پر اللہ کی عنایات کا کیا عالم ہوگا، اس لیے زیادہ سے زیادہ عمل خیر کی کوشش ہونی چاہیے۔ فریب نفس میں مبتلا ہو کر اعمال خیر کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ ③ امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بعد جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ''بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔''[2] اس آیت کے پیش نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہ مطلب ہوگا کہ مجھے تکذیب کے ڈر سے یہ بات ذکر نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن قرآن کریم سے اس بیان کی تائید ہو رہی ہے کہ نیکیاں کرنے سے برائیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی اس تائید کے بعد مجھے خطرہ نہیں کہ یہ حدیث عوام الناس کے لیے کسی تردد کا باعث ہوگی۔[3] ④ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کے بعد

---

① صحیح البخاري، الرقاق، حدیث:6433. ② ھود11:114. ③ مؤطا إمام مالك، الطهارة، حدیث:160.

دو رکعت تحیۃ الوضوء ہیں لیکن ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تحیۃ المسجد ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص وضو کرنے کے بعد مسجد میں آئے اور دو رکعت ادا کرے تو اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔① لیکن اس بشارت کے لیے شرط یہ ہے کہ انھیں حضور قلب سے ادا کیا جائے، دوران نماز میں خیالات منتشر نہ ہوں، از خود خیالات کو دعوت نہ دی جائے۔ اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آ رہے ہیں تو وہ چنداں نقصان دہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے از خود آنے والے خیالات و وساوس سے درگزر فرمایا ہے۔⑤ فضائل اعمال کے سلسلے میں جہاں جہاں مغفرت کا ذکر ہے، اس سے مراد صغیرہ گناہوں کی معافی ہے، اس لیے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرک، قتل ناحق اور زنا جیسے کبیرہ گناہوں کی سزا بیان کرنے کے بعد [اِلَّا مَنْ تَابَ] ''مگر جو شخص ان میں سے توبہ کرے'' سے استثنا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں کی تلافی کے لیے توبہ ضروری ہے۔ صغیرہ گناہوں کی تلافی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کو قرار دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اگر تم ممنوعات کی بڑی بڑی باتوں سے اجتناب کرو گے تو ہم تمھارے صغیرہ گناہوں کو تم سے خود ہی معاف کر دیں گے۔''② پھر اچھے کام کرنا از خود برائیوں کو مٹا دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ''بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔''③ گناہوں کی بخشش کا قرآنی ضابطہ یہی ہے۔ احادیث میں بھی اس کی وضاحت ہے کیونکہ ایک نماز سے دوسری نماز تک کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب نہ ہو۔④ جمعہ ادا کرنے سے دوسرے جمع تک کفارہ بن جاتا ہے بشرطیکہ کبائر کا ارتکاب نہ کرے۔⑤ اسی طرح ایک رمضان کے روزے رکھنے سے دوسرے رمضان تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں جبکہ کبائر سے اجتناب کیا جائے۔⑥

اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ مذکورہ احادیث میں جو بشارت دی گئی ہے وہ صغیرہ گناہوں سے متعلق ہے، کبیرہ گناہ اور حقوق العباد اس میں شامل نہیں اگرچہ بعض اہل علم نے اسے عام رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی حدیث کے مطابق وضو کرے گا اور نماز پڑھے گا تو اسے خود بخود ندامت ہوگی جو توبہ کے لیے اساس ہے، نیز مومن کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کبائر کا ارتکاب کرے اور اگر کبھی بشری تقاضے کے مطابق انکا صدور ہو جائے تو اسے توبہ کیے بغیر چین ہی نہیں آتا [وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ]۔ احادیث میں اکیلے وضو کے متعلق یہ فضیلت ہے کہ آدمی کے ہاتھوں، منہ اور پاؤں سے سرزد ہونے والے گناہ ان کے دھونے سے معاف ہو جاتے ہیں، پھر اس کا مسجد کی طرف آنا اور نماز ادا کرنا ایک اضافی عمل ہوتا ہے جو رفع درجات کا باعث بن جاتا ہے۔⑦ نماز کے متعلق بھی احادیث میں آیا ہے کہ جو شخص وضو کرتا ہے اور نماز پنجگانہ ادا کرتا ہے، اس سے اس کے گناہوں کی میل کچیل اس طرح صاف ہو جائے گی جس طرح گھر کے آگے بہنے والی نہر میں پانچ دفعہ نہانے سے صفائی ہو جاتی ہے۔⑧ لیکن بعض لوگوں کا ''تدبر'' قرآن وحدیث میں ٹکراؤ پیدا کر کے احادیث کے انکار کی راہ ہموار کرتا ہے،

① صحیح البخاري، الرقاق، حدیث:6433. ② النساء4:31. ③ هود11:114. ④ صحیح مسلم، الطهارة، حدیث:543(228).
⑤ صحیح مسلم، الطهارة، حدیث:550(233). ⑥ صحیح مسلم، الطهارة، حدیث:552(233). ⑦ صحیح مسلم، الطهارة، حدیث:577(244). ⑧ صحیح البخاري، مواقیت الصلاة، حدیث:528.

چنانچہ ''امام تدبر'' نے لکھا ہے: ''بخشش کا یہ سستا نسخہ قرآن کے خلاف پڑتا ہے۔''[1] ⑥ حدیث میں نماز اور وضو دونوں کا ذکر ہے اور یہ ایک اتفاقی امر ہے، بصورت دیگر اگر کوئی شخص پہلے سے وضو کیے ہوئے ہے اور اس نے نماز ادا کی تو اسے بھی مغفرت حاصل ہوگی۔ اگر اس سے پہلے کوئی ایسا کام کیا جس سے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو حدیث میں بیان شدہ عمل خیر ترقیٔ درجات کا باعث ہوگا۔ اگر کسی کے کبیرہ گناہ ہیں تو امید ہے کہ اس بابرکت عمل سے ان کی سنگینی کو ضرور ہلکا کر دیا جائے گا۔[2]

(٢٥) بَابُ الْاِسْتِنْثَارِ فِي الْوُضُوءِ

باب: 25- وضو میں ناک صاف کرنا

ذَكَرَهُ عُثْمَانُ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ زَيْدٍ، وَابْنُ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ.

اسے حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے۔

وضاحت: ناک میں پانی چڑھا کر اسے نکالنے کے لیے پردۂ بینی کو حرکت دینے کا نام استنثار ہے تاکہ جمع شدہ رطوبت سے ناک کو صاف کیا جائے۔ اسے ناک جھاڑنے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ عمل بائیں ہاتھ سے ہونا چاہیے جیسا کہ امام نسائی نے اس کے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے لیے ایک حدیث بھی لائے ہیں۔[3] امام مالک نے ہاتھ کے بغیر عمل استنثار کو مکروہ خیال کیا ہے کیونکہ یہ حیوانات کا فعل ہے۔ ناک میں پانی چڑھاتے وقت خوب مبالغہ کیا جائے، البتہ روزے دار کو مبالغے کی اجازت نہیں۔ حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔[4] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پہلے (نمبر 159) گزر چکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث آئندہ (نمبر 185) بیان ہوگی اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث پہلے (نمبر 140) بیان ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس میں ناک جھاڑنے کا ذکر نہیں ہے لیکن صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں ناک جھاڑنے کے الفاظ موجود ہیں، تاہم امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کی طرف اشارہ فرمایا جس میں صراحت کے ساتھ اس کا ذکر ہے۔[5] اسی طرح ابوداود طیالسی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً ان الفاظ کو نقل فرمایا ہے جس کی سند حسن ہے۔[6]

١٦١ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُو إِدْرِيسَ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: «مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوتِرْ». [انظر: ١٦٢]

[161] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وضو کرے، وہ ناک صاف کرے اور جو ڈھیلے سے استنجا کرے، وہ طاق ڈھیلے لے۔''

فوائد و مسائل: ① روایات سے ثابت ہے کہ شیطان خیشوم (نتھنوں) میں بیٹھ کر فاسد اثرات دماغ پر ڈالتا ہے۔[7] اس

① تدبر حدیث: 262/1. ② عمدة القاري: 450/2. ③ سنن النسائي، الطهارة، حديث: 91. ④ سنن النسائی، الطهارة، حديث: 87.
⑤ مسند أحمد: 228/1. ⑥ فتح الباري: 343/1. ⑦ صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث: 3295.

سے معلوم ہوا کہ ناک شیطان کی نشست گاہ ہے۔ وہ اسے اپنی آماجگاہ اس لیے بناتا ہے کہ ایک طرف تو غبار اڑ اڑ کر اس میں پہنچتا ہے، دوسری طرف دماغ کی فاسد رطوبات بھی اسی جگہ جمع ہوتی ہیں، گویا ناک میں اندر اور باہر دونوں طرف سے گندگی جمع ہوتی رہتی ہے اور شیطان کو گندگی سے خاص مناسبت ہے، اس لیے اسے صاف کرنے کا حکم ہے، نیز اگر فاسد رطوبات ناک میں جمع رہیں تو سانس لینے اور قراءت کرنے میں بھی تکلف ہوتا ہے، خاص طور پر غنے کی ادائیگی تو خیشوم سے ہوتی ہے، اس لیے اسے صاف کرنا ضروری ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ اسے واجب خیال کرتے ہیں، بظاہر امام بخاری رحمہ اللہ بھی ان کے ہم نوا ہیں، نیز یہاں امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور صیغۂ امر میں وجوب ہوتا ہے الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ آ جائے۔ اگرچہ جمہور کے نزدیک یہ سنت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کو وضو کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا تھا: ''وضو کر جیسا کہ تجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔'' اور آیت کریمہ میں ناک میں پانی ڈالنے اور اسے صاف کرنے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ استدلال اس لیے محل نظر ہے کہ ایک لحاظ سے منہ اور ناک چہرے ہی کا حصہ ہیں جس کے دھونے کا اللہ نے حکم دیا ہے، نیز حدیث میں اللہ کے حکم سے مراد رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے جو اللہ کے حکم پر مبنی ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ترک ثابت نہیں۔ اگرچہ اس روایت میں تین دفعہ ناک صاف کرنے کا حکم نہیں ہے، تاہم دیگر روایات میں اس کی صراحت ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب کوئی اپنی نیند سے بیدار ہو تو وضو کرتے وقت ناک کو تین دفعہ صاف کرے کیونکہ شیطان اس کے خیشوم میں شب باشی کرتا ہے۔[1] ناک صاف کرتے وقت بعض روایات میں طاق عدد کا لحاظ رکھنے کا حکم ہے۔[2] لیکن یہ حکم وجوب کے لیے نہیں ہے کیونکہ بعض روایات میں جفت عدد پر اکتفا بھی ثابت ہے۔[3] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے ناک صاف کرنے کو کلی کرنے سے پہلے بیان فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ منہ کی نسبت ناک میں زیادہ تستر (پوشیدگی) ہے۔ گویا منہ ظاہر ہے اور ناک اس کا باطن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر کی صفائی بھی ضروری ہے لیکن باطن کی تطہیر زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک وضو کرتے وقت اعضاء کے دھونے میں ترتیب ضروری نہیں، اس لیے اسے مقدم کیا ہے لیکن یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

(٢٦) بَابُ الْاِسْتِجْمَارِ وِتْرًا

باب: 26- استنجا میں طاق ڈھیلے استعمال کرنا

١٦٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ فِي أَنْفِهِ مَاءً ثُمَّ لِيَنْتَثِرْ، وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوتِرْ، وَإِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِّنْ نَّوْمِهِ

[162] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو اپنی ناک میں پانی ڈالے اور اسے صاف کرے۔ اور جو شخص ڈھیلے سے استنجا کرے تو طاق ڈھیلوں سے کرے۔ اور جب تم میں سے کوئی سو کر اٹھے تو وضو کے پانی میں اپنے ہاتھ ڈالنے

1 صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث:3295. 2 مسند حميدي، حديث:957. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:141.

فَلْيَغْسِلْ يَدَهُ قَبْلَ أَنْ يُدْخِلَهَا فِي وَضُوئِهِ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَا يَدْرِي أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهُ». [راجع: ١٦١]

سے پہلے انھیں دھو لے کیونکہ تم میں سے کسی کو خبر نہیں کہ رات کے وقت اس کا ہاتھ کہاں کہاں پھرتا رہا ہے۔‘‘

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ جب استنجا کے لیے ڈھیلوں کا استعمال کیا جائے تو طاق عدد اختیار کرنا چاہیے، نیز وہ بتانا چاہتے ہیں کہ استجمار کے معنی استنجا میں ڈھیلوں کا استعمال ہی ہے۔ اس کا مطلب رمی جمار یا کفن کو دھونی دینا نہیں جیسا کہ بعض حضرات کا خیال ہے۔[1] ② امام بخاری ؒ نے پہلے استنجا کے مسائل سے فراغت کے بعد وضو کے احکام شروع فرمائے تھے، اب انھوں نے دوبارہ استنجا کے متعلق یہ عنوان قائم کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری جب کسی حدیث میں کوئی نئی چیز دیکھتے ہیں تو اس پر ایک عنوان قائم کر دیتے ہیں، اسے باب در باب کہا جاتا ہے چونکہ باب سابق جو وضو سے متعلق ہے اس کے تحت جو حدیث ذکر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے: ’’جو ڈھیلے سے استنجا کرے وہ طاق ڈھیلے لے۔‘‘ بس انھی الفاظ کی مناسبت سے یہ عنوان قائم کر دیا اگرچہ وضو سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ استنجا اور استنثار میں گندگی کی صفائی قدر مشترک ہے، اس لحاظ سے طاق تعداد بھی مشترک ہونی چاہیے۔ ③ امام شافعی ؒ نے لکھا ہے کہ عرب میں قضائے حاجت کے بعد مٹی کے ڈھیلے استعمال کرنے کا رواج تھا، پھر رات سخت گرمی میں پسینہ آنے کے بعد محل نجاست پر بحالت نیند ہاتھ لگنے کا اندیشہ رہتا یا اس کے علاوہ جسم کے کسی ایسے مقام پر لگنے کا بھی احتمال ہے جو انسان کے لیے ناگواری کا باعث ہو، اس لیے نیند سے بیدار ہونے کے بعد ہاتھ برتن میں ڈالنے سے پہلے دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہاتھوں کو دھونے کا حکم کیوں ہے؟ جبکہ سوئے ہوئے آدمی کے زیر استعمال کپڑے کے ملوث ہونے کے زیادہ خدشات ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کپڑوں کو پانی میں ڈالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور پھر اگر کپڑا آلودہ ہو جائے تو اس کا نقصان صرف کپڑا پہننے والے تک محدود ہوتا ہے جبکہ ہاتھ پلید ہونے کی صورت میں پانی کے خراب ہونے کا خدشہ ہے جس سے دوسرے لوگ بھی متأثر ہوں گے، اس لیے ہاتھوں کو دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔[2]

(٢٧) بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ [وَلَا يَمْسَحُ عَلَى الْقَدَمَيْنِ]

باب: 27- دونوں پاؤں دھونے چاہییں، قدموں پر مسح نہیں کرنا چاہیے

١٦٣ - حَدَّثَنِي مُوسَى قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بِشْرٍ، عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: تَخَلَّفَ النَّبِيُّ ﷺ عَنَّا فِي سَفْرَةٍ فَأَدْرَكَنَا وَقَدْ أَرْهَقْنَا الْعَصْرَ فَجَعَلْنَا نَتَوَضَّأُ وَنَمْسَحُ عَلَى أَرْجُلِنَا فَنَادَى بِأَعْلَى

[163] حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ ایک سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر آپ نے ہم کو پالیا جبکہ عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ ہم وضو کرنے لگے اور جلدی جلدی پاؤں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ آپ نے دو یا تین مرتبہ بلند آواز سے پکار کر کہا: ’’ایڑیوں

① فتح الباري: 344/1. ② فتح الباري: 347/1.

صَوْتِهِ: «وَيْلٌ لِّلأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ» مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا. [راجع: ٦٠]

کے لیے آگ کا عذاب ہے۔"

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وضو کرتے وقت پاؤں کا وظیفہ انھیں دھونا ہے، ان پر مسح کرنا نہیں۔ دلیل میں جو روایت پیش فرمائی ہے، اس میں وضاحت ہے کہ عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے پاؤں دھونے کے بجائے جلدی جلدی ان پر مسح کرنے لگے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے خشک ایڑیوں کے متعلق وعید سنائی کہ یہ ایڑیاں جہنم میں جائیں گی۔ اگر پاؤں کا وظیفہ مسح ہوتا تو مسح کرتے وقت کسی کے نزدیک بھی استیعاب ضروری نہیں ہے، اس لیے اس قدر سخت وعید کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وظیفہ تو ادا ہو چکا تھا لیکن چونکہ پاؤں کا وظیفہ دھونا ہے اور اس میں استیعاب (پورے پاؤں پر ہاتھ پھیرنا) ضروری ہے، لہٰذا اس کوتاہی پر رسول اللہ ﷺ نے انھیں وعید شدید سنائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خالی پاؤں کا دھونا ضروری ہے، مسح کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ استدلال اس صورت میں ہے کہ "تَمْسَحُ" کے معنی حقیقی مسح کیا جائے لیکن اگر یہ معنی کیے جائیں کہ ہم اپنے ہاتھ پانی سے تر کرکے پاؤں پر پھیرنے لگے جس سے ایڑیوں کے کچھ حصے خشک رہ گئے تو بھی استدلال صحیح ہے کہ پاؤں کو اچھی طرح دھونا ہے اور اس میں استیعاب ہے، یعنی ان کا کوئی حصہ بھی خشک نہ رہے۔ ② اس عنوان کو یہاں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ پہلے باب میں استنثار کا بیان تھا کہ ناک میں پانی پہنچانا ضروری ہے، کپڑے سے صاف کر لینا کافی نہیں کیونکہ ہم لوگ احکام شریعت کے پابند ہیں، اپنی طرف سے ان میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے، لہٰذا اگر شریعت نے کسی عضو کے متعلق غسل ضروری قرار دیا ہے تو ہمارے لیے جائز نہیں کہ ہم یہ سوچ کر کہ مقصود تو صفائی ہے، لہٰذا دھونے کے بجائے کپڑے سے صفائی کر لیں، ایسا کرنا جائز نہیں۔ جس طرح خالی پاؤں کو دھونا ضروری ہے اسی طرح ناک میں پانی ڈال کر اسے اچھی طرح صاف کرنا ضروری ہے، نیز ناک بدن کی اعلیٰ جانب ہے اور پاؤں بدن کی نچلی جانب ہے، اس لیے ناک کے بعد قدم کا وظیفہ بتایا گیا ہے۔ ③ اس روایت سے شیعہ حضرات کی تردید ہوتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک پاؤں کا وظیفہ غسل نہیں بلکہ مسح ہے اور وہ اس روایت کا یہ جواب دیتے ہیں کہ لوگوں کی ایڑیاں نجاست آلود تھیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انھیں دھونے کا حکم دیا لیکن ہمیں ان حضرات کی عقل وفکر پر حیرت ہوتی ہے۔ اگر ایک دو آدمیوں کی ایڑیاں نجاست آلود ہوتیں تو بات بن سکتی تھی کیا تمام حضرات کی ایڑیوں پر نجاست لگی ہوئی تھی اور انھیں اس کے دور کرنے کا خیال تک نہ آیا، حالانکہ نجاست کا ازالہ حدث کے ازالے سے زیادہ ضروری ہوتا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں پاک کرنے کا حکم نہیں فرمایا کہ تمھاری ایڑیاں نجاست آلود ہیں انھیں دھو کر پاک کرو۔ دراصل ان حضرات نے پورے دین کا ڈھانچہ ازسرنو تشکیل دیا ہے، اذان، اوقات نماز، طریقۂ نماز، زکاۃ، الغرض ہر چیز الگ وضع کر رکھی ہے حتی کہ موجودہ قرآن کریم کے متعلق ان کے ہاں شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں۔

(٢٨) بَابُ الْمَضْمَضَةِ فِي الْوُضُوءِ

باب: 28- وضو میں کلی کرنا

قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ زَيْدٍ عَنِ

اس حکم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن

النَّبِيِّ ﷺ.

زید رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے نقل فرمایا ہے۔

وضاحت: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث (140) پہلے گزر چکی ہے اور حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بیان شدہ حدیث (185) آئندہ آئے گی۔

١٦٤ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَطَاءُ بْنُ يَزِيدَ عَنْ حُمْرَانَ مَوْلَى عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ أَنَّهُ رَأَى عُثْمَانَ ابْنَ عَفَّانَ دَعَا بِوَضُوءٍ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ مِنْ إِنَائِهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَمِينَهُ فِي الْوَضُوءِ، ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، وَيَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ ثَلَاثًا، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ غَسَلَ كُلَّ رِجْلٍ ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَوَضَّأُ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا، وَقَالَ: «مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غَفَرَ اللهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ». [راجع: ١٥٩]

[164] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت حمران سے روایت ہے، انھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا، پھر اسے اپنے دیکھا، انھوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا، پھر اسے اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالا اور انھیں تین مرتبہ دھویا، اس کے بعد اپنا دایاں ہاتھ برتن میں ڈالا، کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا، پھر اسے صاف کیا۔ بعد ازیں اپنا چہرہ تین مرتبہ دھویا، اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک تین بار دھوئے، پھر سر کا مسح کیا، پھر ہر پاؤں کو تین دفعہ دھویا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو اپنے اس وضو کی طرح وضو کرتے دیکھا ہے، نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور دو رکعت بایں طور پڑھیں کہ اپنے دل سے باتیں نہ کیں تو اللہ تعالیٰ اس کے سابقہ گناہ معاف کر دے گا۔''

فائدہ: وضو میں کلی کرنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کلی سمیت وضو فرمایا ہے اور کسی صحابی سے اس کا ترک ثابت نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا حکم بھی مروی ہے جو واجب الاتباع ہے، چنانچہ لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے فرمایا: ''جب تو وضو کرنے لگے تو کلی کر۔''[1] بہر حال وضو میں استنشاق کی طرح کلی بھی مطلوب ہے، البتہ استنشاق میں زیادہ تاکید ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے استنشاق اور استنثار کو مضمضے (کلی) پر مقدم کیا ہے، حالانکہ عمل کے لحاظ سے کلی پہلے ہے۔

(٢٩) بَابُ غَسْلِ الْأَعْقَابِ

باب: 29 - ایڑیوں کا دھونا

وَكَانَ ابْنُ سِيرِينَ يَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ إِذَا تَوَضَّأَ.

حضرت ابن سیرین وضو کرتے وقت انگوٹھی کی جگہ بھی دھویا کرتے تھے۔

وضاحت: حضرت ابن سیرین کے عمل کو امام بخاری رحمہ اللہ نے التاریخ الکبیر (262/1) میں اور ابن ابی شیبہ نے

[1] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 144.

المصنف (74/1) میں موصولاً بیان کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگوٹھی ذرا کھلی تھی جسے حرکت دینے سے نیچے پانی پہنچ جاتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اتار کر موضع خاتم کو دھوتے ہوں، مبادا اسے پہنے ہوئے اس کے نیچے کی جگہ خشک رہ جائے۔ معلوم ہوا کہ اگر زیور بدن تک پانی کے پہنچنے میں رکاوٹ بنتا ہو تو اسے ہلا جلا کر یا اتار کر عضو کو دھونا چاہیے۔[1]

١٦٥ - حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ زِيَادٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ وَكَانَ يَمُرُّ بِنَا وَالنَّاسُ يَتَوَضَّؤُنَ مِنَ الْمِطْهَرَةِ، قَالَ: أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ، فَإِنَّ أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ قَالَ: «وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ».

[165] محمد بن زیاد کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا، جب وہ ہمارے پاس سے گزرتے اور لوگ برتن سے وضو کر رہے ہوتے تو فرماتے: لوگو! وضو پورا کرو کیونکہ ابوالقاسم ﷺ نے فرمایا: ''خشک ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''

فائدہ: حدیث میں ایڑیوں کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ اس وقت ان سے متعلقہ صورت حال سامنے آئی تھی بصورت دیگر اس سے مراد ہر وہ عضو وضو ہے جسے اچھی طرح دھونے میں عام طور پر بے پروائی یا سستی سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً: ایڑیاں اور پاؤں کا نچلا حصہ وغیرہ، چنانچہ حدیث میں اس کی مزید وضاحت ہے۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خشک ایڑیوں اور پاؤں کے تلووں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔''[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن سیرین کا عمل اسی مقصد کے لیے بیان فرمایا ہے کیونکہ بعض اوقات انگوٹھی تنگ ہوتی ہے اور سہولت کے ساتھ پانی نہیں پہنچ پاتا، اس لیے آپ اسے حرکت دیتے۔[3] اسی طرح عام طور پر عورتیں اپنے چہرے کے میک اپ کے لیے ایسی اشیاء استعمال کرتی ہیں کہ اعضائے وضو تک پانی پہنچانے کے لیے ان کی جمی ہوئی تہ رکاٹ بن جاتی ہے، مثلاً: ہونٹوں کے لیے لپ سٹک، چہرے کے لیے تہ دار پاؤڈر اور ناخن پالش وغیرہ، لہٰذا خواتین کو چاہیے کہ ایسے سامان زیبائش کے استعمال سے اجتناب کریں جو اعضائے وضو کی جلد تک پانی پہنچانے کے لیے رکاوٹ کا باعث ہو، ہاں مخصوص ایام میں اپنے خاوند کے لیے اس طرح کا سامان زینت استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں۔

(٣٠) بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ فِي النَّعْلَيْنِ وَلَا يَمْسَحُ عَلَى النَّعْلَيْنِ

باب: 30- جوتوں پر مسح کرنے کے بجائے انھیں پہنے ہوئے پاؤں دھونا

١٦٦ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ سَعِيدٍ الْمَقْبُرِيِّ، عَنْ عُبَيْدِ بْنِ جُرَيْجٍ أَنَّهُ قَالَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ رَأَيْتُكَ تَصْنَعُ أَرْبَعًا لَّمْ أَرَ أَحَدًا مِّنْ أَصْحَابِكَ

[166] حضرت عبید بن جریج سے روایت ہے، انھوں نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میں آپ کو چار ایسی چیزیں کرتے دیکھتا ہوں جو آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی نہیں کرتا۔ حضرت

1 فتح الباري:350/1 . 2 مسند أحمد:191/4 . 3 فتح الباري:350/1 .

يَصْنَعُهَا، قَالَ: وَمَا هِيَ يَا ابْنَ جُرَيْجٍ؟ قَالَ: رَأَيْتُكَ لَا تَمَسُّ مِنَ الْأَرْكَانِ إِلَّا الْيَمَانِيَيْنِ، وَرَأَيْتُكَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِيَّةَ، وَرَأَيْتُكَ تَصْبُغُ بِالصُّفْرَةِ، وَرَأَيْتُكَ إِذَا كُنْتَ بِمَكَّةَ أَهَلَّ النَّاسُ إِذَا رَأَوُا الْهِلَالَ وَلَمْ تُهِلَّ أَنْتَ حَتَّى كَانَ يَوْمُ التَّرْوِيَةِ، قَالَ عَبْدُ اللهِ: أَمَّا الْأَرْكَانُ فَإِنِّي لَمْ أَرَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَمَسُّ إِلَّا الْيَمَانِيَيْنِ، وَأَمَّا النِّعَالُ السِّبْتِيَّةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِي لَيْسَ فِيهَا شَعَرٌ وَّيَتَوَضَّأُ فِيهَا، فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَلْبَسَهَا، وَأَمَّا الصُّفْرَةُ فَإِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَصْبُغُ بِهَا، فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَصْبُغَ بِهَا، وَأَمَّا الْإِهْلَالُ فَإِنِّي لَمْ أَرَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُهِلُّ حَتَّى تَنْبَعِثَ بِهِ رَاحِلَتُهُ. [انظر: ١٥١٤، ١٥٥٢، ١٦٠٩، ٢٨٦٥، ٥٨٥١]

ابن عمر ؓ نے فرمایا: ابن جریج! وہ کیا؟ میں نے عرض کیا: میں دیکھتا ہوں کہ آپ حجر اسود اور رکن یمانی کے علاوہ بیت اللہ کے کسی کونے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ (دوسرے) آپ سبتی جوتے پہنتے ہیں اور (تیسرے) زرد خضاب استعمال کرتے ہیں۔ (چوتھے) مکے میں دوسرے لوگ تو ذوالحجہ کا چاند دیکھتے ہی احرام باندھ لیتے ہیں مگر آپ آٹھویں تاریخ تک احرام نہیں باندھتے۔ حضرت ابن عمر ؓ نے جواب دیا: بیت اللہ کے کونوں کو چھونے کی بات تو یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں یمانی رکنوں کے علاوہ اور کسی رکن کو ہاتھ لگاتے نہیں دیکھا۔ اور سبتی جوتوں کے متعلق یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسی جوتیاں پہنے دیکھا جن پر بال نہ تھے اور آپ ان میں وضو فرماتے تھے، لہٰذا میں ان جوتیوں کو پہننا پسند کرتا ہوں۔ اور جہاں تک زرد خضاب کی بات ہے تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو زرد خضاب استعمال کرتے دیکھا ہے، اس لیے میں بھی اسے استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ اور احرام باندھنے کی بات یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس وقت تک احرام باندھتے نہیں دیکھا جب تک آپ کی سواری آپ کو لے کر سیدھی کھڑی نہ ہو جاتی (یعنی آٹھویں ذوالحجہ کو)۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ وضو کرتے وقت پاؤں کا وظیفہ انھیں دھونا ہے، خواہ جوتا ہی کیوں نہ پہنا ہو۔ اگر پاؤں موزوں یا جرابوں میں نہیں ہیں تو ان کا دھونا معین ہے بصورت دیگر ان پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جوتوں کو موزوں کا حکم دے کر ان پر مسح کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اگر وضو کرنے والا جوتا پہنے ہوئے ہے تو وضو کے وقت دو صورتیں ممکن ہیں: * جوتا پہنے ہوئے پاؤں دھوئے جائیں۔ یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ پاؤں میں چپل، سوفٹی وغیرہ ہو کیونکہ بند جوتے میں پاؤں نہیں دھوئے جا سکتے۔ رسول اللہ ﷺ سے جوتا پہنے پہنے پاؤں دھونا ثابت ہے، چنانچہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کے وقت نعلین کی موجودگی میں پاؤں پر پانی ڈالا پھر انھیں ادھر ادھر موڑا تاکہ پانی پاؤں کے تمام حصوں تک پہنچ جائے۔[1] نعل سے مراد عربی جوتا ہے جو چپل کی طرح ہوتا ہے۔ اس سے بند

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 117، عن علي، و حديث: 137، عن ابن عباس.

جوتا مراد نہیں۔ * دوسری صورت یہ ہے کہ جوتا اتار کر پاؤں دھوئے جائیں۔ اس میں کوئی تکلف نہیں ہوتا بلکہ پاؤں دھونے میں آسانی رہتی ہے۔ امام بخاری کا استدلال لفظ یتوضأ فیھا سے ہے کیونکہ وضو میں اصل غسل اعضاء ہے۔ لفظ توضأ دھونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نیز اگر مسح کیا ہوتا تو یتوضأ فیھا کے بجائے یتوضأ علیھا ہونا چاہیے تھا۔ ② امام بخاری نے اس عنوان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، دوسرا جز بایں الفاظ ہے کہ جوتوں پر مسح نہ کیا جائے۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ ان روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جن میں جوتوں پر مسح کرنے کا ذکر ہے، مثلاً: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ انھوں نے وضو کرتے وقت جوتوں پر مسح کیا اور نماز پڑھی۔[1] اس سلسلے میں ایک مرفوع روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جوتوں پر مسح فرمایا۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے جن روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی صحت اور ضعف میں اختلاف ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے ان روایات کو صحیح کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (تمام المنة، ص:(113-115) و فتاویٰ الدین الخالص: 2/359-363)، دلائل کے اس اختلاف کی وجہ سے اہل علم کا ایک گروہ جوتوں پر مسح کے جواز کا قائل ہے جبکہ بعض اہل علم اسے ناجائز کہتے ہیں۔ دلائل کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسح کرنے کی گنجائش موجود ہے، تاہم چپل نما جوتوں پر مسح نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ③ عرب فطری طور پر سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ جوتوں کے متعلق ان کا عمومی ذوق یہ تھا کہ اونٹ، بکری کی کھال کو خشک کیا، اسے کاٹ کر اس میں تسمے لگا لیے، ان کے یہی جوتے ہوتے تھے۔ لیکن عرب کے علاوہ دوسرے لوگ چمڑے کو دباغت سے خشک کرتے، ان کے بال وغیرہ دور کرتے، پھر اس چمڑے کو جوتے میں استعمال کرتے، جن جوتوں پر بال نہ ہوتے انھیں سبتی جوتا کہا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس قسم کے سبتی جوتے بطور تحفہ آتے اور آپ انھیں استعمال فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چونکہ شدید الاتباع تھے، اس لیے جہاں سے اس قسم کا جوتا ملتا وہ اسے حاصل کرتے اور پہنتے تھے۔ ان پر اعتراض ہوا تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کا جوتا پہنتے دیکھا ہے۔ پھر آپ نے ضمناً یہ بات بیان فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ ان میں وضو کرتے تھے، یعنی ان پر مسح نہیں کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس ضمنی بات سے ایک اہم مسئلہ مستنبط فرمایا۔ روایت میں بیان شدہ دیگر مسائل کے متعلق کتاب الحج اور کتاب اللباس میں بحث ہوگی۔

(٣١) بَابُ التَّيَمُّنِ فِي الْوُضُوءِ وَالْغَسْلِ

باب:31- وضو اور غسل میں دائیں جانب سے شروع کرنا

١٦٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدٌ عَنْ حَفْصَةَ بِنْتِ سِيرِينَ، عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ لَهُنَّ فِي غَسْلِ ابْنَتِهِ: «اِبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ

[167] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کے غسل کے متعلق عورتوں سے فرمایا: ”غسل دائیں جانب اور وضو کے مقامات سے شروع کریں۔“

---

[1] سنن الكبرىٰ للبيهقي: 1/287. [2] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 159.

مِنْهَا». [انظر: ١٢٥٣، ١٢٥٤، ١٢٥٥، ١٢٥٦، ١٢٥٧، ١٢٥٨، ١٢٥٩، ١٢٦٠، ١٢٦١، ١٢٦٢، ١٢٦٣]

١٦٨ - حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَشْعَثُ بْنُ سُلَيْمٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فِي تَنَعُّلِهِ، وَتَرَجُّلِهِ، وَطُهُورِهِ، وَفِي شَأْنِهِ كُلِّهِ. [انظر: ٤٢٦، ٥٣٨٠، ٥٨٥٤، ٥٩٢٦]

[168] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب نبی ﷺ نے جوتا پہننا ہوتا، کنگھی کرنی یا پاکی حاصل کرنی ہوتی، الغرض آپ کو ہر ذی شان کام میں دائیں جانب سے آغاز کرنا اچھا لگتا تھا۔

فوائد ومسائل: ① عربی زبان میں تیمُّن کے کئی معنی ہیں، مثلاً: دائیں جانب سے ابتدا کرنا، دائیں ہاتھ سے کوئی چیز لینا، تبرک حاصل کرنا اور قسم کھانا، وغیرہ۔ امام بخاری ؒ نے حضرت ام عطیہ ؓ کی مذکورہ حدیث سے تیمن کا معنی متعین فرمایا کہ اس سے مراد دائیں جانب سے آغاز کرنا ہے۔ یہ لفظ سیدہ عائشہ ؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہر کام میں تیمن پسند تھا۔[1] امام بخاری کی عنوان بندی کے متعلق معروف عادت ہے کہ جب انھیں کسی زیر بحث مسئلے کے استدلال میں تنگی نظر آتی ہے تو عنوان کو وسعت دینے کے لیے اس کے ساتھ اسی طرح کی کوئی اور چیز شامل کر دیتے ہیں جس سے مطلب حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی وضو میں دائیں جانب سے آغاز کے متعلق جب احادیث میں تنگی نظر آئی تو آپ نے وضو کے ساتھ غسل کا مسئلہ شامل کر دیا تاکہ غسل کے متعلق مسئلۂ تیمن سے وضو میں دائیں جانب سے آغاز کرنے کا مسئلہ واضح ہو جائے کیونکہ اس مسئلے میں غسل اور وضو کا حکم یکساں ہے، چنانچہ جب غسل میت کے وضو میں دائیں جانب سے شروع کرنا مطلوب ہے تو پھر نماز کے وضو میں یہ رعایت بدرجۂ اولیٰ ملحوظ رہنی چاہیے۔ ② رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کو غسل دینے کے متعلق جو ہدایات دی تھیں، ان میں دو باتیں ہیں: * دائیں جانب سے شروع کرنا۔ * مقامات وضو سے شروع کرنا۔ ان دونوں باتوں پر بیک وقت عمل کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ غسل کا آغاز اعضائے وضو سے اسی طرح کیا جائے کہ پہلے میت کا دایاں ہاتھ دھویا جائے پھر بایاں ہاتھ، اسی طرح جب پاؤں دھونے کی نوبت آئے تو پہلے دایاں پاؤں پھر بایاں پاؤں دھویا جائے۔ اس کے بعد تمام جسم کو غسل دیا جائے۔ ③ امام بخاری ؒ نے حدیث عائشہ ؓ کو دوسرے نمبر پر بیان کیا ہے، حالانکہ اس میں لفظ ''طہور'' موجود ہے جو وضو کرتے وقت دائیں جانب سے شروع کرنے کے متعلق بڑی وزنی دلیل ہے لیکن آپ نے اپنے عنوان کے لیے اس حدیث کو بنیاد نہیں بنایا کیونکہ اس حدیث میں تیمن اور طہور کے الفاظ اشتراک واجمال کی وجہ سے مقصد کے لیے نص نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ لفظ تیمُّن دائیں جانب سے شروع کرنے، قسم کھانے، تبرک حاصل کرنے اور دائیں ہاتھ سے لینے کے معانی میں مشترک ہے، اسی طرح لفظ طہور میں اجمال ہے کہ اس سے مراد بدن کی طہارت ہے یا کپڑے کی، پھر اس سے مراد غسل ہے یا وضو، انھی وجوہات کی بنا پر امام بخاری نے حدیث عائشہ ؓ کو دوسرا درجہ دیا اور حدیث ام عطیہ کو پہلا درجہ دے کر اس سے

---

① فتح الباري:358/1.

مسئلہ زیر بحث ثابت فرمایا۔ ④ دائیں جانب اختیار کرنے کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ جن امور کا تعلق تکریم و تعظیم اور تزئین و تحسین سے ہے، وہ دائیں جانب سے شروع کیے جائیں، مثلاً: لباس زیب تن کرنا، موزے پہننا، مسجد میں داخل ہونا، مسواک کرنا، سرمہ لگانا، ناخن کاٹنا، مونچھیں مونڈنا، بالوں میں کنگھی کرنا، بغلوں کے بال اکھاڑنا، سر منڈوانا، نماز میں سلام پھیرنا، اعضائے طہارت دھونا، بیت الخلا سے نکلنا، کھانا، پینا، مصافحہ کرنا، حجر اسود کو بوسہ دینا وغیرہ۔ اور جو امور ان کے برعکس ہیں ان میں بائیں جانب اختیار کی جائے، مثلاً: بیت الخلا میں داخل ہونا، مسجد سے نکلنا، استنجا کرنا، ناک صاف کرنا، کپڑے یا موزے یا جرابیں اتارنا، وغیرہ، نیز بعض اعضائے وضو ایسے بھی ہیں جن میں دائیں یا بائیں کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا بلکہ انھیں یکبار ہی دھونا پڑتا ہے، مثلاً: ہاتھ، کان، رخسار وغیرہ۔[1] ⑤ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حتی المقدور دائیں جانب کا اہتمام کرتے۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ دائیں جانب اختیار کرنے میں اگر کوئی رکاوٹ آجائے تو پھر بائیں جانب اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[3]

(٣٢) بَابُ الْتِمَاسِ الْوَضُوءِ إِذَا حَانَتِ الصَّلَاةُ

باب: 32- نماز کا وقت آجانے پر وضو کے لیے پانی تلاش کرنا

وَقَالَتْ عَائِشَةُ: حَضَرَتِ الصُّبْحُ فَالْتُمِسَ الْمَاءُ فَلَمْ يُوجَدْ فَنَزَلَ التَّيَمُّمُ.

اور حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: صبح کی نماز کا وقت آ گیا، پانی تلاش کیا گیا تو نہ ملا، آخر تیمم کی آیت اتری۔

وضاحت: اس معلق روایت کو امام بخاری ؒ نے سند کے ساتھ بھی بیان کیا ہے۔ اس میں وہ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جب حضرت عائشہ ؓ کے ہار کے گم ہونے کی وجہ سے ایک مقام پر پڑاؤ کرنا پڑا جہاں پانی نہیں تھا، بالآخر آیت تیمم نازل ہوئی۔[4]

١٦٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ، وَحَانَتْ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَالْتَمَسَ النَّاسُ الْوَضُوءَ فَلَمْ يَجِدُوا، فَأُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِوَضُوءٍ فَوَضَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي ذٰلِكَ الْإِنَاءِ يَدَهُ، وَأَمَرَ النَّاسَ أَنْ يَتَوَضَّؤُوا مِنْهُ، قَالَ: فَرَأَيْتُ الْمَاءَ يَنْبُعُ مِنْ تَحْتِ أَصَابِعِهِ حَتّٰى تَوَضَّؤُوا مِنْ عِنْدِ آخِرِهِمْ. [انظر: ١٩٥، ٢٠٠، ٣٥٧٢،

[169] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا، لوگوں نے وضو کے لیے پانی تلاش کیا مگر نہ ملا۔ آخر رسول اللہ ﷺ کے پاس (ایک برتن میں) وضو کے لیے پانی لایا گیا تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اس برتن میں رکھ دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس سے وضو کریں۔ حضرت انس ؓ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ پانی آپ کی انگشت ہائے مبارک کے نیچے سے پھوٹ رہا تھا، یہاں تک کہ سب لوگوں نے وضو کر لیا۔

---

1 عمدة القاري:472/2. 2 صحيح البخاري، الصلاة، حديث:426. 3 فتح الباري:354/1. 4 صحيح البخاري، التفسير، حديث:4608.

٣٥٧٣، ٣٥٧٤، ٣٥٧٥]

فوائد و مسائل: ① اس عنوان کا مقصد یہ ہے کہ وضو کے لیے پانی کی تلاش اس وقت ضروری ہوگی جب نماز کا وقت آجائے کیونکہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق جب نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ ہو تو وضو کرنا چاہیے، یعنی طہارت کا یہ فریضہ نماز کا وقت آنے پر عائد ہوتا ہے، اس لیے پانی کی تلاش بھی وقت آنے پر ہی ضروری ہوگی، اس سے پہلے پانی کی تلاش کا مکلف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جس نے وقت آنے پر پانی تلاش کیا اور نہ ملنے کی صورت میں تیمم کیا، اسے ملامت نہیں کی جائے گی کہ اس نے قبل از وقت پانی تلاش کیوں نہیں کیا۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہ ؓ کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے کہ ایک سفر میں میرا ہار گم ہو جانے کی وجہ سے قافلے کو اس منزل سے پہلے ٹھہرنا پڑا جہاں پانی ملنے کی توقع تھی۔ پانی نہ ملنے کے سبب پریشانی ہوئی تو آیت تیمم نازل ہوئی۔ عنوان بایں طور ثابت ہوا کہ پانی کی تلاش وقتِ نماز کے بعد کی گئی۔ پانی نہ ملنے پر لوگوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا کہ تم نے پہلے سے بندوبست کیوں نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وقت سے پہلے پانی کی تلاش ضروری نہیں۔ ② حدیث انس ؓ میں رسول اللہ ﷺ کے ایک معجزے کا ذکر ہے کہ آپ کی انگشتہائے مبارک سے پانی کے چشمے پھوٹے جس سے تمام صحابۂ کرام ؓ نے وضو کیا۔ اس واقعے سے امام بخاری ؒ نے ایک اہم مسئلے پر تنبیہ فرمائی ہے کہ بلاشبہ پانی کی تلاش اس وقت ضروری ہوگی جب نماز کا وقت آجائے گا لیکن تلاش کے بعد پانی نہ ملنے کی صورت کیا ہے؟ وہ اس حدیث سے معلوم ہو رہی ہے کہ پانی نہ ملنے کی معتاد اور غیر معتاد تمام صورتیں ختم ہو جائیں تو تیمّم کیا جاسکتا ہے لیکن اگر کسی غیر معتاد طریقے سے پانی ملنے کا امکان ہو تو تیمّم جائز نہ ہوگا۔ اگر غیر معتاد صورت بھی ختم ہو جائے تو تیمّم جائز ہوگا، یعنی جب تک تمام ظاہری اور غیر ظاہری اسباب ختم نہ ہو جائیں اور ہر طرف سے مایوسی نہ ہو جائے اس وقت تک تیمّم کرنا جائز نہیں۔ اس حدیث کا عنوان سے گہرا تعلق ہے لیکن جو لوگ احادیث بخاری کے متعلق شبہات و تشکیک پیدا کرنے کے خوگر ہیں وہ کسی نہ کسی انداز میں اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ''امام تدبر'' لکھتے ہیں: ''امام صاحب نے باب میں تعلیق صبح کی نماز کی دی ہے جبکہ روایت نماز عصر سے متعلق ہے اور اس میں تیمّم کی نوبت نہیں آئی۔''[1] یہ ہے ان حضرات کا مبلغ علم اور سوچ بچار کا محور! اب انھیں کون بتائے کہ تعلیق کا واقعہ اور ہے اور روایت میں اس کے علاوہ دوسرا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ③ رسول اللہ ﷺ کے اس معجزے کو حضرت انس ؓ سے کئی ایک راوی بیان کرتے ہیں۔ تمام روایات کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو الگ واقعات ہیں، چنانچہ حسن بصری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کسی سفر میں رونما ہوا تھا اور اس میں حاضرین کی تعداد ستر اسی کے لگ بھگ تھی۔[2] جبکہ حضرت قتادہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت مدینے کی نواحی آبادی زوراء میں تھے اور اس پانی سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔[3] حافظ ابن حجر ؒ فرماتے ہیں کہ تعدد واقعات پر محمول کرنے کے علاوہ جمع و تطبیق کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔[4] ④ بخاری کے شارح ابن بطال نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ واقعہ بے شمار صحابۂ کرام ؓ کے سامنے رونما ہوا لیکن حضرت انس کے علاوہ اسے کوئی دوسرا بیان کرنے والا نہیں۔[5] قاضی عیاض نے ان کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ اس واقعے کو عدد کثیر نے

① تدبر حدیث:1/272. ② صحیح البخاري، المناقب، حدیث:3574. ③ صحیح البخاري، المناقب، حدیث:3572. ④ فتح الباري:6/714. ⑤ شرح ابن بطال:1/264.

جم غفیر سے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے قاضی عیاض کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جابر، ابن مسعود، ابن عباس اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ اس کے علاوہ پانی کے زیادہ ہونے کے معجزے کو حضرت عمران بن حصین، حضرت براء بن عازب، حضرت ابوقتادہ، حضرت زیاد بن حارث صدائی اور حضرت حبان الصدائی رضی اللہ عنہم بھی بیان کرتے ہیں جو مختلف کتب حدیث میں مروی ہے۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان روایات وطرق کے بعد ابن بطال کا نام لے کر ان کے دعوائے بے بنیاد کی تردید کی ہے لیکن جو حضرات تدبر کی آڑ میں احادیث بخاری کا استخفاف اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کی سعی نامشکور کرنے کے درپے رہتے ہیں انھوں نے اندھیرے میں بایں الفاظ تیر پھینکا ہے: ''اس روایت میں ایک مشکل یہ ہے کہ موقع ایسا ہے جب بہت سے لوگوں نے وضو کیا اور یہ معجزہ دیکھا ہوگا، لہٰذا یہ واقعہ متعدد طریقوں سے نقل ہونا چاہیے تھا لیکن حضرت انس کے سوا اور کسی سے اس کی روایت نہیں ہے۔ قاضی عیاض کا دعویٰ ہے کہ اس کے راوی بے شمار ہیں، یہ تواتر سے ثابت ہے اور اس پر اجماع ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ وہ روایات ہیں کہاں! ابن حجر کو بھی یہ بات کھٹکی ہے کہ اتنے اہم واقعہ کے ایک ہی راوی ہیں۔''[2] اس عبارت میں کس قدر دجل وفریب سے کام لیا ہے اور محدثین کے متعلق کس قدر زہر اگلا ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ دراصل یہ حضرات جاہلی ادب پڑھتے پڑھتے احادیث کے متعلق جہالت کا شکار ہیں۔ قاتلهم الله أنى يؤفكون. اس حدیث کے متعلق دیگر تفصیلات کتاب المناقب میں بیان ہوں گی۔

(٣٣) بَابُ الْمَاءِ الَّذِي يُغْسَلُ بِهِ شَعَرُ الْإِنْسَانِ

باب: 33- اس پانی کا حکم جس سے انسان کے بال دھوئے گئے ہوں

وَكَانَ عَطَاءٌ لَّا يَرٰى بِهِ بَأْسًا أَنْ يُّتَّخَذَ مِنْهَا الْخُيُوطُ وَالْحِبَالُ. وَسُؤْرِ الْكِلَابِ وَمَمَرِّهَا فِي الْمَسْجِدِ وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءٍ لَّيْسَ لَهُ وَضُوءٌ غَيْرُهُ يَتَوَضَّأُ بِهِ وَقَالَ سُفْيَانُ: هٰذَا الْفِقْهُ بِعَيْنِهِ، بِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا﴾ [النساء: ٤٣] وَهٰذَا مَاءٌ وَفِي النَّفْسِ مِنْهُ شَيْءٌ يَتَوَضَّأُ بِهِ وَيَتَيَمَّمُ.

حضرت عطاء انسانی بالوں سے سوت اور رسیاں بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، نیز کتوں کے جوٹھے پانی اور ان کے مسجد میں آنے جانے کا حکم۔ حضرت امام زہری فرماتے ہیں کہ جب کتا برتن میں منہ ڈال جائے اور اس کے علاوہ پانی نہ ہو تو اسی سے وضو کر لیا جائے۔ حضرت سفیان کہتے ہیں: ارشاد باری: ''تم پانی نہ پاؤ تو تیمم کر لو'' سے یہی بات سمجھ میں آئی ہے کیونکہ کتے کا جوٹھا بھی پانی ہی ہے لیکن اس کے استعمال سے دل میں کراہت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا اس پانی سے وضو بھی کر لے اور تیمم بھی کر لے۔

وضاحت: حضرت عطاء بن ابی رباح کے اس قول کو محمد بن اسحاق فاکہی نے صحیح سند کے ساتھ اپنی کتاب ''اخبار مکہ'' میں

[1] فتح الباري:715/6. [2] تدبر حديث:271/1.

بیان کیا ہے کہ وہ حج کے موقع پر منیٰ میں جمع شدہ انسانی بالوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔[1] اسی طرح امام زہری کے قول کو ولید بن مسلم نے اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے۔ سفیان ثوری کا اثر بھی اسی کتاب میں منقول ہے۔ امام ابن عبدالبر نے اپنی کتاب التمہید میں بھی ذکر کیا ہے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت تین مسئلے بیان کیے ہیں: ✱ انسانی بالوں کا حکم جب انھیں جسم سے الگ کر دیا جائے۔ ✱ کتے کے پس خوردہ کی شرعی حیثیت۔ ✱ مسجد میں کتوں کے آنے جانے کا حکم۔

پہلے مسئلے کا مدار اس بات پر ہے کہ انسانی بال جسم سے الگ ہونے کے بعد طہارت پر قائم رہتے ہیں یا ناپاک ہو جاتے ہیں؟ اگر ناپاک ہیں تو ان کے پانی میں گرنے سے پانی بھی ناپاک ہو جائے گا اور اگر ناپاک نہیں ہیں تو ان کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انسان کے جسم سے بال الگ ہو کر ناپاک ہو جاتے ہیں جبکہ جمہور علماء کے نزدیک وہ اپنی طہارت پر قائم رہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان جمہور کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ انسانی بال جسم سے الگ ہونے کے بعد ناپاک نہیں ہوتے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم بھی ان بالوں کی طہارت کے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب غسل فرماتے تھے تو بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کے لیے ان کا خلال بھی کرتے تھے، ایسا کرنے سے عموماً مردہ بال گر جاتے ہیں، بعض اوقات پانی میں گرنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ سے ایسے پانی کے متعلق اجتناب کا کوئی حکم یا عمل مروی نہیں۔[3]

کتے کے پس خوردہ کے متعلق امام بخاری کا موقف کیا ہے؟ شارحین نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔ علامہ عینی اور بعض دوسرے شراح امام بخاری کو جمہور کے ساتھ رکھتے ہیں کہ امام صاحب اس کی نجاست کا موقف رکھتے ہیں، یعنی اگر کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو پانی ناپاک ہو جائے گا اور برتن کو دھونا ضروری ہوگا، البتہ حافظ ابن حجر اور شاہ ولی اللہ کا رجحان یہ ہے کہ امام بخاری کے نزدیک کتے کا پس خوردہ پاک ہے، باقی رہا برتن کا دھونا تو وہ ایک تعبدی امر ہے۔ ہمارا رجحان اس کے متعلق پہلے موقف کی طرف ہے۔ امام بخاری نے اسی سلسلے میں امام زہری کا قول پیش کیا ہے کہ ان کے نزدیک اگر دوسرا پانی مل جائے تو یہ پانی ناپاک ہے جس میں کتے نے منہ ڈال دیا ہے اس سے وضو جائز نہیں، اگر دوسرا پانی نہ ملے تو بامر مجبوری اس سے وضو کیا جاسکتا ہے۔ سفیان ثوری کے نزدیک یہ پانی مشکوک ہے، لہٰذا وضو اور تیمم دونوں کر لے۔ امام مالک کے نزدیک پانی کی نجاست کا دارومدار اس کی تبدیلی پر ہے، اگر تغیر ہو تو ناپاک بصورت دیگر پاک ہے۔ پانی میں بالوں کے گرنے سے کوئی تغیر نہیں ہوتا، اس لیے پانی پاک ہے، اسی طرح ولوغ کلب سے بھی کوئی تبدیلی نہیں آتی، لہٰذا جب بالوں کے گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا تو کتے کے ولوغ (چاٹنے) سے بھی ناپاک نہیں ہوگا۔ اسی مناسبت سے بالوں کے بعد ولوغ کلب کا ذکر فرمایا ہے۔ کتے کے پس خوردہ کے متعلق چار مذاہب ہیں: ○ جمہور فقہاء کا موقف ہے کہ ولوغ کلب سے برتن اور پانی دونوں ناپاک ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان ہے۔ ○ مالکیہ اور ظاہریہ کہتے ہیں کہ پانی پاک ہے، البتہ برتن کو دھونے کا حکم تعبدی ہے۔ ○ امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں بوقت ضرورت پاک ہے۔ ○ سفیان ثوری کے نزدیک مشکوک ہے۔ امام بخاری کی یہ عادت ہے کہ جب وہ کسی باب میں دونوں جانب قوت دیکھتے ہیں تو دونوں طرف کی احادیث ذکر کر دیتے ہیں تاکہ قاری خود دلائل کا موازنہ کر کے فیصلہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے عنوان میں کتے کے جوٹھے کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

---

① اخبار مكة:255/4. ② التمهيد لابن عبدالبر:274/18. ③ فتح الباري:356/1.

١٧٠ - حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ عَنْ عَاصِمٍ، عَنِ ابْنِ سِيرِينَ قَالَ: قُلْتُ لِعَبِيدَةَ: عِنْدَنَا مِنْ شَعَرِ النَّبِيِّ ﷺ أَصَبْنَاهُ مِنْ قِبَلِ أَنَسٍ، أَوْ مِنْ قِبَلِ أَهْلِ أَنَسٍ، فَقَالَ: لَأَنْ تَكُونَ عِنْدِي شَعَرَةٌ مِّنْهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا. [انظر: ١٧١]

[170] حضرت ابن سیرین سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا: میں نے عبیدہ سلمانی سے کہا: ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ کے موئے مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ یا ان کے اہل خانہ کی طرف سے ملے ہیں۔ اس پر حضرت عبیدہ نے کہا: اگر میرے پاس ان میں سے ایک بال بھی ہوتا تو مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہوتا۔

١٧١ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيمِ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبَّادٌ عَنِ ابْنِ عَوْنٍ، عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا حَلَقَ رَأْسَهُ كَانَ أَبُو طَلْحَةَ أَوَّلَ مَنْ أَخَذَ مِنْ شَعَرِهِ. [راجع: ١٧٠]

[171] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جب نبی اکرم ﷺ نے اپنا سر منڈوایا تو سب سے پہلے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے موئے مبارک لیے تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کیا تھا کہ انسان کے بال بدن سے الگ ہونے کے بعد بھی پاک ہیں، اگر پانی میں گر جائیں تو پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عطاء بن ابی رباح کا قول پیش کیا تھا کہ ان سے سوت اور رسیاں بنانے میں کوئی حرج نہیں۔ احناف کے ہاں بھی بال پاک تو ہیں لیکن ان کی حرمت و تعظیم کی بنا پر ان کے استعمال کی اجازت نہیں۔ بالوں کی طہارت کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے اب ایک مرفوع روایت پیش کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے بالوں کے تبرکات کا ذکر ہے۔ استدلال بایں طور ہے کہ اگر بال ناپاک ہوتے تو اسے بطور تبرک کیوں رکھا جاتا، لیکن اس استدلال پر اشکال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بالوں سے عام انسانی بالوں کی طہارت کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کیونکہ دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ اس بنا پر یہ تقریب ناتمام ہے لیکن امام بخاری کے مذاقِ استدلال کے اعتبار سے یہ درست ہے کیونکہ یہاں دو باتیں ہیں: ایک بالوں کی طہارت اور دوسرے ان سے تبرک حاصل کرنا۔ اب یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ کے بالوں کی طہارت، آپ کی خصوصیت ہے، اس خصوصیت کے لیے دلیل درکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تقسیم کے وقت بھی اس خصوصیت کا ذکر نہیں فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسانوں کے بال جسم سے الگ ہو کر پاک رہتے ہیں۔ رہا تبرک کا معاملہ تو مخصوص تبرک تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی خاص رہے گا۔ ② مدعیان تدبر کی طرف سے احادیث میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے یہ دعویٰ کیا گیا ہے: ''امام صاحب نے جو باب باندھا تھا وہ اس پانی کے بارے میں تھا جس سے بال دھوئے جائیں یا جس میں کتے نے منہ ڈال دیا ہو، روایتوں میں اس طرح کا کوئی ذکر نہیں ہے۔''[1] پہلی بات تو یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ان اشیاء سے متعلق جو وقتاً فوقتاً پانی میں گرتی رہتی ہیں شرعی حکم بتانا ہے کہ ایسی چیزیں پانی میں گر کر اسے نجس کر دیتی ہیں یا نہیں؟ یہاں پانی کا ذکر محل وقوع کے اعتبار سے تبعاً آ گیا ہے، پانی کے مسائل بیان کرنا اصل مقصود نہیں کیونکہ پانی سے متعلقہ

[1] تدبر حدیث: 274/1.

مسائل آئندہ بیان کریں گے۔ چونکہ عام طور پر یہ چیزیں پانی میں گرتی ہیں، اس لیے یہاں پانی کا ذکر کر دیا ورنہ یہ چیزیں پانی کی طرح کھانے کی چیزوں یا دودھ وغیرہ میں بھی گرتی رہتی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں بالوں کا مسئلہ بیان کیا ہے، خواہ وہ پانی میں گریں یا کھانے میں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پانی میں بالوں کے گرنے یا ڈالنے کا ذکر دوسری روایات میں موجود ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن موہب کہتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے پانی کا ایک پیالہ دے کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کیونکہ ان کے پاس ایک خوبصورت چاندی کی ڈبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک محفوظ تھے۔ آپ انھیں پانی میں ڈال کر ہلاتیں پھر وہ پانی نظر بد یا بخار والے مریض کو پلایا جاتا۔ میں نے اس وقت ڈبیہ میں سرخ رنگ کے موئے مبارک دیکھے تھے۔[1] باقی رہا کتے کا پانی میں منہ ڈالنے کا معاملہ، تو اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے باب در باب کے طور پر آئندہ ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے اور اس کے متعلق روایات بھی ذکر کی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کے متعلق اس طرح کا والہانہ اظہار عقیدت حضرات ''تدبر'' کی مزعومہ عقلیت پسندی کے خلاف تھا، اس لیے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر ''جذباتی اور جوشیلے'' ہونے کی پھبتی کسی ہے کیونکہ انھوں نے آپ کے بالوں کو محفوظ کیا تھا۔ اور جن روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود انھیں بال تقسیم کرنے پر مامور کیا تھا اور انھیں موئے مبارک اس مقصد کے لیے عطا فرمائے تھے وہ تمام روایات ان کے نزدیک محل نظر ہیں۔[2] ③ رسول اللہ ﷺ کے بالوں سے یہ حسن عقیدت تنہا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو نہ تھی بلکہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسی قسم کے جذبات تھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جبکہ حجام آپ کے سر مبارک کو صاف کر رہا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے گرد تھے، وہ چاہتے تھے کہ آپ کا کوئی بھی بال زمین پر گرنے کے بجائے کسی نہ کسی کے ہاتھ میں گرے۔''[3] بلکہ عروہ بن مسعود کا بیان اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے کیونکہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت وعقیدت بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے ہیں تو آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم زمین پر گرنے والے پانی کو لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، جب آپ لعاب دہن تھوکتے ہیں تو جلدی سے اسے اپنے ہاتھوں اور چہروں پر مل لیتے ہیں اور جب کبھی آپ کا موئے مبارک گرتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔''[4] اس مسئلہ کی مزید تفصیل کتاب اللباس میں آئے گی۔

بَابٌ: إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا

باب: جب کتا برتن میں سے پی لے تو برتن سات مرتبہ دھویا جائے

١٧٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ:

[172] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کتا تم میں سے کسی کے

① صحيح البخاري، اللباس، حديث:5896. ② تدبر حديث:1/273. ③ صحيح مسلم، الفضائل، حديث:6043(2325).
④ صحيح البخاري، الشروط، حديث:2731، 2732، و مسند أحمد:4/324.

أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِي إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعًا».

برتن میں سے پی لے، تو چاہیے کہ اس کو سات مرتبہ دھوئے۔"

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان سابق میں انسانی بالوں کی طہارت کا مسئلہ بیان فرمایا تھا۔ اس میں حضرت عطاء کے اثر کے علاوہ دو مرفوع روایات بھی پیش فرمائیں۔ احناف بھی اس کے قائل ہیں، لیکن وہ ان کے استعمال کو انسانی کرامت کے منافی قرار دیتے ہیں۔ وہاں دوسرا مسئلہ کتے کے پس خوردہ کا ذکر کیا۔ اس کے لیے امام بخاری نے سابق عنوان میں امام زہری اور سفیان ثوری کے اقوال پیش کیے لیکن سؤر کلب (کتے کے جوٹھے) کی اہمیت کے پیش نظر باب در باب کے طور پر یہاں الگ عنوان بندی کی ہے، اس بنا پر مذکورہ عنوان مستقل عنوان نہیں۔ اس مسئلے میں امام بخاری کا رجحان کیا ہے؟ اس کے متعلق شراح کی مختلف آراء ہیں: شارح بخاری ابن بطال نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے کتے اور اس کے پس خوردہ کے متعلق چار احادیث ذکر کی ہیں اور ان احادیث سے ان کی غرض یہ ہے کہ کلب اور سؤر کلب کی طہارت کو ثابت کیا جائے۔[1] شارح بخاری حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے تصرف سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سؤر کلب کی طہارت کے قائل ہیں۔[2] لیکن امام بخاری کی دقت نظر اور باریک بینی کے پیش نظر یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ سؤر کلب کی طہارت کے قائل ہوں کیونکہ اس کی نجاست قطعیات سے ثابت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت طرفین کی احادیث ذکر کر دی ہیں تاکہ قارئین خود فیصلہ کر لیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد اس سلسلے میں بیان مذاہب ہے۔ اگر وہ اپنا مختار مسلک بتانا چاہتے تو لفظ سؤر الکلب کے بجائے "طهارة سؤر الكلب" کہتے۔ ہمارے نزدیک امام بخاری سؤر الکلب کے سلسلے میں جمہور اہل علم کے ہم نوا ہیں اور اس مقام پر سؤر الکلب کے متعلق نجاست و طہارت کے دلائل پیش کر دینا مقصود ہے، چنانچہ اس عنوان کے بعد پہلی حدیث سے اس کی نجاست کا ثبوت پیش نظر ہے اور آگے پیاسے کتے کو پانی پلانے کی حدیث کو طہارت کے استدلال میں پیش کیا ہے۔ امام ابن بطال اور حافظ ابن حجر کی جلالت قدر کے باوجود ہمیں ان کی آراء سے اتفاق نہیں۔ شارح بخاری علامہ عینی لکھتے ہیں کہ عنوان کی پہلی حدیث (جس میں دھونے کا ذکر ہے) سے نجاست کلب کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ طہارت (دھونے) کا حکم ہے اور دھونے کا حکم وقوع حدث یا آلودۂ نجاست کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس مقام پر حدث نہیں ہے جس کا مطلب ہے کہ دھونے کا حکم نجاست کی وجہ سے ہے۔ جن حضرات کا خیال ہے کہ امام بخاری سؤر کلب کو تو طاہر ہی کہتے ہیں اور سات بار دھونے کو امر تعبدی پر محمول کرتے ہیں، ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ ظاہر حدیث سے امر تعبدی سمجھنا نہایت بعید ہے۔ پھر صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: [طهور إناء أحدكم] اور دوسری میں: [إذا ولغ الكلب في إناء أحدكم فليرقه] ہیں۔ ان الفاظ کے پیش نظر اگر کتے کا پس خوردہ پاک ہوتا تو اس کے لیے طہور (پاک کرنے) کا لفظ نہ ہوتا اور نہ دوسری روایت کے مطابق اس پانی کو بہا دینے ہی کا حکم ہوتا۔[3] ہمارے نزدیک علامہ عینی کی رائے وزنی ہے جس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

* امام بخاری رحمہ اللہ عنوان میں کوئی ایسا لفظ نہیں لائے جس سے طہارت سؤر کلب کو کشید کیا جاسکے۔ جب عنوان میں اس

---

① شرح ابن بطال: 266/1. ② فتح الباري: 357/1. ③ عمدة القاري: 486/2.

قسم کی صراحت نہیں تو امام بخاری کی طرف اسے منسوب کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔* امام زہری ؒ کا اثر بھی سؤر الکلب کی طہارت پر دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ مصنف عبدالرزاق میں ان سے ایک روایت ہے جس میں کتے کے جوٹھے برتن کو تین بار دھونے کا ذکر ہے۔[1]

یہ مسئلہ تو اس نمازی کی طرح ہے جس کے پاس نجس کپڑے ہوں تو ننگا نماز پڑھنے کے بجائے انھی کپڑوں میں نماز پڑھ لے، جس طرح ان کپڑوں میں نماز پڑھنا ان کے پاک ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا اسی طرح بوقت ضرورت نجس پانی سے وضو کرنا اور اس سے نماز ادا کرنا اس کی طہارت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ سفیان ثوری کا اثر بھی سؤر کلب کے پاک ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ اس کی نظیر یہ ہے کہ بعض ائمۂ کرام نبیذ کی موجودگی میں وضو اور تیمم دونوں کے قائل ہیں۔ پھر ان کا تردد بھی طہارت کے خلاف موقف کو مضبوط کرتا ہے۔ باقی احادیث کے متعلق اپنی گزارشات ان کے فوائد میں بیان کریں گے۔ ② یہ حدیث سؤر کلب کے نہ صرف نجس ہونے بلکہ اغلظ النجاسات ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس برتن کو سات دفعہ دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: ''جب کسی برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اس کی پاکیزگی اس طرح ہوگی کہ اسے سات مرتبہ دھویا جائے۔''[2] بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ برتن میں ہو اسے پھینک دیا جائے، پھر اسے سات مرتبہ دھویا جائے۔[3] پھر سات دفعہ دھونے کا حکم ''امر تعبدی'' نہیں جس کی کوئی ظاہری وجہ معلوم نہیں ہوئی، بلکہ طب جدید نے اس کا معقول المعنی ہونا ثابت کر دیا ہے، چنانچہ دور حاضر کے اطباء کی تحقیق ہے کہ کتے کے لعاب میں ایسے زہریلے جراثیم ہوتے ہیں جو پانی میں تحلیل ہو کر برتن سے چمٹ جاتے ہیں، انھیں صرف مٹی سے ختم کیا جاسکتا ہے، پھر ان کے زہریلے اثرات ایک دو بار دھونے سے نہیں بلکہ سات بار دھونے سے ختم ہوتے ہیں۔ جس حقیقت تک آج طب جدید کی رسائی ہوئی ہے، رسول اللہ ﷺ آج سے چودہ سو سال قبل مطلع فرما چکے ہیں۔ ③ ہمارے ہاں کتب فقہ میں درایت یا شدتِ احتیاط کے نام سے چند ایسے اصول ملتے ہیں جن سے صحیح احادیث کو بڑی آسانی کے ساتھ رد کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی حدیث کو اس وقت قبول نہ کیا جائے جب اس کے راوی کا عمل اس کے خلاف ہو۔ اس اصول کے پیش نظر مذکورہ حدیث کو رد کیا گیا ہے کیونکہ ان حضرات کے کہنے کے مطابق اس روایت کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حدیث مذکور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک منسوخ ہے۔

اولاً ہم اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے کہ راویٔ حدیث کسی صحابی کا فتویٰ یا عمل مروی حدیث کے خلاف ہو تو لازمی طور پر اسے کسی ذریعے سے اس کا نسخ معلوم ہوا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر بھی حدیث پر عمل نہ کرنے کی وجوہات ہوسکتی ہیں، مثلاً: حضرت مرثد بن عبداللہ یزنی، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ابو تمیم نماز مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھتا ہے، کیا آپ کے لیے یہ بات باعث تعجب نہیں؟ حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں یہ پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا: اب کیوں نہیں پڑھتے؟ فرمایا: مصروفیات کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا۔[4] دیکھا آپ نے کہ اس مقام پر حدیث کے

① المصنف لعبد الرزاق: 97/1. ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 651 (279). ③ صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 648 (279). ④ صحيح البخاري، التهجد، حديث: 1184.

مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ اس کا نسخ نہیں بلکہ ان کی ذاتی مصروفیات ہیں۔ ثانیاً حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے موافق فتویٰ بھی مروی ہے اور جس راوی نے ایسے فتوے کو نقل کیا جو ان کی روایت کے مطابق ہے اس سے راجح ہے جس نے ان کے فتوے کو روایت کے مخالف نقل کیا ہے۔ یہ بات نظری لحاظ سے تو ظاہر ہی ہے، اسنادی لحاظ سے اس لیے معقول ہے کہ موافقت کی روایت حضرت حماد بن زید سے ہے، سند کے اعتبار سے اس پر کوئی غبار نہیں اور مخالفت والی روایت عبدالملک بن سلیمان نے بیان کی ہے جو پہلی روایت کے اعتبار سے قوت میں بہت کم ہے۔[1] ④ اس روایت میں برتن کو سات مرتبہ دھونے کا ذکر ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ پہلی دفعہ اس برتن کو مٹی سے صاف کرے۔[2] نیز حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو تم اسے سات مرتبہ دھوو اور آٹھویں مرتبہ اسے مٹی سے صاف کرو۔''[3] ان روایات کے پیش نظر پہلی دفعہ مٹی سے صاف کیا جائے، پھر سات مرتبہ اسے پانی سے صاف کیا جائے کیونکہ اگر آخری مرتبہ اسے مٹی سے صاف کریں گے تو مٹی دور کرنے کے لیے پھر پانی استعمال کرنا پڑے گا اس طرح اسے دھونے کی تعداد نو ہو جائے گی جس کی حدیث میں گنجائش نہیں، لہٰذا پہلی دفعہ مٹی سے پھر سات مرتبہ اسے پانی سے دھویا جائے۔ احناف نے اس حدیث کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس طرح کے برتن کو تین دفعہ دھونا ضروری قرار دیا ہے۔[4] ⑤ طہارت و نجاست کے مسائل میں بعض فقہاء افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ احناف کے متعلق آپ نے ملاحظہ کیا کہ انھوں نے شارع علیہ السلام کے الفاظ سے آزاد ہو کر اس مسئلے کو فقہی موشگافیوں کی نذر کر کے الجھا دیا۔ دوسری طرف ظاہری حضرات ہیں ان کی حرفیت پسندی ملاحظہ فرمائیں: ابن حزم لکھتے ہیں کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈال کر پانی پی لے تو برتن کا پاک کرنا اور پانی کا بہا دینا ضروری ہے، اس کے برعکس اگر کتا پینے کے بجائے کوئی چیز کھا لے یا اس میں منہ ڈالنے کے بجائے اپنا پاؤں یا دم ڈال دے یا خود گر پڑے، اسی طرح برتن کے بجائے اگر زمین کے کسی گڑھے میں منہ ڈال دے یا انسان کے ہاتھوں میں پانی پی لے تو ان تمام صورتوں میں نہ تو پانی بہانے کی ضرورت ہے اور نہ برتن ہی کا دھونا ضروری ہے۔[5]

١٧٣ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ «أَنَّ رَجُلًا رَأَى كَلْبًا يَأْكُلُ الثَّرٰى مِنَ الْعَطَشِ، فَأَخَذَ الرَّجُلُ خُفَّهُ فَجَعَلَ يَغْرِفُ لَهُ بِهِ حَتّٰى أَرْوَاهُ فَشَكَرَ اللهُ لَهُ فَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ». [انظر: ٢٣٦٣، ٢٤٦٦، ٦٠٠٩]

[173] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں: ''ایک شخص نے کتے کو دیکھا جو شدت پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا، چنانچہ اس شخص نے اپنا موزہ لیا اور اس میں پانی بھر بھر کر اسے پلانا شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ خوب سیر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے عمل کی قدر کرتے ہوئے اسے جنت عطا فرما دی۔''

فوائد و مسائل: ① ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا، اس کا تعلق بنی اسرائیل

---

1 فتح الباري:363/1. 2 صحيح مسلم، الطهارة:651(279). 3 صحيح مسلم، الطهارة، حديث:653(280). 4 فتح الباري:363/1. 5 محلّٰى ابن حزم:109/2.

سے تھا، نیز اس قسم کا ایک واقعہ بنی اسرائیل کی ایک زانیہ عورت کے متعلق بھی احادیث میں مذکور ہے۔ اس نے بھی اپنے موزے سے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔[1] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کتے کا پس خوردہ نجس نہیں ہے مگر یہ استدلال کئی لحاظ سے کمزور ہے۔ * ممکن ہے کہ اس نے موزے سے پانی نکال کر کسی دوسری چیز یا زمین کے گڑھے میں ڈال کر پلایا ہو۔ * یہ ممکن ہے کہ اس نے موزے ہی سے پانی پلا کر اس کو دھولیا ہو۔ * یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اس موزے کو ناپاک سمجھ کر پھینک دیا ہو اور استعمال ہی نہ کیا ہو۔ ان سب احتمالات کی موجودگی میں مذکورہ استدلال درست نہیں۔ * علاوہ ازیں امم سابقہ کے واقعات ہمارے لیے حجت نہیں۔ کیا ایک شخص کا جزوی عمل اس قابل ہوسکتا ہے کہ اسے طہارت ونجاست کے باب میں قول فیصل کی حیثیت دی جائے؟ زیادہ سے زیادہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنا اللہ کے ہاں معافی کا باعث ہے۔[2] ② ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ بیان کیا تو صحابۂ کرام ؓ نے کہا: کیا ہمیں حیوانات سے حسن سلوک کرنے میں بھی اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا: ''ہر زندہ جگر رکھنے والے حیوان میں تمھارے لیے اجر وثواب ہے۔''[3] ہماری شریعت میں ایسے حیوانات قابل احترام ہیں جو دوسروں کے لیے ضرررساں نہ ہوں۔[4] ③ اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں: * ایک شخص اکیلا اور زادسفر کے بغیر سفر کرسکتا ہے بشرطیکہ اس طرح سفر کرنے میں کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہو۔ * لوگوں سے حسن سلوک کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ جب کتے کو پانی پلانے سے مغفرت ہوگئی تو انسان سے ہمدردی تو اس سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ * اگر کوئی مسلمان شخص نفلی صدقات کا مستحق موجود نہ ہو تو مشرکین پر صدقہ وخیرات کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر آدمی اور حیوان دونوں مساویانہ طور پر ضرورت مند ہوں اور صرف ایک کی مدد کی جاسکتی ہو تو آدمی حیوانات سے زیادہ قابل احترام ہے، اس کی مدد کرنی چاہیے۔[5]

١٧٤ - وَقَالَ أَحْمَدُ بْنُ شَبِيبٍ: حَدَّثَنَا أَبِي عَنْ يُونُسَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: حَدَّثَنِي حَمْزَةُ بْنُ عَبدِ اللهِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَتِ الْكِلَابُ [تَبُولُ وَ] تُقْبِلُ وَتُدْبِرُ فِي الْمَسْجِدِ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَلَمْ يَكُونُوا يَرُشُّونَ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ.

[174] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کتے مسجد میں (پیشاب کرتے اور) آتے جاتے تھے اور صحابۂ کرام ؓ وہاں کسی جگہ پر پانی نہیں چھڑکتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① یہ اسلام کے ابتدائی دور کی بات ہے جب مساجد کی حرمت وتکریم کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس وقت مسجد کے دروازے بھی نہیں تھے۔ بعد میں مساجد کی حرمت وتکریم کا حکم بھی دیا گیا اور مسجد کے دروازے بھی لگا دیے گئے اور یوں مسجد میں کتوں کی آمد ورفت بند ہوگئی۔[6] ② اس حدیث کو بھی سؤر کلب کی طہارت کے لیے بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے کیونکہ عہد نبوی میں کتے بلاتکلف مسجد میں آتے جاتے تھے پھر کتے کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کھلے منہ چلتا ہے اور اس کے منہ سے رال ٹپکتی رہتی ہے، پھر مسجد میں آمد ورفت سے اس کے لعاب دہن کا گرنا عین ممکن ہے، ان سب چیزوں کے باوجود پانی وغیرہ چھڑکنے کا انتظام

① صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث:3321، وأحاديث الأنبياء، حديث:3467. ② فتح الباري:364/1. ③ صحيح البخاري، المظالم، حديث:2466. ④ فتح الباري:53/5. ⑤ فتح الباري:53/5. ⑥ فتح الباري:364/1.

نہ تھا، لیکن احکام شریعت میں اس قسم کے توہمات وخیالات کا اعتبار نہیں ہوتا، ہاں اگر کسی نے اس لعاب کا گرنا دیکھا ہو اور اس کے بعد مسجد کو نہ دھویا گیا ہو تو بات بن سکتی ہے۔ علمی طور پر تَوَهُّمِ نجاست پر نجاست کا حکم لگانا صحیح نہیں، لہٰذا یہ روایت سؤر کلب کے پاک ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ ہاں اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان کے تیسرے حصے کا ثبوت ملتا ہے کہ مسجد میں کتوں کے آنے جانے سے مسجد پلید نہیں ہوتی۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس سے بعض لوگوں نے کتے کے پاک ہونے پر استدلال کیا ہے کہ زمانۂ رسالت میں کتے مسجد میں آتے جاتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس وجہ سے مسجد کے فرش کو نہیں دھوتے تھے۔ کتوں کی طہارت پر یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ کتے مسجد میں پیشاب بھی کرتے تھے۔[1] کتے کے پیشاب کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں کہ وہ نجس ہے۔ امام ابوداود نے اس حدیث سے اس امر پر استدلال کیا ہے کہ نجس زمین خشک ہو کر پاک ہو جاتی ہے کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مسجد کو پاک کرنے کے لیے معمولی پانی بھی نہیں چھڑکتے تھے چہ جائے کہ اسے اچھی طرح دھویا جائے۔ اگر مسجد خشک ہو کر پاک نہ ہوتی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے یونہی نہ چھوڑتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ بآواز بلند فرمایا کرتے تھے مسجد میں لغو باتیں کرنے سے اجتناب کرو۔ جب بے فائدہ باتوں سے روک دیا گیا تو دوسرے معاملات کے متعلق بھی انھوں نے انتظام کیا ہوگا۔[2]

١٧٥ - حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ ابْنِ أَبِي السَّفَرِ، عَنِ الشَّعْبِيِّ، عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: «إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ الْمُعَلَّمَ فَقَتَلَ فَكُلْ، وَإِذَا أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلَى نَفْسِهِ»، قُلْتُ: أُرْسِلُ كَلْبِي فَأَجِدُ مَعَهُ كَلْبًا آخَرَ؟ قَالَ: «فَلَا تَأْكُلْ، فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلَى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلَى كَلْبٍ آخَرَ». [انظر: ٢٠٥٤، ٥٤٧٥، ٥٤٧٦، ٥٤٧٧، ٥٤٨٣، ٥٤٨٤، ٥٤٨٥، ٥٤٨٦، ٥٤٨٧، ٧٣٩٧]

[175] حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے نبیٔ اکرم ﷺ سے (کتے کے شکار کے متعلق) دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ”جب تو اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑے اور وہ شکار کرے تو اسے کھا لے۔ اگر وہ کتا خود اس سے کچھ کھا لے تو اسے مت کھا کیونکہ اب اس نے شکار اپنے لیے کیا ہے۔“ میں نے پھر عرض کیا: بعض دفعہ میں اپنے کتے کو شکار کے لیے چھوڑتا ہوں، پھر اس کے ساتھ کسی دوسرے کتے کو بھی پاتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: ”ایسے شکار کو مت کھا کیونکہ تو نے اپنے کتے پر بسم اللہ پڑھی تھی، دوسرے کتے پر نہیں پڑھی۔“

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسری روایت میں وضاحت فرمائی ہے کہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کتوں سے شکار کرنے کے متعلق دریافت کیا تھا۔[3] لیکن اس مقام پر اس حدیث کے بیان کرنے کا مقصد شکار کے احکام و مسائل بتانا نہیں بلکہ کتے کے لعاب کو پاک کہنے والوں کے دلائل بیان کرنا ہے، قطع نظر اس سے کہ دلالت صحیح ہے یا غلط۔ لعاب کلب کو طاہر کہنے والوں کا استدلال بایں طور ہے کہ اگر وہ نجس ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ضرور حکم دیتے کہ کتے نے جس جگہ

---

[1] سنن أبي داود، الطهارة، حديث:382. [2] فتح الباري:365/1. [3] صحيح البخاري، الذبائح والصيد، حديث:5487.

سے شکار کے جانور کو پکڑا ہے ان تمام مقامات کو دھویا جائے کیونکہ وہاں لعاب لگا ہوگا۔ آپ نے ایسا حکم نہیں دیا، لہٰذا یہ پاک ہے، حالانکہ یہ استدلال مبہمات میں سے ہے۔ صریح احادیث کی موجودگی میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ واضح احادیث میں سؤر کلب کو نجس قرار دیا گیا ہے جس کی پہلے ہم وضاحت کر آئے ہیں، نیز یہ استدلال منطوق سے نہیں بلکہ مسکوت عنہ سے ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے ان مقامات کے دھونے سے سکوت فرمایا، اس لیے ان کی طہارت ثابت ہوئی، حالانکہ جس طرح آپ نے لعاب دھونے کا حکم نہیں دیا، اسی طرح زخموں سے بہنے والا خون صاف کرنے کا حکم بھی نہیں دیا، تو کیا اس خون کو بھی پاک قرار دیا جائے گا؟ اصل بات یہ ہے کہ شکار کرنے والوں کو یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ اس کا خون اور لعاب دھویا جاتا ہے۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ اگر کتے کا لعاب نجس ہوتا تو اس کے شکار کو کھانے کا جواز نہ ہوتا لیکن محدث اسماعیلی نے اس کا جواب دیا ہے کہ حدیث نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کتے کے شکار کو مار دینا اس کے ذبح کرنے کے قائم مقام ہے، اس میں نجاست کا ثبوت ہے، نہ اس کی نفی ہی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زخم سے بہنے والے خون کو بھی دھونے کا حکم نہیں دیا اور جو بات پہلے سے طے شدہ تھی اسے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، اسی طرح لعاب کلب کی نجاست اور اس کے دھونے کی بات بھی دوسرے ارشادات کی روشنی میں طے شدہ تھی، لہٰذا اس کا ذکر نہیں فرمایا۔[1] ② جب کتے یا کسی اور جانور یا پرندے کو شکار کی ٹریننگ دی جاتی ہے تو یہ چیز اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کر دیتی ہے، لہٰذا ایک عام کتے کے شکار اور سدھائے ہوئے کتے کے شکار میں بھی فرق ایک فطری امر ہے، بلکہ ایک مسلمان کے سدھائے ہوئے کتے اور غیر مسلم کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلیقے میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ شکار کے متعلق دیگر مباحث آئندہ کتاب الذبائح والصید میں بیان ہوں گے، بہر حال کلب معلم کی حدیث پیش کرنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمومی طور پر امام بخاری رحمہ اللہ لعاب کلب کی طہارت کے قائل نہیں ہیں۔ وھو المقصود.

(٣٤) بَابُ مَنْ لَّمْ يَرَ الْوُضُوءَ إِلَّا مِنَ الْمَخْرَجَيْنِ [مِنَ] الْقُبُلِ وَالدُّبُرِ

باب: 34- جس شخص کا موقف ہو کہ وضو صرف اس حدث سے ہے جو دونوں راستوں، یعنی قبل یا دبر سے نکلے

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ ٱلْغَآئِطِ﴾ [المائدة:٦] وَقَالَ عَطَاءٌ فِيمَنْ يَّخْرُجُ مِنْ دُبُرِهِ الدُّودُ، أَوْ مِنْ ذَكَرِهِ نَحْوُ الْقَمْلَةِ: يُعِيدُ الْوُضُوءَ. وَقَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ: إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلَاةِ أَعَادَ الصَّلَاةَ لَا الْوُضُوءَ. وَقَالَ

کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یا تم میں سے کوئی جائے ضرورت سے آیا ہو۔'' اور حضرت عطاء نے کہا: جس کی دبر سے کیڑا یا عضو مستور سے جوں کی طرح کوئی چیز نکلے تو وہ دوبارہ وضو کرے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر کوئی دوران نماز میں ہنس دے تو وہ نماز دوبارہ پڑھے

[1] فتح الباري: 366/1

الْحَسَنُ: إِنْ أَخَذَ مِنْ شَعَرِهِ أَوْ أَظْفَارِهِ أَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ فَلَا وُضُوءَ عَلَيْهِ. وَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: لَا وُضُوءَ إِلَّا مِنْ حَدَثٍ. وَيُذْكَرُ عَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ فِي غَزْوَةِ ذَاتِ الرِّقَاعِ فَرُمِيَ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فَنَزَفَهُ الدَّمُ، فَرَكَعَ وَسَجَدَ، وَمَضَى فِي صَلَاتِهِ. وَقَالَ الْحَسَنُ: مَا زَالَ الْمُسْلِمُونَ يُصَلُّونَ فِي جِرَاحَاتِهِمْ. وَقَالَ طَاوُسٌ، وَمُحَمَّدُ بْنُ عَلِيٍّ، وَعَطَاءٌ وَأَهْلُ الْحِجَازِ: لَيْسَ فِي الدَّمِ وُضُوءٌ. وَعَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنْهَا الدَّمُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. وَبَزَقَ ابْنُ أَبِي أَوْفَى دَمًا فَمَضَى فِي صَلَاتِهِ. وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ وَالْحَسَنُ فِيمَنْ يَحْتَجِمُ: لَيْسَ عَلَيْهِ إِلَّا غَسْلُ مَحَاجِمِهِ.

لیکن وضو دوبارہ نہ کرے۔ اور حسن بصری نے کہا: جس نے اپنے (سر کے) بال منڈوائے یا ناخن کترائے یا اپنے موزے اتار ڈالے تو اس پر وضو کا اعادہ نہیں، نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وضو لازم نہیں ہوتا مگر حدث (بے وضو ہونے) سے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ غزوۂ ذات الرقاع میں تھے کہ ایک شخص کو تیر لگا، اس میں سے بہت سا خون بہا لیکن اس نے رکوع اور سجدہ کیا اور نماز پڑھتا رہا۔ اور حسن بصری نے کہا: مسلمان اپنے زخموں سے چور ہونے کے باوجود ہمیشہ نماز پڑھتے رہے۔ طاؤس، محمد بن علی، عطاء اور حجاز کے اہل علم کا کہنا ہے کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ پھنسی کو دبایا تو اس سے خون نکل آیا، لیکن انھوں نے وضو نہیں کیا۔ اور حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے خون تھوکا، لیکن نماز پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری نے کہا: جو کوئی سینگی لگوائے تو صرف سینگی کی جگہ دھو ڈالے۔

وضاحت: اس عنوان میں امام بخاری رحمہ اللہ نے نواقض وضو (وضو توڑ دینے والے اسباب) بیان فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنی مستقل رائے رکھتے ہیں، نہ تو کلی طور پر شوافع و موالک سے متفق ہیں اور نہ مکمل طور پر احناف ہی کے مخالف ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عنوان دو اجزاء سے مرکب ہے: * سبیلین، یعنی قبل و دبر سے جو چیز نکلتی ہے وہ ناقض وضو ہے، خواہ طبعی طریقے سے نکلے یا غیر طبعی طریقے سے برآمد ہو اور خواہ کم ہو یا زیادہ۔ اسے ایجابی جز کا نام دیا ہے۔ * سَبِیلَین کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے کوئی چیز خارج ہو تو وہ ناقض وضو نہیں۔ اسے سلبی جز کا نام دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ عظام کے دس آثار پیش کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق ایجابی جز سے ہے جبکہ بعض کا تعلق سلبی جز سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک خون، قے، نکسیر، پیپ، مس مراہ، مس ذکر، نواقض وضو سے نہیں۔ ان میں سے پہلی چار میں آپ نے احناف کی مخالفت کی ہے جبکہ آخری دو میں شوافع سے اختلاف کیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے جس کی وضاحت ہم آئندہ کریں گے۔ اس آیت کریمہ، قول عطاء اور فرمودۂ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق ایجابی جز سے ہے جبکہ باقی آثار کا تعلق سلبی جز سے ہے۔ اب ہم علامہ سندھی کے الفاظ میں اس آیت کریمہ کی وضاحت کرتے ہیں جسے امام بخاری نے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جب پانی استعمال کرنے کی قدرت نہ ہو تو تیمّم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں دو قسم کے اسباب بیان ہوئے ہیں: * موجبات غسل،

یعنی حَدَثِ اکبر "اَوْلَا مَسْتُمُ النِّسَاءَ" کا ذکر بطور کنایہ ہے۔ امام بخاری ؒ نے اس سے عورتوں سے جماع مراد لیا ہے۔ یہ الفاظ حدث اکبر کی تمام صورتوں پر مشتمل ہیں۔ * موجبات وضو، یعنی حدث اصغر کے لیے "أَوْ جَاءَ اَحَدٌمِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ" کے الفاظ اشارہ کرتے ہیں جو دونوں راستوں سے نکلنے والی تمام چیزوں کے لیے کنایہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مَاخَرَجَ مِن سَبِیلَیْن کے علاوہ اور کوئی ناقض وضو نہیں ہے۔[1]

دراصل نواقض وضو کے متعلق ائمۂ کرام کا اختلاف، علت اور مناط کی بنا پر ہے۔ احناف اور حنابلہ کے نزدیک نقض وضو کی علت خروج نجاست ہے، خواہ کسی راستے سے ہو۔ ان کے نزدیک خون وغیرہ کا نکل آنا بھی نواقض وضو سے ہوگا۔ شوافع کے نزدیک وضو ٹوٹنے کی علت کسی چیز کا مخرجین سے نکلنا ہے۔ ان کے نزدیک اگر مَخْرجَیْنْ سے کوئی کنکری یا کیڑا برآمد ہوا تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا۔ موالک کے نزدیک مخرجین سے خروج کے ساتھ ساتھ اس کا معتاد ہونا بھی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک استحاضہ اور سلسل البول سے وضو نہیں ٹوٹے گا جبکہ شوافع کے نزدیک یہ نواقض وضو ہیں۔ امام بخاری ؒ اس سلسلے میں اپنی ایک مستقل رائے رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مس ذکر، مس مرأہ اور قہقہہ وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ نواقض وضو کے متعلق اختلاف کی بنیاد کے متعلق علامہ ابن رشد فرماتے ہیں: بدن سے نکلنے والی نجاست کے تین احوال ہیں جو حسب ذیل ہیں: * نفس خروج نجاست * محل خروج * صفت خروج۔ کچھ حضرات تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ نفس خروج نجاست سے وضو ٹوٹ جاتا ہے قطع نظر اس سے کہ خروج کہاں سے اور کیسے ہوا؟ ان کے نزدیک نجاست کا بدن سے خارج ہونا بدن کی طہارت کو زائل کر دیتا ہے۔ کچھ فقہاء نفس خروج کے ساتھ محل خروج کی بھی رعایت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نجاست کا خروج بول و براز کے راستے ہو تو ناقض وضو ہوگا۔ ان راستوں سے جو چیز بھی برآمد ہوگی اس سے وضو ٹوٹ جائے گا، خواہ اس کا خروج معتاد ہو یا غیر معتاد۔ اس کا خروج بحالت صحت ہو یا بحالت مرض۔ کچھ ائمۂ کرام نفس خروج اور مخرج کے ساتھ صفت خروج کا بھی اعتبار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ نجاست جو بول و براز کے راستے سے معتاد طریقے پر بحالت صحت نکلے، وہ ناقض وضو ہے۔ ان کے نزدیک کنکری یا کیڑے کا نکلنا ناقض وضو نہیں کیونکہ ان کا نکلنا غیر معتاد طریقے پر ہوتا ہے۔ اسی طرح سلس البول اور استحاضہ بھی نواقض وضو سے نہیں کیونکہ یہ مرض کی حالت میں ہوتا ہے۔ یہ حضرات نقض وضو کے لیے حالتِ صحت کی شرط لگاتے ہیں۔

ظاہر کتاب وسنت سے جن چیزوں کا بالاتفاق ناقض وضو ہونا ثابت ہے وہ بول و براز، ریح اور مذی وغیرہ ہیں جو سبیلین میں سے خارج ہوتے ہیں۔ اب آگے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ نقض وضو کا تعلق ان کے اعیان سے ہے یا ان کے کسی خاص وصف کی بنا پر ہے، چنانچہ کچھ حضرات کا فیصلہ ہے کہ نقض وضو کا تعلق اعیان سے ہے۔ ان کے نزدیک نقض وضو کا حکم انھی اشیاء میں محصور رہے گا۔ اگر یہ چیزیں بحالت صحت جسم سے خارج ہوتی ہیں تو ناقض ہیں بصورت دیگر نہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ نقض وضو کا تعلق مذکورہ اشیاء سے خاص طور پر نہیں بلکہ انھیں گندی اور نجس ہونے کی بنا پر نواقض وضو قرار دیا گیا ہے، اس لیے نقض وضو کا مدار ان نجاستوں پر ہے جو بدن سے خارج ہوں، خواہ ان کا خروج بول و براز کے راستے سے ہو یا کسی اور طریقے سے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نقض وضو کا مدار تو اسی پر ہے کہ یہ ناپاک چیزیں ہیں اور جسم سے خارج ہو رہی ہیں مگر ان سب کا محل

[1] حاشية السندي: 45/1.

متعین ہے کہ یہ بول و براز کے راستے سے نکلتی ہیں، اس لیے وہی نجاستیں نواقض وضو قرار پائیں گی جن کا خروج سبیلین سے ہو، خواہ معتاد طریقے سے ہو یا غیر معتاد طریقے سے، خواہ ان کا خروج بحالت صحت ہو یا بحالت مرض۔ بہر حال انھیں نواقض وضو خیال کیا جائے گا۔ جسم کے دوسرے حصے سے نکلنے والی یہ نجاستیں نواقض وضو شمار نہیں ہوں گی۔[1] ابن رشد کی تحقیق کے مطابق دیکھا جاسکتا ہے کہ امام بخاری ؒ اس سلسلے میں اپنی مستقل رائے رکھتے ہیں۔ وہ کلی طور پر کسی خاص مکتب فکر کی طرف رجحان نہیں رکھتے، چنانچہ پیش کردہ آثار سے صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

امام بخاری ؒ نے جو آثار نقل فرمائے ہیں ان کی تخریج و تفصیل حسب ذیل ہے: (1) حضرت عطاء بن ابی رباح کا اثر صحیح سند کے ساتھ مصنف ابن ابی شیبہ (72/1) میں موصولاً بیان ہوا ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی، قتادہ اور حماد بن ابی سلیمان نے ان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دُبر یا قبل سے کسی کیڑے کا برآمد ہونا کبھی کبھار ہوتا ہے، اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[2] (2) حضرت جابر ؓ کا قول دارقطنی (172/1) اور سعید بن منصور نے موصولاً بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک مرفوع روایت بھی بیان کی جاتی ہے لیکن وہ صحیح نہیں۔ اس کا تعلق عنوان کے سلبی جز سے ہے۔ یہاں تین چیزیں ہیں: * تبسم، جسے مسکراہٹ کہا جاتا ہے، اس میں آواز نہیں ہوتی، دوران نماز میں ایسا کرنے سے نہ وضو ٹوٹتا ہے اور نہ نماز ہی باطل ہوتی ہے۔ * ضحک، اس سے مراد وہ ہنسی ہے جس کی آواز آدمی خود سنے لیکن پاس والے نہ سن سکیں۔ حضرت جابر ؓ کا فرمان اس سے متعلق ہے۔ اس سے نماز جاتی رہے گی لیکن وضو نہیں ٹوٹے گا۔ * قہقہہ، ایسی آواز سے ہنسنا کہ دوسرے بھی سنیں۔ احناف کے نزدیک اس سے وضو اور نماز دونوں ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ وضو بحق نماز ختم ہو جاتا ہے، بحق تلاوت وضو باقی رہتا ہے، لیکن قہقہے کے متعلق وضو اور نماز کے بطلان پر جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ عقلاً و نقلاً صحیح نہیں۔ ویسے بھی صحابۂ کرام ؓ سے یہ بعید ہے کہ دوران نماز میں اللہ کے حضور اور رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوں اور ایک اندھے آدمی کے کنویں میں گرنے سے وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔[3] (3) حضرت حسن بصری کے قول کو سعید بن منصور اور ابن منذر (237/1) نے موصولاً بیان کیا ہے کہ وضو کرنے کے بعد ناخن کاٹنے یا بال منڈوانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے، جبکہ مجاہد، حکم بن عتیبہ اور حضرت حماد کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اور وضو کے بعد موزے اتارنے کا مسئلہ، ابن منذر (457/1) اور مصنف ابن ابی شیبہ (342/1) نے بیان کیا ہے۔ (4) حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی اثر مسند احمد (410/2) اور جامع ترمذی (74) وغیرہ میں مرفوعاً بیان کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق بھی عنوان کے ایجابی جز سے ہے۔ (5) روایت جابر کو مسند احمد (359/3)، سنن ابوداود (198)، دارقطنی، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اس سے احناف کا رد مقصود ہے کیونکہ ان کے نزدیک بہنے والا خون ناقض وضو ہے لیکن امام بخاری ؒ کے نزدیک دورانِ نماز میں بہنے والے خون سے نماز اور وضو باطل نہیں ہوتا، اس لیے آگے حسن بصری کا قول بیان کیا ہے۔ اور حضرت عمر ؓ کے متعلق بھی صحیح روایت ہے کہ آپ کا خون بہہ رہا تھا لیکن آپ نے نماز جاری رکھی۔[4] (5) امام طاؤس کا اثر بھی مصنف ابن ابی شیبہ (252/1) میں مروی ہے کہ خون بہنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ محمد بن علی کا قول ہے کہ اگر نکسیر جاری پانی کی طرح بہہ پڑے تب بھی اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[5] عطاء ابن ابی رباح کا اثر بھی

---

1 بداية المجتهد:68/1. 2 فتح الباري:367/1 . 3 فتح الباري:367/1 . 4 فتح الباري:368/1 . 5 فتح الباري:368/1.

مصنف عبدالرزاق (145/1) میں موجود ہے۔ ⑦ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل مصنف عبدالرزاق (145/1) وغیرہ میں موصولاً بیان ہوا ہے۔ اس میں مزید یہ ہے کہ آپ نے نماز بھی ادا کی۔ ⑧ حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کا عمل سفیان ثوری نے اپنی جامع میں بیان کیا ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے، نیز مصنف عبدالرزاق (148/1) میں بھی موصولاً بیان ہوا ہے۔ ⑨ حضرت ابن عمر اور حسن بصری کے سینگی سے متعلق آثار کو مصنف ابن ابی شیبہ (81،80/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے، ان کے نزدیک نظافت کے لیے سینگی لگانے کی جگہ کو دھو دیا جائے۔ ان مختلف آثار کے پیش نظر امام بخاری کا رجحان ہے کہ بول و براز کے راستے سے نکلنے والی ہر چیز ناقض وضو ہے، اس کے علاوہ ضحک اور خون وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

١٧٦ - حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدٌ الْمَقْبُرِيُّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا يَزَالُ الْعَبْدُ فِي صَلَاةٍ مَّا كَانَ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ مَا لَمْ يُحْدِثْ». فَقَالَ رَجُلٌ أَعْجَمِيٌّ: مَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: الصَّوْتُ، يَعْنِي الضَّرْطَةَ. [انظر: ٤٤٥، ٤٧٧، ٦٤٧، ٦٤٨، ٦٥٩، ٢١١٩، ٣٢٢٩، ٤٧١٧]

[176] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ اس وقت تک نماز میں رہتا ہے جب تک وہ مسجد میں نماز کا انتظار کرتا ہے، بشرطیکہ اسے حدث لاحق نہ ہو۔'' ایک عجمی شخص نے سوال کیا: ابوہریرہ! حدث کیا ہے؟ فرمایا: حدث آواز، یعنی گوز کو کہتے ہیں۔

فوائد ومسائل: ① اس روایت میں صرف آواز کے ساتھ اخراج ریح کو حدث قرار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مختصر ہے۔ اس سے پہلے حدیث نمبر 135 میں وضاحت ہے کہ حدث دونوں صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ آواز کے ساتھ بھی اور بغیر آواز کے بھی۔ چونکہ نماز اور مسجد کا ذکر ہورہا تھا اور نماز میں اکثر و بیشتر یہی حدث لاحق ہوتا ہے، اس لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے صرف اسی چیز کا ذکر کیا جو اس حالت میں زیادہ پیش آنے والی تھی۔ قبل ازیں ظاہری نجاست کا ذکر تھا اب نجاست باطنی کو بیان کیا جارہا ہے، چونکہ سوال مسجد میں انتظار نماز سے متعلق تھا، اس لیے جواب بھی خاص دیا گیا اور جس ناقض وضو کا احتمال وقوعی ہوسکتا تھا اسے ذکر کر دیا گیا، احتمال عقلی سے تعرض نہیں کیا گیا۔[1] ② اس حدیث کے دیگر طرق سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے لیے فرشتے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں جب تک وہ مسجد میں کسی دوسرے کی اذیت کا باعث نہیں بنتا۔[2] اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد کا استنباط ہوتا ہے: * انتظار نماز کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کیونکہ عبادت کا انتظار بھی عبادت ہی شمار ہوتا ہے۔ * جو نماز کے اسباب میں منہمک ہوتا ہے وہ بھی نمازی شمار ہوتا ہے۔ * یہ فضیلت اس شخص کے لیے ہے جو بے وضو نہ ہو، خواہ اس کا نقض وضو کسی سبب سے بھی ہو * انتظار نماز، نماز ہی سے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے نماز کا ثواب ملتا ہے کیونکہ نماز میں رہنے والے کو دوسرے سے بات چیت کرنا منع ہے جبکہ انتظار کرنے والے پر بات چیت کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔[3]

① فتح الباري: 370/1. ② صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 477. ③ عمدة القاري: 507/2.

١٧٧ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ عَنْ عَمِّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لَا يَنْصَرِفُ حَتَّى يَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ يَجِدَ رِيحًا». [راجع: ١٣٧]

[177] حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تک نماز پڑھنے والا (حدث کی) آواز نہ سنے، یا بدبو نہ محسوس کرے، اس وقت تک اپنی نماز نہ چھوڑے۔''

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث حضرت عبداللہ بن زید ؓ سے مروی ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تھی کہ حالت نماز میں اسے خروج ریح کا خیال گزرتا ہے، تو آپ نے فرمایا: ''وہ نماز نہ توڑے جب تک آواز نہ سنے، یا بو محسوس نہ کرے۔''[1] مقصد یہ ہے کہ جب اسے حدث کا یقین ہو جائے تو نماز چھوڑ دے۔ آواز کا سننا یا بدبو کا پانا بنیادی شرط نہیں کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی سونگھنے اور سننے کی قوت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ نہ آواز سن سکتے ہیں اور نہ بدبو محسوس کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شبہ، یقین کو زائل نہیں کر سکتا اور اس قسم کے شکوک وشبہات کی کوئی حیثیت نہیں۔ ② امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ بول و براز کے راستے سے جو چیز خارج ہو، وہ ناقض وضو ہے، چنانچہ اس حدیث سے وضاحت کے ساتھ اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت امام بخاری ؒ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: [لَا يَتَوَضَّأُ مِنَ الشَّكِّ حَتَّى يَسْتَيْقِنَ] ''شک کی بنیاد پر وضو نہ کرے تا آنکہ اسے یقین ہو جائے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ شبہے کی بنیاد پر نماز توڑنا درست نہیں، جب تک یقین نہ ہو کہ کوئی ناقض وضو حالت پیش آئی ہے۔ عمر رسیدگی میں ایسی باتیں پیش آتی رہتی ہیں لیکن نماز کے متعلق اوہام وخیالات کو بنیاد بنا کر نماز ختم کرنا مناسب نہیں۔

١٧٨ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُنْذِرٍ أَبِي يَعْلَى الثَّوْرِيِّ، عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ، قَالَ: قَالَ عَلِيٌّ: كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَاسْتَحْيَيْتُ أَنْ أَسْأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ بْنَ الْأَسْوَدِ فَسَأَلَهُ فَقَالَ: «فِيهِ الْوُضُوءُ». وَرَوَاهُ شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ. [راجع: ١٣٢]

[178] حضرت محمد بن حنفیہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت علی ؓ نے فرمایا: میری مذی بکثرت خارج ہوتی تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کرنے میں مجھے شرم آتی تھی، اس لیے میں نے حضرت مقداد بن اسود ؓ سے کہا: تم مسئلہ دریافت کرو۔ انھوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''اس میں صرف وضو ہے۔'' اور اس حدیث کو شعبہ نے بھی اعمش سے بیان کیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث کو امام بخاری ؒ نے اس لیے بیان فرمایا ہے کہ یہ خروج مذی سے وضو کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور اس کا خروج بھی بول و براز کے راستے سے ہوتا ہے۔ مذی اس رطوبت کو کہتے ہیں جو بیوی سے بوس وکنار کرتے وقت عضو مستور سے خارج ہوتی ہے۔ اس کے آنے کی صورت میں طہارت کے لیے صرف وضو ہی کافی ہے، غسل کی ضرورت نہیں۔ حضرت علی ؓ کے عقد میں رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر حضرت فاطمہ ؓ تھیں، اس رشتے داری کی وجہ سے خود

1 صحيح البخاري، الوضوء، حديث:137.

پوچھنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے حضرت مقداد ڈاٹنؤ کے ذریعے سے مسئلہ دریافت کیا۔ یہ حدیث پہلے (نمبر 132) کتاب العلم کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں دیگر فوائد دیکھے جاسکتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے کتاب الغسل (حدیث:269) میں بھی بیان کیا ہے، اس روایت میں ہے: آپ نے فرمایا: ''وضو کرے اور اپنے عضو مستور کو دھولے۔'' ② حضرت علی ڈاٹنؤ کا براہ راست ایسے مسائل پوچھنے سے احتراز کرنا قابل تعریف وصف ہے۔ اس فعل سے معلوم ہوا کہ سسر کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے اور اس کی موجودگی میں داماد کو چاہیے کہ بیوی سے دل لگی سے متعلق کوئی تذکرہ نہ کرے۔ ③ حضرت مقداد کے والد کا نام عمرو بن ثعلبہ ہے۔ انھیں ابن اسود اس لیے کہا جاتا ہے کہ اسود بن عبد یغوث نے ان کی تربیت کی تھی یا انھیں لے پالک بنایا تھا یا ان سے عقد حلف کیا تھا یا ان کی والدہ سے نکاح کیا تھا۔ پہلے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں۔ انھوں نے غزوۂ بدر میں بھی شرکت فرمائی۔ ④ آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کا ایک دوسرا طریق بیان فرمایا ہے کہ اس روایت کو امام اعمش سے حضرت شعبہ نے بھی بیان کیا ہے۔ اسے ابوداود طیالسی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔[1]

١٧٩ - حَدَّثَنَا سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ، أَخْبَرَهُ أَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَأَلَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ قُلْتُ: أَرَأَيْتَ إِذَا جَامَعَ فَلَمْ يُمْنِ؟ قَالَ عُثْمَانُ: يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، وَيَغْسِلُ ذَكَرَهُ قَالَ عُثْمَانُ: سَمِعْتُهُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ عَلِيًّا، وَالزُّبَيْرَ، وَطَلْحَةَ، وَأُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ، فَأَمَرُوهُ بِذٰلِكَ. [انظر: ٢٩٢]

[179] حضرت زید بن خالد ڈاٹنؤ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان ڈاٹنؤ سے پوچھا: اگر کوئی شخص (اپنی بیوی سے) جماع کرے لیکن اسے انزال نہ ہو تو (اس پر غسل ہے یا نہیں)؟ انھوں نے جواب دیا: وہ نماز کے وضو کی طرح وضو کرے اور اپنے عضو مستور کو دھو ڈالے۔ پھر حضرت عثمان ڈاٹنؤ نے فرمایا: میں نے یہ مسئلہ نبیٔ اکرم ﷺ سے سنا ہے۔ (حضرت زید کہتے ہیں) چنانچہ میں نے یہ مسئلہ حضرت علی، حضرت زبیر، حضرت طلحہ اور حضرت ابی بن کعب ڈاٹنؤم سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی مجھے یہی جواب دیا۔

فوائد ومسائل: ① عدم انزال کی صورت میں غسل نہ کرنے کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ اب حکم یہ ہے کہ محض دخول ہی سے غسل واجب ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ ائمۂ اربعہ اور اکثر علماء کا یہی موقف ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کا اس روایت اور اس کے بعد آنے والی روایت کو بیان کرنے سے مقصود صرف وضو کا اثبات ہے کیونکہ دخول، مظنہ خروج مذی تو بہرحال ہے۔ اس دخول کا جو دوسرا حکم وجوبِ غسل کا ہے، اس کی تفصیل کتاب الغسل میں آئے گی کیونکہ یہ روایات تو اب منسوخ ہیں اور زیر بحث صورت میں غسل واجب ہے۔

١٨٠ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ - هُوَ ابْنُ مَنْصُورٍ -

[180] حضرت ابوسعید خدری ڈاٹنؤ سے روایت ہے،

[1] فتح الباري:370/1.

قَالَ: أَخْبَرَنَا النَّضْرُ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ ذَكْوَانَ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَرْسَلَ إِلَى رَجُلٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ فَجَاءَ وَرَأْسُهُ يَقْطُرُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَعَلَّنَا أَعْجَلْنَاكَ». فَقَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أُعْجِلْتَ أَوْ قُحِطْتَّ فَعَلَيْكَ الْوُضُوءُ». تَابَعَهُ وَهْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ، قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَلَمْ يَقُلْ غُنْدَرٌ وَيَحْيٰى عَنْ شُعْبَةَ: «الْوُضُوءُ».

رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری آدمی کو بلایا، وہ اس حالت میں حاضر ہوا کہ اس کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: ''شاید ہم نے تجھے جلدی میں ڈال دیا ہے۔'' اس نے کہا: جی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تجھے جلدی میں مبتلا کر دیا جائے یا انزال کو روک دیا جائے تو تجھ پر صرف وضو کر لینا ضروری ہے۔''

نضر کی وہب نے متابعت کی اور کہا کہ یہ حدیث ہم سے شعبہ نے بیان کی، نیز غندر اور یحییٰ نے شعبہ سے ''وضو'' نقل نہیں کیا۔

فوائد و مسائل: ① اس باب کے دو جز ہیں: * بول و براز کے راستے سے نکلنے والی ہر چیز ناقض وضو ہے * بول و براز کے راستے کے علاوہ نکلنے والی کوئی چیز بھی ناقض وضو نہیں۔ اس حدیث کی عنوان کے پہلے حصے سے مطابقت ہے کیونکہ جماع کے دوران میں انزال نہ ہونے کی صورت میں مذی کا قطرہ تو خارج ہو ہی جاتا ہے، اس لیے وضو ضروری ہے۔ اس سے غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق کتاب الغسل میں بحث ہوگی۔ وہاں امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کے متعلق بھی گفتگو کی جائے گی، البتہ اس مقام پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حدیث بالا منسوخ ہے۔ ② اگر اس حدیث کو منسوخ تسلیم کیا جائے تو وضو کے متعلق استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب حافظ ابن حجر نے بایں الفاظ دیا ہے کہ انزال نہ ہونے سے غسل کا واجب نہ ہونا منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا غسل کے متعلق حکم دینا اس کا ناسخ ہے، البتہ وضو کا حکم تو منسوخ نہیں ہوا بلکہ وضو کی مشروعیت تو غسل کی صورت میں بھی باقی رہتی ہے اور وضو کی وجہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مذی کا خروج تو ہو ہی جاتا ہے، نیز عورت سے ملامست بھی وضو کا باعث ہو سکتا ہے اور حدیث کی عنوان سے مناسبت بھی اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا عورت کی ملامست سے وضو ضروری قرار دینا محل نظر ہے، نیز یہ امام بخاری کے موقف کے بھی خلاف ہے۔ ③ روایت میں جس انصاری کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں جیسا کہ صحیح مسلم (حدیث:343) میں اس کی وضاحت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ وہ دیر سے آیا ہے اور اس کے سر سے پانی بھی ٹپک رہا ہے تو آپ نے اندازہ لگایا کہ شاید وہ اپنی بیوی کے ساتھ مصروف تھا اور ہم نے اسے جلدی میں ڈال دیا۔ اس واقعے سے یہ استدلال کہ آپ غیب جانتے تھے، نری جہالت ہے، چنانچہ ایک شارح بخاری نے لکھا ہے: ''اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ امور خفیہ پر مطلع ہیں، چنانچہ اس حدیث میں مجامعت خود امور خفیہ سے ہے، پھر انزال ہونا یا نہ ہونا بھی مخفی امر ہے۔''[2] ④ آخر میں ایک متابعت کا حوالہ ہے کہ شعبہ سے روایت کرنے میں نضر بن شمیل کی وہب بن جریر نے متابعت کی ہے جسے ابو العباس السراج نے اپنی مسند

[1] فتح الباري:371/1. [2] تفهيم البخاري:437/1.

میں موصولاً بیان کیا ہے، نیز امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ غندر اور یحییٰ بن سعید القطان نے بھی شعبہ سے اس روایت کو بیان کیا ہے لیکن انھوں نے لفظ وضو کا ذکر نہیں کیا۔ یحییٰ بن سعید کے متعلق تو یہ بات صحیح ہے کہ انھوں نے وضو کا لفظ ذکر نہیں کیا جیسا کہ مسند احمد (26/3) میں اس کی صراحت ہے لیکن غندر نے لفظ وضو ذکر کیا ہے۔ اس نے بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''تجھ پر غسل نہیں بلکہ صرف وضو واجب ہے۔'' جیسا کہ امام مسلم نے اس کی روایت کو ذکر کیا ہے۔[1] ⑤ حدیث میں لفظ ''اَوْ'' تنویع کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ تقسیم فرمائی ہے کہ عدم انزال اس شخص کی ذات کے باعث ہو یا کسی خارجی امر کے سبب، دونوں صورتوں میں حکم ایک ہی ہے کہ اسکے ذمے صرف وضو کرنا ہے، غسل کرنا ضروری نہیں۔[2] لیکن یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب آدمی بیوی کے ساتھ جماع کرنے کی کوشش کرے اور مرد و زن کے ختان آپس میں مل جائیں تو غسل واجب ہے، انزال ہو یا نہ ہو۔''[3]

(٣٥) بَابُ الرَّجُلِ يُوَضِّئُ صَاحِبَهُ

باب:35- دوسرے کو وضو کرانا

١٨١ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ أُسَامَةَ ابْنِ زَيْدٍ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ لَمَّا أَفَاضَ مِنْ عَرَفَةَ عَدَلَ إِلَى الشِّعْبِ فَقَضَى حَاجَتَهُ، قَالَ أُسَامَةُ: فَجَعَلْتُ أَصُبُّ عَلَيْهِ وَيَتَوَضَّأُ، فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! أَتُصَلِّي؟ فَقَالَ: «الْمُصَلَّى أَمَامَكَ». [راجع: ١٣٩]

[181] حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ جب عرفات سے واپس ہوئے تو گھاٹی کی طرف گئے اور حاجت سے فارغ ہوئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر میں نے پانی ڈالنا شروع کیا اور آپ وضو فرماتے رہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نماز پڑھیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''نماز کی جگہ تیرے آگے ہے۔''

١٨٢ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ قَالَ: سَمِعْتُ يَحْيَى بْنَ سَعِيدٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي سَعْدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ أَنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ عُرْوَةَ بْنَ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، يُحَدِّثُ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، أَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي سَفَرٍ، وَأَنَّهُ ذَهَبَ لِحَاجَةٍ لَهُ وَأَنَّ مُغِيرَةَ جَعَلَ يَصُبُّ

[182] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ آپ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئے (جب آپ فارغ ہو کر آئے) تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے پانی ڈالنا شروع کیا اور آپ وضو فرماتے رہے، چنانچہ آپ نے چہرۂ اقدس اور دونوں ہاتھ دھوئے، سر کا مسح فرمایا۔ اور دونوں موزوں پر بھی مسح کیا۔

① صحيح مسلم، الحيض، حديث:345. ② شرح الكرماني:20/2. ③ صحيح البخاري، الغسل، حديث:291.

الْمَاءَ عَلَيْهِ وَهُوَ يَتَوَضَّأُ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ. [انظر: ٢٠٣، ٢٠٦، ٣٦٣، ٣٨٨، ٢٩١٨، ٤٤٢١، ٥٧٩٨، ٥٧٩٩]

فوائد ومسائل: ① ابن بطال نے لکھا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اپنے لیے کسی دوسرے سے وضو کا پانی منگوانا ناپسند خیال کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہم کسی دوسرے کو اپنے وضو میں شریک نہیں کرنا چاہتے، لیکن استنادی اعتبار سے یہ روایت صحیح نہیں۔ صحیح روایات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وضو کے متعلق دوسروں سے تعاون لینا ثابت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو وضو کرا سکتا ہے۔ اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ مریض کو جب تیمم کرنے کی طاقت نہ ہو تو دوسرا شخص اسے تیمم کرا سکتا ہے، مگر جب مریض نماز پڑھنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔[1] ② وضو کے سلسلے میں اعانت کی تین صورتیں ہیں: * کسی شخص سے وضو کرنے کے لیے پانی منگوانا، اس میں کوئی کراہت نہیں، یہ بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے خلاف اولیٰ قرار دیا ہے۔ * وضو خود کرے لیکن اعضائے وضو پر پانی ڈالنے کے لیے کسی دوسرے سے مدد لے، یہ بھی جائز ہے لیکن اسے بہتر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ * عمل وضو میں مدد لینا، یعنی پانی دوسرا شخص ڈالے اور اعضائے وضو کو بھی دھوئے، اس قسم کی مدد کسی مجبوری کی وجہ سے تو جائز ہے لیکن بلاوجہ ایسا کرنا ناپسندیدہ فعل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان میں تو اعانت کی اقسام کی گنجائش ہے لیکن جو روایات پیش فرمائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعانت کی دوسری قسم کا جواز پیش نظر ہے کیونکہ ان روایات میں صراحت ہے کہ حضرت اسامہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما صرف پانی ڈال رہے تھے لیکن وضو کا عمل خود رسول اللہ ﷺ سرانجام دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی خدمات، خدام سے لی جا سکتی ہیں۔[2] ③ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''نماز کی جگہ تیرے آگے ہے۔'' دراصل رسول اللہ ﷺ عرفات سے مزدلفہ جا رہے تھے۔ نویں ذوالحجہ کو (نو اور دس ذوالحجہ کی درمیانی شب) نماز مغرب اور نماز عشاء مزدلفہ میں ادا کی جاتی ہیں، اس لیے آپ نے فرمایا کہ آج مغرب کی نماز کا مقام مزدلفہ ہے جو آگے آ رہا ہے۔ وہاں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں اکٹھی ادا کی جاتی ہیں۔ اس کے متعلق دیگر مسائل کتاب الحج میں بیان ہوں گے۔ إن شاء اللہ۔ ④ واضح رہے کہ مذکورہ عنوان مستقل نہیں بلکہ باب در باب کی قسم سے ہے کیونکہ اس سے پہلے عنوان تھا کہ بول و براز کے راستے سے کسی چیز کا خارج ہونا ناقض وضو ہے۔ یہ دونوں احادیث بھی اس عنوان کے ثبوت کے لیے تھیں لیکن ان احادیث سے ایک نیا فائدہ بھی معلوم ہو رہا تھا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی آگاہی کے لیے ایک نیا عنوان قائم کر دیا کہ وضو کے سلسلے میں کسی دوسرے سے مدد لی جا سکتی ہے۔

1 شرح ابن بطال: 278/1. 2 عمدة القاري: 516/2.

(٣٦) بَابُ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ بَعْدَ الْحَدَثِ وَغَيْرِهِ

باب: 36- حدث وغیرہ (بے وضو ہونے) کے بعد قرآن پڑھنا

وَقَالَ مَنْصُورٌ عَنْ إِبْرَاهِيمَ: لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ فِي الْحَمَّامِ وَيَكْتُبُ الرِّسَالَةَ عَلَى غَيْرِ وُضُوءٍ. وَقَالَ حَمَّادٌ عَنْ إِبْرَاهِيمَ: إِنْ كَانَ عَلَيْهِمْ إِزَارٌ فَسَلِّمْ وَإِلَّا فَلَا تُسَلِّمْ.

حضرت منصور، ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ حمام میں قرآن پڑھنے اور بغیر وضو خط لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت حماد، جناب ابراہیم نخعی سے بیان کرتے ہیں کہ اگر حمام والے تہ بند باندھے ہوں تو انھیں سلام کرو، بصورت دیگر انھیں سلام نہ کہا جائے۔

وضاحت: فقہائے کرام نے اس عنوان کے متعلق مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔علمائے احناف نے تو کوشش فرمائی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے امام بخاری کو جمہور علماء سے الگ کر دیا جائے،لیکن امام بخاری ؒ نے جو حدیث ذکر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدث حقیقی ہو یا غیر حقیقی، اس کے بعد تلاوت قرآن کا کیا حکم ہے؟ یا حدث کے بعد تلاوت قرآن پاک یا اس کے علاوہ دیگر ادعیہ واذکار کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ چنانچہ حافظ ابن حجر نے حدث سے مراد حدث اصغر اور غیرہ سے مراد مظان الحدث لیا ہے، یعنی حدث سے مراد بول و براز کے راستے سے کسی چیز کا خارج ہونا ہے جیسا کہ پہلے حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے۔ اور مظان الحدث سے مراد نیند وغیرہ ہے جس میں وقوع حدث کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے کرمانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ غیرہ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے، یعنی تلاوت قرآن اور ذکر وسلام کا بے وضو ہونے کے بعد کیا حکم ہے؟[1] چونکہ حمامات محل انجاس واحداث ہوتے ہیں اور ان کا رخ کرنے والے لوگ بھی اکثر و بیشتر بے وضو ہوتے ہیں، اس لیے امام بخاری ؒ نے ان سے متعلقہ آثار کو ذکر فرمایا ہے، نیز خط کتابت کے وقت بسم اللہ لکھی جاتی ہے اور دوران کتابت میں آیات قرآن لکھنے کا بھی اس وقت رواج تھا، لہٰذا وضو کے بغیر خط وغیرہ لکھنے کی بھی وضاحت کر دی۔

١٨٣ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ مَخْرَمَةَ بْنِ سُلَيْمَانَ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ بَاتَ لَيْلَةً عِنْدَ مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ وَهِيَ خَالَتُهُ، فَاضْطَجَعْتُ فِي عَرْضِ الْوِسَادَةِ، وَاضْطَجَعَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَهْلُهُ فِي طُولِهَا، فَنَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتَّى انْتَصَفَ اللَّيْلُ، أَوْ

[183] حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت میمونہ ؓ، جو ان کی خالہ ہیں، کے گھر ایک رات بسر کی۔ انھوں نے کہا: میں تو بستر کے عرض میں لیٹ گیا جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی اہلیہ دونوں بستر کے طول میں محو استراحت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ سو گئے تا آنکہ جب آدھی رات ہوئی یا اس سے کچھ پہلے یا کچھ بعد، تو آپ بیدار ہوئے اور بیٹھ کر ہاتھ کے

[1] فتح الباري:1/375.

قَبْلَهُ بِقَلِيلٍ أَوْ بَعْدَهُ بِقَلِيلٍ، اِسْتَيْقَظَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَجَلَسَ يَمْسَحُ النَّوْمَ عَنْ وَجْهِهِ بِيَدِهِ، ثُمَّ قَرَأَ الْعَشْرَ الْآيَاتِ الْخَوَاتِيمَ مِنْ سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ، ثُمَّ قَامَ إِلٰى شَنٍّ مُعَلَّقَةٍ فَتَوَضَّأَ مِنْهَا فَأَحْسَنَ وُضُوءَهُ ثُمَّ قَامَ يُصَلِّي. قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: فَقُمْتُ فَصَنَعْتُ مِثْلَ مَا صَنَعَ، ثُمَّ ذَهَبْتُ فَقُمْتُ إِلٰى جَنْبِهِ فَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلٰى رَأْسِي وَأَخَذَ بِأُذُنِي الْيُمْنٰى يَفْتِلُهَا فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ أَوْتَرَ، ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى أَتَاهُ الْمُؤَذِّنُ، فَقَامَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلَّى الصُّبْحَ. [راجع: ١١٧]

ذریعے سے چہرۂ مبارک سے نیند کے اثرات دور کرنے لگے۔ پھر آپ نے سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات تلاوت فرمائیں۔ پھر آپ لٹکے ہوئے مشکیزے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے اچھی طرح وضو فرمایا، پھر نماز پڑھنے لگے۔ ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ میں بھی اٹھا اور وہی کچھ کیا جو آپ نے کیا تھا۔ پھر میں اٹھ کر آپ کے پہلو میں جا کھڑا ہوا، چنانچہ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا اور میرا دایاں کان پکڑ کر اسے مروڑا۔ پھر آپ نے دو رکعات ادا کیں، پھر دو رکعات، پھر دو رکعات، پھر دو رکعات، پھر دو رکعات اور پھر دو رکعات پڑھیں۔ پھر وتر پڑھے اور لیٹ گئے تا آنکہ مؤذن آیا۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور ہلکی سی دو رکعات ادا کیں، پھر باہر نکلے اور نماز فجر پڑھی۔

فوائد ومسائل: ① ابن بطال نے عنوان سے حدیث بالا کی مطابقت بایں الفاظ ظاہر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سو کر اٹھے اور وضو سے پہلے ہی سورۂ آل عمران کی دس آیات تلاوت فرمائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدث کے بعد وضو کیے بغیر قرآنی آیات تلاوت کرنا صحیح ہے۔[1] لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں نیند ناقض وضو نہیں کیونکہ آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں لیکن دل بیدار رہتا ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث کا صرف یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر غفلت طاری نہیں ہوتی اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس دوران میں ریاح وغیرہ کا بھی اخراج نہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم لوگوں پر نیند کے ساتھ غفلت بھی طاری ہو جاتی ہے، اس لیے خروج ریح کا پتہ نہیں چلتا لیکن رسول اللہ ﷺ پر دوران نیند میں غفلت طاری نہیں ہوتی، اس لیے ممکن ہے کہ آپ کو بحالت نیند حدث لاحق ہوا ہو، جسے آپ جانتے تھے، اس کے باوجود آپ نے وضو کے بغیر تلاوت فرمائی اور بعد میں وضو کیا، اس لیے بے وضو قراءت درست ہے اور ابن بطال کا موقف صحیح ہے۔[2] حافظ ابن حجر ؒ کی اس توجیہ پر علامہ عینی نے اعتراض کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت ہے کہ حالت نوم میں آپ کو حدث لاحق نہیں ہوتا۔ پیغمبر اور غیر پیغمبر میں یہی فرق ہے۔ ان کے نزدیک یہ کوئی فرق نہیں کہ انھیں احساس ہو جاتا ہے جبکہ ہمیں دوران نیند میں کسی چیز کا غفلت کی وجہ سے احساس نہیں ہوتا۔[3]

قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ علامہ عینی کے اعتراض میں کس قدر وزن ہے جبکہ وہ خود مطابقت بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: امام بخاری ؒ نے اس عنوان کی بنیاد مذکورہ حدیث کے ظاہر پر رکھی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سو کر اٹھنے کے بعد وضو فرمایا،

---

① شرح ابن بطال: 279/1. ② فتح الباري: 377/1. ③ عمدة القاري: 524/2.

یعنی اس حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ناقض وضو پیش آیا ہوگا اور قرآنی آیات تلاوت کرنے کے بعد آپ نے وضو کیا۔ یہ ممکن ہے کہ نقض وضو بعد از تلاوت پیش آیا ہو، یا آپ نے حدث کے بغیر ہی وضو کی تجدید کی ہو۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک اور توجیہ بیان کی ہے کہ عنوان سے حدیث کی مطابقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فعل سے ہے کہ آپ نے کہا: میں نے بھی اسی طرح کیا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو وضو کے بغیر آیات کی تلاوت کرتے سنا اور آپ نے انہیں منع نہیں فرمایا۔ اگر یہ تلاوت درست نہ ہوتی تو آپ ضرور تنبیہ فرما دیتے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس وقت نابالغ تھے، لہٰذا ان کا فعل حجت نہیں۔ یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب رسول اللہ ﷺ کے بائیں جانب کھڑے ہوئے تو آپ نے دوران نماز ہی میں فوراً اصلاح فرمائی۔ اگر تلاوت درست نہ ہوتی تو اس کی بھی اصلاح کر دینی چاہیے تھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نوم طویل کے بعد اٹھے تھے اور عام طور پر اتنے طویل وقت میں کسی حدث کا پیش آنا بعید از امکان نہیں، اس لیے مذکورہ حدیث سے امام بخاری کا استدلال صحیح ہے۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عنوان میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حدث کو مطلق بیان کیا تھا۔ اس حدیث سے اسے مقید کیا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد حدث اصغر ہے کیونکہ اگر حدث اکبر (جماع وغیرہ) لاحق ہوتا تو غسل کی ضرورت تھی جس کا مذکورہ حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک اور توجیہ بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہ کے ساتھ لیٹے تھے، اس لیے ملامست کی وجہ سے نقض وضو ہوا تھا لیکن یہ توجیہ اس لیے درست نہیں کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ اسے ناقض وضو شمار نہیں کرتے، پھر وہ اس پر اپنے عنوان کی بنیاد کیونکر رکھ سکتے ہیں؟ البتہ ملاعبت کی صورت میں اکثر مذی کا خروج ہو جاتا ہے اور مذی ناقض وضو ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس سے تعرض نہیں فرمایا اور جو بات ذکر کی ہے اس سے امام بخاری کو اتفاق نہیں۔ والله أعلم وعلمه أتم.

(۳۷) بَابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ إِلَّا مِنَ الْغَشْيِ الْمُثْقِلِ

باب: 37- شدید اور سخت قسم کی غشی ہی سے وضو ٹوٹتا ہے

وضاحت: نیند کو اس لیے نواقض وضو میں شمار کیا گیا ہے کہ اس میں انسان عقل و اختیار کی حدود سے باہر ہو جاتا ہے اور اس حالت میں خروج ریح کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا، اسی طرح جب بھی زوال عقل اور اختلال حواس کی صورت پیدا ہوگی، اسے ناقض وضو ہونے میں شمار کیا جائے گا۔ فقہاء نے زوال عقل کے دو اسباب ذکر کیے ہیں: نوم اور غیر نوم۔ غیر نوم میں جنون، اغماء، سکر اور عقل زائل کرنے والی ادویات شامل ہیں۔ اطباء کے نزدیک اغماء کا تعلق دماغ سے اور غشی کا تعلق دل سے ہے، یعنی اغماء، دماغ کی باریک شریانوں میں بلغم وغیرہ کے جمع ہونے کے باعث ہوتی ہے، دل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس میں سلب اختیار کی صورت نیند کی حالت سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ سوتے ہوئے انسان کو نیند سے بیدار کیا جا سکتا ہے جبکہ اغماء کی صورت

① عمدة القاري:521/2. ② فتح الباري:377/1. ③ فتح الباري:377/1.

میں غیر معمولی تدابیر ہی سے ہوش میں لایا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر اغماء ہر حالت میں ناقض وضو ہے۔ اور غشی کی حقیقت یہ ہے کہ ضعف قلب یا واردات کے دباؤ سے طاری ہوتی ہے۔ اس کے کئی ایک مدارج ہیں: ایک درجہ یہ ہے کہ اس میں ہوش و حواس ختم ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اسے غشیٔ مثقل کہتے ہیں۔ یہ قسم ناقض وضو ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ دوسرا درجہ غشیٔ خفیف یا غیر مثقل کا ہے۔ اس میں فی الجملہ ہوش قائم رہتا ہے۔ یہ غشی جمہور کے نزدیک ناقض وضو نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلے کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ غشی زیادہ کام کرنے یا زیادہ دیر تک دھوپ میں کھڑا رہنے یا کسی ہولناک کام کو دیکھ لینے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں گھبراہٹ تو کافی ہوتی ہے لیکن حواس معطل نہیں ہوتے۔ اس کا حکم اغماء اور غشیٔ مثقل کے حکم سے الگ ہے کیونکہ علت نقض کا تحقق نہیں ہوتا۔

١٨٤ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنِ امْرَأَتِهِ فَاطِمَةَ، عَنْ جَدَّتِهَا أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ أَنَّهَا قَالَتْ: أَتَيْتُ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ حِينَ خَسَفَتِ الشَّمْسُ فَإِذَا النَّاسُ قِيَامٌ يُصَلُّونَ، وَإِذَا هِيَ قَائِمَةٌ تُصَلِّي فَقُلْتُ: مَا لِلنَّاسِ؟ فَأَشَارَتْ بِيَدِهَا نَحْوَ السَّمَاءِ، وَقَالَتْ: سُبْحَانَ اللهِ! فَقُلْتُ: آيَةٌ؟ فَأَشَارَتْ: أَنْ نَعَمْ، فَقُمْتُ حَتَّى تَجَلَّانِي الْغَشْيُ، وَجَعَلْتُ أَصُبُّ فَوْقَ رَأْسِي مَاءً، فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «مَا مِنْ شَيْءٍ كُنْتُ لَمْ أَرَهُ إِلَّا قَدْ رَأَيْتُهُ فِي مَقَامِي هٰذَا حَتَّى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ، وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُونَ فِي الْقُبُورِ مِثْلَ أَوْ قَرِيبًا مِّنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ» - لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - يُؤْتَى أَحَدُكُمْ فَيُقَالُ لَهُ: مَا عِلْمُكَ بِهٰذَا الرَّجُلِ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ أَوِ الْمُوقِنُ - لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُولُ: هُوَ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ جَاءَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى فَأَجَبْنَا وَآمَنَّا وَاتَّبَعْنَا، فَيُقَالُ: نَمْ صَالِحًا فَقَدْ

[184] حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت گئی جب سورج کو گرہن لگا ہوا تھا۔ دیکھا کہ لوگ کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی کھڑی نماز پڑھ رہی ہیں۔ میں نے کہا: لوگوں کا کیا حال ہے؟ تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور سبحان اللہ کہا۔ میں نے کہا: کیا کوئی نشانی ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ کیا کہ ہاں۔ میں بھی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی تا آنکہ مجھے غشی نے ڈھانک لیا اور میں اپنے سر پر پانی بہانے لگی۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا: ''میں نے اپنے اس مقام میں ہر وہ چیز دیکھی جو مجھے پہلے نہ دکھائی گئی تھی حتی کہ میں نے جنت اور دوزخ کو بھی دیکھا۔ میرے پاس وحی آئی ہے کہ تم اپنی قبروں میں مسیح دجال کے فتنے کے مماثل یا اس کے قریب قریب آزمائے جاؤ گے...... (راویۂ حدیث فاطمہ کہتی ہے:) میں نہیں جانتی کہ حضرت اسماء نے (لفظ مثل یا قریب میں سے) کون سا لفظ کہا تھا...... تم سے ایک کے پاس (قبر میں فرشتے) بھیجے جائیں گے اور اس سے کہا جائے گا کہ اس شخص (محمد ﷺ) کے متعلق تم کیا جانتے ہو؟ تو مومن یا مُوقِن...... (فاطمہ نے کہا:) معلوم

عَلِمْنَا إِنْ كُنْتَ لَمُوقِنًا. وَأَمَّا الْمُنَافِقُ أَوِ الْمُرْتَابُ - لَا أَدْرِي أَيَّ ذٰلِكَ قَالَتْ أَسْمَاءُ - فَيَقُولُ: لَا أَدْرِي، سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُولُونَ شَيْئًا فَقُلْتُهُ». [راجع: ٨٦]

نہیں اسماء نے کیا لفظ کہا تھا.....تو وہ کہے گا کہ یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو ہمارے پاس معجزات اور ہدایات لے کر آئے تھے۔ ہم نے ان کی دعوت کو قبول کیا، ان پر ایمان لائے اور ان کی اطاعت کی۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ آرام سے سو جاؤ۔ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ تم اس کا یقین رکھتے ہو۔ رہا منافق یا مرتاب...... (فاطمہ نے کہا:) مجھے یاد نہیں اسماء نے کیا کہا تھا......تو وہ کہے گا: مجھے معلوم نہیں۔ میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا تھا تو میں نے بھی وہ کہہ دیا۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نواقض وضو میں غشی کا شمار کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ مثقل کی قید لگا کر ان لوگوں کا رد کر رہے ہیں جو اسے مطلقاً ناقض کہتے ہیں۔ امام بخاری کے نزدیک مطلق طور پر غشی ناقض نہیں، صرف وہ غشی ناقض ہے جو انسان کو اس حد تک بوجھل کر دے کہ اس کے حواس معطل ہو جائیں۔ استدلال کی بنیاد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا عمل ہے کہ ان پر بحالت نماز غشی کا اثر ہوا لیکن حواس بحال ہیں، وہ اس حالت میں پانی سر پر ڈالتی رہیں تا کہ بے حواسی ختم ہو جائے۔ اسی حالت میں نماز پڑھتی رہیں۔ آپ کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت میں ہوا، اس لیے آپ کی تقریری حدیث کی رو سے حجت ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی غشی سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ واضح رہے کہ حدیث کے مطابق حضرت اسماء پر غشی کے اثرات ظاہر ہوئے، لیکن اصلاحی صاحب فرماتے ہیں: ''واقعہ یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو غشی طاری ہونے کا اندیشہ ہوا، غشی طاری نہیں ہوئی۔''[1] ع سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔ واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کا مقصد احادیث میں تشکیک پیدا کرنا ہے، خواہ کسی طریقے سے ہو۔ ② اس میں کوئی شک نہیں کہ اغماء، جنون اور غشی مثقل نواقض وضو سے ہیں، اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اس مسئلے میں جمہور کے ساتھ ہیں، البتہ ابن حزم کو اس موقف سے اختلاف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس میں اجماع کا دعویٰ سراسر باطل ہے۔ صرف تین اشخاص نے اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے: ابراہیم نخعی اور حماد تو غشی کے بعد وضو کے قائل ہیں اور حسن بصری اس کے بعد غسل کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اب اجماع کہاں ہے؟ نیند، اغماء اور جنون و بے ہوشی کے مشابہ نہیں، اس لیے نیند پر قیاس کرنا بھی صحیح نہیں۔ پھر سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ غشی اور اغماء کی وجہ سے احرام و صیام اور اس کے دیگر معاملات صحیح رہتے ہیں ان میں کوئی بھی باطل نہیں ہوتا تو وضو کا بطلان بغیر کسی نص صریح کے کیسے ہو جائے گا۔ البتہ اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل ثابت ہوا ہے کہ مرض وفات میں آپ نے نماز کے لیے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو اغماء کی صورت طاری ہو گئی، پھر جب افاقہ ہوا تو آپ نے غسل فرمایا۔ اس میں حدیث مذکور کی راویہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وضو کا کوئی ذکر نہیں کیا اور غسل بھی اس لیے تھا کہ ایسا کرنے سے قوت بحال ہو جائے۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ ابن حزم کے نزدیک غشی و اغماء سے وضو نہیں ٹوٹتا، خواہ وہ کیسی ہی ہو کیونکہ اس کے لیے کوئی نص صریح نہیں، حالانکہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں غشی خفیف ہی کی

① تدبر حدیث: 285/1. ② محلی ابن حزم: 222/1.

ایک صورت کا ذکر ہے جس سے زوال عقل وحواس نہیں ہوا۔ ممکن ہے امام بخاری رحمہ اللہ نے ان حضرات کی تردید ہی کے لیے یہ عنوان قائم کیا ہو۔ ③ اس حدیث سے بعض حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے حاضر وناظر ہونے پر بھی استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں آپ کے لیے "هذا الرجل" استعمال ہوا ہے، حالانکہ اس سے مقصود استحضار ذہنی ہے جیسا کہ شاہ روم ہرقل نے حضرت ابوسفیان سے جب رسول اللہ ﷺ کے متعلق سوال کیے تھے تو وہاں بھی "هذا الرجل" کے الفاظ استعمال کیے تھے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ وہاں موجود نہ تھے، صرف استحضارِ ذہنی کے پیش نظر یہ اسلوب اختیار کیا گیا۔

(٣٨) بَابُ مَسْحِ الرَّأْسِ كُلِّهِ

باب:38- پورے سر کا مسح کرنا

لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ﴾ [المائدة:٦] وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ: اَلْمَرْأَةُ بِمَنْزِلَةِ الرَّجُلِ، تَمْسَحُ عَلَى رَأْسِهَا. وَسُئِلَ مَالِكٌ: أَيُجْزِئُ أَنْ يَمْسَحَ بَعْضَ الرَّأْسِ؟ فَاحْتَجَّ بِحَدِيثِ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ.

کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اور اپنے سروں کا مسح کرو۔" حضرت ابن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا: عورت مرد کی طرح ہے۔ وہ اپنے سر پر مسح کرے گی۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا: آیا یہ کافی ہے کہ انسان اپنے سر کے کچھ حصے کا مسح کر لے؟ تو انھوں نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث (جو آگے آ رہی ہے) بطور دلیل پیش کی، یعنی پورے سر کا مسح کرنا ضروری ہے۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے قبل ازیں وضو میں دھوئے جانے والے اعضاء اور اس کے متعلقات کا ذکر کیا تھا، اب ان اعضاء کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن پر مسح کرنا چاہیے۔ ان میں سرفہرست سر ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ پورے سر کا مسح کرنا ضروری ہے، بطور دلیل آیت کریمہ کو پیش کیا ہے کہ "اپنے سروں کا مسح کرو۔" عربی میں رأس، پورے سر کو کہتے ہیں، سر کے کسی حصے کو رأس نہیں کہا جاتا، بلکہ اسے بعض رأس کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی استیعاب (مکمل سر کا مسح کرنے) پر عمل فرمایا۔ حضرت سعید بن مسیّب نے عورت کے متعلق مسح کا ذکر کرتے ہوئے بعض کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب عورت کے لیے پورے سر کا مسح ضروری ہے، حالانکہ عورت کے بال قابل ستر ہیں، اس کے باوجود اسے رعائت نہیں دی گئی کہ وہ اپنے دوپٹے پر مسح کر لے یا کچھ بالوں پر ہاتھ پھیر لے تو مردوں کے لیے تو بالاولیٰ پورے سر کا مسح ضروری ہوا۔ حضرت سعید بن میسب کے اس اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (45/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ادائے فرض کے لیے اگر سر کے کچھ حصے کا مسح کر لیا جائے تو کافی ہوگا؟ امام صاحب نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی حدیث بطور دلیل پیش فرمائی کہ ایسا کرنا درست نہیں بلکہ پورے سر کا مسح کرنا ہوگا۔ امام مالک سے روایت کرنے والے حضرت اسحاق بن عیسیٰ بن الطباع ہیں جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ میں ہے۔①

1 صحيح ابن خزيمة:81/1، حديث:157.

١٨٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِعَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ - وَهُوَ جَدُّ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى -: أَتَسْتَطِيعُ أَنْ تُرِيَنِي كَيْفَ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ زَيْدٍ: نَعَمْ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ، ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ، بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتَّى ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ رَدَّهُمَا إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. [انظر: ١٨٦، ١٩١، ١٩٢، ١٩٧، ١٩٩]

[185] یحیٰی مازنی سے روایت ہے، ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن زید ؓ سے پوچھا، اور وہ عمرو بن یحیٰی کے دادا ہیں: کیا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح وضو کیا کرتے تھے؟ عبداللہ بن زید ؓ نے کہا: ہاں۔ چنانچہ انھوں نے پانی منگوایا اور اپنے ہاتھوں پر ڈالا اور ان کو دو مرتبہ دھویا۔ پھر تین مرتبہ کلی کے لیے منہ میں اور ناک میں پانی ڈالا۔ پھر تین بار اپنا چہرہ دھویا۔ بعد ازاں اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دو، دو مرتبہ دھویا۔ پھر اپنے سر کا دونوں ہاتھوں سے مسح کیا، ہاتھوں کو آگے سے لے گئے اور پیچھے سے لائے۔ مسح سر کے اگلے حصے سے شروع کیا اور اس کے پچھلے حصے تک لے گئے۔ پھر جہاں سے شروع کیا تھا وہاں تک ہاتھوں کو لائے۔ پھر دونوں پاؤں دھوئے۔

فوائد و مسائل: ① حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی پیشانی اور پگڑی پر مسح فرمایا۔[1] ناصیہ سر کا وہ حصہ ہے جس کے بالوں کا رخ پیشانی کی طرف ہو۔ اس روایت کی بنیاد پر بعض فقہاء نے چوتھائی سر کے مسح کو فرض قرار دیا ہے۔ امام بخاری ؒ کا موقف ان کے خلاف ہے، قرآن مجید میں سر پر مسح کرنے کا ذکر ہے، لیکن اس کی مقدار کے متعلق اجمال تھا جس کی وضاحت حضرت عبداللہ بن زید ؓ سے مروی حدیث میں مذکور ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت میں اگرچہ ناصیہ پر مسح کرنے کا ذکر ہے، لیکن حدیث کے مطابق یہ اس صورت میں ہے جب سر پر پگڑی ہو۔ جتنا حصہ سر کا ننگا ہے، اس پر مسح کر کے باقی پگڑی پر کر لیا جائے۔ اس طرح احادیث میں کوئی ٹکراؤ کی صورت پیدا نہیں ہوتی کیونکہ جب پگڑی نہیں ہوگی تو تمام سر کا مسح کرنا ہوگا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن زید ؓ سے مروی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ جو فقہاء آیت کریمہ میں "ب" کو زائد یا تبعیضیہ قرار دیتے ہیں ان کا موقف بھی درست نہیں، بلکہ یہ "ب" الصاق کے معنی میں مستعمل ہے۔ ② حدیث میں [فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ] سے مقصود مسح کی کیفیت بیان کرنا ہے اور یہ دو حرکتیں ہیں جن سے مسح کی تکمیل ہوتی ہے، دوبار مسح کرنا نہیں کیونکہ اس روایت میں اِقبال و اِدبار کے ساتھ [مرة واحدة] کے الفاظ بھی مروی ہیں۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ اقبال و ادبار کے ساتھ بھی مسح کو ایک ہی بار سمجھا جاتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سامنے کے حصے سے مسح کرتے ہوئے گدی تک دونوں ہاتھ پہنچائے، پھر ادھر سے مسح کرتے ہوئے سامنے تک آجائے تاکہ پوری طرح سارے سر کا مسح ہو جائے۔ ویسے اقبال کے لغوی معنی اگلی طرف آنا اور ادبار کے پچھلی طرف جانا ہیں لیکن یہ معنی روایت مذکور میں مقصود نہیں کیونکہ اس

① صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 636(274). ② صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 186.

سے صورت برعکس ہو جاتی ہے جو غیر مقصود ہے۔ درحقیقت راوی نے یہاں ترتیب کی رعایت نہیں کی اور نہ واؤ عطف میں ترتیب ہی ہوتی ہے لیکن صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت میں [فَأَدْبَرَ بِيَدِهِ وَأَقْبَلَ] بھی ہے۔[1] وہ صحیح صورت واقعہ کا نقشہ پیش کرتی ہے اور لغوی معنی کے بھی مطابق ہے۔ لیکن اگر اَقْبَلَ کے معنی کر لیے جائیں، سر کے اگلے حصے سے مسح شروع کیا وَاَدْبَرَ اور (پھر) پیچھے سے ہاتھ آگے لائے تو اس صورت میں ان کا مطلب بھی صحیح واضح ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم. ③ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے وضو کے متعلق سوال کرنے والے عمرو بن ابی حسن ہیں جیسا کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ نے اگلے باب میں اس کی وضاحت فرمائی ہے جو عمرو بن یحییٰ کے دادا ہیں جس کی صراحت خود روایت میں موجود ہے۔ مؤطا امام مالک میں سائل کی تعیین کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ جمع کی صورت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کے پاس تین شخص تھے: ایک ابوحسن انصاری، دوسرے ان کے بیٹے عمرو بن ابی حسن اور تیسرے ان کے پوتے یحییٰ بن عمارہ بن ابی حسن۔ یہ تینوں حضرات وضوئے نبوی معلوم کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن زید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے متعلق سوال عمرو بن ابی حسن نے کیا۔ اب جہاں سوال کی نسبت عمرو بن ابی حسن کی طرف کی گئی ہے تو یہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن جہاں ان کے والد ابوحسن یا ان کے بھتیجے یحییٰ بن عمارہ کی طرف کی گئی ہے وہاں مجاز پر محمول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سائل عمرو بن ابی حسن ہیں اور یہ یحییٰ بن عمارہ کے حقیقی چچا اور عمرو بن یحییٰ کے عم الاب ہونے کی حیثیت سے عمرو بن یحییٰ کے مجازی دادا ہیں۔ اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ بعض حضرات نے عبارت میں هُوَ ضمیر کو عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی طرف راجع کیا ہے جو درست نہیں کیونکہ عبداللہ بن زید حقیقی یا مجازی کسی بھی اعتبار سے عمرو بن یحییٰ کے دادا نہیں ہیں۔[2]

(٣٩) بَابُ غَسْلِ الرِّجْلَيْنِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

باب: 39- پیروں کو ٹخنوں تک دھونا

١٨٦ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ عَنْ عَمْرٍو، عَنْ أَبِيهِ: شَهِدْتُ عَمْرَو بْنَ أَبِي حَسَنٍ سَأَلَ عَبْدَ اللهِ بْنَ زَيْدٍ عَنْ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ فَدَعَا بِتَوْرٍ مِّنْ مَّاءٍ، فَتَوَضَّأَ لَهُمْ وُضُوءَ النَّبِيِّ ﷺ فَأَكْفَأَ عَلَى يَدِهِ مِنَ التَّوْرِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ غَرَفَاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَمَسَحَ

[186] عمرو بن ابی حسن سے روایت ہے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کے وضو کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے پانی کا برتن منگوایا اور انھیں نبی ﷺ کا وضو کر کے دکھایا، چنانچہ برتن کو جھکا کر اپنے ہاتھ میں پانی لیا اور ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا۔ پھر برتن میں ہاتھ ڈال کر پانی لیا۔ اس سے کلی کی، ناک میں پانی چڑھایا اور اسے صاف کیا۔ یہ سب کام تین چلوؤں سے کیے۔ پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور چہرۂ مبارک کو تین بار دھویا۔ بعد ازاں دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دو مرتبہ دھویا۔ پھر اپنا ہاتھ ڈالا اور اقبال

1 صحيح البخاري، الوضوء، حديث:199. 2 فتح الباري:1/380.

رَأْسَهُ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ مَرَّةً وَاحِدَةً، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ. [راجع: ١٨٥]

و ادبار کے ساتھ ایک مرتبہ سر کا مسح کیا۔ اس کے بعد اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کا مسئلہ دو مرتبہ بیان کر چکے ہیں: * دونوں پاؤں دھونے چاہییں، قدموں پر مسح نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیے: (باب: 27) * جوتوں پر مسح کرنے کے بجائے، انھیں پہنے ہوئے پاؤں دھونا۔ دیکھیے: (باب: 30) اگر اسکے ساتھ ''ایڑیاں دھونا،، کے عنوان کو شامل کر لیا جائے تو گویا آپ اس مسئلے کو تین مرتبہ بیان کر چکے ہیں۔ اب صرف آیت کریمہ کی ترتیب کے اعتبار سے اس مسئلے کو یہاں بیان کر رہے ہیں لیکن تکرار سے بچنے کے لیے اس عنوان کو ''ٹخنوں تک'' کی قید سے مقید کر دیا تا کہ دوسرے تراجم سے ممتاز ہو جائے۔ ② بعض شارحین نے اس عنوان کو سابق عنوان کا تکملہ قرار دیا ہے کہ امام بخاری اس سے بھی مکمل سر کا مسح ثابت کر رہے ہیں کہ جب رِجْلَيْن، جو اعضائے وضو سے ہیں، مکمل دھوئے جاتے ہیں تو مسح بھی سارے سر کا ہونا چاہیے۔ وہ اس طرح کہ پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا ثابت ہے اور سر کے ٹخنے کان ہیں، ان کے سمیت سر کا مسح کرنا ہوگا کیونکہ سنن کی جن روایات میں کانوں کو سر میں شامل کیا گیا ہے وہ روایات امام بخاری کی شرط کے مطابق نہ تھیں۔ اس لطیف اسلوب سے آپ نے ان روایات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ③ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ ایک اور تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم میں پاؤں دھونے کی حد مقرر کی گئی ہے، یعنی انھیں ٹخنوں تک دھویا جائے۔ [اَرْجُلَكُمْ] کو منصوب پڑھیں یا مجرور، دونوں صورتوں میں پاؤں کا دھونا متعین ہے کیونکہ لفظ ''اِلٰی'' تحدید کے لیے ہے اور مسح میں تحدید کا کوئی بھی قائل نہیں، لہٰذا جو لوگ اسے مجرور پڑھنے کی صورت میں پاؤں پر مسح کرنے کے متعلق کہتے ہیں وہ درست نہیں ہے، نیز عربی زبان میں مسح کا لفظ دھونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر اسے مسح کے تحت بھی مان لیا جائے تو بھی انھیں دھونے ہی سے شارع علیہ السلام کا مقصد پورا ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک انھیں دھونے ہی کا ہے، خواہ اسے منصوب پڑھیں یا مجرور۔ ④ پاؤں پر مسح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب موزے پہنے ہوئے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے ایسی حالت میں مسح کرنا ثابت ہے لیکن پاؤں ننگے ہونے کی صورت میں دھونے کے علاوہ اور کوئی صورت متعین نہیں۔ پھر پاؤں کو دھونے سے مسح کا عمل خود بخود ادا ہو جاتا ہے لیکن اس کے برعکس مسح کرنے سے غسل کا عمل بھی ادا ہو جائے، اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ ⑤ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ایک ہی چلو سے کلی اور ناک میں پانی ڈالا جا سکتا ہے، نیز سر کا مسح صرف ایک مرتبہ کرنا ہے اس میں تکرار نہیں ہے۔[1] ⑥ رسول اللہ ﷺ کے وضو کے متعلق مختلف روایات کتب حدیث میں مروی ہیں۔ ان میں کوئی تضاد نہیں بلکہ جس کا جو مشاہدہ تھا اس نے بیان کر دیا، مقصد یہ ہے کہ ان تمام طریقوں سے وضو ہو سکتا ہے۔ اعضاء کا ایک ایک، دو دو یا تین تین مرتبہ دھونا بیان جواز کے لیے ہے، کہنیاں اور ٹخنے بھی دھونے کے عمل میں شامل ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کلائیاں دھوئیں تا آنکہ اپنے بازوؤں کو دھونے لگے، نیز آپ نے اپنے پاؤں دھوئے تا آنکہ پنڈلی کو دھونا شروع کیا۔[2] اس سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ ٹخنے اور کہنیاں دھونے کے عمل میں شامل ہیں، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ''اِلٰی'' بمعنی ''مع'' ہے۔[3]

---

① صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 191، 192. ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 579 (246). ③ فتح الباري: 382/1.

(٤٠) بَابُ اسْتِعْمَالِ فَضْلِ وَضُوءِ النَّاسِ

باب:40- لوگوں کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو کام میں لانا

وَأَمَرَ جَرِيرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ أَهْلَهُ أَنْ يَتَوَضَّؤُا بِفَضْلِ سِوَاكِهِ.

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل خانہ کو اس پانی سے وضو کرنے کا حکم دیا جو مسواک کرنے کے بعد بچ رہا تھا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں مطلق طور پر تین الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کے ساتھ کسی قید کا ذکر نہیں کیا۔ اس بنا پر عنوان کا مفہوم بہت وسیع ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: * استعمال: اس سے مراد پانی کو کام میں لانے کی جتنی بھی صورتیں ممکن ہیں، وہ اس میں شامل ہیں، مثلاً: نوش کرنا، نہانا، کپڑے دھونا اور وضو کرنا وغیرہ * فضل: یہ لفظ بھی اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے، یعنی اس سے مراد وہ پانی بھی ہے جو وضو کے بعد برتن میں بچ گیا ہو اور وہ بھی مراد ہے جو اعضاء کو دھوتے وقت ٹپک ٹپک کر کسی جگہ جمع ہوگیا ہو۔ * وضو: اس میں بھی توسع ہے کہ اس سے مراد وضوئے حدث بھی ہوسکتا ہے اور وضوئے مستحب بھی ہوسکتا ہے جسے وضوعلیٰ وضو کہا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی پیش کردہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فضل وضو دونوں معنوں کے اعتبار سے طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، جبکہ بعض لوگ اسے طاہر تو مانتے ہیں لیکن رفع حدث کے لیے دوبارہ اس قسم کے پانی کو وضو میں استعمال کرنا صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ اس سے ایک مرتبہ طہارت حاصل کی جاچکی ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک جو پانی وضو کے لیے استعمال ہو چکا ہو، اس قسم کا ماءِ مستعمل نجس ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ پانی جو رفع حدث کے لیے ثواب کی نیت سے استعمال کیا گیا ہے اس میں حدیث کے مطابق وہ معاصی بھی شامل ہوگئے ہیں جو وضو کرنے سے پہلے مختلف اعضاء سے سرزد ہوئے تھے، اس بنا پر یہ نجاست ظاہری نہیں جو بصارت اور حواس ظاہری سے معلوم کی جاسکتی ہو بلکہ یہ نجاست معنوی ہے جس کا تعلق بصیرت اور دل کی بیداری سے ہے۔ ان کے نزدیک اگر کسی کے صغیرہ گناہ دھلے ہیں تو یہ پانی نجاست خفیفہ کا حکم رکھتا ہے اور اگر کوئی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے تو ماءِ مستعمل نجاست غلیظہ کے حکم میں ہے، لیکن اس فکر کے پس منظر میں کوئی روایت نہیں بلکہ محض عقل کے بل بوتے پر اسے نجس ثابت کیا جارہا ہے جس کی علمی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں، البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ کے اس عنوان سے وہ پانی مراد ہے جو وضو کے بعد برتن میں بچ گیا ہو۔ لیکن ہمارے نزدیک ''فضل'' سے مراد وہ دونوں صورتیں ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ایک اثر اور چند حدیثیں پیش کی ہیں۔ جریر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اثر کو ابن ابی شیبہ (313/1) اور دارقطنی نے موصولاً بیان کیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ پانی میں ڈبو ڈبو کر مسواک کرتے پھر اپنے اہل خانہ کو اس پانی سے وضو کرنے کا حکم دیتے۔ دارقطنی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تم اس پانی سے وضو کرو جس میں مسواک کو ڈبویا گیا ہے۔ مسواک چونکہ حدیث کے مطابق [مطهرة للفم] ''منہ کو پاک کرنے کا آلہ ہے'' جس طرح وضو [مطهرة للبدن] ''بدن کو پاک کرنے کا ذریعہ ہے۔''

منہ کی طہارت کے لیے استعمال شدہ مسواک کا وہی حکم ہے جو بدن کی طہارت کے لیے استعمال شدہ پانی کا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی بنا پر حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر بیان فرمایا ہے۔ منہ کی طہارت کے لیے استعمال شدہ مسواک جس پانی میں ڈالی گئی، اگر وہ استعمال کے قابل نہ ہوتا تو حضرت جریر اسے استعمال کرنے کا حکم کیوں دیتے؟ امام احمد رحمہ اللہ سے اس اثر کا مطلب دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ پانی کے برتن میں مسواک ڈالتے اور اسے استعمال کرتے، جب مسواک سے فارغ ہو جاتے تو اس پانی سے وضو کر لیتے۔ اس سلسلے میں ایک مرفوع روایت بھی دارقطنی کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے لیکن اس کی سند درست نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن التين وغیرہ کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے وہ پانی مراد ہے جس میں مسواک کو نرم کرنے کے لیے تر کیا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے فعل مذکور سے پانی میں کوئی تغیر نہیں آیا اور انھوں نے اس غیر متغیر پانی کو استعمال کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح پانی کو صرف استعمال کرنے سے بھی اس میں کوئی تغیر نہیں آتا، لہٰذا اس سے دوبارہ طہارت حاصل کرنا ممنوع نہیں ہوگا۔[1]

١٨٧ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا الْحَكَمُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا جُحَيْفَةَ يَقُولُ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ فَأُتِيَ بِوَضُوءٍ، فَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُونَ مِنْ فَضْلِ وَضُوئِهِ فَيَتَمَسَّحُونَ بِهِ، فَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ. [انظر: ٣٧٦، ٤٩٥، ٤٩٩، ٥٠١، ٦٣٣، ٦٣٤، ٣٥٥٣، ٣٥٦٦، ٥٧٨٦، ٥٨٥٩]

[187] حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دن رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت ہمارے ہاں تشریف لائے۔ آپ کے پاس وضو کا پانی لایا گیا تو آپ نے وضو فرمایا۔ پھر لوگ آپ کے وضو سے باقی ماندہ پانی لینے لگے اور بدن پر ملنے لگے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے ظہر اور عصر کی دو، دو رکعت ادا کیں اور دوران نماز میں آپ کے سامنے ایک برچھی گاڑی گئی تھی۔

فوائد ومسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حدیث مذکور میں فضل وضو سے مراد وہ پانی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ گیا تھا جسے لوگوں نے تقسیم کر لیا اور چہروں پر ملنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہو جو وضو کرتے وقت اعضائے شریفہ سے گر رہا تھا جسے فقہاء کی اصطلاح میں ماءِ مستعمل کہتے ہیں۔ یہ حدیث مستعمل پانی کے پاک ہونے کی واضح دلیل ہے۔[2] لیکن ہمارے نزدیک اس سے مراد وہ پانی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اعضائے شریفہ پر لگنے کے بعد گر رہا تھا، اس میں انوار و برکات زیادہ ہیں۔ اس متبرک پانی کو حاصل کرنے کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہوئی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ وضو کے بعد جو پانی برتن میں بچ رہے یا وہ پانی جو وضو کرنے والے کے اعضاء سے ٹپکے، اس قسم کے پانی کو دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ پانی نجس نہیں کیونکہ نجاست آلود چیز بابرکت نہیں ہو سکتی۔ ② جو لوگ ماءِ مستعمل کو ''ماءِ ذُنوب'' قرار دے کر نجس کہتے ہیں اور اسے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے، ان کے متعلق ابن بطال نے محدث ابن القصار کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس پانی سے گناہوں کا ڈھل جانا اپنی جگہ پر مسلّم حقیقت ہے لیکن وہ گناہ نمک کی طرح پانی میں

① فتح الباري: 385/1. ② فتح الباري: 386/1.

تحلیل نہیں ہوئے کہ اسے نجس قرار دیدیا جائے، اس طرح یہ گناہ پانی کے حکم پر شرعاً اثر انداز نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے بطور مثال ہمیں سمجھایا ہے کہ جس طرح کپڑا دھونے سے اس کی میل کچیل دور ہو جاتی ہے اسی طرح وضو کرنے سے انسان کا بدن گناہوں کی میل کچیل سے صاف ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ وضو کا پانی پہلے پہلے اعضائے وضو کے جن اجزاء پر پڑے گا اگر وہ گناہوں کی آمیزش سے نجس ہو جاتے تو اعضائے وضو کے بقیہ اجزاء کو کیونکر پاک کرسکتا ہے۔ اگر ایسی بات ہو تو وضو کرنے والے کو اعضائے وضو کے ہر حصے کو دھونے کے لیے نیا پانی لینا پڑے گا، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔[1] ③ یہ واقعہ حجۃ الوداع کا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مضافات مکہ میں نماز پڑھتے وقت سترے کا اہتمام کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد حرام یا حرم مکہ میں بھی امام اور منفرد کو نماز کے لیے اپنے آگے سترہ رکھنا ضروری ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر مکہ اور غیر مکہ میں سترے کے ضروری ہونے کے لیے ایک عنوان قائم کیا ہے۔[2] ④ وضو کرتے وقت اعضائے وضو سے ٹپکنے والا پانی اس معنی میں تو مستعمل ہوسکتا ہے کہ یہ پینے کے قابل نہیں رہتا کہ آپ لوگوں کو پیش کریں، لیکن اگر کسی کپڑے پر گر جائے تو اس سے کپڑا نجس نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس سے اجتناب کرنے کی تلقین ضرور فرماتے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے پیشاب کے چھینٹوں سے احتراز کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اعضائے شریفہ سے لگ کر گرنے والا پانی انتہائی بابرکت ہے جبکہ عام انسان کے اعضاء سے گرنے والا پانی اس قسم کی خیر و برکت سے خالی ہوتا ہے۔

١٨٨ - وَقَالَ أَبُو مُوسٰى: دَعَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَدَحٍ فِيهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيهِ، وَمَجَّ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ لَهُمَا: «اِشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلٰى وُجُوهِكُمَا وَنُحُورِكُمَا». [انظر: ١٩٦، ٤٣٢٨]

[188] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی اکرم ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا۔ پھر آپ نے اس پیالے میں اپنے دونوں ہاتھ اور چہرۂ مبارک دھویا اور اس میں کلی فرمائی۔ پھر ان دونوں سے فرمایا: ''اس میں سے کچھ پانی نوش جان کر لو اور کچھ اپنے چہروں اور سینوں پر ڈال لو۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو آگے موصولاً بیان کیا ہے۔[3] بلکہ کتاب المغازی میں اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ اور مدینہ کے درمیان جعرانہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ آپ کے ہمراہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ آپ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: آپ وعدے کے مطابق مجھے کچھ دیتے کیوں نہیں؟ آپ نے حوصلہ افزائی کے طور پر فرمایا: [أَبْشِرْ] ''تیرے لیے خوشخبری ہے۔'' اس نے جواب دیا: مجھے خوشخبری نہیں بلکہ مال چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ انور غصے کی وجہ سے متغیر ہو گیا اور آپ نے فرمایا: ''اس نے تو میری بشارت کو رد کر دیا ہے، تم دونوں (ابوموسیٰ اشعری اور بلال) اسے قبول کر لو۔'' انھوں نے عرض کیا: ہم بسر وچشم قبول کرتے ہیں۔ پھر آپ نے ایک پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا۔ اس میں اپنے ہاتھ اور چہرہ دھویا اور کلی فرمائی۔ پھر آپ نے

1 شرح ابن بطال: 290/1. 2 صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 501. 3 صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 196.

حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو نوش جان کرنے کا حکم دیا اور اپنے سینوں اور چہروں پر اسے چھڑکنے کا کہا اور آپ نے انھیں دوبارہ بشارت دی۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اتنے میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پردے کے پیچھے سے گویا ہوئیں کہ اپنی ماں کے لیے کچھ پانی بچا لینا، چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لیے کچھ پانی بچا کر رکھ لیا۔[1] یہ پس منظر ہم نے اس لیے بیان کیا ہے تاکہ بزعم خویش "تدبر قرآن" کے مدعی حضرات کی علمی بے بضاعتی کا پتہ چل جائے۔ ان کے سامنے صرف احادیث بخاری کا استخفاف ہے، چنانچہ اصلاحی صاحب کہتے ہیں: "یہ زیر بحث روایت کا حصہ نہیں بلکہ روایت پر ایک اضافہ ہے۔"[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس معلق (بے سند) روایت کو حدیث ابی جحیفہ کے بعد بیان فرمایا، وہ اس لیے نہیں کہ یہ روایت مذکورہ حدیث کا حصہ ہے بلکہ اسے ایک مستقل حدیث کے طور پر بیان فرمایا، لیکن اصلاحی صاحب کو بخاری کی اصلاح مقصود ہے، خواہ غیر اصلاحی طریقے سے ہو۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مستعمل پانی دوبارہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب اس کا پینا درست ہے تو آٹا گوندھنے اور کھانا پکانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف برکت کی خاطر دست مبارک اور چہرۂ اقدس کو اس پیالے میں دھویا اور برکت ہی کے پیش نظر اس میں کلی فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ وضو برائے تبریک تھا، یہ وضو تام نہیں اور نہ اس سے نماز پڑھنا ہی مقصود تھا، اس لیے ہم نے امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان میں اس کی وضاحت کر دی تھی کہ اس میں وسعت ہے، اپنی طرف سے قیود لگا کر اسے محدود نہ کیا جائے۔

١٨٩ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ قَالَ: وَهُوَ الَّذِي مَجَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي وَجْهِهِ وَهُوَ غُلَامٌ - مِنْ بِئْرِهِمْ - وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَغَيْرِهِ يُصَدِّقُ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهُ: وَإِذَا تَوَضَّأَ النَّبِيُّ ﷺ كَانُوا يَقْتَتِلُونَ عَلَى وَضُوئِهِ. [راجع: ٧٧]

[189] حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، یہ وہی محمود ہیں جن کے چہرے پر رسول اللہ ﷺ نے انھی کے کنویں کے پانی سے کلی فرمائی تھی جب کہ وہ بچے تھے۔ حضرت عروہ جناب مسور وغیرہ سے بیان کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے: جب نبیٔ اکرم ﷺ وضو فرماتے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو لینے کے لیے آپس میں جھگڑتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ایک واقعے سے استدلال کیا ہے۔ یہ استدلال اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب قائم کردہ عنوان میں وسعت پیدا کی جائے بصورت دیگر یہاں وضوئے تام تو دور کی بات ہے وضوئے ناقص بھی نہیں۔ گویا امام بخاری رحمہ اللہ پانی کے استعمال میں تعمیم کر رہے ہیں۔ کلی بھی پانی کے استعمال کی ایک شکل ہے، لہٰذا ان کے نزدیک پانی کسی بھی طرح استعمال ہو، سب کا ایک ہی حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اس عمل مبارک سے برکت پہنچانا مقصود تھا اور برکت کے لیے طہارت لازم ہے۔ واضح رہے کہ حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی جب رسول اللہ ﷺ

① صحيح البخاري، المغازي، حديث:4328. ② تدبر حديث:1/289.

نے ان کے گھر میں ڈول سے پانی لے کر ان کے منہ پر کلی کی تھی۔[1] ② اس سلسلے میں امام بخاری ؒ نے ایک دوسری روایت بھی پیش کی ہے جو حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے نقل کی ہے۔ امام بخاری نے اسے دوسرے مقام پر سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں عروہ بن مسعود ثقفی اپنے تأثرات بیان کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے آپ کے صحابۂ کرام ؓ کی والہانہ عقیدت سے متعلق ہیں، فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں قیصر و کسریٰ، نجاشی اور دیگر ملوک و سلاطین کے درباروں میں بطور سفیر گیا ہوں، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے حواری اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد ﷺ کے اصحاب آپ کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! اگر آپ نے تھوکا تو آپ کے اصحاب نے اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے چہرے اور بدن پر مل لیا۔ آپ نے اگر انھیں کوئی حکم دیا تو ہر شخص اس کی بجا آوری کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔ اگر آپ نے وضو کیا تو ایسا معلوم ہوتا کہ آپ کے وضو کے باقی ماندہ پانی کے لیے لڑائی ہو جائے گی۔ جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ تمام اصحاب ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں۔ ان کے دلوں میں آپ کی تعظیم کا یہ عالم ہے کہ آپ کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتے۔[2] ③ امام بخاری ؒ اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایک دفعہ استعمال کیا ہوا پانی دوبارہ کام میں لایا جا سکتا ہے اور محل استدلال یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ ﷺ کے وضو کے پانی پر صحابۂ کرام ؓ چھینا جھپٹی کرتے اور اسے زمین پر نہ گرنے دیتے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں: * وضو کے بعد برتن میں بچے ہوئے پانی کے حصول کے لیے کوشش کرتے۔ * ماءِ مستعمل حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے۔ لیکن ماءِ مستعمل کے لیے مسابقت کرنا زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اس میں انوار و برکات، جسم مبارک کے اتصال کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں۔ ④ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام ؓ کو آپ سے انتہائی محبت و عقیدت تھی۔ آپ کی ہر ہر ادا پر جان قربان کرتے تھے لیکن اصلاحی صاحب کے نزدیک یہ عقیدت محل نظر ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''رہا روایت کا آخری حصہ کہ لوگ وضو کے پانی پر ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تو میرے نزدیک یہ ابن شہاب کا اضافہ ہے جس کو قابل قبول بنانے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں اس کی تصدیق کرتے تھے۔ ابن شہاب نے یہ اضافہ صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ مسلمانوں کی عقیدت آنحضرت ﷺ کے ساتھ بالکل اندھے بہرے لوگوں کی عقیدت تھی۔ یہ بات اگر کہہ سکتے ہیں تو عام سادہ لوگ کہہ سکتے ہیں...... یہی وجہ ہے کہ کسی روایت میں آپ یہ بات نہیں پائیں گے کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر نے کبھی ایسا کیا ہو۔''[3] اس عبارت میں محدثین عظام بلکہ صحابۂ کرام ؓ کے متعلق جو زہر اگلا گیا ہے، وہ قارئین سے مخفی نہیں۔ اس کی بنیاد علمی دلائل نہیں بلکہ ان حضرات کی عقل عیار ہے۔ اس پر ہماری درج ذیل گزارشات ہیں: * عروہ بن مسعود ثقفی نے صحابۂ کرام ؓ کے متعلق اپنی قوم کے سامنے جس قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے قلبی تعلق اور حسن ارادت کی واضح دلیل ہے جسے اصلاحی صاحب نے ''اندھے بہرے لوگوں کی عقیدت'' کا نام دے کر ان حضرات کا مذاق اڑایا ہے۔ بات صرف رسول اللہ ﷺ کے وضو کا پانی لینے کے متعلق تھی کہ صحابۂ کرام ؓ اس کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔ اس کو ''اندھے بہرے لوگوں کی عقیدت'' سے تعبیر کرنا عجیب ہے، حالانکہ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت ہے کہ آپ نے پانی میں اپنے

[1] صحيح البخاري، العلم، حديث: 77. [2] صحيح البخاري، الشروط، حديث: 2732,2731. [3] تدبر حديث: 289/1.

ہاتھ، منہ دھوئے اور اس میں کلی فرمائی پھر اس پانی کے متعلق حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو نوش جان کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ یہ متبرک پانی میرے لیے بھی بچا کر رکھیں۔[1] کیا اسے بھی ''اندھے بہرے لوگوں کی عقیدت'' کہا جائے گا؟ ✱ مذکورہ روایت مختصر ہے۔ دوسرے مقام پر تفصیلی روایت میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے جذبات کا بھی ذکر ہے: جب عروہ بن مسعود نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ جب مصیبت آئی تو آپ کے اصحاب آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھ سکے اور اسے بایں الفاظ جواب دیا: ''جا اور اپنے بت لات کی شرم گاہ چوس۔'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس جواب کے متعلق آپ کیا گوہر افشانی فرمائیں گے؟ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حدیبیہ کے موقع پر قریش کی شرائط کے متعلق اپنے جذبات کا بایں الفاظ اظہار فرمایا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر ہم حق پر ہیں تو ان کا دباؤ کیوں قبول کریں اور اپنے دین کو کیوں ذلیل کریں؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے اپنی اس عجلت پسندی کی تلافی کے لیے بہت نیک اعمال کیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق اصلاحی صاحب کے کیا ارشادات ہیں؟

بَابٌ:

١٩٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ يُونُسَ قَالَ: حَدَّثَنَا حَاتِمُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ عَنِ الْجَعْدِ قَالَ: سَمِعْتُ السَّائِبَ بْنَ يَزِيدَ يَقُولُ: ذَهَبَتْ بِي خَالَتِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ ابْنَ أُخْتِي وَقِعٌ، فَمَسَحَ رَأْسِي وَدَعَا لِي بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنْ وَضُوئِهِ، ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهِ فَنَظَرْتُ إِلَى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ. [انظر: ٣٥٤٠، ٣٥٤١، ٥٦٧٠، ٦٣٥٢]

باب: بلاعنوان

[190] حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میری خالہ مجھے نبی ﷺ کے پاس لے گئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرا بھانجا بیمار ہے۔ تو آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر آپ نے وضو کیا تو میں نے آپ کے وضو سے بچا ہوا پانی پی لیا۔ پھر میں آپ کے پس پشت کھڑا ہوا اور مہر نبوت کو دیکھا جو آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان چھپر کھٹ کی گھنڈی (یا کبوتری کے انڈے) جیسی تھی۔

فوائد و مسائل: ① یہ باب عنوان کے بغیر ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل دو وجوہات ہیں: ✱ فضل ماء کے دو معنی ہیں: ایک وہ پانی جو وضو کے بعد برتن میں بچ رہے اور دوسرے، وہ پانی جو اعضائے وضو دھونے کے بعد نیچے گرے۔ اسے فقہاء کی اصطلاح میں ماء مستعمل کہتے ہیں۔ پہلے باب میں ماءِ مستعمل کا بیان تھا اور اس باب میں اس پانی کا ذکر ہے جو وضو کے بعد برتن میں باقی بچ رہتا ہے۔ ✱ امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ اگر ماسبق باب کے مضمون میں کوئی کمی رہ جائے تو بلاعنوان باب سے اس کی تلافی کرتے ہیں۔ یہاں بھی سابقہ روایات میں ماءِ مستعمل کو پینے کی اجازت کا ذکر تھا لیکن کمی یہ تھی کہ وہاں وضوئے تام نہیں بلکہ

[1] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4328.

صرف ہاتھ منہ دھونے اور کلی کا ذکر تھا جو وضوئے ناقص ہے۔ اس سے اشکال ہوسکتا تھا کہ وضوئے تام کا شاید کوئی اور حکم ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بلاعنوان میں اس کی تلافی کر دی اور ایسی حدیث پیش کی جس میں وضوئے تام کی تصریح ہے۔
(2) حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے بچا ہوا پانی نوش کیا۔ اس میں دونوں احتمال ہیں کہ وضو کے بعد برتن میں بچا ہوا پانی مراد ہو یا اعضائے شریفہ سے ٹپکنے والا پانی نوش کیا ہو، لیکن آپ کے استعمال کردہ پانی کو برکت اور بیماری کے علاج کے لیے استعمال کرنا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ (3) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان احادیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جو ماءِ مستعمل کو نجس کہتے ہیں، حالانکہ ماءِ مستعمل پلید نہیں کیونکہ ناپاک چیز برکت کے قابل نہیں ہوتی۔ پھر انھوں نے ابن منذر کے حوالے سے لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد جو تری اعضاء پر باقی رہتی ہے یا وہ قطرے جو دوران وضو میں کپڑوں پر گرتے ہیں، ان کے پاک ہونے پر اجماع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماءِ مستعمل بھی پاک ہے، اسے نجس قرار دینا صحیح نہیں۔[1] (4) واضح رہے کہ ''ماءِ مستعمل'' کے متعلق فقہاء کا اختلاف اس وضو یا غسل سے متعلق ہے جو بطور تقرب کیا گیا ہو۔ اگر وضو پر وضو کیا گیا ہے یا محض ٹھنڈک یا نظافت کے لیے پانی استعمال ہوا ہے تو اس قسم کے پانی کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ ایسا پانی طاہر و مطہر ہے۔
(5) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیمار بچے کو کسی بزرگ کے پاس بغرض دعا لے جانا تقویٰ کے خلاف نہیں ہے، نیز بچوں سے پیار اور ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کرنا سنت نبوی ہے۔ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی دعا کا یہ اثر تھا کہ آپ چورانوے (94) سال کی عمر میں تندرست و توانا تھے اور آپ کی سماعت و بصارت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔[2]
(6) اصلاحی صاحب نے اس حدیث پر بھی ''تدبر'' فرما کر اس کے انکار کا راستہ ہموار کیا ہے، چنانچہ مہر نبوت کے متعلق حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کے بیان پر بایں الفاظ تبصرہ کرتے ہیں: ''ایک کم عمر بچے کی زبان سے یہ بیان محل نظر ہے۔ کیا آنحضرت نے نماز میں جسم کا اوپر کا حصہ کھلا رکھا ہوا تھا؟ اگر ایسا ہوا ہو تو سائب کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں وہ مہر نبوت ہے؟ ایک بچے کا خیال اس طرف نہیں جاسکتا۔ ہاں اس کے منہ میں یہ بات ڈالی جاسکتی ہے...... میرے نزدیک مہر نبوت کا تصور اصول نبوت اور دین کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کسی طرح یہ بات رائج کر دی گئی اور یہ بعض لوگوں میں پھیل گئی۔''[3] اس بیان پر ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

* اصلاحی صاحب نے مہر نبوت کے انکار کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ نماز میں رسول اللہ ﷺ کے جسم کا اوپر کا حصہ کھلا ہوا نہیں تھا جس پر مہر نبوت کا مشاہدہ کیا جاسکتا۔ اصلاحی صاحب کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ جب حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے مہر نبوت کو دیکھا تو نبیٔ اکرم ﷺ نماز میں نہیں تھے۔ یہ ان کا اپنا قائم کردہ مفروضہ ہے جس کی احادیث سے تائید نہیں ہوتی۔ * اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت سائب کو کیسے معلوم ہوا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں وہ مہر نبوت ہے؟ حضرت سائب نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا ہے۔ اس وقت بچپن ختم ہو چکا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے چورانوے سال کی عمر میں بھی آپ تندرست و توانا تھے۔[4] نیز عہد رسالت میں پروان چڑھنے والے بچے ہمارے بچوں جیسے نہیں تھے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے

[1] فتح الباري:1/388. [2] صحيح البخاري، المناقب، حديث:3540. [3] تدبر حديث:1/290. [4] صحيح البخاري، المناقب، حديث:3540.

زمانے میں ایسے بچے کا بھی پتہ چلتا ہے کہ چھ سات سال کی عمر میں قرآن کریم کا بہت سا حصہ یاد کر لیا تھا اور لوگوں کی امامت کا فریضہ سرانجام دیتا تھا۔[1] ✱ اصلاحی صاحب نے الزام لگایا ہے کہ ان کے منہ میں یہ بات ڈالی جا سکتی ہے۔ مقام شکر ہے کہ اس روایت کی سند میں ابن شہاب زہری نہیں ہیں جوان کے حلق کا کانٹا ہے بصورت دیگر انھیں مورد الزام ٹھہرا دیا جاتا کہ انھوں نے یہ کام سرانجام دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مستشرقین وملحدین نے مہر نبوت کا انکار اصلاحی صاحب کے منہ میں ڈالا ہے جسے انھوں نے وقت ملتے ہی اگل دیا ہے۔ ✱ مہر نبوت کا مشاہدہ کرنے والے تقریباً دس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کی تفصیل یہ ہے: حضرت سائب بن یزید،[2] ام خالد بنت خالد،[3] جابر بن سمرہ،[4] عبداللہ بن سرجس،[5] قرہ بن ایاس مزنی،[6] رمیثہ بنت عمرو،[7] ابوزید عمرو بن اخطب،[8] حضرت سلمان فارسی،[9] قبیلۂ بنی عامر کا طبیب،[10] نیز امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت بریدہ اسلمی اور حضرت ابوسعید کا بھی حوالہ دیا ہے۔ مہر نبوت کے اثبات کے متعلق محدثین عظام نے اپنی تصانیف میں مستقل عنوان قائم کیے ہیں۔ اور امام بخاری، امام مسلم اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس پر عنوان بندی کر کے پھر مختلف احادیث سے اسے ثابت کیا ہے۔ علمائے اہل کتاب کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ امتیازی علامت معروف تھی۔ اس سلسلے میں صرف دو شہادتیں پیش کی جاتی ہیں: ✱ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے چچا ابوطالب کے ہمراہ بغرض تجارت شام کے علاقے میں گئے تو آپ کے ہمراہ قریش کے بڑے بڑے مشائخ بھی تھے۔ انھیں راستے میں ایک راہب ملا تو اس نے آپ کو اس مہر نبوت سے پہچانا۔[11] ✱ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایک راہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بتایا کہ وہ صدقہ نہیں کھائیں گے، ہدیہ قبول کریں گے۔ اور ان کے دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ان تینوں علامتوں کا مشاہدہ کیا اور مسلمان ہوئے۔''[12] اتنے حقائق کے باوجود اگر کہا جائے کہ مہر نبوت کا تصور اصول نبوت اور دین کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تو اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ خانہ ساز اور خود ساختہ ''تدبر'' کے برگ وبار اور فیوض وبرکات ہیں۔ یقیناً ان حضرات نے تدبر حدیث کے نام سے انکار حدیث کا جو خار دار پودا کاشت کیا تھا، اب وہ اللہ کے ہاں ان کے کانٹوں کی چبھن ضرور محسوس کر رہے ہوں گے۔ فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا.

قارئین کرام کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ احادیث پر تدبر فرمانے والوں نے پہلے قرآن کریم کو تدبر کی بھینٹ چڑھایا۔ ان حضرات کی احادیث کے متعلق دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ تفسیر تدبر قرآن جو آٹھ جلدوں اور ساڑھے چار ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، ان چار ہزار آٹھ صد ستر صفحات میں گنتی کی کل چالیس احادیث ذکر کی ہیں، البتہ جاہلی ادب اور لغت کی باریکیوں کی طرف کافی رجحان ہے۔ انھوں نے مبادیٔ تدبر قرآن میں تفسیر کے چار قطعی اصول بیان فرمائے ہیں: ○ ادب جاہلی ○ نظم قرآن ○ تفسیر القرآن بالقرآن ○ سنت متواترہ۔ اس کے بعد ظنی ماخذ کے طور پر احادیث کو قبول کیا گیا ہے۔ احادیث

---

(1) صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4302. (2) صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 190. (3) صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 3071. (4) صحيح مسلم، الفضائل، حديث: 6084 (2344). (5) صحيح مسلم، الفضائل، حديث: 6088 (2346). (6) سنن أبي داود، اللباس، حديث: 4082. (7) مسند أحمد: 329/6. (8) مسند أحمد: 340/5. (9) مسند أحمد: 438/5. (10) مسند أحمد: 223/1. (11) جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3620. (12) مسند أحمد: 443/5.

سے اس قدر بے اعتنائی بڑی معنی خیز ہے۔

نوٹ: مہر نبوت کی ماہیت وکیفیت اور اس کی غایت وحکمت کتاب المناقب میں تفصیل سے بیان ہوگی۔

(٤١) بَابُ مَنْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ غَرْفَةٍ وَاحِدَةٍ

١٩١ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ: أَنَّهُ أَفْرَغَ مِنَ الْإِنَاءِ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ غَسَلَ أَوْ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَاحِدَةٍ، فَفَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثًا فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ مَا أَقْبَلَ وَمَا أَدْبَرَ، وَغَسَلَ رِجْلَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ. ثُمَّ قَالَ: هٰكَذَا وُضُوءُ رَسُولِ اللهِ ﷺ. [راجع: ١٨٥]

باب:41- ایک ہی چلو سے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

[191] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے برتن سے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی انڈیلا اور ان کو دھویا، پھر دھویا۔ یا (یوں کہا کہ) ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، تین بار ایسا کیا۔ پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دو، دو بار دھویا اور سر پر مسح کیا آگے اور پیچھے دونوں طرف سے۔ اور دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوئے، پھر کہا: رسول اللہ ﷺ اس طرح وضو کیا کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① وضو کرتے ہوئے کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کی دو صورتیں ہیں: ○ ایک ہی چلو سے کلی کی جائے اور ناک میں پانی ڈالا جائے۔ اس صورت کو وصل کہتے ہیں۔ ○ دونوں کے لیے الگ الگ پانی لیا جائے، اسے فصل کہا جاتا ہے۔ بعض ائمۂ کرام کے نزدیک وصل جائز اور فصل افضل ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اس حدیث کے تحت امام شافعی کا موقف بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک فصل کرنا پسندیدہ عمل ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان سے یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ وصل افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے یہی عمل منقول ہے۔ اس روایت کے بعض طرق میں "من غرفة واحدة" کے الفاظ ہیں۔[2] ان الفاظ کی موجودگی میں اس توجیہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا کام ایک ہاتھ سے سرانجام دیا، برخلاف چہرے وغیرہ کے کہ ان میں دونوں ہاتھ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ توجیہ اس لیے بھی غلط ہے کہ ابوداود میں یہ الفاظ مروی ہیں کہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنا ایک ہی پانی سے ہوتا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا۔ انھوں نے یہ دونوں کام ایک ہی دفعہ پانی لے کر کیے۔[3] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح وضو کرنے کی صراحت ہے۔[4] واضح رہے کہ کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کے لیے الگ الگ پانی لینے کا ذکر ایک

---

1 سنن الترمذي، الطهارة، حديث:28. 2 صحيح البخاري، الطهارة، حديث:199. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:113.
4 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:137.

حدیث میں ہے جسے امام ابوداود نے بیان کیا ہے۔[1] لیکن اس روایت کو امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے، نیز حافظ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وضو کا طریقہ یہ تھا کہ آپ پانی کا ایک چلو لیتے آدھا پانی منہ میں اور باقی آدھا ناک میں ڈالتے۔[2] ② امام بخاری ؒ نے قبل ازیں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا تھا: [بَابُ: استعمالِ فَضلِ وَضُوءِ النَّاسِ] ''لوگوں کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو استعمال میں لانا۔'' بچے ہوئے پانی سے مراد برتن میں بچا ہوا پانی بھی ہوسکتا ہے اور دوران وضو میں اعضاء سے ٹپکنے والا پانی بھی ہوسکتا ہے۔ اس عنوان میں بھی امام بخاری ؒ نے اس مناسبت کو برقرار رکھا ہے۔ اس سے ناک میں پانی ڈالا جائے گا تو ظاہر ہے کہ کلی کرنے کے بعد جو پانی ہاتھ میں بچا ہے، اسی سے ناک میں پانی ڈالنے کا عمل سرانجام دیا جائے گا، گویا استعمال شدہ پانی دوبارہ کام میں لایا گیا ہے۔ اس انداز سے باب سابق کے ساتھ اس کا تعلق بھی ظاہر اور واضح ہے۔

(٤٢) بَابُ مَسْحِ الرَّأْسِ مَرَّةً

باب:42- سر کا مسح ایک بار کرنا

١٩٢ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيَى عَنْ أَبِيهِ قَالَ: شَهِدْتُ عَمْرَو بْنَ أَبِي حَسَنٍ سَأَلَ عَبْدَ اللهِ ابْنَ زَيْدٍ عَنْ وُضُوءِ النَّبِيِّ ﷺ فَدَعَا بِتَوْرٍ مِّنْ مَّاءٍ فَتَوَضَّأَ لَهُمْ، فَكَفَأَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثًا ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غَرَفَاتٍ مِّنْ مَّاءٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، فَأَقْبَلَ بِيَدِهِ وَأَدْبَرَ بِهَا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ. حَدَّثَنَا مُوسَى قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: مَسَحَ رَأْسَهُ مَرَّةً. [راجع: ١٨٥]

[192] حضرت عمرو بن ابی حسن سے روایت ہے، انھوں نے عبداللہ بن زید ؓ سے نبی ﷺ کے وضو کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے پانی کا ایک برتن منگوایا اور لوگوں کے سامنے وضو کیا۔ (پہلے) انھوں نے برتن کو جھکایا اور (پانی لے کر) دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور پانی کے تین چلوؤں سے تین مرتبہ کلی کی، ناک میں پانی ڈالا اور اسے صاف کیا۔ پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور پانی لے کر تین مرتبہ اپنا منہ دھویا، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دو بار دھویا، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور سر پر آگے اور پیچھے دونوں طرف سے مسح کیا، پھر برتن میں ہاتھ ڈالا اور اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔

یہی روایت موسیٰ نے وہیب سے بیان کی تو کہا کہ سر پر ایک بار مسح کیا۔

فائدہ: مسح رأس کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے انھیں تین، تین بار دھونے کی تصریح احادیث سے ثابت ہے لیکن جن اعضاء پر مسح کیا جاتا ہے ان میں بھی تثلیث برقرار رہنی چاہیے کیونکہ وضو ایک طہارت حکمیہ ہے، اس میں

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 139. ② زاد المعاد: 1/ 192.

اعضائے مغسولہ اور اعضائے ممسوحہ میں فرق روا نہیں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نص کے مقابلے میں قیاس کو نہیں مانتے۔ ان کا موقف ہے کہ مسح میں تکرار نہیں ہے۔ اگرچہ بظاہر مسح کے وقت اقبال وادبار سے تکرار معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تکرار مسحات نہیں بلکہ تکرار حرکات ہے۔ مسح ایک ہی مرتبہ ہے اگرچہ اس کی حرکات دو ہیں۔ بعض حضرات نے درج ذیل حدیث سے استدلال کیا ہے کہ مسح تین مرتبہ ہے۔ ''رسول اللہ ﷺ نے وضو تین تین بار کیا۔''[1] لیکن اس روایت میں اجمال ہے جس کی وضاحت دوسری روایات سے ہوتی ہے جن میں صراحت ہے کہ مسح رأس میں تکرار نہیں۔ اس بنا پر تین بار کے الفاظ کو اکثر ارکان وضو سے متعلق سمجھنا ہوگا یا دھوئے جانے والے اعضاء مراد ہیں۔ امام ابوداود وضو سے متعلقہ روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے وضو سے متعلقہ روایات عثمان جو بالکل صحیح ہیں، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ سر کا مسح ایک بار ہے۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جو ثابت ہے وہ ایک ہی بار مسح کرنا ہے، تاہم تین مرتبہ مسح کرنے والی روایت کو اگر کبھی کبھی پر محمول کر لیا جائے تو ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں رہتا کیونکہ سنداً وہ روایت بھی صحیح یا حسن ہے۔[3]

(٤٣) بَابُ وُضُوءِ الرَّجُلِ مَعَ امْرَأَتِهِ، وَفَضْلِ وَضُوءِ الْمَرْأَةِ

باب:43- مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ وضو کرنا اور عورت کے وضو سے باقی ماندہ پانی کو استعمال کرنا

وَتَوَضَّأَ عُمَرُ بِالْحَمِيمِ مِنْ بَيْتِ نَصْرَانِيَّةٍ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گرم پانی سے (اور) ایک نصرانی عورت کے گھر سے پانی لے کر وضو فرمایا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں دو عنوان قائم کیے ہیں: * اگر بیوی خاوند دونوں ایک ساتھ وضو کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ * عورت کے وضو سے بچا ہوا پانی مرد کے حق میں استعمال کے قابل ہے یا نہیں؟ اصل مقصد دوسرے عنوان کو ثابت کرنا ہے۔ پہلا عنوان صرف تمہید کے لیے ہے تاکہ دوسرے عنوان کو ثابت کرنے کے لیے راستہ ہموار ہو سکے اور اسے سمجھنے کے لیے آسانی پیدا ہو کیونکہ پہلے عنوان میں بیان شدہ مسئلے کے متعلق کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ اگر بیوی خاوند ایک ساتھ وضو کرتے ہیں تو تمام ائمہ کے نزدیک جائز اور مباح ہے، البتہ دوسرے عنوان میں زیر بحث مسئلے کے متعلق بعض فقہاء کو اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اگر عورت نے مرد کی عدم موجودگی میں وضو کیا ہے تو باقی ماندہ پانی مرد کے لیے ناقابل استعمال ہو جاتا ہے کیونکہ عام طور پر عورتیں طہارت و نظافت کے سلسلے میں غیر محتاط ہوتی ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے پیش نظر، ایسا ہونا بعید نہیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ آدمی، عورت کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے وضو نہ کرے۔[4] اس سلسلے میں جمہور فقہاء کا موقف یہ ہے کہ عورت کے وضو سے بچا ہوا پانی پاک ہے اور مرد کے حق میں مباح الاستعمال ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان جمہور کے ساتھ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے یا دو الگ الگ واقعات ہیں۔ بعض حضرات کہتے

---

1 صحيح مسلم، الطهارة، حديث:230. 2 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:108. 3 تمام المنّة، للألباني رحمه الله، ص:91.

4 سنن أبي ابوداود، الطهارة، حديث:82.

ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عیسائی عورت کے گھر سے گرم پانی لے کر وضو فرمایا، یعنی یہ ایک ہی واقعہ ہے لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ گرم پانی سے وضو کرنے کا واقعہ الگ ہے اور حج کے موقع پر ایک نصرانی عورت کے گھر سے پانی لے کر استعمال کرنا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا رجحان یہ ہے کہ یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا انھیں پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ گھروں میں عام طور پر عورتیں پانی گرم کرتی ہیں اور اسے گرم کرتے وقت اس میں انگلی ڈال کر دیکھتی بھی ہیں کہ پانی گرم ہوا ہے یا نہیں، اس لیے ابتداءً پانی کا تعلق عورتوں سے ہوتا ہے، پھر مردوں سے، نیز جس طرح آدمی کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح عورت کو بھی ہوسکتی ہے۔ ممکن ہے کہ عورت نے پانی گرم کر کے اس سے وضو کر لیا ہو اور پانی اس کا پس ماندہ ہو لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں فرمائی کہ اس گرم پانی کو تم نے پہلے استعمال تو نہیں کیا؟ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس مسئلے کے متعلق کوئی شک نہیں کہ عورت کا باقی ماندہ پانی استعمال ہوسکتا ہے۔ اتنی سی گنجائش سے امام بخاری نے مسئلے کا جواز ثابت کیا ہے۔ آپ نے اس قسم کے انداز کو بکثرت استعمال فرمایا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوران سفر میں ایک نصرانیہ کے گھر سے پانی لیا اور وضو فرما لیا، حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ عورت کسی مسلمان مرد کے عقد میں ہو اور اس نے مسلمان شوہر کی حق ادائیگی کے لیے غسل کیا ہو اور مذکورہ پانی، غسل سے باقی ماندہ ہو، اس لیے احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ صورت حال کو معلوم کر لیا جاتا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک عورت کے استعمال سے بچا ہوا پانی پاک اور قابل استعمال تھا، بصورت دیگر وہ اس کی ضرور تحقیق کر لیتے۔

١٩٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ، أَنَّهُ قَالَ: كَانَ الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَتَوَضَّؤُونَ فِي زَمَانِ رَسُولِ اللهِ ﷺ جَمِيعًا.

[193] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مرد، عورتیں مل کر وضو کیا کرتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں ہے کہ مرد، عورتیں اکٹھے وضو کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے لفظ [جميعًا] استعمال ہوا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں: "كلهم" اس کا مطلب یہ ہے کہ سب وضو کرتے تھے۔ اس میں وقت کی رعایت نہیں ہوگی، یعنی سب وضو کرتے تھے، خواہ وقت الگ الگ ہو۔ "معا" اس لفظ کے اعتبار سے وقت کی رعایت بھی ہوگی، یعنی ایک ہی وقت میں ایک ساتھ وضو کر لیتے تھے تو ممکن ہے کہ مرد، عورتوں کا مل کر وضو کرنا نزول حجاب سے پہلے کا واقعہ ہو یا اس سے وہ مرد عورتیں مراد ہوں جو ایک دوسرے کے محرم ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے میاں بیوی مراد ہوں۔ اس حدیث کا یہ بھی مطلب بیان کیا جاتا ہے کہ مرد ایک جگہ مل کر وضو کرتے اور عورتیں ان سے علیحدہ ایک جگہ مل کر وضو کرتیں۔[1] لیکن ایک روایت میں صراحت ہے کہ سب ایک ہی برتن سے وضو کرتے تھے۔[2] لہٰذا یہ آخری مفہوم صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے اس روایت سے بایں طور استدلال کیا ہے کہ جب عہد نبوی میں مرد عورتیں اکٹھے وضو کرتے تھے اور برتن بھی ایک ہوتا تھا، اسی

① فتح الباري: 392/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 79.

میں ہاتھ ڈال کر وضو کیا جاتا تھا، اس موقع پر یہ احتیاط نہیں ہو سکتی کہ مرد، عورتوں کے ہاتھ بیک وقت برتن میں پڑتے ہوں اور اکٹھے ہی برتن سے نکلتے ہوں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام ایک ہی وقت وضو سے فارغ ہوتے ہوں۔ اگر مرد پہلے فارغ ہو گیا تو بقیہ پانی عورت کے حق میں باقی ماندہ ہوا اور اگر عورت پہلے فارغ ہو گئی تو وہ پانی مرد کے لیے باقی بچ رہا۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کے لیے بقیہ پانی ناقابل استعمال یا ناجائز ہوتا تو عہد رسالت میں ہرگز اس کی اجازت نہ دی جاتی۔ جب اجتماعی طور پر کوئی خرابی لازم نہیں آتی تو انفرادی طور پر بھی نہیں آنی چاہیے۔ البتہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد کو عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کرنے سے منع کیا ہے۔[1] محدثین عظام نے اس کے کئی ایک جوابات دیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

* نہی کا تعلق اس پانی سے ہے جو اعضائے وضو سے گرے جسے ماءِ مستعمل کہا جاتا ہے اور اباحت کا تعلق اس پانی سے ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ رہے۔ * نہی تحریم کے لیے نہیں بلکہ کراہت تنزیہی ہے اور اس قسم کی کراہت اباحت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔ گویا عورت سے بچا ہوا پانی مرد کے لیے استعمال کرنا خلاف اولیٰ ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ عام طور پر عورتیں طہارت کے سلسلے میں بے احتیاط ہوتی ہیں، اس لیے مردوں کو حکم ہوا کہ وہ عورتوں کا استعمال شدہ پانی دوبارہ استعمال نہ کریں۔ اس میں عام طبقوں کی رعایت کی گئی ہے، لہٰذا اجتماعی اور انفرادی حالت کا فرق برقرار رکھا گیا ہے۔ اگر مرد، عورت اجتماعی طور پر وضو کریں تو کسی کو ناگواری نہیں ہوتی لیکن اگر عورت پانی بچا دے تو مرد کو اس کے استعمال کرنے میں گھن محسوس ہوتی ہے جیسا کہ ایک جگہ کھانا کھانے میں کسی کو تکلف نہیں ہوتا لیکن کسی کا بقیہ کھانا تناول کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ اس بنا پر نہ اجتماعی طور پر بیک وقت اکٹھے وضو کرنے سے منع کیا گیا ہے اور نہ عورت کو مرد کے بقیہ پانی کے استعمال ہی سے روکا گیا ہے، بلکہ صرف مرد کو عورت کے باقی چھوڑے ہوئے پانی کے استعمال سے روکا گیا ہے۔ اس میں عام طبیعتوں کے رجحان کو پیش نظر رکھا گیا ہے، شریعت وساوس کا سد باب کرنا چاہتی ہے تاکہ عبادت شرح صدر سے ہو۔ واللہ أعلم.

(٤٤) بَابُ صَبِّ النَّبِيِّ ﷺ وَضُوءَهُ عَلَى الْمُغْمَى عَلَيْهِ

باب:44- نبی ﷺ کا اپنے وضو سے باقی ماندہ پانی بے ہوش پر چھڑکنا

١٩٤ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ، قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرًا يَقُولُ: جَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَعُودُنِي وَأَنَا مَرِيضٌ لَا أَعْقِلُ، فَتَوَضَّأَ وَصَبَّ عَلَيَّ مِنْ وَضُوئِهِ فَعَقَلْتُ فَقُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! لِمَنِ الْمِيرَاثُ؟ إِنَّمَا يَرِثُنِي كَلَالَةٌ، فَنَزَلَتْ آيَةُ الْفَرَائِضِ. [انظر:

[194] حضرت جابر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے، میں ایسا سخت بیمار تھا کہ کوئی بات نہ سمجھ سکتا تھا۔ آپ نے وضو فرمایا اور وضو سے بچا ہوا پانی مجھ پر چھڑکا تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرا وارث کون ہوگا؟ میرا تو کوئی کلالہ ہی وارث بنے گا، تب

[1] سنن أبي داود، الطهارة، حديث:82.

٤٥٧٧، ٥٦٥١، ٥٦٦٤، ٥٦٧٦، ٦٧٢٣، آیت وراثت نازل ہوئی۔
٦٧٤٣، ٧٣٠٩]

فوائد و مسائل: ① ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو بے ہوشی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔[1] رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور دونوں قبیلۂ بنوسلمہ کے ہاں ان کی تیمارداری کے لیے پیدل گئے تھے۔[2] علامہ کرمانی نے اغماء اور غشی کو ایک معنی میں لکھا ہے۔[3] لیکن ان دونوں میں بایں طور فرق ہے کہ غشی ایک مرض کا نام ہے جو اعصابی تھکاوٹ کی وجہ سے ہوتی ہے، اور یہ اغماء سے کم درجہ ہوتی ہے۔ اغماء میں عقل مغلوب ہو جاتی ہے جبکہ دیوانگی یا جنون میں عقل مسلوب ہو جاتی ہے، نیند کے وقت عقل مسلوب نہیں ہوتی بلکہ مستور ہوتی ہے۔ اس عنوان سے امام بخاری رحمہ اللہ کی غرض سابق باب کی تائید ہے کہ ماءِ مستعمل پاک ہے۔ اگر پاک نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر کیوں چھڑکتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد وہ پانی بھی ہو سکتا ہے جو وضو کرتے وقت استعمال ہوا جسے ماءِ متقاطر کہتے ہیں اور وہ پانی بھی مراد ہو سکتا ہے جو وضو کرنے کے بعد برتن میں بچ گیا تھا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ماءِ متقاطر مراد ہے کیونکہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے وضو کا پانی مجھ پر ڈالا۔[4] ابوداود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا، پھر اس پانی کو مجھ پر چھڑکا۔[5] ② عام طور پر کلالہ کا اطلاق اس میت پر ہوتا ہے جس کے اصول و فروع میں سے کوئی نہ ہو، یعنی اس کی اولاد بھی نہ ہو اور نہ باپ دادا ہی میں سے کوئی زندہ ہو۔ مجازی طور پر میت کے وارث جو بے سہارا ہوں انھیں بھی کلالہ کہا جاتا ہے۔ اس روایت میں کلالہ دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری وارث میری ہمشیرگان ہیں جو بے سہارا ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ترکے کو بھی کلالہ کہا جاتا ہے۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل احکام معلوم ہوئے:

* رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے بیماری وغیرہ دور ہو جاتی تھی۔ * بزرگوں کے دم وغیرہ سے بھی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ * بیماروں کی تیمارداری کرنا بہت بڑی فضیلت کا عمل ہے۔ * بڑوں کو چاہیے کہ وہ چھوٹوں کی تیمارداری کریں، ایسا کرنا مسنون ہے۔ ③ آیت میراث سے مراد ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ سے لے کر ﴿وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾ تک ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الفرائض کے آغاز میں بیان کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ﴾ ''اگر کوئی موروث مرد یا عورت کلالہ ہو اور اس کی ایک (اخیافی) بہن یا بھائی ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا چھٹا حصہ ہے۔'' کلالہ کے متعلق یہ وضاحت حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر نازل ہوئی تھی۔ اگرچہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حالت کے پیش نظر سورۂ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی تھی لیکن راجح بات امام بخاری کی بیان کردہ ہے۔[6]

---

① صحيح البخاري، المرض، حديث:5651. ② صحيح البخاري، التفسير، حديث:4577. ③ شرح الكرماني:41/2.
④ صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، حديث:7309. ⑤ سنن أبي داود، الفرائض، حديث:2886. ⑥ صحيح البخاري، التفسير، حديث:4577.

(٤٥) بَابُ الْغُسْلِ وَالْوُضُوءِ فِي الْمِخْضَبِ، وَالْقَدَحِ، وَالْخَشَبِ، وَالْحِجَارَةِ

باب:45- ٹب، لگن اور لکڑی یا پتھر کے برتن میں وضو یا غسل کرنا

وضاحت: اس عنوان کا مقصد یہ ہے کہ وضو اور غسل کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ پانی پاک ہو۔ اس کے لیے قطعاً یہ شرط نہیں کہ پانی کس قسم کے برتن میں ہے اور وہ برتن کس دھات سے بنا ہوا ہے۔ اگر برتن پاک ہے تو اس کا کوئی بھی نام ہو اور کسی بھی دھات سے بنا ہوا ہو، اس سے وضو اور غسل کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس عنوان میں مخضب اور قدح بطور تخصیص نہیں بلکہ نوع کی تعیم کے لیے بطور مثال ہیں جیسا کہ خشب اور حجارۃ کے الفاظ کو مادہ کی تعیم کے لیے بطور مثال بیان کیا گیا ہے، یعنی برتن کا نام ٹب، لگن، لوٹا وغیرہ، پھر وہ لکڑی، پیتل، پتھر یا کسی اور معدنی دھات کا ہو اگر وہ پاک ہے اور تفاخر مقصود نہیں تو اس میں پاک پانی سے طہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس عنوان کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اسلاف، عبادات کے سلسلے میں تواضع اور عجز و انکسار کا بہت خیال رکھتے تھے، اس لیے وضو اور غسل کے لیے ایسے برتنوں کا انتخاب کرتے جن میں تواضع کا اظہار ہوتا ہو۔ اس کے لیے وہ دو چیزوں کا خیال رکھتے: * برتن چھوٹا ہو * مٹی یا پتھر کا بنا ہوا ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ تواضع پر عمل کرنا، باعث فضیلت ضرور ہے لیکن جواز کا معاملہ اس سے زیادہ وسیع ہے، لہٰذا وضو یا غسل کے لیے ہر طرح کا اور ہر قسم کا برتن استعمال ہو سکتا ہے، نیز برتن سے وضو کرنے کی دو صورتیں ہیں: * اس میں ہاتھ ڈال کر پانی لیا جائے اور اس سے وضو کیا جائے۔ * اس برتن کو جھکا کر پانی حاصل کیا جائے اور وضو کیا جائے۔ امام بخاری نے اس باب میں پہلی صورت کو بیان کیا ہے اور آئندہ باب میں دوسری صورت کو بیان کریں گے۔

١٩٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُنِيرٍ، سَمِعَ عَبْدَ اللهِ ابْنَ بَكْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَقَامَ مَنْ كَانَ قَرِيبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وَبَقِيَ قَوْمٌ فَأُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِمِخْضَبٍ مِّنْ حِجَارَةٍ فِيهِ مَاءٌ، فَصَغُرَ الْمِخْضَبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ قُلْنَا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِينَ وَزِيَادَةً. [راجع: ١٦٩]

[195] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دفعہ نماز کا وقت ہو گیا تو جس شخص کا گھر قریب تھا وہ تو اپنے گھر (وضو کرنے کے لیے) چلا گیا جبکہ کچھ لوگ باقی رہ گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک پتھر کا برتن لایا گیا جس میں کچھ پانی تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ آپ اس میں اپنی ہتھیلی نہ پھیلا سکے لیکن (اس کے باوجود) سب لوگوں نے اس سے وضو کر لیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ تم اس وقت کتنے لوگ تھے؟ انھوں نے فرمایا: اَسّی (80) سے کچھ زیادہ تھے۔

فوائد و مسائل: ① عہد رسالت میں مساجد میں وضو کرنے کا دستور نہیں تھا اور نہ مساجد میں پانی وغیرہ کا انتظام ہی ہوتا تھا، اس لیے جن لوگوں کے مکان قریب تھے وہ تو وضو کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے، اَسّی (80) سے کچھ زیادہ آدمی باقی رہ گئے، انھوں نے نماز کے لیے وضو کرنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس پتھر کا مخضب (لگن یا ٹب) لایا گیا جس میں تھوڑا سا پانی

تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک اس میں ڈال دیا۔ پانی میں اس قدر برکت ہوئی کہ انگشت ہائے مبارک سے پانی کے چشمے پھوٹنے لگے۔ اس روایت میں مخضب سے نوع اور مِنْ حِجَارَةٍ سے مادہ کا مسئلہ ثابت ہوا۔ مخضب اگرچہ بڑے برتن کو کہا جاتا ہے لیکن چھوٹے برتن پر بھی اہل زبان مخضب کا لفظ بول دیتے ہیں جیسا کہ اس روایت میں ہے۔[1] ② حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو آپ کے علاوہ اور کسی نبی سے صادر نہیں ہوا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے گوشت اور رگ پٹھوں سے پانی کے چشمے پھوٹنے لگے اور آپ کی انگشت ہائے مبارک سے پانی کا نکلنا بہ نسبت پتھر سے پانی نکلنے کے زیادہ حیران کن ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصائے مبارک کو پتھر پر مارنے سے جاری ہوا تھا کیونکہ پتھر سے پانی نکلنا سب کو معلوم ہے لیکن لحم ودم سے پانی کا پھوٹنا بہت عجیب اور نئی بات ہے۔ اگرچہ احتمال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک کے پانی میں ہونے کی وجہ سے پانی میں خود ہی برکت اور اضافہ ہوا ہو اور دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوا کہ پانی انگلیوں سے نکل رہا ہے مگر پہلی صورت معجزے کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے جبکہ آثار واحادیث میں اس کے خلاف کوئی چیز بھی مروی نہیں۔[2] ③ دور حاضر کے معتزلہ اور خوارج نے حسب عادت اس معجزۂ نبوی سے انکار حدیث کا راستہ ہموار کیا ہے۔ اگرچہ کھلے الفاظ میں اس کا اظہار تو نہیں کیا البتہ احادیث بخاری میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی ہے، چنانچہ تدبر حدیث کی آڑ میں اصلاحی صاحب علیہ ما علیہ لکھتے ہیں: ''برکت کا میں قائل ہوں۔ انبیاء سے اس طرح کے معجزے ظاہر ہوتے (رہے) ہیں۔ تردد جو ہوتا ہے وہ اس بات میں ہے کہ واقعہ ایک اعجوبہ ہے، معجزہ کی حیثیت سے اس کا ذکر بھی کیا جاتا ہے، دیکھنے والوں کی خاص تعداد ہے لیکن بیان کرنے والے صرف حضرت انس ہیں، کوئی اور صاحب اس کو بیان نہیں کرتے اس کی کیا وجہ ہے؟''[3] دراصل ان حضرات کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ کسی کتاب میں کوئی اعتراض اور اس کا جواب دیکھتے ہیں تو اعتراض کو اچھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس مقام کو لیجیے کہ شارح بخاری ابن بطال نے اپنے انداز میں یہ لکھا کہ اس واقعہ کو ایک جم غفیر نے دیکھا لیکن روایت کرنے والے صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس کا بھرپور جواب دیا جس کی وضاحت ہم حدیث:169 میں کر آئے ہیں۔ لیکن ان حضرات کا دجل اور فریب ملاحظہ کریں کہ اعتراض نقل کر کے جواب گول کر دیا۔ اسی طرح رسالہ تدبر کی کسی اشاعت میں حدیث افک پر ان حضرات کی طرف سے بڑے ''وزنی'' اعتراضات شائع ہوئے۔ راقم الحروف نے جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حافظ ابن حجر ؒ نے ان اعتراضات کو نقل کر کے ایک ایک کا جواب دیا ہے لیکن ان حضرات کو تو احادیث بخاری میں تشکیک پیدا کرنا مقصود ہے، خواہ جھوٹ اور فریب ہی سے کام لینا پڑے۔ حدیث افک پر ان کے اعتراضات اور ان کے جوابات کتاب المغازی ''حدیث افک'' کی شرح میں بیان کیے جائیں گے۔ ④ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ معجزۂ نبوی دراصل دو واقعات سے متعلق ہے کیونکہ پانی سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اور جائے وقوعہ کی تعیین مختلف فیہ ہے، اس لیے ان مختلف روایات کو جمع کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جب حسن بصری بیان کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کسی سفر سے متعلق ہے۔ بعض روایات میں اس کی صراحت ہے۔[4] اور جب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قتادہ بیان کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

---

① فتح الباري:1/394. ② فتح الباري:6/715. ③ تدبر حدیث:1/294. ④ صحيح البخاري، المناقب، حديث:3574.

یہ معجزہ مدینہ منورہ میں ظاہر ہوا تھا اور وضو کرنے والوں کی تعداد تین صد کے لگ بھگ تھی۔[1]

١٩٦ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِي مُوسٰى أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَعَا بِقَدَحٍ فِيهِ مَاءٌ فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَوَجْهَهُ فِيهِ، وَمَجَّ فِيهِ. [راجع: ١٨٨]

[196] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے ایک بڑا پیالہ منگوایا جس میں پانی تھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ منہ دھوئے اور اس میں کلی فرمائی۔

فائدہ: اس روایت میں "قدح" کا ذکر ہے جو لکڑی کے بنے ہوئے پیالے کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس میں دست مبارک اور چہرے کو دھویا اور کلی کی۔ اگرچہ اس حدیث میں وضو کا ذکر نہیں، تاہم ہاتھ منہ دھونا اور کلی کرنا وضو کے اعمال ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ نے مکمل وضو کیا ہو لیکن راوی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ اس روایت سے قدح میں وضو کرنا ثابت کرتے ہیں، اس لیے نوعیت اور مادہ دونوں چیزوں پر اس روایت سے استدلال ہوگیا۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے اس سے متعلقہ فوائد حدیث:188 میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

١٩٧ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ يَحْيٰى عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ: أَتٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِّنْ صُفْرٍ، فَتَوَضَّأَ فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، وَيَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، فَأَقْبَلَ بِهِ وَأَدْبَرَ، وَغَسَلَ رِجْلَيْهِ. [راجع: ١٨٥]

[197] حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ہم نے آپ کے لیے ایک طشت میں پانی پیش کیا جو پیتل کا بنا ہوا تھا۔ آپ نے وضو فرمایا، یعنی تین بار منہ دھویا، دو، دو بار اپنے ہاتھ دھوئے۔ پھر اپنے سر کا اس طرح مسح کیا کہ آگے سے پیچھے اور پیچھے سے آگے لائے۔ آخر میں آپ نے اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ اس روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جس طشت میں آپ کو وضو کے لیے پانی پیش کیا گیا وہ پیتل کا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ وضو کے متعلق برتن کی کوئی پابندی نہیں کہ کس نوعیت کا ہے اور کس قسم کی دھات سے بنا ہوا ہے۔ صرف پانی کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ حضرت ابن عمر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم سے اس قسم کے برتنوں میں وضو کرنے کی کراہت مروی ہے۔ ② حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پتھر، لکڑی کے برتنوں اور چمڑے کے مشکیزے سے وضو نہیں کرتے تھے، لیکن ہمارے لیے اسوۂ حسنہ تو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ آپ سے اس قسم کی پابندی مروی نہیں۔ ممکن ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس لیے ناپسند کرتے ہوں کہ سونے چاندی کی طرح یہ بھی معدنیات سے ہے، البتہ حافظ ابن بطال نے لکھا ہے کہ میں نے ایک روایت بھی دیکھی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس قسم کے برتنوں میں وضو کر لیتے تھے۔[2] ③ سونے

[1] فتح الباري: 714/6. [2] شرح ابن بطال: 299/1.

چاندی کے برتنوں میں رسول اللہ ﷺ نے کھانے پینے سے منع فرمایا ہے، اس لیے ہمارے اسلاف اس قسم کی قیمتی دھاتوں کے برتنوں میں وضو کو ناپسند کرتے تھے۔ ویسے بھی وضو کے لیے قیمتی برتنوں کے استعمال میں تفاخر کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔[1]

١٩٨ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُتْبَةَ، أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا ثَقُلَ النَّبِيُّ ﷺ وَاشْتَدَّ بِهِ وَجَعُهُ اسْتَأْذَنَ أَزْوَاجَهُ فِي أَنْ يُمَرَّضَ فِي بَيْتِي فَأَذِنَّ لَهُ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ بَيْنَ رَجُلَيْنِ تَخُطُّ رِجْلَاهُ فِي الْأَرْضِ، بَيْنَ عَبَّاسٍ وَرَجُلٍ آخَرَ، قَالَ عُبَيْدُ اللهِ: فَأَخْبَرْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: أَتَدْرِي مَنِ الرَّجُلُ الْآخَرُ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَ: هُوَ عَلِيٌّ، وَكَانَتْ عَائِشَةُ تُحَدِّثُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ بَعْدَ مَا دَخَلَ بَيْتَهُ وَاشْتَدَّ وَجَعُهُ: «هَرِيقُوا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَمْ تُحْلَلْ أَوْكِيَتُهُنَّ، لَعَلِّي أَعْهَدُ إِلَى النَّاسِ»، وَأُجْلِسَ فِي مِخْضَبٍ لِحَفْصَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ طَفِقْنَا نَصُبُّ عَلَيْهِ مِنْ تِلْكَ الْقِرَبِ حَتَّى طَفِقَ يُشِيرُ إِلَيْنَا أَنْ قَدْ فَعَلْتُنَّ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى النَّاسِ.

[انظر: ٦٦٤، ٦٦٥، ٦٧٩، ٦٨٢، ٦٨٣، ٦٨٧، ٧١٢، ٧١٣، ٧١٦، ٢٥٨٨، ٣٠٩٩، ٣٣٨٤، ٤٤٤٢، ٤٤٤٥، ٥٧١٤، ٧٣٠٣]

[198] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب نبی ﷺ بیمار ہوئے اور آپ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ نے دیگر ازواج مطہرات سے تیمارداری کے لیے میرے گھر میں قیام کی اجازت چاہی، چنانچہ سب نے بخوشی اجازت دے دی۔ پھر نبی ﷺ (حضرت عائشہ کے گھر جانے کے لیے) دو آدمیوں کے سہارے اپنے پاؤں گھسیٹتے ہوئے نکلے۔ وہ دو آدمی حضرت عباس ؓ اور ایک دوسرے شخص تھے۔ راوئ حدیث عبیداللہ کہتے ہیں: جب میں نے حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کو یہ حدیث سنائی تو انھوں نے کہا: تم جانتے ہو کہ وہ دوسرے شخص کون تھے؟ میں نے کہا: نہیں! تو انھوں نے فرمایا: وہ حضرت علی ؓ تھے۔ حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے گھر داخل ہونے کے بعد، جب بیماری شدت اختیار کر گئی، تو فرمایا: ''میرے اوپر سات مشک پانی ڈالو جن کے بندنہ کھولے گئے ہوں۔ شاید میں (تندرست ہو کر) لوگوں کو وصیت کر سکوں۔'' پھر آپ کو ایک بڑے ٹب میں بٹھا دیا گیا جو آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت حفصہ ؓ کا تھا۔ پھر ہم آپ کے جسم مبارک پر ان مشکوں کا پانی ڈالنے لگیں یہاں تک کہ آپ ہمیں اشارہ کرنے لگے کہ بس تم اپنا کام کر چکیں۔ پھر آپ لوگوں کے پاس باہر تشریف لے گئے۔

فوائد و مسائل: ① مخضب (ٹب یا لگن) ایک کھلے برتن کو کہتے ہیں جس میں کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے ہیں۔ امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ اس قسم کے کھلے برتنوں میں بیٹھ کر غسل کرنے میں کوئی قباحت نہیں اگرچہ اس میں استعمال شدہ

① عمدة القاري:2/556.

پانی کے قطرے گرتے رہتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک وضو اور غسل کے لیے پانی کا پاک ہونا ضروری ہے۔ برتنوں کے متعلق کوئی پابندی نہیں، تمام برتن قابل استعمال ہیں۔ ② رسول اللہ ﷺ کو سہارا دے کر لانے کے متعدد واقعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سہارا دینے والوں کے مختلف نام احادیث میں ذکر ہوئے ہیں، مثلاً: ام ایمن، بریرہ، نوبہ (حبشی غلام)، فضل بن عباس، اسامہ، علی بن ابی طالب اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم لیکن ان میں حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما پیش پیش تھے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ کی خواہش کے پیش نظر حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سہارے آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر لایا گیا۔[1] اس وقت ام ایمن، حضرت اسامہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کو سہارا دینے کی خدمات سرانجام دیں۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر آنے کے بعد بیماری میں کچھ افاقہ ہوا تو نماز ظہر کی ادائیگی کے لیے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے سہارے مسجد میں تشریف لے گئے اور نماز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بائیں جانب بیٹھ کر ادا کی۔[2] بعض روایات میں ہے کہ حضرت بریرہ اور نوبہ (حبشی غلام) کے سہارے برآمد ہوئے۔ غالباً انھوں نے گھر سے مسجد تک آپ کو سہارا دیا۔ پھر مسجد سے جائے نماز تک حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے سہارا دینے کی خدمات سرانجام دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعۂ افک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو تأثرات تھے، اس کی وجہ سے صدیقۂ کائنات عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل میں بشری تقاضے کے مطابق شکر رنجی ضرور تھی۔ اس کا اظہار اس صورت میں ہوا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیا جیسا کہ روایت میں وضاحت ہے۔ اس کے متعلق جو تاویلات کی جاتی ہیں، ان پر دل مطمئن نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔[3] ③ دوران مرض میں رسول اللہ ﷺ کے غسل کرنے کے بھی متعدد واقعات ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے آئے تو عشاء کے وقت آپ نے دریافت فرمایا کہ آیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ عرض کیا گیا کہ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر حسب ارشاد ٹب میں پانی بھرا گیا، آپ نے غسل فرمایا۔ جب مسجد میں جانے لگے تو آپ بے ہوش ہو گئے، تین دفعہ ایسا ہوا۔ پھر آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھائیں۔[4] پھر آپ نے ہفتہ یا اتوار کو سات مشکیں پانی کی لانے کے متعلق فرمایا جیسا کہ حدیث الباب (198) میں ہے۔ آپ نے غسل فرمایا، پھر نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے اور نماز ادا کی اور لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمائی جیسا کہ دیگر احادیث میں اس کی وضاحت ہے۔[5] انھی دنوں جمعرات کے دن واقعۂ قرطاس پیش آیا۔[6] اس کی وضاحت ہم حدیث نمبر 114 کے تحت کر آئے ہیں۔ ④ احادیث بخاری کے متعلق تشکیک پیدا کرنے کے لیے اصلاحی صاحب نے اس موقع پر بھی زہر اگلا ہے۔ امام زہری کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں: ''میرے نزدیک حدیث قرطاس زہری کا پھیلایا ہوا فتنہ ہے۔ یہ روایت (198) بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں پورا زہر موجود ہے۔ حدیث قرطاس میں زہری کا ہدف حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہاں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے خلاف زہر اگلا گیا ہے۔ اس روایت میں مشکوں کا پانی مریض پر بہانے کا ٹونا جو بیان ہوا ہے یہ بھی زہری کی حاشیہ آرائی ہے۔ یہ واقعہ ہے

1 صحيح البخاري، الأذان، حديث:665. 2 صحيح البخاري، الأذان، حديث:687. 3 فتح الباري:203/2. 4 صحيح البخاري، الأذان، حديث:687. 5 صحيح البخاري، المغازي، حديث:4442. 6 صحيح البخاري، المغازي، حديث:4431.

کہ عوامی خرافات کو دین بنا کر پیش کرنے میں بھی زہری کا بڑا حصہ ہے۔''[1] امام زہری حضرت امام مالک کے استاد اور امام بخاری کے نزدیک انتہائی قابل اعتماد شخصیت ہیں۔ محدثین عظام نے ان کے متعلق بہت اچھے تأثرات کا اظہار کیا ہے۔ علمی بنیادوں پر کسی شخصیت سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن بھونڈے انداز سے کسی پر کیچڑ اچھالنا بھلے مانس لوگوں کا کام نہیں۔ حضرت اصلاحی تو اللہ کے پاس اپنے کیے ہوئے کا پھل پا رہے ہوں گے، ہمارا ان کے متبعین سے سوال ہے کہ اسلاف کے متعلق اظہار خیالات کا یہی انداز ہونا چاہیے جو اصلاحی صاحب نے اختیار کیا ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام زہری کے متعلق پورے چار صفحات پر مشتمل ان کی ثقاہت کو بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں: امام زہری بڑے بڑے ائمہ کرام میں سے ایک اور شام اور حجاز کے عالم حدیث ہیں۔ آپ نے پندرہ سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حدیث روایت کیا ہے۔ حضرت لیث کہتے ہیں: میں نے امام زہری سے زیادہ علم حدیث رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام زہری کی صحبت اختیار کرو کیونکہ سنت کا علم ان سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔[2] لیکن اصلاحی صاحب نے ان سے مروی احادیث کو عوامی خرافات کا نام دیا ہے۔ مزید لکھا ہے: ''زہری کے متعلق بدگمانی ان کے زمانے میں بھی پائی جاتی تھی۔ آخر لوگ اتنے نابالغ تو نہ تھے کہ وہ کسی کی شرارت پر متنبہ نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک جیسے بڑے آدمی کو بھی کئی روایات میں زہری کا نام حذف کر کے یہ کہنا پڑا کہ یہ روایت اس شخص کی ہے جس پر مجھے اعتماد ہے۔''[3] امام مالک جیسے بڑے شخص کو تو اپنے شیخ پر پورا پورا اعتماد تھا لیکن آپ حضرات ان پر بداعتمادی کا اظہار کر کے احادیث کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔

احادیث کے متعلق جو خطرناک راستہ اصلاحی صاحب نے اختیار کیا ہے وہ یقیناً ان کی باقیات سیئات میں اضافے کا باعث ہوگا۔ اصلاحی صاحب کو سات مشکیزے پانی لانے اور انھیں رسول اللہ ﷺ پر بہانے کے متعلق اعتراض ہے جسے انھوں نے عوامی خرافات کا نام دیا ہے، حالانکہ انھیں علم ہے کہ شریعت میں سات کی تعداد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، مثلاً: ❁ آسمانوں کی تعداد سات ہے۔ ❁ ہفتہ کے دن بھی سات ہیں۔ ❁ اعضائے سجدہ بھی سات ہیں۔ ❁ ایک طواف بیت اللہ کے گرد سات چکر لگانے سے پورا ہوتا ہے۔ ❁ رمئ جمرات کے لیے بھی سات کنکریاں استعمال ہوتی ہیں۔ ❁ سعی کے لیے بھی صفا اور مروہ کے درمیان سات دفعہ آنا جانا پڑتا ہے۔ ❁ صبح صبح سات عجوہ کھجوریں کھانے سے انسان جادو اور زہر سے محفوظ رہتا ہے۔[4] حضرت اصلاحی نے صحیح بخاری کی احادیث کو عوامی خرافات کا نام دیا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کے متعلق نفرت پیدا ہو، خاص طور پر امام زہری پر بداعتمادی کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے: ''اس کی مثالیں مؤطا میں ''العین حق'' والی روایت اور سانپ نکالنے کی روایت میں موجود ہیں۔''[5] جن روایات کی طرف اصلاحی صاحب نے اشارہ کیا ہے اور انھیں عوامی خرافات سے تعبیر کیا ہے، ان میں پہلی روایت مسند احمد، سنن نسائی اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو عامر بن ربیعہ کی نظر لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو ہاتھ، چہرہ، کہنیاں اور پاؤں کے اطراف، نیز داخلۃ الازار، یعنی تہ بند کے اندر کا بدن، ایک پیالے میں دھونے کا حکم دیا اور اسے سہل بن حنیف کے بدن پر بہا دیا گیا، اس طرح نظر بد کے اثرات ختم ہوگئے۔ مؤطا امام مالک

---

(1) تدبر حدیث: 297/1. (2) تهذيب التهذيب: 397/1. (3) تدبر حدیث: 297/1. (4) صحيح البخاري، الطب، حديث: 5769.

(5) تدبر حدیث: 297/1.

(المؤطا لإمام مالك:2/ 116،طبع مؤسسة الرسالة) میں اس کی سند یوں ہے:[قال مالك: عن محمدبن أبي أمامة ابن سهل] اس میں زہری کا نام نہیں۔ اسی طرح دوسری روایت (جو صحیح مسلم اور موطا وغیرہ میں ہے) جس میں ایک نوجوان کا ذکر ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر اپنے گھر آیا اور گھر میں سانپ دیکھ کر اسے نیزہ مارا، اس کی بیوی کا بیان ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلا کہ پہلے میرا خاوند فوت ہوا یا سانپ پہلے مرا؟ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب گھر میں سانپ نظر آئے تو اسے تین مرتبہ گھر سے نکل جانے کا حکم دو۔ اگر چلا جائے تو ٹھیک، بصورت دیگر اسے قتل کردو۔''[1]
مؤطا امام مالک میں جو روایت ہے اس کی سند میں بھی زہری کا نام نہیں۔ لیکن جو انسان کسی کی مخالفت میں اندھا بہرہ ہو جاتا ہے، اسے ہر جگہ مخالف ہی نظر آتا ہے۔ اصلاحی صاحب نے امام زہری رحمہ اللہ کی عوامی خرافات کے سلسلے میں ان دو روایات کا حوالہ دیا ہے لیکن ان میں دور، دور تک زہری کا نشان تک نہیں ملتا۔ دراصل ان کے نزدیک کسی حدیث کے صحیح وضعیف ہونے کا مدار ان کی عقل پر ہے۔ اگر ان کی عقل فیصلہ کر دے تو صحیح بصورت دیگر وہ ناقابل اعتبار ہے، خواہ بیان کرنے والے کتنے بڑے امام اور ثقات ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی وجہ سے ہم نے انھیں دور حاضر کے معتزلہ اور خوارج کا نام دیا ہے کیونکہ ان کے ہاں بھی حدیث جانچنے کا یہی معیار تھا۔

نوٹ: رسول اللہ ﷺ بیماری کی شدت کے بعد پانچ دن تک مسجد میں تشریف نہیں لے گئے، صرف نماز ظہر پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ حضرت ام فضل رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مغرب کی نماز بھی آپ نے مسجد میں ادا کی ہے لیکن سنن نسائی میں وضاحت ہے کہ آپ نے یہ نماز گھر میں ادا کی تھی اور اس میں سورۂ مرسلات کی تلاوت فرمائی تھی۔[2]
شدت بیماری کے پہلے دن نماز عشاء کے وقت مسجد میں جانے کے لیے غسل فرمایا لیکن بے ہوشی کی وجہ سے نہ جا سکے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا۔ جمعرات کے دن واقعۂ قرطاس پیش آیا۔ اس کے بعد ہفتہ یا اتوار نماز ظہر مسجد میں ادا کی۔ پیر کے دن پردہ اٹھا کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز باجماعت ادا کرتے ہوئے دیکھا تو خوش ہوئے اور مسکرائے، پھر پردہ ڈال دیا اور ظہر سے پہلے پہلے جان، جان آفرین کے حوالے کر دی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. جمعے کے سلسلے میں تلاش بسیار کے باوجود کوئی روایت نہیں مل سکی کہ شدت بیماری کے دوران میں جمعہ کس نے پڑھایا؟ اگر کوئی صاحب علم اس کے متعلق آگاہ ہو تو ہمیں مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہو۔

(٤٦) بَابُ الْوُضُوءِ مِنَ التَّوْرِ

باب:46-طشت سے وضو کرنا

١٩٩ - حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ يَحْيٰى عَنْ أَبِيهِ

[199] عمرو بن یحییٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے چچا (عمرو بن ابی الحسن) وضو کرتے وقت بہت زیادہ

[1] صحیح مسلم، السّلام، حدیث:5839(2236)، والمؤطا لإمام مالك:2/156,155، طبع مؤسسة الرسالة. [2] سنن النسائي، الصلاة، حديث: 986.

قَالَ: كَانَ عَمِّي يُكْثِرُ مِنَ الْوُضُوءِ، قَالَ لِعَبْدِ اللهِ ابْنِ زَيْدٍ: أَخْبِرْنِي كَيْفَ رَأَيْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَتَوَضَّأُ؟ فَدَعَا بِتَوْرٍ مِّنْ مَّاءٍ، فَكَفَأَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فِي التَّوْرِ فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّنْ غَرْفَةٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهُ فَاغْتَرَفَ بِهَا فَغَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ، ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِهِ مَاءً فَمَسَحَ بِهِ رَأْسَهُ فَأَدْبَرَ بِهِ وَأَقْبَلَ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ، فَقَالَ: هٰكَذَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَوَضَّأُ.

[راجع: ١٨٥]

پانی بہاتے تھے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ آپ مجھے نبی ﷺ کے وضو سے آگاہ فرمائیں، چنانچہ انھوں نے پانی کا ایک طشت منگوایا اور اس سے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی انڈیلا۔ پھر انھیں تین مرتبہ دھویا۔ پھر اس طشت میں ہاتھ ڈال کر ایک ہی چلو پانی سے تین بار کلی کی اور ناک میں پانی ڈال کر اسے صاف کیا۔ پھر انھوں نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈالا، دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر تین مرتبہ اپنے چہرے کو دھویا، پھر اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دو، دو بار دھوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ہاتھ میں پانی لیا اور اس سے اپنے سر کا مسح کیا۔ مسح کے وقت ہاتھوں کو پیچھے لے گئے، پھر آگے لائے۔ پھر اپنے دونوں پاؤں دھوئے اور فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس سے پہلے باب میں بتایا گیا تھا کہ برتن میں ہاتھ ڈال کر وضو اور غسل کیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں برتن سے وضو کرنے کا دوسرا طریقہ بتایا گیا ہے کہ کسی برتن سے ہاتھ میں پانی لے کر وضو کیا جا سکتا ہے، اس صورت میں تکرار لازم نہیں آتی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تور، طشت سے چھوٹا ہوتا ہے کیونکہ حدیث معراج میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سونے کے طشت میں سونے کا تور رکھ کر پیش کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طشت اور تور دونوں الگ الگ برتن ہیں اور تور طشت سے چھوٹا ہوتا ہے۔[1] لیکن علامہ عینی نے مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مقام پر تور، ابریق کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی لوٹا یا جگ وغیرہ جیسا کہ بڑے لوگوں کے سامنے پانی، جگ وغیرہ میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے۔[2] ② ایک روایت میں ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ہم نے پیتل کے تور میں پانی پیش کیا۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ وضو کے لیے برتن کے متعلق کوئی پابندی نہیں، خواہ کسی نوعیت کا ہو یا کسی بھی مادے سے تیار کیا گیا ہو اور وضو کے لیے پانی لینے کی بھی کوئی پابندی نہیں، اس میں ہاتھ ڈال کر بھی پانی لیا جا سکتا ہے اور اسے جھکا کر بھی اس سے پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

٢٠٠ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ دَعَا بِإِنَاءٍ مِّنْ مَّاءٍ، فَأُتِيَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ فِيهِ شَيْءٌ مِّنْ مَّاءٍ

[200] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک برتن میں پانی منگوایا تو ایک کم گہرائی والا پیالہ لایا گیا جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔ آپ نے اپنی انگشت ہائے

1 فتح الباري: 397/1. 2 عمدة القاري: 561/2. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 100.

فَوَضَعَ أَصَابِعَهُ فِيهِ، قَالَ أَنَسٌ: فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَى الْمَاءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، قَالَ أَنَسٌ: فَحَزَرْتُ مَنْ تَوَضَّأَ مِنْهُ مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى الثَّمَانِينَ. [راجع: ١٦٩]

مبارک کو اس میں رکھ دیا۔ حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں: میں نے آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹتے دیکھے۔ حضرت انس ؓ مزید فرماتے ہیں: میں نے ان لوگوں کا اندازہ لگایا جنھوں نے اس پانی سے وضو کیا تھا تو ان کی تعداد ستر اسی کے درمیان تھی۔

فائدہ: یہ حدیث متعدد مرتبہ پہلے گزر چکی ہے۔ امام بخاری ؒ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وضو کے لیے برتن کی نوعیت یا مادے کی کوئی شرط نہیں ہے، صرف برتن اور پانی کا پاک ہونا ضروری ہے، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اظہار تفاخر مقصود نہ ہو۔

(٤٧) بَابُ الْوُضُوءِ بِالْمُدِّ

باب: 47- ایک مُد سے وضو کرنا

٢٠١ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مِسْعَرٌ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ جَبْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا يَقُولُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَغْسِلُ أَوْ كَانَ يَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَى خَمْسَةِ أَمْدَادٍ وَّيَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ.

[201] حضرت انس ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب غسل فرماتے تو ایک صاع سے پانچ مد تک پانی استعمال کرتے اور ایک مُد پانی سے وضو کر لیتے۔

فائدہ: امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ پانی پیالے میں ہو یا طشت میں یا کسی بھی برتن میں، لیکن اس کی مقدار کتنی ہونی چاہیے جو وضو کے لیے کافی ہو، آپ نے اس روایت سے ثابت کیا ہے کہ وضو کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ ایک مُد پانی سے وضو فرما لیتے تھے، یعنی اکثر طور پر وضو کے لیے پانی کی اتنی مقدار کفایت کر جاتی ہے۔ اسراف سے اجتناب کرتے ہوئے اس سے کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایک مُد سے بھی کم پانی سے وضو کرنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت ام عمارہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک برتن لایا گیا جس میں دو تہائی مد کے برابر پانی تھا۔ آپ نے اس سے وضو فرمایا۔[1] واضح رہے کہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق صاع کا وزن 2 کلو 100 گرام ہے۔ اجناس کے اعتبار سے اس وزن میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ صاع کے متعلق جدید اعشاری نظام کے مطابق اس کا ٹھیک ٹھیک وزن ہم صدقۃ الفطر کے ابواب میں بیان کریں گے۔ وضو اور غسل کے لیے اشخاص و حالات کے پیش نظر پانی کی مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بہرصورت اس میں اسراف کرنا اور بلا ضرورت پانی بہانا درست نہیں، چنانچہ امام بخاری ؒ نے شروع کتاب میں لکھا ہے کہ اہل علم نے وضو میں اسراف کو ناپسند فرمایا ہے اور اس امر کو بھی مکروہ قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فعل سے تجاوز کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے وضو اور غسل کے متعلق جو مقداریں مروی ہیں، وہ سب تقریبی ہیں، تحدیدی نہیں، البتہ اصلاحی صاحب کا یہ کہنا سراسر

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:94.

غلط ہے کہ مد دوکلو کے لگ بھگ ہے۔[1] کیونکہ ایک مد میں 1.33 رطل ہوتے ہیں، ایک رطل نوے مثقال کا ہوتا ہے۔ گویا ایک مد میں ایک سوبیس مثقال ہوئے، ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے، اس طرح ایک مد کے 540 ماشے ہوتے ہیں، چونکہ ایک تولہ میں بارہ ماشے ہوتے ہیں، لہٰذا بارہ پر تقسیم کرنے سے 45 تولے وزن بنتا ہے، جو ایک چھٹانک پانچ تولے ہوتے ہیں، اس لیے اس کا وزن 9 چھٹانک بنتا ہے۔ جدید اعشاری نظام کے مطابق 525 گرام وزن بنتا ہے۔ اصلاحی صاحب کی حساب دانی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ مد کسی صورت میں دوکلو کے لگ بھگ نہیں بنتا۔

(٤٨) بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ

باب:48- موزوں پر مسح کرنا

وضاحت: امام بخاری ؒ نے موزوں پر مسح کرنے کی اہمیت کے پیش نظر مستقل عنوان قائم کیا ہے۔ اہل ضلال و بدعت اور خوارج کے علاوہ کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔ روافض نے بھی اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ امام حسن بصری سے مروی ہے کہ مجھے کم از کم ستر صحابۂ کرام ؓ کے متعلق علم ہے کہ وہ مسح علی الخُفین کو جائز سمجھتے تھے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے ابن منذر کے حوالے سے لکھا ہے کہ پاؤں دھونے کی نسبت موزوں پر مسح کرنا افضل ہے کیونکہ خوارج و روافض مسح کو ناجائز کہتے ہیں اور اس میں طعن کرتے ہیں اور جس سنت کو اہل بدعت بُرا خیال کریں اس کا احیا افضل ہے، البتہ شیخ محی الدین نے کہا ہے کہ مسح کے بجائے پاؤں دھونا افضل ہیں بشرطیکہ ترک، مسح سنت سے بے رغبتی اور جواز، مسح میں شک کے باعث نہ ہو۔ بعض حفاظ حدیث سے مروی ہے کہ مسح علی الخُفین متواتر سنت ہے۔ اس کو بیان کرنے والوں کی تعداد اَسّی (80) سے متجاوز ہے۔ عشرۂ مبشرہ بھی اس سنت کو بیان کرتے ہیں۔[2]

٢٠٢ - حَدَّثَنَا أَصْبَغُ بْنُ الْفَرَجِ عَنِ ابْنِ وَهْبٍ قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرٌو، قَالَ: حَدَّثَنِي أَبُو النَّضْرِ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ، وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ سَأَلَ عُمَرَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ: نَعَمْ، إِذَا حَدَّثَكَ شَيْئًا سَعْدٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُ غَيْرَهُ. وَقَالَ مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ: أَخْبَرَنِي أَبُو النَّضْرِ أَنَّ أَبَا سَلَمَةَ أَخْبَرَهُ أَنَّ سَعْدًا حَدَّثَهُ فَقَالَ عُمَرُ لِعَبْدِ اللهِ نَحْوَهُ.

[202] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے، وہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے موزوں پر مسح کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے جب حضرت عمر ؓ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے بھی اثبات میں جواب دیا (اور) فرمایا: جب سعد ؓ تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو کسی دوسرے سے اس کے متعلق مت پوچھا کرو۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ انھیں ابوالنضر نے بواسطہ ابوسلمہ خبر دی کہ حضرت سعد ؓ نے یہ حدیث بیان کی اور حضرت عمر ؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے ایسا ہی کہا۔

[1] تدبر حديث:1/299. [2] فتح الباري:1/399.

فوائد و مسائل: ① روایت بخاری میں اختصار ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل بایں الفاظ لکھی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کوفے کے گورنر تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کوفہ گئے اور انھوں نے حضرت سعد کو موزوں پر مسح کرتے دیکھا تو انھیں یہ بات کھٹکی۔ انھوں نے اعتراض کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں یہ عمل اس لیے کرتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسح کرتے دیکھا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس پر اطمینان نہ ہوا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مزید تسلی کے لیے اپنے والد گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھ لینا۔ پھر کسی مجلس میں یہ تینوں حضرات جمع ہوئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یاد دلایا کہ وہ مسئلہ دریافت کرلو، چنانچہ یہ مسئلہ پوچھا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سعد بالکل درست کہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر نے فرمایا کہ سعد جب تم سے کوئی حدیث بیان کریں تو اس پر اعتماد رکھو، کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کرو۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے اور موزوں پر مسح کرتے تھے، ایسا کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ ابن عمر نے کہا: اگرچہ انسان قضائے حاجت سے فارغ ہو کر آئے تب بھی مسح کرلے؟ فرمایا: ہاں۔[2] ② حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما قدیم الاسلام ہیں، اس کے باوجود انھیں مسح علی الخفین کے متعلق اشکال تھا۔ محدثین نے اس کی دو وجوہات لکھی ہیں: * حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کو دوران سفر میں مسح کرتے دیکھا تھا جیسا کہ کتب حدیث میں یہ روایت موجود ہے،[3] اس لیے ممکن ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما موزوں پر مسح کرنے کو سفر کے ساتھ خاص سمجھتے ہوں۔ اس بنا پر جب انھوں نے حضر و اقامت میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مسح کرتے دیکھا تو اعتراض کر دیا۔ * ممکن ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما چند ایک دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح یہ سمجھتے ہوں کہ سورۂ مائدہ کی آیتِ وضو کے نازل ہونے کے بعد موزوں پر مسح کرنا منسوخ ہوگیا ہو جیسا کہ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے عمل مسح پر اشکال پیش آیا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تو سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد مسلمان ہوا ہوں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جب حقیقت حال کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے موقف سے رجوع کرلیا، چنانچہ شعبی فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مسح کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: تم موزوں پر مسح کرو۔[4] ③ حدیث کے آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے متابعت کے انداز میں ایک تعلیق بھی ذکر کی ہے جسے اسماعیلی نے اپنی مستخرج میں باسند بیان کیا ہے۔ اس تعلیق میں یکے بعد دیگرے تین تابعی ہیں: ① موسیٰ بن عقبہ ② ابوالنضر، ③ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن۔ واضح رہے کہ یہ تعلیق روایت بالمعنی کے طور پر ہے جیسا کہ امام بخاری نے ''نحوہ'' کے لفظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[5]

٢٠٣ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ الْحَرَّانِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ نَافِعِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْمُغِيرَةِ، عَنْ أَبِيهِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رَضِيَ اللهُ

[203] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ قضائے حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ بھی پانی کا برتن لے کر ساتھ ہو گئے۔ جب آپ حاجت سے فارغ

1 فتح الباري:400/1. 2 صحيح ابن خزيمة:93/1. 3 مصنف ابن أبي شيبة:206/1. 4 مصنف ابن أبي شيبة:207/1.
5 فتح الباري:400/1.

عَنْهُ عَنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ، أَنَّهُ خَرَجَ لِحَاجَتِهِ، فَاتَّبَعَهُ الْمُغِيرَةُ بِإِدَاوَةٍ فِيهَا مَاءٌ، فَصَبَّ عَلَيْهِ حِينَ فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهِ، فَتَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ. [راجع: ١٨٢]

ہوئے تو انھوں (مغیرہ رضی اللہ عنہ) نے آپ پر پانی ڈالا اور آپ نے وضو کیا۔ پھر آپ نے اپنے موزوں پر مسح کیا۔

فائدہ: اس حدیث سے ان حضرات کے موقف کی بھی تردید ہوتی ہے جو نزول سورۂ مائدہ کو بنیاد بنا کر موزوں پر مسح کرنے کے نسخ کا دعویٰ کرتے ہیں کیونکہ سورۂ مائدہ کا نزول غزوۂ مریسیع کے وقت ہوا اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ جنگ تبوک کے موقع پر پیش آیا۔ غزوۂ تبوک، غزوۂ مریسیع کے بعد پیش آیا، اس لیے موزوں پر مسح کرنا منسوخ نہیں۔[1] اس کی مزید وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے پیشاب کیا، اس کے بعد وضو کیا تو موزوں پر مسح بھی فرمایا۔ بعض حضرات نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ عمل کرتے دیکھا ہے۔ اعتراض کرنے والوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل سورۂ مائدہ کے نزول سے پہلے تھا۔ اس کے جواب میں حضرت جریر نے فرمایا: میں تو سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد مسلمان ہوا ہوں، یعنی میں اس آیتِ وضو کے بعد اسلام لایا ہوں جس کے متعلق تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس کے بعد موزوں پر مسح کرنے کی اجازت نہیں رہی۔[2] ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب آپ نے موزوں پر مسح فرمایا تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ بھول گئے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''بھول نہیں گیا بلکہ مجھے میرے رب نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔''[3]

٢٠٤ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ الضَّمْرِيِّ أَنَّ أَبَاهُ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى الْخُفَّيْنِ. وَتَابَعَهُ حَرْبُ [بْنُ شَدَّادٍ] وَأَبَانُ عَنْ يَحْيٰى. [انظر: ٢٠٥]

[204] حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے نبیٔ اکرم ﷺ کو موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کرنے میں حضرت حرب بن شداد اور ابان بن یزید العطار نے حضرت شیبان بن عبدالرحمٰن کی متابعت کی ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ موزوں پر مسح کرنے کے اثبات کے لیے متعدد احادیث لائے ہیں، لیکن توقیت مسح، یعنی اس کی مدت کے متعلق کوئی حدیث نہیں لائے، حالانکہ جمہور علماء اس کے قائل ہیں۔ صرف امام مالک کے متعلق ایک قول نقل ہوا ہے کہ انسان جب تک موزے نہ اتارے مسح کرتا رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اس جیسا قول نقل ہوا ہے۔ توقیت مسح کے متعلق حضرت علی اور حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث درج ذیل ہیں: * حضرت شریح بن ہانی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے موزوں پر مسح کرنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ، وہ مجھ سے زیادہ اس کے

① فتح الباري: 402/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 154. ③ سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 156.

متعلق معلومات رکھتے ہیں کیونکہ وہ سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لیے مسح کی مدت تین دن اور تین رات اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات مقرر فرمائی ہے۔[1] بعض مخصوص حالات یا جنگی ضرورت کے پیش نظر سات روز تک مسح کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔[2] * حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ جب ہم وضو کی حالت میں موزے پہن لیں تو تین دن سفر میں اور ایک دن اقامت میں ان پر مسح کر سکتے ہیں۔[3] ان کے علاوہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے متعلق ایک حدیث مروی ہے جس کی تصحیح امام شافعی وغیرہ نے کی ہے۔[4] ② یہ بھی واضح رہے کہ موزوں پر مسح کرنے کا جواز وضو کے ساتھ خاص ہے، غسل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی حالت جنابت اور ضرورت غسل میں موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں جیسا کہ حضرت صفوان بن عسال مرادی سے مروی حدیث میں اس کی صراحت ہے اور امام ابن خزیمہ نے اس پر ایک مستقل عنوان بھی قائم کیا ہے: ''موزوں پر مسح کی رخصت اس حدث میں ہے جو وضو کا باعث ہو۔ اور جو حدث غسل کا باعث ہو اس میں مسح کرنے کی رخصت نہیں۔'' حضرت زر بن حبیش کہتے ہیں کہ میں حضرت صفوان بن عسال مرادی کے پاس آیا اور ان سے موزوں پر مسح کرنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہم سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ہوتے تھے، آپ نے ہمیں حکم دیا کہ تین دن اپنے موزے نہ اتاریں لیکن جنابت میں ایسی اجازت نہ تھی، البتہ بول و براز اور نیند کے وقت یہ رخصت برقرار رہتی۔[5] ③ متابعت میں ذکر کردہ حرب بن شداد کی روایت سنن نسائی (حدیث:119) میں اور ابان بن یزید العطار کی روایت مسند احمد (179/4) میں موصولاً بیان ہوئی ہے۔[6]

٢٠٥ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا الْأَوْزَاعِيُّ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ عَمْرٍو، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَمْسَحُ عَلٰى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ. وَتَابَعَهُ مَعْمَرٌ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ عَمْرٍو، قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ. [راجع: ٢٠٤]

[205] حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو اپنی پگڑی اور دونوں موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ معمر نے یحییٰ بن ابی کثیر سے بواسطہ ابوسلمہ عن عمرو، امام اوزاعی کی متابعت کی ہے، انھوں (عمرو) نے کہا: میں نے نبیٔ اکرم ﷺ کو (ایسا کرتے) دیکھا ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو پگڑی پر مسح کرنے کے اضافے کے پیش نظر بیان کیا ہے۔ موزوں پر مسح کے لیے شرط یہ ہے کہ انھیں پہلے وضو کی حالت میں پہنا گیا ہو لیکن پگڑی پر مسح کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔ جمہور کے نزدیک تنہا پگڑی کا مسح درست نہیں بلکہ اگر سر کے کچھ حصے پر مسح کر لیا کچھ تکمیل کے طور پر پگڑی پر کیا تو اسے درست قرار دیا جائے گا بصورت دیگر نہیں، لیکن جمہور کا یہ موقف محل نظر ہے کیونکہ رسول اکرم ﷺ سے مطلق پگڑی پر مسح کرنا بھی ثابت ہے جیسا کہ حدیث باب میں ہے۔ پھر عمرو بن امیہ کے علاوہ سیدنا مغیرہ بن شعبہ، سیدنا بلال اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا

1 صحيح مسلم، الطهارة، حديث:639 (267). 2 سنن ابن ماجه، الطهارة، حديث:558. 3 صحيح ابن خزيمة:99/1. 4 فتح الباري:405/1. 5 صحيح ابن خزيمة:99,98/1. 6 فتح الباري:402/1.

ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے: (ذخيرة العقبٰى شرح سنن النسائي: 400/2) اس لیے راجح بات یہی ہے کہ صرف سر کا مسح، سر کے بعض حصے اور پگڑی پر مسح اور صرف پگڑی پر مسح، تینوں صورتیں جائز ہیں۔بعض حضرات نے پگڑی پر مسح کے لیے کچھ شرائط ذکر کی ہیں: (ا) پگڑی کمال طہارت کے بعد باندھی گئی ہو جیسا کہ موزوں میں ہے۔ (ب) پگڑی پورے سر کے لیے ساتر ہو۔ (ج) اسے عرب کے طریقے پر باندھا گیا ہو، یعنی ڈاڑھی کے نیچے سے لا کر اس کو باندھ دیا گیا ہو، جو نہ اٹھانے سے اٹھے اور نہ کھولنے سے کھلے، یعنی ایسی صورت ہو جیسے پاؤں پر موزے چڑھائے جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عمامے (پگڑی) پر مطلقاً اور مستقلاً مسح درست ہے، اس کے لیے جو شرائط ذکر کی گئی ہیں ان کا کتاب وسنت میں کوئی ذکر نہیں۔ اس روایت پر یہ اعتراض کہ حضرت اوزاعی کے علاوہ اس اضافے کو کوئی دوسرا راوی بیان نہیں کرتا، لہٰذا یہ اضافہ شاذ ہے۔ اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ امام اوزاعی ثقہ راوی ہیں اور ثقہ راوی کا اضافہ قبول ہوتا ہے۔ (2) امام بخاری رحمہ اللہ نے جرابوں پر مسح کے متعلق کوئی روایت ذکر نہیں کی۔ واضح رہے کہ دین اسلام کی بنیاد سہولت اور رفع حرج پر رکھی گئی ہے۔ اس کے احکام میں اس قدر آسانی ہے کہ مزید سہولت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جرابوں پر مسح کی سہولت بھی اسی قبیل سے ہے، چنانچہ متعدد احادیث میں جرابوں پر مسح کرنے کی رخصت منقول ہے۔ صحابۂ کرام، تابعین عظام، ائمۂ دین اور محدثین کا بھی یہی موقف ہے کہ جرابوں پر مسح کیا جا سکتا ہے حوالے کے طور پر چند احادیث حسب ذیل ہیں: * حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔[1] * حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ وضو فرمایا تو جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔[2] * حضرت ازرق بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا، وہ بے وضو ہوئے تو انھوں نے وضو کرتے ہوئے ہاتھ اور منہ کو دھویا پھر اون کی جرابوں پر مسح کیا۔ میں نے عرض کیا کہ ان پر مسح کرنا جائز ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! یہ بھی موزے ہیں لیکن یہ اون کے ہیں۔[3] حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی اور عربی الاصل ہیں۔ وہ خف کے معنی بیان کرتے ہیں کہ وہ صرف چمڑے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر اس چیز کو شامل ہے جو قدم کو چھپا لے۔ آپ کی یہ وضاحت معنی کے لحاظ سے نہایت دقیق ہے کیونکہ ان کے نزدیک لفظ جوربین لغوی وضعی معنی کے لحاظ سے خفین کے مدلول میں داخل ہے اور خفین پر مسح میں کوئی اختلاف نہیں، لہٰذا جرابوں پر مسح میں بھی کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے۔[4] فقہائے کرام نے جرابوں پر مسح کرنے کے متعلق بھاری بھرکم شرائط عائد کر رکھی ہیں جن کا کتاب وسنت میں کوئی ثبوت نہیں، مثلاً: وہ اتنی موٹی ہوں کہ ان میں پانی جذب نہ ہوتا ہو، وہ پھٹی ہوئی نہ ہوں وغیرہ۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک جراب کا نام اور کام باقی ہے اس پر مسح کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے صحیح وسالم ہونے کی شرط لگانے کا کوئی ثبوت نہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب تک موزے پاؤں میں رہیں، ان پر مسح کرتے رہو۔ مہاجرین وانصار کے موزے پھٹے پرانے اور پیوند لگے ہوتے تھے۔[5] اسی طرح جرابیں جب تک گرد وغبار سے بچاؤ اور سردی سے تحفظ کا کام دیتی ہیں ان پر مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں، خواہ وہ موٹی ہوں یا باریک، خواہ وہ پھٹی پرانی ہی کیوں نہ ہوں۔

---

(1) مسند أحمد: 275/5. (2) مسند أحمد: 252/4. (3) الكنٰى والأسماء للدولابي: 181/1. (4) محلى ابن حزم: 85/2. (5) محلى ابن حزم: 102/2.

نوٹ: موزے یا جرابوں پر مسح کرنے کا آغاز پہننے کے بعد نہیں بلکہ وضو ٹوٹنے کے بعد پہلے مسح سے ہوگا۔

(٤٩) بَابٌ: إِذَا أَدْخَلَ رِجْلَيْهِ وَهُمَا طَاهِرَتَانِ

باب:49-موزوں کو باوضو پہننے کا بیان

٢٠٦ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الْمُغِيرَةِ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ، فَأَهْوَيْتُ لِأَنْزِعَ خُفَّيْهِ فَقَالَ: «دَعْهُمَا، فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ» فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. [راجع: ١٨٢]

[206] حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں ایک سفر میں نبی ﷺ کے ہمراہ تھا۔ (آپ وضو کر رہے تھے) میں جھکا تاکہ آپ کے دونوں موزے اتاروں تو آپ نے فرمایا: ''انھیں رہنے دو، میں نے انھیں باوضو پہنا تھا۔'' پھر آپ نے ان پر مسح فرمایا۔

فوائد و مسائل: ① امام حمیدی نے اپنی مسند میں بایں الفاظ اس حدیث کو روایت کیا ہے: حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم موزوں پر مسح کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، بشرطیکہ انھیں وضو کی حالت میں پہنا جائے۔''[1] اسی طرح امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ حضرت صفوان بن عسال المرادی نے کہا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیا جبکہ انھیں باوضو ہو کر پہنا گیا ہو۔ ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ مسح اس وقت جائز ہوگا جب ان موزوں کو وضو کے بعد پہنا جائے۔[2] ② مذکورہ حدیث کے مطابق موزوں پر مسح کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاک پاؤں میں پہنے گئے ہوں، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس پاکی اور طہارت کا معیار کیا ہے؟ ظاہریہ کے نزدیک پاؤں کا ظاہری نجاست سے پاک ہونا ضروری ہے، حکمی نجاست (حدث) سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پاؤں پر کوئی نجاست وغیرہ لگی ہوئی نہیں اور ان پر موزوں کو چڑھا لیا جائے تو ان پر مسح کیا جا سکتا ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک مسح کے لیے ضروری ہے کہ موزہ پہنتے وقت پاؤں ظاہری نجاست سے اور حدث سے پاک ہوں۔ پھر جمہور میں اختلاف ہے کہ موزے پہننے کے وقت طہارتِ کاملہ کی ضرورت ہے یا حدث کے وقت؟ شوافع کے نزدیک مسح کے لیے ضروری ہے کہ موزے پہنتے وقت طہارت کاملہ ہو، لیکن احناف حدث کے وقت طہارت کاملہ کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کی وضاحت بایں طور ہے کہ اگر کوئی شخص صرف پاؤں دھو کر موزے پہن لیتا ہے اور پھر باقی وضو مکمل کرتا ہے تو ترتیب کے ساقط ہونے کی وجہ سے شوافع کے نزدیک اس شخص کا وضو صحیح نہیں اور نہ ان موزوں پر مسح ہی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن احناف کے نزدیک وضو میں ترتیب ضروری نہیں، اس لیے ان کے نزدیک ایسے شخص کا وضو بھی مکمل ہے اور ان موزوں پر مسح کی بھی اجازت ہے۔ لیکن احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسح کے لیے ضروری ہے کہ مکمل وضو کر کے موزے پہنے جائیں جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔ حضرت ابوبکرہ ؓ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے مسافر کو تین دن تین رات اور مقیم کو ایک دن ایک رات

1 مسند الحميدي:2/335. 2 صحيح ابن خزيمة:1/96.

موزوں پر مسح کرنے کی اجازت دی، بشرطیکہ وضو کرے، پھر انھیں پہنے۔[1] ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فائدہ" کا عنوان دے کر موزوں پر مسح کرنے کی ایک جزئی کے متعلق لکھا ہے کہ اگر مسح کے بعد اور مدت مسح پورا ہونے سے پہلے موزے اتار دیے جائیں تو اس کے متعلق تین موقف ہیں: * جو توقیت کے قائل ہیں ان میں سے امام احمد اور اسحاق وغیرہ کہتے ہیں کہ اس کا وضو ختم ہو چکا ہے وہ دوبارہ وضو کرے۔ * کوفہ کے اہل علم امام مزنی، ابوثور، امام مالک اور لیث کہتے ہیں: (بشرطیکہ زیادہ وقت نہ گزرا ہو) صرف پاؤں دھو لیے جائیں، دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ * حسن بصری اور ابن ابی لیلیٰ کی رائے ہے کہ اس پر پاؤں کا دھونا بھی ضروری نہیں۔ انھوں نے اس کو سر کے مسح پر قیاس کیا ہے کہ اگر کوئی شخص سر پر مسح کرنے کے بعد سر کے بال منڈوا دے تو اس پر دوبارہ سر کا مسح کرنا ضروری نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قیاس محل نظر ہے۔[2] یہ قیاس مع الفارق اس لیے ہے کہ مسح کے لیے سر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، خواہ سر پر بال ہوں یا نہ ہوں جبکہ موزوں پر مسح کرنا پاؤں دھونے کا بدل ہے اصل نہیں، اس لیے مذکورہ جزئی کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لیے جب موزے اتارے جائیں گے تو وضو باطل ہو جائے گا، صرف پاؤں دھونا اس کے لیے کافی نہیں ہوگا کیونکہ ایسا کرنے سے موالاۃ، یعنی یکے بعد دیگرے دھونے کی شرط فوت ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم. لیکن حافظ ابن حزم اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ وغیرہ کا یہ موقف ہے کہ اگر کسی شخص نے موزوں پر مسح کرنے کے بعد انھیں اتار دیا تو اس کا وضو صحیح رہے گا اسے پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔[3] ④ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ موزے اور پگڑی پر مسح کرنے والا اگر ان کو اتار دے یا مدت مسح ختم ہو جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا اور نہ اس پر دوبارہ سر کا مسح یا پاؤں کا دھونا ہی واجب ہے۔[4] ان حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک عمل پیش کیا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ وضو کیا تو اپنے جوتوں پر مسح کیا پھر مسجد میں داخل ہوئے اور جوتوں کو اتار کر نماز ادا کی۔[5] راقم الحروف کے نزدیک احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے شخص کو دوبارہ وضو کر لینا چاہیے۔ واللہ أعلم.

(٥٠) بَابُ مَنْ لَمْ يَتَوَضَّأْ مِنْ لَحْمِ الشَّاةِ وَالسَّوِيقِ

باب:50- بکری کا گوشت اور ستو کھانے کے بعد وضو نہ کرنے کا بیان

وَأَكَلَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ، فَلَمْ يَتَوَضَّؤُوا.

حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے (گوشت) تناول فرمایا لیکن اس کے بعد وضو نہیں کیا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ کا بیان کردہ یہ معلق اثر مصنف ابن ابی شیبہ (88/1) اور دیگر کئی کتابوں میں موصولاً مروی ہے۔

٢٠٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ،

[207] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے شانے کا گوشت تناول فرمایا، پھر نماز

① صحيح ابن خزيمة:96/1. ② فتح الباري:405/1. ③ محلى ابن حزم:105/2. ④ الاختيارات، رقم:15. ⑤ السنن الكبرىٰ للبيهقي:288/1.

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ .[انظر : ٥٤٠٤، ٥٤٠٥]

پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

فوائد ومسائل: ① قاضی اسماعیل نے وضاحت کی ہے کہ گوشت کھانے کا یہ واقعہ حضرت ضباعہ بنت زبیر ؓ کے گھر پیش آیا جو رسول اللہ ﷺ کی چچا زاد ہمشیرہ ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے حضرت میمونہ ؓ کے گھر گوشت تناول فرمایا ہو جس کا ذکر آئندہ حدیث (210) میں آرہا ہے۔[1] امام نسائی کی بیان کردہ روایت کے مطابق آپ کو نماز کی اطلاع دینے والے حضرت بلال ؓ تھے۔[2] ② حافظ ابن حجر ؒ نے امام بخاری کے مقصود کی بایں الفاظ وضاحت کی ہے کہ بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں۔ جب گوشت کے استعمال سے وضو ضروری نہیں تو اس سے کم درجے کی چیزیں جن میں چکناہٹ نہیں ہوتی (جیسے ستو وغیرہ) ان کے کھانے سے بدرجۂ اولیٰ وضو نہیں ہوگا۔ بکری کے گوشت کا ذکر اس لیے کیا کہ شاید آپ اس سے اونٹ کے گوشت کا استثنا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس میں چکناہٹ اور ایک قسم کی ناگواری بو زیادہ ہوتی ہے، غالباً اسی بنا پر اس میں کچے اور پختہ کی تمیز نہیں، یعنی مطبوخ اور غیر مطبوخ دونوں برابر ہیں۔ امام احمد نے اونٹ کا گوشت استعمال کرنے کے بعد وضو کو ضروری قرار دیا ہے اور محدثین میں سے امام ابن خزیمہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[3] امام بخاری ؒ کا لحم الشاۃ کا تذکرہ کرنے کا یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ آپ جگہ جگہ عنوانات میں ایسی قید لگا دیتے ہیں جس کا اصل موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن حدیث میں اس کا ذکر ہوتا ہے، اس لیے قضیۂ حدیث کی رعایت کرتے ہوئے بسا اوقات وہ ایسا کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ③ ابتدائے اسلام میں آگ کے ذریعے سے تیار کی گئی چیزوں کے استعمال کے بعد وضو کرنے کا حکم تھا جیسا کہ حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوہریرہ اور صدیقۂ کائنات ؓ سے مروی احادیث سے پتہ چلتا ہے۔ ان احادیث کا ذکر متعدد کتب حدیث میں ہے۔[4] حضرت جابر ؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری حکم یہ تھا کہ آگ سے تیار شدہ چیز کے استعمال کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں۔[5] عام محدثین حدیث جابر کے پیش نظر آگ سے تیار شدہ چیز کے استعمال کے بعد وضو کے حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں لیکن امام ابوداود نے حدیث جابر سے نسخ کی متعارف صورت کو مرجوح قرار دیا ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے ایک حکم وجوب وضو کا دیا ہو اور پھر دوسرا حکم ترک وضو کا ارشاد فرمایا ہو بلکہ ان کے نزدیک دو واقعات ایک ہی دن میں پیش آئے اور نماز ظہر اور نماز عصر میں دو طرح کا عمل مروی ہوا ہے۔ انھوں نے خاص طور پر پہلے مفصل حدیث ذکر فرمائی اور اس کے بعد مجمل حدیث کا تذکرہ کیا پھر فرمایا کہ یہ آخری حدیث پہلی روایت کا اختصار ہے۔ مفصل حدیث جابر اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو روٹی اور گوشت پیش کیا گیا، فراغت کے بعد آپ نے وضو کیا اور نماز ظہر ادا کی، پھر آپ نے بقیہ کھانا طلب کیا، اسے تناول کرنے کے بعد آپ نے نماز عصر ادا کی اور وضو نہ فرمایا۔[6] ابن حزم نے امام ابوداود کے موقف کو ''قول بالظن'' قرار دیا ہے اور پھر ''ظن اکذب الحدیث'' کہا ہے۔ چونکہ اکابر محدثین اس مسئلے کے متعلق متعارف

1 فتح الباري:406/1. 2 سنن النسائي، الطهارة، حديث:182. 3 فتح الباري:405/1. 4 صحيح مسلم، الحيض، حديث: 787,788,789(352). 5 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:192. 6 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:191.

نسخ اور عدم نسخ کی بابت دو مستقل رائے رکھتے ہیں، نسخ کی طرف امام ترمذی کا رجحان ہے تو دوسری طرف امام ابوداود ہیں، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کر کے اپنے نزدیک راجح مسلک کی نشاندہی کر دی، پھر محدثانہ اصول کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے عمل سے بھی استدلال کیا ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ اگر کسی سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے مختلف روایات منقول ہوں تو صحابۂ کرام کے عمل سے ترجیح دی جاتی ہے اور اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس کے متعلق مختلف ہوں تو خلفائے راشدین کے عمل کو دیکھا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا کہ امام بخاری نے عنوان کے بعد خلفائے ثلاثہ کا عمل پیش کیا ہے، اس میں یہی حکمت پنہاں ہے۔[1]

٢٠٨ - حَدَّثَنِي يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ: أَخْبَرَنِي جَعْفَرُ بْنُ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ، أَنَّ أَبَاهُ عَمْرًا أَخْبَرَهُ، أَنَّهُ رَأَى رَسُولَ اللهِ ﷺ يَحْتَزُّ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ، فَدُعِيَ إِلَى الصَّلَاةِ، فَأَلْقَى السِّكِّينَ فَصَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. [انظر: ٦٧٥، ٢٩٢٣، ٥٤٠٨، ٥٤٢٢، ٥٤٦٢]

[208] حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بکری کے شانے سے گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ آپ کو نماز کے لیے بلایا گیا تو آپ نے چھری رکھ دی، نماز پڑھی اور نیا وضو نہیں کیا۔

فوائد و مسائل: ① عنوان میں دو چیزیں ہیں: بکری کا گوشت اور ستو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں لیکن کسی ایک میں بھی ستو کا ذکر نہیں۔ دراصل نصوص سے مسائل کا استنباط کئی ایک طریقوں سے ہوتا ہے: ایک طریقہ یہ ہے کہ حدیث کے الفاظ میں اس مسئلے کا واضح طور پر ذکر ہو۔ اسے عبارۃ النص کہا جاتا ہے۔ بکری کے گوشت کے استعمال کے بعد وضو نہ کرنا عبارۃ النص سے ثابت کیا ہے۔ بعض دفعہ الفاظ سے براہ راست نہیں بلکہ ان کی رہنمائی میں مسئلے کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اسے دلالۃ النص کہا جاتا ہے۔ ستو استعمال کرنے کے بعد وضو نہ کرنا دلالۃ النص سے ثابت ہے۔ وہ اس طرح کہ گوشت میں چکناہٹ ہوتی ہے، جب آپ نے چکناہٹ والی چیز استعمال کرنے کے بعد وضو نہیں کیا تو ستو جن میں چکناہٹ نہیں ہوتی ان کے استعمال کے بعد بدرجۂ اولیٰ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھری سے کاٹ کاٹ کر گوشت کھانا جائز ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: [بابُ قَطْعِ اللَّحْمِ بِالسِّكِّينِ] ''گوشت کا چھری سے کاٹنا۔''[2] لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھری سے گوشت کھانے سے منع فرمایا کیونکہ عجمی لوگ ایسا کرتے ہیں۔[3] اس کی تطبیق یہ ہے کہ منع کی یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ امام ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ضرورت کے پیش نظر چھری وغیرہ کا استعمال درست ہے لیکن بلاوجہ چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانا یہ اعاجم اور عیش پسند لوگوں کے ساتھ تشبیہ ہے جسے شریعت نے پسند نہیں کیا۔[4] چھری کی ضرورت اس وقت پڑتی

① فتح الباري: 407/1. ② صحيح البخاري، الأطعمة، باب: 20. ③ سنن أبي داود، الأطعمة، حديث: 3778. ④ فتح الباري: 407/1.

ہے جب گوشت اچھی طرح پکا ہوا نہ ہو، یعنی سخت ہو یا اس کے ٹکڑے بڑے بڑے ہوں، تو ایسے حالات میں گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھایا جاسکتا ہے، البتہ ہمیشہ کے لیے عادت بنا لینا عجمیوں کا طریقہ ہے۔ قاضی عیاض، ملا علی قاری اور امام بیہقی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ ③ حدیث میں ہے کہ جب رات کا کھانا سامنے آجائے اور نماز کا وقت بھی ہو تو پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر اطمینان سے نماز پڑھی جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کھانے کے متعلق یہ ہدایت مقرر امام کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے ہے۔ مسجد کا مقرر امام اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کے کھانے میں مشغولیت کی وجہ سے مسجد کے تمام نمازیوں کو انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑے گی اور نماز میں بھی تاخیر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت بلال نے نماز کے لیے بلایا تو آپ کھانا چھوڑ کر نماز کے لیے تشریف لے گئے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر امام راتب کے مستثنیٰ ہونے کا عنوان بھی قائم کیا ہے۔[2] آگ پر پکی ہوئی چیز استعمال کرنے سے وضو کرنے یا نہ کرنے کی وضاحت کے بعد ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر ان حضرات کا بھی ذکر کر دیا جائے جن کا وتیرہ تدبر حدیث کی آڑ میں احادیث سے مذاق کرنا ہے، چنانچہ "امام تدبر" لکھتے ہیں: "معلوم نہیں کہاں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ گوشت یا ستو وغیرہ کھانے کے بعد وضو کرنا چاہیے۔ اس بارے میں ایک مذہب یہ ہے کہ وضو کا یہ حکم پہلے تھا لیکن بعد میں منسوخ ہوگیا، یہ توجیہ کسی عقلی یا نقلی بنیاد پر نہیں ہے، عوامی باتیں اسی طرح کی ہوتی ہیں۔"[3] اصلاحی صاحب نے احادیث نبویہ کو "عوامی باتوں" سے تعبیر کر کے ان کا استخفاف کیا ہے۔ گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کی نقلی بنیاد تو آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس کی عقلی بنیاد یہ ہے: حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آگ سے تیار ہونے والی چیزوں میں قوتِ ناریہ کے اثرات آجاتے ہیں جو شیطان کا مادہ ہے، یعنی وہ اس سے پیدا ہوا ہے اور آگ پانی سے بجھ جاتی ہے، اس بنا پر اس کے استعمال کے بعد وضو مناسب ہوا۔ اس کی نظیر غصے کے بعد وضو کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہے، جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہیے کہ وضو کرے۔[4] ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے اونٹ کے گوشت کے متعلق کوئی عنوان قائم نہیں کیا اور نہ پوری کتاب میں اس کے متعلق کوئی حدیث ہی بیان کی ہے، تاہم اونٹ کا گوشت کھانے سے نقض وضو کے قائل امام احمد، امام اسحاق، امام یحییٰ بن منذر اور امام ابن خزیمہ وغیرہ ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک تو اونٹ کے گوشت کو محض ہاتھ لگانا ہی نقض وضو کا باعث ہے، چنانچہ امام ابوداود نے ان کی تردید کے لیے اپنی سنن میں ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔[5] امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اس کی تفصیل لکھی ہے کہ اکثر حضرات کے نزدیک اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں خلفائے اربعہ، عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس، ابوالدرداء، ابوطلحہ، عامر بن ربیعہ، ابوامامہ رضی اللہ عنہم جمہور تابعین اور ائمۂ ثلاثہ ہیں۔[6] شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: اس کے متعلق نقض وضو کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا۔ فقہائے صحابہ اور تابعین میں سے کوئی بھی اس سے نقض وضو کا قائل نہیں۔ لیکن محدثانہ نقطۂ نظر سے اس کے منسوخ ہونے کا قطعی فیصلہ دشوار ہے، اس لیے احتیاط کا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔[7] ہمارے نزدیک راجح بات یہی ہے کہ اونٹ کے گوشت میں چکناہٹ زیادہ ہوتی ہے، اس لیے اس کے کھانے کے بعد وضو کیا جائے۔ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے بکری کا

---

(1) فتح الباري: 407/1. (2) صحيح البخاري، الأذان، حديث: 675. (3) تدبر حديث: 302/1. (4) زادالمعاد: 376/4. (5) سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 185. (6) شرح صحيح مسلم للنووي: 65/4. (7) حجة الله البالغة: 547/1.

گوشت کھانے کے بعد وضو کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''اس کے بعد وضو نہیں ہے، لیکن اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد آپ نے وضو کرنے کا حکم دیا۔''[1] اس حدیث میں اونٹ کے گوشت سے وضو کرنے کی صراحت ہے، اس لیے اس سے لغوی وضو مراد لینا یا اس حکم کو استحباب پر محمول کرنا جیسا کہ بعض علماء کہتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ واللّٰہ أعلم.

(٥١) بَابُ مَنْ مَّضْمَضَ مِنَ السَّوِيقِ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ

٢٠٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ بُشَيْرِ بْنِ يَسَارٍ مَوْلٰى بَنِي حَارِثَةَ أَنَّ سُوَيْدَ بْنَ النُّعْمَانِ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى إِذَا كَانُوا بِالصَّهْبَاءِ - وَهِيَ أَدْنٰى خَيْبَرَ - فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ دَعَا بِالْأَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيقِ، فَأَمَرَ بِهِ فَثُرِّيَ فَأَكَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَكَلْنَا، ثُمَّ قَامَ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَمَضْمَضْنَا، ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ. [انظر: ٢١٥، ٢٩٨١، ٤١٧٥، ٤١٩٥، ٥٣٨٤، ٥٣٩٠، ٥٤٥٤، ٥٤٥٥]

باب:51- ستو کھانے کے بعد وضو کے بجائے صرف کلی کرنا

[209] حضرت سوید بن نعمان ؓ سے روایت ہے، وہ فتح خیبر کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئے تھے۔ جب مقام صہباء پر پہنچے جو خیبر کے قریب تھا، تو آپ نے نماز عصر ادا کی، پھر زادسفر طلب فرمایا تو صرف ستو لائے گئے۔ آپ نے انھیں تیار کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ تیار شدہ ستو رسول اللہ ﷺ اور ہم سب نے کھائے۔ اس کے بعد آپ نماز مغرب کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے صرف کلی فرمائی اور ہم نے بھی کلی کی۔ پھر آپ نے نماز پڑھائی اور نیا وضو نہیں کیا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے: * آگ کی تیار کردہ اشیاء کے استعمال سے نہ تو نقض وضو ہوتا ہے اور نہ تجدید وضو ہی کی ضرورت ہے۔ * کھانے کے بعد کلی کے ذریعے سے منہ صاف کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے تاکہ منہ سے چکناہٹ کے اثرات ختم یا ستو وغیرہ کے اجزاء صاف ہو جائیں۔ * دوران سفر میں اشیائے خورونوش کا سامان ساتھ لے کر جانا چاہیے، ایسا کرنا توکل کے منافی نہیں۔ * سفر میں بوقت ضرورت تمام شرکاء اپنے اپنے زادسفر ایک جگہ جمع کر لیں کیونکہ جماعت پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے اور برکت بھی نازل ہوتی ہے۔ * امام وقت کو چاہیے کہ غذا کی کمی کے موقع پر ذخیرہ اندوزوں سے جبراً اشیائے خوردنی برآمد کر کے انھیں بازار میں لائے تاکہ ضرورت مند حضرات بازار سے بسہولت حاصل کر سکیں۔ * سربراہ مملکت کو چاہیے کہ وہ فوجیوں کی ضروریات کا خیال رکھے اور لوگوں سے حاصل کر کے انھیں مہیا کرے تاکہ جس کے پاس خورونوش کا سامان نہ ہو، وہ بھی اپنی ضرورت پوری کر سکے۔[2] ② اس حدیث سے علامہ خطابی نے آگ سے تیار کردہ

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 184. 2 فتح الباري: 408/1.

اشیاء کے استعمال پر وضو کے منسوخ ہونے کی دلیل لی ہے کیونکہ یہ حکم پہلے کا ہے اور فتح خیبر اس سے متاخر ہے جو ہجرت کے ساتویں سال ہوا۔ حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں: یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ ؓ فتح خیبر کے بعد مسلمان ہوئے ہیں اور وہ آگ سے تیار شدہ چیز کے استعمال پر وضو کرنے والی حدیث کے راوی ہیں۔[1] اور حضرت ابوہریرہ ؓ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اس کے متعلق فتویٰ دیتے تھے۔[2] اس پر علامہ عینی ؒ نے لکھا ہے کہ علامہ خطابی کا استدلال صحیح ہے کیونکہ ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہ ؓ نے وضو کا حکم کسی دوسرے صحابی کے واسطے سے معلوم کیا ہو پھر اس حکم کو اس واسطے کے بغیر بیان کر دیا ہو۔[3] علامہ عینی ؒ کے اعتراض اور علامہ خطابی کے دفاع پر دل مطمئن نہیں اگرچہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ آگ سے تیار شدہ اشیاء کے استعمال پر وضو کرنے کا حکم منسوخ ہے یا اس سے لغوی وضو مراد ہے یا اس وضو کو استحباب پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

٢١٠ - وَحَدَّثَنَا أَصْبَغُ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَمْرٌو عَنْ بُكَيْرٍ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَكَلَ عِنْدَهَا كَتِفًا ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

[210] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے پاس بکری کے شانے کا گوشت تناول فرمایا، پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں نہ ستو وغیرہ کا ذکر ہے اور نہ کلی وغیرہ کرنے کا بیان ہے۔ شراح بخاری نے اس کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں: ✱ اس حدیث کا تعلق باب سابق سے ہے لیکن باب در باب کے اصول پر اس سے پہلے ذکر کردہ حدیث پر ایک نیا عنوان قائم کر کے یہ بتایا کہ آگ سے تیار کردہ چیزوں کے استعمال پر منہ کو صاف کرنے کے لیے صرف کلی کافی ہے۔ ✱ حدیث میمونہ کا ذکر یہاں کاتب کی غلطی سے بے محل ہو گیا ہے کیونکہ فربری کے نسخے میں یہ حدیث باب سابق کے تحت ذکر ہوئی ہے۔ علامہ عینی نے اس کو راجح قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام طور پر کتاب نقل کرنے کے لیے خوشخط کاتب کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اکثر عمدہ خط والے کاتب جاہل ہوتے ہیں اور جہلاء سے اس قسم کی غلطی ہو سکتی ہے۔[4] ✱ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاری ؒ نے ترک مضمضہ والی حدیث میمونہ ذکر کر کے اس کے غیر واجب ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یعنی کھائی ہوئی چیز چکناہٹ والی تھی، اس سے کلی کرنا چاہیے تھی، لیکن بیان جواز کے لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے ترک کر دیا۔[5] اس میں شک نہیں کہ کلی کو منہ کی صفائی کے لیے رکھا گیا ہے۔ ستو میں اجزاء کے انتشار اور گوشت میں چکناہٹ کے اثرات دور کرنے کے لیے کلی کی جاتی ہے۔ اگر منہ کے لعاب کے ساتھ وہ اجزاء تحلیل ہو جائیں، اسی طرح کچھ دیر گزرنے کے بعد گوشت کی چکناہٹ بھی ختم ہو جائے تو کلی کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، البتہ اگر ان چیزوں کے استعمال کے فوراً بعد نماز ادا کرنا ہو تو کلی کرنی ہوگی کیونکہ مقصد منہ کی صفائی ہے تاکہ قراءت میں تکلیف نہ ہو۔ اگر نماز کے وقت منہ کسی وجہ سے خود بخود صاف ہو

---

1 صحيح مسلم، حديث:788(352). 2 فتح الباري:1/408. 3 عمدة القاري:2/581. 4 عمدة القاري:2/582. 5 فتح الباري:1/408.

جائے تو کلی کی ضرورت نہیں۔② امام بخاری حدیث میمونہ کو "مضمضة من السويق" کے تحت لائے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک روایت میں اختصار ہے اگرچہ اس میں کلی کا ذکر نہیں لیکن کلی کرنا مراد میں داخل ہے کیونکہ پہلے باب میں گوشت کے استعمال کے بعد وضو لازم نہ ہونے سے، ستو کے بعد بھی وضو لازم نہ ہونے پر استدلال کیا تھا اور یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ جب ستو کے استعمال کے بعد کلی کی جاتی ہے، حالانکہ اس میں چکناہٹ نہیں ہوتی، تو گوشت یا دوسری چکناہٹ والی چیزوں کے استعمال کے بعد کلی کرنا بالاولیٰ درست ہوگا۔

(٥٢) بَابٌ : هَلْ يُمَضْمِضُ مِنَ اللَّبَنِ

باب:52- دودھ پینے کے بعد کلی کرنا

٢١١ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ وَّقُتَيْبَةُ قَالَا : حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ شَرِبَ لَبَنًا فَمَضْمَضَ وَقَالَ: «إِنَّ لَهُ دَسَمًا». تَابَعَهُ يُونُسُ وَصَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ عَنِ الزُّهْرِيِّ. [انظر: ٥٦٠٩]

[211] حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ دودھ نوش فرمایا تو کلی کی اور فرمایا: "اس (دودھ) میں چکناہٹ ہوتی ہے۔" زہری سے بیان کرنے میں یونس اور صالح بن کیسان نے عقیل کی متابعت کی ہے۔

فوائد و مسائل: ① دودھ تازہ ہو یا گرم اس میں چکناہٹ ہوتی ہے۔ اس کے استعمال کے بعد زبان بھی چکناہٹ آلود ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قراءت قرآن میں تکلف ہونے لگتا ہے، اس لیے دودھ کے استعمال کے بعد کلی کرنی چاہیے۔ بعض روایات میں دودھ پینے کے بعد وضو کرنے کا حکم ہے۔[1] یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے طور پر ہے کیونکہ اس روایت کو بیان کرنے والے حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ اگر میں دودھ پینے کے بعد کلی نہ کروں تو بھی کچھ پروا نہیں۔ اس کے علاوہ حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دودھ نوش فرمایا، اس کے بعد نہ تو کلی کی اور نہ وضو ہی فرمایا بلکہ اس کے بعد آپ نے نماز ادا فرمائی۔[2] بعض حضرات نے حدیث انس کو حدیث ابن عباس کے لیے ناسخ ٹھہرایا ہے، حالانکہ یہ موقف صحیح نہیں کیونکہ کلی کے واجب ہونے کا کوئی بھی قائل نہیں کہ اس میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ہو۔[3] مقصد یہ ہے کہ اگر دودھ پینے کے فوراً بعد نماز کی ضرورت ہو تو کلی کر لینی چاہیے۔ اگر کچھ دیر کے بعد لعاب دہن کی وجہ سے یا از خود منہ صاف ہو جائے تو پھر کلی کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ کلی سے مقصود چکناہٹ کو دور کرنا ہے۔ اگر وہ خود بخود یا لعاب دہن سے دور ہو جائے تو کلی کی ضرورت نہیں۔② امام بخاری ؒ نے حدیث کے آخر میں متابعت کا ذکر فرمایا ہے۔ یونس بن یزید کی متابعت صحیح مسلم (حدیث: 358) میں موصولاً بیان ہوئی ہے جبکہ صالح بن کیسان کی روایت کو ابوالعباس السراج نے اپنی مسند میں باسند بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام اوزاعی نے بھی عقیل کی متابعت کی ہے جسے امام بخاری نے خود کتاب الاطعمہ میں ذکر کیا ہے۔[4]

① سنن ابن ماجه، الطهارة، حديث:498. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث:197. ③ فتح الباري:409/1. ④ فتح الباري:409/1.

(٥٣) بَابُ الْوُضُوءِ مِنَ النَّوْمِ، وَمَنْ لَّمْ يَرَ مِنَ النَّعْسَةِ وَالنَّعْسَتَيْنِ أَوِ الْخَفْقَةِ وُضُوءًا

باب:53- نیند سے وضو کرنا، نیز ایک یا دو بار اونگھنے یا جھونکا آ جانے سے وضو ضروری نہیں

وضاحت: اس باب میں تین چیزوں کا حکم بیان کیا گیا ہے: ○ نیند: انسانی شعور پر جب غفلت پوری طرح غالب آ جائے تو اسے نیند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ○ اونگھ: اس میں آنکھ بند ہو جاتی ہے لیکن فی الجملہ شعور باقی رہتا ہے، غفلت طاری نہیں ہوتی، اس لیے اونگھنے والا اپنے پاس والے کی بات سن لیتا ہے اور کبھی کبھی سمجھ بھی لیتا ہے۔ ○ جھونکا: یہ اونگھ کے اوپر والا درجہ ہے۔ اس میں سر ہلنے لگتا ہے اور ٹھوڑی سینے سے ٹکرانے لگتی ہے۔ جھونکے سے پہلے اونگھ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد نیند کی حدود کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اونگھ کے متعلق تکرار الفاظ کا لحاظ رکھا ہے اور جھونکے میں تکرار نہیں کیونکہ اس کے بعد نیند شروع ہو جاتی ہے۔ نیند چونکہ مظنۂ حدث ہے، اس لیے جب شعور معطل ہو جائے اور حواس قائم نہ رہیں تو ایسی نیند سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، البتہ اونگھنے اور جھونکا آ جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

٢١٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي فَلْيَرْقُدْ حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَدْرِي لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبَّ نَفْسَهُ».

[212] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو، اس دوران میں اگر اسے اونگھ آ جائے تو وہ سو جائے تاکہ اس کی نیند پوری ہو جائے کیونکہ اگر کوئی اونگھتے ہوئے نماز پڑھے گا تو وہ نہیں جانتا کہ وہ اپنے لیے استغفار کر رہا ہے یا خود کو بددعا دے رہا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① نیند بذات خود ناقض وضو نہیں بلکہ بے وضو ہونے کا اہم ذریعہ ہے، خاص طور پر جب کہ انسان کے عقل وشعور پر غالب آ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونگھ کی حالت میں عمل نماز ختم کر دینے کا حکم دیا ہے کیونکہ اونگھنے والے کو پورا ہوش نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس کی زبان سے ایسا کلمہ نکل جائے جو اس کے حق میں بددعا ثابت ہو، لہٰذا عمل نماز کو باقی رکھنا مصلحت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اونگھنے سے وضو ٹوٹ گیا اور نماز باطل ہوگئی۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سونے کا حکم دینے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں: * سونے کی وجہ سے وضو ٹوٹ گیا، لہٰذا نماز جاری رکھنا عبث ہے۔ * بے خبری کی حالت میں نماز کا عمل جاری رکھنا مصلحت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز نہ پڑھنے کے لیے دوسری علت بیان فرمائی ہے کہ مبادا دعا کے بجائے بددعا منہ سے نکل جائے۔ نماز باقی نہ رکھنے کے لیے پہلی علت، تو وہ یہاں متحقق ہی نہیں، یعنی وضو نہیں ٹوٹا بلکہ باقی ہے۔ امام بخاری ؒ یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اونگھ یا جھونکے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ ② امام ابوعبداللہ محمد بن نصر المروزی نے اس حدیث کا پس منظر بایں الفاظ بیان کیا ہے: حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ایک دفعہ حولاء بنت تویت کے پاس سے گزرے تو آپ کو بتایا گیا کہ یہ خاتون رات کے وقت لمبا قیام کرتی ہے۔ جب اس پر نیند کا غلبہ

ہوتا ہے تو چھت سے لٹکتی ہوئی رسی میں گردن ڈال دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ہدایت فرمائی کہ نماز اس قدر پڑھی جائے جتنی انسان میں طاقت ہے۔ جب تھک کر اونگھ آنے لگے تو سو جانا چاہیے۔[1]

٢١٣ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَيُّوبُ عَنْ أَبِي قِلَابَةَ، عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا نَعَسَ فِي الصَّلَاةِ فَلْيَنَمْ حَتَّى يَعْلَمَ مَا يَقْرَأُ».

[213] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی تم میں سے نماز کے دوران میں اونگھنے لگے تو اسے سو جانا چاہیے تا آنکہ جو پڑھ رہا ہے اسے سمجھنے کے قابل ہو جائے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ ایسی حالت میں ادا شدہ نماز کو دہرانے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اگر وضو ٹوٹ جاتا تو اس دوران میں ادا کی گئی نماز کو لوٹانے کا ضرور حکم دیا جاتا۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل احکام معلوم ہوتے ہیں: غلبۂ نیند کے وقت نماز ختم کر دینی چاہیے۔ اگر کوئی ایسی حالت میں نماز جاری رکھے گا تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ اس سے ادنیٰ درجۂ خشوع کا پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ خود یا اس کا امام کیا پڑھ رہا ہے۔ دوسرے مراتب خشوع مستحب کے درجے میں ہیں۔ غلبۂ نوم سے کم درجہ اونگھ کا ہے جو نوم قلیل ہے اور اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ عبادات میں خشوع اور حضور قلب کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے بغیر نماز ادا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔[2] ② حافظ ابن حجر ؒ نے امام مہلب کے حوالے سے لکھا ہے کہ نماز چھوڑ کر سونے کا حکم قیام اللیل سے متعلق ہے کیونکہ کوئی بھی (فرض نماز) اوقات نیند میں نہیں اور نہ ان میں اتنی طوالت ہی ہے کہ انسان کو نیند آنے لگے۔ اگرچہ اس حدیث کا ایک پس منظر ہے جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں، تاہم مسائل و احکام میں الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اگر فرض نماز میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو اسے ترک کر کے سو جانا چاہیے بشرطیکہ اتنا وقت باقی ہو کہ سو کر اٹھنے کے بعد نماز بروقت ادا کی جا سکتی ہو۔[3] اس وضاحت کے بعد اصلاحی صاحب نے اس حدیث پر جو ''تدبر'' فرمایا ہے وہ بھی ملاحظہ کریں اور اندازہ لگائیں کہ یہ حضرات کس کس انداز سے حدیث کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایت تہجد کے وقت کے لیے کی ہوگی۔ آپ نے فرمایا کہ نیند کے غلبے میں بجائے نماز پڑھنے کے سو رہے۔ ایسا کون غبی ہوگا جس کو دوسرے اوقات میں ایسی نیند آئے کہ اپنے آپ کو گالیاں دینے لگے...... ان روایات کو باب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''[4] اس تدبر پر ہم اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے اپنے قارئین کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔

(٥٤) بَابُ الْوُضُوءِ مِنْ غَيْرِ حَدَثٍ

باب:54- حدث کے بغیر وضو کرنا

وضاحت: حدث (بے وضو ہونے) کے بعد وضو لازم ہے لیکن اگر حدث لاحق نہ ہو تو وضو کرنے کا کیا حکم ہے؟ امام بخاری ؒ

① مختصر قيام الليل، ص:133. ② عمدة القاري:2/587. ③ فتح الباري:1/411. ④ تدبر:1/305,306.

بتانا چاہتے ہیں کہ ایسی حالت میں وضو کرنا مستحب تو ہے ضروری نہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض حضرات کے نزدیک آیت وضو کے پیش نظر ہر نماز کے لیے وضو کرنا فرض ہے، خواہ حدث لاحق ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح بعض لوگ حدث کے بغیر وضو کرنے کو فعل عبث قرار دیتے ہیں کیونکہ نماز کے لیے وضو ایک آلہ ہے، خود مقصود نہیں، لہٰذا جب تک سابق وضو برقرار ہے دوبارہ وضو کرنا فعل عبث اور ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس میں اسراف اور وقت کا ضیاع ہے۔ امام بخاری ؒ اس وہم کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا کرنا ہرگز فعل عبث نہیں اور وضو کرنا ضروری بھی نہیں، صرف عمل مستحب ہے۔

٢١٤ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَامِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا ؛ ح : [قَالَ]: وَحَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ عَامِرٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ، قُلْتُ: كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُونَ؟ قَالَ: يُجْزِئُ أَحَدَنَا الْوُضُوءُ مَا لَمْ يُحْدِثْ.

[214] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ ہر نماز کے لیے وضو کیا کرتے تھے۔ (راوی عمرو بن عامر کہتے ہیں) میں نے پوچھا: آپ حضرات (صحابہ) کا کیا معمول تھا؟ حضرت انس ؓ نے فرمایا: ہم میں سے ایک شخص کو اس وقت تک وضو کافی ہوتا تھا جب تک اسے حدث لاحق نہ ہوتا۔

فوائد ومسائل: ① امام ترمذی ؒ نے بھی اس روایت کو بیان کیا ہے اس میں کچھ اضافہ ہے کہ نبی ﷺ وضو سے ہوتے یا بغیر وضو کے ہر حال میں نماز کے لیے تازہ وضو کرتے تھے۔[1] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے، پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے وقت تازہ وضو کرنے کے پابند تھے، خواہ آپ وضو ہی سے کیوں نہ ہوں۔ جب آپ پر یہ گراں گزرا تو اس کے بجائے ہر نماز کے لیے مسواک کرنے کا حکم دے دیا گیا۔[2] ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت ایک ہی وضو سے نمازیں ادا کیں تو حضرت عمر ؓ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا، آپ نے جواب دیا: ''میں نے دانستہ ایسا کیا ہے۔''[3] حضرت سوید بن نعمان ؓ کی حدیث (جو آگے آرہی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کی پابندی خیبر کے موقع پر اٹھا لی گئی تھی اور فتح مکہ اس کے بعد ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ پابندی اٹھنے کے باوجود خیر و برکت کے لیے آپ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے ہوں جس کی خبر حضرت عمر ؓ کو نہ ہوسکی کیونکہ ان کے سوال کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اس کا علم نہ تھا۔ واضح رہے کہ ہر نماز کے لیے نیا وضو صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے تھا، افراد امت کے لیے یہ پابندی نہ تھی جیسا کہ حضرت انس ؓ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت انس کا جواب بایں الفاظ منقول ہے کہ ہم تمام نمازیں ایک ہی وضو سے پڑھ لیتے تھے۔[4] وضو پر وضو کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے کیونکہ یہ نور علی نور ہے، البتہ علمائے احناف نے استحباب وضوءِ جدید کے لیے

[1] سنن الترمذي، الطهارة، حديث:58. [2] سنن أبي داود، الطهارة، حديث:48. [3] صحيح مسلم، الطهارة، حديث:642(277).
[4] سنن ابن ماجه، الطهارة، حديث:509.

اختلاف مجلس یا دو وضو کے درمیان توسط عبادت کی شرط لگائی ہے، نیز وضوء علی وضوء میں بعض سلف کے عمل سے وضوء ناقص بھی داخل ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ آپ نے چہرے، بازو، سر اور پاؤں پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ یہ وضو بغیر حدث کا ہے۔[1]

نوٹ: امین اصلاحی نے تدبر حدیث کے لیے محدثین کے اسلوب سے بالا بالا راستہ اختیار کر کے منکرین حدیث کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ انھوں نے اس خود ساختہ تدبر کی آڑ میں احادیث کا مذاق اڑایا ہے اور ان میں شکوک وشبہات کا راستہ ہموار کیا ہے اور اس کے لیے وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مذکورہ حدیث پر بھی جو تدبر فرمایا ہے اس کی ایک جھلک پیش خدمت ہے: ''یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے حضرت انس نہیں کہہ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کراتے تھے، ان سے زیادہ حضور کے معمولات سے واقف کون ہو سکتا ہے۔ اور یہ روایت نہ جانے کتنے طریقوں سے مروی ہے کہ آپ نے ایک ہی وضو سے متعدد نمازیں پڑھیں۔ فتح مکہ کے روز آپ کا ایک ہی وضو سے کئی نمازیں پڑھنا معروف ہے۔ غالباً ہوا یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایسے الفاظ میں روایت کی ہے جس سے عموم نکلتا ہے، لیکن خصوص اس سے سمجھا جا سکتا ہے، یعنی ایسے فقرے ہو سکتے ہیں جن سے یہ سمجھا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ یہی تھا کہ ہر نماز کے لیے نیا وضو کرتے تھے۔ اور یہ روایت صحیح ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ ہر نماز کے لیے، چاہے وضو قائم ہو، نیا وضو کیا جائے، قول سے غلط استشہاد ہے کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول کے نقل کرنے میں کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہے۔''[2] اصلاحی صاحب کی اس عبارت کے ایک ایک لفظ سے احادیث بخاری میں تشکیک کی زہریلی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ تدبر حدیث نامی کتاب میں جگہ جگہ یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ آپ پہلے ہر نماز کے لیے نئے وضو کے پابند تھے، خواہ آپ پہلے وضو ہی سے کیوں نہ ہوں، لیکن جن حضرات کی فطرت میں کجی ہو ان کے سامنے اس طرح کے دلائل بے سود ہیں۔

٢١٥ - حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ قَالَ: حَدَّثَنِي يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي بُشَيْرُ بْنُ يَسَارٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي سُوَيْدُ بْنُ النُّعْمَانِ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ خَيْبَرَ حَتَّى إِذَا كُنَّا بِالصَّهْبَاءِ صَلَّى لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ الْعَصْرَ فَلَمَّا صَلَّى دَعَا بِالْأَطْعِمَةِ فَلَمْ يُؤْتَ إِلَّا بِالسَّوِيقِ فَأَكَلْنَا وَشَرِبْنَا ثُمَّ قَامَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ ثُمَّ صَلَّى لَنَا الْمَغْرِبَ

[215] حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم خیبر کے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ جب ہم مقام صہباء پر پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز عصر پڑھائی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے کھانے (زادِ سفر) منگوائے، چنانچہ ستو کے علاوہ اور کوئی چیز پیش نہ کی جا سکی۔ پس ہم نے کھایا اور پیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ نے کلی کی اور مغرب کی نماز پڑھائی اور وضو نہیں فرمایا۔

[1] سنن النسائي، الطهارة، حديث:130. [2] تدبر حديث:306/1.

وَلَمْ يَتَوَضَّأْ . [راجع : ٢٠٩]

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا قائم کردہ عنوان دو اجزاء پر مشتمل ہے: * حدث کے بغیر وضو ضروری نہیں۔ * ایسی صورت میں وضو کر لینا مستحب ہے۔ امام بخاری ہر جز کے ثبوت کے لیے احادیث لائے ہیں۔ مذکورہ حدیث سے یہ ثابت کیا کہ وضو ضروری نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا اور عصر کی نماز پڑھائی اور پھر مغرب کی نماز بھی اسی وضو سے پڑھائی، نیا وضو نہیں کیا۔ حضرت انس کی روایت سے یہ ثابت کیا کہ وضو کرنا مستحب ہے، چنانچہ آپ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے، خواہ آپ کو وضو کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی دو اجزاء ثابت ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ایک رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے کہ آپ ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے یہ تو استحباب کے ثبوت کے لیے ہے۔ دوسرا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے کہ جب تک حدث لاحق نہ ہوتا، ایک ہی وضو سے کئی کئی نمازیں پڑھ لیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک حدث لاحق نہ ہو، اس وقت تک وضو ضروری نہیں۔ ② حضرت اصلاحی نے اس حدیث پر بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے، فرماتے ہیں: ''معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب اپنا مذہب بیان کرنے کے لیے یہ روایت لائے ہیں۔ حضرت انس والی روایت انھوں نے غالباً صرف یہ دکھانے کے لیے دی ہے کہ راوی حضرات اس طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں تاکہ لوگ متنبہ رہیں اور غور کرتے رہا کریں۔''[1]

(٥٥) بَابٌ : مِنَ الْكَبَائِرِ أَنْ لَّا يَسْتَتِرَ مِنْ بَوْلِهِ

باب:55- اپنے پیشاب سے احتیاط نہ کرنا کبیرہ گناہ ہے

٢١٦ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِحَائِطٍ مِّنْ حِيطَانِ الْمَدِينَةِ أَوْ مَكَّةَ، فَسَمِعَ صَوْتَ إِنْسَانَيْنِ يُعَذَّبَانِ فِي قُبُورِهِمَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «يُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ»، ثُمَّ قَالَ: «بَلٰى، كَانَ أَحَدُهُمَا لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ، وَكَانَ الْآخَرُ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ»، ثُمَّ دَعَا بِجَرِيدَةٍ فَكَسَرَهَا كِسْرَتَيْنِ، فَوَضَعَ عَلٰى كُلِّ قَبْرٍ مِّنْهُمَا كِسْرَةً، فَقِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ! لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟ قَالَ ﷺ: «لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ تَيْبَسَا». [انظر: ٢١٨، ١٣٦١،

[216] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ مدینے یا مکے کے کسی باغ سے گزرے تو وہاں دو آدمیوں کی آواز سنی جن کو قبر میں عذاب ہو رہا تھا۔ اس وقت آپ نے فرمایا: ''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑی بات پر نہیں دیا جا رہا۔'' پھر فرمایا: ''ہاں (بڑی ہی ہے) ان میں سے ایک تو اپنے پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغل خوری کی عادت میں مبتلا تھا۔'' پھر آپ نے ایک تر شاخ منگوائی، اس کے دو ٹکڑے کر کے ہر قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ آپ سے عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے فرمایا: ''امید ہے کہ جب تک یہ خشک نہ ہو جائیں،

[1] تدبر حدیث: 307/1.

۱۳۷۸، ٦٠٥٢، ٦٠٥٥] ان دونوں پر عذاب ہلکا کر دیا جائے گا۔‘‘

فوائد ومسائل: ① یہ عنوان قائم کرنے سے امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ پیشاب ناقض وضو ہونے کے ساتھ ساتھ ناپاک اور نجس بھی ہے، لہٰذا بدن اور کپڑوں کی حفاظت ضروری ہے اور اس سے پرہیز نہ کرنا ایک کبیرہ گناہ ہے جو قبر اور آخرت میں عذاب کا باعث ہوسکتا ہے، خواہ یہ اصل کے اعتبار سے کبیرہ ہو، یا اصرار اور عادی ہونے کی وجہ سے کبیرہ بن گیا ہو۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ دیوار کی جڑ میں نرم جگہ پر پیشاب کیا اور فرمایا: ’’جب تم میں سے کسی کو پیشاب کی حاجت ہو تو اس کے لیے مناسب جگہ کا انتخاب کرے۔‘‘[1] اس سے احتیاط کے درج ذیل طریقے ہیں: ○ کسی بندش یا روک والی جگہ کا انتخاب کیا جائے کیونکہ کھلی جگہ پر ہوا پیشاب کا رخ پلٹ سکتی ہے۔ ○ جہاں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھے ادھر ہوا کا رخ نہ ہو کیونکہ بعض دفعہ آگے سے ہوا پڑنے کی بنا پر کپڑے یا بدن آلودہ ہوسکتا ہے۔ ○ پیشاب کرنے کی جگہ نرم ہو تاکہ پیشاب جذب ہو جائے کیونکہ سخت جگہ پر پیشاب کرنے سے اس کے چھینٹے بدن اور کپڑوں کو ناپاک کر سکتے ہیں۔ ○ پیشاب کرتے وقت ڈھلوان کا رخ اگلی جانب ہو کیونکہ پچھلی جانب رخ ہونے سے بدن کے ناپاک ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ② اس حدیث میں یہ اشکال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلے تو ان کے کبیرہ ہونے کی نفی فرمائی پھر اسکے کبیرہ ہونے کا اثبات فرمایا۔ شارحین نے اس سلسلے میں متعدد تاویلات کی ہیں: ○ یہ دونوں باتیں فی نفسہٖ کبیرہ نہ تھیں مگر ان کے عادی اور خوگر ہو جانے نے ان کو کبیرہ بنا دیا۔ حدیث کے الفاظ بھی اس کی تائید کرتے ہیں کیونکہ كَانَ جب مضارع پر داخل ہوتا ہے تو استمرار اور دوام کا فائدہ دیتا ہے۔ ○ ان گناہوں سے احتراز کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی اور نہ ان سے پرہیز کرنے میں انھیں کسی دقت ہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس کے باوجود ان سے احتراز نہ کیا گیا۔ اس وجہ سے ان میں سنگینی پیدا ہوگئی۔ ○ لوگوں کی نگاہوں میں یہ معمولی گناہ تھے، اس لیے وہ ان سے بچنے کا اہتمام نہ کرتے تھے مگر اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑے جرم تھے جیسا کہ واقعۂ افک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَاللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ ’’تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو مگر وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات تھی۔‘‘[2] ○ جس کبیرہ کی نفی کی گئی ہے وہ اکبر کے معنی میں ہے، یعنی بڑا گناہ تو ہے مگر قتل عمد کی طرح بہت بڑا نہیں۔ اس طرح نفی واثبات دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ○ رسول اللہ ﷺ نے انھیں پہلے صغیرہ ہی خیال کیا تھا لیکن اس کے بعد وحی نازل ہوئی کہ یہ چیزیں صغیرہ نہیں بلکہ کبیرہ ہیں، اس لیے آپ نے فوراً استدراک فرمایا کہ نہیں بلکہ یہ لوگ کبیرہ گناہ کے مرتکب تھے۔ ○ ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ ہر جرم کی دو صورتیں ہوتی ہیں: حسی اور شرعی۔ یعنی یہ جرم وجود حسی کے اعتبار سے معمولی نظر آتے تھے مگر شرعی اعتبار سے انتہائی سنگین تھے کیونکہ کپڑا یا بدن ناپاک ہو تو نماز صحیح نہیں ہوتی، نیز لگائی بجھائی کرنے سے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں، یعنی شریعت کی نظر میں یہ چیزیں معمولی نہ تھیں جس میں یہ لوگ زندگی بھر مبتلا رہے اور اب انھیں اس پاداش میں عذاب دیا جا رہا ہے۔ ③ کبیرہ، وہ گناہ ہوتا ہے جو دوسرے گناہوں کے لحاظ سے زیادہ قبیح اور شارع کی نظر میں بڑے درجے کی برائی رکھتا ہو اور جس کے ارتکاب پر شریعت میں لعنت، غضب، عذاب کی وعید آئی ہو یا دنیا میں اس کے ارتکاب پر حد لگائی جا سکتی ہو۔ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ گناہ کا چھوٹا بڑا ہونا ایک نسبی امر ہے، لہٰذا ہر ایسا گناہ جس سے اوپر درجے کا گناہ بھی ہے، وہ اوپر والے کی نسبت سے صغیرہ

---

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث:3. 2. النور 24:15.

ہے اور اپنے ماتحت کے اعتبار سے وہی کبیرہ بھی ہے۔[1] اصل بات یہ ہے کہ جس کبیرہ گناہ پر بھی صحیح معنی میں اللہ کی طرف رجوع ہو جائے وہ صغیرہ جیسا بن جاتا ہے اور جس صغیرہ پر اصرار و مداومت ہو اور اسے صغیرہ خیال کیا جائے، وہ کبیرہ جیسا بن جاتا ہے، جیسے اگر معمولی چنگاری کو پانی سے نہ بجھایا جائے تو بڑے بڑے محلات کو زمین بوس کر دیتی ہے اور اگر بڑے بڑے شعلوں کو پانی سے سرد کر دیا جائے تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔ ④ یہ حدیث نص صریح ہے کہ عذاب قبر برحق ہے اور عذاب بھی اسی زمینی قبر میں ہوتا ہے اور جن لوگوں کو زمینی قبر نہیں ملتی ہے ان کے لیے وہی قبر ہے جہاں ان کے ذرات پڑے ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس کے لیے کسی برزخی قبر کا وجود ثابت نہیں ہے جیسا کہ بعض فتنہ پرور لوگوں کا خیال ہے۔ اصلاحی صاحب نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب قبر کا انکار کیا ہے، لکھتے ہیں: ''قبر میں عذاب ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس عذاب کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں ہے، اس لیے کہ عالم برزخ میں حساب کتاب نہیں ہوتا۔''[2] درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ سے ان کا رد ہوتا ہے: ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا وَّ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ ''فرعون اور آل فرعون کو صبح وشام آگ کے سامنے لایا جاتا ہے اور جس دن قیامت ہوگی (فرمان ہوگا کہ) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو۔''[3] اس آیت کریمہ سے واضح طور پر عذاب قبر کا اثبات ہوتا ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب میں فرمایا: ''ہاں! قبر کا عذاب حق ہے۔''[4] لیکن منکرین، قرآن اور حدیث کی تصریحات کا انکار کرتے ہیں۔ امید ہے کہ احادیث پر تدبر کرنے والوں کو اب عذاب قبر کا ضرور احساس ہو رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ ⑤ اس حدیث کے پیش نظر قبروں پر سبزہ لگانا اور ان پر پھول چڑھانا جائز قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔ اگر سبزہ لگانا میت کے حق میں تخفیف عذاب کا باعث ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ اس کی ترغیب دیتے۔ آپ نے مردوں کے متعلق ایصال ثواب اور نفع رسانی کے مختلف طریقے بیان فرمائے ہیں لیکن ان میں پھول چڑھانے یا سبزہ لگانے کا عمل کہیں بیان نہیں فرمایا، حالانکہ یہ ایک عام دستیاب سستا اور بے ضرر نسخہ ہے جس سے ہر وقت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا مگر آپ نے اسے جاری رکھنے کا حکم نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین اور دیگر بڑے بڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے جنازوں کے مفصل حالات سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں، کسی نے بھی اس کی ترغیب نہیں دی۔ صرف حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ اس کے عامل ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو قبر پر شاخ رکھنے کی تلقین فرمائی تھی اور بس! دوسرے صحابہ کے مقابلے میں ایک صحابی کے عمل کو سنت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ واللہ أعلم۔

(٥٦) بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الْبَوْلِ

باب:56- پیشاب کو دھونا

وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِصَاحِبِ الْقَبْرِ: «كَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ»، وَلَمْ يَذْكُرْ سِوٰى بَوْلِ النَّاسِ.

نبی ﷺ نے صاحب قبر کے متعلق فرمایا: ''وہ اپنے پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا۔'' اور آپ نے انسانوں کے

1 عمدة القاري:2/592. 2 تدبر حدیث:1/309. 3 المؤمن 40:46. 4 صحيح البخاري، الجنائز، حديث:1372.

پیشاب کے علاوہ اور کسی چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔

وضاحت: امام بخاری ؒ نے سابق باب سے آئندہ پندرہ ابواب تک پیشاب کے متعلق مختلف احکام بیان کیے ہیں، ضمنی طور پر دوسری نجاستوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس مجموعے پر غور کیا جائے تو امام بخاری کا مقصد اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی پیشاب کے متعلق شرعی احکام بہت سخت ہیں اور اس سے اجتناب ہر وقت ضروری ہے کیونکہ یہ نجاست ہر وقت انسان کے ساتھ لگی رہتی ہے، اس لیے انسان بعض اوقات اسے معمولی خیال کر کے اپنے جسم اور بدن کو نجس کر لیتا ہے۔ قیامت کے عذاب سے پہلے ایسے لوگوں کو قبر میں سخت اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں امام بخاری ؒ نے حدیث سابق (216) کا حوالہ دیا ہے۔ مزید فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے پیشاب کے علاوہ اور کسی چیز کا ذکر نہیں فرمایا۔ دراصل امام بخاری اس اسلوب سے ان لوگوں کی تردید کرنا چاہتے ہیں جو دیگر حیوانات کے پیشاب کو بھی بول انسان پر قیاس کر کے انھیں نجس قرار دیتے ہیں۔ آئندہ ابواب میں حیوانات کے پیشاب کے متعلق تفصیل پیش کی جائے گی۔ واضح رہے قبل ازیں امام بخاری نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا تھا [بابُ الاستِنْجَاءِ بِالْمَاءِ] ''پانی سے استنجا کرنا'' وہاں اسی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا تھا، البتہ مذکورہ عنوان ''پیشاب کو دھونا'' اپنے اندر عموم رکھتا ہے کیونکہ استنجا کے علاوہ بھی پیشاب کو دھونے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ بعض روایات میں مِنْ بَوْلِهِ کے بجائے مِنَ الْبَوْلِ کے الفاظ ہیں۔ اس سے بعض فقہاء نے ہر قسم کے پیشاب کے نجس ہونے پر دلیل لی ہے۔ حافظ ابن حجر، علامہ ابن بطال کے حوالے سے لکھتے ہیں: امام بخاری نے اس سے مراد انسانوں کا پیشاب لیا ہے، تمام حیوانات کا پیشاب مراد نہیں۔ جن لوگوں نے اسے عموم پر محمول کرتے ہوئے تمام حیوانات کے پیشاب کو پلید کہا ہے ان کا موقف صحیح نہیں جیسا کہ علامہ خطابی نے الفاظ کے عموم سے اس قسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام حیوانات کے پیشاب کو نجس قرار دیا ہے۔ دراصل من البول کا الف لام بوله کی ضمیر کا بدل ہے، اس سے مراد تمام لوگوں کے پیشاب ہیں کیونکہ یہ ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں چونکہ انسان کا گوشت حرام ہے، اس لیے غیر ماکول اللحم حیوانات کا پیشاب بھی نجس ہے، ہاں ماکول اللحم حیوانات کے پیشاب کی طہارت کے متعلق دوسرے دلائل ہیں جو آئندہ بیان ہوں گے۔ علامہ قرطبی ؒ نے لکھا ہے کہ من البول اسم مفرد ہے جو عموم کا تقاضا نہیں کرتا۔ اگر اس کے عموم کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسے ان دلائل کی وجہ سے خاص کیا جا سکتا ہے جو مأکول اللحم حیوانات کے پیشاب کی طہارت کا تقاضا کرتے ہیں۔[1]

٢١٧ - حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنِي رَوْحُ بْنُ الْقَاسِمِ قَالَ: حَدَّثَنِي عَطَاءُ بْنُ أَبِي مَيْمُونَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَبَرَّزَ لِحَاجَتِهِ أَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فَيَغْتَسِلُ بِهِ. [راجع: ١٥٠]

[217] حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب رفع حاجت کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو میں آپ کے لیے پانی لے کر جایا کرتا جس سے آپ استنجا کرتے۔

فوائد و مسائل: ① رفع حاجت میں بول و براز سب شامل ہیں، اس طرح پیشاب کا دھونا ثابت ہوا۔ حلال جانوروں کا

[1] فتح الباري: 419/1.

پیشاب اس سے مستثنیٰ ہے جس کا بیان آگے ہوگا۔ اس طرح یغسل کا لفظ بھی عام ہے کہ محل نجاست کو دھوتے تھے، اب خواہ وہ محل بول ہو یا محل براز۔ طہارت کی صورت دھونا ہے، اسی مناسبت سے عنوان ثابت ہوگیا۔ ② شارح بخاری ابن بطال نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے حیوانات کے پیشاب کے متعلق اہل ظاہر کی موافقت کی ہے۔[1] یہ ابن بطال کا سہو ہے کہ انھوں نے امام بخاری کو اہل ظاہر کا ہم نوا بتلایا ہے کیونکہ اہل ظاہر کے نزدیک بول الناس کے علاوہ تمام حیوانات کے پیشاب طاہر ہیں، خواہ ان کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ اس موقف کو نہ امام بخاری نے اختیار کیا ہے اور نہ اسے کسی موقع پر راجح ہی قرار دیا ہے۔ ظاہریہ کی بعض جزئیات سے اتفاق کرنے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ تمام جزئیات کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ امام بخاری خود مجتہد مطلق ہیں، کسی مجتہد کی جو جزئیات کتاب وسنت کے موافق ہوتی ہیں انھیں اختیار کر لیتے ہیں اور جو کتاب وسنت کے منافی ہوتی ہیں انھیں خاموشی کے ساتھ ترک کر دیتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے تراجم ہی ان کی ٹھوس اور خاموش ابحاث ہیں۔ ان کی خاص شروط کے مطابق احادیث صحیحہ کی اتباع ہی ان کی دھن ہے۔ ظاہریہ میں تو ابن حزم بھی ہیں، وہ ماکول اللحم حیوانات کے پیشاب اور گوبر وغیرہ کو نجس قرار دیتے ہیں۔ محلی ابن حزم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک ہر جانور کے بول سے اجتناب ضروری ہے، بصورت دیگر تساہل برتنے پر اس کے حق میں عذاب کی وعید ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ مجتہد مطلق ہیں اور وہ دلیل کے تابع ہیں۔ ان کا مسلک کتاب وسنت ہے اور کچھ نہیں۔ ③ عربی کا مقولہ ہے کہ جھوٹا آدمی بھی کبھی سچی بات کہہ دیتا ہے۔ اس کے پیش نظر اصلاحی صاحب کا اس سلسلے میں ایک حکیمانہ فتویٰ ہم یہاں نقل کرتے ہیں: ''میں نے آٹھ سال دیہات میں رہ کر دیکھا ہے کہ سب سے حکیمانہ فتویٰ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے کہا کہ جن جانوروں کا گوشت ہم کھاتے ہیں ان کا پیشاب بھی پاک ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان جانوروں میں آپ زندگی گزاریں تو یہ ناممکن ہے کہ کبھی آپ کے کپڑے وغیرہ پر ان کے پیشاب کا چھینٹا نہ پڑ جائے، لہٰذا ان کے پیشاب کو انسان کے پیشاب پر قیاس کرنے سے لوگوں کے لیے غیر معمولی دشواری پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔''[2]

بَابٌ:

باب: بلاعنوان

٢١٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ خَازِمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ مُجَاهِدٍ، عَنْ طَاوُسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ: «إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي

[218] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ کا گزر دو قبروں سے ہوا، آپ نے فرمایا: ''ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور عذاب بھی کسی بڑی بات کے سلسلے میں نہیں ہے۔ ایک تو ان میں سے پیشاب سے احتیاط نہیں کرتا تھا اور دوسرا چغلی کرتا پھرتا تھا۔'' پھر آپ نے ایک تازہ شاخ لی اور درمیان سے چیر کر اسے دو حصوں

[1] شرح ابن بطال: 347/1. [2] تدبر حدیث: 311/1.

بِالنَّمِيمَةِ»، ثُمَّ أَخَذَ جَرِيدَةً رَّطْبَةً فَشَقَّهَا نِصْفَيْنِ فَغَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَّاحِدَةً، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! لِمَ فَعَلْتَ؟ قَالَ: «لَعَلَّهُ يُخَفَّفُ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا»، قَالَ ابْنُ الْمُثَنّٰى: وَحَدَّثَنَا وَكِيعٌ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ قَالَ: سَمِعْتُ مُجَاهِدًا مِّثْلَهُ.
[راجع: ٢١٦]

میں تقسیم کیا اور ہر قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا۔ صحابۂ کرام ﷡ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ارشاد ہوا: ''جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں، شاید ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے۔'' ابن مثنیٰ نے کہا: ہمیں وکیع نے حدیث بیان کی، انھوں نے اعمش سے تحدیث کے صیغے سے نقل کیا، وہ کہتے ہیں: میں نے مجاہد سے اسی طرح سنا۔

فوائد و مسائل: ① یہ باب بلاعنوان ہے۔ عام طور پر ایسے ابواب کی تین اغراض ہوتی ہیں: * اس کا تعلق پہلے باب سے ہوتا ہے گویا یہ اس کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ * قارئین کی ذہنی استعداد بڑھانا مقصود ہوتا ہے کہ وہ حدیث پر غور و فکر کر کے خود کوئی عنوان قائم کریں۔ * بعض اوقات یہ بھی اشارہ ہوتا ہے کہ باب بلاعنوان کے تحت آنے والی حدیث سے متعدد مسائل ثابت ہوتے ہیں، اس لیے اس پر کوئی ایک عنوان قائم کر کے اسے محدود نہیں کیا جاتا۔ اس مقام پر امام بخاری ؒ کی کیا غرض ہے اس کے متعلق شارحین نے مختلف وجوہات لکھیں ہیں: ○ شاہ ولی اللہ ؒ نے بخاری کے تراجم ابواب میں لکھا ہے کہ باب کا لفظ صرف ابوذر کے نسخے میں ہے بخاری کے دوسرے نسخوں میں یہاں لفظ باب نہیں ہے، لہٰذا اس کا حذف ہی بہتر ہے۔ ○ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ یہ باب، سابق باب کی فصل ہے لیکن اس موقف سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سابق باب کی فصل قرار دینے کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے: * ان دونوں میں کسی اعتبار سے اتحاد ہو۔ * دوسری جہت سے ان میں مغایرت کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ اگر اسے باب سابق ''غسل البول'' کی فصل تسلیم کریں تو کلی طور پر مغایرت ہے، کسی اعتبار سے بھی ان میں اتحاد نہیں۔ اگر اس سے پہلے باب کی فصل تسلیم کریں تو اس میں کلی اتحاد ہے کیونکہ وہاں بھی اس حدیث کو بیان کیا گیا ہے اسے دوبارہ یہاں بیان کرنا چہ معنی دارد۔ ○ علامہ عینی ؒ نے لکھا ہے کہ اس باب بلاعنوان سے امام بخاری کا مقصد اختلاف سند دکھانا ہے، گزشتہ روایت مجاہد عن ابن عباس تھی اور مذکورہ روایت مجاہد عن طاؤس عن ابن عباس ہے، یعنی یہ روایت بواسطہ طاؤس ہے جبکہ پہلی براہ راست تھی۔ امام ابن حبان نے دونوں طریق کی صحت تسلیم کی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مجاہد نے حدیث مذکور کو بواسطہ طاؤس اور براہ راست دونوں طرح سنا ہے۔ امام ترمذی نے بواسطہ طاؤس والی روایت کو اصح کہا ہے۔[1] ہمارے نزدیک اس باب بلاعنوان کی غرض قارئین کی ذہنی استعداد بڑھانا ہے کہ وہ خود اس کے سیاق و سباق کا لحاظ کر کے کوئی موزوں عنوان قائم کریں، چنانچہ یہاں مندرجہ ذیل عنوان مناسب ہے: [البول موجب لعذاب القبر] پہلے باب میں اس کا کبیرہ گناہ ہونا ثابت کیا تھا اور یہاں تنبیہ فرمائی کہ عذاب قبر بھی کبیرہ گناہ کے باعث ہوتا ہے۔ ② حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ یہ مستقل باب امام بخاری نے اس لیے قائم کیا ہے کہ غسل بول پر واضح دلالت ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ پیشاب کا دھونا

① عمدة القاري: 604/2.

واجب ہے، ہاں! ڈھیلے سے استنجا کرنے کی صورت میں رخصت ثابت ہے بشرطیکہ اپنے محل سے منتشر نہ ہو۔ اگر پیشاب اپنے محل سے منتشر ہوا تو ڈھیلے سے استنجا کرنے کے باوجود اس کا دھونا اس حدیث سے ثابت ہوگا، یعنی امام بخاری کی غرض محل سے منتشر شدہ بول کے وجوب غسل پر تنبیہ ہے۔[1] ③ ابن بطال نے لکھا ہے کہ لایستتر کے معنی یہ ہیں: اپنے جسم اور کپڑوں کو پیشاب سے نہیں بچاتا تھا، پھر جب اس کے دھونے سے بے پروائی اور اسے معمولی خیال کرنے کی وجہ سے عذاب کی وعید ہے تو معلوم ہوا کہ جو شخص پیشاب کو اس کے مخرج میں چھوڑ دے گا اسے نہ دھوئے گا، وہ بھی مستحق عذاب ہوگا۔ صحیح بخاری کے علاوہ دوسری روایات میں لَا يَسْتَبْرِئُ کے الفاظ ہیں، یعنی پیشاب کے بعد کوئی قطرہ آنے والا ہو تو اسے نکال دینے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لیے ضروری ہے کہ استنجا کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ پیشاب کی نالی میں کوئی قطرہ باقی نہ رہے۔ اگر اس میں بے پروائی کی اور وضو کے بعد پیشاب کا قطرہ برآمد ہوا تو وضو ساقط ہو کر نماز بھی صحیح نہ ہوگی۔[2] آج کل چونکہ مثانے کی کمزوری کے متعلق عام شکایت ہے، اس لیے استنجا کرتے وقت تحریک ونتر (جھاڑنے) کے ذریعے سے پیشاب گاہ کو بالکل خالی کر لینا چاہیے۔ ④ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عذاب قبر کو پیشاب سے پرہیز نہ کرنے اور چغلی کرنے سے گہرا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان دونوں کے درمیان مناسبت کی توضیح کی ہے کہ برزخ مقدمۂ آخرت ہے اور قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق اللہ میں سے نماز کا فیصلہ کیا جائے گا اور نماز بھی وہ قبول ہوگی جو حدث وخبث سے طہارت پر مبنی ہوگی اور حقوق العباد میں سے قتل و خون کے فیصلے سب سے پہلے ہوں گے اور قتل وخون کا بڑا سرچشمہ غیبت اور چغل خوری ہے۔ جب ایک کی بات دوسرے تک فساد وشر انگیزی کی نیت سے پہنچائی جائے گی تو اس سے جذبات مشتعل ہوں گے اور قتل وخون ناحق تک نوبت پہنچ جائے گی۔[3]

⑤ اصلاحی صاحب نے اس روایت کے متعلق بھی اپنے اندیشہ ہائے دور دراز کا اظہار کیا ہے اور ان کے پیش نظر اسے محل نظر قرار دیا ہے۔ اس روایت میں حضرت امام اعمش کا نام آیا ہے۔ ان کے متعلق امام تدبر کا تبصرہ سنیے: ''اعمش کے متعلق رجال کے ماہرین کہتے ہیں کہ وہ شیعیت کے لیے متہم تھے۔ یہ بات ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح زہری روایات میں ملاوٹ کر دیتے ہیں اسی طریقے سے اعمش نے یہاں یہ کیا ہے۔''[4] رجال کے ماہرین میں سے یحییٰ القطان کا نام سرفہرست ہے۔ امام اعمش کے متعلق یحییٰ القطان فرماتے ہیں کہ یہ نہایت عبادت گزار اور اسلام کی ایک علامت تھے۔ حضرت ابوبکر بن عیاش انھیں سید المحدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔[5]

(٥٧) بَابُ تَرْكِ النَّبِيِّ ﷺ وَالنَّاسِ الْأَعْرَابِيَّ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ بَوْلِهِ فِي الْمَسْجِدِ

باب:57- نبی ﷺ اور صحابۂ کرام نے دیہاتی کو کچھ نہ کہا یہاں تک کہ وہ مسجد میں پیشاب سے فارغ ہو گیا

٢١٩ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ:

[219] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے

---

1 فتح الباري:420/1. 2 شرح ابن بطال:325/2. 3 فتح الباري:579/10. 4 تدبر حديث:310/1. 5 تهذيب الكمال في اسماء الرجال:114,113/8.

حَدَّثَنَا هَمَّامٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا إِسْحَاقُ عَنْ أَنَسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى أَعْرَابِيًّا يَبُولُ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ: «دَعُوهُ»، حَتَّى إِذَا فَرَغَ، دَعَا بِمَاءٍ فَصَبَّهُ عَلَيْهِ. [انظر: ٢٢١، ٦٠٢٥]

ایک دیہاتی کو دیکھا جو مسجد میں پیشاب کر رہا تھا، آپ نے فرمایا: ''اسے کچھ نہ کہو۔'' تا آنکہ جب وہ پیشاب سے فارغ ہوگیا تو آپ نے پانی منگوایا اور اسے پیشاب پر بہا دیا۔

فوائد و مسائل: ① انسانی پیشاب کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے تین ابواب میں یہ بتایا ہے کہ اس کا معاملہ بہت اہم اور سنگین ہے۔ اس میں معمولی سی بے احتیاطی سے عذاب قبر کا اندیشہ ہے۔ ایک طرف اس قدر اہمیت کا بیان، جبکہ دوسری طرف اس کے برعکس ایک اور صورت سامنے آتی ہے کہ ایک اعرابی آیا، مسجد نبوی میں نماز ادا کی اور مسجد ہی کے کونے میں پیشاب کرنے لگا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کا نوٹس لینا چاہتے تھے لیکن آپ نے انھیں منع فرما دیا۔ اس صورت حال سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشاب کا معاملہ اتنا اہم نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذکورہ روایت کے پیش نظر یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ معاملہ سنگین نہیں بلکہ اس مقام پر ایک اور اصول کے تحت تخفیف کی گئی ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب انسان دو مصیبتوں میں گھر جائے تو اسے آسان مصیبت اختیار کر لینی چاہیے۔ اس مقام پر دو مصیبتیں یہ تھیں: ایک مسجد کی تلویث (آلودگی وگندگی) دوسرے، اعرابی کی بیماری کا اندیشہ۔ دیہاتی نے تو پیشاب شروع کر دیا تھا، اب فرش کی حفاظت تو ناممکن تھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، البتہ اس کی تلافی ممکن تھی لیکن اگر اعرابی کو پکڑا جاتا تو اس کے بھاگنے سے معاملہ مزید خراب ہو جاتا، اس کی بیماری بلکہ جان کو بھی خطرہ تھا، اس لیے ہلکی مصیبت کو اختیار کر لیا گیا کہ وہ اطمینان سے پیشاب کر لے، بعد میں آپ نے تین کام کیے: ○ پانی کا ایک ڈول منگوایا اور اسے اعرابی کے پیشاب پر بہا دیا گیا۔ ○ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نصیحت فرمائی کہ ہمارا کام سختی کرنا نہیں بلکہ لطف و مہربانی سے پیش آنا ہے۔[1] ○ اعرابی کو نرمی سے سمجھایا کہ مسجدیں نماز، اللہ کے ذکر اور تلاوت قرآن کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں، گندگی پھیلانے سے ان کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس دیہاتی کو پیشاب سے اس لیے نہیں روکا گیا کہ وہ برائی کا آغاز کر چکا تھا جس کو روکنے سے اس میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اگر اسے روکا جاتا تو دو کاموں میں سے ایک ضرور ہوتا: اگر وہ مارے خوف کے پیشاب روک لیتا تو اس سے ضرر اور بیماری کا اندیشہ تھا۔ اگر وہ پیشاب نہ روکتا اور ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتا تو مسجد کے بہت سے حصے اس سے متاثر ہوتے۔ مزید برآں اس کے کپڑے بھی پلید ہو جاتے۔[3] ② اس حدیث سے بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں: ○ مساجد کو نجاست اور پلیدی سے محفوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ ○ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جلدی کرنی چاہیے۔ ○ دو برائیوں میں سے بڑی برائی کو دور کرنے کے لیے ایک چھوٹی برائی کا ارتکاب جائز ہے۔ ○ جاہل لوگوں سے نرمی، سہولت اور تالیف قلوب کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ ○ اگر کوئی مانع نہ ہو تو ازالۂ مفاسد میں جلدی کرنی چاہیے۔ ③ امت کا اجتماعی مزاج لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے، لہٰذا ہمیں اس کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔ معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے دوسروں کو دین اسلام سے خارج قرار دینا، لوگوں میں دینی معاملات سے متعلق بے زاری پیدا کرنا ہے، اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے جسے مٹانے کے لیے ہمیں پابند کیا گیا ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] صحیح البخاري، الوضوء، حدیث: 220. [2] صحیح مسلم، الطهارة، حدیث: 661 (285). [3] فتح الباري: 421/1.

(٥٨) بَابُ صَبِّ الْمَاءِ عَلَى الْبَوْلِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 58- مسجد میں کیے ہوئے پیشاب پر پانی بہانا

٢٢٠ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ: أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: قَامَ أَعْرَابِيٌّ، فَبَالَ فِي الْمَسْجِدِ، فَتَنَاوَلَهُ النَّاسُ، فَقَالَ لَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ: «دَعُوهُ وَهَرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجْلًا مِّنْ مَّاءٍ، أَوْ ذَنُوبًا مِّنْ مَّاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ». [انظر: ٦١٢٨]

[220] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دیہاتی کھڑا ہوا اور اس نے مسجد ہی میں پیشاب کر دیا۔ لوگوں نے اسے روکنا چاہا تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر پانی سے بھرا ہوا ایک ڈول بہا دو کیونکہ تم لوگ آسانی پیدا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، تمھیں سختی کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔''

فائدہ: امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ پیشاب کی نجاست میں مسجد اور غیر مسجد کا فرق نہیں، جس طرح غیر مسجد کا فرش پیشاب سے ناپاک ہو جاتا ہے، اسی طرح مسجد کا فرش بھی پیشاب کرنے سے نجاست آلود ہو جائے گا، جیسے باہر کی زمین پانی بہا دینے سے پاک ہو جاتی ہے، اسی طرح مسجد کی زمین پر بھی پانی بہا دینا طہارت کے لیے کافی ہے، شاید کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ مسجد عبادت کی بنا پر ایک خاص شرف کی حامل ہے، اس لیے اس کی طہارت کے لیے کوئی خاص طریقہ ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے واضح فرما دیا کہ بلاشبہ مساجد یقیناً ایک خاص شرف کی حامل ہیں لیکن ناپاک ہونے کی صورت میں ان کی طہارت کا طریقہ وہی ہے جو عام زمینوں کا ہے۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ پیشاب پر پانی بہانے سے تو وہ مزید پھیل جائے گا اور مسجد کی ناپاکی میں مزید اضافہ ہوگا۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب اس پیشاب پر پانی بہایا جائے گا تو وہ مغلوب ہو کر جاری پانی کے حکم میں ہو جائے گا، اس طرح وہ جگہ پاک ہو جائے گی۔ اس حدیث پر امام نووی نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ زمین جب ناپاک ہو جائے تو اس پر پانی بہا دینا کافی ہے، اسے کھودنے کی ضرورت نہیں۔ ''یُسر اور تیسیر'' کا تقاضا بھی یہی ہے کہ زمین کی طہارت کے لیے طریقۂ نبوی پر اکتفا کیا جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ زمین کھودنے کے متعلق جن احادیث کا سہارا لیا جاتا ہے، وہ صحیح نہیں اور کچھ مرسل روایات ہیں جو قابل استدلال نہیں۔[1] واللہ اعلم.

٢٢١ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ ابْنَ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. [راجع: ٢١٩].

[221] ہمیں عبدان نے بیان کیا ہے، ان کو عبداللہ نے، ان کو یحییٰ بن سعید نے بتلایا۔ انھوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ سے بیان کرتے ہوئے سنا۔

1 فتح الباري: 424/1.

بَابٌ: يُهْرِيقُ الْمَاءَ عَلَى الْبَوْلِ

باب......: پیشاب پر پانی بہانا

وَحَدَّثَنَا خَالِدٌ قَالَ: وَحَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَبَالَ فِي طَائِفَةِ الْمَسْجِدِ، فَزَجَرَهُ النَّاسُ، فَنَهَاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ فَلَمَّا قَضَى بَوْلَهُ، أَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِذَنُوبٍ مِّنْ مَّاءٍ فَهُرِيقَ عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے اسے ڈانٹا تو نبی ﷺ نے انھیں روک دیا۔ جب وہ پیشاب سے فارغ ہوا تو نبی ﷺ نے پانی کے ایک ڈول کا حکم دیا، چنانچہ وہ ڈول اس کے پیشاب پر بہا دیا گیا۔

فوائد و مسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تراجم ابواب بخاری میں لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کی غرض طہارتِ زمین کا طریقہ بتانا ہے کہ وہ مطلقاً پانی بہا دینے سے حاصل ہوگی۔ اس میں نقل تراب (مٹی اٹھانے) یا حفر مسجد (مسجد کے کھودنے) کی ضرورت نہیں جیسا کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف ہے۔ یا آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر زمین نرم نہ ہو تو پانی بہا دینا اس کی طہارت کے لیے کافی ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کا مسلک پوری طرح متعین نہیں ہو سکا کہ وہ حنفیہ کے موافق ہے یا شافعیہ کے۔ واضح رہے کہ امام بخاری کا مسلک کتاب و سنت کا اتباع ہے۔ انھیں نہ تو کسی کی موافقت کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی مخالفت ہی سے انھیں کوئی غرض ہے۔ امام بخاری کا مسلک وہ ٹھوس اور خاموش تراجم ہیں جو انھوں نے اپنی صحیح میں قائم کیے ہیں، پھر ان کے ثبوت کے لیے ناقابل تردید صحیح احادیث ہیں۔ ② جس اعرابی نے مسجد کے کونے میں پیشاب کیا تھا اس کا نام کیا تھا؟ وہ یمانی تھا یا تمیمی؟ اس کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذوالخویصرہ تمیمی تھا جس کا نام حرقوص بن زہیر ہے اور جو بعد میں خوارج کا سرغنہ ثابت ہوا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اقرع بن حابس یا عیینہ بن حصن تھا۔“ والعلم عنداللہ۔[1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ جب وہ اعرابی آیا تو اس نے مسجد میں نماز ادا کی، پھر دعا کرنے لگا: ”اے اللہ! تو صرف مجھ پر اور محمد (ﷺ) پر رحم کر اور رحم کرنے میں ہمارے علاوہ کسی اور کو شامل نہ کر۔“ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: ”تو نے اللہ کی رحمت کو تنگ کر دیا ہے۔“ پھر وہ اٹھا اور مسجد کے کونے میں پیشاب کرنے لگا۔[2]

(٥٩) بَابُ بَوْلِ الصِّبْيَانِ

باب:59- بچوں کا پیشاب

٢٢٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ

[222] حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا،

① فتح الباري:1/422. ② جامع الترمذي، الطهارة، حديث:147.

عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ، أَنَّهَا قَالَتْ: أُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِصَبِيٍّ فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهِ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَأَتْبَعَهُ إِيَّاهُ. [انظر: ٥٤٦٨، ٦٠٠٢، ٦٣٥٥]

اس نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا تو آپ نے پانی منگوایا اور اس پر بہا دیا۔

٢٢٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُتْبَةَ، عَنْ أُمِّ قَيْسٍ بِنْتِ مِحْصَنٍ: أَنَّهَا أَتَتْ بِابْنٍ لَهَا صَغِيرٍ لَمْ يَأْكُلِ الطَّعَامَ، إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَجْلَسَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي حِجْرِهِ، فَبَالَ عَلٰى ثَوْبِهِ، فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ، وَلَمْ يَغْسِلْهُ. [انظر: ٥٦٩٣]

[223] حضرت ام قیس بنت محصن ؓ سے روایت ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنا چھوٹا بچہ لے کر آئیں جو ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا تو اس نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا۔ آپ نے پانی منگوا کر اس پر چھڑک دیا لیکن اسے دھویا نہیں۔

فوائد ومسائل: ① ان احادیث میں بچوں کے پیشاب کا حکم بیان ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پیشاب بچے کا ہو یا بچی کا دونوں ہی ناپاک ہیں، البتہ حالات وظروف کے پیش نظر بچے کے پیشاب کے متعلق تخفیف ہے۔ بچہ اگر پیشاب کر دے تو اس پر پانی چھڑک دینا کافی ہے، البتہ بچی کے پیشاب کو دھونا ہوگا جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث میں اس کی صراحت منقول ہے: * بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکا جائے اور بچی کے پیشاب کو دھویا جائے۔[1] لیکن بچے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ دودھ کے علاوہ اور کوئی غذا نہ کھاتا ہو۔ * حضرت لبابہ بنت حارث ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچی کا پیشاب دھویا جائے اور بچے کے پیشاب پر پانی چھڑک دیا جائے۔''[2] * حضرت ابو السمح کی روایت میں بچے کے پیشاب پر رش کرنے کے الفاظ ہیں۔[3] واضح رہے کہ نضح کا استعمال جب کپڑے کے ساتھ ہو تو اس سے مراد تھوڑا تھوڑا پانی بہانا ہوتا ہے جسے رش (چھڑکنا) بھی کہا جاتا ہے۔ ② لڑکے کے پیشاب کے لیے طریقۂ تطہیر میں تخفیف کیوں رکھی گئی ہے؟ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لڑکی کے مقابلے میں لڑکے کے ساتھ تعلق خاطر زیادہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ لڑکے کو اٹھانے والے والدین کے علاوہ دیگر خویش واقارب اور دوست واحباب بہت ہوتے ہیں جبکہ لڑکی کو اٹھانے والے اس کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں، جب کسی معاملے میں ابتلا زیادہ ہو تو شریعت اس پر تخفیف کر دیتی ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس توجیہ کو قوی قرار دیا ہے۔[4] بعض حضرات نے لکھا ہے کہ لڑکے کے مزاج میں حرارت (گرمی) غالب ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں لطافت ہوتی ہے، اس لطافت کی وجہ سے صرف پانی کا بہا دینا کافی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے پیشاب کے اجزاء کپڑے سے نکل جائیں گے لیکن لڑکی کے مزاج میں برودت (ٹھنڈک) کی وجہ سے کثافت ہوتی ہے، اس بنا پر اس کے پیشاب میں بھی کثافت کے اثرات ہوتے ہیں جو صرف پانی کے بہاؤ سے زائل نہیں ہوتے جب تک انھیں اچھی طرح دھویا نہ جائے۔ بعض حضرات لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں فرق نہیں کرتے

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:377. 2 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:375. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:376.
4 فتح الباري:427/1.

بلکہ کہتے ہیں کہ دونوں کی طہارت دھونے سے ہوگی، حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت بایں الفاظ مروی ہے کہ آپ نے پیشاب پر پانی بہا دیا اور اسے دھویا نہیں۔[1] اور ام قیس والی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پانی چھڑکنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا۔[2] بلکہ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ایک ہی دفعہ اس پر پانی بہایا۔[3] لیکن اصلاحی صاحب کے تدبر کا نتیجہ بایں الفاظ ظاہر ہوتا ہے: ''یہ بات کہ لڑکے اور لڑکیوں کے پیشاب میں کوئی فرق ہے تو اس کی کوئی علت نہیں۔''[4] ہم نے وضاحت کی ہے کہ یہ رخصت اس وقت تک کے لیے ہے جب بچہ دودھ کے علاوہ اور کوئی چیز نہ کھاتا ہو لیکن اصلاحی صاحب کی سنیے، فرماتے ہیں: ''یہ بات کہ بچہ ابھی کھانا نہیں کھاتا تھا کس کی وضاحت ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات آنحضرت ﷺ نے نہیں فرمائی۔ یہ بات بچے کی ماں نے کہی یا ابن شہاب نے گھسائی ہے اور اپنا فقہی مذہب روایت میں ڈال دیا ہے۔''[5] ہم عرض کریں گے کہ اس کج بحثی کی یہاں ضرورت ہی کیا ہے کہ کھانا نہ کھانے کی وضاحت کس نے کی ہے؟ اصل مسئلہ تو حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ شیر خوار بچے کے پیشاب پر پانی کا بہا دینا یا چھڑک دینا کافی ہے۔ اس کی بابت اصلاحی صاحب کا ''تدبر'' خاموش ہے، حالانکہ اصل ضرورت تو مسئلے کی نوعیت کو واضح کرنا ہے، وہ ان کے ''تدبر'' میں کہیں بھی نہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان صاحب کا مقصد احادیث کی تشریح و توضیح نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان میں شکوک و شبہات پیدا کر کے یا امام زہری کے خلاف زہر افشانی کر کے انکار حدیث کا راستہ ہموار کیا جائے۔ هداهم الله تعالىٰ.

(٦٠) بَابُ الْبَوْلِ قَائِمًا وَّقَاعِدًا

باب: 60- کھڑے ہوئے اور بیٹھ کر پیشاب کرنا

٢٢٤ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: أَتَى النَّبِيُّ ﷺ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا، ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَجِئْتُهُ بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ. [انظر: ٢٢٥، ٢٢٦، ٢٤٧١]

[224] حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ کا ایک قوم کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سے گزر ہوا تو وہاں آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا، پھر آپ نے پانی مانگا تو میں پانی لے آیا، چنانچہ آپ نے وضو فرمایا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان سے خاص حالات و ظروف کے پیش نظر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ بیٹھ کر پیشاب کرنے کا ذکر اس لیے کر دیا ہے تاکہ دوسری صورت بھی پیش نظر رہے۔ بلاشبہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز ہے بشرطیکہ پیشاب کرنے سے معمولی چھینٹے بھی کپڑوں اور بدن پر نہ آئیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں دونوں صورتوں کا ذکر کیا ہے لیکن احادیث صرف پہلی صورت سے متعلق بیان کی ہیں۔ شارحین نے اس کی متعدد توجیہات ذکر کی ہیں: ○ ابن بطال نے لکھا ہے کہ جب احادیث سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی اجازت ثابت ہوئی تو بیٹھ کر

---

① صحيح مسلم، الطهارة، حديث:662(286). ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث:665(287). ③ صحيح مسلم، الطهارة، حديث:663(286). ④ تدبر حديث:305/1. ⑤ تدبر حديث:315/1.

پیشاب کرنے کی اجازت بالاولیٰ ثابت ہوگئی، لہٰذا اس سے متعلقہ احادیث ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔[1] ○ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ بیٹھ کر پیشاب کرنا مشہور و متعارف تھا اور بیشتر لوگوں کا عمل بھی اس پر تھا، اس لیے بیٹھ کر پیشاب کرنے کی احادیث کا حوالہ نہیں دیا۔[2] ○ امام بخاری رحمہ اللہ کے اصول میں سے ہے کہ جب کوئی روایت ان کی شرط کے مطابق نہ ہو تو اس کی طرف عنوان میں اشارہ کر دیتے ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھ کر پیشاب کیا تو کہنے والوں نے کہا: دیکھو آپ عورتوں کی طرح بیٹھ کر پیشاب کرتے ہیں۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے نقل فرمایا ہے۔[4] ○ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک امام موصوف کی غرض عقد باب سے صرف یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے جواز کو بھی ثابت کیا جائے، گویا وہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے جواز کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک اس کا جواز صرف قعود (بیٹھنے) کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کسی قسم کی نہی ثابت نہیں۔ اگر چھینٹے وغیرہ پڑنے کا امکان نہ ہو تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں۔[5] البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: میں ایک دفعہ کھڑے ہو کر پیشاب کر رہا تھا، مجھے رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: ''اے عمر! کھڑے ہو کر پیشاب نہ کیا کرو۔'' اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔[6] لیکن یہ روایت عبدالکریم بن ابی المخارق کی وجہ سے سخت ضعیف ہے جس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔[7] علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[8] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت بایں الفاظ ہے کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔[9] بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف بھی مروی ہے، چنانچہ زید بن وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود حضرت عمر کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا ہے۔[10] مصنف ابن ابی شیبہ اور دیگر کتب حدیث میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا منقول ہے۔[11] جن حضرات نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کو مکروہ تحریمی یا تنزیہی لکھا ہے ان حقائق کے پیش نظر ان کا موقف صحیح نہیں۔ ③ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث میں ہے، انھوں نے فرمایا کہ جو شخص تمھیں رسول اللہ ﷺ کے متعلق بتائے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا اس کی تصدیق نہ کرو۔ آپ تو بیٹھ کر پیشاب کرتے تھے۔[12] بظاہر یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی پیش کردہ حدیث کے معارض ہے۔ اس کے متعلق شارحین کا موقف حسب ذیل ہے: ○ محدث ابو عوانہ اور ابن شاہین نے حدیث عائشہ کے پیش نظر حدیث حذیفہ کو منسوخ ٹھہرایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات اپنے علم کے اعتبار سے کہی ہے، چنانچہ گھر میں رسول اللہ ﷺ کا عمل بیٹھ کر پیشاب کرنے ہی کا ہے لیکن گھر کے علاوہ باہر کے عمل سے آپ مطلع نہ ہو سکیں۔ لیکن حضرت حذیفہ کبار صحابہ میں سے ہیں، لہٰذا گھر سے باہر ان کا مشاہدہ ناقابل تردید ہے۔ امام نسائی نے اپنی سنن میں اس موقف کے مطابق عنوان بندی کی ہے، چنانچہ انھوں نے ایک

---

1 شرح ابن بطال:334/1. 2 عمدة القاري:620/2. 3 سنن النسائي، الطهارة، حديث:30. 4 فتح الباري:427/1. ⑤ فتح الباري:430/1. 6 ابن ماجه، الطهارة، حديث:308. 7 جامع الترمذي، الطهارة، حديث:12. 8 سلسلة الأحاديث الضعيفة، حديث:934. 9 المصنف لابن أبي شيبة:148/1. 10 المصنف لابن أبي شيبة:147/1. 11 المصنف لابن أبي شيبة:147/1. 12 سنن النسائي، الطهارة، حديث:29.

عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:[الرخصة في البول في الصحراء قائما] ''آبادی سے باہر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا جواز'' اس کے تحت وہ حدیث حذیفہ لائے ہیں۔[1] دوسرا باب ان الفاظ سے قائم کرتے ہیں:[البول في البيت جالسًا] ''گھر میں بیٹھ کر پیشاب کرنا'' اس کے تحت حدیث عائشہ بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر پیشاب کرتے تھے۔[2] دوسرا جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ حضرت عائشہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق عام عادت کی نشاندہی فرمائی ہے، مخصوص حالات میں اگر اس کے برعکس ہوا ہے تو اس کے منافی نہیں۔ مخصوص حالات حسب ذیل ہو سکتے ہیں: * اس کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر بیٹھنے کے لیے جگہ نہ تھی چونکہ وہ مخروطی شکل کا تھا، پیشاب کے آپ کی طرف لوٹ آنے کا اندیشہ تھا، اس بنا پر آپ نے کھڑے کھڑے پیشاب سے فراغت حاصل کی۔ * عرب کے نزدیک کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، درد کمر کا علاج تھا۔ ممکن ہے کہ آپ کو بھی کوئی شکایت ہو اور آپ نے بطور علاج ایسا عمل کیا ہو۔ اس سلسلے میں کچھ ضعیف روایات مروی ہیں۔[3] لیکن اس سلسلے میں بے تکلف بات یہ ہے کہ بیان جواز کے لیے آپ نے یہ عمل کیا ہے۔ بوقت ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں چنداں حرج نہیں بشرطیکہ اس کے چھینٹوں سے جسم یا کپڑے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ واللہ أعلم.

(٦١) بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ صَاحِبِهِ وَالتَّسَتُّرِ بِالْحَائِطِ

باب:61- اپنے ساتھی کے قریب اور دیوار کی آڑ میں پیشاب کرنا

٢٢٥ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: رَأَيْتُنِي أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ نَتَمَاشَى، فَأَتَى سُبَاطَةَ قَوْمٍ خَلْفَ حَائِطٍ فَقَامَ كَمَا يَقُومُ أَحَدُكُمْ فَبَالَ، فَانْتَبَذْتُ مِنْهُ، فَأَشَارَ إِلَيَّ فَجِئْتُهُ فَقُمْتُ عِنْدَ عَقِبِهِ حَتَّى فَرَغَ. [راجع: ٢٢٤]

[225] حضرت حذیفہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں خود کو اور نبی ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ ہم جا رہے ہیں۔ آپ کسی قوم کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر (گھورے) پر پہنچے جو ایک دیوار کی پشت پر تھا اور آپ وہاں اس طرح کھڑے ہوئے جس طرح تم میں سے کوئی شخص کھڑا ہوتا ہے، پھر پیشاب کیا۔ میں آپ کے قریب سے ہٹ گیا۔ آپ نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں حاضر ہوا اور آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا تا آنکہ آپ پیشاب سے فارغ ہو گئے۔

فوائد و مسائل: ① حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قضائے حاجت کے لیے باہر جاتے تو بہت دور تشریف لے جاتے اور آپ کو کوئی دیکھ نہ سکتا تھا۔[4] براز (پاخانے) کے لیے چونکہ دو طرفہ پردے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے آپ دور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ پیشاب میں ایک طرف آڑ کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا براز کی طرح دور جانے کے اہتمام کی

① سنن النسائي، الطهارة، حديث:26. ② سنن النسائي، الطهارة، حديث:29. ③ المستدرك للحاكم:241/4، و السنن الكبرٰى للبيهقي:101/1. ④ سنن أبي داود، الطهارة، حديث:2,1.

ضرورت نہیں، وہ لوگوں کی موجودگی میں بلکہ کسی کو پردے کی غرض سے پاس کھڑا کر کے بھی یہ حاجت پوری کی جاسکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی مقصد کے لیے یہ عنوان قائم کیا ہے اور حدیث حذیفہ کو دوبارہ پیش کیا ہے۔ عرب کے ہاں بول و براز کے وقت بے حجابی عام تھی، اس کا تعلق اسلامی تہذیب سے نہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے اسلامی تہذیب کو بایں الفاظ واضح فرمایا ہے: ''دو شخص اس طرح قضائے حاجت کے لیے نہ نکلیں کہ اس وقت ایک دوسرے کے سامنے اپنا ستر کھولیں اور آپس میں باتیں کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنے سے ناراض ہوتا ہے۔''[1] ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حضرت حذیفہ کو اپنے قریب بلانا اشارے سے تھا، زبان سے بول کر نہیں بلایا تھا۔ اور روایت بخاری کے پیش نظر صحیح مسلم کے الفاظ کو اشارۂ غیر لفظیہ پر محمول کریں گے، لہٰذا اس حدیث سے حالتِ بول میں جواز کلام پر استدلال درست نہیں ہے۔[2] رسول اللہ ﷺ ایسے وقت میں سلام کا جواب بھی نہیں دیتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ آپ پیشاب کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آپ کو سلام کہا تو آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔[3]

(٦٢) بَابُ الْبَوْلِ عِنْدَ سُبَاطَةِ قَوْمٍ

باب:62- کسی قوم کے گھورے پر پیشاب کرنا

٢٢٦ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: كَانَ أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ يُشَدِّدُ فِي الْبَوْلِ وَيَقُولُ: إِنَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَ إِذَا أَصَابَ ثَوْبَ أَحَدِهِمْ قَرَضَهُ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: لَيْتَهُ أَمْسَكَ، أَتَى رَسُولُ اللهِ ﷺ سُبَاطَةَ قَوْمٍ فَبَالَ قَائِمًا. [راجع: ٢٢٤]

[226] حضرت ابووائل سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پیشاب کے معاملے میں بہت تشدد سے کام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ بنی اسرائیل میں اگر کسی کے کپڑے کو پیشاب لگ جاتا تو وہ متاثرہ کپڑے کو کاٹ دیتا تھا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کاش وہ ایسا (تشدد) نہ کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کسی قوم کے گھورے پر تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔

فوائد و مسائل: ① شارحین نے اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کی متعدد اغراض ذکر کی ہیں: ○ شاہ ولی اللہ تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر (گھورے) اگرچہ کسی دوسرے کی ملکیت ہوتے ہیں لیکن ان پر بول و براز کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں کیونکہ انھیں گندگی جمع کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے، اس لیے پیشاب کرنا اس قسم کا تصرف نہیں جس سے مالک ناراض ہو۔ ○ اس عنوان سے گندگی کے مقامات پر پیشاب کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ ایسی جگہوں پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا چاہیے، بیٹھ کر پیشاب کرنے سے کپڑوں اور بدن کی آلودگی کا اندیشہ ہے۔ ② حضرت ابوموسیٰ اشعری تقویٰ و طہارت کی بنا پر پیشاب کے معاملے میں بہت متشدد تھے۔ وہ اپنے ساتھ شیشے کی بوتل رکھتے، اس میں پیشاب کر کے اسے زمین پر بہا دیتے۔ ابن منذر نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کسی شخص کو کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھا تو

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:15. 2 فتح الباري:429/1. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:16.

فرمایا: تمھیں کھڑے ہوکرنہیں بلکہ بیٹھ کر پیشاب کرنا چاہیے تھا۔ بنی اسرائیل کا عمل یہ تھا کہ اگر کسی شخص کے کپڑے کونجاست لگ جاتی تو وہ اسے کاٹ ڈالتا تھا، لہٰذا ہمیں بھی پیشاب کے سلسلے میں احتیاط کرنی چاہیے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے وضاحت فرمائی کہ پیشاب کے معاملے میں اتنے تشدد کی ضرورت نہیں کیونکہ دین اسلام کی بنیاد یُسر وسہولت پر ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے (گھورے پر) کھڑے ہوکر پیشاب کیا اور اس طرح پیشاب کرنے میں باریک باریک چھینٹوں کا اندیشہ باقی رہتا ہے لیکن آپ نے اس قسم کے دور از کار احتمالات کی بالکل پروانہیں کی۔ ③ علامہ ابن بطال نے لکھا ہے کہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی روایت ان لوگوں کی دلیل ہے جو پیشاب کے معمولی چھینٹوں کو قابل معافی سمجھتے ہیں کیونکہ کھڑے ہوکر پیشاب کرنے سے سوئی کی نوک کے برابر چھینٹوں کے اڑنے اوران کے کپڑوں پر آنے کا احتمال تو عام طور پر باقی رہتا ہے۔ پھر سوئی کی نوک کے برابر پیشاب کے چھینٹوں کے متعلق اختلاف ہے: امام مالک نے انھیں دھونا مستحب قرار دیا ہے جبکہ امام شافعی اسے واجب کہتے ہیں اور اہل کوفہ نے دوسری نجاستوں کی طرح اس میں بھی سہولت اور رخصت دی ہے۔[1]

④ اصلاحی صاحب نے تدبر حدیث کی آڑ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو ہدف تنقید بنایا ہے، لکھتے ہیں: ''بنی اسرائیل سے متعلق ابوموسیٰ اشعری کی بات سنی سنائی معلوم ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عرب کے لوگوں کو سابقہ ادیان کے بارے میں جو معلومات حاصل تھیں وہ مدینہ اوراس کے قرب و جوار میں رہنے والے اہل کتاب سے سنی ہوئی تھیں۔ وہ صحیفوں سے براہ راست ناقدانہ واقفیت نہ رکھتے تھے۔''[2] حالانکہ یہود کے ہاں نجاسات کے معاملے میں بڑا تشدد تھا۔ قرآن کریم نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ ''اوران لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔''[3] اس بوجھ اور طوق کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ان یہودیوں کے ہاں جس کپڑے کو نجاست لگ جاتی اس کا قطع کرنا ضروری تھا جسے شریعت اسلامیہ نے صرف دھونے کا حکم دیا ہے۔

(٦٣) بَابُ غَسْلِ الدَّمِ

باب: 63- خون کا دھونا

٢٢٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ هِشَامٍ قَالَ: حَدَّثَتْنِي فَاطِمَةُ عَنْ أَسْمَاءَ قَالَتْ: جَاءَتِ امْرَأَةٌ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ: أَرَأَيْتَ إِحْدَانَا تَحِيضُ فِي الثَّوْبِ كَيْفَ تَصْنَعُ؟ قَالَ: «تَحُتُّهُ ثُمَّ تَقْرُصُهُ بِالْمَاءِ وَتَنْضَحُهُ وَتُصَلِّي فِيهِ». [انظر: ٣٠٧]

[227] حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا: بتایئے ہم میں سے اگر کسی عورت کو حیض آئے اور کپڑے کو لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا: ''اسے کھرچ ڈالے، پھر پانی ڈال کر رگڑے اور دھو ڈالے، پھر اس میں نماز پڑھ لے۔''

فوائد و مسائل: ① پہلے بچے کے پیشاب کے متعلق بیان تھا کہ اگر وہ دودھ پیتا ہے تو اس کے پیشاب کو دھونے کی

① شرح ابن بطال: 337/1. ② تدبر حدیث: 318/1. ③ الأعراف 157:7.

ضرورت نہیں، صرف اس پر چھینٹے مار لینا ہی کافی ہے۔ اب خون کے متعلق حکم بیان ہوا کہ اسے دھونا ہوگا اس کے بغیر طہارت حاصل نہیں ہوگی۔ اس پر صرف چھینٹے مارنے سے کام نہیں چلے گا۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے والی خود حضرت اسماء ؓ ہیں جیسا کہ ایک روایت میں اس کی صراحت ہے۔ اگرچہ امام نووی ؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، تاہم روایت صحیح ہے اور بعض اوقات راویٔ حدیث بیان کرتے وقت اپنا نام ظاہر نہیں کرتا، ایسا کرنے سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[1] ② حافظ ابن حجر ؒ نے علامہ خطابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر صرف خالص پانی ہی سے نجاسات کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ پانی کے علاوہ دیگر مائع اور سیال چیزوں سے طہارت حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ خون حیض کی طرح دیگر نجاستوں کا بھی یہی حکم ہے جیسا کہ جمہور کا موقف ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ پانی کے علاوہ بھی ہر سیال چیز سے نجاست کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ ان کی دلیل حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک حدیث ہے، فرماتی ہیں کہ ہمارے ہاں کپڑوں کی فراوانی نہ تھی، صرف ایک ہی جوڑا ہوتا۔ اگر اسے خون حیض لگ جاتا تو اس جگہ کو تھوک سے تر کرکے ناخنوں سے رگڑ دیا جاتا۔[2] لیکن یہ حدیث ان حضرات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ پانی کے بغیر بھی طہارت حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں ہے کہ خون کے اثرات کو تھوک سے زائل کیا جاتا، لیکن نماز کے وقت اسے دھو کر پاک کیا جاتا، پھر اس میں نماز ادا کی جاتی جیسا کہ اس کی وضاحت حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک روایت میں ہے۔[3] اگرچہ حافظ ابن حجر ؒ نے دیگر احتمالات کا بھی ذکر کیا ہے لیکن وہ سب امام بخاری ؒ کے قائم کردہ عنوان کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، اس لیے ان کے کہنے کے مطابق یہی تاویل زیادہ قوی ہے۔[4] ③ دور حاضر میں جنسی لٹریچر عام ہو رہا ہے۔ مغربی تہذیب و ثقافت کو مسلمانوں پر جبراً مسلط کیا جارہا ہے۔ ایسے حالات میں اس قسم کی احادیث کو عام کرنے کی ضرورت ہے جن سے صنف نازک کے دین، دنیا اور جسم و روح کو طہارت ملتی ہے۔ ان احادیث میں عورتوں کے پوشیدہ معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور انھیں اسلامی ہدایات دی گئی ہیں۔ انھیں بیان کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ صحابیات اگر ایسے معاملات میں شرم سے کام لیتیں تو عورت کی زندگی کے اہم اور پوشیدہ بے شمار گوشے اسلامی ہدایات سے محروم رہتے۔ ④ علامہ عینی نے اس حدیث کے تحت مندرجہ ذیل فوائد ذکر کیے ہیں: ○ خون (حیض) بالاجماع نجس ہے۔ ○ کسی چیز کو پاک کرنے میں عدد غسل ضروری نہیں، صرف نجاست سے صفائی شرط ہے۔ ○ جن کپڑوں میں حیض آیا ہو، اگر ان پر خون کا نشان نظر نہ آئے تو ان پر پانی ڈالنے کے بعد ان میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔[5]

٢٢٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: جَاءَتْ فَاطِمَةُ ابْنَةُ أَبِي حُبَيْشٍ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي امْرَأَةٌ أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ؟ فَقَالَ

[228] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! میں ایسی عورت ہوں کہ اکثر مستحاضہ رہتی ہوں اور اس کی وجہ سے پاک نہیں ہوسکتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں،

1 فتح الباري:431/1. 2 صحيح البخاري، الحيض، حديث:312. 3 صحيح البخاري، الحيض، حديث:306. 4 فتح الباري: 535/1. 5 عمدة القاري:631/2.

رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا، إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَّلَيْسَ بِحَيْضٍ، فَإِذَا أَقْبَلَتْ حَيْضَتُكِ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ ثُمَّ صَلِّي»، قَالَ: وَقَالَ أَبِي: «ثُمَّ تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ حَتّٰى يَجِيءَ ذٰلِكِ الْوَقْتُ».

نماز مت چھوڑ۔ یہ ایک رگ کا خون ہے، حیض نہیں۔ پھر جب تیرے حیض کا وقت آ جائے تو نماز چھوڑ دے اور جب وقت گزر جائے تو (اپنے بدن اور کپڑوں سے) خون دھو کر نماز ادا کر۔'' ہشام نے کہا: میرے والد (عروہ بن زبیر) نے کہا: (آپ نے فرمایا:) ''پھر ہر نماز کے لیے وضو کر حتی کہ وہی (حیض کا) وقت پھر آ جائے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس مقام پر حیض کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں، صرف خون کو دھونے کے اثبات کے لیے یہ حدیث لائے ہیں کیونکہ مسائل حیض آئندہ کتاب الحیض میں بیان ہوں گے۔ عورتوں کو تین طرح کے خون آتے ہیں: خون حیض، خون استحاضہ اور خون نفاس۔ ان تینوں کے احکام الگ الگ ہیں جو آئندہ بیان ہوں گے۔ اس مقام پر چند گزارشات پیش خدمت ہیں: استحاضہ کا خون رگ پھٹنے سے آتا ہے جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ جب رگوں میں خون زیادہ بھر جاتا ہے تو وہ پھٹ جاتی ہیں جس سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی تین وجوہات بیان فرمائی ہیں، آپ نے فرمایا: ''یہ خون رکضۂ شیطان یا انقطاع رگ یا کسی بیماری کے لاحق ہونے سے آتا ہے۔''[1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استحاضہ کی صورت، انقطاع عرق اور بیماری کی وجہ سے ہوتی ہے، یعنی غیر طبعی خون کبھی فساد مزاج کے سبب اور کبھی امتلائے عروق کی وجہ سے خارج ہوتا ہے، اور کبھی خون استحاضہ کی وجہ رکضۂ شیطان بنتی ہے۔ علماء نے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ شیطان کو موقع ملتا ہے کہ عورت کو التباس میں ڈال دے تاکہ یہ ایک دینی معاملے میں مغالطے کا شکار ہو جائے کہ وہ خود کو نماز کے قابل خیال نہ کرے یا نماز کا اہل تصور کرے۔ لیکن بعض علماء نے مذکورہ تاویل اور مفہوم سے اتفاق نہیں کیا اور رکضۂ شیطان کو اس کے ظاہری معنی ہی پر محمول کیا ہے، یعنی شیطان کے کچوکہ مارنے سے بھی بعض دفعہ استحاضے کا خون جاری ہو جاتا ہے۔ ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جسے بار بار ہوا یا پیشاب آنے کی بیماری ہو، وہ بھی ہر نماز کے لیے تازہ وضو کر کے اسے ادا کرتا رہے کیونکہ مستحاضہ کے لیے ہر نماز کے وقت تازہ وضو کی صراحت حدیث میں موجود ہے۔ اگرچہ امام مسلم نے اس لفظ کے متعلق اپنے تردد کا اظہار کیا ہے اور فرمایا کہ حدیث حماد بن زید میں ایک لفظ کے اضافے کے پیش نظر ہم نے اسے چھوڑ دیا ہے۔[2] امام مسلم کا اشارہ اسی لفظ "توضئي" کی طرف ہے جو کسی قسم کے تردد یا تفرد کے بغیر صحیح ثابت ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ہشام کے حوالے سے روایت کے آخر میں اسے بیان کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی لفظ مذکور کی صحت کا اقرار کیا ہے۔[3] اس لفظ کا تقاضا ہے کہ مستقل عذر والے مرد یا عورت کو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا اور اس نماز سے متعلقہ سنن و نوافل بھی اس وضو سے پڑھے جا سکتے ہیں، نماز ادا کرنے کے بعد وضو خود بخود ختم ہو جائے گا جبکہ احناف اور حنابلہ کا موقف ہے کہ ہر وقتِ نماز کے لیے نیا وضو کرنا ہے اور اس وقت کے اندر جتنے چاہے فرائض و نوافل پڑھ لے، خواہ وہ اس نماز سے غیر متعلق ہی کیوں نہ ہوں، اس دوران میں فوت شدہ نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ مالکی حضرات کے نزدیک یہ وضو اس وقت تک

[1] مسند أحمد: 6/464. [2] صحيح مسلم، الحيض، حديث: 754(333). [3] فتح الباري: 1/433.

برقرار رہے گا جب تک اسے کوئی ناقضِ وضو لاحق نہ ہو۔ یہ مستقل شرعی عذر اس کے لیے ناقضِ وضو نہیں ہوگا۔ بہر حال حدیث کے الفاظ کے پیش نظر ہمارا موقف یہ ہے کہ اس طرح کے مستقل شرعی عذر والے کے لیے ہر نماز نئے وضو سے ادا کرنی ہوگی، باقی تاویلات اس لفظ کے منافی ہیں۔ لیکن اس مقام پر ''تدبر'' کی آڑ میں حدیث میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی مذموم کوشش کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ''امام تدبر'' فرماتے ہیں: ''لیکن فی الواقع اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہر نماز کے لیے وضو کرے جبکہ از روئے شریعت وہ پاک ہے۔ ایک بیماری کی بنیاد پر یہ پابندی کیوں عائد کر دی جائے کہ وہ وضو کے بارے میں دین کی ایک رخصت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی؟ اس معاملہ میں صفائی کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی کوئی خاص اہمیت معلوم نہیں ہوتی۔''[1] بعض حضرات نے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنے کے حکم کو حضرت عروہ کا کلام قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ حضرت عروہ کا فتویٰ ہوتا تو تَتَوَضَّأُ کہا جاتا کہ وہ عورت وضو کرے لیکن صیغۂ خطاب کا استعمال اس امر کی دلیل ہے کہ یہ مرفوع حدیث ہے اور رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔[2] ③ حدیث میں حیض سے متعلق حکم کا دارومدار اس کے اقبال و ادبار پر ہے۔ اس کی علامت کیا ہے اس کے متعلق دو موقف ہیں: ○ شوافع کے نزدیک اس کی تمیز الوان سے ہوتی ہے، یعنی گہرا سرخ رنگ جو سیاہی مائل ہو، وہ حیض کا خون ہے کیونکہ حدیث میں رنگ کو حیض کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حیض کا خون سیاہ رنگ سے پہچانا جاتا ہے۔''[3] اس لیے حیض کا خون اپنے رنگ کی وجہ سے استحاضہ کے خون سے ممتاز ہے اور اس کے آنے جانے سے پتہ چلتا رہے گا کہ حیض کا آغاز اور اختتام کب ہوا۔ ○ احناف کے نزدیک اقبال و ادبار کا اعتبار عورت کی عادت سے ہوگا، یعنی عورت کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایام کب شروع ہوتے اور کب انتہا کو پہنچتے ہیں، یعنی اقبال و ادبار کو اس کی عادت سے پہچانا جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے کہ وہ ان ایام کے شمار پر نظر رکھے جو ہر مہینے اس کے حیض کے لیے مخصوص ہیں۔[4] امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس سلسلے میں ایک روایت بایں الفاظ نقل کی ہے کہ جتنے دن اسے حیض آتا ہے اس کی مقدار نماز چھوڑ دے، یعنی ان دنوں میں نماز نہ پڑھے۔[5] حاصل کلام یہ ہے کہ عورت اگر معتادہ ہے، یعنی اپنی عادت کو پہچانتی ہے تو اقبال و ادبار کا حال حسب عادت ہوگا اور اگر غیر معتادہ یا مُبْدِئَہ ہے تو رنگ وغیرہ سے اس کی پہچان ہوگی۔

نوٹ: اس کے متعلق دیگر مباحث کتاب الحیض میں بیان ہوں گے۔

(٦٤) بَابُ غَسْلِ الْمَنِيِّ وَفَرْكِهِ، وَغَسْلِ مَا يُصِيبُ مِنَ الْمَرْأَةِ

باب:64- منی کا دھونا اور اسے کھرچ ڈالنا، نیز جو رطوبت عورت سے لگ جائے، اس کا دھونا

٢٢٩ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُونٍ الْجَزَرِيُّ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنْتُ

[229] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نبی ﷺ کے کپڑے سے جنابت کے اثرات کو دھو ڈالتی تھی اور آپ انھی کپڑوں میں نماز کے لیے باہر

---

1 تدبر حدیث:320/1. 2 فتح الباري:433/1. 3 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:286. ④ سنن أبي داود، الطهارة، حديث:274. 5 صحيح البخاري، الحيض، حديث:325.

أَغْسِلُ الْجَنَابَةَ مِنْ ثَوْبِ النَّبِيِّ ﷺ فَيَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ وَإِنَّ بُقَعَ الْمَاءِ فِي ثَوْبِهِ. [انظر: ٢٣٠، ٢٣١، ٢٣٢]

تشریف لے جاتے جبکہ پانی کے دھبے آپ کے کپڑے میں باقی ہوتے (نظر آتے) تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں تین چیزیں بیان کی ہیں: منی کا دھونا، منی کا کھرچ دینا اور عورت کی شرمگاہ سے نکلنے والی رطوبت کا دھونا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے پہلے خون، پیشاب اور مذی کے ساتھ لفظ غسل لا کر ان کے ناپاک ہونے پر تنبیہ کی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی منی اور رطوبت فرج کے ساتھ لفظ غسل لا کر ان کے نجس ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ منی کی نجاست سے طہارت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں: اگر آلودہ کپڑا تر ہے تو اسے دھویا جائے۔ اگر منی خشک ہو چکی ہے تو اسے کھرچ دیا جائے۔ بعض روایات میں تر کپڑے سے منی کو تنکے وغیرہ سے دور کر دینے کا ذکر ہے، اس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں تین امور کا ذکر کیا ہے لیکن حدیث میں صرف غسل منی کا حکم ہے باقی دو، یعنی فرک (کھرچنے) اور رطوبت فرج (شرم گاہ کی تری) کا کیا حکم ہے؟ اس کے متعلق کوئی حدیث ذکر نہیں کی۔ اس کے متعلق شارحین بخاری نے مختلف توجیہات ذکر کی ہیں، تاہم ہمارے نزدیک عنوان کے ہر سہ اجزاء حدیث الباب سے ثابت ہیں، البتہ ہر جز کے لیے اس کی دلالت الگ الگ نوعیت کی ہے۔ غسل منی تو عبارت نص سے ثابت ہے اور فرک منی اس طرح ثابت ہے کہ بقائے اثر کا غیر مضر ہونا حدیث الباب سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے اور فرک میں بھی ظاہری اجزاء تو زائل ہو جاتے ہیں، اس کا خفیف سا اثر باقی رہتا ہے جو چنداں نقصان دہ نہیں۔ اور رطوبت فرج کا ذکر حدیث کے الفاظ "أغسل الجنابة" میں ہے کہ جنابت سے مراد عام منی ہے، خواہ مرد کی ہو یا عورت کی، اس کا دھونا متعین ہے۔ اس سے اس کی نجاست ثابت ہوگئی۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرک منی کے متعلق چند احادیث ذکر کی ہیں: ○ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے خشک منی کو اپنے ناخن سے کھرچ دیتی تھیں۔[1] ○ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک مہمان ٹھہرا، اسے رات کو احتلام ہو گیا تو اس نے بستر کی چادر دھو دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اس نے ہمارے کپڑے کو خواہ مخواہ خراب کر دیا ہے، صرف اتنا کافی تھا کہ وہ منی کو کھرچ دیتا۔ میں خود رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے اسے کھرچ دیتی تھی۔[2] ○ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے اذخر کے تنکوں کے ذریعے سے منی کو دور کر دیتی تھیں پھر آپ اس میں نماز پڑھ لیتے۔[3] بعض حضرات کا موقف ہے کہ جن کپڑوں سے منی کو کھرچا جاتا تھا وہ نیند کے کپڑے تھے، ان میں نماز پڑھنا ثابت نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ موقف صحیح نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے منی کو کھرچ ڈالتی تو آپ اس میں نماز ادا کر لیتے۔[4] ان احادیث کے پیش نظر یہ موقف غلط ہے کہ مفروک کپڑوں میں نماز پڑھنا ثابت نہیں۔[5]

---

① صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 674(290). ② جامع الترمذي، الطهارة، حديث: 116. ③ صحيح ابن خزيمة: 149/1.
④ صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 668 (288). ⑤ فتح الباري: 434/1.

٢٣٠ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرٌو عَنْ سُلَيْمَانَ قَالَ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ؛ ح: وَحَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُونٍ عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنِ الْمَنِيِّ يُصِيبُ الثَّوْبَ؟ فَقَالَتْ: كُنْتُ أَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَيَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ وَأَثَرُ الْغَسْلِ فِي ثَوْبِهِ بُقَعُ الْمَاءِ. [راجع: ٢٢٩]

[230] حضرت سلیمان بن یسار سے روایت ہے، انھوں نے حضرت عائشہ ؓ سے سوال کیا: جس کپڑے کو منی لگ جائے تو (کیسے پاک کیا جائے)؟ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں سے منی دھو ڈالتی، پھر آپ نماز کے لیے باہر تشریف لے جاتے اور دھونے کے نشان، یعنی پانی کے دھبے کپڑے پر باقی رہ جاتے۔

فوائد و مسائل: ① ان احادیث کے پیش نظر امام بخاری ؒ کا رجحان نجاستِ منی کی طرف معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ نے ان احادیث پر غسل منی کا عنوان قائم کیا ہے، جیسے قبل ازیں غسل بول اور غسل مذی کا عنوان قائم کر چکے ہیں۔ آئندہ ایک عنوان غسل جنابت ہے۔ امام بخاری ؒ جس چیز کے متعلق غسل کا عنوان قائم کرتے ہیں، وہ ان کے نزدیک نجس ہوتی ہے۔ آپ نے اس عنوان میں فرک منی کا بھی ذکر کیا ہے، وہ اس لیے ہے کہ منی سے تطہیر، فرک (کھرچنے) سے بھی ہو جاتی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں طہارت کی مختلف صورتیں ہیں اور اس کے حصول کے بھی متعدد طریقے ہیں کیونکہ جن چیزوں سے نجاست متعلق ہو جاتی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ دھونے کے علاوہ دیگر تمام طریقے طہارت کی علامتِ لازمہ ہیں، درست نہیں۔ طہارت کی مختلف صورتیں حسب ذیل ہیں: * استنجا کے لیے ڈھیلوں کا استعمال جائز ہے، پانی سے طہارت حاصل کرنا ضروری نہیں۔ * جوتوں کو نجاست لگی ہو تو انھیں پاک زمین پر رگڑ دیا جائے تو پاک ہو جائیں گے، انھیں دھونے کی ضرورت نہیں۔ * جن چیزوں میں نجاست اندر داخل نہ ہو، جیسے شیشہ وغیرہ، ان کی طہارت صرف مسح سے ہو جاتی ہے۔ * زمین نجاست آلود ہو تو خشک ہونے پر خود بخود پاک ہو جائے گی۔ * بچے کے پیشاب پر پانی چھڑکنا ہی کافی ہے، اسے بھی دھونے کی ضرورت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت میں طہارت حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ اسی طرح اگر کپڑے کو منی لگ جائے تو اس کی طہارت کے دو طریقے ہیں: اسے دھو دیا جائے یا اسے کھرچ ڈالا جائے۔ اب اگر فرک (رگڑنے) ہی کو دلیل طہارت بنالیا جائے تو ایسا ہوگا کہ کسی شخص کا موزہ نجاست آلود ہو جائے اور وہ اسے زمین پر رگڑ کر پاک کر لے تو کہا جائے کہ اگر اس کا زمین پر رگڑنا دلیل طہارت ہے تو اس نجاست کے متعلق کیا حکم ہے جو اسے لگی ہوئی ہے۔ اگر فرک منی، طہارت منی کے لیے دلیل ہے تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ بیان جواز کے طور پر آلودہ کپڑوں میں نماز پڑھنے کا ثبوت ضرور ملنا چاہیے۔ ہاں، مفروک کپڑے میں نماز پڑھنا ثابت ہے کیونکہ فرک بھی منی سے طہارت حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کا ذکر امام بخاری ؒ نے اپنے عنوان میں کیا ہے۔ ② منی نجس ہے، اس کی نجاست کے دلائل حسب ذیل

ہیں: ٭ قرآن کریم میں اسے "ماء مهين" حقیر پانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1] کسی پاکیزہ چیز کے متعلق یہ انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ ٭ جب حدث اصغر کا سبب پیشاب ناپاک ہے تو حدث اکبر کا سبب منی، بطریق اولیٰ ناپاک ہونا چاہیے۔ ٭ صحیح احادیث سے ازالۂ منی کا ثبوت غسل، فرک، مسح، حت اور حک کے الفاظ سے ملتا ہے جو اس کی نجاست کے لیے واضح دلیل ہے۔ ٭ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ جماع کے کپڑوں میں نماز پڑھ لیتے تھے تو آپ نے فرمایا کہ اگر ان میں نجاست کا اثر نہ دیکھتے تو ان میں نماز پڑھ لیتے۔[2] اس میں دو طرح سے منی کی نجاست پر دلیل لی گئی ہے: ٭ اسے اَذٰی سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ حیض کو اَذٰی کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منی ناپاک ہے۔ ٭ رسول اللہ ﷺ کا اس کی موجودگی میں نماز نہ پڑھنا بھی اس کے ناپاک ہونے کی دلیل ہے۔ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ کپڑے یا جسم پر منی کو بدستور باقی رکھا گیا ہو اور اس کا ازالہ نہ کیا گیا ہو۔ اگر یہ پاک ہوتی تو کم از کم بیان جواز کے لیے ایک مرتبہ تو اسے بدستور باقی رکھنے کا ثبوت ہوتا۔ حدیث الباب کے الفاظ [كُنْتُ أَغْسِلُ الْجَنَابَةَ] بھی نجاست منی کی دلیل ہیں۔ اس پر علامہ کرمانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے نجاست منی پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ غسل منی نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس کی گزرگاہ نجس ہے یا بوجہ اختلاط رطوبت فرج ہے۔[3] علامہ عینی کہتے ہیں کہ مستقر منی اور مستقر بول دونوں الگ الگ ہیں، اسی طرح ان کے مخرج بھی جدا جدا ہیں، لہٰذا گزرگاہ کے نجس ہونے کی بات بے دلیل ہے۔ اور نجاست رطوبت فرج کا مسئلہ بھی اختلافی ہے، اس کی وجہ سے بھی استدلال مذکور کو کمزور نہیں کہہ سکتے۔[4]

(٦٥) بَابٌ: إِذَا غَسَلَ الْجَنَابَةَ أَوْ غَيْرَهَا فَلَمْ يَذْهَبْ أَثَرُهُ

باب:65- جب منی وغیرہ دھوئے اور اس کا اثر زائل نہ ہو

٢٣١ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْمِنْقَرِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُونٍ قَالَ: سَمِعْتُ سُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ فِي الثَّوْبِ تُصِيبُهُ الْجَنَابَةُ قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ: كُنْتُ أَغْسِلُهُ مِنْ ثَوْبِ رَسُولِ اللهِ ﷺ ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الصَّلَاةِ وَأَثَرُ الْغَسْلِ فِيهِ بُقَعُ الْمَاءِ. [راجع: ٢٢٩]

[231] عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے حضرت سلیمان بن یسار سے منی آلود کپڑے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے کپڑے سے منی دھو ڈالتی تھی، پھر آپ نماز کے لیے تشریف لے جاتے جبکہ دھونے کا نشان، یعنی پانی کے دھبے کپڑے پر باقی رہ جاتے۔

٢٣٢ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ مَيْمُونِ بْنِ مِهْرَانَ

[232] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ منی کو نبی ﷺ کے کپڑوں سے دھوتی تھیں۔ (حضرت عائشہ نے

[1] المرسلات 20:77. [2] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 366. [3] شرح الكرماني: 82/2. [4] عمدة القاري: 639/2.

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا كَانَتْ تَغْسِلُ الْمَنِيَّ مِنْ ثَوْبِ النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ أَرَاهُ فِيهِ بُقْعَةً أَوْ بُقَعًا . [راجع : ٢٢٩]

کہا:) پھر میں اس دھونے کا ایک دھبا یا کئی دھبے آپ کے کپڑوں میں دیکھتی تھی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر ناپاک منی کو اچھی طرح دھو دیا جائے، اس کے باوجود اس کا دھبا زائل نہ ہو تو کوئی حرج نہیں، اسے کسی خارجی چیز سے دھونے کی ضرورت نہیں۔ ان دھبوں کو زائل کرنا محض تکلف ہے۔ اسی طرح کپڑے کو خشک کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر پانی کے نشانات کپڑے پر نظر آتے ہیں تو چنداں حرج نہیں۔ شارحین کا اختلاف ہے کہ دھبوں سے مراد پانی کے دھبے ہیں یا منی کے؟ دراصل روایت میں تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ○ پانی کے دھبے کپڑے میں موجود ہوتے تھے۔[1] ○ دھونے کے دھبے کپڑے میں موجود ہوتے تھے۔[2] ○ پھر میں اس کپڑے پر دھبے دیکھتی تھی۔[3] ان آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ دھونے کے بعد اس کپڑے میں منی کے دھبے نظر آتے تھے، پہلے اور دوسرے الفاظ سے پانی کے دھبے معلوم ہوتے ہیں، بہرحال دھونے کے بعد دھبوں کا بقا نقصان دہ نہیں۔ ② امام بخاری ؒ نے جنابت کے ساتھ غيرها کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حدیث میں اس کا ذکر نہیں، البتہ جنابت کا حکم معلوم کر لینے کے بعد دیگر نجاستوں کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت خولہ بنت یسار ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے پاس صرف ایک کپڑا ہے، حالت حیض میں وہ ملوث ہو جاتا ہے تو کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: ''جب تم پاک ہو جایا کرو تو اسے دھو لیا کرو۔'' عرض کیا: اگر اس سے خون کا دھبا نہ جائے تو؟ آپ نے فرمایا: ''پانی سے دھو لینا کافی ہے۔ اس کے بعد اگر نشان رہ جائے تو کوئی حرج نہیں۔''[4] غيرها کا لفظ بڑھانے سے یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حکم منی سے مخصوص نہیں دیگر نجاستوں کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو حدیث الباب میں اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ واللہ أعلم.

(٦٦) بَابُ أَبْوَالِ الْإِبِلِ وَالدَّوَابِّ وَالْغَنَمِ وَمَرَابِضِهَا

باب:66- اونٹ، بکریوں اور دیگر چوپایوں کے پیشاب، نیز بکریوں کے باڑے کا حکم

وَصَلّٰى أَبُو مُوسٰى فِي دَارِ الْبَرِيدِ وَالسِّرْقِينِ وَالْبَرِّيَّةُ إِلٰى جَنْبِهِ، فَقَالَ : هَاهُنَا وَثَمَّ سَوَاءٌ .

حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ نے دارالبرید اور سرقین میں نماز ادا کی جبکہ جنگل، یعنی میدانی علاقہ ان کے پہلو میں تھا اور انھوں نے فرمایا: یہاں اور وہاں دونوں برابر ہیں۔

٢٣٣ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ أَبِي قِلَابَةَ، عَنْ

[233] حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ قبیلۂ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور انھیں یہاں کی

1 صحيح البخاري، الوضوء، حديث:229. 2 صحيح البخاري، الوضوء، حديث:230. 3 صحيح البخاري، الوضوء، حديث:232. 4 سنن أبي داود، الطهارة، حديث:365.

أَنَسٍ قَالَ: قَدِمَ أُنَاسٌ مِّنْ عُكْلٍ أَوْ عُرَيْنَةَ فَاجْتَوَوُا الْمَدِينَةَ فَأَمَرَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ بِلِقَاحٍ وَأَنْ يَّشْرَبُوا مِنْ أَبْوَالِهَا وَأَلْبَانِهَا فَانْطَلَقُوا فَلَمَّا صَحُّوا قَتَلُوا رَاعِيَ النَّبِيِّ ﷺ وَاسْتَاقُوا النَّعَمَ فَجَاءَ الْخَبَرُ فِي أَوَّلِ النَّهَارِ فَبَعَثَ فِي آثَارِهِمْ فَلَمَّا ارْتَفَعَ النَّهَارُ جِيءَ بِهِمْ، فَأَمَرَ بِقَطْعِ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلِهِمْ، وَسُمِّرَتْ أَعْيُنُهُمْ وَأُلْقُوا فِي الْحَرَّةِ يَسْتَسْقُونَ فَلَا يُسْقَوْنَ. قَالَ أَبُو قِلَابَةَ: فَهٰؤُلَاءِ سَرَقُوا وَقَتَلُوا وَكَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ، وَحَارَبُوا اللهَ وَرَسُولَهُ. [انظر: ١٥٠١، ٣٠١٨، ٤١٩٢، ٤١٩٣، ٤٦١٠، ٥٦٨٥، ٥٦٨٦، ٥٧٢٧، ٦٨٠٢، ٦٨٠٣، ٦٨٠٤، ٦٨٠٥، ٦٨٩٩]

آب وہوا موافق نہ آئی تو نبی ﷺ نے انھیں دودھ والی اونٹنیوں میں جانے کا حکم دیا کہ وہاں جا کر ان کا دودھ اور پیشاب استعمال کریں، چنانچہ وہ لوگ چلے گئے۔ اور جب وہ صحت مند ہو گئے تو انھوں نے نبی ﷺ کے چرواہے کو قتل کر ڈالا اور جانور ہانک کر لے گئے۔ صبح کے وقت (رسول اللہ ﷺ کو جب) یہ خبر پہنچی تو آپ نے ان کے تعاقب میں چند آدمی روانہ کیے، چنانچہ سورج بلند ہوتے ہی ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر آپ کے حکم سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں، اس کے بعد گرم سنگلاخ جگہ پر انھیں ڈال دیا گیا۔ وہ پانی مانگتے تھے لیکن انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ ابوقلابہ نے فرمایا: ان لوگوں نے چوری کی، خون ناحق کیا، ایمان کے بعد مرتد ہوئے اور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ انھوں نے اعلانِ جنگ کیا (اس لیے یہ سزا تجویز کی گئی)۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ حیوانات کے بول و براز کے مسائل بیان کر رہے ہیں کہ تمام ابوال ناپاک نہیں بلکہ جن حیوانات کا گوشت کھایا جاتا ہے، مثلاً: اونٹ، گائے، بکری، بھیڑ اور بھینس وغیرہ ان کا بول و براز پاک ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک عمل پیش کیا ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ ابونعیم نے اپنی تالیف [کتاب الصلوۃ] میں موصولاً بیان کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے کوفے سے باہر دارالبرید میں نماز پڑھائی جہاں گوبر پڑا ہوا تھا جبکہ پاس ہی میدانی علاقہ بھی موجود تھا اور انھیں کہا گیا کہ آپ اپنے قریب جنگل یا میدانی علاقے میں اس نماز کا اہتمام کر لیں، انھوں نے فرمایا: یہاں اور وہاں دونوں برابر ہیں۔ دراصل حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کوفے کے گورنر تھے اور سرکاری ڈاک کی ترسیل کے لیے شہروں کے درمیان اڈے بنے ہوئے تھے جسے دارالبرید کہا جاتا تھا، اس زمانے میں گھوڑے اور اونٹ وغیرہ ڈاک برداری میں استعمال ہوتے تھے اور دارالبرید میں ان کے باندھنے اور گھاس چارے کا انتظام ہوتا تھا، ان میں گوبر بھی ہوتا اور زمین بھی ان کے پیشاب سے تر رہتی، حضرت ابوموسیٰ اشعری وہاں نماز پڑھ لیتے تھے۔ یہ کسی مجبوری کے پیش نظر نہیں بلکہ سامنے ہی کھلا میدان تھا۔ اگر کبھی توجہ دلائی جاتی کہ حضرت وہاں نماز پڑھ لیں تو فرماتے محل وقوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، حالانکہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ عام معاملات میں متشدد ہونے کی حد تک محتاط تھے جن کا تشدد اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ پیشاب کرتے وقت اپنے ساتھ ایک بوتل رکھتے تاکہ پیشاب کے چھینٹوں سے محفوظ رہ سکیں۔ ان کا ایسے مقام پر نماز پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ "ماکول اللحم" حیوانات کا بول و براز نجس نہیں۔ ② اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ کا دوسرا استدلال

حدیث عرنیین ہے۔اس حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ قبیلۂ عکل اور عرینہ کے لوگوں سے متعلق ہے جن کی تعداد آٹھ تھی۔ (حدیث:3018) اس حدیث میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے اونٹوں کا دودھ اور پیشاب بطور دوا تجویز فرمایا، نیز صحیح بخاری میں تصریح ہے کہ مسلمان اونٹوں کے پیشاب سے علاج کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔[1] اگر اونٹوں کا پیشاب نجس ہوتا تو رسول اللہ ﷺ قطعی طور پر اسے بطور دوا تجویز نہ فرماتے کیونکہ فرمان نبوی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں میں شفا نہیں رکھی۔''[2] صحیح بخاری میں یہ الفاظ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں۔[3] اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اونٹوں کے دودھ اور پیشاب میں پیٹ کی بیماریوں کا علاج ہے۔''[4] معلوم ہوا کہ اونٹوں کا پیشاب حرام نہیں۔ اگر حرام ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے بطور دوا تجویز نہ فرماتے کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔[5] ③ امام مالک، امام احمد، ابن خزیمہ، ابن منذر، ابن حبان رحمہم اللہ اور دیگر کئی علمائے سلف کے نزدیک مأکول اللحم جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔اس کے برعکس امام شافعی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر کئی علماء کے نزدیک تمام جانوروں کا پیشاب ناپاک ہے۔دوسرے قول کے قائلین پیشاب سے پرہیز کرنے کی روایت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں انسانوں کے علاوہ جانوروں کا پیشاب بھی ہے،لیکن ان کا یہ موقف درست نہیں کیونکہ حلال جانوروں کے پیشاب کا استثنا حدیث سے ثابت ہے۔ اور مأکول اللحم جانوروں کے پیشاب کے ناپاک ہونے کے متعلق دیگر تمام روایات بھی ضعیف ہیں۔ بہرحال جن حیوانات کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا پیشاب نجس نہیں جیسا کہ حدیث الباب سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔اور جس پیشاب سے اجتناب کرنے کا حکم ہے اس سے مراد بھی لوگوں کا پیشاب ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے، نیز حدیث قَبْرین اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی اس کا واضح ثبوت ہے، اس کے متعلق جو بھی اعتراضات یا اشکالات پیش کیے گئے ہیں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر اونٹوں کا پیشاب نجس ہوتا اور اس کی بطور دوا بامر مجبوری اجازت دی ہوتی تو کم از کم رسول اللہ ﷺ اس کی وضاحت فرما دیتے اور استعمال کرنے والوں کو ہدایت دیتے کہ اس کے استعمال کے بعد تم نے اپنے منہ دھو لینے ہیں، جبکہ ایسی کوئی وضاحت کتب حدیث میں نہیں ملتی، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے حرام چیز کو بطور دوا استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔[6]

٢٣٤ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو التَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي قَبْلَ أَنْ يُبْنَى الْمَسْجِدُ فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ.

[234] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مسجد (نبوی) بننے سے پہلے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① مسجد نبوی کی تعمیر ہجرت سے چھ ماہ بعد ہوئی ہے۔اس سے قبل آپ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے۔چونکہ بکریاں وہاں پیشاب اور مینگنیاں کرتی تھیں اس کے باوجود آپ نے وہاں نماز پڑھی اور نماز پڑھنے کی اجازت دی، تو معلوم ہوا کہ ان کا پیشاب وغیرہ پلید نہیں، البتہ اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے کیونکہ ان

1 صحيح البخاري، الطب، حديث:5781. 2 سنن أبي داود، الطب، حديث:3873. 3 صحيح البخاري، الأشربة، باب رقم:15. 4 مسند أحمد:293/1. 5 سنن أبي داود، الطب، حديث:3874. 6 سنن أبي داود، الطب، حديث:3874.

کے مستی میں آنے سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ ② امام بخاری ؒ اونٹوں، بکریوں اور دیگر جانوروں کے پیشاب کی طہارت کے قائل ہیں اور مرابض غنم (بکریوں کے باڑوں) کا ذکر کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان حیوانات کا پیشاب بھی پاک ہے۔ عنوان میں ''دواب'' کا لفظ زیادہ کیا تا کہ تمام مأکول اللحم جانوروں کا حکم بتا دیا جائے، گویا آپ نے قیاس کے ذریعے سے ان کو بھی اونٹوں اور بکریوں کے حکم میں شامل کیا ہے۔ بہر حال دین اسلام کے سہل اور یسر (آسان) ہونے کا تقاضا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت استعمال ہوتا ہے ان کے بول و براز کے متعلق اس قدر سختی مناسب نہیں کہ اسے نجس قرار دے کر اس سے اجتناب کی تلقین کی جائے۔ دیہاتی ماحول کے لیے یہ ضابطہ انتہائی پیچیدگی اور مشکل کا باعث ہو سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

(٦٧) بَابُ مَا يَقَعُ مِنَ النَّجَاسَاتِ فِي السَّمْنِ وَالْمَاءِ

باب: 67- ان نجاستوں کا بیان جو گھی یا پانی میں گر جائیں

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: لَا بَأْسَ بِالْمَاءِ مَا لَمْ يُغَيِّرْهُ طَعْمٌ، أَوْ رِيحٌ، أَوْ لَوْنٌ. وَقَالَ حَمَّادٌ: لَا بَأْسَ بِرِيشِ الْمَيْتَةِ. وَقَالَ الزُّهْرِيُّ، فِي عِظَامِ الْمَوْتٰى نَحْوِ الْفِيلِ وَغَيْرِهِ: أَدْرَكْتُ نَاسًا مِّنْ سَلَفِ الْعُلَمَاءِ يَمْتَشِطُونَ بِهَا، وَيَدَّهِنُونَ فِيهَا، لَا يَرَوْنَ بِهِ بَأْسًا. وَقَالَ ابْنُ سِيرِينَ وَإِبْرَاهِيمُ: لَا بَأْسَ بِتِجَارَةِ الْعَاجِ.

امام زہری بیان کرتے ہیں کہ پانی کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں جب تک نجاست اس کا مزہ، بو یا رنگ نہ بدلے۔ حضرت حماد نے فرمایا: مردار کے بال اور پروں میں (اگر وہ پانی میں گر جائیں) کوئی مضائقہ نہیں۔ زہری فرماتے ہیں: مردار جانور، مثلاً: ہاتھی وغیرہ کی ہڈیوں کے متعلق میں نے بہت سے علمائے سلف کو پایا کہ وہ ان کی کنگھی بنا کر استعمال کرتے تھے اور ان میں تیل رکھتے تھے، نیز ان کے استعمال میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ امام ابن سیرین اور ابراہیم فرماتے ہیں کہ ہاتھی دانت کی تجارت میں کوئی حرج نہیں۔

وضاحت: امام بخاری ؒ نجاستوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر نجاست کسی چیز میں گر جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ چیز، نجاست گرتے ہی ناپاک ہو جائے گی یا اس کی کچھ حدود و شرائط ہیں یا سرے سے نجاست اس میں اثر انداز ہی نہیں ہوگی؟ امام بخاری کے پیش کردہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک پانی میں نجاست گرنے کے بعد اس کی طہارت و نجاست کا دار و مدار پانی کے اوصاف ثلاثہ کے بدلنے یا نہ بدلنے پر ہے۔ اگر اوصاف بدل گئے تو ناپاک، بصورت دیگر پاک ہے۔ پانی کے تین اوصاف ہیں: ذائقہ، بو اور رنگ۔ اگر نجاست کی وجہ سے ان اوصاف میں تبدیلی آ جاتی ہے تو پانی ناپاک ہو جاتا ہے، بصورت دیگر پاک رہتا ہے۔ امام زہری کے نزدیک بھی مدار تغیر اوصاف پر ہے۔ اگر پانی اپنے اوصاف پر قائم ہے تو پاک ہے، اگر نجاست کی وجہ سے اوصاف میں تبدیلی آ گئی تو ناپاک ہو جائے گا۔ حضرت حماد کے فرمان کا

مطلب بھی یہی ہے کہ مردار کے پر اگر پانی میں گر جائیں تو پانی پلید نہیں ہوتا، حالانکہ میتۃ (مردار) ناپاک ہے اور اس کا جز اگر پانی میں گر جائے تو اس سے پانی ناپاک ہونا چاہیے لیکن اس کے گرنے سے پانی کے اوصاف میں کوئی تغیر نہیں آیا، لہٰذا پر گرنے کے بعد پانی استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ جو چیزیں تغیر کو قبول کرتی ہیں وہ تغیر کے بعد ناپاک ہو جاتی ہیں۔ ہڈی مردہ کی ہو یا زندہ کی، بال مردہ کے ہوں یا زندہ کے، دانت مردہ کے ہوں یا زندہ کے، ان میں تغیر نہیں آتا، اس لیے مردار کا جز ہونے کے باوجود یہ پاک رہیں گے اور انھیں ناپاک قرار نہیں دیا جائے گا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت جتنے بھی آثار پیش فرمائے ہیں ان میں یہی اصول کارفرما ہے۔ اب امام بخاری اس سلسلے میں چند احادیث بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

٢٣٥ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سُئِلَ عَنْ فَأْرَةٍ سَقَطَتْ فِي سَمْنٍ، فَقَالَ: «أَلْقُوهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوهُ وَكُلُوا سَمْنَكُمْ». [انظر: ٢٣٦، ٥٥٣٨، ٥٥٣٩، ٥٥٤٠]

[235] حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ سے ایک چوہیا کے متعلق پوچھا گیا جو گھی میں گر گئی تھی؟ آپ نے فرمایا: ''اسے نکال دو اور اس کے قریب جس قدر گھی ہو اسے بھی پھینک دو، پھر اپنا باقی گھی استعمال کرلو۔''

٢٣٦ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا مَعْنٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ عَنْ فَأْرَةٍ سَقَطَتْ فِي سَمْنٍ؟ فَقَالَ: «خُذُوهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوهُ». قَالَ مَعْنٌ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ مَا لَا أُحْصِيهِ يَقُولُ: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ. [راجع: ٢٣٥]

[236] حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے، نبی ﷺ سے سوال ہوا کہ چوہا اگر گھی میں گر پڑے تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا: ''چوہے کو اور اس کے آس پاس کے گھی کو پھینک دو۔''

حضرت معن کہتے ہیں: امام مالک نے ہمیں کئی مرتبہ یہ حدیث بیان کی اور وہ یوں کہتے تھے: عن ابن عباس عن میمونة رضی اللہ عنہا۔

فوائد و مسائل: ① سنن نسائی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ چوہیا جمے ہوئے گھی میں گر جائے۔[1] صحیح بخاری کی ایک روایت میں اضافہ ہے کہ وہ چوہیا گھی میں گرنے کے بعد اس میں مر جائے۔[2] سنن ابی داود میں مزید وضاحت ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''اگر چوہا گھی میں گر جائے، اگر گھی جما ہوا ہے تو چوہے اور اس کے ارد گرد کے گھی کو پھینک دو۔ اور اگر گھی سیال ہے تو اس کے پاس مت جاؤ۔''[3] حدیث بخاری سے صرف جامد کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے، سیال کا نہیں کیونکہ اگر سیال میں نجاست گرے

1 سنن النسائي، الفرع والعتيرة: 4263. 2 صحيح البخاري، الذبائح، حديث: 5538. 3 سنن أبي داود، الأطعمة، حديث: 3842.

گی تو اس کے آس پاس کے حصے کا تعین کرنا اور پھینکنا ممکن ہی نہیں کیونکہ جس طرف سے بھی اسے الٹنا چاہیں گے اس کی جگہ فوراً دوسرے حصے پیچھے سے آ جائیں گے اور وہ بھی اردگرد کے حصے بن جائیں گے یہاں تک کہ پورے کو پھینکنا پڑے گا۔ اور القائے ماحول (اردگرد کے پھینکنے) کا حکم صرف جامد میں جاری ہوسکتا ہے، سیال اشیاء میں یہ حکم جاری نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ حدیث بخاری اپنے الفاظ اور منطوق کے لحاظ سے سیال اور جامد کے فرق پر دلالت نہیں کرتی، تاہم اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے جامد اور سیال کا فرق بتلا رہی ہے۔ حدیث بخاری کے مفہوم مذکور کی تائید ابوداود کی حدیث ابی ہریرہ (نمبر3842) اور سنن نسائی کی حدیث میمونہ (نمبر4264) کے منطوق سے بھی ہوتی ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ ایک عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جامد اور سیال کا کوئی فرق نہیں، چنانچہ کتاب الذبائح والصید میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں: [بابٌ: إذا وقعت الفأرةُ في السَّمْنِ الْجَامِدِ أوالذَّائبِ] ''جب جامد یا سیال گھی میں چوہیا گر جائے۔'' اس کے تحت انھوں نے حدیث میمونہ ذکر کی ہے، نیز انھوں نے امام زہری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ اگر کوئی بھی جاندار (چوہیا وغیرہ) گھی یا تیل میں گر جائے، وہ جامد ہو یا سیال، تو کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھی میں گرنے والی چوہیا کے متعلق فرمایا کہ اسے اور اس کے آس پاس والے گھی کو پھینک دو۔ اسے پھینک دیا گیا باقی ماندہ کو استعمال کر لیا گیا۔[1] لیکن امام زہری کے اس ضابطے پر اعتراض ہوتا ہے کہ القاء ماحول جامد میں تو ہوسکتا ہے لیکن سیال میں کیسے اس پر عمل کیا جائے گا؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت: ''اگر وہ سیال ہے تو اس کے قریب نہ جاؤ'' کو معلول قرار دیا ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اپنی سنن میں ان کے قول کا حوالہ دیا ہے۔[2] بہر حال اس سلسلے میں صحیح بات یہی ہے کہ اگر گھی، شہد، دودھ اور پانی وغیرہ میں نجاست گر جائے تو دیکھا جائے اگر جامد ہے تو نجاست اور اس کے ماحول کو باہر پھینک دیا جائے اور باقی قابل استعمال ہے اور اگر سیال ہے تو اسے پھینک دیا جائے اور استعمال نہ کیا جائے۔ واللہ أعلم. ③ محدثین کرام کا ان احادیث کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ مسانید ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں یا ان کا شمار مسانید حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا میں ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں کے آخر میں فیصلہ دیا ہے کہ اصل حدیث ابن عباس عن میمونہ رضی اللہ عنہا ہے، یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت کو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے واسطے سے لیا ہے اور یہ مسانید حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ہے۔ حضرت معن نے بارہا اس روایت کو امام مالک سے عن ابن عباس عن میمونہ کے طریق سے سنا ہے اور یہی صحیح ہے۔

٢٣٧ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كُلُّ كَلْمٍ يُكْلَمُهُ الْمُسْلِمُ فِي سَبِيلِ اللهِ، يَكُونُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَهَيْئَتِهَا إِذْ طُعِنَتْ تَفَجَّرُ دَمًا، اَللَّوْنُ لَوْنُ

[237] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں مسلمان کو جو زخم لگتا ہے، قیامت کے دن وہ اپنی اصلی حالت میں ہوگا جیسے زخم لگتے وقت تھا، خون بہہ رہا ہوگا، اس کا رنگ تو خون جیسا ہوگا مگر خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔''

① صحيح البخاري، الذبائح والصيد، حديث:5539. ② جامع الترمذي، الأطعمة، حديث:1798.

الدَّمِ، وَالْعَرْفُ عَرْفُ الْمِسْكِ». [انظر: ٢٨٠٣، ٥٥٣٣]

فوائد ومسائل: ① اس خون کا رنگ تو خون جیسا ہوگا مگر خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس جملے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ قیامت کے دن شہیدوں کے زخم اور ان سے بہتا ہوا خون تمام اہل محشر کو دکھایا جائے گا تاکہ ان کی فضیلت اور ظالموں کا ظلم سب پر عیاں ہو جائے اور ان کے خون سے مشک کی طرح خوشبو مہکنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام اہل موقف ان کی عظمت کو جان لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے شہداء کے زخموں سے خون صاف کرنے کی ممانعت کر دی ہے بلکہ انھیں اسی حالت میں دفن کرنے کی تلقین کی ہے۔[1] ② بظاہر اس حدیث کی عنوان سے کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی تو پھر امام بخاری ؒ اس حدیث کو یہاں کیوں لائے ہیں کیونکہ یہ حدیث خون کی طہارت ونجاست کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں زخمی ہونے والوں کی فضیلت بیان کرنے کے لیے لائی گئی ہے، اس بنا پر توجیہ مناسبت میں شارحین کے متعدد اقوال ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بخاری درجۂ اجتہاد پر فائز ہیں اور کسی کی تقلید نہیں کرتے، وہ خود اپنے فہم وعلم کے مطابق شرعی نصوص سے استنباط کرتے ہیں۔ انھیں کسی موافقت یا مخالفت سے کوئی غرض نہیں بلکہ وہ تو اتباع نصوص کے خوگر ہیں۔ چونکہ ان کے مختارات فقہیہ کو جمع نہیں کیا گیا، اس لیے ان کے قائم کردہ عنوانوں پر کھینچ تان رہتی ہے، ہر ایک انھیں اپنے موافق کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان کوششوں کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

وكل يدعى حبا بليلىٰ   وليلىٰ لا تقرلهم بذاك

اس حدیث کی عنوان سے مطابقت کی بابت حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ امام بخاری کا مقصد اپنے موقف کی تائید کرنا ہے کہ پانی محض نجاست کے مل جانے سے نجس نہیں ہوتا جب تک اس میں تغیر نہ آ جائے۔ یہ اس لیے کہ صفت کے بدلنے سے موصوف پر اثر ہوتا ہے، جس طرح خون کی ایک صفت بو والی، خوشبو میں بدل جانے سے اس کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی اور ذم کے بجائے اس میں مدح کا پہلو پیدا ہوگیا اسی طرح پانی کی کوئی صفت اگر نجاست کی وجہ سے بدل جائے تو اس کی طہارت کا حکم بدل کر نجاست کا حکم آ جائے گا اور جب تک تغیر نہیں ہوگا نجاست نہیں آئے گی،[2] بشرطیکہ پانی دو قُلّے یا اس سے زیادہ ہو۔ قلتین سے مراد پانچ حجازی مشکیں ہیں، جو پانچ سو رطل کے قریب ہے۔[3] موجودہ اعشاری وزن 197 کلو گرام ہے۔

(٦٨) بَابُ الْبَوْلِ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ

باب:68- کھڑے پانی میں پیشاب کرنا

٢٣٨ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو الزِّنَادِ أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ هُرْمُزَ الْأَعْرَجَ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ أَنَّهُ

[238] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''ہم (دنیا میں) آخر میں آنے والے ہیں لیکن (قیامت کو) سبقت کر جانے

1 فتح الباري:448/1. 2 فتح الباري:449/1. 3 تحفة الأحوذي:71/1.

سَمِعَ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ». [انظر: ٨٧٦، ٨٩٦، ٢٩٥٦، ٣٤٨٦، ٦٦٢٤، ٦٨٨٧، ٧٠٣٦، ٧٤٩٥]

والے ہیں۔''

٢٣٩ - وَبِإِسْنَادِهِ قَالَ: «لَا يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي الْمَاءِ الدَّائِمِ، الَّذِي لَا يَجْرِي، ثُمَّ يَغْتَسِلُ فِيهِ».

[239] اور اسی سند کے ساتھ (مروی ہے کہ) آپ نے یہ بھی فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص ایسے رکے پانی میں پیشاب نہ کرے جو چلتا نہیں، پھر اس میں غسل بھی کرے۔''

فوائد و مسائل: ① اس عنوان کے تحت پہلی حدیث کہ ہم آخر میں آنے والے ہیں مگر سبقت کر جانے والے ہیں، اس کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں اگرچہ بعض شارحین نے مناسبت پیدا کرنے کے لیے دور از کار تاویلات کا سہارا لیا ہے۔ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے بطور علامت ذکر کیا ہے تاکہ اس کے ماخذ کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے دو شاگرد ہیں: ✱ عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج۔ ✱ ہمام بن منبہ۔ ان دونوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو احادیث سنیں، انھیں قلم بند کر کے اپنے اپنے صحیفوں میں محفوظ کر لیا۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ ان دونوں کے مرتب کردہ صحیفوں سے احادیث بیان کرتے ہیں۔ امام مسلم ان سے بیان کرتے وقت پہلے بطور علامت یہ جملہ لاتے ہیں: ''فذكر أحاديث منها'' پھر قال رسول اللہ ﷺ سے حدیث کا آغاز کرتے ہیں لیکن امام بخاری رحمہ اللہ ان سے بیان کرتے وقت ''نحن الآخرون السابقون'' کا جملہ شروع میں لاتے ہیں۔ ویسے امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقل طور پر مکمل حدیث کتاب الجمعہ (875) میں بیان کی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج کے طریق سے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ انداز دیکھا جا سکتا ہے: الوضوء (حدیث:238)، الجهاد (حدیث:2956)، الدیات (حدیث:6887)، التوحید (حدیث:7495)۔ بعض مقامات پر اس جملے کے بغیر بھی احادیث بیان کی ہیں، مثلاً: کتاب التوحید، حدیث:7505,7504,7501,7506۔ شاید باب میں ایک جگہ ذکر کرنے کو کافی خیال کر لیا گیا ہو۔ اسی طرح ہمام بن منبہ کے طریق سے مندرجہ ذیل مقامات پر یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔[1] بعض اوقات اس جملے کے بغیر بھی اس طریق سے احادیث بیان کی ہیں، مثلاً: أحاديث الأنبياء (حدیث:3472) التوحید:(7498). واضح رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اعرج اور ہمام کے علاوہ بھی جب حضرت طاؤس کے طریق سے بیان کرتے ہیں تو بعض اوقات ان الفاظ کو شروع میں لاتے ہیں، مثلاً: کتاب الجمعہ (حدیث:896)، أحاديث الأنبياء (حدیث:3486). ② امام بخاری رحمہ اللہ کا دوسری حدیث بیان کرنے سے یہ مقصد ہے کہ اگر رکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی اجازت دی جائے گی تو ایک راستہ کھل جائے گا، جب اس طرح لوگ اس میں پیشاب کرنے لگیں گے تو ایک نہ ایک دن وہ پانی متغیر ہو کر نجس ہو جائے گا، پھر وہ غسل اور وضو کے قابل نہیں رہے گا، اس لیے رکے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت اس دروازے کو بند کرنے کے پیش نظر ہے تاکہ لوگ کثرت سے پیشاب کرنے کی وجہ سے اسے ناقابل استعمال نہ کر دیں۔ ③ حدیث میں الدائم کے بعد الذي لا يجري کے الفاظ بطور صفت کاشفہ نہیں بلکہ انھیں احتراز کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یعنی ماء دائم کی دو اقسام ہیں: ✱ ماء دائم غیر جاری، جیسے تالاب اور جوہڑ وغیرہ ✱ ماء دائم جاری،

[1] صحيح البخاري، الأيمان والنذور، حديث:6624، و كتاب التعبير، حديث:7036.

جیسے کنویں، جن کا پانی بہنے والے سوتوں کے ذریعے سے اوپر آتا رہتا ہے۔ لیکن مذکورہ صفت حکم سے متعلق نہیں کہ اس سے ماء دائم جاری میں پیشاب کرنے کی اجازت ثابت کرنے لگیں کیونکہ مفہوم مخالف ہر جگہ نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی قیود کے فوائد دوسرے ہوتے ہیں، مثلاً: یہاں پانی میں پیشاب کرنے کی قباحت کو نمایاں کرنا مقصود ہے، گویا ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب سے منع کیا، خاص طور پر وہ پانی جو جاری بھی نہ ہو، اس سے پیشاب کرنے کی قباحت کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ ④ اصحاب ظواہر نے اس حدیث کو اپنے ذوق کے مطابق عجیب معنی پہنائے ہیں، لکھا ہے کہ ممانعت پیشاب کے ساتھ خاص ہے۔ اگر اس میں کوئی پاخانہ کردے تو کوئی حرج نہیں، نہ اس کی ممانعت ہے، یعنی اس پانی سے خود بھی اور دوسرے بھی وضو اور غسل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ پیشاب کرنے والا کسی برتن میں پیشاب کر کے پانی میں ڈال دے یا پیشاب قریب میں کرے کہ وہاں سے خود بہہ کر پانی میں چلا جائے تو اس سے بھی وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[1] ⑤ اس عنوان کے تحت پہلی حدیث کیوں بیان کی گئی جبکہ اس کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں؟ اسے ہم پہلے بیان کر آئے ہیں لیکن ''اصحاب تدبر'' کے ہاں احادیث بخاری میں تشکیک پیدا کرنا ایک محبوب مشغلہ ہے، اس کے لیے وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، چنانچہ لکھا ہے: لیکن سوال یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے دو بے جوڑ باتوں کو یہاں کیوں لیا ہے جبکہ باب کی رعایت سے ان کا تعلق روایت کے آخری ٹکڑے سے تھا، وہ اس کو لیتے اور پہلے ٹکڑے کو چھوڑ دیتے۔''[2]

(٦٩) بَابٌ: إِذَا أُلْقِيَ عَلَى ظَهْرِ الْمُصَلِّي قَذَرٌ أَوْ جِيفَةٌ لَمْ تَفْسُدْ عَلَيْهِ صَلَاتُهُ

باب:69- جب نمازی کی پشت پر گندگی یا مردار ڈال دیا جائے تو اس کی نماز خراب نہیں ہوگی

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا رَأَى فِي ثَوْبِهِ دَمًا وَهُوَ يُصَلِّي وَضَعَهُ وَمَضَى فِي صَلَاتِهِ. وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ وَالشَّعْبِيُّ: إِذَا صَلَّى وَفِي ثَوْبِهِ دَمٌ أَوْ جَنَابَةٌ، أَوْ لِغَيْرِ الْقِبْلَةِ، أَوْ تَيَمَّمَ وَصَلَّى ثُمَّ أَدْرَكَ الْمَاءَ فِي وَقْتِهِ: لَا يُعِيدُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اگر نماز پڑھتے ہوئے اپنے کپڑے پر خون دیکھتے تو نماز جاری رکھتے اور کپڑا اتار دیتے۔ حضرت سعید بن مسیب اور امام شعبی بیان کرتے ہیں: جب کوئی شخص ایسی حالت میں نماز پڑھے کہ اس کے کپڑے پر خون یا منی لگی ہو یا اس کا رخ غیر قبلے کی طرف ہو یا اس نے تیمم سے نماز پڑھی ہو، پھر وقت کے اندر اسے پانی میسر آ گیا ہو تو وہ نماز کا اعادہ نہیں کرے گا۔

٢٤٠ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: بَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ

[240] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ کعبے کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل اور اس کے ساتھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آپس

1 محلی ابن حزم: 35/1. 2 تدبر حدیث: 329/1.

سَاجِدٌ؛ ح: وَحَدَّثَنِي أَحْمَدُ بْنُ عُثْمَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُرَيْحُ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ ابْنُ يُوسُفَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ: حَدَّثَنِي عَمْرُو بْنُ مَيْمُونٍ: أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُودٍ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي عِنْدَ الْبَيْتِ، وَأَبُو جَهْلٍ وَأَصْحَابٌ لَّهُ جُلُوسٌ، إِذْ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: أَيُّكُمْ يَجِيءُ بِسَلَى جَزُورِ بَنِي فُلَانٍ فَيَضَعُهُ عَلٰى ظَهْرِ مُحَمَّدٍ إِذَا سَجَدَ؟ فَانْبَعَثَ أَشْقَى الْقَوْمِ، فَجَاءَ بِهِ فَنَظَرَ حَتّٰى إِذَا سَجَدَ النَّبِيُّ ﷺ وَضَعَهُ عَلٰى ظَهْرِهِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ وَأَنَا أَنْظُرُ، لَا أُغْنِي شَيْئًا، لَوْ كَانَتْ لِي مَنَعَةٌ. قَالَ: فَجَعَلُوا يَضْحَكُونَ وَيُحِيلُ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ سَاجِدٌ لَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ، حَتّٰى جَاءَتْهُ فَاطِمَةُ فَطَرَحَتْهُ عَنْ ظَهْرِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ» ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ إِذْ دَعَا عَلَيْهِمْ، قَالَ: وَكَانُوا يَرَوْنَ أَنَّ الدَّعْوَةَ فِي ذٰلِكَ الْبَلَدِ مُسْتَجَابَةٌ، ثُمَّ سَمّٰى: «اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِأَبِي جَهْلٍ، وَعَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَالْوَلِيدِ بْنِ عُتْبَةَ، وَأُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ»، وَعَدَّ السَّابِعَ فَلَمْ نَحْفَظْهُ، قَالَ: فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ رَأَيْتُ الَّذِينَ عَدَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ صَرْعٰى فِي الْقَلِيبِ قَلِيبِ بَدْرٍ. [انظر: ٥٢٠، ٢٩٣٤، ٣١٨٥، ٣٨٥٤، ٣٩٦٠]

میں کہنے لگے: تم میں سے کون جاتا ہے کہ فلاں قبیلے کی اونٹنی کی بچہ دانی لے آئے جسے وہ سجدے کی حالت میں محمد (ﷺ) کی پشت پر رکھ دے؟ چنانچہ ان میں سے ایک سب سے زیادہ بدبخت اٹھا اور اسے اٹھا لایا، پھر دیکھتا رہا۔ جب نبی ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے اسے آپ کے دونوں شانوں کے درمیان پشت پر رکھ دیا۔ میں یہ سب کچھ دیکھ تو رہا تھا لیکن کچھ نہ کرسکتا تھا۔ کاش کہ مجھے تحفظ حاصل ہوتا، پھر وہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ سجدے ہی میں پڑے رہے، اپنا سر نہیں اٹھایا تا آنکہ حضرت فاطمہ ؓ آئیں اور آپ کی پشت پر سے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ تب آپ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور تین مرتبہ یوں بددعا کی: ''یااللہ! قریش سے بدلہ لے۔'' رسول اللہ ﷺ کا یوں بددعا کرنا ان پر بڑا گراں گزرا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس شہر میں دعا قبول ہوتی ہے۔ پھر آپ نے نام بہ نام فرمایا: ''یااللہ! ابوجہل سے انتقام لے۔ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کی ہلاکت کو اپنے اوپر لازم کر۔'' ساتویں شخص کا بھی نام لیا لیکن میں وہ بھول گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ان لوگوں کو دیکھا، جن کا نام رسول اللہ ﷺ نے لیا تھا، وہ بدر کے کنویں میں مرے پڑے تھے۔

فوائد ومسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تراجم ابواب بخاری میں لکھتے ہیں: امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ جو چیزیں ابتدائے نماز میں دخول نماز کے لیے مانع قرار دی گئی ہیں اگر اثنائے نماز میں بدن یا کپڑے کو لگ جائیں تو یہ چیزیں بقائے نماز

کے لیے نقصان دہ نہیں، گویا آپ ابتدا اور بقا کا فرق بیان کررہے ہیں، چنانچہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ دوران نماز میں اگر کوئی نمازی پر گندگی پھینک دے یا مردار کے جسم کا کوئی حصہ ڈال دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے باب میں ایک مسئلہ بیان کیا تھا کہ پانی میں اگر پیشاب وغیرہ پڑ جائے تو پانی اس وقت نجس ہوگا جب اس کا اثر پانی میں ظاہر ہو جائے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ سبب نجاست موجود ہے لیکن حکم نجاست ندارد! یہ عجیب بات ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس اشکال کو دور کرنے کے لیے نماز کا مسئلہ بیان کر دیا کہ بعض اوقات دوران نماز میں سبب نجاست موجود ہوتا ہے لیکن حکم نجاست مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک اثر پیش کیا ہے جسے مصنف ابن ابی شیبہ (317/3) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ نماز کی حالت میں کپڑے پر خون کا اثر دیکھتے تو اگر کپڑے اتار سکتے تو اتار دیتے، بصورت دیگر نماز سے ہٹ کر اسے دھوتے اور پھر باقی نماز بنا کر کے پوری کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امر مذکور کی تصحیح کے بعد لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ابتدا اور دوام میں فرق کرتے تھے اور یہی قول ایک جماعت صحابہ اور تابعین کا ہے۔[1] اس اثر کے جواب میں علامہ عینی لکھتے ہیں کہ اثر مذکور کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ بحالت نماز اگر نمازی پر کوئی نجاست گر جائے تو اس سے نماز خراب نہیں ہوتی جبکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اگر دوران نماز میں اپنے کپڑے پر کوئی خون کا نشان دیکھتے تو اسے اتار دیتے اور نماز جاری رکھتے تھے، یعنی کپڑے پر نجاست کی موجودگی میں وہ نماز جائز نہ سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اسے اتار کر الگ کر دیتے، لہٰذا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ابتدا اور دوام میں فرق کرتے تھے، درست نہیں کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کسی حالت میں بھی نجاست آلود کپڑے میں نماز درست نہ سمجھتے تھے۔[2] امام شعبی اور سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا اثر بھی مصنف ابن ابی شیبہ (463/3) میں موصولاً بیان ہوا ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ اگرچہ تمام ائمہ سے الگ ہے، تاہم روایت مذکور سے اسے تقویت ملتی ہے کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت میں نماز کو جاری رکھا اور سلام کے بعد ان کے حق میں بددعا فرمائی۔[3] لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ پر نجاست پھینکنے کا واقعہ نماز کے وقت کپڑے پاک رکھنے کے حکم سے پہلے کا ہے، چنانچہ ابن منذر سے منقول ہے کہ یہ واقعہ آیت ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ کے نزول سے پہلے کا ہے بلکہ اس آیت کی شانِ نزول ہی یہ واقعہ ہے۔[4] مگر اس پر یہ اشکال ہے کہ داخلی قرائن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ مدثر کے نزول سے پہلے لوگوں کو آپ سے اس قدر عداوت نہ تھی کہ وہ دوران نماز میں آپ سے اس طرح کی حرکت کریں کیونکہ سورۂ مدثر فترتِ وحی کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس فترت کے تین سال ہیں۔ اس سورت میں آپ کو تبلیغ کرنے کا حکم ہوا اور تبلیغ کرنے کے نتیجے میں آپ سے لوگوں کی عداوت کا آغاز ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اس سورت کے نزول کے بعد کا ہے۔ واللہ أعلم. ③ روایت میں ہے کہ ساتویں شخص کا نام بھی لیا لیکن راوی کو بھول گیا، بھولنے والے ابواسحاق راوئ حدیث ہیں کبھی ان کو یاد آتا تو اس کی وضاحت کر دیتے جیسا کہ امام بخاری نے ایک روایت میں صراحت کی ہے کہ وہ عمارہ بن ولید تھا۔[5] لیکن عمارہ بن ولید، غزوۂ بدر کے موقع

---

[1] فتح الباري:453/1. [2] عمدة القاري:671/2. [3] فتح الباري:456/1. [4] فتح الباري:866/8. [5] صحيح البخاري، الصلاة، حديث:520.

پر نہیں مرا بلکہ وہ حبشہ کی سرزمین پر واصل جہنم ہوا جبکہ اس نے نجاشی کی عورت کے ساتھ شرارت کی تھی۔[1] اسی طرح عقبہ بن ابی معیط بھی میدان بدر میں نہیں مارا گیا بلکہ اسے میدان بدر میں قید کر کے مدینہ کے پاس پہنچ کر قتل کیا گیا جیسا کہ علامہ عینی نے لکھا ہے۔ اسے عرق الظبیہ کے مقام پر خود رسول اللہ ﷺ نے قتل کیا اور آپ نے اسے قتل کرتے وقت نجاست ڈالنے کا واقعہ بھی یاد دلایا۔[2] معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا: میں نے ان لوگوں کو دیکھا جن کا رسول اللہ ﷺ نے نام لیا تھا، وہ بدر کے کنویں میں مرے پڑے تھے، یہ اکثریت کی بنا پر ہے کیونکہ تمام کے تمام اس کنویں میں نہیں پھینکے گئے تھے۔[3] ④ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبی شرافت اور بلندیٔ مرتبہ کے ساتھ ساتھ حوصلے اور دل کی بھی مضبوط تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے برملا طور پر سرداران قریش کو برا بھلا کہا اور کسی کو ان کے مقابلے میں جواب دینے کی بھی جرأت نہ ہو سکی۔[4] ⑤ بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے کہ دوران نماز میں نجاست لگنے سے نماز میں خلل نہیں آتا، البتہ نماز کے آغاز میں ہر قسم کی طہارت کا اہتمام ضروری ہے۔ واللہ أعلم.

(٧٠) بَابُ الْبُصَاقِ وَالْمُخَاطِ وَنَحْوِهِ فِي الثَّوْبِ

باب:70- کپڑے میں تھوک اور بلغم وغیرہ لگ جانے کا بیان

وَقَالَ عُرْوَةُ عَنِ الْمِسْوَرِ وَمَرْوَانَ: خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ زَمَنَ حُدَيْبِيَةَ فَذَكَرَ الْحَدِيثَ: وَمَا تَنَخَّمَ النَّبِيُّ ﷺ نُخَامَةً إِلَّا وَقَعَتْ فِي كَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهُ وَجِلْدَهُ.

عروہ نے حضرت مسور اور مروان سے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ حدیبیہ کے سال نکلے۔ اس کے بعد انھوں نے حدیث بیان کی۔ اس میں ہے کہ نبی ﷺ نے جب تھوکا تو لوگوں میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرا اور انھوں نے اسے اپنے منہ اور بدن پر مل لیا۔

٢٤١ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: بَزَقَ النَّبِيُّ ﷺ فِي ثَوْبِهِ. قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: طَوَّلَهُ ابْنُ أَبِي مَرْيَمَ، قَالَ: أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ قَالَ: حَدَّثَنِي حُمَيْدٌ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. [انظر: ٤٠٥، ٤١٢، ٤١٣، ٤١٧، ٥٣١، ٥٣٢، ٨٢٢، ١٢١٤]

[241] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے ایک مرتبہ اپنے کپڑے میں تھوکا۔ امام بخاری کہتے ہیں: اس حدیث کو ابن مریم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ انھوں نے کہا: ہم نے یحییٰ بن ایوب سے بواسطۂ حمید سنا، انھوں نے کہا: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کی یہی روایت سنی۔

فوائد و مسائل: ① اقذار کے متعلق وضاحت کی جارہی ہے جو قذر کی جمع ہے۔ قابل نفرت چیز کو قذر کہا جاتا ہے۔ اس کی دو

① فتح الباري:457/1. ② عمدة القاري:677/2. ③ فتح الباري:457/1. ④ فتح الباري:458/1.

قسمیں ہیں: ✱ قابل نفرت کے ساتھ ساتھ نجس بھی ہو، جیسے بول و براز اور منی وغیرہ۔ ✱ قابل نفرت ہونے کے باوجود ناپاک نہ ہو، جیسے تھوک، بلغم اور پسینہ وغیرہ۔ اس باب میں امام بخاری ان اقذار کا حکم بیان کرتے ہیں جو قابل نفرت تو ہیں لیکن نجس نہیں۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی تھوک اور ناک سے بہنے والی رطوبت کو منہ اور ناک سے الگ ہونے کے بعد نجس خیال کرتے تھے۔ اس مسئلے میں امام بخاری رحمہ اللہ جمہور کے ہم نوا ہیں کہ تھوک اور بلغم وغیرہ پاک ہیں، اگر کپڑے کو لگ جائیں تو کپڑا ناپاک نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر یہ چیزیں پانی میں گر جائیں تو اس سے پانی نجس نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے استعمال سے دوسروں کو گھن آئے لیکن ہر گھن والی چیز کا ناپاک ہونا ضروری نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن حزم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت سلمان فارسی اور ابراہیم نخعی کے نزدیک لعاب دہن نجس ہے بشرطیکہ منہ سے الگ ہو جائے۔[1] ② علامہ عینی نے لکھا ہے: تھوک کے متعلق کچھ تفصیل ہے کہ اگر منہ پاک ہوگا تو تھوک بھی پاک ہوگا اور اگر تھوک ایسے شخص کا ہو جس نے شراب نوشی کی ہے تو اس وقت اس کا تھوک بھی نجس ہوگا اور جوٹھا بھی ناپاک ہوگا۔[2] ③ مروان کے والد فتح مکہ کے دن اسلام لائے تھے، بعض وجوہات کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے انھیں جلاوطن کر دیا تھا، حضرت مروان بھی ان کے ساتھ طائف چلے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں باپ حکم اور بیٹے مروان دونوں کو مدینہ طیبہ بلا لیا تھا۔ مروان حدیبیہ کے موقع پر موجود نہ تھے، پھر ان سے مذکورہ روایت کی کیا حیثیت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل روایت تو حضرت مسور رضی اللہ عنہ سے ہے اور اس کے ساتھ مروان کی روایت کو بطور تائید ملا دیا گیا ہے لیکن اعتراض پھر بھی باقی رہتا ہے کہ جو شخص موقع پر وہاں موجود نہیں تھا اس کی روایت سے تقویت حاصل کرنا چہ معنی دارد؟ ممکن ہے کہ حضرت مروان نے صلح حدیبیہ سے متعلق اس روایت کو کسی اور صحابی سے سنا ہو۔ واللّٰہ أعلم. مفصل روایت صلح حدیبیہ کے باب میں بیان ہوگی۔

④ رسول اللہ ﷺ کا کپڑے میں تھوکنا اس وجہ سے تھا کہ آپ نے مسجد میں دیوار کے ساتھ تھوک لگا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ دوران نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو اپنی بائیں طرف یا قدموں کے نیچے تھوکے، پھر آپ نے چادر کے کونے پر تھوک کر اس کے کناروں کو مل دیا اور فرمایا کہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے لیکن کپڑے میں تھوکنے کی صورت اس وقت ہے جب اس سے جلدی فراغت کی ضرورت ہو جیسا کہ امام بخاری نے کتاب الصلاۃ میں ایک عنوان (باب:39) بایں الفاظ قائم کیا ہے: [إِذَا بَدَرَهُ الْبُزَاقُ فَلْيَأْخُذْ بِطَرَفِ ثَوْبِهِ] "جب تھوک کا غلبہ ہو تو چادر کے کسی کنارے میں تھوک دے۔" اگرچہ مذکورہ حدیث سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی، تاہم صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کی وضاحت ہے۔[3] چونکہ وہ روایت امام بخاری کی شرط کے مطابق نہ تھی، لہٰذا عنوان میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔[4] ان احادیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اگر نماز میں اس کی ضرورت پیش آ جائے تو اسے منہ میں جمع کرنے کے بجائے اپنے بائیں طرف تھوک لے اور اگر بائیں جانب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اپنے پاؤں کے نیچے تھوک لے اور اگر غلبے کی صورت ہو تو کپڑے میں تھوک کر اسے مل لے، لیکن موجودہ حالات میں بائیں جانب یا قدموں کے نیچے تھوکنے کے بجائے کپڑے والی صورت ہی متعین ہے۔ واللّٰہ أعلم.

---

1 فتح الباري:459/1. 2 عمدة القاري:681/2. 3 فتح الباري:465/1. 4 صحيح مسلم، حديث:1228(550).

(٧١) بَابٌ: لَا يَجُوزُ الْوُضُوءُ بِالنَّبِيذِ وَلَا الْمُسْكِرِ

باب:71- نبیذ اور نشہ آور چیزوں سے وضو جائز نہیں

وَكَرِهَهُ الْحَسَنُ وَأَبُو الْعَالِيَةِ، وَقَالَ عَطَاءٌ: التَّيَمُّمُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْوُضُوءِ بِالنَّبِيذِ وَاللَّبَنِ.

امام حسن اور ابوالعالیہ نے ایسی چیزوں سے وضو کرنے کو مکروہ خیال کیا ہے۔ حضرت عطاء نے کہا: میرے نزدیک نبیذ اور دودھ سے وضو کرنے کے بجائے تیمّم کر لینا بہتر ہے۔

وضاحت: نبیذ یہ ہے کہ پانی میں کھجوریں اس وقت تک ڈالے رکھیں حتی کہ اس میں حلاوت پیدا ہو جائے۔ اس کا نوش کرنا جائز ہے۔ اور اگر زیادہ دیر تک کھجوریں پڑی رہیں یا پانی میں کھجوریں ڈال کر اسے جوش دیا جائے تا آنکہ اس میں سرور کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کا نوش کرنا منع ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے، جب پانی نہ ملے تو نبیذ سے وضو کرنے کو جائز کہا ہے جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک نبیذ سے وضو جائز نہیں، بلکہ اس کی موجودگی میں تیمّم کرنا تجویز کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔ حسن بصری کے اثر کو ابن ابی شیبہ (11/1) وغیرہ نے موصولاً بیان کیا ہے کہ نبیذ سے وضو نہ کیا جائے۔ اور ابوعبید نے ایک دوسری سند سے بیان کیا ہے کہ اس سے وضو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک کراہت تحریمی نہیں بلکہ تنزیہی ہے۔ ابوخلدہ کہتے ہیں: میں نے ابوالعالیہ سے دریافت کیا کہ ایک آدمی بحالت جنابت ہے لیکن اسے پانی میسر نہیں، کیا وہ نبیذ سے غسل کر سکتا ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں۔[1] ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اسے ناپسند فرمایا۔ اسی طرح عطاء بن ابی رباح کے اثر کو بھی ابوداود نے موصولاً بیان کیا ہے۔[2] امام اوزاعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہر قسم کے نبیذ سے وضو جائز ہے۔ حضرت عکرمہ سے بھی اس کا جواز منقول ہے۔[3]

٢٤٢ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كُلُّ شَرَابٍ أَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ». [انظر: ٥٥٨٥، ٥٥٨٦]

[242] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتی ہیں، آپ نے فرمایا: ”ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو، حرام ہے۔“

فوائد ومسائل: ① پانی میں شامل ہونے والی چیزیں دو طرح کی ہوتی ہیں: ناپاک اور پاک۔ پھر پاک کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جو پاک ہونے کے باوجود قابل نفرت ہوتی ہیں، جیسے تھوک یا بلغم وغیرہ۔ دوسری وہ جو قابل نفرت نہیں ہوتیں، جیسے کھجور وغیرہ۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ اگر پانی میں کوئی ناپاک چیز شامل ہوگئی اور اس نے تغیر پیدا کر دیا تو اس سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ اور پاک مگر قابل نفرت چیزوں کے متعلق اس سے پہلے باب میں وضاحت کر آئے ہیں۔ اب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر پانی میں کوئی چیز مل جائے جو پاک ہونے کے ساتھ ساتھ قابل نفرت نہ ہو اور اس نے پانی کے تینوں اوصاف میں سے کوئی وصف

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث:87. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث:86. ③ فتح الباري:460/1.

بدل دیا یا اس پر پانی کا اطلاق نہ ہو سکے تو اس سے وضو جائز نہیں۔ امام بخاری ؒ کا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ اگر پانی میں ملنے والی کسی چیز سے نہ پانی کا نام بدلا اور نہ اس کے اوصاف ہی میں کوئی تبدیلی آئی، ایسی صورت میں اس سے وضو کرنا ناجائز نہیں ہوگا۔ ② امام بخاری ؒ نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے حدیث عائشہ ؓ کو بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ مشروب جو نشہ آور ہو حرام ہے۔ وضو ایک عبادت ہے جس میں کسی حرام چیز کو استعمال نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا نشہ آور چیز سے وضو کرنا حرام ہے۔ امام بخاری کا استدلال بایں طور ہے کہ سکر (نشہ آور چیز) میں تعمیم ہے: سکر بالفعل ہو، جیسے شراب وغیرہ یا بالقوہ ہو، جیسے نبیذ وغیرہ، ان سے وضو کرنا درست نہیں ہے۔ نبیذ میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اگر اسے زیادہ دیر تک رکھا جائے یا اسے زیادہ جوش دیا جائے تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نبیذ تیار ہو جانے کے بعد اس سے لفظ ''پانی'' زائل ہو جاتا ہے، یعنی اس پر پانی کا لفظ نہیں بولا جاتا جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ ''جب تم پانی نہ پاؤ تو پاکیزہ مٹی سے تیمم کر لو۔''[1] امام بخاری نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبیذ کی موجودگی میں تیمم تو ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس پانی نہیں۔ واضح رہے کہ جن روایات میں نبیذ سے وضو کرنے کی اجازت مروی ہے وہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتیں، لہٰذا انھیں بطور دلیل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ③ امام تدبر نے اس مقام پر بھی تدبر سے کام نہیں لیا اور جھٹ سے امام بخاری پر اعتراض جڑ دیا ہے، ملاحظہ فرمائیں: ''معلوم نہیں اس باب کے باندھنے کی ضرورت کیا تھی؟ پانی کے علاوہ کسی اور چیز سے وضو کرنے کی اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''[2] فقہائے احناف نے نبیذ سے وضو کرنے کے لیے اپنی تمام تر علمی اور فکری توانائیوں کو صرف کر ڈالا ہے۔ فقہ کی ہر کتاب میں اسے بڑی شد ومد سے بیان کیا گیا ہے۔ امام بخاری ؒ ان حضرات کی یہاں تردید فرما رہے ہیں لیکن اصلاحی صاحب اس سے بے خبر ہیں، نہ معلوم کیوں؟

(٧٢) بَابُ غَسْلِ الْمَرْأَةِ أَبَاهَا الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ

باب:72- عورت کا اپنے باپ کے چہرے سے خون دھونا

وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ: اِمْسَحُوا عَلٰى رِجْلِي فَإِنَّهَا مَرِيضَةٌ.

ابوالعالیہ نے کہا: میرے پاؤں پر مسح کر دو کیونکہ وہ صحت مند نہیں ہے۔

وضاحت: امام بخاری ؒ سابقہ ابواب میں مقدمات وضو میں کسی غیر کی اعانت کو جائز قرار دے چکے ہیں۔ اس عنوان میں اصل وضو میں بھی دوسروں کی اعانت کو جائز قرار دیا جا رہا ہے جیسا کہ ابوالعالیہ سے مروی ہے۔ مصنف عبدالرزاق (162/1) میں اس کی تفصیل ہے کہ عاصم بن ابی سلیمان حضرت ابوالعالیہ کی تیمارداری کے لیے ان کے ہاں گئے، دوسرے لوگوں نے انھیں وضو کرایا، جب ایک پاؤں باقی رہ گیا تو انھوں نے فرمایا: اس پر مسح کر دو کیونکہ یہ تندرست نہیں ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ (247/1) میں ہے کہ پاؤں پر زخم کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔

---

[1] المآئدۃ 6:5. [2] تدبر حدیث: 334/1.

٢٤٣ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ أَبِي حَازِمٍ، سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ السَّاعِدِيَّ وَسَأَلَهُ النَّاسُ وَمَا بَيْنِي وَبَيْنَهُ أَحَدٌ: بِأَيِّ شَيْءٍ دُووِيَ جُرْحُ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: مَا بَقِيَ أَحَدٌ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، كَانَ عَلِيٌّ يَجِيءُ بِتُرْسِهِ فِيهِ مَاءٌ، وَفَاطِمَةُ تَغْسِلُ عَنْ وَجْهِهِ الدَّمَ، فَأُخِذَ حَصِيرٌ فَأُحْرِقَ فَحُشِيَ بِهِ جُرْحُهُ. [انظر: ٢٩٠٣، ٢٩١١، ٣٠٣٧، ٤٠٧٥، ٥٢٤٨، ٥٧٢٢]

[243] حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، لوگوں نے ان سے سوال کیا: نبی ﷺ کے زخم پر کون سی دوا استعمال کی گئی تھی؟ انھوں نے فرمایا: اس کے متعلق مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی شخص نہیں رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال میں پانی لاتے تھے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے چہرۂ مبارک سے خون دھوتی تھیں۔ پھر ایک بوریا لایا گیا اور اسے جلانے کے بعد اس کی راکھ کو آپ کے زخم میں بھر دیا گیا۔

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر غزوۂ احد کے وقت زخم لگا تھا۔ جب پانی ڈالنے سے خون بند نہ ہوا تو ایک پرانا بوریا جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر دی گئی۔ یہ راکھ اپنے اندر یہ خصوصیت رکھتی ہے کہ اس سے خون فوراً بند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کا ختنہ کرنے کے بعد اس مقام پر راکھ لگا دی جاتی ہے لیکن آج کل ترقی یافتہ دور میں جدید سہولیات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات سے ختنہ کرانے میں دو فائدے ہیں: * بچے کو تکلیف نہیں ہوتی کیونکہ وہ ختنے سے قبل ٹیکہ لگا کر جگہ سن کر دیتے ہیں۔ * ایسی ادویات استعمال کی جاتی ہیں جن سے زخم جلدی مندمل ہو جاتا ہے۔ ② حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس وقت مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں کیونکہ یہ واقعہ غزوۂ احد کے موقع پر پیش آیا اور جب حضرت سہل نے یہ حدیث بیان کی تو اس وقت اس واقعے پر اسی سال سے زائد عرصہ بیت چکا تھا اور حضرت سہل مدینے میں سب سے آخری وفات پانے والے صحابی ہیں۔ انھوں نے 91 ہجری میں وفات پائی جبکہ ان کی عمر سو سال ہو چکی تھی۔[1] ③ علامہ ابن بطال نے اس حدیث سے مندرجہ ذیل فوائد کا استخراج کیا ہے: ۞ عورت اپنے باپ اور دیگر محارم کی خدمت اور تیمارداری کے پیش نظر ان کا بدن چھو سکتی ہے۔ ۞ دوا اور علاج کا جواز معلوم ہوا اور ایسا کرنا توکل کے منافی نہیں۔ ۞ علاج معالجے میں دوسروں سے مدد لینے کا جواز ثابت ہوا۔ ۞ بوریا جلا کر اس کی راکھ زخموں پر لگانے کی افادیت معلوم ہوئی۔ ۞ مصائب و آلام میں حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی مبتلا کیا جاتا رہا ہے۔ ۞ لوگ اگر کسی چیز سے واقف نہ ہوں تو وہ اہل علم سے استفسار کا حق رکھتے ہیں۔[2] ④ عنوان میں "عَنْ وَجْهِهِ" کا اضافہ صرف مطابقت واقعہ کی رعایت سے کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے دست مبارک سے رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک دھو رہی تھیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اگر چہرے کے علاوہ بدن کے کسی اور حصے کو ہاتھ لگائے تو اس کا الگ حکم ہوگا۔ اور اس روایت کو کتاب الوضوء میں لانے کی مناسبت یہ ہے کہ وضو لغوی لحاظ سے وضاءۃ سے مشتق ہے جس کے معنی حسن و نظافت ہیں، لہٰذا چہرے سے خون کی آلائش کو دور کرنا اس میں داخل ہوگا، لیکن ارباب "تدبر" نے تو امام بخاری رحمہ اللہ پر طعن کرنا ہے، چنانچہ اصلاحی صاحب کہتے ہیں: "اس میں کسی شرعی حکم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس پر باب باندھنے کی ضرورت نہ تھی۔"[3] لیکن

① فتح الباري:1/462. ② شرح ابن بطال:1/362، وعمدة القاري:2/689. ③ تدبر حدیث:1/334.

ہمارے نزدیک امام بخاری ؒ کی یہ عظمت ہے کہ ان کے مخالفین بھی چاروناچار ان کی دقت نظر کا اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں، چنانچہ اصلاحی صاحب امام بخاری کی باریک بینی بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: ''اگر سیدہ فاطمہ ؓ نے نبی ﷺ کا زخم دھویا تو یہ تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ دنیا کی تمام خواتین کے لیے اور لڑکیوں کے لیے یہ ایک نمونہ ہے۔ اس حوالے سے امام صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اعضائے وضو پر زخم وغیرہ کی صورت میں وضو میں کسی دوسرے سے مدد لی جاسکتی ہے۔''[1]

(٧٣) بَابُ السِّوَاكِ

باب:73-مسواک کرنا

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: بِتُّ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَاسْتَنَّ.

حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا: میں ایک رات نبی ﷺ کے ہاں رہا تو آپ نے مسواک کی۔

وضاحت: مسواک کے مسنون ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام بخاری ؒ نے اس سلسلے میں حضرت ابن عباس ؓ کا ایک اثر بیان کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاں رات گزاری اور دیکھا کہ آپ نے مسواک فرمائی۔ اس اثر کو امام بخاری نے متعدد مقامات پر باسند بیان کیا ہے، البتہ ان الفاظ کے ساتھ کتاب التفسیر میں لائے ہیں۔[2]

٢٤٤ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ ابْنُ زَيْدٍ عَنْ غَيْلَانَ بْنِ جَرِيرٍ، عَنْ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَوَجَدْتُهُ يَسْتَنُّ بِسِوَاكٍ بِيَدِهِ، يَقُولُ: «أُعْ، أُعْ»، وَالسِّوَاكُ فِي فِيهِ كَأَنَّهُ يَتَهَوَّعُ.

[244] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں ایک دفعہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ اپنے ہاتھ مبارک سے مسواک کررہے تھے۔ مسواک آپ کے منہ میں تھی اور آپ اع، اع کی آواز نکال رہے تھے، گویا آپ قے کررہے ہیں۔

٢٤٥ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ. [انظر: ٨٨٩، ١١٣٦]

[245] حضرت حذیفہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب رات کو اٹھتے تو (پہلے) اپنے منہ کو مسواک سے صاف کرتے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے مسواک کو وضو کی سنت ثابت کرنے کے لیے کتاب الوضوء میں مذکورہ عنوان قائم کیا ہے کیونکہ مسواک متعلقات وضو سے ہے۔ اسے کتاب الصلاۃ میں بھی لائیں گے تاکہ اس کے سنت صلاۃ ہونے کو بھی واضح کیا جائے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اگر مجھے لوگوں پر گرانی کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کو ضروری قرار دے دیتا۔[3] اسی طرح وضو کے متعلق بھی ارشاد نبوی ہے کہ اگر مجھے امت پر گرانی کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر وضو کے ساتھ مسواک کو لازم

---

1 تدبر حدیث: 334/1. 2 صحیح البخاري، التفسیر، حدیث: 4569. 3 صحیح البخاري، الجمعة، حدیث: 887.

قرار دے دیتا۔[1] مسواک کرتے وقت منہ سے اُع اُع کی آواز کا پیدا ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ مسواک زبان پر پھیری جاتی تھی کیونکہ جب زبان پر بلغم وغیرہ جم جاتی ہے تو قراءت کے وقت تکلف ہوتا ہے، اس لیے زبان کو صاف کرنے کے لیے مسواک کا عمل رکھا گیا ہے۔ ② مسواک کے مستحب اوقات حسب ذیل ہیں: ❀ وضو کے ساتھ۔ ❀ نماز کے وقت۔ ❀ تلاوت قرآن کے لیے۔ ❀ سونے سے پہلے۔ ❀ نیند سے بیدار ہو کر۔ ❀ جمعے کے دن۔ ❀ کھانے کے وقت۔ ❀ منہ میں کسی وجہ سے بو پیدا ہونے کی صورت میں۔ واضح رہے کہ منہ میں کئی ایک وجوہات کی بنا پر بو پیدا ہو جاتی ہے، چند ایک حسب ذیل ہیں: ❀ کھانے پینے کا ترک۔ ❀ بو والی چیز تناول کرنا۔ ❀ مسلسل سکوت۔ ❀ کثرت کلام۔ مزید برآں حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسواک کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔[2] ③ مسواک کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے رب کبریا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ منہ کی پاکیزگی اور صفائی کا ذریعہ ہے، اس سے مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں، قوت حافظہ کو بڑھاتی اور ترقی دیتی ہے، نظر کو تیز کرتی اور اس کی روشنی کو بڑھاتی ہے، فاضل رطوبتوں کا ازالہ اور اخراج کرتی ہے، معدے کے نظام کو درست رکھتی ہے۔ پابندی سے مسواک کرنے والا درد دنداں سے محفوظ رہتا ہے۔ ان کے علاوہ بے شمار فوائد ہیں جن کا طب جدید نے بھی اعتراف کیا ہے۔ ④ حضرت حذیفہ ؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو نیند سے بیدار ہوتے تو مسواک سے منہ صاف کرتے تھے، یعنی سونے کی وجہ سے جو بخارات معدے سے چڑھ کے زبان پر جم جاتے ہیں، ان سے بھی قراءت متاثر ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ ان کے ازالے کے لیے مسواک کا عمل کرتے تھے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زبان پر طول کے بل مسواک کرنا مشروع ہے جبکہ دانتوں پر عرض کے بل کرنی چاہیے۔[3]

(٧٤) بَابُ دَفْعِ السِّوَاكِ إِلَى الْأَكْبَرِ

باب:74- بڑے شخص کو پہلے مسواک دینا

٢٤٦ - وَقَالَ عَفَّانُ: حَدَّثَنَا صَخْرُ بْنُ جُوَيْرِيَةَ عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أَرَانِي أَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ فَجَاءَنِي رَجُلَانِ: أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْآخَرِ، فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْأَصْغَرَ مِنْهُمَا، فَقِيلَ لِي: كَبِّرْ، فَدَفَعْتُهُ إِلَى الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا». قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: اِخْتَصَرَهُ نُعَيْمٌ عَنِ ابْنِ الْمُبَارَكِ، عَنْ أُسَامَةَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ.

[246] حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنے آپ کو خواب میں مسواک کرتے دیکھا، پھر میرے پاس دو شخص آئے، ان میں ایک عمر میں دوسرے سے بڑا تھا۔ میں نے ان میں سے چھوٹے کو مسواک دے دی تو مجھے ہدایت کی گئی کہ بڑے کا لحاظ کرو، تب میں نے وہ مسواک بڑے کو دے دی۔'' امام بخاری ؒ کہتے ہیں کہ نعیم نے ابن عمر ؓ سے بروایت ابن مبارک عن اسامہ عن نافع اس حدیث کو مختصر بیان کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے شرح تراجم ابواب بخاری میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت

① مسند أحمد:250/2. ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث:590 (253). ③ فتح الباري :463/1.

مبارکہ تھی کہ جب کوئی معمولی چیز آتی تو چھوٹوں کو عنائت فرماتے، چنانچہ جب آپ کے پاس کوئی نیا پھل آتا تو آپ وہ پھل پہلے بچوں میں تقسیم کرتے اور جب کوئی بڑی چیز آتی تو بڑوں کو عنائت فرماتے، اس بنا پر آپ نے مسواک کو چھوٹا خیال کیا اور چھوٹے کو دینی چاہی تو آپ کو بذریعہ وحی ہدایت کی گئی کہ بڑے کو دیجیے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک بھی مسواک کی بہت فضیلت اور بڑائی ہے۔ ② ابن بطال نے لکھا ہے کہ حاضرین میں سے اکابر کا حق اصاغر پر مقدم ہے اور کھانے، پینے، گفتگو وغیرہ میں بڑوں کو پہلے موقع دینا چاہیے کیونکہ مسواک کے متعلق آپ کو حکم ہوا کہ بڑے کو دیجیے۔ ایک موقع پر آپ نے حویصہ اور محیصہ کو کہا تھا کہ بڑے کو گفتگو کا پہلے موقع دیا جائے اور یہ اسلامی آداب سے ہے۔ مہلب نے فرمایا کہ بڑی عمر والے کو ہر چیز میں مقدم کرنا چاہیے اور یہ اس صورت میں ہے جب لوگ ترتیب سے نہ بیٹھے ہوں، جب ترتیب سے بیٹھے ہوں تو سنت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے دائیں جانب سے آغاز کیا جائے۔[1] ③ حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسواک کر رہے تھے کہ آپ کے پاس دو شخص آئے جن میں سے ایک دوسرے سے بڑا تھا، اس وقت آپ کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ ان میں سے بڑے کو مسواک دیجیے۔[2] حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے۔ اسے تعدد واقعات پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو خواب میں دیکھا پھر وہی واقعہ عالم بیداری میں پیش آیا جیسا کہ متعدد واقعات کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ پہلے انھیں خواب میں دیکھتے پھر بیداری میں ان سے واسطہ پڑتا۔[3] ④ اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے کی مسواک استعمال کرنا مکروہ نہیں لیکن سنت یہ ہے کہ اسے دھو کر استعمال کیا جائے۔ حدیث میں حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے مسواک دیتے تاکہ میں اسے دھو دوں۔ میں اسے پہلے خود استعمال کرتی پھر دھو کر رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دیتی۔[4] اس موقع پر ارباب ''تدبر'' نے بھی گوہر افشانی کی ہے، ملاحظہ فرمائیں: ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس خواب کو یہاں بیان کرنے کا موقع کیا ہے؟ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جا سکتا کہ آپ مسواک کر رہے ہوں اور اگر کوئی دو آدمی کہیں کہ یہ ہمیں دے دو تو بڑے کو دیں اور چھوٹے کو نہ دیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ میری مسواک ہے آپ اپنی مسواک حاصل کریں۔''[5] دراصل منطقی اور فلسفی حضرات کی طرح ان ''صاحبان تدبر'' کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ حدیث فہمی سے اللہ تعالیٰ نے انھیں محروم رکھا ہے۔ قاتلهم اللّٰه أنّٰى يؤفكون.

(٧٥) بَابُ فَضْلِ مَنْ بَاتَ عَلَى الْوُضُوءِ

باب:75- باوضو سونے کی فضیلت

٢٤٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ سَعْدِ بْنِ عُبَيْدَةَ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ:

[247] حضرت براء بن عازب ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''جب تم اپنی خوابگاہ میں جاؤ تو پہلے نماز کا سا وضو کرو، پھر اپنے دائیں

---

① شرح ابن بطال:364/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث:50. ③ فتح الباري:464/1. ④ سنن أبي داود، الطهارة، حديث:52 وعمدة القاري:694/1. ⑤ تدبر حديث:336/1.

قَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلَى شِقِّكَ الْأَيْمَنِ، ثُمَّ قُلْ: اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ رَغْبَةً وَّرَهْبَةً إِلَيْكَ، لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، اَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ، فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ، فَأَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ، وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهِ»، قَالَ: فَرَدَّدْتُهَا عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَلَمَّا بَلَغْتُ: «اَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ»، قُلْتُ: وَرَسُولِكَ، قَالَ: «لَا، وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ». [انظر: ٦٣١١، ٦٣١٣، ٦٣١٥،

پہلو پر لیٹ کر یہ دعا پڑھو: [اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَ فَوَّضْتُ......] ''اے اللہ! تیرے ثواب کے شوق میں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہوئے، میں نے خود کو تیرے سپرد کر دیا اور اپنا کام تجھے سونپ دیا، نیز تجھے اپنا پشت پناہ بنا لیا۔ تجھ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور ٹھکانا نہیں مگر تیرے ہی پاس۔ اے اللہ! میں اس کتاب پر ایمان لایا جو تو نے اتاری اور تیرے اس نبی پر یقین کیا جسے تو نے بھیجا۔'' اب اگر تم اس رات مر جاؤ تو فطرتِ اسلام پر مرو گے، نیز یہ دعائیہ کلمات سب باتوں سے فارغ ہو کر (بالکل سوتے وقت) پڑھو۔'' حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ کلمات آپ کے سامنے دہرائے۔ جب میں اس جگہ پہنچا: آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ تو اس کے بعد میں نے وَرَسُولِكَ کہہ دیا تو آپ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ یوں کہو: [وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ]''

فوائد و مسائل: ① معلوم ہوا کہ ادعیۂ مسنونہ اور اذکار ماثورہ میں جو الفاظ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں ان میں تصرف درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے جامع کلمات عطا ہوئے ہیں۔ اس جامعیت و خصوصیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو نبيك کے بجائے رسولك پڑھنے سے اس بنا پر منع فرمایا کہ نبی میں جو جامعیت ہے وہ رسول میں نہیں کیونکہ رسول کا اطلاق فرشتوں پر بھی ہوا ہے، حالانکہ وہ نبی نہیں، نیز ان دعائیہ کلمات میں نبوت و رسالت کے دونوں اوصاف کا ذکر ہے جبکہ رسولك کہنے سے صرف ایک وصف کا ذکر ہوتا ہے۔[1] ② اس حدیث سے قبل از نیند باوضو ہونے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، نیز واضح رہے کہ یہ وضو نماز کا نہیں بلکہ اسے وضوءِ احداث کہتے ہیں۔ حدیث میں ہر قسم کے وضو کو «شطر الأيمان» کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے باوضو ہو تو کیا وہ بھی سونے کے وقت دوبارہ وضو کرے؟ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بظاہر حدیث الباب سے تجدید وضو کا مفہوم معلوم ہوتا ہے، یعنی اگرچہ وہ طہارت سے ہو پھر بھی وضو کرے، تاہم احتمال اس امر کا بھی ہے کہ نیند کے وقت امر وضو حالتِ حدث ہی کے ساتھ خاص ہو۔[2] علامہ عینی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر پہلے سے باوضو ہے تو وہ پہلا وضو ہی کافی ہے کیونکہ مقصود طہارت کی حالت میں سونا ہے، مبادا اگر رات کو موت آ جائے تو بے طہارت مرے، نیز اس وضو کی برکت سے اس کو اچھے اور سچے خواب نظر آئیں گے اور وہ شیطانی اثرات سے بھی محفوظ رہے گا۔[3] ③ دائیں جانب کو ترجیح دینا تمام مواقع میں شریعت کو زیادہ پسند ہے،

① فتح الباري:466/1. ② فتح الباري:465/1. ③ عمدة القاري:698/2.

اسی طرح سوتے وقت دائیں کروٹ پسند کی گئی ہے کہ ایسا کرنے سے دل معلق رہتا ہے، نیند کا استغراق نہیں ہوتا، اس صورت میں انسان سہولت اور عجلت سے بیدار ہوسکتا ہے۔ موت علٰی فِطْرۃِ کا مطلب یہ ہے کہ جس فطری حالت میں انسان گناہوں کے بغیر دنیا میں آیا تھا، اسی حالت پر گناہوں کی آلائش کے بغیر ہی واپس لوٹ جائے گا۔ واللّٰہ أعلم۔ ④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث پر کتاب الوضوء کو اس لیے ختم کیا ہے کہ یہ انسان کے زمانۂ بیداری کا آخری وضو ہوتا ہے، نیز حدیث کے مطابق کلمات مذکورہ کو بیداری کے آخری کلمات قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ختم کتاب کی طرف اشارہ کر دیا۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا طریقۂ کار یہ ہے کہ کتاب کے اختتام پر آخرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور موت کی یاددہانی کراتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی "فَإِنْ مُتَّ" کے الفاظ سے وضاحت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

1 فتح الباري :1/466.

فرمانِ رسولِ مکرّم
اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ
حَلِیْمٌ حَیِیٌّ سِتِّیْرٌ
یُحِبُّ الْحَیَاءَ وَالسِّتْرَ
فَاِذَا اغْتَسَلَ اَحَدُکُمْ
فَلْیَسْتَتِرْ
اللہ عزوجل خوب بردبار، انتہائی حیادار، اور بہت پردے والا ہے۔ حیا اور پردے کو پسند فرماتا ہے، لہٰذا جب تم میں سے کوئی غسل کرے تو پردے میں کرے۔
ابوداود، حدیث: 4012

غسل کے احکام و آداب

امام بخاری رحمہ اللہ نے طہارت صغریٰ (وضو) کا بیان ختم کر کے طہارت کبریٰ (غسل) کا ذکر شروع فرمایا ہے۔ طہارت صغریٰ کو اس لیے مقدم کیا ہے کہ طہارت کبریٰ کے مقابلے میں اس کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے۔ واضح رہے کہ موجبات غسل کئی چیزیں ہیں، مثلاً: جنابت، حیض، نفاس، اسلام، احرام، تغسیل میت، نماز جمعہ اور نماز عیدین وغیرہ۔ مؤخر الذکر چار تو استحباب کے درجے میں ہیں جبکہ پہلی چار فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے حیض و نفاس صرف عورتوں کے ساتھ خاص ہیں۔ اور غُسلِ اسلام زندگی میں صرف ایک مرتبہ کیا جاتا ہے اس بنا پر وہ کثیر الوقوع نہیں۔ چونکہ غسل جنابت میں مرد و عورت کو یکساں طور پر واسطہ پڑتا ہے اس بنا پر یہ کثیر الوقوع ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے اس کے احکام و مسائل بیان فرمائے ہیں۔ اس کے متعلق آپ نے 45 چھوٹے بڑے عناوین قائم کیے ہیں، پھر ان کی تفصیل و تشریح کے لیے 75 احادیث بیان کی ہیں۔ ان احادیث کی روشنی میں غسل جنابت کا وجوب، علتِ وجوب، شرائط و واجبات اور احکام و آداب کو ثابت کیا ہے۔ امام بخاری نے آغاز میں دو قرآنی آیات کا حوالہ دے کر اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ غسل جنابت کے سلسلے میں ان آیات کو بنیاد اور اصل کی حیثیت حاصل ہے اور ان کے بعد آنے والی احادیث انھی آیات کی تبیین و تفصیل ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ تراجم ابواب سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ احکام غسل جنابت سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً: غسل سے پہلے وضو کرنا، غسل سے پہلے خوشبو کا استعمال جس کے اثرات غسل کے بعد باقی رہیں، دوران غسل میں صابن وغیرہ کا استعمال، غسل سے پہلے اعضائے مخصوصہ سے آلائش دور کرنے کے بعد ہاتھوں کو مٹی سے صاف کرنا، ہاتھوں کو دھونے سے پہلے برتن میں ڈالنا، دوران غسل میں بالوں کا خلال کرنا، متعدد مرتبہ مباشرت کرنے کے بعد آخر میں ایک ہی غسل کر لینا، غسل میں عدد کا لحاظ رکھا جائے یا صرف تمام بدن پر پانی بہا دیا جائے اور غسل کے لیے کم از کم پانی کی مقدار وغیرہ۔ اور کچھ احکام جنبی انسان کے بارے میں ہیں، مثلاً: وہ بحالت جنابت سو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا بازار جانا یا گھر رہنا شرعاً کیسا ہے؟ اگر مسجد میں یہ حالت (احتلام وغیرہ) پیش آجائے تو

کیا کرے؟ اس کے پسینے کا کیا حکم ہے؟ بیوی خاوند کا اکٹھے غسل کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ خلوت وجلوت میں غسل کرنے کے لوازمات کیا ہیں؟ عورت کو احتلام کا عارضہ لاحق ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ اور خروج مذی کا حکم وغیرہ۔ آخر میں مباشرت کے دوران میں اندام نہانی سے برآمد ہونے والی رطوبت کا شرعی حکم بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بے شمار حقائق و دقائق سے پردہ اٹھایا ہے جو پڑھتے وقت غور و فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ دوران مطالعہ میں ہماری پیش کردہ گزارشات کو مدنظر رکھیں تاکہ امام بخاری کے علم کی گہرائی اور گیرائی کا عملی تجربہ ہو۔ واللہ المستعان وهو يهدي من يشاء إلى سواء السبيل.

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

5 - كِتَابُ الْغُسْلِ

غسل سے متعلق احکام و مسائل

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَإِن كُنتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ ۚ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ [المائدة:٦] وَقَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا﴾ [النساء:٤٣].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر تم بحالت جنابت ہو تو غسل کر لو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے (فارغ ہو کر) آیا ہو یا تم نے عورتوں سے اختلاط کیا ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمّم کر لو۔ اسے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر ملو۔ اللہ تم پر کسی قسم کی تنگی نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ اس کا ارادہ تمھیں پاک کرنے اور تمھیں بھرپور نعمت دینے کا ہے تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔'' نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم بحالت نشہ ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ تا آنکہ تم اپنی بات کو سمجھنے لگو اور بحالت جنابت بھی، جب تک تم غسل نہ کر لو، ہاں اگر تم راہ چلتے گزر جانے والے ہو تو اور بات ہے۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اسے اپنے منہ اور ہاتھوں پر مل لو۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت زیادہ معاف کرنے والا بے حد بخشنے والا ہے۔''

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے ان ہر دو آیات سے غسل جنابت کے واجب ہونے پر استدلال کیا ہے۔ پہلی آیت میں صیغۂ مبالغہ [اِطَّهَّرُوْا] استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ بحالت جنابت جہاں تک اثر جنابت پہنچ چکا ہو وہاں وہاں کوشش کر کے پانی پہنچا کر اس کے اثرات کو زائل کرنا ضروری ہے۔ چونکہ غسل جنابت کا تعلق پورے جسم سے ہے اس سلسلے میں کسی عضو

کا ذکر نہیں جیسا کہ وضو میں اعضائے اربعہ کا ذکر تھا، اس لیے غسل جنابت میں معمولی طہارت کافی نہ ہوگی بلکہ کان، ناک اور حلق کے اندر پانی پہنچانا ضروری ہے۔ ہاں! جس عضو میں پانی پہنچانے سے کسی نقصان کا اندیشہ ہوگا وہاں معافی ہوگی، مثلاً: آنکھوں کے اندر کا معاملہ ہے۔ اگر وہاں پانی پہنچانے کی کوشش کریں گے تو بصارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس لیے اثرات جنابت دور کرنے کے لیے آنکھوں کے اندر پانی پہنچانے کا مکلّف قرار نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے سورۂ مائدہ والی آیت کو پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اس میں مبالغے کا صیغہ آیا ہے، حالانکہ ترتیب کے لحاظ سے یہ سورت، سورۃ النساء کے بعد ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ نے سورۂ مائدہ کی آیت کو سورۂ نساء کی آیت پر اس لیے مقدم کیا ہے کہ سورۂ مائدہ کی آیت میں اطهروا کا لفظ ہے جس میں اجمال اور ابہام تھا اور سورۂ نساء کی آیت میں تغتسلوا کا لفظ ہے، اس میں غسل کی تصریح آ گئی۔ گویا دوسری آیت پہلی آیت کے لیے تفسیر کا کام دیتی ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اطهروا سے اغتسلوا مراد لینے پر دلیل یہ ہے کہ یہی لفظ حائضہ کے سلسلے میں بھی وارد ہوا ہے، وہاں تطهرن سے بالاتفاق اغتسلن مراد لیا گیا ہے۔[1] لیکن علامہ عینی، حافظ ابن حجر کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں، فرماتے ہیں: لفظ اطهروا میں کوئی اجمال نہیں، نہ لغوی اور نہ اصطلاحی، کیونکہ اس کے معنی ہر لحاظ سے غسل بدن کے ہیں۔[2] علامہ کرمانی لکھتے ہیں کہ ان آیات سے امام بخاری کا مقصود یہ ہے کہ غسل جنابت کا وجوب قرآن مجید سے مستفاد ہے۔[3]

(١) بَابُ الْوُضُوءِ قَبْلَ الْغُسْلِ

باب:1- غسل سے پہلے وضو کرنا

٢٤٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ بَدَأَ فَغَسَلَ يَدَيْهِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ يُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِي الْمَاءِ فَيُخَلِّلُ بِهَا أُصُولَ الشَّعَرِ ثُمَّ يَصُبُّ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثَ غُرَفٍ بِيَدَيْهِ، ثُمَّ يُفِيضُ الْمَاءَ عَلَى جِلْدِهِ كُلِّهِ.
[انظر: ٢٦٢، ٢٧٢]

[248] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب غسل جنابت فرماتے تو پہلے دونوں ہاتھ دھوتے۔ پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کرتے۔ بعد ازاں اپنی انگلیاں پانی میں ڈال کر بالوں کی جڑوں کا خلال کرتے۔ پھر دونوں ہاتھوں سے تین چلو لے کر اپنے سر پر ڈالتے۔ اس کے بعد اپنے تمام جسم پر پانی بہاتے۔

٢٤٩ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ زَوْجِ

[249] حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی ﷺ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے (غسل کے وقت) اس طرح وضو فرمایا جس طرح نماز کے لیے کیا جاتا ہے لیکن

[1] فتح الباري:468/1. [2] عمدة القاري:4/3. [3] شرح الكرماني:111/1.

النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: تَوَضَّأَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ غَيْرَ رِجْلَيْهِ وَغَسَلَ فَرْجَهُ وَمَا أَصَابَهُ مِنَ الْأَذٰى، ثُمَّ أَفَاضَ عَلَيْهِ الْمَاءَ ثُمَّ نَحّٰى رِجْلَيْهِ فَغَسَلَهُمَا، هٰذِهِ غُسْلُهُ مِنَ الْجَنَابَةِ. [انظر: ٢٥٧، ٢٥٩، ٢٦٠، ٢٦٦، ٢٧٤، ٢٧٦، ٢٨١]

پاؤں نہیں دھوئے، البتہ اپنی شرمگاہ کو اور جسم پر لگی ہوئی آلائش کو دھویا۔ پھر اپنے اوپر پانی بہایا، اس کے بعد جائے غسل سے الگ ہو کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ یہ آپ کا غسل جنابت تھا۔

فوائد ومسائل: ① غسل چونکہ جامع طہارت ہے، اس میں طہارت استنجا بھی ہے، طہارت وضو بھی اور طہارت غسل بھی، جب یہ تمام طہارتوں کو شامل ہے تو پھر اس کی ترتیب کیا ہونی چاہیے؟ امام بخاری ؒ کا مقصد غسل سے قبل وضو کی مشروعیت کو بیان کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل کی ابتدا وضو سے فرماتے تھے بلکہ حضرت عائشہ ؓ کی ایک روایت میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے غسل کی ابتدا استنجا سے کرتے تھے۔[1] حضرت میمونہ ؓ کی ایک روایت میں یہ بھی وضاحت ہے کہ استنجا کے بعد اپنے ہاتھ کو زمین پر رگڑتے اور اسے خوب صاف کرتے۔[2] حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ کسی حدیث میں (غسل جنابت کرتے وقت) سر کے مسح کا ذکر نہیں ہے۔[3] حضرت عائشہ ؓ، حضرت ابن عمر ؓ، رسول اللہ ﷺ کے غسل جنابت میں وضو کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ اس پر پانی ڈالا۔[4] امام نسائی نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''جنابت کے وضو میں سر کے مسح کو ترک کرنا۔'' ② حضرت عائشہ ؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کرتے وقت پاؤں بھی دھو لیے جائیں جب کہ حضرت میمونہ ؓ کی روایت میں وضاحت ہے کہ پاؤں غسل سے فراغت کے بعد دھوئے جائیں۔ ان روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر نہانے کی جگہ صاف ستھری ہے اور وہاں پانی نہیں ٹھہرتا تو پاؤں وضو کرتے وقت دھو لیے جائیں۔ اگر پانی وہاں جمع ہو جاتا ہے تو غسل سے فراغت کے بعد انھیں دھو لیا جائے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے پاؤں غسل سے فراغت کے بعد اس لیے دھوتے تھے تاکہ غسل کا افتتاح اور اختتام اعضائے وضو سے ہو۔[5] بعض حضرات نے ان دونوں روایات کو بایں طور بھی جمع کیا ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کی حدیث پر عمل کرتے ہوئے پاؤں پہلے بھی دھو لیے جائیں اور حضرت میمونہ ؓ کی روایت کے پیش نظر غسل سے فراغت کے بعد بھی دھو لیے جائیں تاکہ دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے۔ ③ ان دونوں روایات کے پیش نظر غسل کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پردے کا اہتمام کیا جائے، پھر دونوں ہاتھ دھوئے جائیں۔ بعد ازاں دائیں ہاتھ سے پانی ڈال کر بائیں ہاتھ سے شرمگاہ کو دھویا جائے اور اس پر لگی ہوئی آلائش کو دور کیا جائے۔ پھر وضو کا اہتمام ہو، بعد میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچا کر انھیں اچھی طرح تر کیا جائے۔ پھر تمام بدن پر پانی بہا لیا جائے۔ اگر غسل خانہ صاف ستھرا ہو اور پانی جمع نہ ہوتا ہو تو وضو کرتے وقت پاؤں بھی دھوئے جائیں بصورت دیگر غسل سے فراغت کے بعد اس جگہ سے الگ ہو کر پاؤں دھوئے جائیں۔ اس کی تفصیل آئندہ احادیث میں بیان ہوگی۔ ④ شارحین نے

---

1 صحيح مسلم، الحيض، حديث: 718(316). 2 صحيح مسلم، الحيض، حديث: 722(317). 3 فتح الباري: 472/1.
4 سنن النسائي، الغسل والتيمم، حديث: 422. 5 فتح الباري: 470/1.

امام بخاری ؒ کے قائم کردہ عنوان کے تین مفہوم بیان کیے ہیں: ٭غسل کا وضو غسل سے پہلے ہے بعد میں نہیں۔ جب غسل کر لیا اور طہارت حاصل ہوگئی تو بلاضرورت غسل کے بعد وضو کرنا خلاف سنت ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل کے بعد وضو نہ کرتے تھے۔[1] ٭اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ غسل سے پہلے وضو کرنا غسل کا ایک حصہ ہے، اس کی مستقل حیثیت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اعضاء وضو کرتے وقت دھو لیے ہیں انھیں دوران غسل میں دوبارہ دھونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے متعلق امام بخاری ؒ آگے ایک مستقل عنوان (رقم 16) لا رہے ہیں۔ ٭غسل سے پہلے وضو کی کیفیت بیان کرنا مقصود ہے، یعنی اس کا طریقہ وضو جیسا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر جائے غسل صاف ہے اور وہاں پانی کھڑا نہیں ہوتا تو پاؤں غسل سے پہلے وضو کے ساتھ ہی دھو لیے جائیں بصورت دیگر انھیں فراغت کے بعد وہاں سے ہٹ کر دھونا چاہیے۔ ⑤ حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ حدیث میمونہ ؓ میں تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے کیونکہ شرمگاہ کا دھونا وضو سے پہلے ہے جیسا کہ امام بخاری نے آئندہ عبداللہ بن مبارک کے طریق میں بیان کیا ہے، وہاں پہلے ہاتھوں کا دھونا، پھر استنجا کرنا، پھر زمین پر رگڑ کر انھیں صاف کرنا، اس کے بعد وضو کرنا، پاؤں دھونے کے علاوہ پھر تمام جسم پر پانی بہانے کا ذکر ہے۔[2] اور غسل جنابت کا صحیح طریقہ یہی ہے۔

(٢) بَابُ غُسْلِ الرَّجُلِ مَعَ امْرَأَتِهِ

باب:2- خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ غسل کرنا

٢٥٠ - حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، مِنْ قَدَحٍ يُقَالُ لَهُ: الْفَرَقُ. [انظر: ٢٦١، ٢٦٣، ٢٧٣، ٢٩٩، ٥٩٥٦، ٧٣٣٩]

[250] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں اور نبی ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے۔ وہ برتن ایک بڑا پیالہ تھا جسے فرق کہا جاتا ہے۔

فوائد و مسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ بعض حضرات کے نزدیک خاوند بیوی کا اکٹھے غسل کرنا جائز نہیں۔ امام بخاری ؒ ان کی تردید کرتے ہوئے اس کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ سندھی لکھتے ہیں: مذکورہ روایت سے بیوی خاوند کا اکٹھے غسل کرنا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اتحاد ظرف، اتحاد زمان کو لازم نہیں کہ ایک ہی وقت میں دونوں کا غسل ہوتا ہو، نیز واؤ کا استعمال عطف اور انفصال کے لیے ہے، قران و اتحاد کے لیے اس کا استعمال نہیں ہوتا، ہاں دوسری روایات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اس برتن سے ایک وقت میں دونوں غسل کرتے تھے۔[3] امام بخاری ؒ نے کتاب الوضوء میں مرد، عورت کا ایک برتن میں وضو کرنا ثابت فرمایا۔ اسی طرح یہاں مرد و عورت کا ایک وقت میں ایک ہی برتن سے اکٹھا غسل کرنا ثابت کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ دیگر روایات میں اس کی صراحت ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: میں اور نبی ﷺ

---

① سنن النسائي، الغسل، حديث: 430. ② صحيح البخاري، الغسل حديث: 281. ③ حاشية السندي: 56/1.

ایک برتن سے اکٹھے غسل کرتے تھے اور اس برتن میں ہمارے ہاتھ باری باری جاتے۔[1] ایک روایت میں ہے کہ ہم اس سے اکٹھے چلو بھرتے تھے۔[2] صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے پہلے چلو بھرتے تو میں کہتی: میرے لیے پانی بچانا۔[3] نسائی کی روایت میں ہے کہ جب میں پہلے چلو بھر لیتی تو رسول اللہ ﷺ (مزاح کے طور پر) فرماتے: میرے لیے پانی بچا رکھیو۔[4] بعض شارحین کا خیال ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کا جواز ثابت کرنا ہے جیسا کہ قبل ازیں عورت کے بچے ہوئے پانی سے وضو کا جواز ثابت کر چکے ہیں کیونکہ جب ایک ساتھ غسل کریں گے تو جس وقت ایک پانی لے گا تو بقیہ پانی دوسرے کے لیے ''فضل'' بن جائے گا لیکن اس قدر تکلف کی کیا ضرورت ہے کیونکہ احادیث میں صراحت ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بچے ہوئے پانی سے غسل فرما لیتے تھے۔[5] ② علامہ داودی نے اس حدیث سے ایک دوسرے کا عضو مستور دیکھنے کا جواز ثابت کیا ہے کیونکہ جب بیوی خاوند مل کر اکٹھے غسل کریں گے تو یقیناً ایک دوسرے کے عضو مستور پر نظر پڑے گی، اس کی تائید ابن حبان کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ سلیمان بن موسیٰ سے خاوند بیوی کے ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھنے کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے اس کے متعلق حضرت عطاء سے سوال کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے اس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تو انھوں نے اس حدیث کا حوالہ دیا۔[6] ③ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن (قدح) سے غسل کرتے تھے۔ اس برتن کو فرق کہا جاتا تھا۔ فرق سولہ رطل کا پیمانہ ہے۔ چونکہ ایک صاع $5\frac{1}{3}$ رطل کا ہوتا ہے، اس لیے فرق میں تین صاع پانی آتا تھا۔ اس کی تائید سفیان بن عیینہ کے قول سے بھی ہوتی ہے جسے امام مسلم نے بیان کیا ہے کہ فرق، تین صاع کا پیمانہ ہے۔[7] جب رسول اللہ ﷺ اکیلے غسل فرماتے تو ایک صاع پانی کی مقدار استعمال کرتے جیسا کہ احادیث میں بصراحت آیا ہے لیکن یہ تحدید نہیں بلکہ حسب ضرورت اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حدیث عائشہ میں جو فرق سے غسل کرنے کا ذکر ہے اس میں مقدار ماء کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ بھرا ہوا تھا یا کم تھا۔[8] اگر وہ بھرا ہوا تھا تو ہر ایک کے حصے میں ڈیڑھ، ڈیڑھ صاع آتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت برتن میں دو صاع پانی ہو تو پھر مذکورہ بالا حدیث کے خلاف نہیں ہوگا اور یہ تحقیقی صورت ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ایک ہی صاع سے غسل فرماتے تھے، کبھی وہ مقدار چھوٹے برتن میں ہوتی تھی اور کبھی بڑے برتن میں اسے ڈال لیا جاتا تھا۔ اگر پہلی صورت ہے تو غسل کے پانی کی مقدار تقریبی ہوگی، تحدید سے اس کا تعلق نہیں ہوگا، یعنی ایک، ڈیڑھ صاع سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ واللہ أعلم.

(٣) بَابُ الْغُسْلِ بِالصَّاعِ وَنَحْوِهِ

باب:3- ایک صاع یا اس کے قریب قریب پانی کی مقدار سے غسل کرنا

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کو ایک خاص اہمیت کے پیش نظر قائم کیا ہے کہ جو معاملات رسول اللہ ﷺ کے

---

1 صحيح البخاري، الغسل، حديث:261. 2 صحيح البخاري، الغسل، حديث:273. 3 صحيح مسلم، الحيض، حديث:732(321). 4 سنن النسائي، الغسل، حديث:414. 5 صحيح مسلم، الحيض، حديث:734(323). 6 فتح الباري:473/1. 7 صحيح مسلم ، الحيض، حديث:727(319). 8 عمدة القاري:13/1.

تعامل سے ثابت ہیں انھیں نمایاں کیا جائے۔ اس سے مراد تحدید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صاع کے ساتھ نحوہ کا اضافہ کیا ہے۔ اصل مسئلہ بالاتفاق یہی ہے کہ اسراف کے بغیر جتنے پانی کی بھی ضرورت ہو غسل میں صرف کیا جائے، حصول طہارت میں کمی نہیں ہونی چاہیے، مقدار ماء کی عدم تحدید پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

٢٥١ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ الصَّمَدِ قَالَ: حَدَّثَنِي شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرِ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا سَلَمَةَ يَقُولُ: دَخَلْتُ أَنَا وَأَخُو عَائِشَةَ عَلَى عَائِشَةَ فَسَأَلَهَا أَخُوهَا عَنْ غُسْلِ النَّبِيِّ ﷺ، فَدَعَتْ بِإِنَاءٍ نَّحْوٍ مِّنْ صَاعٍ فَاغْتَسَلَتْ وَأَفَاضَتْ عَلَى رَأْسِهَا وَبَيْنَنَا وَبَيْنَهَا حِجَابٌ.

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: قَالَ يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ، وَبَهْزٌ، وَالْجُدِّيُّ عَنْ شُعْبَةَ: قَدْرِ صَاعٍ.

[251] حضرت ابوسلمہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں اور حضرت عائشہ ؓ کے بھائی حضرت عائشہ ؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے بھائی نے نبی ﷺ کے غسل کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے صاع جیسا ایک برتن منگوایا۔ پھر غسل کیا اور اسے اپنے سر پر بہایا۔ اس وقت ہمارے اور آپ کے درمیان پردہ حائل تھا۔ ابوعبداللہ (امام بخاری ؒ) کہتے ہیں کہ یزید بن ہارون، بہز (بن اسعد) اور (عبدالملک بن ابراہیم) جدی نے حضرت شعبہ سے قدر صاع کے الفاظ بیان کیے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① روایت میں ابوسلمہ سے مراد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عوف ہیں جنھیں ام کلثوم بنت ابی بکر ؓ نے دودھ پلایا تھا، اس بنا پر وہ حضرت عائشہ ؓ کے رضاعی بھانجے ہیں۔[1] اور دوسرے شخص جو حضرت عائشہ ؓ کے بھائی ہیں، ان کے متعلق محدث داودی کا خیال ہے کہ وہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر ؓ ہیں جبکہ بعض نے کہا ہے کہ وہ طفیل بن عبداللہ ہیں جو حضرت عائشہ ؓ کے مادری بھائی ہیں لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں کہ روایات میں اس بات کی وضاحت ہے کہ وہ حضرت عائشہ ؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ امام نووی ؒ نے کہا ہے کہ وہ عبداللہ بن یزید ہے جیسا کہ مسلم کی روایت میں اس کی وضاحت ہے۔[2] ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ہو یا کوئی دوسرا ہو۔[3] واللہ أعلم. ② اس حدیث سے عملی تعلیم کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ عملی تعلیم جس قدر اطمینان بخش ہوتی ہے، قول اس درجے میں نہیں ہوتا۔ اسلاف میں تعلیم کا یہی طریقہ رائج تھا۔ صحابۂ کرام ؓ میں بھی یہ بات موجود تھی کہ جب کوئی شخص ان سے رسول اللہ ﷺ کے وضو کے متعلق دریافت کرتا تو زبانی بتانے کے بجائے وہ وضو کر کے دکھا دیتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہ ؓ سے غسل کے طریقے اور مقدار ماء کے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے عملاً کر کے دکھا دیا۔[4] ③ اس حدیث کی آڑ میں منکرین حدیث اور رافضی بہت اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عریانیت ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے غسل کرنے کا بیان ہے، لہٰذا احادیث کی صداقت مجروح ہے، حالانکہ حدیث میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ہمارے اور عائشہ ؓ کے درمیان حجاب تھا، یعنی یہ غسل پس پردہ کیا گیا تھا، پھر سوال کرنے والے بھی محرم تھے: ایک آپ کا

---

(1) عمدة القاري:13/3. (2) صحيح مسلم، الجنائز، حديث:2198(947). (3) فتح الباري:474/1. (4) فتح الباري:474/1.

رضاعی بھانجا اور دوسرا رضاعی بھائی تھا۔ چونکہ غسل کرکے دکھانا تھا، اس لیے سر کا حصہ پردے سے باہر تھا اور یہ دونوں محرم دیکھ رہے تھے کہ غسل کی ابتدا کہاں سے ہوئی لیکن جسم کے دیگر اعضاء جن کا چھپانا محرم سے بھی ضروری ہے، وہ پردے میں تھے۔[1]

٢٥٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ آدَمَ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو جَعْفَرٍ أَنَّهُ كَانَ عِنْدَ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ هُوَ وَأَبُوهُ، وَعِنْدَهُ قَوْمٌ، فَسَأَلُوهُ عَنِ الْغُسْلِ؟ فَقَالَ: يَكْفِيكَ صَاعٌ، فَقَالَ رَجُلٌ: مَا يَكْفِينِي، فَقَالَ جَابِرٌ: كَانَ يَكْفِي مَنْ هُوَ أَوْفَى مِنْكَ شَعَرًا، وَخَيْرٌ مِّنْكَ، ثُمَّ أَمَّنَا فِي ثَوْبٍ. [انظر: ٢٥٥، ٢٥٦]

[252] حضرت ابوجعفر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ اور ان کے والد گرامی، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے پاس تھے جبکہ ان کے ہاں اور لوگ بھی تھے۔ انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے غسل کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا: تجھے ایک صاع کافی ہے۔ اس پر انھی لوگوں میں سے کسی نے کہا: مجھے تو کافی نہیں ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اتنا پانی تو اس ذاتِ گرامی کے لیے کافی ہوتا تھا جن کے بال بھی تجھ سے زیادہ تھے اور وہ خود بھی تجھ سے بہتر تھے۔ پھر حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک کپڑے میں ہماری امامت کرائی۔

فوائد ومسائل: ① روایت میں ابوجعفر سے مراد حضرت باقر ہیں جن کا نام محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب ہے۔ ان کے والد حضرت زین العابدین علی بن حسین ہیں۔ دراصل ان حضرات میں رسول اللہ ﷺ کے غسل کے بارے میں کچھ اختلاف ہوا تو انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی تحقیق کرنی چاہی۔ سوال کرنے والے صرف حضرت باقر ہیں، چونکہ تحقیق کی طلب سب حضرات کو تھی، اس لیے سوال کی نسبت سب کی طرف کر دی گئی ہے۔ جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ غسل کے لیے ایک صاع کافی ہے تو مجلس میں موجود ایک شخص نے کہا کہ اتنی سی مقدار غسل کے لیے ناکافی ہے۔ یہ بات کہنے والے حضرت محمد بن حنفیہ کے صاحبزادے حضرت حسن ہیں، چونکہ ان کا انداز مناسب نہیں تھا، اس لیے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ تمھیں یہ مقدار کافی نہ ہوگی، شاید تمھارے سر میں بال زیادہ ہیں یا تم زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہو لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے تو یہ مقدار کافی تھی، حالانکہ آپ کے سر مبارک پر بال بھی تم سے زیادہ تھے، پھر آپ ہر معاملے میں محتاط بھی بہت تھے، اس لیے کافی نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ تم پانی کے استعمال میں اسراف سے کام لیتے ہو۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث کے خلاف جھگڑنے والے کو سختی سے سمجھانے میں کوئی حرج نہیں۔[2] ② اس روایت کے مطابق حضرت ابوجعفر باقر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے غسل کے لیے پانی کی مقدار کے متعلق سوال کیا، جس کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دے دیا کہ ایک صاع کافی ہے، حسن بن محمد بن حنفیہ نے کہا کہ مجھے کافی نہ ہوگا، تو اس کا بھی جواب دیا۔ آگے حسن بن محمد حنفیہ کا غسل کی کیفیت کے بارے میں سوال آ رہا ہے کہ جنابت کے غسل کا کیا طریقہ ہے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ تین چلو پانی لیتے اور انھیں اپنے سر پر بہاتے تھے، پھر اپنے تمام بدن پر پانی ڈالتے، اس پر حسن بن محمد نے کہا:

1 فتح الباري:1/474. 2 فتح الباري:1/475.

میں تو بہت بالوں والا ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نبی ﷺ کے بال تم سے زیادہ تھے۔ [1]

٢٥٣ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ عَمْرٍو، عَنْ جَابِرِ بْنِ زَيْدٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَمَيْمُونَةَ كَانَا يَغْتَسِلَانِ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ. قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: كَانَ ابْنُ عُيَيْنَةَ يَقُولُ أَخِيرًا: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُونَةَ. وَالصَّحِيحُ مَا رَوَاهُ أَبُو نُعَيْمٍ.

[253] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ایک ہی برتن سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ ابوعبداللہ (امام بخاری رحمہ اللہ) نے کہا کہ ابن عیینہ آخر عمر میں عن ابن عباس عن میمونہ کہنے لگے تھے لیکن صحیح الفاظ وہی ہیں جو ابونعیم نے بیان کیے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① بعض شارحین نے لکھا ہے کہ حدیث میمونہ رضی اللہ عنہا کو عنوان سے کوئی مناسبت نہیں کیونکہ اس حدیث میں برتن کی مقدار نہیں بتائی گئی جبکہ عنوان میں اس کی مقدار کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ مناسبت کا لحاظ ایک اور مقدمہ ملانے سے ہوگا: وہ یہ کہ ان لوگوں کے برتن چھوٹے تھے جیسا کہ امام شافعی نے کئی ایک مقام پر اس کی وضاحت کی ہے، لہٰذا یہ حدیث نحوہ کے تحت آ جاتی ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث میمونہ میں بیان شدہ مطلق لفظ اِنَاء (برتن) کو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقید لفظ فَرَق پر محمول کریں گے کیونکہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی زوجات ہیں اور ہر ایک نے آپ کے ساتھ غسل کیا ہے، لہٰذا ہر ایک کے حصے میں ایک صاع سے زیادہ پانی آیا ہوگا، اس لیے وہ برتن جس کا حدیث میمونہ میں ذکر ہے تقریبی طور پر تحت الترجمہ ہو جائے گا۔ [2] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما بروایت ابی نعیم کو دوسروں کی روایت پر ترجیح دی ہے، یعنی اپنی روایت کو مسانید ابن عباس سے قرار دیا ہے اور دوسرے حضرات اسے مسانید میمونہ سے کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مسانید میمونہ سے قرار دینا حضرت ابن عیینہ کی آخری عمر سے تعلق رکھتا ہے جبکہ مسند ابن عباس کا معاملہ ان کی پہلی عمر سے تعلق رکھتا ہے، اس عمر میں حافظہ قوی ہوتا ہے، لیکن دوسرے لوگوں کی روایت کو بھی حافظ ابن حجر نے قابل ترجیح کہا ہے۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں: * آخری عمر میں ان سے روایت کرنے والے تعداد میں زیادہ ہیں اور انھیں اپنے شیخ کے ساتھ زیادہ مدت تک رہنے کا موقع ملا ہے۔ * حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما خود تو رسول اللہ ﷺ کے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ غسل کرنے کی کیفیت پر مطلع نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے اس کا علم حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بتانے سے ہی حاصل کیا ہوگا۔ [3] ایک تیسری وجہ علامہ عینی نے بیان کی ہے کہ مسلم، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ چاروں نے اس حدیث کو عن ابن عباس عن میمونہ ہی بیان کیا ہے، یعنی ان محدثین کے نزدیک یہ روایت مسانید میمونہ سے ہے۔ [4] مسند حمیدی میں بھی اس روایت کو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے۔ [5]

---

① صحیح البخاري، الغسل، حدیث: 256. ② فتح الباري: 476/1. ③ فتح الباري: 476/1. ④ عمدة القاري: 17/3. ⑤ مسند الحمیدي، رقم: 309.

(٤) بَابُ مَنْ أَفَاضَ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثًا

باب:4- جس نے اپنے سر پر تین مرتبہ پانی بہایا

٢٥٤ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ: حَدَّثَنِي سُلَيْمَانُ بْنُ صُرَدٍ قَالَ: حَدَّثَنِي جُبَيْرُ بْنُ مُطْعِمٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَمَّا أَنَا فَأُفِيضُ عَلَى رَأْسِي ثَلَاثًا» وَأَشَارَ بِيَدَيْهِ كِلْتَيْهِمَا.

[254] حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو اپنے سر پر تین بار پانی بہاتا ہوں۔'' اور (یہ کہہ کر) آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرمایا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا اس عنوان سے مقصد یہ ہے کہ غسل میں اصل بات استیعاب ہے۔ تین بار پانی ڈالنے کا عدد بذات خود مطلوب نہیں بلکہ تین بار عمل کرنے میں راز یہ ہے کہ تکرار عمل سے عمل میں قوت آ جاتی ہے۔ تین بار کا عمل تکرار کی آخری حد ہے۔ ② بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے غسل جنابت کے متعلق اپنی اپنی حالتیں بیان کیں، کسی نے کہا: میں ایسے کرتا ہوں، دوسرے نے کہا: میں ایسے کرتا ہوں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تو تین بار پانی بہاتا ہوں۔[1] بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلۂ ثقیف کے لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے غسل جنابت کے سلسلے میں اپنی اپنی حالتیں بیان کیں تو رسول اللہ ﷺ نے وہ جواب دیا جس کا ذکر اس روایت میں ہے۔[2]

٢٥٥ - حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ مِخْوَلِ بْنِ رَاشِدٍ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُفْرِغُ عَلَى رَأْسِهِ ثَلَاثًا. [راجع: ٢٥٢]

[255] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنے سر پر تین بار پانی بہایا کرتے تھے۔

فائدہ: اسماعیلی نے اضافہ کیا ہے کہ شعبہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ غسل جنابت میں ایسا کرتے تھے۔ جب حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان فرمائی تو بنوحاتم میں سے ایک آدمی نے کہا: میرے سر کے بال بہت گھنے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: رسول اللہ ﷺ کے بال تیرے بالوں سے زیادہ اور عمدہ تھے۔[3] اس سے یہ معلوم ہوا کہ غسل جنابت کے وقت تین مرتبہ سر پر پانی بہا دینا کافی ہے اگرچہ غسل کرنے والے کے سر پر بال زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔[4]

---

1 صحيح مسلم، الحيض، حديث:740(327). 2 صحيح مسلم، الحيض، حديث:742(328). 3 صحيح البخاري، حديث:252. 4 عمدة القاري:21/3.

٢٥٦ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مَعْمَرُ بْنُ يَحْيَى بْنِ سَامٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبُو جَعْفَرٍ قَالَ: قَالَ لِي جَابِرٌ: أَتَانِي ابْنُ عَمِّكَ، يُعَرِّضُ بِالْحَسَنِ بْنِ مُحَمَّدِ ابْنِ الْحَنَفِيَّةِ، قَالَ: كَيْفَ الْغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ؟ فَقُلْتُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْخُذُ ثَلَاثَةَ أَكُفٍّ وَيُفِيضُهَا عَلَى رَأْسِهِ، ثُمَّ يُفِيضُ عَلَى سَائِرِ جَسَدِهِ، فَقَالَ لِي الْحَسَنُ: إِنِّي رَجُلٌ كَثِيرُ الشَّعَرِ، فَقُلْتُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَكْثَرَ مِنْكَ شَعَرًا. [راجع: ٢٥٢]

[256] حضرت ابوجعفر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ہم سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے پاس تمھارے چچازاد آئے تھے، ان کا اشارہ حسن بن محمد ابن حنفیہ کی طرف تھا، انھوں نے پوچھا: غسل جنابت کا کیا طریقہ ہے؟ میں نے کہا: نبی ﷺ تین چلو لیتے اور انھیں اپنے سر پر بہاتے تھے، پھر اپنے تمام بدن پر پانی ڈالتے تھے۔ حسن نے کہا: میں تو بہت بالوں والا شخص ہوں۔ میں نے جواب دیا: نبی ﷺ کے بال تم سے زیادہ تھے۔

فوائد ومسائل: ① حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ تم سے زیادہ بالوں والے اور زیادہ نظافت پسند بھی تھے، پھر بھی انھوں نے تین دفعہ سر پر پانی ڈالا اور اس مقدار پر اکتفا کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ صفائی اور طہارت اتنی مقدار سے ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ پر صفائی کا مدار خیال کرنا خود پسندی کی علامت ہے یا وہم و وسوسہ کی وجہ سے ہے جس کو اہمیت دینا مناسب نہیں۔[1] ② اس سے معلوم ہوا کہ امور دین کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لیے علماء سے سوال کرنا چاہیے اور عالم کو چاہیے کہ جواب دینے میں بخل سے کام نہ لے، نیز طالب حق کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ جب حق واضح ہو جائے تو اسے قبول کرنے میں حیل و حجت نہ کرے۔[2] ③ اس سے معلوم ہوا کہ حسن بن محمد کا یہ سوال ابوجعفر کے ذکر کردہ سوال سے الگ ہے۔ دونوں واقعات میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے تعرض کرنے والے حسن بن محمد ہیں۔ سابق الذکر میں انھوں نے مقدار پانی پر اعتراض کیا تھا کہ مجھے اتنا کافی نہیں ہوتا اور یہاں انھوں نے کیفیت پر اعتراض کیا ہے کہ اس طرح میرے بال صاف نہیں ہوتے۔ پہلے واقعے کے وقت ابوجعفر موجود تھے جبکہ اس واقعے کے وقت وہ موجود نہیں تھے۔[3] ④ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا حسن بن محمد کو ابوجعفر کا چچازاد بھائی کہنا بطور مجاز ہے کیونکہ وہ دراصل ابوجعفر باقر کے والد زین العابدین کے چچازاد بھائی ہیں۔ وہ اس بنا پر کہ زین العابدین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور حسن حضرت محمد ابن حنفیہ کے صاحبزادے ہیں اور محمد ابن حنفیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، گویا حضرت حسین اور حضرت محمد ابن حنفیہ آپس میں پدری بھائی ہیں، لہٰذا حضرت حسن، ابوجعفر کے نہیں بلکہ ان کے والد زین العابدین کے چچازاد بھائی ہیں۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مجازی طور پر انھیں ابوجعفر کا چچازاد کہا ہے۔[4] ⑤ حنفیہ نامی عورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ کے عقد میں آئیں۔ ان کے بطن سے محمد نامی بچہ پیدا ہوا اور وہ بجائے باپ کے ماں ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ کہتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یزید بن معاویہ کے پاس گزرا، اس بنا پر یار لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا اچھا خیال نہیں کیا تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاندانی

---

① فتح الباري:478/1. ② عمدة القاري:24/3. ③ فتح الباري:478/1. ④ فتح الباري:478/1.

رقابت قائم رہے۔ واللہ أعلم۔ انھی محمد کے بیٹے حسن ہیں جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے غسل کے متعلق بحث و تمحیص کرتے ہیں۔

(٥) بَابُ الْغُسْلِ مَرَّةً وَّاحِدَةً

باب:5- غسل میں ایک مرتبہ پانی ڈالنا

٢٥٧ - حَدَّثَنَا مُوسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَتْ مَيْمُونَةُ: وَضَعْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ مَاءً لِلْغُسْلِ، فَغَسَلَ يَدَهُ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَفْرَغَ عَلٰى شِمَالِهِ فَغَسَلَ مَذَاكِيرَهُ، ثُمَّ مَسَحَ يَدَهُ بِالْأَرْضِ، ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلٰى جَسَدِهِ، ثُمَّ تَحَوَّلَ مِنْ مَّكَانِهِ فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ.
[راجع: ٢٤٩]

[257] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے ایک مرتبہ نبی ﷺ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے اپنا ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھویا۔ پھر آپ نے اپنے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرمگاہ کو دھویا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر رگڑا، بعد ازاں کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا۔ پھر چہرۂ مبارک اور دونوں ہاتھوں کو دھویا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے جسم پر پانی بہایا۔ پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر دونوں پاؤں دھوئے۔

فوائد ومسائل: ① شارحین نے اس عنوان کے دو مطلب بیان کیے ہیں: * فریضۂ غسل ایک مرتبہ پانی بہا لینے سے ادا ہو جاتا ہے جس طرح وضو میں ایک مرتبہ پانی ڈالنا ادائے فرض کے لیے کافی ہے۔ جن روایات میں تین مرتبہ کا ذکر ہے وہ تحصیل کمال کے پیش نظر ہے۔ اس کے لیے وقت اور پانی میں گنجائش کا ہونا ضروری ہے۔ * بعض روایات میں ہے کہ شروع شروع میں غسل جنابت کے لیے سات مرتبہ پانی بہانا ضروری تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے بار بار سوال کرنے پر اسے ایک بار کر دیا گیا۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ابتدائے اسلام کا وہ عمل منسوخ ہے اور اب ایک مرتبہ پانی بہانا ادائے فرض کے لیے کافی ہے۔ ② شارح بخاری ابن بطال کہتے ہیں کہ امام بخاری کا قائم کردہ عنوان "پھر اپنے جسم پر پانی بہایا" کے الفاظ سے بایں طور ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے کوئی عدد ذکر نہیں کیا، اس لیے کم از کم تعداد، یعنی ایک مرتبہ پر اسے محمول کیا جائے گا، اصل یہی ہے کہ ایک مرتبہ پر اضافہ نہ کیا جائے، یعنی تکرار خلاف اصل ہے اور اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غسل میں استیعاب اور تعمیم شرط ہے، تعداد وغیرہ کا لحاظ ضروری نہیں۔[2] علامہ سندھی نے ایک اور انداز سے اس عنوان کو ثابت کیا ہے، فرماتے ہیں: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کے غسل کی پوری کیفیت بیان کر رہی ہیں۔ انھوں نے ہاتھ دھونے کی تعداد ذکر کی لیکن پانی بہانے میں ذکر تعداد سے سکوت فرمایا۔ یہ سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ پانی بہانے میں تکرار نہیں بلکہ صرف ایک بار بہانے پر اکتفا کیا گیا۔[3] ابن بطال نے عدم ذکر سے عدم واقعہ پر استدلال لیا ہے

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 247. (یہ روایت ضعیف ہے۔) 2 شرح ابن بطال: 374/1. 3 حاشية السندي: 57/1.

جبکہ علامہ سندھی نے محل بیان سے سکوت کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور محل بیان کا سکوت، حجت ہوتا ہے۔

(٦) بَابُ مَنْ بَدَأَ بِالْحِلَابِ أَوِ الطِّيبِ عِنْدَ الْغُسْلِ

باب:6- جس شخص نے غسل کے وقت حلاب یا خوشبو سے ابتدا کی

٢٥٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَاصِمٍ عَنْ حَنْظَلَةَ، عَنِ الْقَاسِمِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ، دَعَا بِشَيْءٍ نَّحْوِ الْحِلَابِ فَأَخَذَ بِكَفِّهِ، فَبَدَأَ بِشِقِّ رَأْسِهِ الْأَيْمَنِ ثُمَّ الْأَيْسَرِ، فَقَالَ بِهِمَا عَلٰى رَأْسِهِ.

[258] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب غسل جنابت کرنے کا ارادہ فرماتے تو حلاب جیسی کوئی چیز منگواتے اور اسے اپنے ہاتھ میں لے کر پہلے سر کے دائیں حصے سے ابتدا کرتے، پھر بائیں جانب لگاتے۔ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں سے تالو پر مالش کرتے۔

فائدہ: شارحین نے باب میں وارد لفظ حلاب کے درج ذیل مفہوم بیان کیے ہیں: * شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم ابواب میں لکھتے ہیں کہ حلاب، بیجوں سے نکالے ہوئے دودھ، یعنی روغن کو کہتے ہیں۔ اہل عرب اپنی عادت کے مطابق سر اور دیگر اعضاء کی صفائی کے لیے اس محلب کو استعمال کرتے تھے، اس سے مراد برتن نہیں۔ لیکن اہل عرب آج اس لفظ حلاب کو اس معنی میں استعمال نہیں کرتے۔ شاید یہ لفظ ان معنوں میں پہلے مستعمل رہا ہوگا جواب متروک ہو چکا ہے۔ * حلاب اس برتن کو کہتے ہیں جس میں اونٹنی کا دودھ جمع کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی عنوان سے مطابقت کے متعلق محدثین کرام کو خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ ائمۂ کرام نے امام بخاری کی تغلیط کی ہے، بغرض افادہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے: * ان میں سرفہرست محدث اسماعیلی کا نام ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ امام بخاری کی سمجھ کے مطابق حلاب کسی خوشبو کا نام ہے، حالانکہ غسل سے پہلے خوشبو استعمال کرنا چہ معنی دارد؟ [1] * علامہ خطابی نے کہا: حلاب ایک ایسا برتن ہے جس میں اونٹنی کو ایک بار دوھنے کی مقدار آتی ہے۔ امام بخاری ؒ نے اس لفظ کا ذکر کیا ہے لیکن اسے غسل میں خوشبو استعمال کرنے پر محمول کیا ہے۔ [2] * محدث حمیدی نے لکھا کہ امام مسلم نے تو حلاب سے برتن ہی سمجھا مگر امام بخاری کے خیال کے مطابق ایک خوشبو کا نام ہے جو غسل سے پہلے استعمال ہوتی ہے۔ [3] * علامہ سندھی نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے ظاہر طریقے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حلاب کو خوشبو کی کوئی قسم خیال کیا ہے...... لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حلاب سے مراد ایک برتن ہے۔ [4] * مشہور لغوی ازہری نے کہا ہے کہ صحیح بخاری کے نسخے میں کتابت کی غلطی ہے کیونکہ اصل لفظ جلاب ہے جو گلاب کا معرب ہے، اس کے معنی آب ورد ہیں۔ کسی کاتب کی غلطی سے حلاب بن گیا ہے۔ [5]

---

① فتح الباري:479/1. ② فتح الباري:480/1. ③ فتح الباري:480/1. ④ حاشية السندي:57/1. ⑤ فتح الباري:480/1.

واضح رہے کہ یہ تمام احتمالات ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کی دقت نظر اور علمی جامعیت سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہیں۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ میں نے بعض حضرات کی جن کا نام مجھے اب یاد نہیں آ رہا، یہ توجیہ دیکھی ہے کہ عنوان میں الطیب سے مقصود حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ وہ احرام کے وقت رسول اللہ ﷺ کو خوشبو لگایا کرتی تھیں اور غسل چونکہ سنن احرام سے ہے، اس لیے گویا خوشبو وقتِ غسل ثابت ہوئی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں یہ اشارہ فرمایا ہے کہ ہر غسل کے وقت آپ کی عادت خوشبو لگانے کی نہ تھی اور آپ نے خوشبو کے بغیر بھی غسل فرمایا ہے۔ وہ اس توجیہ کو احسن الاجوبۃ قرار دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ اس توجیہ کی تقویت اس امر سے ہوتی ہے کہ سات ابواب کے بعد امام بخاری نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''جس نے خوشبو لگائی پھر غسل کیا اور خوشبو کے اثرات باقی رہے'' پھر حدیث عائشہ ذکر کی ہے جس سے خوشبو لگانے کے بعد غسل کرنا ثابت ہوتا ہے، لہٰذا اس عنوان میں ''من بدأ بالحلاب'' سے غسل کا برتن مراد ہے جسے آپ نے بغرض غسل طلب فرمایا اور من بدأ بالطیب کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے غسل کا ارادہ کرتے وقت خوشبو کا استعمال فرمایا۔ عنوان میں دونوں امر ملحوظ ہیں لیکن پیش کردہ حدیث میں آپ کی مداومت بداءت غسل ثابت ہوتی ہے اور غسل کے بعد خوشبو لگانا تو آپ کی عام عادت تھی اور قبل از غسل خوشبو لگانا، اس کی طرف اشارہ حدیث عائشہ سے کر دیا۔[1] لیکن حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں جس خوشبو کا ذکر ہے وہ حصول نشاط کے لیے معلوم ہوتی ہے کہ خوشبو محرک ہونے کی وجہ سے جماع کے لیے مفید ہوتی ہے اور اس کا غسل سے کوئی تعلق نہیں۔ واللہ أعلم.

(۷) بَابُ الْمَضْمَضَةِ وَالْاِسْتِنْشَاقِ فِي الْجَنَابَةِ

باب:7- غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا

۲۵۹ - حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصِ بْنِ غِيَاثٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ قَالَ: حَدَّثَنِي سَالِمٌ عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدَّثَتْنَا مَيْمُونَةُ قَالَتْ: صَبَبْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ غُسْلًا فَأَفْرَغَ بِيَمِينِهِ عَلَى يَسَارِهِ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ غَسَلَ فَرْجَهُ، ثُمَّ قَالَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَمَسَحَهَا بِالتُّرَابِ، ثُمَّ غَسَلَهَا ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ، وَأَفَاضَ عَلَى رَأْسِهِ، ثُمَّ تَنَحَّى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ، ثُمَّ أُتِيَ بِمِنْدِيلٍ فَلَمْ يَنْفُضْ بِهَا.

[259] حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا تو آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور دونوں ہاتھوں کو دھویا۔ پھر آپ نے اپنی شرمگاہ کو دھویا۔ اس کے بعد آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر رکھا اور اسے مٹی سے رگڑا اور دھویا۔ بعد ازاں آپ نے کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا۔ پھر چہرۂ مبارک کو دھویا اور اپنے سر پر پانی بہایا۔ اس کے بعد آپ اس جگہ سے الگ ہوئے اور اپنے پاؤں دھوئے۔ پھر آپ کو ایک رومال پیش کیا گیا لیکن آپ نے اس سے

[1] فتح الباري:1/481.

اپنا بدن صاف نہیں فرمایا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے مذکورہ بالا باب کیوں قائم کیا ہے؟ اس کے متعلق علماء کی دو رائے ہیں: ✱ امام بخاری ؒ مضمضہ اور استنشاق کا الگ باب قائم کر کے غسل میں اس کا وجوب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ عینی نے اس کا ذکر کیا ہے۔[1] امام بخاری ؒ کا مقصد مضمضہ اور استنشاق کا عدم وجوب ثابت کرنا ہے۔ اس کے قائل ابن بطال ہیں اور حافظ حجر ؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ ② مضمضہ اور استنشاق غسل میں واجب ہیں یا سنت؟ احناف اور حنابلہ واجب کہتے ہیں جبکہ مالکیہ اور شوافع اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ امام بخاری ؒ کے ترجمۃ الباب سے یہ معلوم ہوتا ہے غالبًا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غسل سے پہلے اگر وضو نہ کیا جائے (کیونکہ اسے وجوب کا درجہ حاصل نہیں، صرف سنت ہی ہے) تو غسل سے پہلے مضمضہ (کلی کرنے) اور استنشاق (ناک میں پانی ڈالنے) کا اہتمام ضرور کر لیا جائے۔ واللہ أعلم. ③ اس روایت میں ہے کہ غسل کے بعد رسول اللہ ﷺ کو بدن صاف کرنے کے لیے رومال پیش کیا گیا لیکن آپ نے اس سے اپنا بدن صاف نہیں فرمایا۔ دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے بدن صاف کیا۔[2] اس سے ان حضرات کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ وضو اور غسل چونکہ عبادت کا مقدمہ ہیں، اس لیے ان کا پانی بدن میں جذب ہونا چاہیے۔ اسے ہاتھ یا کپڑے سے صاف کرنا، عبادت کے اثر کو زائل کرنا ہے جو درست نہیں۔ اس مسئلے میں ایک حدیث بھی پیش کی جاتی ہے کہ وضو کے بعد اپنے ہاتھوں کو صاف نہ کرو۔ یہ حدیث صحیح نہیں۔ ابن صلاح نے لکھا ہے کہ مجھے اس حدیث کا سراغ نہیں ملا۔ یہ حدیث امام ابن حبان نے اپنی تالیف ''الضعفاء'' میں اور ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں حضرت ابو ہریرہ سے بیان کی ہے، لیکن یہ معیار محدثین پر پوری نہیں اترتی، لہٰذا قابل حجت نہیں۔ بہر حال وضو اور غسل میں اعضاء پر لگا ہوا پانی صاف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[3] باقی رہا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس رومال کو استعمال نہیں فرمایا، تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ غسل کے بعد اس کا استعمال ضروری نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اسے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ممانعت کی کوئی صحیح دلیل نہیں۔

(٨) بَابُ مَسْحِ الْيَدِ بِالتُّرَابِ لِتَكُونَ أَنْقَى

باب:8- ہاتھ کو مٹی سے رگڑنا تاکہ وہ صاف ہو جائے

٢٦٠ - حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ بِيَدِهِ، ثُمَّ دَلَكَ بِهَا الْحَائِطَ، ثُمَّ غَسَلَهَا،

[260] حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے، وہ حضرت میمونہ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بایں طور غسل جنابت کیا کہ پہلے اپنی شرمگاہ کو اپنے ہاتھ سے دھویا، پھر ہاتھ کو دیوار سے رگڑا اور اسے دھویا، پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کیا۔ اور جب آپ غسل سے فارغ ہو گئے تو

---

① عمدة القاري:26/3. ② صحيح البخاري، الغسل، حديث:276,274. ③ فتح الباري:471/1.

ثُمَّ تَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهِ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. [راجع: ٢٤٩]
اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے استنجا کرنے کے بعد ہاتھ کو اچھی طرح دھونے کے متعلق یہ عنوان قائم کیا ہے، حالانکہ یہ بات پہلے باب میں معلوم ہو چکی تھی۔ یہ تکرار نہیں، کیونکہ پہلے باب میں ہاتھ کو مٹی پر رگڑنے اور یہاں دیوار پر مارنے کا ذکر ہے ان دونوں میں فرق ہے۔[1] اس کے علاوہ علامہ کرمانی لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنے مختلف شیوخ کے استنباط و استخراج کی طرف اشارہ فرمایا ہے، مثلاً: عبداللہ بن زبیر حمیدی نے مسح الید بالتراب ثابت کرنے کے لیے حدیث میمونہ کو بیان کیا ہے جبکہ اس سے پہلے امام بخاری کے استاد عمر بن حفص بن غیاث نے اس حدیث سے مضمضہ اور استنشاق کا استخراج کیا تھا، لہٰذا دونوں روایات کے الگ الگ سیاق اور شیوخ کے جدا جدا مسائل کے استخراج ہیں۔ اس اسلوب کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دونوں روایات کو ایک دوسرے سے قوت و تائید بھی حاصل ہوگئی۔[2] ② امام بخاری رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابوداود نے بھی حدیث میمونہ پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''استنجا سے فراغت کے بعد آدمی کا اپنے ہاتھ کو زمین پر رگڑنے کا بیان'' فرق صرف اتنا ہے کہ امام بخاری نے اسے کتاب الغسل میں بیان کیا ہے جبکہ امام ابوداود نے کتاب الطهارة میں ذکر کیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ امام بخاری کے قائم کردہ عناوین کی دو قسمیں ہیں: * عنوان ایک دعویٰ کی قبیل سے ہوتا ہے اور اس کے بعد آنے والی حدیث اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کے بیشتر عنوان اسی قسم سے متعلق ہیں۔ * عنوان، بعد میں آنے والی حدیث کی شرح اور وضاحت کے لیے ہوتا ہے۔ مذکورہ عنوان اسی قسم سے ہے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے استنجے سے فراغت کے بعد اپنے ہاتھ کو دیوار پر رگڑا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں وضاحت کر دی کہ ہاتھ کو دیوار پر رگڑنے سے مقصود صفائی کا حصول تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری اس مقام پر ایک اختلاف کی طرف اشارہ کر کے اپنا رجحان بیان کر رہے ہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ ہاتھ کو زمین پر رگڑنے سے مقصود حصول نظافت ہے یا حصول طہارت؟ اس اختلاف کی بنیاد ایک دوسرے نظریاتی اختلاف پر ہے۔ وہ اس طرح کہ بعض حضرات کے نزدیک استنجا کرنے کے بعد جس بدبو کو دور کرنے کے لیے ہاتھوں کو زمین پر رگڑا جاتا ہے وہ درحقیقت نجاست کے ان اجزاء کو دور کرنے کے لیے ہے جو نظر نہیں آتے لیکن ہاتھ میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے اس موقف کی تائید میں کہتے ہیں کہ خروج ریح سے وضو اسی لیے ٹوٹتا ہے کہ نجاست کے اجزاء ہوا میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے خروج سے طہارت ساقط ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک استنجا کرنے کے بعد ہاتھ کو مٹی سے رگڑنا ضروری ہے تاکہ نجس اجزاء سے طہارت ہو جائے جبکہ دوسرے حضرات کا موقف ہے کہ ہوا میں نجاست کے اجزاء نہیں ہوتے بلکہ ان کے قریب سے ہوا کے گزرنے کی بنا پر اس میں بو کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، ان ہوائی کیفیات کا زائل کرنا ضروری نہیں بلکہ حصول نظافت کے لیے یہ عمل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر گیلے کپڑے پر بدبودار ہوا گزرے تو اس سے کپڑا نجس نہیں ہوتا۔ اگر اس ہوا میں نجاست آلود اجزاء ہوتے تو اس گندی ہوا کے گزرنے سے کپڑا پلید ہونا چاہیے تھا۔ باقی رہا خروج ریح سے نقض طہارت کا مسئلہ تو

1 عمدة القاري:27/3. 2 شرح الكرماني:123/1. 3 فتح الباري:483/1.

یہ شریعت کے ایک منصوص حکم کی وجہ سے ہے، وہ اس لیے نہیں کہ نجاست کے اجزاء اس ہوا میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی ہوا ناقض وضو ہے، خواہ اس سے بدبو آئے یا نہ آئے، اس لیے ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں اس اختلاف پر تنبیہ فرمائی ہو اور اس امر کو ترجیح دی ہو کہ ہاتھ کو مٹی پر رگڑ کر دھونا طہارت کے لیے نہیں بلکہ نظافت کے لیے ہے تاکہ ازالۂ عین نجاست کے بعد جو بدبو کے اثرات باقی رہ گئے ہیں انھیں بھی دور کر دیا جائے، کیونکہ ان کی موجودگی باقی اعضائے جسم دھونے کے لیے نفرت کا باعث ہے۔ ③ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غسل جنابت کیا تو اپنی شرمگاہ کو دھویا، فغسل فرجه کی فا کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہاں فا تعقیب کے لیے نہیں بلکہ تفسیر کے لیے ہے کیونکہ استنجا غسل سے فراغت کے بعد نہیں ہوا۔[1] دراصل یہ فا عاطفہ ہے جو بیان ترتیب کے لیے استعمال ہوئی ہے اور حدیث کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ ﷺ نے غسل فرمایا تو اپنے غسل کی ترتیب اس طرح فرمائی کہ پہلے غسل فرج کیا، پھر ہاتھ کو مٹی پر رگڑ کر دھویا، پھر وضو فرمایا، بعد ازیں غسل فرما کر اپنے پاؤں وہاں سے الگ ہو کر دھوئے۔[2] علامہ کرمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فا تفصیل کے لیے ہے کیونکہ غسل کے اجمال کو اس فا کے بعد تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ہمیشہ تفصیل، اجمال کے بعد ہوتی ہے۔

(٩) بَابٌ : هَلْ يُدْخِلُ الْجُنُبُ يَدَهُ فِي الْإِنَاءِ قَبْلَ أَنْ يَغْسِلَهَا إِذَا لَمْ يَكُنْ عَلَى يَدِهِ قَذَرٌ غَيْرُ الْجَنَابَةِ؟

باب:9- کیا جنبی اپنے ہاتھ دھونے سے پہلے انھیں برتن میں ڈال سکتا ہے جبکہ جنابت کے علاوہ اس کے ہاتھ پر کوئی گندگی نہ ہو؟

وَأَدْخَلَ ابْنُ عُمَرَ وَالْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ يَدَهُ فِي الطَّهُورِ وَلَمْ يَغْسِلْهَا، ثُمَّ تَوَضَّأَ. وَلَمْ يَرَ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ بَأْسًا بِمَا يَنْتَضِحُ مِنْ غُسْلِ الْجَنَابَةِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما نے اپنے ہاتھ دھونے سے پہلے انھیں غسل کے پانی میں ڈالا تھا، پھر اس سے وضو کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ان چھینٹوں میں کوئی مضائقہ خیال نہیں کرتے تھے جو غسل جنابت سے اڑتی ہیں۔

وضاحت: اس باب کا مطلب یہ ہے کہ جنابت میں جو نجاست ہے وہ حکمی اور معنوی ہے، حسی نہیں کہ ظاہر میں اس کا اثر ہوتا ہو، اس لیے اگر جنبی آدمی پانی یا برتن میں ہاتھ ڈال دے تو اس میں کوئی نقصان نہیں بشرطیکہ اس کے ہاتھ پر اور کوئی نجاست نہ لگی ہوئی ہو، کیونکہ اگر ہاتھ پر کوئی اور نجاست لگی ہے تو اس صورت میں پانی پلید ہو جائے گا۔ شریعت نے خاص خاص چیزوں میں نجاست حکمی کا اعتبار کیا ہے، مثلاً: * جنبی آدمی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ * جنبی آدمی قرآن مجید کی تلاوت نہیں کر سکتا۔ * جنبی آدمی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ وغیرہ۔ اگرچہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جنبی آدمی اپنے ہاتھ دھوئے بغیر پانی میں نہ ڈالے۔ تو یہ ایک احتیاطی معاملہ ہے تاکہ شیطان کو غسل یا وضو کرنے والے کے دل میں وسوسہ اندازی کا موقع نہ ملے۔ حضرت

---

① عمدة القاري:27/3. ② شرح الكرماني:123/3.

ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کو سعید بن منصور نے بیان کیا ہے لیکن مصنف عبدالرزاق (258/1) میں ہے کہ آپ وضو یا غسل سے پہلے ہاتھ دھو لیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو یقین ہوتا کہ ہاتھ پر کوئی نجاست نہیں ہے تو دھوئے بغیر اسے پانی میں ڈال دیتے اگر اس کا یقین نہ ہوتا تو احتیاط کے پیش نظر انھیں پہلے دھو لیتے پھر برتن میں ڈالتے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کے اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (184/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اور ابن ابی شیبہ نے حضرت امام شعبی سے روایت کیا ہے کہ بعض صحابۂ کرام اپنے ہاتھ بغیر دھوئے پانی میں ڈال دیتے، حالانکہ وہ جنابت کی حالت میں ہوتے۔ یہ اس وقت ہوتا جب ان کے ہاتھوں پر بظاہر کوئی نجاست نہ نظر آتی تھی۔[1] اسی طرح حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم تو ان چھینٹوں میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے جو غسل کرتے وقت اڑ اڑ کر پانی کے برتن میں جا پڑتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر مصنف عبدالرزاق (92/1) میں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر مصنف ابن ابی شیبہ (133/1) میں موصولاً بیان ہوا ہے۔

٢٦١ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَفْلَحُ عَنِ الْقَاسِمِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَّاحِدٍ تَخْتَلِفُ أَيْدِينَا فِيهِ. [راجع: ٢٥٠]

[261] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں اور نبی ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے جس میں ہمارے ہاتھ ایک دوسرے سے آگے پیچھے پڑتے تھے۔

٢٦٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ غَسَلَ يَدَهُ. [راجع: ٢٤٨]

[262] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت فرماتے تو (پہلے) اپنا ہاتھ دھوتے تھے۔

٢٦٣ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ حَفْصٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ مِّنْ جَنَابَةٍ. وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ مِثْلَهُ. [راجع: ٢٥٠]

[263] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں: میں اور نبی ﷺ ایک ہی برتن میں غسل جنابت کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے والد (قاسم بن محمد بن ابی بکر) کے واسطے سے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔

٢٦٤ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَبْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ ابْنَ مَالِكٍ يَقُولُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ وَالْمَرْأَةُ مِنْ نِّسَائِهِ يَغْتَسِلَانِ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ. زَادَ مُسْلِمٌ

[264] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ اور آپ کی بیویوں میں سے کوئی بیوی ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے۔ اس روایت میں مسلم بن ابراہیم اور وہب بن جریر نے بواسطۂ شعبہ یہ اضافہ بیان کیا

1. المصنف لابن أبي شيبة:152/1.

وَوَهْبٌ عَنْ شُعْبَةَ : مِنَ الْجَنَابَةِ .

ہے کہ وہ غسل جنابت کا ہوتا تھا۔

فوائد ومسائل: ① ان احادیث کے بیان کرنے سے امام بخاری رحمہ اللہ کی ایک غرض تو پانی میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہاتھ دھونے کو ثابت کرنا ہے اور دوسری یہ کہ ضرورت کے وقت ہاتھ دھوئے بغیر بھی پانی میں ہاتھ ڈال سکتے ہیں اور چلو میں پانی نکال سکتے ہیں اگر چہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ یہی ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے جائیں پھر انھیں پانی میں ڈالا جائے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے چار احادیث نقل کی ہیں: پہلی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ غسل کرتے وقت ہمارے ہاتھ اس برتن میں یکے بعد دیگرے پڑتے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسا بحالت جنابت ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجاست حکمی (جنابت) کا پانی پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن اس روایت میں غسل جنابت کی صراحت نہ تھی۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ غسل نظافت یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے ہو، اس لیے دوسری روایت پیش فرمائی جس میں صراحت ہے کہ یہ غسل، غسل جنابت ہوتا تھا لیکن اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل جنابت سے پہلے اپنے ہاتھوں کو دھو لیتے، اور یہ اس وقت ہوتا تھا جب آپ کو ہاتھ پر نجاست کا شبہ ہوتا۔ اگر ایسا ہو تو ہاتھ دھو کر برتن میں ڈالنا چاہیے، اگر کوئی شبہ نہ ہو بلکہ یقین ہو کہ ہاتھوں پر کوئی دوسری نجاست نہیں تو بغیر دھوئے بھی انھیں برتن میں ڈالا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ابتداءً یہ عمل اس احتیاط پر مبنی ہو کہ دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہ ہو۔ تیسری روایت میں برتن اور غسل جنابت دونوں کا یکجا ذکر ہے۔ ان تینوں روایات سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ روایات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ اس طرح بحالت جنابت پانی لینے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کسی خصوصیت کو دخل ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے چوتھی روایت لا کر اس شبہے کا ازالہ کر دیا کیونکہ اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ذکر نہیں ہے۔ بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ کا منشا یہ ہے کہ یہ تمام احادیث مطلق ہیں اور ان کا تعلق جنابت سے ہے۔ پانی لینے کی کوئی بھی صورت ہو اگر ہاتھ پر کوئی ظاہری نجاست لگی ہوئی نہ ہو تو غسل سے قبل پانی یا برتن میں ہاتھ ڈالنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، ہاں اگر کوئی نجاست لگی ہو تو اسے غسل سے قبل ضرور دھو لینا چاہیے۔ اگر اسے دھوئے بغیر پانی یا برتن میں ہاتھ ڈال دیا تو اس سے پانی نجس ہو جائے گا۔

(١٠) بَابُ تَفْرِيقِ الْغُسْلِ وَالْوُضُوءِ

باب:10- غسل اور وضو کے درمیان فاصلہ کرنا

وَيُذْكَرُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ غَسَلَ قَدَمَيْهِ بَعْدَ مَا جَفَّ وَضُوؤُهُ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انھوں نے اپنے قدموں کو وضو کا پانی خشک ہو جانے کے بعد دھویا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ وضو اور غسل کے ارکان میں موالات، یعنی پے در پے دھونا ضروری نہیں بلکہ پہلے دھوئے ہوئے اعضاء کے خشک ہونے کے بعد بھی دوسرے اعضاء دھو لیے جائیں تو بھی وضو اور غسل صحیح رہے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک اثر پیش کیا ہے جسے ابن حزم نے بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بازار میں تھے، وہاں پیشاب کرنے کے بعد وضو کیا اس طرح کہ چہرہ اور ہاتھ دھوئے، سر کا مسح کیا، پھر ایک جنازے کے لیے آپ کو مسجد نبوی

میں بلایا گیا، وہاں پہنچ کر آپ نے موزوں پر مسح کیا اور نماز جنازہ پڑھائی۔

٢٦٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مَحْبُوبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ سَالِمِ ابْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَتْ مَيْمُونَةُ: وَضَعْتُ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ مَاءً يَغْتَسِلُ بِهِ فَأَفْرَغَ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا مَرَّتَيْنِ، أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَفْرَغَ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَغَسَلَ مَذَاكِيرَهُ، ثُمَّ دَلَكَ يَدَهُ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، وَغَسَلَ رَأْسَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَفْرَغَ عَلَى جَسَدِهِ ثُمَّ تَنَحَّى مِنْ مَّقَامِهِ فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ.

[265] حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور انھیں دو یا تین مرتبہ دھویا۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور اپنی شرمگاہ کو دھویا۔ بعد ازاں آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر رگڑا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا۔ پھر آپ نے اپنا چہرہ اور اپنے ہاتھوں کو دھویا، پھر اپنے سر کو تین مرتبہ دھویا اور بدن پر پانی بہایا۔ پھر آپ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور دونوں پاؤں دھوئے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے مسئلہ موالات بیان کیا ہے، یعنی اعضائے وضو اور غسل کو پے در پے دھونا ضروری نہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ جواز تفریق ہی امام شافعی کا قول جدید ہے، جس کے لیے بایں طور استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اعضاء کا دھونا فرض کیا ہے، جو شخص بھی اس امر کی تعمیل کرے گا وہ فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو جائے گا، خواہ تفریق سے کرے یا موالات سے۔ امام بخاری ؒ نے اس کی تائید حضرت ابن عمر ؓ کے عمل سے بھی کر دی ہے۔ یہی موقف ابن مسیب، عطاء اور ایک جماعت کا ہے۔ امام مالک اور حضرت ربیعہ کہتے ہیں کہ جو دانستہ تفریق کرے گا اس پر وضو اور غسل کا اعادہ ہوگا اور جو بھول کر ایسا کرے گا اسے دوبارہ وضو یا غسل کرنے کی ضرورت نہیں۔ امام مالک سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر تفریق تھوڑے وقفے کی ہے تو بنا کرے، اگر لمبے وقفے کی ہے تو اعادہ کرے۔ امام اوزاعی اور قتادہ کہتے ہیں کہ اگر تفریق اس قدر ہے کہ اعضاء خشک ہو جائیں تو اعادہ ہے بصورت دیگر نہیں۔ امام نخعی نے غسل میں تو تفریق کی اجازت دی ہے مگر وضو میں نہیں۔ مذاہب کی یہ تفصیل ابن منذر نے بیان کی ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ جس نے اس معاملے میں اعضاء کے خشک ہونے کو حد فاصل قرار دیا اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔[1] ② اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آغاز غسل میں وضو فرمایا لیکن پاؤں نہیں دھوئے، پھر غسل فرمایا، اس کے بعد جائے غسل سے الگ ہو کر پاؤں دھوئے۔ اس سے معلوم ہوا، اعضائے وضو میں موالات ضروری نہیں بلکہ تفریق جائز ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حدیث اور اثر میں صرف وضو کے متعلق تفریق کا جواز ہے لیکن امام بخاری نے عنوان میں وضو کے ساتھ غسل کو بھی شامل فرمایا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ موالات و تفریق کے متعلق وضو اور غسل کی حیثیت یکساں ہے۔ جو حضرات موالات کے قائل ہیں، مثلاً: امام مالک وغیرہ، وہ وضو اور غسل دونوں میں موالات

1 محلی ابن حزم: 2/69.

کو شرط قرار دیتے ہیں اور جن کے نزدیک موالات ضروری نہیں وہ دونوں جگہ اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ صرف امام نخعی نے تفریق و موالات کے سلسلے میں وضو اور غسل میں فرق کیا ہے۔ [3] حافظ ابن حزم نے بھی اس کے متعلق مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے بھی وضو اور غسل میں تفریق کو جائز قرار دیا ہے، خواہ درمیان میں کتنا ہی وقفہ ہو جائے اور اس کو امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام اوزاعی اور سفیان ثوری کا مذہب لکھا ہے، پھر احادیث و آثار ذکر کر کے امام مالک کے موقف کی تردید کی ہے۔ [1] علامہ طحاوی نے اس کے متعلق بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ اعضاء کا خشک ہو جانا حدث نہیں کہ اسے ناقض وضو قرار دیا جائے۔ اگر وضو کرنے کے بعد اعضاء خشک ہونے سے وضو نہیں ٹوٹتا تو دوران وضو میں اعضاء کا خشک ہو جانا کیونکر ناقض وضو ہو سکتا ہے۔ [2]

(١١) بَابُ مَنْ أَفْرَغَ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فِي الْغُسْلِ

باب:11- جس شخص نے غسل کے وقت اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا

وضاحت: استنجا کرتے وقت دونوں ہاتھوں سے کام لیا جاتا ہے، دائیں ہاتھ سے پانی ڈالا جاتا ہے اور بائیں ہاتھ سے استنجا کیا جاتا ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ استنجا میں دائیں ہاتھ کی مشغولیت، اس کی شرافت کے خلاف ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان قائم کر کے بتایا ہے کہ دائیں ہاتھ کی شرافت ہی کی وجہ سے بحالت استنجا عضو مستور کو چھونے کا معاملہ بائیں ہاتھ سے متعلق رہا اور پانی ڈالنے کا کام دائیں ہاتھ سے لیا گیا ہے۔

٢٦٦ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ: حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ سَالِمِ بْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ بِنْتِ الْحَارِثِ قَالَتْ: وَضَعْتُ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ غُسْلًا وَسَتَرْتُهُ، فَصَبَّ عَلَى يَدِهِ فَغَسَلَهَا مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ - قَالَ سُلَيْمَانُ: لَا أَدْرِي أَذَكَرَ الثَّالِثَةَ أَمْ لَا - ثُمَّ أَفْرَغَ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ، ثُمَّ دَلَكَ يَدَهُ بِالْأَرْضِ أَوْ بِالْحَائِطِ، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ، وَغَسَلَ رَأْسَهُ، ثُمَّ صَبَّ عَلَى جَسَدِهِ، ثُمَّ تَنَحَّى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ، فَنَاوَلْتُهُ خِرْقَةً، فَقَالَ بِيَدِهِ هٰكَذَا وَلَمْ

[266] حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا اور پردہ کر دیا۔ آپ نے اپنے (دائیں ہاتھ سے بائیں) ہاتھ پر پانی ڈالا، پھر اسے ایک یا دو مرتبہ دھویا۔ حضرت سلیمان اعمش کہتے ہیں: مجھے یاد نہیں، سالم نے تیسری مرتبہ کا ذکر کیا یا نہیں۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور اپنی شرمگاہ کو دھویا، پھر زمین یا دیوار سے اپنا ہاتھ رگڑا۔ پھر آپ نے کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا، اور اپنے چہرۂ مبارک اور ہاتھوں کو دھویا اور سر کو دھویا، پھر بدن پر پانی بہایا۔ اس کے بعد ایک طرف ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ بعد ازاں میں نے ایک کپڑا دیا لیکن آپ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا اور اس کے

[1] فتح الباري:487/1. [2] محلى ابن حزم:68/1. [3] فتح الباري:487/1.

يُرِدْهَا . [راجع : ٢٤٩]

لینے کا ارادہ نہیں فرمایا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ہے کہ جس معاملے میں ایک ہاتھ سے کام نہیں چلتا بلکہ دونوں ہاتھ استعمال ہوتے ہیں وہاں گھٹیا کام بائیں ہاتھ سے متعلق ہوگا جیسا کہ استنجے کا معاملہ ہے۔ اس میں نجاست کا ازالہ بائیں ہاتھ سے ہوگا، دائیں ہاتھ سے اس کی شرافت کے پیش نظر پانی ڈالنے کا کام لیا جائے گا۔ اس مقام پر اعتراض کیا گیا ہے کہ دعویٰ عام ہے لیکن جس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے وہ خاص ہے، یعنی اس کا تعلق صرف استنجے کی صورت سے ہے۔ اس کا جواب حافظ ابن حجر نے بایں الفاظ دیا ہے کہ استنجے والی صورت تو حدیث الباب سے ثابت ہوگئی اور اس کے علاوہ دوسری صورتیں دوسری معروف احادیث سے پہلے ہی معلوم ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر کام دائیں طرف سے شروع کرنے کو محبوب رکھتے تھے اور یہاں وہ صورت مراد ہوگی کہ چوڑے منہ والے برتن سے پانی چلو کے ذریعے سے نکالا جائے تو ظاہر ہے کہ اس برتن کو دائیں جانب رکھ کر دائیں ہاتھ سے پانی نکالیں گے اور بائیں ہاتھ پر ڈالیں گے۔ اگر تنگ منہ والا برتن ہو جس سے چلو نہ بھرا جا سکتا ہو تو اسے بائیں جانب رکھیں گے پھر اسے جھکا کر دائیں ہاتھ میں پانی لیں گے جیسا کہ خطابی نے وضاحت کی ہے۔[1] علامہ خطابی کی وضاحت کو کرمانی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔[2] ② اس حدیث میں ہے کہ آپ نے جسم صاف کرنے کے لیے کپڑا نہ لینے کا اشارہ فرمایا، آگے وضاحت ہے کہ آپ نے لینے کا ارادہ نہیں فرمایا۔ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ آپ نے اسے واپس نہیں کیا۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں کیونکہ مسند امام احمد میں مزید وضاحت ہے کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ میں لینا نہیں چاہتا اور حدیث میمونہ کے ایک طریق میں ہے کہ میں نے آپ کو کپڑا دیا لیکن آپ نے نہ لیا۔[3] ③ اس روایت میں ہے کہ اعمش کہتے ہیں: مجھے یاد نہیں کہ سالم نے تیسری مرتبہ کا ذکر کیا یا نہیں، حالانکہ اس سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ عبدالواحد جب اعمش سے بیان کرتے ہیں تو دو یا تین مرتبہ میں شک کو بیان کرتے ہیں اور جب حضرت ابن فضیل اعمش سے بیان کرتے ہیں تو وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ تین مرتبہ اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن فضیل جب اعمش سے روایت کرتے ہیں تو اس وقت اعمش کا شک دور ہو گیا ہوگا کیونکہ اعمش سے ابن فضیل کا سماع بعد کا ہے، بغیر شک کے تین مرتبہ ہاتھوں پر پانی ڈالنے کی روایت کو ابو عوانہ نے اپنی مستخرج میں بیان کیا ہے۔[4] ④ شریعت مطہرہ کے اصول کی رُو سے جو کام تکریم و زینت سے تعلق رکھتے ہیں انھیں دائیں جانب سے شروع کرنا مستحب ہے، مثلاً: مسجد میں داخل ہونا، مصافحہ کرنا، مسواک کرنا، سرمہ لگانا، بالوں میں کنگھی کرنا، کپڑا زیب تن کرنا، سلام پھیرنا، اعضائے طہارت دھونا، بیت الخلا سے نکلنا، کھانا، پینا، حجر اسود کا استلام کرنا وغیرہ۔ باقی جو باتیں ان کی ضد ہیں یا بری جگہوں سے متعلق ہیں یا ایسے کام جو ادنیٰ ہیں، تو وہاں بائیں کو دائیں پر مقدم کرنا چاہیے، مثلاً: بیت الخلا میں داخل ہونا، مسجد سے نکلنا، ناک صاف کرنا، استنجا کرنا، جوتا اتارنا۔ ان میں تیامن (دائیں جانب اختیار کرنے) کے بجائے تیاسر (بائیں جانب اختیار کرنا) مستحب ہے۔

---

1. فتح الباري:488/1. 2. شرح الكرماني:129/1. 3. فتح الباري:488/1. 4. فتح الباري:488/1.

(١٢) بَابٌ: إِذَا جَامَعَ ثُمَّ عَادَ، وَمَنْ دَارَ عَلَى نِسَائِهِ فِي غُسْلٍ وَاحِدٍ

باب:12- ایک دفعہ جماع کے بعد دوبارہ ہم بستر ہونا اور ایک ہی غسل سے تمام بیویوں کے پاس جانا

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان میں دو مسئلے بیان کرنا چاہتے ہیں: * ایک دفعہ جماع کے بعد اگر کوئی اسی رات یا دن کو دوبارہ جماع کرنا چاہتا ہے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ * اگر کوئی ایک رات میں تمام بیویوں سے ہم بستر ہونے کے بعد آخر میں غسل کرتا ہے تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ متعدد جماع کے لیے ایک غسل کافی ہے، چنانچہ علماء کا اس پر اجماع ہے، البتہ ہر جماع کے لیے الگ الگ غسل کرنا مستحب ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ تمام بیویوں سے جماع کیا اور ہر جماع کے بعد مستقل طور پر غسل فرمایا۔ راویٔ حدیث حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ایک غسل پر اکتفا کیوں نہیں فرمایا؟ تو آپ نے فرمایا: ''یہ صورت زیادہ پاکیزہ اور ستھری ہے۔''[1] اس صحیح حدیث سے استحباب ثابت ہوا۔ اگرچہ امام ابوداود نے دوسری حدیث انس بھی بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متعدد جماع کے بعد صرف ایک بار غسل فرمایا اور حدیث انس کو حدیث ابی رافع سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے حدیث ابی رافع کی صحت کو بھی تسلیم کر لیا ہے، گویا ایک اصح حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا متعدد جماع کے بعد غسل واحد ثابت ہوا تو دوسری صحیح حدیث سے متعدد غسل کا ثبوت آپ کے ارشاد سے ہوا۔ اس سے وجوب کی نفی ہو کر استحباب کا درجہ رہ جاتا ہے۔ متعدد جماع کے درمیان وضو کرنا بھی ضروری نہیں اگرچہ بعض حضرات نے حدیث مسلم کے پیش نظر وضو کو ضروری قرار دیا ہے کہ تم میں سے جب کوئی اپنی بیوی سے ہم بستر ہو، پھر دوبارہ جماع کا ارادہ ہو تو وضو کرے۔[2] وضو کرنا ضروری اس لیے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جماع کے بعد اعادہ فرماتے تھے اور درمیان میں وضو نہ کرتے تھے۔[3] وضو کرنا مستحب ہے، ضروری نہیں کیونکہ ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے کہ درمیان میں وضو کرنا دوبارہ جماع کے لیے زیادہ نشاط پیدا کرنے والا ہے۔[4]

٢٦٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي عَدِيٍّ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْتَشِرِ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: ذَكَرْتُهُ لِعَائِشَةَ فَقَالَتْ: يَرْحَمُ اللهُ أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ كُنْتُ أُطَيِّبُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَيَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ ثُمَّ يُصْبِحُ مُحْرِمًا يَنْضَخُ طِيبًا. [انظر: ٢٧٠]

[267] حضرت ابراہیم بن محمد بن منتشر سے روایت ہے، وہ اپنے والد محمد بن منتشر سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس (غسل احرام میں استعمالِ خوشبو) کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوعبدالرحمٰن (ابن عمر) پر رحم فرمائے (انھیں غلط فہمی ہوئی)، میں نے رسول اللہ ﷺ کو خوشبو لگائی، پھر آپ اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس گئے اور صبح کو احرام اس حالت

[1] سنن أبي داود، الطهارة، حديث:219. [2] صحيح مسلم، الحيض، حديث:707(308). [3] شرح معاني الآثار للطحاوي: 77/1. [4] صحيح ابن خزيمة:110/1.

میں باندھا کہ خوشبو سے آپ کا جسم مہک رہا تھا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ جماع کے بعد دوسرے جماع کی نوبت آئے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ جماع، خواہ اس بیوی سے ہو جس سے پہلی بار کیا گیا تھا یا دوسری کسی بیوی سے۔ عنوان کا دوسرا جز یہ ہے کہ چند بیویاں ہیں، ان سب سے ہم بستر ہونے کے بعد آخر میں ایک ہی غسل کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ دونوں جائز ہیں۔ دوسرے مسئلے کے ثبوت سے پہلا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جائے گا کیونکہ جب متعدد بیویوں سے فراغت کے بعد ایک ہی غسل درست ہوا تو دوبارہ جماع خود بخود ثابت ہو گیا۔ ② بحالت احرام خوشبو استعمال کرنے پر کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف تھا کہ اگر احرام سے پہلے خوشبو استعمال کی گئی اور احرام کے بعد اس کا اثر باقی رہا تو اس پر بھی کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے جب یہ بات آئی تو آپ نے اس کی تردید فرمائی اور بطور ثبوت رسول اللہ ﷺ کا عمل پیش کر دیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ حضرت امام مالک نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا موقف اختیار کیا جبکہ جمہور علمائے امت احرام سے پہلے خوشبو کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے، خواہ اس کا اثر احرام کے بعد بھی باقی رہے۔ ③ عنوان میں بیان شدہ مسئلہ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خوشبو کے استعمال کے بعد تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاتے۔ صبح کو احرام باندھتے تو جسم اطہر سے خوشبو مہک رہی ہوتی تھی۔ عنوان کا پہلا جز تو يطوف على نسائه، یعنی اپنی عورتوں سے ہم بستر ہوئے، اس سے ثابت ہو رہا ہے اور اس کا دوسرا جز اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ ہر بیوی سے فراغت کے بعد علیحدہ علیحدہ غسل کرتے تو یہ بات عادۃً ناممکن ہے کہ متعدد بار غسل کیا جائے اور خوشبو کے اثرات بھی باقی رہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمام ازواج سے فراغت کے بعد آخر میں ایک غسل فرمایا ہوگا۔ ④ رسول اللہ ﷺ کے متعلق زیر بحث واقعہ صرف ایک مرتبہ حجۃ الوداع کے موقع پر احرام سے پہلے پیش آیا۔ آپ نے چاہا کہ احرام سے پہلے سنت جماع کو بھی ادا فرمائیں اور چونکہ سب ازواج مطہرات اس موقع پر آپ کے ساتھ تھیں، اس لیے جمع کی صورت پیش آئی تاکہ فراغ خاطر اور اطمینان کے ساتھ مناسک حج میں یکسوئی حاصل ہو جو اس سنت کے ادا کرنے کا مقصد تھا۔

٢٦٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَدُورُ عَلَى نِسَائِهِ فِي السَّاعَةِ الْوَاحِدَةِ مِنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُنَّ إِحْدَى عَشْرَةَ، قَالَ: قُلْتُ لِأَنَسٍ: أَوَكَانَ يُطِيقُهُ؟ قَالَ: كُنَّا نَتَحَدَّثُ أَنَّهُ أُعْطِيَ قُوَّةَ ثَلَاثِينَ.

[268] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ دن اور رات کے ایک ہی وقت میں اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس گئے اور یہ گیارہ تھیں۔ راوی نے کہا: میں نے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ اس کی طاقت رکھتے تھے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کے برابر طاقت دی گئی ہے۔

وَقَالَ سَعِيدٌ عَنْ قَتَادَةَ: إِنَّ أَنَسًا حَدَّثَهُمْ: تِسْعُ نِسْوَةٍ. [انظر: ٢٨٤، ٥٠٦٨، ٥٢١٥]

سعید راوی نے قتادہ سے روایت کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ آپ کی نو ازواج مطہرات تھیں۔

فوائد و مسائل: ① عنوان سے حدیث کی مطابقت کے متعلق علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ حدیث عائشہ سے پتہ چلتا ہے کہ احرام سے پہلے لگائی گئی خوشبو کے اثرات احرام کے بعد بھی باقی تھے، اگر رسول اللہ ﷺ نے ہر بیوی کے پاس الگ الگ غسل کیا ہوتا تو خوشبو کے اثرات کا باقی رہنا عادۃً بعید ہے، اسی طرح حدیثِ انس میں عنوان کا ثبوت في الساعة الواحدة کے الفاظ سے بھی ہو رہا ہے، اس لیے کہ ایک ساعت میں ہر ایک کے پاس جانا اور ہر ایک کے پاس الگ الگ غسل کرنا عادۃً محال ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ نے سب سے فراغت کے بعد آخر میں ایک غسل فرمایا تھا۔[1] دونوں روایات سے عنوان کا ثبوت اشارۃ النص سے ہو رہا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اپنی دقتِ نظر کے پیش نظر استدلال کے لیے نئے نئے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ② اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی ساعت میں گیارہ ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے، حیرت وتعجب کے ساتھ اس سے سوال ہوا کہ آیا رسول اللہ ﷺ کے پاس اس قدر طاقت تھی کہ آپ ایک وقت میں گیارہ ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے جاسکتے تھے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیوں نہیں، ہمارے ہاں یہ بات مشہور تھی کہ آپ کو اس دنیا میں تیس مردوں کی قوت دی گئی۔ اسماعیلی کی روایت میں چالیس مردوں کی صراحت ہے اگرچہ وہ روایت شاذ ہے، مگر مراسیل طاوس میں بھی اسی طرح ہے اور اس میں في الجماع کا لفظ بھی ہے، نیز صفة الجنة لأبي نعيم میں اہل جنت کے آدمیوں کی طاقت کے الفاظ ہیں۔ حضرت زید بن ارقم کی روایت میں ہے کہ جنت کے ایک آدمی کو اکل وشرب اور جماع وشہوت کی قوت ایک سو مردوں کے برابر حاصل ہوگی، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی قوت کا حساب چار ہزار مردوں کے برابر ہوتا ہے۔[2] اس قدر قوت جماع کے باوجود آپ نے صرف گیارہ عورتوں سے تعلق رکھا ہے۔ ③ ہشام کی روایت کے مطابق ازواج مطہرات کی تعداد گیارہ ہے جبکہ سعید کی روایت میں نو کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عقدِ زواج میں بیک وقت نو سے زیادہ ازواج جمع نہیں ہوئیں۔ اس بنا پر سعید کی روایت راجح ہے اور ہشام کی روایت کو ازواج کے ساتھ ماریہ اور ریحانہ کو بھی ملانے پر محمول کریں گے۔ ان تمام پر نساء النبي کا اطلاق بطور تغلیب ہوا ہے۔ علامہ دمیاطی نے اپنی سیرت میں ان کی تعداد تیس تک بتائی ہے جن میں وہ بھی ہیں جو پوری طرح شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں اور وہ بھی ہیں جن سے صرف عقد نکاح ہوا اور وہ بھی ہیں جن کو آپ نے قبل مصاحبت طلاق دے دی اور وہ بھی ہیں جنھیں آپ نے پیغام نکاح دیا لیکن عقد زواج نہ ہوا۔ حق یہ ہے کہ کثرتِ مذکورہ بوجہ اختلاف بعض اسماء ہوئی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ صحیح تعداد ان سے کہیں کم ہے۔[3] ④ ازواج مطہرات کی تعداد میں اختلاف ہے مگر گیارہ پر سب کا اتفاق ہے: حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت ام سلمہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت میمونہ، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت جویریہ، حضرت صفیہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہن۔ تزوج کے لحاظ سے ترتیب اس طرح ہے: حضرت خدیجہ، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت زینب بنت خزیمہ ام المساکین، حضرت میمونہ، حضرت جویریہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہن۔ رسول اللہ ﷺ کی بیشتر اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوئی، جن کی تفصیل یہ ہے: حضرت قاسم، حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت ام کلثوم، حضرت فاطمہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہم۔ ان کے علاوہ آخری اور ساتویں اولاد حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے جو آپ کی لونڈی ماریہ قبطیہ کے

---

① حاشية السندي:1/59. ② فتح الباري:1/491. ③ فتح الباري:1/490.

بطن سے پیدا ہوئے، ان کا انتقال بھی صغر سنی میں ہوا۔

(١٣) بَابُ غَسْلِ الْمَذْيِ وَالْوُضُوءِ مِنْهُ

باب:13- مذی کا دھونا اور اس کے خروج سے وضو کا واجب ہونا

وضاحت: اس عنوان میں تین باتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ① مذی ناپاک ہے کیونکہ اس کے لیے غسل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ② اس سے طہارت صرف دھونے سے ہوگی، اس میں کھرچنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ③ خروج مذی ناقض وضو ہے، موجب غسل نہیں۔

٢٦٩ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا زَائِدَةُ عَنْ أَبِي حَصِينٍ، عَنْ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ رَجُلًا [أَنْ] يَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ لِمَكَانِ ابْنَتِهِ، فَسَأَلَ فَقَالَ: «تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ». [راجع: ١٣٢]

[269] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: مجھے مذی بکثرت آتی تھی۔ چونکہ میرے گھر میں نبی ﷺ کی صاحبزادی تھیں، اس لیے میں نے ایک شخص سے کہا کہ وہ آپ سے اس کے متعلق سوال کرے۔ انھوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''وضو کرلو اور اپنے عضو مخصوص کو دھولو۔''

فوائد ومسائل: ① مذی اس رطوبت کو کہتے ہیں جو بیوی سے ملاعبت اور بوس وکنار کے وقت خارج ہوتی ہے۔ اس میں اور منی میں کئی لحاظ سے فرق ہے: * منی گاڑھی لیس دار ہوتی ہے، جبکہ مذی ایک رقیق لیس دار مادہ ہے۔ * منی بھرپور شہوت سے خارج ہوتی ہے، جبکہ مذی میں شہوت کمزور ہوتی ہے۔ * منی کے خروج سے غسل واجب ہوتا ہے جبکہ مذی سے صرف وضو کرنا ضروری ہے۔ * منی کی طہارت کھرچنے سے بھی ہوسکتی ہے، جبکہ مذی کو دھونا ضروری ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود بھی سوال کیا تھا لیکن مذکورہ حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے تعلق دامادی کی بنا پر براہ راست خود اس قسم کا سوال کرنے سے شرماتے تھے۔ محدثین نے تطبیق کی یہ صورت نکالی ہے کہ پہلے آپ نے حضرت عمار اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما سے سوال کرنے کے متعلق کہا، جب ان کے دریافت کرنے پر جواب مل گیا تو مزید اطمینان کے لیے کسی موقع پر خود بھی دریافت کرلیا ہوگا۔ صحیح اور صریح احادیث کے پیش نظر تینوں کی طرف سوال کی نسبت حقیقی ہے۔[1] ② علامہ عینی نے اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل کا استنباط کیا ہے: * مسئلہ پوچھنے میں دوسروں کو وکیل بنایا جاسکتا ہے۔ * خبر مقطوع پر قدرت کے باوجود خبر مظنون پر اعتماد درست ہے۔ * دامادی اور سسرالی رشتوں کی رعایت کرنا ایک اچھا اقدام ہے۔ * شوہر کو خاص طور پر نسوانی تعلق کی باتیں اپنے قریبی (سسرالی) رشتے داروں کے سامنے نہیں کہنی چاہئیں۔ * مذی کے خروج سے صرف وضو واجب ہوتا ہے، غسل کی ضرورت نہیں۔ * صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ کی انتہائی تعظیم وتوقیر ملحوظ ہوا کرتی تھی۔ * شرم وحیا کی

1 عمدة القاري: 44/3.

بات براہ راست نہ کرنے میں ادب و احترام کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔[1]

(١٤) بَابُ مَنْ تَطَيَّبَ ثُمَّ اغْتَسَلَ وَبَقِيَ أَثَرُ الطِّيبِ

باب:14- جس نے خوشبو لگائی پھر غسل کیا لیکن خوشبو کا اثر باقی رہا

٢٧٠ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُوعَوَانَةَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْتَشِرِ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ، فَذَكَرْتُ لَهَا قَوْلَ ابْنِ عُمَرَ: مَا أُحِبُّ أَنْ أُصْبِحَ مُحْرِمًا أَنْضَخُ طِيبًا. فَقَالَتْ عَائِشَةُ: أَنَا طَيَّبْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ ثُمَّ طَافَ فِي نِسَائِهِ ثُمَّ أَصْبَحَ مُحْرِمًا. [راجع: ٢٦٧]

[270] حضرت ابراہیم بن محمد بن منتشر سے روایت ہے، وہ اپنے والد محمد بن منتشر سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ ؓ سے پوچھا اور ان سے حضرت ابن عمر ؓ کے اس قول کا بھی ذکر کیا کہ میں یہ بات گوارا نہیں کرتا کہ احرام باندھوں اور خوشبو میرے جسم سے مہک رہی ہو۔ اس پر حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو خوشبو لگائی، پھر آپ اپنی تمام ازواج کے پاس گئے اور اس کے بعد احرام باندھا۔

٢٧١ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا الْحَكَمُ عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى وَبِيصِ الطِّيبِ فِي مَفْرِقِ النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ. [انظر: ١٥٣٨، ٥٩١٨، ٥٩٢٣]

[271] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے، آپ نے فرمایا: گویا میں نبی ﷺ کی مانگ میں خوشبو کی چمک دیکھ رہی ہوں اور آپ احرام باندھے ہوئے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس عنوان کے دو حصے ہیں: * غسل کرنا، چونکہ طواف نساء، جماع سے کنایہ ہے اور اس کے لوازمات سے فریضہ غسل ہے۔ * خوشبو کا اثر باقی رہنا، اس کا ثبوت حضرت عائشہ ؓ کے جواب سے ہے جو انھوں نے حضرت ابن عمر بات رد کرتے ہوئے فرمایا، نیز دوسری حدیث میں مانگ میں خوشبو کی چمک دیکھنا بھی عنوان کے اس دوسرے حصے کے مطابق ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث محرم کے بدن پر خوشبو کے اثرات باقی رہنے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اگر خوشبو پہلے سے لگی ہوئی ہو تو حالت احرام کے خلاف نہیں اور نہ اس کی وجہ سے کفارہ ہی لازم آتا ہے۔ البتہ احرام کے بعد خوشبو کا استعمال درست نہیں۔[2] ② شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شرح تراجم بخاری میں اس عنوان کا یہ مقصد بیان کیا ہے کہ غسل یا وضو میں اعضاء کو ملنا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر پر غسل کے بعد بھی خوشبو کا اثر باقی رہا۔ اگر آپ نے بدن کو ملا ہوتا یا اس میں مبالغہ کیا ہوتا تو خوشبو یا اسکے اثرات کا باقی رہنا مشکل تھا۔ ہم شاہ صاحب کے بیان پر مزید اضافہ کرتے ہیں

① عمدة القاري:45/3. ② فتح الباري:495/1.

کہ امام بخاری ﷫ نے غسل سے متعلقہ دو مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے: ✷ خوشبو کے استعمال کے بعد جب مجامعت کا عمل کیا تو بدن ناپاک ہوگیا اور بدن کی ناپاکی سے خوشبو کا متاثر ہونا بھی یقینی ہے، اب اگر غسل کے بعد ایسی خوشبو کا اثر باقی رہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ امام صاحب نے بتا دیا کہ وہ خوشبو جو جنابت کے اثر سے متاثر تھی غسل کے بعد طاہر ہے اور غسل بھی معتبر ہے، نیز جنابت کی حالت میں جنابت سے متاثر شدہ خوشبو کا غسل کے بعد باقی رہنا مضر نہیں۔ ✷ بدن پر خوشبو یا تیل کے استعمال کے بعد غسل کیا جائے تو ایسی حالت میں پانی جسم پر بہت کم نفوذ کرتا ہے کیونکہ خوشبو یا تیل کی چکناہٹ جلد کی تہہ تک پانی پہنچانے میں بعض اوقات رکاوٹ بن جاتی ہے، اس قسم کے غسل کی کیا حیثیت ہے؟ اس عنوان سے معلوم ہوا کہ غسل صحیح ہے اور اس قسم کے خیالات شریعت کی نظر میں ناقابل التفات ہیں۔

(١٥) بَابُ تَخْلِيلِ الشَّعَرِ، حَتّٰى إِذَا ظَنَّ أَنَّهُ قَدْ أَرْوٰى بَشَرَتَهُ أَفَاضَ عَلَيْهِ

باب:15- بالوں کا خلال کرنا اور جب یقین ہوگیا کہ کھال تر ہوگئی تو اس پر پانی بہا دینا

وضاحت: اس مقام پر تخلیل شعر کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ غسل جنابت کرتے وقت بالوں کی جڑیں اور سر کی کھال کا تر کرنا ضروری ہے، یوں ہی پانی بہا دینا کافی نہیں ہوگا۔

٢٧٢ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ غَسَلَ يَدَيْهِ، وَتَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ اغْتَسَلَ، ثُمَّ يُخَلِّلُ بِيَدِهِ شَعَرَهُ حَتّٰى إِذَا ظَنَّ أَنَّهُ قَدْ أَرْوٰى بَشَرَتَهُ أَفَاضَ عَلَيْهِ الْمَاءَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ غَسَلَ سَائِرَ جَسَدِهِ. [راجع: ٢٤٨]

[272] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو پہلے اپنے ہاتھوں کو دھوتے اور نماز کے وضو کی طرح وضو کرتے۔ پھر غسل کا آغاز کرتے۔ پھر اپنے ہاتھ سے بالوں کا خلال کرتے اور جب یقین ہو جاتا کہ کھال تر ہوگئی ہے تو تین دفعہ اس پر پانی بہاتے، پھر تمام بدن کا غسل کرتے۔

٢٧٣ - وَقَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ نَغْرِفُ مِنْهُ جَمِيعًا. [راجع: ٢٥٠]

[273] حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: میں اور نبی ﷺ ایک برتن میں غسل کرتے تھے۔ ہم دونوں اس سے چلو بھر بھر کر پانی لیتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① اس سے پہلے حدیث نمبر (248) میں یہ الفاظ تھے کہ پھر آپ تمام جلد پر پانی ڈالتے۔ یہاں سائر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگر یہ لفظ بقیہ کے معنی میں لیا جائے تو اس سے باقی جسم دھونے کی بات ثابت ہوئی اور اگر سائر، سور البلد سے

ہوتو تمام جسم کے دھونے کا ثبوت ہوا، اس طرح دونوں روایات کا معنی ایک ہو جاتا ہے۔[1] ② غسل جنابت میں صرف پانی بہا لینا کافی نہیں بلکہ اس میں بالوں کی جڑ اور سر کی جلد کا تر کرنا ضروری ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے پانی سے بالوں کی جڑوں کو تر کر لیا جائے، جب یقین ہو جائے کہ جلد تر ہو گئی ہے تو پانی کو اپنے اوپر بہا لیا جائے۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے سر مبارک پر تین لپ پانی ڈالتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسا عمل تخلیل کے بعد ہوتا تھا، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے، اور اگر یہ کام خلال کے بغیر ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ امام بخاری ؒ اس مقام پر امام احمد بن حنبل کی تائید فرما رہے ہیں کہ عورتوں کے لیے غسل جنابت میں مینڈھیوں کا کھولنا ضروری نہیں بلکہ ان کی جڑوں تک پانی پہنچا دینا کافی ہے جبکہ غسل حیض میں ان مینڈھیوں کا کھولنا ضروری ہے جیسا کہ آئندہ کتاب الحیض میں ایک عنوان بایں الفاظ آئے گا ''غسل حیض کے وقت عورت کے لیے اپنے بالوں کو کھولنا'' جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک عورتوں کے لیے غسل جنابت اور غسل حیض میں کوئی فرق نہیں۔ ③ ابن بطال نے لکھا ہے کہ غسل جنابت میں تخلیل شعر کا ضروری ہونا اتفاقی اور اجماعی مسئلہ ہے اور اسی پر ڈاڑھی کے بالوں کو قیاس کیا گیا ہے کیونکہ وہ بھی اسی طرح کے بال ہیں، البتہ ڈاڑھی کے خلال میں کچھ اختلاف ہے جبکہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عمار، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت انس ؓ ڈاڑھی کا خلال کرتے تھے۔[2] امام بخاری نے ڈاڑھی کے خلال کے متعلق کوئی عنوان قائم نہیں کیا البتہ امام ترمذی اور امام ابوداود نے اس پر عنوان قائم کر کے روایات ذکر کی ہیں۔ شاید وہ روایات امام بخاری کی شرط کے مطابق نہ تھیں، چنانچہ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے تو ڈاڑھی کا خلال کرتے اور فرماتے کہ مجھے میرے رب نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔[3] بہر حال غسل جنابت میں جلد تک پانی پہنچانا ضروری ہے اور تمام بالوں کو تر کرنا بھی لازم ہے۔ صرف عورتوں کو گندھے ہوئے بالوں کے متعلق اجازت ہے کہ وہ انھیں (غسل جنابت میں) کھولے بغیر اپنے سر پر تین دفعہ پانی ڈال لیں جیسا کہ حضرت ثوبان ؓ سے اس کی تفصیل مروی ہے۔[4]

(١٦) بَابُ مَنْ تَوَضَّأَ فِي الْجَنَابَةِ ثُمَّ غَسَلَ سَائِرَ جَسَدِهِ وَلَمْ يُعِدْ غَسْلَ مَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهُ مَرَّةً أُخْرَى

باب: 16- جس نے بحالت جنابت وضو کیا، پھر سارا بدن دھویا اور اعضائے وضو دوبارہ نہیں دھوئے

٢٧٤ - حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ عِيسَى قَالَ: أَخْبَرَنَا الْفَضْلُ بْنُ مُوسَى قَالَ: أَخْبَرَنَا الْأَعْمَشُ عَنْ سَالِمٍ، عَنْ كُرَيْبٍ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ: وَضَعَ رَسُولُ اللهِ

[274] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے غسل جنابت کے لیے پانی رکھا۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر دو یا تین مرتبہ پانی ڈالا۔ بعد ازاں اپنی شرمگاہ کو دھویا، پھر اپنے ہاتھ

① فتح الباري:496/1. ② شرح ابن بطال:386/1. ③ سنن أبي داود، الطهارة، حديث:145. ④ سنن أبي داود، الطهارة، حديث:255.

ﷺ وَضُوءَ الْجَنَابَةِ فَكَفَأَ بِيَمِينِهِ عَلٰى يَسَارِهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ فَرْجَهُ، ثُمَّ ضَرَبَ يَدَهُ بِالْأَرْضِ أَوِ الْحَائِطِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلٰى رَأْسِهِ الْمَاءَ، ثُمَّ غَسَلَ جَسَدَهُ، ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ، قَالَتْ: فَأَتَيْتُهُ بِخِرْقَةٍ فَلَمْ يُرِدْهَا فَجَعَلَ يَنْفُضُ الْمَاءَ بِيَدِهِ. [راجع: ٢٤٩]

کو زمین یا دیوار پر دو، تین مرتبہ رگڑ کر دھویا۔ پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور اپنے چہرے اور بازوؤں کو دھویا۔ پھر آپ نے اپنے سر مبارک پر پانی بہایا۔ پھر تمام جسم کو دھویا، پھر اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ حضرت میمونہ ؓ فرماتی ہیں: میں آپ کے پاس ایک کپڑا لے کر آئی تو آپ نے اسے نہیں لیا اور ہاتھوں ہی سے پانی جھاڑنے لگے۔

فوائد ومسائل: ① کتاب الوضوء کے آغاز میں امام بخاری ؒ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا تھا ''غسل جنابت سے پہلے وضو کرنا'' وہاں غسل جنابت سے پہلے وضو کرنے کی اہمیت وحیثیت بیان فرمائی تھی، مگر یہ بات کہ اس وضو کے بعد جب غسل کرے تو کیا پھر بھی اعضائے وضو کو دھونے کا اعادہ کرے یا اس کی ضرورت نہیں؟ امام بخاری ؒ نے اس عنوان میں اس بات کی وضاحت کر دی کہ اس کے اعادے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اعضاء ایک مرتبہ دھل چکے ہیں اور غسل جنابت میں تمام اعضائے جسم کا دھل جانا کافی ہے، خواہ ان کا دھونا وضو کے طور پر ہو یا غسل کے طور پر، اسی طرح غسل کے بعد دوبارہ وضو کرنے کی بھی ضرورت نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل کے بعد وضو نہیں فرمایا کرتے تھے۔[1] ② علامہ ابن بطال نے لکھا ہے کہ اس عنوان کے مطابق تو حدیث عائشہ رقم (172) تھی جس میں ہے کہ وضو سے فراغت کے بعد جسم کے باقی اعضاء دھوتے، مذکورہ حدیث عنوان کے مطابق نہیں کیونکہ اس کے الفاظ ہیں: وضو کے بعد اپنے جسم کو دھوتے۔ اور جلد کا لفظ عام ہے، اس میں مواضع وضو بھی شامل ہیں۔[2] جب یہ صورت حال ہے تو عدم اعادہ والی بات کیسے ثابت ہوگئی؟ شارحین اس کے مختلف جواب دیتے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: * قرینۂ حال اور عرف کے تحت سیاق کلام سے اعضائے وضو مستثنیٰ ہیں، یعنی اعضائے معینہ کے ذکر کے بعد جلد کا ذکر عرف کے طور پر بقیہ جلد کا مفہوم دے رہا ہے، اس سے پورا جسم مراد نہیں کیونکہ اعضائے وضو کو دوبارہ دھونے کا ذکر نہیں ہوا۔[3] * ابن تین نے اس کا جواب بایں طور دیا ہے کہ دوسری روایت کے قرینے سے یہاں بقیہ جسم مراد ہے کیونکہ ترمذی کی روایت میں [ثم أفاض علٰى سائر جسده] کے الفاظ ہیں۔[4] لیکن حافظ ابن حجر ؒ نے اس جواب کو محل نظر قرار دیا ہے۔[5] وہ لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ نے ثم غسل جسده کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ اس کی دلیل حدیث کے آخر میں آنے والے الفاظ ''پھر آپ نے اپنے پاؤں دھوئے'' ہیں۔ اگر غسل جسده کو عام حقیقی معنی پر محمول کیا جائے تو اس کے بعد پاؤں کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان کا دھونا تو عموم میں آچکا تھا۔ پھر آپ نے لکھا ہے کہ یہ جواب

1 جامع الترمذي، الطهارة، حديث:107. 2 شرح ابن بطال:389/1. 3 المتواري، ص:77. 4 جامع الترمذي، الطهارة، حديث:103. 5 فتح الباري:497/1.

امام بخاری کی شانِ تدقیق اور خصوصی تصرفات کے زیادہ مناسب ہے۔ وہ واضح امور کے بجائے دقیق نکات کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔[1] ③ اعضائے وضو کو دوران غسل میں دوبارہ دھونے کی ضرورت اس وقت نہیں ہوگی جب وضوئے شرعی کی نیت سے اعضائے وضو کو غسل سے پہلے دھویا گیا ہو۔ اس کے برعکس اگر اعضائے وضو کو صرف ان کی شرافت کی وجہ سے غسل سے پہلے دھویا، وضوئے شرعی کی نیت نہیں کی تو اس صورت میں امام بخاری نے عدم اعادہ کا فیصلہ نہیں دیا۔

(١٧) بَابٌ: إِذَا ذَكَرَ فِي الْمَسْجِدِ أَنَّهُ جُنُبٌ يَخْرُجُ كَمَا هُوَ وَلَا يَتَيَمَّمُ

باب:17- جب کسی کو مسجد میں یاد آئے کہ وہ جنبی ہے تو اسی حالت میں باہر آجائے، اسے تیمم کرنے کی ضرورت نہیں

٢٧٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَعُدِّلَتِ الصُّفُوفُ قِيَامًا فَخَرَجَ إِلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَلَمَّا قَامَ فِي مُصَلَّاهُ ذَكَرَ أَنَّهُ جُنُبٌ، فَقَالَ لَنَا: «مَكَانَكُمْ»، ثُمَّ رَجَعَ فَاغْتَسَلَ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَيْنَا وَرَأْسُهُ يَقْطُرُ، فَكَبَّرَ فَصَلَّيْنَا مَعَهُ. تَابَعَهُ عَبْدُ الْأَعْلَى، عَنْ مَعْمَرٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، وَرَوَاهُ الْأَوْزَاعِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ.

[انظر: ٦٣٩، ٦٤٠]

[275] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ایک دفعہ نماز کے لیے اقامت کہہ دی گئی اور کھڑے ہو کر صفیں بھی سیدھی کر لی گئیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ جب آپ مصلے پر کھڑے ہو چکے تو یاد آیا کہ آپ جنابت کی حالت میں ہیں۔ اس وقت آپ نے ہم سے فرمایا: ''اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔'' پھر آپ واپس چلے گئے، غسل فرمایا اور دوبارہ مسجد میں تشریف لائے تو آپ کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا تھا، چنانچہ آپ نے نماز کے لیے تکبیر کہی اور ہم نے آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ عبدالاعلیٰ نے بواسطۂ معمر زہری سے عثمان بن عمر کی متابعت کی ہے اور اوزاعی نے بھی زہری سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔

فوائد ومسائل: ① ابن بطال نے بعض تابعین کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی جنبی شخص بھول کر مسجد میں داخل ہو جائے، جب اسے یاد آئے تو تیمم کر کے مسجد سے نکلے۔ امام ثوری اور اسحاق کا بھی یہی موقف ہے۔[2] امام بخاری ؒ نے ان حضرات کی تردید میں اس عنوان کو قائم کیا ہے، یعنی جنبی آدمی مسجد میں آ گیا، اسے خیال نہ تھا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہے، بعد میں اسے یاد آیا کہ میں تو جنبی ہوں، اب نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟ آیا تیمم کرے پھر نکلے یا فوراً مسجد سے باہر آ جائے؟ امام بخاری نے اپنا مسلک واضح کر دیا ہے کہ یاد آنے پر اسے فوراً مسجد سے نکل آنا چاہیے، اسے تیمم کے بقدر ٹھہرنے کی اجازت نہیں،

---

① فتح الباري:497/1. ② شرح ابن بطال:389/1.

البتہ مجبوری کے احکام اس سے مستثنیٰ ہوں گے، مثلاً: ✽ کوئی آدمی مسجد میں سو رہا ہے، اسے احتلام ہو گیا، ادھر رات بہت اندھیری ہے، باہر نہیں جا سکتا۔ ✽ مسجد کے باہر کوئی درندہ وغیرہ کھڑا ہے جس سے جان کو خطرہ ہے۔ ✽ باہر بہت تیز بارش ہو رہی ہے۔ ایسے حالات میں وہ مسجد میں بیٹھا رہے اور اللہ سے توبہ کرتا رہے۔ ② حدیث سے امام بخاری کے استدلال کی علامہ سندھی نے بایں الفاظ وضاحت کی ہے کہ احادیث کے بیان کرنے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقصد کوئی قصہ سرائی یا داستان گوئی نہ ہوتا تھا بلکہ وہ واقعات کو صرف مسائل شرعیہ بیان کرنے کے لیے سنایا کرتے تھے۔ اگر اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تیمم کیا ہوتا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کا ضرور تذکرہ کرتے، اس لیے یہ سکوت، محل بیان کا سکوت ہے جو بیان کا حکم رکھتا ہے۔ ایسے مواقع پر عدم الذکر عدم وجود کی دلیل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد سے نکلتے وقت تیمم نہیں کیا تھا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ اگر مسجد میں داخل ہونے کے بعد جنابت کا خیال آئے تو تیمم کا انتظار کیے بغیر فوراً مسجد سے نکل آنا چاہیے۔ مسجد کے تقدس کے پیش نظر مسجد کی دیوار سے بھی تیمم کرنے کی اجازت نہیں۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تائید میں دو متابعتیں پیش فرمائی ہیں: ✽ عبدالاعلیٰ بن عبدالاعلیٰ بصری نے بواسطۂ معمر زہری سے روایت کرنے میں عثمان بن عمر کی متابعت کی ہے جسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں موصولاً بیان کیا ہے۔ ✽ امام اوزاعی نے بھی حضرت ابن شہاب زہری سے اس روایت کو بیان کیا ہے جسے امام بخاری نے خود أبواب الإمامة کے اوائل میں باسند بیان کیا ہے۔[2]

(١٨) بَابُ نَفْضِ الْيَدَيْنِ مِنَ الْغُسْلِ عَنِ الْجَنَابَةِ

٢٧٦ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو حَمْزَةَ قَالَ: سَمِعْتُ الْأَعْمَشَ عَنْ سَالِمٍ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَتْ مَيْمُونَةُ: وَضَعْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ غُسْلًا فَسَتَرْتُهُ بِثَوْبٍ، وَصَبَّ عَلَى يَدَيْهِ فَغَسَلَهُمَا، ثُمَّ صَبَّ بِيَمِينِهِ عَلَى شِمَالِهِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ، فَضَرَبَ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَمَسَحَهَا، ثُمَّ غَسَلَهَا، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، وَغَسَلَ وَجْهَهُ وَذِرَاعَيْهِ، ثُمَّ صَبَّ عَلَى رَأْسِهِ وَأَفَاضَ عَلَى جَسَدِهِ، ثُمَّ تَنَحَّى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ، فَنَاوَلْتُهُ ثَوْبًا فَلَمْ يَأْخُذْهُ فَانْطَلَقَ

باب:18- غسل جنابت کے بعد ہاتھوں سے پانی جھاڑنا

[276] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کے لیے غسل کا پانی رکھا اور ایک کپڑے سے پردہ بھی کر دیا۔ پہلے آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر پانی ڈالا اور انھیں دھویا۔ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا اور اپنی شرمگاہ کو دھویا۔ پھر اپنے ہاتھ کو زمین پر خوب رگڑا اور اسے دھویا۔ اس کے بعد کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا، پھر چہرہ اور بازو دھوئے، پھر اپنے سر پر پانی بہایا اور سارے جسم کو دھویا۔ اس کے بعد ایک طرف ہٹ کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ بعد ازاں میں نے آپ کو ایک کپڑا دینا چاہا لیکن

---

1 حاشية السندي:1/60. 2 فتح الباري:1/497.

وَهُوَ يَنْفُضُ يَدَيْهِ. [راجع: ٢٤٩]

آپ نے اسے نہیں لیا اور آپ اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی جھاڑتے ہوئے چلے گئے۔

فوائد ومسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ غسل کرنے کے بعد جو پانی بدن پر رہ گیا وہ پاک ہے اگرچہ وہ اس پانی کا بقیہ ہے جس سے جنابت کو دور کیا گیا تھا۔ اگر اس میں کوئی مضائقہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے ہاتھوں سے نہ جھاڑتے کیونکہ ایسا کرنے سے چھینٹے اڑتے ہیں اور ان کے کپڑوں پر پڑنے کا بھی اندیشہ بدستور ہے، اس لیے مناسب یہ تھا کہ احتیاط کے ساتھ تولیے وغیرہ سے پانی کو خشک کرلیا جاتا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ پانی پاک ہے اور اس کے کپڑوں پر لگ جانے میں کوئی نقصان نہیں۔ ② بعض شراح نے لکھا ہے کہ اس عنوان سے امام بخاری ؒ ایک ضعیف حدیث کی تردید کرنا چاہتے ہیں ''وضو میں اپنے ہاتھوں کو مت جھاڑو کیونکہ یہ تو شیطان کے پنکھے ہیں'' اس حدیث کے متعلق امام ابن الصلاح نے لکھا ہے کہ مجھے اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ امام نووی ؒ نے بھی ایسا ہی کہا ہے جبکہ اس حدیث کو امام ابن حبان نے اپنی تالیف الضعفاء میں اور ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے بیان کیا ہے۔ یہ حدیث دو اعتبار سے ناقابل حجت ہے: * بخاری کی صحیح حدیث اس کے معارض ہے۔ * یہ سند کے لحاظ سے بھی قابل التفات نہیں۔[1] ③ علامہ عینی لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ نے یہ عنوان قائم کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ہاتھوں سے پانی کا جھاڑنا جائز ہے۔ اس سے عبادت کے اثرات زائل نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو تولیہ واپس کیا اس کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ غسل کے اثرات باقی رہیں بلکہ آپ نے کپڑا اس لیے استعمال نہیں فرمایا کہ یہ عیش پرست اور فضول خرچ لوگوں کی عادت ہے جس سے تکبر کی بھی بو آتی ہے۔[2] اگر غسل کے اثر کو باقی رکھنا مقصود ہوتا تو ہاتھوں سے پانی جھٹکنا بھی درست نہ ہوتا۔ ④ حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے بعض حضرات نے استدلال کیا ہے کہ غسل کے بعد بدن خشک کرنے کے لیے تولیے کا استعمال مکروہ ہے۔ یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہ تو ایک وقتی حالات کا تقاضا تھا جس میں دوسری باتوں کا بھی احتمال ہے، مثلاً: ممکن ہے کہ وہ کپڑا ناپاک ہو یا اور کوئی عذر اس کے لینے میں رکاوٹ بنا ہو، یا آپ جلدی میں ہوں، چنانچہ مہلب نے لکھا ہے: احتمال ہے کہ آپ نے تولیے کا استعمال اس لیے نہ فرمایا ہو کہ پانی کی برکت جسم پر باقی رہے یا تواضع اور انکساری کے پیش نظر اسے ترک فرمایا ہو یا اور کوئی بات اس کپڑے میں دیکھی ہو کہ وہ ریشم کا ہو یا میلا ہو۔ امام احمد اور محدث اسماعیلی کی یہ روایت بھی منقول ہے کہ حضرت نخعی سے امام اعمش نے تولیے وغیرہ سے بدن صاف کرنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اس لیے واپس کیا تھا کہ آپ اس کے عادی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ حضرت تیمی نے اپنی شرح میں لکھا ہے: اس حدیث میں دلیل ہے کہ آپ اسے استعمال کرتے تھے۔ اگر آپ کا عمل معروف نہ ہوتا تو حضرت میمونہ ؓ اسے کیوں پیش فرماتیں! ہاتھ سے پانی صاف کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تولیہ وغیرہ بھی استعمال ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں طریقوں سے پانی کا صاف کرنا مقصود ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعضائے وضو سے گرنے والا پانی پاک ہے جبکہ بعض غالی احناف اسے نجس کہتے ہیں۔[3]

---

① فتح الباري:471/1. ② عمدة القاري:55/3. ③ فتح الباري:472/1.

(۱۹) بَابُ مَنْ بَدَأَ بِشِقِّ رَأْسِهِ الْأَيْمَنِ فِي الْغُسْلِ

باب:19- سر کے دائیں حصے سے غسل جنابت کا آغاز کرنا

٢٧٧ - حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ نَافِعٍ عَنِ الْحَسَنِ بْنِ مُسْلِمٍ، عَنْ صَفِيَّةَ بِنْتِ شَيْبَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنَّا إِذَا أَصَابَ إِحْدَانَا جَنَابَةٌ أَخَذَتْ بِيَدَيْهَا ثَلَاثًا فَوْقَ رَأْسِهَا، ثُمَّ تَأْخُذُ بِيَدِهَا عَلٰى شِقِّهَا الْأَيْمَنِ، وَبِيَدِهَا الْأُخْرٰى عَلٰى شِقِّهَا الْأَيْسَرِ.

[277] حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم میں سے اگر کسی کو جنابت لاحق ہوتی تو وہ اپنے ہاتھوں میں پانی لے کر سر پر تین مرتبہ ڈالتی، پھر اپنے ہاتھ میں پانی لے کر اپنے دائیں حصے پر ڈالتی، اس کے بعد پانی لے کر بائیں حصے کا غسل کرتی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کسی مرفوع حدیث کا حوالہ نہیں دیا بلکہ حضرت عائشہ ؓ کے قول کا حوالہ دیا ہے۔ امام بخاری کے نزدیک قول صحابی مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ اس سے امام بخاری کے مسلک کا بھی پتہ چلتا ہے کہ صحابی کا یوں کہنا: [كُنَّا نَفْعَلُ] مرفوع حدیث کا درجہ رکھتا ہے، خواہ وہ صحابی اس فعل کو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی طرف منسوب کرے یا نہ کرے۔ امام حاکم کا بھی یہی موقف ہے، جبکہ دوسرے محدثین قول صحابی کو اس وقت حدیث مرفوع کا درجہ دیتے ہیں جب وہ اسے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی طرف منسوب کرے۔[1] ② اس عنوان کا مقصد یہ ہے کہ غسل میں بھی وضو کی طرح مسنون طریقہ دائیں جانب سے شروع کرنا ہے لیکن اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ عنوان میں تو سر کی دائیں جانب کا ذکر ہے جبکہ حدیث مذکور میں جسم کے دائیں حصے کو پہلے دھونے کا بیان ہے۔ اس کے جواب میں علامہ کرمانی لکھتے ہیں کہ جسم کے دائیں حصے سے مراد سر کے سمیت جسم کا دایاں حصہ مراد ہے، اس طرح حدیث کی عنوان سے مطابقت ہو جاتی ہے کیونکہ سر بھی جسم میں شامل ہے۔[2] حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے حدیث میں تین بار سر دھونے کے ذکر سے یہ تقسیم سمجھی ہے کہ پہلے سر ہی کے دائیں حصے کو تین بار پھر بائیں حصے کو تین بار دھویا جائے جیسا کہ پہلے ایک حدیث میں وضاحت آچکی ہے کہ آپ نے سر کی دائیں جانب پھر بائیں جانب سے غسل کا آغاز فرمایا۔[3] لیکن اس حدیث (رقم 258) میں یہ بات طے شدہ نہیں کہ اس سے مراد سر دھونا ہے یا خوشبو استعمال کرنا ہے۔ سر دھونے کی صورت میں ممکن ہے کہ اس کی دائیں جانب سے شروع کر کے جسم کے دائیں حصے کو بھی ساتھ ہی دھویا ہو، پھر سر کے بائیں حصے سے شروع کر کے جسم کے بائیں حصے کو بھی ساتھ شامل کر لیا ہو لیکن راوی نے اختصار کے پیش نظر جسم کا ذکر نہیں کیا بلکہ بدأ بشق رأسه الأيمن کے الفاظ روایت کر دیے ہیں۔ ③ اس حدیث میں مطلق طور پر دائیں جانب اور بائیں جانب کا ذکر ہے۔ اس میں سر کی قید نہیں لیکن امام بخاری نے عنوان میں سر

1 فتح الباري:499/1. 2 شرح الكرماني:140/2. 3 صحيح البخاري، الغسل، حديث:258، وفتح الباري:500/1.

کی قید لگا کر وضاحت کر دی کہ حدیث میں شق ایمن اور شق ایسر سے مراد سر کی دو جانب ہیں کیونکہ سر کے دھونے کا یہی طریقہ ہے کہ چلو میں پانی لیا جائے، اسے سر کی دائیں جانب ڈالا جائے، اسی طرح پھر بائیں جانب کو دھویا جائے۔ پورے جسم کو دھونے کے لیے پانی کو بہایا جاتا ہے یا پھر دونوں ہاتھوں کو بیک وقت استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک چلو پانی لے کر جسم پر ڈالنا عادت کے خلاف ہے۔

(٢٠) بَابُ مَنِ اغْتَسَلَ عُرْيَانًا وَحْدَهُ فِي خَلْوَةٍ، وَمَنْ تَسَتَّرَ فَالتَّسَتُّرُ أَفْضَلُ

باب:20- جس نے خلوت میں ننگے ہو کر غسل کیا اور جس نے کپڑا باندھ لیا، (دونوں جائز ہیں، مگر) کپڑا باندھ کر غسل کرنا افضل ہے

وَقَالَ بَهْزٌ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: «اَللهُ أَحَقُّ أَنْ يُسْتَحْيَا مِنْهُ مِنَ النَّاسِ».

بہز نے اپنے والد حکیم سے، انھوں نے بہز کے دادا معاویہ سے، انھوں نے نبی ﷺ سے بیان کیا: ''اللہ تعالیٰ لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔''

٢٧٨ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ هَمَّامِ بْنِ مُنَبِّهٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ يَغْتَسِلُونَ عُرَاةً يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ، وَكَانَ مُوسٰى يَغْتَسِلُ وَحْدَهُ، فَقَالُوا: وَاللهِ مَا يَمْنَعُ مُوسٰى أَنْ يَّغْتَسِلَ مَعَنَا إِلَّا أَنَّهُ آدَرُ، فَذَهَبَ مَرَّةً يَغْتَسِلُ فَوَضَعَ ثَوْبَهُ عَلٰى حَجَرٍ، فَفَرَّ الْحَجَرُ بِثَوْبِهِ، فَجَمَحَ مُوسٰى فِي أَثَرِهِ يَقُولُ: ثَوْبِي يَا حَجَرُ! ثَوْبِي يَا حَجَرُ! حَتّٰى نَظَرَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ إِلٰى مُوسٰى فَقَالُوا: وَاللهِ مَا بِمُوسٰى مِنْ بَأْسٍ، وَأَخَذَ ثَوْبَهُ فَطَفِقَ بِالْحَجَرِ ضَرْبًا». فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: وَاللهِ إِنَّهُ لَنَدَبٌ بِالْحَجَرِ سِتَّةٌ أَوْ سَبْعَةٌ ضَرْبًا بِالْحَجَرِ.

[انظر: ٣٤٠٤، ٤٧٩٩]

[278] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل ایک دوسرے کے سامنے برہنہ ہو کر غسل کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جبکہ موسیٰ تنہا نہاتے۔ بنی اسرائیل نے کہا: اللہ کی قسم! موسیٰ ہمارے ساتھ اس لیے غسل نہیں کرتے کہ وہ مرض فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے نہاتے وقت اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ دیے۔ ہوا یوں کہ وہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگ نکلا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے: اے پتھر! میرے کپڑے دے دے۔ اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ لیا اور کہنے لگے: واللہ! موسیٰ کو کوئی بیماری نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے لیے اور پتھر کو مارنے لگے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم!

موسیٰ علیہ السلام کی مار کے چھ یا سات نشان اس پتھر پر اب بھی موجود ہیں۔

٢٧٩ - وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «بَيْنَا أَيُّوبُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِّنْ ذَهَبٍ، فَجَعَلَ أَيُّوبُ يَحْتَثِي فِي ثَوْبِهِ، فَنَادَاهُ رَبُّهُ: يَا أَيُّوبُ! أَلَمْ أَكُنْ أَغْنَيْتُكَ عَمَّا تَرٰى؟ قَالَ: بَلٰى وَعِزَّتِكَ، وَلٰكِنْ لَّا غِنٰى بِي عَنْ بَرَكَتِكَ». وَرَوَاهُ إِبْرَاهِيمُ عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ صَفْوَانَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «بَيْنَا أَيُّوبُ يَغْتَسِلُ عُرْيَانًا». [انظر: ٣٣٩١، ٧٤٩٣]

[279] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام ننگے نہار ہے تھے کہ ان پر سونے کی ٹڈیاں گرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام انھیں اپنے کپڑے میں سمیٹنے لگے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انھیں آواز دی: اے ایوب! جو تم دیکھ رہے ہو، کیا میں نے تمھیں ان سے بے نیاز نہیں کیا؟ حضرت ایوب نے عرض کیا: مجھے تیری عزت کی قسم! کیوں نہیں، مگر میں تیرے کرم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔'' اس حدیث کو ابراہیم، موسیٰ بن عقبہ سے، وہ صفوان سے وہ عطاء بن یسار سے، وہ حضرت ابوہریرہ سے، وہ نبی ﷺ سے اس طرح بیان کرتے ہیں: ''ایک دفعہ ایوب علیہ السلام ننگے ہو کر غسل کر رہے تھے۔''

فوائد ومسائل: ① حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو ننگے نہاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی غسل کرے تو اسے چاہیے کہ چھپ کر نہائے۔''[1] اس حدیث کے پیش نظر محدث ابن ابی لیلیٰ کا موقف ہے کہ خلوت میں ننگے نہانا جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی تردید میں اس عنوان کو قائم کیا ہے کہ خلوت میں ننگے نہانا جائز ہے، البتہ ستر چھپا کر غسل کرنا بہتر ہے کیونکہ خلوت میں اگرچہ کسی انسان کی موجودگی نہیں جس سے شرم آئے مگر اللہ تعالیٰ سے تو شرم ہونی چاہیے۔ جب انسانوں سے حیا کے پیش نظر ننگا نہانا درست نہیں تو اللہ تعالیٰ سے تو بدرجۂ اولیٰ شرمانا چاہیے۔ اس کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت بہز بن حکیم کی روایت کا حوالہ دیا ہے، ان کے دادا حضرت معاویہ بن حیدہ نے رسول اللہ ﷺ سے خلوت میں ستر کھولنے کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس سے حیا کی جائے۔''[2] اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر تو خلوت میں بھی ننگے نہانے کا جواز نہیں تو امام بخاری نے ننگے نہانے کے موقف کو کیوں اپنایا ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے جواز کے لیے دو واقعات بیان فرمائے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ خلوت میں ننگے ہو کر نہائے تھے، اسی طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے بھی برہنہ غسل فرمایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سابقہ انبیاء علیہم السلام کے عمل کو نقل فرمایا اور اس پر کسی قسم کا انکار نہیں فرمایا۔ اگر ہماری شریعت میں کوئی مختلف حکم ہوتا تو آپ اس پر ضرور تنبیہ فرما دیتے، اس لیے یہ سکوت، محل بیان کا سکوت ہے جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ برہنہ غسل میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا

[1] سنن أبي داود، الحمام، حديث:4012. [2] جامع الترمذي، الأدب، حديث:2769.

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد انبیاء ﷺ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾ ''ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت یاب بنایا ہے، لہٰذا آپ ان کی اقتدا کریں۔'' [1] اس لیے ان جلیل القدر انبیاء کا عمل قابل اقتدا اور لائق اتباع ہے۔ [2] ② کھلی فضا یا ایسے وسیع مکان میں جہاں لوگوں کے آنے کا احتمال نہ ہو، برہنہ غسل کرنا معصیت نہیں بلکہ صرف جائز ہے۔ بعض انتہا پسند حضرات غسل خانے میں بھی تہ بند باندھ کر غسل کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بے جا تشدد ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں کیونکہ غسل خانہ خود ایک تستر (پردے) کی صورت ہے۔③ ابن بطال نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نافرمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے ننگے نہاتے تھے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے وادئ تیہ میں قیام کے دوران میں پیش آیا جہاں عمارتیں اور مکانات نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں ایک دوسرے کے سامنے ننگے ہو کر نہانا جائز تھا۔ اگر آپ کی نافرمانی کرتے ہوئے ایسا کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کو روکنا ضرور منقول ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا غسل اس لیے کرتے تھے کہ ان کے ہاں ایسا کرنا افضل تھا۔ [3] ④ موسیٰ علیہ السلام کے اس قصے سے معلوم ہوا کہ علاج یا عیب سے براءت کے پیش نظر دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز ہے، مثلاً: زوجین میں سے کوئی دوسرے کے متعلق فسخ نکاح کے لیے برص کا دعویٰ کرے تو اس کی تحقیق کے لیے دیکھنا درست ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء ﷺ اپنی خلقت و اخلاق کے لحاظ سے انتہائی کامل ہوتے ہیں اور جو کوئی ان کی طرف کسی نقص خلقی یا عیب خلقی منسوب کرے گا وہ انھیں ایذا دینے والوں میں سے ہوگا اور اس کے ارتکاب پر کفر کا اندیشہ ہے۔ [4] ⑤ ابن بطال نے لکھا ہے کہ واقعۂ ایوب سے عریاں ہو کر غسل کرنے کا جواز معلوم ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو سونے کی ٹڈیاں جمع کرنے پر ملامت کی مگر عریاں غسل کرنے پر کوئی عتاب نہیں فرمایا۔ [5]

(٢١) بَابُ التَّسَتُّرِ فِي الْغُسْلِ عِنْدَ النَّاسِ

باب:21- لوگوں کے سامنے نہاتے وقت پردہ کرنا

٢٨٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ أَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ، أَنَّ أَبَا مُرَّةَ مَوْلَى أُمِّ هَانِئٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أُمَّ هَانِئٍ بِنْتَ أَبِي طَالِبٍ تَقُولُ: ذَهَبْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُهُ يَغْتَسِلُ وَفَاطِمَةُ تَسْتُرُهُ، فَقَالَ: مَنْ هٰذِهِ؟ فَقُلْتُ: أَنَا أُمُّ هَانِئٍ.

[انظر: ٣٥٧، ٣١٧١، ٦١٥٨]

[280] حضرت ام ہانی بنت ابی طالب ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو میں نے دیکھا کہ آپ غسل کر رہے ہیں اور حضرت فاطمہ ؓ نے آپ کو پردہ کر رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کون (خاتون) ہیں؟'' میں نے خود عرض کیا: میں ام ہانی ہوں۔

٢٨١ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ

[281] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے

① الأنعام 6:90. ② فتح الباري:1/501. ③ فتح الباري:1/501. ④ فتح الباري:6/532. ⑤ شرح ابن بطال:1/393.

قَالَ: أَخْبَرَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ سَالِمِ ابْنِ أَبِي الْجَعْدِ، عَنْ كُرَيْبٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ: سَتَرْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ، فَغَسَلَ يَدَيْهِ، ثُمَّ صَبَّ بِيَمِينِهِ عَلٰى شِمَالِهِ فَغَسَلَ فَرْجَهُ وَمَا أَصَابَهُ، ثُمَّ مَسَحَ بِيَدِهِ عَلَى الْحَائِطِ أَوِ الْأَرْضِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ غَيْرَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ أَفَاضَ الْمَاءَ عَلٰى جَسَدِهِ، ثُمَّ تَنَحّٰى فَغَسَلَ قَدَمَيْهِ. تَابَعَهُ أَبُو عَوَانَةَ وَابْنُ فُضَيْلٍ فِي السَّتْرِ. [راجع: ٢٤٩]

فرمایا: میں نے نبی ﷺ کا پردہ کیا تھا جبکہ آپ غسل جنابت کر رہے تھے، چنانچہ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے۔ پھر آپ نے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا، پھر آپ نے اپنی شرمگاہ اور اس آلائش کو دھویا جو لگی ہوئی تھی۔ بعد ازاں آپ نے اپنا ہاتھ دیوار یا زمین پر رگڑا، پھر آپ نے نماز کے وضو جیسا وضو کیا البتہ پاؤں نہیں دھوئے، پھر آپ نے پورے جسم پر پانی بہایا۔ اس کے بعد وہاں سے ہٹ کر اپنے پاؤں دھوئے۔

ستر کے بیان میں ابوعوانہ اور ابن فضیل نے سفیان کی متابعت کی ہے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے پہلے باب میں تنہا اور الگ غسل کرنے کا حکم بتایا تھا، اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر دوسروں کی موجودگی میں غسل کی حاجت ہو تو تستر (پردہ کرنا) ضروری ہے۔ باپردہ ہونے کی قدرت کے باوجود برہنہ غسل کرنا حرام ہے۔ شاہ ولی اللہ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ دوسروں کی موجودگی میں غسل کرنا ہو تو آڑ اور پردہ کر کے غسل کرنا چاہیے۔ الغرض تستر تو فضا میں بھی مطلوب ہے اگرچہ کپڑے سے یا کم از کم کسی آڑ ہی سے ہو، ہاں اگر وہاں کسی کے گزرنے کا اندیشہ نہ ہو تو تستر کے بغیر غسل جائز ہے۔ اسی طرح غسل خانہ اور حمام میں بھی برہنہ غسل کرنا جائز ہے۔ امام بخاری ؒ نے اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لیے دو روایات پیش کی ہیں: حدیث میمونہ تو متعدد مرتبہ پہلے آچکی ہے۔ حدیث ام ہانی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن فتح سے فراغت کے بعد حضرت ام ہانی کے مکان پر تشریف لے گئے، ان کا مکان مکے سے باہر تھا، حضرت فاطمہ ؓ نے پردہ کیا اور آپ نے غسل فرمایا۔ دوران غسل میں حضرت ام ہانی وہاں پہنچیں تو آپ نے دریافت فرمایا: ''کون عورت ہے؟'' یہ معلوم تھا کہ کوئی مرد زنانے مکان میں نہیں آسکتا، اس لیے فرمایا کہ کون عورت ہے؟ اس روایت سے ثابت ہوا کہ لوگوں کی موجودگی میں غسل کے لیے پردہ کرنا ضروری ہے۔ ② علامہ عینی نے لکھا ہے کہ مذکورہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ غسل کے وقت لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہونا ضروری ہے، لہٰذا جس طرح ایک شخص اپنے قابل ستر جسم کو دوسروں کے سامنے بلاوجہ ظاہر نہیں کر سکتا اسی طرح دوسروں کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ قابل ستر جسم کو بلاضرورت دیکھیں۔ پھر اس امر پر بھی اجماع ہے کہ مرد اپنی بیوی کا اور بیوی اپنے شوہر کا قابل ستر جسم دیکھ سکتی ہے۔ علامہ نووی نے لکھا ہے کہ ایک شخص اپنی محرم عورتوں کی موجودگی میں غسل کر سکتا ہے بشرطیکہ درمیان میں پردہ حائل ہو۔[1] ③ لوگوں کے سامنے نہاتے وقت ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ صرف کپڑا باندھ کر نہانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے بھی پردہ کرے جیسا کہ حدیث میں اس بات کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ برہنہ تو غسل نہیں کر رہے تھے بلکہ کپڑا وغیرہ باندھ کر غسل فرما رہے ہوں گے،

1 عمدة القاري:3/65.

اس کے باوجود حضرت فاطمہ ؓ آڑ کیے ہوئے تھیں، وہ بقیہ بدن کے لیے تھی۔ اگرچہ اس کا تستر ضروری نہ تھا، تاہم اس آڑ کا بھی اہتمام کیا۔ وھو المقصود۔ ④ حدیث میمونہ ؓ میں ہے کہ وہ دوران غسل میں رسول اللہ ﷺ کو پردہ کیے ہوئے تھیں۔ امام اعمش سے یہ الفاظ بیان کرنے میں سفیان اکیلے نہیں۔ امام بخاری ؒ نے اس کے لیے متابعت بیان فرمائی ہے کہ ان الفاظ کو امام اعمش سے ابوعوانہ الوضاح البصری بھی بیان کرتے ہیں جسے خود امام بخاری نے حدیث رقم (266) میں نقل فرمایا ہے۔ اور محمد بن فضیل نے بھی یہ الفاظ امام اعمش سے بیان کیے ہیں جیسا کہ صحیح ابی عوانہ الاسفرائنی میں ہے۔[1] امام بخاری ؒ نے یہاں صرف دو متابعات کا حوالہ دیا ہے جن میں پردہ کرنے کا ذکر ہے، البتہ ایک تیسری متابعت بھی ہے جسے امام اعمش سے ابوحمزہ نے بیان کیا ہے، اس میں بھی پردہ کرنے کی صراحت ہے۔ اسے بھی امام بخاری نے ہی بیان کیا ہے۔[2]

(٢٢) بَابٌ : إِذَا احْتَلَمَتِ الْمَرْأَةُ

باب:22- جب عورت کو احتلام ہو جائے

٢٨٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّهَا قَالَتْ: جَاءَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ امْرَأَةُ أَبِي طَلْحَةَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ اللهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ، هَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا هِيَ احْتَلَمَتْ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «نَعَمْ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ». [راجع: ١٣٠]

[282] حضرت ام المؤمنین ام سلمہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ابوطلحہ کی بیوی حضرت ام سلیم ؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے حیا نہیں کرتا، جب عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل واجب ہوتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں، جب پانی دیکھے۔“

فوائد و مسائل: ① انصار کی عورتیں ایسے مسائل دریافت کرنے میں کسی قسم کی روایتی شرم سے کام نہ لیتی تھیں جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ام سلیم ؓ نے سب سے پہلے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اللہ کی صفت حیا بیان فرمائی کہ وہ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا، پھر شرم وحیا کے دائرے میں رہتے ہوئے وہ مسئلہ دریافت کیا جو بظاہر شرم سے متعلق تھا مگر ایک مسئلہ ہونے کی حیثیت سے دریافت طلب ضرور تھا۔ اگر آپ اس کے دریافت کرنے میں عورتوں جیسی شرم سے کام لیتیں تو نہ صرف ایک دینی حکم سے محروم رہتیں بلکہ دوسری تمام مسلمان عورتیں بھی اس سے ناواقف رہتیں۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کا اس امت پر بڑا احسان ہے کہ آپ نے ذاتی زندگی سے متعلق وہ باتیں کھول کر بیان کر دیں جنھیں عام طور پر روایتی شرم

[1] فتح الباري:1/503. [2] صحيح البخاري، الغسل، حديث:276.

وحیا کے پیش نظر بیان نہیں کیا جاتا۔ دوسری طرف صحابیات مُبَشّرات کا بھی اس امت پر بہت احسان ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے ایسے سوالات دریافت کیے جن کی ہر مسلمان عورت کو زندگی میں ضرورت پیش آ سکتی تھی، اور جو مسائل بسا اوقات اپنے خاوند سے بھی دریافت کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ ② لفظ استحیاء میں ایک انفعالی کیفیت ہے جسے حافظ ابن حجر نے تغیر وانکسار سے تعبیر کیا ہے۔ علماء کو اس مقام پر بڑا اشکال ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اسے کس معنی میں منسوب کیا جائے؟ ان حضرات کے بقول اس معنی کے لحاظ سے اللہ کی طرف نسبت کرنا صحیح نہیں، لہٰذا انھوں نے اس کی بایں الفاظ تاویل کر ڈالی کہ اللہ تعالیٰ حق کے معاملات میں شرم وحیا کا حکم نہیں دیتا۔ درست بات یہ ہے جن امور کی نسبت خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اقدس کی طرف کی ہے ان کی نسبت اللہ کی طرف کرنے میں ہم بھی تأمل نہیں کریں گے۔ البتہ ان کی کیفیت کا ہمیں علم نہیں، لہٰذا کیفیت کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں گے۔ اس مقام پر بھی تاویل کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صفت حیا کو اللہ کی طرف بایں طور منسوب کریں گے جو اس کی شایان شان ہے اور اس طرح کہ کسی طرح بھی مخلوق اس صفت میں اپنے خالق سے مشابہت نہیں رکھتی جیسا کہ دیگر صفات باری تعالیٰ کے متعلق اہل حق کا موقف ہے۔ یہی نجات کا راستہ اور حق بات ہے۔ ③ اس عنوان سے امام بخاری ؒ کا مقصود یہ ہے کہ مرد کی طرح عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے لیکن بحالت خواب اگر وہ جماع کی حالت دیکھے تو بیداری کے بعد اگر اپنے کپڑے پر تری دیکھے تو عورت پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ احتلام کے متعلق مرد وعورت میں مساوات کا حکم ہے کہ حالتِ نوم میں بصورت انزال دونوں پر غسل واجب ہو جاتا ہے اور بصورت عدم انزال دونوں پر غسل واجب نہیں ہوگا، چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''جو شخص بیدار ہو، تری دیکھے لیکن احتلام کا خواب یاد نہ ہو'' پھر انھوں نے حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے: رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ جو شخص تری دیکھے اور اسے احتلام کا خواب یاد نہ ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: ''وہ غسل کرے۔'' پھر ایسے شخص کے متعلق سوال ہوا جسے احتلام تو یاد ہو مگر تری نہ دیکھے؟ آپ نے فرمایا: ''اس پر غسل نہیں۔'' اس پر حضرت ام سلیم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر عورت ایسا دیکھے تو کیا اس پر بھی غسل ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں اس پر بھی غسل ہے کیونکہ عورتیں بھی تو مردوں کی طرح ہیں۔''[1] یہ احادیث مجرد وجود منی کو معتبر ٹھہراتی ہیں، خواہ اس کے ساتھ دفق وشہوت ہو یا نہ ہو۔ ④ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے ان حضرات کا موقف غلط ثابت ہوا جو کہتے ہیں کہ عورت کے پانی میں خروج و بروز ہوتا ہی نہیں اور اس کے انزال کو صرف اس کی شہوت ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک پانی دیکھنے سے مراد پانی کا معلوم ہو جانا ہے، یعنی رؤیت، علم کے معنی میں ہے۔ ان کا یہ خیال درست نہیں۔ کلام کو ظاہر پر محمول کرنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔[2] ایک روایت میں ہے کہ حضرت ام سلمہ ؓ نے تعجب کے طور پر سوال کیا: آیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کیوں نہیں؟ ایسا ہوتا ہے ورنہ بچے میں ماں کی شکل وصورت کیسے آتی ہے؟'' اس سے ثابت ہوا کہ مرد کی طرح عورت کا بھی مادہ منویہ ہوتا ہے اور بچہ دونوں کے نطفے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب عورت کے لیے منی کا وجود ثابت ہے تو اس کا انزال اور خروج بھی ممکن ہے اگرچہ بحالت خواب ایسا کم ہوتا ہے۔ ⑤ صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ مرد کا پانی گاڑھا سفید اور عورت کا پانی رقیق زرد ہوتا ہے اور دونوں میں سے جس کا پانی غالب

---

1. جامع الترمذي، الطهارة، حديث: 113. ② فتح الباري: 505/1.

آ جائے اس کی شکل و شباہت بچہ اختیار کرتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جس کا پانی رحم مادر میں پہلے پہنچ جائے، بچہ تذکیرو تانیث اسی کی اختیار کرتا ہے۔ اس بنا پر چار صورتیں ممکن ہیں: * رحم مادر میں مرد کا پانی پہلے پہنچتا ہے اور عورت کے پانی پر غالب آ جاتا ہے تو اس صورت میں بچہ نر ہوگا اور شکل و صورت بھی ددھیال کی اختیار کرے گا۔ * رحم مادر میں عورت کا پانی پہلے پہنچتا ہے اور عورت ہی کا پانی غالب آ تا ہے تو بچہ مادہ ہوگا اور ننھیال کی شکل و صورت اختیار کرے گا۔ * رحم مادر میں مرد کا پانی پہلے پہنچتا ہے لیکن غالب عورت کا پانی آ تا ہے تو اس صورت میں بچہ نر ہوگا لیکن شکل و صورت میں ننھیال جیسا ہوگا۔ * رحم مادر میں عورت کا پانی پہلے پہنچتا ہے لیکن غالب مرد کا پانی آ تا ہے تو اس صورت میں بچہ مادہ ہوگا لیکن شکل و صورت ددھیال جیسی اختیار کرے گا۔ واللہ أعلم.

(٢٣) بَابُ عَرَقِ الْجُنُبِ وَأَنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ

باب:23- جنبی کا پسینہ اور یہ کہ مسلمان نجس نہیں ہوتا

٢٨٣ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا بَكْرٌ عَنْ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَهُ فِي بَعْضِ طَرِيقِ الْمَدِينَةِ وَهُوَ جُنُبٌ، فَانْخَنَسْتُ مِنْهُ، فَذَهَبَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ: «أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟» قَالَ: كُنْتُ جُنُبًا فَكَرِهْتُ أَنْ أُجَالِسَكَ وَأَنَا عَلٰى غَيْرِ طَهَارَةٍ، فَقَالَ: «سُبْحَانَ اللهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ». [انظر: ٢٨٥]

[283] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ انھیں مدینے کے راستے میں ملے جبکہ وہ (ابو ہریرہ) اس وقت بحالت جنابت تھے، چنانچہ (وہ کہتے ہیں:) میں آپ کے پاس سے کھسک گیا اور دور جا کر غسل کیا۔ پھر حاضر خدمت ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو ہریرہ! تم کہاں تھے؟'' میں نے عرض کیا: میں جنبی تھا، لہٰذا مجھے یہ بات پسند نہ تھی کہ آپ کے پاس ناپاک حالت میں بیٹھوں۔ آپ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! مسلمان نجس نہیں ہوتا۔''

فوائد و مسائل: ① جنبی کا پسینہ پاک ہے یا جنابت کی وجہ سے وہ بھی ناپاک ہو گیا؟ امام بخاری ؒ نے اس کے متعلق کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں فرمایا لیکن اس کے ساتھ عنوان کا دوسرا حصہ بایں الفاظ بیان کیا کہ مسلمان کبھی ناپاک نہیں ہوتا، یہ بظاہر دو عنوان ہیں لیکن امام بخاری ؒ کا مقصد پہلے حصے کو ثابت کرنا ہے جبکہ حدیث میں دوسرے حصے کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پسینہ بدن ہی کا ایک حصہ ہے، اس کا وہی حکم ہے جو اصل بدن کا ہے۔ جب جنبی کا بدن پاک ہے تو اس سے برآمد ہونے والا پسینہ کیوں ناپاک ہو؟ شاہ ولی اللہ شرح تراجم میں فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مومن نجس نہیں ہوتا اور آپ نے جنبی سے ملاقات اور اس سے مصافحہ کرنے سے اجتناب نہیں کیا جبکہ غالب احوال میں انسان کے جسم پر کچھ نہ کچھ پسینہ باقی رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنبی کے پسینے کو ناپاک قرار نہیں دیا۔ ② امام ترمذی نے ایک

عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جنبی سے مصافحہ کرنے کے متعلق کیا وارد ہے؟'' اس کے تحت اسی حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بیان کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں آپ کے ساتھ چلتا رہا تا آنکہ آپ بیٹھ گئے۔ یہ روایت صحیح بخاری میں آگے آرہی ہے (حدیث: 285)۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام ترمذی کا استدلال درست ہے۔ جب جنبی سے مصافحہ کیا جاسکتا ہے تو اس کا پسینہ کیونکر ناپاک ہوسکتا ہے۔ ③ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے عنوان سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن نجس نہیں ہوتا اور وہ طاہر ہی رہتا ہے، خواہ وہ جنبی یا بے وضو ہی کیوں نہ ہو اور وہ دنیا کی زندگی میں اور مرنے کے بعد دونوں حالتوں میں پاک رہتا ہے۔ اسی طرح اس کا پس خوردہ، پسینہ، لعاب اور آنکھوں سے بہنے والے آنسو بھی پاک ہیں، پھر ان احکام ظاہری میں کافر کی بھی یہ سب چیزیں شرعاً پاک ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ تم اپنے مردوں کو نجس خیال نہ کرو کیونکہ مسلمان نجس نہیں ہوتا، نہ زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد۔ مستدرک حاکم میں اسے موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ ابن منذر نے کہا: اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ جنبی کا پسینہ پاک ہے اور یہی حضرت ابن عباس، ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔[1] ④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی: ''مومن نجس نہیں ہوتا'' کے مفہوم مخالف کے پیش نظر بعض اہل الظاہر (ابن حزم وغیرہ) نے کافر کو نجس العین قرار دیا ہے اور بطور تائید قرآن پاک کا یہ ارشاد پیش کیا جاتا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ﴾ ''مشرکین نجس ہیں۔'' جمہور اہل علم نے جواب دیا ہے کہ حدیث سے مراد یہ ہے: مومن نجاستوں سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے، اس لیے اس کے اعضاء طاہر ہوتے ہیں اور مشرک ان سے بچنے کا عادی نہیں ہوتا، اس لیے وہ نجس ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ کے متعلق فرمایا کہ اس میں اہل شرک کی عقیدے سے متعلق خرابی بتائی گئی ہے تاکہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ پھر جمہور کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ شریعت میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نکاح کے بعد ان سے اختلاط بھی ہوگا اور ان کے پسینے سے پرہیز کرنا بھی دشوار ہوگا اور غسل جنابت بھی جس طرح مسلمان عورت سے جماع کرنے کے بعد ہوتا ہے اسی طرح کافرہ کتابیہ سے جماع کے بعد ہوتا ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی زندہ آدمی نجس العین نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں۔[2] ⑤ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنابت مسلمان میں اس قسم کی نجاست پیدا نہیں کرتی کہ اس کی وجہ سے سلام وکلام، نشست و برخاست، اکل وشرب اور اس سے میل ملاقات ممنوع قرار دی جائے۔ جنابت ایک حکمی چیز ہے جس کی موجودگی میں اکثر علماء کے نزدیک وہ قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، اس کی تلاوت نہیں کرسکتا، مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا اور اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جنبی نماز نہیں پڑھ سکتا، یعنی اس نجاست حکمی کا تعلق خاص خاص معاملات سے ہے۔

(٢٤) بَابٌ: اَلْجُنُبُ يَخْرُجُ وَيَمْشِي فِي السُّوقِ وَغَيْرِهِ

باب: 24- جنبی کا گھر سے باہر نکلنا، بازار میں چلنا وغیرہ جائز ہے

وَقَالَ عَطَاءٌ: يَحْتَجِمُ الْجُنُبُ، وَيُقَلِّمُ

حضرت عطاء نے کہا: جنبی سینگی لگوا سکتا ہے، اپنے ناخن

1 عمدة القاري: 3/73. 2 فتح الباري: 1/506.

أَظْفَارَهُ، وَيَحْلِقُ رَأْسَهُ وَإِنْ لَّمْ يَتَوَضَّأْ.

کاٹ سکتا ہے اور اپنا سر بھی منڈوا سکتا ہے، خواہ اس نے وضو نہ کیا ہو۔

وضاحت: جنابت کے فوراً بعد غسل کرنا واجب نہیں بلکہ نماز کا وقت آنے سے پہلے پہلے جنبی کو ہر کام کرنے کی اجازت ہے، خواہ اس کام میں چلنے پھرنے کی نوبت آئے یا ایک جگہ بیٹھ کر انجام دیا جا سکے، یعنی اسے کھانے پینے اور سونے، لیٹنے کی اجازت ہے۔ اسی مناسبت سے امام بخاری ؒ نے حضرت عطاء کا قول نقل کیا ہے جسے مصنف عبدالرزاق (282/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے، البتہ نماز کا وقت آنے پر اسے فوراً غسل کرنا ہوگا تاکہ اس کی بروقت ادائیگی ہو۔

٢٨٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْأَعْلَى بْنُ حَمَّادٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدٌ عَنْ قَتَادَةَ: أَنَّ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ حَدَّثَهُمْ: أَنَّ نَبِيَّ اللهِ ﷺ كَانَ يَطُوفُ عَلَى نِسَائِهِ فِي اللَّيْلَةِ الْوَاحِدَةِ وَلَهُ يَوْمَئِذٍ تِسْعُ نِسْوَةٍ. [راجع: ٢٦٨]

[284] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ بعض اوقات ایک رات میں اپنی تمام ازواج مطہرات کے پاس ہو آتے تھے اور اس وقت ان کی تعداد نو تھی۔

٢٨٥ - حَدَّثَنَا عَيَّاشٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْأَعْلَى قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ عَنْ بَكْرٍ، عَنْ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: لَقِيَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا جُنُبٌ، فَأَخَذَ بِيَدِي، فَمَشَيْتُ مَعَهُ حَتَّى قَعَدَ، فَانْسَلَلْتُ فَأَتَيْتُ الرَّحْلَ فَاغْتَسَلْتُ، ثُمَّ جِئْتُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَقَالَ: «أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟» فَقُلْتُ لَهُ، فَقَالَ: «سُبْحَانَ اللهِ! يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ». [راجع: ٢٨٣]

[285] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے میری ملاقات بحالت جنابت ہوئی۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں آپ کے ساتھ چلنے لگا، یہاں تک کہ آپ بیٹھ گئے تو میں چپکے سے اٹھا اور اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ وہاں میں نے غسل کیا، پھر حاضر خدمت ہوا، آپ وہیں تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! تم کہاں تھے؟'' میں نے آپ سے عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا: ''ابو ہریرہ! سبحان اللہ! بلاشبہ مومن ناپاک نہیں ہوتا۔''

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک جنبی آدمی غسل کیے بغیر ہر کام میں مصروف ہو سکتا ہے۔ حضرت عطاء کے قول کو بطور استدلال پیش کیا ہے لیکن کچھ حضرات نے اس سلسلے میں حضرت عطاء کی مخالفت کی ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے حسن بصری کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ سب کاموں سے پہلے وضو کرنے کو مستحب قرار دیتے تھے۔ حدیث انس سے حضرت عطاء کے موقف کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس میں وضو کرنے کا ذکر نہیں ہے۔[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری وغیرہ وضو یا غسل سے پہلے بحالت جنابت دوسرے کاموں میں مصروف ہونے کو پسند نہ کرتے تھے جبکہ حدیث انس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت سے قبل جنبی آدمی کو چلنے پھرنے کی ممانعت نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ایک بیوی کے

① فتح الباري:508/1.

پاس سے دوسری بیوی کے پاس بحالت جنابت تشریف لے گئے، پھر ازواج مطہرات کے گھر مسجد کے چاروں طرف واقع تھے۔ جب ایک حجرے سے دوسرے حجرے تک جانے کی اجازت ہے تو محلے میں بھی چلنے پھرنے کی اجازت ہوگی، پھر محلے میں چلنا اور بازار میں جانا دونوں برابر ہیں۔ جب آمد و رفت کا جواز ہے تو کھانے پینے میں کیا مضائقہ ہوسکتا ہے۔ اسی سے عنوان ثابت ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں تو یہ بات اور واضح ہوگئی کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے مدینے کے کسی راستے میں ملے جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس وقت حالت جنابت میں تھے۔ اس سے جنابت کی حالت میں بازار کی آمد و رفت ثابت ہوئی۔ ② علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عام فقہاء کا یہی موقف ہے کہ جنبی آدمی بازار میں جا سکتا ہے اور آمد و رفت رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تاہم مصنف ابن ابی شیبہ (1/ 112، 113) میں ہے کہ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت عمر، حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہم پھر حضرت سعید بن مسیّب، مجاہد، ابن سیرین، زہری، محمد بن علی اور امام نخعی رحمہم اللہ جنابت کے بعد وضو سے پہلے نہ کچھ کھاتے اور نہ گھر ہی سے باہر نکلتے۔ اسی طرح امام بیہقی نے کتاب الطہارت میں حضرت سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن عمرو، حضرت عطاء اور حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرات بھی وضو کے بغیر مشاغل میں مصروف ہونے کو ناپسند کرتے تھے۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عطاء کا قول بیان جواز کے لیے پیش کیا ہے اگرچہ بہتر یہ ہے کہ جنابت کے بعد وضو کرلیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے بھی نقل وحرکت کے علاوہ اور کوئی فعل بحالت جنابت ثابت نہیں۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں "جسے رات کو جنابت لاحق ہو، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ وضو کرو اور شرم گاہ کو دھولو پھر سو جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ جنابت چونکہ فرشتوں کی صفات وطبائع کے منافی ہے اور وہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اس لیے مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ وہ بحالت جنابت یوں ہی آزادی و بے پروائی سے اپنی ضروریات، سونے، کھانے پینے میں مصروف نہ ہو۔ اگر طہارت کبریٰ (غسل) نہ کر سکے تو کم از کم طہارت صغریٰ (وضو) ہی کر لے کیونکہ فی الجملہ طہارت کا حصول دونوں سے ہو جاتا ہے اگرچہ شارع نے دونوں کو، جدا جدا احداث پر تقسیم کر دیا ہے۔"[2] اس بنا پر بہتر ہے کہ جنبی آدمی کم از کم وضو کر لے اگرچہ جواز کی حد تک وضو کے بغیر رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ واللہ أعلم.

(٢٥) بَابُ كَيْنُونَةِ الْجُنُبِ فِي الْبَيْتِ إِذَا تَوَضَّأَ

باب:25- غسل سے پہلے جنبی کا گھر میں ٹھہرنا جبکہ وہ وضو کرلے

٢٨٦ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ وَشَيْبَانُ عَنْ يَحْيَى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ قَالَ:

[286] حضرت ابوسلمہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: آیا نبی

1 عمدة القاري: 74/3. 2 حجة الله البالغة: 1/557-558.

سَأَلْتُ عَائِشَةَ: أَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَرْقُدُ وَهُوَ جُنُبٌ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، وَيَتَوَضَّأُ. [انظر: ٢٨٨]

ﷺ بحالت جنابت گھر میں سو جاتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ہاں، لیکن وضو کر لیتے تھے۔

فائدہ: صحیح مسلم کی روایت میں مزید وضاحت ہے، حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب بحالت جنابت سونے کا ارادہ فرماتے تو وضو کر لیتے جیسا کہ نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے، بلکہ خود امام بخاری ؒ نے اگلی روایت (288) میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی شرمگاہ کو دھو لیتے اور نماز کے وضو جیسا وضو کر کے سو جاتے۔ دراصل امام بخاری حضرت علی ؓ سے مروی ایک حدیث کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا، تصویر اور جنبی موجود ہو۔''[1] بعض حضرات کا خیال ہے کہ امام بخاری نے اس عنوان سے مذکورہ روایت ابی داود کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ روایت دوسری صحیح روایات کے مقابلے میں قابل عمل نہیں لیکن حافظ ابن حجر ؒ اس موقف سے مطمئن نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی سے مروی روایت اس شخص کے بارے میں ہے جو غسل جنابت کے معاملے میں بے پروائی کا عادی ہو۔ ایسے شخص کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ اس کے گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہ ہوں لیکن جو شخص عادی نہیں، وہ غسل جنابت کا پورا اہتمام کرتا ہے لیکن بعض اوقات کسی عذر کی وجہ سے غسل میں تاخیر ہو جاتی ہے تو جب تک نماز کا وقت نہ ہو جائے اس وقت تک جنبی رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے ایک توجیہ یہ بھی لکھی ہے کہ حدیث علی سے مراد وہ جنبی ہے جو وضو بھی نہیں کرتا ہے، اس لیے اگر غسل کا موقع نہ ہو تو اتنے وقت کے لیے یہ تخفیفی طہارت کر لی جائے تا کہ فرشتوں کی آمد و رفت بھی ہو سکے اور طبیعت بھی ہلکی رہے۔ اس طرح ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں رہتا۔[2] ہمارے نزدیک بھی تطبیق کی یہی صورت بہتر ہے کہ جنبی بے وضو ہو تو رحمت کا فرشتہ گھر میں نہیں آئے گا۔ اگر وضو کر لے تو کم از کم فرشتے کی آمد و رفت کے لیے راہ کھل جاتی ہے اور اتباع سنت کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔

(٢٦) [بَابُ نَوْمِ الْجُنُبِ]

باب:26- جنبی کا سونا

وضاحت: صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں یہاں کوئی عنوان نہیں بلکہ حدیث الباب کو سابق باب کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطابقت بایں طور ہے کہ جب بحالت جنابت سونے کا جواز معلوم ہو گیا تو اس حالت میں استقرار بیت کا ثبوت خود بخود ہو گیا جو سابق عنوان کا مقصد ہے۔ مستقل عنوان کی صورت میں حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے: بظاہر یہ عنوان زائد ہے کیونکہ آگے اس سے ملتا جلتا ایک عنوان آ رہا ہے، تاہم یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہ عنوان مطلق اور آئندہ قید وضو کے ساتھ مقید ہے۔[3]

٢٨٧ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سَأَلَ

[287] حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے، حضرت عمر بن خطاب نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا ہم میں سے

---

(1) سنن أبي داود، الطهارة، حديث:227. (2) فتح الباري:1/508. (3) فتح الباري:1/509.

رَسُولَ اللهِ ﷺ: أَيَرْقُدُ أَحَدُنَا وَهُوَ جُنُبٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَلْيَرْقُدْ وَهُوَ جُنُبٌ». [انظر: ٢٨٩، ٢٩٠]

کوئی جنابت کی حالت میں سو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، وضو کر کے بحالت جنابت سو سکتا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① سنن نسائی میں اس حدیث کا سبب ورود بایں الفاظ بیان ہوا ہے: حضرت ابن عمر ؓ کو جنابت لاحق ہوئی تو وہ اپنے والد محترم حضرت عمر ؓ کے پاس آئے اور ان سے سونے کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے یہی سوال رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وضو کر لے اور سو جائے۔'' اس بنا پر یہ واقعہ حضرت ابن عمر سے متعلق ہوگا اور جواب میں صیغۂ خطاب اس لیے استعمال فرمایا کہ حضرت ابن عمر ؓ مجلس سوال میں موجود تھے اور مسئلہ بھی ان سے متعلق تھا تو رسول اللہ ﷺ نے براہ راست ان سے خطاب فرمایا کہ وضو کر لو، شرم گاہ دھولو، پھر سو جاؤ جیسا کہ آئندہ حدیث نمبر (290) میں اس کی وضاحت ہے۔[1] ② پہلا عنوان عام تھا کیونکہ وہاں کینونہ کا لفظ ''ہونا'' کے معنی میں استعمال ہوا تھا، چاہے انسان مکان میں بیداری کی حالت میں ہو یا نیند کی حالت میں۔ اب یہ دوسرا عنوان خاص ہے، یعنی جنبی سو سکتا ہے۔ روایات میں سوال ہی کے اندر وضو کی قید موجود ہے، یعنی کیا ایسی صورت میں جنبی آدمی وضو کر کے سو سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے سوال کی رعایت کرتے ہوئے اس قید کو جواب میں دہرا دیا۔ ایسی قید میں مفہوم مخالف کی رعایت نہیں ہوتی۔ یہ مطلب نہیں کہ وضو کے بغیر سونا ناجائز ہے۔ بعض روایات میں نیند کو موت کی بہن کہا گیا ہے۔[2] ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ مجھے موت اچھی حالت میں آئے، اسی طرح انسان کا جذبہ ہونا چاہیے کہ نیند بھی اچھی حالت میں (باوضو) آئے۔ وضو کرنا ضروری نہیں، افضل ہے اگرچہ بعض ظاہری حضرات اسے واجب قرار دیتے ہیں۔

(٢٧) بَابُ الْجُنُبِ يَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَنَامُ

باب:27- جنبی وضو کرے، پھر سوئے

وضاحت: سابق عنوان مطلق تھا، اب اس عنوان کو مقید لائے ہیں۔ وہاں مقصد جنبی کے لیے سو جانے کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس عنوان میں جنبی کے لیے وضو کرنے کو مقصد میں شامل کیا گیا ہے۔

٢٨٨ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ أَبِي جَعْفَرٍ، عَنْ مُحَمَّدِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَنَامَ وَهُوَ جُنُبٌ غَسَلَ فَرْجَهُ وَتَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ. [راجع: ٢٨٦]

[288] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب بحالت جنابت سونا چاہتے تو پہلے اپنی شرمگاہ کو دھوتے، پھر وضو کرتے جو نماز کے لیے کیا جاتا ہے۔

1. فتح الباري: 510/1. 2. المعجم الأوسط للطبراني، حديث: 923، و السلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 1087.

٢٨٩ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا جُوَيْرِيَةُ عَنْ نَافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: اسْتَفْتَى عُمَرُ النَّبِيَّ ﷺ: أَيَنَامُ أَحَدُنَا وَهُوَ جُنُبٌ؟ قَالَ: «نَعَمْ، إِذَا تَوَضَّأَ». [راجع:٢٨٧]

[289] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا: آیا ہم میں سے کوئی حالت جنابت میں سوسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں، جب وضو کرلے۔''

٢٩٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ قَالَ: ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ بِأَنَّهُ تُصِيبُهُ الْجَنَابَةُ مِنَ اللَّيْلِ؟ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ ثُمَّ نَمْ». [راجع: ٢٨٧]

[290] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا کہ اسے (ابن عمر رضی اللہ عنہما کو) رات کے کسی حصے میں جنابت لاحق ہو جاتی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''وضو کرلو اور اپنا عضو دھولو، پھر سو جاؤ۔''

فوائد ومسائل: ① تَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ سے مراد یہ ہے کہ نماز والا وضو کرتے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ ادائے نماز کے لیے وضو کرتے تھے، نیز اس وضو سے مراد لغوی وضو نہیں بلکہ شرعی وضو ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: جمہور علماء کے نزدیک یہ وضو، وضوئے شرعی ہے اور اس وضو کی حکمت یہ ہے کہ اس سے حدث میں کمی آجاتی ہے، خصوصاً جواز تفریق غسل کے قول پر، یعنی ان حضرات کے قول پر جو غسل میں موالات ضروری خیال نہیں کرتے، لہٰذا اگر نیتِ غسل کرلے گا تو اعضائے وضو سے تو رفع حدث ہو ہی جائے گا۔ اس کی تائید ابن ابی شیبہ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے رجال ثقہ ہیں کہ اگر کسی کو رات میں جنابت لاحق ہو اور وہ سونا چاہے تو وضو کرلے کیونکہ وضو کرنا نصف غسل جنابت ہے۔[1] بعض نے یہ حکمت لکھی ہے کہ دو طہارتوں میں سے ایک طہارت کا حصول ہے اور اس بنا پر تیمّم بھی وضو کے قائم مقام ہوسکتا ہے۔ بیہقی میں باسناد حسن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بحالت جنابت جب سونے کا ارادہ فرماتے تو وضو یا تیمّم کر لیتے تھے۔[2] اگرچہ یہاں اس بات کا احتمال بھی ہے کہ آپ کا یہ تیمّم پانی ملنے میں دشواری کی بنا پر ہو۔ بعض حضرات نے اس وضو کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ اس سے دوبارہ جماع کرنے یا غسل کرنے کے لیے نشاط پیدا ہو جاتا ہے۔ حافظ ابن دقیق العید نے امام شافعی رحمہ اللہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ تخفیف حدث والا یہ وضو حائضہ کے لیے نہیں ہے کیونکہ وہ تو غسل بھی کرلے تو بھی اس کا حدث رفع نہیں ہوتا۔ البتہ خون حیض کے منقطع ہونے پر وضو کا استحباب ہوگا کہ اگر وہ انقطاع خون کے بعد سونا چاہے تو وضو کرکے سو جائے، جس طرح جنبی کے لیے حکم ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غسل جنابت فوراً کرنا ضروری نہیں، البتہ نماز کا وقت آنے پر غسل کے حکم میں شدت آجاتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ نیند کے وقت تنظیف (صفائی ستھرائی) مطلوب ہے۔ امام ابن جوزی نے اس کی حکمت بایں الفاظ بیان کی ہے کہ فرشتے میل کچیل، گندگی اور بدبو سے نفرت کرتے ہیں اور شیاطین ان چیزوں کے قریب ہوتے ہیں۔ اس

---

① المصنف لابن أبي شيبة:113/1. ② السنن الكبرٰى للبيهقي:200/1.

لیے کم از کم وضو کا حکم ہے تاکہ فرشتوں کا قرب اور شیاطین سے دوری حاصل ہو۔[1] ② جنبی جنابت کی حالت میں مختلف افعال بجا لاتا ہے، ان کے اختلاف کی وجہ سے اس پر مختلف احکام مرتب ہوتے ہیں، مثلاً: بحالت جنابت چلنا پھرنا یا مبادی غسل کے طور پر کوئی کام کرنا، اس قسم کے افعال وضو کے بغیر کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی ان میں کوئی کراہت ہی کا پہلو ہے۔ ان کے بعد کھانے پینے اور سونے کا درجہ ہے، ان کے لیے جمہور نے طہارت صغریٰ کو مستحب قرار دیا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ جماع کرنے کا مرتبہ ہے، اس کے لیے حدیث میں وضو کا حکم ہے اور اس کے متعلق امر کا صیغہ آیا ہے جو کہ یہاں وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب وارشاد کے لیے ہے کیونکہ اس کا قرینہ حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی حکمت بایں الفاظ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح وضو کرنا دوبارہ جماع کے لیے زیادہ نشاط پیدا کرتا ہے۔ امام ابن خزیمہ نے انھی الفاظ سے جمہور کے مسلک کے مطابق استحباب ہی پر استدلال کیا ہے۔ ③ بہر حال بحالت جنابت نیند سے پہلے وضو کرنا ضروری نہیں بلکہ مستحب اور افضل ہے۔ اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے غسل جنابت سے قبل سونے کے سوال پر فرمایا کہ ہاں سو سکتا ہے مگر وضو کرے اگر چاہے۔[2] إِنْ شَاءَ کے الفاظ سے وجوب نہیں بلکہ استحباب ثابت ہوتا ہے۔

(٢٨) بَابٌ: إِذَا الْتَقَى الْخِتَانَانِ

باب:28- جب (میاں بیوی) دونوں (کے) ختان ایک دوسرے سے مل جائیں

وضاحت: اِلْتِقَاءِ خِتَانَیْن سے مراد دخول، یعنی غیوبت حشفہ ہے۔ محض التقا سے تو کسی کے نزدیک غسل واجب نہیں ہوتا۔

٢٩١ - حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ؛ ح: وَحَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ قَتَادَةَ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا جَلَسَ بَيْنَ شُعَبِهَا الْأَرْبَعِ ثُمَّ جَهَدَهَا فَقَدْ وَجَبَ الْغُسْلُ».
تَابَعَهُ عَمْرٌو عَنْ شُعْبَةَ، مِثْلَهُ. وَقَالَ مُوسَى: حَدَّثَنَا أَبَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا الْحَسَنُ، مِثْلَهُ.

[291] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جب مرد، عورت کے چاروں اعضاء کے درمیان بیٹھ جائے، پھر کوشش شروع کر دے تو غسل واجب ہو جائے گا۔'' اس حدیث کی متابعت عمرو بن مرزوق نے بواسطۂ شعبہ (عن قتادہ) کی ہے۔ اور موسیٰ نے کہا: ہم سے ابان نے حدیث بیان کی، انھوں نے قتادہ سے بیان کی، قتادہ نے حضرت حسن سے یہی روایت بیان کی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ کے بیان کردہ عنوان بڑے خاموش اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ ان سے امام بخاری ؒ کی مراد کو سمجھنا آسان نہیں۔ انھوں نے مذکورہ بالا عنوان میں کوئی حکم بیان نہیں کیا۔ اس کی تعیین پیش کردہ حدیث پر غور وفکر کرنے کے

1 فتح الباري:512/1. 2 صحيح ابن خزيمة:106/1، حديث:211.

بعد ہوگی، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب مرد اپنی عورت کے دونوں ہاتھوں اور ٹانگوں کے درمیان بیٹھ کر عمل شروع کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں انزال کا ذکر نہیں بلکہ کوشش کرنے کا ہے۔ گویا محض بیٹھنے سے بھی غسل واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کا انحصار جہد (کوشش) پر ہے جو دخول سے کنایہ ہے۔ دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے، خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ اس وضاحت سے امام بخاری ؒ کے عنوان کی تعیین ہو جاتی ہے کیونکہ مرد کے ختان کا عورت کے ختان سے التقاء، غیبوبت حشفہ کے بغیر ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ ختان اس مقام کا نام ہے جہاں کٹاؤ ہوتا ہے اور عورت کے ختان کا مقام ذرا نیچے ہوتا ہے۔ عورت کے ختان کو خفاض کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں، عرب میں عورتوں کا ختنہ کیا جاتا ہے اور شادی سے پہلے کم از کم دو تین مرتبہ ختنہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس مقام پر محض کپڑے کی رگڑ سے شہوانی جذبات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ افریقہ کے بعض دور افتادہ اور پسماندہ علاقوں میں ختنہ کے بجائے اس مقام پر ٹانکے لگا دیے جاتے ہیں تاکہ شادی ہونے تک عورت کی عزت وناموس محفوظ رہے۔ اسے ''عفت اجباری'' کا نام دیا جاتا ہے۔ شادی کے وقت ٹانکے کھول کر عورت کو خاوند کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ اس مسئلے کی مزید وضاحت فرماتی ہیں: ان کی بیان کردہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب مرد کا ختنہ، عورت کے ختنے کے مقام میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔[1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ میں نے اور رسول اللہ ﷺ نے وظیفۂ زوجیت ادا کیا، پھر ہم دونوں نے غسل کیا۔[2] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کہتے ہیں کہ غسل جنابت میں مہاجرین اور انصار کے درمیان اختلاف ہوا تو میں حضرت عائشہ ؓ کے پاس گیا اور عرض کیا: اماں جان! میں ایک مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے حیا آتی ہے۔ انھوں نے فرمایا: پوچھو! میں تیری حقیقی ماں کی طرح ہوں۔ میں نے دریافت کیا کہ غسل کب واجب ہوتا ہے؟ حضرت عائشہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کا فرمان سنا دیا کہ جب خاوند اپنی بیوی کے چاروں اعضاء کے درمیان بیٹھ جائے اور مرد کا ختنہ عورت کے ختنے سے لگ جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔[3] رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایک آدمی اپنی بیوی سے ہمبستر ہوتا ہے لیکن اسے انزال نہیں ہوتا، کیا ایسی حالت میں بیوی خاوند کو غسل کرنا ہوگا؟ حضرت عائشہ ؓ بھی آپ کے پاس بیٹھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اور یہ دونوں ایسا کرتے ہیں پھر غسل بھی کرتے ہیں۔''[4] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ غسل جنابت کے لیے انزال شرط نہیں بلکہ دخول ہی کافی ہے۔ اولاً یہی امام بخاری ؒ کا موقف ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہم آئندہ باب میں کریں گے۔ ② امام بخاری ؒ کی عادت ہے کہ وہ بعض اوقات کسی حدیث کے الفاظ کو عنوان میں رکھ دیتے ہیں۔ چونکہ وہ ان کی شرط کے مطابق نہیں ہوتی، اس لیے اس کی طرف اس انداز سے اشارہ کر دیتے ہیں۔ مذکورہ عنوان کے الفاظ امام بیہقی نے بیان کیے ہیں کہ جب خاوند بیوی کے ختنے آپس میں مل جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ امام شافعی ؒ نے بھی حضرت عائشہ ؓ سے ان الفاظ کو بیان کیا ہے لیکن ان کی بیان کردہ روایت میں ایک راوی علی بن زید ضعیف ہے، البتہ ابن ماجہ میں بیان شدہ حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔[5] ③ عمرو بن مرزوق نے شعبہ سے بیان کرنے میں ہشام کی متابعت کی ہے جسے فوائد عثمان بن احمد السماک میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔

---

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث:216. 2 جامع الترمذي، الطهارة، حديث:108. 3 صحيح مسلم، الحيض، حديث: 785(349). ④ صحيح مسلم، الحيض، حديث: 786(350). 5 فتح الباري:513/1.

پھر موسیٰ کی تعلیق کو اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ قتادہ گو ثقہ راوی ہیں مگر ان پر تدلیس کا الزام ہے اور مذکورہ روایت کو انھوں نے ''عن'' سے بیان کیا ہے اور مدلس راوی کا کسی روایت کو عن سے بیان کرنا قابل اعتبار نہیں ہوتا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ کو اس متابعت میں تحدیث کی تصریح نقل کرنی پڑی۔[1]

(٢٩) بَابُ غَسْلِ مَا يُصِيبُ مِنْ رُطُوبَةِ فَرْجِ الْمَرْأَةِ

باب:29- عورت کی شرمگاہ سے جو رطوبت لگ جائے، اس کا دھونا

وضاحت: عورت کی اندام نہانی سے بہنے والی رطوبت دو طرح کی ہوتی ہے: * رطوبت داخل فرج: اس سے مراد وہ رطوبت ہے جو عورت سے جماع کے وقت حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رطوبت بالاتفاق ناپاک ہے۔ اگر کپڑے کو لگ جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے جسے دھونا ضروری ہے۔ * رطوبت خارج فرج: اس سے مراد وہ رطوبت ہے جو ہمہ وقت محل میں رہتی ہے، گویا وہ اس حصۂ جسم کا پسینہ ہے۔ چونکہ یہ پیشاب کا مقام ہے، اس لیے محل کے نجس ہونے سے یہ بھی نجس ہے، البتہ احناف کے ہاں یہ رطوبت ناپاک نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں قسم کی رطوبت کو دھونے کے متعلق فرمایا ہے۔

٢٩٢ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ: قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنِ الْحُسَيْنِ، قَالَ يَحْيَى: وَأَخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ الْجُهَنِيَّ، أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَأَلَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ إِذَا جَامَعَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ فَلَمْ يُمْنِ؟ قَالَ عُثْمَانُ: يَتَوَضَّأُ كَمَا يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ، وَيَغْسِلُ ذَكَرَهُ، قَالَ عُثْمَانُ: سَمِعْتُهُ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ فَسَأَلْتُ عَنْ ذٰلِكَ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، وَالزُّبَيْرَ بْنَ الْعَوَّامِ، وَطَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللهِ، وَأُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ، فَأَمَرُوهُ بِذٰلِكَ. قَالَ يَحْيَى: وَأَخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ أَنَّ عُرْوَةَ بْنَ الزُّبَيْرِ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا أَيُّوبَ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ ذٰلِكَ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ. [راجع: ١٧٩]

[292] حضرت زید بن خالد جہنی سے روایت ہے، انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ہمبستری کرے مگر انزال نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ وضو کرے جیسا کہ نماز کے لیے وضو کرتا ہے اور اپنے عضو مخصوص کو دھولے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا ہی سنا ہے۔ حضرت زید کہتے ہیں: میں نے پھر اس کے متعلق حضرت علی بن ابی طالب، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی یہی فیصلہ دیا۔ یحییٰ بن ابی کثیر نے کہا: مجھے ابوسلمہ نے خبر دی، انھیں عروہ بن زبیر نے بتایا، انھیں ابوایوب انصاری نے خبر دی، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

---

1 فتح الباري:513/1.

٢٩٣ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُو أَيُّوبَ قَالَ: أَخْبَرَنِي أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ أَنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِذَا جَامَعَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ فَلَمْ يُنْزِلْ؟ قَالَ: «يَغْسِلُ مَا مَسَّ الْمَرْأَةَ مِنْهُ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وَيُصَلِّي». قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: اَلْغُسْلُ أَحْوَطُ، وَذَاكَ الْأَخِيرُ، إِنَّمَا بَيَّنَّا لِاخْتِلَافِهِمْ.

[293] حضرت ابوایوب ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: مجھے ابی بن کعب نے بتایا، انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جب کوئی مرد اپنی بیوی سے ہمبستر ہو اور اسے انزال نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا: ''اس مقام کو دھولے جس سے عورت کو مس کیا تھا، پھر وضو کرے اور نماز پڑھ لے۔'' ابو عبداللہ بخاری کہتے ہیں کہ غسل کرنے میں ہی احتیاط ہے۔ یہ آخری روایت ہم نے صحابۂ کرام ؓ کے اختلاف کی وجہ سے بیان کی ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ دوران مجامعت میں جو رطوبت عورت کی شرمگاہ سے برآمد ہوتی ہے، وہ ناپاک ہے۔ اس کا دھونا ضروری ہے، خواہ وہ عضو مستور پر لگے یا کپڑے پر اس کا دھبہ آئے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہ اپنے عضو مستور کو دھوئے۔ اور دوسری حدیث میں ہے کہ وہ اس مقام کو دھوئے جس سے عورت کو مس کیا تھا۔ اسے دھونے کی بنیاد یہی ہے کہ اسے عورت کی رطوبت لگی ہے۔ واضح رہے کہ امام بخاری نے پہلے بھی اس نوعیت کا عنوان قائم کیا تھا ''منی کا دھونا اور اس کا کھرچ ڈالنا، نیز عورت کی شرمگاہ سے برآمد ہونے والی مذی کو دھونا۔'' یہ تکرار نہیں بلکہ وہاں کتاب الوضوء میں عورت کے مادۂ منویہ کے متعلق حکم بیان کرنا مقصود تھا کہ وہ مرد کے مادۂ منویہ کی طرح نجس اور پلید ہے جس کا دھونا ضروری ہے اور اس مقام پر اس رطوبت کا حکم بیان کرنا مقصود ہے جو مداعبت و ملاعبت یا مجامعت کے دوران میں عورت کی شرمگاہ سے برآمد ہو۔ یہ بھی نجس ہے، خواہ داخل فرج سے آئے یا خارج فرج میں جمع ہو۔ ② امام بخاری ؒ نے دونوں احادیث بیان کرنے کے بعد اپنی طرف سے ایک نوٹ دیا ہے کہ غسل کرنے میں ہی احتیاط ہے۔ ان الفاظ پر صحیح بخاری کے شارحین نے خوب طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ ابن العربی نے امام بخاری ؒ کے متعلق اپنی قطعی رائے کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے کہ ان کا موقف داود ظاہری جیسا ہے، یعنی دوران مجامعت میں اگر انزال نہ ہو تو صرف وضو کرنا ضروری ہے، غسل کرنا ضروری نہیں، البتہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ غسل کرلے۔ داود ظاہری کی تو اتنی اہمیت نہیں، البتہ امام بخاری ؒ کا معاملہ بہت حیران کن ہے کہ انھوں نے اجماع کے خلاف موقف اختیار کیا ہے کیونکہ آپ ائمۂ دین اور علمائے مسلمین سے ہیں، پھر ابن العربی نے حدیث الباب کو ضعیف قرار دینے پر زور دیا ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر کا تبصرہ درج ذیل ہے: ''حدیث الباب کی تضعیف کے متعلق ابن العربی کا کلام ناقابل قبول ہے۔'' پھر ابن العربی امام بخاری کا دفاع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ممکن ہے امام بخاری ؒ کی الغسل احوط سے مراد احتياط في الدين ہے جو اصول کا مشہور باب ہے۔ یہی بات ان کے فضل و کمال کے مناسب ہے۔ ابن العربی کی یہ توجیہ امام بخاری کی عادت تصرف سے بھی مناسبت رکھتی ہے کیونکہ انھوں نے ان احادیث پر ترک غسل کے جواز کے متعلق کوئی عنوان قائم نہیں کیا، نیز ابن العربی نے مسئلۂ زیر بحث کے متعلق جو اختلاف کی نفی کی ہے وہ بھی قابل اعتراض ہے کیونکہ اختلاف تو صحابۂ کرام ؓ

میں بھی شہرت پا چکا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے یہی ثابت ہے کہ ایسے حالات میں غسل واجب نہیں۔ اسی طرح ابن قصار کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ تابعین کے دور میں اختلاف نہیں تھا۔ تابعین میں اس کے متعلق اختلاف تھا بلکہ تابعین کے بعد بھی اس موقف سے اختلاف کرنے والوں کی نشاندہی ہوتی ہے، البتہ جمہور علماء کا موقف ہے کہ ایسے حالات میں غسل واجب ہے اور یہی درست بات ہے۔ [1] محقق عینی نے بھی ابن حجر کی طرح ابن قصار کے دعوی پر نقد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ تابعین میں اس کے متعلق اختلاف ضرور تھا اگرچہ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ صحابہ کے بعد اعمش تابعی کے علاوہ کسی نے بھی اس مسئلے سے اختلاف نہیں کیا، لیکن ان کے علاوہ بھی ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے غسل نہ کرنا ثابت ہے اور ہشام بن عروہ اور عطاء بھی وجوب غسل کے قائل نہ تھے اگرچہ حضرت عطا کہا کرتے تھے کہ لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے میرا دل بھی غسل کے بغیر مطمئن نہیں ہوتا اور میں عروۂ وثقیٰ کے تمسک کو ہی عملاً اختیار کرتا ہوں۔ [2] ③ علامہ ابن رشد نے اس سلسلے میں اختلاف اور وجہ اختلاف کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''اکثر فقہائے امصار اور اہل ظاہر کی ایک جماعت التقائے ختانین سے وجوب غسل کی قائل ہے جبکہ اہل ظاہر سے کچھ حضرات صرف انزال پر غسل کو واجب کہتے ہیں۔ سبب اختلاف تعارض احادیث صحیحہ ہیں۔ ایک طرف التقائے ختانین سے غسل واجب قرار دیے جانے کی حدیث ابی ہریرہ ہے اور دوسری طرف حدیث عثمان ہے جس میں غسل کا مدار صرف انزال کو قرار دیا گیا ہے۔ اکثریت نے اس دوسری حدیث کو منسوخ قرار دیا ہے۔ اور دوسروں نے اس تعارض کے پیش نظر متفق علیہ صورت انزال کو معمول بہ بنا لیا ہے۔ منسوخ کہنے والوں نے ابوداود کی حدیث ابی بن کعب کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ حکم عدم غسل آغاز اسلام میں تھا، نیز انھوں نے حدیث ابی ہریرہ کو قیاس کے لحاظ سے بھی ترجیح دی ہے کہ مجاوزتِ ختانین سے بالاجماع حد نافذ ہوتی ہے، لہٰذا غسل کا وجوب بھی اسی سے ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ جمہور نے فیصلۂ وجوب غسل کو حدیث عائشہ کی وجہ سے بھی ترجیح دی ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے جس میں، اگرچہ انزال نہ ہو، کے الفاظ ہیں۔'' [3] اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ اتھارٹی (حرفِ آخر) کی حیثیت رکھتا ہے جسے امام طحاوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے اس مسئلے کے متعلق ان کی آراء حاصل کیں۔ کسی نے اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ والی حدیث پیش کر کے عدم وجوب غسل کی نشاندہی کی، جبکہ دوسروں نے التقائے ختانین والی حدیث پیش کر کے وجوب غسل کی رائے کا اظہار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس سلسلے میں ازواج مطہرات سے معلومات لی جائیں کیونکہ وہ اسے زیادہ جانتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آدمی بھیج کر مسئلہ معلوم کرایا تو انھوں نے کہا کہ مجھے اس کے متعلق علم نہیں۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آدمی بھیجا تو انھوں نے وہ حدیث پیش کی جس میں ہے کہ جب مرد کے ختنے عورت کے ختنوں سے تجاوز کر جائیں تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ آئندہ اگر کسی نے اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ کے حوالے سے عدم وجوب غسل کا فتویٰ دیا تو میں اسے عبرتناک سزا دوں گا۔ حضرت عمر نے یہ فیصلہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں دیا اور اس پر کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ [4] اس فیصلے کے باوجود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ اَلْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ کو اختیار کرتے تھے۔ ان کے اختیار کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے پہلے ہونے پر محمول کرنا چاہیے۔ اس کے بعد ان کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

1 فتح الباري:517/1. 2 عمدة القاري:93/3. 3 بداية المجتهد:95/1-97. 4 شرح معاني الآثار للطحاوي:36/1.

امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عثمان کو ان لوگوں میں ذکر کیا ہے جو التقاء ختانین سے غسل کو واجب کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے کہ مجاوزت ختان سے غسل واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ انھوں نے سابق عنوان میں اسے بیان فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا کسی مسئلے میں رجحان پیش کردہ احادیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے حدیث ابی ہریرہ پیش کر کے اپنا رجحان واضح کر دیا ہے۔ اس حدیث کے آخر میں [الغسل أحوط] اس لیے کہا کہ جب جواز اور وجوب میں اختلاف ہو تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ وجوب پر عمل کیا جائے، نیز احوط کو استحباب پر منحصر نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کا اطلاق وجوب پر بھی ہوتا ہے۔ احتیاط پر عمل کرنا کس مقام پر مستحب ہوتا ہے اور کس جگہ پر واجب ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عبادات کے باب میں احتیاط پر عمل واجب ہوتا ہے۔ غسل کا معاملہ بھی عبادات سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے احتیاط پر عمل کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ غسل واجب ہے۔ گویا امام بخاری رحمہ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ روایات میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی بنیاد پر کسی کو اشکال پیدا ہو سکتا ہے مگر اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تحقیقی فیصلے کے بعد اس کی گنجائش نہیں۔ ان کے فیصلے نے یہ بات طے کر دی ہے کہ غسل کرنا صرف التقائے ختانین سے واجب ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ وجوب عبادات میں عمل بر احتیاط کی بنیاد پر ہے، لہٰذا امام بخاری کو یہ الزام دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ آپ نے جمہور اہل علم سے اختلاف کر کے صرف انزال کو غسل کا مدار ٹھہرایا ہے اور التقائے ختانین کے وقت صرف احتیاطاً غسل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ خیال کسی انسان کا ذاتی تو ہو سکتا ہے لیکن امام بخاری نے صراحت کے ساتھ کسی مقام پر ایسا نہیں کہا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت مستمرہ ہے کہ کتاب کے اختتام پر آخرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے ذاك الأخير کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے موت کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ اس لفظ سے اختتام کتاب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حیض، نفاس اور استحاضہ کا مفہوم

نماز کے لیے ہر قسم کے حدث (ناپاکی) سے پاک ہونا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے حدث اصغر سے طہارت (وضو) کو بیان فرمایا، پھر حدث اکبر (جنابت) سے پاکیزگی کے احکام ذکر کیے۔ چونکہ حیض سے طہارت بھی نماز کے لیے بنیادی شرط ہے، اس لیے اس کے مسائل کا آغاز فرمایا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے احکام زیادہ ہونے کی وجہ سے عنوان کتاب الحیض تجویز کیا، تاہم ضمنی طور پر جستہ جستہ استحاضہ اور نفاس کے مسائل بھی زیر بحث آئیں گے۔ ویسے بھی اصل تو حیض ہی ہے، استحاضہ اور نفاس کا خون مستقل نہیں۔ استحاضہ کا عارضہ تو شاذ و نادر کسی کسی عورت کو لاحق ہوتا ہے، اور نفاس دراصل حیض ہی کا خون ہے جو ایام حمل میں رحم کے اندر جمع ہوتا رہتا ہے۔ ایام حمل میں چونکہ رحم کا منہ بند ہوتا ہے، اس لیے ولادت کے بعد رحم کا منہ کھلتے ہی باہر نکل آتا ہے۔ حیض کیا ہے؟ لغوی طور پر سیلان کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ حَاضَ السَّیْلُ کا محاورہ اسی سے ہے۔ حوض کا لفظ بھی اسی لفظ سے بنا ہے۔ اصطلاحی طور پر صحت و تندرستی کی حالت میں بلوغ کے بعد عورت کی اندام نہانی سے مقررہ اوقات پر حسب عادت بہنے والے خون کو حیض کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے اسے اَذًی سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ یہ تکلیف دہ اور گندا ہوتا ہے، اس لیے اس پر اَذًی کا لفظ بولا گیا ہے۔ اس لفظ سے علت حکم کی طرف اشارہ ہے کیونکہ حکم کے ساتھ اگر علت حکم بھی بیان کر دی جائے تو اس حکم کی عظمت و اہمیت دلوں میں اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ حائض بغیر ''تا'' بھی فصیح لغت ہے جو عموماً غیر حالت حیض کے لیے ہے، اور دوران حیض میں حائضہ ''تا'' کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ حائض اور حائضہ کی جمع حُيَّض اور حوائض آتی ہے۔ اس کے لیے عربی زبان میں دوسرے نام بھی ہیں، مثلاً: طمث، عراک، ضحک، فرا، اکبار، اعصار، فراک، طمس، دراس اور نفاس وغیرہ۔ اس کے علاوہ استحاضہ ہے۔ یہ وہ خون ہے جو رحم کی رگ پھٹنے یا کسی بیماری کی وجہ سے ادنائے رحم سے برآمد ہو اور بعض دفعہ اس کی وجہ رکضۂ شیطان ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ شیطان کو عورت کے لیے وساوس میں مبتلا کر دینے کا موقع ملتا ہے تاکہ یہ ایک دینی معاملے میں مغالطے کا شکار ہو جائے۔ یا پھر رکضہ کو اس کے اصلی ظاہری معنی پر محمول کیا جائے گا کہ شیطان عورت کے رحم میں کچوکا لگاتا ہے جس سے خون جاری ہو جاتا ہے۔ علامہ

سندھی نے کہا ہے کہ اسے ظاہری معنی پر محمول کرنا ہی اَولیٰ ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب میں چالیس احادیث بیان کی ہیں جن پر تیس عنوان قائم کیے ہیں جن میں ایک نفاس، چار استحاضہ اور پچیس عنوان حیض سے متعلق ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل مسائل بیان ہوئے ہیں: حیض کی ابتدا کن حالات کے پیش نظر، کس زمانے میں ہوئی؟ خون حیض کی نجاست اور اس کی طہارت کا طریقہ، حائضہ کے کپڑوں کی حیثیت، حیض کی آمد اور بازگشت (ختم ہونے) کی علامات، کیا دوران حمل میں حیض آ سکتا ہے؟ غسل حیض کا طریقہ اور محل حیض کی صفائی، غسل حیض سے فراغت کے بعد خوشبو کا استعمال، غسل حیض کے وقت بالوں کو کھولنا، دوران حیض میں عورت کی ذمے داریاں، اور اس سے کون سی خدمات لی جاسکتی ہیں؟ حائضہ عورت سے کس حد تک خاوند کو تمتع کرنے کی اجازت ہے؟ اسے کن عبادات کو بجالانا اور کن سے اجتناب کرنا ہے؟ حائضہ عورت کا حج اور عمرہ کرنا، وہ کون سی عبادات ہیں جو حائضہ عورت سے ساقط ہیں جن کی قضا ضروری نہیں؟ اجتماعی عبادات میں حائضہ عورت کی شرکت اور اس کا طریقہ، حیض و نفاس کے متعلق عورت کے بیان کا اعتبار، ایام حیض کے بعد اگر رنگین رطوبت برآمد ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ حیض اور نفاس میں مابہ الاشتراک اور مابہ الافتراق، استحاضہ کی نوعیت اور اس کی وضاحت، استحاضہ کا سبب اور علت، مسجد میں مستحاضہ کا اعتکاف کرنا، مستحاضہ کا خون رک جائے تو وہ کیا کرے؟ آخر میں بیان کیا کہ نفاس والی اور حائضہ عورت وقتی طور پر نجاست آلود ہوتی ہے، نجس العین نہیں ہو جاتی۔ اگر اس حالت میں انھیں موت آ جائے تو ان کی نماز جنازہ پڑھنی ہوگی، نیز نمازی کے آگے ان کے لیٹنے سے نماز قطعاً متاثر نہیں ہوگی۔ ان کے علاوہ بے شمار احکام و مسائل بیان ہوں گے۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ تمہیدی معروضات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کتاب الحیض کا مطالعہ کریں۔

والله الموفق والله يهدي من يشاء إلى سواء الصراط.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

6 - كِتَابُ الْحَيْضِ

حیض سے متعلق احکام و مسائل

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالٰی: ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ﴾. [البقرة: ٢٢٢].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: وہ ایک گندگی ہے، لہٰذا حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان کے قریب نہ جاؤ، ہاں! جب وہ خوب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں اجازت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت کتاب الحیض کا آغاز آیت کریمہ سے فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حیض کے بارے میں یہ آیت کریمہ اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آئندہ ابواب میں حیض کے جتنے مسائل اور متعلقات بیان ہوں گے، وہ اس آیت کریمہ کی تفسیر ہوں گے، مثلاً: * حیض کا خون نجس ہے، اسے ہر صورت میں دھونا ہوگا، اسے کھرچنے یا رگڑنے سے کام نہیں چلے گا۔ * خون حیض کی نجاست حائضہ کے دیگر اعضائے جسم سے متعلق نہیں، اس لیے وہ دعا، ذکر اور دیگر علمی مجالس میں شریک ہوسکتی ہے۔ * حیض کی آمد اور بازگشت کی علامات کیا ہیں؟ نیز اس کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مقدار کیا ہوسکتی ہے؟ * حیض اور استحاضہ کے احکام الگ الگ ہیں، انھیں ایک خیال نہ کیا جائے۔ * حائضہ کا پسینہ وغیرہ پاک ہے، اس سے اجتناب کی ضرورت نہیں۔ * ایام حیض میں صرف مجامعت منع ہے، اس کے علاوہ خاوند کو تمتع کی اجازت ہے۔ * حیض کے بعد غسل واجب ہے اور اس میں دلک (جسم کا ملنا) وغیرہ ضروری ہے۔ * غسل کے بعد رفع کراہت اور اعادۂ شادابی کے لیے محل حیض پر خوشبو کا استعمال ہونا چاہیے۔ اس طرح کے دیگر احکام اسی آیت کریمہ کے اجمال کی تفصیل اور تشریح ہوں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ شریعت فہمی اور اخذ احکام کے لیے اکیلا قرآن کافی نہیں، اس کے ساتھ صاحب قرآن کی ہدایات اور تشریحات کا ہونا از بس ضروری ہے۔ یہ دونوں اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں، اس لیے قرآن کو ماننا اور صاحب قرآن سے بے اعتنائی کرنا اللہ کی منشا کے خلاف ہے۔ ضروری ہے کہ قرآن کریم میں رب العالمین کے بیان کردہ مدعا کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ

کے فرمودات کی طرف رجوع کیا جائے۔ بظاہر قرآن کریم میں حائضہ کے متعلق حکم اعتزال اور یہود ومجوس کی روش اجتناب ایک ہی معلوم ہوتی ہے لیکن حدیث نے اسے بیان فرمایا کہ مجامعت کے علاوہ ہر چیز جائز ہے۔ اعتزال کا مطلب یہ نہیں کہ اسے گھر سے نکال دیا جائے یا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ اس آیت کریمہ کی شان نزول یہ ہے کہ اسلام سے قبل مدینے کی آبادی میں اکثر یہودی شامل تھے۔ اہل مدینہ مذہبی معاملات میں انھی کا اتباع کرتے تھے۔ حائضہ کے متعلق یہود کا عمل بڑے تشدد کا تھا۔ وہ اس سے اس قدر اجتناب کرتے کہ اسے گھر سے نکال کر کسی دوسرے گھر میں منتقل کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس نصاریٰ کے ہاں ایام حیض میں کوئی پرہیز نہ ہوتا، وہ حیض اور طہر کی حالت کو یکساں خیال کرتے۔ کفار ومشرکین ان ایام میں عورت کے مقام مخصوص سے تو پرہیز کرتے لیکن اس سے زیادہ گھناؤنے جرم کے مرتکب ہوتے، یعنی وہ وطی بالدبر کرتے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر اہل اسلام اس کے متعلق سوالات کرتے، چنانچہ مذکورہ آیت کریمہ اسی قسم کے سوالات کے جواب میں نازل ہوئی۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو ناجائز قرار دیتے ہوئے حائضہ کے ساتھ ایک معتدل اور مناسب طریق عمل کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسی طریق عمل کو امام بخاری ؒ نے آئندہ ابواب میں کھول کر بیان کیا ہے۔ آئندہ جو احکام ومسائل ہیں وہ اس آیت کریمہ کی تفسیر ہیں۔ امام بخاری ؒ نے اپنی اس عظیم تالیف میں اسی اسلوب کو اپنایا ہے۔ پہلے بنیادی طور پر قرآن سے استشہاد لیتے ہیں، پھر اس کی تائید میں رسول اللہ ﷺ کے فرمودات پیش کرتے ہیں۔

(١) بَابٌ: كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْحَيْضِ

وَقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «هٰذَا شَيْءٌ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ». وَقَالَ بَعْضُهُمْ: كَانَ أَوَّلُ مَا أُرْسِلَ الْحَيْضُ عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ. قَالَ أَبُو عَبْدِ اللّٰهِ: وَحَدِيثُ النَّبِيِّ ﷺ أَكْثَرُ.

باب:1- حیض کی ابتدا کیسے ہوئی؟

نبیٔ اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''حیض ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم ؑ کی بیٹیوں کے لیے مقرر فرما دی ہے۔'' بعض حضرات کہتے ہیں: حیض پہلے پہلے بنی اسرائیل پر مسلط کیا گیا تھا۔ ابو عبداللہ (امام بخاری ؒ) کہتے ہیں: نبی ﷺ کی حدیث تمام عورتوں کو شامل ہے۔

وضاحت: امام بخاری ؒ پہلے جنس حیض کے متعلق بتانا چاہتے ہیں کہ اس کا ظہور دنیا میں کس طرح ہوا۔ اس کے بعد اس سے متعلقہ احکام ومسائل بیان کریں گے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کے پیش نظر حیض کا وجود بناتِ آدم کی ابتدائے آفرینش سے ہے۔ بنی اسرائیل کی عورتوں سے اس کا آغاز نہیں ہوا۔ امام بخاری رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی آگے حدیث: (305) میں موصولاً بیان فرمائیں گے۔ یہاں انھوں نے بنی اسرائیل سے متعلقہ روایت کا سرسری ذکر کیا ہے لیکن ان دونوں روایات میں تطبیق کی کوئی صورت بیان نہیں کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: بنی اسرائیل کی عورتیں مردوں کے ساتھ نماز پڑھا کرتی تھیں۔ دوران نماز میں انھوں نے مردوں سے تاک جھانک کا سلسلہ شروع کر دیا تو

اللہ تعالیٰ نے ان پر حیض مسلط کر دیا اور انھیں مساجد میں جانے سے روک دیا گیا۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان دونوں روایات میں تطبیق اس طرح دی ہے کہ حیض کی ابتدا تو بنی اسرائیل سے پہلے ہو چکی تھی جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جب حضرت حواء کو جنت سے زمین پر اتارا گیا تو اس وقت سے حیض کا آغاز ہوا۔[2] لیکن بنی اسرائیل کی عورتوں پر بطور سزا اس کی مدت کو بڑھا دیا گیا۔[3] علامہ عینی حسب عادت اس توجیہ سے خوش نہیں۔ وہ کہتے ہیں: اس کی کیا دلیل ہے کہ پہلے حیض میں کمی تھی جس پر بعد میں اضافہ ہوا؟ پھر انھوں نے اپنی طرف سے ایک توجیہ بیان کی ہے کہ کثرت عناد کی وجہ سے حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی عورتوں کا حیض منقطع کر دیا، پھر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور عادت حیض کا اجراء فرما دیا، یعنی جب اعادۂ حیض ہوا تو مدت انقطاع کے لحاظ سے وہی اول ارسال کا مدلول قرار پایا، لہٰذا اولیت کا اطلاق اس اعتبار سے ہوا۔[4] اس توجیہ پر ہمارا سوال ہے کہ اول انقطاع پھر اعادہ کی کیا دلیل ہے؟ بہر حال حافظ ابن حجر کی توجیہ علامہ عینی کی توجیہ سے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انھیں مساجد سے روکنے کے لیے ان کی مدت حیض کو بڑھا دیا گیا۔ لیکن ہمارے خیال میں دونوں توجیہیں ہی تسلی بخش نہیں، اس لیے مرفوع روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے کہ حیض کا آغاز ابتدائے آفرینش ہی سے ہے، اسی بات کو ترجیح حاصل ہے۔ اس کے مقابلے میں موقوف آثار نا قابل التفات ہیں جن میں حیض کا آغاز بنی اسرائیل کی عورتوں سے بتلایا گیا ہے۔ موقوف روایات کی غیر معقول توجیہات کے بجائے مرفوع روایت ہی راجح ہے۔ واللہ أعلم.

...... بَابُ الْأَمْرِ بِالنُّفَسَاءِ إِذَا نُفِسْنَ

باب: ...... حائضہ کو جب حیض آ جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

٢٩٤ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: سَمِعْتُ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الْقَاسِمِ قَالَ: سَمِعْتُ الْقَاسِمَ يَقُولُ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ تَقُولُ: خَرَجْنَا لَا نُرٰى إِلَّا الْحَجَّ، فَلَمَّا كُنَّا بِسَرِفَ حِضْتُ، فَدَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا أَبْكِي، فَقَالَ: «مَا لَكِ؟ أَنُفِسْتِ؟» قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: «إِنَّ هٰذَا أَمْرٌ كَتَبَهُ اللهُ عَلٰى بَنَاتِ آدَمَ فَاقْضِي مَا يَقْضِي الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَّا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ»، قَالَتْ: وَضَحّٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنْ نِّسَائِهِ بِالْبَقَرِ. [انظر: ٣٠٥، ٣١٦، ٣١٧، ٣١٩،

[294] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ ہم سب مدینہ منورہ سے صرف حج کے ارادے سے نکلے، چنانچہ جب ہم مقام سرف پر پہنچے تو مجھے حیض آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں رو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے کیا ہوا؟ کیا حیض آ گیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''یہ امر تو اللہ تعالیٰ نے بنات آدم پر لکھ دیا ہے، لہٰذا تم وہ تمام کام کرو جو حاجی کرتا ہے، البتہ بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی دی۔

---

1 صحيح ابن خزيمة، حديث: 1700. 2 المستدرك للحاكم: 381/2. 3 فتح الباري: 519/1. 4 عمدة القاري: 92/2.

٣٢٨، ١٥١٦، ١٥١٨، ١٥٥٦، ١٥٦٠، ١٥٦١، ١٥٦٢، ١٦٣٨، ١٦٥٠، ١٧٠٩، ١٧٢٠، ١٧٣٣، ١٧٥٧، ١٧٦٢، ١٧٧١، ١٧٧٢، ١٧٨٣، ١٧٨٦، ١٧٨٧، ١٧٨٨، ٢٩٥٢، ٢٩٨٤، ٤٣٩٥، ٤٤٠١، ٤٤٠٨، ٥٣٢٩، ٥٥٤٨، ٥٥٥٩، ٦١٥٧، ٧٢٢٩]

فوائد ومسائل: ① بخاری کے عام نسخوں میں اس حدیث پر کوئی عنوان نہیں بلکہ اسے سابق عنوان کے تحت ہی درج کیا گیا ہے۔اس صورت میں چونکہ پہلے بنات آدم پر حیض مقرر کر دینے کا بیان تھا، اس حدیث سے مذکورہ مقصد کو واضح کر دیا ہے۔لیکن ابوذر کے نسخے میں مذکورہ عنوان موجود ہے۔اس اعتبار سے مقصد یہ ہے کہ حالتِ حیض میں عورت کو آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا کہ اس سے امر و نہی کا کوئی تعلق ہی نہیں جیسا کہ یہود و مجوس نے ان ایام میں عورت کو ایک طرف کر رکھا تھا۔ بتایا گیا ہے کہ ان ایام میں صرف مخصوص عبادات کے ادا کرنے پر پابندی ہے۔دوران حج میں حائضہ منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں مناسک حج ادا کر سکتی ہے، صرف بیت اللہ کا طواف اور صفا مروہ کی سعی نہیں کرنی۔ان ایام میں مجالس خیر میں شرکت کر سکتی ہے، دیگر اسباب خیر بجا لا سکتی ہے۔اس کے متعلق دیگر تفصیلات کتاب الحج میں بیان ہوں گی۔ إن شاء الله. ② ایک روایت میں ہے، حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ ذوالحجہ کی دس تاریخ کو ہمیں گائے کا گوشت پیش کیا گیا۔ میں نے کہا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے آج اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی کی ہے، یہ اس کا گوشت ہے۔[1] اس پر امام بخاری ؒ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: [بَابُ ذَبْحِ الرَّجُلِ الْبَقَرَ عَنْ نِسَائِهِ مِنْ غَيْرِ أَمْرِهِنَّ] ''آدمی اپنی بیوی کی طرف سے اس کی اجازت یا علم کے بغیر قربانی کر سکتا ہے۔'' واضح رہے کہ امام بخاری نے مذکورہ حدیث سے تقریباً پینتیس مسائل کا استنباط فرمایا ہے جن کی ہم آئندہ جستہ جستہ وضاحت کرتے رہیں گے۔ایک حدیث سے اتنی کثیر تعداد میں مسائل کا استخراج امام بخاری کی قوتِ استنباط اور دقت نظر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(٢) بَابُ غَسْلِ الْحَائِضِ رَأْسَ زَوْجِهَا وَتَرْجِيلِهِ

باب:2- حائضہ عورت کا اپنے خاوند کے سر کو دھونا اور اس میں کنگھی کرنا

٢٩٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: كُنْتُ أُرَجِّلُ رَأْسَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَنَا حَائِضٌ. [انظر: ٢٩٦، ٣٠١، ٢٠٢٨، ٢٠٣٠، ٢٠٣١، ٢٠٤٦، ٥٩٢٥]

[295] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں بحالت حیض رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک میں کنگھی کیا کرتی تھی۔

[1] صحيح البخاري، الحج، حديث: 1709.

۲۹٦ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ مُوسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ يُوسُفَ أَنَّ ابْنَ جُرَيْجٍ أَخْبَرَهُمْ قَالَ: أَخْبَرَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ عُرْوَةَ أَنَّهُ سُئِلَ: أَتَخْدُمُنِي الْحَائِضُ أَوْ تَدْنُو مِنِّي الْمَرْأَةُ وَهِيَ جُنُبٌ؟ فَقَالَ عُرْوَةُ: كُلُّ ذٰلِكَ عَلَيَّ هَيِّنٌ، وَكُلُّ ذٰلِكَ تَخْدُمُنِي، وَلَيْسَ عَلٰى أَحَدٍ فِي ذٰلِكَ بَأْسٌ، أَخْبَرَتْنِي عَائِشَةُ أَنَّهَا كَانَتْ تُرَجِّلُ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَهِيَ حَائِضٌ وَّرَسُولُ اللهِ ﷺ حِينَئِذٍ مُّجَاوِرٌ فِي الْمَسْجِدِ، يُدْنِي لَهَا رَأْسَهُ وَهِيَ فِي حُجْرَتِهَا، فَتُرَجِّلُهُ وَهِيَ حَائِضٌ.

[296] حضرت عروہ رحمہ اللہ سے روایت ہے، ان سے سوال کیا گیا: آیا حائضہ عورت میری خدمت کر سکتی ہے یا بحالت جنابت میرے قریب آ سکتی ہے؟ حضرت عروہ نے فرمایا: میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس طرح کی عورتیں میری بھی خدمت بجالاتی ہیں۔ کسی شخص پر اس سلسلے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ وہ بحالت حیض رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک میں کنگھی کیا کرتی تھیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد میں اعتکاف فرما ہوتے۔ آپ اپنا سر مبارک قریب کر دیتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حائضہ ہونے کے باوجود اپنے حجرے ہی سے کنگھی کر دیا کرتی تھیں۔

فوائد ومسائل: ① یہود کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وہ بحالت حیض عورت کے ساتھ کھانے پینے اور ایک مکان میں ساتھ رہنے کو ممنوع خیال کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان کے غیر معقول رویے پر تنبیہ کرنا، نیز قرآنی ہدایت کہ ان دنوں میں عورتوں کے قریب نہ جاؤ، اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے صرف مباشرت و جماع کی ممانعت ہے، حائضہ عورت کا قرب ومس ممنوع نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے کہ حائضہ عورت اپنے خاوند کے تمام امور خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔ سر دھو سکتی ہے، اس میں کنگھی کر سکتی ہے، خاوند کا سر گود میں رکھ کر اسے آرام پہنچا سکتی ہے اور کھانا وغیرہ پکا سکتی ہے۔ حدیث سے بالوں میں کنگھی کرنا اور انھیں سنوارنا تو ثابت ہے لیکن انھیں دھونے کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے۔ دراصل امام بخاری نے اس روایت کے بیان کرنے میں اختصار سے کام لیا ہے کیونکہ اس روایت کے دوسرے طرق سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بحالت حیض سر مبارک دھوتی تھیں۔[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حیض کے عذر کی وجہ سے مسجد میں نہ آ سکتی تھیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کھڑکی سے اپنا سر مبارک باہر نکالتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے دھو دیتیں اور اس میں کنگھی کر دیتی تھیں۔ لفظ ''ترجیل'' بالوں کو درست کرنے سے کنایہ ہے، خواہ بالوں کو سنوارنا دھونے کی صورت میں ہو یا کنگھی کرنے کی شکل میں۔
② دوسری حدیث میں حضرت عروہ سے سوال کیا گیا کہ آیا بیوی حیض یا جنابت کی حالت میں اپنے خاوند کی خدمت کر سکتی ہے اور اس کے قریب آ سکتی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ انھوں نے بطور دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کر دی کہ وہ بھی بحالت حیض رسول اللہ ﷺ کے بال سنوار دیا کرتی تھیں۔ اس میں حائضہ سے خدمت لینے کی وضاحت ہے لیکن بحالت جنابت خدمت لینے کا مسئلہ اس روایت میں بیان نہیں ہوا۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: حضرت عروہ نے حیض پر قیاس کرتے ہوئے جنابت کو اس کے ساتھ ملا دیا کیونکہ حیض قذر اور گندگی ہے۔ جب اس گندگی کی

---

1 صحيح البخاري، الحيض، حديث: 301.

حالت میں خدمت لینے کی اجازت ہے تو جنابت تو ایک معنوی نجاست ہے، اس حالت میں تو بدرجۂ اولیٰ خدمت لینے کی اجازت ہونی چاہیے، اور انھوں نے بال سنوارنے پر دیگر خدمات کو قیاس کر کے اس میں عموم پیدا کیا ہے۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل بھی معلوم ہوئے: * حائضہ کا بدن اور پسینہ پاک ہے۔ * حائضہ عورت مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ * معتکف کے لیے جماع اور اس کے مقدمات ممنوع ہیں۔[1] ③ حائضہ عورت کے اپنے خاوند کا سر دھونے اور اس میں کنگھی کرنے کے متعلق کسی کا اختلاف نہیں، البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک دفعہ اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو انھوں نے فرمایا کہ بیٹے تمھارے بال اتنے پراگندہ کیوں ہیں؟ عرض کیا کہ بیوی ام عمار ہی میرے بال سنوارتی ہے اور وہ ان دنوں حیض میں مبتلا ہے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: حیض اس کے ہاتھ میں سرایت نہیں کر گیا کہ اس سے کوئی خدمت نہ لی جائے۔ رسول اللہ ﷺ آرام کرنے کے لیے ہماری گود میں سر رکھ دیتے تھے جبکہ ہم حیض میں مبتلا ہوتی تھیں۔[2]

(٣) بَابُ قِرَاءَةِ الرَّجُلِ فِي حَجْرِ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ

باب: 3- مرد کا اپنی حائضہ بیوی کی گود میں قرآن پڑھنا

وَكَانَ أَبُو وَائِلٍ يُرْسِلُ خَادِمَهُ وَهِيَ حَائِضٌ إِلَى أَبِي رَزِينٍ لِتَأْتِيَهُ بِالْمُصْحَفِ فَتُمْسِكُهُ بِعِلَاقَتِهِ.

حضرت ابووائل اپنی خادمہ کو ابورزین کے پاس بھیجتے جبکہ وہ بحالت حیض ہوتی، وہ (غلاف میں لپٹے ہوئے) قرآن کو اس کی ڈوری سے پکڑے لے آتی۔

٢٩٧ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ الْفَضْلُ بْنُ دُكَيْنٍ: سَمِعَ زُهَيْرًا عَنْ مَنْصُورِ بْنِ صَفِيَّةَ أَنَّ أُمَّهُ حَدَّثَتْهُ أَنَّ عَائِشَةَ حَدَّثَتْهَا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَّكِئُ فِي حَجْرِي وَأَنَا حَائِضٌ ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ. [انظر: ٧٥٤٩]

[297] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ میری گود میں تکیہ لگا لیتے تھے جبکہ میں حیض سے ہوتی، پھر آپ قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد دو باتیں ثابت کرنا ہے: * حائضہ عورت کی گود میں سر رکھ کر قرآن کی تلاوت کرنا۔ * حائضہ عورت کا جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن کو اس کی ڈوری سے اٹھانا۔ یہ دونوں باتیں جائز ہیں۔ حدیث عائشہ سے پہلی بات ثابت ہوتی ہے جبکہ ابووائل کے اثر سے دوسری بات کا ثبوت ملتا ہے۔ اس اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (342/2) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید پر دو طرح کے غلاف ہوتے ہیں: ایک وہ جو جلد کے گتوں پر سلا ہوتا ہے جسے چولی کہتے ہیں، دوسرا وہ جس میں اسے لپیٹا جاتا ہے، اسے جزدان کہا جاتا ہے۔ حائضہ عورت کا چولی کو ہاتھ لگانا درست نہیں، البتہ جزدان کے ساتھ حائضہ عورت اسے اٹھا سکتی ہے کیونکہ وہ اس سے الگ ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ حائضہ عورت اور جنبی مرد قرآن مجید کو

① فتح الباري : 521/1. ② المصنف لابن أبي شيبة : 366/1.

ہاتھ نہیں لگا سکتے، البتہ گود میں تکیہ لگا کر قرآن کی تلاوت کرنا چیزے دیگر است۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نجاست کے قرب میں تلاوت قرآن کی ممانعت نہیں کیونکہ حائضہ کا وہ حصۂ جسم جس سے حیض خارج ہو رہا ہے وہ ناپاک ہے اور اس کی گود میں سر رکھ کر تلاوت قرآن کی اجازت ہے۔ ② امام بخاری ؒ نے اسی حدیث کو بایں الفاظ بھی بیان کیا ہے، حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ میری گود میں سر رکھ کر تلاوت کرتے جبکہ میں حالت حیض میں ہوتی۔[1] اس روایت سے معلوم ہوا کہ گود میں تکیہ لگانے سے مراد سر رکھنا ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے محقق ابن دقیق العید کا ایک عجیب استدلال نقل فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس حالت میں قرآن کریم کی تلاوت کرنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حائضہ تلاوت نہیں کر سکتی، اس لیے کہ اگر خود اسے تلاوت کرنے کی اجازت ہوتی تو اس کی گود میں امتناع قراءت کا سوال ہی کیا تھا جس کے دفاع کے لیے قراءت وغیرہ کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ حافظ ابن حجر ؒ مزید لکھتے ہیں کہ اس سے ملامستِ حائضہ کا جواز بھی معلوم ہوا، نیز اس کے کپڑے اور بدن بھی پاک ہے بشرطیکہ وہاں نجاست نہ لگی ہوئی ہو۔[2]

(٤) بَابُ مَنْ سَمَّى النِّفَاسَ حَيْضًا

باب: 4- جس نے نفاس کا نام حیض رکھا

٢٩٨ - حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّ زَيْنَبَ بِنْتَ أُمِّ سَلَمَةَ حَدَّثَتْهُ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ حَدَّثَتْهَا قَالَتْ: بَيْنَا أَنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ مُضْطَجِعَةٌ فِي خَمِيصَةٍ إِذْ حِضْتُ فَانْسَلَلْتُ، فَأَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِي، فَقَالَ: «أَنُفِسْتِ؟» قُلْتُ: نَعَمْ، فَدَعَانِي فَاضْطَجَعْتُ مَعَهُ فِي الْخَمِيلَةِ. [انظر: ٣٢٢، ٣٢٣، ١٩٢٩]

[298] حضرت ام سلمہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ ایک چادر میں لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے حیض آ گیا، اس لیے میں آہستہ سے باہر آ گئی اور اپنے حیض کے کپڑے پہن لیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تجھے نفاس آ گیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور میں چادر میں آپ کے ساتھ لیٹ گئی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا اس عنوان سے یہ مقصد نہیں کہ وہ حیض و نفاس کے متعلق کوئی لغوی تشریح کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ کتاب لغت سے متعلق نہیں بلکہ اس کا موضوع احادیث مبارکہ سے مسائل و احکام کا استخراج و استنباط ہے۔ غالباً امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نفاس کا خون دراصل حیض ہی کا خون ہے جو قرار حمل کے سبب رحم کا منہ بند ہونے کی وجہ سے رک گیا تھا۔ ولادت کے بعد رحم کا منہ کھلتے ہی وہ نکل پڑا۔ اس بنا پر حیض و نفاس کے مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ اس مقصد کے تعین کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ عنوان سے حدیث کی مطابقت کس حد تک ہے؟ شارحین نے اس کے متعلق اپنے اپنے ذوق کے مطابق اظہار خیال کیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ حیض کا اطلاق نفاس پر اور

1 صحيح البخاري، التوحيد، حديث: 7549. 2 فتح الباري: 522/1.

نفاس کا اطلاق حیض پر اہل عرب کے ہاں عام ہے، اس لیے امام بخاری کے نزدیک جو احکام حیض کے ہوں گے وہی نفاس کے ہیں۔ شارع علیہ السلام نے الگ سے نفاس کے احکام نہیں بتائے۔ ② ابن المنیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بظاہر عنوان کے مطابق نہیں کیونکہ حدیث میں عنوان کے برعکس حیض کو نفاس سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن امام بخاری اس امر پر تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ منافات نماز وغیرہ کے مسائل میں حیض و نفاس کا حکم ایک ہی ہے، اس لیے حدیث سے دونوں کا یکساں حکم استنباط کر کے عنوان قائم کر دیا۔ یہ اس لیے کیا کہ نفاس سے متعلقہ احادیث ان کی شرط کے مطابق نہ تھیں۔[1] ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اپنے عنوان میں فن بلاغت کی مشہور صنعت قلب کو استعمال فرمایا ہے۔ اصل اس طرح ہے کہ جس نے حیض کا نام نفاس رکھا، یا اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مَنْ سَمّٰی سے مراد یہ ہے کہ جس نے لفظ نفاس کا اطلاق حیض پر کیا۔ ان تمام صورتوں میں حدیث کی عنوان سے مطابقت بے تکلف ہو جائے گی۔[2] ④ محدث ابن رشید نے فرمایا ہے کہ رحم سے نکلنے والے خون کو دراصل نفاس ہی کہتے ہیں کیونکہ نفاس بمعنی خون لغت میں معروف ہے اور اس لفظ سے اس کی تعبیر کرنا عام معنی کی تعبیر ہے اور لفظ حیض سے اس کی تعبیر کرنا مخصوص معنی کے ساتھ تعبیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عام معنی کے اعتبار سے اس پر نفاس کا لفظ استعمال فرمایا جبکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی تعبیر خاص معنی کے اعتبار سے ہے۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ طہارت کے متعلق حیض و نفاس کے مسائل یکساں ہیں۔ فقہاء نے جو وجوہِ فرق بیان کیے ہیں وہ دوسرے اعتبارات سے ہیں جو اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ مبارک میں خواتین حیض کے دوران میں استعمال کے کپڑے الگ رکھتی تھیں اور عام حالات میں استعمال کے کپڑے الگ ہوتے تھے، اس سے ان کے سلامتِ ذوق اور نفاستِ طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کپڑوں کی عام قلت کے حالات میں ایسا اہتمام کرنا معمولی بات نہ تھی جبکہ ہمارے ہاں خواتین میں ایسا اہتمام نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہماری خواتین خود کو اس حالت میں نمایاں نہیں کرنا چاہتیں۔ واللہ أعلم.

(٥) بَابُ مُبَاشَرَةِ الْحَائِضِ

باب: 5- حائضہ عورت کے بدن سے بدن ملانا

٢٩٩ - حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ، كِلَانَا جُنُبٌ. [راجع: ٢٥٠]

[299] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں اور نبی ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کیا کرتے تھے جبکہ ہم دونوں جنبی ہوتے۔

٣٠٠ - وَكَانَ يَأْمُرُنِي فَأَتَّزِرُ فَيُبَاشِرُنِي وَأَنَا حَائِضٌ. [انظر: ٣٠٢، ٢٠٣٠]

[300] اور آپ مجھے حکم فرماتے تو میں ازار باندھ لیتی، پھر آپ میرے ساتھ استراحت فرماتے، یعنی مل کر سوتے جبکہ میں بحالت حیض ہوتی۔

① المتواري: 79. ② فتح الباري: 1/ 522. ③ فتح الباري: 1/ 522.

٣٠١ - وَكَانَ يُخْرِجُ رَأْسَهُ إِلَيَّ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَائِضٌ. [راجع: ٢٩٥]

[301]اور آپ اپنا سر مبارک میری جانب نکال دیتے جب کہ آپ اعتکاف میں ہوتے اور میں بحالت حیض آپ کے سر مبارک کو دھو دیتی۔

٣٠٢ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ خَلِيلٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو إِسْحَاقَ - هُوَ الشَّيْبَانِيُّ - عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْأَسْوَدِ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَتْ إِحْدَانَا إِذَا كَانَتْ حَائِضًا فَأَرَادَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَنْ يُبَاشِرَهَا أَمَرَهَا أَنْ تَتَّزِرَ فِي فَوْرِ حَيْضَتِهَا ثُمَّ يُبَاشِرُهَا، قَالَتْ: وَأَيُّكُمْ يَمْلِكُ إِرْبَهُ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَمْلِكُ إِرْبَهُ. تَابَعَهُ خَالِدٌ وَجَرِيرٌ عَنِ الشَّيْبَانِيِّ. [راجع: ٣٠٠]

[302] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم ازواج میں سے جب کوئی حیض سے ہوتی اور اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ ہمارے ساتھ استراحت کا ارادہ فرماتے تو آپ ازار باندھنے کا حکم دیتے باوجودیکہ حیض جوش میں ہوتا، پھر آپ اس کے ساتھ استراحت فرماتے۔ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: تم میں سے ایسا کون ہے جو نبی ﷺ کی طرح اپنی خواہش پر کنٹرول کرنے والا ہو؟
اس حدیث کو شیبانی سے بیان کرنے میں خالد اور جریر نے (علی بن مسہر کی) متابعت کی ہے۔

٣٠٣ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا الشَّيْبَانِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ شَدَّادٍ قَالَ: سَمِعْتُ مَيْمُونَةَ تَقُولُ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا أَرَادَ أَنْ يُبَاشِرَ امْرَأَةً مِّنْ نِّسَائِهِ أَمَرَهَا فَاتَّزَرَتْ وَهِيَ حَائِضٌ. رَوَاهُ سُفْيَانُ عَنِ الشَّيْبَانِيِّ.

[303] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج میں سے کسی کے ساتھ استراحت فرمانا، یعنی مل کر سونا چاہتے اور وہ حائضہ ہوتی تو آپ کے حکم سے وہ ازار باندھ لیتی۔ اس حدیث کو سفیان نے شیبانی سے بیان کیا ہے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے مباشرتِ حائض کے احکام بیان کرنے کے متعلق یہ عنوان قائم کیا ہے۔ اس سے مراد حائضہ کے ساتھ سونا یا اس سے بوس و کنار کرنا ہے۔ اس سے مراد جماع نہیں کیونکہ وہ تو حائضہ سے کسی صورت میں جائز نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں اور محاورے میں لفظ مباشرت جماع کے لیے بولا جاتا ہے، اس لیے اس لفظ کا اردو زبان میں مباشرت سے ترجمہ کرنا غلط ہے۔ بعض عاقبت نااندیش مستشرقین نے اس باب میں آنے والی احادیث کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو خاکم بدہن ''عورتوں کا رسیا'' ثابت کیا ہے جو حالت حیض میں بھی ان سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ ان احادیث سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ انتہائی نفاست پسند تھے۔ ایک عام آدمی کو بھی بحالت حیض عورت کے پاس جانے سے گھن آتی ہے چہ جائیکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اس قسم کا فعل منسوب کیا جائے۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ. قارئین کرام کی معلومات

کے لیے عرض ہے کہ ضب (سانڈھے) کو قسام ازل (اللہ تعالیٰ) نے انتہائی شہوانی جذبات سے نوازا ہے۔ قابل اعتماد عینی گواہوں کا بیان ہے کہ اس کے دو ذکر ہوتے ہیں۔ لوگ اسے کھانے اور اس کی چربی کو طلا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حلال ہونے کے باوجود اسے ناپسند فرمایا۔ آپ کے دستر خوان پر دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے کھایا لیکن آپ نے تناول نہیں فرمایا۔ غالباً اس کی یہی وجہ تھی کہ لوگ اس بات کا چرچا کریں گے کہ آپ کے عقد میں نو بیویاں ہیں، اس لیے ضب (سانڈھے) کو استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کراہت کا اظہار کیا تاکہ کسی طرف سے بھی آپ کی شخصیت پر حرف نہ آئے۔ والله أعلم. ② امام ثوری، امام احمد، امام اسحاق اور دیگر کئی ائمہ کے نزدیک دوران حیض میں عورت سے صرف جماع حرام ہے اور فرج (حیض والی جگہ) کے سوا پورے جسم سے تمتع کرنا جائز ہے۔ دلائل کے اعتبار سے یہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تائید سنن ابوداود کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ہے کہ نبی ﷺ اگر اپنی اہلیہ سے خواہش کرتے اور وہ حیض سے ہوتی تو اس کی شرمگاہ پر کپڑا ڈال دیتے۔ [1] ابتدائی دنوں اور بعد کے ایام کی تفریق والی وہ روایت جسے ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ابن ماجہ کے حوالے سے نقل کیا ہے، وہ معجم طبرانی میں ہے لیکن ضعیف ہے۔ [2] یاد رہے کہ جواز اسی صورت میں ہے جب انسان اپنے آپ پر کنٹرول رکھتا ہو، ورنہ ایام حیض میں مرد عورت سے الگ رہے۔ ③ رسول اللہ ﷺ اپنی خواہشات پر انتہائی قابو یافتہ تھے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ✱ رسول اللہ ﷺ اپنے جذبات پر پوری طرح قابو یافتہ تھے اور ناممکن تھا کہ ازار کے بغیر بھی اگر وہ کسی بیوی کے ساتھ استراحت کرنا چاہیں تو ان سے کوئی خلاف شرع فعل صادر ہو سکے، مگر اس قدر کنٹرول کے باوجود آپ پہلے ازار پہنانے کا اہتمام کرتے، پھر اس کے ساتھ محو استراحت ہوتے۔ ✱ ازار کے بعد بھی وفور جذبات میں بہہ جانے کا اندیشہ باقی رہتا ہے، اس لیے ازار استعمال کرانے کے باوجود شدید احتیاط کی ضرورت ہے، لہٰذا ایام حیض میں بیوی کے ساتھ لیٹنے والے کے بارے میں تفصیل ہے کہ اگر اسے اپنی ذات پر پورا اعتماد ہو اور کسی غلط روی کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی اجازت دی جائے گی بصورت دیگر اسے منع کر دیا جائے گا۔ ④ حدیث عائشہ رقم (302) کو ابواسحاق شیبانی سے بیان کرنے میں خالد بن عبداللہ الواسطی اور جریر بن عبدالحمید نے علی بن مسہر کی متابعت کی ہے۔ خالد کی متابعت کو ابوالقاسم التنوخی نے اپنے فوائد میں موصولاً بیان کیا ہے جبکہ جریر کی متابعت کو ابوداود نے اپنی سنن اور امام حاکم نے اپنی مستدرک میں موصولاً بیان کیا ہے۔ منصور بن ابی الاسود نے بھی شیبانی سے اس روایت کو بیان کیا ہے جسے ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے۔ [3] حدیث میمونہ رضی اللہ عنہا رقم (303) کو شیبانی سے عبدالواحد کے علاوہ سفیان ثوری نے بھی بیان کیا ہے، اسے امام احمد نے اپنی مسند میں موصولاً بیان کیا ہے۔ [4] ⑤ دور حاضر کے منکرین حدیث کی کوشش ہے کہ قرآن و حدیث میں تضاد اور ٹکراؤ پیدا کر کے انکار حدیث کا راستہ ہموار کیا جائے۔ اس طرح جب حدیث کا قرآن فہمی میں کوئی کردار نہیں ہوگا تو قرآن کریم کی من مانی تاویلات کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اس حدیث کے متعلق بھی انھوں نے کہا کہ اس میں بحالت حیض بیوی سے مباشرت کرنے کا ذکر ہے جبکہ قرآن کریم میں اس کے متعلق حکم امتناعی ہے، لہٰذا یہ حدیث قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل تسلیم ہے۔

---

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 272. ② السلسلة الضعيفة: 283/9. ③ فتح الباري: 525/1. ④ فتح الباري: 526/1.

قارئین کرام کو خبردار کرنے کے لیے ہم نے ان کا ذکر کر دیا ہے۔ حدیث اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح ہے کہ مباشرت سے مراد جماع نہیں بلکہ اپنی بیوی کے ساتھ لیٹنا اور اس سے بوس وکنار کرنا ہے۔ اگر قرآن وحدیث میں بظاہر تعارض نظر آئے تو انکار کے بجائے اس کی توجیہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے لیکن مفسرین اس کی توجیہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جہاں معمولی سا تعارض نظر آیا، اس کا سرے سے انکار کر دیا۔

(٦) بَابُ تَرْكِ الْحَائِضِ الصَّوْمَ

٣٠٤ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي زَيْدٌ - هُوَ ابْنُ أَسْلَمَ - عَنْ عِيَاضِ بْنِ عَبْدِ اللهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي أَضْحًى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُصَلَّى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ: «يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ». فَقُلْنَ: وَبِمَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ، مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ». قُلْنَ: وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: «أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟» قُلْنَ: بَلَى، قَالَ: «فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا، أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟» قُلْنَ: بَلَى، قَالَ: «فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا». [انظر: ١٤٦٢، ٩٥٦، ١٩٥١، ٢٦٥٨]

باب:6- حائضہ عورت کا روزہ چھوڑ دینا

[304] حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ تشریف لے گئے۔ پھر آپ کا گزر عورتوں پر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ زیادہ کیا کرو کیونکہ میں نے تمھاری اکثریت جہنم میں دیکھی ہے۔'' وہ بولیں: یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تم لعنت بہت کرتی ہو اور اپنے خاوند کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم سے زیادہ کسی کو دین وعقل میں نقص رکھنے کے باوجود پختہ رائے مرد کی عقل کو لے جانے والا نہیں پایا۔'' انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری عقل اور دین میں نقصان (کمی) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کیا عورت کی گواہی مرد کی نصف گواہی کے برابر نہیں؟'' انھوں نے کہا: بے شک ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''یہی اس کی عقل کا نقصان ہے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب عورت کو حیض آتا ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔'' انھوں نے کہا: ہاں، یہ تو ہے۔ آپ نے فرمایا: ''بس یہی عورت کے دین کا نقصان ہے۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے عنوان میں صرف ترک روزے کو بیان کیا ہے، حالانکہ حالتِ حیض میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کی حیثیت الگ الگ ہے کیونکہ حائضہ عورت نماز کی اہل تو اس لیے نہیں رہتی کہ اس میں طہارت شرط ہے اور حیض کی حالت میں طہارت کا فقدان ہوتا ہے جس کی بنا پر حائضہ نماز کی مکلّف ہی نہیں۔ لیکن

روزے کی حالت اس سے مختلف ہے۔ روزے میں طہارت شرط نہیں، اس کے باوجود شریعت نے حالت حیض کو روزے کے لیے مانع قرار دیا ہے۔ چونکہ نماز کے حق میں حائضہ کی اہلیت ہی باقی نہیں رہتی، اس لیے حیض کے بعد طہارت کے ایام میں اس کی لازم نہیں لیکن روزے کے حق میں اس کی اہلیت باقی تھی، لہٰذا یہ یکسر معاف نہیں بلکہ ایام طہارت میں اس کی قضا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے نماز اور روزے کے ترک کو ایک باب میں جمع نہیں کیا بلکہ نماز کے ترک کا آئندہ عنوان قائم کریں گے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث ابن رشید کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اپنی عادت کے مطابق مشکل کو واضح کیا اور واضح بات کو آئندہ کے لیے ترک کر دیا کیونکہ ترک نماز کی بات شرط طہارت کی وجہ سے واضح تھی اور روزے میں چونکہ طہارت شرط نہیں اور اس کا ترک محض تعبدی تھا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے متعلق صراحت سے لکھا۔[1] تعبدی کا مطلب یہ ہے کہ جس کی کوئی معقول وجہ سامنے نہ ہو، محض اللہ کا حکم سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے کیونکہ حائضہ کا نماز ترک کرنا معقول المعنی ہے کہ اس کے لیے طہارت شرط ہے لیکن روزے میں طہارت شرط نہیں، لہٰذا بحالت حیض اس کا ترک کرنا محض حکم الٰہی کے پیش نظر ہے۔ ② جنبی کا روزہ صحیح اور حیض ونفاس والی عورت کا غیر صحیح اس لیے ہے کہ ان کا حدث جنبی کے حدث سے زیادہ اغلظ (کہیں زیادہ شدید) ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[2] پھر حدث کے مراتب پر بھی نظر رہنی چاہیے، مثلاً: ✱ ایک عدم طہارت حدث اصغر (بلاوضو) کی ہے۔ اس کی موجودگی میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی، البتہ قرآن مجید کی تلاوت ہوسکتی ہے اور مسجد میں داخل ہونا بھی مباح ہے۔ ✱ اور دوسری عدم طہارت حدث اکبر (جنابت) کی ہے۔ اس کی وجہ سے تلاوت بھی ممنوع اور مسجد میں داخل ہونا بھی ناجائز ہے۔ مگر اس کی موجودگی میں روزہ رکھا جاسکتا ہے۔ ✱ تیسری عدم طہارت حالتِ حیض ونفاس کی ہے جو شدت وغلظت میں جنابت سے بھی آگے ہے۔ اس کی موجودگی میں نماز، روزہ، تلاوت قرآن اور دخول مسجد سب کچھ منع ہے۔ پھر اس دوران میں روزہ نہ رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اولاً عورتیں پیدائشی طور پر کمزور اور ناتواں ہوتی ہیں، پھر حیض ونفاس کا خون جاری ہونے سے ان کی نقاہت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر روزہ ضروری قرار دیا جاتا تو ان کے لیے مزید تکلیف کا باعث تھا، اس لیے انھیں مستثنیٰ قرار دیا گیا، لیکن جنبی آدمی کو روزہ رکھنے میں کوئی مشقت نہیں ہوتی، اس لیے اسے روزہ رکھنے کا پابند کیا گیا ہے۔ طبی لحاظ سے بھی ایام حیض میں روزہ نقصان دہ ہے کیونکہ حائضہ کی صحت کے لیے حیض کا ادرار (جاری رہنا) ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران میں ایسی چیزیں استعمال کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے حیض بسہولت جاری رہتا ہے جبکہ روزے سے خشکی بڑھتی ہے اور خون کے جاری ہونے میں دقت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا طبی لحاظ سے بھی حائضہ کے لیے روزہ مفید نہیں۔ ③ حیض ونفاس کی حالت میں فوت شدہ نمازیں ادا نہیں کی جاتیں جبکہ روزے بعد میں رکھے جاتے ہیں، اس کی مختلف توجیہات بیان کی گئی ہیں: ✱ شریعت کا حکم ہے اور اس کا اتباع ضروری ہے، خواہ اس کے فرق کا ادراک ہو یا نہ ہو۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہمیں قضائے صوم کا حکم دیا جاتا تھا، قضائے صلاۃ کے متعلق نہیں کہا جاتا تھا۔[3] ✱ نماز کا وجوب بار بار اور زیادہ ہوتا ہے، اتنی زیادہ نمازوں کی قضا میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے معاف ہے، لیکن روزے میں ایسا نہیں ہوتا، وہ سال بھر میں چند ہی قضا ہوتے ہیں۔[4] ✱ طہارت کے بعد وقتی نمازوں کے ساتھ

① فتح الباري: 526/1. ② فتح الباري: 529/1. ③ صحيح مسلم، الحيض، حديث:763(335). ④ فتح الباري: 547/1.

حالت حیض و نفاس کی قضا نمازوں کی ادائیگی کا حکم بھی ہوتا تو عمل ڈبل ہو جاتا، اس کی ادائیگی میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا، البتہ روزے اس کے برعکس ہیں۔ سات یا آٹھ روزے سال کے باقی گیارہ مہینوں میں بسہولت رکھے جا سکتے ہیں۔ واللہ أعلم.

(٧) بَابٌ: تَقْضِي الْحَائِضُ الْمَنَاسِكَ كُلَّهَا إِلَّا الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ

باب: 7- حائضہ کا طواف کعبہ کے سوا دیگر مناسک حج ادا کرنا

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ: لَا بَأْسَ أَنْ تَقْرَأَ الْآيَةَ. وَلَمْ يَرَ ابْنُ عَبَّاسٍ بِالْقِرَاءَةِ لِلْجُنُبِ بَأْسًا. وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَذْكُرُ اللهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ. وَقَالَتْ أُمُّ عَطِيَّةَ: كُنَّا نُؤْمَرُ أَنْ يَخْرُجَ الْحُيَّضُ فَيُكَبِّرْنَ بِتَكْبِيرِهِمْ وَيَدْعُونَ. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: أَخْبَرَنِي أَبُوسُفْيَانَ أَنَّ هِرَقْلَ دَعَا بِكِتَابِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَرَأَهُ فَإِذَا فِيهِ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ: ﴿يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْاْ إِلَىٰ كَلِمَةٍ﴾ اَلْآيَةَ [آل عمران: ٦٤]. وَقَالَ عَطَاءٌ، عَنْ جَابِرٍ: حَاضَتْ عَائِشَةُ فَنَسَكَتِ الْمَنَاسِكَ كُلَّهَا غَيْرَ الطَّوَافِ بِالْبَيْتِ وَلَا تُصَلِّي. وَقَالَ الْحَكَمُ: إِنِّي لَأَذْبَحُ وَأَنَا جُنُبٌ. وَقَالَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَلَا تَأْكُلُواْ مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ ٱسْمُ ٱللَّهِ عَلَيْهِ﴾ [الأنعام: ١٢١].

ابراہیم (نخعی) نے فرمایا: حائضہ عورت کے لیے آیت پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت ابن عباس ؓ جنبی کے لیے قرآن کریم پڑھنے میں کوئی حرج نہیں خیال کرتے تھے۔ نبی ﷺ اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ حضرت ام عطیہ ؓ فرماتی ہیں: عید کے دن حائضہ عورتوں کو بھی باہر نکلنے کا حکم ہوتا تھا۔ وہ بھی مردوں کی طرح تکبیرات پڑھتی تھیں اور دعا کرتی تھیں۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا: انھیں حضرت ابوسفیان ؓ نے بتایا کہ ہرقل نے نبی ﷺ کا نامۂ مبارک طلب کیا اور اسے پڑھا، اس میں لکھا تھا: ”شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان انتہائی رحم کرنے والا ہے: اے اہل کتاب! ایک ایسے کلمے کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں..... الآیۃ۔“ حضرت عطاء حضرت جابر ؓ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ ؓ کو (حج میں) حیض آ گیا تو انھوں نے بیت اللہ کے طواف کے سوا دیگر تمام مناسکِ حج پورے کیے اور وہ نماز بھی نہیں پڑھتی تھیں۔ حضرت حکم نے کہا: میں جنبی ہونے کے باوجود جانور ذبح کر لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”تم اس ذبیحے کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔“

٣٠٥ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ، عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ لَا نَذْكُرُ إِلَّا الْحَجَّ، فَلَمَّا جِئْنَا سَرِفَ طَمِثْتُ فَدَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ ﷺ وَأَنَا أَبْكِي فَقَالَ: «مَا يُبْكِيكِ؟» قُلْتُ: لَوَدِدْتُ وَاللهِ أَنِّي لَمْ أَحُجَّ الْعَامَ، قَالَ: «لَعَلَّكِ نُفِسْتِ؟» قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: «فَإِنَّ ذٰلِكَ شَيْءٌ كَتَبَهُ اللهُ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ، فَافْعَلِي مَا يَفْعَلُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَّا تَطُوفِي بِالْبَيْتِ حَتّٰى تَطْهُرِي». [راجع: ٢٩٤]

[305] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ بایں حالت نکلے کہ ہم حج کے علاوہ کسی چیز کا ذکر نہ کرتے تھے۔ جب ہم مقام سرف پر پہنچے تو مجھے حیض آ گیا۔ نبی ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں رو رہی تھی۔ آپ نے پوچھا: ”تم کیوں رو رہی ہو؟“ میں نے عرض کیا: کاش میں امسال حج کا ارادہ ہی نہ کرتی۔ آپ نے فرمایا: ”شاید تمھیں حیض آ گیا ہے؟“ میں نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ”اسے تو اللہ تعالیٰ نے تمام بناتِ آدم پر لکھ دیا ہے، اس لیے تم وہ تمام افعال کرتی رہو جو حاجی کرتا ہے، البتہ بیت اللہ کا طواف نہیں کرنا تاآنکہ تم پاک ہو جاؤ۔“

فوائد ومسائل: ① بظاہر عنوان کا یہ مقصد ہے کہ حائضہ بحالت حیض حج کے تمام ارکان ادا کر سکتی ہے لیکن بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی اور نہ اسے صفا مروہ کی سعی کرنے کی اجازت ہے مگر امام بخاری ؒ نے جو آثار پیش کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حائضہ اور جنبی کو قرآن کریم پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس سے پہلے کچھ تمہیدات بیان کی تھیں: * قرب نجاست میں قرآن پڑھا جا سکتا ہے۔ * حائضہ کی گود میں قرآن پڑھنے کی اجازت ہے۔ * حائضہ عورت جزدان کی ڈوری سے قرآن اٹھا سکتی ہے۔ اب اس عنوان میں ”حدیث دیگراں“ کے طور پر اپنے مقصد کو بیان فرمایا ہے کہ نہ حیض قرآن کریم کی تلاوت سے باعث رکاوٹ ہے اور نہ بحالت جنابت ہی اس کی ممانعت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر، ابن بطال اور ابن رشید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ نے حدیث عائشہ ؓ سے یہ دلیل لی ہے کہ حائضہ اور جنبی کے لیے قرآن مجید کی تلاوت جائز ہے کیونکہ ممانعت کے سلسلے میں مناسک حج میں سے صرف طواف کا ذکر ہے، یعنی طواف کے علاوہ دیگر مناسک حج ادا کر سکتی ہے۔ اور طواف بھی اس لیے منع فرمایا کہ یہ بھی ایک مخصوص نماز ہے، باقی اعمالِ حج ذکر، تلبیہ اور دعا پر مشتمل ہیں، حائضہ عورت کو ان میں سے کسی کی ممانعت نہیں ہے، اسی طرح جنبی کے لیے بھی منع نہیں ہیں کیونکہ حائضہ کی حالتِ حدث میں زیادہ غلظت پائی جاتی ہے۔ جب حائضہ کے لیے جائز ہے تو جنبی کے لیے بالاولیٰ جائز ہونا چاہیے۔ جب ذکر اللہ جائز ہے تو تلاوت بھی جائز ہونی چاہیے کیونکہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ اگر حائضہ اور جنبی کے لیے تلاوت قرآن کی ممانعت امر تعبدی ہے تو یہ دلیل خاص کا محتاج ہے۔ اس کی ممانعت کے متعلق جو احادیث وارد ہیں وہ امام بخاری کے نزدیک درجۂ صحت کو نہیں پہنچتیں۔ اگرچہ مانعین کے نزدیک یہ احادیث واردہ مجموعی حیثیت سے حجت بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر کی تاویل کی جا سکتی ہے۔[1]

① فتح الباري: 529/1.

② امام بخاری رحمہ اللہ حائضہ اور جنبی کے لیے جواز قراءت قرآن کا موقف اختیار کرنے میں منفرد نہیں۔ اسلاف میں سے متعدد حضرات، مثلاً: امام طبری، ابن منذر اور داود و دیگر کے نزدیک جنبی اور حائضہ کے لیے قراءت قرآن کی اجازت ہے، لیکن ان حضرات کے پاس اس کے جواز کے لیے کوئی صریح اور واضح دلیل نہیں ہے بلکہ احادیث و آثار کے اطلاقات و عمومات سے ان حضرات نے استدلال کیا ہے لیکن اطلاق و عموم مانعین جواز کے خلاف اس لیے حجت نہیں بن سکتا کہ مخصوص حکم کے سامنے یہ عمومات و اطلاقات کار آمد نہیں ہو سکتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے جن آثار سے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے اگرچہ ان سب میں نزاع و بحث ہوئی ہے جس کا ذکر طوالت کا باعث ہے، البتہ امام بخاری کے طرز تصرف سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے جواز قراءت ہی کا ارادہ کر رہے ہیں۔ جمہور کی طرف سے منع تلاوت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو پیش کیا جاتا ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھنے پڑھانے سے جنابت کے علاوہ اور کوئی چیز مانع نہ ہوتی تھی۔''[1] اس روایت کو امام ترمذی اور امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس کے کچھ راویوں کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایت حسن کی قسم سے ہے اور دلیل کے طور پر پیش ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن کہا گیا ہے کہ یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مجرد ہے جو دوسروں پر حرام ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ امام طبری نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ مانعین اور قائلین کے دلائل کے پیش نظر اسے اکمل پر محمول کیا جائے گا، یعنی بہتر ہے کہ ایسی حالت میں قراءت سے پرہیز کیا جائے، تاہم جواز کے لیے گنجائش ہے۔ وہ حدیث جس میں ہے کہ حائضہ اور جنبی قرآن کریم کا کچھ حصہ بھی تلاوت نہیں کر سکتے، تمام طرق سے ضعیف اور ناقابل استدلال ہے۔[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے آخری مرفوع حدیث، حدیث عائشہ پیش کی ہے جسے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس میں ہے کہ تمھیں بیت اللہ کے طواف کے علاوہ ہر چیز کی اجازت ہے۔ امام بخاری کا استدلال یہی ہے کہ حائضہ طواف کے علاوہ تمام مناسک حج ادا کر سکتی ہے، ان مناسک میں تلبیہ، ذکر اور دعائیں وغیرہ ہیں جن میں قرآن مجید بھی ہے۔ جب حائضہ کو اجازت ہے تو جنبی کو بالاولی تلاوت قرآن کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ قراءت قرآن بطور دعا اور قراءت قرآن بطور تلاوت ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ بطور دعا اور ذکر قرآن کی آیات پڑھنے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف یہ ہے کہ قرآن مجید کو تلاوت کے طور پر حائضہ اور جنبی کے لیے پڑھنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ جمہور کے ہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کی نظر میں کوئی صحیح روایت ایسی نہیں ہے جس میں جنبی اور حائضہ کو قراءت قرآن سے روکا گیا ہو، اس لیے انھوں نے ان کے لیے تلاوت قرآن کو جائز رکھا ہے اگرچہ حکم امتناعی پر مشتمل متعدد روایات ہیں، بعض محدثین سے ان کی تصحیح بھی منقول ہے، لیکن دوسرے علماء کے نزدیک درجۂ حسن کی روایات موجود ہیں۔ ان متعدد روایات میں قدر مشترک یہی مضمون ہے کہ حائضہ اور جنبی کے لیے قراءت قرآن کی اجازت نہیں۔ بہر حال مسئلۂ زیر بحث میں دونوں ہی موقف ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے ہم نواؤں میں امام ابن حزم، امام ابن تیمیہ، امام ابن القیم رحمہم اللہ وغیرہ جیسے اساطین علم اور ائمۂ اعلام ہیں، اس لیے اس موقف کو بھی دلائل کے اعتبار سے بے وزن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دوسرا موقف احتیاط پر مبنی ہے اور اس کے قائلین تعداد میں زیادہ ہیں۔ واللہ أعلم.

---

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث :229. 2 فتح الباري : 530/1.

(٨) بَابُ الِاسْتِحَاضَةِ

باب:8-استحاضے کا بیان

وضاحت: جو خون بحالت صحت قاعدے کے مطابق رحم کی گہرائی سے آئے، اسے حیض کہتے ہیں اور جو خون غیر وقت میں فم رحم کی ایک عاذل نامی رگ سے جاری ہو، اسے استحاضہ کہا جاتا ہے۔

٣٠٦ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: قَالَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ أَبِي حُبَيْشٍ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي لَا أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ وَّلَيْسَ بِالْحَيْضَةِ، فَإِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَاتْرُكِي الصَّلَاةَ، فَإِذَا ذَهَبَ قَدْرُهَا، فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ وَصَلِّي» [انظر: ٣٢٥]

[306] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے پاکی حاصل نہیں ہوتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ایک رگ کا خون ہے، حیض نہیں، لہٰذا جب حیض آئے تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو خود سے خون دھو ڈالو، یعنی غسل کرو اور نماز پڑھو۔

فوائد و مسائل: ① اس عنوان سے امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ حیض اور استحاضے کے احکام میں فرق ہے۔ استحاضہ ایک عذر ہے اور مستحاضہ کا حکم معذور جیسا ہے۔ عورت نماز بھی پڑھے گی، روزے بھی رکھے گی۔ واضح رہے کہ حدیث کی رُو سے اس کی تین وجہیں ہیں: * یہ خون بیماری یا رگ پھٹنے سے آتا ہے۔ جب رگوں میں خون حد سے زیادہ بھر جاتا ہے تو وہ پھٹ جاتی ہیں اور ان سے خون بہنے لگتا ہے، یعنی انقطاع رگ۔ * الحاق مرض۔ * رکضۃ شیطان۔[1] رکضۃ شیطان کا مطلب بعض علماء کے نزدیک یہ ہے کہ شیطان کو موقع ملتا ہے کہ وہ عورت کو اس کے ذریعے سے التباس میں مبتلا کر دے تاکہ وہ ایک دینی معاملے میں توہمات کا شکار ہو جائے کہ وہ ایسے حالات میں خود کو نماز کے قابل سمجھے یا نماز کے قابل خیال نہ کرے۔ لیکن یہ تاویل ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اسے ظاہر معنی ہی پر محمول کیا جائے، یعنی شیطان کے کچوکا مارنے سے بھی بعض دفعہ استحاضے کا خون جاری ہو جاتا ہے۔ ② اس روایت میں ہے کہ خون دھو ڈالو اور نماز پڑھو۔ یہاں غسل کرنے کی صراحت نہیں جبکہ ایک دوسری روایت (325) میں غسل کرنے کی ہدایت ہے لیکن وہاں خون دھونے کی وضاحت نہیں۔ راوی نے دونوں جگہ اختصار سے کام لیا ہے کیونکہ خون دھونا اور غسل کرنا دونوں ہی ضروری ہیں۔ ایک تیسری چیز کی بھی ضرورت ہے کہ اس قسم کی عورت ہر نماز کے لیے وضو بھی کرے جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث (228) میں موجود ہے۔ اس لفظ کا تقاضا ہے کہ مستقل عذر والے مرد یا عورت کو ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا اور اس نماز سے متعلقہ سنن و نوافل بھی اس وضو سے پڑھے جا سکتے ہیں، نماز ادا کرنے کے بعد وضو خود بخود ختم ہو جائے گا، جبکہ کچھ حضرات کا موقف ہے کہ ہر وقت نماز کے لیے نیا وضو کرنا ہوگا۔ اور اس وقت میں جس قدر چاہے نوافل و فرائض پڑھ لے، خواہ وہ اس نماز سے غیر متعلق ہی کیوں نہ ہوں، نیز اس دوران میں فوت شدہ نمازیں بھی ادا کی جا سکتی ہیں۔ ③ حیض کے

---

① مسند أحمد: 464/6.

اقبال وادبار (شروع ہونے اور بند ہونے) کی پہچان پر استحاضے کی شناخت کا دارومدار ہے۔ اس لحاظ سے حیض کے اقبال وادبار کی شناخت حسب ذیل طریقوں سے ہوسکتی ہے: * عادت: عورتوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایام حیض کب شروع ہوتے ہیں اور وہ کب انتہا کو پہنچتے ہیں۔ اس طرح کی عورت کو مُعْتَادَہ کہا جاتا ہے۔ ایام حیض کے علاوہ دوسرے دن استحاضے کے شمار ہوں گے۔ * تمیز: اگر عادت پختہ نہ ہو تو ایام حیض کی پہچان تمیز سے ہوسکتی ہے اور اس کی بنیاد تین چیزیں ہیں: ○ خون سیاہی مائل ہو۔ ○ گاڑھا ہو۔ ○ اس کی ہوا گندی ہو۔ اس قسم کی عورت کو متمیزہ کہا جاتا ہے۔ * تحری: اگر ایام حیض یاد نہیں یا تمیز بھی نہیں ہوسکتی تو ایسی عورت کو تَحَرِّی (سوچ بچار) کرنی چاہیے۔ اگر کسی ایک جانب غالب گمان ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کرے۔ ایسی عورت کو مُتَحَرِیَّہ کہتے ہیں۔ اگر تحری سے بھی کچھ فائدہ نہ ہو تو ایسی عورت متحیرہ ضالہ مضلہ ہے۔ ایسی عورت کو چاہیے کہ وہ اپنی عمر اور جسمانی صحت کے لحاظ سے ملتی جلتی عورتوں کی عادت کے مطابق عمل کرے۔ عام عورتیں چھ یا سات دن تک حیض میں مبتلا رہتی ہیں، اس کے بعد غسل کر کے نماز شروع کر دیتی ہیں۔ ④ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استحاضے کے متعلق شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کے نتیجۂ فکر کو تحریر کر دیا جائے جو انھوں نے ایک کتابچے میں رقم فرمایا ہے۔ استحاضے کی دو صورتیں ہیں: * عورت کو ہمیشہ خون آتا رہے اور وہ کسی دن بند نہ ہو جیسا کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! مجھے استحاضہ آتا ہے کہ میں کبھی پاک نہیں ہوتی ہوں۔[1] * عورت کو بکثرت خون آتا ہو، مہینے میں ایک یا دو دن کے لیے منقطع ہو جیسا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! مجھے بکثرت بڑی شدت سے استحاضہ آتا ہے۔[2] مستحاضہ کی تین حالتیں ممکن ہیں: * اسے اپنے ایام حیض معلوم ہوں۔ اس صورت میں جتنے ایام حیض کے لیے مخصوص ہوں گے ان پر احکام حیض اور بقیہ دنوں پر استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے۔ حدیث میں ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ہمیشہ ایسا استحاضہ آتا ہے کہ کبھی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ یہ خون ایک رگ سے آتا ہے، اپنے ایام حیض کی مقدار نماز ترک کر دے پھر غسل کر کے نماز پڑھ۔[3] اسی طرح آپ نے ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ جتنے دن تجھے حیض روکے رکھے، اتنے دن نماز ترک کر دے پھر غسل کر اور نماز پڑھ۔[4] اس بنا پر مستحاضہ کو چاہیے کہ وہ اپنے مقرر ایام حیض میں نماز ترک کر دے اور بقیہ ایام میں غسل کر کے نماز شروع کر دے۔ اگر بقیہ دنوں میں خون جاری رہتا ہے تو اس کی پروا نہ کرے۔ * اسے ایام حیض معلوم نہیں۔ جب سے حیض آنا شروع ہوا خون جاری رہا، کبھی بند نہیں ہوا۔ تو ایسی عورت کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ خون حیض کی تمیز کرے جس کی تین صورتیں ہیں: * خون سیاہی مائل ہو۔ * گاڑھا ہو۔ * اس کی ہوا گندی ہو۔ مثال کے طور پر ایک عورت کو جب حیض شروع ہوا تو اس نے ابتدائی دس دن اس کی رنگت سیاہ دیکھی یا وہ گاڑھا تھا یا اس کی ہوا گندی تھی تو ابتدائی دس دن حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام استحاضہ میں غسل کر کے نماز پڑھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ حیض کا خون سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ سیاہ خون آنے تک نماز نہ پڑھو، پھر وضو کر کے نماز شروع کر دو کیونکہ اس کے بعد آنے والا خون استحاضے کا ہے۔[5] * اس کے دن بھی مقرر نہ ہوں اور نہ وہ تمیز ہی کر سکتی ہو، مثلاً: جب اسے حیض آنا شروع ہوا تو وہ ایک ہی صفت پر رہا یا کبھی سیاہ پھر سرخ پھر سیاہ آتا رہا جس سے حیض کی پہچان نہ ہوسکی تو وہ اپنی عمر اور جسمانی صحت کے

---

1 صحيح البخاري، الحيض، حديث: 306. 2 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 287. 3 صحيح البخاري، الحيض، حديث: 306. 4 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 279. 5 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 286.

لحاظ سے ملتی جلتی عام عورتوں کی عادت کے مطابق عمل کرے، یعنی وہ ہر مہینے چھ یا سات دن حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام میں استحاضہ کے مطابق عمل کرے جیسا کہ حضرت حمنہ بنت جحش ؓ نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! مجھے بکثرت شدت سے خون آتا ہے، کیا میں نماز روزہ ترک کر دوں؟ آپ نے فرمایا: ''تم روئی استعمال کرو، اس سے خون رک جائے گا۔'' عرض کیا: خون اس سے بھی زیادہ ہے، یعنی روئی وغیرہ کے استعمال سے بند نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا: ''یہ رکضۂ شیطان ہے۔ تو اللہ کے علم کے مطابق چھ یا سات دن تک نماز ترک کر دے پھر غسل کر کے تیئیس یا چوبیس دن نماز پڑھ اور روزہ رکھ۔''[1] واضح رہے کہ چھ یا سات دن اکثر عورتوں کی عادت کے مطابق ہیں۔ وہ دیکھے کہ میری عمر اور جسمانی صحت کس سے ملتی ہے، اس کی عادت کے مطابق عمل کرے۔ بعض دفعہ کسی ہنگامی حالت (رحم کے اپریشن وغیرہ) کے پیش نظر خون جاری ہو جاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں: * اپریشن کے وقت رحم کو نکال دیا جائے یا اسے مسدود کر دیا جائے۔ ایسے حالات میں یقینی طور پر حیض جاری نہیں ہو سکے گا۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر جاری شدہ خون کا حکم اس زرد رنگ کے پانی یا رطوبت جیسا ہوگا جو حیض سے فراغت کے بعد فرج سے برآمد ہوتا ہے۔ ایسی عورت نماز روزے کی پابندی کرے گی اور اس سے جماع کی بھی کوئی ممانعت نہیں۔ اسے چاہیے کہ نماز کے وقت خون دھو کر شرمگاہ پر پٹی باندھ لے تاکہ مزید خون نکلنا بند ہو جائے، پھر اگر فرض نماز پڑھنی ہے تو دخول وقت کے بعد اور اگر نوافل وغیرہ ادا کرنے ہیں تو ان کی ادائیگی سے پہلے وضو کر لیا جائے۔ * اپریشن کے بعد اگر حیض کا امکان باقی رہے تو اس صورت میں جاری شدہ خون حیض نہیں ہوگا بلکہ اس کے متعلق استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو فرمایا تھا کہ یہ رگ کا خون ہے، ہاں جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دینا۔ اس فرمان نبوی سے رہنمائی ملتی ہے کہ جس عورت کو حیض آ سکتا ہے اور اس کے آنے جانے کا بھی پتہ ہو تو حیض کے علاوہ دوسرا خون استحاضے کا شمار ہوگا اور جس کے حیض کا امکان ہی نہیں جیسا کہ پہلی صورت میں ہے، اس کا خون زرد رنگ کے پانی یا رطوبت کا حکم رکھتا ہے۔

⑤ مستحاضہ پاک عورت کے حکم میں ہے۔ صرف تین احکام اس کے ساتھ خاص ہیں: * مستحاضہ کو ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا ہوگا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ بروقت ادا کی جانے والی نماز کے لیے دخول وقت کے بعد وضو کیا جائے۔ اور جن نوافل کا وقت مقرر نہیں ہے انھیں ادا کرنے سے پہلے وضو کرنا ہوگا۔ * جب وضو کرنے کا ارادہ ہو تو پہلے خون کے نشانات کو دھویا جائے، پھر شرمگاہ پر روئی رکھ کر اس پر پٹی باندھ لی جائے تاکہ مزید خون بہنا بند ہو جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمنہ ؓ کو فرمایا تھا کہ شرمگاہ پر روئی رکھ لو۔ عرض کیا: اس سے خون بند نہیں ہوگا۔ فرمایا: ''کپڑا رکھ لو۔'' عرض کیا: ایسا کرنے سے بھی خون جاری رہتا ہے۔ فرمایا: ''لنگوٹ باندھ لو۔''[3] اگر اس کے بعد بھی خون نہ رکے تو کوئی حرج نہیں۔ * مستحاضہ سے جماع کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ راجح بات یہی ہے کہ جماع کیا جا سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں کم وبیش دس عورتیں ایسی تھیں جنھیں استحاضے کا عارضہ لاحق تھا لیکن اللہ یا اس کے رسول ﷺ نے ان سے جماع کے متعلق کوئی امتناعی حکم جاری نہیں فرمایا بلکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جب عورتوں کو حیض آئے تو ان سے الگ رہو۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ حائضہ کے علاوہ دوسری عورتوں سے جماع کی پابندی نہیں۔

---

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث : 287. ② صحيح البخاري، الوضوء، حديث : 228. ③ سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 287.

پھر جب نماز پڑھ سکتی ہے تو جماع بھی کیا جا سکتا ہے۔ حائضہ سے جماع پر اسے قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ ان دونوں کے احکام الگ الگ ہیں، اس لیے یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہوگا، نیز اس کے جواز کے متعلق حدیث میں وضاحت بھی موجود ہے۔[1]

(٩) بَابُ غَسْلِ دَمِ الْمَحِيضِ

باب:9- حیض کے خون کو دھونا

٣٠٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ الْمُنْذِرِ، عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِي بَكْرٍ أَنَّهَا قَالَتْ: سَأَلَتِ امْرَأَةٌ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ إِحْدَانَا إِذَا أَصَابَ ثَوْبَهَا الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ كَيْفَ تَصْنَعُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا أَصَابَ ثَوْبَ إِحْدَاكُنَّ الدَّمُ مِنَ الْحَيْضَةِ فَلْتَقْرُصْهُ، ثُمَّ لِتَنْضَحْهُ بِمَاءٍ، ثُمَّ لِتُصَلِّي فِيهِ». [راجع: ٢٢٧]

[307] حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا، کہنے لگی: اے اللہ کے رسول! جب ہم عورتوں میں سے کسی کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا عمل کرے؟ اس کے متعلق ارشاد فرمایئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو اسے اپنی چٹکیوں سے ملے، پھر اسے پانی سے دھو ڈالے، پھر اس میں نماز پڑھ لے۔''

٣٠٨ - حَدَّثَنَا أَصْبَغُ قَالَ: أَخْبَرَنِي ابْنُ وَهْبٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَمْرُو بْنُ الْحَارِثِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ، حَدَّثَهُ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَتْ إِحْدَانَا تَحِيضُ ثُمَّ تَقْتَرِصُ الدَّمَ مِنْ ثَوْبِهَا عِنْدَ طُهْرِهَا فَتَغْسِلُهُ وَتَنْضَحُ عَلٰى سَائِرِهِ ثُمَّ تُصَلِّي فِيهِ.

[308] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب ہم میں سے کسی کو حیض آتا تو وہ طہر کے وقت اپنے کپڑے سے خون کو چٹکیوں سے کھرچ ڈالتی اور اسے دھو ڈالتی، پھر بقیہ کپڑے پر پانی چھڑک دیتی، پھر اس میں نماز پڑھ لیتی۔

فوائد و مسائل: ① اس عنوان کے تحت جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان میں حیض کے خون کو دھونے کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ اس کپڑے کو خون سے پاک کرنے کے لیے مبالغے سے کام لیا جائے۔ وہ اس طرح کہ پہلے تو تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر انگلیوں کے پوروں سے ملا جائے، پھر اسے دھویا جائے، پھر اسی کپڑے میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت ہے۔ چٹکیوں سے ملنے کا یہ فائدہ ہے کہ کپڑے کے تاروں میں جو خون پیوست ہو گیا تھا وہ نکل جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ حیض کے خون کو دھوتے وقت خوب مبالغے سے کام لیا جائے۔ ② امام بخاری ؒ نے کتاب الوضوء میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا تھا: ''باب غسل الدم'' جس میں ہر قسم کے خون کو دھونے کا بیان تھا، پھر غسل منی کے متعلق بیان کیا تھا کہ اس کے دھونے میں عام ابتلا کی وجہ سے کچھ تخفیف تھی۔ اس سے شاید کوئی خیال کرتا کہ دم حیض کے دھونے میں بھی تخفیف ہے، لہٰذا اس خیال کو دور کرنے کے لیے فرمایا: اسے دھونے کے

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 310,309.

لیے خصوصی اہتمام کی ضرورت ہے۔ خون حیض کی نجاست پر اجماع ہے۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ پھر تمام کپڑے پر پانی بہادیا جائے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے رفع وسوسہ کے لیے قرار دیا ہے۔[1] اس سے پہلی حدیث میں غسل دم استحاضہ کا بیان تھا، یہاں دم حیض کے متعلق وضاحت فرمائی۔ ان میں فرق واضح کرنے کے لیے ایسا کیا ہے کہ دم حیض کو مبالغے سے دھویا جائے جبکہ دم استحاضہ میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ دوسرا فرق آئندہ باب میں بیان ہوگا کہ حائضہ مسجد میں داخل نہیں ہوسکتی جبکہ مستحاضہ مسجد میں اعتکاف بھی بیٹھ سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دم استحاضہ کی نجاست دم حیض کے مقابلے میں ذرا خفیف ہے۔ واللہ أعلم.

(١٠) بَابُ اِعْتِكَافِ الْمُسْتَحَاضَةِ

باب:10- مستحاضہ کا اعتکاف بیٹھنا

٣٠٩ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ اللهِ عَنْ خَالِدٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِعْتَكَفَ مَعَهُ بَعْضُ نِسَائِهِ وَهِيَ مُسْتَحَاضَةٌ تَرَى الدَّمَ فَرُبَّمَا وَضَعَتِ الطَّسْتَ تَحْتَهَا مِنَ الدَّمِ. وَزَعَمَ عِكْرِمَةُ أَنَّ عَائِشَةَ رَأَتْ مَاءَ الْعُصْفُرِ فَقَالَتْ: كَأَنَّ هٰذَا شَيْءٌ كَانَتْ فُلَانَةُ تَجِدُهُ. [انظر: ٣١٠، ٣١١، ٢٠٣٧]

[309] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک نے اعتکاف کیا جبکہ وہ استحاضہ میں مبتلا تھیں۔ وہ اکثر خون دیکھتی رہتیں اور عام طور پر وہ اپنے نیچے خون کی وجہ سے طشت رکھ لیا کرتی تھیں۔ راویٔ حدیث حضرت عکرمہ نے کہا کہ (کسی تقریب میں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسم کا پانی دیکھا تو فرمایا: یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فلاں صاحبہ کو استحاضہ کا خون آتا ہے۔

٣١٠ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ زُرَيْعٍ عَنْ خَالِدٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: اِعْتَكَفَتْ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ اِمْرَأَةٌ مِّنْ أَزْوَاجِهِ فَكَانَتْ تَرَى الدَّمَ وَالصُّفْرَةَ، وَالطَّسْتُ تَحْتَهَا، وَهِيَ تُصَلِّي. [راجع: ٣٠٩]

[310] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ آپ کی ایک اہلیہ نے اعتکاف کیا تو وہ خون اور زردی دیکھتی تھیں۔ طشت ان کے نیچے ہوتا اور وہ اسی حالت میں نماز پڑھتی تھیں۔

٣١١ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ عَنْ خَالِدٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ بَعْضَ أُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ اعْتَكَفَتْ وَهِيَ مُسْتَحَاضَةٌ. [راجع: ٣٠٩]

[311] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ امہات المؤمنین میں سے کسی ایک نے استحاضے کی حالت میں اعتکاف کیا۔

---

[1] فتح الباري: 1/ 532.

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے بعینہٖ یہی عنوان کتاب الاعتکاف میں بھی قائم کیا ہے اور اس کے تحت حدیث (310) کو بیان کیا ہے۔[1] اس مقام پر ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیض کی وجہ سے جو امور ممنوع تھے، مثلاً: مسجد میں داخل ہونا اور نماز پڑھنا وغیرہ، استحاضے کی وجہ سے ان کی ممانعت نہیں ہے، صرف اعتکاف بیٹھنے کی صورت میں مسجد کے تقدس کے پیش نظر اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ اس کی تلویث وغیرہ نہ ہو۔ اس کے لیے کوئی خاص اہتمام کرنا ہوگا جیسا کہ زوجۂ محترمہ نے اپنے نیچے طشت رکھنے کا بندوبست کیا تھا۔ ② امام ابن جوزی نے لکھا ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی کسی بیوی کو استحاضے کا عارضہ لاحق نہیں تھا۔ حضرت عائشہ ؓ کے فرمان سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات ؓ سے کوئی تعلق رکھنے والی ہے اور وہ ام حبیبہ بنت جحش ہے جو زوجۂ محترمہ حضرت زینب بنت جحش کی بہن ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ روایت (310) میں صراحت ہے کہ وہ آپ کی بیویوں میں سے کوئی عورت تھی بلکہ حدیث (311) میں اس سے بڑھ کر وضاحت ہے کہ وہ امہات المؤمنین میں سے کوئی ایک تھی۔ یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی غیر عورت رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اعتکاف بیٹھی ہو اگرچہ آپ کے ساتھ اس کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ سنن سعید بن منصور میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اعتکاف بیٹھنے والی ام المومنین حضرت ام سلمہ ؓ تھیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت سودہ بنت زمعہ یا حضرت رملہ ام حبیبہ بنت ابی سفیان تھیں۔[2] ③ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جن عورتوں کو استحاضے کا عارضہ تھا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے: ✿ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ ؓ۔ ✿ حضرت ام المؤمنین ام حبیبہ ؓ۔ ✿ حضرت ام المؤمنین زینب بنت جحش ؓ۔ ✿ ام المؤمنین سودہ بنت زمعہ ؓ۔ ✿ ام حبیبہ زوجۂ عبدالرحمٰن بن عوف ؓ۔ ✿ حضرت حمنہ بنت جحش زوجۂ طلحہ ؓ۔ ✿ اسماء بنت رشد ؓ۔ ✿ بادیہ بنت غیلان ؓ۔ ✿ فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ۔ ✿ سہلہ بنت سہیل ؓ۔[3] ④ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مستحاضہ مسجد میں ٹھہر سکتی ہے لیکن حائضہ کے لیے مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے، نیز مستحاضہ کا اعتکاف اور نماز وغیرہ صحیح ہے۔ مندرجہ ذیل خواتین وحضرات کا مستحاضہ جیسا حکم ہے: * جسے پیشاب کے قطرے آتے ہوں۔ * مرض جریان ہو۔ * ہوا خارج ہوتی رہتی ہو۔ * سیلان رحم کا عارضہ ہو * جس کے زخموں سے خون رستا رہے۔ اعتکاف کے متعلقہ مسائل کتاب الاعتکاف میں بیان ہوں گے۔ بإذن اللہ۔ ⑤ حضرت عائشہ ؓ نے کسی تقریب میں شرکت کی، وہاں کسم کا رنگین پانی دیکھا تو فرمایا: یہ ایسے رنگ کا پانی ہے جیسا کہ فلاں عورت استحاضے کے وقت دیکھتی تھی۔ خون استحاضہ کا رنگ ہلکا اور قوام رقیق ہوتا ہے جبکہ حیض کے خون کا رنگ گہرا، تیز اور قوام گاڑھا ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

(١١) بَابٌ: هَلْ تُصَلِّي الْمَرْأَةُ فِي ثَوْبٍ حَاضَتْ فِيهِ؟

باب: 11- عورت کا اس لباس میں نماز پڑھنا جس میں اسے حیض آیا ہو؟

٣١٢ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ

[312] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے

[1] صحيح البخاري، الاعتكاف، حديث: 2037. [2] فتح الباري: 534/1. [3] عمدة القاري: 127/3.

ابْنُ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ أَبِي نَجِيحٍ، عَنْ مُجَاهِدٍ [قَالَ:] قَالَتْ عَائِشَةُ: مَا كَانَ لِإِحْدَانَا إِلَّا ثَوْبٌ وَّاحِدٌ تَحِيضُ فِيهِ، فَإِذَا أَصَابَهُ شَيْءٌ مِّنْ دَمٍ قَالَتْ بِرِيقِهَا فَقَصَعَتْهُ بِظُفْرِهَا.

فرمایا: ہمارے پاس صرف ایک ہی لباس ہوتا تھا۔ اسی میں ایام حیض گزارتیں، اگر اس میں حیض کا کچھ خون لگ جاتا تو اس پر تھوک ڈال دیتیں اور اسے اپنے ناخنوں سے رگڑ دیتیں۔

فوائد ومسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم ابواب میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے اس عنوان میں یہ ثابت کیا ہے کہ حائضہ عورت انھی کپڑوں میں نماز پڑھ سکتی ہے جن میں اس نے ایام حیض گزارے ہوں۔ اور اس مسئلے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ قبل از اسلام عورتیں ایام حیض میں استعمال شدہ کپڑوں کو طہر کے وقت تبدیل کرنا ضروری خیال کرتی تھیں، لیکن شریعت نے بتلایا کہ جو کپڑا ایام حیض میں بدن پر تھا اگر وہ خون سے آلودہ نہیں ہوا تو اسے دھونے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی میں نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر کہیں خون لگا ہو تو اس آلودہ حصے کو دھولیا جائے، پھر اس میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ ناخنوں سے رگڑنے کے بعد اسے پانی سے دھو لیتی تھیں۔ ظاہر پر اعتماد کرتے ہوئے اختصار کے پیش نظر دھونے کا ذکر حدیث میں نہیں ہے۔ کپڑے کو دھونے کی وضاحت حدیث (308) میں گزر چکی ہے کہ جب ہم میں سے کسی کو حیض آتا تو وہ طہر کے وقت اپنے کپڑے سے خون کو کھرچ ڈالتی اور اسے دھو دیتی، پھر باقی ماندہ کپڑے پر پانی بہا کر اس میں نماز پڑھ لیتی۔ ② بعض حضرات کے نزدیک پانی کے علاوہ ہر مائع چیز سے ازالۂ نجاست ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے کیونکہ اس میں پانی کے بغیر ازالۂ نجاست کی صراحت ہے، لیکن یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ دوسری احادیث میں وضاحت ہے کہ صرف ناخن سے رگڑنے پر ہی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ اسے دھویا جاتا، پھر اس میں نماز ادا کی جاتی۔ تھوک کا استعمال اس لیے ہوتا تھا کہ لعاب دہن میں شوریت (نمکینی) ہوتی ہے، اس کی وجہ سے خون کا دھبا آسانی کے ساتھ دور کیا جاسکتا ہے۔ گویا لعاب دہن کا استعمال کلی طور پر ازالۂ نجاست کے لیے نہیں بلکہ ازالۂ نجاست میں سہولت پیدا کرنے کے لیے تھا۔ ③ دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ ازواج مطہرات کے پاس ایام حیض اور حالت طہارت کے لیے الگ الگ لباس ہوتا تھا جیسا کہ حضرت ام سلمہ ؓ سے مروی حدیث میں ہے، جبکہ اس روایت میں ہے کہ ہم ازواج مطہرات کے پاس حیض وطہر کے لیے ایک ہی لباس ہوتا تھا۔ بظاہر ان روایات میں تعارض ہے۔ ان میں تطبیق بایں طور ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کا بیان اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے جبکہ تنگی کا زمانہ تھا، پھر جب فتوحات کا دور آیا اور اللہ تعالیٰ نے فراخی عطا فرمائی تو حیض وطہر کا لباس الگ الگ کرلیا گیا، نیز حضرت ام سلمہ ؓ کا بیان ایام حیض میں الگ لباس کے متعلق نص نہیں کیونکہ ممکن ہے حیض کے لباس سے ان کی مراد وہ کرسف وغیرہ ہو جسے حیض سے احتیاط کے پیش نظر عورتیں استعمال کرتی ہیں، مستقل لباس مراد نہ ہو۔ اسی طرح حضرت عائشہ ؓ کا بیان اس بارے میں نص نہیں کہ ایک ہی لباس میں طہر اور حیض کے ایام گزرتے تھے۔ ان کے بیان کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معمولی لباس کے علاوہ اور کوئی مخصوص قسم کا کپڑا ہمارے پاس نہیں ہوتا تھا جس کی ضرورت داخل فرج کا خون روکنے کے لیے پڑتی تھی۔ الغرض حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ ؓ کے بیانات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ④ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

حائضہ کا پسینہ پاک ہے کیونکہ اگر بحالت حیض عورت کا پسینہ ناپاک ہوتا تو حیض کے ختم ہونے کے بعد بہرصورت اس کے بدن کا کپڑا ناپاک قرار دیا جاتا جسے دھونا ضروری ہوتا، خواہ اس پر خون کا دھبا ہو یا نہ ہو، حالانکہ حدیث میں ہے کہ اگر کپڑے پر خون کا دھبا نہیں ہے تو اسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں، اس لیے معلوم ہوا کہ جنبی آدمی کی طرح حائضہ عورت کا پسینہ بھی پاک ہے۔ ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا اس عنوان سے یہی مقصد ہو۔

(۱۲) بَابُ الطِّيبِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيضِ

باب: 12- غسل حیض سے فراغت کے بعد عورت کا خوشبو استعمال کرنا

۳۱۳ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ الْوَهَّابِ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ حَفْصَةَ، [قَالَ أَبُو عَبْدِاللهِ: أَوْ هِشَامِ بْنِ حَسَّانٍ عَنْ حَفْصَةَ] عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: كُنَّا نُنْهٰى أَنْ نُحِدَّ عَلٰى مَيِّتٍ فَوْقَ ثَلَاثٍ إِلَّا عَلٰى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا، وَلَا نَكْتَحِلَ، وَلَا نَتَطَيَّبَ وَلَا نَلْبَسَ ثَوْبًا مَّصْبُوغًا إِلَّا ثَوْبَ عَصْبٍ، وَقَدْ رُخِّصَ لَنَا عِنْدَ الطُّهْرِ إِذَا اغْتَسَلَتْ إِحْدَانَا مِنْ مَّحِيضِهَا فِي نُبْذَةٍ مِّنْ كُسْتِ أَظْفَارٍ، وَكُنَّا نُنْهٰى عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ. قَالَ: وَرَوٰى هِشَامُ بْنُ حَسَّانَ عَنْ حَفْصَةَ، عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. [انظر: ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۵۳٤۰، ۵۳٤۱، ۵۳٤۲، ۵۳٤۳]

[313] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہمیں کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنے سے روکا جاتا تھا، سوائے شوہر کے کہ اس کے معاملے میں چار ماہ دس دن تک سوگ کا حکم تھا، نیز یہ بھی حکم تھا کہ اس دوران میں ہم نہ سرمہ لگائیں، نہ خوشبو استعمال کریں اور نہ کوئی رنگین کپڑا پہنیں، مگر جس کپڑے کا دھاگا بناوٹ کے وقت ہی رنگا ہوا ہو۔ البتہ حیض سے فراغت کے وقت یہ اجازت تھی کہ جب ہم میں سے کوئی غسل حیض کرے تو وہ کست اظفار (خوشبو) استعمال کرے۔ اس کے علاوہ ہمیں جنازے کے ساتھ جانے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

اس حدیث کی روایت ہشام بن حسان نے حفصہ سے، انھوں نے ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے، انھوں نے نبی ﷺ سے بھی کی ہے۔

فوائد ومسائل: ① حیض کے خون میں زہریلا مادہ ہوتا ہے جس کے اخراج سے مخصوص محل کی جلد سکڑ جاتی ہے اور اس کی رنگت بھی بدل جاتی ہے۔ اس کی سکڑن کے ازالے اور تازگی کے اعادے کے لیے خوشبو کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت قسط ہندی کے استعمال سے پوری ہو جاتی ہے۔ غسل حیض کے بعد اس خوشبو کے استعمال کی اس حد تک تاکید ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اسے چار ماہ دس دن تک زینت اور خوشبو استعمال کرنے کی اجازت نہیں، اسے بھی غسل حیض کے بعد خوشبو استعمال کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔ خوشبو کا استعمال اس لیے بھی ضروری ہے کہ نفرت وکراہت دور ہو جائے اور آئندہ نماز وغیرہ کے وقت

خون حیض کا تصور تکدر طبع کا باعث نہ ہو، لیکن ہمارے برصغیر (پاک و ہند) کی بیشتر عورتیں اس امر نبوی کو نہ معلوم کیوں نظر انداز کر دیتی ہیں۔ ② عصب اس یمنی کپڑے کو کہتے ہیں جس کے سوت میں پہلے چند گرہیں باندھ لی جاتی تھیں، پھر اسی حالت میں رنگنے کے بعد اس سے کپڑا بنا جاتا تھا، جہاں جہاں گرہیں ہوتیں وہاں رنگ نہیں چڑھتا تھا بلکہ سادہ رہ جاتا تھا، غالباً اسی وجہ سے بعض حضرات نے اسے دھاری دار چادر سے تعبیر کیا ہے۔ حدیث نبوی کا مقصد حالتِ عدت میں ان تمام کپڑوں کے پہننے کی ممانعت ہے جو بغرض زینت رنگے جاتے ہیں۔ ہاں ثوب عصب کی اجازت اس لیے دی کہ اس دور میں یہی عام لباس تھا۔ اگر یہی دھاری دار یمنی کپڑا اعلیٰ قسم کا باعث زینت ہو تو اسے بھی پہننے کی اجازت نہیں جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ حالت سوگ میں عورت نہ رنگین کپڑا پہنے، نہ ثوب عصب پہنے اور نہ سرمہ لگائے۔[1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ثوب عصب اگر باعث زینت ہو تو اس کا زیب تن کرنا بھی سوگ والی کے لیے ممنوع ہوگا۔ ③ زمانۂ جاہلیت میں عدت گزارنے کا یہ طریقہ تھا کہ عورت کو نہایت تنگ و تاریک کوٹھری میں سب سے الگ تھلگ ایک سال کے لیے مقید کر دیا جاتا۔ اس دوران میں اسے غسل کی بھی اجازت نہ تھی۔ ایک سال کے بعد نہایت قبیح شکل وصورت کے ساتھ نکلتی تھی، پھر کسی پرندے کو عورت کے خاص خاص حصوں کے ساتھ مس کیا جاتا۔ اکثر حالات میں تعفن کی تاب نہ لا کر پرندہ مر جاتا، پھر بکری کی مینگنی عورت کے ہاتھ میں دے دیتے تھے جسے وہ اپنی پشت کے پیچھے پھینک دیتی، گویا اس نے عدت کو پھینک دیا ہے۔ اسلام نے ان تمام رسوم کا خاتمہ کر کے نہایت معقول و مہذب شکل میں عدتِ سوگ کو باقی رکھا۔ ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے ہشام کی روایت کو آگے موصولاً بیان کیا ہے۔[2] اس روایت میں وضاحت ہے کہ سوگ والی عورت جب حیض سے فارغ ہو تو نہانے کے بعد اسے کچھ کست اور اظفار کو استعمال کرنا چاہیے۔ کست، قسط ہندی کو کہتے ہیں جسے عود یا لوبان بھی کہا جاتا ہے۔ اور اظفار ایک خوشبو دار لکڑی ہے جو ناخن کے مشابہ ہوتی ہے یا اس لکڑی کو ناخن کی طرح کاٹ کر خوشبو میں استعمال کیا جاتا ہے اور اسے اظفار الطیب بھی کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے اسے ظفار پڑھا ہے۔ اس سے مراد یمن کا ایک شہر ہے۔ وہاں سے عود ہندی کو درآمد کر کے عرب ممالک میں برآمد کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ غسل کے وقت ان خوشبوؤں میں سے کسی ایک کو استعمال کرے تاکہ بدبو کا ازالہ ہو جائے۔[3]

(١٣) بَابُ دَلْكِ الْمَرْأَةِ نَفْسَهَا إِذَا تَطَهَّرَتْ مِنَ الْمَحِيضِ، وَكَيْفَ تَغْتَسِلُ وَتَأْخُذُ فِرْصَةً مُمَسَّكَةً فَتَتَّبِعُ بِهَا أَثَرَ الدَّمِ

باب: 13- حیض سے فراغت کے بعد (نہاتے وقت) عورت کا اپنے بدن کو ملنا اور غسل کرنے کا طریقہ، غسل کے بعد وہ چیز جس پر مشک لگایا گیا ہو، اسے خون آلود مقامات پر پھیر دے

٣١٤ - حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنْ مَنْصُورِ بْنِ صَفِيَّةَ، عَنْ أُمِّهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ

[314] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے نبی ﷺ سے اپنے غسل حیض کے متعلق دریافت کیا تو

---

[1] سنن النسائي، الطلاق، حديث: 3564. [2] صحيح البخاري، الطلاق، حديث: 5343. [3] فتح الباري: 537/1.

امْرَأَةً سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيضِ، فَأَمَرَهَا كَيْفَ تَغْتَسِلُ، قَالَ: «خُذِي فِرْصَةً مِّنْ مِّسْكٍ، فَتَطَهَّرِي بِهَا»، قَالَتْ: كَيْفَ أَتَطَهَّرُ بِهَا؟ قَالَ: «سُبْحَانَ اللهِ! تَطَهَّرِي». فَاجْتَبَذْتُهَا إِلَيَّ فَقُلْتُ: تَتَبَّعِي بِهَا أَثَرَ الدَّمِ. [انظر: ٣١٥، ٧٣٥٧]

آپ نے اس کے سامنے غسل کی کیفیت بیان کی۔ مزید فرمایا: ''کستوری لگا ہوا روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اس سے طہارت حاصل کر۔'' وہ کہنے لگی: اس کے ساتھ کیسے طہارت حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! پاکیزگی حاصل کر۔'' حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچا اور اسے سمجھایا کہ اسے خون کے مقامات پر لگا لے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس عنوان میں چار چیزیں بیان کی ہیں: * غسل حیض کرتے وقت جسم کو خوب مل کر دھونا۔ * غسل کا طریقہ۔ * کستوری لگے روئی کے ٹکڑے سے مدد لینا۔ * خون کے اثرات کو دور کرنا، جبکہ حدیث میں پہلی دو باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے متعلق علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ چوتھی چیز، یعنی خون کے اثرات کو دور کرنے سے دلک (ملنا) ثابت ہوا اور کیفیت غسل سے مراد غسل کا طریقہ نہیں بلکہ غسل حیض کی مخصوص صفت خوشبو کا استعمال بتانا مقصود ہے۔[1] لیکن حافظ ابن حجر ؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے حسب عادت عنوان میں ایسی چیز بیان کی ہے جو بیان شدہ حدیث کی دیگر روایات میں موجود ہے۔ چونکہ وہ روایات امام بخاری کی شرط پر نہ تھیں، اس لیے انھیں ذکر نہیں فرمایا بلکہ ان کی طرف عنوان میں اشارہ کر دیا ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی روایات میں ان باتوں کی صراحت ہے،[2] نیز اس روایت میں دلکِ شدید کا ذکر ہے۔ ② صحیح مسلم ہی کی روایت میں حضرت عائشہ ؓ نے انصار کی عورتوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: یہ عورتیں انتہائی عقلمند اور سمجھدار ہیں کہ انھیں دین میں تفقہ حاصل کرنے کے لیے حیا مانع نہیں ہوتی۔[3] صحیح مسلم کی ایک روایت میں صراحت ہے کہ وہ سائلہ اسماء بنت شکل تھیں۔[4] ③ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ حدیث میں سادہ روئی کا ٹکڑا مراد ہے، اس پر کستوری لگی ہوئی ہو، یہ مراد نہیں کیونکہ کستوری اتنی مقدار میں دستیاب نہ تھی کہ اسے ایسے مواقع پر استعمال کیا جاتا، لیکن یہ بات درست نہیں کیونکہ مصنف عبدالرزاق (1/ 315) میں "من ذريرة" کے الفاظ ہیں جو ایک قسم کی مشہور خوشبو ہے، پھر اس کی دستیابی کی بات بھی صحیح نہیں کیونکہ اہل حجاز کے ہاں خوشبو کا استعمال عام ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ حضرت اسماء کو تردد اس لیے ہوا کہ کستوری کوئی سیال چیز نہیں جس سے طہارت کی جائے، اس لیے انھوں نے دوبارہ سہ بارہ دریافت کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ کہا کہ عورتوں کو اپنے معاملات کے متعلق خوب سمجھ ہونی چاہیے، چنانچہ حضرت عائشہ ؓ نے اسے اپنے پاس بلا کر اس کی وضاحت کر دی۔ سنن دارمی (حدیث: 773) میں ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کی وضاحت کو خود رسول اللہ ﷺ بھی سن رہے تھے اور آپ نے انکار نہیں فرمایا۔[5] ④ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غسل حیض صرف اتنا ہی نہیں کہ پانی بہا لیا اور فارغ ہو گئے بلکہ اس میں بدن کو خوب ملنا ہے اور جہاں جہاں خون کے نشانات ہوں، وہاں خوشبودار چیز کا استعمال کرنا ہے۔ مشک کا یہ خاصا ہے کہ وہ جلد کے سکیٹر کو ختم کر کے اس کی

1 شرح الكرماني:3/180. 2 صحيح مسلم،الحيض، حديث: 750 (332). 3 صحيح مسلم،الحيض، حديث:752(332).
4 صحيح مسلم، الحيض، حديث:750(332). 5 فتح الباري :1/539.

شادابی کو بحال کرتی ہے۔ اس کی دوسری مصلحت یہ ہے کہ اس کے استعمال کے بعد اگر کوئی خون کا دھبا نظر آئے گا تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ مشک کا رنگ ہے، خون نہیں۔ گویا دفع وسواس کے لیے یہ اچھی صورت ہے۔ اس کی تیسری مصلحت یہ ہے کہ حیض سے فراغت کے بعد اس حصۂ جسم پر کستوری کا استعمال علوق نطفہ کے لیے معاون ہوتا ہے۔ ان ایام میں ویسے بھی عورت قبولیت نطفہ کی صلاحیت رکھتی ہے، خوشبو کا استعمال مزید اس کے لیے معاون ثابت ہوگا۔ واللہ أعلم. ⑤ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل معلوم ہوتے ہیں: * ناقابل صراحت معاملات کو اشارے کنائے سے بتانا چاہیے۔ * عورت اپنے قابل اخفا معاملات کے متعلق علمائے شریعت کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔ * مسائل کو سمجھانے کے لیے جواب کا تکرار اچھی چیز ہے۔ * عالم کی موجودگی میں دوسرا حاضر مجلس، سائل کو سمجھا سکتا ہے بشرطیکہ عالم اسے پسند کرے۔ * طالب علم کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہیے بالخصوص ناسمجھ اور کند ذہن کو معذور خیال کرنا چاہیے۔[1]

(١٤) بَابُ غُسْلِ الْمَحِيضِ

باب:14- غسل حیض کا بیان

٣١٥ - حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مَنْصُورٌ عَنْ أُمِّهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ امْرَأَةً مِّنَ الْأَنْصَارِ قَالَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ: كَيْفَ أَغْتَسِلُ مِنَ الْمَحِيضِ؟ قَالَ: «خُذِي فِرْصَةً مُّمَسَّكَةً وَتَوَضَّئِي ثَلَاثًا»، ثُمَّ إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَحْيَا فَأَعْرَضَ بِوَجْهِهِ أَوْ قَالَ: «تَوَضَّئِي بِهَا». فَأَخَذْتُهَا فَجَذَبْتُهَا، فَأَخْبَرْتُهَا بِمَا يُرِيدُ النَّبِيُّ ﷺ. [راجع: ٣١٤]

[315] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ قبیلۂ انصار کی ایک عورت نے نبی ﷺ سے عرض کیا: میں حیض کا غسل کس طرح کروں؟ آپ نے فرمایا: ”کستوری لگا ہوا روئی کا ایک ٹکڑا لو اور اس سے پاکی حاصل کرو۔“ یہ آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔ پھر نبی ﷺ کو حیا دامن گیر ہوئی اور آپ نے چہرۂ مبارک دوسری طرف پھیر لیا، یا فرمایا: ”اس سے پاکی حاصل کرو۔“ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ میں نے اس عورت کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور نبی ﷺ جو بات کہنا چاہتے تھے، وہ میں نے اسے سمجھائی۔

فوائد ومسائل: ① اس عنوان میں غسل حیض کی مخصوص کیفیت بتلانا مقصود ہے، یعنی ایسا غسل جو دیگر ہر طرح کے غسل سے ممتاز ہو کیونکہ نفس غسل تو معروف ہے، اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دوسری حدیث میں اس کی تفصیل بایں الفاظ ہے: ”تم میں سے ہر عورت غسل کے لیے پانی اور بیری کے پتے لے اور طہارت حاصل کرے، اچھی طرح غسل کرے، پھر اپنے سر پر پانی ڈالے اور اسے خوب اچھی طرح ملے یہاں تک کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ پھر اپنے اوپر پانی بہالے، فارغ ہو کر کستوری لگا ہوا روئی کا ٹکڑا لے اور اسے خون آلود جگہوں پر لگائے......“[2] واضح رہے کہ امام بخاری ؒ کے نزدیک غسل جنابت اور غسل حیض دونوں ایک طرح کے نہیں بلکہ ان دونوں میں فرق ہے۔ اس بنا پر اس عنوان میں غسل حیض کی الگ کیفیت

① فتح الباري: 539/1. ② صحيح مسلم، الطهارة، حديث: 750(332).

بتائی گئی ہے۔ آئندہ ابواب میں بھی اس فرق کی طرف ہی اشارہ فرمائیں گے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ اس مقام پر سوال نفس غسل سے نہیں کیونکہ یہ تو معروف و معلوم تھا، سوال صرف غسل حیض کی خاص کیفیت سے ہے۔ ② بعض حضرات نے اسے غسل، یعنی غین کے فتحہ سے پڑھا ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ یہ تو باب رقم (9) حدیث (308) کے تحت آ چکا ہے۔ ہاں! اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ پہلے باب میں خون حیض سے ملوث کپڑوں کو دھونے کا بیان تھا اور اس باب میں بدن پر لگے ہوئے خون کو دھونے کا ذکر ہے جیسا کہ احادیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مقام پر محیض مصدر میمی کے بجائے اسم مکان ہو، یعنی جائے حیض (شرمگاہ) دھونے کا بیان۔ اس مقام پر حسب عادت علامہ عینی کی بھی سنتے جائیے، فرماتے ہیں کہ اس عنوان کا درحقیقت چنداں فائدہ نہیں کیونکہ یہ بات تو پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے اور روایت بھی وہی ذکر کی ہے جو پہلے عنوان میں لائے تھے، ہاں! طریق روایت میں فرق ضرور ہے۔[1] ③ بعض شارحین نے مِسْك کو مَسْك پڑھا ہے جس کا ترجمہ چمڑا ہے یا بکرے اور بھیڑ کے چمڑے کا وہ ٹکڑا جس پر اون ہو۔ اسے خون والی جگہ پر ملنے سے خون کی نجاست اور بو دور ہو جائے گی۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ مِسک ایک گراں قیمت چیز ہے اور بظاہر اتنی وافر بھی نہیں تھی کہ ایسے مواقع پر استعمال کی جاتی، لیکن ان حضرات کا یہ قیاس درست نہیں۔ اولاً: انسانی جسم کوئی زنگار آلود لوہا نہیں کہ اسے ریگ مار سے رگڑ کر صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے، اس پر خون کی اس قدر تہ کیونکر جم سکتی ہے جبکہ قضائے حاجت کے بعد وقتاً فوقتاً استنجا بھی کیا جاتا ہے۔ ہر عورت ان ایام میں نظافت کا خیال رکھتی ہے۔ ثانیاً: اون سے نہ تو نجاست دور ہو سکتی ہے اور نہ اس سے بو ہی کا ازالہ ہوتا ہے۔ ثالثاً: اہل عرب کے ہاں کستوری نایاب چیز نہ تھی بلکہ وافر مقدار میں دستیاب تھی اور اس کا استعمال بھی عام تھا۔ رابعاً: ہر عورت کے لیے اس کا مہیا کرنا ضروری نہیں بلکہ جس کے لیے اس کا حصول ممکن ہو، وہ استعمال کرے بصورت دیگر دوسری خوشبو بھی استعمال کی جا سکتی ہے، مقصد تو جلد کو تازہ کرنا اور بدبو کا ازالہ ہے اور وہ کسی بھی خوشبو سے ہو سکتا ہے۔ ④ اس حدیث میں لفظ تَوَضَّئِي سے لغوی معنی مراد ہیں کیونکہ لغت میں اس کے معنی روشن کرنا ہیں۔ آپ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس سے صفائی حاصل کرو۔ بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔[2] تو یہ حیا کی وجہ سے تھا۔ واللّٰہ أعلم.

(١٥) بَابُ اِمْتِشَاطِ الْمَرْأَةِ عِنْدَ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيضِ

باب:15- غسل حیض کے وقت عورت کا بالوں میں کنگھی کرنا

٣١٦ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ: أَهْلَلْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَكُنْتُ مِمَّنْ تَمَتَّعَ وَلَمْ

[316] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں احرام باندھا تو میں ان لوگوں میں شامل تھی جنھوں نے حج تمتع کی نیت کی تھی اور اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے

1 عمدة القاري: 140/3. 2 سنن النسائي، الطهارة، حديث: 252.

يَسُقِ الْهَدْيَ، فَزَعَمَتْ أَنَّهَا حَاضَتْ وَلَمْ تَطْهُرْ حَتَّى دَخَلَتْ لَيْلَةُ عَرَفَةَ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! هٰذِهِ لَيْلَةُ عَرَفَةَ وَإِنَّمَا كُنْتُ تَمَتَّعْتُ بِعُمْرَةٍ؟ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُنْقُضِي رَأْسَكِ وَامْتَشِطِي، وَأَمْسِكِي عَنْ عُمْرَتِكِ». فَفَعَلْتُ، فَلَمَّا قَضَيْتُ الْحَجَّ أَمَرَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ لَيْلَةَ الْحَصْبَةِ فَأَعْمَرَنِي مِنَ التَّنْعِيمِ مَكَانَ عُمْرَتِي الَّتِي نَسَكْتُ. [راجع: ٢٩٤]

تھے۔ حضرت عائشہ ؓ نے کہا کہ انھیں حیض آ گیا اور شب عرفہ تک پاک نہ ہوسکیں۔ تب انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ عرفے کی رات ہے اور میں نے عمرے کا احرام باندھ کر تمتع کا ارادہ کیا تھا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنا سر کھول کر کنگھی کر لو اور اپنے عمرے کے اعمال کو موقوف کر دو۔'' چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور جب میں حج سے فارغ ہوگئی تو آپ نے شب محصب (میرے بھائی) عبدالرحمٰن ؓ کو حکم دیا تو وہ، میرے اس عمرے کے بدلے جس کا میں نے احرام باندھا تھا، مجھے مقام تنعیم سے عمرہ کرا لائے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ غسل حیض کی امتیازی حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے بتایا تھا کہ غسل حیض کے وقت کستوری کا استعمال غسل جنابت سے مابہ الامتیاز ہے اور اس عنوان میں ثابت کیا کہ غسل حیض کے وقت جنابت کے برعکس، سر کے پراگندہ بالوں کی پراگندگی کو کنگھی کے ذریعے سے دور کرنا ہوگا تاکہ انھیں دھونے میں آسانی رہے۔ آئندہ باب میں بالوں کی مینڈھیوں کو کھولنے کا ذکر ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک غسل حیض کے وقت نقض رأس (سر کے بالوں کا کھولنا) ضروری ہے جبکہ غسل جنابت میں ان کا کھولنا ضروری نہیں جیسا کہ حضرت ام سلمہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ میں اپنے بالوں کی بہت مینڈھیاں کرتی ہوں، کیا مجھے غسل جنابت کے وقت انھیں کھولنا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔''[1] البتہ حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ اس معاملے میں سختی کیا کرتے تھے۔ وہ عورتوں کو غسل جنابت کے وقت بھی سر کھولنے کا حکم دیتے تھے۔ ردعمل کے طور پر حضرت عائشہ ؓ فرماتیں کہ وہ سر کھولنے کے بجائے سر منڈوانے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ رسول اللہ ﷺ اور میں (اکٹھے مل کر) ایک ہی برتن سے غسل کیا کرتے تھے اور میں اپنے سر پر تین بار ہی پانی بہاتی تھی۔[2] صحیح مسلم ہی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہ ؓ کو فرمایا تھا کہ تمھیں اپنے سر پر صرف تین چلو پانی ڈال لینا کافی ہے۔[3] امام بخاری ؒ کے نزدیک بالوں کے متعلق تخفیفی حکم غسل جنابت میں ہے، غسل حیض میں نہیں۔ غسل حیض میں بالوں کو کھول کر ان میں کنگھی کرنی ہوگی، لیکن جمہور اسے مستحب کہتے ہیں کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ام سلمہ ؓ نے غسل جنابت اور غسل حیض دونوں کے متعلق پوچھا تھا کہ ان میں بالوں کا کھولنا ضروری ہے؟ تو آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں۔[4] (بعض علماء نے اس روایت میں [و الحيضة] کے الفاظ کو شاذ قرار دیا ہے اور یہی بات راجح ہے، اس لیے جمہور کا استدلال درست نہیں۔) جمہور کے نزدیک غسل جنابت اور غسل حیض میں کوئی فرق نہیں، بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری

---

① صحيح مسلم، الحيض، حديث: 744(330). ② صحيح مسلم، الحيض، حديث: 747(331). ③ صحيح مسلم، الحيض، حديث: 744(330). ④ صحيح مسلم، الحيض، حديث: 745(330).

ہے۔ اگر بالوں کو کھولے بغیر یہ کام ہو جائے تو انھیں کھولنے کی ضرورت نہیں۔ اگر بغیر کھولے جڑوں تک پانی نہ پہنچ سکے تو کھولنا ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح بخاری کی روایت کو ترجیح ہے جس میں غسل حیض کے وقت بالوں کو کھولنے کا ذکر ہے۔ واضح رہے کہ حدیث الباب میں غسل کا ذکر نہیں ہے لیکن عنوان میں امام بخاری نے غسل کی قید لگائی ہے۔ ان کے نزدیک بالوں کو کھولنا اوران میں کنگھی کرنا غسل سے کنایہ ہے، یا انھوں نے دوسری روایات پر اعتماد کیا ہے جن میں غسل کا ذکر ہے۔[1] اب دو صورتیں ہیں: ٭ اس غسل کو حیض ہی سے متعلق قرار دیا جائے اگرچہ حیض ابھی ختم نہیں ہوا، تاہم غسل نجاست کی تخفیف وتقلیل کی غرض سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ ٭ غسل احرام کو سنت تسلیم کیا جائے جس میں جسم کی نظافت وصفائی پیش نظر ہوتی ہے۔ غسل احرام سنت کے درجے میں ہے۔ اگر اس کی نظافت وصفائی کی وجہ سے غسل کے وقت بال کھولنے اوران میں کنگھی کرنے کی ضرورت ہو تو غسل حیض میں بدرجۂ اولیٰ اس ضرورت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ صفائی اور پاکیزگی کا مقصد تو دونوں جگہ موجود ہے بلکہ غسل حیض کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی صورت میں غسل احرام کو نہیں کیونکہ غسل حیض فرض ہے اور اس میں نجاست کا ازالہ مقصود ہوتا ہے جبکہ غسل احرام سنت ہے اور اس میں صرف جسم کی صفائی پیش نظر ہوتی ہے۔[2] ② شب محصب سے مراد وہ رات ہے جس میں حج سے فراغت کے بعد اہل مدینہ قافلہ بندی کے لیے ٹھہرتے تھے۔ ان کا مقام پڑاؤ وادیٔ محصب تھا جو مکہ اور منیٰ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ پھر وہاں سے جمع ہو کر رات کے آخری حصے میں مدینے کی طرف روانگی ہوتی تھی۔ ذوالحجہ کی تیرھویں یا چودھویں رات کو لیلۃ الحصبہ یا شب محصب کہا جاتا ہے۔

(١٦) بَابُ نَقْضِ الْمَرْأَةِ شَعْرَهَا عِنْدَ غُسْلِ الْمَحِيضِ

باب: 16- غسل حیض کے وقت عورت کا اپنے بالوں کو کھولنا

٣١٧ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: خَرَجْنَا مُوَافِينَ لِهِلَالِ ذِي الْحِجَّةِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُهْلِلَ بِعُمْرَةٍ فَلْيُهْلِلْ، فَإِنِّي لَوْلَا أَنِّي أَهْدَيْتُ لَأَحْلَلْتُ بِعُمْرَةٍ»، فَأَهَلَّ بَعْضُهُمْ بِعُمْرَةٍ، وَأَهَلَّ بَعْضُهُمْ بِحَجٍّ، وَكُنْتُ أَنَا مِمَّنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَأَدْرَكَنِي يَوْمُ عَرَفَةَ وَأَنَا حَائِضٌ فَشَكَوْتُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: «دَعِي عُمْرَتَكِ، وَانْقُضِي رَأْسَكِ، وَامْتَشِطِي

[317] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم ہلال ذی الحجہ کے قریب حج کے لیے روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص عمرے کا احرام باندھنا چاہے، وہ عمرے کا احرام باندھ لے اور خود میں اگر ہدی (قربانی کا جانور) نہ لایا ہوتا تو عمرے ہی کا احرام باندھتا۔'' چنانچہ کچھ لوگوں نے عمرے کا احرام باندھا اور کچھ نے حج کا۔ اور میں ان لوگوں میں تھی جنھوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا۔ مجھے عرفے کا دن بحالت حیض آیا، چنانچہ میں نے نبی ﷺ سے عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''عمرہ

1 صحيح مسلم، الحج، حديث: 2937 (1213). 2 فتح الباري: 541/1.

وَأَهِلِّي بِحَجٍّ»، فَفَعَلْتُ، حَتّٰى إِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْحَصْبَةِ أَرْسَلَ مَعِي أَخِي عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ، فَخَرَجْتُ إِلَى التَّنْعِيمِ، فَأَهْلَلْتُ بِعُمْرَةٍ مَّكَانَ عُمْرَتِي. قَالَ هِشَامٌ: وَلَمْ يَكُنْ فِي شَيْءٍ مِّنْ ذٰلِكَ هَدْيٌ وَّلَا صَوْمٌ وَّلَا صَدَقَةٌ. [راجع: ٢٩٤]

ترک کر دو اور سر کے بال کھول کر کنگھی کر لو، پھر حج کا احرام باندھ لو۔" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ جب وادئ محصب میں پڑاؤ کی رات آئی تو آپ نے میرے ساتھ میرے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کو بھیجا۔ میں (ان کے ساتھ) تنعیم تک گئی اور وہاں سے فوت شدہ عمرے کی جگہ دوسرا احرام باندھا۔ ہشام راوی کہتے ہیں کہ ان سب باتوں میں نہ قربانی لازم ہوئی، نہ روزہ رکھنا پڑا اور نہ صدقہ ہی دینا پڑا۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غسل حیض میں سر کھولنا ہوگا جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سر نہ کھولنے کا تخفیفی حکم صرف غسل جنابت میں ہے کیونکہ جنابت کثرت سے پیش آتی ہے جبکہ غسل حیض مہینے میں ایک مرتبہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عورتیں غسل حیض کے وقت صفائی و نظافت کا پورا پورا اہتمام کرتی ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شرح تراجم ابواب میں ذکر کیا ہے۔ ② مدینے سے روانہ ہوتے وقت عام لوگوں کا یہی خیال تھا کہ ہم صرف حج کریں گے کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں یہ ایام (اَشْهُرِ حج) حج کے لیے مخصوص سمجھے جاتے تھے اور ان دنوں میں عمرہ کرنے کو بدترین گناہ خیال کیا جاتا تھا۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے قبل ازیں ماہ ذوالقعدہ میں تین دفعہ عمرہ کر کے اس خیال کو عملی طور پر باطل قرار دے دیا تھا مگر آپ نے ان عمروں میں حج ساتھ نہیں کیا تھا۔ چونکہ یہ روانگی حج کے لیے تھی، اس لیے آپ نے اس کی وضاحت فرما دی۔ اس کے علاوہ آپ نے مزید فرمایا کہ مجھے ایک مجبوری ہے کہ میرے ساتھ قربانی کا جانور ہے، اس لیے صرف عمرے کا احرام نہیں باندھ سکتا، اس لیے میری حالت کو نہ دیکھا جائے بلکہ ہر انسان اپنی اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے۔ ③ حضرت ہشام نے ان تمام باتوں میں ہدی، روزہ اور صدقہ وغیرہ کی نفی کی ہے کیونکہ ایسی چیزیں کسی جنایت کے ارتکاب پر ہوتی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذمے کوئی دم جنایت لازم نہیں آیا کیونکہ حیض کا آ جانا عذر سماوی تھا۔ اس میں ان کے اختیار کو کوئی دخل نہ تھا جبکہ ہدی وغیرہ کسی فعل اختیاری کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ④ اس حدیث سے متعلقہ دیگر احکام کتاب الحج میں بیان ہوں گے۔ بإذن الله.

(١٧) بَابٌ: ﴿مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ [الحج: ٥]

باب: 17- مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ کا بیان

وضاحت: عنوان میں درج الفاظ سورۂ حج آیت: 5 کا حصہ ہیں۔ مُخَلَّقَه سے مراد وہ بچہ ہے جو تامّ الخلقت ہو اور اس کی شکل و صورت نمایاں ہو۔ ایسے بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے اور تکمیل کے بعد اس کی ولادت ہو جاتی ہے۔ غیر مخلقہ سے مراد وہ بچہ ہے جو ناقص الخلقت ہو اور اس کی شکل و صورت واضح نہ ہو۔ اس میں روح نہیں پھونکی جاتی بلکہ وہ قبل از ولادت ہی ساقط ہو جاتا ہے۔ آئندہ حدیث میں ان کی کیفیات و مدارج کا بیان ہوگا۔

٣١٨ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ وَكَّلَ بِالرَّحِمِ مَلَكًا يَقُولُ: يَا رَبِّ نُطْفَةٌ، يَا رَبِّ عَلَقَةٌ، يَا رَبِّ مُضْغَةٌ، فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَقْضِيَ خَلْقَهُ قَالَ: أَذَكَرٌ أَمْ أُنْثَى؟ شَقِيٌّ أَمْ سَعِيدٌ؟ فَمَا الرِّزْقُ وَالْأَجَلُ؟ فَيُكْتَبُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ». [انظر: ٣٣٣٣، ٦٥٩٥]

[318] حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ رحم مادر پر ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو عرض کرتا ہے: اے پروردگار! رحم مادر میں یہ نطفہ ہے۔ اے رب! یہ علقہ، یعنی خون بستہ ہو گیا۔ اے رب! اب یہ گوشت کا لوتھڑا بن گیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اس کی خلقت کو مکمل کر دینا چاہتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: مذکر یا مؤنث؟ بدبخت یا نیک بخت؟ پھر اس کا رزق اور عمر کس قدر ہے؟ یہ تمام باتیں (فرشتے کی طرف سے) رحم مادر ہی میں لکھ دی جاتی ہیں۔''

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر ؒ کہتے ہیں کہ امام بخاری آیت کریمہ کی حدیث شریف سے تفسیر کرنا چاہتے ہیں لیکن تفسیر کا مقام تو کتاب التفسیر ہے، کتاب الحیض سے اس کا کیا تعلق ہے؟ تعلق بایں طور ہے کہ جب نطفہ رحم مادر میں جائے گا تو اس کی دو صورتیں ہوں گی: ٭ اس میں تخلیقی کیفیت پیدا کی جائے گی اور یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب رحم میں حیض کی صلاحیت ہو، حیض کے بغیر نطفے میں تخلیقی تبدیلی لانا اللہ کے قانون کے خلاف ہے۔ ٭ اس میں تخلیقی کیفیت پیدا نہ کی جائے، اس طرح کے نطفے کو رحم باہر پھینک دیتا ہے۔ اس طرح حدیث کا کتاب الحیض سے ربط تو ہو گیا لیکن امام بخاری ؒ کا اس عنوان بندی سے کیا مقصد ہے؟ اس کے متعلق شارح بخاری ابن بطال فرماتے ہیں: اس عنوان سے امام بخاری ایک اختلافی مسئلے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حالت حمل میں عورت کو خون آ جائے تو اس خون کو حیض قرار دیا جائے گا یا اسے استحاضہ شمار کریں گے؟ امام بخاری کے نزدیک ایام حمل میں آنے والا خون حیض نہیں ہو سکتا۔ اہل کوفہ اور اوزاعی نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔[1] ② ایام حمل میں آنے والا خون، حیض نہیں ہوتا کیونکہ استقرار حمل کے بعد رحم کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور خون حیض سے اللہ تعالیٰ بچے کی خوراک کا کام لیتا ہے اور جو نلکی بچے کی ناف سے لگی رہتی ہے وہ خون کو صاف بھی کرتی ہے اور اس کی وساطت سے صاف شدہ خون بچے کے لیے غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ حمل قرار پانے کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: ٭ اس بچے کا مُخَلَّقَہ، یعنی تام الخلقت ہونا مقدر ہوگا۔ ٭ پورا ہونا منظور نہ ہوگا۔ دوسری صورت میں سقط بن کر گر جائے گا۔ گرنے سے پہلے رحم کا منہ بند ہے۔ وقت آنے پر رحم کا منہ کھول کر اسے گرا دیا جائے گا، اس لیے استقرار حمل کی صورت میں جو خون آ رہا ہے وہ حیض کا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ رحم سے برآمد نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کا منہ بند ہے، نیز اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ رحم کی صفائی معلوم کرنے کے لیے حیض کی آمد کو علامت قرار دیا گیا ہے۔ اگر بحالت حمل بھی حیض آ سکتا ہے تو استبرائے رحم کا فیصلہ کیسے ہوگا؟[2] ③ اگر نطفے سے اولاد کا ہونا اللہ کے ہاں مقدر ہوتا ہے تو خون حیض رحم میں بند ہو جاتا ہے اور وہ بچے کی پرورش پر صرف ہوتا ہے۔ اور اگر اللہ کے ہاں اس نطفے سے اولاد کا ہونا مقدر نہیں ہوتا تو وہ خون کے ہمراہ رحم سے خارج ہو جاتا ہے۔ اولاد ہونے کی صورت

1 شرح ابن بطال: 444/1. 2 فتح الباري: 543/1.

میں اللہ کی طرف سے مختلف فرشتے متعین ہوتے ہیں جو مختلف اطوار میں بچے کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں۔ مختلف مراحل حسب ذیل ہیں: ٭ پہلے مرحلے میں نطفہ' امشاج اپنی حالت میں چالیس دن تک رہتا ہے۔ ٭ دوسرے مرحلے میں علقہ بن جاتا ہے اور چالیس دن اس خون بستہ پر گزرتے ہیں۔ ٭ تیسرے مرحلے میں اسے مضغہ کی شکل دی جاتی ہے اور چالیس دن اس گوشت کے لوتھڑے پر گزرتے ہیں۔ ٭ چوتھے مرحلے میں صورت ولد تیار ہوتی ہے اور اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چار ماہ بعد اس میں روح پڑتی ہے اور یہ تمام امور فرشتے کی نگرانی میں انجام پاتے ہیں۔ ان مراحل کا ذکر احادیث میں ہے۔[1] ④ امام بخاری رحمہ اللہ نے صراحت کے ساتھ حاملہ کے حیض آنے یا نہ آنے کو ثابت نہیں فرمایا بلکہ ان کے انداز اور اسلوب سے اشارہ ملتا ہے کہ حاملہ کو حیض نہیں آتا کیونکہ رحم میں بچے کا محفوظ ہونا خون حیض کے خروج کے لیے ایک رکاوٹ ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث مذکور سے عدم اتیان حیض کا استدلال محل نظر ہے کیونکہ حدیث سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حاملہ کے رحم سے برآمد ہونے والی چیز ناتمام بچہ ہے جس کی شکل و صورت نہیں ہوتی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حاملہ کے رحم سے اگر بحالت حمل خون نکلے تو وہ حیض نہیں ہوگا۔ جن حضرات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نکلنے والا خون بچے کی غذا کا فضلہ یا اس کے جسم سے ٹپکا ہے یا کسی بیماری کی وجہ سے وہ خون نکلا ہے تو اس دعوے کے ثبوت کے لیے دلیل درکار ہے اور جو اخبار و آثار اس سلسلے میں مروی ہیں وہ ثبوت دعویٰ کے لیے ناکافی ہیں، بلکہ یہ خون بھی دم حیض کی صفات کا حامل ہے اور اس وقت اس کے آنے کا امکان بھی ہوتا ہے، لہٰذا اسے دم حیض کا حکم دینا چاہیے اور جو اس کے خلاف دعویٰ کرتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے موقف کو دلیل سے ثابت کرے۔[2] ⑤ آخر میں ہم سرزمین حجاز کے مشہور عالم دین شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ کی تحقیق لکھتے ہیں جو انھوں نے اپنے ایک رسالے میں پیش کی ہے، فرماتے ہیں: ''عام طور پر جب عورت کو استقرار حمل ہوتا ہے تو خون حیض رک جاتا ہے، چنانچہ امام احمد فرماتے ہیں کہ عورتیں خون حیض کے رک جانے سے حمل کی پہچان کرتی ہیں۔ حاملہ کے خون دیکھنے کی دو صورتیں ہیں: ٭ اگر ولادت سے دو، تین دن پہلے خون دیکھیں اور اس کے ساتھ دردزہ بھی ہو تو وہ نفاس کا خون ہوگا۔ ٭ اگر ولادت سے بہت عرصہ پہلے خون دیکھیں یا چند دن پہلے خون آئے اور اس کے ساتھ دردزہ نہ ہو تو وہ نفاس نہیں ہوگا۔ نفاس نہ ہونے کی صورت میں اسے خون حیض قرار دیا جائے گا یا استحاضہ؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اسے خون حیض شمار کیا جائے گا بشرطیکہ حیض کے معتاد طریقے کے مطابق ہو کیونکہ اصل یہی ہے کہ عورت کو جو خون آتا ہے وہ حیض کا ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی ایسا سبب حائل ہو جائے کہ اس کی موجودگی میں اسے حیض نہ قرار دیا جا سکتا ہو۔ کتاب وسنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی رو سے ہم فیصلہ کریں کہ حاملہ کو حیض نہیں آ سکتا۔ امام شافعی اور امام مالک کا یہی موقف ہے اور حافظ ابن تیمیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام بیہقی نے امام احمد سے یہی بات نقل کی ہے بلکہ انھوں نے فرمایا کہ امام احمد کا پہلے عدم حیض کا موقف تھا جس سے انھوں نے رجوع کر لیا تھا۔ اس بنا پر حاملہ کے حیض کے وہی احکام ہوں گے جو غیر حاملہ کے حیض کے لیے ہوتے ہیں، البتہ دو مسائل میں اس کا حکم الگ ہوگا۔ ٭ غیر حاملہ کو ایام حیض میں طلاق دینا درست نہیں کیونکہ اس حالت میں طلاق دینے سے ارشاد باری کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہے کہ تم عورتوں کو طلاق

---

[1] صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث :3208، والقدر، حديث :6594. [2] فتح الباري : 543/1.

دینا چاہو تو طلاق عدت کے دنوں میں دو۔[1] لیکن حاملہ عورت کو بحالت حیض طلاق دینے سے یہ مخالفت لازم نہیں آتی کیونکہ دوران حمل میں طلاق دینا اس سے عدت کا آغاز ہوسکتا ہے کیونکہ اس کی عدت وضع حمل ہے جو ابھی نہیں ہوگا، اس لیے حاملہ کو دوران حیض میں طلاق دینا حرام نہیں جبکہ غیر حاملہ کو دوران حیض میں طلاق دینا صحیح نہیں۔ ✱ حاملہ عورت کو اگر حیض آجائے تو اس سے عدت متاثر نہیں ہوگی اور نہ حیض سے اس کی عدت ہی شمار ہوگی جبکہ غیر حاملہ کی عدت حیض ہی سے شمار ہوتی ہے کیونکہ حاملہ کی عدت تو وضع حمل ہے، خواہ اسے حیض آئے یا نہ آئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ ''حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل کو جنم دے دیں۔''[2] بہرحال اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ دوران حمل میں اگر خون آتا ہے تو عورت کو نماز روزہ ترک نہیں کرنا چاہیے اور نہ خاوند کو مقاربت کرنے ہی کی کوئی ممانعت ہے۔ واللہ أعلم. اس حدیث کے متعلق دیگر مباحث کتاب القدر میں بیان ہوں گے۔ باذن اللہ.

(١٨) بَابٌ: كَيْفَ تُهِلُّ الْحَائِضُ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ

باب: 18- حائضہ عورت حج اور عمرے کا احرام کس طرح باندھے؟

٣١٩ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِعُمْرَةٍ، وَمِنَّا مَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ، فَقَدِمْنَا مَكَّةَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ أَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَلَمْ يُهْدِ فَلْيُحْلِلْ، وَمَنْ أَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَأَهْدٰى فَلَا يَحِلَّ حَتّٰى يَحِلَّ بِنَحْرِ هَدْيِهِ، وَمَنْ أَهَلَّ بِحَجٍّ فَلْيُتِمَّ حَجَّهُ»، قَالَتْ: فَحِضْتُ فَلَمْ أَزَلْ حَائِضًا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَلَمْ أُهْلِلْ إِلَّا بِعُمْرَةٍ، فَأَمَرَنِي النَّبِيُّ ﷺ أَنْ أَنْقُضَ رَأْسِي وَأَمْتَشِطَ وَأُهِلَّ بِحَجٍّ، وَأَتْرُكَ الْعُمْرَةَ، فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ حَتّٰى قَضَيْتُ حَجَّتِي، فَبَعَثَ مَعِيَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ أَبِي بَكْرٍ، وَأَمَرَنِي

[319] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم نبی ﷺ کے ہمراہ حجۃ الوداع کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم میں سے کسی نے عمرے کا احرام باندھا اور کسی نے حج کا۔ جب ہم مکہ مکرمہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور وہ قربانی کا جانور ساتھ نہیں لایا تو وہ (عمرہ کرنے کے بعد) حلال ہو جائے۔ اور جس نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی کا جانور ساتھ لایا ہے تو وہ ہدی کی قربانی سے پہلے حلال نہیں ہوگا۔ اور جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہے اسے اپنے حج کو پورا کرنا ہوگا۔'' حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: مجھے حیض آ گیا اور یوم عرفہ تک اسی حالت میں رہی۔ چونکہ میں نے صرف عمرے کا احرام باندھا تھا، اس لیے نبی ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنا سر کھول کر کنگھی کرلوں، پھر حج کا احرام باندھ لوں اور عمرے کو ترک کردوں۔ میں نے ایسا ہی کیا

1 الطلاق 65:1. 2 الطلاق 65:4.

أَنْ أَعْتَمِرَ مَكَانَ عُمْرَتِي مِنَ التَّنْعِيمِ. [راجع: ٢٩٤]

تا آنکہ میں نے اپنا حج پورا کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے میرے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو روانہ کیا اور مجھ سے فرمایا کہ میں اپنے ترک کردہ عمرے کے بدلے تنعیم سے دوسرا عمرہ کروں۔

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس عنوان کا مقصد بایں الفاظ متعین فرمایا ہے کہ آیا حائضہ حج یا عمرے کا احرام باندھ سکتی ہے یا نہیں؟ اور عنوان میں لفظ کیف سے کوئی خاص کیفیت مراد نہیں بلکہ موجودہ صورتحال کو استفہام کے انداز میں بیان کرنے کے لیے کیف کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس تقریر سے ان لوگوں کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ حدیث اور عنوان میں مطابقت نہیں کیونکہ حدیث میں کسی خاص کیفیت کا تذکرہ نہیں ہے جس سے عنوان ثابت ہوتا ہو۔[1] ② اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت سے ثابت کیا ہے کہ حائضہ عورت دوران حیض میں احرام باندھ سکتی ہے لیکن لغوی لحاظ سے لفظ کَیْفَ حالت سے متعلق سوال کرنے کے لیے آتا ہے، اس لیے عنوان کا مطلب یہ ہے کہ حائضہ کس حالت و کیفیت کے ساتھ احرام باندھے؟ یعنی غسل کر کے احرام باندھے یا غسل کے بغیر ہی احرام باندھ لے؟ روایت سے ثابت ہوا کہ حائضہ غسل کر کے احرام باندھے جیسا کہ ایک روایت میں اس کی صراحت ہے۔[2] ویسے بھی سر کھولنا اور کنگھی کرنا غسل سے کنایہ ہیں۔ اس عنوان کی ضرورت اس لیے ہے کہ حیض کی حالت میں غسل کرنے سے طہارت تو حاصل نہیں ہوگی، اس لیے حائضہ کا غسل کرنا چہ معنی وارد؟ روایت سے پتہ چلا کہ حائضہ کا غسل کرنا فائدے سے خالی نہیں کیونکہ غسل کرنا احرام کی سنت ہے، کم از کم وہ تو حاصل ہو جائے گی، اس لیے حائضہ کو چاہیے کہ حالت حیض میں اس سنت کو ترک نہ کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احرام کے وقت غسل کرنا نظافت و صفائی کے لیے ہے، خاص طور پر حائضہ عورت کے لیے بطور طہارت نہیں کیونکہ خون حیض کے انقطاع سے پہلے طہارت کا حصول ممکن ہی نہیں، لہٰذا حائضہ کو چاہیے کہ وہ احرام سے پہلے غسل نظافت کرے۔

(١٩) بَابُ إِقْبَالِ الْمَحِيضِ وَإِدْبَارِهِ

باب: 19- حیض کی آمد اور بازگشت (ختم ہونے) کا بیان

وَكُنَّ نِسَاءٌ يَبْعَثْنَ إِلَى عَائِشَةَ بِالدُّرْجَةِ فِيهَا الْكُرْسُفُ، فِيهِ الصُّفْرَةُ، فَتَقُولُ: لَا تَعْجَلْنَ حَتَّى تَرَيْنَ الْقَصَّةَ الْبَيْضَاءَ، تُرِيدُ بِذٰلِكَ الطُّهْرَ مِنَ الْحَيْضَةِ. وَبَلَغَ ابْنَةَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ أَنَّ نِسَاءً يَدْعُونَ بِالْمَصَابِيحِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ، يَنْظُرْنَ

عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ڈبیہ میں روئی بھیجتیں جس میں زردی ہوتی تھی، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان سے فرماتیں: جلدی نہ کرو تا آنکہ چونے کی طرح سفیدی دیکھو۔ اس سے مراد حیض کی پاکی ہوتی تھی۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عورتیں درمیان رات چراغ

---

① فتح الباري: 543/1. ② صحيح مسلم، الحج، حديث: 2937 (1213).

إِلَى الطُّهْرِ فَقَالَتْ: مَا كَانَ النِّسَاءُ يَصْنَعْنَ هٰذَا وَعَابَتْ عَلَيْهِنَّ.

منگوا کر طہر دیکھتی ہیں تو انھوں نے فرمایا: پہلے عورتیں (صحابیات) ایسا نہ کرتی تھیں اور انھوں نے اسے معیوب خیال کیا۔

٣٢٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ، فَسَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: «ذٰلِكِ عِرْقٌ وَّلَيْسَتْ بِالْحَيْضَةِ، فَإِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْتَسِلِي وَصَلِّي».

[320] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو استحاضہ کا عارضہ تھا۔ انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ حیض نہیں بلکہ رگ کا خون ہے، لہٰذا جب حیض کی آمد ہو تو نماز ترک کر دو اور جب حیض ختم ہو جائے تو غسل کر کے نماز ادا کرو۔''

فوائد ومسائل: ① ابتدائی معلق روایت کو امام مالک ؒ نے اپنی موطأ (حدیث: 90) میں موصولاً بیان کیا ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امکان حیض کے وقت تیزی کے ساتھ خون کی آمد اقبال حیض کی علامت ہے۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے، البتہ ادبار (ختم ہونے) کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ داخل فرج میں رکھی ہوئی روئی اگر خشک نکل آئے تو یہ ادبار کی علامت ہے، لیکن بعض اوقات دوران حیض میں بھی وقفات کے وقت روئی خشک نکل آتی ہے، لہٰذا اسے ادبار کی علامت قرار نہیں دیا جا سکتا، جبکہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر روئی پر چونے جیسی سفید رطوبت لگی ہو تو یہ ادبار کی نشانی ہے۔ امام بخاری ؒ کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے اور اس کی تائید حضرت عائشہ ؓ کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ سفید رطوبت کے متعلق امام مالک فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے متعلق اپنی عورتوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں یہ امر معروف ہے، وہ اس سے طہر کی پہچان کرتی ہیں۔[1] ② حضرت زید بن ثابت ؓ کی حسنہ، عمرہ اور ام کلثوم نامی چند ایک لڑکیاں ہیں۔ احادیث کی روایت میں حضرت ام کلثوم کا نام ملتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس روایت میں حضرت زید بن ثابت کی گمنام بیٹی یہی ام کلثوم ہو۔ انھوں نے عورتوں کے کردار پر اس لیے اعتراض کیا کہ رات کے وقت خالص سفیدی کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ عین ممکن ہے کہ وہ جسے طہر خیال کریں وہ طہر نہ ہو اور نماز ایام حیض میں طہر سے پہلے ادا کر لی جائے۔[2] ③ عورتیں رات کے وقت چراغ طلب کرنے کا اہتمام اس لیے کرتی تھیں تاکہ انھیں اختتام حیض کا پتہ چل جائے، مبادا عشاء کی نماز قضا ہو جائے۔ جب ان کا یہ اہتمام ادائیگی نماز کے پیش نظر تھا تو حضرت زید بن ثابت ؓ کی صاحبزادی کو یہ بات کیوں ناگوار معلوم ہوئی؟ بعض حضرات نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان کے رات کے وقت چراغ جلانے کا اہتمام بلاوجہ تھا کیونکہ خون کی آمد تو ہاتھ کے چھونے سے معلوم ہو سکتی تھی، لیکن یہ جواب درست نہیں کیونکہ ہاتھ کے چھونے سے حیض کے خون اور رطوبت فرج کے درمیان تمیز نہیں ہو سکتی۔ دراصل شریعت نے حیض کے متعلق زیادہ سختی نہیں کی ہے کہ اسے رات کے وقت چراغ جلا کر دیکھنے کا اہتمام کیا جائے بلکہ

---

1 فتح الباري: 1/ 544. 2 فتح الباري: 1/ 545.

سوتے وقت دیکھ لیا جائے اگر منقطع ہو گیا ہو تو غسل کر کے نماز عشاء ادا کر لی جائے اور اگر سوتے وقت منقطع نہیں ہوا تو روئی رکھ کر سو جانا چاہیے۔ صبح اٹھ کر اگر روئی کو خون لگا دیکھے تو حیض جاری ہے، اس کے ذمے کچھ نہیں۔ اگر خون کا نشان وغیرہ نہیں ہے تو پھر غسل کر کے نمازِ فجر ادا کر لے۔ ④ احناف نے عورت کی عادت کو حیض کے اقبال و ادبار کا مدار ٹھہرایا ہے جبکہ شوافع کے ہاں الوان (رنگوں) کا اعتبار ہے۔ احناف کا کہنا ہے کہ الوان پر حیض کا مدار نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ صحت مند عورت جس کا مزاج معتدل ہو اور غذا اور آب و ہوا بھی معتدل ہو، تو تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ خون کی رنگت سرخ ہوتی ہے، اس کے برعکس اگر مزاج کی خرابی ہے، آب و ہوا معتدل نہیں اور گرم غذائیں استعمال کرتی ہے تو اس سے خون میں احتراقی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے خون سیاہ ہو جاتا ہے، اس لیے رنگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہاں، اگر کسی عورت کو عادت کے طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کے خون کی رنگت سیاہ یا سرخ ہوتی ہے تو الگ بات ہے۔ بہرحال حدیث سے عادات اور الوان دونوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے متعلق استحاضے کے باب میں بحث ہو چکی ہے۔ واللہ أعلم.

(٢٠) بَابٌ: لَا تَقْضِي الْحَائِضُ الصَّلَاةَ

باب: 20- حائضہ عورت کا نماز کی قضا ادا نہ کرنا

وَقَالَ جَابِرٌ وَّأَبُو سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: «تَدَعُ الصَّلَاةَ».

حضرت جابر اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے: ”حائضہ نماز چھوڑ دے گی۔“

٣٢١ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا هَمَّامٌ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ، قَالَ: حَدَّثَتْنِي مُعَاذَةُ أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ لِعَائِشَةَ: أَتَجْزِي إِحْدَانَا صَلَاتَهَا إِذَا طَهُرَتْ؟ فَقَالَتْ: أَحَرُورِيَّةٌ أَنْتِ؟ [قَدْ] كُنَّا نَحِيضُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَلَا يَأْمُرُنَا بِهِ، أَوْ قَالَتْ: فَلَا نَفْعَلُهُ.

[321] حضرت معاذہ بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا: جب ہم میں سے کوئی حیض سے پاک ہو تو کیا وہ فوت شدہ نمازوں کی قضا ادا کرے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا تو حروریہ (خارجی) ہے؟ ہمیں نبی ﷺ کے عہد مبارک میں حیض آتا تھا اور آپ ہمیں نماز کا حکم نہیں دیتے تھے یا فرمایا: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حائضہ کے لیے قضائے صلوات کے متعلق عدم وجوب پر اجماع نقل کیا ہے۔ صرف خوارج کے ایک گروہ کا موقف ہے کہ حائضہ کو فراغت کے بعد فوت شدہ نمازوں کی قضا دینا ضروری ہے۔ غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی لیے سائلہ کو حروریہ کہا۔ یہ ایک ایسے مقام کی طرف نسبت ہے جہاں خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اکٹھے ہوئے تھے اور علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ان کے بے شمار فرقے ہیں، البتہ یہ عقیدہ سب میں مشترک ہے کہ جو مسئلہ قرآن کریم کی نص سے ثابت ہے اسی پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان کی نظر میں احادیث کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس دور کے خوارج، یعنی منکرین حدیث کا بھی یہی نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک احادیث ”اسفار لھو الحدیث“ اور ”عجمی سازش“ ہے۔ چونکہ حائضہ سے فرضیت نماز کا ساقط ہونا صرف حدیث سے ثابت ہے، قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی ہدایت نہیں، اس لیے وہ حائضہ کے لیے فوت شدہ

نمازوں کی قضا ضروری قرار دیتے ہیں۔[1] ② روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کرنے والی ایک گمنام عورت ہے۔ دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود حضرت معاذہ بنت عبداللہ العدویہ ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوال کرنے پر اس نے عرض کیا کہ میں حروریہ نہیں ہوں بلکہ صرف مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حائضہ کے لیے عدم قضائے نماز کی دلیل تو پیش کر دی لیکن اس کی علت بیان نہیں فرمائی۔ علمائے امت نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ نماز کا وجوب بار بار اور زیادہ ہے، اتنی زیادہ نمازوں کی قضا میں کافی تنگی اور دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا جبکہ روزے میں ایسا نہیں ہے، وہ سال میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت جابر اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کی تعلیقات کا بالمعنیٰ ذکر کیا ہے کیونکہ حدیث جابر کے الفاظ یہ ہیں کہ حائضہ طواف نہیں کرے گی اور نہ نماز ہی پڑھے گی۔[4] اور حدیث ابوسعید خدری کے الفاظ یہ ہیں کہ عورت کو جب حیض آتا ہے تو وہ نماز نہیں پڑھتی اور نہ روزے ہی رکھتی ہے۔[5] یہاں ایک اشکال ہے کہ عنوان تو عدم قضا سے متعلق ہے لیکن تعلیقات سے عدم ایقاع ثابت ہوتا ہے، لہٰذا عنوان اور تعلیقات میں تقریب تام نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عنوان کے دو جز ہیں: ✱ حائضہ نماز چھوڑ دے۔ ✱ اسے بطور قضا نہ پڑھے۔ پہلے جز کے اثبات کے لیے حضرت جابر اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کی تعلیقات کو پیش کیا ہے کہ حائضہ نماز چھوڑ دے اور دوسرا جز کہ وہ طہارت کے بعد قضا بھی نہ کرے، اسے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت کیا ہے۔ علامہ اسماعیلی نے اس روایت کو بایں الفاظ نقل کیا ہے: ''ہم ان نمازوں کی قضا نہیں دیتی تھیں اور نہ ہمیں اس کے متعلق کہا ہی جاتا تھا۔'' گویا امام بخاری نے تعلیقات کو موصول حدیث کے لیے ایک مقدمے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔[6]

(٢١) بَابُ النَّوْمِ مَعَ الْحَائِضِ وَهِيَ فِي ثِيَابِهَا

باب: 21- حائضہ کے ساتھ سونا جبکہ وہ حیض کے کپڑوں میں ہو

٣٢٢ - حَدَّثَنَا سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ زَيْنَبَ ابْنَةِ أَبِي سَلَمَةَ حَدَّثَتْهُ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ قَالَتْ: حِضْتُ وَأَنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْخَمِيلَةِ فَانْسَلَلْتُ فَخَرَجْتُ مِنْهَا، فَأَخَذْتُ ثِيَابَ حِيْضَتِي فَلَبِسْتُهَا، فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَنُفِسْتِ»؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فَدَعَانِي فَأَدْخَلَنِي مَعَهُ فِي الْخَمِيلَةِ، قَالَتْ: وَحَدَّثَتْنِي أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

[322] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نبی ﷺ کے ساتھ چادر میں لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے حیض آ گیا۔ میں آہستہ سے اٹھی اور اس چادر سے نکل آئی۔ پھر میں نے اپنے حیض کے کپڑے لیے اور انھیں پہن لیا۔ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھیں حیض آ گیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ نے مجھے بلا لیا اور اپنے ساتھ چادر میں لے لیا۔ زینب نے کہا: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بھی بیان کیا کہ نبی ﷺ روزے کی حالت

---

① فتح الباري:546/1. ② صحيح مسلم، الحيض، حديث:763(335). ③ فتح الباري :547/1. ④ صحيح البخاري،التمني، حديث :7230. ⑤ صحيح البخاري، الحيض، حديث :304. ⑥ فتح الباري : 546/1.

كَانَ يُقَبِّلُهَا وَهُوَ صَائِمٌ، وَكُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ وَّاحِدٍ مِّنَ الْجَنَابَةِ. [راجع: ٢٩٨]

میں ہوتے تھے اور اسی حالت میں ان کا بوسہ لے لیتے تھے، نیز میں اور نبی ﷺ ایک ہی برتن میں غسل جنابت کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ "اور (اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ وہ گندا اور نقصان دہ (خون) ہوتا ہے، اس لیے حالت حیض میں اپنی عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔"[1] قرآن کریم کی اس ظاہر نص سے عورتوں سے بحالت حیض اعتزال (علیحدگی) اور عدم قرب کا حکم ہے، تو پھر اس حالت میں ان کے ساتھ لیٹنے کا جواز کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شرعی احکام کے اثبات کے لیے اکیلا قرآن کافی نہیں جب تک صاحب قرآن کے فرمودات کو اس کے ساتھ نہ ملایا جائے۔ صرف قرآن سے شرعی احکام معلوم کرنا ایک سنگین غلطی ہے۔ اس سلسلے میں صرف ظاہر نص قرآن پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اعتزال اور عدم قربت کا مفہوم کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے آیت کے مفہوم کو بایں الفاظ متعین فرمایا: "حائضہ عورت کو گھر میں رہنے دو اور جماع کے علاوہ تمھیں ہر چیز کی اجازت ہے۔"[2] مذکورہ حدیث ام سلمہ ؓ نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ حائضہ عورت کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، اس کے ساتھ لیٹنے، الغرض جماع کے علاوہ دیگر ہر قسم کے امور استمتاع کی اجازت ہے۔ اس کی مکمل وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

(٢٢) بَابُ مَنِ اتَّخَذَ ثِيَابَ الْحَيْضِ سِوَى ثِيَابِ الطُّهْرِ

باب: 22- عام کپڑوں کے علاوہ حالتِ حیض کے لیے الگ لباس بنانا

٣٢٣ - حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ يَحْيَى، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: بَيْنَا أَنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ مُضْطَجِعَةٌ فِي خَمِيلَةٍ حِضْتُ، فَانْسَلَلْتُ فَأَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِي فَقَالَ: «أَنُفِسْتِ؟» فَقُلْتُ: نَعَمْ، فَدَعَانِي فَاضْطَجَعْتُ مَعَهُ فِي الْخَمِيلَةِ. [راجع: ٢٩٨]

[323] حضرت ام سلمہ ؓ ہی سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: میں نبی ﷺ کے ہمراہ ایک چادر میں لیٹی ہوئی تھی کہ مجھے حیض آ گیا۔ میں چپکے سے نکل آئی اور حیض کا لباس پہن لیا۔ آپ نے فرمایا: "کیا تجھے حیض آ گیا ہے؟" میں نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ نے مجھے بلا لیا اور میں آپ کے ساتھ چادر میں لیٹ گئی۔

فائدہ: شارح بخاری علامہ ابن بطال لکھتے ہیں کہ اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ حدیث تو حضرت عائشہ ؓ سے مروی ایک

① البقرة 2:222. ② سنن أبي داود، النكاح، حديث: 2165.

حدیث کے معارض ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے: ''ہمارے پاس صرف ایک ہی لباس ہوتا تھا جس میں حیض کے دن بھی گزارتے تھے۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ ؓ نے ابتدائے اسلام کا حال بیان فرمایا ہے، جب مسلمانوں پر تنگی اور افلاس کے دن تھے، لیکن جب اس کے بعد فتوحات کا دور آیا اور اموال غنیمت کی بہتات ہوئی تو رہن سہن کے معاملات میں بھی وسعت آ گئی اور عورتوں نے بھی لباس میں تنوع اختیار کر لیا، زمانۂ طہر کا لباس الگ اور زمانۂ حیض میں استعمال کے لیے لباس دوسرا۔ حضرت ام سلمہ ؓ نے حدیث مذکور میں دوسرے خوش عیشی کے وقت کی خبر دی ہے۔[1] مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی عورت ایام حیض کے لیے کوئی مخصوص لباس رکھتی ہے تو یہ عمل قابل اعتراض نہیں اور نہ اسے اسراف میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کی شریعت میں ممانعت ہے۔ اسراف ممنوع یہ ہے کہ بے ضرورت یا محض فخر ومباہات کے لیے لباس میں تنوع اختیار کیا جائے۔ اگر گنجائش ہو تو ان دنوں الگ لباس کا اہتمام کرنا بہتر ہے۔ بعض حضرات نے ثیابِ حیض سے مراد روئی کی گدی اور لنگوٹ وغیرہ لیا ہے، یعنی قمیص، شلوار اور دوپٹہ تو عورت کا لباس ہے، اگر ایام حیض میں گدی اور لنگوٹ وغیرہ کا اضافہ کر لیا جائے تو قابل اعتراض نہیں، لیکن ہمارے نزدیک یہ محل نظر ہے کیونکہ ان پٹیوں، گدیوں اور لنگوٹ وغیرہ کو لباس کا درجہ دینا صحیح نہیں۔ اسے احتمال بعید کا نام دینا ہی مناسب ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم ابواب میں لکھتے ہیں: ''اس حدیث سے استدلال اس بات پر موقوف ہے کہ ثیاب حیض سے مراد ایسے کپڑے لیے جائیں جو روئی کی گدیوں کے علاوہ پہنے جاتے ہیں۔ روئی کی گدیاں اور پٹیوں کا استعمال تو ایام حیض میں معروف ہے اور احتمال ہے کہ یہی لباس مراد ہو۔'' ہمارے نزدیک احتمال ہی نہیں بلکہ حقیقت میں ایسا ہی ہے کہ حضرت ام سلمہ ؓ نے گدیوں اور لنگوٹ کے علاوہ کوئی دوسرا لباس پہنا تھا جو ایام حیض کے لیے مخصوص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لباس کو دیکھ کر فرمایا: ''کیا تجھے حیض آ گیا ہے؟'' یہ گدیاں اور لنگوٹ تو نظر نہیں آتے کہ انھیں دیکھ کر کوئی شخص حیض کا اندازہ لگا لے۔ واللہ أعلم.

(٢٣) بَابُ شُهُودِ الْحَائِضِ الْعِيدَيْنِ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ، وَيَعْتَزِلْنَ الْمُصَلَّى

باب: 23- حائضہ کا عیدین اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہونا بشرطیکہ وہ عیدگاہ سے الگ رہیں

٣٢٤ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ حَفْصَةَ، قَالَتْ: كُنَّا نَمْنَعُ عَوَاتِقَنَا أَنْ يَخْرُجْنَ فِي الْعِيدَيْنِ، فَقَدِمَتِ امْرَأَةٌ فَنَزَلَتْ قَصْرَ بَنِي خَلَفٍ، فَحَدَّثَتْ عَنْ

[324] حضرت حفصہ بنت سیرین سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ہم جوان لڑکیوں کو عیدین کے لیے باہر نکلنے سے منع کیا کرتی تھیں۔ ایک عورت آئی اور بنی خلف کے محل میں اتری۔ اس نے اپنی بہن کے واسطے سے یہ حدیث

1. شرح ابن بطال: 449/1.

أُخْتِهَا، وَكَانَ زَوْجُ أُخْتِهَا غَزَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ، وَكَانَتْ أُخْتِي مَعَهُ فِي سِتٍّ، قَالَتْ: كُنَّا نُدَاوِي الْكَلْمٰى وَنَقُومُ عَلَى الْمَرْضٰى، فَسَأَلَتْ أُخْتِي النَّبِيَّ ﷺ: أَعَلٰى إِحْدَانَا بَأْسٌ إِذَا لَمْ يَكُنْ لَّهَا جِلْبَابٌ أَنْ لَّا تَخْرُجَ؟ قَالَ: «لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا، وَلْتَشْهَدِ الْخَيْرَ، وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِينَ». فَلَمَّا قَدِمَتْ أُمُّ عَطِيَّةَ سَأَلْتُهَا: أَسَمِعْتِ النَّبِيَّ ﷺ؟ قَالَتْ: بِأَبِي نَعَمْ - وَكَانَتْ لَا تَذْكُرُهُ إِلَّا قَالَتْ: بِأَبِي - سَمِعْتُهُ يَقُولُ: «تَخْرُجُ الْعَوَاتِقُ وَذَوَاتُ الْخُدُورِ، أَوِ الْعَوَاتِقُ ذَوَاتُ الْخُدُورِ، وَالْحُيَّضُ، وَلْيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِينَ، وَيَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى». قَالَتْ حَفْصَةُ: فَقُلْتُ: آلْحُيَّضُ؟ فَقَالَتْ: أَلَيْسَ تَشْهَدُ عَرَفَةَ وَكَذَا وَكَذَا؟ [انظر: ٣٥١، ٩٧١، ٩٧٤، ٩٨٠، ٩٨١، ١٦٥٢]

سنائی اور اس کے بہنوئی نے نبی ﷺ کے ہمراہ بارہ غزوات میں شرکت کی تھی اور خود ان کی بہن بھی اپنے شوہر کے ہمراہ چھ غزوات میں شرکت کر چکی تھی۔ اس (بہن) نے بتایا کہ ہم زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں اور مریضوں کی تیمارداری بھی کرتی تھیں۔ میری بہن نے ایک مرتبہ نبی ﷺ سے دریافت کیا: اگر ہم میں سے کسی کے پاس بڑی چادر نہ ہو تو اس کے (نماز عید کے لیے) باہر نہ جانے میں کوئی حرج ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی ساتھی کو چاہیے کہ وہ اسے اپنی چادر کا کچھ حصہ پہنا دے تاکہ وہ مجالس خیر اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہو۔'' پھر جب ام عطیہ ؓ آئیں تو میں نے ان سے دریافت کیا: کیا آپ نے نبی ﷺ سے (ایسا) سنا ہے؟ انھوں نے فرمایا: میرے (ماں) باپ آپ پر فدا ہوں...... ام عطیہ ؓ جب بھی آپ کا ذکر کرتیں ''میرے (ماں) باپ آپ پر فدا ہوں'' کے الفاظ ضرور کہتیں...... ہاں، میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''جوان لڑکیاں، پردہ نشین خواتین (یا فرمایا) پردہ نشین جوان لڑکیاں اور حیض والی عورتیں عیدگاہ جائیں اور مجالس خیر، نیز مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہوں، البتہ حائضہ عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں۔'' حفصہ بنت سیرین کہتی ہیں: میں نے حضرت ام عطیہ ؓ سے دریافت کیا: آیا حائضہ بھی شریک ہو سکتی ہے؟ انھوں نے فرمایا: (کیوں نہیں؟) کیا حائضہ عورتیں عرفہ میں اور فلاں فلاں جگہ نہیں جاتیں؟

فوائد و مسائل: ① مقصد یہ ہے کہ حائضہ عورتیں عیدین میں شرکت کر سکتی ہیں، نیز ان کا مجالس خیر و برکت اور اجتماعات دعوت وارشاد میں جانا بھی درست ہے، لیکن ایک بات کا خیال رکھیں کہ حیض والی عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں: * ہنگامی طور پر عیدگاہ کو مسجد کا حکم دیا ہے، اس لیے حائضہ عورت کو عیدگاہ میں جانے کی ممانعت ہے۔ * جب اس نے نماز نہیں پڑھنی تو نمازی عورتوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور ان کے پاس بیٹھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شارح بخاری ابن بطال لکھتے ہیں: اس حدیث سے حیض والی اور پاک عورتوں کے لیے عیدین اور دینی اجتماعات میں شرکت کا جواز معلوم ہوا، البتہ حیض والی

عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں۔ دعا میں شریک ہوں گی، خود دعا کریں یا آمین کہیں، بہر حال انھیں اس مقدس اجتماع کی خیر و برکات ضرور حاصل ہوں گی۔[1] عیدین میں عورتوں کے شریک ہونے کے متعلق تفصیلی بحث کتاب العیدین میں آئے گی۔
② یہ روایت بظاہر ایک مجہول عورت کے واسطے سے منقول ہے، اس اعتبار سے صحیح بخاری میں اس روایت کا آنا صحیح نہیں لیکن جب حضرت حفصہ بنت سیرین نے حضرت ام عطیہ ؓ کی آمد پر تمام باتیں براہ راست معلوم کر لیں تو درمیان سے گمنام عورت کا واسطہ ختم ہو گیا، اب اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مجہولہ عورت حضرت ام عطیہ ؓ کی ہمشیرہ تھیں۔ واللہ أعلم۔ اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل کا استنباط ہوتا ہے: * حائضہ بحالت حیض اللہ کا ذکر کر سکتی ہے اور مجالس خیر میں بھی شرکت کر سکتی ہے۔ * کسی کار خیر کے لیے باہر جانے کی ضرورت ہو تو دوسروں سے حسب ضرورت کپڑے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ * مسلمان عورتوں کو بڑی چادر کے بغیر گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں۔ موجودہ دور میں بڑی چادر کا قائم مقام برقع ہے بشرطیکہ اس سے ستر کا فائدہ ہو اور اظہار زینت کے لیے نہ ہو۔ دو عورتیں ایک چادر میں بھی نکل سکتی ہیں۔ * عورتیں بوقت ضرورت زخمیوں کی مرہم پٹی کر سکتی ہیں اگرچہ وہ غیر محرم ہوں، نیز عورتیں بیمار پرسی بھی کر سکتی ہیں۔

(٢٤) بَابٌ: إِذَا حَاضَتْ فِي شَهْرٍ ثَلَاثَ حِيَضٍ

وَمَا يُصَدَّقُ النِّسَاءُ فِي الْحَيْضِ وَالْحَمْلِ، وَفِيمَا يُمْكِنُ مِنَ الْحَيْضِ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِىٓ أَرْحَامِهِنَّ﴾ [البقرة: ٢٢٨] وَيُذْكَرُ عَنْ عَلِيٍّ وَشُرَيْحٍ: إِنْ جَاءَتْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ بِطَانَةِ أَهْلِهَا مِمَّنْ يُرْضَى دِينُهُ، أَنَّهَا حَاضَتْ فِي شَهْرٍ ثَلَاثًا صُدِّقَتْ. وَقَالَ عَطَاءٌ: أَقْرَاؤُهَا مَا كَانَتْ، وَبِهِ قَالَ إِبْرَاهِيمُ. وَقَالَ عَطَاءٌ: اَلْحَيْضُ يَوْمٌ إِلَى خَمْسَ عَشْرَةَ. وَقَالَ مُعْتَمِرٌ عَنْ أَبِيهِ: سَأَلْتُ ابْنَ سِيرِينَ عَنِ الْمَرْأَةِ تَرَى الدَّمَ بَعْدَ قُرْئِهَا بِخَمْسَةِ أَيَّامٍ، قَالَ: اَلنِّسَاءُ أَعْلَمُ بِذٰلِكَ.

باب: 24- اگر کسی عورت کو ایک ہی مہینے میں تین بار حیض آ جائے

جب حیض آنے کا امکان ہو تو حیض اور حمل کے متعلق عورتوں کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان عورتوں کے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے، وہ اسے چھپائیں۔'' حضرت علی ؓ اور قاضی شریح سے منقول ہے: اگر عورت کے گھرانے کا کوئی دیندار فرد گواہی دے کہ اس عورت کو ایک مہینے میں تین مرتبہ حیض آیا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔ حضرت عطاء نے کہا: عورت کے حیض کے دن اتنے ہی ہوں گے جتنے پہلے ہوتے تھے۔ ابراہیم نخعی نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت عطاء نے یہ بھی کہا: حیض ایک دن سے پندرہ دن تک ہو سکتا ہے۔ حضرت معتمر بن سلیمان اپنے باپ (سلیمان) سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے ابن

[1] شرح ابن بطال: 450/1.

سیرین سے ایک ایسی عورت کے متعلق دریافت کیا جو اپنی عادت کے مطابق حیض آ جانے کے بعد پانچ دن تک خون دیکھتی ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: عورتیں اپنے معاملات کے متعلق زیادہ علم رکھتی ہیں۔

۳۲۵ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَبِي رَجَاءٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ قَالَ: سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ عُرْوَةَ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ أَبِي حُبَيْشٍ سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ قَالَتْ: إِنِّي أُسْتَحَاضُ فَلَا أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ؟ فَقَالَ: «لَا، إِنَّ ذٰلِكِ عِرْقٌ، وَلٰكِنْ دَعِي الصَّلَاةَ قَدْرَ الْأَيَّامِ الَّتِي كُنْتِ تَحِيضِينَ فِيهَا، ثُمَّ اغْتَسِلِي وَصَلِّي». [راجع: ٣٠٦]

[325] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ نے نبی ﷺ سے پوچھا: مجھے استحاضے کا خون آتا ہے اور میں مدتوں پاک نہیں ہو سکتی، تو کیا میں نماز چھوڑ دیا کروں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں، یہ تو ایک رگ کا خون ہے۔ ہاں، اتنے دن نماز چھوڑ دیا کرو جن میں اس (بیماری) سے قبل تمھیں حیض آیا کرتا تھا۔ اس کے بعد غسل کر کے نماز پڑھا کرو۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورت دعویٰ کرے کہ اسے ایک ماہ میں تین حیض آ گئے ہیں تو کیا اس کی بات کو تسلیم کیا جائے گا یا نہیں؟ صورت مسئلہ یوں ہو سکتی ہے کہ کسی عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی، وہ ایک ماہ کے بعد رجوع کرنا چاہتا ہے لیکن عورت کا یہ دعویٰ ہے کہ اسے ایک ماہ میں تین حیض آ چکے ہیں، یعنی خاوند کا حق رجوع ختم ہو چکا ہے کیونکہ اس کی عدت تین حیض آنے تک تھی، اب وہ ختم ہو چکی ہے۔ امام بخاری ؒ کا موقف صراحت کے ساتھ نہیں، البتہ اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ حیض اور حمل کے معاملات میں عورت کی بات کا اعتبار کیا جائے گا لیکن اس سے قسم لی جائے گی۔ امام بخاری ؒ نے ایک اور شرط بھی بیان کی ہے کہ اگر تین حیض کا دعویٰ ایسی مدت میں ہے کہ اس مدت میں تین حیض آ سکتے ہیں تو صحیح ہے، اگر امکانی مدت سے کم میں دعویٰ کرتی ہے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا۔ امام بخاری ؒ نے دلیل کے طور پر آیت کریمہ کو پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ چھپائیں۔ اگر حیض یا حمل ہے تو اسے ظاہر کر دیں کیونکہ حیض یا حمل تک خاوند کو رجوع کرنے کا حق ہے۔ استدلال بایں طور ہے کہ عورت کو رحمی حالت کے اظہار کی تاکید کی جا رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں عورت کا بیان ہی معتبر ہوگا۔ یہ بھی واضح رہے کہ بیان کے معتبر ہونے کے معنی بیان حلفی کے معتبر ہونے کے ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ایک ماہ میں تین حیض آنے کے متعلق بھی اس کا بیان قسم لے کر معتبر مانا جائے گا، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم ابواب میں لکھتے ہیں: اگر عورت یہ دعویٰ کرے کہ ایک ماہ میں اسے تین حیض آ چکے ہیں تو اس کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ ایسا ممکن ہے۔ قرآنی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی بات معتبر ہوگی۔ اس باب میں بیان کردہ جملہ تعلیقات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حیض کی مدت محدود و مقرر نہیں ہے، اس لیے عورت ہی

کی بات پر مدار ہے بشرطیکہ حد امکان سے باہر نہ ہو۔ ② امام بخاری ؒ نے اگرچہ واضح طور پر یہ نہیں کہا کہ ایک ماہ میں تین حیض آ جانے کا دعویٰ کرنے والی عورت کی بات کو تسلیم کیا جائے گا اور وہ عدت سے خارج ہو جائے گی لیکن ان کے پیش کردہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جواز و تصدیق کے قائل ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے قاضی شریح تابعی کا ایک فیصلہ اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل بایں طور ہے کہ ایک دن قاضی شریح کے سامنے ایک مقدمہ آیا جس میں عورت کو طلاق پر ایک ماہ گزر چکا تھا، خاوند رجوع کرنا چاہتا تھا لیکن عورت کا دعویٰ تھا کہ مجھے ایک ہی ماہ میں تین حیض آ چکے ہیں، لہٰذا میری عدت ختم ہو چکی ہے۔ حضرت شریح نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے گھر کے راز داں دیندار اقرباء میں سے ایسے گواہ لاؤ جو گواہی دیں کہ ہم نے اسے ایام حیض میں ترک صوم و صلاۃ کے بعد صوم و صلاۃ ادا کرتے دیکھا ہے تو عدالت تیرے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہوئے فیصلہ تیرے حق میں کر دے گی۔ حضرت شریح نے یہ فیصلہ حضرت علی ؓ کی موجودگی میں کیا، انھوں نے اس فیصلے کی تحسین فرمائی۔[1] ویسے عورت کو ایک ماہ میں تین بار حیض نہیں آتا۔ تندرست عورت کو ہر ماہ صرف چند ایام کے لیے ایک ہی بار حیض آتا ہے لیکن اگر کبھی شاذ و نادر ایسا ہو جائے اور عورت خود اقرار کرے کہ اسے ایک ہی مہینے میں تین بار حیض آیا ہے تو اس کا بیان قابل تسلیم ہے جس طرح استحاضے کے متعلق عورت ہی کے بیان پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ ③ حضرت عطاء بن ابی رباح نے فرمایا کہ اگر مطلقہ عورت ایک ماہ میں تین حیض گزر جانے کا دعویٰ کرتی ہے تو دیکھا جائے کہ طلاق سے قبل اس کی عادت کیا تھی۔[2] اگر اسے ایک ماہ میں تین مرتبہ حیض آنے کی عادت تھی تو اس کا دعویٰ تسلیم کیا جائے گا بصورت دیگر یہ سمجھا جائے گا کہ یہ اپنے شوہر سے پیچھا چھڑانے کا دعویٰ کر رہی ہے اور اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ اس بہانے خاوند کا حق رجوع باطل کر رہی ہے۔ ④ امام بخاری ؒ کے نزدیک حیض و حمل کے متعلق عورتوں کا بیان قابل اعتبار ہے، اس لیے انھوں نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں ہے کہ جن دنوں میں تجھے حیض آتا ہے اتنے دن نماز چھوڑ دے، پھر غسل کر کے نماز شروع کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس معاملے میں عورت کی بات اور رائے کا اعتبار ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے معاملہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش کے سپرد کر دیا کہ ان دنوں کے اندازے پر تم نماز چھوڑ دو جن میں تمھیں حیض آتا ہے، نیز رسول اللہ ﷺ نے ان کے بیان پر ہی مسائل متعلقہ تعلیم فرمائے۔ واللہ أعلم۔

نوٹ: عطا ؒ کا دوسرا اثر کہ مدت حیض ایک دن سے پندرہ دن تک ہے، کو امام داری نے سنن الدارمی، (حدیث: 833) میں اور ابن سیرین ؒ کے اثر کو (حدیث 795) میں موصولاً بیان کیا ہے۔

(٢٥) بَابُ الصُّفْرَةِ وَالْكُدْرَةِ فِي غَيْرِ أَيَّامِ الْحَيْضِ

باب: 25- ایام حیض کے علاوہ زرد اور خاکستری رطوبت کا آنا

٣٢٦ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا

[326] حضرت ام عطیہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے

1 سنن الدارمي، حديث: 855. 2 المصنف لعبدالرزاق: 311/6.

إِسْمَاعِيلُ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ، قَالَتْ: كُنَّا لَا نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ شَيْئًا.

فرمایا: ہم زرد اور خاکستری رنگ کی رطوبت کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔

فوائد و مسائل: ① اس سے قبل ایک حدیث گزر چکی ہے کہ عورتیں کرسف، یعنی روئی کو ڈبیہ میں بند کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بغرض تحقیق روانہ کرتیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتیں کہ اس معاملے میں جلدی سے کام نہ لیا جائے، جب تک کرسف بالکل سفید برآمد نہ ہو اس وقت تک حالت حیض برقرار ہے، یعنی ان کے نزدیک ہر رنگ کی رطوبت حیض میں داخل ہے، خواہ زرد رنگ کی ہو یا خاکستری رنگ کی، لیکن حدیث ام عطیہ میں ہے کہ ہم زرد اور خاکستری رنگ کی رطوبت کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان دونوں احادیث میں تطبیق کی یہ صورت پیدا فرمائی کہ انھوں نے عنوان میں ایک قید کا اضافہ کیا، یعنی ایام حیض کے علاوہ اگر زرد یا خاکستری رنگ کی رطوبت آئے تو اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے جیسا کہ حدیث ام عطیہ رضی اللہ عنہا میں ہے اور اگر ایام حیض میں اس طرح کی رطوبت برآمد ہو تو اسے حیض شمار کیا جائے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی روایت بایں الفاظ بھی مروی ہے کہ طہر کے بعد ہم زرد اور خاکستری رنگ کی رطوبت کو کچھ اہمیت نہ دیتی تھیں۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بھی طہر سے پہلے ایام حیض کے دوران میں ان رطوبتوں کو حیض ہی شمار کرتی تھیں۔ گویا امام بخاری نے عنوان میں جو الفاظ بڑھائے ہیں اس کی بنیاد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے یا پھر حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ہی کی روایت میں یہ قید موجود ہے۔

(٢٦) بَابُ عِرْقِ الْاِسْتِحَاضَةِ

باب: 26- استحاضے کی رگ کا بیان

٣٢٧ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: حَدَّثَنَا مَعْنٌ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ، وَعَنْ عَمْرَةَ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ اسْتُحِيضَتْ سَبْعَ سِنِينَ فَسَأَلَتْ رَسُولَ اللهِ ﷺ، عَنْ ذٰلِكَ؟ فَأَمَرَهَا أَنْ تَغْتَسِلَ، فَقَالَ: «هٰذَا عِرْقٌ»، فَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلَاةٍ.

[327] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سات سال تک مستحاضہ رہیں۔ انھوں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے انہیں غسل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''یہ رگ (کا خون) ہے۔'' چنانچہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہر نماز کے لیے غسل کرتی تھیں۔

فوائد و مسائل: ① جحش کی تین صاحبزادیاں تھیں: حضرت ام المومنین زینب، حضرت ام حبیبہ زوجۂ عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت حمنہ رضی اللہ عنہن اور یہ تینوں استحاضے میں مبتلا تھیں۔ علماء نے ان عورتوں کی تعداد دس لکھی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک

[1] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 307.

میں مستحاضہ تھیں۔ سنن ابوداود میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے متعلق الفاظ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ختنہ (سالی) اور عبدالرحمٰن بن عوف کی بیوی تھیں۔ ختن کا لفظ زوجہ کے اقارب کے لیے، احماء خاوند کے رشتہ داروں کے لیے اور اصہار دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ② روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سات سال تک مرض استحاضہ میں مبتلا رہیں۔ اس سے ابن قاسم نے استدلال کیا ہے کہ اگر مستحاضہ، حیض کے دھوکے میں نمازیں ترک کر دے تو اس کے ذمے قضا نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اتنی بڑی مدت کی نمازیں لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ سات سال کی مدت کا ذکر تو ضرور ہوا ہے مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مسئلہ پوچھنے کے وقت سے پہلے یہ مدت گزر چکی تھی۔[1] صحابیات کے دینی لگاؤ اور عبادات کے اہتمام کے پیش نظر یہی اغلب ہے کہ انھیں استحاضے کا عارضہ لاحق ہوتے ہی مسئلے کی ضرورت پڑی اور اسی وقت دریافت کر لیا ہوگا، اس لیے ترک نماز اور اس کی قضا کو ادا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی ہوگی۔ ③ اس حدیث میں ہے کہ حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ہر نماز کے وقت غسل کیا کرتی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے مطلق طور پر غسل کا حکم دیا تھا، اس میں بار بار ہر نماز کے لیے غسل کرنے کے متعلق کوئی دلالت نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے کسی قرینے سے ہر نماز کے وقت غسل کا حکم سمجھ لیا ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے کوئی حکم نہیں دیا تھا مگر انھوں نے خود ہی ہر نماز کے لیے غسل کرنے کا التزام کر لیا۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے کہ متحیرہ کے علاوہ کسی مستحاضہ پر ہر نماز کے وقت غسل ضروری نہیں، البتہ وضو کرنا ہر نماز کے لیے ضروری ہے۔ ہاں سنن ابی داود میں سلیمان بن کثیر اور یحییٰ بن ابی کثیر (292-293) کی روایات میں ہر نماز کے لیے غسل کرنے کا حکم ہے، لیکن ان دونوں روایات کی صحت اور ضعف میں اختلاف ہے، تاہم بشرط صحت دونوں قسم کی روایات میں یہ تطبیق دی جا سکتی ہے کہ حکم غسل کو استحباب پر محمول کیا جائے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے حدیث ام حبیبہ کو حدیث فاطمہ بنت ابی حبیش سے منسوخ قرار دیا ہے جس میں صرف وضو کا حکم ہے، غسل کا نہیں، تاہم ہمارے نزدیک دونوں طرح کی احادیث میں تطبیق پیدا کرنا ہی بہتر ہے، یعنی ام حبیبہ کی حدیث میں غسل کے متعلق امر نبوی کو استحباب و ارشاد پر محمول کیا جائے۔ واللہ أعلم.[2]

(٢٧) بَابُ الْمَرْأَةِ تَحِيضُ بَعْدَ الْإِفَاضَةِ

باب: 27- طواف افاضہ کے بعد عورت کو حیض آنا

٣٢٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا

[328] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی ﷺ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا کو حیض آ گیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شاید وہ ہمیں (مدینہ) جانے سے باز رکھے

1. فتح الباري: 553/1. ② فتح الباري: 554/1.

قَالَتْ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ قَدْ حَاضَتْ؟ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَعَلَّهَا تَحْبِسُنَا، أَلَمْ تَكُنْ طَافَتْ مَعَكُنَّ؟» فَقَالُوا: بَلَى، قَالَ: «فَاخْرُجِي». [راجع: ٢٩٤]

گی۔ کیا اس نے تمھارے ساتھ طواف (زیارت) نہیں کر لیا تھا؟'' انھوں نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''پھر وہ رخت سفر باندھے۔''

٣٢٩ - حَدَّثَنَا مُعَلَّى بْنُ أَسَدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ طَاوُسٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: رُخِّصَ لِلْحَائِضِ أَنْ تَنْفِرَ إِذَا حَاضَتْ. [انظر: ١٧٥٥، ١٧٦٠]

[329] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: اگر حائضہ کو عذر حیض شروع ہو جائے تو وہ (طواف وداع کے بغیر) مکے سے روانہ ہو سکتی ہے۔

٣٣٠ - وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُولُ فِي أَوَّلِ أَمْرِهِ: إِنَّهَا لَا تَنْفِرُ، ثُمَّ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: تَنْفِرُ، إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ لَهُنَّ. [انظر: ١٧٦١]

[330] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پہلے پہلے اس حالت میں مکے سے واپس ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ (حضرت طاؤس کہتے ہیں کہ) پھر میں نے انھیں یہ فرماتے سنا کہ وہ طواف وداع کے بغیر واپس جا سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

فوائد و مسائل: ① طواف کی تین اقسام ہیں: * طواف قدوم: اسے طواف تحیہ بھی کہا جاتا ہے۔ بیت اللہ میں داخل ہوتے ہی پہلے یہ طواف کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت حالت حیض میں مکہ پہنچے تو یہ طواف ساقط ہو جاتا ہے۔ * طواف افاضہ: اسے طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حج کا رکن ہے۔ یہ طواف ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو کیا جاتا ہے۔ یہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتا۔ اگر عورت کو حیض آ جائے تو وہ اس کے ختم ہونے کا انتظار کرے اور طواف افاضہ کر کے وطن واپس آئے۔ * طواف وداع: اسے طواف صدر بھی کہتے ہیں جو وطن واپسی کے وقت کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت حالت حیض میں ہے تو طواف وداع بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ طواف افاضہ، جو حج کا رکن ہے، کر لینے کے بعد اگر کسی خاتون کو حیض شروع ہو جائے تو اسے طواف وداع کے لیے مکہ مکرمہ میں ٹھہرنا ضروری نہیں، وہ اپنے گھر واپس آ سکتی ہے کیونکہ شریعت نے اسے ساقط کر دیا ہے۔ طواف افاضہ کو طواف رکن، طواف زیارت اور طواف یوم النحر بھی کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا پہلے فتویٰ تھا کہ حائضہ کو طواف وداع کے لیے طہارت کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب انھیں پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی رخصت دی تھی تو اس موقف سے رجوع کر لیا یا رخصت کا پہلے علم تھا لیکن وہ بھول گئے اور اسے متأخر کر دینے کا فتویٰ دینے لگے، بعد میں یاد دہانی کرانے سے اپنے فتویٰ سے دستبردار ہو گئے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حائضہ عورت بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی۔[1]

[1] فتح الباري: 555/1.

(٢٨) بَابٌ: إِذَا رَأَتِ الْمُسْتَحَاضَةُ الطُّهْرَ

باب: 28- جب مستحاضہ کو خون آنا بند ہو جائے

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: تَغْتَسِلُ وَتُصَلِّي وَلَوْ سَاعَةً، وَيَأْتِيهَا زَوْجُهَا إِذَا صَلَّتْ، اَلصَّلَاةُ أَعْظَمُ.

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ (مستحاضہ کا جب خون بند ہو جائے تو) غسل کرے اور نماز پڑھے اگرچہ یہ بندش تھوڑی دیر کے لیے ہو۔ جب وہ نماز پڑھ سکتی ہے جس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، تو اس کا شوہر بدرجۂ اَولیٰ اس کے پاس آ سکتا ہے۔

٣٣١ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ عَنْ زُهَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَدَعِي الصَّلَاةَ، وَإِذَا أَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ وَصَلِّي».

[331] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے (فاطمہ بنت ابی حبیش سے) فرمایا: ''جب حیض کے ایام آئیں تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو خون کو دھو ڈالو اور نماز ادا کرو۔''

فوائد و مسائل: ① علامہ سندھی نے عنوان کا مقصد بایں الفاظ بیان کیا ہے کہ اس مقام پر طہر سے مراد خون حیض کا انقطاع ہے، مطلق خون کا بند ہونا مراد نہیں کیونکہ کلام تو اس عورت سے متعلق ہے جو خونِ استحاضہ کی حالت سے دوچار ہو اور اس کا خون بند نہ ہو رہا ہو۔[1] حافظ ابن حجر ؒ کہتے ہیں: جب حیض کے خون سے استحاضہ کو تمیز کر سکے، تو گو استحاضے کا خون جاری رہے، اسے طہر کہا گیا ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مطلق خون بند ہونے کو طہر سے تعبیر کیا گیا ہو، لیکن سیاق کے اعتبار سے پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔[2] مقصد یہ ہے کہ عورت جس وقت دیکھے کہ طہر شروع ہو گیا ہے، گو استحاضے کا خون آ تا رہے تو فوراً غسل کر کے نماز شروع کر دے۔ لیکن علامہ عینی نے اس سے واقعی طور پر انقطاع دم مراد لیا ہے۔ دم استحاضہ کو طہر قرار دینا صرف مجازی طور پر ممکن ہے جس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں، اس لیے یہاں طہر کی تفسیر مطلق خون بند ہونے سے کی جائے گی۔ امام بخاری ؒ کا مطلب یہ ہے کہ خون بند ہو گیا ہے تو فوراً غسل کر کے نماز پڑھے، مزید وقت گزرنے کا انتظار نہ کرے۔[3] ② حضرت ابن عباس ؓ کے اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (153/1) اور دارمی (805) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت ابن سیرین نے حضرت ابن عباس ؓ سے مستحاضہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جب بحرانی خون، یعنی حیض دیکھے تو نماز نہ پڑھے اور جب طہر دیکھے، خواہ ایک لحظہ ہو، تو غسل کر کے نماز ادا کرے۔ خاوند کی مقاربت سے متعلق اثر ابن عباس کو مصنف عبدالرزاق (310/1) میں حضرت عکرمہ کی سند سے بیان کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا: اس سے مقاربت (ہم بستری) کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ابوداود میں ہے کہ ام حبیبہ کا خاوند استحاضے کی حالت میں اس سے مقاربت کر لیتا تھا۔ یہ حدیث صحیح ہے

1 حاشية السندي: 1/205. 2 فتح الباري: 1/555. 3 عمدة القاري: 3/178.

بشرطیکہ حضرت عکرمہ کا حضرت ام حبیبہ سے سماع ثابت ہو۔[1] ③ ابراہیم نخعی، حکم اور امام زہری وغیرہ کا خیال ہے کہ مستحاضہ عورت سے جماع جائز نہیں۔ امام بخاری ؒ ان کی تردید فرما رہے ہیں کہ جب نماز پڑھنا جائز ہے تو خاوند کو اس سے صحبت کرنا بطریق اولی جائز ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اس کے لیے حدیث فاطمہ بنت ابی حبیش کو مختصراً بیان کیا ہے جس میں صراحت ہے کہ مستحاضہ کو نماز پڑھنی چاہیے۔ حدیث مذکور پہلے گزر چکی ہے، تشریح کے لیے اس کی طرف مراجعت کی جائے۔

(٢٩) بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى النُّفَسَاءِ وَسُنَّتِهَا

باب: 29- نفاس والی عورت کا جنازہ اور اس کا طریقہ

٣٣٢ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ أَبِي سُرَيْجٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا شَبَابَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ، عَنِ ابْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ: أَنَّ امْرَأَةً مَاتَتْ فِي بَطْنٍ، فَصَلَّى عَلَيْهَا النَّبِيُّ ﷺ فَقَامَ وَسَطَهَا. [انظر: ١٣٣١، ١٣٣٢]

[332] حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت کا زچگی میں انتقال ہوگیا تو نبی ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور جنازہ پڑھتے وقت اس کے درمیان (کمر کے سامنے) کھڑے ہوئے۔

فوائد و مسائل: ① اس عنوان میں امام بخاری ؒ دو باتیں بتلانا چاہتے ہیں: * حالت نفاس میں مرنے والی کا جنازہ پڑھا جائے گا۔ * جنازہ پڑھتے وقت اس کے وسط، یعنی کمر کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے۔ اس مسئلے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ نفاس کی حالت نجاست کی حالت ہے اور اس حالت میں اسے موت آئی ہے، گویا موت آنے سے نجاست مستقر ہوگئی۔ اب سوال یہ ہے کہ نفاس کی حالتِ نجاست جب موت سے برقرار ہوگئی تو اس پر نماز جنازہ کی اجازت ہوگی؟ امام بخاری نے حدیث سے ثابت فرمایا کہ نفاس میں مرنے والی عورت کا جنازہ پڑھنا صحیح ہے۔ یہ خیال کرنا کہ وہ تو پہلے ہی ناپاک تھی اور موت آنے سے اس کی ناپاکی میں اضافہ ہوگیا، اس لیے نماز جنازہ پڑھنے کا کیا موقع ہے، یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ یہ ایک معنوی ناپاکی تھی جو موت آنے سے ختم ہوگئی اور حسی ناپاکی غسل دینے سے ڈھل گئی۔ وہ عورت پاک ہے۔ اس کے اندر ایمانی طہارت موجود ہے، لہٰذا نماز جنازہ پڑھنا درست ہوا۔ عنوان کا دوسرا جز کہ ایسی عورت کی نماز جنازہ کیسے پڑھی جائے؟ اس مسئلے کا اصل محل کتاب الجنائز ہے، چنانچہ وہاں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''مرد اور عورت کے جنازے میں امام کہاں کھڑا ہو؟'' لیکن امام بخاری ؒ یہاں تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ نماز جنازہ پڑھاتے وقت کھڑے ہونے میں نفاس والی اور دوسری عورتوں میں کوئی فرق نہیں اور کتاب الجنائز میں جب مذکورہ عنوان آئے گا تو وہاں مقصد مسئلۂ قیام ہی کا بیان ہوگا۔ ② شارح بخاری علامہ ابن بطال لکھتے ہیں کہ نفاس والی عورت چونکہ خود نماز نہیں پڑھ سکتی، اس لیے شاید کسی کے دل میں خیال پیدا ہو کہ اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔

[1] فتح الباري: 556/1.

امام بخاری ﷫ نے تنبیہ فرمائی کہ جنازے کے متعلق اس عورت کا حکم عام عورتوں جیسا ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھی ہے تو گویا اس کے لیے طہارت کا حکم ثابت ہوا۔ حالتِ نفاس میں اس کا نماز نہ پڑھنا نجاست کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ ایک حکم تعبدی ہے۔ اس سے اس موقف کی بھی تردید ہوگئی کہ مومن مرنے سے ناپاک ہو جاتا ہے کیونکہ ایسی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ نفاس والی عورت کا جنازہ کیوں پڑھاتے، جبکہ نجاستِ دم تو پہلے ہی تھی، پھر اس کے ساتھ موت کی نجاست بھی جمع ہوگئی، جب رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورت کا جنازہ پڑھایا ہے تو ایسی میت جس سے خون نہیں بہتا کیونکر مرنے سے نجاست آلود ہوگی۔[1] ③ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مذکورہ حدیث پر یہ عنوان قائم کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ وہ عورت پیٹ کی بیماری سے فوت ہوئی تھی، شاید امام بخاری کو اس پر وہم ہوا ہے کہ انھوں نے اسے زچگی خیال کیا ہے، حالانکہ یہ بات سرے سے خلاف حقیقت ہے بلکہ اس سے مراد نفاس میں فوت ہونا ہے جیسا کہ امام بخاری کی بیان کردہ ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے نفاس میں فوت ہوئی تھی،[2] لہٰذا حدیث اور امام بخاری کا عنوان بالکل صحیح اور برمحل ہے۔

نفاس اور اس کے احکام: سرزمین حجاز کے مشہور عالم دین شیخ محمد بن صالح العثیمین ﷫ کے ایک رسالے سے نفاس اور اس کے احکام درج کیے جاتے ہیں: * تعریف: وہ خون جو ولادت کی بنا پر رحم سے برآمد ہو، نفاس کہلاتا ہے، خواہ ولادت کے وقت یا اس کے بعد یا اس سے دو یا تین دن پہلے آئے بشرطیکہ اس کے ساتھ دردِ زہ بھی ہو۔ * مدت: عام طور پر اس کی مدت چالیس دن ہوتی ہے۔ چالیس دنوں سے زائد ہونے کی صورت میں عورت کی سابقہ عادت کے مطابق عمل کیا جائے یا اس کے بعد اگر خون رکنے کی علامتیں ظاہر ہوں تو اس کے ختم ہونے کا انتظار کیا جائے اور اسے نفاس میں شمار کیا جائے بصورت دیگر چالیس دن پورے ہونے پر غسل کر کے نماز روزہ شروع کر دیا جائے۔ اگر چالیس دنوں سے پہلے خون بند ہو جائے تو بھی عورت کو چاہیے کہ وہ غسل کر کے نماز روزہ شروع کر دے۔ واضح رہے کہ نفاس اس ولادت کے بعد شمار ہوگا جس میں بچے کی شکل وصورت بن چکی ہو۔ اگر شکل وصورت بننے سے پہلے ہی اسقاط ہو جائے تو اس وقت برآمد ہونے والے خون کو نفاس نہیں کہا جائے گا بلکہ وہ کسی رگ کا خون ہے جس پر استحاضے کے احکام جاری ہوں گے۔ کم از کم مدت جس میں بچے کی شکل وصورت بن جاتی ہے، وہ ابتدائے حمل سے اسی (80) دن اور زیادہ سے زیادہ نوے (90) دن ہے۔ * نفاس کے احکام: اس کے احکام حیض جیسے ہیں، البتہ درج ذیل چند مسائل میں اس کا الگ حکم ہے: * عدتِ طلاق کا تعلق قطعی طور پر نفاس سے نہیں ہے کیونکہ اگر طلاق وضع حمل سے پہلے دی گئی ہے تو اس کی مدت کو بڑھایا نہیں جائے گا اور اگر طلاق وضع حمل کے بعد دی ہے تو نفاس کے بعد حیض آنے تک انتظار کیا جائے گا، یعنی تین حیض گزرنے پر عدت ختم ہوگی۔ * ایلا کی صورت میں حیض کی مدت کو شمار کیا جائے گا لیکن نفاس کی مدت شمار نہیں ہوگی۔ ایلا یہ ہے کہ خاوند چار ماہ سے زائد یا ہمیشہ کے لیے اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لے۔ عورت کے مطالبے پر خاوند کے قسم کھانے سے چار ماہ کی مدت مقرر کی جائے گی اور اس سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے یا اسے فارغ کر دے۔ اس چار ماہ کی مدت میں اگر ولادت ہو جائے تو نفاس کے ایام چار ماہ میں شامل نہیں ہوں گے، البتہ ایام حیض کو چار ماہ کی مدت میں شمار کیا جائے گا۔ * حیض کی آمد عورت کے بالغ ہونے کی علامت ہے جبکہ خون نفاس سے

---

[1] شرح ابن بطال: 462/1. [2] صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1331.

پہلے اس کا بالغ ہونا ضروری ہے کیونکہ عورت کو حمل اس کے انزال سے ہوتا ہے۔ حمل سے پہلے انزال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالغ ہو چکی ہے، اس لیے خون نفاس کو بلوغ کی علامت ٹھہرانے کے بجائے حیض کو اس کے بالغ ہونے کی نشانی قرار دیا جائے گا۔ * اگر حیض کا خون رک جائے، پھر عادت کے ایام میں دوبارہ شروع ہو جائے تو اسے قطعی طور پر حیض ہی شمار کیا جائے گا، مثلاً: ایک عورت کو اس کی عادت کے مطابق آٹھ دن خون آتا ہے، چار دن کے بعد خون منقطع ہو گیا، دو دن خون بند رہا، پھر ساتویں اور آٹھویں دن خون جاری ہوا تو اسے حیض ہی شمار کیا جائے گا اور اس پر احکام حیض ہی جاری ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر چالیس دن سے پہلے خون نفاس بند ہو گیا، پھر چالیس دن پورے ہونے پر دوبارہ جاری ہو گیا تو اسے خون مشکوک قرار دیا جائے گا، یعنی وہ عورت نماز روزہ شروع کر دے گی، البتہ شوہر اس کے پاس نہیں آئے گا۔ طہر کے بعد، پڑھی ہوئی نمازوں اور رکھے ہوئے روزوں کی قضا بھی دینی ہوگی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ خون بند ہونے کے بعد اگر ایسے وقت دوبارہ آجائے کہ اس میں نفاس آنا ممکن ہو تو اسے تو نفاس ہی شمار کریں گے، بصورت دیگر وہ حیض کا خون ہے۔ اگر خون جاری رہتا ہے تو اسے استحاضہ شمار کیا جائے گا۔ امام مالک فرماتے ہیں: خون نفاس انقطاع کے دو، تین دن بعد دوبارہ شروع ہو جاتا ہے تو نفاس ہی ہے، بصورت دیگر اسے حیض شمار کیا جائے گا۔ * حیض کا خون آنے کی صورت میں اگر عورت اپنی مقررہ عادت سے پہلے پاک ہو جاتی ہے تو خاوند کو مقاربت کی اجازت ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن خون نفاس آنے کی صورت میں اگر چالیس دن سے پہلے عورت پاک ہو جائے تو خاوند کو اس سے مقاربت کرنا مکروہ ہے لیکن جمہور کے نزدیک اس مدت میں عورت کے پاس جانا مکروہ نہیں اور یہی بات درست ہے کیونکہ کراہت بھی ایک شرعی حکم ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔ اس سلسلے میں صرف عثمان بن ابی العاص کا عمل پیش کیا جاتا ہے کہ ان کی بیوی چالیس دن سے پہلے نفاس سے فارغ ہوگئی اور وہ ان کے پاس آئی تو انھوں نے کہا: میرے پاس نہ آنا۔ اس عمل سے کراہت کشید کی جاتی ہے لیکن اس میں بھی کئی ایک احتمالات ہیں: ممکن ہے کہ عورت کو ابھی طہر کا یقین نہ ہوا ہو، اس لیے احتیاط کے پیش نظر ایسا کیا ہو یا اس خطرے کے پیش نظر ایسا کیا ہو مبادا جماع کرنے سے خون حرکت میں آجائے اور دوبارہ جاری ہو جائے۔ واللّٰہ أعلم.

(٣٠) بَابٌ :

باب: 30- بلاعنوان

٣٣٣ - حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُدْرِكٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمَّادٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو عَوَانَةَ، مِنْ كِتَابِهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا سُلَيْمَانُ الشَّيْبَانِيُّ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ: سَمِعْتُ خَالَتِي مَيْمُونَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا كَانَتْ تَكُونُ حَائِضًا لَا تُصَلِّي، وَهِيَ مُفْتَرِشَةٌ بِحِذَاءِ مَسْجِدِ رَسُولِ اللهِ

[333] حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ اور اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے سنا کہ وہ حائضہ ہوتیں اور نماز نہ پڑھتیں تو بھی رسول اللہ ﷺ کی سجدہ گاہ کے پاس لیٹی رہتیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھتے رہتے، جب سجدہ کرتے تو آپ کا کچھ کپڑا ان کے جسم سے لگ جاتا تھا۔

ﷺ، وَهُوَ يُصَلِّي عَلٰى خُمْرَتِهِ، إِذَا سَجَدَ أَصَابَنِي بَعْضُ ثَوْبِهِ. [انظر: ٣٧٩، ٣٨١، ٥١٧، ٥١٨].

فوائد ومسائل: ① صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں یہاں باب کا لفظ نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث سابقہ عنوان میں داخل ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مطلب ہے کہ جس طرح نفاس والی عورت پر نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے اسی طرح اگر عورت دوران حیض میں فوت ہو جائے تو اس کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا کیونکہ حیض و نفاس دونوں کا ایک ہی حکم ہے، لہٰذا جس طرح نفاس والی عورت کا خون مرنے سے بند ہو جاتا ہے اور غسل دینے سے وہ پاک ہو جاتی ہے، اسی طرح حیض والی عورت کا خون بھی مرنے کے بعد بند ہو جاتا ہے اور غسل دینے سے وہ پاک ہو جائے گی اور اس کا جنازہ پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اگر باب کا لفظ موجود ہے تو یہ سابقہ عنوان کی ایک فصل شمار ہوگا۔ سیاق و سباق کی مناسبت کے پیش نظر اس پر درج ذیل عنوان قائم کیے جا سکتے ہیں: الصلاة بقرب الحائض، إذا مس ثوب المصلي بدن الحائض فلا ضير فيه، باب طهارة عين الحائض. ② خمرہ: اس چھوٹے مصلے کو کہتے ہیں جو کھجور کے پتوں سے دھاگے کے ذریعے سے بنایا جاتا ہے اور بڑی چٹائی کو عربی میں حصیر کہتے ہیں۔ چھوٹی چٹائی کو خمرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دھاگے پتوں میں چھپے ہوتے ہیں، نیز زمین کی گرمی اور سردی سے چہرہ اور ہاتھ محفوظ رہتے ہیں۔[1] اس حدیث سے مندرجہ ذیل احکام کا استنباط ہوتا ہے: * حائضہ نجس نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ دوران نماز میں اپنا کپڑا حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا پر نہ گرنے دیتے۔ یہی حکم نفاس والی عورت کا ہے۔ * حائضہ نماز تو نہیں پڑھتی، البتہ نمازی کے آگے اپنا بستر بچھا کر لیٹ سکتی ہے۔ * حائضہ عورت کے پاس نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں، اسی طرح اس کے بستر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا بھی جائز ہے۔ * کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر نماز پڑھنا تواضع کی علامت ہے۔[2] * اس حدیث میں امام بخاری رحمہ اللہ نے براعۃ الاختتام کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ بعض روایات میں افتراش الجنازة کے الفاظ بھی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے جنازے کی طرح لیٹی رہتیں۔ اس سے کتاب الحیض کے اختتام کی طرف بھی اشارہ ہے اور امام بخاری نے قاری کو آخرت یاد دلانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ أَتَمُّ. عنوان کی مناسبت سے سرزمین حجاز کے مایۂ ناز عالم دین شیخ محمد بن صالح العثیمین کے ایک رسالے سے حیض کے احکام کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے: حیض کی تعریف: لغوی طور پر حیض کے معنی کسی چیز کا جاری ہونا اور بہہ پڑنا ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں وہ خون جو طبعی طور پر عورت کی شرمگاہ سے ایک وقت مقرر پر کسی بیماری، زخم، اسقاط، یا ولادت کے بغیر جاری ہو، حیض کہلاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک طبعی خون ہوتا ہے، اس لیے عورتوں کے مخصوص حالات، خاندانی روایات اور آب و ہوا کے تغیرات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس میں مختلف عورتوں کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر یا کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ حکمت: جب بچہ شکم مادر میں ہوتا ہے تو اسے باہر سے کوئی غذا مہیا نہیں کی جا سکتی، اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس خون سے بچے کو غذا مہیا کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ بچے کی ناف کے ذریعے سے خون سے حاصل شدہ غذائی مواد اس کے رگ و ریشے میں پہنچ جاتا ہے۔ تَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ

1 فتح الباري: 558/1. 2 عمدة القاري: 184/3.

الخالقين. خون حیض میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی حکمت کارفرما ہے، چنانچہ عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو خون حیض بند ہو جاتا ہے۔ تجربات شاہد ہیں کہ حاملہ عورت کو شاذ و نادر ہی خون حیض آتا ہے، اسی طرح دودھ پلانے والی ماں کو بالخصوص ابتدائی چند مہینوں تک خون نہیں آتا۔ حیض آنے کی عمر: عام طور پر عورت کو بارہ سال سے پچاس سال کی عمر تک حیض آ سکتا ہے۔ عورتوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس عمر میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ بعض علماء نے خون حیض کے متعلق عمر کی حد بندی بھی کی ہے، تاہم امام دارمی فرماتے ہیں کہ اس کی حد بندی کرنا صحیح نہیں۔ عورت کو جب بھی خون آئے گا اسے حیض ہی شمار کیا جائے گا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے کہ جب بھی عورت حیض دیکھے، اسے حائضہ کہا جائے گا، خواہ اس کی عمر نو سال سے کم یا پچاس سال سے زائد ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے احکام حیض کے لیے اس کے خون کو بنیاد بنایا ہے، اس لیے کسی قسم کی عمر کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ حد بندی کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو کتاب و سنت میں نہیں ملتی۔ مقدار حیض: عورت کو کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کتنے دن خون آ سکتا ہے؟ اس کے متعلق فقہاء کے چھ یا سات اقوال ہیں: ابن منذر کہتے ہیں کہ ایک گروہ کے نزدیک خون حیض کے لیے کم از کم یا زیادہ سے زیادہ دنوں کی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات بھی امام دارمی کے سابق قول کی طرح ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ کتاب و سنت اور قیاس صحیح کے اعتبار سے یہی صحیح ہے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل دلائل ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ”لوگ آپ سے حیض کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ یہ ایک ناپاک اور تکلیف دہ خون ہے، اس لیے حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے پاس نہ جاؤ۔ (ان سے ہم بستری نہ کرو۔)“ [1] اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے پاس جانے کی پابندی کی حد اس کی پاکیزگی کو ٹھہرایا ہے۔ ایک دن رات یا تین یا پندرہ دن تک انتہا بیان نہیں فرمائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکم کی علت حیض کی آمد اور اس کی بازگشت (واپسی) ہے۔ جب بھی حالت حیض ہوگی، پابندی بحال، بصورت دیگر پابندی ختم ہو جائے گی، یعنی احکام کا مدار حیض کا آنا جانا ہے اور بس۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حالت احرام میں حیض آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بیت اللہ کے طواف کے علاوہ ہر وہ کام کرتی رہو جو حاجی لوگ کرتے ہیں تا آنکہ تو پاک ہو جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: مجھے ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو طہارت حاصل ہوئی۔ [2] ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ حیض سے پاک ہونے کا انتظار کرو۔ جب پاکی حاصل ہو جائے تو مقام تنعیم سے احرام باندھ کر عمرہ کر لینا۔ [3] اس حدیث کی رو سے بھی رسول اللہ ﷺ نے پابندی کی انتہا طہر کو مقرر فرمایا ہے اور اس کے لیے کسی خاص وقت کا تعین نہیں فرمایا۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ احکام کا دارو مدار حیض کی آمد و رفت پر ہے۔ جن حضرات نے حیض کے متعلق ایام کی حد بندی کی ہے یہ کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے، حالانکہ اگر اس کی کوئی حیثیت ہوتی تو شارع علیہ السلام اس کے متعلق خاموشی اختیار نہ فرماتے۔ اس پر متعدد احکام مرتب ہوتے ہیں جیسا کہ نماز، روزہ، نکاح، طلاق اور وراثت وغیرہ۔ جب اس طرح کی حد بندیوں کا قرآن و حدیث میں وجود نہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ اگر اس سلسلے میں کوئی چیز قابل اعتماد ہے تو وہ حیض کی آمد و بازگشت ہے۔ شریعت نے اس کے متعلق کم از کم یا

---

(1) البقرة 2:221. (2) صحيح مسلم، الحج، حديث: 2919(1211). (3) صحيح البخاري، العمرة، حديث: 1785.

زیادہ سے زیادہ دنوں کا تعین نہیں کیا۔ جو اس سلسلے میں حد بندی کرتا ہے، وہ کتاب وسنت کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتا ہے۔ صحیح قیاس بھی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض کو گندا اور نقصان دہ خون قرار دیا ہے۔ جب بھی حیض ہوگا یہ گندگی موجود ہوگی۔ اس میں دوسرے یا پہلے، چوتھے یا تیسرے، سولھویں یا پندرھویں، اٹھارویں یا سترھویں دن میں کوئی فرق نہیں۔ حیض، حیض ہے اور گندگی، گندگی ہے۔ جب بھی یہ موجود ہوگی اس پر احکام مرتب ہوں گے اور جب ختم ہو جائے گی احکام بھی زائل ہو جائیں گے۔ حد بندی کرنے والوں میں اس کے متعلق بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حد بندی کے متعلق کوئی ٹھوس دلیل نہیں جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ یہ سب اجتہادی باتیں ہیں۔ ایسے حالات میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ کتاب وسنت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حیض کے متعلق کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔ راجح بات یہ ہے کہ کوئی بھی عورت کسی قسم کے زخم کے بغیر اگر خون دیکھتی ہے تو اسے حیض شمار کیا جائے، اس کی عمر یا وقت کی تحدید کرنا درست نہیں۔ ہاں! اگر خون بند نہیں ہوتا یا مہینے میں ایک دو دن کے لیے انقطاع آتا ہے تو اسے استحاضے کا نام دیا جائے گا۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو خون رحم سے برآمد ہو، وہ حیض ہے الا یہ کہ اس کے استحاضہ ہونے پر دلیل مل جائے، نیز آپ نے فرمایا کہ شرمگاہ سے بہنے والا خون حیض ہے بشرطیکہ اس کے رگ سے آنے یا زخم سے بہنے کا علم نہ ہو۔ یہی موقف دین اسلام کی روح کے مطابق ہے اور اس سے ہی دین کے آسان ہونے کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم.

○ **ہنگامی حالات:** حیض کے متعلق کچھ ہنگامی حالات بھی آجاتے ہیں جس کی چند ایک انواع حسب ذیل ہیں: ✱ عادت سے زیادہ یا کم آجائے، مثلاً: ایک عورت کو اس کی عادت کے مطابق چھ دن حیض آتا ہے لیکن کسی ہنگامی حالت میں وہ سات دن تک جاری رہے یا کسی عورت کو سات دن خون آتا ہے لیکن کسی وجہ سے چھ دن کے بعد طہارت ہو جائے۔ ✱ تقدیم وتاخیر، جیسا کہ بعض عورتوں کو مہینے کے آخر میں حیض آتا ہے اور انھیں مہینے کے آغاز میں شروع ہو جائے۔ یا اس کے برعکس عادت کے طور پر مہینے کے آغاز میں آتا ہو لیکن کسی وجہ سے مہینے کے آخر میں خون آجائے، ان دونوں حالتوں کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عورت جب خون دیکھے تو وہ حائضہ ہے اور جب پاک ہو جائے تو وہ طاہرہ ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی عادت سے خون زیادہ دن آتا ہے یا اس کی عادت سے کم آتا ہے۔ اور تقدیم وتاخیر کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ عورت جب بھی حیض کا خون دیکھے گی اس پر احکام حیض عائد ہوں گے، حیض ختم ہوتے ہی وہ احکام بھی ختم ہو جائیں گے۔ اگر عادت کا اعتبار ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے ضرور بیان کرتے۔ ہاں! استحاضے کی صورت میں عادت کو مدار ٹھہرایا گیا ہے جس کی تفصیل سابقہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔ ✱ عورت اگر زرد یا خاکستری رنگ کی رطوبت دیکھتی ہے تو اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ کتاب وسنت میں اس کی پوری وضاحت ہے کہ اگر دوران حیض میں یا طہر سے چند لمحے قبل زخموں کے پانی جیسا خون دیکھتی ہے تو اسے حیض ہی شمار کیا جائے گا اور اگر طہر کے بعد دیکھا جاتا ہے تو اسے حیض شمار نہیں کیا جائے گا جیسا کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم طہر کے بعد زرد یا خاکستری رنگ کی رطوبت کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھیں۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''وہ زرد یا خاکستری رنگ کی رطوبت جو ایام حیض کے علاوہ نظر آئے۔'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اس

---

1 سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 307.

عنوان بندی سے بظاہر دو متعارض احادیث کے درمیان تطبیق کی صورت پیدا فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چونے کی طرح سفید روئی برآمد ہونے تک حیض شمار کرتی تھیں، یعنی دوران حیض میں اس رنگ کی رطوبت حیض شمار ہوگی جبکہ حدیث ام عطیہ کا مطلب ہے کہ طہر کے بعد اس رطوبت کا کوئی اعتبار نہ ہوتا تھا۔ منظّم طور پر حیض نہ آئے، یعنی ایک دن خون دیکھا تو دوسرے دن خون برآمد نہ ہوا، اس کی دو حالتیں ممکن ہیں: * عورت ہمیشہ ہر وقت اسی کیفیت سے دوچار رہے۔ اس صورت میں عورت کو استحاضے کے احکام اختیار کرنا ہوں گے۔ * عورت ہمیشہ اس حالت میں مبتلا نہ ہو بلکہ کبھی کبھار اس سے دوچار ہو تو اس میں اختلاف ہے کہ جن ایام میں حیض نہیں آیا، وہ طہر شمار ہوں گے یا ان پر حیض کے احکام جاری ہوں گے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دوران حیض میں بندش کے ایام حیض کے شمار ہوں گے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے جبکہ حنابلہ کہتے ہیں کہ خون کے ایام حیض کے شمار ہوں گے اور بندش کے ایام کو طہر کہا جائے گا۔ ہاں اگر مجموعی ایام، مدت حیض سے زیادہ ہوں تو مدت حیض سے زیادہ دنوں پر استحاضے کے احکام جاری ہوں گے۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ اگر بندش کی مدت ایک دن سے کم ہے تو اسے طہر شمار نہیں کیا جائے گا اور اگر ایک کامل دن سے زیادہ ہے تو اسے طہر کہا جائے گا۔ * خون بالکل خشک ہو جائے اور عورت محض رطوبت دیکھے تو اس کے متعلق یہ حکم ہے کہ اگر ایسی حالت دوران حیض میں یا طہر سے قبل طاری ہوتی ہے تو اسے حیض شمار کیا جائے گا، بصورت دیگر یہ طہر ہے۔ یہ کیفیت ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے زرد یا خاکستری رنگ کی رطوبت آنے لگے۔

○ احکام حیض: حیض سے متعلقہ احکام بے شمار ہیں۔ ہم صرف چند ایک کا ذکر کرتے ہیں جن کی اکثر و بیشتر ضرورت پڑتی ہے۔ * **نماز**: عورت کو ان دنوں نماز پڑھنا حرام ہے۔ ہاں! اگر اسے پوری ایک رکعت ادا کرنے کے لیے طہر کا وقت مل جائے تو اسے فراغت کے بعد پوری نماز ادا کرنی ہوگی۔ اس کی دو صورتیں ہیں: * عورت کو غروب آفتاب کے بعد حیض شروع ہوا لیکن ایک رکعت پڑھنے کی گنجائش تھی بعد میں حیض کا آغاز ہوا تو اس صورت میں اسے طہارت کے بعد یہ نماز مغرب ادا کرنی ہوگی۔ * جب اسے طہارت ایسے وقت میں ہوئی کہ کسی نماز کی ایک رکعت ادا کرنے کی گنجائش تھی تو بھی اسے یہ نماز پوری ادا کرنی ہوگی۔ اگر ایک رکعت ادا کرنے کی گنجائش نہ تھی تو اسے یہ نماز معاف ہے۔ نماز کے علاوہ ذکر، تسبیح وتہلیل اور دعا وغیرہ کرسکتی ہے۔ کتب احادیث اور کتب فقہ کا مطالعہ بھی کرسکتی ہے، بلکہ قرآن کریم کی تلاوت بھی سن سکتی ہے۔ صرف نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ حائضہ عورت کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کے متعلق جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ دل میں تو پڑھا جا سکتا ہے، البتہ زبان سے اس کی قراءت جائز نہیں، لیکن امام بخاری، ابن جریر طبری، امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم، امام ابن حزم اور امام ابن منذر کا موقف ہے کہ حائضہ تلاوت قرآن کرسکتی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حائضہ کے لیے تلاوت قرآن کی ممانعت کے متعلق قرآن وحدیث سے کچھ بھی ثابت نہیں۔ اس سلسلے میں جو احادیث مروی ہیں، وہ صحیح نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عورتوں کو حیض آتا تھا، اگر ممانعت ہوتی تو نماز کی طرح اس کی بھی وضاحت کے ساتھ روایات ہوتیں، لیکن کسی بھی صحیح حدیث سے ممانعت ثابت نہیں۔ شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ نے تطبیق کی صورت بایں الفاظ بیان کی ہے کہ حائضہ عورت کو زبان سے تلاوت نہیں کرنی چاہیے، ہاں! اگر اسے امتحان دینا ہے اور طالبات کی تصحیح کرنا ہے تو ایسی صورت میں قرآن کی تلاوت کی جاسکتی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی مجبوری نہیں، بہتر ہے کہ ان دنوں تلاوت قرآن سے مکمل طور پر اجتناب کرے۔

○ روزہ: حائضہ عورت کو نماز کی طرح روزہ رکھنے کی بھی ممانعت ہے لیکن فراغت کے بعد ان روزوں کی قضا ادا کرنی ہوگی جو حیض کے دوران میں رہ گئے ہیں۔ اگر روزے کی حالت میں غروب آفتاب سے چند منٹ قبل حیض آ گیا تو وہ روزہ بھی ختم ہو جائے گا، اس کی فراغت کے بعد قضا دینی ہوگی، ہاں! اگر غروب آفتاب سے پہلے حرکتِ خون محسوس کرتی ہے لیکن اس کا خروج غروب آفتاب کے بعد ہوا ہے تو اس صورت میں اس کا روزہ مکمل ہے، اسے بعد میں قضا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر فجر سے چند منٹ پہلے وہ حیض سے فارغ ہو جاتی ہے تو غسل سے پہلے سحری کھا کر روزہ رکھ سکتی ہے، البتہ نماز فجر غسل کے بعد ادا کرنی ہوگی جیسا کہ جنبی بھی بحالت جنابت روزہ رکھ سکتا ہے۔

○ طواف: حائضہ عورت کو بیت اللہ کا طواف بھی نہیں کرنا چاہیے، خواہ طواف فرض ہو یا نفل۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ بیت اللہ کے طواف کے علاوہ تمام ارکان حج ادا کر جس طرح دوسرے حاجی لوگ کرتے ہیں تا آنکہ تجھے طہارت حاصل ہو جائے۔ صفا مروہ کی سعی، میدان عرفہ میں وقوف، مزدلفہ اور منیٰ میں ٹھہرنا اور رمی جمار کرنے کے متعلق کوئی پابندی نہیں۔ اس بنا پر اگر عورت نے بحالت طہارت طواف مکمل کر لیا، پھر فوراً بعد حیض آ گیا تو اس کا طواف مکمل ہے۔ اسی طرح سعی کرتے وقت اگر حیض آ جائے تو اپنی سعی مکمل کر لینی چاہیے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

○ طواف وداع: طواف وداع بھی حائضہ عورت سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اگر کسی عورت نے اپنا حج مکمل کر لیا ہے لیکن طواف وداع سے پہلے اسے حیض آ گیا تو اس کے لیے ایام طہارت کا انتظار نہ کرے بلکہ طواف وداع کیے بغیر واپس وطن لوٹ آئے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: لوگوں کو چاہیے کہ وہ طواف وداع کریں، البتہ حائضہ عورت کے لیے تخفیف ہے کہ اس کے بغیر بھی واپس آ سکتی ہے۔ بعض عورتیں اس حالت میں مسجد حرام کے دروازے کے پاس آ کر دعا مانگتی ہیں۔ ان کا یہ فعل سنت کے خلاف ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں روانگی سے قبل حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو حیض آ گیا تو آپ نے اسے طواف وداع کیے بغیر روانہ ہونے کے متعلق حکم دیا، یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسجد حرام کے دروازے کے پاس دعا کر کے آئے، اگر ایسا کوئی حکم ہوتا تو منقول ہوتا، البتہ طواف حج کسی صورت میں معاف نہیں۔ طواف حج سے مراد دسویں تاریخ کا طواف ہے۔ جسے طواف افاضہ اور طواف زیارت بھی کہا جاتا ہے۔ اگر عورت صرف عمرے کی نیت سے آئی ہے تو اس کے لیے عمرے کا طواف ضروری ہوگا۔ وہ حیض ختم ہونے کا انتظار کرے اور طہارت حاصل کرنے کے بعد طواف کر کے واپس آئے گی، تب اس کا عمرہ مکمل ہوگا۔ اگر عورت حج کی نیت سے آئی ہے اور اسے حیض جاری ہو گیا ہے تو پھر اس سے طواف قدوم اور طواف وداع ساقط ہو جائے گا جیسا کہ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ ✱ مسجد میں داخل ہونا بھی حائضہ عورت کے لیے جائز نہیں بلکہ عیدگاہ میں بھی وہ عام عورتوں سے الگ بیٹھے۔ حدیث میں ہے کہ نوجوان لڑکیاں، دیگر خواتین اور حائضہ عورتیں عید کے لیے جائیں لیکن حائضہ عورتیں عیدگاہ سے الگ ہو کر بیٹھیں۔ ✱ دوران حیض میں خاوند کے لیے عورت سے مقاربت کرنا بھی حرام ہے۔ عورت کو بھی چاہیے کہ وہ کسی صورت میں اپنے خاوند کو موقع نہ دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ ''اور آپ سے خون حیض کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں۔ آپ انھیں

کہہ دیں کہ یہ گندا اور نقصان دہ خون ہے۔ ان دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور پاک ہونے تک ان کے پاس نہ جاؤ۔''[1] محیض سے مراد حیض کا مقام اور وقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جماع کے علاوہ تمھیں حائضہ عورت سے ہر قسم کا استمتاع کرنے کی اجازت ہے۔''[2] نیز امت کا اجماع ہے کہ اس دوران میں خاوند اپنی بیوی سے جماع نہیں کر سکتا، البتہ اس دوران میں بیوی سے بوس و کنار اور اس کے ساتھ محو استراحت ہونے کی اجازت ہے بشرطیکہ اسے اپنے آپ پر کنٹرول ہو۔

○ **طلاق:** خاوند پر حرام ہے کہ وہ اس حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ تم ایسی حالت میں طلاق دو کہ وہ طلاق کے بعد اپنی عدت کا آغاز کر سکے، لہٰذا حیض کی حالت میں بیوی کو طلاق نہیں دینی چاہیے، البتہ اس سے تین صورتیں مستثنیٰ ہیں: * عورت سے نکاح کرنے کے بعد مقاربت یا خلوت صحیحہ سے پہلے اگر طلاق دینا ہو تو وہ حالت حیض میں دی جا سکتی ہے کیونکہ ایسی صورت میں عورت کے ذمے عدت وغیرہ ہوتی ہی نہیں۔ * حالتِ حمل میں اگر حیض آ جائے تو اس حالت میں بھی طلاق دی جا سکتی ہے جیسا کہ پہلے وضاحت ہو چکی ہے کیونکہ اس صورت میں عدت وضع حمل ہے، خواہ حیض آئے یا نہ آئے۔ * اگر عورت کے مطالبے پر خلع کی صورت میں طلاق دی جائے تو وہ بھی حیض کی حالت میں دی جا سکتی ہے، البتہ حالت حیض میں نکاح کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں لیکن اس حالت میں خاوند کو بیوی کے پاس نہیں جانا چاہیے۔ اگر اسے خود پر کنٹرول ہو تو اس کے پاس جانے (لیٹنے) میں کوئی حرج نہیں، تاہم بہتر ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔

○ **عدت کا اعتبار:** جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اسے تین حیض آنے تک عدت گزارنی ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ﴾ ''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے انھیں چاہیے کہ وہ تین حیض آنے تک انتظار کریں۔''[3] اگر عورت حاملہ ہے تو اسے وضع حمل تک عدت گزارنی ہوگی، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ ''اگر طلاق یافتہ عورت حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔''[4] اگر وہ حاملہ نہیں اور نہ اسے حیض ہی آتا ہے تو اسے عدت کے بطور تین قمری مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ حمل کے علاوہ حیض کے نہ آنے کی تین صورتیں ہیں: * وہ نابالغہ ہو۔ * بوڑھی ہو چکی ہو۔ * کسی بیماری کی وجہ سے رحم نکال دیا گیا ہو یا بے کار ہو چکا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ ''تمھاری جو عورتیں حیض سے مایوس ہیں اور وہ جنھیں حیض آنا شروع نہیں ہوا، ان کی عدت تین ماہ ہے۔''[5] جن عورتوں کو حیض آتا ہو لیکن کسی بیماری یا دودھ پلانے کی وجہ سے عارضی طور پر موقوف ہو گیا ہو، ایسی عورتوں کو اگر طلاق ہو جائے تو انھیں تین حیض آنے تک انتظار کرنا ہوگا، خواہ وہ مدت کتنی لمبی ہو جائے۔ اگر مدت رضاعت ختم ہو گئی یا بیماری سے شفا مل گئی لیکن ان کا حیض شروع نہیں ہوا تو ایسی عورتوں کو پورا سال انتظار کرنا ہوگا۔ جن عورتوں کو مقاربت کے بغیر طلاق ہو جائے ان پر کوئی عدت نہیں۔ وہ طلاق ہوتے ہی عقد زوجیت سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

○ **رحم کا خالی ہونا:** جن عورتوں کو حیض آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے رحم میں کچھ نہیں ہے۔ اگر خلو رحم کی ضرورت ہو تو اس کا مدار حیض کا آنا ہوگا۔

---

① البقرة 2:222. ② صحيح مسلم، الحيض، حديث: 694(302). ③ البقرة 2:228. ④ الطلاق 65:4. ⑤ الطلاق 65:4.

○ وجوب غسل: جب حائضہ عورت حیض سے فارغ ہو جائے تو اسے غسل کرنا ضروری ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو حکم دیا تھا: ''جب تجھے حیض آ جائے تو نماز چھوڑ دے اور جب حیض بند ہو جائے تو غسل کر کے نماز شروع کر دے۔''[1] اگر عورت کسی نماز کے وقت حیض سے فارغ ہو تو اسے چاہیے کہ جلدی غسل کرے تاکہ نماز کو بروقت ادا کر سکے۔ اگر سفر میں ہو اور پانی نہیں مل سکتا یا پانی موجود ہو لیکن اس کے استعمال سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھے۔ جب عذر ختم ہو جائے تو غسل کرے۔ بعض عورتیں کسی نماز کے وقت میں حیض سے فارغ ہو جاتی ہیں لیکن غسل کو اس بہانے مؤخر کر دیتی ہیں کہ وقت بہت کم ہے، اتنے وقت میں اچھی طرح غسل نہیں ہو سکتا، عورتوں کا یہ عذر لنگ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہے۔ انھیں چاہیے کہ تمام بدن پر پانی ڈال کر غسل کر لیں اور بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچا دیں، پھر بروقت نماز ادا کریں۔ اس کے بعد کھلے وقت میں اچھی طرح غسل کا اہتمام کر لیں۔

○ مانع حیض ادویات کا استعمال: کسی ضرورت کے پیش نظر مانع حیض ادویات استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں: ✱ ان کے استعمال سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اگر نقصان کا خطرہ ہو تو ان کا استعمال جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ ''اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو۔''[2] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔''[3] ان ارشادات کے پیش نظر اگر واضح طور پر کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو مانع حیض ادویات کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ✱ اگر اس کے ساتھ خاوند کا تعلق ہے تو اس سے اجازت لینا بھی ضروری ہے، مثلاً: عورت کسی ایسی عدت میں ہے کہ اس کا نان و نفقہ خاوند کے ذمے ہے، اس حالت میں عورت مانع حیض ادویات استعمال کر کے اپنی عدت طویل کرنا چاہتی ہو تاکہ اسے تادیر خرچہ ملتا رہے، اس صورت میں خاوند سے اجازت لینی پڑے گی۔ جواز کے باوجود عورت کے حق میں بہتر یہ ہے کہ ایسی ادویات شدید ضرورت کے علاوہ استعمال نہ کرے کیونکہ قدرت کے نظام سے چھیڑ چھاڑ کرنا اچھا کام نہیں۔ فطرت نے عورت میں اعتدال اور اس کی صحت کے پیش نظر نظام حیض کو جاری کیا ہے، اس لیے بہتر ہے کہ اس فطرتی نظام کو برقرار رکھا جائے۔ واللہ أعلم. اسی طرح جریان حیض کے لیے ادویات کا استعمال بھی جائز ہے۔ اس کی بھی دو شرطیں ہیں: ✱ کسی واجب کے اسقاط کا حیلہ نہ بنایا جائے، مثلاً: رمضان کے آغاز میں ایسی ادویات استعمال کر لی جائیں تاکہ حیض جاری ہو جائے اور رمضان کے روزے نہ رکھے جائیں یا نماز کی ادائیگی سے رخصت مل جائے، ایسا کرنا ناجائز ہے۔ ✱ اس کے متعلق بھی خاوند سے اجازت لینی ہوگی کیونکہ وہ دوران حیض میں اپنی بیوی سے پوری طرح استمتاع نہیں کر سکتا، ہاں! اگر وہ اجازت دے دے تو الگ بات ہے۔ اگر عورت مطلقہ ہے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ جریان حیض ادویات استعمال کر کے اپنی عدت کی مدت کم کرے تاکہ خاوند کا حق رجوع جلدی ختم ہو جائے۔
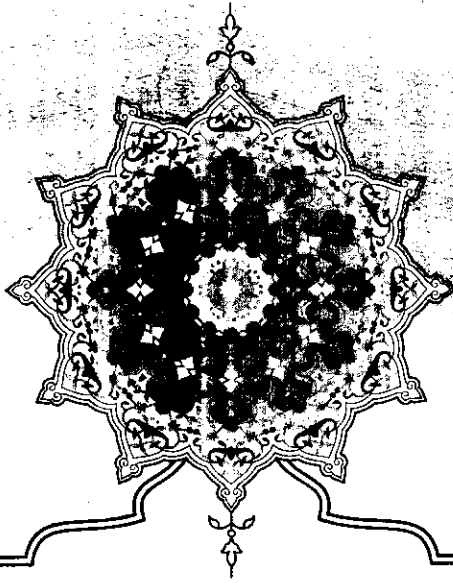
---

[1] صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 228. [2] البقرة 2:195. [3] النساء 4:29.

ارشاد باری تعالیٰ
فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً
فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا
فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ
اگر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔
(المائدة ٥: ٦)

تیمّم کی مشروعیت کا بیان

لغوی لحاظ سے تیمّم کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں بغرض طہارت ہاتھ اور چہرے کے مسح کے لیے پاک مٹی کا قصد کرنا تیمّم کہلاتا ہے۔ گویا تیمّم کی شرعی تعریف میں لغوی حقیقت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جسے دن رات میں پانچ مرتبہ ادا کرنا ضروری ہے اور نماز کے لیے طہارت ایک بنیادی شرط ہے۔ طہارت پانی کی موجودگی میں بآسانی حاصل ہوسکتی ہے لیکن اگر پانی میسر نہ ہو یا پانی تو موجود ہو لیکن اس کے استعمال میں کوئی عذر مانع ہو تو اس صورت میں اگر نماز کا وقت آجائے تو کیا کیا جائے؟ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں: نماز کو ترک کر دیا جائے یا نماز کو طہارت کے بغیر ادا کر لیا جائے۔ شریعت میں یہ دونوں صورتیں ناجائز ہیں کیونکہ کسی بھی صورت میں نماز کا ترک صحیح نہیں اور طہارت کے بغیر اس کا ادا کرنا بھی چنداں فائدہ مند نہیں۔ اب ایک تیسری صورت ہے کہ مجبوری کی حالت میں کوئی ایسی چیز ہو جو وضو کا قائم مقام ہو سکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات میں تیمّم کو مشروع قرار دیا جو وضو کا قائم مقام ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اس کی حکمت سے بایں الفاظ پردہ اٹھاتے ہیں: ''احکام شرائع مقرر کرنے میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ جو امور عام لوگوں کی استطاعت سے باہر ہیں ان میں آسانی اور سہولت پیدا کر دی جاتی ہے۔ اس سہولت کی سب سے مناسب صورت یہ ہے کہ جس چیز کے استعمال کرنے میں دقت ہو اسے ساقط کر کے اس کا کوئی بدل قائم کر دیا جائے تاکہ لوگوں کے دل مطمئن ہو جائیں کہ جس کی وہ سختی سے پابندی کر رہے تھے اسے یکبارگی ترک کر دینے سے پریشان نہ ہوں اور نہ ترک طہارت ہی کے عادی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیماری اور سفر (یا حضر) میں (پانی کے استعمال پر عدم قدرت کی صورت میں) وضو اور غسل کو ساقط کر کے ان کی جگہ تیمّم کو مقرر فرمایا۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ جب طہارت مائیہ صغریٰ (وضو) اور کبریٰ (غسل) اور ان کے متعلقات سے فارغ ہوئے تو طہارت ترابیہ (تیمّم) کا بیان شروع فرمایا: چونکہ وضو اور غسل اصل طہارت ہیں اور تیمّم ان کا قائم مقام ہے، اس لیے پہلے اصل کو بیان کیا اور اس کے بعد قائم مقام کی وضاحت فرمائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت کتاب تیمّم کا آغاز بھی قرآنی

---

1 حجة الله البالغة : 558/1.

آیت سے کیا ہے تاکہ اس کے ماخذ کی نشاندہی ہو جائے، نیز یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ آئندہ جو احادیث و آثار بیان ہوں گے، وہ اسی آیت کریمہ کی تشریح و تبیین ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کا منصب بایں الفاظ بیان فرمایا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ ''یہ ذکر ہم نے آپ کی طرف اس لیے اتارا ہے تاکہ لوگوں کی جانب جو نازل فرمایا گیا ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں۔''[1]

یہ وہی بیان ہے جس کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ ''پھر اس (قرآن) کا واضح کر دینا ہمارے ذمے ہے۔''[2] یعنی اس کے مشکل مقامات کی تشریح اور حلال و حرام کی توضیح بھی ہمارے ذمے ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے مجملات کی جو تفصیل، مبہمات کی توضیح اور اس کے عمومات کی جو تخصیص بیان کی ہے جسے حدیث کہا جاتا ہے، یہ سب اللہ کی طرف سے ہے اور اسے تسلیم کرنا گویا قرآن کریم کو ماننا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی اس مبارک تصنیف میں اسی اصول کو پیش نظر رکھا ہے، پہلے بنیادی ماخذ قرآنی آیت کا حوالہ دیا، پھر اس کی تشریح احادیث و آثار سے فرمائی۔

آپ نے کتاب تیمّم میں نو چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کیے ہیں جن میں دو باب بلاعنوان ہیں، باقی سات ابواب میں مندرجہ ذیل مسائل و احکام بیان کیے ہیں۔

فاقد الطھورین کا کیا حکم ہے؟ جب نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو اور پانی نہ ملے تو حضر میں بھی تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ تیمّم کرنے والا خاک آلود ہاتھوں پر پھونک مار سکتا ہے۔ تیمّم، چہرے اور ہاتھوں کے مسح سے مکمل ہو جاتا ہے۔ جب پانی نہ ملے تو بندۂ مسلم کے لیے پاک مٹی ہی وضو کے پانی کا کام دیتی ہے۔ جب کسی کو پیاس لگی ہو اور وضو کرنے سے پانی ختم ہونے کا اندیشہ ہو یا جنبی آدمی کو پانی استعمال کرنے سے بیماری یا موت کا خطرہ ہو تو پانی کی موجودگی میں بھی تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ تیمّم کرتے وقت صرف ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا کافی ہے۔ اسی طرح بیشتر معارف و حقائق بیان کیے ہیں جن کی ہم آئندہ وضاحت کریں گے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے تیمّم سے متعلقہ احکام و مسائل ثابت کرنے کے لیے سترہ (17) مرفوع احادیث بیان کی ہیں جن میں دس احادیث مکرر ہیں، نیز دو معلق روایات بھی لائے ہیں۔ غیر مکرر احادیث کی تعداد سات ہے جن میں ایک معلق ہے باقی موصول ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے دس آثار بھی پیش کیے ہیں جن میں تین موصول ہیں، یعنی حضرت عمر، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے فتویٰ جات باسند بیان کیے ہیں۔

---

[1] النحل 16:44. [2] القیامۃ 75:19.

مُعلَّق روایت یا اثر کا مطلب ہے: اسے بے سند بیان یا نقل کرنا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی بیان کردہ معلق روایات و آثار کی سندیں دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں جن کی تفصیل حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اپنی شرح ''فتح الباری'' میں بیان کر دیتے ہیں، اس لیے صحیح بخاری میں بے سند (معلق) ہونے کا مطلب، بے سروپا اور بے بنیاد ہونا نہیں بلکہ اختصار کے طور پر سند کا حذف کر دینا ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ ہماری پیش کردہ معروضات کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب تیمم کا مطالعہ فرمائیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ اور وہ ہمیں کتاب و سنت کے مطابق حیات مستعار کے چند دن گزارنے کی توفیق دے۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

7 - كِتَابُ التَّيَمُّمِ

تیمّم سے متعلق احکام و مسائل

[وَ] قَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ﴾ [المائدة: ٦].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''(اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو) پھر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کر لو، پس اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔''

(١) [بَابٌ]:

باب: 1- بلا عنوان

٣٣٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ الْقَاسِمِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ حَتَّى إِذَا كُنَّا بِالْبَيْدَاءِ - أَوْ بِذَاتِ الْجَيْشِ - اِنْقَطَعَ عِقْدٌ لِي، فَأَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْتِمَاسِهِ وَأَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ، وَلَيْسُوا عَلَى مَاءٍ فَأَتَى النَّاسُ إِلَى أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ فَقَالُوا: أَلَا تَرَى إِلَى مَا صَنَعَتْ عَائِشَةُ؟ أَقَامَتْ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ وَالنَّاسِ، وَلَيْسُوا عَلَى مَاءٍ، وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَّاءٌ، فَجَاءَ

[334] نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔ جب ہم بیداء یا ذات الجیش پہنچے تو میرا ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تلاش کے لیے قیام فرمایا تو دوسرے لوگ بھی آپ کے ہمراہ ٹھہر گئے، مگر وہاں کہیں پانی نہ تھا۔ لوگ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ نہیں دیکھتے کہ عائشہ ؓ نے کیا کیا؟ رسول اللہ ﷺ اور سب لوگوں کو ٹھہرا لیا اور یہاں پانی بھی نہیں ملتا اور نہ ان کے پاس پانی ہی ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ آئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میری ران پر سر رکھے محو استراحت تھے۔ صدیق اکبر ؓ

أَبُو بَكْرٍ وَرَسُولُ اللهِ ﷺ وَاضِعٌ رَأْسَهُ عَلَى فَخِذِي قَدْ نَامَ، فَقَالَ: حَبَسْتِ رَسُولَ اللهِ ﷺ وَالنَّاسَ وَلَيْسُوا عَلَى مَاءٍ، وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَاءٌ. فَقَالَتْ عَائِشَةُ: فَعَاتَبَنِي أَبُو بَكْرٍ وَقَالَ مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُولَ، وَجَعَلَ يَطْعُنُنِي بِيَدِهِ فِي خَاصِرَتِي فَلَا يَمْنَعُنِي مِنَ التَّحَرُّكِ إِلَّا مَكَانُ رَسُولِ اللهِ ﷺ عَلَى فَخِذِي، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حِينَ أَصْبَحَ عَلَى غَيْرِ مَاءٍ، فَأَنْزَلَ اللهُ آيَةَ التَّيَمُّمِ، فَتَيَمَّمُوا. فَقَالَ أُسَيْدُ بْنُ الْحُضَيْرِ: مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ أَبِي بَكْرٍ! قَالَتْ: فَبَعَثْنَا الْبَعِيرَ الَّذِي كُنْتُ عَلَيْهِ فَأَصَبْنَا الْعِقْدَ تَحْتَهُ.
[انظر: ٣٣٦، ٣٦٧٢، ٣٧٧٣، ٤٥٨٣، ٤٦٠٧، ٤٦٠٨، ٥١٦٤، ٥٢٥٠، ٥٨٨٢، ٦٨٤٤، ٦٨٤٥]

کہنے لگے: تم نے رسول اللہ ﷺ اور سب لوگوں کو یہاں ٹھہرا لیا، حالانکہ یہاں پانی نہیں ہے اور نہ ہی لوگوں کے پاس ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ابوبکر صدیق ؓ مجھ پر ناراض ہوئے اور جو اللہ کو منظور تھا (برا بھلا) کہا، نیز میری کوکھ میں ہاتھ سے کچوکا لگانے لگے، لیکن میں نے حرکت اس لیے نہ کی کہ میری ران پر رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک تھا۔ صبح کے وقت اس بے آب مقام پر رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آیت تیمّم نازل فرما دی، چنانچہ لوگوں نے تیمّم کر لیا۔ اس وقت حضرت اسید بن حضیر ؓ بولے: اے آل ابوبکر! یہ کوئی تمھاری پہلی برکت نہیں! حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: جس اونٹ پر میں سوار تھی، ہم نے اسے اٹھایا تو اس کے نیچے سے ہار مل گیا۔

فوائد ومسائل: ① قرآن کریم میں دو آیات تیمّم سے متعلق ہیں: ایک سورۂ نساء آیت: 43 اور دوسری سورۂ مائدہ آیت: 6۔ اس روایت میں آیت تیمّم سے کون سی آیت مراد ہے؟ ابن عربی فرماتے ہیں کہ یہ عقدہ بہت پیچیدہ ہے جس کا کوئی حل ہمیں نظر نہیں آتا کیونکہ اگر سورۂ نساء والی آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی تو پانی نہ ملنے کی صورت میں صحابۂ کرام ؓ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر سورۂ نساء والی آیت اس سے پہلے نازل نہیں ہوئی تھی تو اس حکم کو سورۂ نساء میں دوبارہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جبکہ دونوں کے الفاظ اور سیاق بھی ایک جیسا ہے۔ علامہ ابن بطال نے اس کے متعلق تردد کا اظہار کیا ہے جبکہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد سورۂ نساء کی آیت ہے کیونکہ سورۂ مائدہ کی آیت کو آیت وضو کہتے ہیں اور سورۂ نساء میں چونکہ وضو کا ذکر نہیں ہے، اس لیے اس آیت کو آیت تیمّم کہا جاتا ہے۔ لیکن جو بات ان تمام حضرات پر مخفی رہی وہ امام بخاری ؒ کے لیے کسی قسم کے تردد کے بغیر ظاہر ہو گئی۔ انھوں نے فیصلہ فرما دیا کہ اس موقع پر سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی کیونکہ انھوں نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان میں منه کا لفظ ہے۔ یہ لفظ سورۂ نساء میں نہیں بلکہ سورۂ مائدہ میں ہے۔ پھر امام بخاری ؒ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں جو روایت لائے ہیں اس میں اس آیت تیمّم کے آغاز کی صراحت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد سورۂ مائدہ ہی کی آیت ہے۔[1] تنبیہ: امام بخاری ؒ نے سورۂ نساء میں متعلقہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بھی روایت عائشہ ؓ کو بیان کیا ہے لیکن اس کا مطلب شانِ نزول کی وضاحت کرنا نہیں اور نہ یہ اس بات ہی کی دلیل ہے کہ خود امام بخاری بھی اس معاملے میں متردد ہیں جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے۔ ② مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کے ہار کی

1 صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4608.

گمشدگی دو مرتبہ ہوئی۔ اب یہ بات کہ ایک سفر میں دو بار ہار گم ہوا ہو، بعید از قیاس ہے، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ دو مختلف سفروں میں دو مرتبہ ہار گم ہوا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: ایک مرتبہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر حضرت عائشہ ؓ کا ہار گم ہوا جو انھوں نے اپنی بہن حضرت اسماء ؓ سے عاریتاً لیا تھا۔ اس مرتبہ انھوں نے خود ہی تلاش کیا اور اس وقت دستیاب ہوا جب لشکر کوچ کر چکا تھا۔ دوسری مرتبہ غزوۂ ذات الرقاع میں آپ کا ہار گم ہوا۔ اس مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام ؓ کو اس کی تلاش کے لیے بھیجا اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرنے کے سبب اس میدان میں رکنا پڑا۔ طبرانی کی ایک روایت اس موقف کی مؤید ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: جب میرے ہار گم ہو جانے کا واقعہ پیش آیا اور بہتان لگانے والوں نے جو چاہا کہا، پھر اس کے بعد میں دوبارہ کسی غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ گئی، وہاں پھر میرا ہار گم ہو گیا اور لوگوں کو اس کی تلاش کے لیے رکنا پڑا تو اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے کہا بیٹی! تو ہر سفر میں لوگوں کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر دیتی ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے تیمم کی رخصت نازل فرمائی۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ ؓ کا ہار دوبار گم ہوا اور تیمم کی آیت دوسرے سفر سے متعلق ہے۔ اگرچہ اس روایت کی سند میں محمد بن حمید رازی کی وجہ سے کلام کیا گیا ہے، تاہم تائید وشواہد میں اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ ذات الرقاع سے متعلق ہے۔ یہ غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔ غزوۂ خیبر سات ہجری میں ہوا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ جب آیت تیمم نازل ہوئی تو میں نہیں جانتا تھا کہ تیمم کا عمل کیسے کروں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت تیمم کے نزول کے وقت حضرت ابوہریرہ ؓ موجود تھے کیونکہ آپ خیبر کے موقع پر حاضر ہوئے تھے جبکہ غزوۂ بنی مصطلق چھ ہجری میں ہو چکا تھا، نیز حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ جو غزوۂ خیبر کے موقع پر یمن سے آئے تھے، ان کی غزوۂ ذات الرقاع میں شرکت سے بھی اس موقف کی مزید تائید ہوتی ہے۔[1] ③ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس ان کی دختر نیک اختر حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے متعلق شکایت کی کہ ہمیں اس بے آب و گیاہ میدان میں ان کی وجہ سے رکنا پڑا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ آپ نے حضرت عائشہ ؓ کو ملامت کرنا شروع کر دی کہ تمھاری بے احتیاطی کی وجہ سے لوگوں کو اس لق و دق میدان میں رکنا پڑا اور ان کی نمازیں پانی نہ ملنے کی وجہ سے قضا ہونے والی ہیں۔ آپ نے ہاتھ سے بھی حضرت عائشہ ؓ کو کچوکے لگائے۔ اس انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اجنبی آدمی کسی کو اس کی غلطی پر تنبیہ کر رہا ہو۔ تنبیہ کا یہ انداز شفقت پدری کے خلاف تھا کہ زبان سے بھی ملامت اور ہاتھ سے بھی طعن۔ اس بنا پر حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: ابوبکر ؓ مجھ پر عتاب فرمانے لگے۔ اور آپ نے ان کے لیے ''پدر بزرگوار'' کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے۔[2]

٣٣٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ؛ ح: قَالَ: وَحَدَّثَنِي سَعِيدُ بْنُ النَّضْرِ قَالَ: أَخْبَرَنَا هُشَيْمٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا سَيَّارٌ قَالَ:

[335] حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں: ایک یہ کہ مجھے ایک مہینے کی

① فتح الباري : 564/1. ② فتح الباري : 562/1.

حَدَّثَنَا يَزِيدُ الْفَقِيرُ قَالَ: أَخْبَرَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَّمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي، وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً». [انظر: ٤٣٨، ٣١٢٢]

مسافت پر بذریعۂ رعب مدد دی گئی ہے۔ دوسری یہ کہ تمام روئے زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔ اب میری امت میں جس شخص کو نماز کا وقت آ جائے اسے چاہیے کہ وہیں نماز پڑھ لے۔ تیسری یہ کہ میرے لیے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا ہے جبکہ اس سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھا۔ چوتھی یہ کہ مجھے شفاعت (کبریٰ) عطا کی گئی ہے۔ پانچویں یہ کہ پہلے نبی خاص اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوا کرتا تھا، مگر میں تمام لوگوں کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں۔''

فوائد ومسائل: ① اس حدیث میں مفہوم عدد کو تمام محدثین نے غیر معتبر قرار دیا ہے کیونکہ دیگر احادیث کے پیش نظر خصائص نبویہ اس عدد میں منحصر نہیں، چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنی تالیف الخصائص الکبریٰ میں بے شمار خصائص ذکر کیے ہیں جو سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے دیگر طرق کو مدنظر رکھتے ہوئے متعدد خصائص کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کچھ حسب ذیل ہیں: ○ رسول اللہ ﷺ کو جوامع الکلم عطا کیے گئے۔[1] ○ آپ کی آمد کے ساتھ منصب نبوت کو سربمہر کر دیا گیا۔[2] ○ آپ کی امت کی صف بندی کو فرشتوں کی صفوں جیسا قرار دیا گیا۔[3] ○ آپ کو سورۂ بقرہ کی آخری آیات دی گئیں جو عرش کے خزانوں میں سے ہیں۔[4] ○ آپ کو روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں عنایت کی گئیں۔[5] ○ آپ کی امت کو بہترین امت قرار دیا گیا۔[6] ○ قیامت کے دن آپ کو حوض کوثر اور حمد کا جھنڈا دیا جائے گا۔[7] ○ آپ کا قرین (شیطان) آپ کے تابع کر دیا گیا۔[8] امام ابوسعید نیشاپوری نے اپنی تالیف ''شرف المصطفیٰ'' میں ایسی ساٹھ خصلتوں کا ذکر کیا ہے جو آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔[9] ② امم سابقہ میں یہ پابندی تھی کہ وہ نماز کی ادائیگی اپنے کنیسوں اور عبادت گاہوں میں کریں جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے پہلے لوگوں کو نمازیں اپنے کنائس میں پڑھنے کا پابند کیا گیا تھا۔''[10] لیکن اس امت کے لیے نماز کے لیے مقامات کی تعیین کو اٹھا دیا گیا۔ اس کی وضاحت حدیث میں بایں طور ہے کہ میری امت میں جس شخص کو جس جگہ بھی نماز کا وقت آ جائے، اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ نوافل کے لیے مسجد کی پابندی ضروری نہیں، البتہ فرض نماز حتی المقدور مسجد ہی میں ادا کرنی چاہیے جیسا کہ حدیث میں ہے: جو شخص اذان سنتا ہے، پھر نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہے۔ ہاں! اگر کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔[11] علامہ خطابی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں: یقیناً

---

1 صحيح مسلم، المساجد، حديث :1167(523). 2 صحيح البخاري، المناقب، حديث : 3535. 3 صحيح مسلم، الصلاة، حديث :968(430). 4 مسند أحمد : 151/5. 5 صحيح البخاري، الجنائز، حديث : 1344. 6 جامع الترمذي، تفسير القرآن، حديث : 3001. 7 صحيح البخاري، التفسير، حديث : 4964، و جامع الترمذي، تفسير القرآن، حديث : 3148. 8 صحيح مسلم، صفات المنافقين، حديث 7108(2814). 9 فتح الباري: 569/1. 10 فتح الباري: 567/1. 11 سنن ابن ماجه، المساجد والجماعات، حديث : 793.

رسول اللہ ﷺ نے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا ہے، تاہم ایک دوسری حدیث کے پیش نظر اس سے دو مقامات کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قبرستان اور حمام کے علاوہ تمام روئے زمین مسجد ہے۔[1] نیز اجماع امت کو مدنظر رکھتے ہوئے نجس مقامات بھی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ نماز کی ادائیگی کے لیے جگہ کا پاک ہونا بھی ضروری ہے۔[2] علامہ خطابی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں کہ اس میں لفظ ارض مجمل ہے جس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں کی گئی ہے کہ اس سے مراد زمین کی مٹی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لیے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر ہم پانی حاصل نہ کرسکیں تو اس کی مٹی کو ہمارے لیے طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔''[3] اس سے معلوم ہوا کہ تیمم صرف زمین کی مٹی سے ہوسکتا ہے اس کے علاوہ زمین کے دیگر اجزاء سے تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔[4] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے حدیث مسلم میں آنے والے لفظ تربة کے پیش نظر تیمم کے لیے صرف مٹی کے کارآمد ہونے والے موقف پر اعتراض کیا ہے کہ تربة سے صرف مٹی مراد لینا درست نہیں، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ایک روایت میں واضح طور پر لفظ تراب آیا ہے جس کے معنی مٹی کے ہیں، چنانچہ ارشاد نبوی ہے کہ میرے لیے مٹی کو طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔[5] اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں بھی لفظ تراب ہے جسے امام احمد اور امام بیہقی نے بیان کیا ہے۔[6]

نوٹ: حدیث میں وارد دیگر خصائص نبویہ کی تشریح کتاب الجہاد، حدیث: 3122 میں کی جائے گی۔

(٢) بَابٌ: إِذَا لَمْ يَجِدْ مَاءً وَّلَا تُرَابًا

باب: 2- جب نمازی پانی نہ پا سکے اور نہ مٹی دستیاب ہو (تو کیا کرے؟)

وضاحت: جس شخص کو پاک مٹی میسر نہ آئے اور نہ پانی کا کوئی انتظام ہو تو فقہاء کی اصطلاح میں اسے فاقد الطہورین کہا جاتا ہے۔ اس کی درج ذیل صورتیں ہیں: * ایک شخص کسی ایسے قید خانے میں محبوس ہے جس کی زمین اور در و دیوار پاک نہیں اور وہاں پانی بھی نہیں ہے۔ * ایک شخص ایسی کشتی میں سوار ہے کہ دریا یا سمندر سے پانی نہیں لیا جاسکتا۔ ایسے شخص کے متعلق نماز کی ادائیگی کیونکر ہوسکتی ہے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص تیمم اور وضو کے بغیر ہی نماز پڑھے اور اس کا اعادہ بھی نہ کرے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف بھی یہی ہے۔ آپ نے اس مسئلے میں حنابلہ کی موافقت کی ہے۔[7]

٣٣٦ - حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا اسْتَعَارَتْ مِنْ أَسْمَاءَ

[336] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے ایک ہار حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستعار لیا جو گم ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اس کی تلاش کے لیے روانہ کیا۔ وہ

---

(1) سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 492. (2) إعلام الحديث، شرح البخاري: 333/1. (3) صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1165(522). (4) إعلام الحديث، شرح البخاري: 334/1. (5) صحيح ابن خزيمة: 132/1. (6) فتح الباري: 568/1. (7) شرح تراجم بخاري.

قِلَادَةً فَهَلَكَتْ، فَبَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلًا فَوَجَدَهَا، فَأَدْرَكَتْهُمُ الصَّلَاةُ وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَّاءٌ، فَصَلَّوْا فَشَكَوْا ذٰلِكَ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَنْزَلَ اللهُ آيَةَ التَّيَمُّمِ. فَقَالَ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ لِّعَائِشَةَ: جَزَاكِ اللهُ خَيْرًا، فَوَاللهِ! مَا نَزَلَ بِكِ أَمْرٌ تَكْرَهِينَهُ إِلَّا جَعَلَ اللهُ ذٰلِكِ لَكِ وَلِلْمُسْلِمِينَ فِيهِ خَيْرًا. [راجع: ٣٣٤]

اسے مل گیا لیکن ان لوگوں کو نماز کا وقت ایسی حالت میں آیا کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے (ویسے ہی) نماز ادا کر لی۔ جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت نازل فرما دی۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: اللہ تمھیں جزائے خیر دے، اللہ کی قسم! جب بھی تم پر کوئی ایسی بات آ پڑی جسے تم ناگوار خیال کرتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس میں تمھارے لیے اور تمام مسلمانوں کے لیے خیر و برکت عطا فرما دی۔

فائدہ: فاقدالطہورین (پانی اور مٹی دونوں چیزیں نہ پانے والے) کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہ موقف ہے کہ وہ ایسی حالت میں وضو اور تیمّم کے بغیر نماز ادا کر لے، اس کی نماز صحیح ہوگی اور اس کے ذمے کوئی قضا وغیرہ نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔''[1] نیز قرآن مجید میں ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''[2] رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جب میں تمھیں کسی کام کے متعلق حکم دوں تو حسب استطاعت بجا لاؤ اور جب تمھیں کسی چیز سے منع کروں تو وہ چھوڑ دو۔''[3] گویا تکلیف بقدر طاقت ہے۔ اور ایسا شخص جسے نماز تو ادا کرنی ہے لیکن پانی یا مٹی، جس سے طہارت حاصل کر سکے، میسر نہیں تو اپنی استطاعت کے مطابق یہی کچھ کر سکتا ہے کہ اسی حالت میں نماز پڑھے اور اللہ سے توبہ و استغفار کرے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے کیونکہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء جب ہار کی تلاش میں نکلے تو ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں آلۂ طہارت (پانی اور مٹی) موجود نہیں تھا۔ پانی کے متعلق تو حدیث میں وضاحت ہے کہ وہ تھا ہی نہیں اور مٹی اس طرح موجود نہ تھی کہ اس وقت تیمّم کا حکم ہی نہ اترا تھا۔ اس بنا پر انھوں نے یوں ہی نماز پڑھ لی، چنانچہ حدیث کے بعض طرق میں صراحت ہے کہ انھوں نے وضو کے بغیر نماز ادا کی۔[4] استدلال کا مدار اس بات پر ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے جو نماز وضو کے بغیر پڑھی تھی، اسے برقرار رکھا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو راویٔ حدیث ضرور اس کا ذکر کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کی وہی بلا طہارت نماز صحیح قرار دی گئی کیونکہ اگر نماز کا اعادہ ضروری ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے ضرور بیان کرتے اور ضرورت کے وقت بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ اگرچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس موقف پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اس نماز کا اعادہ فوراً واجب نہیں تھا، اس لیے ضرورت کے وقت بیان مؤخر نہیں ہوا۔[5] لیکن یہ اعتراض اس لیے صحیح نہیں کہ جب نماز کے ادا کرنے کا تقاضا موجود تھا تو اس کا اعادہ بھی فوری طور پر واجب تھا لیکن رسول اللہ

---

[1] التغابن 16:64. [2] البقرة 286:2. [3] صحيح البخاري، الاعتصام، حديث: 7288. [4] صحيح البخاري، الفضائل، حديث: 3773. [5] فتح الباري: 570/1.

ﷺ نے انھیں اعادے کا حکم نہیں دیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کے متعلق اپنی ذمے داری سے فارغ ہو چکے تھے۔ علامہ خطابی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے لیکن انھوں نے اسے بایں طور مشروط کیا ہے کہ جب حالات سازگار ہوں، یعنی پانی یا مٹی میسر ہو تو نماز از سرنو ادا کرنی ہو گی۔[1] لیکن اس کے لیے انھوں نے کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: ''مؤلف نے اس موقف کو ظاہر حدیث سے ثابت کیا ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب لوگوں نے اس تکلیف کا اظہار کیا تو آپ نے انھیں نماز دہرانے کا حکم نہیں دیا، مگر فرق یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے فقدان تراب، یعنی مٹی کا نہ ملنا حکمی تھا، اس لیے تیمم بھی ان کے لیے مشروع و مقرر نہ کیا گیا۔ اور آج کل اگر ایسی صورت بن جائے تو یہاں فقدانِ حقیقی ہوگا اور اسے بھی حکمی کے دائرے میں شمار کیا جائے گا، یعنی اس حالت میں ادا کی ہوئی نماز جائز ہو جائے گی، اس کا دوبارہ پڑھنا لازم نہیں ہوگا۔'' واللہ أعلم.

(۳) بَابُ التَّيَمُّمِ فِي الْحَضَرِ إِذَا لَمْ يَجِدِ الْمَاءَ وَخَافَ فَوْتَ الصَّلَاةِ

باب: 3- اگر پانی دستیاب نہ ہو اور نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو حضر میں تیمم کرنا

وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ، وَقَالَ الْحَسَنُ فِي الْمَرِيضِ عِنْدَهُ الْمَاءُ وَلَا يَجِدُ مَنْ يُنَاوِلُهُ: يَتَيَمَّمُ. وَأَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ مِنْ أَرْضِهِ بِالْجُرُفِ فَحَضَرَتِ الْعَصْرُ بِمِرْبَدِ الْغَنَمِ فَصَلَّى، ثُمَّ دَخَلَ الْمَدِينَةَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ فَلَمْ يُعِدْ.

حضرت عطاء بن ابی رباح بھی اسی کے قائل ہیں۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے اس مریض کے متعلق فرمایا جس کے پاس پانی ہو لیکن اسے دینے والا موجود نہ ہو، وہ تیمم کر لے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی اس زمین سے واپس ہوئے جو مقام جرف میں تھی، مربد غنم کے مقام پر عصر کا وقت ہو گیا تو آپ نے وہیں نماز ادا کر لی۔ پھر جب مدینہ منورہ آئے تو آفتاب بلند تھا لیکن آپ نے نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

وضاحت: قرآن کریم میں تیمم کے لیے سفر کی قید موجود ہے، اس لیے سوال پیدا ہوا کہ حضر (حالت اقامت) میں اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ جس ضرورت کے پیش نظر تیمم کی اجازت سفر میں دی گئی ہے اگر اس قسم کی کوئی ضرورت حضر میں پیش آ جائے تو تیمم درست ہے۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضر میں پانی نہ ملے تو فوراً تیمم نہیں کرنا چاہیے بلکہ انتظار کیا جائے شاید کہیں سے پانی کا انتظام ہو جائے لیکن جب مزید انتظار میں نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عطاء بن ابی رباح کے اثر کو مصنف عبدالرزاق (283/1) اور مصنف ابن ابی شیبہ (294/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اس اثر میں ادا کردہ نماز کے متعلق وجوب اعادہ سے تعرض نہیں کیا گیا۔[2] حسن بصری کے اثر کو علامہ اسماعیل القاضی نے اپنی کتاب ''الأحکام'' میں موصولاً بیان کیا

[1] إعلام الحديث :339/1. [2] فتح الباري : 571/1.

ہے، نیز مصنف ابن ابی شیبہ (294/1) میں حضرت حسن بصری اور ابن سیرین سے مروی ہے کہ نماز کے وقت کے اندر اگر پانی ملنے کی امید ہو تو اسے تیمم نہیں کرنا چاہیے۔[1] جرف، مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں غزوے کے موقع پر لشکر جمع کیا جاتا تھا۔ اور مربد غنم مدینے سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں پہنچ کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عصر کی نماز پڑھی۔ اس روایت کے دوسرے طرق میں تصریح ہے کہ آپ نے تیمم کیا اور نماز عصر ادا کی، پھر مدینے پہنچ کر نماز کا اعادہ نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مقیم کے لیے تیمم جائز خیال کرتے تھے کیونکہ مربد غنم مدینے سے اتنے فاصلے پر نہیں کہ اس کو سفر شرعی کا درجہ دیا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حضر میں بھی شرائط تیمم پائی جائیں تو تیمم کر کے ادا کردہ نماز صحیح ہے، اس کے اعادے کی ضرورت نہیں، لیکن یہاں ایک اشکال ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک حضر میں تیمم کرنے کی دو شرطیں ہیں: * خروج وقت کا اندیشہ۔ * پانی کا نہ ہونا۔ اگر پانی موجود ہے لیکن اس کے استعمال کی قدرت نہیں تو اسے بھی پانی کا فقدان ہی شمار کیا جائے گا۔ یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مدینے سے صرف ایک میل کے فاصلے پر ہیں، اگر وقت کے اندر وہاں پہنچنا چاہیں تو پہنچ سکتے ہیں، چنانچہ نماز کے بعد روانہ ہوئے اور وقت کے اندر پہنچ بھی گئے، اس لیے حضرت امام بخاری کی شرط پوری نہیں ہو رہی۔ استدلال تو اس صورت میں صحیح ہوتا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما انتظار کرتے، جب وقت ختم ہوتا دیکھتے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لیتے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ شاید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو مربد غنم میں دیر تک ٹھہرنا ہو اور یقین ہو کہ میں جس ضرورت سے یہاں ٹھہرا ہوں اس کے پورا ہونے میں اتنی دیر ضرور لگے گی کہ وقت کے اندر اندر مدینے نہیں پہنچ سکوں گا، اس لیے انھوں نے تیمم سے عصر کی نماز پڑھ لی پھر یا تو خلاف توقع ضرورت جلدی پوری ہوگئی یا ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے فوراً مدینے کا رخ کر لیا اور وقت کے اندر اندر وہ مدینہ پہنچ گئے۔[2]

٣٣٧ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ رَبِيعَةَ، عَنِ الْأَعْرَجِ، قَالَ: سَمِعْتُ عُمَيْرًا مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: أَقْبَلْتُ أَنَا وَعَبْدُ اللهِ بْنُ يَسَارٍ مَّوْلَى مَيْمُونَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ حَتَّى دَخَلْنَا عَلَى أَبِي جُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ الْأَنْصَارِيِّ، فَقَالَ أَبُو جُهَيْمٍ: أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ.

[337] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام عمیر کہتے ہیں کہ میں اور نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام عبداللہ بن یسار ابوجہیم بن حارث بن صمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ ایک دفعہ بئر جمل سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں ایک شخص ملا اور اس نے آپ کو سلام کیا لیکن نبی ﷺ نے اس کا جواب نہ دیا یہاں تک کہ آپ ایک دیوار کے پاس آئے اور اس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کیا، یعنی تیمم فرمایا، پھر اس کے سلام کا جواب دیا۔

[1] فتح الباري: 572/1. [2] فتح الباري: 572/1.

فوائد ومسائل: ① دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بئر جمل سے واپسی کے وقت جو شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا وہ خود راوی حدیث حضرت ابوجہیم بن حارث انصاری ہیں، صحیح بخاری کی روایت میں اختصار ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ ابوجہیم نے جس وقت سلام کیا، رسول اللہ ﷺ باوضو نہیں تھے، اس لیے آپ نے سلام کا جواب نہ دیا، پھر جب ابوجہیم گلی میں مڑنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فوراً دیوار پر تیمّم کر کے جواب دیا اور وضاحت فرمائی کہ مجھے یہ بات پسند نہ تھی کہ طہارت کے بغیر اللہ کا نام زبان پر لاؤں، اس لیے تیمّم کے بعد جواب دیا ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب فوت ہونے کے اندیشے سے تیمّم فرمایا، حالانکہ اذکار وسلام کے لیے طہارت شرط نہیں۔ پھر اگر حضر میں نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو بدرجۂ اولیٰ تیمّم کی اجازت ہونی چاہیے جبکہ پانی دستیاب نہ ہو اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو۔[2] ② روایات میں ایک اور واقعہ بھی منقول ہے جو حضرت مہاجر بن قنفذ سے متعلق ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ ایسی حالت میں سلام کیا جب آپ پیشاب کر رہے تھے۔ اس وقت آپ نے جواب نہیں دیا کیونکہ ایسے وقت میں اللہ کا نام لینا پسندیدہ نہیں۔ اس کا جواب آپ نے وضو کے بعد دیا۔[3]

(٤) بَابُ الْمُتَيَمِّمِ هَلْ يَنْفُخُ فِيهِمَا؟

باب: 4- جب تیمّم کے لیے مٹی پر ہاتھ مارے تو کیا ہاتھوں پر پھونک ماری جاسکتی ہے؟

وضاحت: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ مٹی پر ہاتھ مار کر ان کو جھاڑنا اس وقت ہے جب ہاتھوں پر مٹی زیادہ لگ جائے۔ تیمّم چونکہ وضو کا قائم مقام ہے، اس لیے پانی کی طرح بظاہر تمام اعضاء پر مٹی پہنچانے کا اہتمام بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کا ازالہ کرتے ہیں کہ مسح کا اہتمام تو ہونا چاہیے لیکن تمام اعضاء پر مٹی کا لگانا ضروری نہیں۔

٣٣٨ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا الْحَكَمُ عَنْ ذَرٍّ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزَى، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ: إِنِّي أَجْنَبْتُ فَلَمْ أُصِبِ الْمَاءَ، فَقَالَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ: أَمَا تَذْكُرُ أَنَّا كُنَّا فِي سَفَرٍ أَنَا وَأَنْتَ؟ فَأَمَّا أَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ، وَأَمَّا أَنَا فَتَمَعَّكْتُ فَصَلَّيْتُ، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ النَّبِيُّ

[338] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ فرماتے ہیں: ایک شخص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: مجھے جنابت لاحق ہوگئی ہے لیکن پانی نہیں مل سکا۔ اس موقع پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اور آپ دونوں سفر میں تھے اور جنبی ہو گئے تھے؟ آپ نے تو نماز نہیں پڑھی تھی لیکن میں نے مٹی میں لوٹ پوٹ ہو کر نماز پڑھ لی تھی۔ پھر میں نے نبی ﷺ سے ذکر کیا تو نبی ﷺ

① عمدة الأحكام: 204/3. ② فتح الباري: 573/1. ③ سنن النسائي، الطهارة، حديث: 38.

ﷺ: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هٰكَذَا» وَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ، وَنَفَخَ فِيهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ. [انظر: ٣٣٩، ٣٤٠، ٣٤١، ٣٤٢، ٣٤٣، ٣٤٥، ٣٤٦، ٣٤٧]

نے فرمایا: ''تیرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔'' یہ فرما کر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے، پھر ان میں پھونک ماری اس کے بعد آپ نے ان سے اپنے منہ اور ہاتھوں پر مسح فرمایا۔

فائدہ: بعض حضرات کا خیال ہے کہ جب تک مٹی کا اثر تیمّم کے وقت چہرے اور ہاتھوں پر نمایاں نہ ہو اس وقت تک مٹی کا استعمال درست نہیں۔ بعض شوافع کا یہ بھی خیال ہے کہ تیمّم کے لیے زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ غبار ہاتھوں کو لگ جائے، تب تیمّم درست ہو گا جبکہ امام بخاری ؒ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پانی کی طرح مٹی کے اثرات کا چہرے اور ہاتھوں پر نمایاں ہونا ضروری نہیں۔ مٹی سے آلودہ ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا طہارت و نظافت کے خلاف ہے، اس لیے تیمّم کے لیے مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد ہاتھوں پر پھونک مار کر زائد مٹی کو اڑا دیا جائے، اس کے بعد چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا جائے۔ امام بخاری ؒ اس سلسلے میں جو روایت لائے ہیں وہ مختصر ہے کیونکہ روایتِ بخاری میں سائل کے جواب میں سیدنا عمر ؓ کا جواب منقول نہیں ہے، البتہ دیگر طُرُق روایت میں ہے کہ حضرت عمر ؓ نے فرمایا: جنابت کے بعد اگر پانی نہ مل سکے تو نماز نہیں پڑھنی چاہیے جیسا کہ سنن نسائی وغیرہ میں ہے کہ میں اگر پانی نہ پاؤں تو نماز نہیں پڑھتا ہوں تا آنکہ مجھے پانی میسر آ جائے، یعنی غسل کر کے نماز پڑھوں گا۔[1] بہرحال امام بخاری ؒ کی پیش کردہ روایت سے ان کا مدعا پورا ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہاتھوں کو زمین پر مارنے کے بعد ان میں پھونک مارنے کی صراحت ہے۔ اب اس میں ایک اشکال ہے کہ جب روایت میں پھونک مارنے کی صراحت ہے تو امام بخاری ؒ نے عنوان میں لفظ هَلْ کیوں استعمال کیا ہے؟ اس کا جواب حافظ ابن حجر ؒ نے بایں طور دیا ہے: احتمال تھا کہ آپ کا پھونک مارنا مٹی کی وجہ سے ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ ہاتھ پر کسی تنکے وغیرہ کے لگ جانے کی بنا پر ہو، یا رسول اللہ ﷺ پھونک مارنے کی مشروعیت بیان کرنا چاہتے ہوں۔ ان احتمالات کی بنا پر امام بخاری ؒ نے عنوان میں لفظ هَلْ استعمال فرمایا ہے۔[2] امام بخاری ؒ کے اصول موضوعہ میں سے ہے کہ جہاں احتمالات ہوں وہاں عنوان کو هَلْ کے ساتھ مقید کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات کسی خاص وجہ سے اللہ کے ہاں گرد و غبار کی بہت اہمیت ہوتی ہے جیسا کہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے وقت جو گرد و غبار اڑتی ہے اور مجاہد کے قدموں پر یا نتھنوں میں پڑتی ہے۔ اسی طرح تیمّم کا گرد و غبار بھی اللہ ہی کے لیے ہوتا ہے، لہٰذا عقلی تقاضا ہے کہ اسے دور کرنے کے لیے پھونک نہ ماری جائے۔ امام بخاری ؒ نے اس کی وضاحت فرما دی کہ عقلی تقاضے کے مقابلے میں نص پر عمل کیا جائے گا اور وہ ہے زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد ہاتھوں پر پھونک مارنا۔

(٥) بَابُ التَّيَمُّمِ لِلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ

باب: 5- تیمّم صرف چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے لیے ہے

٣٣٩ - حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنِ

[339] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ ؓ سے روایت ہے

[1] سنن النسائي، الطهارة، حديث: 317. [2] فتح الباري: 574/1.

الْحَكَمِ، عَنْ ذَرٍّ، عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزٰى، عَنْ أَبِيهِ: قَالَ عَمَّارٌ بِهٰذَا، وَضَرَبَ شُعْبَةُ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ؛ ثُمَّ أَدْنَاهُمَا مِنْ فِيهِ، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ. [راجع: ٣٣٨]

کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے تیمم کے متعلق یہ سب واقعہ بیان کیا (پہلی روایت کی طرف اشارہ ہے) اور شعبہ (ایک راوی) نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا، پھر دونوں ہاتھ اپنے منہ کے قریب کیے، پھر اپنے منہ اور دونوں ہتھیلیوں پر مسح کیا۔

وَقَالَ النَّضْرُ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ قَالَ: سَمِعْتُ ذَرًّا يَقُولُ: عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ أَبْزٰى. قَالَ الْحَكَمُ: وَقَدْ سَمِعْتُهُ مِنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ عَمَّارٌ: وُضُوءُ الْمُسْلِمِ يَكْفِيهِ مِنَ الْمَاءِ.

نضر (بن شمیل) کی روایت کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (پاک مٹی) مسلمان کا وضو ہے، پانی کی جگہ وہ (مسلمان کو) کافی ہوتی ہے، یعنی جب پانی دستیاب نہ ہو۔

٣٤٠ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ سَمِعْتُ ذَرًّا، عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزٰى، عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ شَهِدَ عُمَرَ، وَقَالَ لَهُ عَمَّارٌ: كُنَّا فِي سَرِيَّةٍ فَأَجْنَبْنَا. وَقَالَ: تَفَلَ فِيهِمَا. [راجع: ٣٣٨]

[340] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے جب ان سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم دونوں ایک چھوٹے لشکر میں تھے کہ دونوں کو جنابت لاحق ہوگئی۔ مزید کہا: رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر اتنی زور سے پھونک ماری کہ اس میں قدرے لعاب دہن بھی شامل ہوگیا۔

٣٤١ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيرٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ ذَرٍّ، عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزٰى، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ عَمَّارٌ لِعُمَرَ: تَمَعَّكْتُ فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ: «يَكْفِيكَ الْوَجْهُ وَالْكَفَّانِ». [راجع: ٣٣٨]

[341] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا۔ پھر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: ”تجھے اپنے منہ اور دونوں ہتھیلیوں پر مسح کرنا ہی کافی تھا۔“

٣٤٢ - حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ عَنْ شُعْبَةَ، عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ ذَرٍّ، عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزٰى، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ: شَهِدْتُ عُمَرَ قَالَ لَهُ عَمَّارٌ. وَسَاقَ الْحَدِيثَ. [راجع: ٣٣٨]

[342] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا، ان سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے کہا، پھر انھوں نے حدیث (سابق) بیان کی۔

٣٤٣ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ ذَرٍّ، عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبْزٰى، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قَالَ عَمَّارٌ: فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِيَدِهِ الْأَرْضَ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ. [راجع: ٣٣٨]

[343] حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت عمار ؓ نے فرمایا: پھر نبی ﷺ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا، پھر اپنے منہ اور ہتھیلیوں پر مسح فرمایا۔

فوائد و مسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ کا مذہب اس مسئلے میں وہی ہے جو اصحاب ظواہر اور بعض مجتہدین کا ہے کہ تیمم چہرے اور ہتھیلیوں کا ہونا چاہیے کہنیوں تک کی قید ضروری نہیں، حالانکہ جمہور اس کے خلاف ہیں۔ اصحاب ظواہر کا مسلک یہ ہے کہ تیمم میں مسح کفین تک ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بھی یہی موقف ہے۔ امام بخاری ؒ پیش کردہ روایات سے اسی موقف کی تائید فرما رہے ہیں۔ حافظ ابن حجر امام بخاری ؒ کے موقف کی بایں الفاظ وضاحت کرتے ہیں: واجب یہی ہے کہ تیمم میں صرف ہتھیلیوں اور چہرے کا مسح کیا جائے۔ امام بخاری ؒ نے صیغۂ جزم کے ساتھ عنوان بندی کی ہے، حالانکہ اس میں اختلاف مشہور ہے کیونکہ امام بخاری ؒ اس کے لیے بڑی مضبوط دلیل رکھتے ہیں۔ صفت تیمم کے متعلق جس قدر احادیث منقول ہیں، ان میں صرف ابوجہیم اور حضرت عمار کی احادیث صحیح ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر احادیث ضعیف ہیں یا ان کے موقوف یا مرفوع ہونے میں اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ موقوف ہیں۔ حضرت ابوجہیم کی حدیث میں ہاتھوں کا ذکر مجمل طور پر آیا ہے اور حضرت عمار ؓ کی حدیث میں ہتھیلیوں کا ذکر ہے جیسے صحیحین میں بیان کیا گیا ہے۔ البتہ کہنیوں، نصف کلائی اور بغلوں کا ذکر کتب سنن میں ہے، جن روایات میں نصف کلائی یا کہنیوں کا ذکر ہے ان میں تو بہت کلام کیا گیا ہے، البتہ جن روایات میں بغلوں کا ذکر ہے اس کے متعلق امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر یہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ثابت ہے تو آپ کے عملی طریقے نے اسے منسوخ کر دیا ہے اور اگر آپ کے حکم سے ایسا کرنا ثابت نہیں تو وہ دلیل کیونکر بن سکتا ہے۔ صحیحین کی روایت میں جو ہتھیلیوں اور چہرے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کی تائید حضرت عمار ؓ کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صرف چہرے اور ہتھیلیوں پر مسح کرنے کا فتویٰ دیتے تھے۔ حدیث کا راوی ہی حدیث کی مراد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، خاص طور پر جب وہ مجتہد بھی ہو۔[1] امام ترمذی ؒ نے بعض اہل علم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حدیث عمار اضطراب کی وجہ سے قابل حجت نہیں ہے کیونکہ اس کے بعض طرق میں کندھوں اور بغلوں تک مسح کرنے کا ذکر ہے۔ امام بخاری ؒ نے اپنے مختلف چھ مشائخ سے بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ ہتھیلیوں اور چہرے کے مسح والی روایت بہ نسبت دوسری روایات کے راجح ہے۔ اور جس روایت میں کندھوں اور بغلوں کا ذکر ہے[2] اس کا جواب امام ترمذی ؒ نے بایں الفاظ نقل کیا ہے کہ وہ چہرے اور ہتھیلیوں والی روایت کے خلاف نہیں کیونکہ حضرت عمار ؓ یہ نہیں کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کندھوں اور بغلوں تک مسح کرنے کا حکم دیا تھا بلکہ انھوں نے اپنی طرف سے یہ کام کیا تھا، پھر جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے صرف ہتھیلیوں اور چہرے پر مسح کرنے کا حکم دیا، پھر حضرت عمار ؓ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد بھی

① فتح الباري: 576/1. ② سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 318.

فتویٰ دیتے تھے کہ تیمّم کرتے وقت ہتھیلیوں اور چہرے ہی کا مسح کیا جائے۔[1] ② حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ کسی نے ان سے تیمّم کے متعلق سوال کیا تو آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے وضو کے متعلق فرمایا ہے: ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ "تم اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھوؤ۔"[2] اور تیمّم کے متعلق فرمایا ہے: ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ "اپنے چہرے اور ہاتھوں کا پاک مٹی سے مسح کرو۔"[3] چور کے ہاتھ کاٹنے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا﴾ "چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت اس کے ہاتھ کاٹ دو۔"[4] سنت نے اس کی وضاحت کی ہے کہ چوری میں ہتھیلیوں کو کاٹا جائے، اسی طرح تیمّم کے سلسلے میں بھی وضاحت ہے کہ صرف ہاتھ اور ہتھیلیوں کا مسح کیا جائے۔[5]

(٦) بَابٌ: اَلصَّعِيدُ الطَّيِّبُ وَضُوءُ الْمُسْلِمِ، يَكْفِيهِ عَنِ الْمَاءِ

باب: 6- پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے اور اسے پانی کے بدلے کافی ہے

وَقَالَ الْحَسَنُ يُجْزِئُهُ التَّيَمُّمُ مَا لَمْ يُحْدِثْ. وَأَمَّ ابْنُ عَبَّاسٍ وَهُوَ مُتَيَمِّمٌ. وَقَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ: لَا بَأْسَ بِالصَّلَاةِ عَلَى السَّبَخَةِ وَالتَّيَمُّمِ بِهَا.

حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: تیمّم اس وقت تک کافی ہوگا جب تک دوبارہ بے وضو نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تیمّم کی حالت میں امامت کی۔ یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ شوریلی زمین پر نماز پڑھنے اور اس سے تیمّم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے جو عنوان قائم کیا ہے وہ دراصل ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پاک مٹی مسلمان کے لیے وضو کی طرح ہے اگرچہ وہ دس سال تک پانی حاصل نہ کر سکے۔"[6] حضرت حسن بصری کے اثر (قول) کو مصنف عبدالرزاق(216/1) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ بے وضو ہونے تک ایک دفعہ تیمّم کر لینا کافی ہے، یعنی ہر نماز کے لیے تیمّم ضروری نہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے عمل کو امام بیہقی نے اپنی السنن الکبریٰ(234/1) میں باسند بیان کیا ہے کہ انھوں نے تیمّم کی حالت میں وضو کرنے والوں کی امامت کرائی تھی۔ اسی طرح حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے بھی ایک دفعہ تیمّم کر کے جماعت کرائی تھی جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے اشارہ فرمایا ہے کہ تیمّم وضو کے قائم مقام ہے اور اس سے وضو کرنے والوں کی امامت کرانے میں کوئی حرج نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں اہل کوفہ اور جمہور کی موافقت فرمائی ہے۔ یحییٰ بن سعید کے اثر کا تعلق "پاک مٹی" سے ہے، یعنی شوریلی زمین کا شور اور کلر بھی پاک ہے اور اس پر نماز پڑھنا اور اس سے تیمّم کرنا درست ہے۔ امام ابن خزیمہ نے شوریلی زمین سے تیمّم کرنے کے جواز پر حدیث عائشہ سے استدلال کیا ہے جو ہجرت سے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے تمھارا دار ہجرت دکھایا گیا ہے جو کھجوروں پر

---

① جامع الترمذي، الطهارة، حديث : 144. ② المائدة5:6. ③ المائدة5:6. ④ المائدة5:38. ⑤ جامع الترمذي، الطهارة، حديث : 144. ⑥ مسند أحمد : 155/5.

مشتمل ایک شوریلی زمین ہے، یعنی مدینہ منورہ۔" پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کو طیبہ بھی کہا ہے اور یہ اس کا نام ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شوریلی زمین بھی پاک ہے۔ اس موقف کا کوئی بھی مخالف نہیں، صرف اسحاق بن راہویہ کی رائے اس کے خلاف ہے۔[1]

٣٤٤ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنِي يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْفٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو رَجَاءٍ عَنْ عِمْرَانَ قَالَ: كُنَّا فِي سَفَرٍ مَّعَ النَّبِيِّ ﷺ وَإِنَّا أَسْرَيْنَا حَتَّى إِذَا كُنَّا فِي آخِرِ اللَّيْلِ وَقَعْنَا وَقْعَةً، وَلَا وَقْعَةَ أَحْلٰى عِنْدَ الْمُسَافِرِ مِنْهَا، فَمَا أَيْقَظَنَا إِلَّا حَرُّ الشَّمْسِ، فَكَانَ أَوَّلَ مَنِ اسْتَيْقَظَ فُلَانٌ، ثُمَّ فُلَانٌ ثُمَّ فُلَانٌ يُسَمِّيهِمْ أَبُو رَجَاءٍ، فَنَسِيَ عَوْفٌ ثُمَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الرَّابِعُ، وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا نَامَ لَمْ يُوقَظْ حَتّٰى يَكُونَ هُوَ يَسْتَيْقِظُ، لِأَنَّا لَا نَدْرِي مَا يَحْدُثُ لَهُ فِي نَوْمِهِ، فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ عُمَرُ وَرَأَى مَا أَصَابَ النَّاسَ وَكَانَ رَجُلًا جَلِيدًا، فَكَبَّرَ وَرَفَعَ صَوْتَهُ بِالتَّكْبِيرِ، فَمَا زَالَ يُكَبِّرُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ بِالتَّكْبِيرِ حَتَّى اسْتَيْقَظَ بِصَوْتِهِ النَّبِيُّ ﷺ، فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ شَكَوْا إِلَيْهِ الَّذِي أَصَابَهُمْ، قَالَ: «لَا ضَيْرَ أَوْ لَا يَضِيرُ، ارْتَحِلُوا» فَارْتَحَلُوا فَسَارَ غَيْرَ بَعِيدٍ ثُمَّ نَزَلَ فَدَعَا بِالْوَضُوءِ فَتَوَضَّأَ، وَنُودِيَ بِالصَّلَاةِ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ، فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهِ إِذَا هُوَ بِرَجُلٍ مُّعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ، قَالَ: «مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟» قَالَ: أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَّلَا مَاءَ، قَالَ: «عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ، فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ»، ثُمَّ سَارَ النَّبِيُّ ﷺ فَاشْتَكٰى إِلَيْهِ النَّاسُ مِنَ الْعَطَشِ، فَنَزَلَ فَدَعَا

[344] حضرت عمران بن حصین خزاعی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم ایک مرتبہ نبی ﷺ کے ہمراہ سفر میں تھے اور رات بھر چلتے رہے۔ جب آخر شب ہوئی تو ہم کچھ دیر کے لیے سو گئے، اور مسافر کے نزدیک اس وقت سے زیادہ کوئی نیند میٹھی نہیں ہوتی۔ ہم ایسے سوئے کہ آفتاب کی گرمی ہی سے بیدار ہوئے۔ سب سے پہلے جس کی آنکھ کھلی وہ فلاں شخص تھا، پھر فلاں شخص اور پھر فلاں شخص۔ ابورجاء ان (فلاں، فلاں اور فلاں) کے نام لیتے تھے لیکن عوف بھول گئے...... پھر چوتھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جاگے۔ اور (ہمارا دستور یہ تھا کہ) جب نبی ﷺ استراحت فرماتے تو کوئی آپ کو بیدار نہ کرتا تھا تا آنکہ آپ خود بیدار ہو جاتے کیونکہ ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ کو خواب میں کیا پیش آ رہا ہے؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیدار ہو کر وہ حالت دیکھی جو لوگوں پر طاری تھی، اور وہ دلیر آدمی تھے، تو انھوں نے باآواز بلند تکبیر کہنا شروع کی۔ سو وہ برابر اللہ اکبر بلند آواز سے کہتے رہے یہاں تک کہ ان کی آواز سے نبی ﷺ بیدار ہو گئے۔ جب آپ جاگے تو لوگوں نے آپ سے اس مصیبت کا شکوہ کیا جو ان پر پڑی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''کچھ حرج نہیں یا اس سے کچھ نقصان نہ ہو گا۔ چلو اب کوچ کرو۔'' پھر لوگ روانہ ہوئے۔ تھوڑی سی مسافت کے بعد آپ اترے، وضو کے لیے پانی منگوایا اور وضو کیا، نماز کے لیے اذان دی گئی، اس کے بعد آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اچانک ایک شخص کو گوشۂ تنہائی میں بیٹھے دیکھا جس نے ہم لوگوں

[1] فتح الباري: 580/1.

فُلَانًا، كَانَ يُسَمِّيهِ أَبُو رَجَاءٍ، نَسِيَهُ عَوْفٌ، وَدَعَا عَلِيًّا فَقَالَ: «اِذْهَبَا فَابْتَغِيَا الْمَاءَ»، فَانْطَلَقَا فَتَلَقَّيَا امْرَأَةً بَيْنَ مَزَادَتَيْنِ أَوْ سَطِيحَتَيْنِ مِنْ مَّاءٍ عَلٰى بَعِيرٍ لَّهَا: فَقَالَا لَهَا: أَيْنَ الْمَاءُ؟ قَالَتْ: عَهْدِي بِالْمَاءِ أَمْسِ هٰذِهِ السَّاعَةَ، وَنَفَرُنَا خُلُوفًا، قَالَا لَهَا: اِنْطَلِقِي إِذًا، قَالَتْ: إِلٰى أَيْنَ؟ قَالَا: إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ، قَالَتْ: اَلَّذِي يُقَالُ لَهُ الصَّابِىءُ؟ قَالَا: هُوَ الَّذِي تَعْنِينَ، فَانْطَلِقِي، فَجَاءَا بِهَا إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَحَدَّثَاهُ الْحَدِيثَ. قَالَ: فَاسْتَنْزَلُوهَا عَنْ بَعِيرِهَا، وَدَعَا النَّبِيُّ ﷺ بِإِنَاءٍ فَفَرَّغَ فِيهِ مِنْ أَفْوَاهِ الْمَزَادَتَيْنِ - أَوِ السَّطِيحَتَيْنِ - وَأَوْكَأَ أَفْوَاهَهُمَا وَأَطْلَقَ الْعَزَالِيَ، وَنُودِيَ فِي النَّاسِ: أُسْقُوا وَاسْتَقُوا، فَسَقٰى مَنْ سَقٰى، وَاسْتَقٰى مَنْ شَاءَ، وَكَانَ آخِرَ ذٰلِكَ أَنْ أَعْطَى الَّذِي أَصَابَتْهُ الْجَنَابَةُ إِنَاءً مِّنْ مَّاءٍ، قَالَ: «اِذْهَبْ فَأَفْرِغْهُ عَلَيْكَ»، وَهِيَ قَائِمَةٌ تَنْظُرُ إِلٰى مَا يُفْعَلُ بِمَائِهَا، وَايْمُ اللهِ! لَقَدْ أُقْلِعَ عَنْهَا، وَإِنَّهُ لَيُخَيَّلُ إِلَيْنَا أَنَّهَا أَشَدُّ مِلْأَةً مِّنْهَا حِينَ ابْتَدَأَ فِيهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اِجْمَعُوا لَهَا»، فَجَمَعُوا لَهَا مِنْ بَيْنِ عَجْوَةٍ، وَدَقِيقَةٍ، وَسَوِيقَةٍ، حَتّٰى جَمَعُوا لَهَا طَعَامًا فَجَعَلُوهَا فِي ثَوْبٍ وَحَمَلُوهَا عَلٰى بَعِيرِهَا، وَوَضَعُوا الثَّوْبَ بَيْنَ يَدَيْهَا، قَالَ لَهَا: «تَعْلَمِينَ مَا رَزِئْنَا مِنْ مَّائِكِ شَيْئًا، وَلٰكِنَّ اللهَ هُوَ الَّذِي أَسْقَانَا»، فَأَتَتْ أَهْلَهَا وَقَدِ احْتَبَسَتْ عَنْهُمْ، فَقَالُوا: مَا حَبَسَكِ

کے ساتھ نماز نہ پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''اے فلاں شخص! تیرے لیے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے کون سی چیز مانع ہوئی؟'' اس نے عرض کیا: میں جنبی ہوں اور پانی موجود نہ تھا۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے پاک مٹی سے تیمّم کرنا چاہیے تھا۔ وہ تجھے کافی تھا۔'' پھر نبی ﷺ چلے تو لوگوں نے آپ سے پیاس کی شکایت کی۔ آپ اترے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے شخص کو بلایا...... ابورجاء اس شخص کا نام لیتے تھے، عوف بھول گئے ...... اور فرمایا: ''تم دونوں جاؤ اور پانی تلاش کرو۔'' چنانچہ وہ دونوں روانہ ہوئے تو راستے میں انھیں ایک عورت ملی جو اپنے اونٹ پر پانی کی دو مشکوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ پانی کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ پانی مجھے گزشتہ کل اسی وقت ملا تھا اور ہمارے مرد پیچھے ہیں۔ ان دونوں نے اس سے کہا: ہمارے ہمراہ چل۔ اس نے کہا: کہاں جانا ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کے پاس۔ وہ بولی: وہی جسے بے دین کہا جاتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں وہی ہے جنھیں تو ایسا سمجھتی ہے، چل تو سہی۔ آخر وہ دونوں اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے اور آپ سے سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت عمران رضی اللہ عنہ نے کہا: لوگوں نے اسے اونٹ سے اتار لیا اور نبی ﷺ نے ایک برتن منگوایا اور دونوں پکھالوں یا مشکوں کے منہ اس میں کھول دیے۔ پھر اوپر کا منہ بند کر کے نیچے کا منہ کھول دیا اور لوگوں کو اطلاع دی کہ خود بھی پانی پیو اور جانوروں کو بھی پلاؤ، تو جس نے چاہا خود پیا اور جس نے چاہا جانوروں کو پلایا اور بالآخر آپ نے یہ کیا کہ جس شخص کو نہانے کی ضرورت تھی اسے بھی پانی کا ایک برتن بھر کر دیا اور اس سے کہا: ''جاؤ، اس سے غسل کرو۔'' وہ عورت کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی کہ اس کے پانی

يَا فُلَانَةُ؟ قَالَتِ: الْعَجَبُ، لَقِيَنِي رَجُلَانِ فَذَهَبَا بِي إِلٰى هٰذَا الَّذِي يُقَالُ لَهُ الصَّابِىءُ، فَفَعَلَ كَذَا وَكَذَا، فَوَاللهِ! إِنَّهُ لَأَسْحَرُ النَّاسِ مِنْ بَيْنِ هٰذِهِ وَهٰذِهِ، وَقَالَتْ بِإِصْبَعِهَا الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةِ، فَرَفَعَتْهُمَا إِلَى السَّمَاءِ - تَعْنِي السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ - أَوْ إِنَّهُ لَرَسُولُ اللهِ حَقًّا. فَكَانَ الْمُسْلِمُونَ بَعْدَ ذٰلِكَ يُغِيرُونَ عَلٰى مَنْ حَوْلَهَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ، وَلَا يُصِيبُونَ الصِّرْمَ الَّذِي هِيَ مِنْهُ. فَقَالَتْ يَوْمًا لِقَوْمِهَا: مَا أُرٰى [أَنَّ] هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ يَدَعُونَكُمْ عَمْدًا، فَهَلْ لَّكُمْ فِي الْإِسْلَامِ؟ فَأَطَاعُوهَا فَدَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ. قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: صَبَأَ: خَرَجَ مِنْ دِينٍ إِلٰى غَيْرِهِ. وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ: اَلصَّابِئِينَ فِرْقَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ يَقْرَؤُونَ الزَّبُورَ. [انظر: ٣٤٨، ٣٥٧١]

کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اللہ کی قسم! جب پانی لینا بند کیا گیا تو ہمارے خیال کے مطابق وہ (مشکیں) اب اس وقت سے بھی زیادہ بھری ہوئی تھیں جب آپ نے ان سے پانی لینا شروع کیا تھا۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا: ''اس عورت کے لیے کچھ جمع کرو۔'' لوگوں نے کھجور، آٹا اور ستو اکٹھا کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ طعام کی ایک اچھی مقدار اس کے لیے جمع ہو گئی۔ جمع شدہ سامان انھوں نے ایک کپڑے میں باندھ دیا اور اسے اونٹ پر سوار کر کے وہ کپڑا اس کے آگے رکھ دیا۔ پھر آپ نے اس سے فرمایا: ''تم جانتی ہو کہ ہم نے تمھارے پانی میں کچھ کمی نہیں کی بلکہ ہمیں تو اللہ نے پلایا ہے۔'' پھر وہ عورت اپنے گھر والوں کے پاس واپس آئی۔ چونکہ وہ دیر سے پہنچی تھی، اس لیے انھوں نے پوچھا: اے فلاں عورت! تجھے کس نے روک لیا تھا؟ اس نے کہا: مجھے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اور وہ یہ کہ (راستے میں) مجھے دو آدمی ملے جو مجھے اس شخص کے پاس لے گئے جس کو بے دین کہا جاتا ہے، اس نے ایسا ایسا کیا۔ اللہ کی قسم! جتنے لوگ اس (آسمان) کے اور اس (زمین) کے درمیان ہیں، اور اس نے اپنی درمیان والی اور شہادت والی انگلی اٹھا کر آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کیا، ان سب میں سے وہ بڑا جادوگر ہے، یا وہ اللہ کا حقیقی رسول ہے۔ پھر مسلمانوں نے یہ کرنا شروع کر دیا کہ اس عورت کے اردگرد جو مشرک آباد تھے ان پر تو وہ حملہ آور ہوتے اور جن لوگوں میں وہ عورت رہتی تھی ان کو چھوڑ دیتے۔ آخر اس نے ایک دن اپنی قوم سے کہا: میرے خیال میں مسلمان تمھیں دانستہ چھوڑ دیتے ہیں، کیا تمھیں اسلام سے کچھ رغبت ہے؟ تب انھوں نے اس کی بات قبول کی اور مسلمان ہو گئے۔

ابوعبداللہ (امام بخاری ؒ) کہتے ہیں: صَبَأَ کے معنی ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا ہیں۔ ابوالعالیہ نے کہا: صابئین اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور کی تلاوت کرتا ہے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس عنوان کے تحت دو مسئلے بیان کیے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: * تیمّم طہارت اصلیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے نماز کے لیے طہارت کو ضروری قرار دیا ہے اور طہارت دو الگ الگ صورتوں میں دو طرح سے حاصل کی جاسکتی ہے: اگر پانی میسر ہو اور اس کے استعمال پر قدرت بھی ہو تو پانی کے ذریعے سے طہارت حاصل کی جائے۔ اگر پانی نہ ہو یا اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو مٹی اس کا بدل ہے، گویا حصول طہارت میں پانی اصل ہے اور مٹی اس کا بدل ہے۔ اصل کے نہ ملنے سے بدل سے وہ تمام کام لیے جائیں گے جو اصل سے لیے جاتے ہیں۔ شریعت نے ان دونوں کو ایک ہی درجہ دیا ہے۔ جس طرح ایک وضو سے ہر قسم کی نمازیں: فرائض، نوافل، فوت شدہ نمازیں، عیدین اور نماز جنازہ وغیرہ ادا کیا جاسکتا ہے، اسی طرح ایک تیمّم سے بھی سب کام لیے جائیں گے اور یہ ہر وقت کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوگا، البتہ نواقض تیمّم میں ایک چیز نواقض وضو سے زائد ہے اور وہ ہے پانی کا دستیاب ہونا، یعنی پانی دستیاب ہوتے ہی تیمّم ختم ہوجائے گا۔ بعض حضرات کے نزدیک تیمّم طہارت ضروریہ ہے، یعنی تیمّم کے ذریعے سے طہارت حاصل کرنا مجبوری کے درجے کی چیز ہے، جتنی ضرورت ہو، اتنے وقت تک تیمّم سے کام لے سکتے ہیں، ضرورت پوری ہوتے ہی یہ طہارت ختم ہو جائے گی۔ ایک تیمّم سے وقت کے دوران میں صرف وقتی فریضہ ہی ادا کیا جاسکتا ہے، کسی دوسرے فریضے کی قضا بھی نہیں دے سکتے، اس کے لیے دوسرا تیمّم کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں تیمّم رافع حدث نہیں بلکہ صرف استباحت صلاۃ کا کام دے سکتا ہے۔ امام بخاری ؒ اس رائے سے متفق نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ پاک مٹی مومن کے حق میں وضو کی جگہ ہے، اگر پانی میسر نہ ہو تو یہ اس سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ * دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تیمّم مطلق طور پر وجہ ارض سے جائز ہے، خواہ وہ زرخیز ہو یا بنجر۔ بعض حضرات یہ فرق کرتے ہیں کہ تراب منبت (زرخیز مٹی) سے جائز ہے، غیر منبت سے جائز نہیں۔ امام بخاری ؒ اس فرق کو قبول نہیں کرتے۔ وہ فرماتے ہیں: زمین شور (بنجر زمین) پر بھی تیمّم کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وضاحت بھی پہلے ہو چکی ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں امام ابن خزیمہ کے ایک وقیع استدلال کا بھی حوالہ دیا تھا۔ ② اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز فجر نیند کی وجہ سے قضا ہوگئی تھی جبکہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ کی آنکھیں بند ہوجاتی تھیں دل بیدار رہتا تھا۔ بظاہر ان دونوں روایات میں تعارض ہے۔ اس تعارض کو دو طرح سے دور کیا گیا ہے: * دل کے بیدار رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے محسوسات کا ادراک کرتا ہے جو اس سے براہ راست متعلق ہیں، جیسے حدث وغیرہ۔ لیکن جو محسوسات آنکھ یا کسی اور چیز سے متعلق ہیں ان کا ادراک دل نہیں کرتا، یہاں طلوع سحر کے ادراک کا تعلق دل سے نہیں، آنکھ سے ہے جو اس وقت سو چکی تھی۔ * دل کی دو حالتیں ہیں: ایک بیداری، جو عام طور پر رہتی تھی، دوسری نیند جو کبھی کبھار پیش آتی تھی۔ اتفاق سے یہ واقعہ دل کی حالت نیند میں پیش آ گیا۔ بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بعض اوقات بیداری کی حالت میں بعض مصالح کے پیش نظر سہو

ہوتا تھا، پھر جب بیداری میں سہو کی صورت پیش آ سکتی ہے تو نیند کی حالت میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔[1] ② آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے لفظ صابی کی لغوی تحقیق فرمائی ہے، اس مناسبت سے قرآن کریم میں جو صابئین آیا ہے اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابوالعالیہ کے قول کا حوالہ دیا ہے جسے ابن ابی حاتم نے موصولاً بیان کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باسناد حسن نقل کیا ہے کہ صابئین اہل کتاب نہیں تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ وضاحت اس لیے کی ہے کہ حدیث میں آنے والے لفظ صابی کی وضاحت ہو جائے کہ اس سے مراد وہ طائفہ نہیں جس کا ذکر قرآن میں ہے۔[2]

(٧) بَابٌ : إِذَا خَافَ الْجُنُبُ عَلٰى نَفْسِهِ الْمَرَضَ أَوِ الْمَوْتَ، أَوْ خَافَ الْعَطَشَ تَيَمَّمَ

باب: 7- جب جنبی اپنے متعلق بیماری، موت یا پیاس کا اندیشہ رکھتا ہو تو اسے تیمّم کرنے کی اجازت ہے

وَيُذْكَرُ أَنَّ عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ أَجْنَبَ فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ فَتَيَمَّمَ وَتَلَا ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ [النساء: ٢٩] فَذُكِرَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ يُعَنِّفْ.

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ انھیں سردی کی رات میں جنابت لاحق ہوگئی تو انھوں نے تیمّم کیا اور یہ آیت پڑھی: ''اپنی جانوں کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ بہت مہربان ہے۔'' جب نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے انھیں کوئی سرزنش نہیں فرمائی۔

وضاحت: کچھ لوگ جنبی کے لیے تیمّم کرنے کے متعلق یہ شرط لگاتے ہیں کہ اسے پانی کے استعمال سے موت یا کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ ہو، یہ محض تشدد ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس طرح پیاس کا معاملہ متفقہ ہے، اسی طرح اگر جنبی کو یہ خطرہ ہو کہ پانی استعمال کرنے سے بیمار ہو جائے گا یا بیماری بڑھ جائے گی یا صحت یابی میں دیر ہو جائے گی تو وہ تیمّم کر لے، یعنی امام صاحب کے نزدیک موت، پیاس اور بیماری تینوں صورتوں میں تیمّم کی اجازت ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ایک اجتہاد کا حوالہ دیا ہے جو انتہائی مختصر ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ غزوۂ ذات السلاسل کے موقع پر حضرت عمرو بن العاص کو نہانے کی ضرورت پیش آ گئی لیکن سخت سردی تھی، اس لیے انھوں نے تیمّم کر کے اپنے رفقاء کو نماز پڑھا دی۔ لوگوں کو یہ بات ناگوار گزری کہ پانی کی موجودگی میں انھوں نے تیمّم کیوں کیا؟ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی گئی تو آپ نے باز پرس فرمائی۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنا عذر پیش کیا کہ سخت سردی تھی، خطرہ تھا کہ نہانے سے موت واقع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تلاوت کیا کہ خود کو ہلاکت میں مت ڈالو، وہ تمھارے ساتھ بہت مہربان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص کا بیان سن کر تبسم فرمایا اور خاموش ہو گئے۔[3] رسول اللہ ﷺ نے اپنی خاموشی سے حضرت عمرو بن العاص کے عمل کی توثیق کر دی۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مدعا ثابت ہو گیا کہ اگر موت کا اندیشہ ہو تو جنبی آدمی کو تیمّم کی اجازت ہے۔

---

1 فتح الباري : 583/1. 2 فتح الباري : 588/1. 3 فتح الباري : 589/1.

٣٤٥ - حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ - هُوَ غُنْدَرٌ - عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ سُلَيْمَانَ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: قَالَ أَبُو مُوسٰى لِعَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ: إِذَا لَمْ تَجِدِ الْمَاءَ لَا تُصَلِّي؟ قَالَ عَبْدُ اللهِ: لَوْ رَخَّصْتُ لَهُمْ فِي هٰذَا كَانَ إِذَا وَجَدَ أَحَدُهُمُ الْبَرْدَ، قَالَ هٰكَذَا: يَعْنِي تَيَمَّمَ وَصَلّٰى، وَقَالَ: قُلْتُ: فَأَيْنَ قَوْلُ عَمَّارٍ لِعُمَرَ؟ قَالَ: إِنِّي لَمْ أَرَ عُمَرَ قَنِعَ بِقَوْلِ عَمَّارٍ. [راجع: ٣٣٨]

[345] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر تمھیں (جنابت کی حالت میں) پانی نہ ملے تو کیا تم نماز نہیں پڑھو گے؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اگر میں اس معاملے میں رخصت دے دوں تو پھر یہ ہوگا کہ جب کبھی کسی کو سردی کا احساس ہوگا تو یہی کرے گا، یعنی تیمّم کر کے نماز پڑھ لے گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اگر یہی بات ہے) تو پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا وہ قول کہاں جائے گا جو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قول پر اطمینان نہیں ہوا تھا۔

٣٤٦ - حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ قَالَ: سَمِعْتُ شَقِيقَ بْنَ سَلَمَةَ قَالَ: كُنْتُ عِنْدَ عَبْدِ اللهِ وَأَبِي مُوسٰى فَقَالَ لَهُ أَبُو مُوسٰى: أَرَأَيْتَ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ إِذَا أَجْنَبَ فَلَمْ يَجِدْ مَاءً، كَيْفَ يَصْنَعُ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ: لَا يُصَلِّي حَتّٰى يَجِدَ الْمَاءَ، فَقَالَ أَبُو مُوسٰى: فَكَيْفَ تَصْنَعُ بِقَوْلِ عَمَّارٍ حِينَ قَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: «كَانَ يَكْفِيكَ»؟ قَالَ: أَلَمْ تَرَ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِذٰلِكَ؟ فَقَالَ أَبُو مُوسٰى: فَدَعْنَا مِنْ قَوْلِ عَمَّارٍ، كَيْفَ تَصْنَعُ بِهٰذِهِ الْآيَةِ؟ فَمَا دَرٰى عَبْدُ اللهِ مَا يَقُولُ، فَقَالَ: إِنَّا لَوْ رَخَّصْنَا لَهُمْ فِي هٰذَا لَأَوْشَكَ إِذَا بَرَدَ عَلٰى أَحَدِهِمُ الْمَاءُ أَنْ يَدَعَهُ وَيَتَيَمَّمَ. فَقُلْتُ لِشَقِيقٍ: فَإِنَّمَا كَرِهَ عَبْدُ اللهِ لِهٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ. [راجع: ٣٣٨]

[346] حضرت شقیق بن سلمہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس تھا جب حضرت ابوموسیٰ نے حضرت ابن مسعود سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰن! آپ کی کیا رائے ہے، اگر کسی کو جنابت لاحق ہو جائے اور اسے پانی نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جب تک پانی نہ ملے وہ نماز نہ پڑھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے اس قول کی کیا تاویل کریں گے جب نبی ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: ''تمھیں (چہرے اور ہاتھوں کا مسح) کافی تھا'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیا تم نہیں جانتے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے اطمینان نہیں ہوا تھا؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا: حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی روایت کو جانے دیجیے۔ قرآن مجید میں جو آیت تیمّم ہے اس کا کیا جواب ہے؟ اس پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ لاجواب ہو گئے،

فرمانے لگے: اگر ہم نے لوگوں کو اس کے متعلق رعایت دے دی تو عجب نہیں کہ جب کسی کو پانی ٹھنڈا محسوس ہو گا تو وہ اسے استعمال کرنے کے بجائے تیمّم کرلیا کرے گا۔

(راویٔ حدیث حضرت اعمش کہتے ہیں:) میں نے (اپنے شیخ ابو وائل) شقیق بن سلمہ سے کہا: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے تیمّم کی اجازت نہیں دیتے تھے؟ ابو وائل نے جواب دیا: ہاں ایسا ہی ہے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر پانی صرف اتنا ہے جس سے پیاس بجھائی جاسکے تو ایسے حالات میں بھی تیمّم کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر پانی زیادہ ہے جو وضو یا غسل کے لیے کافی ہوسکتا ہے لیکن اس کے استعمال سے کسی بیماری یا موت کا اندیشہ ہو تو بھی تیمّم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے دو روایات پیش کی ہیں: پہلی روایت مختصر بھی ہے اور اس میں کچھ تقدیم وتاخیر بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے دوسری روایت اس لیے بیان فرمادی تاکہ معلوم ہوجائے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے درمیان مناظرے کی اصل صورت کیا تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جنبی کو تیمّم کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس پر حضرت ابوموسیٰ اشعری نے پہلے تو حضرت عمار اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا قصہ پیش کیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مناظرانہ اصول کے مطابق اس کا جواب دیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو کہا تھا کہ تم اس معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ مطلب یہ تھا کہ آپ جس واقعے کو بطور استدلال پیش کررہے ہیں اس کا تو خود صاحب واقعہ منکر ہے، ایسے حالات میں وہ دلیل کے طور پر کیسے پیش کیا جاسکتا ہے؟ اس کے بعد حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے آیت تیمّم بطور دلیل پیش کی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کا جواب نہ دے سکے بلکہ اصل مصلحت سے پردہ اٹھانے پر مجبور ہوگئے کہ میرا انکار مصلحت شرعیہ کی وجہ سے ہے کہ اس جواز کی آڑ میں ہر شخص ذرا سی سردی میں بھی تیمّم کرنے لگے گا جو شریعت کا منشا نہیں۔ اس مصلحت کے پیش نظر میں یہ فتویٰ نہیں دینا چاہتا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنبی کے تیمّم کے متعلق اپنے اس فتوی سے رجوع فرمالیا تھا جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے لیکن اس کی سند میں انقطاع ہے۔[1] ② حضرت ابوموسیٰ اشعری نے بطور دلیل جو آیت تیمّم پیش فرمائی تھی اس میں اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاءَ کے الفاظ ہیں۔ اگر اس سے مراد جماع نہ ہوتا تو حضرت عبداللہ بن مسعود بطور جواب کہہ سکتے تھے کہ تم جس آیت کو بطور استدلال پیش کررہے ہو، اس میں لمس سے مراد جماع نہیں بلکہ لمس بالید مراد ہے، یعنی یہاں تو جنابت کا قصہ ہی نہیں بلکہ حدث اصغر کی بات ہورہی ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک بھی اس آیت کریمہ میں لمس سے مراد لمس بالید نہیں بلکہ جماع ہے۔[2]

---

(1) فتح الباري : 593/1. (2) إعلام الحديث للخطابي : 345/1.

(٨) بَابٌ: اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَةٌ

٣٤٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ شَقِيقٍ قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا مَّعَ عَبْدِ اللهِ وَأَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ، فَقَالَ لَهُ أَبُو مُوسٰى: لَوْ أَنَّ رَجُلًا أَجْنَبَ فَلَمْ يَجِدِ الْمَاءَ شَهْرًا، مَا كَانَ يَتَيَمَّمُ وَيُصَلِّي؟ فَكَيْفَ تَصْنَعُونَ فِي سُورَةِ الْمَائِدَةِ ﴿فَلَمْ تَجِدُوا مَآءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [المائدة:٦]؟ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ: لَوْ رُخِّصَ لَهُمْ فِي هٰذَا لَأَوْشَكُوا إِذَا بَرَدَ عَلَيْهِمُ الْمَاءُ أَنْ يَّتَيَمَّمُوا الصَّعِيدَ؟ قُلْتُ: وَإِنَّمَا كَرِهْتُمْ هٰذَا لِذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، فَقَالَ أَبُو مُوسٰى: أَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ عَمَّارٍ لِعُمَرَ: بَعَثَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي حَاجَةٍ فَأَجْنَبْتُ فَلَمْ أَجِدِ الْمَاءَ فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيدِ كَمَا تَمَرَّغُ الدَّابَّةُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ أَنْ تَصْنَعَ هٰكَذَا»، فَضَرَبَ بِكَفِّهِ ضَرْبَةً عَلَى الْأَرْضِ، ثُمَّ نَفَضَهَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهَا ظَهْرَ كَفِّهِ بِشِمَالِهِ، أَوْ ظَهْرَ شِمَالِهِ بِكَفِّهِ، ثُمَّ مَسَحَ بِهَا وَجْهَهُ. فَقَالَ عَبْدُ اللهِ: أَلَمْ تَرَ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ؟ زَادَ يَعْلٰى عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ شَقِيقٍ قَالَ: كُنْتُ مَعَ عَبْدِ اللهِ وَأَبِي مُوسٰى فَقَالَ أَبُو مُوسٰى: أَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ عَمَّارٍ لِعُمَرَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ بَعَثَنِي أَنَا وَأَنْتَ فَأَجْنَبْتُ فَتَمَعَّكْتُ بِالصَّعِيدِ، فَأَتَيْنَا رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَخْبَرْنَاهُ فَقَالَ: «إِنَّمَا كَانَ

باب:8- تیمّم میں صرف ایک ضرب ہے

[347] حضرت شقیق بن سلمہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھا تھا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر کسی کو جنابت لاحق ہو جائے اور اسے ایک ماہ تک پانی نہ ملے تو کیا وہ تیمّم نہ کرلے اور نماز پڑھے؟ (حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، خواہ اسے ایک ماہ تک پانی نہ ملے۔) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ سورۂ مائدہ کی اس آیت کے متعلق کیا کہیں گے: ''اگر تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر اس بارے میں لوگوں کو رخصت دی جائے تو اندیشہ ہے کہ لوگوں کو جب پانی ٹھنڈا محسوس ہوگا تو وہ پاک مٹی سے تیمّم کرلیا کریں گے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں: میں نے حضرت ابن مسعود سے کہا: آپ اس رخصت کو اس مصلحت کے پیش نظر ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں؟ حضرت ابن مسعود نے جواب دیا: جی ہاں! حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ نے وہ بات نہیں سنی جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہی تھی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے کسی کام پر بھیجا تھا۔ مجھے وہاں جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہ مل سکا تو میں نے چوپائے کی طرح زمین پر لوٹ پوٹ لگائی (اور نماز پڑھ لی تھی)۔ پھر جب میں نے نبی ﷺ کے حضور عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''تمھیں صرف اس طرح کر لینا کافی تھا۔'' پھر آپ نے ایک بار زمین پر اپنا ہاتھ مارا، اس سے غبار کو جھاڑا، اس کے بعد اپنے ہاتھ کی پشت کا بائیں

يَكْفِيكَ هٰكَذَا»، وَمَسَحَ وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ وَاحِدَةً.
[راجع : ٣٣٨]

ہاتھ سے مسح فرمایا، یا اپنے بائیں ہاتھ کی پشت کا اپنے ہاتھ سے مسح فرمایا، پھر ان سے اپنے چہرے پر مسح کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قول سے مطمئن نہیں ہوئے تھے؟

حضرت یعلیٰ بن عبید نے حضرت اعمش سے، انھوں نے شقیق سے قدرے اضافے کے ساتھ روایت کو بیان کیا ہے۔ شقیق نے کہا: میں عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری کے ہمراہ تھا تو حضرت ابوموسیٰ نے کہا: کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اور آپ کو کہیں باہر بھیجا تھا۔ اس دوران میں مجھے جنابت لاحق ہوگئی تو میں نے مٹی میں لوٹ لگائی۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''تمھیں صرف اس طرح کر لینا کافی تھا۔'' اس کے بعد آپ نے اپنے منہ اور ہاتھوں کا ایک ہی مرتبہ مسح فرمایا۔

فوائد ومسائل: ① امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کئی ایک کا یہی قول ہے کہ تیمم میں چہرے اور ہتھیلیوں کے لیے ایک ہی ضرب ہے۔ ان میں حضرت علی، حضرت عمار اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ پھر تابعین میں سے حضرت شعبی، حضرت عطاء اور مکحول وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اسی طرح ائمہ میں سے امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی موقف ہے، جب کہ کچھ اہل علم کہتے ہیں کہ تیمم میں ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ضرب ہاتھوں سے کہنیوں تک کے لیے ہے۔ ان میں حضرت ابن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم ہیں۔ حضرت ابراہیم نخعی، حسن بصری اور سفیان ثوری کا بھی یہی موقف ہے۔ ائمہ میں سے امام مالک، امام عبداللہ بن مبارک اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی موقف کو اپنایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلے میں امام احمد بن حنبل کی تائید میں ہیں کہ ایک ہی بار زمین پر ہاتھ مارا جائے پھر چہرے اور ہتھیلیوں کا مسح کر لیا جائے اگرچہ اس روایت میں اختصار ہے کہ دائیں ہاتھ کی پشت پر بایاں ہاتھ پھیرا یا بائیں ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ سے مسح کیا، یعنی اس روایت میں صرف ہاتھ کی پشت کا ذکر ہے۔ باطن کف، یعنی ہاتھ کے اندر کی جانب مسح کا ذکر نہیں ہے، تاہم دیگر روایات میں اس کی وضاحت ہے۔ ابوداود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمین پر ہاتھ مارا، پھر اسے جھاڑا، پھر بائیں سے دائیں اور دائیں

سے بائیں کا، یعنی ہتھیلیوں کا مسح کیا، اس کے بعد چہرے کا مسح کیا۔[1] حافظ ابن حجر ؒ نے علامہ اسماعیلی کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے وہ بہت ہی واضح ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار ؓ سے فرمایا: ''تجھے اتنا ہی کافی تھا کہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارتا، پھر انھیں جھاڑتا، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا مسح کرتا، اس کے بعد اپنے چہرے کا مسح کرتا۔''[2] ② یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری ؒ جنبی کے لیے تیمم کا طریقہ بتانا چاہتے ہوں کہ جنبی کا تیمم بھی حدث اصغر کے تیمم کی طرح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنابت کا تیمم کرنے کے لیے بھی مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کی ضرورت نہیں جیسا کہ حضرت عمار ؓ نے کیا تھا بلکہ اس کے لیے زمین پر ہاتھ مار کر مسح کر لینا کافی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک پہلا موقف زیادہ قرین قیاس ہے کہ امام بخاری ؒ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تیمم میں ایک ہی ضرب کافی ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک دفعہ ضرب لگانے سے وہ مستعمل ہوگئی، پھر چہرے کے لیے دوبارہ ضرب لگائی جائے بلکہ ایک ہی ضرب سے چہرے اور ہتھیلیوں کا مسح کر لیا جائے۔ واللہ أعلم.

(٩) بَابٌ:

باب:9- بلاعنوان

٣٤٨ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَوْفٌ عَنْ أَبِي رَجَاءٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ الْخُزَاعِيُّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى رَجُلًا مُعْتَزِلًا لَّمْ يُصَلِّ فِي الْقَوْمِ، فَقَالَ: «يَا فُلَانُ! مَا مَنَعَكَ أَنْ تُصَلِّيَ فِي الْقَوْمِ؟» فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَّلَا مَاءَ، قَالَ: «عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ». [راجع: ٣٤٤]

[348] حضرت عمران بن حصین خزاعی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو الگ کھڑا تھا اور اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آپ نے فرمایا: ''اے فلاں! تجھے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں کون سا عذر مانع تھا؟'' اس نے کہا: اللہ کے رسول! مجھے جنابت لاحق ہوگئی ہے اور میرے پاس پانی نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تو مٹی استعمال کر لیتا، وہ تیری ضرورت کے لیے کافی تھی۔''

فوائد ومسائل: ① صحیح بخاری کے متعدد نسخوں میں یہاں لفظ باب نہیں ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اکثر صحیح نسخوں میں لفظ باب نہیں ہے اور ایسا ہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس بنا پر حدیث کی مناسبت باب سابق سے بایں طور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے حق میں فرمایا کہ تو مٹی کو استعمال کر لیتا وہ تیرے لیے کافی تھی۔ جس طرح یہ جملہ مٹی کی تمام انواع کے لیے عام ہے اسی طرح اس کا عموم تیمم کی کیفیت کے لحاظ سے بھی ہے کہ وہ ایک ضرب کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور دو کے ساتھ بھی (شرح تراجم بخاری) لیکن یہ توجیہ امام بخاری ؒ کے عنوان کے خلاف ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ اگر اسے باب سابق کا تتمہ خیال کیا جائے تو وہ بایں طور ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسے مطلق طور پر مٹی استعمال کرنے کے

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 321. ② فتح الباري: 595/1.

متعلق فرمایا ہے اور مطلق کا کم از کم فرد کامل ایک ہوتا ہے، اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا مدعا ثابت کیا ہے۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ کا باب بلاعنوان کئی ایک اغراض کے پیش نظر ہوتا ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے پہلے عنوان ہی کی فصل شمار کیا جائے، چنانچہ حدیث مذکور میں کسی عدد کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ایک بار ہاتھ مار کر مسح کر لینا بھی کافی ہے۔ وھو المقصود. باب بلاعنوان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے طلباء کا امتحان اور تشخیدِ اذہان (ذہنی آزمائش) مراد ہو، یعنی قارئین خود اس حدیث پر کوئی عنوان قائم کریں، چنانچہ اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا جا سکتا ہے: باب الجنب إذا لم يجد الماء تيمم وصلى، یعنی جنبی آدمی کو اگر پانی نہ ملے تو وہ تیمّم کرے اور نماز پڑھے۔ ③ بعض شارحین نے اس مقام پر ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے، وہ اس طرح کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے ایک اشکال کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ اشکال یہ ہے کہ اگر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو آیت تیمّم معلوم تھی تو وہ زمین پر لوٹ پوٹ کیوں ہوئے اور اگر معلوم نہ تھی تو انھیں کیسے معلوم ہوا کہ مٹی پانی کے قائم مقام ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف [عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ] سن رکھا تھا کہ "تجھے مٹی استعمال کرنی چاہیے۔" اس بنا پر انھوں نے اس کے عموم کو دیکھتے ہوئے تیمّم کو غسل پر قیاس کیا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلاح فرما دی۔ ④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ ہر کتاب کے آخر میں کوئی ایسی روایت لاتے ہیں جس کے کسی لفظ سے انتہائے کتاب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، چنانچہ یہاں لفظ يَكْفِيكَ ہے، یعنی تیمّم کے متعلق تجھے اتنا ہی کافی ہے۔[2] ⑤ واعظین حضرات کا کہنا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کتاب کے آخر میں کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے انسان کے خاتمے اور فکر آخرت کی طرف واضح اشارہ ہوتا ہے۔ اس مقام پر بھی امام بخاری نے [عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ] کے لفظ سے موت یاد دلائی ہے، یعنی خود پر مٹی کو لازم کر لو، اس سے قبر کی طرف بھی اشارہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ "اسی سے ہم نے تمھیں پیدا کیا اور اسی میں تمھیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمھیں دوبارہ نکالیں گے۔"[3] والله أعلم و علمه أتمّ.

[1] فتح الباري: 593/1. [2] فتح الباري: 593/1. [3] طٰه 55:20.

نماز کی اہمیت، فرضیت اور شروط کا بیان

[صلاۃ] کے لغوی معنی دعا و استغفار ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾[1] ''آپ ان کے اموال سے صدقہ لیجیے، انھیں پاک کیجیے اور اس کے ذریعے سے ان کا تزکیہ کیجیے اور ان کے لیے دعا کیجیے۔'' جب صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس کے معنی رحمت اور خیر و برکت ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ﴾[2] ''وہی ہے (اللہ) جو تم پر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے۔''

شریعت میں صلاۃ ایک مخصوص عبادت کا نام ہے جس کا آغاز تکبیر تحریمہ سے اور اختتام تسلیم سے ہوتا ہے۔ چونکہ یہ عبادت بندے کی طرف سے دعاؤں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی پر اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، اس لیے اس عبادت کو صلاۃ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے بندے کو اس عبادت کا مکلف ہونا پڑتا ہے اور قیامت کے دن بھی حقوق اللہ کی بابت سب سے پہلے اس کے متعلق ہی سوال ہوگا۔ صلاۃ، اللہ سے مناجات کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لہٰذا عبادات میں اسے مقدم رکھا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے شرائط صلاۃ، یعنی طہارت صغریٰ، طہارت کبریٰ، پھر طہارت مائیہ (وضو) اور طہارت ترابیہ (مسح) سے فراغت کے بعد مشروط، جو کہ اصل مقصود ہے، اسے بیان فرمایا۔ طہارت، نماز کے لیے شرط ہے اور وسیلے میں چونکہ مشروط پر شرط اور مقصود پر وسیلہ مقدم ہوتا ہے، اس لیے شرط اور وسیلے کے بعد مشروط اور مقصود کو بیان کیا جا رہا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الصلاۃ کا آغاز اس کی فرضیت کے بیان سے کیا ہے، یعنی فرضیت صلاۃ کہاں، کب اور کیسے ہوئی اور کس شان سے ہوئی؟ اس کے بعد آداب صلاۃ بیان کیے ہیں جو چار حصوں پر مشتمل ہیں: ستر العورۃ، استقبال قبلہ، احکام مساجد اور مسائل سترہ، وغیرہ۔ نماز کی فرضیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کو بطور مہمان اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلایا۔ چونکہ میزبان کی طرف سے اپنے معزز مہمان کو کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح شب معراج میں آپ کو صلاۃ کا تحفہ پیش کیا گیا تاکہ اس کے ذریعے سے جب بھی بندہ اپنے آقا کے حضور حاضری دینا چاہے، دے سکے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مناسبت سے حدیث معراج کو بیان فرمایا، پھر آداب صلاۃ کے سلسلے میں سرفہرست ستر عورۃ کا مسئلہ ہے کیونکہ برہنگی تو ویسے ہی اللہ کو پسند نہیں چہ جائیکہ راز و نیاز کے وقت اسے اختیار کیا جائے، اس لیے جسم کے

---

[1] التوبة 103:9. [2] الأحزاب 43:33.

قابل ستر حصے اور ان کی حدود و قیود کو بیان کیا۔ قابل ستر حصے کو ڈھانپنے کے لیے نہ تو کپڑوں کی تعداد درکار ہوتی ہے اور نہ کسی خاص نوعیت کے کپڑوں ہی کی ضرورت، اس مناسبت سے نماز میں مرد اور عورت کے لیے لباس کی اہمیت اور اس سے متعلقہ ہدایات ذکر کیں، پھر متعلقات لباس جوتے اور موزے پہن کر نماز ادا کرنا، ان کے متعلق شرعی ضابطہ ذکر کیا، پھر اس بات کا ذکر کیا کہ نماز کے لیے خاص جگہ کا انتخاب ضروری نہیں کہ وہ سطح زمین ہو بلکہ چھت، منبر، چٹائی، تختہ، بوریا، بستر اور دری یا قالین وغیرہ پر ادا کی جا سکتی ہے۔

نماز کی ایک اہم شرط استقبال قبلہ ہے۔ اس کی اہمیت وفضیلت، عین قبلہ، جہت قبلہ، تحریٔ قبلہ کے مسائل، پھر اس مناسبت سے یہ وضاحت کہ اگر نمازی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے تو قبلے کی جانب اس کے سامنے آگ یا جلتا ہوا تنور ہونا نماز کے منافی نہیں۔ چونکہ استقبال قبلہ جگہ کا تقاضا کرتا ہے اس لحاظ سے آداب مساجد کا ذکر فرمایا۔ اس میں فضیلت بنائے مسجد، اہمیت مسجد، حفاظت مسجد، نظافت مسجد، آداب دخول وخروج مسجد، مسجد میں سونا، فیصلے کرنا، اس کے ستونوں کے ساتھ قیدی باندھنا اور مسجد سے متعلقہ مکروہات ومباحات کی تفصیل، کون سی جگہ نماز کے قابل نہیں اور نماز کہاں ادا کی جائے، اسے بیان فرمایا۔ پھر اس مناسبت سے مکے اور مدینے کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے دوران سفر میں جہاں جہاں نماز پڑھی تھی، وہاں تعمیر کردہ تاریخی مساجد کا تذکرہ کیا ہے۔ آخر میں سترے کے احکام بیان کیے ہیں، یعنی سترۂ امام کی حیثیت، سترے کی مقدار، نمازی اور سترے کے درمیان فاصلہ، کون کون سی چیز کو سترہ بنایا جا سکتا ہے، مسجد حرام میں سترہ، ستونوں کے درمیان اور ان کے پیچھے نماز کی ادائیگی اور اس کی شرعی حیثیت، نمازی کے آگے سے گزرنا اور اس کی سنگینی۔ ابواب سترہ میں اس بات کو خاص طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگر عورت نماز میں سترے کی جگہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، پھر اس مناسبت سے چند ابواب عورت کے متعلق منعقد کیے تاکہ نماز کے متعلق عورت کے معاملے میں تشدد سے کام نہ لیا جائے جیسا کہ بعض حضرات اس کے فاعل وقائل ہیں۔ دوران نماز میں اسے چھونے سے اگر نماز ختم نہیں ہوتی تو اسے سترہ بنانے میں کیا حرج ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے صلاۃ سے متعلقہ ڈھیروں مسائل بیان کرنے کے لیے ایک سو سے زیادہ چھوٹے چھوٹے عنوان قائم کیے ہیں جن سے آپ کی دقت نظر اور جلالت قدر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مسائل کو ثابت کرنے کے لیے 171 مرفوع احادیث بیان کی ہیں جن میں 51 مکرر ہیں۔ اس کے معلقات 33 اور موقوف آثار کی تعداد 34 ہے۔ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب میں متعدد حقائق ومعارف سے پردہ اٹھایا ہے۔ ہماری ان معروضات کو سامنے رکھتے ہوئے کتاب الصلاۃ کا مطالعہ کریں اور اپنے قلب وذہن کو قرآن وحدیث سے جلا بخشیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو اور ہمیں کتاب وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق دے۔ آمین.

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

8 - كِتَابُ الصَّلَاةِ

نماز سے متعلق احکام و مسائل

(۱) بَابٌ: كَيْفَ فُرِضَتِ الصَّلَاةُ فِي الْإِسْرَاءِ؟

باب: 1- شب معراج میں نماز کس طرح فرض کی گئی؟

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: حَدَّثَنِي أَبُو سُفْيَانَ فِي حَدِيثِ هِرَقْلَ فَقَالَ: يَأْمُرُنَا - يَعْنِي النَّبِيَّ ﷺ - بِالصَّلَاةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھ سے حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے ہرقل کی حدیث ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ وہ، یعنی نبی ﷺ ہمیں نماز، صدقہ اور پرہیز گاری کا حکم دیتے ہیں۔

وضاحت: ✱ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ شب معراج کو فرضیت نماز کس شان اور کس کیفیت کے ساتھ ہوئی؟ یہ اسلوب بیان کیفیت زمان، کیفیت مکان اور کیفیت شان سب کو شامل ہے۔ اگر توسع سے کام لیا جائے تو اس میں کیفیت عددی بھی شامل ہو سکتی ہے، یعنی ہم جو نماز پنجگانہ پڑھتے ہیں، ابتدا میں یہ پانچ ہی تھیں یا اس سے کم و بیش اور بعد میں ان میں تخفیف یا اضافہ ہوا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت پیش کردہ حدیث سے ان تمام سوالات کا جواب دیا ہے۔ ✱ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے حدیث سفیان بن حرب ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جو قبل ازیں باب بدء الوحی میں گزر چکی ہے۔ اس کی مناسبت عنوان کے ساتھ بایں طور ہے کہ نماز ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی کیونکہ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد ہرقل کی ملاقات سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ اقامت مکہ کے دوران میں ہی انھیں نماز پڑھنے کا حکم دیتے تھے جس کا ذکر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے شاہ روم ہرقل کے بھرے دربار میں کیا ہے۔ اگرچہ وقت فرضیت کا تعلق کیفیت سے نہیں، تاہم اس کے مقدمات اور متعلقات سے ضرور تعلق رکھتا ہے۔[1]

۳٤۹ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يُونُسَ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ أَنَسٍ

[349] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ رسول

[1] فتح الباري: 597/1.

ابْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ أَبُو ذَرٍّ يُحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «فُرِجَ عَنْ سَقْفِ بَيْتِي وَأَنَا بِمَكَّةَ، فَنَزَلَ جِبْرِيلُ فَفَرَجَ صَدْرِي ثُمَّ غَسَلَهُ بِمَاءِ زَمْزَمَ، ثُمَّ جَاءَ بِطَسْتٍ مِّنْ ذَهَبٍ مُّمْتَلِئٍ حِكْمَةً وَّإِيمَانًا فَأَفْرَغَهُ فِي صَدْرِي، ثُمَّ أَطْبَقَهُ، ثُمَّ أَخَذَ بِيَدِي فَعَرَجَ بِي إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَلَمَّا جِئْتُ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ جِبْرِيلُ لِخَازِنِ السَّمَاءِ: افْتَحْ، قَالَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: جِبْرِيلُ، قَالَ: هَلْ مَعَكَ أَحَدٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، مَعِيَ مُحَمَّدٌ ﷺ، فَقَالَ: أَأُرْسِلَ إِلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَلَمَّا فَتَحَ عَلَوْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا فَإِذَا رَجُلٌ قَاعِدٌ عَلٰى يَمِينِهِ أَسْوِدَةٌ وَّعَلٰى يَسَارِهِ أَسْوِدَةٌ، إِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَمِينِهِ ضَحِكَ، وَإِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَسَارِهِ بَكٰى، فَقَالَ: مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ، وَالْابْنِ الصَّالِحِ، قُلْتُ لِجِبْرِيلَ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا آدَمُ، وَهٰذِهِ الْأَسْوِدَةُ عَنْ يَّمِينِهِ وَشِمَالِهِ نَسَمُ بَنِيهِ، فَأَهْلُ الْيَمِينِ مِنْهُمْ أَهْلُ الْجَنَّةِ، وَالْأَسْوِدَةُ الَّتِي عَنْ شِمَالِهِ أَهْلُ النَّارِ، فَإِذَا نَظَرَ عَنْ يَّمِينِهِ ضَحِكَ، وَإِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهِ بَكٰى، حَتّٰى عَرَجَ بِي إِلَى السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ، فَقَالَ لِخَازِنِهَا: اِفْتَحْ، فَقَالَ لَهُ خَازِنُهَا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُ فَفَتَحَ». قَالَ أَنَسٌ: فَذَكَرَ أَنَّهُ وَجَدَ فِي السَّمٰوَاتِ آدَمَ، وَإِدْرِيسَ، وَمُوسٰى، وَعِيسٰى، وَإِبْرَاهِيمَ صَلَوَاتُ اللهِ عَلَيْهِمْ، وَلَمْ يُثْبِتْ كَيْفَ مَنَازِلُهُمْ غَيْرَ أَنَّهُ ذَكَرَ أَنَّهُ وَجَدَ آدَمَ فِي السَّمَاءِ الدُّنْيَا، وَإِبْرَاهِيمَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ. قَالَ

اللہ نے فرمایا: ''جب میں مکے میں تھا تو ایک شب میرے گھر کی چھت پھٹی۔ حضرت جبریل علیہ السلام اترے، انھوں نے پہلے میرے سینے کو چاک کر کے اسے آب زم زم سے دھویا، پھر ایمان وحکمت سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت لائے اور اسے میرے سینے میں ڈال دیا، بعد میں سینہ بند کر دیا، پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان دنیا کی طرف لے چڑھے۔ جب میں آسمان دنیا پر پہنچا تو جبریل علیہ السلام نے داروغۂ آسمان سے کہا: دروازہ کھول۔ اس نے کہا: کون ہے؟ بولے: میں جبریل ہوں۔ پھر اس نے پوچھا: تمھارے ہمراہ بھی کوئی ہے؟ حضرت جبریل نے کہا: ہاں، میرے ساتھ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ اس نے پھر دریافت کیا: انھیں دعوت دی گئی ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں۔ اس نے جب دروازہ کھول دیا تو ہم آسمان دنیا پر چڑھے۔ وہاں ہم نے ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھا جس کی دائیں جانب جم غفیر اور بائیں جانب بھی انبوہ کثیر تھا۔ جب وہ اپنی دائیں جانب دیکھتا تو ہنستا اور جب بائیں طرف دیکھتا تو رو دیتا۔ اس نے (مجھے دیکھ کر) فرمایا: ''نیک پیغمبر اور اچھے بیٹے! خوش آمدید۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کے دائیں بائیں انبوہ کثیر ان کی اولاد کی ارواح ہیں۔ دائیں جانب والی جنتی اور بائیں جانب والی دوزخی ہیں، اس لیے دائیں طرف نظر کر کے ہنس دیتے ہیں اور بائیں طرف دیکھ کر رو دیتے ہیں۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام مجھے لے کر دوسرے آسمان کی طرف چڑھے اور اس کے داروغے سے کہا: دروازہ کھول! اس نے بھی وہی گفتگو کی جو پہلے نے کی تھی۔ پھر اس نے دروازہ کھول دیا۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت ابوذر کے بیان کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے آسمانوں میں

أَنَسٌ: فَلَمَّا مَرَّ جِبْرِيلُ بِالنَّبِيِّ ﷺ بِإِدْرِيسَ قَالَ: «مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْأَخِ الصَّالِحِ، فَقُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا إِدْرِيسُ، ثُمَّ مَرَرْتُ بِمُوسٰى، فَقَالَ: مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْأَخِ الصَّالِحِ، قُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا مُوسٰى، ثُمَّ مَرَرْتُ بِعِيسٰى فَقَالَ: مَرْحَبًا بِالْأَخِ الصَّالِحِ وَالنَّبِيِّ الصَّالِحِ، قُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا عِيسٰى، ثُمَّ مَرَرْتُ بِإِبْرَاهِيمَ فَقَالَ: مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالِابْنِ الصَّالِحِ، قُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا إِبْرَاهِيمُ ﷺ».

حضرت آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات کی، لیکن ان کے مقامات کو بیان نہیں کیا، صرف اتنا کہا کہ آسمانِ اوّل پر حضرت آدم علیہ السلام اور چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پایا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب حضرت جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کو لے کر حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انھوں نے فرمایا: نیک پیغمبر اور اچھے بھائی! خوش آمدید۔ میں نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: یہ حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے کہا: نیک پیغمبر اور اچھے بھائی! خوش آمدید۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ جبریل نے جواب دیا: یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ پھر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے کہا: نیک پیغمبر اور اچھے بھائی، خوش آمدید! میں نے حضرت جبریل سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ پھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے بھی کہا: اے صالح نبی اور اچھے بیٹے! خوش آمدید۔ میں نے حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔''

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: فَأَخْبَرَنِي ابْنُ حَزْمٍ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَأَبَا حَبَّةَ الْأَنْصَارِيَّ كَانَا يَقُولَانِ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «ثُمَّ عُرِجَ بِي حَتّٰى ظَهَرْتُ لِمُسْتَوًى أَسْمَعُ فِيهِ صَرِيفَ الْأَقْلَامِ».

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوحبہ انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر مجھے اوپر لے جایا گیا حتی کہ میں ایک ایسے بلند ہموار مقام پر پہنچا جہاں میں (فرشتوں کے) قلموں کی آوازیں سنتا تھا۔''

قَالَ ابْنُ حَزْمٍ وَأَنَسُ بْنُ مَالِكٍ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «فَفَرَضَ اللهُ عَلٰى أُمَّتِي خَمْسِينَ صَلَاةً، فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى مَرَرْتُ عَلٰى مُوسٰى، فَقَالَ: مَا فَرَضَ اللهُ لَكَ عَلٰى أُمَّتِكَ؟ قُلْتُ: فَرَضَ خَمْسِينَ صَلَاةً. قَالَ مُوسٰى:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں۔ میں یہ حکم لے کر واپس آیا، جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے پوچھا: اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا: (شب و روز میں) پچاس نمازیں فرض کی

فَارْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ، فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيقُ ذٰلِكَ، فَرَاجَعَنِي فَوَضَعَ شَطْرَهَا، فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوسٰى، قُلْتُ: وَضَعَ شَطْرَهَا، قَالَ: رَاجِعْ رَبَّكَ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيقُ، فَرَاجَعْتُ، فَوَضَعَ شَطْرَهَا، فَرَجَعْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ: اِرْجِعْ إِلٰى رَبِّكَ فَإِنَّ أُمَّتَكَ لَا تُطِيقُ ذٰلِكَ، فَرَاجَعْتُهُ، فَقَالَ: هُنَّ خَمْسٌ وَّهُنَّ خَمْسُونَ، لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ، فَرَجَعْتُ إِلٰى مُوسٰى، فَقَالَ: رَاجِعْ رَبَّكَ، فَقُلْتُ: اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَّبِّي، ثُمَّ انْطَلَقَ بِي حَتّٰى انْتَهٰى بِي إِلٰى سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، وَغَشِيَهَا أَلْوَانٌ لَا أَدْرِي مَا هِيَ، ثُمَّ أُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ، فَإِذَا فِيهَا حَبَايِلُ اللُّؤْلُؤِ، وَإِذَا تُرَابُهَا الْمِسْكُ». [انظر: ١٦٣٦، ٣٣٤٢]

ہیں۔ (اس پر) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیے کیونکہ آپ کی امت ان کی متحمل نہیں ہو سکے گی، چنانچہ میں واپس گیا تو اللہ تعالیٰ نے کچھ نمازیں معاف کر دیں۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے کچھ نمازیں معاف کر دی ہیں۔ انھوں نے کہا: اپنے رب کے پاس دوبارہ جاؤ آپ کی امت ان کی بھی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ میں لوٹا تو اللہ نے کچھ اور نمازیں معاف کر دیں۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا تو انھوں نے کہا: پھر اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیں کیونکہ آپ کی امت ان (نمازوں) کی بھی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ میں پھر لوٹا (اور ایسا کئی بار ہوا) بالآخر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ نمازیں پانچ ہیں اور درحقیقت (ثواب کے لحاظ سے) پچاس ہیں۔ میرے ہاں فیصلہ بدلنے کا دستور نہیں۔ میں پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس لوٹ کر آیا تو انھوں نے کہا: اپنے رب کے پاس (مزید تخفیف کے لیے) لوٹ جاؤ۔ میں نے کہا: اب مجھے اپنے مالک سے شرم آتی ہے۔ پھر مجھے جبریل لے کر روانہ ہو گئے یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا جسے کئی طرح کے رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا جن کی حقیقت کا مجھے علم نہیں۔ پھر میں جنت میں داخل کیا گیا، وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں موتیوں کی (جگمگاتی) لڑیاں ہیں اور اس کی مٹی کستوری ہے۔"

فوائد ومسائل: ① شب معراج میں فرضیت نماز کی یہ حکمت تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس رات فرشتوں کی مختلف عبادات کو دیکھا، ان میں جو حالت قیام میں تھے وہ بیٹھتے نہیں تھے اور جو رکوع میں تھے وہ سجدے میں نہ جاتے تھے اور بہت سے فرشتے حالت سجدہ میں پڑے اپنا سر نہیں اٹھا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی تمام انواع عبادات کو ایک رکعت نماز میں جمع کر دیا، نیز اس میں نماز کی عظمت اور اس کے شرف کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس کی فرضیت میں یہ خصوصیت رکھی گئی کہ اس کی فرضیت بلاواسطۂ فرشتہ ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں کہ شب معراج میں فرضیت نماز کی حکمت تھی کہ معراج سے پہلے

رسول اللہ ﷺ کو ظاہری اور باطنی طہارت سے آراستہ کیا گیا کہ آپ کے قلب مبارک کو آب زمزم سے دھو کر اس میں ایمان و حکمت کو بھر دیا گیا تاکہ آپ اپنے رب سے مناجات کے لیے مستعد ہو جائیں۔ اسی طرح نماز میں بھی بندہ اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کے لیے پہلے خود کو طہارت و نظافت سے مزین کرتا ہے، اس لیے مناسب ہوا کہ معراج کی مناسبت سے اس امت پر نماز کو فرض کر دیا جائے، نیز اس سے ملأ اعلیٰ پر رسول اللہ ﷺ کا شرف ظاہر کرنا بھی مقصود تھا تاکہ ساکنانِ حریم قدس ملائکہ اور حضرات انبیائے کرام کی امامت کروائیں اور اپنے رب سے مناجات کریں، اس مناسبت سے نمازی بھی دوران نماز میں اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔[1] ② اس روایت میں بیت المقدس تک اسرا کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ معراج اسرا کے بغیر ہے بلکہ کسی راوی نے واقعہ مختصر کر دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ جس رات میں نماز فرض ہوئی اس رات میں بیت المقدس تک اسرا بھی ہے اور عالم بالا تک معراج بھی ہوا ہے اگرچہ اسرا اور معراج دو الگ الگ چیزیں ہیں، یعنی مکے سے بیت المقدس تک کا سفر اسرا کہلاتا ہے اور بیت المقدس سے عالم بالا کے سفر کو معراج کہا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ دونوں سفر ایک ہی رات سے متعلق ہیں، چنانچہ عنوان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسرا کی رات نماز کیسے فرض ہوئی؟ حالانکہ روایت میں اسرا کا ذکر نہیں ہے لیکن اسرا کا واقعہ بھی اسی رات میں بحالت بیداری پیش آیا۔ واللہ أعلم.

③ اس روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات کو امت پر پچاس نمازیں فرض فرما دیں جو بندے اور آقا کے درمیان مناجات کا ذریعہ ہیں، چنانچہ آپ بے چون و چرا اس تحفے کو لے کر واپس ہوئے۔ آپ نے یہ خیال نہیں کیا کہ پچاس نمازیں کس طرح ادا ہوں گی کیونکہ آپ مقام عبدیت میں ہیں، عبودیت کاملہ تھی جس کا تقاضا تھا کہ جو چیز آقا کی طرف سے عطا کی جائے اسے بے چون و چرا قبول کیا جائے۔ ان پچاس نمازوں کی فرضیت میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ بندوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت نماز ہے۔ جس قدر یہ نعمت زیادہ ہوگی، اسی قدر شان نمایاں ہو گی۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نو بار اپنے رب کے حضور آمد و رفت سے پچاس نمازوں میں سے پانچ رہ گئیں۔ ایک مرتبہ میں ہی تخفیف کر کے پانچ کی جا سکتی تھیں مگر اس صورت میں آپ کی شانِ محبوبیت کا اظہار نہ ہوتا۔ بار بار حاضری کا موقع دیا جا رہا ہے، آخر میں فرما دیا کہ اب نمازیں پانچ ہیں، وہ پانچ رہتے ہوئے بھی پچاس ہی ہیں۔ چونکہ قرآنی ضابطے کے مطابق ایک نیکی کا اجر دس گنا ہے، اس لیے پانچ نمازیں ادا کرنے سے پچاس ہی کا ثواب لکھا جاتا ہے۔[2] ④ آخری مرتبہ پانچ نمازیں رہ جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے واپس نہ جانے کی جو وجہ ظاہر کی ہے وہ یہ کہ اب مجھے اپنے رب سے درخواست پیش کرنے میں شرم آرہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پانچ پانچ کی تخفیف سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر پانچ رہ جانے کے بعد بھی درخواست کریں گے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ باقی ماندہ پانچ نمازیں بھی بالکل معاف کر دی جائیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عطیے کو واپس کیا جا رہا ہے جو کسی حال میں مناسب نہیں تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند نہ کیا۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کو یقین ہو گیا تھا کہ ہر بار میں جو باقی حکم رہ گیا ہے وہ حتمی اور آخری فیصلہ نہیں لیکن آخری بار میں پانچ

① فتح الباري : 596/1. ② فتح الباري : 600/1.

نمازوں کے ساتھ فرما دیا تھا کہ میرے ہاں قول وفیصلہ کی الٹ پلٹ نہیں ہوتی، اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اب آخری اور حتمی فیصلہ ہو چکا ہے، اب تخفیف کی درخواست کرنا مناسب نہیں۔[1] ⑤ حدیث میں ہے کہ معراج میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں: پانچ نمازیں، سورۂ بقرہ کی آخری آیات، اور بشرط عدم شرک کبائر کی مغفرت۔[2] پانچ نمازوں کی عطا سے مراد ان کی فرضیت ہے۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیات، آمن الرسول سے ختم سورت تک، ان آیات میں اس امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی کمالِ رحمت، تخفیف احکام، بشارت مغفرت اور کافروں کے مقابلے میں نصرت کا بیان ہے۔ اس عطا سے مراد عطائے مضمون ہے کیونکہ نزول کے لحاظ سے تو تمام سورۂ بقرہ مدنی ہے اور معراج مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شب معراج میں بلاواسطہ یہ آیات رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہوں پھر جب حضرت جبریل کے واسطے سے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں تو مصحف میں لکھی گئیں۔ کبائر معاصی کی مغفرت کا مطلب یہ نہیں کہ موحدین اہل کبائر کو قیامت کے دن عذاب ہی نہیں ہوگا کیونکہ یہ بات تو اجماع اہل سنت کے خلاف ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی طرح امت کے اہل کبائر ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے بلکہ انھیں آخر کار جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ واللہ أعلم.

نوٹ: اسراء و معراج کے متعلق دیگر مباحث کتاب أحادیث الأنبیاء، حدیث: 3342 میں بیان ہوں گے۔ بإذن اللہ.

٣٥٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ قَالَتْ: فَرَضَ اللهُ الصَّلَاةَ حِينَ فَرَضَهَا رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَأُقِرَّتْ صَلَاةُ السَّفَرِ وَزِيدَ فِي صَلَاةِ الْحَضَرِ. [انظر: ١٠٩٠، ٣٩٣٥]

[350] حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب نماز فرض کی تو حضر وسفر میں (ہر نماز کی) دو دو رکعتیں فرض کی تھیں۔ پھر نماز سفر اپنی اصلی حالت میں قائم رکھی گئی اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔

فوائد ومسائل: ① کیفیت عددی کی دو قسمیں ہیں: ایک تو نمازوں کی تعداد، دوسرے نماز میں رکعات کی تعداد۔ پہلی قسم کے متعلق وضاحت تو حدیث اسرا میں موجود ہے کہ پہلے پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں، پھر تخفیف کرتے کرتے پانچ نمازوں کو برقرار رکھا گیا۔ اس حدیث میں نماز کی فرضیت کے وقت تعداد رکعات کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جب نماز فرض ہوئی تھی تو ہر نماز کی دو دو رکعت تھیں، پھر حضر کی نماز میں دو، دو رکعت کا اضافہ کر دیا گیا۔ البتہ ابن اسحاق کی بیان کردہ روایت میں مغرب کی نماز کا استثنا ہے۔ گویا صلاۃ مغرب شروع ہی سے تین رکعات تھیں، اس کی دو رکعت نہیں تھیں۔[3] ایک روایت میں اس کی مزید تفصیل ہے کہ ابتداءً ہر نماز کی دو، دو رکعت فرض ہوئی تھیں، پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی تو چار رکعت فرض ہو گئیں اور سفر کی نماز پہلی حالت پر چھوڑ دی گئی۔[4] محدث ابن خزیمہ نے حضرت عائشہ ؓ کی تفصیلی روایت بایں الفاظ نقل کی ہے: ابتداءً سفر و حضر

① فتح الباري: 600/1. ② صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 431(173). ③ مسند أحمد: 273/6. ④ صحيح البخاري، المناقب، حديث: 3935.

میں ہر نماز کی دو، دو رکعت فرض ہوئی تھیں، پھر رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ کو سکون و اطمینان نصیب ہوا تو صلاۃ حضر میں دو، دو رکعت کا اضافہ کر دیا گیا اور صلاۃ فجر کو طولِ قراءت کی وجہ سے یونہی رہنے دیا گیا، اسی طرح مغرب چونکہ وتر النہار ہے، اس لیے اس میں بھی اضافہ نہیں کیا گیا۔[1] ایک روایت میں ہے کہ نماز اولاً تو دو، دو رکعت ہی فرض ہوئی تھی، پھر سفر کے لیے تو اسی طرح باقی رہی، البتہ حضر کی نماز کو پورا کر دیا گیا۔ راویٔ حدیث حضرت امام زہری نے اپنے شیخ حضرت عروہ بن زبیر سے سوال کیا کہ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دوران سفر میں نماز پوری کیوں پڑھتی تھیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح تاویل کرتی تھیں۔[2] حضرت عروہ رحمہ اللہ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تاویلاً مقیم بن کر اتمام فرمایا، نہ کہ مسافر رہتے ہوئے اتمام کا عمل فرمایا، لہٰذا ان کے عمل اور روایت میں کوئی تضاد نہیں۔ دوران سفر میں قصر واجب ہے یا عزیمت یا رخصت؟ اس کے متعلق کتاب تقصیر الصلاۃ میں بحث ہوگی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اس مقام پر حدیث عائشہ بیان کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نماز کی ابتدائی فرضیت کی نوعیت مقدار رکعات کے لحاظ سے سفر و حضر دونوں حالتوں میں دو، دو رکعت ہی تھی، اس کے بعد حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور سفر کی نماز دو، دو رکعت ہی باقی رہی۔ اس حدیث سے متعلقہ دیگر مباحث امام بخاری رحمہ اللہ نے آئندہ بیان کیے ہیں، لہٰذا ہم بھی وہاں اپنی گزارشات پیش کریں گے۔ واضح رہے کہ تعداد رکعات کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجتہاد سے کام نہیں لیا کیونکہ اس میں قیاس کا کوئی دخل نہیں بلکہ یہ بات یا تو انھیں رسول اللہ ﷺ سے معلوم ہوئی یا کسی اور صحابی سے، اس لیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے وضاحت فرما دی کہ یہ روایت معناً مرفوع ہے۔[3] ② حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بیان کردہ ایک روایت کے خلاف ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ ﷺ کی زبان حق ترجمان سے حضر میں نماز کی چار، چار رکعات، سفر میں دو، دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت فرض کی گئی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ تعارض اس طرح رفع کیا کہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں نمازوں کو پورا کر دیا گیا تھا، اس کے بعد جب سفر کی مشکلات درپیش ہوئیں تو مسافر کے لیے دیگر مراعات کے ساتھ ایک رعایت نماز کے متعلق بھی دے دی گئی کہ اسے قصر سے پڑھا جا سکتا ہے کیونکہ ہجرت کے چوتھے سال آیت قصر نازل ہوئی ہے۔ اس توجیہ کے پیش نظر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ مطلب ہے کہ انجام اور نتیجے کے اعتبار سے تخفیف کے بعد سفر کی نماز چار رکعت کے بجائے دو رکعت رہ گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فرضیت کے وقت ہی سے اس کی دو رکعت تھیں جنھیں برقرار رکھا گیا۔[4] لیکن اس توجیہ پر دل مطمئن نہیں کیونکہ یہ تاویل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے صریح الفاظ کے خلاف ہے۔ پھر اس توجیہ میں ایک ایسا قیاس کیا گیا ہے جس کی کوئی معقول وجہ نہیں، وہ یہ کہ آیت قصر ہجرت کے چوتھے سال نازل ہوئی، لہٰذا ان چار سال کی مدت میں نماز سفر بھی چار رکعت ہی ہوں گی۔ اس قیاس پر کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت واضح ہے کہ اضافہ حضر کی نماز میں ہوا، سفر کی نماز میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ اسے جوں کا توں برقرار رکھا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہجرت کے بعد حضر کی نمازیں چار چار رکعت مقرر کر دی گئیں اور سفر میں دو رکعت ہی رہیں۔ واللہ أعلم.

---

1 صحيح ابن خزيمة: 157/1، حديث: 305. 2 صحيح البخاري، تقصير الصلاة، حديث: 1090. 3 فتح الباري: 602/1.
4 فتح الباري: 602/1.

(٢) بَابُ وُجُوبِ الصَّلَاةِ فِي الثِّيَابِ

وَقَوْلِ اللهِ تَعَالَى: ﴿خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف:٣١] وَمَنْ صَلَّى مُلْتَحِفًا فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، وَيُذْكَرُ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «يَزُرُّهُ وَلَوْ بِشَوْكَةٍ». فِي إِسْنَادِهِ نَظَرٌ، وَمَنْ صَلَّى فِي الثَّوْبِ الَّذِي يُجَامِعُ فِيهِ مَا لَمْ يَرَ فِيهِ أَذًى، وَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ لَا يَطُوفَ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ.

باب:2-نماز کے لیے لباس کی فرضیت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہر نماز کے وقت اپنی آرائش، یعنی لباس پہن لیا کرو۔'' اور جو شخص ایک ہی کپڑے میں لپٹ کر نماز پڑھ لے (تو یہ درست ہے)۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھیں نبی ﷺ نے قمیص کے گریبان کو بند کرنے کے متعلق کہا تھا اگرچہ کانٹے ہی سے کیوں نہ ہو، لیکن اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔ اور اگر کسی نے ایسے کپڑے پہن کر نماز پڑھی جن میں جماع کرتا ہے تو کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ ان میں نجاست نہ دیکھے۔ نبی ﷺ نے حکم دیا تھا کہ کوئی برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔

وضاحت: نماز کی فرضیت ثابت کرنے کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ شرائط نماز بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے ستر عورۃ کو شروع کیا کیونکہ ستر عورۃ نماز اور غیر نماز دونوں میں ضروری ہے۔ نماز میں ستر عورۃ کے واجب ہونے کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ''ہر مسجد میں حاضری کے وقت اپنا لباس زیب تن کرو۔'' جب مسجد میں حاضری کے لیے لباس کا پہننا ضروری ہے تو نماز کے لیے بدرجۂ اولیٰ اس کی ضرورت ثابت ہو گئی۔ آیت کریمہ میں زینت سے مراد اعلیٰ قسم کا لباس نہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اس حصۂ جسم کو ڈھانپ کر آؤ جس کا کھلا رکھنا معیوب ہے۔ چونکہ لباس والا جسم ننگے جسم کے مقابلے میں مزین نظر آتا ہے، اس لیے لباس کو زینت کہا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ستر عورۃ کی اہمیت بایں طور بیان کرتے ہیں کہ اگر برہنگی دور کرنے کے لیے ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ لی جائے تو بھی جائز ہے۔ اس میں کوئی پابندی نہیں کہ اس کپڑے کو بطور تہ بند استعمال کیا جائے یا اسے بدن پر لپیٹ کر نماز پڑھ لی جائے۔ ایک کپڑے میں نماز کی دلیل حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے جس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں شکاری ہوں، اس لیے ضرورت سے زیادہ کپڑے ساتھ نہیں رکھتا صرف ایک کرتا پہن لیتا ہوں، کیا میں اس کرتے میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا کہ نماز پڑھی جا سکتی ہے بشرطیکہ چاک گریبان بند کر لیا جائے، خواہ کانٹے ہی سے کیوں نہ ہو۔ کانٹا لگانے کا مطلب بھی ستر عورۃ ہے، یعنی پردے والے حصۂ جسم کو چھپانا۔ جب نمازی کا حصۂ مستور خود اپنے لیے چھپانا ضروری ہے تو غیر سے اس کا چھپانا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوا۔ اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تالیف التاریخ الکبیر میں اور امام ابوداود، محدث ابن خزیمہ اور ابن حبان نے باسند روایت کیا ہے لیکن اس کی سند پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اعتراض کیا ہے جس کی تفصیل فتح الباری میں ہے۔ جس کا خلاصہ ہے کہ روایت مجموعی حیثیت سے قابل استدلال ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث سلمہ بن اکوع بیان کر کے اس بات کی طرف

① فتح الباري: 604/1.

اشارہ کیا ہے کہ آیت کریمہ میں اخذ زینت سے مراد لباس پہننا ہے، زیبائش و آرائش مراد نہیں۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ ستر عورۃ کے لیے لباس میں مزید وسعت پیدا کرتے ہیں کہ اس میں آزادی ہے، خواہ وہ کپڑا نیا ہو یا مستعمل، پھر مستعمل بھی عام حالات میں ہو یا بوقت مجامعت بدن پر رہا ہو، صرف اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔ وہ نجاست آلود نہ ہو۔ اس وسعت کے ذریعے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک روایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے اپنی بہن حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: آیا رسول اللہ ﷺ اس کپڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے جسے بحالت جماع پہن رکھا ہو؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، جب اس میں نجاست وغیرہ نہ دیکھتے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے ستر عورۃ کے وجوب پر ایک اور دلیل ذکر فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عریاں ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنے کے متعلق حکم امتناعی جاری کیا ہے۔[3] وجہ استدلال یہ ہے کہ برہنگی کی حالت میں طواف سے منع فرمایا گیا ہے، حالانکہ طواف کی اہمیت نماز سے زیادہ نہیں اور طواف کے لیے اس قسم کی شرائط و آداب بھی نہیں ہیں جو نماز کے لیے ہیں۔ اس کے باوجود حکم ہے کہ بیت اللہ کا طواف برہنہ ہو کر نہ کیا جائے تو نماز میں بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا کہ برہنگی کی حالت میں اسے ادا نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ ستر عورۃ کے متعلق مالکیہ کا موقف بہت عجیب ہے۔ غیر نماز میں تو وہ ستر عورۃ کے متعلق جمہور کے ساتھ ہیں کہ یہ فرض ہے لیکن نماز میں ستر عورۃ ان کے نزدیک سنن کے درجے میں ہے جبکہ جمہور کے نزدیک نماز میں ستر عورۃ ضروری اور شرط ہے۔ ممکن ہے امام بخاری رحمہ اللہ جمہور کی موافقت کرتے ہوئے مالکیہ کی تردید فرما رہے ہوں۔ اس اختلاف کا ثمرہ اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ اگر کوئی شخص بند کمرے میں تنہا ستر عورۃ کے بغیر نماز پڑھے تو جمہور ائمہ اور امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی نماز نہیں ہوگی کیونکہ اس نے ایک فرض کو ترک کر دیا ہے جبکہ مالکیہ کے نزدیک نماز ہو جائے گی، صرف سنت کے ترک کی وجہ سے ایسا کرنا مکروہ ضرور ہے لیکن متاخرین مالکیہ نے جمہور کی موافقت کی ہے اور ستر عورۃ کو نماز میں بھی لازم قرار دیا ہے۔ واللہ أعلم.

٣٥١ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ الْحُيَّضَ يَوْمَ الْعِيدَيْنِ وَذَوَاتِ الْخُدُورِ فَيَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَدَعْوَتَهُمْ، وَيَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ عَنْ مُصَلَّاهُنَّ، قَالَتِ امْرَأَةٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِحْدَانَا لَيْسَ لَهَا جِلْبَابٌ. قَالَ: «لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا»، وَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ رَجَاءٍ: حَدَّثَنَا

[351] حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم عیدین کے موقع پر حائضہ اور پردہ نشین عورتوں کو باہر لائیں تاکہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کی دعاؤں میں شریک ہوں، البتہ جو عورتیں ایام والی ہوں وہ نماز کی جگہ سے الگ رہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کو چادر میسر نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا: ”اس کے ساتھ جانے والی اس کو اپنی چادر میں لے لے۔“ عبداللہ بن رجاء نے کہا: ہمیں عمران نے یہ حدیث سنائی، انھوں

[1] فتح الباري: 604/1. [2] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 366، و سنن النسائي، الطهارة، حديث: 295. [3] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4363.

عِمْرَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِيرِينَ قَالَ: حَدَّثَتْنَا أُمُّ عَطِيَّةَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ بِهٰذَا. [راجع: ٣٢٤]

نے کہا: ہم سے محمد بن سیرین نے یہ حدیث بیان کی اور محمد بن سیرین نے کہا: ہم سے ام عطیہ ؓ نے یہ حدیث ذکر کی، انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ سے یہ حدیث سنی۔

فوائد ومسائل: ① اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کو عیدگاہ میں جانے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے تاکید فرمائی ہے حتی کہ جو عورتیں اپنی طبعی مجبوری کی وجہ سے نماز پڑھنے سے معذور ہیں وہ بھی عیدگاہ میں حاضر ہوں، لیکن پردے کا اہتمام ضروری ہے۔ اگر کسی کے پاس چادر نہیں تو وہ اپنی کسی بہن سے مستعار لے لے یا بڑی چادر میں کسی دوسری عورت کے ساتھ چلی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عیدگاہ میں جانا ضروری بھی ہے لیکن بے پردہ جانے کی بھی اجازت نہیں۔ جب راستے میں جاتے ہوئے اس قدر اہتمام ہے تو نماز کپڑے کے بغیر کس طرح درست ہوگی، یعنی جب نماز میں حاضری کے لیے کپڑا ضروری ہے تو نماز میں بدرجۂ اَولیٰ اس کی ضرورت ہوگی۔ وھو المقصود. امام بخاری ؒ کا استدلال اس طور بھی ہوسکتا ہے کہ جب حائضہ کے لیے کپڑے اور چادر کا اس قدر التزام ہے، حالانکہ اس نے نماز نہیں پڑھنی ہے تو طاہرہ جس نے نماز پڑھنی ہے، اس کے لیے کپڑے کا اہتمام بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا۔ استدلال اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ شریعت کی نظر میں سوال کرنا اچھی عادت نہیں لیکن نماز پڑھنے کے لیے کپڑوں کے سوال کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کے لیے کپڑے کا ہونا ضروری ہے۔ واللہ أعلم. ② امام بخاری ؒ نے روایت کے آخر میں ایک تعلیق بیان کی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں محدث ابن سیرین نے صراحت کی ہے کہ انھوں نے حضرت ام عطیہ ؓ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ امام بخاری ؒ نے اس تعلیق سے ان حضرات کی تردید کی ہے جن کے خیال کے مطابق محدث ابن سیرین نے حضرت ام عطیہ ؓ سے سماع نہیں کیا بلکہ اس کی بہن حضرت حفصہ سے حدیث سنی ہے۔ امام بخاری کی پیش کردہ پہلی سند میں محمد بن سیرین نے اس روایت کو "عن" کے صیغے سے بیان کیا تھا۔ شبہ تھا کہ شاید براہ راست انھوں نے حضرت ام عطیہ ؓ سے اس حدیث کو نہیں سنا۔ اس تعلیق سے اس شبہے کو دور فرما دیا۔[1] ③ حفصہ بنت سیرین کہتی ہیں کہ ہم اپنی کنواری جوان بچیوں کو عیدگاہ جانے سے منع کرتی تھیں۔ مجھے کسی نے حضرت ام عطیہ ؓ کے حوالے سے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کو عیدین کے موقع پر عیدگاہ جانے کی تاکید کرتے تھے۔ جب ہماری ملاقات ام عطیہ سے ہوئی تو میں نے براہ راست ان سے سوال کیا تو انھوں نے یہ حدیث بیان کی۔ میں نے سوال کیا: آیا حائضہ عورت بھی عیدگاہ جائے؟ انھوں نے فرمایا: وہ حج کے موقع پر عرفات اور دیگر مقامات مقدسہ میں جاتی ہیں تو عیدگاہ جانے میں کیوں ممانعت ہو؟[2] ④ امام بخاری ؒ آئندہ 15 ابواب میں ستر عورۃ کا مسئلہ بیان فرمائیں گے جن میں مختلف احوال وظروف کے اعتبار سے نماز میں کپڑوں کے استعمال کے متعلق وضاحت کی جائے گی۔ کپڑے کم ہوں یا تنگ ہوں تو کیا کیا جائے؟ مرد اور عورت کے لیے الگ الگ احکام کیا ہیں؟ اس باب میں جن احادیث کی طرف امام بخاری ؒ نے اشارہ کیا ہے وہ ان کی شرائط صحت کے مطابق نہ تھیں، اس لیے انھیں موصولاً نہیں لائے، صرف حدیث ام عطیہ ؓ کو بطور استیناس اس مقام پر بیان فرمایا ہے۔ اس حدیث میں

① فتح الباري: 605/1. ② صحيح البخاري، الحيض، حديث: 324.

ایام والی عورتوں کو کہا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہوں۔ اس سے مراد جماعت نماز میں شرکت کرنا نہیں بلکہ صرف عیدگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ اگرچہ شہود کا استعمال شرکت جماعت اور اقتدا کے لیے بھی حدیث میں استعمال ہوا ہے، تاہم اس مقام پر یہ معنی نہیں ہیں کیونکہ ایام والی عورتیں نماز پڑھنے سے معذور ہیں۔ ⑤ ایک عورت کا دوسری سے چادر مستعار لینا یا ایک بڑی چادر میں دو عورتوں کا اکٹھے جانا بعض حضرات کے نزدیک یہ اہتمام صرف راستے میں جاتے وقت راہ گیروں سے پردے کی وجہ سے ہے، اس کا ستر عورۃ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ انسان سے شرم اس درجہ ضروری کہ عیدگاہ میں بے پردہ جانا ممنوع ٹھہرا لیکن دوران نماز میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر ستر عورۃ کا اہتمام نہ کرنا، یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے حیا زیادہ کرنی چاہیے۔ واللہ أعلم.

(٣) بَابُ عَقْدِ الْإِزَارِ عَلَى الْقَفَا فِي الصَّلَاةِ

باب: 3- دوران نماز میں گردن پر تہ بند کی گرہ لگانا

وَقَالَ أَبُو حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ: صَلَّوْا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ عَاقِدِي أُزْرِهِمْ عَلَى عَوَاتِقِهِمْ.

سہل بن سعد سے روایت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ کے ساتھ اپنے شانوں پر تہ بند کی گرہ لگا کر نماز پڑھی تھی۔

وضاحت: اس باب کا مقصد یہ ہے کہ نماز شروع کرنے والا اپنی چادر کو بدن سے لپیٹ کر گدی سے باندھ لے کیونکہ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو رکوع یا سجدے کے وقت ستر کھلنے کا خطرہ ہے۔ گرہ لگانے کے عمل سے کشف ستر کا احتمال باقی نہیں رہے گا۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سہل بن سعد سے مروی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جسے آئندہ موصولاً (رقم: 362 میں) بیان کریں گے۔ مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو شانوں پر گرہ لگاتے دیکھا لیکن منع نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ یہ عمل جائز ہے۔ واضح رہے کہ مسجد میں رہنے والے اصحاب صفہ اپنے تہ بند کی گردن پر گرہ لگا لیتے تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا، ان میں سے کسی ایک کے پاس پوری چادر نہ تھی، صرف تہ بند ہوتا یا اوڑھنے کی چادر جسے وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے اور اسے اپنے ہاتھ سے اس خطرے کے پیش نظر سمیٹ لیتے کہ مبادا شرم گاہ کھل جائے۔[1]

٣٥٢ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَاصِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنِي وَاقِدُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ، قَالَ: صَلَّى جَابِرٌ فِي إِزَارٍ قَدْ عَقَدَهُ مِنْ قِبَلِ قَفَاهُ، وَثِيَابُهُ مَوْضُوعَةٌ عَلَى الْمِشْجَبِ، قَالَ لَهُ قَائِلٌ: تُصَلِّي فِي إِزَارٍ وَاحِدٍ؟ فَقَالَ: إِنَّمَا صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِيَرَانِي أَحْمَقُ

[352] حضرت محمد بن منکدر رحمہ اللہ سے روایت ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صرف ایک تہ بند میں نماز پڑھی جس کی گرہ انھوں نے اپنی گردن پر لگائی تھی، حالانکہ ان کے دوسرے کپڑے ایک تپائی پر رکھے ہوئے تھے۔ لوگوں میں سے کسی نے کہا: آپ ایک ازار میں نماز پڑھتے ہیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے ایسا صرف اس لیے کیا

1 صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 442.

مِثْلُكَ، وَأَيُّنَا كَانَ لَهُ ثَوْبَانِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ؟ [انظر: ٣٥٣، ٣٦١، ٣٧٠]

ہے تا کہ مجھے تجھ جیسا احمق دیکھ لے۔ اور نبی ﷺ کے عہد مبارک میں کس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟

٣٥٣ - حَدَّثَنَا مُطَرِّفٌ أَبُو مُصْعَبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِي الْمَوَالِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ: رَأَيْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، وَقَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ. [راجع: ٣٥٢]

[353] حضرت محمد بن منکدر سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ صحت نماز کا مدار کپڑوں کی گنتی پر نہیں بلکہ ستر عورۃ پر ہے، خواہ وہ کسی طریقے سے حاصل ہو۔ پیش کردہ روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک ہی چادر میں نماز پڑھی اور ستر عورۃ کے لیے انھوں نے چادر کے دونوں کناروں کو گردن پر باندھ لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس ایک سے زائد کپڑے ہوں اس کے باوجود وہ صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے، اگرچہ بہتر ہے کہ وہ پورا لباس پہن کر نماز پڑھے، چنانچہ پہلی روایت میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا عمل بیان ہوا ہے۔ دوسری روایت سے پتہ چلا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ایک کپڑے میں نماز پڑھنا اس لیے تھا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا تھا، تاہم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف روایت منقول ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: کوئی آدمی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے اگرچہ وہ زمین و آسمان جتنا وسیع ہو۔ محدث ابن بطال نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف اس طرح کا امتناعی حکم منسوب کیا ہے۔ آخر کار اس بات پر اجماع ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز ادا کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ ساتر ہو اگرچہ دوسرے کپڑے اس کے پاس موجود ہوں۔[1] ② صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے متعلق روایت کرنے والے حضرت عبادہ بن ولید تھے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت (360) سے معلوم ہوتا ہے کہ سعید بن حارث نے اس کے متعلق سوال کیا تھا، جبکہ صحیح بخاری ہی کی دوسری روایت (370) میں ہے ابن منکدر کہتے ہیں: ہم نے کہا: اے ابوعبداللہ! یعنی ہم نے اس کے متعلق سوال کیا۔ ممکن ہے کہ متعدد دفعہ مختلف لوگوں نے اس کے متعلق سوال کیے ہوں۔ ابن منکدر کے جواب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے چاہا کہ آپ جیسے جاہل مجھے اس طرح نماز پڑھتے دیکھ لیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا تحقیق اکابر علماء پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے بلکہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں ایسا کرنا حماقت اور جہالت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے قصداً ایسا کیا ہے، اس میں تمھارے اس اعتراض کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ تمھیں سوچنا چاہیے تھا کہ واقف شریعت صحابی عمل کر رہا ہے اور اس عمل میں عقل و قیاس کو بھی کوئی دخل نہیں، اس لیے یہ عمل خود جواز کی دلیل ہے لیکن تم اس عمل سے مسئلہ مستنبط کرنے کے بجائے اعتراض کرنے لگے جو حماقت اور جہالت کی علامت ہے۔[2] ③ مشجب کے معنی ہمارے یہاں کی متداول تپائی نہیں بلکہ اس

① فتح الباري: 607/1. ② فتح الباري: 606/1.

سے مراد تین لکڑیاں کھڑی کر کے ان کے اوپر والے سرے جوڑ دیے جائیں اور نیچے کے سرے پھیلا دیے جائیں جیسے سپاہی پریڈ کے میدان میں تین بندوقیں جوڑ کر کھڑی کر دیتے ہیں، اس وقت لوگ لکڑی کے اس اسٹینڈ پر غسل وغیرہ کے وقت اپنے کپڑے رکھ دیتے تھے، نیز پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے اس پر مشکیزے بھی لٹکایا کرتے تھے، چرواہے بھی اسے استعمال کرتے تھے، یعنی اس پر اپنا ڈول اور مشکیزہ لٹکا دیتے تھے۔[1]

(٤) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ مُلْتَحِفًا بِهِ

باب : 4- صرف ایک کپڑا بدن پر لپیٹ کر نماز پڑھنا

قَالَ الزُّهْرِيُّ فِي حَدِيثِهِ: اَلْمُلْتَحِفُ الْمُتَوَشِّحُ، وَهُوَ الْمُخَالِفُ بَيْنَ طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ، وَهُوَ الْاِشْتِمَالُ [عَلٰى] مَنْكِبَيْهِ.

امام زہری نے اپنی روایت کردہ حدیث میں بیان کیا کہ ملتحف کے معنی متوشح کے ہیں۔ اور متوشح اس شخص کو کہتے ہیں جو کپڑے کے دائیں کنارے کو بائیں بغل کے نیچے سے نکال کر اور بائیں کنارے کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر کندھوں پر ڈال لے۔ اور دونوں کندھوں کو لپیٹ لینا (اشتمال) بھی یہی ہے۔

قَالَ: وَقَالَتْ أُمُّ هَانِئٍ: اِلْتَحَفَ النَّبِيُّ ﷺ بِثَوْبٍ، وَخَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ.

امام زہری نے کہا: حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نبی ﷺ نے ایک کپڑا کندھوں پر اس طرح لپیٹا کہ بایاں کنارہ دائیں طرف اور دایاں کنارہ بائیں طرف نکل آیا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نماز میں کپڑا استعمال کرنے کی مختلف صورتیں بیان کر رہے ہیں: پہلی صورت یہی تھی کہ گردن پر تہ بند کی گرہ لگائی جائے۔ یہ ایسے کپڑے کے متعلق ہدایت تھی جس میں لپیٹ لینے کی گنجائش نہ ہو۔ اس باب میں ایک دوسری صورت بیان کر رہے ہیں کہ اگر کپڑے میں لپیٹ لینے کی گنجائش ہو تو بغیر گرہ لگائے اسے دونوں کندھوں پر ڈال لیا جائے۔ اس سلسلے میں مختلف تعبیرات منقول ہیں۔ التحاف، توشیح، مخالفت اور اشتمال وغیرہ۔ امام بخاری نے حضرت امام زہری کے قول سے ثابت کیا کہ تعبیرات کا یہ فرق محض لفظی ہے، عمل کی صورتیں مختلف نہیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ کپڑے کے دائیں کنارے کو بائیں کندھے پر اور بائیں کنارے کو دائیں کندھے پر ڈال لیا جائے، یا وہ کنارہ جو دائیں کندھے پر ہے، اسے بائیں بغل سے اور جو بائیں کندھے پر ہے اسے دائیں بغل سے نکال کر دونوں کناروں کو سینے پر باندھ لیا جائے۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ اس طرح چادر اوڑھنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ حالت نماز میں رکوع کے وقت بدن کے واجب الستر (جن کا چھپانا ضروری ہے) حصے پر نظر نہیں پڑے گی۔[2] اور علامہ عینی فرماتے ہیں کہ دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ چادر رکوع اور سجدے کی حالت میں بدن سے نہیں گرے گی۔ اس کے علاوہ ایک صورت اشتمال صما کی ہے جسے اشتمال یہود بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ چادر کو بدن کے اردگرد اس

---

1. فتح الباري : 606/1. 2. شرح ابن بطال : 20/2.

طرح لپیٹ دیا جائے کہ بوقت ضرورت کشف عورت کے بغیر ہاتھوں کو باہر نہ نکالا جاسکے۔ اسے شریعت نے ناپسند کیا ہے۔[1] حضرت ام ہانی ؓ کی حدیث امام بخاری ؒ خود بیان کریں گے۔ یہاں اس روایت کو صرف التحاف کی تفسیر بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

٣٥٤ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ قَدْ خَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ. [انظر: ٣٥٥، ٣٥٦]

[354] حضرت عمر بن ابی سلمہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دفعہ ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھی جبکہ اس کے دونوں کناروں کو الٹ کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا تھا۔

٣٥٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ عُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ أَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ فِي بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ، قَدْ أَلْقٰى طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ. [راجع: ٣٥٤]

[355] حضرت عمر بن ابی سلمہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے نبی ﷺ کو حضرت ام سلمہ ؓ کے گھر میں ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ نے چادر کے دونوں کناروں کو دونوں کندھوں پر ڈالا ہوا تھا۔

٣٥٦ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ أَبِي سَلَمَةَ أَخْبَرَهُ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلًا بِهِ فِي بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ وَاضِعًا طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ. [راجع: ٣٥٤]

[356] حضرت عمر بن ابی سلمہ ؓ ہی سے ایک اور روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت ام سلمہ ؓ کے گھر میں ایک کپڑا لپیٹ کر نماز پڑھتے دیکھا جس کے دونوں کنارے آپ نے اپنے دونوں کندھوں پر ڈال رکھے تھے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ ؓ کی تین روایات ذکر کی ہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے ان کی حکمت بایں الفاظ ذکر کی ہے: پہلی روایت کی سند عالی ہے کیونکہ اس میں امام بخاری اور راوئ حدیث حضرت عمر بن ابی سلمہ ؓ کے درمیان تین واسطے ہیں، اگرچہ یہ علو مطلق نہیں بلکہ نسبی ہے کیونکہ دوسری اور تیسری روایت کے مقابلے میں علو پایا جاتا ہے، تاہم سند گو عالی ہے لیکن اس میں راوئ حدیث نے اپنے مشاہدے کی صراحت نہیں کی، اس کے علاوہ اس میں بصیغہ ''عن'' روایت کی گئی ہے۔ امام بخاری نے دوسری سافل سند ذکر کر کے راوی کے مشاہدے کی تصریح نقل کر دی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ راوی نے جو رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کی ہے وہ مشاہدے کے بعد کی ہے، لیکن اس روایت میں یہ سقم تھا کہ اگرچہ اس میں ہشام نے اپنے باپ عروہ سے تصریح سماع کر دی ہے، تاہم حضرت عروہ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ سے بصیغہ ''عن'' روایت کی ہے۔ تیسری روایت بیان کر کے امام بخاری ؒ نے عَنْعَنَہ کے بجائے سماع کی تصریح نقل کر دی ہے کیونکہ عنعنہ میں

① عمدة القاري: 266/3.

احتمال کی حد تک انقطاع کا شائبہ رہ جاتا ہے، نیز آخری دو روایات میں اس جگہ کی بھی تعیین کر دی گئی ہے جہاں راوئ حدیث نے اس عمل کا مشاہدہ کیا تھا اور وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا گھر ہے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ ہیں، نیز ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مخالفت طرفین اور اشتمال دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے۔ واللہ أعلم۔[1] ② علامہ ابن بطال نے مصنف عبدالرزاق (356/1) کے حوالے سے حضرت ابی بن کعب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے متعلق مناظرہ نقل کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب کا موقف تھا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اس لیے آج بھی اس پر عمل کیا جا سکتا ہے جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ ایسا کرنا اضطراری حالات کے پیش نظر تھا، جب لوگوں کے ہاں کشادگی اور وسعت نہ تھی۔ آج جب حالات ناگفتہ بہ نہیں ہیں تو نماز کے لیے مکمل لباس پہننا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فیصلہ فرمایا کہ بات تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی صحیح ہے، البتہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اجتہاد کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔[2]

٣٥٧ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي أُوَيْسٍ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ؛ أَنَّ أَبَا مُرَّةَ مَوْلَى أُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ أَبِي طَالِبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ أُمَّ هَانِئٍ بِنْتَ أَبِي طَالِبٍ تَقُولُ: ذَهَبْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُهُ يَغْتَسِلُ وَفَاطِمَةُ ابْنَتُهُ تَسْتُرُهُ، قَالَتْ: فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَقَالَ: «مَنْ هٰذِهِ؟» فَقُلْتُ: أَنَا أُمُّ هَانِئٍ بِنْتُ أَبِي طَالِبٍ، فَقَالَ: «مَرْحَبًا بِأُمِّ هَانِئٍ»، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهِ قَامَ فَصَلَّى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ مُلْتَحِفًا فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! زَعَمَ ابْنُ أُمِّي أَنَّهُ قَاتِلٌ رَجُلًا قَدْ أَجَرْتُهُ فُلَانَ بْنَ هُبَيْرَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ يَا أُمَّ هَانِئٍ»، قَالَتْ أُمُّ هَانِئٍ: وَذَاكَ ضُحًى.

[راجع: ٢٨٠]

[357] حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو میں نے اس وقت آپ ﷺ کو غسل کرتے ہوئے پایا جبکہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کر رکھا تھا۔ فرماتی ہیں: میں نے آپ کو سلام کیا، آپ نے دریافت فرمایا: ''یہ کون عورت ہے؟'' میں نے خود عرض کیا: میں ابو طالب کی بیٹی ام ہانی ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''ام ہانی کو خوش آمدید ہو۔'' پھر جب آپ غسل سے فارغ ہو گئے تو آپ نے ایک ہی کپڑا اپنے گرد لپیٹ کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میرے مادر زاد، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک آدمی، یعنی فلاں بن ہبیرہ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، حالانکہ میں نے اسے پناہ دی رکھی ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ام ہانی! جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی۔'' حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ چاشت کی نماز تھی۔

---

1 فتح الباري: 608/1. ② شرح البخاري: 21/2.

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے چوتھی روایت پیش کی ہے جو حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اس میں صراحت کے ساتھ انھوں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ نے صرف ایک کپڑا لپیٹ کر آٹھ رکعات ادا کیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد حدیث کے اسی ٹکڑے سے متعلق ہے۔ جمہور اہل علم صحابۂ کرام اور تابعین عظام کا یہی مذہب ہے کہ ایک کپڑے میں نماز درست ہے اگرچہ زائد کپڑے موجود ہوں۔ البتہ عبداللہ بن مسعود، طاوس، امام نخعی، عبداللہ بن وہب اور محمد بن جریر طبری سے یہ منقول ہے کہ نمازی کے پاس ایک سے زائد کپڑے موجود ہوں تو ایک کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ جمہور کی طرف سے دو کپڑوں میں نماز پڑھنے کی تاکید کو استحباب و افضلیت پر محمول کیا گیا ہے، لہٰذا اس اختلاف کی چنداں اہمیت نہیں۔[1] ② نماز کے بعد حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شکایت پیش کی کہ میں نے ابن ہبیرہ کو پناہ دی ہے جبکہ میرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ میری پناہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سوچا ہو کہ عورت کو سیاسی معاملات میں بصیرت نہیں ہوتی، اس لیے ضروری نہیں کہ اس کی پناہ کو تسلیم کیا جائے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کی پناہ کو برقرار رکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو اپنی پناہ میں لے لے، خواہ یہ مسلمان کسی طبقے کا فرد ہو، مرد ہو یا عورت تو اس کی پناہ تمام مسلمانوں کی طرف سے مانی جائے گی۔ اب کسی مسلمان کو اس کے مال و جان سے بلاوجہ تعرض کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ لیکن اگر امام اس پناہ کو مصلحت کے خلاف خیال کرے تو پہلے اس پناہ کو ختم کرنے کا اعلان کرے گا، پھر کافر کو اتنا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے۔ اس مسئلے کے متعلق مکمل تفصیل کتاب الجہاد میں بیان ہوگی۔ ③ بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی نماز آٹھ رکعات پڑھی تھیں۔ بعض حضرات نے ان رکعات کو فتح کے شکرانے کی نماز قرار دیا ہے۔ بہر حال وقت چاشت ہی کا تھا اور آپ نے چاشت کی آٹھ رکعت ادا کی تھیں جیسا کہ صحیح مسلم (حدیث:1668(336)) میں اس کی صراحت ہے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے اس نماز کی تفصیل بھی بیان کی ہے کہ آپ نے آٹھ رکعات اس طرح ادا فرمائیں کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔[2] رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم کو نماز چاشت پڑھنے کی وصیت فرمائی تھی۔[3] اس کے متعلق مکمل تفصیل آئندہ ذکر کریں گے۔ إن شاء الله.

٣٥٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ سَائِلًا سَأَلَ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَنِ الصَّلَاةِ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَوَلِكُلِّكُمْ ثَوْبَانِ؟».
[انظر: ٣٦٥]

[358] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سائل نے رسول اللہ ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟''

① عمدة القاري: 263/3. ② سنن أبي داود، التطوع، حديث: 1290. ③ صحيح البخاري، التهجد، حديث: 1178، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين، حديث: 1675(722)، و سنن النسائي، الصيام، حديث: 2406.

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ کے سوال کا مقصد یہ ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو، ایک واضح اور بدیہی امر کے متعلق سوال کر رہے ہو۔ تمھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اگر ایک کپڑے میں نماز جائز نہ ہوتی تو میں ضرور انکار کر دیتا لیکن نہ تو میں نے انکار کیا اور نہ اس معاملے کی تفتیش ہی کی کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے والا فاقد ثوب ہے یا واجد ثوب، اس سلسلے میں وسعت اور تنگی کا فرق بھی نہیں۔ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا جواز ہے کیونکہ نماز میں کپڑوں کی تعداد پر انحصار نہیں بلکہ مدار ستر عورۃ پر ہے، البتہ مستحب ہے کہ بشرط گنجائش ایک سے زائد کپڑے استعمال کیے جائیں۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے سوالیہ انداز میں جواب دیا لیکن دراصل آپ تنگی کے ایام کی خبر دینا چاہتے ہیں اور فحوائے کلام سے اصل سوال کا جواب بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ستر عورۃ واجب ہے اور نماز کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اور تم میں سے ہر ایک کے لیے کپڑے بھی نہیں ہوتے، ایسے حالات میں تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک کپڑے میں نماز جائز ہے۔ اگر جائز نہ ہوتی تو میں اس کی وضاحت کر دیتا۔[1] ② حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ایک دوسری روایت میں اضافہ ہے کہ حضرت عمر ؓ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے لباس کے معاملے میں وسعت دی ہے تو انھیں بھی وسعت سے کام لینا چاہیے، وہ اس طرح کہ لوگ اپنے جسم پر اللہ کے دیے ہوئے کپڑے استعمال کریں، یعنی انھیں چاہیے کہ وہ ازار اور چادر میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قبا میں، پائجامہ اور چادر میں، پائجامہ اور قمیص میں، پائجامہ اور قبا میں، جانگیہ اور قبا میں، نیز جانگیہ اور قمیص میں نماز پڑھیں۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں: میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت عمر ؓ نے اسی کے ساتھ جانگیہ اور چادر میں نماز پڑھنے کے متعلق بھی فرمایا تھا۔[2]

(٥) بَابٌ: إِذَا صَلَّى فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَلْيَجْعَلْ عَلَى عَاتِقَيْهِ

باب: 5- جب کوئی ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھے تو اس سے کچھ حصہ اپنے کندھوں پر ڈال لے

وضاحت: اگر ایک ہی کپڑے میں نماز ادا کرنے کی نوبت آ جائے تو احتیاط اسی میں ہے کہ کپڑے کے کچھ حصے کو دونوں کندھوں پر ڈال لیا جائے کیونکہ بحالت نماز ستر عورۃ کے علاوہ کندھوں کا ڈھانپنا بھی ضروری ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بدن ڈھک جائے گا اور اس کے گرنے یا کھل جانے کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا۔

٣٥٩ - حَدَّثَنَا أَبُو عَاصِمٍ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا يُصَلِّي أَحَدُكُمْ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَيْسَ عَلَى عَاتِقَيْهِ شَيْءٌ». [انظر: ٣٦٠]

[359] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے جبکہ اس کے کندھے پر کوئی چیز نہ ہو، یعنی شانے ننگے ہوں۔''

٣٦٠ - حَدَّثَنَا أَبُو نُعَيْمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيَى بْنِ أَبِي كَثِيرٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ: سَمِعْتُهُ

[360] حضرت ابو ہریرہ ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ

[1] إعلام الحديث: 349/1. [2] صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 365.

أَوْ كُنْتُ سَأَلْتُهُ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ صَلَّى فِي ثَوْبٍ فَلْيُخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ». [راجع: ٣٥٩]

فرماتے سنا: ''جو شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھے، اسے چاہیے کہ اس کے دونوں کناروں کو الٹ لے، یعنی اس کا دایاں کنارہ بائیں طرف اور بایاں کنارہ دائیں طرف ڈال لے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس باب میں نمازی کے لیے بحالت نماز ستر پوشی کی ایک قسم بیان فرمائی ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے کیونکہ نمازی کے لیے دوران نماز میں بسا اوقات جسم کے کسی ایسے حصے کو چھپانا بھی ضروری ہوتا ہے جسے نماز کے علاوہ عام حالات میں ظاہر کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض اوقات نماز میں کسی ایسے حصے کو ظاہر کرنا ہوتا ہے جسے عام حالات میں عورتوں کے لیے مردوں سے چھپانا ضروری ہوتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال کندھے ہیں کہ بحالت نماز ان کا ڈھانپنا ضروری ہے۔ یہ حکم حق نماز کی وجہ سے ہے جبکہ مرد حضرات عام حالات میں اپنے کندھوں کو ننگا رکھ سکتے ہیں۔ دوسری صورت کی مثال چہرہ، ہاتھ اور پاؤں کا حکم ہے کہ عورت کے لیے عام حالات میں اجنبی مردوں کے سامنے ان کا کھولنا جائز نہیں لیکن نماز کی حالت میں عورت کے لیے ان کا چھپانا ضروری نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اس نوعیت کی ستر پوشی اللہ کا حق ہے اور یہی وجہ ہے کہ رات کی تاریکی میں تن تنہا بھی بیت اللہ کا عریاں ہو کر طواف نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ اکیلے آدمی کو اختیاری حالات میں ننگے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ اس بحث کو امام ابن تیمیہ ؒ نے اپنے ایک رسالے میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، جس کا ہم نے اردو ترجمہ بعنوان ''مسلمان عورت کا پردہ اور اس کا لباسِ نماز'' کیا ہے۔ ② حافظ ابن حجر ؒ کہتے ہیں کہ نماز کی حالت میں کندھوں پر کپڑا ڈالنے کی تاکید جمہور کے نزدیک استحباب کے لیے ہے اور جن احادیث میں ممانعت ہے وہ کراہت تنزیہی پر محمول ہے لیکن امام احمد سے ایک قول یہ منقول ہے کہ کندھوں پر کپڑا ڈالے بغیر نماز جائز نہیں گویا انھوں نے اس کو شرط صحت صلاۃ قرار دیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز ہو جائے گی لیکن ترک واجب کی وجہ سے گناہ گار ہو گا۔[1] علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ بظاہر ممانعت کا تقاضا تو تحریم ہی ہے مگر اجماع جواز ترک پر ہو چکا ہے کیونکہ اصل مقصود تو ستر عورۃ ہے وہ کسی بھی طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔[2] علامہ کرمانی ؒ کا یہ اجماع کا دعویٰ محل نظر ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل نے اس موقف سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ خطابی نے عدم وجوب پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی جس کا ایک کنارہ کسی زوجۂ محترمہ پر تھا اور وہ سو رہی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کپڑا اتنا بڑا نہیں تھا کہ کندھوں پر ڈالا جا سکتا اور نہ اتنا چھوٹا ہی تھا کہ اسے بطور تہ بند ہی استعمال کیا جا سکتا۔ اگر کندھوں کا ڈھانپنا ضروری ہوتا تو دوسرے کنارے سے انھیں ڈھانپا جا سکتا تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ دوران نماز میں کندھوں کا ڈھانپنا ضروری نہیں۔[3] حافظ ابن حجر ؒ خطابی کا استدلال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ محل نظر ہے۔[4] بظاہر امام بخاری ؒ کے مسلک میں تفصیل ہے کہ کپڑا اگر بڑا ہو تو اسے کندھوں پر ڈالنا ضروری ہے اور اگر تنگ ہو تو اسے بطور تہ بند استعمال کیا جائے، کندھوں پر ڈالنا ضروری نہیں۔ ان کا موقف امام احمد کے موقف سے مختلف ہے۔ امام احمد کندھوں کے ڈھانپنے کو صحت صلاۃ کے لیے شرط قرار

① فتح الباري: 611/1. ② شرح الكرماني: 18/2. ③ إعلام الحديث: 250/1. ④ فتح الباري: 612/1.

دیتے ہیں جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ صرف وجوب کے قائل ہیں اور اس وجوب کو بھی تنگی کے وقت اٹھا دیتے ہیں جیسا کہ آئندہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے۔ علامہ کرمانی نے عنوان سے دوسری حدیث کی مطابقت بایں الفاظ بیان کی ہے کہ اس حدیث میں مخالفت طرفین کا حکم ہے اور اس پر عمل کرنا اسی وقت ممکن ہو گا جب کندھوں پر کچھ حصہ ڈالا جائے گا، اس کے بغیر مخالفت طرفین نہیں ہو سکتی۔[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی شرح تراجم بخاری میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں: اس حدیث کی عنوان پر دلالت بایں طور ہے کہ کپڑے کے دونوں کناروں کا ایک دوسرے کے مخالف سمت ہونا ہی اس بات کا سبب ہے کہ کوئی کنارہ اس کے کندھوں پر ضرور ڈالا جائے گا۔ حافظ ابن حجر، جو امام بخاری کے رمز شناس ہیں، کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حسب عادت اس انداز سے ایک روایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس میں مخالفت طرفین کے وقت کندھوں پر کپڑا ڈالنے کی صراحت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے اسے چاہیے کہ کندھوں پر کپڑا ڈال کر اس کے دونوں کناروں کو الٹ لے۔[2] علامہ اسماعیلی اور ابونعیم نے بھی حسین کے طریق سے اسی طرح بیان کیا ہے۔[3] مختصر یہ ہے کہ جب کپڑا اس قدر وسیع ہو کہ ستر پوشی کے بعد کندھوں کو ڈھانپا جا سکتا ہو تو ایسا ہی کرنا چاہیے، اس کے برعکس اگر کپڑا تنگ ہو کہ کندھوں کو چھپانے کے بعد ستر کھلنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں کندھوں کو کھلا رکھتے ہوئے تہ بند باندھ کر نماز پڑھ لینا بالاتفاق جائز ہے۔ واللہ أعلم.

(٦) بَابٌ: إِذَا كَانَ الثَّوْبُ ضَيِّقًا

باب: 6- جب کپڑا تنگ ہو تو (نمازی کیا کرے)؟

وضاحت: پہلے باب میں بیان ہوا ہے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی ضرورت ہو تو اس کے دونوں کناروں کو الٹی سمت سے دونوں کندھوں پر ڈال لیا جائے لیکن اگر کپڑا تنگ ہو کہ کندھوں پر نہ ڈالا جا سکے تو کیا کرے؟ اس باب میں یہی وضاحت ہو گی کہ اسے بطور ازار (تہ بند) کے استعمال کیا جائے۔

٣٦١ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ صَالِحٍ قَالَ: حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ: سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ عَنِ الصَّلَاةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ؟ فَقَالَ: خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ فَجِئْتُ لَيْلَةً لِبَعْضِ أَمْرِي، فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّي وَعَلَيَّ ثَوْبٌ وَاحِدٌ، فَاشْتَمَلْتُ بِهِ وَصَلَّيْتُ إِلَى جَانِبِهِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: «مَا السُّرَى يَا جَابِرُ؟» فَأَخْبَرْتُهُ بِحَاجَتِي فَلَمَّا

[361] حضرت سعید بن حارث سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: میں نبی ﷺ کے ہمراہ ایک سفر میں تھا، رات کو کسی ضروری کام کے لیے آپ کے پاس آیا تو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت میرے اوپر ایک ہی کپڑا تھا۔ میں نے اسے اپنے بدن پر لپیٹا اور آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''اے جابر! رات کے وقت کیسے آئے؟'' میں نے آپ کی خدمت

---

[1] شرح الكرماني: 19/2. [2] مسند أحمد: 255/2. [3] فتح الباري: 611/1.

فَرَغْتُ قَالَ: «مَا هٰذَا الْاِشْتِمَالُ الَّذِي رَأَيْتُ؟» قُلْتُ: كَانَ ثَوْبٌ قَالَ: «فَإِنْ كَانَ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِهِ، وَإِنْ كَانَ ضَيِّقًا فَاتَّزِرْ بِهِ». [راجع: ٣٥٢]

میں اپنی ضرورت پیش کی۔ جب میں اپنی ضرورت سے فارغ ہوا تو آپ نے فرمایا: ''یہ کپڑے کا لپیٹنا کیا ہے جو میں نے دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا: میرے پاس ایک ہی کپڑا تھا۔ آپ نے فرمایا: ''کپڑا اگر کشادہ ہو تو اسے لپیٹ لیا کرو اور اگر تنگ ہو تو اسے بطور تہ بند پہنو۔''

فائدہ: دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر اور حضرت جبار بن صخر ؓ کو غزوۂ بواط کے موقع پر اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ وہ آگے چل کر منزل پر پانی وغیرہ کا انتظام کریں جیسا کہ صحیح مسلم میں صراحت ہے۔ علامہ خطابی ؒ فرماتے ہیں: چونکہ حضرت جابر ؓ نے کپڑے کو بدن پر اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ اس سے ہاتھ وغیرہ بسہولت باہر نہیں نکلتے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انکار فرمایا۔[1] شاید انھوں نے اشتمال صماء کی وجہ سے یہ توجیہ کی ہے بصورت دیگر صحیح مسلم میں اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ کپڑا انتہائی تنگ تھا، انھوں نے اسے اس طرح پہنا کہ اس کے دونوں کناروں کو ٹھوڑی کے نیچے دبا کر آگے کو جھکے ہوئے تھے تاکہ ستر نہ کھل جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب انھیں بایں حالت دیکھا تو فرمایا کہ کناروں کو الٹ کر پہننا اس وقت ہے جب کپڑا کشادہ ہو، تنگ ہونے کی صورت میں اسے بطور ازار پہننا ہی کافی ہے کیونکہ مقصد ستر کو چھپانا ہے۔[2]

٣٦٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبُو حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ قَالَ: كَانَ رِجَالٌ يُصَلُّونَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ عَاقِدِي أُزْرِهِمْ عَلٰى أَعْنَاقِهِمْ كَهَيْئَةِ الصِّبْيَانِ، وَقَالَ لِلنِّسَاءِ: لَا تَرْفَعْنَ رُؤُسَكُنَّ حَتّٰى يَسْتَوِيَ الرِّجَالُ جُلُوسًا. [انظر: ٨١٤، ١٢١٥]

[362] حضرت سہل (بن سعد) ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے ہمراہ کچھ صحابہ اپنی چادریں بچوں کی طرح گردنوں پر گرہ لگائے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ مستورات کو ہدایت کی جاتی کہ جب تک لوگ سیدھے ہو کر بیٹھ نہ جائیں اس وقت تک وہ سجدے سے اپنے سر نہ اٹھائیں۔

فوائد ومسائل: ① بچوں کی طرح گردن پر کپڑے کی گرہ اس لیے لگائی جاتی تاکہ بحالت سجدہ مستور حصہ ظاہر نہ ہو جائے لیکن اس اہتمام کے باوجود بھی ستر کھلنے کا اندیشہ تھا، اس لیے عورتوں کو ہدایت کی جاتی کہ وہ سجدے سے اپنے سر مردوں کے ساتھ ہی نہ اٹھا لیا کریں بلکہ جب مرد اچھی طرح بیٹھ جائیں تو پھر وہ سر اٹھائیں۔ ابوداود (851) اور مسند احمد (348/6) میں اس کی یہ مصلحت بیان کی گئی ہے کہ کہیں عورتوں کی نظر مردوں کے حصۂ مستور پر نہ پڑ جائے، مبادا یہ صورت کسی فتنے کا باعث بن جائے۔[3] ② اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کپڑا بدن پر لپیٹا جا سکے تو تہ بند کے طور پر استعمال کرنے کی نسبت اس میں زیادہ ستر پوشی ہے۔ اگر تنگ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں: اسے بطور تہ بند پہن لیا جائے یا گردن پر اس کی گرہ لگا دی جائے جیسا کہ

① إعلام الحديث: 253/1. ② فتح الباري: 612/1. ③ فتح الباري: 613/1.

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شرح تراجم بخاری میں لکھا ہے۔

(٧) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الْجُبَّةِ الشَّامِيَّةِ

باب: 7- شامی جبے میں نماز پڑھنا

وَقَالَ الْحَسَنُ فِي الثِّيَابِ يَنْسُجُهَا الْمَجُوسِيُّ: لَمْ يَرَ بِهَا بَأْسًا. وَقَالَ مَعْمَرٌ: رَأَيْتُ الزُّهْرِيَّ يَلْبَسُ مِنْ ثِيَابِ الْيَمَنِ مَا صُبِغَ بِالْبَوْلِ. وَصَلَّى عَلِيٌّ فِي ثَوْبٍ غَيْرِ مَقْصُورٍ.

حضرت حسن (بصری) نے کہا: جن کپڑوں کو آتش پرست بنتے ہیں، انھیں پہن کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ معمر بن راشد نے کہا: میں نے امام زہری کو یمن کے دو کپڑے پہنے ہوئے دیکھا جنھیں پیشاب میں رنگا گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کورے کپڑے میں (بغیر دھوئے) نماز پڑھی۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ کفار کے تیار کردہ کپڑوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور ان میں نماز پڑھنا بھی جائز ہے، اسی طرح دارالکفر کے تیار کردہ کپڑے، خواہ ان کے بنانے والے آتش پرست ہوں یا یہود و نصاریٰ، ان کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ کپڑا پاک ہو کیونکہ ان کے استعمال کا مدار طہارت وعدم طہارت پر ہے، تیار کرنے والوں کے احوال واوصاف اور ان کے ملک ومقام پر مدار نہیں۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے تین آثار کا حوالہ دیا ہے: حضرت حسن بصری کا قول ابونعیم بن حماد نے باسند ذکر کیا ہے جس میں وضاحت ہے کہ آتش پرست کے تیار کردہ کپڑے میں دھونے سے پہلے نماز پڑھی جا سکتی ہے، البتہ ابن سیرین اسے ناپسند کرتے تھے۔ امام زہری کا عمل مصنف عبدالرزاق میں موصولاً مذکور ہے کہ وہ ایسے کپڑے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے جو پیشاب میں رنگے گئے ہوں۔ شارحین نے لکھا ہے کہ حضرت زہری دھونے کے بعد ان کپڑوں کو استعمال کرتے تھے یا پھر ان جانوروں کا پیشاب مراد ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔[1] یہ بھی ممکن ہے کہ امام زہری کے نزدیک کپڑا ان چیزوں میں سے ہو جن پر طہارت ونجاست کا حکم شرعی تیاری کے بعد لگایا جاتا ہے، تیاری کے دوران میں جو بھی حالات گزریں، شریعت ان کا اعتبار نہیں کرتی، اس لیے اگر کپڑے کی تیاری کے دوران میں بول کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل کو ابن سعد نے موصولاً بیان کیا ہے۔ عطاء بن محمد کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک نئی کرابیسی قمیص میں نماز پڑھتے دیکھا جو ان دھلی تھی۔[2] الغرض کفار کے تیار کردہ اور بلاد کفار سے درآمد کردہ کپڑے اگر ظاہری آثار کے اعتبار سے پاک ہوں اور مخبر صادق کی اطلاع ان کی نجاست پر نہ ہو تو ان کے استعمال میں چنداں حرج نہیں ہے۔

٣٦٣ - حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُسْلِمٍ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ مُغِيرَةَ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ فَقَالَ: «يَا مُغِيرَةُ! خُذِ الْإِدَاوَةَ»، فَأَخَذْتُهَا، فَانْطَلَقَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتّٰى تَوَارٰى

[363] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں ایک دفعہ نبی ﷺ کے ہمراہ کسی سفر میں تھا، آپ نے فرمایا: ''اے مغیرہ! پانی کا برتن پکڑ لو۔'' میں نے تعمیل حکم کرتے ہوئے برتن پکڑ لیا۔ پھر آپ باہر گئے یہاں تک کہ آپ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر آپ

[1] فتح الباري: 614/1. [2] فتح الباري: 614/1.

عَنِّي فَقَضَى حَاجَتَهُ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ شَامِيَّةٌ، فَذَهَبَ لِيُخْرِجَ يَدَهُ مِنْ كُمِّهَا فَضَاقَتْ، فَأَخْرَجَ يَدَهُ مِنْ أَسْفَلِهَا، فَصَبَبْتُ عَلَيْهِ، فَتَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ وَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ، ثُمَّ صَلَّى. [راجع: ١٨٢]

نے قضائے حاجت کی اور اس وقت آپ شامی جبہ پہنے ہوئے تھے۔آپ نے اس کی آستین سے اپنا ہاتھ باہر نکالنا چاہا۔چونکہ وہ تنگ تھی، اس لیے آپ نے اپنا ہاتھ اس کے نیچے سے نکالا۔ پھر میں نے آپ کے اعضائے شریفہ پر پانی ڈالا۔ آپ نے نماز کے لیے وضو کیا اور اپنے موزوں پر مسح کیا، پھر نماز پڑھی۔

فوائد ومسائل: ① ابن بطال نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ 9 ہجری میں غزوۂ تبوک کے موقع پر پیش آیا۔شام میں ان دنوں کفار کی حکومت تھی اور ان کے تیار کردہ جبے تنگ آستینوں والے تھے۔اس سے معلوم ہوا کہ کفار ومشرکین کے تیار کردہ کپڑوں میں نماز پڑھنا درست ہے بشرطیکہ اس بات کا یقین ہو کہ یہ نجاست آلود نہیں۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے اپنا مدعا بایں طور ثابت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے دارالکفر کا تیار کردہ جبہ استعمال فرمایا اور یہ دریافت نہیں کیا کہ اسے کس نے بنایا ہے اور اس کی تیاری میں کوئی ناپاک چیز تو استعمال نہیں کی گئی، پھر اس کے دھونے کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ ثابت ہوا کہ ان چیزوں کے متعلق کریدنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک اس کے نجس ہونے کے متعلق خصوصی دلیل نہ ہو اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔خصوصی دلیل کے لیے مشاہدہ یا مخبر صادق کی اطلاع کا ہونا ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی مقصد تھا تو عنوان میں جبۂ شامیہ کی قید کیوں لگائی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری عام طور پر الفاظِ حدیث کی رعایت کرتے ہوئے عنوان بندی کا اہتمام کرتے ہیں۔ ③ کفار ومشرکین اور یہود و ہنود کے مستعمل کپڑوں کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ چونکہ ہمارے ہاں غیر مسلم ممالک سے مستعمل کپڑے درآمد کیے جاتے ہیں جسے ''لنڈے کا مال'' کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق حکم یہ ہے کہ جو کپڑے اوپر کے حصۂ جسم پر استعمال ہوتے ہوں جیسا کہ چادر، قمیص اور جرسی وغیرہ، وہ طاہر سمجھے جائیں گے اور جو کپڑے جسم کے نچلے حصے پر استعمال ہوتے ہیں، جیسے پاجامہ، شلوار، پینٹ اور جانگیہ وغیرہ انھیں دھو کر استعمال کیا جائے کیونکہ یہ لوگ طہارت و نظافت کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ نجاست سے احتراز کرتے ہیں، لہٰذا بظاہر ایسے کپڑے بول و براز سے ملوث ہوں گے۔ موفق ابن قدامہ نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک اگر ایسے کپڑوں میں نماز پڑھ لی جائے تو اس نماز کا اعادہ انھیں زیادہ پسند ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ لنڈے کے وہ کپڑے جو کفار ومشرکین نے جسم کے نچلے حصے میں استعمال کیے ہوں انھیں دھو کر کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔انھیں بغیر دھوئے استعمال کرنا صحیح نہیں۔ واللہ أعلم.

(٨) بَابُ كَرَاهِيَةِ التَّعَرِّي فِي الصَّلَاةِ

باب: 8- نماز میں (یا نماز کے علاوہ) برہنہ رہنے کی ممانعت

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ننگے رہنے کی علی الاطلاق ممانعت ہے، نماز ہو یا غیر نماز۔ اس مقام پر امام بخاری

[1] شرح ابن بطال: 25/2.

رحمہ اللہ نے لفظ کراہت لغوی معنی میں استعمال کیا ہے، یعنی ممنوع اور ناپسندیدہ ہے۔ اس تعبیر میں ہر طرح کی ممانعت شامل ہے۔

٣٦٤ - حَدَّثَنَا مَطَرُ بْنُ الْفَضْلِ قَالَ: حَدَّثَنَا رَوْحٌ قَالَ: حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ إِسْحَاقَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِينَارٍ قَالَ: سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يُحَدِّثُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ الْحِجَارَةَ لِلْكَعْبَةِ وَعَلَيْهِ إِزَارُهُ، فَقَالَ لَهُ الْعَبَّاسُ عَمُّهُ: يَا ابْنَ أَخِي! لَوْ حَلَلْتَ إِزَارَكَ فَجَعَلْتَ عَلَى مَنْكِبَيْكَ دُونَ الْحِجَارَةِ، قَالَ: فَحَلَّهُ فَجَعَلَهُ عَلَى مَنْكِبَيْهِ، فَسَقَطَ مَغْشِيًّا عَلَيْهِ، فَمَا رُئِيَ بَعْدَ ذٰلِكَ عُرْيَانًا ﷺ. [انظر: ١٥٨٢، ٣٨٢٩]

[364] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ قریش کے ہمراہ تعمیر کعبہ کے لیے پتھر اٹھاتے تھے۔ آپ نے صرف تہ بند باندھا ہوا تھا۔ آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے بھتیجے! اگر تم اپنا تہ بند اتار کر اسے اپنے کندھوں پر پتھر کے نیچے رکھ لو (تو تمھارے لیے آسانی ہوگی)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا تہ بند اتار کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا، چنانچہ آپ اسی وقت بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کبھی برہنہ نہیں دیکھے گئے۔

فوائد و مسائل: ① برہنگی نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں میں ممنوع ہے، نماز کی حالت میں تو ظاہر ہے لیکن نماز کے علاوہ بھی بلاضرورت ستر کا برہنہ رکھنا شرعاً ممنوع ہے۔ مذکورہ بالا روایت میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ خارج صلاۃ کا ہے۔ امام بخاری کا استدلال اس طرح ہے کہ جب ستر پوشی کا اہتمام نماز کے علاوہ اس قدر ہے تو نماز میں تو بدرجۂ اولیٰ اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ ابن بطال نے لکھا ہے کہ کشف ازار کا واقعہ جب پیش آیا تو آپ کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی اور نبوت سے بھی سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ چونکہ برہنگی آپ کی شان کے خلاف تھی، اس لیے فوراً بے ہوشی طاری کر دی گئی اور تنبیہ کر دی گئی تاکہ آئندہ اس کا اعادہ نہ ہو کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تربیت شروع ہی سے اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں ہوتی ہے۔ بعثت سے قبل ایسے امور کی اصلاح دوسرے ہی طریقوں سے ممکن تھی، اس لیے آسمانی اشارے یا سلامت طبع کے تحت فوراً آپ بے ہوش ہو گئے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبرانی کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ آپ فوراً کھڑے ہوئے، اپنی ازار کو سنبھالا اور فرمایا کہ مجھے ننگا ہو کر چلنے سے منع کر دیا گیا ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ آپ بعثت سے پہلے بھی برے کاموں اور بے شرمی کی باتوں سے محفوظ تھے۔ بہرحال امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ جب عام حالات میں کسی خاص ضرورت کے پیش نظر برہنگی درست نہیں تو نماز ننگے کیسے پڑھی جا سکتی ہے؟ ② ابن بطال نے لکھا ہے کہ برہنگی اسی لیے منع ہے تاکہ لوگوں کی نگاہوں سے شرم گاہ کو محفوظ کیا جائے، ہاں میاں بیوی ایک دوسرے کو ننگا دیکھ سکتے ہیں۔[2] اس کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں دوسروں کے سامنے ننگا ہونا منع ہے، البتہ خاص حالات میں کسی مجبوری کے پیش نظر اس کا جواز ہے۔ خاص حالات حسب ذیل ہو سکتے ہیں: غسل خانے میں نہاتے وقت۔ مثانے یا بواسیر کا آپریشن کراتے وقت۔ ولادت کے موقع پر اپنا ستر کھولنے کی اجازت ہے۔ واللہ أعلم.

1 فتح الباري: 615/1. 2 شرح ابن بطال: 27/2.

(٩) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الْقَمِيصِ وَالسَّرَاوِيلِ وَالتُّبَّانِ وَالْقَبَاءِ

باب:9- قمیص، پاجامہ، جانگھیا اور قبا میں نماز پڑھنا

وضاحت: نماز کے لیے ستر پوشی ضروری ہے۔ اس کے لیے نہ تو عدد کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور ہی نوعیت کی پابندی ہے، صرف ستر عورۃ کی پابندی ہے۔

٣٦٥ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَامَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلَهُ عَنِ الصَّلَاةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ، فَقَالَ: «أَوَ كُلُّكُمْ يَجِدُ ثَوْبَيْنِ؟»، ثُمَّ سَأَلَ رَجُلٌ عُمَرَ فَقَالَ: إِذَا وَسَّعَ اللهُ فَأَوْسِعُوا، جَمَعَ رَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابَهُ، صَلَّى رَجُلٌ فِي إِزَارٍ وَّرِدَاءٍ، فِي إِزَارٍ وَّقَمِيصٍ، فِي إِزَارٍ وَّقَبَاءٍ، فِي سَرَاوِيلَ وَرِدَاءٍ، فِي سَرَاوِيلَ وَقَمِيصٍ، فِي سَرَاوِيلَ وَقَبَاءٍ، فِي تُبَّانٍ وَّقَبَاءٍ، فِي تُبَّانٍ وَّقَمِيصٍ، قَالَ: وَأَحْسِبُهُ قَالَ: فِي تُبَّانٍ وَّرِدَاءٍ. [راجع: ٣٥٨]

[365] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک آدمی کھڑا ہوا اور نبی ﷺ سے سوال کیا: آیا ایک کپڑے میں نماز پڑھی جا سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: ”کیا تم میں سے سب کے پاس دو، دو کپڑے ہیں؟“ پھر کسی شخص نے حضرت عمر ؓ سے یہی سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا: جب اللہ تعالیٰ وسعت فرمائے تو اس وسعت کا اظہار کرو۔ چاہیے کہ لوگ اپنے جسم پر اللہ کے دیے ہوئے کپڑے استعمال کریں، یعنی ازار اور چادر میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قبا میں، پاجامہ اور چادر میں، پاجامہ اور قمیص میں، پاجامہ اور قبا میں، جانگھیے اور قبا میں، جانگھیے اور قمیص میں نماز پڑھیں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ کہتے ہیں: میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت عمر ؓ نے جانگھیے اور چادر میں ادائیگیٔ نماز کے متعلق بھی فرمایا تھا۔

فوائد ومسائل: ① حضرت عمر ؓ کی کپڑوں کے متعلق بیان کردہ تفصیل میں ستر پوشی، پھر بدن پوشی کی رعایت مقدم معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کپڑے جو وسط جسم کے ستر کے لیے استعمال ہوتے ہیں انھیں آپ نے پہلے بیان فرمایا کیونکہ جسم کے جس حصے کا ستر ضروری ہے وہ وسط جسم ہی ہے، پھر جو کپڑے وسط جسم کی حفاظت کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہ تین ہیں: ازار، پاجامہ اور جانگھیا۔ ان تینوں میں سے ازار کو سب سے پہلے رکھا کیونکہ یہ کثیر الاستعمال بھی ہے اور جسم کے لیے ساتر بھی۔ گویا آپ نے ستر عورۃ کے لحاظ سے کپڑوں کے تین درجے بتائے ہیں: پہلے ازار، پھر پاجامہ، آخر میں جانگھیے اس لیے رکھا کہ اس میں ستر سب سے کم ہے، ہاں اگر چادر یا قمیص کے ساتھ اس کا استعمال ہو تو چنداں حرج نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر نمازی دو کپڑوں میں نماز پڑھے تو تہ بند کے ساتھ اوپر کے جسم کے لیے چادر، کرتا یا قبا بھی ہو، اگر پاجامے کے ساتھ پڑھے تو اس کے ساتھ بھی چادر یا کرتا یا قبا ہو۔ اگر جانگھیے پہنے ہوئے ہو تو اس کے ساتھ چادر یا کرتا یا قبا ہو تا کہ ستر پوشی کی رعایت زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔[1]

[1] فتح الباري: 617/1.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نماز کے وقت کپڑوں کا اہتمام ضروری ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور ایک کپڑے میں نماز پڑھنا صرف تنگی اور افلاس کے وقت ہے۔ دو کپڑوں میں نماز پڑھنا بہ نسبت ایک کپڑے کے افضل ہے۔ اگرچہ قاضی عیاض نے اس کے متعلق اختلاف کی نفی کی ہے، تاہم ابن منذر کی عبارت سے اختلاف کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے ائمہ سے ایک کپڑے میں جواز صلاۃ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے دو کپڑوں میں نماز کو مستحب قرار دیا ہے مگر اشہب کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر کوئی قدرت و وسعت کے باوجود صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے گا تو وقت کے دوران میں اس کا اعادہ کرنا ہوگا، ہاں اگر وہ کپڑا موٹا ہو تو اعادے کی ضرورت نہیں اور بعض حنفیہ نے بھی شخص مذکور کی نماز کو مکروہ کہا ہے۔[1] ② مصنف عبدالرزاق (356/1) میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک کپڑے میں نماز کو مکروہ کہتے تھے اور اس کی اجازت کو اسلام کے ابتدائی دور میں تنگی کے وقت پر محمول کرتے تھے جب لوگوں کو زیادہ کپڑے میسر نہ تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس کے خلاف ایک کپڑے میں نماز کو مکروہ نہیں کہتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے اختلاف کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور اعلان فرمایا کہ درست بات وہی ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نہ کہ وہ جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

٣٦٦ - حَدَّثَنَا عَاصِمُ بْنُ عَلِيٍّ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي ذِئْبٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ؟ فَقَالَ: «لَا يَلْبَسُ الْقَمِيصَ، وَلَا السَّرَاوِيلَ، وَلَا الْبُرْنُسَ، وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ زَعْفَرَانٌ وَّلَا وَرْسٌ، فَمَنْ لَّمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ، وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ». وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَهُ. [راجع: ١٣٤]

[366] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ محرم کیا پہنے؟ آپ نے فرمایا: ''محرم قمیص، پاجامہ اور بارانی کا استعمال نہ کرے اور نہ وہ کپڑے پہنے جو زعفران یا ورس سے رنگے گئے ہوں۔ اور جس کے پاس جوتے نہ ہوں وہ موزے پہن لے اور انھیں اوپر سے کاٹ دے تاکہ وہ ٹخنوں سے نیچے ہو جائیں۔ حضرت نافع نے بواسطۂ ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے اس کے مثل روایت کی ہے۔

فوائد ومسائل: ① عنوان سے اس حدیث کی مناسبت اس طرح ہے کہ محرم کو قمیص، پاجامہ اور بارانی استعمال کرنے کی اجازت نہیں بلکہ وہ اَن سلے کپڑے استعمال کرے اور انھی بغیر سلی احرام والی چادروں میں نماز پڑھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے لیے کپڑے کا سلا ہوا ہونا ضروری نہیں بلکہ اَن سلے کپڑوں میں بھی نماز ہو جاتی ہے جیسا کہ احرام کی حالت سے ظاہر ہے۔ ثابت ہوا کہ کسی خاص کپڑے کی پابندی صحت نماز کے لیے ضروری نہیں حتی کہ اس کا سلا ہوا ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ احرام کی حالت میں مردوں کے لیے سلا ہوا کپڑا ممنوع ہے۔ باب سے مطابقت بایں طور بھی ہے کہ اس حدیث کے مطابق قمیص یا پاجامے کی ممانعت صرف محرم کے لیے ہے، خارج از احرام ممانعت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر محرم ان کپڑوں، یعنی قمیص اور پاجامے

1 عمدة القاري: 286/3.

میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ واللہ أعلم. ② واضح رہے کہ ابن ابی ذئب نے یہ حدیث دو طریق سے حاصل کی ہے: * عن الزہری، عن سالم، عن عبداللہ بن عمر ؓ۔ * عن الزہری، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر ؓ۔ قبل ازیں کتاب العلم (حدیث نمبر 134) میں طریق نافع بیان کر کے طریق سالم کا اس پر عطف ڈالا تھا اور یہاں اس کے برعکس کیا ہے، یعنی طریق سالم بیان کر کے طریق نافع کا اس پر عطف ڈالا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس روایت کے دونوں طریق ایک دوسرے کے مؤید ہیں۔[1]

(١٠) بَابُ مَا يَسْتُرُ مِنَ الْعَوْرَةِ

باب:10- قابل ستر حصے کا بیان

وضاحت: مایستر من العورۃ میں مِنْ بیانیہ ہے جیسا کہ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر ؒ نے تصریح کی ہے۔ من بیانیہ میں مدخول کے تمام افراد پر حکم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری عورۃ کا چھپانا ضروری ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک من تَبْعِیضِیَہ ہے۔ اس میں مدخول کے بعض افراد پر حکم ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ عورۃ لغوی طور پر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے حیا کی جائے۔ اس میں عورۃ کے ان حصوں کا بیان ہے جن کا ستر واجب ہے۔ مذکورہ باب میں من بیانیہ ہے۔ امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ جسم کے اس حصے کی تعیین کر دی جائے جس کا چھپانا ضروری ہے، اسے عورۃ کہا جاتا ہے۔ اس کی تعیین و مصداق میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری ؒ کے نزدیک قابل ستر حصہ صرف سَبِیلَیْن، یعنی قبل اور دبر ہیں جس کی ہم آئندہ وضاحت کریں گے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام بخاری ؒ کا مقصد خارج صلاۃ کا مسئلہ بیان کرنا ہے کیونکہ نماز میں ستر کی وضاحت کر چکے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی حدیث میں احتباء کا ذکر ہے جو خارج صلاۃ ہی ہو سکتا ہے۔ داخل نماز میں احتباء کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔[2]

٣٦٧ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا لَيْثٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ اشْتِمَالِ الصَّمَّاءِ، وَأَنْ يَّحْتَبِيَ الرَّجُلُ فِي ثَوْبٍ وَّاحِدٍ لَيْسَ عَلَى فَرْجِهِ مِنْهُ شَيْءٌ. [انظر: ١٩٩١، ٢١٤٤، ٢١٤٧، ٥٨٢٠، ٥٨٢٢، ٦٢٨٤]

[367] حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے سخت بکل سے منع فرمایا ہے، نیز آپ نے گوٹھ مار کر ایک کپڑے میں بیٹھنے سے بھی روکا جبکہ آدمی کی شرم گاہ پر کچھ نہ ہو۔

فوائد و مسائل: ① اس سے پہلے امام بخاری ؒ ایک عنوان لائے تھے جس میں بتایا گیا تھا کہ نماز اور غیر نماز میں ننگے رہنے کی ممانعت ہے۔ اب اس حدیث سے ننگے رہنے کی حد (تعریف) بتانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ سَوْءَ تَین، یعنی پیشاب اور پاخانے کا مقام کھلا ہوا ہو تو یہ ننگا رہنا ہے کیونکہ مذکورہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑے میں احتباء کی شکل سے منع فرمایا ہے جبکہ اس کا عضو مستور مکشوف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اعضائے مخصوصہ مستور ہیں تو اس سے منع نہیں کیا گیا۔ گویا امام بخاری

① فتح الباري: 1/617-618. ② فتح الباري: 1/618.

کے نزدیک کشف ستر کا مدار دُبر وقبل کے ننگے یا مستور ہونے پر ہے۔ اگر یہ اعضاء کھلے ہیں اور باقی پورا جسم ڈھکا ہے تو ایسے شخص کو برہنہ کہا جائے گا اور اگر اس کے برعکس یہ اعضاء مستور ہیں تو پھر خواہ سارا جسم کھلا ہو، اسے کشف ستر یا ننگے رہنے کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ② اشتمال صماء کی تشریح فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ انسان چادر اوڑھے، پھر ایک طرف سے چادر کے دونوں کنارے اٹھا کر دوسرے کندھے پر ڈال لے جس سے جسم کا ایک حصہ بالکل کھلا رہے جبکہ اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا نہ ہو۔ ایسا کرنا حرام ہے کیونکہ شریعت نے بلاوجہ کشف ستر کی اجازت نہیں دی۔ اشتمال صماء کی یہ تعریف ایک حدیث میں مرفوعاً مروی ہے۔[1] دوسری تعریف اہل لغت نے کی ہے کہ چادر اس طرح بدن پر لپیٹی جائے کہ ہاتھ بندھ جائیں اور ان کے باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہ رہے۔ اس طرح چادر لپیٹنے سے نقل و حرکت میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق اشتمال صماء ایک ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ ضرورت کے وقت ہاتھوں کا باہر نکالنا مشکل ہوتا ہے جس سے کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔[2] ③ احتباء یہ ہے کہ انسان اپنے گھٹنوں کو پیٹ سے ملا کر اپنے سرینوں پر بیٹھ جائے، پھر اپنے ہاتھ یا کپڑے سے اس کی بندش کر لے جبکہ اس کی شرم گاہ پر کوئی چیز نہ ہو۔ عرب کے ہاں اس طرح بیٹھنا معیوب نہیں تھا۔ احتباء کی یہ تعریف ایک مرفوع حدیث میں مروی ہے۔[3] اس سے معلوم ہوا کہ اگر شرم گاہ ننگی نہ ہو تو منع نہیں۔ واللہ أعلم.

٣٦٨ - حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ، عَنِ اللِّمَاسِ وَالنِّبَاذِ، وَأَنْ يَشْتَمِلَ الصَّمَّاءَ، وَأَنْ يَحْتَبِيَ الرَّجُلُ فِي ثَوْبٍ وَّاحِدٍ. [انظر: ٥٨٤، ٥٨٨، ١٩٩٣، ٢١٤٥، ٢١٤٦، ٥٨١٩، ٥٨٢١]

[368] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے دو قسم کی خرید و فروخت سے منع فرمایا: ایک صرف چھونے سے اور دوسری جو صرف پھینکنے سے پختہ ہو جائے، نیز آپ نے اشتمال صماء اور ایک کپڑے میں گوٹھ مار کر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا۔

فوائد و مسائل: ① دور جاہلیت میں خرید و فروخت کے دو ایسے طریقے رائج تھے جن میں جوئے اور دھوکے کا شائبہ تھا، اس لیے شریعت نے ان سے منع فرمایا: ایک ملامسہ اور دوسرا منابذہ۔ بیع ملامسہ کی صورت یہ تھی کہ کپڑے کی دوکان پر فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان زبانی بات چیت طے ہوگئی، قیمت کا بھی فیصلہ ہوگیا، اب خریدار نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنا ہاتھ جس تھان پر رکھ دیا وہی تھان مقرر شدہ قیمت میں اس کا ہوگیا۔ کسی کے لیے خیار مجلس، خیار عیب یا خیار رؤیت نہیں ہوتا تھا۔ شریعت نے اس سے منع کر دیا۔ اسی طرح منابذہ کا یہ طریقہ تھا کہ زبانی قیمت طے ہونے کے بعد فروخت کنندہ نے آنکھ بند کر کے جو تھان خریدار کی طرف پھینک دیا وہی مشتری کا ہوگیا، خواہ وہ اعلیٰ قسم کا ہو یا گھٹیا قسم کا۔ اسے بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ عنوان سے ان کا کوئی تعلق نہیں، اس لیے ان سے متعلقہ مباحث کو ہم کتاب البیوع میں بیان کریں گے۔ ② اشتمال صماء کو سخت بکل کہتے ہیں جس کی وضاحت پہلی حدیث میں ہو چکی ہے۔ اور اِحتِباء یہ ہے کہ دونوں سرین زمین پر رکھ کر اپنی پنڈلیاں کھڑی کر کے اس طرح

[1] صحيح البخاري، اللباس، حديث: 5820. [2] فتح الباري: 618/1. [3] صحيح البخاري، اللباس، حديث: 5821.

بیٹھنا کہ عضو مستور ننگا ہو جائے۔ اس حدیث میں اگرچہ مطلق طور پر گوٹھ مار کر بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے، تاہم اس کی وضاحت ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ اس کی شرم گاہ آسمان کی طرف کھلی رہے۔[1] حدیث کے اس جز کا عنوان سے تعلق ہے کہ اس طرح ننگا ہو کر بیٹھنا شریعت میں ناپسندیدہ اور ناجائز کام ہے۔

٣٦٩ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ ابْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَخِي ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَمِّهِ قَالَ: أَخْبَرَنِي حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ عَوْفٍ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: بَعَثَنِي أَبُو بَكْرٍ فِي تِلْكَ الْحَجَّةِ فِي مُؤَذِّنِينَ يَوْمَ النَّحْرِ نُؤَذِّنُ بِمِنًى: أَنْ لَّا يَحُجَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، وَلَا يَطُوفَ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ. قَالَ حُمَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ: ثُمَّ أَرْدَفَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلِيًّا فَأَمَرَهُ أَنْ يُؤَذِّنَ بِـ ﴿بَرَاءَةٌ﴾. قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَأَذَّنَ مَعَنَا عَلِيٌّ فِي أَهْلِ مِنًى يَوْمَ النَّحْرِ: لَا يَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ. [انظر: ١٦٢٢، ٣١٧٧، ٤٣٦٣، ٤٦٥٥، ٤٦٥٦، ٤٦٥٧]

[369] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج میں قربانی کے دن منادی کرنے والوں کے ہمراہ روانہ کیا تاکہ ہم منیٰ میں یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف نہ کرے۔ حمید بن عبدالرحمٰن نے کہا: پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ وہ مشرکین سے لاتعلقی کا اعلان کر دیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قربانی کے دن ہمارے ساتھ منیٰ کے لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ آج کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف ہی کرے۔

فوائد ومسائل: ① بیت اللہ کا برہنہ طواف کرنے کی ممانعت ہی ستر پوشی کے وجوب کی دلیل ہے۔ عنوان کے ساتھ حدیث کے اسی جز کی مطابقت ہے۔[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دور جاہلیت میں عورت بیت اللہ کا طواف بالکل برہنہ ہو کر کرتی اور کہتی کہ مجھے کوئی طواف کے لیے اتنا کپڑا عاریتاً دے دے جس سے میں اپنی شرم گاہ کو ڈھانپ سکوں اور وہ شعر پڑھتی:

آج جسم کا کچھ حصہ یا تمام جسم ننگا ہے
اور جو حصہ عریاں ہے اسے کسی دوسرے کے لیے حلال نہیں کرتی ہوں

اللہ تعالیٰ نے اسی عریانی کے سدباب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ ''اے اولاد آدم! ہر مسجد میں نماز کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔''[3] ② جب حج فرض ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حجاج کا امیر بنا کر روانہ فرمایا۔ انھوں نے مکہ پہنچ کر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اعلان پر مامور کیا جس کا ذکر حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس اعلان براءت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تھا وہ سورۂ براءۃ کی ابتدائی

① صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: 584. ② عمدة القاري: 291/3. ③ صحيح مسلم، التفسير، حديث: 7551(3028).

آیات تھیں۔ جامع ترمذی میں اس کی تفصیل ہے: حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو ان امور کے اعلان کرنے کا حکم دیا، پھر حضرت علی ؓ کو حکم فرمایا۔ پھر جب دونوں حضرات نے حج کر لیا تو حضرت علی ؓ نے چار باتوں کا اعلان کیا: ✱ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہر مشرک سے بری الذمہ ہے، انھیں صرف چار ماہ کی رعایت ہے۔ ✱ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کے حج کے لیے نہیں آ سکے گا۔ ✱ کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا۔ ✱ اللہ کی جنت میں صرف اہل ایمان کو داخلہ ملے گا۔ حضرت علی ؓ اعلان کرتے تھے، جب وہ تھک جاتے تو حضرت ابوبکر صدیق کھڑے ہو کر انھی باتوں کا اعلان کرتے۔[1] ③ حضرت علی ؓ کو الگ سے آیات براءۃ پڑھنے کے حکم میں یہ حکمت تھی کہ ان آیات میں نقضِ عہد کی بات تھی اور عرب کے دستور کے مطابق نقض عہد وہی کر سکتا تھا جس نے عہد باندھا ہو یا پھر کوئی ایسا شخص یہ کام کرتا جو اس کے اہل بیت سے ہوتا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ نقض عہد کی بات دوٹوک ہو جائے اور کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ بعض نے کہا ہے کہ سورۂ براءۃ میں چونکہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا ذکر خیر تھا، اس لیے مناسب ہوا کہ آیات براءۃ کو کوئی دوسرا شخص پڑھ کر سنائے۔[2] ④ حج کی فرضیت نویں سال ہوئی لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس سال حج نہیں فرمایا جبکہ فریضۂ حج جلد ادا کرنا مطلوب ہے۔ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو حج کے لیے روانہ فرمایا۔ شارحین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ عرب کے ہاں ایک بری رسم تھی کہ وہ اپنی مطلب برآری کے لیے مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے جسے قرآن کریم نے نسیئی سے تعبیر کیا ہے۔ اس فعل شنیع کی وجہ سے ایام حج اپنی مقررہ جگہ سے آگے پیچھے ہو جاتے۔ جس سال حج فرض ہوا اس وقت بھی ایسی ہی صورت تھی کہ حج اپنے خاص مہینے میں ادا نہیں ہوا تھا، دسویں سال حج ٹھیک اپنے مہینوں میں آ گیا جس کی وضاحت آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مختلف خطبات میں فرمائی، اس لیے آپ نے نویں سال حج کرنے کی بجائے دسویں سال یہ فریضہ ادا فرمایا تاکہ یہ اپنے ایام میں ادا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن فروگزاشتوں کی اصلاح ناممکن یا دشوار ہو ان میں مسامحت سے بھی کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ جن لوگوں نے ہجرت کے نویں سال حج کیا ان کا حج یقیناً معتبر ہوا ہے کسی کو بھی اس کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا۔ واللہ أعلم.

(١١) بَابُ الصَّلَاةِ بِغَيْرِ رِدَاءٍ

٣٧٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي الْمَوَالِي عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ وَهُوَ يُصَلِّي فِي ثَوْبٍ مُلْتَحِفًا بِهِ، وَرِدَاؤُهُ مَوْضُوعٌ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْنَا: يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ! تُصَلِّي وَرِدَاؤُكَ مَوْضُوعٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، أَحْبَبْتُ أَنْ يَرَانِي

باب: 11- چادر کے بغیر نماز ادا کرنا

[370] حضرت محمد بن منکدر سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں حضرت جابر ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ اس وقت ایک کپڑا لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے جبکہ ان کی دوسری چادر پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا: اے ابوعبداللہ! آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے ہیں جبکہ آپ کی دوسری چادر

1 جامع الترمذي، التفسير، حديث: 3091. 2 عمدة القاري: 292/3.

الْجُهَّالُ مِثْلُكُمْ، رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي كَذَا.
[راجع: ٣٥٢]

الگ رکھی ہوئی ہے؟ حضرت جابر ؓ نے فرمایا: جی ہاں! میں چاہتا ہوں کہ تم جیسے جاہل مجھے دیکھ لیں۔ میں نے نبی ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

فوائد ومسائل: ① بعض لوگ تکمیل ہیئت کے لیے چادر اوڑھنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب عام حالات میں چادر کا استعمال زینت کی تکمیل کے لیے ضروری خیال کیا گیا ہے تو نماز میں بھی چادر کی ضرورت ہونی چاہیے۔ امام بخاری ؒ تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ نماز کی صحت کا مدار کپڑوں کی گنتی یا نوعیت پر نہیں، اس کی صحت کے لیے ستر پوشی کافی ہے۔ اگر ستر پوشی ایک ازار سے ہو جائے تو چادر کی ضرورت نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ چادر اوڑھنے سے زینت بڑھ جاتی ہے لیکن نماز کی صحت کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں جیسا کہ حضرت جابر ؓ نے چادر کے ہوتے ہوئے بیان جواز کے لیے اس کے بغیر نماز ادا کی ہے۔ ② باب :9 میں حضرت عمر ؓ کا ایک فرمان بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی پر کشادگی فرماتا ہے تو اس وسعت کا اظہار ہونا چاہیے۔ اس ارشاد سے وہم ہوسکتا ہے کہ شاید وسعت کی صورت میں ایک کپڑے سے نماز جائز نہ ہو۔ ممکن ہے کہ امام بخاری ؒ نے اس وہم کے ازالے کے لیے اس باب کا انعقاد کیا ہو کیونکہ اس میں وضاحت ہے کہ حضرت جابر ؓ کے پاس دوسری چادر موجود تھی لیکن انھوں نے اس وسعت کے باوجود ایک ہی کپڑے میں نماز ادا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وسعت کے باوجود ایسا کرنا جائز ہے اور ایسا کرنا تقویٰ کے خلاف نہیں۔ ③ حضرت جابر ؓ نے زبانی مسئلہ سمجھانے کے بجائے عملی تعلیم کا اہتمام کیا ہے کیونکہ اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ عام لوگوں کی عادت ہے کہ وہ سنن و آداب اور مستحبات کے ساتھ فرض و واجب جیسا معاملہ کرتے ہیں، حالانکہ ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر رکھنا چاہیے، اس لیے حضرت جابر ؓ نے لوگوں کو تعلیم دی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیمی مقاصد کے پیش نظر بعض اوقات اولیٰ اور بہتر چیز کو ترک کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت جابر ؓ نے کیا کیونکہ نماز ایک کپڑے میں پڑھنا جائز ہے، تاہم بہتر ہے کہ اگر زیادہ کپڑوں کی گنجائش ہو تو نماز میں انھیں استعمال کیا جائے۔ واللہ أعلم.

(١٢) بَابُ مَا يُذْكَرُ فِي الْفَخِذِ

باب: 12- ان روایات کا بیان جو ران سے متعلق ہیں

وَيُرْوٰى عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَرْهَدٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ جَحْشٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ: «اَلْفَخِذُ عَوْرَةٌ». وَقَالَ أَنَسٌ: حَسَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ فَخِذِهِ، وَحَدِيثُ أَنَسٍ أَسْنَدُ، وَحَدِيثُ جَرْهَدٍ أَحْوَطُ حَتّٰى يُخْرَجَ مِنِ اخْتِلَافِهِمْ. وَقَالَ أَبُو مُوسٰى: غَطَّى النَّبِيُّ ﷺ رُكْبَتَيْهِ حِينَ دَخَلَ عُثْمَانُ. وَقَالَ زَيْدُ

(ابوعبداللہ حضرت امام بخاری ؒ فرماتے ہیں کہ) حضرت ابن عباس، حضرت جرہد اور حضرت محمد بن جحش ؓ سے بیان کیا جاتا ہے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ "ران چھپانے کی چیز ہے۔" حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ اپنی ران کو کھول دیا۔ حضرت انس کی حدیث سند کے لحاظ سے قوی ہے جبکہ احتیاط کا تقاضا

ابْنُ ثَابِتٍ: أَنْزَلَ اللهُ عَلٰى رَسُولِهِ ﷺ وَفَخِذُهُ عَلٰى فَخِذِي، فَثَقُلَتْ عَلَيَّ حَتّٰى خِفْتُ أَنْ تَرُضَّ فَخِذِي.

ہے کہ حضرت جرہد رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کیا جائے، تاکہ اس مسئلے میں جمع و تطبیق کے ذریعے سے علماء کے اختلاف سے نکلا جا سکے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو نبی ﷺ نے اپنے گھٹنوں کو ڈھانک لیا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر ایک مرتبہ وحی نازل فرمائی تو اس وقت آپ کی ران میری ران کے اوپر تھی۔ وہ مجھ پر اتنی بھاری ہوگئی کہ مجھے اپنی ران کی ہڈی ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہوگیا۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے ران کے متعلق دوٹوک فیصلہ نہیں فرمایا کہ یہ عورۃ (قابل ستر) ہے اور اسے چھپانا چاہیے یا یہ عورۃ نہیں اور اسے چھپانے کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ جانبین کے دلائل پیش کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑ رہے ہیں۔ انھوں نے ران کے واجب الستر ہونے کے متعلق تین روایات پیش کی ہیں: * حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ران چھپانے کی چیز ہے۔''[1] لیکن اس روایت میں ابویحییٰ القتات راوی ضعیف ہے۔[2] * حضرت جرہد اسلمی رضی اللہ عنہ کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ران عورۃ ہے، لہٰذا اسے چھپانا چاہیے۔''[3] لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے اضطراب کی وجہ سے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[4] * محمد بن جحش رضی اللہ عنہ کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: ''اپنی ران کو چھپاؤ کیونکہ یہ ڈھانکنے کی چیز ہے۔''[5] اس روایت کے متعلق ابن حزم فرماتے ہیں: اس میں ایک راوی ابوکثیر مجہول ہے۔[6] پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے ان حضرات کے دلائل پیش کیے ہیں جو ران کو چھپانے کی چیز خیال نہیں کرتے۔ یہ بھی تین روایات ہیں: * حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کہ رسول اللہ نے ایک مرتبہ اپنی ران کو کھولا۔ اسے امام بخاری اسی باب میں موصولاً بیان فرمائیں گے۔ یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔[7] * حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت، جسے امام بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ میں موصولاً بیان کریں گے۔ یہ بھی ایک طویل حدیث کا حصہ ہے۔[8] * حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے خود کتاب التفسیر میں موصولاً بیان کیا ہے۔[9] امام بخاری رحمہ اللہ نے فریقین کے دلائل بیان کر کے اپنی طرف سے کوئی محاکمہ نہیں کیا، صرف ایک تبصرہ فرمایا کہ سند کے اعتبار سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت قوی ہے اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ حضرت جرہد سے مروی حدیث پر عمل کیا جائے۔ پھر احتیاط کا پہلو اختیار کرنے کی وجہ بیان کر دی کہ جب کسی معاملے میں حلت و حرمت کا اختلاف ہو تو تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ حرمت پر عمل کیا جائے۔ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

---

[1] جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2797. [2] فتح الباري: 620/1. [3] مسند أحمد: 478/3. [4] عمدة القاري: 295/3. [5] مسند أحمد: 290/5. [6] عمدة القاري: 295/3. [7] صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 371. [8] صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3674. [9] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4592.

٣٧١ - حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ ابْنُ عُلَيَّةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ غَزَا خَيْبَرَ، فَصَلَّيْنَا عِنْدَهَا صَلَاةَ الْغَدَاةِ بِغَلَسٍ، فَرَكِبَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ وَرَكِبَ أَبُو طَلْحَةَ وَأَنَا رَدِيفُ أَبِي طَلْحَةَ، فَأَجْرٰى نَبِيُّ اللهِ ﷺ فِي زُقَاقِ خَيْبَرَ وَإِنَّ رُكْبَتِي لَتَمَسُّ فَخِذَ نَبِيِّ اللهِ ﷺ، ثُمَّ حَسَرَ الْإِزَارَ عَنْ فَخِذِهِ، حَتّٰى إِنِّي أَنْظُرُ إِلٰى بَيَاضِ فَخِذِ نَبِيِّ اللهِ ﷺ، فَلَمَّا دَخَلَ الْقَرْيَةَ قَالَ: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ، إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ»، قَالَهَا ثَلَاثًا، قَالَ: وَخَرَجَ الْقَوْمُ إِلٰى أَعْمَالِهِمْ فَقَالُوا: مُحَمَّدٌ. قَالَ عَبْدُ الْعَزِيزِ: وَقَالَ بَعْضُ أَصْحَابِنَا: وَالْخَمِيسُ - يَعْنِي الْجَيْشَ - قَالَ: فَأَصَبْنَاهَا عَنْوَةً، فَجُمِعَ السَّبْيُ، فَجَاءَ دِحْيَةُ فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللهِ! أَعْطِنِي جَارِيَةً مِّنَ السَّبْيِ، قَالَ: «اِذْهَبْ فَخُذْ جَارِيَةً»، فَأَخَذَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ، فَجَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: يَا نَبِيَّ اللهِ! أَعْطَيْتَ دِحْيَةَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ سَيِّدَةَ قُرَيْظَةَ وَالنَّضِيرِ، لَا تَصْلُحُ إِلَّا لَكَ، قَالَ: «اُدْعُوهُ بِهَا»، فَجَاءَ بِهَا فَلَمَّا نَظَرَ إِلَيْهَا النَّبِيُّ ﷺ قَالَ: «خُذْ جَارِيَةً مِّنَ السَّبْيِ غَيْرَهَا»، قَالَ: فَأَعْتَقَهَا النَّبِيُّ ﷺ وَتَزَوَّجَهَا. فَقَالَ لَهُ ثَابِتٌ: يَا أَبَا حَمْزَةَ! مَا أَصْدَقَهَا؟ قَالَ: نَفْسَهَا، أَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا، حَتّٰى إِذَا كَانَ بِالطَّرِيقِ جَهَّزَتْهَا لَهُ أُمُّ سُلَيْمٍ، فَأَهْدَتْهَا لَهُ مِنَ اللَّيْلِ، فَأَصْبَحَ النَّبِيُّ

[371] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کا رخ کیا تو ہم نے نماز فجر خیبر کے نزدیک اندھیرے میں (اوّل وقت میں) ادا کی۔ پھر نبی ﷺ اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سوار ہوئے۔ میں حضرت ابوطلحہ کے پیچھے سوار تھا۔ نبی ﷺ نے خیبر کی گلیوں میں اپنی سواری کو ایڑی لگائی۔ (دوڑتے وقت) میرا گھٹنا نبی ﷺ کی ران مبارک سے چھو جاتا تھا۔ پھر آپ نے اپنی ران سے چادر ہٹا دی یہاں تک کہ مجھے نبی ﷺ کی ران مبارک کی سفیدی نظر آنے لگی۔ اور جب آپ بستی کے اندر داخل ہوگئے تو آپ نے تین دفعہ یہ کلمات فرمائے: ''اللہ اکبر، خیبر ویران ہوا۔ جب ہم کسی قوم کے آنگن میں پڑاؤ کرتے ہیں تو ان لوگوں کی صبح بڑی ہولناک ہوتی ہے جو قبل ازیں متنبہ کیے گئے ہوں۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: بستی کے لوگ اپنے کام کاج کے لیے نکلے تو کہنے لگے: یہ محمد (ﷺ) اور ان کا لشکر آ پہنچا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے خیبر کو بزور شمشیر فتح کیا۔ پھر قیدی جمع کیے گئے تو حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے نبی! مجھے ان قیدیوں میں سے ایک لونڈی عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: ''جاؤ کوئی لونڈی لے لو۔'' چنانچہ انھوں نے صفیہ بنت حیی کو لے لیا۔ پھر ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: اے اللہ کے نبی! آپ نے قبیلۂ قریظہ اور نضیر کے سردار کی بیٹی صفیہ بنت حیی حضرت دحیہ کو دے دی، حالانکہ آپ کے علاوہ کوئی اس کے مناسب نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''اچھا اسے (دحیہ رضی اللہ عنہ کو) صفیہ سمیت بلاؤ۔'' چنانچہ وہ صفیہ سمیت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی ﷺ نے جب صفیہ کو دیکھا تو (دحیہ سے) فرمایا: ''تم اس کے علاوہ قیدیوں میں سے کوئی اور لونڈی لے لو۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر نبی ﷺ

ﷺ عَرُوسًا، فَقَالَ: مَنْ كَانَ عِنْدَهُ شَيْءٌ فَلْيَجِئْ بِهِ، وَبَسَطَ نِطَعًا، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيءُ بِالتَّمْرِ، وَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيءُ بِالسَّمْنِ، قَالَ: وَأَحْسِبُهُ قَدْ ذَكَرَ السَّوِيقَ، قَالَ: فَحَاسُوا حَيْسًا، فَكَانَتْ وَلِيمَةَ رَسُولِ اللهِ ﷺ.

[انظر: ٦١٠، ٩٤٧، ٢٢٢٨، ٢٢٣٥، ٢٨٨٩، ٢٨٩٣، ٢٩٤٣، ٢٩٤٤، ٢٩٤٥، ٢٩٩١، ٣٠٨٥، ٣٠٨٦، ٣٣٦٧، ٣٦٤٧، ٤٠٨٣، ٤٠٨٤، ٤١٩٧، ٤١٩٨، ٤١٩٩، ٤٢٠٠، ٤٢٠١، ٤٢١١، ٤٢١٢، ٤٢١٣، ٥٠٨٥، ٥١٥٩، ٥١٦٩، ٥٣٨٧، ٥٤٢٥، ٥٥٢٨، ٥٩٦٨، ٦١٨٥، ٦٣٦٣]

نے صفیہ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ثابت بنانی نے حضرت انس ؓ سے پوچھا: اے ابوحمزہ نبی ﷺ نے ان کا حق مہر کیا مقرر کیا تھا؟ انھوں نے کہا: خود ان کی آزادی۔ آپ نے انھیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا حتی کہ جب روانہ ہوئے تو راستے ہی میں حضرت ام سلیم ؓ نے صفیہ کو آپ کے لیے آراستہ کر کے رات کو آپ کے پاس بھیجا اور صبح کو نبی ﷺ نے بحیثیت دولھا فرمایا: ''جس کے پاس جو کچھ ہے وہ یہاں لے آئے۔'' اور آپ نے چمڑے کا ایک دستر خوان بچھا دیا تو کوئی کھجوریں لایا اور کوئی گھی لایا۔ راوئ حدیث (عبدالعزیز) کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ حضرت انس نے ستو کا بھی ذکر کیا۔ پھر انھوں نے ملیدہ تیار کیا اور یہی رسول اللہ ﷺ کی دعوت ولیمہ تھی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے ران کے واجب الستر ہونے یا نہ ہونے کے متعلق دونوں طرح کے دلائل ذکر کر دیے ہیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں فرمایا کیونکہ ران کے عورۃ نہ ہونے کے متعلق جو مضبوط دلیل ہے وہ حدیث انس ہے جسے امام بخاری ؒ نے تفصیل سے نقل فرمایا ہے۔ اس میں چند ایک احتمالات ہیں جن کی بنا پر اس کے عورۃ نہ ہونے کے متعلق استدلال محل نظر بن جاتا ہے۔ شاید اسی بنا پر امام بخاری ؒ نے اس کے متعلق دوٹوک فیصلہ نہیں کیا۔ وہ احتمالات حسب ذیل ہیں: صحیح مسلم کی روایت میں انحسر الإزار کے الفاظ ہیں جس کے معنی ہیں کہ چادر خود بخود اوپر ہو گئی، رسول اللہ ﷺ نے اسے از خود اوپر نہیں اٹھایا۔[1] اس کے علاوہ مسند امام احمد اور طبرانی میں بھی یہ روایت انھی الفاظ سے نقل ہوئی ہے۔ اس روایت کو جب محدث اسماعیلی نے بیان کیا تو اس کے الفاظ بایں طور ہیں: [خر الإزار] ''آپ کی چادر گر پڑی۔'' عربی زبان میں لفظ خرور بمعنی وقوع بھی انحسار کی طرح لازم استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو معنی یہ ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ نے از خود اپنی ران سے چادر نہیں ہٹائی بلکہ بھیڑ یا سواری کو تیز دوڑانے کی وجہ سے ران کا حصہ کھل گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی جلالت قدر کے شایان شان بھی یہی ہے کہ آپ کی طرف دانستہ ران کے کھولنے کا انتساب نہ کیا جائے خصوصاً جبکہ آپ کے ارشادات سے اس کا قابل ستر ہونا ثابت بھی ہو چکا ہو۔ حضرت انس ؓ نے جو اس فعل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی ہے وہ شاید اس لیے کہ انھوں نے حالتِ مذکورہ میں ران مبارک کو کھلا دیکھا تو یہی گمان کر لیا کہ آپ نے قصداً ایسا کیا ہے، حالانکہ واقع میں ایسا نہ تھا۔ صحیح بخاری میں چونکہ لفظ حَسَرَ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دانستہ چادر ران سے ہٹائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حسر لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، اس لیے ضروری نہیں کہ اسے متعدی ہی استعمال کیا جائے بلکہ یہاں لازم کے معنی میں استعمال کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔ بایں صورت معنی ہوں گے کہ ازار از خود کسی وجہ سے ہٹ گیا۔ پھر صحیح مسلم میں مروی الفاظ سے اس معنی کی مزید تائید ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حسر الإزار کے یہ معنی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ازار (تہ بند) کو ران کے مقام پر ڈھیلا کیا ہوتا کہ ران

[1] صحیح مسلم، الجهاد، حدیث: 4665 (1365).

سے چمٹا ہوا نہ رہے اور ایسا کرنے میں اتفاقاً ران کا کچھ حصہ کھل گیا ہو۔ یہ احتمال اس روایت کے زیادہ مناسب ہے جو علامہ کرمانی نے بعض نسخوں کے حوالے سے بیان کی ہے کہ عن فخذہ کے بجائے علی فخذہ ہے، یعنی ازار کا جو حصہ ران پر تھا آپ نے اسے کھولا اور ڈھیلا کیا۔[1] رسول اللہ ﷺ کی سواری ایک تنگ گلی میں جا رہی تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی، اس لیے ممکن ہے کہ گھٹنا بار بار تہ بند سے الجھتا ہو اور ہوا نے اس تہ بند کا رخ پلٹ دیا ہو۔ اگر آپ نے خود ہٹایا تو اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ تہ بند کے بار بار الٹنے سے آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس الجھاؤ میں ایسا نہ ہو کہ اس حصے کی بے پردگی ہو جائے جس کی کسی صورت میں نوبت نہیں آنی چاہیے۔ اس خطرے کے پیش نظر ممکن ہے کہ آپ نے اپنا ازار گھٹنے سے ہٹا کر ران کے نیچے دبا لیا ہو۔ خود صحیح بخاری میں ایک روایت موجود ہے جس میں فخذ کے بجائے قدم کے الفاظ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا قدم آپ کے قدم سے مس کر رہا تھا۔[2] ② علامہ قرطبی کہتے ہیں: حدیث انس پر حدیث جرہد کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ اس کے معارض جو بھی احادیث ہیں وہ خاص واقعات و حالات سے متعلق ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت کا احتمال بھی ہو سکتا ہے اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ ران کے متعلق پہلے نرمی چلی آ رہی تھی، اس کے بعد اس کے عورۃ ہونے کا حکم ہوا، لیکن حدیث جرہد میں اس قسم کا کوئی احتمال نہیں بلکہ اس میں ایک کلی حکم بیان ہوا ہے۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے انھی احتمالات کی بنا پر کہا ہے کہ جرہد رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل کرنا احتیاط کا تقاضا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ذہن میں اس کے متعلق کچھ تفصیل ہے۔ انھوں نے اسے دوٹوک بیان کرنے کے بجائے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ران کے متعلق متوسط اور معتدل موقف رکھتے ہیں، وہ اس طرح کہ ران کے اوپر والے حصے کو سَوأَتَیْن (قُبل، دُبر) کے ساتھ ملحق خیال کرتے ہیں لیکن وہ حصہ جو گھٹنے کی جانب ہے اس کے متعلق کچھ نرم گوشہ اس طرح ہے کہ بے تکلف احباب اور وہ حضرات جو بکثرت آنے جانے والے ہیں، ان کے سامنے کشف کا مضائقہ نہیں، لیکن اجانب اور وہ حضرات جو کبھی کبھار آنے جانے والے ہوں یا ایسے لوگ جن سے بے تکلفی نہ ہو، ان کے سامنے امام بخاری رحمہ اللہ بھی کشف فخذ کی اجازت نہیں دیتے۔ واللہ أعلم.

نوٹ: اس حدیث سے متعلق دیگر مباحث کتاب الجہاد اور کتاب النکاح میں بیان ہوں گے۔

(١٣) بَابٌ: فِي كَمْ تُصَلِّي الْمَرْأَةُ مِنَ الثِّيَابِ؟

باب: 13- عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟

وَقَالَ عِكْرِمَةُ: لَوْ وَارَتْ جَسَدَهَا فِي ثَوْبٍ جَازَ.

حضرت عکرمہ کہتے ہیں: اگر عورت نے ایک کپڑے سے سارا جسم ڈھانک لیا ہے تو اس کی نماز جائز ہے۔

وضاحت: اس عنوان کا مقصد یہ ہے کہ عورت کے لیے وہی حکم ہے جو مرد حضرات کا ہے کہ ستر کا چھپانا ضروری ہے۔ اس

---

① شرح الكرماني: 31/2. ② صحيح البخاري، الأذان، حديث: 610. ③ فتح الباري: 623/1.

کے لیے کپڑوں کی تعداد یا نوعیت کی چنداں ضرورت نہیں۔ چونکہ عورت کے لیے تمام جسم چھپانا ضروری ہے، اس لیے مدار جسم چھپانے پر ہے۔ حضرت عکرمہ کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کا یہ اثر مصنف عبدالرزاق (129/3) میں موصولاً بیان ہوا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر عورت ایک کپڑے میں خود کو لپیٹ لے تا آنکہ اس کے بال بھی نظر نہ آئیں تو اس کے لیے یہ کافی ہے۔[1]

٣٧٢ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ أَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَقَدْ كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الْفَجْرَ فَيَشْهَدُ مَعَهُ نِسَاءٌ مِّنَ الْمُؤْمِنَاتِ مُتَلَفِّعَاتٍ فِي مُرُوطِهِنَّ، ثُمَّ يَرْجِعْنَ إِلَى بُيُوتِهِنَّ، مَا يَعْرِفُهُنَّ أَحَدٌ. [انظر: ٥٧٨، ٨٦٧، ٨٧٢]

[372] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے تو آپ کے ہمراہ کچھ خواتین اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی حاضر ہوتی تھیں۔ پھر (فراغت کے بعد) وہ اپنے گھروں کو ایسے لوٹ جاتیں کہ انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ عورت اگر ایک ہی چادر میں اچھی طرح لپٹ کر نماز ادا کرے تو نماز درست ہے کیونکہ اس حدیث میں صرف چادروں میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے، ان کے ساتھ دوسرے کپڑوں کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ چونکہ عورت کا پورا جسم چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ قابل ستر ہے، اس لیے عورتوں کے معاملے میں صحت نماز کا دارومدار کپڑوں کی گنتی پر نہیں بلکہ ستر پر ہے۔ اگر عورت سر سے پاؤں تک چادر لپیٹ لے تو نماز کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ ائمۂ کرام سے عورتوں کے لیے کپڑوں کی تعداد منقول ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت کے لیے نماز کی صحت کسی گنتی پر موقوف ہے۔ چونکہ عام حالات میں عورت کا جسم چھپانے کے لیے ایک سے زیادہ کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے زیادہ کپڑوں کے استعمال کی ہدایت کی ہے لیکن اگر ستر پوشی اور سارے جسم کو چھپانے کا مقصد ایک ہی کپڑے سے حاصل ہو جائے تو یہ بھی کافی ہے، چنانچہ امام ابن منذر نے جمہور کا قول کُرتے (قمیص) اور دوپٹے میں وجوب صلاۃ کا نقل کر کے لکھا ہے کہ اس سے مراد بدن اور سر کا ضروری طور پر چھپانا ہے۔ اگر ایک ہی کپڑا اتنا بڑا ہو جس سے سارا بدن اور اس کے باقی حصے سے سر بھی چھپ سکے تو نماز درست ہو جائے گی۔ اس کے بعد حضرت عطاء اور ابن سیرین کے اقوال، جو عورت کی نماز کے لیے کپڑوں کی تعداد سے متعلق ہیں، ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اقوال استحباب پر محمول ہیں۔[2] ② عورتیں جب نماز سے فراغت کے بعد گھروں کو جاتیں تو پتہ نہ چلتا کہ کون سی عورت ہے؟ البتہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ عورت ہے، مرد نہیں۔ عدم معرفت کی وجہ رات کا اندھیرا ہوتا یا ان کا خود کو چھپانا، اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے ان کی پہچان نہ ہوسکتی تھی۔[3] علامہ خطابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنے کی تھی، کبھی کبھار کسی ہنگامی صورت کے پیش نظر آپ نے صبح کی روشنی میں ادا کی ہے، نیز اس حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مسلم خواتین رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز ادا کرتی

---

① فتح الباري: 625/1. ② فتح الباري: 625/1. ③ صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: 578.

تھیں، چنانچہ عورتوں کا مردوں کے ہمراہ نماز باجماعت ادا کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے۔[1] ③ امام بخاری ؒ کے استدلال پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ عورتیں چادر کو برقع کے طور پر استعمال کرتی تھیں، یہ مطلب نہیں کہ اس کے علاوہ جسم پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا تھا۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ استدلال کی بنیاد حدیث کا ظاہری مفہوم ہے چونکہ دیگر کپڑوں کا ذکر نہیں، اس لیے احتمال ہے کہ کوئی اور کپڑا نہ ہو، اگرچہ امام بخاری ؒ نے اس کی تصریح نہیں کی لیکن ان کی عادت ہے کہ اپنے اختیارات (موقف) کو عنوان میں ذکر کر دیتے ہیں جیسا کہ انھوں نے حضرت عکرمہ کے حوالے سے اسے بیان کیا ہے۔[2] اس کے علاوہ یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ صحابۂ کرام ؓ کے دور میں کپڑوں کی فراوانی نہ تھی، غربت کا دور تھا، اس لیے حالات کے پیش نظر ہوسکتا ہے کہ عورتوں کے پاس صرف ایک ہی چادر ہو۔

نوٹ: صبح کی نماز اسفار میں ہو یا اندھیرے میں؟ اس کی وضاحت ہم آئندہ کریں گے۔

اس حدیث پر فوائد لکھنے کے بعد راقم نے اپنے گھر اس کا تذکرہ کیا کہ عورت صرف ایک چادر میں بھی نماز پڑھ سکتی ہے بشرطیکہ اس نے اس سے اپنے جسم کو لپیٹ رکھا ہو کیونکہ صحابہ کے دور میں کپڑوں کی فراوانی نہ تھی، لہٰذا ممکن ہے کہ حالات کے پیش نظر اس وقت ایک ہی چادر ہو۔ اس پر اہلیہ نے تعلیق لگائی کہ آپ کا یہ کہنا محل نظر ہے کیونکہ جب پردے سے متعلق سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں تو سب سے پہلے مہاجرین سابقین کی خواتین نے ان پر عمل کیا، وہ اس طرح کہ انھوں نے اپنی چادروں کو پھاڑ کر دوپٹے بنائے اور ان سے اپنے سر اور سینے کو ڈھانپ لیا۔[3] اگر ان کے پاس چادروں کے علاوہ اور کپڑے نہیں تھے تو چادروں کو پھاڑنے کے بعد وہ کیا پہنتی تھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ خواتین اسلام کے پاس صرف چادریں ہی نہ تھیں بلکہ ان کے علاوہ اور لباس بھی تھا جسے وہ زیب تن کرتی تھیں۔ لیکن مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ اگر کسی عورت کے پاس صرف ایک چادر ہو اور اسے اپنے بدن پر اس طرح لپیٹ لے کہ جسم کا کوئی حصہ ظاہر نہ ہو تو اس میں نماز جائز ہے لیکن امام بخاری ؒ کی دلیل کو مضبوط کرنے کے لیے اسے اس وقت کی خواتین کے لیے دیگر کپڑوں کی عدم دستیابی سے معلق نہ کیا جائے۔ واللہ أعلم. اللہ تعالیٰ اہلیہ کو اجر عظیم عطا فرمائے کہ انھوں نے اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی۔

(١٤) بَابٌ: إِذَا صَلَّى فِي ثَوْبٍ لَهُ أَعْلَامٌ وَنَظَرَ إِلَى عَلَمِهَا

باب: 14- جب کوئی منقش کپڑے میں نماز پڑھے اور دوران نماز میں کپڑے کے نقش و نگار کو دیکھے؟

٣٧٣ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى فِي خَمِيصَةٍ لَهَا أَعْلَامٌ، فَنَظَرَ إِلَى أَعْلَامِهَا نَظْرَةً، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: «اِذْهَبُوا بِخَمِيصَتِي هٰذِهِ إِلَى

[373] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک دفعہ منقش چادر میں نماز پڑھی۔ آپ کی ایک نظر اس کے نقش و نگار پر پڑی تو آپ نے نماز سے فراغت کے بعد فرمایا: ”میری اس چادر کو ابوجہم کے پاس واپس لے جاؤ اور ابوجہم سے اس کی انبجانی (سادہ) چادر لے آؤ کیونکہ

① إعلام الحديث : 355/1. ② فتح الباري : 625/1. ③ صحيح البخاري، التفسير، حديث :4758.

أَبِي جَهْمٍ، وَائْتُونِي بِأَنْبِجَانِيَّةِ أَبِي جَهْمٍ، فَإِنَّهَا أَلْهَتْنِي آنِفًا عَنْ صَلَاتِي».

اس منقش چادر نے مجھے ابھی اپنی نماز میں دوسری طرف متوجہ کر دیا تھا۔"

وَقَالَ هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «كُنْتُ أَنْظُرُ إِلَى عَلَمِهَا وَأَنَا فِي الصَّلَاةِ فَأَخَافُ أَنْ تَفْتِنَنِي». [انظر: ۷۵۲، ۵۸۱۷]

ہشام بن عروہ نے اپنے باپ عروہ سے اور وہ حضرت عائشہ ؓ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "میں نے اس چادر کے نقش و نگار کی طرف بحالت نماز نظر کی تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ مجھے فتنے میں نہ ڈال دے۔"

فوائد و مسائل: ① منقش کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ امام بخاری ؒ نے اس کے متعلق عنوان میں کوئی فیصلہ نہیں کیا لیکن جو روایت پیش کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز ہو جائے گی کیونکہ نماز کے لیے تو کپڑے کا ساتر اور طاہر ہونا ضروری ہے جو اس صورت میں بھی حاصل ہے لیکن اگر نمازی یہ خیال کرے کہ ایسا کپڑا اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو اس سے احتراز کرنا چاہیے، چنانچہ حدیث میں اس بات کی صراحت ہے کہ نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی ایک نظر کپڑے کے نقش و نگار پر پڑی تو آپ نے نماز کو تو جاری رکھا، نہ اسے ختم کیا اور نہ پڑھنے کے بعد اس کا اعادہ فرمایا۔ امام بخاری ؒ کا مدعا ثابت ہو گیا کہ اس قسم کے کپڑے میں نماز ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کے استعمال میں فتنے کا سامان مہیا ہوتا ہو تو سادہ کپڑا استعمال کرنا اولیٰ ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اشیاء بھی دوران نماز میں نمازی کے خشوع میں خلل انداز ہوں، ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ منقش جائے نماز کا حکم بھی یہی ہے۔ ② ابن شہاب عن عروہ والی پہلی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نقش و نگار کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوسری ہشام عن عروہ والی روایت میں ہے کہ آپ کو فتنے میں پڑنے کا اندیشہ لاحق ہوا۔ حافظ ابن حجر ؒ نے دونوں باتوں کو متضاد خیال کر کے پہلی روایت کی بایں طور تاویل کی ہے کہ قریب تھا کہ آپ نقش و نگار کی طرف متوجہ ہو جاتے، یعنی پہلی روایت کا مطلب دوسری روایت کے مطابق کر دیا ہے کہ آپ کو غفلت بھی پیش نہیں آئی تھی۔[1] لیکن اس حدیث سے بعض شارحین نے ایک مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نماز میں کوئی غیر متعلق خیال آنے پر نماز خراب نہیں ہوتی۔ اگر رسول اللہ ﷺ کو کسی درجے میں بھی غفلت پیش نہیں آئی تھی بلکہ صرف اس کا خوف و خطرہ ہی تھا تو استدلال مذکور کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس لیے بہتر توجیہ یہ ہے کہ غفلت کا تحقق و وجود تو تسلیم کر لیا جائے لیکن یہ غفلت فتنے میں پڑ جانے کے درجے سے بہت کم تھی جس میں غیر متعلق خیال و فکر میں استغراق کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت رسول اللہ ﷺ کو پیش نہیں آئی بلکہ اس کا صرف اندیشہ پیدا ہوا۔ ممکن ہے نقش و نگار کی طرف توجہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعت گری کا فکر و خیال پیدا ہوا ہو جسے آپ نے اپنے مرتبۂ عالیہ کی نسبت سے ایک درجے کا نقص خیال فرمایا ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ اللہ کی طرف توجہ سے ہٹ گئے ہوں کیونکہ بعض لوگ دو کاموں میں بیک وقت مشغول ہوتے ہیں اور کسی ایک امر کی ادائیگی میں نقص واقع نہیں ہوتا۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ معمولی درجے کا فکری اشتغال مانع صلاۃ نہیں اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے، نیز اگر نماز میں، نماز سے

1 فتح الباري: 626/1.

باہر کی کسی چیز کا خیال آ جائے تو نماز درست ہے۔ بعض سلف سے جو منقول ہے کہ اس سے نماز کی صحت پر اثر پڑے گا وہ معتبر نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں خشوع اور دل کا پوری طرح متوجہ ہونا مطلوب ہے، لہٰذا نمازی کو چاہیے کہ حتی الامکان اپنے قصد و ارادے سے دوران نماز میں دوسرے خیالات نہ آنے دے اور اگر خود بخود آ جائیں تو ان کی طرف توجہ نہ دے۔ [1] ④ رسول اللہ ﷺ نے اس منقش چادر کو فتنے کا سامان قرار دیا تو آپ نے اسے ابوجہم رضی اللہ عنہ کو کیوں واپس کیا؟ جب وہ آپ کے لیے باعث فتنہ تھی تو حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ کے لیے تو وہ بدرجۂ اولیٰ باعث فتنہ ہو سکتی تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے اس کی دلجوئی کے لیے اس چادر کو واپس کیا تا کہ وہ اسے کسی اور مصرف میں لا سکے، اس لیے واپس نہیں کیا کہ وہ اس میں نماز ادا کرے۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابوجہم چونکہ نابینا تھے، اس لیے منقش کپڑا ان کے حق میں سامانِ فتنہ نہ تھا، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کا اثر رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر ہو، اس کا اثر عوام کے دل پر بھی ہو کیونکہ آپ کا قلب مبارک صاف آئینے کی طرح تھا، اس لیے وہ کمال صفائی اور غایت لطافت کی بنا پر ظاہری نقوش کا اثر جلدی قبول کر لیتا تھا، اس کے برعکس اگر آئینے پر صفائی نہ ہو تو وہ معمولی نقوش کو قبول ہی نہیں کرتا، اس لیے آپ نے وہ منقش چادر ابوجہم کو واپس کر دی کہ اگر وہ استعمال کریں گے تو کچھ مضائقہ نہیں ہو گا۔ ⑤ رسول اللہ ﷺ نے وہ چادر ابوجہم رضی اللہ عنہ کو اس لیے واپس کی تھی کہ اسی نے آپ کو بطور ہدیہ بھیجی تھی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو ایک منقش چادر بطور تحفہ بھیجی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عطیہ بھیجنے والے کو اگر اس کا عطیہ واپس کر دیا جائے اور وہ خود اسے واپس لینے کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو اسے واپس لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہم کی دلجوئی کے لیے اس منقش چادر کی جگہ سادہ چادر لینے کا مطالبہ کیا تا کہ وہ اپنے ہدیے کی واپسی پر دل برداشتہ نہ ہو۔ [2]

(١٥) بَابٌ: إِنْ صَلَّى فِي ثَوْبٍ مُصَلَّبٍ أَوْ تَصَاوِيرَ هَلْ تَفْسُدُ صَلَاتُهُ؟ وَمَا يُنْهَى مِنْ ذٰلِكَ؟

باب: 15- صلیب یا تصویر بنے کپڑے میں نماز پڑھے تو کیا نماز فاسد ہو جائے گی؟ اور اس کے متعلق ممانعت کا بیان

٣٧٤ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ ابْنُ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ سَتَرَتْ بِهِ جَانِبَ بَيْتِهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «أَمِيطِي عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا، فَإِنَّهُ لَا تَزَالُ تَصَاوِيرُ تَعْرِضُ فِي صَلَاتِي». [انظر: ٥٩٥٩]

[374] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا جسے انھوں نے گھر کی ایک طرف لٹکا رکھا تھا۔ نبی ﷺ نے (اسے دیکھ کر) فرمایا: ''ہمارے سامنے سے اپنا یہ پردہ ہٹا دو کیونکہ اس کی تصویریں مسلسل میری نماز میں سامنے آتی رہتی ہیں۔''

فوائد و مسائل: ① عنوان میں اگر تصاویر کا عطف ''مصلّب'' پر ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے: اگر ایسے کپڑے میں نماز

① عمدة القاري: 314/3. ② شرح ابن بطال: 37/2.

پڑھی جائے جس پر صلیب کا نقش ہو یا دوسری تصویریں ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر اس کا عطف ''ثوب'' پر ہو تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا: اگر ایسے کپڑے میں نماز پڑھی جائے جس پر صلیب کا نشان ہو یا ایسی جگہ پر نماز ادا کی جائے جہاں تصاویر ہوں تو ایسی نماز کا کیا حکم ہے؟ اس روایت سے تصاویر کے متعلق معلوم ہوا کہ نماز تو فاسد نہیں ہوگی البتہ کراہت برقرار رہے گی۔ اس حدیث کی تفصیل دیگر روایات میں اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا جسے انھوں نے گھر کے ایک حصے پر لٹکا رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف نماز پڑھ کر ناگواری کا اظہار فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے اتار کر دو ٹکڑے کر دیے جو دو تکیوں کے غلاف بنے۔ رسول اللہ ﷺ ان پر تکیہ لگا کر آرام فرماتے تھے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا منشا ان تصاویر و تماثیل کی توہین کرنا اور انھیں عزت و احترام کے مقام سے گرانا ہے، لہٰذا ہر وہ صورت جس سے اس کی تعظیم ہوتی ہو، ممنوع ہوگی اور جس سے اس کی اہانت ہو وہ مطلوب۔ مجسمے یا تصاویر بنانا اور فوٹو لینا بہرصورت ناجائز و حرام ہیں کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کی مشابہت کے علاوہ عبادت غیراللہ اور بہت سے مفاسد ہیں، یعنی ان سے بے شمار برائیوں اور بداخلاقیوں کا دروازہ کھلتا ہے، اس لیے ناجائز و حرام ہیں۔ چونکہ یہاں مقصود نماز کا مسئلہ ہے، تصویر کا مسئلہ بتانا مقصود نہیں، لہٰذا اس کی تفصیل کتاب اللباس میں آئے گی۔ ② اس روایت میں اگرچہ صلیب کا ذکر نہیں، تاہم رسول اللہ ﷺ کو اس کا نقش اس درجہ قابل نفرت تھا کہ جہاں اس کا نقش پاتے اسے مٹا دیتے یا اکھاڑ دیتے، چنانچہ حدیث میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں اگر کوئی ایسی چیز دیکھتے جس پر صلیب کا نشان ہوتا تو اسے توڑ ڈالتے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ حدیث پیش کر کے اس روایت کی طرف اشارہ کر دیا جس میں صلیب کے توڑنے کا ذکر ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ صلیب بھی ایک شکل میں تصویر ہی ہے اور تصویر ہی کے حکم میں اسے ممنوع قرار دیا جائے گا۔ حافظ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ دونوں کی عبادت کی جاتی ہے، لہٰذا ایک کا ذکر کر کے دوسری کو اس پر قیاس کر لیا گیا ہے۔[3] ممکن ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی کسی دیوار میں عیب ہو اور آپ نے اسے چھپانے کے لیے یہ پردہ استعمال کیا ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے زیب و زینت کے طور پر در و دیوار کی پردہ پوشی سے منع کیا ہے۔ فرمان نبوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ ہم اس کے رزق کو پتھروں اور اینٹوں کی پوشش پر صرف کریں۔[4]

(١٦) بَابُ مَنْ صَلّٰى فِي فَرُّوجِ حَرِيرٍ ثُمَّ نَزَعَهُ

باب: 16- ریشمی کوٹ پہن کر نماز پڑھنا پھر اسے اتار دینا

٣٧٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ، عَنْ أَبِي الْخَيْرِ، عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: أُهْدِيَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَرُّوجُ حَرِيرٍ

[375] حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ کی خدمت میں ایک ریشمی کوٹ بطور ہدیہ لایا گیا۔ آپ نے اسے زیب تن فرما کر نماز پڑھی، مگر جب

[1] سنن النسائي، الزينة، حديث: 5357. ② صحيح البخاري، اللباس، حديث: 5952. [3] فتح الباري: 628/1. ④ سنن أبي داود، اللباس، حديث: 4153.

فَلَبِسَهُ فَصَلّٰى فِيهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهُ نَزْعًا شَدِيدًا كَالْكَارِهِ لَهُ، وَقَالَ: «لَا يَنْبَغِي هٰذَا لِلْمُتَّقِينَ». [انظر: ٥٨٠١]

نماز سے فارغ ہوئے تو اسے سختی سے اتار پھینکا۔ گویا آپ کو وہ سخت ناگوار گزرا، نیز آپ نے فرمایا: ''تقویٰ شعار لوگوں کے لیے یہ غیر مناسب ہے۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی شخص ریشم کا لباس پہن کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی، ریشم پہننے کا گناہ اسے ضرور ملے گا کیونکہ اس کا پہننا مردوں کے لیے حرام ہے جیسا کہ محرم کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا حرام ہے لیکن اگر پہن لے اور نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ ان عوارض کی وجہ سے جو نقصان آتا ہے اس کی تعبیر کراہت سے کی جاتی ہے، چنانچہ علامہ خطابی کہتے ہیں کہ جو شخص ریشمی کپڑا پہن کر نماز ادا کرتا ہے، اس کی نماز صحیح ہے اگرچہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔[1] یہ بھی واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو ریشمی کوٹ پہن کر نماز پڑھی تھی، وہ دومۃ الجندل کے بادشاد اکیدر بن عبدالملک نے آپ کو بطور تحفہ دیا تھا۔[2] صحیح مسلم ہی میں قبائے دیباج کا ذکر ہے۔ اس میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت جبریل نے اس سے منع کر دیا تھا،[3] اس لیے ممکن ہے کہ یہ نماز ریشمی کپڑا پہننے کی حرمت سے پہلے ادا کی ہو اور جب آپ کو اس کی حرمت کا پتہ چلا تو آپ نے ناگواری کے ساتھ اپنے جسم سے الگ فرما دیا۔ اور اگر آپ نے اس نہی سے پہلے اتارا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تحریم وممانعت سے پہلے بھی حق تعالیٰ کی مرضیات پر نظر رکھتے تھے۔ ② یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک آپ نے ریشم استعمال نہیں کیا تھا، اس وقت تک آپ کو اس کے عیب ونقصان کا اندازہ نہ تھا۔ جب آپ نے استعمال کیا تو اس کا عیب معلوم ہوا کہ یہ تو عیش پرست لوگوں کا لباس ہے اور اس کے استعمال سے جسم میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے جو مردانہ جفاکشی اور سخت کوشی کے خلاف ہے۔ مرد کا جسم تو مضبوط ہونا چاہیے، اس لیے آپ نے اتارتے وقت فرمایا: ''یہ تقویٰ شعار لوگوں کا لباس نہیں، عیش پرستوں کا لباس ہے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔'' واضح رہے کہ شریعت نے چند ضرورتوں کے پیش نظر ریشم کے استعمال کی اجازت دی ہے، مثلاً: جہاد کے موقع پر زرہ کے نیچے ریشم کا استعمال درست ہے تاکہ اگر دشمن کی تلوار زرہ کو کاٹ دے تو ریشم پر جا کر وہ بے کار ہو جائے۔ کوئی اور کپڑا نہیں تو ستر پوشی یا سردی سے حفاظت کے لیے استعمال کیا جائے۔ خشونت جسم کی وجہ سے خشک خارش یا جوئیں پڑ گئی ہوں تو بغرض علاج اسے پہنا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق دیگر مسائل کتاب اللباس میں بیان ہوں گے۔ بإذن اللّٰہ تعالٰی۔

(١٧) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الثَّوْبِ الْأَحْمَرِ

باب: 17- سرخ کپڑے میں نماز پڑھنا

وضاحت: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شرح تراجم بخاری میں لکھا ہے کہ سرخ کپڑے میں نماز بلا کراہت جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود یہی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سرخی عصفر کی نہ ہو کیونکہ اس میں رنگے ہوئے سرخ کپڑے کی ممانعت احادیث سے ثابت ہے۔

---

① إعلام الحديث:357/1. ② صحيح مسلم، اللباس، حديث :5422 (2071). ③ صحيح مسلم، اللباس، حديث: 5419 (2070).

٣٧٦ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ: حَدَّثَنِي عُمَرُ بْنُ أَبِي زَائِدَةَ عَنْ عَوْنِ بْنِ أَبِي جُحَيْفَةَ، عَنْ أَبِيهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فِي قُبَّةٍ حَمْرَاءَ مِنْ أَدَمٍ، وَرَأَيْتُ بِلَالًا أَخَذَ وَضُوءَ رَسُولِ اللهِ ﷺ. وَرَأَيْتُ النَّاسَ يَبْتَدِرُونَ ذَاكَ الْوَضُوءَ، فَمَنْ أَصَابَ مِنْهُ شَيْئًا تَمَسَّحَ بِهِ، وَمَنْ لَّمْ يُصِبْ مِنْهُ شَيْئًا أَخَذَ مِنْ بَلَلِ يَدِ صَاحِبِهِ، ثُمَّ رَأَيْتُ بِلَالًا أَخَذَ عَنَزَةً فَرَكَزَهَا، وَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ فِي حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مُشَمِّرًا، صَلَّى إِلَى الْعَنَزَةِ بِالنَّاسِ رَكْعَتَيْنِ، وَرَأَيْتُ النَّاسَ وَالدَّوَابَّ يَمُرُّونَ بَيْنَ يَدَيِ الْعَنَزَةِ.

[راجع: ١٨٧]

[376] حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو چمڑے کے ایک سرخ خیمے میں دیکھا اور میں نے یہ بھی بچشم خود ملاحظہ کیا کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے وضو سے بچا ہوا پانی لائے تو لوگ اسے دست بدست لینے لگے۔ جسے اس میں سے کچھ مل جاتا، وہ اسے اپنے چہرے پر مل لیتا اور جسے کچھ نہ ملتا وہ اپنے پاس والے آدمی کے ہاتھ سے تری لے لیتا۔ پھر میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انھوں نے ایک نیزہ اٹھا کر زمین میں گاڑ دیا اور نبی ﷺ ایک سرخ جوڑا زیب تن کیے، دامن اٹھائے ہوئے برآمد ہوئے اور چھوٹے نیزے کی طرف منہ کر کے لوگوں کو دو رکعت پڑھائیں۔ میں نے دیکھا کہ لوگ اور جانور نیزے کے آگے سے گزر رہے تھے۔

فوائد ومسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے سرخ کپڑے پہننے کا جواز ثابت ہوتا ہے مگر احناف اس کے خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سرخ لباس مکروہ ہے اور انھوں نے حدیث مذکور کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ حلہ (جوڑا) ایسی چادروں پر مشتمل تھا جس میں سرخ دھاریاں تھیں۔[1] لیکن احناف کے ہاں اس میں تفصیل ہے جسے ملا علی قاری نے بایں طور بیان کیا ہے: اگر وہ رنگ عصفر یا زعفران کا ہو تو مردوں کے لیے اس کا استعمال مکروہ ہے اور اگر ان دو چیزوں کے علاوہ سرخ رنگ ہو تو دیکھا جائے کہ سرخ رنگ شوخ ہے یا ہلکا، اگر شوخ ہو تو اس کا استعمال مکروہ تنزیہی یا خلاف تقویٰ ہے اور اگر رنگ پھیکا ہو تو اس کا استعمال مباح ہے۔ پھر اگر سرخ کپڑا دھاری دار ہو، یعنی زمین سفید اور اس پر سرخ دھاریاں ہوں تو اس کے استعمال میں استحباب کا درجہ ہے۔ ترقی کر کے اسے سنت بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اسے پسند فرماتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ آپ کا یہ جوڑا خالص سرخ رنگ کا نہ تھا بلکہ اس میں سرخ دھاریاں تھیں۔ اس سے مردوں کو سرخ لباس پہننے کا جواز ملتا ہے بشرطیکہ عورتوں اور کفار سے مشابہت، نیز شہرت و ریاکاری کی ہوس نہ ہو۔[2] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث ابن التین کے حوالے سے لکھا ہے: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سرخ جوڑا جنگی حالات کے پیش نظر زیب تن فرمایا تھا۔ یہ خیال محل نظر ہے کیونکہ یہ واقعہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے اور اس وقت کسی قسم کے جنگی حالات نہ تھے۔[3] واضح رہے کہ سرخ رنگ کے متعلق یہ تفصیل کپڑوں سے متعلق ہے، چمڑے کے متعلق کسی رنگ میں کراہت نہیں۔ ② حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے ایک آدمی گزرا جس نے دو سرخ کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس نے آپ کو سلام

(1) فتح الباري: 629/1. (2) عون الباري: 508/1. (3) فتح الباري: 629/1.

کیا لیکن آپ نے اس کا جواب نہ دیا۔[1] اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سرخ لباس کو اچھا خیال نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اس کے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں فرمایا جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ کی پیش کردہ حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے سرخ لباس زیب تن فرمایا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں: اس کی سند ضعیف ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے صراحت کی ہے۔[2] اگرچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔[3] اگر اس کی سند کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس سے اقوی حدیث اس کے معارض ہے اور اسے ترجیح ہوگی۔ پھر یہ خاص واقعہ ہے جس میں کسی اور چیز کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی اور وجہ سے سلام کا جواب نہ دیا ہو۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کا بایں طور جواب دیا ہے کہ اسے تیار کرنے کے بعد رنگا گیا تھا۔ اگر اس کے دھاگے کو رنگ کر کپڑا تیار کیا جائے تو چنداں حرج نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کا لباس عصفر بوٹی سے رنگا ہوا تھا، اگر اس کے بغیر کسی اور چیز سے سرخ رنگ دیا جائے تو ممانعت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: [باب ماجاء في كراهية لبس المعصفر للرجال] ''عصفر سے رنگے ہوئے کپڑوں کی کراہت۔'' بہرحال سرخ رنگ کے کپڑے استعمال کیے جاسکتے ہیں اور اس میں کوئی ممانعت نہیں، بشرطیکہ عورتوں اور کفار سے مشابہت نہ ہو۔

(١٨) بَابُ الصَّلَاةِ فِي السُّطُوحِ، وَالْمِنبَرِ، وَالْخَشَبِ

باب: 18- چھت، منبر اور لکڑی پر نماز پڑھنا

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَلَمْ يَرَ الْحَسَنُ بَأْسًا أَنْ يُصَلَّى عَلَى الْجَمْدِ وَالْقَنَاطِرِ، وَإِنْ جَرٰى تَحْتَهَا بَوْلٌ أَوْ فَوْقَهَا أَوْ أَمَامَهَا إِذَا كَانَ بَيْنَهُمَا سُتْرَةٌ. وَصَلّٰى أَبُو هُرَيْرَةَ عَلٰى ظَهْرِ الْمَسْجِدِ بِصَلَاةِ الْإِمَامِ. وَصَلَّى ابْنُ عُمَرَ عَلَى الثَّلْجِ.

امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں: حسن بصری نے برف اور پل پر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے اگرچہ اس کے نیچے یا اس کے اوپر یا آگے پیشاب بہہ رہا ہو بشرطیکہ نمازی اور پیشاب کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے امام کے پیچھے مسجد کی چھت پر نماز ادا کی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے برف پر نماز پڑھی۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے فرضیت نماز کے بیان کے بعد شرائط نماز کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ستر عورۃ کی شرط کو پہلے بیان کیا کیونکہ یہ شرط خارج صلاۃ اور داخل صلاۃ دونوں حالتوں میں ضروری ہے۔ اب پہلی شرط سے فراغت کے بعد دوسری شرط محل صلاۃ کی طہارت کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس شرط کا حاصل یہ ہے کہ نمازی جہاں کھڑا ہے وہ جگہ اور جس جگہ سجدہ ہو وہ مقام پاک ہونا چاہیے، خواہ ماحول کتنا ہی گندہ اور نجاست آلود ہو۔ ایسی جگہ نماز ادا کرنے سے فرض ادا ہو جائے گا قطع نظر اس سے کہ وہ پاک جگہ اونچی ہو یا نیچی، ہموار ہو یا ناہموار، گڑھا ہو یا ٹیلا، قطعۂ زمین ہو یا بالا خانہ، مکان کی چھت ہو یا منبر کے درجات، خواہ جنس ارض ہو یا کسی اور چیز کا فرش۔ الغرض امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں بہت توسع ہے جیسا کہ آئندہ معلوم

---

① سنن أبي داود، اللباس، حديث: 4069. ② فتح الباري: 629/1. ③ جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2807.

ہوگا،صرف نماز کی جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ [جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُورًا] کا مفہوم یہ نہیں کہ زمین پر ہی سجدہ ہونا چاہیے بلکہ اگر زمین اور نمازی کے درمیان چھت، منبر یا لکڑی کا تختہ ہوتو یہ سب صورتیں نماز کے لیے جائز قرار دی جائیں گی بشرطیکہ وہ پاک ہوں۔اگر جگہ پاک ہے تو چھت اور سطح زمین کا کوئی فرق نہیں۔ چونکہ بعض اسلاف سے ألواح (تختوں) اور أخشاب (لکڑیوں) پر نماز کی کراہت منقول ہوئی ہے،اس لیے امام بخاری ؒ کو عنوان میں صراحت کرنی پڑی کہ لکڑی کے تختوں پر بھی نماز جائز ہے

٣٧٧ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو حَازِمٍ قَالَ: سَأَلُوا سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ: مِنْ أَيِّ شَيْءٍ الْمِنْبَرُ؟ فَقَالَ: مَا بَقِيَ بِالنَّاسِ أَعْلَمُ مِنِّي، هُوَ مِنْ أَثْلِ الْغَابَةِ عَمِلَهُ فُلَانٌ مَوْلَى فُلَانَةَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ، وَقَامَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ حِينَ عُمِلَ وَوُضِعَ، فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ، كَبَّرَ، وَقَامَ النَّاسُ خَلْفَهُ، فَقَرَأَ وَرَكَعَ، وَرَكَعَ النَّاسُ خَلْفَهُ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى فَسَجَدَ عَلَى الْأَرْضِ، ثُمَّ عَادَ إِلَى الْمِنْبَرِ، ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى حَتّٰى سَجَدَ بِالْأَرْضِ، فَهٰذَا شَأْنُهُ.

[377] حضرت ابو حازم فرماتے ہیں کہ حضرت سہل بن سعد ؓ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ (نبی ﷺ کا) منبر کس چیز سے تیار کیا گیا تھا؟ وہ بولے کہ اب لوگوں میں اس کے متعلق مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ وہ مقام غابہ کے جھاؤ سے بنا تھا جسے رسول اللہ ﷺ کے لیے فلاں عورت کے فلاں غلام نے تیار کیا تھا۔ جب وہ تیار ہو چکا اور مسجد میں رکھ دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ اس پر کھڑے ہوئے اور قبلہ رو ہو کر تکبیر تحریمہ کہی۔ دیگر لوگ بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ پھر آپ نے قراءت کی اور رکوع کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے رکوع کیا۔ پھر آپ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور پیچھے ہٹ کر زمین پر سجدہ کیا۔ (دونوں سجدے ادا کرنے کے بعد) پھر منبر پر لوٹ آئے، پھر قراءت کی اور رکوع کیا، پھر رکوع سے سر اٹھایا، پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور زمین پر سجدہ کیا۔ منبر نبوی کا یہی قصہ ہے۔

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: قَالَ عَلِيُّ بْنُ الْمَدِينِيِّ سَأَلَنِي أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ رَحِمَهُ اللهُ عَنْ هٰذَا الْحَدِيثِ قَالَ: فَإِنَّمَا أَرَدْتُّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ أَعْلٰى مِنَ النَّاسِ، فَلَا بَأْسَ أَنْ يَّكُونَ الْإِمَامُ أَعْلٰى مِنَ النَّاسِ بِهٰذَا الْحَدِيثِ، قَالَ: فَقُلْتُ إِنَّ سُفْيَانَ بْنَ عُيَيْنَةَ كَانَ يُسْأَلُ عَنْ هٰذَا كَثِيرًا فَلَمْ تَسْمَعْهُ مِنْهُ؟ قَالَ: لَا. [انظر: ٤٤٨، ٩١٧]

ابوعبداللہ (امام بخاری ؒ) کہتے ہیں کہ علی بن عبداللہ مدینی نے کہا: مجھ سے امام احمد بن حنبل ؒ نے اس حدیث کے متعلق سوال کیا اور کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ لوگوں سے بلند جگہ پر تھے، اس لیے اس حدیث کی رو سے اس میں کوئی حرج نہیں کہ امام مقتدیوں سے بلند جگہ پر ہو۔ علی بن مدینی کہتے ہیں: میں نے (احمد بن حنبل) سے کہا کہ سفیان بن عیینہ سے اس روایت کے متعلق بہت سوال کیا جاتا تھا، آپ نے ان سے یہ روایت نہیں سنی؟ تو انھوں نے

٢٠٩٤، ٢٥٦٩] فرمایا: نہیں (میں نے ان سے اس روایت کا سماع نہیں کیا)۔

فوائد ومسائل: ① رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس لیے امامت کرائی تاکہ تمام مقتدی آپ کی نماز کا مشاہدہ کر لیں، بصورت دیگر صرف وہی لوگ آپ کو دیکھ سکتے تھے جو پہلی صف میں ہوں، تمام لوگ آپ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر نماز پڑھی جو لکڑی کا تھا اور سطح زمین سے بلند تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا عنوان تین اجزاء پر مشتمل تھا کہ چھت، منبر اور تختوں پر نماز کا جواز۔ یہ تینوں اجزاء اسی ایک روایت سے ثابت ہو گئے۔ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کا منبر دو سیڑھیوں اور ایک نشست پر مشتمل تھا۔ دوران نماز میں منبر سے اترنے اور اس پر چڑھنے میں عمل کثیر کا شبہ نہیں ہونا چاہیے جو نماز کے لیے درست نہیں کیونکہ اترنے اور چڑھنے کی صورت یہ تھی کہ ایک قدم اٹھایا اور رک گئے، پھر ایک قدم اٹھایا اور رک گئے، یہ عمل کثیر نہیں بلکہ عمل قلیل کا تکرار ہے جو نماز کے منافی نہیں، چنانچہ علامہ خطابی لکھتے ہیں کہ دورانِ نماز میں اس قدر عمل یسیر نماز کے لیے باعث فساد نہیں کیونکہ آپ کا منبر تین سیڑھوں پر مشتمل تھا اور شاید آپ دوسری سیڑھی پر تھے، اس طرح اترنے اور چڑھنے میں دو قدم آگے پیچھے ہونا پڑا ہوگا۔[1] ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر امام مقتدی حضرات سے اونچے مقام پر کھڑا ہو تو امامت اور اقتدا جائز ہے، اگرچہ ایسا کرنا کراہت سے خالی نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعلیم دینے کے لیے اونچا کھڑے ہوئے تھے تاکہ مقتدی حضرات آپ کی حرکات وسکنات سے واقف ہو سکیں۔ البتہ امام اور مقتدی کا یہ فرق اگر کسی ضرورت کی بنا پر ہو تو بلا کراہت ایسا کرنا جائز ہے، مثلاً: ٭ امام مقتدی حضرات کو نماز کی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ ٭ امام کی تکبیرات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اونچا کھڑا ہونے کی ضرورت ہے۔ ٭ جگہ کم رہ جانے کی وجہ سے چھت پر نماز ادا کرنے کی نوبت آ جائے، وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ الٹے پاؤں اس لیے اترے تاکہ قبلے سے انحراف نہ ہو۔[2] ③ بلا وجہ امام کا اونچا کھڑا ہونا اس لیے مکروہ ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کی کراہت منقول ہے، مثلاً: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اونچی دکان پر کھڑے ہو کر جماعت کرائی، وہاں سجدہ کیا، دوران نماز میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے انھیں نیچے کر دیا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو ابو مسعود رضی اللہ عنہ کہنے لگے: آپ کو معلوم نہیں کہ اس کی ممانعت ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اسی وجہ سے تو میں آپ کے اشارے سے نیچے آ گیا تھا۔[3] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امام کا مقتدی حضرات سے اونچا کھڑا ہونا ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔[4] امام ابوداود نے اپنی سنن میں اس کے متعلق ایک عنوان بھی قائم کیا ہے۔ ④ حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنے شیخ سفیان بن عیینہ سے پوری حدیث کا سماع نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنی سند میں صرف اسی قدر نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا منبر غابہ جنگل کے جھاؤ کا تھا، باقی حدیث کا علم انھیں حضرت علی بن عبداللہ المدینی سے ہوا جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کے آخر میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[5]

٣٧٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيمِ قَالَ: [378] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

---

① إعلام الحديث: 360/1. ② إعلام الحديث: 360/1. ③ صحيح ابن خزيمة: 13/3. ④ مجمع الزوائد: 67/3. ⑤ فتح الباري: 631/1.

حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ هَارُونَ قَالَ: أَخْبَرَنَا حُمَيْدٌ الطَّوِيلُ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سَقَطَ عَنْ فَرَسٍ فَجُحِشَتْ سَاقُهُ أَوْ كَتِفُهُ، وَآلَى مِنْ نِّسَائِهِ شَهْرًا فَجَلَسَ فِي مَشْرُبَةٍ لَّهُ، دَرَجَتُهَا مِنْ جُذُوعٍ، فَأَتَاهُ أَصْحَابُهُ يَعُودُونَهُ، فَصَلَّى بِهِمْ جَالِسًا وَّهُمْ قِيَامٌ، فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ: «إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوا وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوا، وَإِنْ صَلَّى قَائِمًا فَصَلُّوا قِيَامًا»، وَنَزَلَ لِتِسْعٍ وَّعِشْرِينَ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّكَ آلَيْتَ شَهْرًا، فَقَالَ: «إِنَّ الشَّهْرَ تِسْعٌ وَّعِشْرُونَ». [انظر: ٦٨٩، ٧٣٢، ٧٣٣، ٨٠٥، ١١١٤، ١٩١١، ٢٤٦٩، ٥٢٠١، ٥٢٨٩، ٦٦٨٤]

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھوڑے سے گر گئے تو آپ کی پنڈلی یا کندھا مجروح ہو گیا اور آپ نے ایک ماہ تک اپنی ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھائی، اس بنا پر اپنے بالا خانے میں تشریف فرما ہوئے جس کی سیڑھی کھجور کے تنوں کی تھی، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی تیمار داری کے لیے آئے۔ آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بیٹھ کر نماز پڑھائی جبکہ وہ کھڑے ہوئے تھے۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو فرمایا: ''امام تو اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اسی طرح جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اور اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر اس کی اقتدا کرو۔'' پھر آپ نے انتیس دن پورے ہونے پر بالا خانے سے نزول فرمایا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ نے تو ایک ماہ الگ رہنے کی قسم کھائی تھی! آپ نے فرمایا: ''مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔''

فوائد و مسائل: ① ابن بطال نے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث مَشْرُبَہ اس لیے پیش کی ہے تاکہ لکڑی پر نماز پڑھنے کا جواز ثابت ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے بالا خانے کی چھت لکڑیوں کی تھی۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ چھت پر نماز ادا کرنے کے جواز میں اس حدیث کو پیش کیا ہے کیونکہ ضروری نہیں کہ بالا خانے کی چھت تمام کی تمام لکڑیوں ہی پر مشتمل ہو۔[2] بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ اپنے قائم کردہ عنوان کو ثابت کرنے کے لیے اس حدیث کو لائے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ عنوان کے تمام اجزاء اس سے ثابت ہوں بلکہ اگر بعض اجزاء بھی ثابت ہو جائیں تو کافی ہے۔ ② اس حدیث میں دو واقعات کو یکجا بیان کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان دونوں کے درمیان تقریباً چار سال کا دورانیہ ہے۔ ✱ پہلا واقعہ رسول اللہ ﷺ کا گھوڑے سے گرنے کا ہے جو ذوالحجہ 5 ہجری بمطابق مئی 627ء کو پیش آیا۔ آپ قیام مدینہ کے دوران میں گھوڑے پر سوار ہو کر غابہ جانا چاہتے تھے کہ گھوڑے نے شوخی میں آ کر آپ کو ایک کھجور کے درخت پر گرا دیا جس سے قدم مبارک کی ہڈی اپنے جوڑ سے الگ ہو گئی، اس کے علاوہ آپ کا پہلو بھی زخمی ہوا، چوٹ معمولی نہیں بلکہ زیادہ تھی، اس لیے آپ نے بالا خانے میں قیام فرمایا۔ معذوری کی

1. شرح ابن بطال: 42/2. ② فتح الباري: 632/1.

وجہ سے مسجد میں نہ جا سکے بلکہ وہیں نمازیں پڑھتے رہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عیادت کے لیے تشریف لاتے اور موقع پا کر نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ * دوسرا واقعہ ایلا کا ہے جو 9 ہجری میں پیش آیا۔ اس میں بھی آپ نے بالا خانے میں قیام فرمایا مگر معذور نہ تھے، اس لیے نمازیں مسجد ہی میں ادا کرتے تھے۔ اس سے ازواج مطہرات سے تخلیہ مقصود تھا۔ اس میں حسب معمول اوقات نماز میں مسجد میں آتے اور امامت کے فرائض سرانجام دیتے۔ انھی دنوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نماز فجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ادا کرنے کا بیان بخاری میں ہے۔ ان دونوں واقعات میں مابہ الاشتراک دو چیزیں تھیں جس سے بعض راویوں کو دھوکا ہوا اور انھوں نے دونوں واقعات کو ایک ہی سیاق میں بیان کر دیا: * دونوں واقعات میں قیام بالا خانے میں رہا۔ * دونوں واقعات میں مدتِ قیام انتیس دن تھی۔ لیکن کچھ چیزیں مابہ الافتراق (الگ الگ) بھی ہیں، مثلاً: سقوط (گرنے والے واقعے) میں انفکاک قدم (پیر میں چوٹ لگنے) کی وجہ سے مسجد میں تشریف نہیں لے جاتے تھے جبکہ واقعۂ ایلا میں حسب معمول مسجد میں تشریف لے جاتے رہے، نیز واقعۂ ایلا میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور ان کے متعلقین کو جو پریشانی اور بے چینی لاحق تھی وہ واقعۂ سقوط میں نہیں تھی۔ واقعۂ ایلا میں جو پریشانی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور ان کے متعلقین کو تھی اس کی جھلک صحیح بخاری کی حدیث (2468) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صرف تین مرتبہ بیٹھ کر نماز ادا فرمائی: * غزوۂ احد میں جب آپ کو زخم آئے تو ظہر کی نماز بیٹھ کر ادا فرمائی۔ یہ 3 ہجری کا واقعہ ہے۔ * 5 ہجری میں سقوط عن الفرس (گھوڑے سے گرنے) کے وقت بھی آپ بیٹھ کر نمازیں ادا کرتے رہے۔ ان دونوں مواقع پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کے پیچھے بیٹھ کر نمازیں ادا کیں۔ * 11 ہجری مرض وفات میں آپ نے بیٹھ کر نمازیں پڑھائیں جبکہ مقتدی حضرات کھڑے ہو کر آپ کی اقتدا کرتے تھے۔ آئندہ اس کی تفصیل ہدیۂ قارئین ہوگی۔ ④ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک ماہ کی مہاجرت اور ترک روابط کی حکمت یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی تعداد نو تھی، زیادہ سے زیادہ تین دن تک کسی دوسرے سے ترک کلام کیا جا سکتا ہے۔ 9 ازواج کے لیے تین دن کے حساب سے 27 دن ازواج مطہرات کے ہوئے اور آپ کی ایک لونڈی ماریہ قبطیہ بھی تھیں، دو دن اس کی مہاجرت شامل کرنے سے کل انتیس دن ہوتے ہیں، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین دن کی مہاجرت کی ہے۔[1] ترک کلام میں باری مقرر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے خلاف تھا، اس لیے ایک ساتھ تمام سے ترک کلام فرمایا۔ واللہ أعلم۔ ⑤ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی۔ آپ نے فراغت کے بعد انھیں سمجھایا کہ اگر امام کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو مقتدی بھی کھڑے ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو مقتدی بھی بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ ابوداود میں اس کی تفصیل ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جب تیمار داری کے لیے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل بیٹھ کر ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے بطور تبرک شمولیت اختیار کر لی لیکن صحابہ نے آپ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، پھر دوبارہ عیادت کے لیے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز بیٹھ کر ادا کر رہے تھے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی ساتھ شامل ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اشارہ فرمایا کہ تم میرے پیچھے بیٹھ کر نماز ادا کرو، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے پیچھے بیٹھ کر نماز ادا

---

① فتح الباري: 233/9.

کی۔[1] اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی حضرات بھی اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز ادا کریں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول اور عمل سے ثابت ہے، لیکن امام بخاری ؒ کے نزدیک یہ عمل منسوخ ہے۔ آپ نے صحیح بخاری میں دو مقام پر اس کی وضاحت فرمائی ہے: ٭ شیخ حمیدی سے منقول ہے کہ ارشاد نبوی: ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔'' مرض قدیم میں تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مرض وفات میں بیٹھ کر نماز پڑھی اور صحابۂ کرام ؓ نے کھڑے ہو کر اقتدا کی۔ آپ نے اس وقت انھیں بیٹھنے کا حکم نہیں دیا اور رسول اللہ ﷺ کے آخری فعل ہی کو معمول بنایا جا سکتا ہے۔[2] ٭ شیخ حمیدی نے کہا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری نماز بیٹھ کر پڑھائی جب کہ لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔[3] ہمارا رجحان بھی یہی ہے کہ اگر امام کسی عذر کی بنا پر بیٹھ کر نماز ادا کرتا ہے تو مقتدی حضرات تو معذور نہیں ہیں، انھیں کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چاہیے۔ واللہ أعلم.

(١٩) بَابٌ: إِذَا أَصَابَ ثَوْبُ الْمُصَلِّي امْرَأَتَهُ إِذَا سَجَدَ

باب: 19- جب نمازی کا کپڑا دوران سجدہ میں اس کی بیوی کو لگ جائے

وضاحت: امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر نمازی کے قریب اس کی بیوی لیٹی ہوئی ہو اور سجدے میں جاتے وقت کپڑے کا کوئی حصہ بیوی کے بدن کو چھو جائے تو اس سے نماز میں کوئی خلل نہیں آتا کیونکہ صحت صلاۃ کی شرط تو صرف مقام صلاۃ کی طہارت ہے۔ اگر عورت حائضہ بھی ہے، تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ امام بخاری ؒ کی عادت تو یہ ہے کہ وہ عنوان میں اس قسم کا انداز اس وقت اختیار کرتے ہیں جب مسئلے میں کوئی اختلافی صورت موجود ہو، لیکن اس مقام پر خلاف عادت یہ اسلوب اختیار فرمایا ہے کیونکہ اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ واضح رہے کہ نماز کے لیے وہی نجاست باعث فساد ہے جسے نمازی خود اٹھائے، جبکہ مذکورہ صورت میں ایسا نہیں ہے۔

٣٧٩ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ عَنْ خَالِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ الشَّيْبَانِيُّ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ شَدَّادٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا حِذَاءَهُ وَأَنَا حَائِضٌ، وَرُبَّمَا أَصَابَنِي ثَوْبُهُ إِذَا سَجَدَ، قَالَتْ: وَكَانَ يُصَلِّي عَلَى الْخُمْرَةِ.

[راجع: ٣٣٣]

[379] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرماتے تھے جبکہ میں بحالت حیض آپ کے سامنے لیٹی ہوتی تھی۔ اور بسا اوقات آپ کا کپڑا سجدے کی حالت میں میرے بدن پر پڑ جاتا تھا۔ حضرت میمونہ ؓ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ کھجور کے چھوٹے مصلے پر نماز پڑھتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① صحت نماز کے لیے نمازی کے سجدے اور قیام کی جگہ کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر نماز کی جگہ پاک ہو تو

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 602. [2] صحيح البخاري، الأذان، حديث: 689. [3] صحيح البخاري، المرض، حديث: 5658.

قریب میں عورت کے لیٹے رہنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اگر نمازی کا کپڑا بھی عورت کے بدن سے لگتا رہے تو بھی کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ نجاست حکمی ہے حسی نہیں۔ حدیث میں صراحت ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بحالت حیض آپ کے قریب لیٹی رہتیں اور آپ نماز پڑھتے رہتے۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مدعا ثابت ہو گیا۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حائضہ عورت کی نجاست حکمی ہے، ذاتی نہیں کیونکہ حیض آنے سے اس کی ذات ناپاک نہیں ہو جاتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ دوران نماز میں اگر نمازی کا کپڑا یا اس کے بدن کا کوئی حصہ حائضہ سے چھو جائے تو اس سے نماز میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔ ہاں، اگر حقیقی نجاست نمازی کے بدن یا کپڑے کو لگ جائے تو صحت نماز کے لیے اس کا ازالہ ضروری ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوران نماز میں عورت کے سامنے ہونے سے نماز خراب نہیں ہوتی۔[1] ③ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ نمازی کے کپڑے کا کچھ حصہ اگر بیوی کے بدن سے لگ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ اسے لمس نساء ہی خیال کیا جائے کہ اس سے نماز ٹوٹ جاتی ہو۔ اس طرح نماز میں کوئی خلل نہیں آتا۔

(٢٠) بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْحَصِيرِ

باب:20- چٹائی پر نماز پڑھنے کا بیان

وَصَلَّى جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ وَأَبُو سَعِيدٍ فِي السَّفِينَةِ قَائِمًا. وَقَالَ الْحَسَنُ: تُصَلِّي قَائِمًا مَّا لَمْ تَشُقَّ عَلَى أَصْحَابِكَ تَدُورُ مَعَهَا وَإِلَّا فَقَاعِدًا.

حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا: اگر تمھارے رفقاء سفر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں مشقت محسوس نہ کریں تو کھڑے ہو کر نماز پڑھنی چاہیے بصورت دیگر بیٹھ کر نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر حال میں کشتی کے ساتھ قبلہ کی سمت گھومتے رہنا چاہیے۔

وضاحت: چٹائی پر اور کشتی میں نماز ادا کرنے میں قدر مشترک یہ ہے کہ جس طرح چٹائی زمین کا فرش ہوتی ہے اسی طرح کشتی پانی کا فرش ہے، پھر دونوں کا مادہ ایک ہی ہے، یعنی جس طرح چٹائی نباتی ہے اسی طرح کشتی بھی نباتی ہے کہ وہ تختوں سے بنائی جاتی ہے، اس لیے معنوی اور مادی مناسبت کی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ آثار کو چٹائی پر نماز پڑھنے کے عنوان میں بیان کر دیا ہے۔ حضرت جابر اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما کے اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (187/3) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔[2] علامہ ابن منیر نے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان آثار کو اس باب میں اس لیے بیان کیا ہے کہ چٹائی پر نماز اور کشتی میں نماز دونوں زمین کے علاوہ کسی دوسری چیز پر ہیں تاکہ یہ خیال نہ آئے کہ صرف زمین پر نماز کی ادائیگی ضروری ہے جیسا کہ آپ نے حضرت افلح رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''دوران نماز میں اپنے چہرے کو خاک آلود کر۔''[3] امام بخاری رحمہ اللہ نے ان آثار سے اس اشکال کو دور فرمایا ہے۔[4] یاد رہے کہ ترمذی کی مذکورہ روایت ضعیف ہے۔ دیکھیے: (ضعيف جامع الترمذي للألباني، حديث:381) علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ قوی مناسبت یہ ہے کہ جس طرح چٹائی زمین پر ہوتی ہے اس طرح کشتی پانی میں ہوتی

① فتح الباري: 633/1. ② فتح الباري: 634/1. ③ جامع الترمذي، الصلاة، حديث: 381. ④ المتواري: 84.

ہے، لہٰذا دونوں پر نماز درست ہے۔[1]

٣٨٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ؛ أَنَّ جَدَّتَهُ مُلَيْكَةَ دَعَتْ رَسُولَ اللهِ ﷺ لِطَعَامٍ صَنَعَتْهُ لَهُ، فَأَكَلَ مِنْهُ، ثُمَّ قَالَ: «قُومُوا فَلأُصَلِّي لَكُمْ». قَالَ أَنَسٌ: فَقُمْتُ إِلٰى حَصِيرٍ لَّنَا قَدِ اسْوَدَّ مِنْ طُولِ مَا لُبِسَ، فَنَضَحْتُهُ بِمَاءٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَصَفَفْتُ أَنَا وَالْيَتِيمُ وَرَاءَهُ، وَالْعَجُوزُ مِنْ وَّرَائِنَا، فَصَلّٰى لَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفَ. [انظر: ٧٢٧، ٨٦٠، ٨٧١، ١١٦٤]

[380] حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ ان کی دادی حضرت مُلَیکہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ کو کھانے کے لیے دعوت دی جو انھوں نے آپ کے لیے تیار کیا تھا۔ آپ نے اس سے کچھ تناول فرمایا، پھر فرمانے لگے: ''کھڑے ہو جاؤ میں تمھیں نماز پڑھاؤں۔'' حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایک چٹائی کو اٹھایا جو کثرت استعمال کی وجہ سے سیاہ ہو گئی تھی، اسے پانی سے دھویا۔ پھر رسول اللہ ﷺ اس پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اور ایک چھوٹے بچے نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی۔ فراغت کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

فوائد و مسائل: ① ابن بطال کی رائے کے مطابق اگر مصلّٰی بقدر قامت انسان ہو تو اسے حصیر کہتے ہیں، اس سے کم ہو تو اسے خمرہ کہا جاتا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ کی عادت ہے کہ وہ ان تمام افعال پر عنوانات قائم کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوں۔ اس مقام پر الصلاة على الحصير، اس کے بعد الصلاة على الخمرة اور الصلاة على الفراش اسی نوعیت کے ہیں۔ اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ چھوٹی یا بڑی چٹائی پر نماز ادا کرنا جائز ہے۔ البتہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کے متعلق بعض روایات ملتی ہیں کہ ان کے لیے مٹی لائی جاتی، اسے چٹائی پر رکھا جاتا، پھر آپ اس پر سجدہ کرتے۔ حضرت ابراہیم نخعی کے متعلق بھی مروی ہے کہ وہ بھی زمین پر سجدہ کرنے کو پسند کرتے تھے۔ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو یہ ان حضرات کے انتہائی عجز و انکسار اور تواضع پر محمول کی جائیں گی۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ چٹائی پر نماز ادا کرنے کو درست خیال نہیں کرتے تھے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ سے چٹائی پر نماز پڑھنا ثابت ہے تو اس کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جب کہ آپ سے زیادہ تواضع اور خشوع بھی کسی میں نہیں ہو سکتا بلکہ سعید بن مسیّب نے تو چٹائی پر نماز ادا کرنے کو سنت قرار دیا ہے۔[2] ② شریح بن ہانی نے حضرت عائشہ ؓ سے سوال کیا کہ آیا رسول اللہ ﷺ چٹائی پر نماز پڑھا کرتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے چٹائی بنایا ہے؟ اس پر حضرت عائشہ ؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ چٹائی پر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ امام بخاری ؒ نے اس عنوان میں اس حدیث کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اگر مذکورہ روایت صحیح ہے تو شاذ ہونے کی وجہ سے قابل حجت نہیں کیونکہ اس سے زیادہ قوی روایات اس کے معارض ہیں جیسا کہ حضرت انس ؓ کی روایت جسے امام بخاری

---

[1] عمدة القاري: 336/3. [2] شرح ابن بطال: 43/2.

نے بیان فرمایا ہے بلکہ خود حضرت عائشہ ؓ سے مروی ہے جیسا کہ آئے گا کہ نبی ﷺ کی ایک چٹائی تھی جسے آپ بچھا کر بیٹھتے اور بوقت ضرورت اس پر نماز ادا کرتے۔[1] ③ اس کے علاوہ حضرت ابوسعید خدری ؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو چٹائی پر نماز ادا کرتے دیکھا ہے۔[2]

(٢١) بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْخُمْرَةِ

باب:21- چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھنے کا بیان

وضاحت: خمرہ اس چٹائی کو کہتے ہیں کہ اگر اس پر سجدہ کیا جائے تو کھڑے ہونے کی جگہ باقی نہ بچے اور اگر اس پر کھڑے ہو جائیں تو اس پر سجدہ نہ ہو سکے۔ اس کا مقصد بحالت سجود ہاتھ اور پیشانی کا تحفظ ہوتا ہے۔ امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر نمازی چٹائی پر نماز ادا کرے تو ضروری نہیں کہ اس کا ہر جز چٹائی ہی پر ہو بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ کچھ حصہ چٹائی پر ہو اور کچھ حصہ زمین پر۔ دونوں طرح نماز جائز ہے۔

٣٨١ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ الشَّيْبَانِيُّ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ شَدَّادٍ، عَنْ مَيْمُونَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي عَلَى الْخُمْرَةِ. [راجع: ٣٣٣]

[381] حضرت میمونہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ چھوٹی چٹائی پر نماز ادا کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری ؒ ان عنوانات سے ایک شبہے کا ازالہ فرمانا چاہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ میرے لیے مٹی کو مسجد اور طہور بنا دیا گیا ہے، اسی طرح ایک صحابی نے سجدے کے لیے پھونک مار کر مٹی کو اڑانا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کر بلکہ اپنی پیشانی کو خاک آلود کر۔ ان روایات سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید مٹی کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ جائز نہیں۔ امام بخاری ؒ اس کی نفی کر رہے ہیں کہ زمین پر سجدہ ضروری نہیں بلکہ بوریا، چٹائی اور دوسرے کسی بھی طرح کے پاک فرش پر سجدہ کرنا جائز ہے۔ ② اس روایت سے پہلے حضرت میمونہ ؓ کی حدیث میں خمرہ پر نماز پڑھنے کا ذکر آ چکا تھا، یہاں مستقل عنوان قائم کر کے اس حدیث کو پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری کا مقصد اختلاف سند، استخراج مسائل اور مقصود شیخ کا بیان ہے کہ ہر شیخ کا حدیث بیان کرنے کا الگ مقصد ہوتا ہے۔ اس سے پہلے امام بخاری کے شیخ مسدد نے اس حدیث کو مطول بیان کیا تھا اور اب ان کے دوسرے شیخ ابوالولید نے اپنے خاص مقصد کے پیش نظر اسے اتنا ہی مختصر بیان کیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پہلے یہ مسئلہ ضمناً معلوم ہوا تھا، یہاں اہمیت کے پیش نظر اسے مستقل عنوان کے تحت لائے ہیں۔ واللہ أعلم. ③ امام بخاری ؒ کا اس تالیف سے مقصود جمع احادیث ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اختلاف سند، استنباط مسائل اور استخراج احکام بھی ہے، پھر کہیں تفصیل اور کہیں اختصار پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ الصلاة علی النفساء کے عنوان میں حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے مروی ایک حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نفاس والی

---

① فتح الباري: 636/1. ② صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1159(519).

عورت کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے درمیان میں کھڑے ہوئے۔ پھر اس کے بعد ایک مستقل عنوان قائم کیا، یعنی عورت کے جنازے میں کہاں کھڑا ہونا چاہیے؟ اس عنوان کے ثبوت کے لیے پھر حدیث سمرہ پیش کی لیکن اس کی سند دوسری لائے ہیں۔ اس باب میں مستقل طور پر بیان فرمایا کہ اگر میت عورت ہو تو اس کے جنازے کے لیے درمیان میں کھڑا ہونا چاہیے۔ واللہ أعلم.

(٢٢) بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْفِرَاشِ

باب:22- بستر پر نماز پڑھنا

وَصَلّٰى أَنَسٌ عَلٰى فِرَاشِهِ وَقَالَ أَنَسٌ: كُنَّا نُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَيَسْجُدُ أَحَدُنَا عَلٰى ثَوْبِهِ.

حضرت انس ؓ نے اپنے بستر پر نماز پڑھی، نیز حضرت انس ؓ نے فرمایا: ہم نبی ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے تھے تو ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے پر سجدہ کر لیتا تھا۔

وضاحت: فراش ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو زمین پر بچھائی جائے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، دری ہو یا قالین، گدا ہو یا لحاف۔ پہلے حصیر اور خمرہ کا جواز بتلایا تھا اب مزید توسع فرماتے ہیں کہ کسی بھی پاک چیز کو زمین پر بچھا کر نماز پڑھی جا سکتی ہے، اس کے لیے جنس ارض ہونا ضروری نہیں، چنانچہ حضرت انس ؓ کے متعلق روایات میں ہے کہ انھوں نے اپنے بستر پر نماز پڑھی تھی۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ (129/2) وغیرہ نے موصولاً بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح حضرت انس ؓ کے دوسرے اثر کو خود امام بخاری ؒ آئندہ موصولاً بیان کریں گے۔

٣٨٢ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ أَبِي النَّضْرِ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَرِجْلَايَ فِي قِبْلَتِهِ، فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَقَبَضْتُ رِجْلَيَّ، فَإِذَا قَامَ بَسَطْتُهُمَا. قَالَتْ: وَالْبُيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيهَا مَصَابِيحُ.

[انظر: ٣٨٣، ٣٨٤، ٥٠٨، ٥١١، ٥١٢، ٥١٣، ٥١٤، ٥١٥، ٥١٩، ٩٩٧، ١٢٠٩، ٦٢٧٦]

[382] نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی ہوتی تھی جبکہ میرے دونوں پاؤں آپ کے سجدے کی جگہ ہوتے۔ جب آپ سجدہ کرتے تھے تو مجھے دبا دیتے اور میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی۔ پھر جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں انھیں دراز کر لیتی۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

٣٨٣ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي، وَهِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، عَلٰى

[383] حضرت عائشہ ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اہل کے بستر پر نماز پڑھتے جبکہ وہ خود آپ کے اور قبلے کے درمیان جنازے کی طرح لیٹی ہوتی تھیں۔

فِرَاشِ أَهْلِهِ، اِعْتِرَاضَ الْجَنَازَةِ. [راجع: ٣٨٢]

٣٨٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ، عَنْ عِرَاكٍ، عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي، وَعَائِشَةُ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، عَلَى الْفِرَاشِ الَّذِي يَنَامَانِ عَلَيْهِ. [راجع: ٣٨٢]

[384] حضرت عروہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھتے تھے جبکہ حضرت عائشہ ؓ آپ کے اور قبلے کے درمیان اس بستر پر لیٹی رہتیں جس پر یہ دونوں سوتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے اس باب میں ثابت کیا ہے کہ جس طرح نماز زمین یا اس کی جنس پر درست ہے غیر جنس ارض پر بھی درست ہے، خواہ وہ بستر ہو یا اور کوئی فرش، قطع نظر اس سے کہ وہ بہترین ہو یا گھٹیا۔ چونکہ بعض اسلاف سے ان پر نماز پڑھنے کا انکار ثابت ہے، وہ عمدہ قالین یا وہ بستر جس میں روئی زیادہ ہو ان پر نماز ادا کرنا مکروہ قرار دیتے تھے، اس لیے امام بخاری ؒ نے یہ روایت لا کر ان کے موقف کی تردید ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اگرچہ بعض حضرات تاویل کرتے ہیں کہ پاؤں کو دباتے وقت اس پر کپڑا ہوتا تھا لیکن یہ تاویل بعید ہے۔ پہلی حدیث میں بستر پر نماز پڑھنے کی صراحت نہ تھی، اس لیے دوسری روایت پیش کی کہ آپ بستر پر نماز پڑھتے تھے۔ اگرچہ ام المومنین عائشہ ؓ کے آگے لیٹنے میں اشارہ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ سونے کے بستر پر نماز پڑھ رہے تھے، تاہم تیسری روایت میں اس کی بھی صراحت موجود ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پیشانی زمین پر رکھنا ضروری نہیں۔ البتہ پاؤں کا جمانا اور ہاتھوں اور پیشانی کا کسی پاک چیز پر ٹکانا ضروری ہے۔ ہاں، ایسے بستر یا قالین جو زیب و زینت کی وجہ سے دل کو اپنی طرف متوجہ کر دیں ان پر نماز ادا کرنا پسندیدہ نہیں، تاہم اگر ان پر نماز پڑھ لی جائے تو فرض ادا ہو جائے گا۔ حضرت عائشہ ؓ اپنے اس معمول کے متعلق ایک عذر پیش کرتی ہیں کہ اس وقت مکانوں میں چراغ نہ تھے کیونکہ چراغ ہونے کی صورت میں مجھے پتہ چل جاتا کہ آپ کس وقت سجدے میں جا رہے ہیں اس وقت میں خود ہی پاؤں سمیٹ لیتی لیکن اندھیرے کے سبب کچھ نظر ہی نہ آتا تھا، اس لیے آپ کو پاؤں دبانے کی ضرورت پیش آتی۔ ② بعض احادیث کے مطابق حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے بستروں میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔[1] امام بخاری ؒ نے یہ روایت پیش کر کے اس کے ضعف کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ امام ابوداود ؒ نے اس روایت کے بعد اس کے ناقابل حجت ہونے کی علت بھی بیان کی ہے۔ اگر ایسی روایات صحیح ہیں تو امام بخاری ؒ کی پیش کردہ روایات کے مقابلے میں وہ شاذ اور مردود قرار پائیں گی۔[2] ③ ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سوئے ہوئے آدمی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مکروہ نہیں بلکہ جائز ہے۔

(٢٣) بَابُ السُّجُودِ عَلَى الثَّوْبِ فِي شِدَّةِ الْحَرِّ

باب: 23- سخت گرمی کے سبب کپڑے پر سجدہ کرنا

① سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 368. ② فتح الباري: 637/1.

وَقَالَ الْحَسَنُ: كَانَ الْقَوْمُ يَسْجُدُونَ عَلَى الْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِي كُمِّهِ.

حضرت حسن بصری ؒ فرماتے ہیں: صحابۂ کرام پگڑی اور ٹوپی پر سجدہ کیا کرتے تھے، جبکہ ان کے ہاتھ ان کی آستین میں ہوتے تھے۔

وضاحت: امام بخاری ؒ نے سخت گرمی کا ذکر الفاظ حدیث کی رعایت سے کیا ہے کیونکہ اگر زمین شدت گرمی سے تپ رہی ہو یا سخت سردی کی وجہ سے برف بن گئی ہو تو دونوں صورتوں میں زمین میں کپڑا ڈالنے کی اجازت ہے، خواہ زمین پر کپڑا ڈال لیا جائے یا پیشانی پر کپڑا ڈال کر سجدہ کر لیا جائے، خواہ کپڑا الگ سے بچھایا جائے یا پہنے ہوئے کپڑے کا خاص حصہ زمین پر بچھا دیا جائے۔ حضرت حسن بصری ؒ کے اثر کو محدث عبدالرزاق نے اپنی مصنف (400/1) میں باسند بیان کیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ صحابۂ کرام ؓ جب سجدہ کرتے تھے تو ان کے ہاتھ ان کے کپڑوں میں ہوتے اور کچھ حضرات تو اپنی پگڑی اور ٹوپی پر سجدہ کرتے۔ اس اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (117/2) میں بھی موصولاً بیان کیا گیا ہے۔[1] ہاتھ کے آستین میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ گرمی سے پیشانی کی حفاظت تو پگڑی یا ٹوپی سے کی جاتی اور ہاتھوں کی حفاظت آستین سے کی جاتی، یعنی آستین کو آگے بڑھا کر اس پر ہاتھ رکھ لیے جاتے۔ چونکہ عمامہ اور ٹوپی ثوب ملبوس ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ثوب ملبوس پر بھی سجدے کی اجازت ہے۔

٣٨٥ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ قَالَ: حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ قَالَ: حَدَّثَنَا غَالِبٌ الْقَطَّانُ عَنْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ، عَنْ أَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَيَضَعُ أَحَدُنَا طَرَفَ الثَّوْبِ مِنْ شِدَّةِ الْحَرِّ فِي مَكَانِ السُّجُودِ. [انظر: ٥٤٢، ١٢٠٨]

[385] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ہم نبی ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھا کرتے تھے تو ہم میں سے کوئی شخص سخت گرمی کی وجہ سے سجدے کی جگہ پر اپنے کپڑے کا کنارہ بچھا لیتا تھا۔

فوائد و مسائل: ① جمہور محدثین کے نزدیک طرف الثوب کے یہی معنی ہیں کہ صحابۂ کرام ؓ ثوب ملبوس کے فاضل حصے پر سجدہ کرتے تھے۔ ② امام شافعی ثوب ملبوس کے فاضل حصے پر سجدے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ایسا کپڑا نمازی کے ساتھ نماز میں شامل ہے گویا وہ نمازی کے بدن کا حصہ ہے، اس لیے ایسے ثوب ملبوس پر سجدہ زمین پر سجدہ نہیں بلکہ اپنے حصے پر سجدہ ہے جس کی اجازت نہیں۔ ان کے نزدیک طرف الثوب سے مراد یا تو وہ کپڑا ہے جو نمازی کے بدن پر نہ ہو اگر بدن پر ہو تو وہ اتنی گنجائش رکھتا ہو کہ اس کا سجدے کی جگہ پر ڈالا گیا حصہ نمازی کی حرکت سے متحرک نہ ہو، لیکن جمہور کے نزدیک سجدے میں نمازی کا پہنا ہوا کپڑا اور دوسرے کپڑے میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اس دور میں صحابۂ کرام ؓ کی مجموعی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس تو پہننے کے کپڑے بھی پورے نہ تھے چہ جائیکہ فاضل کپڑے ہوں جنھیں محل سجود میں ڈال لیا کریں اور نہ بدن کے کپڑے میں اتنی کشادگی کا

[1] فتح الباري: 639/1.

امکان ہی ہے کہ نمازی کی حرکت سے وہ متحرک نہ ہو، اس لیے یہ فرق قابل قبول نہیں۔ عنوان میں حضرت حسن بصری کے اثر سے جمہور کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔

(٢٤) بَابُ الصَّلَاةِ فِي النِّعَالِ

باب: 24- جوتوں سمیت نماز پڑھنا

وضاحت: قبل ازیں بیان ہوا تھا کہ پیشانی اعضائے سجدہ سے ہے، اس لیے سجدہ کرتے وقت اگر اس کے اور زمین کے درمیان کوئی چیز حائل ہو جائے، مثلاً: کپڑا وغیرہ تو سجدہ صحیح ہے۔ اب بیان کیا جا رہا ہے کہ پاؤں بھی اعضائے سجدہ سے ہیں، اگر ان کے اور زمین کے درمیان جوتا وغیرہ حائل ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟[1]

٣٨٦ - حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنَا أَبُو مَسْلَمَةَ سَعِيدُ بْنُ يَزِيدَ الْأَزْدِيُّ قَالَ: سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ: أَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي فِي نَعْلَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ. [انظر: ٥٨٥٠]

[386] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ان سے دریافت کیا گیا: کیا نبی ﷺ جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں پڑھ لیتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے تو تأدبا فرمان الٰہی صادر ہوا: ﴿اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ ''بلاشبہ میں تمھارا رب ہوں، یقیناً (اس وقت) تم مقدس وادی طویٰ میں ہو، لہٰذا اپنے جوتے اتار لو۔''[2] یہود نے اس حکم کو مطلق طور پر ممانعت پر محمول کیا جس کی بنا پر ان کے نزدیک کسی بھی صورت میں جوتوں سمیت نماز درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود کی اس شدت کی اصلاح کرتے ہوئے مطلق جواز کو باقی رکھا اور فرمایا کہ یہود کی مخالفت کرو اور جوتوں میں نماز پڑھو۔[3] لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جوتے پاک ہوں کیونکہ ناپاکی کی صورت میں انھیں پہن کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اگر انھیں نجاست لگی ہو تو دھونے کے بجائے صرف پاک مٹی سے صاف کر لینا ہی کافی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ جوتوں سمیت نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک دوران نماز میں انھیں اتار دیا۔ آپ کی اتباع میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جوتے اتار دیے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جوتے اتارنے کی وجہ دریافت فرمائی۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم نے تو آپ کی اتباع میں اتارے ہیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے بتایا تھا کہ آپ کے جوتوں میں نجاست لگی ہوئی ہے، اس لیے میں نے انھیں اتار دیا، لہٰذا تم میں سے جب کوئی نماز کے لیے مسجد میں آئے تو اپنے جوتوں کو دیکھ لے، اگر نجاست آلود ہوں تو انھیں صاف کر کے ان میں نماز پڑھ لے۔[4] ② جوتے پہن کر نماز پڑھنے کی رخصت ضرور ہے لیکن اسے درجۂ استحباب دے کر دیدہ دانستہ صاف ستھری مساجد میں جوتوں سمیت نماز ادا کرنے پر اصرار انتہا پسندی ہے۔ ہمارے بعض شدت پسند نوجوان اسے ''مردہ سنت'' خیال کر کے اس کے احیا کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس فکری غلطی کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ شریعت نے اس عمل کو صرف جائز قرار دیا ہے، بذات خود یہ مطلوب نہیں۔ صرف یہود

① فتح الباري: 640/1. ② طٰهٰ 12:20. ③ سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 652. ④ سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 650.

کے عمل سے اختلاف ظاہر کرنے کی صورت میں اسے استحباب کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ عمل رخصت ضرور ہے لیکن اسے مستحب نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ نماز کے لیے یہ عمل بذات خود مطلوب نہیں۔ جوتا پہننا اگرچہ ملابس زینت سے ہے لیکن زمین پر چلتے وقت ان کے نجاست آلود ہونے کی وجہ سے انھیں رتبۂ مطلوب حاصل نہیں ہو سکا اور جب مصلحت تحسین اور ازالۂ نجاست کا تعارض ہو تو ازالۂ نجاست کی رعایت کرتے ہوئے انھیں جلب مصالح کے بجائے دفع مفاسد ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی خاص دلیل آ جائے جس کے پیش نظر اس کا تجمل راجح قرار پائے تو اس قیاس کا ترک صحیح ہو سکتا ہے، البتہ مخالفت یہود کے پیش نظر اسے استحباب پر محمول کیا جا سکتا ہے، بصورت دیگر یہ عمل صرف مباح اور جواز کی حد تک صحیح ہے۔[1] عہد نبوی میں مساجد کی حالت اور اس وقت کے جوتوں کی نوعیت اور ہمارے دور کی بود و باش اور طرز معاشرت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقل ایک عنوان قائم کیا ہے کہ حالات وظروف کے پیش نظر بعض اوقات اپنے کسی پسندیدہ عمل کو ترک بھی کیا جا سکتا ہے۔[2] ③ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعا ایک روایت نقل کی ہے کہ [خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ] کی تفسیر یہ ہے کہ جوتوں سمیت نماز پڑھو، لیکن روایت ذکر کرنے کے بعد اس کی صحت کو محل نظر قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند انتہائی کمزور ہے۔[3]

(٢٥) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الْخِفَافِ

باب: 25- موزے پہن کر نماز پڑھنا

وضاحت: روافض کے نزدیک وضو کرتے وقت موزوں کے بغیر پاؤں پر مسح کرنا ضروری ہے جب کہ خوارج موزوں پر بھی مسح کی اجازت نہیں دیتے، ان کے نزدیک ہر حالت میں پاؤں دھونا ضروری ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس افراط وتفریط سے بالا ہو کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موزوں کی حالت میں پاؤں پر مسح کیا جا سکتا ہے اور ان میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

٣٨٧ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ قَالَ: سَمِعْتُ إِبْرَاهِيمَ يُحَدِّثُ عَنْ هَمَّامِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ: رَأَيْتُ جَرِيرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ بَالَ، ثُمَّ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ، ثُمَّ قَامَ فَصَلَّى، فَسُئِلَ فَقَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ صَنَعَ مِثْلَ هٰذَا.

قَالَ إِبْرَاهِيمُ: فَكَانَ يُعْجِبُهُمْ لِأَنَّ جَرِيرًا كَانَ مِنْ آخِرِ مَنْ أَسْلَمَ.

[387] ہمام بن حارث سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے ایک دفعہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، انھوں نے پیشاب کیا، پھر وضو فرمایا تو اپنے موزوں پر مسح کیا۔ پھر وہ کھڑے ہوئے اور (موزوں سمیت) نماز ادا کی۔ ان سے اس کی بابت پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اہل علم حضرات کو یہ حدیث بہت پسند تھی کیونکہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ آخر میں اسلام لائے تھے۔

---

1 فتح الباري: 640/1. 2 صحيح البخاري، كتاب العلم، باب: 48. 3 فتح الباري: 640/1.

٣٨٨ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُسْلِمٍ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ: وَضَّأْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَمَسَحَ عَلَى خُفَّيْهِ وَصَلَّى. [راجع: ١٨٢]

[388] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو وضو کرایا تو آپ نے موزوں پر مسح کیا اور نماز پڑھی۔

فوائد ومسائل: ① شیعہ حضرات کے نزدیک موزوں پر مسح کرنا اور انھیں پہن کر نماز پڑھنا درست نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت فرمایا کہ موزے پہن کر نماز پڑھنا درست ہے۔ گرمی اور سردی سے پاؤں کی حفاظت کا یہ دوسرا طریقہ ہے کہ زمین اور پاؤں کے درمیان موزوں کو حائل کر دیا جائے۔ سورۂ مائدہ میں آیت وضو کے نزول کے بعد بعض صحابہ کو شبہ ہو گیا تھا کہ شاید اب مسح کی اجازت منسوخ ہو چکی ہے اور پاؤں ہر حالت میں دھونے پڑیں گے۔ جب حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ بیان کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ مسح کا حکم تو نزول سورۂ مائدہ سے پہلے کا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تو اسلام ہی سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد لایا ہوں۔ بعض روایات میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اسلام لائے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ حضرات نے جو آیت مائدہ کا مفہوم اس طرح متعین کیا ہے کہ پاؤں پر ہر حالت میں مسح کرنا چاہیے، یہ سراسر غلط ہے۔ اسی طرح خوارج کا تشدد بھی درست نہیں۔ ② محمد بن حوشب کہتے ہیں کہ میں نے جب حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو موزوں پر مسح کر کے ان میں نماز پڑھتے دیکھا، نیز سوال کرنے پر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق اپنا مشاہدہ بیان کیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ یہ مشاہدہ نزول سورۂ مائدہ سے پہلے کا ہے یا بعد کا؟ انھوں نے فرمایا: میں تو مسلمان ہی نزول سورۂ مائدہ کے بعد ہوا ہوں۔[2] اس حدیث پر امام ترمذی بایں الفاظ تبصرہ کرتے ہیں: اس حدیث نے خوب وضاحت کر دی ہے کیونکہ جو لوگ موزوں پر مسح کرنے کا انکار کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ موزوں پر مسح کی رخصت نزول سورۂ مائدہ سے پہلے تھی لیکن حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے نبی ﷺ کو نزول مائدہ کے بعد موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کے عمل سے وضاحت ہو گئی کہ سورۂ مائدہ میں وضو کے وقت پاؤں دھونے کا جو ذکر ہے، اس سے موزوں پر مسح کرنے کا عمل منسوخ نہیں ہوا، بلکہ یہ حکم آخر وقت تک باقی رہا۔

نوٹ: حدیث مغیرہ بن شعبہ سے متعلقہ دیگر فوائد گزشتہ حدیث: 182 میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

(٢٦) بَابٌ: إِذَا لَمْ يُتِمَّ السُّجُودَ

باب: 26- جب نمازی سجدے کو پورے طور پر ادا نہ کرے

وضاحت: اتمام سجدہ کا تعلق کیفیت صلاۃ سے بھی ہے کہ سجدہ کس شان سے ادا ہونا چاہیے، چنانچہ اس کا ذکر آئندہ کتاب الاذان، باب: 132 میں آئے گا۔ وہاں بھی انھی الفاظ سے عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کا تعلق شرائط صلاۃ سے بھی ہے، یعنی سجدے میں تمکن علی الارض ہونا ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس جگہ یہ مسئلہ شرائط کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ اسے تکرار یا

① فتح الباري: 641/1. ② جامع الترمذي الطهارة، حديث: 94.

سہو قلم خیال نہ کیا جائے۔

٣٨٩ - أَخْبَرَنَا الصَّلْتُ بْنُ مُحَمَّدٍ: أَخْبَرَنَا مَهْدِيٌّ عَنْ وَاصِلٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ، عَنْ حُذَيْفَةَ أَنَّهُ رَأَى رَجُلًا لَا يُتِمُّ رُكُوعَهُ وَلَا سُجُودَهُ، فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ قَالَ لَه حُذَيْفَةُ: مَا صَلَّيْتَ؟ قَالَ: وَأَحْسِبُهُ قَالَ: لَوْ مُتَّ مُتَّ عَلَى غَيْرِ سُنَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ. [انظر: ٧٩١، ٨٠٨]

[389] حضرت حذیفہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی نماز میں رکوع اور سجدے کو مکمل طور پر ادا نہیں کر رہا تھا۔ جب یہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو حضرت حذیفہ ؓ نے اس سے فرمایا: تمھاری نماز نہیں ہوئی۔ راوی (ابووائل) کہتے ہیں: میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت حذیفہ ؓ نے اس سے یہ بھی فرمایا: اگر تمھیں (اسی حالت میں) موت آ گئی تو تم محمد ﷺ کے طریقے پر نہیں مرو گے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ نماز کے ارکان میں تمامیت کا ضرور خیال رکھا جائے۔ اگر نماز کی حفاظت و تمامیت کے لیے پیشانی کے نیچے کپڑا اور پاؤں کے لیے جوتوں یا موزوں کی ضرورت ہو تو انھیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سجدے کی صحت کا مدار اعضاء پر ہے، یعنی پیشانی اور قدم اگر زمین پر ٹھہرے ہوئے ہوں تو سجدہ صحیح ہوگا، اس کے برعکس اگر پیشانی زمین پر لگی ہوئی نہیں یا قدم زمین سے اٹھے ہوئے ہیں تو سجدہ نہیں ہوگا۔ گویا امام بخاری ؒ نے اس باب میں پچھلے ابواب کی وجہ بیان کی ہے۔ ② حافظ ابن حجر ؒ نے اس باب کے ذکر کو یہاں بے محل قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ باب بظاہر ناسخین اور ناقلین کی غلطی سے درج ہو گیا ہے کیونکہ مستملی کے نسخے میں اس جگہ یہ باب نہیں ہے اور مستملی ہی تمام ناقلین میں زیادہ حفظ و اتقان والے ہیں۔ اس کا اصل مقام صفة الصلاة ہے۔ ویسے ابواب ستر العورة میں اس باب کو لانے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اگر نمازی کسی شرط کو ترک کر دے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی جیسا کہ کسی رکن کو ترک کرنے سے نماز صحیح نہیں ہوتی۔[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ فربری کی روایت کے مطابق صحیح بخاری کے کچھ اوراق کتاب سے علیحدہ تھے۔ بعض ناسخین سے غلطی ہوئی کہ انھوں نے ان اوراق کو ایسی جگہوں سے ملحق کر دیا جہاں مصنف نے الحاق نہیں کیا تھا۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ باب اور اس سے ملحق باب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے کہ ناسخین کی غلطی سے دوسری جگہ لگ گئے ہیں، اس لیے کہ یہ مسائل دراصل ابواب صفة الصلاة سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ناسخین کی غلطی سے اوراق کا ردوبدل نہیں ہوا بلکہ امام بخاری ؒ نے قصداً ایسا کیا ہے جیسا کہ ہم نے اس کی توجیہ بیان کی ہے۔ ③ امام بخاری ؒ سے صحیح بخاری کو نوے ہزار علماء نے سنا ہے لیکن اسے مرتب کرنے والے صرف چار اہل علم ہیں: ٭ شیخ ابراہیم بن معقل نسفی ٭ شیخ حماد بن شاکر نسوی ٭ محمد بن یوسف فربری ٭ شیخ ابوطلحہ منصور بن طلحہ بزدوی۔ ہمارے سامنے فربری والا نسخہ ہے۔ اس نسخے کی ان سے بلاواسطہ روایت کرنے والے مستملی اور کشمیهني ہیں اور بالواسطہ روایت کرنے والے اصیلی اور مروزی ہیں۔ ان سب سے مستملی کے نسخے کو ان کے احفظ ہونے کی بنا پر ترجیح ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے۔[2]

1 فتح الباري: 642/1. 2 فتح الباري: 642/1.

(٢٧) بَابٌ : يُبْدِي ضَبْعَيْهِ وَيُجَافِي فِي السُّجُودِ

باب: 27- نمازی دوران سجدہ میں بازوؤں کو کشادہ کرے اور انھیں اپنے پہلوؤں سے الگ رکھے

وضاحت: ستر عورۃ کے ابواب کے آخر میں اس باب کو اس لیے رکھا گیا ہے کہ ستر عورۃ تو ضروری ہے لیکن دوران سجدہ میں بازوؤں کو اپنے پہلوؤں سے الگ رکھنا نہ تو خلاف سنت ہے اور نہ ستر عورۃ کے منافی ہے۔[1]

٣٩٠ - أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا بَكْرُ ابْنُ مُضَرَ عَنْ جَعْفَرٍ، عَنِ ابْنِ هُرْمُزَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ مَالِكٍ ابْنِ بُحَيْنَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَلَّى فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتَّى يَبْدُوَ بَيَاضُ إِبْطَيْهِ.

[390] حضرت عبداللہ بن مالک ابن بُحَیْنَہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے ہاتھوں کو کشادہ رکھتے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نمایاں طور پر ظاہر ہوتی۔

وَقَالَ اللَّيْثُ: حَدَّثَنِي جَعْفَرُ بْنُ رَبِيعَةَ نَحْوَهُ. [انظر: ٨٠٧، ٣٥٦٤]

لیث کہتے ہیں: جعفر بن ربیعہ نے مجھ سے اس طرح کی روایت بیان کی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں اتمام سجدہ کی مزید تشریح کر رہے ہیں کہ سجدہ کرتے وقت ہاتھوں کو کشادہ اور انھیں پہلوؤں سے الگ رکھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اسی انداز سے کرتے تھے، نیز دوران سجدہ میں اپنی کہنیوں کو پہلوؤں سے الگ رکھتے۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بوقت سجدہ جسم کے تمام اعضاء سجدہ کرتے ہیں۔ اگر جسم کو سمیٹ کر اور اعضائے جسم کو آپس میں ملا کر سجدہ کیا جائے تو سب اعضاء سمٹ کر ایک ہی عضو کی شکل اختیار کر جائیں گے اور ہر عضو کو مستقل طور پر سجدے کا حصہ نہیں مل سکے گا جو شریعت کو مطلوب ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بندہ جب سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضائے جسم بھی سجدہ کرتے ہیں: چہرہ، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ چہرے کی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں۔[2] یہی وجہ ہے کہ دوران سجدہ میں افتراشِ ذراعین (بازوؤں کو بچھانے) کی ممانعت آئی ہے۔ واللہ أعلم۔ ② حضرت بُحَیْنَہ رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام ہے اور حضرت مالک رضی اللہ عنہ ان (عبداللہ) کے والد کا نام ہے۔ عام دستور سے ہٹ کر حضرت عبداللہ کا انتساب ماں باپ دونوں کی طرف کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالک کے آخر میں تنوین پڑھی جاتی ہے اور ابن بُحَیْنَہ میں ابن کے الف کو لکھنا چاہیے کیونکہ اس مقام پر ابن، مالک کی صفت نہیں۔[3] ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے آخر میں ایک تعلیق بیان کی ہے جسے امام مسلم نے موصولاً بیان کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو بازوؤں سے دور رکھتے یہاں تک کہ میں آپ کی بغلوں کی سفیدی کو دیکھ لیتا۔[4] اس تعلیق کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حدیث مذکور میں بکر نامی راوی نے اپنے شیخ جعفر بن ربیعہ سے بصیغۂ عن بیان کیا تھا اور لیث

① فتح الباري: 642/1. ② سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 891-892. ③ عمدة القاري: 356/3. ④ صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1106(495).

نے ان سے تحدیث کی صراحت کی ہے، نیز اس روایت میں لفظ سجدہ کی صراحت نہ تھی بلکہ [إِذَا صَلَّى] کے الفاظ تھے جبکہ لیث کی روایت میں [إِذَا سَجَدَ] کی صراحت ہے۔ واضح رہے کہ امام بخاری ؒ نے خود بھی ایک روایت میں [إِذَا سَجَدَ] کے الفاظ نقل کیے ہیں۔[1]

(۲۸) بَابُ فَضْلِ اسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ

باب: 28- دوران نماز میں قبلہ رو کھڑے ہونے کی فضیلت

يَسْتَقْبِلُ بِأَطْرَافِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ قَالَهُ أَبُو حُمَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ.

نمازی اپنے پاؤں کی انگلیوں کا رخ بھی قبلے کی طرف رکھے۔ اس کو حضرت ابو حمید ساعدی ؓ نے نبی ﷺ سے بیان کیا ہے۔

وضاحت: امام بخاری ؒ احکام ستر اور اس کی اقسام بیان کرنے کے بعد ایک مزید شرط استقبال قبلہ کے متعلق بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرضیت استقبال کے ساتھ اس امر کی بھی فضیلت بتائی کہ استقبال قبلہ جمیع اعضائے جسم سے جس قدر بھی زیادہ ہو سکے کرنا چاہیے حتی کہ حالت سجدہ اور تشہد میں بھی پاؤں کی انگلیوں کو قبلے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت ابو حمید ساعدی ؓ کی حدیث کا حوالہ دیا ہے جسے آئندہ موصولاً بیان کریں گے۔[2] واضح رہے کہ امام بخاری ؒ اس ضمن میں مساجد کے احکام بھی بیان کریں گے کیونکہ جو شخص نماز شروع کرنا چاہتا ہے اس کے لیے سب سے پہلے ستر عورۃ پھر استقبال قبلہ ضروری ہے۔ چونکہ فرض نماز کی ادائیگی مساجد میں مطلوب ہے، اس لیے ان کے احکام بھی بیان ہوں گے۔

٣٩١ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ الْمَهْدِيِّ قَالَ: حَدَّثَنَا مَنْصُورُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ مَيْمُونِ بْنِ سِيَاهٍ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا، فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللهِ وَذِمَّةُ رَسُولِهِ، فَلَا تُخْفِرُوا اللهَ فِي ذِمَّتِهِ». [انظر: ٣٩٢، ٣٩٣]

[391] حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلے کی طرف منہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ ایسا مسلمان ہے جسے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے، لہذا تم اللہ کے ذمے میں خیانت (بدعہدی) نہ کرو۔“

فوائد و مسائل: ① اس حدیث میں استقبال قبلہ کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، وہ اس طرح کہ جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہماری نماز میں رکوع بھی ہے، سجدہ بھی ہے اور قبلے کی طرف منہ بھی لیکن اس ضمنی تذکرے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ استقبال قبلہ کو مستقل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کی خصوصی فضیلت اور اہمیت معلوم ہوگئی اور اس حقیقت پر تنبیہ ہوگئی کہ قبلے کا

1 صحیح البخاري، المناقب، حدیث: 3564. 2 صحیح البخاري، الأذان، حدیث: 828.

استقبال مستقل طور پر مطلوب ہے۔[1] اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اہل قبلہ کا لقب اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ نماز اور استقبال قبلہ مذہبی امتیاز ہے کیونکہ دوسرے مذاہب میں اوّل تو نماز ہماری نماز کی طرح نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کی نماز میں استقبال قبلہ نہیں۔ تیسرا امتیاز ذبیحہ کا کھانا ہے جو معاشرتی امتیاز ہے کیونکہ دیگر اہل مذاہب ہمارا ذبیحہ استعمال نہیں کرتے۔ گویا یہ تینوں چیزیں مسلمانوں کے لیے شعار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر کوئی ایسی چیز ظاہر نہ ہو جس کے اختیار کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ان چیزوں کے اختیار کرنے والے کو مسلمان سمجھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہ تین چیزیں ہی مسلمان ہونے کے لیے کافی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کو جو لوگ دین کی دوسری ضروریات کے ساتھ ان امتیازات کو قائم رکھیں وہ مسلمان ہیں۔ ② جو شخص ضروریات دین کا انکار کرتا ہے وہ اہل قبلہ نہیں رہتا۔ ضروریات دین سے مراد وہ چیزیں ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت سے ثابت ہوں۔ ان تینوں ذرائع سے جتنے بھی عقائد و اعمال اور فرائض و نوافل ثابت ہیں ان سب پر ایمان لانا، اور انھیں تسلیم کرنا ضروریات دین کہلاتا ہے، ان کا انکار یا تاویل باطل کفر ہے، مثلاً: نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے فرض ہونے کا اعتقاد بھی فرض، اس کا سیکھنا بھی فرض، اس سے ناواقفیت یا انکار کفر ہے۔ ③ دوران نماز میں قبلے کی طرف منہ کرنا ضروری ہے، البتہ عذر یا خوف کی حالت میں اس کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے، اسی طرح نفلی نماز میں اس کے متعلق کچھ تخفیف ہے جبکہ سواری پر ادا کی جا رہی ہو۔[2]

٣٩٢ - حَدَّثَنَا نُعَيْمٌ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ حُمَيْدٍ الطَّوِيلِ، عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، فَإِذَا قَالُوهَا وَصَلَّوْا صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلُوا قِبْلَتَنَا، وَذَبَحُوا ذَبِيحَتَنَا، فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَأَمْوَالُهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ». [راجع: ٣٩١]

[392] حضرت انس بن مالک ؓ ہی سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے کلمۂ طیبہ کے قائل ہونے تک لوگوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر جب وہ اس کلمۂ طیبہ کے قائل ہو جائیں، ہماری طرح نماز ادا کرنے لگیں، ہمارے قبلے کی طرف منہ کریں اور ہمارے ذبیحے کھائیں تو اس وقت ہم پر ان کے خون اور مال حرام ہو جائیں گے مگر حق (اسلام) کی صورت میں ان کی جان و مال سے تعرض درست ہوگا، باقی ان کا حساب اللہ کے حوالے ہے۔''

فوائد و مسائل: ① اس سے پہلی روایت میں تھا کہ جو شخص تین چیزوں کو بجا لاتا ہے، اس سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد قائم ہو جاتا ہے۔ اس روایت میں کلمۂ طیبہ کے اقرار کا اضافہ ہے اور اس عہد کی تشریح اور وضاحت بھی ہے جو پہلی حدیث میں قائم ہوا تھا کہ ایسے شخص کے مال و جان کے بلا وجہ درپے ہونا، اللہ اور اس کے رسول کے عہد (ذمے) میں دخل اندازی کرنا ہے۔

---

① فتح الباري: 644/1. ② عون الباري: 522/1.

ہاں اگر ایسے شخص پر مال یا جان کا تاوان یا قصاص واجب ہو تو وہ اس سے ضرور وصول کیا جائے گا اور ایسا کرنا ذمے اور عہد کے خلاف نہیں ہوگا۔ ② اس روایت میں حمید طویل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بصیغۂ عن بیان کرتے ہیں، اس طرح سند میں عنعنہ آ جائے تو اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس کے بعد ایک سند لا کر اس اشتباہ کو ختم کرتے ہیں کیونکہ اس میں تحدیث کی تصریح ہے، بلکہ اگلی روایت میں مزید وضاحت کر دی کہ واقعی حمید الطّویل نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بلا واسطہ اس حدیث کو بیان کیا ہے کیونکہ ان کی موجودگی میں حضرت میمون بن سیاہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا، چنانچہ اسے بیان کیا جاتا ہے۔

٣٩٣ - وَقَالَ ابْنُ أَبِي مَرْيَمَ: أَخْبَرَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ. وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ: حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ قَالَ: سَأَلَ مَيْمُونُ ابْنُ سِيَاهٍ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: يَا أَبَا حَمْزَةَ! مَا يُحَرِّمُ دَمَ الْعَبْدِ وَمَالَهُ؟ فَقَالَ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَصَلّٰى صَلَاتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا، فَهُوَ الْمُسْلِمُ لَهُ مَا لِلْمُسْلِمِ، وَعَلَيْهِ مَا عَلَى الْمُسْلِمِ. [راجع: ٣٩١]

[393] حضرت انس سے ایک دوسری روایت ہے کہ ان سے حضرت میمون بن سیاہ نے سوال کیا: اے ابوحمزہ! کون سی چیز انسان کی جان اور اس کے مال کو حرام قرار دیتی ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے لا إلٰه إلا الله کی شہادت دی، (دوران نماز میں) ہمارے قبلے کی طرف منہ کیا، ہماری طرح نماز ادا کی اور ہمارا ذبح کیا ہوا کھایا، تو وہ مسلمان ہے۔ اس کے وہی حقوق ہیں جو ایک مسلمان کے ہیں۔ اور اس کے ذمے وہی فرائض ہیں جو ایک مسلمان کے ذمے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے احوال و معاملات کو ظاہر پر محمول کرنا چاہیے، اس بنا پر جو شخص شعار دین کو ظاہر کرے، اس پر اہل اسلام ہی کے احکام جاری کیے جائیں گے، جب تک اس سے دین کے خلاف کوئی بات ظاہر نہ ہو۔ اور اس میں استقبال قبلہ اور اکل ذبیحہ وغیرہ کا ذکر اس لیے ہوا کہ بعض اہل کتاب بھی اگرچہ اقرار توحید کے ساتھ استقبال قبلہ کرتے ہیں مگر وہ ہماری نماز جیسی نماز نہیں پڑھتے اور نہ ہمارے قبلے کا استقبال کرتے ہیں اور ان میں سے بے شمار غیر اللہ کے لیے ذبح کرتے ہیں اور بہت سے ہمارا ذبیحہ نہیں کھاتے، نیز کسی شخص کی نماز اور کھانے کا حال بہت جلد بلکہ پہلے ہی دن معلوم ہو جاتا ہے، دوسرے امور دین کا حال جلدی معلوم نہیں ہوتا، اس لیے بھی چند چیزوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہمارے جیسی نماز نہ پڑھیں یا ہمارا ذبیحہ نہ کھائیں تو وہ خود بھی ہم سے کٹ گئے اور ہمارے دین سے اپنے دین کو الگ سمجھنے لگے، اس لیے ہمارے فیصلے سے پہلے ہی گویا انھوں نے اپنے متعلق فیصلہ دے دیا ہے۔ ② حدیث میں ذکر کردہ علامتیں اہل اسلام کی بڑی اور کھلی ہوئی علامات ہیں جن سے بڑی آسانی سے دین اسلام سے تعلق رکھنے والے دیگر اہل مذاہب سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ علامتیں اہل اسلام کے لیے شعار کے درجے میں ہوگئی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جن لوگوں میں یہ تینوں چیزیں پائی جائیں، انھیں ضرور ہی مسلمان خیال کیا جائے، خواہ وہ ضروریات دین کا انکار بھی کر دیں اور وہ رسول اللہ

1. فتح الباري: 644/1.

ﷺ ہی کے ارشاد کے مطابق دین اسلام سے اس طرح خارج بھی ہو جائیں جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص پورے دین کو مانتا ہو، اس پر عمل پیرا بھی ہو، مگر ایک چھوٹی سی قرآنی سورت کا انکار کر دے یا اس کا حکم نہ مانے یا دانستہ طور پر اس کی غلط تاویل کرے تو اس کے کفر میں شک نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے، حضرات انبیاء علیہم السلام کی توہین کا مرتکب ہو، ان کی شان کے خلاف سخت نازیبا الفاظ استعمال کرے، دین کی تحریف کرے، احادیث و اخبار، واقعات و معجزات کا انکار و استہزا کرے تو ایسے انسان کو کیسے داخل اسلام قرار دیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ان سب موجبات کفر کا ارتکاب کیا جبکہ ان میں سے صرف ایک کا ارتکاب بھی ثبوت کفر کے لیے کافی تھا، لہٰذا یہ شخص کلمہ گو ہونے کے باوجود دین اسلام سے خارج اور مرتد ہے۔ اس کے کفر میں تردد یا احتیاط کی ضرورت نہیں کیونکہ جس طرح اکفارِ مسلم (مسلمان کو کافر کہنے) پر دلیری کرنا گناہ ہے بالکل اسی طرح عدم اکفارِ کافر (کافر کو کافر نہ کہنا) بھی گناہ ہے۔

نوٹ: اس حدیث کے پیش نظر یہود و نصاریٰ اور مجوس و مشرکین کے متعلق فیصلہ تو واضح ہے لیکن مسلمانوں کے اندر جو فرق باطلہ پیدا ہو چکے ہیں، ان کے متعلق ایمان و کفر کا فیصلہ بہت غور و خوض کا متقاضی ہے۔ اس کے متعلق مفصل بحث آئندہ کتاب استتابة المرتدین، حدیث: 6924 کے تحت کریں گے۔ بإذن الله تعالى.

(٢٩) بَابُ قِبْلَةِ أَهْلِ الْمَدِينَةِ وَأَهْلِ الشَّامِ وَالْمَشْرِقِ

باب: 29- اہل مدینہ، اہل شام اور اہل مشرق کی سمتِ قبلہ کا بیان

لَيْسَ فِي الْمَشْرِقِ وَلَا فِي الْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «لَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا».

(ان لوگوں کے) مشرق و مغرب میں قبلہ نہیں، اس لیے کہ نبی ﷺ نے (ان سے) فرمایا: ''جب تم قضائے حاجت کے لیے بیٹھو تو قبلے کی طرف منہ نہ کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو۔''

وضاحت: اس عنوان میں اہل مدینہ، اہل شام بلکہ اہل مشرق کی سمتِ قبلہ بتانا مقصود ہے کہ ان کا قبلہ نہ مشرق میں ہے اور نہ مغرب میں بلکہ ان کا قبلہ جنوب میں ہے، اس لیے کہ مدینہ منورہ اور ملک شام بلکہ مدینہ منورہ کے مشرقی بلاد مکہ معظمہ سے شمال کی جانب واقع ہیں۔ مکہ معظمہ ان کے جنوب میں ہے، اس لیے ان بلاد کا قبلہ مشرق و مغرب نہیں بلکہ جنوب ہو گا۔ اس عنوان کو عموم پر محمول کرنا درست نہیں کہ دنیا میں کسی ملک کا قبلہ مشرق یا مغرب کی طرف نہیں بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر، علامۂ زمان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی اور پھر ان کے شہر بخارا کا قبلہ بھی بجانب مغرب ہے۔ اس عموم پر محمول کرنے کا مفہوم یہ ہو گا کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ کو اپنے شہر کی سمت قبلہ کا پتہ نہیں، حالانکہ یہ بعید از قیاس ہے۔

٣٩٤ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيدَ

[394] حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو

عَنْ أَبِي أَيُّوبَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «إِذَا أَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوهَا، وَلٰكِنْ شَرِّقُوا أَوْ غَرِّبُوا».

قبلے کی طرف منہ نہ کرو اور نہ اس کی طرف اپنی پشت ہی کرو بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرلو۔"

قَالَ أَبُو أَيُّوبَ: فَقَدِمْنَا الشَّامَ فَوَجَدْنَا مَرَاحِيضَ بُنِيَتْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ فَنَنْحَرِفُ وَنَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ تَعَالٰى. وَعَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَطَاءٍ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا أَيُّوبَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَهُ. [راجع: ١٤٤]

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم ملک شام گئے تو ہم نے وہاں بیت الخلا قبلہ رخ پائے، چنانچہ ہم وہاں ترچھے ہو کر بیٹھتے اور حق تعالیٰ سے اس پر معافی مانگتے۔ امام زہری رحمہ اللہ حضرت عطاء سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ سے سنا، انھوں نے نبی ﷺ سے اس (روایت) کے مثل بیان کیا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے مدینے کے مشرقی جانب والے شہروں کا قبلہ بتایا ہے جب کہ مغربی جانب والوں کا بھی قبلہ یہی ہے۔ اس کے متعلق ابن بطال کہتے ہیں کہ یہاں مشرق کا ذکر اکتفا کی قبیل سے ہے کیونکہ مراد مشرق و مغرب دونوں ہیں، یعنی احد المتقابلین کے ذکر پر اکتفا کر لیا یا اس لیے صرف مشرق کا ذکر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی آبادی زیادہ تر اسی جانب تھی، مغرب میں اتنے مسلمان نہیں تھے۔[1] ② امام بخاری رحمہ اللہ نے جس حدیث کو مدار استدلال بنایا ہے اس میں یہ ہے کہ قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت نہ کرو اور نہ پشت ہی اس طرف کرو بلکہ قضائے حاجت کرتے وقت مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا مدینہ منورہ اور اس کے مشرق و مغرب میں واقع شہروں کا قبلہ جنوب ہے، اس لیے ان کے لیے جنوب کی جہت بوقت قضائے حاجت منہ کرنا جائز ہے نہ پشت۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ اور اس کے مشرقی شہروں کے علاوہ جو شہر مکہ مکرمہ کے مشرق میں واقع ہیں ان کا قبلہ بھی جنوب یا شمال ہے، مشرق و مغرب نہیں، لہٰذا ان کے لیے مشرق و مغرب کی طرف بوقت قضائے حاجت منہ کرنا جائز ہے سوائے ان لوگوں کے جو کعبے کی "سیدھ" میں مشرق سے مغرب تک واقع ہیں ان کے لیے مشرق و مغرب کی طرف منہ یا پشت کرنا جائز نہیں۔[2] اب اگر امام بخاری رحمہ اللہ کی مراد صرف اہل مدینہ، اہل شام اور مدینے سے مشرق کی طرف والے بلاد عرب ہوں تو بات صاف ہے اور اگر ابن بطال والی توجیہ مراد ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کہ مشرق و مغرب سے مراد مشرق و مغرب کی تمام سمتیں ہو سکتی ہیں۔ ٹھیک درمیانی خط مشرق اور خط مغرب کو چھوڑ کر جنوب و شمال کی طرف تھوڑا سا انحراف بھی بول و غائط کے وقت کافی ہے اور یہی تشریق و تغریب ہے جس میں خانہ کعبہ کی تعظیم کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ چونکہ ٹھیک درمیانی خط والے بہ نسبت دوسروں کے بہت کم لوگ ہیں ان کی طرف گویا اس عام حکم میں کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔ اس کی وضاحت بایں طور ہے کہ توجہ الی الکعبہ کے لحاظ سے ساری دنیا کے لوگوں کی مثال مرکز کے گرد دائرے کی ہے اب جو شخص کعبے سے مغربی جانب ہے اس کا قبلہ مشرق ہوگا اور جو مشرق کی جانب ہے اس کا قبلہ مغرب ہوگا۔ اگر روئے زمین کو دائرہ خیال

1 شرح ابن بطال: 55/2. 2 شرح ابن بطال: 54/2.

کیا جائے تو ظاہر ہے کہ محیط کی طرف وسعت اور پھیلاؤ اور مرکز کی جانب تنگی اور سمٹاؤ ہو گا۔ انحراف کی صورت میں جہت قبلہ سے وہ انحراف مانا جائے گا جو ربع دائرہ کے بقدر ہو کیونکہ کسی بھی دائرے کا مرکز سے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ ربع تک ہی ہو سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں، خواہ مرکز سے جوانب دائرہ تک فاصلہ ایک میل ہو یا ہزاروں میل کا۔ اس بنا پر کعبے سے اوجھل نماز پڑھنے والے کا شرعی حکم ایک ہی رہے گا، خواہ وہ کعبے سے کتنے ہی فاصلے پر ہو کہ دائرہ کے چوتھائی (نوے درجے) سے کم انحراف ہو تو اس کی نماز درست ہو اور نوے درجے یا زیادہ کا انحراف ہو تو نماز صحیح نہیں ہو گی، یعنی کعبے سے 45 درجے تک دائیں طرف اور اتنا ہی بائیں طرف انحراف کا جواز ہے۔ واللہ أعلم.

(٣٠) بَابُ قَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَٱتَّخِذُوا۟ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة: ١٢٥]

باب: 30- ارشاد باری تعالیٰ: ''تم مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ'' (کی وضاحت)

وضاحت: مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر بیت اللہ کی تھی۔ اس پر آپ کے نقوشِ پا ثبت ہیں اور یہ بیت اللہ کے سامنے نصب ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اصل مقصد تو نمازوں کے لیے استقبال قبلہ کو بیان کرنا ہے لیکن اس میں یہ بتایا ہے کہ طواف کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے پاس پڑھنا زیادہ بہتر ہے لیکن اس بات کو نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ اصل حکم استقبال کعبہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ ہر حکم کو اپنے اپنے مقام پر رکھا جائے۔

٣٩٥ - حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ دِينَارٍ قَالَ: سَأَلْنَا ابْنَ عُمَرَ عَنْ رَّجُلٍ طَافَ بِالْبَيْتِ الْعُمْرَةَ وَلَمْ يَطُفْ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، أَيَأْتِي امْرَأَتَهُ؟ فَقَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ فَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعًا وَّصَلَّى خَلْفَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ، وَطَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ، وَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. [انظر: ١٦٢٣، ١٦٢٧، ١٦٤٥، ١٦٤٧، ١٧٩٣]

[395] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ان سے ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے بیت اللہ کا طواف کیا لیکن صفا اور مروہ کے درمیان ابھی سعی نہیں کی، تو کیا وہ اپنی بیوی کے پاس آ سکتا ہے؟ انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ (ایک دفعہ) مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے، پھر آپ نے مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت پڑھیں، اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان سعی فرمائی۔ یقیناً رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

٣٩٦ - وَسَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ فَقَالَ: لَا يَقْرَبَنَّهَا حَتَّى يَطُوفَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ. [انظر: ١٦٢٤، ١٦٤٦، ١٧٩٤]

[396] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ان سے مذکورہ شخص کے متعلق سوال ہوا تو فرمایا: صفا اور مروہ کے طواف سے پہلے ہرگز اپنی بیوی سے صحبت نہ کرے۔

فائدہ: اس عنوان سے امام بخاری رحمہ اللہ کے کئی ایک مقاصد ہیں: ایک تو مقام ابراہیم کی تعیین ہے کیونکہ اس کے متعلق

اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک بیت اللہ، مسجد حرام، حرم پاک یا مقامات حج سب مقام ابراہیم ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تعیین کر دی کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرا یہ کہ ارشاد باری تعالیٰ میں امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے کہ مقام ابراہیم کے پاس طواف کی دو رکعت پڑھنا بہتر ہے، واجب نہیں۔ تیسرا یہ کہ مصلی کا تعین کرنا ہے کہ اس سے مراد جائے نماز ہے، یعنی اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے وہ اس طرح کہ استقبال کعبہ بھی برقرار رہے۔ چوتھا یہ کہ یہ حکم صرف طواف کی دو رکعت کے لیے ہے تمام نمازوں کے لیے نہیں، چنانچہ ان تمام مقاصد کے لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت پیش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف کرنے کے بعد مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر دو رکعت ادا کیں جو تحیۂ طواف ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم کے پاس حکم نماز کے باوجود استقبال کعبہ کے فرض کی تاکید میں فرق نہیں آیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے باوجود استقبال کعبہ کو ترک نہیں فرمایا۔ چونکہ اس روایت میں سائل کے سوال کا جواب دوٹوک الفاظ میں نہیں تھا بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اشارہ کر دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک یہ ہے۔ اب تم خود غور کرو کہ صفا اور مروہ کی سعی سے پہلے بیوی سے صحبت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کو پیش فرمایا جس میں صراحت ہے کہ صفا اور مروہ کی سعی سے پہلے کسی صورت میں بیوی سے مقاربت نہ کی جائے۔

٣٩٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سَيْفٍ قَالَ: سَمِعْتُ مُجَاهِدًا قَالَ: أُتِيَ ابْنُ عُمَرَ فَقِيلَ لَهُ: هٰذَا رَسُولُ اللهِ ﷺ دَخَلَ الْكَعْبَةَ، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: فَأَقْبَلْتُ وَالنَّبِيُّ ﷺ قَدْ خَرَجَ، وَأَجِدُ بِلَالًا قَائِمًا بَيْنَ الْبَابَيْنِ، فَسَأَلْتُ بِلَالًا فَقُلْتُ: أَصَلَّى النَّبِيُّ ﷺ فِي الْكَعْبَةِ؟ قَالَ: نَعَمْ، رَكْعَتَيْنِ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ اللَّتَيْنِ عَلٰى يَسَارِهِ إِذَا دَخَلْتَ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلّٰى فِي وَجْهِ الْكَعْبَةِ رَكْعَتَيْنِ. [انظر: ٤٦٨، ٥٠٤، ٥٠٥، ٥٠٦، ١١٦٧، ١٥٩٨، ١٥٩٩، ٢٩٨٨، ٤٢٨٩، ٤٤٠٠]

[397] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھیں بتایا گیا کہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے: میں ادھر پہنچا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ دونوں دروازوں کے درمیان کھڑے ہیں، چنانچہ میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: آیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں، دو رکعت (پڑھیں) ان دو ستونوں کے درمیان جو بیت اللہ میں داخل ہوتے وقت بائیں جانب ہوتے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور آپ نے کعبے کے سامنے دو رکعت نماز ادا کی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ مقام ابراہیم کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں بلکہ ہر حالت میں دوران نماز میں کعبے کا استقبال ہے، چنانچہ اس روایت میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے سامنے دو رکعت ادا کیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم آپ کی پچھلی جانب تھا۔ مقام ابراہیم کا قبلہ ہونا صرف اس صورت میں متعین ہے کہ نمازی

اسے اپنے اور کعبے کے درمیان کرے کیونکہ باقی تین جہتوں میں صرف بیت اللہ کی طرف منہ کرنے سے نماز درست ہو جاتی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ فرض تو استقبال قبلہ، یعنی بیت اللہ کی طرف منہ کرنا ہے، مقام ابراہیم کی طرف استقبال ضروری نہیں۔ ② صحیح بخاری کی بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے یہ دریافت کرنا بھول گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ میں کتنی رکعات ادا کی ہیں۔[1] اس روایت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حضرت بلال سے کیفیت کے متعلق سوال کیا، مقدار کے متعلق سوال نہ کر سکے جبکہ مذکورہ روایت میں صراحت ہے کہ حضرت بلال نے انھیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز ادا کی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے سوال کرنے پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کیا جس سے دو رکعت سمجھی گئیں، پھر زبانی طور پر اس کی وضاحت کرانا بھول گئے جس کا افسوس کیا کرتے تھے۔ اور جن روایات میں بیت اللہ کے اندر نماز پڑھنے کی نفی ہے وہ مرجوح ہیں بلکہ آپ کا بیت اللہ کے اندر نماز پڑھنا ثابت ہے۔ واضح رہے کہ بیت اللہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت بلال، حضرت اسامہ اور حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم داخل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جب علم ہوا تو آپ نماز سے فارغ ہو کر باہر آ رہے تھے۔[2]

٣٩٨ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ: سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ: لَمَّا دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ الْبَيْتَ دَعَا فِي نَوَاحِيهِ كُلِّهَا وَلَمْ يُصَلِّ حَتَّى خَرَجَ مِنْهُ، فَلَمَّا خَرَجَ رَكَعَ رَكْعَتَيْنِ فِي قُبُلِ الْكَعْبَةِ وَقَالَ: «هٰذِهِ الْقِبْلَةُ». [انظر: ١٦٠١، ٣٣٥١، ٣٣٥٢، ٤٢٨٨]

[398] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبے میں داخل ہوئے تو آپ نے اس کے سب گوشوں میں دعا فرمائی، باہر نکلنے تک بیت اللہ کے اندر کوئی نماز نہیں پڑھی۔ جب آپ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو اس کے سامنے دو رکعت ادا کیں اور فرمایا: ''یہی قبلہ ہے۔''

فوائد و مسائل: ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ روایت مرسل ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ کے اندر جانا ثابت نہیں، پھر وہ کعبے کے اندر کے حالات کیونکر بیان کر سکتے ہیں؟ لیکن امام مسلم نے ابن جریج کے طریق سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ روایت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے سنی ہے۔[3] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کے اندر صرف دعا کی ہے جبکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ نے دو رکعت نماز بھی پڑھی تھی۔ اس موقع پر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی بات کا اعتبار کیا گیا ہے اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی بات کو لاعلمی پر محمول کیا گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ کے اندر موجود تھے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے تو آپ نے دعا شروع کی، حضرت اسامہ بھی دعا میں مشغول ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سے فراغت کے بعد دو رکعت ادا فرما لیں لیکن حضرت اسامہ اپنی دعا ہی میں منہمک رہے۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز

① صحيح البخاري، الجهاد، حديث :2988. ② فتح الباري : 648/1. ③ صحيح مسلم، الحج، حديث :3237(1330).

کا مشاہدہ کیا، اس لیے اس مشاہدے کی وجہ سے، اسے ترجیح حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔ ② قبلے کے متعلق تو معلوم ہے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے ''یہی قبلہ ہے'' کے الفاظ کیوں ارشاد فرمائے؟ اس کے متعلق علماء کی کئی ایک توجیہات حسب ذیل ہیں: * بیت المقدس سے تحویل قبلہ کا حکم ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب قبلے کا حکم بیت اللہ پر ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں اب نسخ نہیں ہو گا۔ * اس وضاحت میں ان لوگوں کا حکم بتایا جو بیت اللہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ان کے لیے بعینہ بیت اللہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس جو بیت اللہ سے غائب ہیں وہ اپنے اجتہاد سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ * امام کے لیے کھڑے ہونے کی تلقین فرمائی کہ مواجۂ بیت اللہ میں کھڑا ہو۔ باقی جوانب میں بھی امام کا کھڑا ہونا جائز ہے، تاہم بہتر ہے کہ بیت اللہ کے سامنے کھڑا ہو۔ * اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوران نماز میں مسجد حرام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ سے وضاحت فرمائی کہ قبلہ صرف بیت اللہ ہے، اس کے اردگرد جو مسجد حرام ہے یا مکہ مکرمہ یا حرم کی حدود ہیں یہ قبلہ نہیں ہیں۔ نماز کے لیے صرف بیت اللہ کی طرف منہ کیا جائے، نہ کہ مسجد حرام کی طرف جو بیت اللہ کے اردگرد کا علاقہ ہے۔[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث سے یہی مقصود ہے کہ مقام ابراہیم کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں، اصل قبلہ تو بیت اللہ ہے لیکن ان الفاظ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بیت اللہ کے اندر نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیونکہ اس طرح پورے بیت اللہ کا استقبال نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ حصے کی طرف پشت ہو جاتی ہے لیکن یہ موقف مرجوح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا بیت اللہ کے اندر نماز پڑھنا ثابت ہے۔[3]

(٣١) بَابُ التَّوَجُّهِ نَحْوَ الْقِبْلَةِ حَيْثُ كَانَ

باب: 31- نمازی جہاں بھی ہو، قبلے کی طرف رخ کرے

وَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اِسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَكَبِّرْ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''(پہلے) قبلے کی طرف منہ کرو پھر تکبیر تحریمہ کہو۔''

وضاحت: نمازی سفر میں ہو یا حضر میں، کعبے کے پاس ہو یا دور، بیت اللہ کے اندر ہو یا باہر، بہرصورت نماز کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ اگر کعبہ سامنے ہو تو عین کعبے کی طرف منہ کرنا ضروری ہے، اگر سامنے نہ ہو تو عین قبلے کے بجائے جہت قبلہ کا استقبال ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل صورتوں میں گنجائش کا پہلو ہے: * دوران سفر میں نوافل ادا کرنے ہوں اور نمازی سواری پر ہو۔ * فرائض میں غیر اطمینانی حالت ہو اور چلتے چلتے نماز ادا کرنے کی مجبوری ہو۔ * کمزوری یا خوف دشمن یا کسی اور وجہ سے سواری پر سوار ہونا ضروری ہو۔ دراصل سترعورۃ اور استقبال قبلہ دونوں کو کسی خاص ضرورت یا مجبوری کی بنا پر ساقط مان لیا گیا ہے، عام حالات میں قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان نقل ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے سمت قبلہ صحیح کر لو۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس تعلیق کو خود امام بخاری رحمہ اللہ نے مسیئ الصلاۃ

---

1 البقرة 2:149. 2 فتح الباري : 650/1. 3 فتح الباري : 649/1.

سے متعلق حدیث بیان کرتے ہوئے موصولاً ذکر کیا ہے۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ استقبال قبلہ کی فرضیت صرف فرض نماز کے لیے ہے جیسا کہ خود امام بخاری رحمہ اللہ کی پیش کردہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوتا ہے۔[2] علامہ عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس باب میں نماز فرض کے لیے جہت قبلہ کی طرف منہ کرنے کی ضرورت وفرضیت کو بیان کیا ہے، خواہ نمازی سفر میں ہو یا حضر میں۔[3] استقبال قبلہ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾ ''اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا رخ کعبے کی طرف پھیر لیں اور تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنا رخ اسی طرف پھیر لو۔''[4]

٣٩٩ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ رَجَاءٍ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ [رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا] قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ صَلَّى نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا، وَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُحِبُّ أَنْ يُوَجَّهَ إِلَى الْكَعْبَةِ، فَأَنْزَلَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى ٱلسَّمَآءِ﴾ [البقرة: ١٤٤] فَتَوَجَّهَ نَحْوَ الْكَعْبَةِ، وَقَالَ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ - وَهُمُ الْيَهُودُ -: ﴿مَا وَلَّىٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ ٱلَّتِى كَانُوا۟ عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ ٱلْمَشْرِقُ وَٱلْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِى مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ [البقرة: ١٤٢] فَصَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ رَجُلٌ ثُمَّ خَرَجَ بَعْدَمَا صَلَّى فَمَرَّ عَلَى قَوْمٍ مِّنَ الْأَنْصَارِ فِي صَلَاةِ الْعَصْرِ نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ فَقَالَ: هُوَ يَشْهَدُ أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَنَّهُ تَوَجَّهَ نَحْوَ الْكَعْبَةِ، فَتَحَرَّفَ الْقَوْمُ حَتَّى تَوَجَّهُوا نَحْوَ الْكَعْبَةِ. [راجع: ٤٠]

[399] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی لیکن رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ انھیں کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: ''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔'' اس حکم کے بعد آپ نے کعبے کی طرف رخ کر لیا۔ اس پر بے عقل لوگوں نے، جو یہود تھے، کہا: ''ان لوگوں کو کس چیز نے اس قبلے سے پھیر دیا ہے جس کی طرف وہ متوجہ تھے؟ کہہ دیجیے! مشرق ومغرب اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔'' پھر ایک شخص نے نبی ﷺ کے ہمراہ (قبلہ رخ ہو کر) نماز پڑھی اور نماز کے بعد وہ چلا گیا، پھر نماز عصر میں یہ شخص انصار کی جماعت کے پاس سے گزرا، یہ اس وقت بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ اس شخص نے انھیں اطلاع دی کہ وہ اس بات کا عینی گواہ ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور آپ ﷺ نے کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، چنانچہ وہ لوگ اسی وقت گھوم گئے اور اپنا رخ کعبے کی طرف کر لیا۔

---

(1) صحيح البخاري، الاستئذان، حديث: 6251. (2) فتح الباري: 650/1. (3) عمدة القاري: 373/3. (4) البقرة 150:2.

فوائد و مسائل: ① اس روایت سے استقبال قبلہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ واقعۂ مذکور میں دو رکعات پڑھی جا چکی تھیں جب معلوم ہوا کہ قبلے کے متعلق تبدیلی کا حکم آ چکا ہے، اب یہ نہیں ہوا کہ اس نماز کو نا تمام چھوڑ کر نئے سرے سے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور یہ بھی نہیں ہوا کہ اس نماز کو بیت المقدس ہی کی طرف رخ کیے ہوئے پورا کر لیتے بلکہ استقبال کعبہ کی اہمیت کے پیش نظر دوران نماز ہی میں اسی وقت رخ بدل دیا گیا، حالانکہ اس تبدیلی میں یقیناً بہت زیادہ دشواری ہوئی ہو گی، خاص طور پر امام کے لیے بہت مشکل تھا کیونکہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے میں رخ شمال کی طرف تھا اور اب اس کے برعکس جنوب کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بہر حال دشواری تو یقیناً ہوئی لیکن قبلہ اسی حالت میں درست کیا گیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس تحویل کی کیفیت بایں الفاظ بیان کی ہے: امام مسجد کے اگلے حصے سے پچھلے حصے کی طرف منتقل ہوا کیونکہ وہیں کھڑے کھڑے رخ پھیر لیا جاتا تو آدمیوں کے لیے پیچھے کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی، پھر آدمیوں نے اپنے رخ تبدیل کیے، عورتیں چل کر آدمیوں کے پیچھے آئیں۔[1] ② رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مدینے میں اکثر یہودی آباد تھے جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ آپ کو حکم ہوا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، اس سے یہودی بہت خوش ہوئے لیکن آپ کی دلی خواہش تھی کہ قبلۂ ابراہیم علیہ السلام، یعنی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، چنانچہ آپ آسمان کی طرف منہ کیے اس حکم کا انتظار کرتے۔ آپ کو تبدیلیٔ قبلہ کا اس لیے بھی انتظار رہتا کہ یہودی اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ نبی دیگر احکام میں ہماری مخالفت کرنے کے باوجود ہمارے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے پر مجبور ہے۔ بالآخر سترہ ماہ کے بعد تحویل قبلہ کا حکم آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا بھی حکم ہوا تھا۔ وہ آپ کا اجتہاد یا اہل کتاب کی تالیف قلبی کی خاطر نہ تھا۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ ہی میں تھے کہ آپ کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ مکہ مکرمہ میں تین سال اسی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور نماز پڑھتے وقت آپ کعبے کو بھی اپنے سامنے کر لیتے لیکن مدینہ پہنچ کر ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی سمتیں باہم مخالف ہو گئیں تھیں، اس لیے آپ کو انتظار رہتا کہ کب اللہ تعالیٰ اس کی تبدیلی کا حکم دے۔ بالآخر آپ کی خواہش کے مطابق تبدیلیٔ قبلہ کا حکم آ گیا۔[2] ③ تحویل قبلہ کا حکم کس مسجد اور کس نماز میں ہوا؟ اس کے متعلق مختلف روایات ہیں: طبقات ابن سعد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی مسجد میں نماز ظہر پڑھا رہے تھے کہ تحویل قبلہ کے متعلق وحی آئی۔ آپ نے دوران نماز ہی میں کعبے کی طرف منہ کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن حضرت بشر بن براء کی والدہ کے ہاں قبیلۂ بنوسلمہ میں گئے تو اس نے آپ کے لیے دعوت طعام کا اہتمام کیا، وہیں نماز ظہر کا وقت ہو گیا تو آپ نے بنوسلمہ کی مقامی مسجد ہی میں نماز پڑھنے کا پروگرام بنایا، ابھی دو رکعت ہی پڑھی تھیں کہ کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آ گیا، چنانچہ آپ دوران نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے، اس بنا پر مسجد بنوسلمہ کا نام مسجد قبلتین مشہور ہوا کیونکہ اس مسجد میں ایک ہی نماز دو قبلوں کی طرف منہ کر کے مکمل کی گئی۔ حضرت بشر بن عباد وہاں نماز پڑھ کر عصر کے وقت بنوحارثہ کی مسجد میں گئے تو وہ عصر کی دو رکعت پڑھ چکے تھے۔ آپ نے دوران نماز ہی میں نمازیوں کو تبدیلیٔ

---

1. فتح الباري: 656/1. ② فتح الباري: 651/1.

کعبہ کی اطلاع کر دی تو انھوں نے بھی اسی حالت میں قبلے کی طرف منہ کر لیا۔[1] چونکہ بنو حارثہ مدینے کے اندر ہی آباد تھے، اس لیے انھیں نماز عصر کے وقت اطلاع ہو گئی۔ البتہ اہل قباء، جو مدینے کے باہر تھے، کے پاس صبح کی نماز کے دوران میں اطلاع پہنچی۔ انھوں نے بھی دوران نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف منہ کر لیا۔[2]

٤٠٠ – **حَدَّثَنَا** مُسْلِمٌ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ أَبِي كَثِيرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ جَابِرٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي عَلٰى رَاحِلَتِهِ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ، فَإِذَا أَرَادَ الْفَرِيضَةَ نَزَلَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ. [انظر: ١٠٩٤، ١٠٩٩، ٤١٤٠]

[400] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھ لیتے تھے، وہ جس طرف بھی لے جا رہی ہوتی۔ لیکن جب آپ فرض نماز پڑھنے کا ارادہ فرماتے تو سواری سے اترتے اور قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کی پابندی سے ایک استثنائی صورت بیان کرنے کے لیے اس حدیث کو ذکر کیا ہے، یعنی اگر نفل نماز کی ادائیگی مقصود ہو تو قبلہ رو ہونے کی پابندی ضروری نہیں، لیکن سنن ابوداود میں ہے کہ جب آپ دوران سفر میں نفل نماز اپنی سواری پر پڑھنا چاہتے تو پہلے سواری کا منہ قبلے کی طرف کر لیتے، اس کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر لیتے، پھر سواری کا منہ جدھر بھی ہو جاتا کوئی پروا نہ کرتے، البتہ فرض نماز سواری سے اتر کر قبلہ رو ہو کر ادا فرماتے۔[3] ② الضرورات تبیح المحذورات کے اصول کے پیش نظر اگر شدت خوف ہو تو فرض نماز کے لیے استقبال قبلہ کی شرط ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر سفر میں بارش ہو جائے اور نماز پڑھنے کے لیے خشک جگہ نہ ملے تو سواری کو روک کر قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے لیکن ریل اور بس میں جو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا رواج ہے اس کی اصلاح نہایت ضروری ہے کیونکہ نماز میں استقبال قبلہ اور قیام دونوں ضروری ہیں۔ ریل اور بس میں نماز پڑھنے سے یہ دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔ اسلامی حکومت کو چاہیے کہ ریل کے ڈبوں میں ایک ڈبہ ادائیگی نماز کے لیے مختص کرے جس میں پانی اور سمت قبلہ کا اہتمام ہو۔

٤٠١ – **حَدَّثَنَا** عُثْمَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ: قَالَ عَبْدُ اللهِ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ – قَالَ إِبْرَاهِيمُ: لَا أَدْرِي – زَادَ أَوْ نَقَصَ، فَلَمَّا سَلَّمَ قِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَحَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا، فَثَنٰى رِجْلَهُ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ

[401] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے نماز پڑھائی۔ راویٔ حدیث ابراہیم نخعی کہتے ہیں: مجھے یاد نہیں کہ آپ نے نماز میں اضافہ کر دیا تھا یا کچھ کمی کر دی تھی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! کیا نماز کے بارے میں کوئی نیا حکم آ گیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''بتاؤ اصل بات کیا ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: آپ نے اس قدر نماز پڑھی

① فتح الباري: 651/1. ② فتح الباري: 655/1-656. ③ سنن أبي داود، صلاة السفر، حديث: 1225.

سَلَّمَ، فَلَمَّا أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ قَالَ: «إِنَّهُ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلَاةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ بِهِ، وَلٰكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، أَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي، وَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاتِهِ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُسَلِّمْ ثُمَّ يَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ». [انظر: ٤٠٤، ١٢٢٦، ٦٦٧١، ٧٢٤٩]

ہے۔ یہ سن کر آپ نے اپنے دونوں پاؤں موڑے اور قبلہ رو ہو کر دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا اور ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اگر نماز کے متعلق کوئی نیا حکم آتا تو میں تمھیں ضرور مطلع کرتا، لیکن میں بھی تمھاری طرح ایک انسان ہوں جس طرح تم بھول جاتے ہو میں بھی بھول کا شکار ہو جاتا ہوں، اس لیے جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔ اور جب تم میں سے کوئی اپنی نماز میں شک کرے تو اسے چاہیے کہ صحیح حالت معلوم کرنے کی کوشش کرے، پھر اسی پر اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیر دے، اس کے بعد دو سجدے کرے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ نماز میں قبلے کی رعایت انتہائی ضروری ہے حتی کہ اگر کوئی شخص بھول کر نماز سے خارج ہو گیا اور غیر قبلے کی طرف متوجہ ہو گیا، پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے غلطی سے سلام پھیر دیا ہے تو اس صورت میں بھی وہ فوراً قبلہ رو ہو کر نماز پوری کرے اور اگر صرف سجدۂ سہو کرنا ہو تو وہ بھی نماز ہی کا حصہ ہے، اس لیے سجدۂ سہو بھی قبلہ رو ہو کر ادا کرے جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ آپ نے نماز سے فراغت کے بعد منہ قبلے سے پھیر لیا تھا، بتانے پر نئے سرے سے قبلہ رو ہو کر نماز کی تکمیل فرمائی۔ ② کسی چیز سے دل کا غافل ہو جانا نسیان ہے اور کسی چیز کا دل سے اوجھل ہو جانا سہو ہے۔ اگر نمازی کو سہو و نسیان کی وجہ سے اپنی نماز کے متعلق شک پڑ جائے تو سوچ بچار کر کے صحیح اور درست بات کو متعین کرنا تحری کہلاتا ہے۔ اسے ظن غالب بھی کہتے ہیں۔ حدیث کے مطابق نمازی کو ایسے حالات میں تحری سے کام لینا چاہیے۔ اگر تحری سے کوئی جانب راجح ہو جائے تو آئندہ اسی غلبۂ ظن پر بنیاد رکھتے ہوئے نماز کو مکمل کر لیا جائے۔ اگر دونوں جانب برابر ہوں، کوئی ایک جانب راجح قرار نہ پا سکے تو جانب اقل پر عمل کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تعداد رکعات کے متعلق تین یا چار کا شک ہو تو جانب اقل تین پر بنیاد قائم کر کے نماز مکمل کی جائے، یعنی تحری الی الصواب اور اخذ بالاقل دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تحری الی الصواب کو اخذ بالاقل پر محمول کرنا صحیح نہیں جیسا کہ بعض اہل علم کا موقف ہے۔ ③ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی سہو ہو سکتا ہے لیکن یہ سہو و نسیان اعمال کے معاملے میں تو ممکن ہے، تبلیغ کے معاملے میں ہرگز ممکن نہیں کیونکہ اس کی ذمے داری اللہ تعالیٰ نے خود اٹھائی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ قرآن کریم کا بیان، یعنی کھول کر واضح کرنا ہماری ذمے داری ہے۔ اعمال کے معاملے میں انبیاء علیہم السلام کو جو سہو پیش آیا ہے وہ بھی دراصل اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے پیش نظر آیا ہے تاکہ عام مسلمانوں کو عملی طور پر مسائل سہو کی تعلیم دی جا سکے۔[1] ④ راوئ حدیث حضرت منصور جب اپنے شیخ ابراہیم

1 فتح الباري : 653/1.

نخعی سے بیان کرتے ہیں تو سجدۂ سہو کے سبب کے متعلق شک ہوتا ہے کہ وہ تعداد رکعات میں اضافے کی وجہ سے تھا یا کم ہونے کی بنا پر لیکن آئندہ روایت میں جب ان سے حضرت حکم بیان کرتے ہیں تو یقین سے بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعات پڑھا دی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے جب اپنے شاگرد حکم کو حدیث بیان کی تو سجدے کی بنیاد کو جزم و وثوق سے بیان کیا اور جب اپنے شاگرد منصور کو حدیث بیان کی تو شک پڑ گیا کہ تعداد رکعات میں اضافہ ہو گیا تھا یا کہ کمی واقع ہو گئی تھی۔ واللہ أعلم۔[1] ⑤ رسول اللہ ﷺ کو دوران نماز میں زندگی بھر چار دفعہ سہو ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے: * ظہر کی نماز میں قعدۂ اوّل میں بیٹھنے کی بجائے کھڑے ہو گئے۔[2] * ظہر کی پانچ رکعات پڑھا دیں۔[3] * ظہر کی چار رکعات کے بجائے دو پر سلام پھیر دیا۔[4] * عصر کی نماز میں تین رکعات پر سلام پھیر دیا۔[5] سہو ونسیان کے متعلق مکمل بحث آئندہ کتاب السہو میں ہوگی۔ بإذن اللہ تعالیٰ۔

(۳۲) بَابُ مَا جَاءَ فِي الْقِبْلَةِ، وَمَنْ لَّمْ يَرَ الْإِعَادَةَ عَلَى مَنْ سَهَا، فَصَلَّى إِلَى غَيْرِ الْقِبْلَةِ

باب: 32- قبلے کے متعلق کیا منقول ہے، نیز جس شخص نے سہواً غیر قبلے کی طرف نماز پڑھ لی، اس پر اعادہ ضروری نہیں

وَقَدْ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ فِي رَكْعَتَيِ الظُّهْرِ وَأَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ بِوَجْهِهِ، ثُمَّ أَتَمَّ مَا بَقِيَ.

نبی ﷺ نے ایک دفعہ نماز ظہر میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور لوگوں کی طرف اپنا چہرہ کر لیا، پھر (یاد دلانے پر) باقی نماز کو پورا کیا۔

وضاحت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس عنوان کے دو جز ہیں: پہلا ماجاء في القبلة- اس کا مطلب غیر ما تقدم ہے، یعنی مصنف قبلے کے متعلق گزشتہ باتوں کے علاوہ مزید کچھ باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے جز میں متعلقات قبلہ کا ایک اہم مسئلہ، یعنی قبلے میں سہو ونسیان کو بیان فرمایا ہے۔ دراصل پہلا جز بطور متفرق مسائل کے ہے اور دوسرا حصہ ایک اہم جز پر مشتمل ہے کہ اگر کسی نے بھول کر غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر کسی نے قبلے کے متعلق تحری کے بعد بھول کر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی تو ائمہ کے تین موقف ہیں: * مطلق طور پر نماز کا اعادہ کرے، خواہ غلطی کا علم وقت کے اندر ہو یا وقت گزر جانے کے بعد۔ * اگر غلطی کا احساس وقت کے اندر ہو جائے تو اعادہ ضروری ہے بصورت دیگر نہیں۔ * کسی صورت میں بھی اعادے کی ضرورت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی موقف ہے۔ آپ کے استدلال کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے کہ آپ نے سہواً ظہر کی چار رکعات کے بجائے دو پڑھ کر سلام پھیر دیا، پھر آپ نے قبلے سے چہرۂ مبارک پھیر کر مقتدیوں کی طرف کر لیا اور آپ حکماً نماز ہی میں تھے۔ آپ نے صرف باقی نماز کو ادا کیا، پوری نماز کا اعادہ نہیں کیا۔ واضح رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے

---

① فتح الباري: 563/1. ② صحيح البخاري، السهو، حديث: 1225. ③ صحيح البخاري، السهو، حديث: 1226. ④ صحيح البخاري، السهو، حديث: 1227. ⑤ صحيح مسلم، المساجد، حديث: 1293 (574).

جو روایت تعلیقاً ذکر کی ہے اسے خود ہی آئندہ باسند بیان کریں گے۔[1]

٤٠٢ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَوْنٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ عُمَرُ: وَافَقْتُ رَبِّي فِي ثَلَاثٍ، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! لَوِ اتَّخَذْنَا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى؟ فَنَزَلَتْ: ﴿وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾ [البقرة:١٢٥] وَآيَةُ الْحِجَابِ، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! لَوْ أَمَرْتَ نِسَاءَكَ أَنْ يَّحْتَجِبْنَ فَإِنَّهُ يُكَلِّمُهُنَّ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ، فَنَزَلَتْ آيَةُ الْحِجَابِ، وَاجْتَمَعَ نِسَاءُ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْغَيْرَةِ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ لَهُنَّ: ﴿عَسَىٰ رَبُّهُۥٓ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُۥٓ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ﴾ [التحريم:٥] فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ. [انظر: ٤٤٨٣، ٤٧٩٠، ٤٩١٦]

[402] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: حضرت عمر ؓ نے فرمایا: مجھے اپنے پروردگار سے تین باتوں میں موافقت کا شرف حاصل ہوا ہے: ایک مرتبہ میں نے کہا: اللہ کے رسول! کاش مقام ابراہیم ہماری جائے نماز ہوتا، تو یہ آیت نازل ہوئی: ''مقام ابراہیم کو جائے نماز بنا لو۔'' آیت حجاب بھی اسی طرح نازل ہوئی کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کاش آپ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دے دیں کیونکہ ہر نیک و بد ان سے گفتگو کرتا ہے، تو آیت حجاب نازل ہوئی۔ (ایک دفعہ ایسا ہوا کہ) نبی ﷺ کی ازواج مطہرات نے باہمی رشک و رقابت کی وجہ سے آپ کے خلاف اتفاق کر لیا تو میں نے ان سے کہا: بعید نہیں اگر رسول اللہ ﷺ تمھیں طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار انھیں تمھارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں انھیں عطا فرما دے، پھر یہی آیت (سورۂ تحریم:5) نازل ہوئی۔

وَقَالَ ابْنُ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ قَالَ: حَدَّثَنِي حُمَيْدٌ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا بِهٰذَا.

(راویٔ حدیث) ابن ابی مریم نے کہا: ہمیں یحییٰ بن ایوب نے خبر دی، ان سے حمید طویل نے بیان کیا کہ میں نے حضرت انس ؓ سے یہ حدیث سنی ہے۔

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر ؒ نے عنوان سے اس حدیث کی مطابقت بایں الفاظ ذکر کی ہے کہ آیت مذکور میں ''مقام ابراہیم'' سے مراد کعبہ شریف ہے جیسا کہ اس کی تفسیر میں یہ قول نقل ہوا ہے اور یہ باب بھی قبلے کے متعلق ہے۔ یا اس سے مراد کل حرم ہے۔ اس صورت میں من تبعیضیہ ہوگا اور مصلی سے مراد قبلہ ہے جو آفاق والوں کے حق میں ہے۔ یا اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم ؑ نے کھڑے ہو کر بیت اللہ کی تعمیر کی تھی۔ اس صورت میں مطابقت قبلہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ متعلقات قبلہ کے لحاظ سے ہوگی۔[2] علامہ کرمانی نے امام خطابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمر ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ جس پتھر پر حضرت ابراہیم ؑ کے پاؤں کے نشانات ثبت ہیں اسے قبلے کے سامنے جائے نماز بنایا جائے، یعنی امام اس کے پاس کھڑا ہو، تو اس خواہش کے احترام میں مذکورہ آیت نازل ہوئی۔[3] ② حمید طویل نے حضرت انس ؓ سے یہ روایت

[1] صحيح البخاري، السهو، حديث: 1227. [2] فتح الباري: 655/1. [3] شرح الكرماني: 67/4.

بصیغۂ عَنْ بیان کی ہے۔ اس انداز میں تدلیس کا شبہ تھا۔ اس کے ازالے کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن ابی مریم کا طریق بیان کیا ہے جس میں حمید طویل اپنے سماع کی صراحت کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ کا اس مقام پر یہ روایت لانے کا اتنا ہی مقصد تھا جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ اس حدیث کی مکمل تشریح کتاب المناقب میں بیان ہو گی۔ وہاں ہم ثابت کریں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ واقعی اس امت میں فتن و محن کی روک تھام کے لیے ایک دروازے کی حیثیت رکھتے تھے۔ بدقسمتی سے اس دروازے کو بزور توڑا گیا۔ اس دروازے کو توڑنے کا پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر ہم وہاں بیان کریں گے اور ان عوامل و محرکات سے پردہ اٹھائیں گے جو اس واقعۂ جانکاہ میں کارفرما تھے۔ بإذن اللّٰه تعالىٰ. ③ واضح رہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کبھی بھی کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس میں دوسروں نے ایک رائے دی ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی دوسری رائے کا اظہار کیا ہو مگر قرآن مجید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق اترتا۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت موافقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہے لیکن نقل کے اعتبار سے تعیین کے ساتھ پندرہ چیزوں میں موافقت ہمارے علم میں آئی ہے جسے ''موافقات عمر'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔[3] موافقات عمر کی تشریح بھی کتاب المناقب میں بیان ہو گی۔ إن شاء اللّٰه. ④ بعض اہل علم کی طرف سے امام بخاری رحمہ اللہ پر یہ اعتراض ہوا ہے کہ اس حدیث کو سابق باب میں لانا چاہیے تھا جو اس آیت کے متعلق ہی قائم کیا گیا تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ وہاں حدیث ابن عمر بیان کی ہے جس میں صراحت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کی دو رکعت میں مقام ابراہیم کو قبلۂ نماز بنایا جب کہ حدیث عمر میں اس قسم کی صراحت نہ تھی، اس لیے اسے یہاں متعلقات قبلہ کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔ واللّٰه أعلم.[4]

٤٠٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: بَيْنَا النَّاسُ بِقُبَاءٍ فِي صَلَاةِ الصُّبْحِ إِذْ جَاءَهُمْ آتٍ فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَدْ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اللَّيْلَةَ قُرْآنٌ، وَقَدْ أُمِرَ أَنْ يَّسْتَقْبِلَ الْكَعْبَةَ، فَاسْتَقْبِلُوهَا، وَكَانَتْ وُجُوهُهُمْ إِلَى الشَّامِ فَاسْتَدَارُوا إِلَى الْكَعْبَةِ. [انظر: ٤٤٨٨، ٤٤٩٠، ٤٤٩١، ٤٤٩٣، ٤٤٩٤، ٧٢٥١]

[403] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک آنے والا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ آج رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا ہے اور اس میں آپ کو استقبال کعبہ کا حکم دے دیا گیا ہے، لہٰذا تم بھی کعبے کی طرف اپنا رخ کر لو، چنانچہ وہ (سنتے ہی) کعبے کی طرف گھوم گئے جب کہ اس وقت ان کا رخ شام کی طرف تھا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ جہل و نسیان کو عذر ٹھہرانے میں کچھ زیادہ ہی وسیع النظر ہیں، چنانچہ انھوں نے اس مقام پر ایک مستقل عنوان قائم کر کے بتایا کہ اگر سہو و نسیان کی وجہ سے کوئی شخص غیر قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھ لے گا تو اس کی نماز

① فتح الباري: 655/1. ② جامع الترمذي، المناقب، حديث: 3682. ③ فتح الباري: 654/1. ④ فتح الباري: 654/1-655.

درست ہوگی۔ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ کعبۂ معظمہ کی طرف رخ کرنے کا حکم آ جانے کے باوجود اہل قباء نے لاعلمی کی وجہ سے نماز قبلۂ منسوخہ کی طرف منہ کر کے ادا کی اور ناواقفیت کی وجہ سے وہ بھولنے والے کے حکم میں تھے، اس لیے انھیں نماز کے اعادے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اسی طرح یہ حدیث عنوان کے پہلے جز پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہے۔[1] ② حضرت ثویلہ بنت اسلم دوران نماز میں تحویل کی کیفیت بیان کرتی ہیں کہ عورتیں مردوں کی جگہ اور مرد عورتوں کی جگہ پر منتقل ہو گئے اور ہم نے دو رکعت استقبال کعبہ کے ساتھ ادا کیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ذرا تفصیل بیان کی ہے کہ امام مسجد کے اگلے حصے سے پچھلے حصے کی طرف آیا کیونکہ اسی مقام پر تحویل کے لیے جگہ ناکافی تھی، اس کے بعد آدمی اور پھر عورتیں ایک دوسرے کے پیچھے ہو گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مکلّف کے لیے ناسخ کے حکم کی پابندی اس وقت ہوگی جب اسے معلوم ہوگا، اس سے پہلے وہ اس کا پابند نہیں ہے۔[2] ③ اہل قباء نے نماز کا کچھ حصہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کیا، ان کا یہ عمل ان کے یقین کے مطابق صحیح اور درست تھا، اس لیے اس حصے کا اعادہ نہیں کرایا گیا۔ تحری میں بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان غور و فکر کے بعد ایک سمت کو قبلہ قرار دیتا ہے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے جیسا کہ اہل قباء نے اپنے یقین کے مطابق بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز کا کچھ حصہ ادا کیا اور اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کبھی سوال نہیں ہوا اور نہ آپ نے انھیں اعادے ہی کا حکم دیا۔

٤٠٤ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ شُعْبَةَ، عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ إِبرَاهِيمَ، عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الظُّهْرَ خَمْسًا، فَقَالُوا: أَزِيدَ فِي الصَّلَاةِ؟ قَالَ: «وَمَا ذَاكَ؟» قَالُوا: صَلَّيْتَ خَمْسًا، فَثَنّٰى رِجْلَيْهِ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ. [راجع: ٤٠١]

[404] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نے سہواً ظہر کی پانچ رکعات پڑھا دیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آیا نماز میں اضافہ کر دیا گیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کیوں، اصل بات کیا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: آپ نے پانچ رکعات پڑھا دی ہیں، (یہ سنتے ہی) آپ نے اپنے دونوں پاؤں موڑے اور دو سجدے کیے۔

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سہو کی صورت میں نماز کا اعادہ نہیں فرمایا۔ آپ نے سلام پھیرنے کے بعد لوگوں کی طرف توجہ فرمائی، یاد آنے پر آپ نے پہلی نماز پر بنا فرمائی، کعبے کی طرف پشت کرنے کی صورت میں آپ حکماً نماز کے حکم میں تھے، اگر نماز سے خارج ہو جاتے تو سابقہ نماز پر بنا نہ کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو انسان غلطی کی بنا پر قبلے سے انحراف کرے گا، اس کی نماز درست ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں۔[3] ② اس روایت کا تعلق عنوان کے دوسرے جز سے اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اپنے ظن کے مطابق عمل کیا جو خلاف واقعہ تھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب آپ کو توجہ دلائی تو آپ نے خلاف واقعہ کیے ہوئے عمل کو فساد نماز کا موجب نہیں ٹھہرایا بلکہ اسی وقت سہو کے دو سجدے

① فتح الباري: 657/1. ② فتح الباري: 656/1. ③ عمدة القاري: 392/3.

کیے۔ معلوم ہوا کہ ظن اگر واقعے کے خلاف بھی ہو تو فساد صلاۃ کا موجب نہیں۔ اس روایت کا تعلق عنوان کے پہلے جز سے بھی ہو سکتا ہے کہ استقبال قبلہ اتنی اہم چیز ہے کہ سجدۂ سہو کے لیے بھی اس کا وجوب ثابت ہے۔

(۳۳) بَابُ حَكِّ الْبُزَاقِ بِالْيَدِ مِنَ الْمَسْجِدِ

باب: 33- مسجد سے تھوک کو ہاتھ سے صاف کرنا

وضاحت: قبلے اور مسجد کے درمیان جو مناسبت ہے، وہ محتاج بیان نہیں کیونکہ مسجد میں قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے۔ مسجد میں ہر ایک کے لیے استقبال قبلہ کے تعین کی سہولت ہوتی ہے، اسی مناسبت سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ابواب قبلہ کے ساتھ مسجد کے احکام کو شامل کر دیا ہے۔ مسجد کی شان کیا ہے، اور اس کے آداب کیا ہیں؟ اب ان کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ آئندہ پچپن ابواب تک مسجد کے احکام بیان ہوں گے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس کا احترام انتہائی ضروری ہے۔ اگر اس میں کوئی نفرت والی چیز نظر آئے تو خادم وغیرہ کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ خود ہی اسے دور کر دیا جائے۔ عنوان میں ہاتھ کے الفاظ حدیث کی اتباع میں ذکر کیے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اسے ہاتھ ہی سے صاف کرنا ہے بلکہ جس طرح بھی ممکن ہو اسے صاف کرنا چاہیے۔

٤٠٥ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ حُمَيْدٍ، عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِ حَتَّى رُئِيَ فِي وَجْهِهِ، فَقَامَ فَحَكَّهُ بِيَدِهِ، فَقَالَ: «إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِي صَلَاتِهِ فَإِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ أَوْ إِنَّ رَبَّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا يَبْزُقَنَّ أَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهِ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ» ثُمَّ أَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهِ فَبَصَقَ فِيهِ، ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ، فَقَالَ: «أَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا». [راجع: ٢٤١]

[405] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے ایک دفعہ قبلے کی جانب کچھ تھوک دیکھا تو آپ کو سخت ناگواری ہوئی حتی کہ اس کے اثرات آپ کے چہرۂ انور پر دیکھے گئے۔ آپ (خود) کھڑے ہوئے اور اپنے دست مبارک سے صاف کر کے فرمایا: ''تم میں سے جب کوئی اپنی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو گویا وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے اور اس کا رب اس کے اور قبلے کے درمیان ہوتا ہے، لہٰذا تم میں سے کوئی (بحالت نماز) اپنے قبلے کی طرف نہ تھوکے بلکہ بائیں جانب یا اپنے قدم کے نیچے تھوکے۔'' پھر آپ نے اپنی چادر کے کنارے میں تھوکا اور اسے الٹ پلٹ کیا، اور فرمایا: ''اس طرح بھی کر سکتا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① اس باب کی روایات میں تین چیزوں کو باعث نفرت قرار دیا گیا ہے: نخامہ: سینے کا بلغم۔ مخاط: ناک سے بہنے والی رطوبت۔ بصاق: منہ کا تھوک۔ مسجد کے معاملے میں ان تینوں کا حکم یکساں ہے کہ یہ چیزیں جہاں کہیں نظر آئیں انھیں فوراً زائل کر دیا جائے۔ احترام مسجد کا تقاضا ہے کہ مسجد کے خادم یا مؤذن کا انتظار کیے بغیر ہر دیکھنے والا اسے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبلے کی طرف منہ کر کے تھوکنا حرام ہے اگرچہ مسجد سے باہر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی سنگینی حدیث میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہے کہ جو شخص قبلے کی طرف تھوکتا ہے قیامت کے دن جب یہ شخص اللہ کے حضور پیش

ہوگا تو اس کا تھوک اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ہوگا۔[1] ایک روایت میں ہے کہ قبلے کی طرف منہ کر کے تھوکنے والے کو جب قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اس کا تھوک اس کے چہرے پر ہوگا۔[2] حضرت سائب بن خلاد بیان کرتے ہیں کہ ایک امام مسجد نے دوران نماز میں قبلے کی جانب منہ کر کے تھوک دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے امامت سے معزول کر کے فرمایا: ”تو نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دی ہے۔“[3] ③ دوسری روایت میں سامنے نہ تھوکنے کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اس کے سامنے ہوتی ہے۔[4] اس سے قبلے کی عظمت معلوم ہوتی ہے، نیز اس کی تاویل کی کوئی ضرورت نہیں اگرچہ اس حدیث کے پیش نظر معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ یہ ان کی کھلی جہالت ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بائیں جانب یا پاؤں تلے تھوکنا بھی منع ہوتا۔[5] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث سے ان لوگوں کی بھی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے عرش پر ہے، لیکن حافظ صاحب کی جلالت قدر کے باوجود ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ متعدد آیات اور بکثرت احادیث اس امر کے متعلق قطعی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے مستوی علی العرش ہے۔ تمام ائمۂ سنت کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش معلی پر مستوی ہے اور ہر جگہ اس کی معیت سے مراد اس کی قدرت کاملہ اور وسیع علم ہے۔ بعض اہل علم کا موقف ہے کہ قدرت اور علم اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفات ہیں۔ معیت سے قدرت کاملہ اور وسیع علم مراد لینا بھی ایک قسم کی تاویل ہے جس کی ممانعت ہے، لہٰذا معیت کو بھی اپنے معنی میں ہی رکھا جائے اور یہ موقف اختیار کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق ہر ایک کے ساتھ ہے۔ یہ موقف بھی وزنی اور خاصا محتاط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کے متعلق مکمل بحث آئندہ کتاب التوحید میں آئے گی۔ بإذن اللّٰه تعالیٰ.

٤٠٦ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَّافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ؛ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى بُصَاقًا فِي جِدَارِ الْقِبْلَةِ فَحَكَّهُ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ يُصَلِّي فَلَا يَبْصُقْ قِبَلَ وَجْهِهِ، فَإِنَّ اللهَ قِبَلَ وَجْهِهِ إِذَا صَلَّى». [انظر: ٧٥٣، ١٢١٣، ٦١١١]

[406] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار قبلہ پر تھوک دیکھا تو اسے کھرچ ڈالا، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو اپنے سامنے کی جانب نہ تھوکے کیونکہ جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے۔“

فوائد و مسائل: ① ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحالت نماز دیوار قبلہ پر نخامہ (بلغم) دیکھا۔[6] دوسری روایت میں ہے کہ آپ اہل مسجد پر خفا ہوئے اور انھیں وعظ فرمایا، پھر منبر سے اترے اور اسے اپنے ہاتھوں سے دور فرمایا۔[7] علامہ اسماعیلی نے اپنی بیان کردہ روایت میں صراحت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زعفران منگوایا اور اسے تھوک کی جگہ پر لگایا۔

---

1 سنن أبي داود، الأطعمة، حديث: 3824. 2 صحيح ابن خزيمة: 278/2، حديث: 1313. 3 سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 481. 4 صحيح البخاري، حديث: 406. 5 فتح الباري: 658/1. 6 صحيح البخاري، الأذان، حديث: 753. 7 صحيح البخاري، العمل في الصلاة، حديث: 1213.

مساجد میں زعفران استعمال کرنے کی سنت اسی بنا پر قائم ہوئی۔[1] ② مسجد میں تھوکنے سے ممانعت کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں: * بندے کا اپنے رب سے مناجات میں مشغول ہونا۔ * اللہ تعالیٰ کا نمازی اور قبلے کے درمیان ہونا۔ * دیوار قبلہ کا احترام۔ * مسجد کا احترام۔ * نماز کا احترام اور کاتب حسنات فرشتے کا احترام۔ یہ سب وجوہ اشارتاً یا دلالتاً نصوص سے ثابت ہیں، لہٰذا ان سب وجوہ کے مجموعے کو باعث ممانعت قرار دیا جائے تو بہتر ہے، خاص طور پر نمازی کا مناجاتِ حق کے وقت بہترین حالت میں ہونا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، اس لیے ایسی حالت میں تھوکنا مناسب نہیں ہے، البتہ کسی مجبوری کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اس مجبوری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مختلف طریقے احادیث میں بتائے گئے ہیں جن کا آئندہ تذکرہ ہوگا۔ ③ امام بخاری رحمہ اللہ نے مساجد سے متعلق ان ابواب میں دو چیزیں بیان فرمائی ہیں: * آدابِ مسجد، انھیں مختلف انداز میں ثابت فرمایا، مثلاً: حک بزاق (تھوک کا کھرچنا) وغیرہ * کچھ چیزوں کا استثنا فرمایا جن کا مسجد میں کرنا جائز ہے جیسا کہ مسجد میں سونا وغیرہ کیونکہ مساجد کے متعلق کچھ تشددات اور وعیدات وارد ہوئی ہیں اور پھر ان کے کچھ آداب بھی ذکر ہوئے ہیں جن سے شبہ ہو سکتا ہے کہ ان میں تلاوت قرآن، ذکر اللہ اور ادائے نماز کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہ کیا جائے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان ابواب میں ایسی باتوں یا ایسے کاموں کا تذکرہ کیا ہے جنھیں مسجد میں کیا جا سکتا ہے۔

٤٠٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى فِي جِدَارِ الْقِبْلَةِ مُخَاطًا أَوْ بُصَاقًا أَوْ نُخَامَةً فَحَكَّهُ.

[407] ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار قبلہ پر ناک کی رطوبت یا تھوک یا بلغم دیکھا تو اسے کھرچ دیا۔

فائدہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بلغم، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں تھوک اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں شک کے طور پر ناک کی رطوبت، تھوک اور بلغم کا ذکر ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان تینوں روایات کو لا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ منہ کا تھوک ہو یا ناک کی رطوبت یا سینے کا بلغم، تینوں ہی قابل نفرت چیزیں ہیں اور مسجد کے معاملے میں ان کا حکم برابر ہے۔ یہ چیزیں مسجد کے فرش پر نظر آئیں یا دیوار قبلہ پر، تر ہوں یا خشک، احترام مسجد کے پیش نظر ضروری ہے کہ انھیں فوراً دور کر دیا جائے، یہ ہر دیکھنے والے کی ذمے داری ہے، مسجد کے خادم یا مؤذن کا انتظار نہ کیا جائے۔ اس سے نمازیوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا انھیں کسی صورت میں بھی برقرار نہ رکھا جائے۔

(٣٤) بَابُ حَكِّ الْمُخَاطِ بِالْحَصَى مِنَ الْمَسْجِدِ

باب: 34- مسجد میں ناک کی رطوبت پڑی ہو تو اسے کنکری سے کھرچ دینا

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: إِنْ وَطِئْتَ عَلَى قَذَرٍ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اگر تمھارا پاؤں کسی تر

① فتح الباري: 659/1.

رَطْبٍ فَاغْسِلْهُ، وَإِنْ كَانَ يَابِسًا فَلَا .

گندگی پر پڑ جائے تو اسے دھولو اور اگر خشک گندگی پر پڑے تو دھونے کی ضرورت نہیں۔

فوائد و مسائل: ① بعض شارحین نے باب: 33 میں بالید (ہاتھ کے ساتھ) اور اس باب میں بالحصی (کنکری کے ساتھ) کے الفاظ سے یہ سمجھا ہے کہ یہ دونوں بالمقابل ہیں۔ ان کے نزدیک باب سابق میں یہ بتلانا تھا کہ قابل نفرت چیز کو کسی آلے کی مدد کے بغیر اپنے ہاتھ سے دور کرے اور اس باب سے مقصود یہ ہے کہ اس طرح کی اشیاء کو کنکری یا کسی دوسری چیز کی مدد سے زائل کر دے، حالانکہ یہ تشریح سرسری اور سطحی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقصد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک تو مسجد میں آنے والے ہر شخص کی ذمے داری ہے کہ جب وہ مسجد میں کوئی قابل نفرت چیز دیکھے تو اسے ایک لحہ بھی نہ پڑا رہنے دے اور جس طرح بھی ممکن ہو اسے صاف کرنے کی کوشش کرے۔ مختلف ابواب میں مختلف الفاظ کا استعمال امام بخاری رحمہ اللہ کا تفنن ہے یا الفاظ روایات کا اتباع۔ امام بخاری کا یہ طریقۂ کار بکثرت صحیح بخاری میں موجود ہے۔ ② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (104/1) میں باسند بیان کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس اثر کو لانے کا مقصد بایں الفاظ بیان کیا ہے: مسجد میں تھوکنے کے متعلق امتناعی حکم میں اہم ترین علت احترام قبلہ ہے، محض تھوک وغیرہ کا قابل نفرت ہونا نہیں۔ اگرچہ ان چیزوں کا قابل نفرت ہونا بھی ایک سبب ہے، لیکن قبلے کے احترام کی بات اس سے زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد میں تر اور خشک کا فرق بھی روا نہیں رکھا گیا، حالانکہ جن چیزوں میں نہی کی علت محض ان کا قابل نفرت ہونا ہے وہاں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ خشک پر پاؤں پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں اور تر پر پاؤں آ جائے تو اسے دھونا ہوگا۔ گویا حضرت ابن عباس کے اثر میں تر اور خشک کا یہ فرق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ معاملہ مسجد کا نہیں ہے۔ مسجد کے معاملے میں تر اور خشک کا فرق نہیں کیا جائے گا بلکہ گندی چیز تر ہو یا خشک، اسے مسجد سے باہر پھینکنا ہوگا۔[1]

٤٠٨، ٤٠٩ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: أَخْبَرَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ؛ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ وَأَبَا سَعِيدٍ حَدَّثَاهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى نُخَامَةً فِي جِدَارِ الْمَسْجِدِ، فَتَنَاوَلَ حَصَاةً فَحَكَّهَا، فَقَالَ: «إِذَا تَنَخَّمَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمَنَّ قِبَلَ وَجْهِهِ، وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى». [انظر: ٤١٠، ٤١١، ٤١٤، ٤١٦]

[409,408] حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی دیوار پر بلغم دیکھا تو ایک کنکری لی اور اسے کھرچ دیا اور فرمایا: ''اگر کسی کو بلغم آئے تو وہ اسے سامنے کی جانب تھوکے نہ دائیں جانب، بلکہ اپنی بائیں جانب یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے۔''

[1] فتح الباري: 660/1.

فائدہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ اس عنوان سے امام بخاری رحمہ اللہ ان حضرات کی تردید کرتے ہیں جنھوں نے مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ناک کی رطوبت کو ناپاک قرار دیا ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا بذات خود اس کام کو سرانجام دینا صرف مسجد کی نظافت کے پیش نظر نہ تھا بلکہ آپ مسجد کو نجاست سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے پیش نظر ان حضرات کی تردید ہی ہو کیونکہ امام بخاری نے عام طور پر اپنے تراجم میں ایسی چیزوں کو ملحوظ رکھا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر بھی شاید اسی مقصد کے پیش نظر ذکر کیا ہو کہ اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے، لیکن میرے نزدیک اس کی عمدہ توجیہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے پاس ایک حدیث متعدد سندوں سے ہوتی ہے تو وہ ان تمام سندوں کو ایک جگہ ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کی عادت ہے کہ ہر روایت کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں اور الفاظ حدیث کی رعایت سے عنوان اور ترجمہ میں تنوع پیدا کر دیتے ہیں اور اصل مقصد اس حدیث کی مختلف سندوں کا ذکر کرنا ہوتا ہے وگرنہ باب البزاق اور باب المخاط دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد بعض اوقات ابواب نہیں بلکہ روایات ہوتی ہیں، چنانچہ یہاں بھی مقصود ابواب نہیں بلکہ روایات ہیں۔ واللہ أعلم.

(٣٥) بَابٌ: لَا يَبْصُقْ عَنْ يَمِينِهِ فِي الصَّلَاةِ

باب: 35- بحالت نماز اپنی دائیں جانب نہیں تھوکنا چاہیے

٤١٠، ٤١١ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ أَنَّ أَبَا هُرَيْرَةَ وَأَبَا سَعِيدٍ أَخْبَرَاهُ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى نُخَامَةً فِي حَائِطِ الْمَسْجِدِ، فَتَنَاوَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَصَاةً فَحَتَّهَا، ثُمَّ قَالَ: «إِذَا تَنَخَّمَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمْ قِبَلَ وَجْهِهِ، وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى». [راجع: ٤٠٨، ٤٠٩]

[410، 411] حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی دیوار پر بلغم لگا ہوا دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے ایک سنگریزہ اٹھایا اور اسے صاف کر دیا، پھر فرمایا: ''اگر کسی کو بلغم آئے تو وہ اسے سامنے کی جانب نہ تھوکے اور نہ دائیں جانب ڈالے بلکہ اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں بحالت نماز دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کا ذکر کیا ہے جبکہ روایات مطلق ہیں، ان میں نماز کی قید نہیں ہے، تاہم دیگر روایات میں نماز کی قید موجود ہے جیسا کہ صحیح بخاری، حدیث انس: 413 اور حدیث ابی ہریرہ: 416 میں ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ان مطلق روایات کو مقید روایات پر محمول کیا جائے گا۔ نماز کے علاوہ دائیں جانب تھوکنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق دیگر روایات کو دیکھنا ہوگا۔ ② امام نووی رحمہ اللہ نے اس کے متعلق مطلق طور پر ممانعت کا ذکر کیا ہے، خواہ مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر، نماز میں ہو یا نماز سے خارج، چنانچہ متعدد اسلاف سے اس

کی ممانعت منقول ہے جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نماز کے علاوہ بھی دائیں جانب تھوکنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کبھی دائیں جانب نہیں تھوکا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے صاحبزادے کو دائیں جانب تھوکنے سے مطلق طور پر منع فرمایا۔ جو حضرات بحالت نماز کی قید لگاتے ہیں ان کی دلیل غالباً وہ روایت ہے جس میں ہے کہ نماز میں دائیں جانب فرشتہ ہوتا ہے۔[1] یہ اس صورت میں ہوگا کہ جب نگرانی کرنے اور حسنات لکھنے والے فرشتوں کے علاوہ فرشتہ مراد ہو کیونکہ نگران اور کراماً کاتبین تو ہر وقت ہی دائیں جانب رہتے ہیں۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں في الصلاة کا لفظ بڑھا کر امام مالک کی تائید کی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ ممانعت نماز کے ساتھ خاص ہے۔ ہمارے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف راجح ہے کیونکہ بحالت نماز اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ نمازی کی دائیں جانب متعین کرتا ہے جو اس کے دل کی حفاظت کرتا ہے، اس لیے بحالت نماز دائیں جانب تھوکنا ممنوع اور بائیں جانب جائز ہے۔ واضح رہے کہ نمازی کو بائیں جانب تھوکنے کی اجازت اس وقت ہوگی جب اس کے بائیں جانب کوئی نمازی نہ ہو جیسا کہ ہم آئندہ حدیث میں اس کی وضاحت کریں گے۔ بائیں جانب تھوکنے کے جواز کے لیے مشہور ہے کہ بائیں جانب شیطان ہوتا ہے جو اس کے دل میں وساوس ڈالتا ہے، یہ تھوک شیطان کے سر پر گرتا ہے اور یوں اس کی ذلت و رسوائی کا سامان ہوتا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ایک روایت ہے جو اگرچہ مشہور ہے لیکن بالکل ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو: (المعجم الكبير، للطبراني: 199/8، رقم الحديث: 7808، الطبعة الثانية)

٤١٢ - حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: أَخْبَرَنِي قَتَادَةُ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسًا قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «لَا يَتْفِلَنَّ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ رِجْلِهِ». [راجع: ٢٤١]

[412] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنے سامنے یا اپنی دائیں جانب نہ تھوکے بلکہ اسے بائیں جانب یا بائیں پاؤں تلے تھوکنا چاہیے۔''

فائدہ: قاضی عیاض نے صراحت کی ہے کہ نماز میں دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت بھی اس وقت ہے جبکہ کوئی دوسری صورت ممکن ہو اور اگر مجبوری ہو تو دائیں جانب بھی تھوکا جا سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کپڑے کے موجود ہونے کی صورت میں کوئی مجبوری نہیں ہو سکتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے کہ ایسی صورت میں کپڑے میں تھوک کر اسے مسل دیا جائے۔ علامہ خطابی کہتے ہیں کہ اگر بائیں جانب کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو پھر پاؤں کے نیچے یا اپنے کپڑے میں تھوکنا متعین ہے جیسا کہ ابوداود کی ایک روایت میں ہے کہ اگر بائیں جانب کوئی دوسرا نمازی ہو تو پاؤں کے نیچے تھوک کر اسے مسل دیا جائے۔[3] اور اگر پاؤں کے نیچے کوئی قالین یا صف وغیرہ بچھی ہو تو پھر کپڑے ہی میں تھوک لینا چاہیے۔ اگر کپڑا بھی موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کا نگل لینا ہی امر ممنوع کے ارتکاب سے اولیٰ معلوم ہوتا ہے۔[4] واللہ أعلم.

---

[1] صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 416. [2] فتح الباري: 661/1. [3] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 478. [4] فتح الباري: 661/1.

(٣٦) بَابٌ: لِيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى

باب: 36- نمازی کو اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہیے

وضاحت: نمازی کو اپنی بائیں جانب بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنے کی اجازت عام نہیں کیونکہ اس سلسلے میں وارد روایات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں یا بحالت نماز تھوکنے میں توسع نہیں بلکہ اضطرار اور انتہائی مجبوری کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بایں طور ترتیب ملحوظ رکھی جائے: اگر دوران نماز میں ایسی حالت ہو جائے تو پہلے اسے روکنے کی کوشش کرے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو بائیں جانب تھوکنا چاہیے بشرطیکہ اس طرف اور کوئی نمازی نہ ہو۔ اگر یہ سمت خالی نہ ہو تو بائیں پاؤں کے نیچے جبکہ نیچے صف یا قالین نہ ہو۔ اگر نیچے قالین یا دری وغیرہ ہو تو پھر اس کام کے لیے کپڑا استعمال کیا جائے، اگر کپڑا بھی نہ ہو تو اسے نگل لینا بہتر ہے تاکہ کسی ممنوع امر کا ارتکاب نہ ہو۔

٤١٣ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يُنَاجِي رَبَّهُ، فَلَا يَبْزُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ». [راجع: ٢٤١]

[413] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب مومن نماز میں ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے راز و نیاز میں مصروف ہوتا ہے، اس لیے اسے اپنے سامنے یا اپنی دائیں جانب نہیں تھوکنا چاہیے بلکہ اپنی بائیں جانب یا اپنے قدم تلے تھوکنا چاہیے۔''

فائدہ: دوران نماز میں دائیں جانب نہ تھوکنے کی وجہ دائیں جانب کے فرشتے کی عزت و تکریم ہے جو غالباً نماز کے وقت خصوصی طور اس جانب مقرر ہوتا ہے۔

٤١٤ - حَدَّثَنَا عَلِيٌّ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ؛ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَبْصَرَ نُخَامَةً فِي قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ فَحَكَّهَا بِحَصَاةٍ، ثُمَّ نَهٰى أَنْ يَبْزُقَ الرَّجُلُ بَيْنَ يَدَيْهِ أَوْ عَنْ يَمِينِهِ، وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى.

[414] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی ﷺ نے مسجد کے قبلے کی طرف بلغم دیکھا تو اسے ایک سنگریزے سے دور کر دیا، پھر آپ نے سامنے کی سمت یا دائیں طرف تھوکنے سے منع فرمایا اور بائیں جانب یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنے کی اجازت دی۔

وَعَنِ الزُّهْرِيِّ سَمِعَ حُمَيْدًا عَنْ أَبِي سَعِيدٍ نَحْوَهُ. [راجع: ٤٠٩]

اس روایت کے ایک طریق میں امام زہری نے اپنے شیخ حمید طویل سے سماع کی تصریح بھی کی ہے، وہ ابوسعید

خدری رضی اللہ عنہ سے مذکورہ روایت کی طرح بیان کرتے ہیں۔

فوائد و مسائل: ① عنوان میں بصاق (تھوک) اور اس روایت میں بلغم کے ذکر سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تھوک، بلغم اور ناک کی رطوبت وغیرہ تمام ہی ناگوار اور قابل نفرت چیزیں ہیں۔ ان ناپسندیدہ چیزوں کا مسجد کے بارے میں ایک ہی حکم ہے۔[1] ② اس روایت میں بائیں طرف تھوکنے کے الفاظ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اختلاف کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ قاضی عیاض کے نزدیک مسجد میں تھوکنا جائز ہے لیکن اس کا دفن نہ کرنا گناہ ہے جبکہ امام نووی کہتے ہیں کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس گناہ کی تلافی اس کا دفن کر دینا ہے۔ امام بخاری کے قائم کردہ عنوان سے قاضی عیاض کے موقف کے راجح ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ أعلم. ③ روایت کے آخر میں ایک سند نقل کر کے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ روایت اگرچہ بصیغۂ عَنْ بیان ہوئی ہے لیکن امام زہری کا سماع اپنے شیخ حمید بن عبدالرحمٰن سے ثابت ہے، لہٰذا اس میں تدلیس کا کوئی شبہ نہیں ہے۔

(٣٧) بَابُ كَفَّارَةِ الْبُزَاقِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 37- مسجد میں تھوکنے کا کفارہ

٤١٥ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اَلْبُزَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيئَةٌ وَكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا».

[415] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: ”مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس (گناہ) کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے۔“

فوائد و مسائل: ① مسجد میں تھوکنا اس کے تقدس اور احترام کے خلاف ہے لیکن اگر کسی مجبوری کے پیش نظر اس کی نوبت آ جائے تو اس کا تدارک اور کفارہ یہ ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ فرش پر ریت یا مٹی ہو۔ اور اگر مسجد کا فرش پختہ ہو تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے۔ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اختلاف کی طرف اشارہ فرمایا ہے: علامہ نووی رحمہ اللہ کے نزدیک حالت نماز اور مسجد میں تھوکنا بہرحال گناہ ہے، خواہ اسے دفن کرنے کا ارادہ کرے یا نہ کرے، اگر اسے دفن کر دے گا تو اس گناہ کی تلافی ہو جائے گی، جبکہ قاضی عیاض کا کہنا ہے کہ تھوکتے وقت اگر اس نے ازالے کا ارادہ کیا تھا تو کچھ گناہ نہیں، البتہ اگر اس کا ازالہ نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث کے عموم میں تعارض ہے۔ ایک حدیث ہے کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور دوسرا ارشاد ہے کہ بوقت ضرورت بائیں جانب اور بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنا جائز ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے پہلے ارشاد کو عام رکھتے ہوئے دوسرے میں اس طرح تخصیص کی ہے کہ بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکنے کی اجازت مسجد میں نہ ہونے کی صورت میں ہے جبکہ قاضی عیاض نے دوسرے ارشاد کو عموم پر باقی رکھتے ہوئے پہلے ارشاد میں اس طرح تخصیص کی ہے کہ اگر تھوکنے کے بعد زمین میں اسے دفن کرنے کا ارادہ نہ ہو تو مسجد میں

[1] فتح الباري: 661/1.

تھوکنا گناہ ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ متقدمین میں سے متعدد علماء نے قاضی عیاض کی تائید کی ہے، پھر چند ایسی روایات کا حوالہ دیا ہے جن سے قاضی عیاض کا موقف راجح قرار پاتا ہے۔[1] بہر حال حدیث کے مطابق مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اگر کسی سے یہ گناہ سرزد ہو گیا ہو تو اس کا کفارہ دفن کر دینا ہے، گویا اس کا دفن کر دینا گناہ کے بعد توبہ کے درجے کی بات ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ان احادیث سے ثابت فرمایا ہے کہ دوران نماز میں یا مسجد میں اگر تھوکنے کی مجبوری ہو تو مسجد کے آداب اور نمازیوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ② ابتدائے اسلام میں مساجد کچی تھیں اور ان کے صحن میں مٹی یا ریت وغیرہ ہوتی تھی جن میں تھوک لینا اور پھر اسے مٹی یا ریت میں چھپا دینا ممکن تھا جبکہ آج کل مساجد پختہ ہیں اور ان کے فرش بھی پختہ ہیں جن پر بہترین چٹائیاں یا قالین بچھے ہوتے ہیں، ایسے حالات وظروف میں رومال وغیرہ ہی مناسب ہے کہ اس میں تھوک لیا جائے، لہٰذا ایسے حالات میں مذکورہ احادیث سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مساجد کے در و دیوار پر تھوکنا سخت گناہ اور مساجد کی بے حرمتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا ہے جو مساجد کے تقدس کو اس طرح پامال کرتے ہیں۔ بنابریں حالات وظروف بدل جانے کے نتیجے میں اب بائیں جانب یا پیر تلے تھوکنا قطعاً غیر مناسب ہے۔ اب صرف دو ہی صورتوں پر عمل کیا جانا چاہیے: یا تو تھوک یا بلغم نگل لیا جائے یا پھر اس کے لیے رومال یا ٹشو پیپر استعمال کیا جائے۔

(٣٨) بَابُ دَفْنِ النُّخَامَةِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 38- مسجد میں پڑے بلغم وغیرہ کو مٹی کے اندر چھپا دینا

٤١٦ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ، عَنْ هَمَّامٍ: سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَلَا يَبْصُقْ أَمَامَهُ، فَإِنَّمَا يُنَاجِي اللهَ مَا دَامَ فِي مُصَلَّاهُ، وَلَا عَنْ يَمِينِهِ فَإِنَّ عَنْ يَمِينِهِ مَلَكًا، وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ، أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ، فَيَدْفِنُهَا». [راجع: ٤٠٨]

[416] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ”جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ اپنے آگے نہ تھوکے کیونکہ جب تک وہ اپنی جائے نماز میں ہے، اللہ تعالیٰ سے مناجات کر رہا ہے، اور نہ اپنی دائیں جانب ہی اسے پھینکے کیونکہ اس کی دائیں جانب ایک فرشتہ ہے بلکہ اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوک لے، پھر اسے دفن کر دے۔“

فوائد ومسائل: ① سابقہ احادیث میں تھوکنے کی ممانعت کے کئی اسباب بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سبب اعظم اللہ تعالیٰ اور نمازی کے درمیان مواجہت کا احترام ہے۔ باقی تمام اسباب اس کے تحت آتے ہیں۔ اسباب حسب ذیل ہیں: * نمازی کی اللہ تعالیٰ سے مناجات۔ * اللہ تعالیٰ کا بحالت نماز قبلے اور نمازی کے درمیان ہونا۔ * احترام قبلہ۔ * دیوار قبلہ کی تلویث۔ * اللہ اور اس کے رسول کی ایذا رسانی۔ * نمازیوں کا احترام۔ * دائیں جانب متعین فرشتے کا احترام۔ تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ اجازت صرف اضطرار اور مجبوری کی حالت میں ہے۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں مسجد کی قید ذکر کی ہے جبکہ حدیث

---

① فتح الباري: 1/662-663.

میں مسجد کا ذکر نہیں ہے؟ آپ کا استدلال نماز کے لیے کھڑا ہونے کے لفظ سے ہے لیکن ان الفاظ سے عموم سمجھا جاتا ہے، یعنی مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہو یا مسجد کے علاوہ باہر کسی دوسرے مقام پر، ہر وقت یہ پابندی ضروری ہے۔ پھر آپ نے قبل ازیں کفارے کا ذکر کیا تھا اور اس مقام پر صرف دفن کر دینے پر اکتفا کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ دو حالتوں کو بیان کرنا چاہتے ہیں: ایک یہ کہ انسان دانستہ طور پر مسجد میں بلاوجہ تھوکنے کی حرکت کرتا ہے تو یہ گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ انسان مجبوراً ایسی حرکت کرتا ہے تو اس کی تلافی اس باب میں بیان کی ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے یا کسی چیز سے اسے دور کر دیا جائے۔[1] ③ اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ بحالت نماز تھوکنے کی ممانعت ہے جبکہ ایذائے مسلم کا تقاضا ہے کہ یہ ممانعت مطلق طور پر ہے، خواہ نماز پڑھ رہا ہو یا نماز کے علاوہ مسجد میں موجود ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوکنے سے ممانعت کے کئی ایک مراتب ہیں، یعنی مسجد میں مطلق طور پر تھوکنا سنگین جرم ہے لیکن دیوار قبلہ پر تھوکنا اس سے زیادہ سنگین ہے، پھر بحالت نماز قبلے کی طرف تھوکنا انتہائی بے ادبی اور گھناؤنا جرم ہے۔[2] ④ دفن کر دینے کا مفہوم یہ نہیں کہ اس پر معمولی سی مٹی ڈال کر اسے چھپا دیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے اگر کوئی وہاں بیٹھتا ہے تو مزید گندگی پھیلنے کا اندیشہ ہے بلکہ دفن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین کھود کر تھوک کو اس کے اندر دبا دیا جائے، پھر زمین کو ہموار کر دیا جائے۔ یہ اس صورت میں ہے جب زمین کچی ہو۔ اگر پختہ زمین پر تھوکنے کی نوبت آ جائے تو دفن کرنے کے بجائے اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے اور مسجد کے فرش کو صاف کر کے وہاں خوشبو وغیرہ لگا دی جائے تا کہ کسی قسم کی ناگواری نہ ہو۔

(٣٩) بَابٌ: إِذَا بَدَرَهُ الْبُزَاقُ فَلْيَأْخُذْ بِطَرَفِ ثَوْبِهِ

٤١٧ - حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ عَنْ أَنَسٍ؛ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَى نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ فَحَكَّهَا بِيَدِهِ، وَرُئِيَ مِنْهُ كَرَاهِيَةٌ أَوْ رُئِيَ كَرَاهِيَتُهُ لِذٰلِكَ وَشِدَّتُهُ عَلَيْهِ، وَقَالَ: «إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ فِي صَلَاتِهِ فَإِنَّمَا يُنَاجِي رَبَّهُ، أَوْ رَبُّهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قِبْلَتِهِ، فَلَا يَبْزُقَنَّ فِي قِبْلَتِهِ، وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ»، ثُمَّ أَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهِ، فَبَزَقَ فِيهِ وَرَدَّ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ، قَالَ: «أَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا». [راجع: ٢٤١]

باب: 39- جب تھوک نمازی کو مجبور کر دے تو اسے اپنے کپڑے کے کنارے میں تھوک لینا چاہیے

[417] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قبلے کی سمت ناک کی رطوبت لگی ہوئی دیکھی تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا اور اس کی ناگواری آپ کے چہرے سے ظاہر ہوئی یا اس وجہ سے آپ کی ناگواری اور اس کی گرانی معلوم ہوئی۔ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ یا (فرمایا کہ) اس کا پروردگار اس کے اور قبلے کے درمیان ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنے قبلے کی جانب نہ تھوکے بلکہ وہ اپنی بائیں جانب یا اپنے پاؤں

[1] فتح الباري: 663/1. [2] فتح الباري: 664/1.

کے نیچے تھوکے۔'' اس کے بعد آپ نے اپنی چادر کا
کنارہ لیا اور اس میں تھوکا۔ پھر آپ نے اس کے ایک حصے
کو دوسرے حصے پر مل دیا اور فرمایا:''اس طرح بھی کر سکتا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① دوران نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت پیش آ جائے تو دو صورتیں پہلے بیان ہو چکی ہیں: ایک بائیں جانب اور دوسری بائیں پاؤں کے نیچے۔ اس کے آداب وشرائط بھی بیان ہو چکے ہیں۔ ایک تیسری صورت کو اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ اپنے کپڑے میں تھوک کر اسے مل دینا چاہیے، مگر اس تیسری صورت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے مقید کیا ہے کہ کپڑے میں لے کر رگڑنے کی صورت اس وقت ہے جب تھوک نمازی پر غالب آ جائے اور نمازی اس کے غلبے کے وقت دائیں بائیں جانب کا امتیاز نہ کر سکے، ایسی مجبوری میں اسے کپڑے میں لے کر مل دینا چاہیے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں جس قید کا ذکر کیا ہے وہ حدیث میں موجود نہیں۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''عنوان کے الفاظ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ان دو روایات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں تھوک کے غلبے کی قید موجود ہے جیسا کہ امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ ایسے حالات میں نمازی اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوک لے لیکن اگر تھوک عجلت پر مجبور کرے تو اسے اپنے کپڑے میں اس طرح لے لے، پھر اس کے ایک کنارے کو دوسرے پر رگڑ دے۔ اسی طرح ابوداود میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ نمازی اپنے کپڑے میں تھوکے، پھر ایک کنارے کو دوسرے سے رگڑ دے۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ جن احادیث میں یہ تفصیل نہیں انھیں مفصل احادیث پر محمول کیا جائے۔''[1] واللہ أعلم۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے عناوین سے بیشتر احادیث کے عموم کی تخصیص، اطلاق کی تقیید یا خصوص کی تعمیم کرتے ہیں۔ بعض اوقات حدیث میں کوئی ابہام ہوتا ہے تو عنوان میں کسی لفظ کا اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تراجم کو شارحہ کہا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر نماز میں تھوکنے کی ضرورت پیش آ جائے تو موقع ومحل کے مطابق ان تفصیلات پر عمل کیا جائے جو روایات سابقہ میں مذکور ہیں اور ان میں ایک مجبور کن صورت مذکورہ حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

(٤٠) بَابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النَّاسَ فِي إِتْمَامِ الصَّلَاةِ وَذِكْرِ الْقِبْلَةِ

باب: 40- ذکر قبلہ اور اتمام صلاۃ کے متعلق امام کا لوگوں کو وعظ کرنا

وضاحت: ارکان نماز کی پوری طرح ادائیگی کے لیے امام کو مقتدیوں کی حرکات پر نظر رکھنی چاہیے۔ اگر کوئی اس سلسلے میں کوتاہی نظر آئے تو امام کو چاہیے کہ اس پر انھیں تنبیہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ تھوکنے کی مجبوری میں غلط روی اختیار کر لیں اور بلاوجہ قبلے سے منحرف ہو جائیں کیونکہ قبلے کا معاملہ بہت ہی اہم ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی مقصد کے پیش نظر مذکورہ عنوان بندی کی ہے۔

---

① فتح الباري : 665/1.

٤١٨ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هَاهُنَا؟ فَوَاللهِ مَا يَخْفَى عَلَيَّ خُشُوعُكُمْ وَلَا رُكُوعُكُمْ، إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي». [انظر: ٧٤١]

[418] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میرا منہ اس طرف سمجھتے ہو؟ اللہ کی قسم! مجھ پر نہ تمھارا خشوع پوشیدہ ہے اور نہ تمھارا رکوع۔ اور میں تمھیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔''

٤١٩ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ صَالِحٍ قَالَ: حَدَّثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ هِلَالِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَنَسِ ابْنِ مَالِكٍ قَالَ: صَلَّى بِنَا النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةً، ثُمَّ رَقِيَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ فِي الصَّلَاةِ وَفِي الرُّكُوعِ: «إِنِّي لَأَرَاكُمْ مِنْ وَرَائِي كَمَا أَرَاكُمْ». [انظر: ٧٤٢، ٦٦٤٤]

[419] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور نماز اور رکوع کے متعلق فرمایا: ''بے شک میں تمھیں اپنے پیچھے سے اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے مصالح مساجد کی طرف اشارہ فرمایا کہ امام کو چاہیے وہ مقتدیوں کے احوال پر نظر رکھے۔ اگر وہ نماز وغیرہ صحیح نہ پڑھتے ہوں تو انھیں تنبیہ کرے۔ اگر اسے دائیں بائیں التفات کرنا پڑے تو اس میں چنداں حرج نہیں، البتہ یہ التفات گوشۂ چشم سے ہونا چاہیے۔ اپنا منہ اور سینہ قبلے کی طرف رکھے کیونکہ چہرے کا انحراف کراہت اور سینے کا انحراف فساد نماز کا حکم رکھتا ہے۔ بعض شارحین نے رکوع کی مناسبت سے خشوع سے مراد سجدہ لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک بہتر ہے کہ خشوع کو اپنے عموم پر رکھا جائے تاکہ تمام افعال نماز اس میں آجائیں، خاص طور پر رکوع کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس میں کوتاہی زیادہ ہوتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جلد بازی میں بہت سے لوگ رکوع کا اتمام نہیں کرتے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں خشوع کے بجائے سجود کے الفاظ ہیں۔[1] ② رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں پچھلی سمت سے بھی سامنے کی طرح دیکھتا ہوں۔'' اس روایت کے متعلق شارحین کے کئی اقوال ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: * اس سے مراد آپ کا معلوم کر لینا ہے، خواہ بذریعۂ وحی ہو یا بطریق الہام، ان کے ذریعے سے آپ کو مقتدی حضرات کی حرکات و سکنات بتا دی جاتی تھیں، مگر یہ درست نہیں کیونکہ اس سے پیٹھ پیچھے دیکھنے کی قید بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ * رسول اللہ ﷺ دائیں بائیں کے لوگوں کو کسی قدر التفات نظر سے دیکھ لیتے ہوں گے، مگر یہ رائے بھی بے وزن ہے کیونکہ اس میں آپ کی کیا خصوصیت رہی۔ * دیوار قبلہ میں آئینے کی طرح رسول اللہ ﷺ کے سامنے نمازیوں کی تصاویر آ جاتی تھیں جس سے آپ صورت حال سے مطلع ہو جاتے تھے۔ عام مشائخ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے لیکن اس پر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ملتی۔ * رسول اللہ ﷺ کو پشت مبارک میں

1 فتح الباري: 666/1.

قوت باصرہ عطا فرمائی گئی تھی، پھر آگے وضاحت ہے کہ قوت باصرہ مہر نبوت میں تھی یا دونوں کندھوں کے درمیان سوئی کی نوک کی طرح آنکھیں عطا کی گئی تھیں۔ اس موقف کو بھی محققین نے مسترد کر دیا ہے کہ اگر ایسی بات ہوتی تو سیرت نگار آپ کے احوال میں اس کا تذکرہ کرتے۔ ✹ سب سے بہتر اور راجح موقف یہ ہے جسے جمہور نے اختیار کیا ہے کہ سامنے کی طرح پیچھے بھی دیکھنا رسول اللہ ﷺ کے خصائص سے تھا اور وہی علم و ادراک حقیقی کا سبب تھا جو بطور خرق عادت (معجزہ) آپ کو حاصل تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا پسندیدہ موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انھوں نے اسی روایت کو علامات نبوت میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ اہل سنت و الجماعت کا بھی یہی رجحان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو عام انسانوں کی مقررہ عادت کے خلاف انھی آنکھوں سے ہر سمت دیکھنے کی طاقت عطا فرما دی تھی، اس لیے بعید نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے نماز میں یہ خصوصیت ہو کہ آپ مقتدیوں کو بلاجہت دیکھتے ہوں، لیکن یہ حالت کلی طور پر نہیں رہتی تھی کہ اس سے مسئلۂ علم غیب کشید کیا جا سکے کیونکہ ابوبکرہ کی روایت میں ہے کہ وہ مسجد میں آئے جبکہ جماعت ہو رہی تھی۔ انھوں نے دور ہی سے رکوع کر لیا۔ نماز کے بعد دریافت کرنے پر رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے انھیں تنبیہ فرمائی۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے ہانپتے کانپتے ہوئے رکوع سے اٹھتے وقت بلند آواز سے حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ کے الفاظ کہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بعد دریافت فرمایا کہ باآواز بلند یہ کلمات کہنے والا کون تھا؟ بتانے پر معلوم ہوا کہ وہ فلاں شخص تھا۔ اگر آپ کو ہمیشہ بحالت نماز پیچھے سے نظر آتا رہتا تو دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نمازی کو خشوع اور اتمام ارکان کی طرف توجہ دینی چاہیے، نیز امام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو نماز سے متعلقہ مسائل و احکام پر متنبہ کرتا رہے، خاص طور پر اگر ان میں کوتاہی نظر آئے تو اس کی اصلاح کرنے میں پوری توجہ کرنی چاہیے۔[1] واللہ أعلم.

(٤١) بَابٌ: هَلْ يُقَالُ: مَسْجِدُ بَنِي فُلَانٍ؟

باب: 41- کیا مسجد بنی فلاں کہا جا سکتا ہے؟

وضاحت: قرآن کریم میں ہے کہ تمام مساجد اللہ کی ہیں۔[2] اس آیت کریمہ کے ہوتے ہوئے کسی مسجد کو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اور ایسی مساجد میں نماز پڑھنے کی کیا حیثیت ہے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان بالا قائم کر کے واضح فرمایا کہ مساجد کے متعلق اس طرح کی نسبت جائز ہے کیونکہ اضافت صرف تملیک کے لیے نہیں ہوتی بلکہ دوسرے تعلقات، جیسے تولیت، قرب اور بانی ہونے کی وجہ سے بھی اضافت کی نسبت قائم کی جا سکتی ہے۔ امام بخاری چونکہ بہت باریک بین ہیں، اس لیے آپ نے هَلْ سے، یعنی تردد کے ساتھ عنوان قائم کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک مسجد، مسجد بنی زریق کہلاتی تھی، لیکن یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کے علم میں یہ بات آئی تھی یا نہیں؟ اس لیے ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد مسجد بنی زریق کہا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں استدلال تمام نہ ہوگا۔[3] واللہ أعلم.

٤٢٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا

[420] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ایک

① فتح الباري: 667/1. ② الجن 18:72. ③ فتح الباري: 667/1.

مَالِكٌ عَنْ نَّافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِي أُضْمِرَتْ: مِنَ الْحَفْيَاءِ، وَأَمَدُهَا ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ، وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِي لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِي زُرَيْقٍ، وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ فِيمَنْ سَابَقَ بِهَا. [انظر: ٢٨٦٨، ٢٨٦٩، ٢٨٧٠، ٧٣٣٦]

دفعہ رسول اللہ ﷺ نے تیار شدہ گھوڑوں کی دوڑ مقام حفیاء سے ثنیۃ الوداع تک، اور غیر تیار شدہ گھوڑوں کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک کرائی۔ اور عبداللہ بن عمر ﷺ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے اس دوڑ میں حصہ لیا تھا۔

فوائد ومسائل: ① شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں فرماتے ہیں کہ تمام مساجد درحقیقت اللہ کی ملکیت ہیں، کسی اور کی نہیں، اس لیے کوئی شخص وہم کر سکتا ہے کہ کسی انسان کی طرف ان کی نسبت کرنا صحیح نہیں۔ مصنف نے اس وہم کو دور کرنے کی غرض سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ مسجد کی نسبت کسی شخص یا قبیلے کی طرف جائز ہے اور ایسا کسی تعلق کی بنا پر ہو سکتا ہے، مثلاً: بنانے والے یا متولی یا قرب و جوار کے رہنے والے کی طرف اس کی نسبت کر دی جائے جیسا کہ حدیث میں بنو زریق کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ ② امام ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت امام ابراہیم نخعی کسی مسجد کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرنا ناپسند کرتے تھے، اس لیے کہ مسجدیں صرف اللہ کے لیے ہیں جبکہ امام بخاری ؒ نے اس عنوان سے ثابت کیا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جمہور علماء بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور ایسی مساجد میں جس نسبت کا بیان ہے وہ تمیز کے لیے ہے، ملکیت بتانے کے لیے نہیں۔[1] ③ اس زمانے میں گھوڑوں کو جہاد کے لیے اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ پہلے انھیں خوب کھلا پلا کر موٹا کیا جاتا، پھر انھیں بھوکا رکھا جاتا اور گھروں میں ان پر جھول ڈال دیے جاتے تاکہ پسینہ آنے کے بعد ان کی چربی پگھل کر جزو بدن بن جائے۔ یہ عمل چالیس دن کرنے سے گھوڑا تیز رو ہو جاتا اور اس کا سانس بھی بڑھ جاتا تھا۔ ان کی دوڑ کے لیے زیادہ فاصلہ رکھا گیا جبکہ غیر تیار شدہ گھوڑوں کے مقابلے کے لیے فاصلہ کم رکھا گیا تھا۔ بنو زریق انصار مدینہ کے مشہور قبیلے خزرج کی ایک شاخ تھی۔ واضح رہے کہ دوڑ کا یہ مقابلہ جہادی مشقوں کا ایک حصہ تھا۔ اس کے برعکس موجودہ دور میں ریس کے میدانوں میں جو دوڑ کرائی جاتی ہے جن کی ہار جیت کا سلسلہ جوئے بازی پر ہوتا ہے، ایسی دوڑ میں شرکت کرنا مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس حدیث سے متعلقہ دیگر مسائل کتاب الجہاد، حدیث: 2868 کے تحت بیان ہوں گے۔ باذن اللہ تعالیٰ.

(٤٢) بَابُ الْقِسْمَةِ وَتَعْلِيقِ الْقِنْوِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 42- مسجد میں مال تقسیم کرنا اور خوشۂ کھجور لٹکانا

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: اَلْقِنْوُ: اَلْعِذْقُ وَالْاِثْنَانِ: قِنْوَانِ، وَالْجَمَاعَةُ أَيْضًا: قِنْوَانٌ مِثْلُ صِنْوٍ وَصِنْوَانٍ.

امام بخاری ؒ کہتے ہیں کہ قِنْوٌ کے معنی کھجور کا خوشہ ہیں اور یہ مفرد کا صیغہ ہے۔ اس کا تثنیہ قِنْوان اور جمع بھی قِنْوان ہے، جیسے صِنْوٌ کا تثنیہ اور جمع ایک ہی وزن صنوان

[1] فتح الباري: 667/1.

پر آتے ہیں۔

وضاحت: قِنْوٌ اور صِنْوٌ کے تثنیہ اور جمع میں فرق یہ ہے کہ ان کے تثنیہ کا نون حسب ضابطہ مکسور ہے جبکہ جمع میں نون پر تنوین ہے۔ ان کے تثنیہ اور جمع میں محض لفظی مشاکلت ہے، نیز ایک جڑ سے نکلے ہوئے دو درختوں میں سے ہر ایک کو صِنْوٌ کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث میں مساجد کے اندر عبادت کے علاوہ دیگر امور کی بجا آوری کے متعلق ممانعت آئی ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ مساجد تو خاص مقاصد کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں،[1] نیز فرمایا کہ مسجدیں صرف ذکر الٰہی، نماز اور تلاوت قرآن کے لیے ہیں۔[2] مساجد میں خرید و فروخت کرنے اور اشعار پڑھنے کی بھی ممانعت ہے اور ان میں بآواز بلند گفتگو کرنا بھی ناجائز ہے۔ اگر کوئی شخص مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرے تو اس کی حوصلہ شکنی ان الفاظ سے کی جائے کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس نہ کرے۔ ان تصریحات کے پیش نظر خیال کیا جا سکتا ہے کہ مسجد میں ذکر، نماز اور تلاوت قرآن کے علاوہ دیگر امور کی بجا آوری جائز نہیں لیکن امام بخاری ؒ ضرورت کے مواقع پر اس میں توسع ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مصالح عامہ کے متعلق مختلف نوعیت کے امور مسجد میں سرانجام دیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ کبھی کبھی اور ضرورت کے پیش نظر ہوں اور ان کاموں کی انجام دہی سے احترام مسجد بھی متاثر نہ ہو۔ ضرورت کے بغیر یا مستقل طور پر مساجد میں عبادت، ذکر اور تلاوت قرآن کے علاوہ دیگر کام کرنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرما دی ہے کہ مساجد کی تعمیر ایسے کاموں کے لیے نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ امام بخاری کے آئندہ تراجم ابواب اور توسع کی وجہ سے اس مغالطے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ یہ احکام بطور قاعدہ کلیہ، کثیر الاستعمال اور عام ہیں بلکہ انصاف پسندی کا تقاضا ہے کہ ان تراجم میں بیان شدہ احکام کو بطور واقعہ جزئیہ خاصہ کے سمجھنا زیادہ بہتر اور قرین قیاس ہے۔ اس وضاحت کی روشنی میں آئندہ تراجم و احادیث کا مطالعہ کرنا مناسب رہے گا۔

٤٢١ - وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ - يَعْنِي ابْنَ طَهْمَانَ - عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ، عَنْ أَنَسٍ رَّضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: أُتِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِمَالٍ مِّنَ الْبَحْرَيْنِ فَقَالَ: «انْثُرُوهُ فِي الْمَسْجِدِ» وَكَانَ أَكْثَرَ مَالٍ أُتِيَ بِهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ، فَخَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَى الصَّلَاةِ وَلَمْ يَلْتَفِتْ إِلَيْهِ، فَلَمَّا قَضَى الصَّلَاةَ جَاءَ فَجَلَسَ إِلَيْهِ، فَمَا كَانَ يَرٰى أَحَدًا إِلَّا أَعْطَاهُ، إِذْ جَاءَ الْعَبَّاسُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَعْطِنِي فَإِنِّي فَادَيْتُ نَفْسِي وَفَادَيْتُ عَقِيلًا، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ

[421] حضرت انس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے پاس بحرین سے کچھ مال لایا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اسے مسجد میں ڈھیر کر دو۔'' یہ مال اب تک آپ کے پاس لائے گئے مالوں سے بہت زیادہ مقدار میں تھا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے تو آپ نے اس کی طرف التفات بھی نہیں کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آ کر اس کے پاس بیٹھ گئے، پھر جسے دیکھا اسے دیتے چلے گئے۔ اتنے میں حضرت عباس ؓ آپ کے پاس آئے اور کہا: اللہ کے رسول! مجھے بھی دیجیے کیونکہ میں نے (بدر کی لڑائی میں) اپنا اور عقیل کا

① صحیح مسلم، المساجد، حدیث: 1262 (569)۔ ② صحیح مسلم، الطھارۃ، حدیث: 661 (285)۔

ﷺ: «خُذْ»، فَحَثٰى فِي ثَوْبِهِ، ثُمَّ ذَهَبَ يُقِلُّهُ فَلَمْ يَسْتَطِعْ، فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! مُرْ بَعْضَهُمْ يَرْفَعْهُ إِلَيَّ. قَالَ: «لَا»، قَالَ: فَارْفَعْهُ أَنْتَ عَلَيَّ، قَالَ: «لَا»، فَنَثَرَ مِنْهُ ثُمَّ ذَهَبَ يُقِلُّهُ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! اؤْمُرْ بَعْضَهُمْ يَرْفَعْهُ. قَالَ: «لَا»، قَالَ: فَارْفَعْهُ أَنْتَ عَلَيَّ، قَالَ: «لَا»، فَنَثَرَ مِنْهُ ثُمَّ احْتَمَلَهُ فَأَلْقَاهُ عَلٰى كَاهِلِهِ ثُمَّ انْطَلَقَ فَمَا زَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُتْبِعُهُ بَصَرَهُ حَتّٰى خَفِيَ عَلَيْنَا عَجَبًا مِّنْ حِرْصِهِ، فَمَا قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَثَمَّ مِنْهَا دِرْهَمٌ. [انظر: ٣٠٤٩، ٣١٦٥]

فدیہ دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں فرمایا: ''اٹھا لو۔'' انھوں نے اپنے کپڑے میں دونوں ہاتھ سے اتنا مال بھر لیا کہ اٹھا نہ سکے، کہنے لگے: اللہ کے رسول! ان میں سے کسی کو کہہ دیجیے کہ یہ مال اٹھانے میں میری مدد کرے۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' انھوں نے کہا: پھر آپ ہی اسے اٹھا کر میرے اوپر رکھ دیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ کم کیا اور پھر اٹھانے لگے لیکن اب بھی نہ اٹھا سکے، تو عرض کیا: اللہ کے رسول! ان میں سے کسی کو کہہ دیں کہ مجھے اٹھوا دے۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' انھوں نے کہا: پھر آپ خود اٹھا کر میرے اوپر رکھ دیں۔ آپ نے فرمایا: ''نہیں۔'' تب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس میں کچھ مزید کمی کی۔ بعد میں اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور چل دیے۔ رسول اللہ ﷺ ان کی حرص اور طمع پر تعجب سے انھیں دیکھتے ہی رہے حتی کہ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ الغرض رسول اللہ ﷺ وہاں سے اس وقت اٹھے جب ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان کے دو جز ہیں: * مسجد میں اموال کی تقسیم * مسجد میں خوشۂ کھجور لٹکانے کا بیان۔ اس سلسلے میں جو حدیث پیش کی گئی ہے اسے امام حاکم نے مستدرک میں موصولاً بیان کیا ہے، اس سے اموال کی تقسیم کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے لیکن اس میں خوشۂ کھجور لٹکانے کے متعلق کوئی ذکر نہیں۔ شارح ابن بطال نے اسے امام بخاری رحمہ اللہ کی غفلت قرار دیا ہے۔[1] ابن تین نے اسے امام بخاری رحمہ اللہ کی بھول پر محمول کیا ہے۔[2] لیکن بعض شارحین نے امام بخاری رحمہ اللہ کے ذوق کے مطابق مختلف توجیہات ذکر کی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ خوشۂ کھجور لٹکانے کو تقسیم اموال پر قیاس کر رہے ہیں کیونکہ دونوں میں ضرورت مندوں کے لیے مسجد میں مال رکھنے کی بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں اس کا ذکر کر کے اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے جسے عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے بایں الفاظ بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں عصا تھا۔ ایک شخص نے مسجد میں ردی کھجور کا خوشہ لٹکا دیا تھا۔ آپ نے اس خوشے کو عصا مارتے ہوئے فرمایا: ''صدقہ دینے والا اگر چاہتا تو اس سے بہتر بھی صدقہ دے سکتا تھا۔''[3] چونکہ یہ روایت امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہ تھی، اس لیے انھوں نے عنوان میں اس کی طرف اشارہ کر دیا۔[4] اگرچہ اس روایت میں

1 شرح ابن بطال: 173/2. 2 فتح الباري: 668/1. 3 السنن النسائي، الزكاة، حديث: 2495. 5 فتح الباري: 669/1.

خوشۂ کھجور کا ذکر نہیں لیکن امام ثابت بن حزم اندلسی نے دلائل فی غریب الحدیث میں اس روایت کے ساتھ یہ الفاظ بیان کیے ہیں کہ جب آپ تشریف لائے تو آپ نے مسجد میں کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے دیکھے کیونکہ آپ نے ہر دیوار پر انھیں لٹکانے کا حکم دیا تھا تاکہ جن لوگوں کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں وہ ان سے کھا سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل روایات میں خوشۂ کھجور کو مسجد میں لٹکانے کا تذکرہ تھا جن کی طرف امام بخاری نے عنوان میں اشارہ کر دیا ہے۔[1] بہر حال روایت سے مسجد میں تقسیم اموال کا مسئلہ ثابت ہو گیا۔ رہا خوشۂ کھجور کے مسجد میں لٹکانے کا حکم تو وہ اگرچہ روایت میں نہیں، تاہم قیاس، اصل روایت یا دیگر روایات سے ثابت ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں اشارہ فرمایا ہے۔ ② دیگر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علاء بن حضرمی نے تقریباً ایک لاکھ درہم بحرین سے بھیجے تھے جو وہاں کے باشندوں سے بطور خراج وصول کیے گئے تھے اور یہ مال مدینہ پہنچ چکا تھا اور آپ نے اسے تقسیم فرمایا، لیکن حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین سے مال آنے پر انھیں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ اس سے پہلے ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔ دونوں روایات میں ظاہری طور پر تعارض معلوم ہو رہا ہے لیکن درحقیقت یہ روایت مذکورہ حدیث کے معارض نہیں کیونکہ مال ہر سال آتا تھا جس سال آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو دینے کا وعدہ کیا تھا اس سال مال آنے سے پہلے پہلے آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔[2] واللہ أعلم.
③ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں ہر وہ کام کرنا جائز ہے جس کا تعلق مصالح عامہ سے ہو، مثلاً: پانی کی سبیل کا اہتمام جس سے تمام لوگ مستفید ہوتے ہیں، اسی طرح کے دیگر کام مسجد میں کیے جا سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ مسجد میں تقسیم کے لیے مال تو رکھا جا سکتا ہے لیکن مسجد کو بطور سٹور استعمال کرنا جائز نہیں۔[3] اس حدیث سے متعلقہ دیگر احکام و مسائل کتاب الجہاد، حدیث: 3049 کے تحت بیان ہوں گے۔ بإذن اللہ تعالیٰ.

(٤٣) بَابُ مَنْ دُعِيَ لِطَعَامٍ فِي الْمَسْجِدِ وَمَنْ أَجَابَ مِنْهُ

باب: 43- کسی شخص کو مسجد میں دعوتِ طعام دینا اور مسجد ہی میں اسے قبول کر لینا

٤٢٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ، سَمِعَ أَنَسًا: وَجَدْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ مَعَهُ نَاسٌ فَقَالَ لِي: «أَأَرْسَلَكَ أَبُو طَلْحَةَ؟» قُلْتُ: نَعَمْ فَقَالَ: «لِطَعَامٍ؟» قُلْتُ: نَعَمْ، فَقَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ: «قُومُوا»، فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ. [انظر: ٣٥٧٨، ٥٣٨١، ٥٤٥٠، ٦٦٨٨]

[422] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی ﷺ کو مسجد میں موجود پایا جبکہ آپ کے ساتھ کچھ دیگر حضرات بھی تھے۔ (میں وہاں جا کر کھڑا ہو گیا تو آپ نے مجھ سے فرمایا:) ''کیا تجھے ابو طلحہ نے بھیجا ہے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! پھر آپ نے فرمایا: ''دعوتِ طعام دینے کے لیے؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! چنانچہ آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا جو آپ کے پاس تھے: ''اٹھو، (چلیں)۔'' پھر آپ

① عمدة القاري: 409/3. ② فتح الباري: 669/1. 3 فتح الباري: 669/1.

وہاں سے روانہ ہوئے اور میں ان کے آگے آگے تھا۔

فائدہ: اس عنوان کے دو اجزاء ہیں: ایک دعوت دینا، دوسرا دعوت قبول کرنا۔ یہ دونوں کام مسجد میں ہو سکتے ہیں، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مسجد ہی میں آپ کو دعوت طعام پیش کی اور مدعو کا دعوت کو قبول کرنا بھی مسجد ہی میں ہوا ہے۔ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ ان ابواب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں ہر قسم کی گفتگو پر پابندی نہیں ہے کیونکہ جو گفتگو مسجد ہی سے متعلق ہو اس کے جائز ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں ہے۔ اگر گفتگو مسجد سے متعلق نہیں تو بقدر ضرورت اس کا جواز ہے جیسا کہ مسجد میں بیٹھے بیٹھے کسی شخص نے دعوت پیش کی اور وہیں اسے قبول کر لیا گیا تو اس کی اجازت ہے کیونکہ یہ کلام جائز بقدر ضرورت ہے۔[1]

نوٹ: امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو مکمل طور پر کتاب المناقب (حدیث:3578) میں بیان کریں گے، لہٰذا اس سے متعلقہ دیگر مباحث بھی وہاں بیان ہوں گے۔ بإذن اللّٰه تعالىٰ.

(٤٤) بَابُ الْقَضَاءِ وَاللِّعَانِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 44- مسجد میں مقدمات کے فیصلے کرنا اور (مردوں، عورتوں کے درمیان) لعان کرنا

وضاحت: مساجد چونکہ عبادت کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے جو کام عبادت کے نہیں، ان کے متعلق شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کی ادائیگی مسجد میں جائز نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ عنوان قائم کر کے مسجد میں قضا اور لعان کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ لعان بھی قضا ہی کی ایک قسم ہے، تاہم اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے مستقل طور پر الگ بیان کیا ہے۔

٤٢٣ - حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي ابْنُ شِهَابٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ؛ أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَرَأَيْتَ رَجُلًا وَجَدَ مَعَ امْرَأَتِهِ رَجُلًا أَيَقْتُلُهُ؟ فَتَلَاعَنَا فِي الْمَسْجِدِ وَأَنَا شَاهِدٌ. [انظر: ٤٧٤٥، ٤٧٤٦، ٥٢٥٩، ٥٣٠٨، ٥٣٠٩، ٦٨٥٤، ٧١٦٥، ٧١٦٦، ٧٣٠٤]

[423] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ ایسے شخص کے متعلق کیا حکم فرماتے ہیں جس نے اپنی بیوی کے ہمراہ اجنبی مرد کو پایا ہو، کیا وہ اسے قتل کر دے؟ اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے مسجد میں لعان کیا اور میں وہاں موجود تھا۔

فوائد ومسائل: ① مقدمات کے فیصلے کے لیے اگر دارالقضا علیحدہ تعمیر شدہ نہیں ہے تو مسجد میں فیصلے کرنے کے لیے بیٹھنا مسلمانوں کا قدیم عمل چلا آ رہا ہے، البتہ امام شافعی کے نزدیک اگر قاضی کو اتفاقاً اس کی نوبت آ جائے تو چنداں حرج نہیں، تاہم اسے معمول بنا لینا، ان کے ہاں ناپسندیدہ عمل ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ فریقین میں حائضہ عورت بھی ہو سکتی ہے، اس لیے

(1) شرح تراجم بخاري.

ان کے مقدمات نمٹانے کے لیے مسجد میں بیٹھنا اس کے تقدس اور احترام کے منافی ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس موقف سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ اس عنوان سے اس کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ مذکورہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعان کر دیا اور لعان بیوی اور خاوند کے درمیان ہوتا ہے، اس لیے مسجد میں لعان اور مرد وعورت کے درمیان فیصلے کرنا دونوں کا حکم معلوم ہو گیا۔ ② امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقام پر مختصر روایت ذکر کی ہے۔ کتاب الطلاق، کتاب التفسیر اور دیگر مقامات پر یہ روایت متعدد طرق سے تفصیل کے ساتھ آئے گی اور امام بخاری اس سے مختلف مسائل پر استدلال کریں گے۔ لعان یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے مرد کو ملوث دیکھتا ہے یا اس قسم کا یقین اسے دوسرے ذرائع سے ہو جاتا ہے لیکن کوئی معقول شہادت اس کے پاس نہیں تو شریعت نے خاص طور پر شوہر اور بیوی کے تعلقات کے پیش نظر اس بات کی اجازت دی ہے کہ دونوں قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کریں اور ایک دوسرے کے خلاف چار چار قسمیں اٹھائیں اور پانچویں مرتبہ جھوٹا ہونے کی صورت میں اپنے آپ پر لعنت بھیجیں تو پھر ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے گی۔ اس کی تفصیل متعلقہ ابواب میں آئے گی۔ زیر بحث مسئلے کے متعلق بھی تفصیلی گفتگو کتاب الاحکام، حدیث: 7165 میں آئے گی۔ بإذن الله تعالىٰ. واضح رہے کہ مسجد میں جب بیوی خاوند کے درمیان لعان ہوا تو اس وقت حضرت سہل بن سعد کی عمر پندرہ سال تھی اور وہ اس بات کے عینی شاہد ہیں۔[1]

(٤٥) بَابٌ: إِذَا دَخَلَ بَيْتًا يُصَلِّي حَيْثُ شَاءَ أَوْ حَيْثُ أُمِرَ، وَلَا يَتَجَسَّسُ

باب: 45- جب کسی کے گھر جائے تو جس جگہ چاہے نماز پڑھ لے، یا جس جگہ کی نشان دہی کی جائے وہاں نماز پڑھے اور تجسس نہ کرے

٤٢٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ مَحْمُودِ ابْنِ الرَّبِيعِ، عَنْ عِتْبَانَ بْنِ مَالِكٍ؛ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَاهُ فِي مَنْزِلِهِ فَقَالَ: «أَيْنَ تُحِبُّ أَنْ أُصَلِّيَ لَكَ مِنْ بَيْتِكَ؟» قَالَ: فَأَشَرْتُ لَهُ إِلَى مَكَانٍ، فَكَبَّرَ النَّبِيُّ ﷺ وَصَفَفْنَا خَلْفَهُ، فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ.

[انظر: ٤٢٥، ٦٦٧، ٦٨٦، ٨٣٨، ٨٤٠، ١١٨٦، ٤٠٠٩، ٤٠١٠، ٥٤٠١، ٦٤٢٣، ٦٩٣٨]

[424] حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ ان کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: ''تم کس جگہ کا انتخاب کرتے ہو کہ وہاں میں تمھارے گھر میں تمھارے لیے نماز پڑھوں؟'' کہتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ پھر نبی ﷺ نے تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کر دی اور ہم آپ کے پیچھے صف میں کھڑے ہو گئے اور آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی۔

فوائد ومسائل: ① اس عنوان کے دو جز ہیں: * مہمان اپنے اختیار سے جہاں چاہے نماز پڑھ لے۔ * جس جگہ اہل خانہ کہیں وہیں نماز ادا کرے۔ ان دونوں اجزاء کے درمیان کلمۂ أَوْ ہے جو دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: * تخییر: مہمان کو ان دونوں

[1] صحيح البخاري، الأحكام، حديث: 7165.

میں سے کسی بھی ایک صورت کا اختیار ہے، چاہے تو گھر میں داخل ہونے کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں چاہے نماز پڑھ لے اور چاہے تو اہل خانہ کی نشان دہی کے مطابق عمل کرے، یعنی اسے ان دونوں باتوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ * تعیین احد الامرین: کلمۂ اَوْ دونوں صورتوں میں سے ایک کی تعیین کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مہمان کو ان دونوں صورتوں میں سے کس صورت کو اختیار کرنا ہے۔ یہ معنی لینے میں اس سے پہلے هَلْ مقدر ہوگا۔ ② اس مختصر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ میزبان کی خواہش کا احترام کیا جائے، خود اپنی مرضی سے کوئی اقدام نہ کیا جائے کیونکہ اس روایت میں وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود پوچھا کہ تم اپنے گھر میں کس جگہ نماز پڑھنے کو پسند کرتے ہو تاکہ میں وہاں نماز پڑھوں لیکن تفصیلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ میزبان کو اپنے اختیارات استعمال کرنے کا حق ہے کیونکہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ آپ میرے گھر تشریف لا کر کسی بھی جگہ نماز پڑھ دیں تاکہ میں اس متبرک مقام کو خانگی مسجد بنا لوں۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں جو لَايَتَجَسَّسُ کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ وہ تجسس نہ کرے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل خانہ کی مرضی کا پابند ہے کیونکہ جہاں چاہے نماز پڑھنے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی جگہ پڑھنا چاہے جہاں گھر والوں کو پسند نہ ہو یا اہل خانہ کے ستر و حجاب کے منافی ہو یا ایسی جگہ پڑھنا چاہے جہاں ان کا ایسا گھریلو سامان پڑا ہو جسے وہ کسی پر ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں، وغیرہ۔ ہاں! اگر گھر والا ہی عام اجازت دے دے کہ جہاں چاہے نماز پڑھ لے تو پھر اپنے اختیارات استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ تو عام بات کے متعلق تفصیل ہے لیکن اگر کوئی کسی بزرگ کو اسی مقصد کے لیے بلاتا ہے تو بزرگ کو چاہیے کہ وہ اہل خانہ سے جگہ دریافت کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تھا۔ الغرض امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ان دونوں صورتوں میں سے ایک کی تعیین معلوم ہوتا ہے اگرچہ دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل کرنے کی آزادی بھی ہو سکتا ہے، تاہم اس کے لیے روایت کے دیگر طرق میں ذکر کردہ تفصیلات کا سہارا لینا پڑے گا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن منیر کے حوالے سے اس دوسری صورت کو ترجیح دی ہے۔[1] لیکن دل اس پر مطمئن نہیں۔ واللہ أعلم.

(٤٦) بَابُ الْمَسَاجِدِ فِي الْبُيُوتِ

باب: 46- گھروں میں مساجد بنانا

وَصَلَّى الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ فِي مَسْجِدِهِ فِي دَارِهِ جَمَاعَةً.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما نے اپنے گھر کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کی۔

وضاحت: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کے اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔[2] اس باب کا مقصد یہ ہے کہ اگر گھر میں مسجد بنا لی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کی اور مسجد شرعی کی حیثیت برابر ہے یا دونوں میں کوئی فرق ہے؟ اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

٤٢٥ - حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنِي

[425] حضرت محمود بن ربیع انصاری سے روایت ہے کہ

---

1 فتح الباري: 671/1. 2 فتح الباري: 672/1.

اللَّيْثُ قَالَ: حَدَّثَنِي عُقَيْلٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي مَحْمُودُ بْنُ الرَّبِيعِ الْأَنْصَارِيُّ أَنَّ عِتْبَانَ بْنَ مَالِكٍ، وَهُوَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا مِّنَ الْأَنْصَارِ، أَنَّهُ أَتٰى رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! قَدْ أَنْكَرْتُ بَصَرِي وَأَنَا أُصَلِّي لِقَوْمِي، فَإِذَا كَانَتِ الْأَمْطَارُ سَالَ الْوَادِي الَّذِي بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ، لَمْ أَسْتَطِعْ أَنْ آتِيَ مَسْجِدَهُمْ فَأُصَلِّيَ بِهِمْ، وَوَدِدْتُّ يَا رَسُولَ اللهِ! أَنَّكَ تَأْتِينِي فَتُصَلِّي فِي بَيْتِي فَأَتَّخِذَهُ مُصَلًّى قَالَ: فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «سَأَفْعَلُ إِنْ شَاءَ اللهُ». قَالَ عِتْبَانُ: فَغَدَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَبُو بَكْرٍ حِينَ ارْتَفَعَ النَّهَارُ فَاسْتَأْذَنَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَأَذِنْتُ لَهُ فَلَمْ يَجْلِسْ حِينَ دَخَلَ الْبَيْتَ، ثُمَّ قَالَ: «أَيْنَ تُحِبُّ أَنْ أُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ؟» قَالَ: فَأَشَرْتُ لَهُ إِلٰى نَاحِيَةٍ مِّنَ الْبَيْتِ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فَكَبَّرَ، فَقُمْنَا فَصَفَفْنَا، فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ. قَالَ: وَحَبَسْنَاهُ عَلٰى خَزِيرَةٍ صَنَعْنَاهَا لَهُ، قَالَ: فَثَابَ فِي الْبَيْتِ رِجَالٌ مِّنْ أَهْلِ الدَّارِ ذَوُو عَدَدٍ فَاجْتَمَعُوا، فَقَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ: أَيْنَ مَالِكُ بْنُ الدُّخَيْشِنِ أَوِ ابْنُ الدُّخْشُنِ؟ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: ذٰلِكَ مُنَافِقٌ لَّا يُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَا تَقُلْ ذٰلِكَ، أَلَا تَرَاهُ قَدْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، يُرِيدُ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللهِ؟» قَالَ: اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: فَإِنَّا نَرٰى وَجْهَهُ وَنَصِيحَتَهُ إِلَى الْمُنَافِقِينَ، قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «فَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ان انصاری صحابہ میں سے ہیں جو شریک بدر تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! میری بینائی جاتی رہی ہے اور میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں لیکن بارش کی وجہ سے جب وہ نالہ بہنے لگتا ہے جو میرے اور ان کے درمیان ہے تو میں نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں نہیں آ سکتا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ہاں تشریف لائیں اور میرے گھر میں کسی جگہ نماز پڑھیں تاکہ میں اس جگہ کو جائے نماز قرار دے لوں۔ راوی کہتا ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان شاء اللہ جلد ہی ایسا کروں گا۔'' حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دوسرے روز دن چڑھے میرے گھر تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو میرے اجازت دینے پر آپ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھنے سے پہلے فرمایا: ''تم اپنے گھر میں کس جگہ چاہتے ہو کہ میں وہاں نماز پڑھوں؟'' حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے گھر کے ایک کونے کی نشان دہی کی تو آپ نے وہاں کھڑے ہو کر تکبیر تحریمہ کہی۔ ہم بھی صف بستہ ہو کر آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے تو آپ نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد سلام پھیر دیا۔ پھر ہم نے کچھ حلیم تیار کر کے آپ کو روک لیا۔ اس کے بعد اہل محلّہ میں سے کئی آدمی گھر میں آ کر جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک شخص کہنے لگا کہ مالک بن دُخَیشِن یا ابن دُخْشُن کہاں ہے؟ کسی نے کہا: وہ تو منافق ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا مت کہو۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خالص اللہ کی خوشنودی کے لیے لا إلٰه إلا اللّٰه کہتا ہے۔'' وہ شخص بولا اللہ اور اس کا

مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللهِ».

رسول ہی خوب جانتے ہیں۔ بظاہر تو ہم اس کا رخ اور اس کی خیر خواہی منافقین کے حق میں دیکھتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر آگ حرام کر دی ہے جو لا إله إلا الله کہہ دے بشرطیکہ اس سے اللہ کی رضامندی ہی مقصود ہو۔

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: ثُمَّ سَأَلْتُ الْحُصَيْنَ بْنَ مُحَمَّدٍ الْأَنْصَارِيَّ، وَهُوَ أَحَدُ بَنِي سَالِمٍ، وَهُوَ مِنْ سَرَاتِهِمْ، عَنْ حَدِيثِ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ فَصَدَّقَهُ بِذٰلِكَ. [راجع: ٤٢٤]

حضرت امام زہری کہتے ہیں: پھر میں نے حصین بن محمد انصاری سے، جو قبیلۂ بنو سالم کے ایک فرد اور ان کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھے، محمود بن ربیع ؓ کی اس روایت کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔

فوائد ومسائل: ① یہاں مسجد سے مراد یہ ہے کہ گھر میں نماز پڑھنے کے لیے کوئی جگہ مخصوص کر لی جائے۔ اس پر عام مساجد کے احکام نافذ نہیں ہوں گے کیونکہ عام مساجد کسی کی ملک نہیں ہوتیں، ان کی خرید و فروخت نہیں کی جا سکتی، ان میں وراثت جاری نہیں ہوتی، بحالت جنابت وحیض ان میں آمد و رفت جائز نہیں جبکہ گھر کی مسجد صاحب خانہ کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اس کا میراث میں تقسیم کیا جانا بھی جائز ہے۔ جنابت اور حیض کی حالت میں وہاں آمد و رفت رکھنا بھی جائز ہے۔ اگر گھر کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو صرف جماعت کا ثواب حاصل ہوگا۔ مسجد کی جماعت کا ثواب نہیں ملے گا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معذور کے لیے اس طرح کی گھریلو مساجد میں فرائض کی ادائیگی درست ہے۔ اگر نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے گھر میں کوئی جگہ مقرر کر لی جائے جہاں معذوری کی صورت میں نماز باجماعت کا اہتمام ہو تو جماعت کا ثواب مل جائے گا اور اس پر مسجد شرعی سے غیر حاضر ہونے کا الزام عائد نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ گھروں میں نماز باجماعت کا ثبوت ظالم حکمرانوں کے زمانے میں اور دوسرے اعذار کے وقت ہوا ہے۔ ② حافظ ابن حجر ؒ نے اس حدیث سے بہت سے مسائل کا استنباط فرمایا ہے، مثلاً: نابینے کی امامت کا جائز ہونا کیونکہ حضرت عتبان ؓ نابینا ہونے کے باوجود اپنی قوم کو نماز پڑھاتے تھے۔ اپنی بیماری کو بیان کرنا اللہ تعالیٰ کے شکوہ و شکایت میں داخل نہیں۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ دیگر مساجد میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام تھا۔ معذوروں کے لیے بارش اور سخت تاریکی میں جماعت کی پابندی ضروری نہیں۔ ضرورت کے وقت گھر میں نماز پڑھنے کے لیے کوئی بھی جگہ مقرر کی جا سکتی ہے۔ ملاقات کے لیے آنے والے بڑے آدمی کی امامت کا جائز ہونا بشرطیکہ صاحب خانہ اسے اجازت دے۔ کسی نیک آدمی کو گھر میں خیر و برکت کے لیے دعوت دی جائے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ بڑے لوگوں کو چاہیے کہ وہ چھوٹے لوگوں کی دعوت قبول کریں اور اس میں حاضر ہوں۔ وعدہ پورا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ''ان شاء اللہ'' کہنا چاہیے۔ اگر میزبان پر اعتماد ہو تو دعوتی حضرات کے علاوہ دوسرے کو ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اہل خانہ سے اجازت لینا شریعت کا اہم تقاضا ہے۔ اہل محلّہ کا کسی عالم یا امام کے پاس حصول برکت

کے لیے جمع ہونا بھی جائز ہے۔ امام کے سامنے اس شخص کا تذکرہ کرنا جس سے دین اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ایمان میں صرف زبانی اقرار کافی نہیں جب تک دل میں یقین اور ظاہر میں عمل صالح نہ ہو۔ توحید پر مرنے والا ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔ موسم برسات میں (جبکہ آمد و رفت میں مشقت ہو) نماز گھروں میں پڑھنا جائز ہے۔ نوافل باجماعت ادا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ تداعی (ایک دوسرے کو اس کے لیے دعوت دینا) نہ ہو۔ واضح رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو دس سے زیادہ مقامات پر بیان کیا ہے اور اس سے بہت سے مسائل کا استنباط کیا ہے جیسا کہ تفصیل بالا سے واضح ہے۔[1] ③ چونکہ حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ ایک کم سن صحابی ہیں، نیز اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے لیے صرف ایمان ہی کافی ہے اعمال کی ضرورت نہیں، اس لیے ابن شہاب نے اطمینان قلب کے لیے حضرت حصین بن محمد انصاری سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی، چنانچہ جب ان سے پوچھا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی جیسے امام بخاری رحمہ اللہ نے آخر میں بیان کیا ہے۔ ④ ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان سے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ فرمایا ہو جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں مساجد بنانے اور انھیں صاف ستھرا اور معطر رکھنے کا حکم دیا ہے،[2] نیز حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کو خط لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں گھروں میں مساجد بنانے، ان کی اصلاح کرنے اور انھیں پاکیزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے۔[3]

(٤٧) بَابٌ: اَلتَّيَمُّنُ فِي دُخُولِ الْمَسْجِدِ وَغَيْرِهِ

باب: 47- مسجد میں داخل ہونے اور دوسرے کاموں میں دائیں طرف سے ابتدا کرنا

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَبْدَأُ بِرِجْلِهِ الْيُمْنٰى، فَإِذَا خَرَجَ بَدَأَ بِرِجْلِهِ الْيُسْرٰى.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مسجد میں داخل ہونے کے لیے دائیں پاؤں اور نکلتے وقت بائیں پاؤں سے ابتدا کرتے تھے۔

وضاحت: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ عمل باسند کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث مستدرک حاکم (218/1) میں ہے کہ مسجد میں دائیں پاؤں سے داخل ہونا اور بائیں پاؤں سے نکلنا مسنون ہے۔ اور صحابی کا کسی عمل کو مسنون کہنا مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتا ہے۔[4]

٤٢٦ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْأَشْعَثِ بْنِ سُلَيْمٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ، فِي طُهُورِهِ وَتَرَجُّلِهِ وَتَنَعُّلِهِ. [راجع: ١٦٨]

[426] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے تمام اچھے کاموں، مثلاً: طہارت حاصل کرنے، کنگھی کرنے اور جوتا پہننے میں دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔

① فتح الباري: 677/1. ② سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 455. ③ سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 456.
④ فتح الباري: 678/1.

فوائد و مسائل: ① حتی المقدور دائیں جانب سے شروع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دائیں جانب اختیار کرنے میں اگر کوئی رکاوٹ آ جائے تو پھر بامر مجبوری بائیں جانب اختیار کرنے میں چنداں حرج نہیں، نیز ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہر ذی شان کام کا دائیں جانب سے آغاز کرنا اچھا لگتا تھا۔[1] دائیں جانب اختیار کرنے کے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ جن امور کا تعلق تکریم و تعظیم یا تزئین و تحسین سے ہے، وہ دائیں جانب سے شروع کیے جائیں اور جو امور ان کے برعکس ہیں ان میں بائیں جانب اختیار کی جائے۔ اس حدیث کی مکمل تشریح پہلے ہو چکی ہے، اس لیے یہاں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔[2] ② احناف کے نزدیک دائیں جانب سے آغاز کرنا بطور عادت کے تھا بطور عبادت کے نہیں تھا، اگر بطور عبادت کے ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کی ہیشگی سے یہ افعال مسنون ہو جاتے کیونکہ ان کے نزدیک تعبد اور تعود میں فرق ہے، لہٰذا ان افعال کو ان کے ہاں مستحب کہا گیا ہے۔ ہمارے ہاں رسول اللہ ﷺ کے افعال کی یہ تفریق اسوۂ حسنہ کے منافی ہے۔ آپ کے جملہ افعال ہمارے لیے مسنون ہیں اگرچہ وہ زندگی میں ایک مرتبہ ہی کیوں نہ ادا ہو۔ سنت کے ثبوت کے لیے عبادت اور مواظبت (ہیشگی) کی شرط صحیح نہیں۔

(٤٨) بَابٌ: هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الْجَاهِلِيَّةِ وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ

لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: «لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ» وَمَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّلَاةِ فِي الْقُبُورِ، وَرَأَى عُمَرُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يُّصَلِّي عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ: اَلْقَبْرَ الْقَبْرَ، وَلَمْ يَأْمُرْهُ بِالْإِعَادَةِ.

باب: 48- زمانۂ جاہلیت میں بنی ہوئی مشرکین کی قبریں اکھاڑ کر وہاں مساجد تعمیر کرنا؟

فرمان نبوی ہے: ''اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' (علاوہ ازیں) قبروں پر نماز پڑھنا ناپسندیدہ عمل ہے۔ حضرت عمر ؓ نے (ایک دفعہ) حضرت انس ؓ کو قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: قبر سے بچو، قبر سے دور رہو لیکن آپ نے انھیں نماز دہرانے کے متعلق نہیں فرمایا۔

وضاحت: انبیاء ؑ اور صلحائے امت کی قبروں کو سجدہ گاہ اور مسجد بنانے میں تعظیم و تکریم کا پہلو نکلتا ہے۔ کفار و یہود اسی طرح گمراہی میں مبتلا ہوئے اور اسی وجہ سے اللہ کی طرف سے ان پر لعنت کی گئی لیکن مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کر وہاں مسجد تعمیر کرنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ایسا کرنے میں ان کی تعظیم و تکریم کا وہم بھی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ان کی توہین کا پہلو نکلتا ہے اور مشرکین کی اہانت جائز ہے۔ امام بخاری ؒ نے جس فرمان نبوی سے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے، اسے صحیح بخاری میں موصولاً بھی بیان کیا ہے۔[3] بلکہ ایک روایت میں یہود کے ساتھ نصاریٰ کا بھی ذکر ہے، نیز اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے اپنی امت کو خبردار کرنا چاہتے تھے۔[4] اس کے علاوہ دیگر مقامات پر اس حدیث کو بیان کیا گیا ہے۔[5] اس عنوان کا دوسرا جز یہ ہے کہ قبروں میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ اس سے مراد قبر کے اوپر یا قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ہے یا دو قبروں کے

[1] صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 168. [2] ملاحظہ ہو، حدیث: 168. [3] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4441.
[4] صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 435-436. [5] فتح الباري: 679/1.

درمیان نماز ادا کرنا ہے۔ یہ تمام صورتیں منع ہیں۔ اس کے متعلق ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے، ان پر یا ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[1] چونکہ یہ حدیث امام بخاری ؒ کی شرط کے مطابق نہ تھی، اس لیے آپ نے عنوان میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت عمر ؓ کے اثر کو امام بخاری ؒ کے شیخ ابونعیم نے اپنی تالیف ”کتاب الصلاۃ،، میں موصولاً بیان کیا ہے۔[2]

٤٢٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ هِشَامٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ وَأُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتَا كَنِيسَةً، رَأَيْنَهَا بِالْحَبَشَةِ فِيهَا تَصَاوِيرُ فَذَكَرَتَا لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ أُولٰئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَّصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، فَأُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ». [انظر: ٤٣٤، ١٣٤١]

[427] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہ اور ام سلمہ ؓ نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ (جب) انھوں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ”ان لوگوں کی عادت تھی کہ ان میں اگر کوئی نیک آدمی مرتا تو اس کی قبر پر مسجد اور تصویریں بنا دیتے۔ قیامت کے دن یہ لوگ اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔“

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ کا دعویٰ ہے کہ مشرکین کے قبرستان میں قبریں ختم کر کے مسجد تعمیر کرنا درست ہے اور جو دلیل ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ قبرستان کو مسجد بنانے کی اجازت نہیں، اس لیے امام بخاری ؒ کے دعویٰ اور دلیل میں تقریب تام نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ یہود ونصاریٰ کے حق میں وعید اور لعنت جس طرح ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے انبیاء ؑ کی قبروں کی تعظیم میں غلو کرتے ہوئے انھیں سجدہ گاہ بنا لیا اور نتیجتاً وہ انبیاء ؑ کو معبود سمجھنے لگے، اسی طرح یہ وعید ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو ان قبروں کی جگہ اس طرح مسجد تعمیر کریں کہ ان کے جسد اطہر کو قبر سے نکال دیں اور ہڈیاں پھینک دیں۔ وہ فرماتے ہیں یہ دونوں باتیں حضرات انبیاء ؑ اور ان کے متبعین ہی کے ساتھ خاص ہیں، جہاں تک کفار کا تعلق ہے تو ان میں یہ باتیں نہیں پائی جاتیں، اس لیے اگر کفار کی قبروں سے ہڈیاں نکال کر پھینک دی جائیں اور ان کی جگہ مسجد تعمیر کر لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ان کی تعظیم تو مقصود نہیں اور ان کی اہانت میں بھی کوئی حرج نہیں۔[3] ② یہود ونصاریٰ پر لعنت کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے انبیائے کرام ؑ کی قبروں کو باقی رکھتے ہوئے انھیں مساجد بنا لیا تھا۔ جب انبیاء ؑ کی قبروں کو باقی رکھتے ہوئے وہاں مسجد بنانا باعث لعنت ہے تو قبور مشرکین کو باقی رکھتے ہوئے وہاں مسجد تعمیر کرنا بدرجۂ اَوْلیٰ موجب لعنت ہوگا۔ اس طرح امام بخاری ؒ کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت ظاہر ہوگئی۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ انبیاء کی قبروں کو کھودنا سخت حرام اور ان کی توہین کا باعث ہے، اس لیے ان کی قبروں کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ اس کے برعکس مشرکین کی قبروں کا کوئی احترام نہیں، اس لیے ان کی جگہ پر مساجد تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

---

① صحيح مسلم، الجنائز، حديث: 2250(972). ② فتح الباري: 679/1. ③ فتح الباري: 679/1.

انھیں اکھاڑ کر ہڈیاں الگ کر دی جائیں اور جب زمین ان کے ناپاک جسم سے پاک ہو جائے تو وہاں مسجد بنا لی جائے۔ ③ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی قبروں پر مسجدیں بنانا یہود و نصاریٰ کی علامت ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور آپ نے یہ باتیں مرض وفات میں ارشاد فرمائیں، جن کا مفہوم یہ تھا کہ آپ کے بعد آپ کی قبر مبارک کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ حکومت سعودیہ کو جزائے خیر دے جس کی مخلصانہ کوششوں سے امت ابھی تک ان ہدایات پر قائم ہے اور آپ کی قبر سجدہ گاہ بننے سے محفوظ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ.

٤٢٨ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَدِمَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَدِينَةَ فَنَزَلَ أَعْلَى الْمَدِينَةِ فِي حَيٍّ يُقَالُ لَهُمْ بَنُو عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ، فَأَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ فِيهِمْ أَرْبَعَ عَشْرَةَ لَيْلَةً، ثُمَّ أَرْسَلَ إِلٰى بَنِي النَّجَّارِ فَجَاؤُوا مُتَقَلِّدِينَ السُّيُوفَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ عَلٰى رَاحِلَتِهِ وَأَبُو بَكْرٍ رِدْفُهُ وَمَلَأُ بَنِي النَّجَّارِ حَوْلَهُ، حَتّٰى أَلْقٰى بِفِنَاءِ أَبِي أَيُّوبَ، وَكَانَ يُحِبُّ أَنْ يُصَلِّيَ حَيْثُ أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ، وَيُصَلِّي فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ، وَأَنَّهُ أَمَرَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ، فَأَرْسَلَ إِلٰى مَلَإٍ مِّنْ بَنِي النَّجَّارِ، فَقَالَ: «يَابَنِي النَّجَّارِ! ثَامِنُونِي بِحَائِطِكُمْ هٰذَا» قَالُوا: لَا وَاللهِ لَا نَطْلُبُ ثَمَنَهُ إِلَّا إِلَى اللهِ، فَقَالَ أَنَسٌ: فَكَانَ فِيهِ مَا أَقُولُ لَكُمْ: قُبُورُ الْمُشْرِكِينَ، وَفِيهِ خَرِبٌ، وَفِيهِ نَخْلٌ، فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِقُبُورِ الْمُشْرِكِينَ فَنُبِشَتْ، ثُمَّ بِالْخَرِبِ فَسُوِّيَتْ، وَبِالنَّخْلِ فَقُطِعَ، فَصَفُّوا النَّخْلَ قِبْلَةَ الْمَسْجِدِ وَجَعَلُوا عِضَادَتَيْهِ الْحِجَارَةَ، وَجَعَلُوا يَنْقُلُونَ الصَّخْرَ وَهُمْ يَرْتَجِزُونَ وَالنَّبِيُّ ﷺ مَعَهُمْ وَهُوَ يَقُولُ: «اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَهْ، فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ

[428] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ (جب ہجرت کر کے) مدینہ تشریف لائے تو عمرو بن عوف نامی قبیلے میں پڑاؤ کیا جو مدینے کی بالائی جانب واقع تھا۔ نبی ﷺ نے ان لوگوں میں چودہ شب قیام فرمایا۔ پھر آپ نے بنونجار کو بلایا تو وہ تلواریں لٹکائے ہوئے آپہنچے۔ (حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:) گویا میں نبی ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہیں، ابوبکر صدیق آپ کے ردیف اور بنونجار کے لوگ آپ کے گرد ہیں، یہاں تک کہ آپ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے اپنا پالان ڈال دیا۔ آپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ جس جگہ نماز کا وقت ہو جائے وہیں پڑھ لیں حتی کہ آپ بکریوں کے باڑے میں بھی نماز پڑھ لیتے تھے۔ پھر آپ نے مسجد بنانے کا حکم دیا اور بنونجار کے لوگوں کو بلا کر فرمایا: ''اے بنونجار! تم اپنا یہ باغ ہمارے ہاتھ بیچ دو۔'' انھوں نے عرض کیا: ایسا نہیں ہوسکتا، اللہ کی قسم! ہم تو اس کی قیمت اللہ ہی سے لیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں تمھیں بتاؤں کہ اس باغ میں کیا تھا، وہاں مشرکوں کی قبریں، پرانے کھنڈرات اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق مشرکین کی قبریں اکھاڑ دی گئیں، کھنڈرات ہموار کر دیے گئے اور کھجوروں کے درخت کاٹ کر ان کی لکڑیوں کو مسجد کے سامنے نصب کر دیا گیا۔

وَالْمُهَاجِرَهْ». [راجع: ٢٣٤]

(اس وقت قبلہ بیت المقدس تھا) اور اس کی بندش پتھروں سے کی گئی، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رجز پڑھتے ہوئے پتھر لانے لگے۔ نبی ﷺ بھی ان کے ہمراہ تھے اور آپ بھی اس وقت یہ رجز پڑھتے تھے:

''اے اللہ! بھلائی تو بس آخرت کی بھلائی ہے۔
اس لیے تو مہاجرین اور انصار کو معاف فرما دے۔''

فوائد ومسائل: ① عنوان یہ ہے کہ مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کر وہاں مسجد بنانا جائز ہے اور دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابر کو مساجد بنانا ناجائز ہے۔ ان کی قبروں کو مساجد بنانے کی دو صورتیں ممکن ہیں: * قبروں کو اکھاڑا نہ جائے بلکہ انھیں باقی رکھ کر مسجد بنالی جائے۔ اس صورت میں بت پرستی سے مشابہت ہوگی جو ناجائز ہے۔ * قبروں کو اکھاڑ کر مسجد بنائی جائے۔ اس صورت میں قبور انبیاء علیہم السلام کی اہانت لازم آئے گی، لہٰذا یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابر کو مساجد بنانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اس کے برعکس مشرکین و کفار کی قبروں کو مساجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ انھیں اکھاڑ کر جو کچھ ان سے برآمد ہو اسے باہر پھینک دیا جائے اور صاف زمین پر مسجد تعمیر کی جائے۔ کفار ومشرکین کی قبروں کو اکھاڑنا جائز ہے کیونکہ ان کی اہانت ممنوع نہیں، نیز ومايكره من الصلاة في القبور عنوان کا دوسرا جز نہیں بلکہ مشرکین کی قبروں کو مساجد میں تبدیل کرنے کی دوسری دلیل یا علت ہے اور اس کا عطف قول پر ہے۔ عنوان کے معنی یہ ہوں گے: کیا مشرکین کی قبور کو اکھاڑ کر مساجد بنا دیا جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبور انبیاء کو مساجد بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے اور اس لیے کہ قبروں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ مايكره من الصلاة في القبور عنوان کا دوسرا جز نہیں، اس لیے کہ قبروں میں نماز مکروہ ہونے کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ آئندہ ایک عنوان قائم کر رہے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں: [باب كراهية الصلاة في المقابر][1] اگر مايكره من الصلاة في القبور کو عنوان کا جز تسلیم کیا جائے تو ابواب کا تکرار ہوتا ہے جو اصولاً درست نہیں کیونکہ اگر تراجم کی غرض ایک ہو تو الفاظ کی تبدیلی سے بھی تکرار ہو جاتا ہے لیکن اگر الفاظ ایک ہوں اور اغراض الگ الگ ہوں تو یہ تکرار نہیں ہوتا لیکن یہاں دونوں ابواب کی غرض ایک ہے اور الفاظ بھی تقریباً ملتے جلتے ہیں۔ اس طرح کا تکرار تراجم بخاری میں نہیں ہے، لہٰذا مايكره من الصلاة في القبور کو عنوان کی علت قرار دیا جائے گا، اسے عنوان کا جز نہیں بنایا جائے گا۔ ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس جگہ مسجد نبوی تعمیر کی گئی ہے وہاں پہلے مشرکین کا قبرستان تھا اور یہ قبرستان بنونجار کی ملکیت تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ ابتدا میں ان حضرات نے قیمت لینے سے انکار کر دیا، تاہم اس کی قیمت ادا کر کے اسے خرید لیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبرستان اگر وقف نہ ہو بلکہ کسی کی ملکیت ہو تو اسے فروخت یا ہبہ کرنا جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر وقف ہو تو اس کی خرید وفروخت یا اسے کسی دوسرے کو ہبہ کرنا جائز نہیں۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ بیضاوی کے حوالے

① صحیح البخاري، الصلاة، باب: 52.

سے لکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ قبور انبیاء ﷺ کو سجدۂ تعظیمی کرتے اور انھیں قبلہ بناتے تھے، یعنی ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، اس لیے ان پر لعنت کی گئی، لیکن اگر کسی صالح بزرگ کے قرب میں محض برکت کے خیال سے مسجد بنائی جائے تو وعید میں داخل نہ ہوگی۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ ممانعت نبوی صرف اس خطرے کے پیش نظر ہے کہ قبر کو وثن اور بت نہ بنا لیا جائے لیکن ان کے نزدیک اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہو تو ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ حافظ ابن حجر ؒ جیسے حساس شخص نے اس رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، حالانکہ گزشتہ قوموں میں شرک باللہ اور توسل بغیر اللہ کے لیے چور دروازہ یہاں سے ہی کھلتا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مسئلے کی نزاکت کے پیش نظر بڑی شدت کے ساتھ اس کی تردید فرمائی کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو جنھوں نے انبیاء اور صالحین کی قبروں پر مساجد تعمیر کر لیں اور یہ بھی فرمایا کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصاویر آویزاں کر دیتے تھے۔ یہی لوگ قیامت کے دن بدترین انسان ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس قسم کی ذہنیت کے حامل لوگوں کی بات نقل کی ہے کہ اصحاب کہف کے مرنے کے بعد لوگوں نے طے کیا کہ انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور غار کا دروازہ بند کر دیا جائے لیکن شہر کے بااثر لوگوں نے برملا کہا کہ ہم ان کی یادگار کے طور پر ان کی قبروں پر مسجد بنائیں گے۔[2] ان کا مقصد بھی غالباً یہی تھا کہ ہم ان کے اجسام اور ان کی تربت سے برکت کے لیے اس مسجد میں نمازیں پڑھیں گے، اس لیے حافظ ابن حجر ؒ کی نقل کردہ رائے صحیح نہیں۔

(٤٩) بَابُ الصَّلَاةِ فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ

باب:49- بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنا

٤٢٩ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ أَبِي التَّيَّاحِ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ، ثُمَّ سَمِعْتُهُ بَعْدُ يَقُولُ: كَانَ يُصَلِّي فِي مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَبْلَ أَنْ يُبْنَى الْمَسْجِدُ. [راجع: ٢٣٤]

[429] حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد پھر میں نے انھیں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے آپ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے۔

فائدہ: جس جگہ رات کے وقت بکریاں باندھی جائیں اسے عربی میں [مَرْبَض] کہتے ہیں جس کی جمع [مَرَابِض] ہے۔ ان باڑوں میں زمین کو عموماً ہموار اور نرم رکھا جاتا ہے، ان میں صفائی کا بھی اہتمام ہوتا ہے، پھر بکریوں کے پاس نماز پڑھنے میں نمازی کو کوئی خطرہ یا تشویش نہیں ہوتی، اس لیے مذکورہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ واضح رہے کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا یہ عمل مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے تھا، مسجد کی تعمیر کے بعد آپ کا معمول مسجد میں نماز پڑھنے کا رہا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنا مطلوب نہیں صرف اس کی اجازت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو،[3] نیز آپ نے فرمایا کہ ان کے باڑوں میں نماز پڑھ لو کیونکہ

[1] فتح الباري: 680/1. [2] الكهف 21:18. [3] سنن ابن ماجه، المساجد، حديث: 769.

بکریوں میں برکت ہے۔[1]

(٥٠) بَابُ الصَّلَاةِ فِي مَوَاضِعِ الْإِبِلِ

باب:50- اونٹوں کی جگہوں پر نماز پڑھنا

٤٣٠ - حَدَّثَنَا صَدَقَةُ بْنُ الْفَضْلِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَيَّانَ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ عَنْ نَّافِعٍ قَالَ: رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يُصَلِّي إِلَى بَعِيرِهِ، وَقَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْعَلُهُ. [انظر: ٥٠٧]

[430] حضرت نافع کہتے ہیں: میں نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے اونٹ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے اور فرماتے کہ میں نے نبی ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔

فوائد ومسائل: ① اونٹوں کی جگہ پر نماز پڑھنے کی ممانعت کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں جو اگرچہ امام بخاری ؒ کی شرائط کے مطابق نہیں، تاہم ان کی اسناد قوی ہیں۔ حضرت جابر ؓ سے مروی حدیث صحیح مسلم میں، حضرت براء بن عازب ؓ سے مروی حدیث ابوداود میں، حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث ترمذی میں، حضرت عبداللہ بن مغفل ؓ کی روایت سنن نسائی میں اور حضرت سبرہ بن معبد ؓ سے مروی حدیث ابن ماجہ میں ہے۔ اکثر روایات میں لفظ [مَعَاطِن] آیا ہے جس کے معنی ہیں: اونٹوں کو پانی پلا کر بٹھانے کی جگہ۔ بعض روایات میں [مَبَارِك الْإِبِل] اور بعض میں [مناخ الابل] کے الفاظ ہیں لیکن امام بخاری ؒ نے ان تمام مروی الفاظ سے ہٹ کر مواضع کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ یہ تمام کو شامل ہے، نیز آپ کا کمال ادب و احترام اور احتیاط ہے کہ مبادا حدیث کے الفاظ سے تقابل ہو جائے۔ بعض روایات میں ممانعت کی وجہ ان کا شیاطین سے ہونا بیان ہوئی ہے۔ کچھ ائمہ کا خیال ہے کہ [معاطن ابل] میں نماز پڑھنا درست نہیں جبکہ امام بخاری ؒ یہ واضح کرنا چاہتے کہ اگر مقامات پر ممانعت کی علت اونٹ کا شیاطین سے ہونا مان لیا جائے تو اس میں معاطن کی کیا خصوصیت ہے، اونٹ جہاں بھی ہو جس حالت میں ہو، اس کے قریب نماز درست نہیں ہونی چاہیے جبکہ روایات میں اس کا گھٹنا باندھ کر اسے سترہ بنانے کا ذکر موجود ہے۔ اونٹ پر سواری کی حالت میں نماز پڑھنا ثابت ہے۔ امام بخاری ؒ کے نزدیک مذکورہ علت صحیح نہیں۔ ان کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ پانی پینے کی جگہ جہاں بہت زیادہ اونٹ جمع ہوتے ہیں اور پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے ہیں وہاں نماز پڑھنے میں اطمینان قلب میسر نہیں آتا، اس لیے ممانعت کر دی گئی ہے۔ اگر جگہ پاک ہو اور اونٹ کو نکیل ڈال کر اور اس کا گھٹنا باندھ کر اس کے خطرات کو کم کر دیا گیا ہو تو ان مقامات پر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے اونٹ کو سامنے بٹھا کر نماز پڑھی اور فرمایا کہ میں نے نبی ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اونٹ کی شرارت سے اگر تحفظ ہو تو اس کے قریب نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔[2] ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ اونٹوں کی جگہ پر نماز پڑھنا درست نہیں کیونکہ متعدد احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہے۔ اور امام بخاری ؒ کی پیش کردہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب اونٹ سامنے بیٹھا ہو اور اس سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو تو ایسے حالات میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اور

① سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 493. ② فتح الباري: 683/1.

جن احادیث میں ممانعت آئی ہے وہاں یہ مقصود ہے کہ اونٹ کھڑے ہوں اور ان کی طرف سے مستی میں آنے یا لات مارنے کا اندیشہ ہو تو اس سے نماز کا خشوع اور اطمینان غارت ہوگا، لہٰذا ایسے حالات میں وہاں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ بعض ائمۂ کرام نے متعارض احادیث کو اس طرح جمع کیا ہے کہ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُورًا کے عموم کے پیش نظر متعلقہ ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔[1] ② بھینسوں اور گایوں کے فارم میں نماز پڑھنے کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا ان کا اطلاق بکریوں کے ساتھ ہے کہ وہاں نماز میں کوئی قباحت نہیں یا انھیں اونٹوں کے حکم میں شامل کر کے وہاں نماز پڑھنے کو مکروہ کہا جائے گا؟ ابوبکر ابن المنذر نے اسے بکریوں پر قیاس کرتے ہوئے ان کے فارموں میں نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے جبکہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے لیکن اونٹوں اور گایوں کے طویلے میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔[2] لیکن اس کی سند میں ایک مشہور راوی ابن لہیعہ ہے جس کے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے۔ اس بنا پر یہ روایت صحت حدیث کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔[3]

(٥١) بَابُ مَنْ صَلَّى وَقُدَّامَهُ تَنُّورٌ أَوْ نَارٌ أَوْ شَيْءٌ مِّمَّا يُعْبَدُ، فَأَرَادَ بِهِ وَجْهَ اللهِ تَعَالَى

باب: 51- جو شخص بایں حالت نماز پڑھے کہ اس کے سامنے تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی عبادت کی جاتی ہو لیکن نمازی کی نیت صرف اللہ کی رضا جوئی ہو

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: أَخْبَرَنِي أَنَسٌ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ وَأَنَا أُصَلِّي».

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی ﷺ نے فرمایا: ''دوزخ کو میرے روبرو پیش کیا گیا جب کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔''

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں تین چیزوں کا ذکر کیا ہے: تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز جس کی عبادت کی جاتی ہو۔ ان تمام کا حکم ایک ہے کہ یہ نمازی کی نیت پر موقوف ہے کہ اگر اس کی نیت صحیح ہے تو اس سے نماز میں کراہت یا فساد واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کی نماز بلا کراہت صحیح ہوتی ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے کھل کر اپنے موقف کو واضح نہیں کیا، البتہ پیش کردہ روایات سے ان کے موقف کا تعین ہوتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جس حدیث کو معلق بیان کیا ہے اسے آئندہ (حدیث: 540 میں) موصولاً بھی بیان کریں گے۔ پہلے کتاب العلم (حدیث: 93) میں بھی اسے مختصراً بیان کیا تھا۔ اور جو الفاظ یہاں بیان ہوئے ہیں ان الفاظ کے ساتھ مذکورہ حدیث آئندہ کتاب التوحید (حدیث: 7294) میں بھی آئے گی۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے اس استدلال پر کچھ حضرات نے اعتراض بھی کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بحالت نماز جو آگ دکھائی گئی تھی وہ ایسی نہ تھی جو کسی قوم کی معبود ہو اور اس آگ کو ہٹانے یا برقرار رکھنے پر بھی آپ کو قدرت نہ تھی بلکہ اسے تو صرف لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اس آگ کا ایک منظر دکھایا گیا تھا جو قیامت کے دن مجرمین کے لیے ہوگی، لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا ہے

[1] فتح الباري: 683/1. [2] مسند أحمد: 178/2. [3] عمدة القاري: 439/1.

کہ اس آگ کے متعلق اختیار یا عدم اختیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر غیر اختیاری آگ کا دکھانا درست نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو یہ منظر نہ دکھایا جاتا کیونکہ آپ کسی باطل چیز پر برقرار نہیں رہ سکتے، چنانچہ شاہ ولی اللہ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: ''اس باب سے مؤلف کی غرض اس شخص کا وہم دور کرنا ہے جو تنور کے بالمقابل نماز پڑھنے کو جائز خیال نہیں کرتا کیونکہ اس طرح مجوس (آگ پرست) سے مشابہت ہو جاتی ہے۔ مصنف کے استدلال میں ایک قسم کا خفا ہے اسے یوں دور کیا جا سکتا ہے کہ اگر آگ کا نمازی کے سامنے ہونا اللہ کو ناپسند اور نماز کی خرابی کا باعث ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے رسول ﷺ کے سامنے بحالت نماز حاضر نہ کرتا کیونکہ آپ اللہ کے رسول اور اس کے محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اس آگ کو بحالت نماز آپ کے سامنے کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ نماز کے لیے خرابی کا باعث نہیں ہے۔''

٤٣١ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ فَصَلَّى رَسُولُ اللهِ ﷺ، ثُمَّ قَالَ: «أُرِيتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ مَنْظَرًا كَالْيَوْمِ قَطُّ أَفْظَعَ». [راجع: ٢٩]

[431] حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ایک دفعہ سورج کو گرہن لگا تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، پھر فرمایا: ''مجھے نماز کی حالت میں جہنم دکھائی گئی، چنانچہ میں نے آج کی طرح کا ہیبت ناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔''

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ نے حضرت ابن عباس ؓ سے مروی اس حدیث کو نہایت مختصر طور پر یہاں بیان کیا ہے۔ تفصیل کے مطابق رسول اللہ ﷺ دوران نماز میں دفعتاً پیچھے ہٹے، پھر آگے بڑھے۔ نماز کے بعد دریافت کرنے پر بتایا کہ دوران نماز میں میرے سامنے جنت لائی گئی، میں آگے بڑھا اور اس کا خوشۂ انگور توڑنا چاہا۔ پھر مجھے جہنم دکھائی گئی، اس کا خوفناک منظر دیکھ کر میں پیچھے ہٹا۔[1] امام بخاری ؒ نے اس سے عنوان ثابت کیا کہ اگر نمازی کے سامنے آگ ہو اور نمازی کی نیت صرف اللہ کے لیے نماز پڑھنے کی ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دراصل امام بخاری ؒ کو ایسے اجتہادی مسائل ثابت کرنے کے لیے اشاروں سے کام لینا پڑتا ہے کیونکہ اس سلسلے میں کوئی نص صریح کتب حدیث میں موجود نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی وقت اختیاری حالات میں آگ کو سامنے کی سمت میں لے کر نماز پڑھی ہو۔ امام بخاری ؒ اس عنوان سے امام ابن سیرین کی تردید کرنا چاہتے جن کا موقف ہے کہ تنور کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔[2] حافظ ابن حجر ؒ نے ایک اور انداز سے امام بخاری ؒ کے موقف کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے عنوان میں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ اگر نمازی کے آگے آگ ہو تو اس کی نماز جائز ہے یا مکروہ، ممکن ہے کہ آپ پیش کردہ روایات سے اس فرق کو واضح کرنا چاہتے ہوں۔ اگر نمازی اور اس کے قبلے کے درمیان آگ حائل ہو جائے اور وہ اسے زائل کرنے یا اس سے ہٹ جانے کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے حالات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اگر وہ اس قسم کی آگ کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو اور اسے دور کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ایسے حالات میں نماز پڑھنا جائز ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس ؓ کے متعلق روایات میں ہے کہ وہ اس

① صحيح البخاري، الكسوف، حديث :1052. ② فتح الباري : 684/1.

گرجے میں نماز نہیں پڑھتے تھے جس میں سامنے دیوار پر تماثیل ہوتی تھیں بلکہ ایسے حالات میں باہر بارش میں نماز پڑھنے کو اختیار فرماتے۔ ② بعض حضرات نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث میں صرف آگ دیکھنے کا ذکر ہے لیکن یہ کہ آپ نے سامنے والی دیوار میں یہ منظر دیکھا، حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ ممکن ہے کہ دائیں یا بائیں جانب اس آگ کو دیکھا ہو، لہٰذا اس روایت سے عدم کراہت پر استدلال محل نظر ہے، لیکن اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ حدیث انس میں یہ صراحت ہے کہ بحالت نماز وہ آگ آپ کو پیش کی گئی۔ اس سے بھی زیادہ صراحت حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما میں ہے۔ اس میں ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد لوگوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو دوران نماز میں آگے بڑھتے دیکھا گویا آپ کسی چیز کو پکڑ رہے ہیں، پھر دفعتاً ہم نے آپ کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے جنت اور دوزخ کو لایا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آگ آپ کے سامنے تھی اور ان روایات کے پیش نظر نمازی کے قریب یا دور ہونے کا فرق بھی صحیح نہیں۔[1] واضح رہے کہ آگ کو ہی آپ کے پاس لایا گیا تھا۔ یہ احتمال بعید ہے کہ آگ اپنی جگہ پر رہی، صرف درمیان سے حجابات کو دور کر دیا گیا تھا۔ واللہ أعلم. ③ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں گیس ہیٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ وہ بجانب قبلہ ہی کیوں نہ ہوں، تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ انھیں دائیں یا بائیں یا عقبی دیوار پر نصب کیا جائے تاکہ سامنے ہونے کی صورت میں نمازی کے لیے تشویش کا باعث نہ بنیں۔

(٥٢) بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي الْمَقَابِرِ

باب:52- قبرستان میں نماز پڑھنے کی حرمت

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے ذریعے سے ان روایات کی طرف اشارہ کیا ہے جنھیں امام ابوداود اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تمام روئے زمین پر نماز پڑھی جا سکتی ہے، مگر قبرستان اور حمام اس قابل نہیں کہ وہاں نماز ادا کی جائے۔[2] اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اسے امام ابن حبان اور امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

٤٣٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنِي نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «اجْعَلُوا فِي بُيُوتِكُمْ مِّنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا». [انظر: ١١٨٧]

[432] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: آپ نے فرمایا: ''کچھ نماز (نوافل وغیرہ) اپنے گھروں میں ادا کرو، انھیں قبرستان مت بناؤ۔''

فوائد و مسائل: ① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' سے موجودہ مسئلے کا استنباط کیا ہے کہ چونکہ قبریں محل عبادت نہیں، لہٰذا ان میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔[4] لیکن علامہ ابن منیر نے اس معنی اور استنباط کو محل نظر قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم گھروں میں اس انداز سے مت رہو جیسا کہ قبروں میں

---

1 فتح الباري : 684/1. 2 جامع الترمذي، الصلاة، حديث : 317. 3 فتح الباري : 685/1. 4 فتح الباري : 685/1.

مردے ہوتے ہیں۔ان مردوں کا اعمال سے تعلق ختم ہو جاتا ہے اور شرعی پابندیاں بھی ان سے اٹھالی جاتی ہیں۔اس بنا پر زندوں کے لیے قبرستان میں نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے کے متعلق یہ حدیث خاموش ہے۔ یہ مفہوم مراد لینے کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں بھی لفظ قبور ہے، مقابر نہیں اور قبر اس گڑھے کو کہتے ہیں جس میں مردہ دفن کیا جاتا ہے اور مقبرہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں قبریں ہوں۔[1] لیکن ان کا امام بخاری رحمہ اللہ کے استنباط کو محل نظر قرار دینا بجائے خود محل نظر ہے کیونکہ انھوں نے اس کے لیے حدیث کے الفاظ ''قبور'' کو بنیاد بنایا ہے، حالانکہ بعض روایات میں مقابر کے الفاظ بھی موجود ہیں جس کے معنی قبرستان ہیں۔[2] اسی طرح حدیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبرستان کو مسجد کا درجہ دینے سے منع فرمایا ہے۔[3] اس کے علاوہ ابن المنذر نے اکثر اہل علم سے نقل کیا ہے کہ قبرستان محل صلاۃ نہیں۔انھوں نے امام بخاری رحمہ اللہ کی طرح اسی حدیث کو بنیاد بنا کر استنباط کیا ہے۔امام بغوی اور علامہ خطابی نے اس سے موافقت کی ہے۔[4] ② اس حدیث کے اور بھی معنی کیے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: * اپنے مردوں کو گھروں میں دفن نہ کرو کیونکہ ایسا کرنے سے گھروں میں نماز پڑھنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔[5] لیکن چونکہ یہاں نماز کا بیان ہے، لہٰذا یہ معنی مناسب معلوم نہیں ہوتے۔ * گھروں کو صرف نیند کی آماجگاہ نہ بنایا جائے کہ ان میں مردوں کی طرح سوتے رہو، کبھی نماز پڑھنے کا خیال تک نہ آئے۔[6] ہمارے نزدیک راجح موقف یہی ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا درست نہیں۔ البتہ نماز جنازہ قبرستان میں پڑھی جاسکتی ہے۔گھروں کو مقبرہ نہ بناؤ کا یہی مطلب ہے کہ نفل نمازیں گھر میں پڑھا کرو، قبرستان کی طرح وہاں نماز پڑھنے سے پرہیز نہ کیا کرو۔ واللہ أعلم.

(٥٣) بَابُ الصَّلَاةِ فِي مَوَاضِعِ الْخَسْفِ وَالْعَذَابِ

باب: 53- عذاب اور دھنسنے کے مقامات پر نماز پڑھنے کا حکم

وَيُذْكَرُ أَنَّ عَلِيًّا كَرِهَ الصَّلَاةَ بِخَسْفِ بَابِلَ.

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے عذاب کی وجہ سے بابل کی دھنسی ہوئی جگہ پر نماز (پڑھنے) کو ناپسند فرمایا تھا۔

وضاحت: قبرستان میں مرحوم اور محروم دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جب قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جہاں ہر طرح کے لوگ دفن ہوتے ہیں، تو عذاب کے مقامات پر نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ مکروہ ہوگا کیونکہ محل عذاب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا، یعنی رحمت طلب کرنا ایک طرح کی جسارت اور آثار غضب سے بے پروائی کا نتیجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ جہاں شیطانی اثرات تھے وہاں سے نکل کر دوسری جگہ نماز پڑھی تھی،[7] اس لیے جن مقامات پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا ہو وہاں بھی شیطانی اثرات ضرور ہوں گے، تو ایسی جگہ پر نماز پڑھنا کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت علی

---

① المتواري، ص: 84. ② صحيح مسلم، صلاة المسافرين، حديث: 1824(780). ③ صحيح مسلم، المساجد، حديث: 1188(532). ④ فتح الباري: 685/1. ⑤ فتح الباري: 685/1. ⑥ فتح الباري: 686/1. ⑦ صحيح مسلم، المساجد، حديث: 1560(680).

رضی اللہ عنہ کا ایک اثر پیش کیا ہے جسے مصنف ابن ابی شیبہ (369-368/3) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بابل کے ایک مقام خسف سے گزرے تو وہاں نماز نہ پڑھی، بلکہ اسے عبور کرنے کے بعد دوسرے علاقے میں نماز ادا کی۔ ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا: میں ایسی سرزمین میں نماز کیوں ادا کروں جہاں اللہ کی طرف سے خسف ہوا ہے؟ سنن ابی داود میں ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بابل کی سرزمین میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا تھا کیونکہ یہ اللہ کے ہاں لعنت زدہ ہے، لیکن اس کی سند کمزور ہے۔ بابل میں خسف سے مراد وہ مقام ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے: ﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ ''ان سے پہلے بھی لوگ مکروفریب کرتے رہے ہیں، آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کی عمارت کو بنیادوں سے اکھاڑ پھینکا اور اوپر سے چھت کو بھی ان پر گرا دیا۔''[1] اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں نمروذ بن کنعان نے بابل شہر میں پانچ ہزار ہاتھ اونچی عمارت بنائی تھی جو ان کے اعمال بد اور سازشوں کی وجہ سے اس پر اور اس کی قوم پر الٹا دی گئی۔[2] بہرحال حضرت علی رضی اللہ عنہ بابل کے مقامات خسف سے گزرے تو انھوں نے وہاں نماز نہیں پڑھی بلکہ وہاں سے آگے بڑھنے کے بعد نماز ادا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں عذاب الٰہی نازل ہوا ہو، ان مقامات پر نماز پڑھنا مستحسن عمل نہیں۔

٤٣٣ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِينَارٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا؛ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «لَا تَدْخُلُوا عَلَى هٰؤُلَاءِ الْمُعَذَّبِينَ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ، فَإِنْ لَّمْ تَكُونُوا بَاكِينَ فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ، لَا يُصِيبُكُمْ مَّا أَصَابَهُمْ». [انظر: ٣٣٨٠، ٣٣٨١، ٤٤١٩، ٤٤٢٠، ٤٧٠٢]

[433] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان عذاب یافتہ قوموں کے آثار سے اگر تمھارا گزر ہو تو اس طرح گزرو کہ تم پر گریہ و بکا طاری ہو۔ اگر رو نہ سکو تو وہاں سے مت گزرو، مبادا تم پر وہی عذاب آجائے جس نے انھیں اپنی گرفت میں لیا تھا۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا دوسرا استدلال یہ مرفوع حدیث ہے کہ نبی ﷺ جب غزوۂ تبوک کے لیے جاتے ہوئے دیار ثمود، یعنی مقام حجر سے گزرے تو آپ نے فرمایا کہ اگر ایسے مقامات سے گزرنے کی مجبوری ہو تو اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے گزرنا چاہیے، غفلت اور بے پروائی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ علامہ ابن بطال نے امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلال سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے مقامات پر نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ نماز میں بھی رونا اور عاجزی کرنا ہوتا ہے۔[3] گویا ابن بطال کے نزدیک مذکورہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل کے مطابق نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث پورے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل کے مطابق ہے کیونکہ اس حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وہاں پڑاؤ نہیں کیا جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سر جھکا لیا اور جلدی جلدی چلنے لگے تاآنکہ اس وادی کو عبور کر لیا۔[4] اس روایت سے معلوم ہوتا

---

[1] النحل 26:16. [2] فتح الباري: 686/1. [3] شرح ابن بطال: 87/2. [4] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4419.

ہے کہ آپ نے وہاں قیام نہیں فرمایا اور نہ نماز ہی پڑھی جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بابل کے خسف شدہ مقام سے گزرتے ہوئے کیا تھا، اس لیے معلوم ہوا کہ عذاب والے علاقوں اور خسف شدہ مقامات میں قیام کرنا اور وہاں نماز ادا کرنا شارع علیہ السلام کو پسند نہیں۔ اور یہی امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصود ہے۔ یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ گریہ و بکا تو کمال خشوع کی علامت ہے اور نماز میں یہ کیفیت مطلوب ہے، اس لیے نماز سے روکنا کیسے ثابت ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کے اندر جو خشوع خضوع مطلوب ہے وہ نماز ہی کے سلسلے میں ہے اور صورت مذکورہ میں جو گریہ طاری ہوگا وہ عذاب یافتہ اقوام کے احوال میں غور و فکر سے متعلق ہے جو نماز میں مطلوب حضور قلب کے منافی ہے۔ واللہ أعلم. ② اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کو خود اپنی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے، نیز عذاب شدہ اقوام کے مقامات پر رہائش رکھنے کی ممانعت ہے۔ اگر وہاں سے بامر مجبوری کبھی گزرنا پڑے تو جلدی جلدی گزرنا چاہیے جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے: ﴿وَ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ﴾ ''اور تم ایسے لوگوں کی بستیوں میں آباد ہوئے تھے جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم ڈھایا تھا اور تم پر واضح ہو چکا تھا کہ ان سے ہم نے کیا سلوک کیا تھا اور ہم نے تمھیں ان کے حالات بھی بتا دیے تھے۔''[1]

(٥٤) بَابُ الصَّلَاةِ فِي الْبِيعَةِ

باب: 54- گرجے میں نماز پڑھنا

وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: إِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَكُمْ مِّنْ أَجْلِ التَّمَاثِيلِ الَّتِي فِيهَا الصُّوَرُ. وَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يُصَلِّي فِي الْبِيعَةِ إِلَّا بِيعَةً فِيهَا تَمَاثِيلُ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم تمھارے گرجا گھروں میں تماثیل، یعنی تصویروں اور مجسموں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کلیسا، یعنی گرجا گھر میں نماز پڑھ لیتے تھے مگر اس گرجا گھر میں نماز نہیں پڑھتے تھے جس میں تصاویر اور مجسمے ہوتے تھے۔

وضاحت: مسلمانوں کی عبادت گاہ کو مسجد، عیسائیوں کے عبادت خانے کو بیعہ، یہود کے پوجا گھر کو صلاۃ اور عام صوفیاء اور راہبوں کے عبادت خانے یا رہائش گاہ کو صومعہ کہا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہود و نصاریٰ کے عبادت گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم بتانا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے آثار پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس عبادت خانے میں مجسمے اور تصاویر ہوں وہاں تو داخلہ بھی ممنوع ہے اور جہاں تصاویر وغیرہ نہ ہوں وہاں نماز ادا کرنا درست ہے، یعنی مسلمانوں کی مساجد اور یہود و نصاریٰ کے گرجا گھر عبادت خانہ ہونے کی حیثیت میں مشترک ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اثر مصنف عبدالرزاق (411/1) میں موصولاً بیان ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کا سفر کیا تو وہاں کے ایک بڑے پادری قسطنطین نے حضرت عمر کو دعوتِ طعام دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ ہم ان تصاویر اور مجسموں کی وجہ سے تمھارے عبادت خانوں

[1] ابراهيم 45:14.

میں نہیں جاتے۔[1] معلوم ہوا کہ تصاویر کی وجہ سے جب داخلہ تک درست نہیں تو ایسے مقامات پر نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ درست نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الجعدیات'' میں موصولاً بیان کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ اگر اس میں تصاویر ہوتیں تو وہاں سے نکل کر باہر نماز پڑھتے، خواہ وہاں بارش ہو رہی ہوتی۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تفصیل ہے، یعنی اگر یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں میں تصاویر و منکرات نہ ہوں تو ان میں نماز ادا کرنا درست ہے بصورت دیگر نماز تو درکنار داخلہ بھی ممنوع ہے۔

٤٣٤ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ أُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتْ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ كَنِيسَةً رَأَتْهَا بِأَرْضِ الْحَبَشَةِ يُقَالُ لَهَا: مَارِيَةُ، فَذَكَرَتْ لَهُ مَا رَأَتْ فِيهَا مِنَ الصُّوَرِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُولٰئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَّصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ».

[راجع: ٤٢٧]

[434] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اس گرجا گھر کا ذکر کیا جسے انھوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھا تھا، جس کا نام ماریہ تھا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس میں جو تصاویر دیکھیں تھیں انھیں بیان کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ تھے جب ان میں کوئی نیک انسان فوت ہو جاتا تو یہ اس کی قبر پر مسجد تعمیر کر دیتے، پھر وہاں یہ تصویریں بنا دیتے تھے۔ یہی لوگ اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہیں۔''

فوائد و مسائل: ① یہ حدیث پہلے 427 کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ اس کی تشریح وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس مقام پر امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ وضاحت کرنا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں میں تصاویر کب اور کیوں داخل ہوئیں کیونکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنے کی وجہ صرف تصاویر و تماثیل کا موجود ہونا ہے۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک مسلمان کو گرجے میں نماز پڑھنا ناجائز ہے کیونکہ احتمال ہے کہ گرجے کی جگہ پہلے قبر ہو اور مسلمان کے نماز پڑھنے کی وجہ سے اسے مسجد کا مقام دے دیا جائے۔[3] ان عیسائیوں سے بدتر آج ان نام نہاد مسلمانوں کا حال ہے جو مزارات کو مساجد کا مقام دے کر وہاں نمازیں پڑھتے ہیں اور وہاں صاحب قبر کے حضور جبین نیاز جھکا کر سجدے کرتے اور ان سے حاجات طلب کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اللہ کے ہاں بدترین خلائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہوش کے ناخن لینے کی توفیق دے۔ ③ ابن بطال نے امام مالک رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ میں ان کے کنیساؤں میں نماز پڑھنا ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ لوگ وہاں خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا طاہر ہونا یقینی نہیں۔ ہاں! اگر کوئی جگہ نہ ہو یا باہر کیچڑ یا بارش ہو رہی ہو تو بامر مجبوری نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔[4]

(٥٥) بَابٌ :

باب: 55- بلاعنوان

[1] فتح الباري: 688/1. [2] فتح الباري: 688/1. [3] فتح الباري: 688/1. [4] شرح ابن بطال: 89/2.

٤٣٥، ٤٣٦ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ: أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِاللهِ بْنِ عُتْبَةَ أَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَا: لَمَّا نَزَلَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيصَةً لَّهُ عَلٰى وَجْهِهِ، فَإِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهِ، فَقَالَ وَهُوَ كَذٰلِكَ: «لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ» يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا. [انظر: ١٣٣٠، ١٣٩٠، ٣٤٥٣، ٣٤٥٤، ٤٤٤١، ٤٤٤٣، ٤٤٤٤، ٥٨١٥، ٥٨١٦]

[436,435] حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ پر مرض الوفات میں نزع کی حالت طاری ہوئی تو آپ نے اپنی چادر کو بار بار اپنے چہرۂ اقدس پر ڈالنا شروع کر دیا۔ جب گھٹن محسوس فرماتے تو اسے چہرے سے اتار دیتے۔ اسی حالت میں آپ نے فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔'' اس طرح آپ امت کو یہود و نصاریٰ کے (مشرکانہ) افعال سے خبردار کر رہے تھے۔

٤٣٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَّالِكٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «قَاتَلَ اللهُ الْيَهُودَ، اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ».

[437] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت کرے، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔''

فوائد و مسائل: ① قبروں پر مساجد تعمیر کرنا اور انھیں عبادت گاہ بنانا افراط ہے اور ان کی بے حرمتی کرنا، انھیں بلاوجہ اکھاڑنا، تفریط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے افراط و تفریط سے منع فرمایا ہے۔ ان احادیث میں قبروں کے متعلق یہود و نصاریٰ کے افراط کو بیان کیا گیا ہے۔ امام بخاری ؒ نے ان احادیث پر کوئی عنوان قائم نہیں کیا کیونکہ یہ پہلے باب کا نتیجہ یا تکملہ ہے۔ احادیث میں قدر مشترک یہ ہے کہ قبروں کو مساجد کا درجہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔ امام بخاری ؒ اس فعل کی شناعت بیان کرتے ہیں کہ یہ فعل انتہائی قابل مذمت ہے، خواہ ان میں تصاویر رکھی جائیں یا تصاویر کے بغیر ہوں۔[1] عنوان ذکر نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں میں نماز کی کراہت اس وجہ سے ہے کہ وہاں مجسمے اور تصاویر ہوتی ہیں، بصورت دیگر اصل کے اعتبار سے تو ہر جگہ نماز جائز ہے۔ ممانعت کی اصل وجہ منکرات اور خلاف شرع امور کا پایا جانا ہے۔ اس بنا پر یہ ممانعت یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اگر مسلمانوں کی مساجد میں بھی ایسی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ان میں بھی نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، مثلاً: کسی مسجد میں نمایاں طور پر قبر کو برقرار رکھا گیا ہو۔ گویا امام بخاری ؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مساجد میں قبروں کو باقی رکھنا ایسا ہی ہے جیسے یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں میں تصاویر کا پایا جانا، چنانچہ ان احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا جاسکتا ہے: [بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي الْمَسَاجِدِ الَّتِي فِيهَا الْقُبُورُ] ''ایسی مساجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جن میں قبروں کو برقرار رکھا گیا ہو۔'' ② پہلی حدیث میں ایک اشکال ہے کہ اس میں

[1] فتح الباري: 689/1.

مشرکانہ عمل کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے جبکہ واقعہ یہ ہے کہ انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کے اصل مجرم تو یہودی ہیں، نصاریٰ نے کسی نبی کی قبر کو سجدہ گاہ نہیں بنایا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا اور ان کی قبر بنانے کی نوبت ہی نہیں آئی اور ان کے بعد رسول اللہ ﷺ تک کوئی اور نبی بھی نہیں آیا تو ان حالات میں انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کے جرم میں نصاریٰ کو یہود کے ساتھ شریک کرنا چہ معنی دارد؟ اس کی متعدد توجیہات حسب ذیل ہیں: * عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی تو آئے تھے لیکن وہ رسول نہ تھے جیسا کہ حواریین میں سے بعض اس کام کے لیے مامور کیے گئے تھے جن کا تذکرہ سورۂ یٰسٓ آیات 13 تا 18 میں ہے، اس لیے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کا الزام ان پر براہ راست بھی عائد ہو سکتا ہے۔ * حدیث میں انبیاء کے ساتھ کبار اتباع بھی مراد ہیں جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء اور صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نمبر 434 میں جب نصاریٰ کا بطور خاص ذکر ہوا تو وہاں کسی نیک بندے کی قبر کو سجدہ گاہ بنانے کا حوالہ دیا گیا اور جب حدیث نمبر 436 میں یہود کو بطور خاص بیان کیا گیا تو انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کا تذکرہ ہوا ہے۔ * اگرچہ اس کام کے موجد یہودی تھے لیکن نصاریٰ نے اس فعل بد کا برابر اتباع کیا، لہٰذا اس لعنت میں دونوں شریک ہو گئے، یہودی ابتداع (پہلے پہل یہ کام کرنے) کے طور پر اور عیسائی اتباع (یہود کی پیروی) کے طور پر۔[1] ③ ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حدیث اس وقت بیان فرمائی ہو جب آپ کے سامنے حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما نے سرزمین حبشہ پر کنیسۂ ماریہ کے متعلق اپنے چشم دید واقعات بیان کیے ہوں جن کا ذکر اس سے قبل حدیث: 434 میں ہوا ہے اور مرض وفات میں آپ کو قرائن و آثار یا بذریعۂ وحی معلوم ہو گیا ہو کہ اب دنیا سے روانگی کا وقت بھی قریب آ پہنچا ہے تو آپ نے امت کو تنبیہ فرمائی کہ میری قبر پر میلہ نہ لگانا اور اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ یا اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پوجا پاٹ ہونے لگے۔[2] آپ نے اس وقت یہ حدیث بھی از راہِ احتیاط بیان فرمائی کہ مبادا آپ کی قبر کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے۔ لیکن دور حاضر کے نام نہاد مسلمانوں پر افسوس کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی آخری خواہش کا احترام کرنے کی بجائے اس کی خلاف ورزی میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ حکومت سعودیہ اور اس کے ذمہ داران کو اپنے ہاں جزائے خیر دے کہ وہ لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر غیر شرعی کام کرنے سے روکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ بات افسوس ناک ہے کہ بدعتی حضرات کی طرف سے یہ مطالبہ سننے میں آ رہا ہے کہ مدینہ منورہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے تا کہ یہ لوگ اپنی مرضی سے وہاں بدعات و خرافات کو رواج دے سکیں۔ ④ اس حدیث کی روشنی میں ہم عام مسلمانوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج اکثریت حدیث نبوی کی مخالفت پر کمربستہ ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ نے قبور انبیاء پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا مگر مسلمان قبروں پر عبادت کرنے کو اپنی سعادت خیال کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر عمارت کھڑی کرنے سے منع فرمایا لیکن مسلمان ان پر مزارات اور خانقاہیں تعمیر کرتے ہیں اور انھیں دربار کا نام دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر چراغاں کرنے سے منع فرمایا لیکن مسلمان قبروں پر قمقموں اور روشنیوں کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر زائد مٹی ڈالنے سے منع فرمایا مگر یہ حضرات ماربل اور چینی کی ٹائلیں لگا کر انھیں پختہ

---

[1] فتح الباري: 989/1. [2] مسند أحمد: 246/2.

کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں پر لکھنے سے منع فرمایا مگر ہمارے رواجی مسلمان قرآنی آیات پر مشتمل کتبے آویزاں کرتے ہیں اور صاحب قبر کا نام کندہ کراتے ہیں بلکہ آج تو بیت اللہ کی طرح بعض قبروں کا طواف اور وہاں ''مناسک حج'' ادا کیے جاتے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى.

(٥٦) بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ «جُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا»

باب: 56- نبی ﷺ کا ارشاد کہ ''میرے لیے تمام روئے زمین کو سجدہ گاہ اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے''

٤٣٨ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ قَالَ: حَدَّثَنَا سَيَّارٌ - هُوَ أَبُو الْحَكَمِ - قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ الْفَقِيرُ قَالَ: حَدَّثَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أُعْطِيتُ خَمْسًا لَّمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِّنَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا، وَأَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً، وَّأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ».

[راجع: ٣٣٥]

[438] حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے قبل کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں: مجھے ایک مہینے کی مسافت سے رعب عطا کر کے میری مدد فرمائی گئی۔ پوری روئے زمین کو میرے لیے سجدہ گاہ اور طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا، چنانچہ میری امت کے کسی فرد کو جہاں بھی نماز کا وقت آ جائے اسی جگہ نماز پڑھ لینی چاہیے۔ مال غنیمت کو میرے لیے حلال کر دیا گیا۔ اور ہر نبی کو قبل ازیں مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام انسانوں کے لیے مبعوث کیا گیا اور مجھے شفاعت (کبریٰ) کا حق دیا گیا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث پہلے (حدیث: 335 کے تحت) گزر چکی ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے یہاں بیان کرنے کا مقصد بایں الفاظ متعین کیا ہے: قبل ازیں متعدد ابواب میں مختلف مقامات پر نماز پڑھنے کی جو کراہت بیان ہوئی ہے وہ تحریم کے لیے نہیں کیونکہ ''میرے لیے تمام روئے زمین کو سجدہ گاہ بنا دیا گیا ہے'' کے عموم کا تقاضا ہے کہ اس زمین کا ہر جز جائے سجدہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا وہاں مسجد بنائی جا سکتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ قبل ازیں بیان شدہ کراہت تحریم کے لیے ہو اور حدیث جابر کے اس ٹکڑے کو اس سے خاص کر دیا جائے، یعنی مقابر کے علاوہ روئے زمین سجدہ گاہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسرا احتمال زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے مقابر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور آپ کا حکم امتناعی تحریم کے لیے ہوتا ہے الا یہ کہ وہاں کسی قرینے کی موجودگی میں مکروہ تنزیہی پر محمول کیا جائے۔ یہاں کوئی قرینہ موجود نہیں، اس لیے ہمارے نزدیک مقابر اور درباروں پر نماز ادا کرنا حدیث جابر کے عموم سے مخصوص ہو گا، یعنی مزارات و مقابر کے علاوہ دیگر روئے زمین سجدہ گاہ

بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ واللہ أعلم. ② اس حدیث کی تشریح حدیث: 335 کے تحت ہو چکی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ بالا آپ کی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے آپ تمام انبیاء ﷩ سے ممتاز ہیں، نیز آپ کا رعب اور دبدبہ اس قدر تھا کہ بڑے بڑے بادشاہ اور ان کی مضبوط ترین حکومتیں آپ کا نام سن کر لرزہ براندام ہو جاتی تھیں۔ اب بھی دشمنان رسول اور مخالفان حدیث رسول کا یہی حشر ہوتا ہے کہ وہ کسی میدان میں اہل حق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے بلکہ ذلت کی موت مرتے ہیں جیسا کہ غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز وغیرہ ذلیل و خوار ہو کر مرے ہیں۔

(٥٧) بَابُ نَوْمِ الْمَرْأَةِ فِي الْمَسْجِدِ

٤٣٩ - حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو أُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ؛ أَنَّ وَلِيدَةً كَانَتْ سَوْدَاءَ لِحَيٍّ مِّنَ الْعَرَبِ فَأَعْتَقُوهَا فَكَانَتْ مَعَهُمْ. قَالَتْ: فَخَرَجَتْ صَبِيَّةٌ لَّهُمْ عَلَيْهَا وِشَاحٌ أَحْمَرُ مِنْ سُيُورٍ. قَالَتْ: فَوَضَعَتْهُ أَوْ وَقَعَ مِنْهَا، فَمَرَّتْ بِهِ حُدَيَّاةٌ وَّهُوَ مُلْقًى فَحَسِبَتْهُ لَحْمًا فَخَطِفَتْهُ. قَالَتْ: فَالْتَمَسُوهُ فَلَمْ يَجِدُوهُ، قَالَتْ: فَاتَّهَمُونِي بِهِ. قَالَتْ: فَطَفِقُوا يُفَتِّشُونَ حَتّٰى فَتَّشُوا قُبُلَهَا، قَالَتْ: وَاللهِ! إِنِّي لَقَائِمَةٌ مَّعَهُمْ إِذْ مَرَّتِ الْحُدَيَّاةُ فَأَلْقَتْهُ. قَالَتْ: فَوَقَعَ بَيْنَهُمْ. قَالَتْ: فَقُلْتُ: هٰذَا الَّذِي اتَّهَمْتُمُونِي بِهِ زَعَمْتُمْ وَأَنَا مِنْهُ بَرِيئَةٌ وَهُوَ ذَا هُوَ. قَالَتْ: فَجَاءَتْ إِلٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَأَسْلَمَتْ، قَالَتْ: فَكَانَتْ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ أَوْ حِفْشٌ. قَالَتْ: فَكَانَتْ تَأْتِينِي فَتَحَدَّثُ عِنْدِي. قَالَتْ: فَلَا تَجْلِسُ عِنْدِي مَجْلِسًا إِلَّا قَالَتْ:

وَيَوْمَ الْوِشَاحِ مِنْ تَعَاجِيبِ رَبِّنَا
أَلَا إِنَّهُ مِنْ بَلْدَةِ الْكُفْرِ أَنْجَانِي

باب: 57- مسجد میں عورت کا سونا

[439] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک سیاہ فام باندی تھی جسے انھوں نے آزاد کر دیا مگر وہ ان کے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اس قبیلے کی کوئی بچی باہر نکلی، اس پر سرخ تسموں کا ایک کمر بند تھا جسے اس نے اتار کر رکھ دیا یا وہ از خود گر گیا۔ ایک چیل ادھر سے گزری تو اس نے اسے گوشت خیال کیا اور جھپٹ کر لے گئی۔ وہ کہتی ہے کہ اہل قبیلہ نے کمر بند تلاش کیا مگر نہ ملا تو انھوں نے مجھ پر چوری کا الزام لگا دیا اور میری تلاشی لینے لگے یہاں تک کہ انھوں نے میری شرمگاہ کو بھی نہ چھوڑا۔ وہ کہتی ہے: اللہ کی قسم! میں ان کے پاس ہی کھڑی تھی کہ اتنے میں وہی چیل آئی اور اس نے وہ کمر بند پھینک دیا تو وہ ان کے درمیان آ گرا۔ میں نے کہا: تم اس کی چوری کا الزام مجھ پر لگاتے تھے، حالانکہ میں اس سے بری تھی، لو اب اپنا کمر بند سنبھال لو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پھر وہ لونڈی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلی آئی اور مسلمان ہو گئی۔ اس کا خیمہ یا جھونپڑا مسجد میں تھا۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: وہ میرے پاس آ کر باتیں کیا کرتی تھی اور جب بھی میرے پاس بیٹھتی تو یہ شعر ضرور پڑھتی: کمر بند کا دن اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرتوں سے ہے۔ اسی نے مجھے کفر کے ملک سے نجات دی۔

قَالَتْ عَائِشَةُ: فَقُلْتُ لَهَا: مَا شَأْنُكِ لَا تَقْعُدِينَ مَعِي مَقْعَدًا إِلَّا قُلْتِ هٰذَا؟ قَالَتْ: فَحَدَّثَتْنِي بِهٰذَا الْحَدِيثِ. [انظر: ٣٨٣٥]

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: میں نے اس سے کہا: کیا بات ہے جب بھی تم میرے پاس بیٹھتی ہو تو یہ شعر ضرور پڑھتی ہو؟ تب اس نے مجھ سے اپنی یہ داستان بیان کی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ نے یکے بعد دیگرے دو باب قائم کیے ہیں: * مسجد میں عورت کا سونا۔ * مسجد میں مرد کا سونا۔ اس سے مقصود جواز کا بیان ہے جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے لیکن امام بخاری ؒ نے ''عورت کے سونے'' کو مقدم کیا کیونکہ عورت محل فتنہ ہے، اس لیے بعض ائمۂ کرام کے ہاں مطلق طور پر عورت کا مسجد میں سونا ممنوع ہے اگرچہ وہ بوڑھی ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ امام مالک سے منقول ہے۔ اس وہم کے پیش نظر اسے مقدم کر کے جواز کو واضح فرمایا۔ اور یہ اجازت کسی ہنگامی ضرورت کی وجہ سے ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: ''عورت کا مسجد میں سونا جائز ہے اگرچہ اسے حیض آنے کا احتمال ہو لیکن جب اسے حیض آ جائے تو مسجد سے باہر چلی جائے۔ اس سے پہلے اس کا مسجد میں سونا حرام نہیں۔''[1] ② حافظ ابن حجر ؒ نے اس حدیث سے مندرجہ ذیل مسائل کا استنباط کیا ہے: * مسلمانوں میں سے جس مرد یا عورت کا کوئی ٹھکانا نہ ہو وہ مسجد میں پڑاؤ کر سکتا ہے بشرطیکہ وہاں کوئی خوف اور خطرہ نہ ہو۔ * مسجد میں خیمہ یا سایہ کرنے کے لیے کسی اور چیز کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ * جس ملک میں کسی کو اخلاقی یا دینی گراوٹ کا اندیشہ ہو وہاں سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا جائز ہے۔ * دارالکفر سے ہجرت کرنے کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔ * مظلوم کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔[2] ③ واضح رہے کہ اس نومسلمہ لونڈی کا خیمہ مسجد نبوی کے شمالی حصے میں لگوایا گیا تھا، جس کا ایک حصہ اصحاب صفہ کے لیے مخصوص تھا جو تحویل قبلہ کے بعد مسجد کے صحن کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس قسم کے واقعات کو رخصت کے درجے میں رکھا جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

(٥٨) بَابُ نَوْمِ الرِّجَالِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 58- مردوں کا مسجد میں سونا

وَقَالَ أَبُو قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ: قَدِمَ رَهْطٌ مِّنْ عُكْلٍ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ فَكَانُوا فِي الصُّفَّةِ.

حضرت ابوقلابہ حضرت انس ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عکل قبیلے کے کچھ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے، وہ صفہ میں رہتے تھے۔

وَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ أَبِي بَكْرٍ: كَانَ أَصْحَابُ الصُّفَّةِ الْفُقَرَاءَ.

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر کہتے ہیں: صفہ والے تنگ دست اور فقیر لوگ تھے۔

وضاحت: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں سونے کی ممانعت ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ سے منقول ہے کہ مسجد میں صرف نمازی کو انتظار کے دوران میں سونے کی اجازت ہے، اس کے علاوہ سونے کو وہ مکروہ خیال کرتے تھے۔ حضرت

① شرح تراجم بخاري. ② فتح الباري: 692/1.

عبداللہ بن مسعود ؓ سے بہر حال مسجد میں سونے کی ممانعت منقول ہے۔ حضرت امام مالک ؒ فرق کرتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس جائے سکونت نہیں تو اسے مسجد میں سونے کی اجازت ہے بصورت دیگر نہیں۔ ان تمام اختلافات کے باوجود جمہور علماء جواز ہی کے قائل ہیں۔ امام بخاری ؒ نے اس مسئلے میں جمہور کی تائید کی ہے کہ مردوں کے لیے ضرورت کے وقت مسجد میں سونے کی اجازت ہے۔[1] امام بخاری ؒ نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے دو تعلیقات ذکر کی ہیں: حضرت انس ؓ سے مروی تعلیق پہلے گزر چکی ہے۔[2] اس میں ہے کہ قبیلۂ عکل کے ان نو وارد لوگوں کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے مسجد میں رہنا اور سونا جائز ہے۔ دوسری تعلیق اصحاب صفہ کے متعلق ہے جسے مفصل طور پر آئندہ بیان کیا جائے گا۔[3] واضح رہے کہ صفہ، مسجد نبوی کا وہ حصہ تھا جہاں سائبان پڑا ہوا تھا، جہاں غریب اور نادار طالبانِ حدیث فروکش تھے۔ معلوم ہوا کہ ایسے بے سہارا لوگوں کو مسجد میں مستقل طور پر رہنے کی اجازت ہے۔

٤٤٠ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنِي نَافِعٌ قَالَ: أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَنَامُ، وَهُوَ شَابٌّ أَعْزَبُ لَا أَهْلَ لَهُ، فِي مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ. [انظر: ١١٢١، ١١٥٦، ٣٧٣٨، ٣٧٤٠، ٧٠١٥، ٧٠٢٨، ٧٠٣٠]

[440] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ وہ مسجد نبوی میں سویا کرتے تھے جب کہ وہ غیر شادی شدہ جوان تھے اور ان کا گھر بار نہیں تھا۔

فائدہ: حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ نکاح سے پہلے ان کا گھر مسجد ہی تھا اور آپ وہیں سوتے تھے۔[4] حضرت ابن عمر ؓ خود فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ کوشش کی کہ رہنے کے لیے جھونپڑی بنالوں مگر افسوس کہ مخلوق میں سے کسی نے میری مدد نہ کی۔[5] اس لیے وہ مسافر سے بھی زیادہ مسجد میں اقامت گزیں ہونے کے حقدار تھے۔ واضح رہے کہ ان جزوی واقعات سے مسجد میں سونے کی اجازت کو ثابت کیا جا رہا ہے، ان سے مراد مسجد میں سونے کی ترغیب نہیں کیونکہ یہ اجازت صرف ضرورت کے پیش نظر ہے۔ واللہ أعلم.

٤٤١ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ: جَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بَيْتَ فَاطِمَةَ فَلَمْ يَجِدْ عَلِيًّا فِي الْبَيْتِ، فَقَالَ: أَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ؟ قَالَتْ: كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ شَيْءٌ فَغَاضَبَنِي فَخَرَجَ فَلَمْ يَقِلْ عِنْدِي. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ

[441] حضرت سہل بن سعد ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ ؓ کے گھر تشریف لائے تو حضرت علی ؓ کو گھر میں نہ پا کر ان سے پوچھا: ''تمھارے چچا زاد کہاں گئے؟'' انھوں نے عرض کیا: ہمارے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ انھوں نے میرے ہاں قیلولہ نہیں

---

1 فتح الباري: 693/1. 2 صحيح البخاري، الوضوء، حديث: 233. 3 صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: 602.

4 صحيح البخاري، التعبير، حديث: 7028. 5 سنن ابن ماجه، الزهد، حديث: 4162.

لِإِنْسَانٍ: «اُنْظُرْ أَيْنَ هُوَ؟». فَجَاءَ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! هُوَ رَاقِدٌ فِي الْمَسْجِدِ، فَجَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُوَ مُضْطَجِعٌ قَدْ سَقَطَ رِدَاؤُهُ عَنْ شِقِّهِ وَأَصَابَهُ تُرَابٌ، فَجَعَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَمْسَحُهُ عَنْهُ وَيَقُولُ: «قُمْ أَبَا تُرَابٍ! قُمْ أَبَا تُرَابٍ!». [انظر: ٣٧٠٣، ٦٢٠٤، ٦٢٨٠]

کیا (یہاں نہیں سوئے۔) رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا: ''دیکھو وہ کہاں ہیں؟'' وہ دیکھ کر آیا اور کہنے لگا: اللہ کے رسول! وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ (یہ سن کر) آپ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے ایک پہلو سے چادر ہٹنے کی وجہ سے وہاں مٹی لگ گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ان کے جسم سے مٹی صاف کرتے ہوئے فرمانے لگے: ''ابوتراب، اٹھو! ابوتراب، اٹھو!''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں سونے کا جواز صرف ان لوگوں کے لیے ہی نہیں جو بے گھر اور مسافر ہوں بلکہ جن کے پاس معقول جائے سکونت ہو وہ بھی اگر کسی مصلحت کے پیش نظر مسجد میں سونا چاہیں تو اس میں تنگی نہیں ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر بار موجود تھا، اس کے باوجود وہ مسجد میں آ کر سو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اس موقع پر مسجد میں سونے سے منع نہیں فرمایا بلکہ ایک مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی دلجوئی فرمائی۔ ممکن ہے امام بخاری رحمہ اللہ حدیث علی اس لیے لائے ہوں کہ گھر بار والے حضرات کو مستقل طور پر مسجد میں شب باشی نہیں کرنی چاہیے، البتہ کسی ضرورت کی وجہ سے عارضی طور پر دوپہر کے وقت آرام کرنے میں چنداں حرج نہیں۔ ② چونکہ زمین پر لیٹنے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بدن پر مٹی کچھ زیادہ ہی لگ گئی تھی، رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے اس مٹی کو صاف کیا، اس مناسبت سے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''ابوتراب'' کے لقب سے یاد کیا۔ عربی زبان میں تراب مٹی کو کہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اگر کوئی اس کنیت سے یاد کرتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔[1] رسول اللہ ﷺ اس انداز گفتگو سے اس ناگواری کو دور کرنا چاہتے تھے جو حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کے درمیان در آئی تھی، نیز اس واقعے سے رشتۂ مصاہرت میں مدارات کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ③ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد نہ تھے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے چچا ابوطالب کے بیٹے تھے۔ اس میں عرب کے محاورے کے مطابق باپ کے عزیز رشتے دار کو چچازاد کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس قریبی رشتے داری کے حوالے سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند سے حسن سلوک اور نرم رویہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دلانا چاہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تیرے چچا زاد، یعنی شوہر نامدار کہاں ہیں؟ عرض کیا: وہ مسجد میں ہیں۔[2] پھر آپ نے راوئ حدیث حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ مسجد میں ان کا پتہ کر کے آئیں کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہیں؟ کیونکہ اس وقت حضرت سہل کے علاوہ اور کوئی دوسرا شخص آپ کے ہمراہ نہیں تھا۔ وہ گئے تو دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دوپہر کے وقت مسجد کی دیوار کے سائے تلے لیٹے ہوئے ہیں۔[3] اس حدیث سے اسلامی معاشرے کے خدوخال کا پتہ چلتا ہے کہ اس پاکیزہ ماحول میں اگر خاوند کی بیوی سے کسی بات پر چپقلش ہو جاتی تو بیوی کو مار پیٹ کر گھر سے نکالنے کے بجائے خاوند خود ہی ''قہر درویش بر جان درویش'' وہاں سے

① صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6204. ② صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3703. ③ فتح الباري: 693/1.

کنارہ کش ہو جاتا۔ وہ کسی ہوٹل، پارک، ویڈیو سنٹر، انٹرنیٹ کلب یا دیگر تفریحی مقامات کا رخ نہ کرتا بلکہ مسجد ہی کو اپنی ''احتجاج گاہ'' قرار دے لیتا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

٤٤٢ - حَدَّثَنَا يُوسُفُ بْنُ عِيسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ فُضَيْلٍ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: رَأَيْتُ سَبْعِينَ مِنْ أَصْحَابِ الصُّفَّةِ مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَاءٌ، إِمَّا إِزَارٌ وَإِمَّا كِسَاءٌ، قَدْ رَبَطُوا فِي أَعْنَاقِهِمْ، فَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ، وَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ، فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهِ كَرَاهِيَةَ أَنْ تُرٰى عَوْرَتُهُ.

[442] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا، ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کے پاس پوری چادر ہو، تہبند ہوتا تھا یا رات کو اوڑھنے کا کپڑا، جنھیں وہ اپنی گردنوں سے باندھ لیتے تھے۔ یہ چادر کسی کی آدھی پنڈلی تک آ جاتی اور کسی کے ٹخنوں تک ہوتی۔ یہ حضرات اپنے کپڑوں کو ہاتھوں سے تھامے رکھتے اس اندیشے کے پیش نظر کہ مبادا ستر کھل جائے۔

فائدہ: اس روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اصحاب صفہ کے فقر و افلاس کو بیان کیا ہے کہ ان کے پاس پہننے کے لیے بھی پورے کپڑے نہ ہوتے تھے، جب غربت کا یہ عالم ہے کہ پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں تو رہنے کے لیے مکان تو بہت دور کی بات ہے، ایسی صورت میں وہ مسجد ہی میں سوتے تھے۔ یہ اصحاب صفہ جنھیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا، ان اصحاب صفہ کے علاوہ ہیں جن کی تعداد بھی ستر تھی اور جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بئر معونہ کے لیے بھیجا تھا اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے قبل وہاں شہید ہو گئے تھے۔ رضی اللہ عنہم۔ ان کا ذکر کتاب المحاربین میں تفصیل سے آئے گا۔[1] بإذن اللہ تعالیٰ۔

(٥٩) بَابُ الصَّلَاةِ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ

باب: 59- جب کوئی سفر سے واپس لوٹے تو پہلے نماز پڑھے

وَقَالَ كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيهِ.

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور وہاں نماز پڑھتے۔

وضاحت: جب انسان سفر سے بخیر و عافیت گھر آتا ہے تو گھر جانے سے پہلے بطور شکرانہ مسجد میں دو رکعت پڑھنا مستحب ہیں۔ انھیں رکعات تحیۃ القدوم یا تحیۃ الشکر کہتے ہیں۔ ان کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ مسجد میں جمع شدہ نمازیوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ان حضرات کی مزاج پرسی ایک اضافی ثواب کا باعث ہوگی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اس معلق روایت کو آگے ''حدیث کعب بن مالک'' کے نام سے باسند بیان کیا ہے۔ یہ وہی روایت ہے جس میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی غزوۂ تبوک میں

---

1 فتح الباري: 694/1.

شرکت سے محرومی اور ان کی توبہ کا ذکر ہے۔اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا۔[1] سفر سے واپسی پر گھر جانے سے پہلے مسجد میں دو رکعت ادا کرنا رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت نہ تھی جیسا کہ آئندہ حدیث جابر سے معلوم ہوگا۔[2]

٤٤٣ - حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيَى قَالَ: حَدَّثَنَا مِسْعَرٌ قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَارِبُ بْنُ دِثَارٍ عَنْ جَابِرِ ابْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ - قَالَ مِسْعَرٌ: أُرَاهُ قَالَ: ضُحًى - فَقَالَ: صَلِّ رَكْعَتَيْنِ، وَكَانَ لِي عَلَيْهِ دَيْنٌ فَقَضَانِي وَزَادَنِي. [انظر: ١٨٠١، ٢٠٩٧، ٢٣٠٩، ٢٣٨٥، ٢٣٩٤، ٢٤٠٦، ٢٤٧٠، ٢٦٠٣، ٢٦٠٤، ٢٧١٨، ٢٨٦١، ٢٩٦٧، ٣٠٨٧، ٣٠٨٩، ٣٠٩٠، ٤٠٥٢، ٥٠٧٩، ٥٠٨٠، ٥٢٤٣، ٥٢٤٤، ٥٢٤٥، ٥٢٤٦، ٥٢٤٧، ٥٣٦٧، ٦٣٨٧]

[443] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ آپ نے (مجھ سے) فرمایا: ''دو رکعت نماز پڑھ لو۔'' میرا آپ ﷺ کے ذمے قرض تھا جو آپ نے ادا فرمایا اور مجھے قرض سے زیادہ دیا۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اس روایت کو تقریباً پچیس مقامات پر بیان فرمایا ہے اور اس سے متعدد مسائل ثابت کیے ہیں۔ اس روایت میں اگرچہ سفر کا تذکرہ نہیں، تاہم مفصل روایت میں ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک غزوے سے واپسی کے موقع پر میرا اونٹ تھک گیا، آپ ادھر سے گزرے تو آپ نے دعا فرمائی اور اونٹ کو چھڑی لگا دی، پھر کیا تھا، اونٹ تیز چلنے لگا۔ آپ نے فرمایا: ''جابر! یہ اونٹ ہمیں فروخت کر دو۔'' پہلے تو میں نے انکار کیا، بالآخر آپ کے اصرار پر میں نے آپ کو فروخت کر دیا اور آپ نے مدینے تک اس پر سواری کی مجھے اجازت دے دی۔ آپ مدینہ پہلے پہنچ گئے، میں صبح کے وقت پہنچا۔ مدینے پہنچتے ہی میں نے وہ اونٹ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے پہلے تو مجھے دو رکعت ادا کرنے کی ہدایت فرمائی، پھر اونٹ کی قیمت ادا کر دی اور کچھ زیادہ بھی دیا، نیز جب میں واپس آنے لگا تو اونٹ بھی میرے حوالے کر دیا۔[3] اس روایت میں وضاحت ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سفر سے واپسی کے بعد جب اونٹ کی قیمت لینے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دو رکعت پڑھنے کی ہدایت فرمائی، لہٰذا سفر سے واپسی پر دو رکعت پڑھنے کا استحباب ثابت ہو گیا۔ اس حدیث کے دیگر طرق پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے مغلطائی نے امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ مذکورہ روایت میں چونکہ سفر سے واپسی کا ذکر نہیں، اس لیے اس حدیث کی عنوان سے مطابقت نہیں۔[4] ② جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ مذکورہ دو رکعت ''صلاۃ قدوم'' ہے۔ یہ تحیۃ المسجد نہیں جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں بیٹھنے سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ البتہ صلاۃ قدوم ادا کرنے سے تحیۃ المسجد بھی ادا ہو جائے گی، اس کا الگ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔

① صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4418. ② فتح الباري: 695/1. ③ صحيح البخاري، البيوع، حديث: 2097.
④ فتح الباري: 695/1.

(٦٠) بَابٌ: إِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ

باب:60- جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو اسے چاہیے کہ دو رکعت نماز پڑھے

٤٤٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ، عَنْ أَبِي قَتَادَةَ السَّلَمِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ».
[انظر: ١١٦٣]

[444] حضرت ابوقتادہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے قبل دو رکعت ضرور پڑھے۔''

فوائد و مسائل: ① اس حدیث کا پس منظر اس طرح ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ مسجد میں آئے تو رسول اللہ ﷺ اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوقتادہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوقتادہ سے فرمایا: ''تجھے بیٹھنے سے قبل دو رکعت پڑھنے میں کیا رکاوٹ تھی؟'' عرض کیا: میں نے آپ کو اور دیگر لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا، اس بنا پر میں بھی بیٹھ گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ضرور پڑھے۔''[1] مصنف ابن ابی شیبہ (245/2) میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''مساجد کو ان کا حق دو۔'' عرض کیا گیا: ان کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''بیٹھنے سے پہلے دو رکعت ادا کرنا۔''[2] ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ائمۂ فتویٰ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مذکورہ روایت میں امر نبوی استحباب پر محمول ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے جا رہا تھا تو آپ نے اس سے فرمایا: ''بیٹھ جا، تو نے دوسروں کو اذیت پہنچائی ہے۔'' آپ نے اسے تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امر نبوی وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی دو رکعت پڑھنے سے قبل بیٹھ جائے تو اس کی تلافی ضروری نہیں کیونکہ ان کا وقت فوت ہو گیا ہے۔ لیکن صحیح موقف یہ ہے کہ بیٹھنے سے تحیۃ المسجد فوت نہیں ہو جاتا کیونکہ ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے دو رکعت نماز پڑھ لی ہے؟'' عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعت نماز پڑھو۔'' اس حدیث پر امام ابن حبان رحمہ اللہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''تحیۃ المسجد، ادائیگی سے قبل بیٹھ جانے سے فوت نہیں ہوتا۔'' محب طبری نے کہا کہ بیٹھنے سے پہلے ادا کرنا وقت فضیلت ہے اور بیٹھنے کے بعد ادا کرنا وقت جواز۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بیٹھنے سے پہلے ادا کا وقت ہے اور اس کے بعد وقت قضا۔[3] واللہ أعلم. ③ اوقات ممنوع میں سبھی نماز ادا کی جا سکتی ہے لیکن مطلق نوافل ادا کرنے پر پابندی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دوران خطبہ میں آکر بیٹھنے والے شخص کو دو رکعت ادا کرنے کا حکم دیا تھا،[4] حالانکہ خطبے کو

1 صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، حدیث: 1654(714). 2 فتح الباري: 696/1. 3 فتح الباري: 696/1. 4 صحیح البخاري، الجمعة، حدیث: 930.

خاموشی سے سننے کا حکم ہے۔ دراصل اوقات ممنوعہ میں ادائیگیٔ نماز کے متعلق احناف اور شوافع کا اختلاف ہے۔ احناف روایت نہی کے عموم کے پیش نظر کہتے ہیں کہ ان اوقات میں تحیۃ المسجد کی بھی اجازت نہیں لیکن شوافع اس نہی کو عموم پر محمول نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک امر نبوی کے عموم کے پیش نظر اوقات ممنوعہ میں بھی تحیۃ المسجد ادا کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن نمازوں اور نوافل کے اسباب معلوم ہیں، ان کے متعلق کوئی ممنوعہ وقت نہیں۔ تحیۃ المسجد کا سبب مسجد میں داخل ہونا ہے، لہٰذا اس سبب کے ہوتے ہوئے کسی وقت کی پابندی یا قید نہیں۔[1] مختصر یہ ہے کہ اگر کوئی تحیۃ المسجد پڑھے بغیر بیٹھ جائے تو اس سے تحیۃ المسجد ساقط نہیں ہوگا بلکہ اٹھ کر اسے ادا کرنا ہوگا اور اس کی ادائیگی کے لیے کوئی وقت ممنوع نہیں کیونکہ اس کا تعلق سببی نماز سے ہے۔

(٦١) بَابُ الْحَدَثِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 61- مسجد میں (خروج ریح سے) بے وضو ہونا

وضاحت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مازری کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس باب میں ان لوگوں کا رد کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے جنبی کی طرح بے وضو کے لیے مسجد میں داخل ہونے یا بیٹھنے کو ممنوع قرار دیا ہے۔[2] لیکن ہمارے نزدیک اس باب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں بدبودار اشیاء لے جانا ممنوع ہے اور ریح بھی بدبودار ہوتی ہے، نیز ایسا کرنا بے ادبی اور مسجد کے احترام کے منافی ہے، اس کے علاوہ فرشتوں کے لیے بھی باعث تکلیف ہے، اس لیے اس سے احتراز کرنا چاہیے لیکن اگر مسجد کے اندر ریح خارج کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایسا کرنا جائز ہے اگرچہ یہ خلاف اولیٰ ہے مگر معتکف اس سے مستثنیٰ ہوگا کیونکہ وہ مسجد میں رہنے کا پابند ہے۔ حوائج ضروریہ کے علاوہ اس کے لیے مسجد سے باہر جانے پر پابندی ہے، اس لیے مسجد میں اس طرح کا حدث (بے وضو ہونا) اس کے لیے قابل معافی ہونا چاہیے۔

٤٤٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ، عَنِ الْأَعْرَجِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «اَلْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلٰى أَحَدِكُمْ مَّا دَامَ فِي مُصَلَّاهُ الَّذِي صَلّٰى فِيهِ مَا لَمْ يُحْدِثْ، تَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ»

[راجع: ١٧٦]

[445] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تک تم اپنے مصلے پر رہو جہاں تم نے نماز پڑھی تھی اور ریاح بھی خارج نہ کرو تو ملائکہ تمھارے لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے، اے اللہ! اس پر رحم فرما۔''

فوائد و مسائل: ① اس جگہ حدث سے مراد حدث اصغر (بے وضو ہونا) ہے، حدثِ اکبر، یعنی جنابت وغیرہ مراد نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مذکورہ روایت میں حدث سے یہی مراد لیا ہے۔ (حدیث:176) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عام معنی مراد ہے، یعنی جب تک وہاں کوئی تکلیف دہ معاملہ نہ کرے۔ چنانچہ حدیث مسلم سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

---

① فتح الباري: 696/1. ② فتح الباري: 696/1.

''جب تک بے وضو نہ ہو، جب تک کسی کو تکلیف نہ دے۔''[1] لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ریح کا خارج کرنا ہے جو دوسروں کی تکلیف کا باعث بنتی ہے جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب تک وہ حدث کے ذریعے سے کسی دوسرے کی تکلیف کا باعث نہ بنے۔[2] ② یہ فضیلت ہر اس شخص کے لیے ہے جو نماز ادا کر کے دوسری نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھا رہتا ہے، اپنے گھر نہیں جاتا، اس لیے مصلی سے مراد جائے سجود ہی نہیں بلکہ تمام مسجد ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ انسان اس وقت تک نماز ہی میں رہتا ہے جب تک وہ دوسری نماز کے انتظار میں ہے، اس لیے دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہیں۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ مسجد میں ریح کا خارج کرنا تھوکنے سے زیادہ سنگین ہے کیونکہ مسجد میں تھوکنے کا کفارہ بیان ہوا ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے لیکن اس کا کوئی کفارہ نہیں بلکہ فرشتوں کی دعائے رحمت سے بھی اسے محروم کر دیا جاتا ہے۔[4] لیکن یہ سنگین جرم اس صورت میں قرار دیا جائے گا جب حدث سے مراد کوئی گناہ یا بدعت کا ارتکاب ہو، بصورت دیگر اسے سنگین جرم قرار دینا صحیح نہیں اگرچہ اس فعل سے فرشتوں کی دعا حاصل نہیں ہوتی۔ بہر حال مسجد میں یہ فعل خلاف اولیٰ ضرور ہے، حرام یا ناجائز نہیں۔ واللہ أعلم.

(٦٢) بَابُ بُنْيَانِ الْمَسْجِدِ

وَقَالَ أَبُو سَعِيدٍ: كَانَ سَقْفُ الْمَسْجِدِ مِنْ جَرِيدِ النَّخْلِ. وَأَمَرَ عُمَرُ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ وَقَالَ: أَكِنَّ النَّاسَ مِنَ الْمَطَرِ وَإِيَّاكَ [أَنْ] تُحَمِّرَ أَوْ تُصَفِّرَ فَتَفْتِنَ النَّاسَ. وَقَالَ أَنَسٌ: يَتَبَاهَوْنَ بِهَا ثُمَّ لَا يَعْمُرُونَهَا إِلَّا قَلِيلًا. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى.

باب: 62- مسجد (نبوی) کی تعمیر کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مسجد نبوی کی چھت کھجور کی ایسی شاخوں کی تھی جن کے پتے صاف کر دیے گئے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا حکم دیا اور فرمایا کہ لوگوں کو بارش سے محفوظ رکھنے کا بندوبست کرو لیکن اسے سرخ یا زرد کرنے سے اجتناب کرو مبادا رنگ کے استعمال سے لوگ فتنے میں مبتلا ہو جائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (آئندہ) لوگ مسجدیں بنانے میں بطور فخر و مباہات مقابلہ بازی کریں گے مگر انھیں (عبادت سے) آباد بہت کم لوگ کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم بھی مساجد کو نقش و نگار سے ضرور آراستہ کرو گے جیسے یہود و نصاریٰ نے اپنی عبادت گاہوں کو آراستہ کیا تھا۔

وضاحت: اس عنوان کے تحت مساجد بنانے کی فضیلت بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس کے لیے آئندہ ایک باب: 65 آرہا ہے۔ اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ مسجد کس شان کی ہونی چاہیے اور بانی کے لیے کن چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، یعنی

---

1 صحيح مسلم، المساجد، حديث: 1506(649). 2 صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 477. 3 فتح الباري: 697/1.

4 فتح الباري: 697/1.

مسجد میں سادگی کو ملحوظ رکھا جائے۔ مسجد نماز باجماعت ادائیگی کے لیے بنائی جائے اور بنانے والے کی نیت شہرت اور نمائش کی نہ ہو بلکہ اخلاص اور اللہ کی رضا مقصود ہو۔ اگر حالات تبدیل ہو جائیں تو سادگی کو برقرار رکھتے ہوئے اسے شاندار بنانے کی بھی اجازت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کچھ تعلیقات بیان کی ہیں۔ سادگی کے متعلق پہلی تعلیق کو خود ہی آئندہ باسند بیان کریں گے بلکہ اسے متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے، البتہ یہ الفاظ کتاب الاذان (حدیث: 813) میں ہیں۔ اس میں امام بخاری رحمہ اللہ نے تعمیر مسجد کے سلسلے میں سادگی کے اصول کو اپنانے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ابتدائی طور پر مسجد نبوی ایک چھپر کی طرح تھی، اس کی چھت پر کڑیوں کی جگہ کھجور کی شاخیں تھیں، اس سے صرف گرمی وغیرہ سے حفاظت ہوتی تھی، جب بارش ہوتی تو یہ چھت ٹپکنے لگتی حتی کہ سجدے کے وقت آپ کی پیشانی مبارک پر کیچڑ لگ جاتا۔ تعمیر مسجد کے سلسلے میں دوسرا اصول یہ ہے کہ سادگی کے ساتھ نمازیوں کی راحت رسانی کا بندوبست کیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر رہنمائی کرتا ہے کہ انھوں نے جب اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع فرمائی تو معماروں کو ہدایت فرمائی کہ میرا مقصد نمازیوں کے لیے بارش سے حفاظت کا سامان کرنا ہے، اس کے لیے مختلف رنگوں کو استعمال کر کے نمازیوں کو فتنے میں مبتلا کرنا ہرگز مقصد نہیں۔ تعمیر مسجد کے متعلق تیسرا رہنما اصول یہ ہے کہ اسے آباد کیا جائے۔ اسے نام ونمود اور فخر ومباہات کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا اثر پیش فرمایا جسے مسند ابی یعلیٰ اور صحیح ابن خزیمہ (281/2) میں باسند بیان کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگ مسجد کے معاملے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے اور انھیں آباد کرنے والے بہت کم ہوں گے۔'' پھر مساجد میں گلکاری کرنا اور انھیں منقش کر کے اپنا سرمایہ ضائع کرنا بھی سادگی کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر پیش فرمایا۔ سنن ابی داود میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس ارشاد سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے مسجدوں کو آراستہ اور انھیں منقش کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔[1] اس میں یہ تنبیہ ہے کہ زیب وزینت کرنا یہود ونصاریٰ کا فعل ہے، مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں۔ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس میں دنیوی تکلفات اور ظاہری زیبائش کی کیا ضرورت ہے؟[2] اب امام بخاری رحمہ اللہ اس سلسلے میں موصول روایت ذکر کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

٤٤٦ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا نَافِعٌ أَنَّ عَبْدَ اللهِ أَخْبَرَهُ أَنَّ الْمَسْجِدَ كَانَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَبْنِيًّا بِاللَّبِنِ، وَسَقْفُهُ الْجَرِيدُ، وَعُمُدُهُ خَشَبُ النَّخْلِ، فَلَمْ يَزِدْ فِيهِ أَبُو بَكْرٍ شَيْئًا، وَزَادَ فِيهِ عُمَرُ وَبَنَاهُ عَلَى بُنْيَانِهِ فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ

[446] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے بتایا: رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، چھت پر کھجور کی ڈالیاں تھیں اور ستون بھی کھجور کی لکڑی کے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں توسیع ضرور کی لیکن عمارت اسی طرح کی رکھی جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھی، یعنی کچی اینٹیں، ڈالیاں

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 448. [2] فتح الباري: 698/1.

بِاللَّبِنِ وَالْجَرِيدِ، وَأَعَادَ عُمُدَهُ خَشَبًا ، ثُمَّ غَيَّرَهُ عُثْمَانُ فَزَادَ فِيهِ زِيَادَةً كَثِيرَةً وَّبَنٰى جِدَارَهُ بِالْحِجَارَةِ الْمَنْقُوشَةِ وَالْقَصَّةِ، وَجَعَلَ عُمُدَهُ مِنْ حِجَارَةٍ مَّنْقُوشَةٍ وَّسَقَفَهُ بِالسَّاجِ.

اور ستون اسی کھجور کی لکڑی کے بنائے گئے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں تبدیلی کر کے بہت توسیع فرمائی، یعنی اس کی دیواریں منقش پتھروں اور چونے سے بنوائیں، ستون بھی منقش پتھروں کے بنائے اور اس کی چھت ساگوان سے تیار کی۔

فوائد ومسائل: ① رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی کی تعمیر کچی اینٹوں سے ہوئی، چھت پر کھجور کی شاخیں اور ستونوں کے لیے کھجور کے تنے استعمال کیے گئے۔ احادیث میں اشارات ملتے ہیں کہ فتح خیبر کے بعد اس کے رقبے میں کچھ توسیع کی گئی لیکن دوران تعمیر میں جو سامان استعمال کیا گیا وہ پہلے جیسا ہی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اگرچہ مال و دولت کی فراوانی تھی اس کے باوجود انھوں نے اس کے طول وعرض یا قبلے کی جانب دوصفوں کا اضافہ تو کیا لیکن سامان تعمیر اور انداز تعمیر وہی برقرار رکھا جو پہلے تھا، یعنی کچی اینٹیں، کھجور کی شاخوں کی چھت اور اس کے تنوں کے ستون وغیرہ، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سامان تعمیر اور انداز تعمیر دونوں میں تبدیلی آئی۔ انھوں نے اپنی گرہ سے ازواج مطہرات کے حجرات کو خرید کر مسجد میں شامل کر دیا اور مسجد کے طول وعرض میں اضافہ فرمایا۔ اس کے علاوہ کچی اینٹوں کی جگہ نقش دار پتھر، انھیں جوڑنے کے لیے چونا استعمال ہوا اور ستون بھی پتھروں کے بنائے گئے، چھت پر کھجور کی شاخوں کے بجائے ساگوان کی کڑیاں استعمال کی گئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس مخلصانہ عمل پر اعتراضات بھی ہوئے جن کے متعلق انھیں منبر پر کھڑے ہو کر جواب دہی کرنی پڑی۔ ہم ان کی وضاحت حدیث نمبر 450 میں کریں گے۔ بہر حال مسجد کے طول وعرض میں بقدر ضرورت اضافہ کیا جا سکتا ہے، نیز اس کی مضبوطی کے لیے بہترین اور قیمتی ساز وسامان استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں اور سادگی کی رعایت کرتے ہوئے اسے پرشکوہ اور عالی شان بھی بنایا جا سکتا ہے۔ ② محدث ابن منیر نے کہا ہے کہ جب لوگ اپنے ذاتی مکانات پختہ بنانے لگیں اور اس کی زیبائش وآرائش پر روپیہ خرچ کرنے لگیں تو ایسے حالات میں اگر مساجد کی تعمیر میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں تاکہ مساجد کی اہانت نہ ہو۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اگر مسجد کی زیب و زینت نہ کرنے کی وجہ صرف سلف صالحین کی پیروی ہو تو پھر یہ موقف صحیح ہے لیکن اگر نقش ونگار کو نظر انداز کرنے کی علت یہ ہو کہ اس قسم کی زیبائش وآرائش نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل انداز ہوتی ہو تو پھر اس موقف سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔[1] لیکن ہم اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس پرفتن دور میں لوگوں نے مساجد کی تزئین وآرائش پر بہت توجہ دے رکھی ہے بالخصوص محراب اور اس کے دائیں بائیں آئینہ اور رنگین ٹائیلوں کا استعمال، پھر بیش بہا فانوس اسی زمرے میں آتے ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ بلاشبہ مسجد کی تعمیر مضبوط بنیادوں پر ہونی چاہیے، نیز اسے شاندار اور پرشوکت بنانے میں بھی کوئی قباحت نہیں لیکن تزیین پر روپیہ صرف کرنا اسراف وتبذیر ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ مساجد کی تزیین کا سلسلہ

[1] فتح الباري : 700/1.

ولید بن عبدالملک بن مروان سے شروع ہوا جبکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا آخری دور تھا، متعدد اہل علم اس وقت اندیشۂ فتنے کی بنا پر خاموش رہے۔ ③ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس تزیین و آرائش کے متعلق اظہار ناپسندیدگی اس بنا پر تھا کہ اس سے دنیا میں انہماک اور غلو آجاتا ہے جس سے انسان آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، چنانچہ ابن بطال نے لکھا ہے کہ مساجد کی تزیین کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ممانعت منقول ہے۔ آپ نے شاید اس واقعے سے استنباط فرمایا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہم رضی اللہ عنہ کی منقش چادر واپس کر دی تھی اور فرمایا تھا کہ اس نے مجھے میری نماز سے غافل کر دیا تھا۔[1] لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس کے متعلق کوئی خاص ہدایت موجود ہو کیونکہ سنن ابن ماجہ میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب کسی قوم میں بدعملی پھیلتی ہے تو وہ اپنی عبادت گاہوں کو بڑی زیب و زینت سے سجانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کی سند میں جبارہ بن مغلس راوی ایسا ہے جس کے متعلق ائمۂ جرح و تعدیل نے کلام کیا ہے۔[2] تاہم پہلے زمانے میں اگر مسلمان سلاطین و امراء مساجد عالی شان اور پختہ نہ بناتے تو آج بلاد کفر میں ان کا نام و نشان مٹ چکا ہوتا جیسا کہ جامع قرطبہ، آثار اندلس اور مساجد ہندوستان وغیرہ ہیں۔ اگرچہ بلاد کفر میں یہ مساجد مسلمانوں کی نوحہ خوانی کرتی ہیں، تاہم ان کا باقی رہنا اس بات کی علامت ہے کہ کبھی ان مقامات پر اسلام کا بول بالا تھا اور آج مسلمانوں کی پست ہمتی کی وجہ سے وہاں کفار قابض ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن. ④ بعض مسلمان سلاطین نے ان تمام تغیرات کو جو عہد نبوی، عہد فاروقی اور عہد عثمانی میں ہوئے، نشانات لگا کر ممتاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد جو تعمیری تبدیلیاں آئی ہیں وہ ایک دوسرے سے ممتاز نہیں ہیں، البتہ ترکی کا انداز تعمیر رنگ سے ممتاز کر دیا گیا ہے۔ موجودہ دور میں حکومت سعودیہ نے مسجد نبوی کی عمارت اس قدر طویل و عریض کر دی ہے کہ اسے دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور بے ساختہ دل سے اس حکومت کے دوام کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور قیامت کے دن ان کے لیے ذریعۂ نجات بنائے، لیکن دوسرے ممالک میں مسلمانوں کی مساجد جن کے مینار تو آسمانوں سے باتیں کر رہے ہیں مگر یہ مساجد توحید و سنت کی آبیاری اور حقیقی اسلام کی سربلندی سے عاری اور نمازیوں سے خالی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان مساجد کو توحید و سنت کے مرکز بنائے اور نمازیوں سے آباد فرمائے۔ آمین.

(٦٣) بَابُ التَّعَاوُنِ فِي بِنَاءِ الْمَسْجِدِ

باب: 63- مسجد کی تعمیر میں باہم تعاون کرنا

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسَـٰجِدَ اللَّهِ شَـٰهِدِينَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَـٰلُهُمْ وَفِى النَّارِ هُمْ خَـٰلِدُونَ ○ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَـٰجِدَ اللَّهِ مَنْ ءَامَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْـَٔاخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَوٰةَ وَءَاتَى الزَّكَوٰةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰٓ أُو۟لَـٰٓئِكَ أَن يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ﴾ [التوبة: ١٧، ١٨].

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”مشرکین کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جبکہ وہ تو خود اپنے آپ پر کفر کی شہادت دے رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے سب اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔ اللہ کی مساجد کو تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکاۃ ادا کی اور اللہ کے

① شرح ابن بطال: 97/2. ② فتح الباري: 698/1.

سوا کسی دوسرے سے نہیں ڈرا، امید ہے کہ ایسے ہی لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے۔''

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقصد ہے کہ مسجد کون لوگ بنائیں؟ اس آیت کریمہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ خالص مسلمانوں کا کام ہے اور مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ باہمی تعاون سے اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہوں اور مشرکین کو تعمیر مسجد کے سلسلے میں قطعاً کوئی موقع نہ دیا جائے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک مساجد سے مراد صرف جائے سجود نہیں بلکہ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جو نماز کی ادائیگی کے لیے تیار کی جائیں اور ان کی تعمیر سے مراد ان کا بنانا اور عمارت کھڑی کرنا ہے۔[1]

٤٤٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ ابْنُ مُخْتَارٍ قَالَ: حَدَّثَنَا خَالِدٌ الْحَذَّاءُ عَنْ عِكْرِمَةَ: قَالَ لِي ابْنُ عَبَّاسٍ وَّلِابْنِهِ عَلِيٍّ: انْطَلِقَا إِلَى أَبِي سَعِيدٍ فَاسْمَعَا مِنْ حَدِيثِهِ، فَانْطَلَقْنَا فَإِذَا هُوَ فِي حَائِطٍ يُّصْلِحُهُ، فَأَخَذَ رِدَاءَهُ فَاحْتَبَى، ثُمَّ أَنْشَأَ يُحَدِّثُنَا حَتّٰى أَتٰى عَلٰى ذِكْرِ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ: كُنَّا نَحْمِلُ لَبِنَةً لَبِنَةً، وَعَمَّارٌ لَبِنَتَيْنِ لَبِنَتَيْنِ، فَرَآهُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَنْفُضُ التُّرَابَ عَنْهُ وَيَقُولُ: «وَيْحَ عَمَّارٍ، [تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ] يَدْعُوهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُونَهُ إِلَى النَّارِ». قَالَ: يَقُولُ عَمَّارٌ: أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ.

[انظر: ٢٨١٢]

[447] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے اپنے شاگرد عکرمہ اور اپنے لخت جگر علی سے کہا: تم دونوں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے احادیث سنو، چنانچہ وہ دونوں گئے تو دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہیں اور اسے درست کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی چادر لی اور اسے کمر سے گھٹنوں تک لپیٹ کر بیٹھ گئے اور احادیث سنانے لگے حتی کہ مسجد نبوی کی تعمیر کا ذکر آیا تو فرمایا: ہم ایک ایک اینٹ اٹھاتے تھے جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو، دو اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ نبی ﷺ نے جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو ان کے جسم سے مٹی جھاڑتے ہوئے فرمانے لگے: ''عمار کی حالت قابل رحم ہے! انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔ یہ انھیں جنت کی دعوت دیں گے اور وہ انھیں جہنم کی طرف بلائیں گے۔'' حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت عمار رضی اللہ عنہ (یہ سن کر اکثر) کہا کرتے تھے: میں فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

فوائد و مسائل: ① رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت مسجد کے قریب ہی کچی اینٹیں تیار کرائی تھیں، وہ اتنی وزنی تھیں کہ بمشکل ایک آدمی ایک اینٹ ہی اٹھا سکتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ بھی دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اینٹیں اٹھا رہے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ کریں، یہ کام کرنے کے لیے ہم کافی ہیں، چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ دو، دو اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ تم دو، دو اینٹیں کیوں اٹھا رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک اینٹ اپنے حصے کی اور

1 فتح الباري: 700/1.

دوسری آپ کے حصے کی لا رہا ہوں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے جامع معمر کے حوالے سے لکھا ہے۔[1] مزید برآں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا یہ جواب بھی روایات میں منقول ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ثواب لینے کے لیے یہ مشقت برداشت کر رہا ہوں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مستخرج ابی نعیم کے حوالے سے لکھا ہے۔[2] اس پر رسول اللہ ﷺ نے مسرت و رنج کے ملے جلے جذبات کے ساتھ فرمایا: ''عمار کی شہادت ایک باغی گروہ کے ہاتھوں سے ہوگی۔'' اس جملے کی وضاحت ہم آئندہ کریں گے، تاہم اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مساجد کی تعمیر مسلمانوں کو خود کرنی چاہیے اور اس کی تعمیر میں پتھر اٹھا اٹھا کر مدد دینا اتنا بڑا ثواب کا کام ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ② معلوم ہوتا ہے کہ شرح بخاری لکھتے وقت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے سامنے بخاری کا وہ نسخہ تھا جس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ جملہ حذف تھا کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اس کے متعلق مستقل نوٹ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ''فائدے'' کا عنوان دے کر لکھتے ہیں کہ قتل عمار والے جملے کی حدیث کو صحابہ کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت قتادہ بن نعمان اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے۔ پھر جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہ نے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے سنن نسائی میں بیان کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان، حضرت حذیفہ، حضرت ابورافع، حضرت خزیمہ بن ثابت، حضرت امیر معاویہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت ابوالیسر اور خود حضرت عمار رضی اللہ عنہم نے اس جملے کو بیان کیا ہے جسے امام طبرانی نے نقل کیا ہے۔ ان میں سے اکثر طرق صحیح یا حسن درجے کے ہیں۔ اور اس حدیث میں ایک پیش گوئی کا ذکر ہے جو اعلام نبوت سے تعلق رکھتی ہے جس کا ظہور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ہوا، نیز اس حدیث میں حضرت علی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما کی واضح فضیلت کا ذکر ہے اور نواصب کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی جنگی اور عسکری کارروائیوں میں حق پر نہیں تھے۔[3] ③ اس حدیث کے پیش نظر بعض اہل علم حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو ''باغی'' کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ نے اپنی تالیف ''منہاج السنہ'' میں فیصلہ کن بحث کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر خلیفہ کی اطاعت اور بیعت لازم ہے کیونکہ مسلمانوں کا ایک ہی خلیفہ ہوسکتا ہے اور یہ لوگ خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہیں اور بیعت سے توقف کر کے ایک امر واجب سے گریز کر رہے ہیں، پھر ان کا کچھ اثر و رسوخ بھی ہے۔ اس بنا پر ان سے لڑنا ضروری ہے تا آنکہ اطاعت قبول کر لیں اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں، جبکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فریق کا یہ خیال تھا کہ ہم پر ان کی اطاعت و بیعت واجب نہیں۔ اگر اسی بنیاد پر ہم سے جنگ کی گئی تو ہم مظلوم ہوں گے کیونکہ باتفاق اہل اسلام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ظلم وعدوان سے شہید کیا گیا ہے اور قاتلین عثمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں موجود ہیں اور وہ ان میں اپنا اثر و رسوخ بھی رکھتے ہیں۔ اگر ہم اس خلیفے کی اطاعت میں آجائیں تو قاتلین عثمان ہم پر ظلم وستم کریں گے، حضرت علی انھیں روک نہیں سکیں گے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع نہیں کر سکے۔ ہم پر اس خلیفے کی بیعت لازم ہے جو ہمارے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس گروہ بندی میں شامل ہونے والوں میں کچھ جاہل قسم کے لوگ بھی موجود تھے جو حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے متعلق برے خیالات رکھتے تھے، حالانکہ دونوں بزرگوں کا ان سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ان میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم

---

① فتح الباري : 701/1. ② فتح الباري : 702/1. ③ فتح الباري : 702/1.

دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حلفاً کہتے تھے کہ میں نے نہ قتل کیا اور نہ ان کے قتل پر راضی ہی تھا اور نہ میں نے قاتلین کے ساتھ کوئی تعاون ہی کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بیان میں حق بجانب تھے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض حامی اور مخالف اس پروپیگنڈے میں شریک تھے۔ آپ کے حامی تو حضرت عثمان پر طعن کرتے کہ واقعی حضرت عثمان قتل ہی کے حق دار تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جائز طور پر ان کے قتل کا حکم دیا تھا جبکہ مخالفین کا مقصد یہ تھا کہ ایسی باتیں پھیلا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیچڑ اچھالا جائے کہ انھوں نے مظلوم خلیفے کو قتل کرنے پر تعاون کیا ہے۔ ایسے انسان کی اطاعت کس بنیاد پر کی جائے؟ حدیث میں ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔ اس کے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس حدیث پر جرح کی ہے، مگر یہ درست نہیں کیونکہ یہ حدیث صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں موجود ہے جبکہ بعض حضرات یہ تاویل کرتے ہیں کہ باغیہ کے معنی حضرت عثمان کا بدلہ طلب کرنے والی جماعت ہیں۔ یہ تاویل بھی غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بظاہر جو معلوم ہو رہا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے، البتہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو باغیہ جماعت کے قتل کرنے سے اس جماعت کا کفر یا نفاق لازم نہیں آتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ ''اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر ان میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان انصاف سے صلح کرا دو اور عدل کرو کیونکہ اللہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔''[1] اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں اقتتال اور بغی کے باوجود اہل ایمان قرار دیا ہے بلکہ باغی گروہ کے ساتھ لڑائی کے حکم کے باوجود انھیں مومن گردانا ہے، لہٰذا بغی، ظلم اور تعدی تو عوام الناس کو بھی ایمان سے خارج نہیں کرتے اور نہ ان کو لعنت کے سزاوار قرار دیتے ہیں، اگر خیر القرون میں سے کوئی یہ کام کر بیٹھے تو اسے ایمان سے کیوں کر خارج کیا جا سکتا ہے؟ دراصل باغی، ظالم، تعدی کرنے والا اور کسی گناہ کا مرتکب دو طرح کا ہوتا ہے: متأول اور غیر متأول۔ متأول مجتہد سے مراد وہ ماہرین علم و دین ہیں جو دینی معاملات میں اجتہاد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک عالم کسی چیز کی حلت کا قائل ہے تو دوسرا اس کی حرمت کا مؤید ہوتا ہے جیسا کہ اشربہ، سود کی بعض اقسام، عقد حلالہ اور نکاح متعہ جیسے مسائل میں ایسا ہوا ہے۔ اس قسم کے اختلافات سلف میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ متأول مجتہد ہیں۔ ان میں سے ایک فریق خطا پر ہوتا ہے اور خطا اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے۔ ہاں صحیح فیصلے کے علم کے باوجود غلط فیصلہ کرنا ظلم ہوگا اور اس پر اصرار فسق، بلکہ تحریم کے علم کے بعد اسے حلال قرار دینا کفر ہوگا۔ بغی کو بھی اسی اصول پر جانچنا چاہیے، چنانچہ باغی اگر مجتہد اور متأول ہے، یعنی اسے یہ معلوم نہیں کہ میں باغی ہوں بلکہ وہ اپنے برحق ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے تو اس کے حق میں ''باغی'' کا اطلاق اسے بغاوت کے گناہ کا سزاوار نہیں بناتا۔ جو لوگ متأول باغیوں کے قتال کے قائل ہیں

[1] الحجرات 49:9،10.

وہ بھی ان کے عدوان وظلم کو دور کرنے کے لیے ان سے لڑائی کے قائل ہیں انھیں سزا دینے کے طور پر نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ عادل ہیں، فاسق نہیں۔ جس طرح بچے، مجنون، بھولنے، والے بے ہوش اور سونے والے کو نقصان کرنے سے روکا جاتا ہے اسی طرح انھیں بھی روکا جائے گا۔ اگر بغاوت بلا تاویل ہے تو بھی وہ ایک گناہ ہی ہے اور گناہ کی سزا، توبہ، حسنات اور مصائب و آلام وغیرہ اسباب سے زائل ہو سکتی ہے، نیز اس حدیث میں یہ صراحت نہیں کہ فئة باغيه سے مراد ضرور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ خاص گروہ ہو جنھوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا اور انھیں شہید کیا اور وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایک طائفہ تھا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قتل پر راضی ہونے والے بھی اسی فہرست میں شامل ہوں گے کیونکہ ان کے لشکر میں ایسے لوگ موجود تھے۔ البتہ وہ افراد جو قتل عمار پر راضی نہیں تھے وہ اس وعید میں شامل نہیں ہوں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسے اچھا نہ سمجھتے تھے۔ حضرت معاویہ سے یہ بھی مروی ہے کہ انھوں نے اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا قاتل وہی ہے جو اسے میدان جنگ میں لایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس تاویل کا یہ جواب دیا کہ پھر تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی ہم نے ہی قتل کیا ہوگا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کو قاتل عمار نہیں سمجھتے تھے اسی طرح وہ خود کو باغی بھی نہیں خیال کرتے تھے، اس لیے جس شخص کو ظاہر حالات کی بنا پر باغی سمجھا جا سکتا ہو لیکن وہ اپنے آپ کو باغی نہ سمجھے تو اسے متأول مخطی کے درجے میں سمجھنا چاہیے۔ ④ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ انھیں جنت کی دعوت دیتے تھے جبکہ وہ انھیں جہنم کی طرف بلا رہے تھے۔ اس میں ایک اشکال ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید ہوئے جبکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور انھیں قتل کرنے والے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں تھے اور ان میں بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ ایسے حالات میں یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ انھیں جہنم کی دعوت دیتے تھے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ اپنے گمان کے مطابق لوگوں کو جنت کی دعوت دیتے تھے۔ چونکہ معاملہ اجتہادی ہے، اس لیے وہ اپنے ظنون کے اتباع میں قابل ملامت نہیں۔ جنت کی دعوت دینے سے مراد دخول جنت کے اسباب کی دعوت دینا ہے اور وہ امام کی اطاعت و بیعت ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ لوگوں کو اطاعت امام، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دعوت دیتے تھے جو اس وقت واجب التعمیل تھی اور ان کے مخالفین اپنے اجتہاد کی وجہ سے اس کے خلاف کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن انھیں اپنی تاویل و اجتہاد کی بنا پر معذور خیال کیا جائے گا۔[1] ⑤ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت پر ”اسے باغی گروہ قتل کرے گا“ تو صادق آتا ہے اور ان کے ہاں اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ فعل ان حضرات سے خطائے اجتہادی کے طور پر صادر ہوا لیکن آگے جو فرمایا کہ ”وہ انھیں جنت کی دعوت دیتے تھے اور وہ اسے آگ کی طرف بلاتے تھے“ اس کا تعلق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی جماعت سے نہیں بلکہ یہ جملہ مستأنفه ہے۔ اس میں ایک دوسری بات بیان کی گئی ہے کہ ان کا معاملہ مشرکین مکہ کے ساتھ بھی بڑا قابل رحم رہا، ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، والدہ تک شہید کر دی گئیں جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان مشرکین کو جنت کی طرف دعوت دیتے تھے اور مشرکین قریش انھیں جہنم کی طرف بلاتے تھے لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس توجیہ سے مطمئن نہیں کیونکہ الفاظ حدیث اس توجیہ کا

① فتح الباري : 701/1.

ساتھ نہیں دیتے بلکہ اس سے مراد حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے قاتلین اہل شام ہیں۔[1] واللہ أعلم. ⑥ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مشاجرات صحابہ کے سلسلے میں بڑے حساس تھے۔ ان سے ایک دفعہ سوال ہوا کہ آپ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ تو انھوں فرمایا: ان کے متعلق اچھی بات کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر رحم کرے۔[2] بلکہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے کہ وہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور حدیث ''انھیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' کے متعلق بحث وتکرار ہی کو ناپسند کرتے تھے، یعنی اس حدیث کو بیان تو کرتے لیکن اس پر مزید بات کرنے کو ناپسند خیال کرتے تھے۔[3]

(٦٤) بَابُ الِاسْتِعَانَةِ بِالنَّجَّارِ وَالصُّنَّاعِ فِي أَعْوَادِ الْمِنْبَرِ وَالْمَسْجِدِ

باب: 64- بڑھئی اور کاریگر سے مسجد اور منبر کے تختے بنوانے میں تعاون حاصل کرنا

٤٤٨ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ عَنْ أَبِي حَازِمٍ، عَنْ سَهْلٍ قَالَ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَى امْرَأَةٍ أَنْ مُرِي غُلَامَكِ النَّجَّارَ يَعْمَلْ لِي أَعْوَادًا، أَجْلِسُ عَلَيْهِنَّ. [راجع: ٣٧٧]

[448] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کے ہاں آدمی بھیجا کہ وہ اپنے بڑھئی غلام سے کہے کہ وہ میرے لیے لکڑی کے تختوں سے منبر بنا دے جس پر میں بیٹھا کروں۔

٤٤٩ - حَدَّثَنَا خَلَّادٌ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ ابْنُ أَيْمَنَ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرٍ: أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَلَا أَجْعَلُ لَكَ شَيْئًا تَقْعُدُ عَلَيْهِ؟ فَإِنَّ لِي غُلَامًا نَجَّارًا. قَالَ: «إِنْ شِئْتِ»، فَعَمِلَتِ الْمِنْبَرَ. [انظر: ٩١٨، ٢٠٩٥، ٣٥٨٤، ٣٥٨٥]

[449] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، ایک عورت نے کہا: اللہ کے رسول! کیا میں آپ کے لیے کوئی ایسی چیز نہ بنا دوں جس پر آپ بیٹھا کریں؟ اس لیے کہ میرا ایک غلام بڑھئی کا کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اگر تم چاہتی ہو تو بنوا دو۔'' چنانچہ اس نے منبر بنوا دیا۔

فوائد ومسائل: ① پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازخود منبر بنوانے کی فرمائش کی جبکہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے خود پیش کش کی تھی۔ ممکن ہے کہ جب عورت نے پیش کش کی تھی اس وقت منبر کی ضرورت نہ ہو، پھر آپ نے منبر کی تیاری کو عورت کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی تیاری کے لیے پیغام بھیج دیا۔ یہ توجیہ اس طرح بھی کی جا سکتی ہے کہ پہلے عورت نے خود درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر تمھاری رائے ہو تو ٹھیک ہے، چنانچہ جب تیاری میں تاخیر ہوئی تو یاددہانی کے طور پر آپ نے کہلا بھیجا۔[4] ② روایت میں صرف بڑھئی اور منبر کی تیاری کا ذکر ہے، مسجد کی تیاری میں کاریگروں سے مدد لینے کو اس پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ بڑھئی اور دوسرے کاریگروں سے کام لینے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، اس لیے ہر طرح کے کاریگروں سے کام لینے کا جواز معلوم ہو گیا۔ شاید امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں ان روایات کی طرف اشارہ فرمایا ہو جن میں مسجد کی تیاری کے سلسلے میں دوسرے سے تعاون لینے کی

---

[1] فتح الباري: 702/1. [2] السنة للخلال، حديث: 460. [3] السير: 421/1. [4] فتح الباري: 703/1.

صراحت ہے، چنانچہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ مسجد تعمیر کر رہا تھا تو آپ نے دیگر صحابہ سے فرمایا کہ یمامی کے نزدیک مٹی کا ڈھیر لگا دو کیونکہ یہ مٹی بنانے اور اینٹیں تیار کرنے میں بہت ماہر ہے۔[1] ایک روایت میں ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت یہ مٹی کا گارا بنا رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ کو اس کا کام بہت پسند آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مٹی کا کام اس کے حوالے کر دو کیونکہ یہ اس کا ماہر معلوم ہوتا ہے۔[2]

(٦٥) بَابُ مَنْ بَنَى مَسْجِدًا

٤٥٠ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ وَهْبٍ: أَخْبَرَنِي عَمْرٌو: أَنَّ بُكَيْرًا حَدَّثَهُ أَنَّ عَاصِمَ بْنَ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ عُبَيْدَ اللهِ الْخَوْلَانِيَّ، أَنَّهُ سَمِعَ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ يَقُولُ عِنْدَ قَوْلِ النَّاسِ فِيهِ حِينَ بَنَى مَسْجِدَ الرَّسُولِ ﷺ: إِنَّكُمْ أَكْثَرْتُمْ وَإِنِّي سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «مَنْ بَنَى مَسْجِدًا - قَالَ بُكَيْرٌ: حَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ: يَبْتَغِي بِهِ وَجْهَ اللهِ - بَنَى اللهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الْجَنَّةِ».

باب: 65- اس شخص کی فضیلت جس نے مسجد بنوائی

[450] حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، جب انھوں نے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی تو لوگ اس کے متعلق مختلف باتیں کرنے لگے۔ تب انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جو شخص مسجد بنائے اور اس کا مقصود محض اللہ کو راضی کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس جیسا گھر جنت میں بنا دیتا ہے۔''

فوائد ومسائل: ① تعمیر مسجد کی دو صورتیں ہیں: ٭ مسجد کو شروع ہی سے تعمیر کیا جائے۔ ٭ اس کی توسیع یا تجدید کی جائے۔ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں بانی کو تعمیر مسجد کی فضیلت حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے اسی طرح کا محل تیار کرے گا۔ یہاں ایک اشکال ہے کہ دیگر اعمال خیر کا اجر دس گنا ہوتا ہے لیکن مسجد بنانے کا اجر اس کے مثل یا برابر کیوں ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مثلیت سے زیادہ کی نفی نہیں، نیز ہر عمل کے اجر میں برابری تو عدل ہے اور کم و کیف میں زیادتی اللہ تعالیٰ کا محض فضل و کرم ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک عمدہ جواب دیا ہے کہ مسجد بنانے کی جزا میں گھر تو جنت میں ایک ہی ملے گا مگر وہ کیفیت میں اس دنیا کے گھر سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔ بعض اوقات دنیا میں بھی ایک گھر دوسرے ایک سو گھروں سے بھی زیادہ عالی شان اور پُرشکوہ ہوتا ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ نے فرمایا: ممکن ہے کہ اس گھر کی فضیلت جنت کے گھروں پر ایسی ہو جیسے دنیا میں مسجد کی فضیلت دنیا کے باقی گھروں پر ہوتی ہے۔ بہر حال جنت میں ملنے والا گھر بہت وسیع اور بہترین ہوگا اور مثلیت سے مراد مساوات من کل الوجوہ نہیں، نیز اس میں واضح اشارہ ہے کہ بانی کو جنت میں داخلہ ملے گا کیونکہ گھر بنانے سے مقصود اس میں رہائش رکھنا ہوتا ہے اور رہائش دخول جنت کے بعد ہوگی۔[3] ② حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مسجد نبوی کی توسیع کے متعلق متعدد

---

① الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: 463/39. ② الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: 465/39-466. ③ فتح الباري: 706/1.

اعتراضات کیے گئے، مثلاً: اگر مسجد کی موجودہ صورت بہتر ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء اس کے زیادہ حق دار تھے۔ مسلمانوں کی اجازت کے بغیر مذکورہ توسیع بیت المال کے خزانے سے کی جارہی ہے جو درست نہیں۔ یہ کام اللہ کی رضا کے لیے نہیں بلکہ محض نام ونمود اور شہرت پسندی کے پیش نظر کیا جا رہا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہی حدیث نبوی سے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے: ✱ میں نے یہ کام رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے کیا ہے کیونکہ آپ کا فرمان ہے کہ اگر کوئی اللہ کی رضا کے لیے مسجد تعمیر کرے گا تو اللہ اسے جنت میں اس کے ہم مثل گھر عطا فرمائے گا۔ معلوم ہوا کہ جنت میں ہم مثل جزا لینے کے لیے مسجد بنانے کی اجازت ہے۔ ✱ اس حدیث میں جنت کا مکان حاصل کرنے کی بشارت اس شخص کو دی گئی ہے جو خود تعمیر کرے۔ میں بھی یہ کام حصول جنت کے لیے کر رہا ہوں، لہذا بیت المال سے مسجد کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے بھی آپ نے مسجد کے لیے قطعۂ ارض خرید کر دیا تھا۔ ✱ اس روایت میں ہے کہ جس نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے مسجد تعمیر کی تو اسے جنت میں اس کا مثل عطا کیا جائے گا۔ میں اسی عظیم مقصد کے لیے یہ کام کر رہا ہوں، اس لیے تمھیں نیت پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں، تم میری دل کی باتوں کو نہیں جانتے۔ الغرض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہی حدیث سے تمام اعتراضات کا شافی جواب دے دیا۔ علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ جو شخص مسجد بنوا کر اس پر اپنا نام کندہ کرا دیتا ہے وہ مخلص نہیں بلکہ نمود ونمائش اور ریاکاری کا خوگر ہے کیونکہ حدیث میں جس ثواب کی بشارت دی گئی ہے اس میں للّٰہیت بنیادی شرط ہے۔ اگر کوئی مزدوری کے عوض مسجد تعمیر کرتا ہے تو وہ مذکورہ بشارت کا حق دار نہیں ہوگا اگرچہ حدیث میں دی گئی بشارت کے علاوہ ثواب سے تو محروم نہیں کیا جائے گا۔ حدیث میں ہے کہ ایک تیر کی وجہ سے تین آدمی جنت میں داخل ہوں گے: بنانے والا، چلانے والا اور اس کے لیے سامان مہیا کرنے والا۔ اس میں بنانے والے کے متعلق وضاحت نہیں ہے کہ وہ مزدوری کے عوض بنائے یا فی سبیل اللہ بنا کر مجاہد کے حوالے کر دے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی مملوکہ زمین کے ٹکڑے کو مسجد کا درجہ دے دیتا ہے، پھر وہاں عمارت بنائے بغیر لوگ نماز ادا کرتے ہیں، یا کوئی تیار شدہ عمارت کو مسجد کا درجہ دے دیتا ہے تو اسے بھی مذکورہ فضیلت حاصل ہوگی یا نہیں؟ ظاہری الفاظ کے پیش نظر تو وہ اس فضیلت کا حق دار نہیں ہوگا کیونکہ اس میں مسجد کی تعمیر نہیں ہوئی لیکن اگر مقصود کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسا شخص بھی مذکورہ ثواب سے محروم نہیں ہوگا۔ اسی طرح بنانے سے مراد خود تعمیر کرنے والا اور تعمیر کا حکم دینے والا دونوں ہی ہیں اور دونوں ہی بشارت مذکورہ کے حق دار ہیں۔[1]

(٦٦) بَابٌ: يَأْخُذُ بِنُصُولِ النَّبْلِ إِذَا مَرَّ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 66- جب کوئی مسجد میں جائے تو تیر کے پیکان کو ہاتھ میں لے لے

وضاحت: اگر کسی کے پاس کوئی ہتھیار ہو تو مسجد سے گزرتے وقت اس کی نمائش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اسے محفوظ کر کے وہاں سے گزرے تاکہ کسی نمازی کو نقصان نہ پہنچے۔

[1] فتح الباري: 706/1.

٤٥١ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ: قُلْتُ لِعَمْرٍو: أَسَمِعْتَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَقُولُ: مَرَّ رَجُلٌ فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ سِهَامٌ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَمْسِكْ بِنِصَالِهَا». [انظر: ٧٠٧٣، ٧٠٧٤]

[451] حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک شخص مسجد نبوی میں تیر لیے ہوئے گزر رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے حکم دیا: ''اس کے پیکان تھامے رکھو۔''

فائدہ: معلوم ہوا کہ ہتھیار بند ہو کر مسجد میں آنا جائز ہے، البتہ اگر کوئی تیز دھار چیز ہے تو اس کی دھار پر ہاتھ رکھ لے تاکہ کسی دوسرے کو زخم نہ آئے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ مذکورہ آدمی مسجد سے تیروں سمیت گزرا جن کے پیکان ننگے تھے، تو اسے حکم دیا گیا کہ ان کے سروں کو پکڑ لے تاکہ ان سے کوئی مسلمان زخمی نہ ہو۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ وہ آدمی تیر بنا کر انھیں مجاہدین پر صدقہ کرنے مسجد آیا تھا تاکہ انھیں جہاد میں استعمال کیا جا سکے۔[1]

(٦٧) بَابُ الْمُرُورِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 67- مسجد سے گزرنا

وضاحت: بوقت ضرورت مسجد سے گزرنا جائز ہے لیکن اسے گزرگاہ بنانا درست نہیں جیسا کہ امام بخاری آئندہ باب: 80 میں اس کی وضاحت فرمائیں گے۔

٤٥٢ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو بُرْدَةَ ابْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا بُرْدَةَ عَنْ أَبِيهِ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «مَنْ مَرَّ فِي شَيْءٍ مِّنْ مَّسَاجِدِنَا أَوْ أَسْوَاقِنَا بِنَبْلٍ فَلْيَأْخُذْ عَلَى نِصَالِهَا، لَا يَعْقِرْ بِكَفِّهِ مُسْلِمًا». [انظر: ٧٠٧٥]

[452] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''جو شخص ہماری مسجدوں یا ہمارے بازاروں سے تیر لے کر گزرے تو اسے چاہیے کہ ان کے پیکان ہاتھ میں پکڑ لے مبادا اس کے ہاتھ سے کسی مسلمان کو زخم لگ جائے۔''

فائدہ: مسلمان کی عزت و حرمت بہر حال مقدم ہے اور مسلمان کے خون کی اللہ کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ جب وہ مسجد یا بازار آئیں تو برہنہ ہتھیار لے کر نہ نکلیں۔ ایک روایت میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے اس جملے کو تین بار دہرایا کہ وہ اس کے پیکان پکڑ لے۔[2]

(٦٨) بَابُ الشِّعْرِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 68- مسجد میں شعر پڑھنا

٤٥٣ - حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ:

[453] حضرت حسان بن ثابت ؓ سے روایت ہے،

[1] صحیح مسلم، البر والصلة، حدیث: 6663(2614). [2] فتح الباري: 708/1.

أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ، قَالَ: أَخْبَرَنِي أَبُوسَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ: أَنَّهُ سَمِعَ حَسَّانَ بْنَ ثَابِتٍ الْأَنْصَارِيَّ يَسْتَشْهِدُ أَبَا هُرَيْرَةَ: أَنْشُدُكَ اللهَ، هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «يَا حَسَّانُ! أَجِبْ عَنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ، اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ»؟ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: نَعَمْ. [انظر: ٣٢١٢، ٦١٥٢]

وہ حضرت ابوہریرہ ؓ سے گواہی طلب کررہے تھے: تمھیں اللہ کی قسم! بتاؤ کیا تم نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''اے حسان! رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کافروں کو جواب دو۔ اے اللہ! تو حسان کی روح القدس سے تائید فرما؟'' حضرت ابوہریرہ ؓ نے جواب دیا: ہاں، میں نے سنا ہے۔

فوائد ومسائل: ① حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجدوں میں شعر پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[1] اس کی سند صحیح ہے۔ اس حکم امتناعی پر دیگر احادیث بھی مشتمل ہیں لیکن ان کی صحت کے متعلق محدثین نے کلام کیا ہے، تاہم اس قسم کی متعارض احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مسجد میں ایسے اشعار پڑھنے منع ہیں جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہوں یا دور جاہلیت کی یادگار، عشقیہ مضامین اور فحش گوئی پر مشتمل ہوں۔ البتہ ایسے اشعار پڑھنے کی اجازت ہے جو درج بالا عیوب سے پاک ہوں اور ان میں اسلام کی خوبیوں یا ان میں مخالفین اسلام کے حملوں کا جواب دیا گیا ہو۔ بعض حضرات نے یہ توجیہ کی ہے کہ حکم امتناعی اس صورت میں ہے کہ مسجد کو غزل خانہ بنا دیا جائے یا تمام اہل مسجد شعر گوئی میں مصروف ہو جائیں۔[2] بہرحال امام بخاری جمہور کی تائید کرتے ہوئے تفصیل کے قائل ہیں کیونکہ اشعار، کلام کا حصہ ہیں۔ جس طرح کلام اچھا برا ہوتا ہے اسی طرح اشعار بھی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ برے اشعار کا مسجد کے باہر پڑھنا بھی درست نہیں، ایسے اشعار کو مسجد میں پڑھنا ان کی قباحت میں مزید اضافے کا باعث ہے، البتہ اچھے اشعار جو اسلامی مضامین پر مشتمل ہوں، مسجد کے باہر اور اندر پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ② مذکورہ حدیث میں اس بات کا تذکرہ نہیں ہے کہ حضرت حسان ؓ مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اشعار پڑھتے تھے لیکن صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان ؓ کو فرمایا تھا: ''اے حسان! میری طرف سے ان مشرکین کو جواب دو۔''[3] چنانچہ حضرت حسان ؓ نے مسجد ہی میں مشرکین کے ہجو یہ کلام کا جواب دیا تھا۔ امام بخاری ؒ کی عادت ہے کہ وہ عنوان قائم کرتے وقت روایت کے دوسرے طرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضرت حسان ؓ کو حضرت ابوہریرہ ؓ سے شہادت لینے کی اس لیے ضرورت پڑی کہ ایک دن حضرت حسان ؓ مسجد نبوی میں اشعار پڑھ رہے تھے، حضرت عمر ؓ کا وہاں سے گزر ہوا تو انھوں نے آپ کو گھور کر دیکھا اور ناگواری کا اظہار فرمایا۔ حضرت حسان ؓ نے فوراً کہا کہ میں تو مسجد نبوی میں آپ سے زیادہ مرتبے والی شخصیت کی موجودگی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر آپ نے حضرت ابوہریرہ ؓ کی طرف التفات کر کے ان سے شہادت طلب کی۔[4] حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ حضرت حسان ؓ کے لیے مسجد نبوی میں خود منبر رکھتے جس پر کھڑے ہو کر وہ مشرکین کی ہجو کرتے تھے۔[5] ممکن ہے کہ حضرت عمر ؓ کے سامنے مندرجہ

---

[1] جامع الترمذي، الصلاة، حديث: 322. [2] فتح الباري: 710/1. [3] صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6152. [4] صحيح البخاري، بدء الخلق، حديث: 3212. [5] جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2846.

ذیل ارشاد نبوی ہو: ''تم میں سے کسی کے پیٹ میں پیپ بھری ہو تو (یہ) اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ اس کے پیٹ میں اشعار بھرے ہوں۔''[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر بڑا محتاط عنوان قائم کیا ہے: ''مکروہ ہے کہ انسان کی طبیعت پر اشعار کا اس حد تک غلبہ ہو کہ وہ اللہ کے ذکر، حصول علم اور تلاوت قرآن سے بھی غافل رہے۔''

(٦٩) بَابُ أَصْحَابِ الْحِرَابِ فِي الْمَسْجِدِ

باب:79- برچھے والوں کا مسجد میں آنا

وضاحت: پہلے باب میں یہ بیان ہوا تھا کہ مسجد میں ننگے ہتھیار لے کر جانا منع ہے۔ اس عنوان میں ایک استثنائی صورت کا بیان ہے کہ اگر مسجد میں جہادی مشقیں کرنے کے لیے ہتھیار کھول دیے جائیں تو چنداں حرج نہیں کیونکہ اس میں کوئی خطرے والی بات نہیں۔ اس کے برعکس جب بلا مقصد مسجد میں ہتھیار کھولے جائیں گے تو ان سے نقصان کا اندیشہ ہے۔[2]

٤٥٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَوْمًا عَلٰى بَابِ حُجْرَتِي وَالْحَبَشَةُ يَلْعَبُونَ فِي الْمَسْجِدِ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يَسْتُرُنِي بِرِدَائِهِ أَنْظُرُ إِلٰى لَعِبِهِمْ». [انظر: ٤٥٥، ٩٥٠، ٩٨٨، ٢٩٠٦، ٣٥٢٩، ٣٩٣١، ٥١٩٠، ٥٢٣٦]

[454] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑے دیکھا جب کہ حبشہ کے کچھ لوگ مسجد میں (جہادی مشقیں کرتے ہوئے) کھیل رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ اپنی چادر سے مجھے چھپا رہے تھے اور میں ان کا کھیل دیکھ رہی تھی۔

٤٥٥ - وَزَادَ إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَالْحَبَشَةُ يَلْعَبُونَ بِحِرَابِهِمْ. [راجع: ٤٥٤]

[455] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے، فرماتی ہیں: میں نے نبی ﷺ کو دیکھا جب کہ اہل حبشہ اپنے نیزوں سے کھیل رہے تھے۔

فوائد و مسائل: ① چھوٹے نیزے کو خاص انداز سے چکر دے کر پھینکنا ایک کامیاب فن حرب ہے۔ اہل حبشہ کو اس میں خاص مہارت تھی۔ صحیح بخاری کی اصل روایت میں تو یہ وضاحت تھی کہ صدیقۂ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب کھیل دیکھا تو وہ مسجد میں ہو رہا تھا لیکن اصل روایت میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ وہ کھیل نیزے کی فنی مشق سے متعلق تھا جبکہ عنوان میں ''برچھے والوں کا مسجد میں آنا'' بیان کیا گیا تھا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک راوی ابراہیم بن منذر کی روایت ذکر کر دی جس میں نیزوں سے کھیلنے کی صراحت تھی۔ ② بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسجد چونکہ عبادت کی جگہ ہے، اس لیے جو چیزیں عبادت

① صحيح البخاري، الأدب، حديث: 6154. ② فتح الباري: 710/1.

سے متعلق ہوں گی صرف انھیں مسجد میں جائز ہونا چاہیے، اس کے علاوہ دوسرے کام مسجد میں جائز نہیں۔ اس قسم کے لوگوں نے مذکورہ روایت کے متعلق یہ تأثر ظاہر کیا ہے کہ اس کھیل کا مظاہرہ مسجد میں نہیں بلکہ مسجد سے باہر یا مسجد کے متعلقات میں کیا جا رہا تھا لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس معاملے میں توسع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ اسلحے کی نمائش اور فنونِ حرب کا مظاہرہ اگر جہاد کی نیت سے ہو تو عبادت ہے اور اس قسم کی عبادت مسجد میں کی جا سکتی ہے۔ اس روایت کے بعض طرق میں ہے کہ جب اہل حبشہ مسجد میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے تو کہیں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ادھر آ نکلے، انھوں نے مسجد میں اس قسم کا مظاہرہ کرنے سے منع کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! رہنے دو۔''[1] مقصد یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کام جہاد کی تیاری اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہو تو اسے مسجد میں کرنے کی اجازت ہے۔[2] ③ حضرت مہلب رحمہ اللہ نے کہا ہے: مساجد کی تعمیر دین کے اجتماعی کاموں کے لیے ہوتی ہے، اس لیے وہ تمام کام جن سے دین اور اہل دین کی منفعت وابستہ ہو، مسجد میں کیے جا سکتے ہیں۔ نیزوں سے کھیلنا دراصل اپنی جنگی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی ایک مشق ہے، اس سے دشمن پر حملہ کرنے اور اس سے اپنا دفاع کرنے کا سلیقہ آتا ہے، اس لیے اسے مسجد میں کھیلا جا سکتا ہے، نیز معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ کس درجہ حسن معاشرت کا لحاظ رکھتے تھے! مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسی باتوں کو حرزِ جاں بنائیں اور ان کی بجا آوری کے لیے بھرپور کوشش کریں۔[3]

(٧٠) بَابُ ذِكْرِ الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ عَلَى الْمِنْبَرِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 70- مسجد میں منبر پر خرید و فروخت کا ذکر کرنا

٤٥٦ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ يَحْيٰى، عَنْ عَمْرَةَ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: أَتَتْهَا بَرِيرَةُ تَسْأَلُهَا فِي كِتَابَتِهَا. فَقَالَتْ: إِنْ شِئْتِ أَعْطَيْتُ أَهْلَكِ وَيَكُونُ الْوَلَاءُ لِي. وَقَالَ أَهْلُهَا: إِنْ شِئْتِ أَعْطَيْتِهَا مَا بَقِيَ - وَقَالَ سُفْيَانُ مَرَّةً: إِنْ شِئْتِ أَعْتَقْتِهَا - وَيَكُونُ الْوَلَاءُ لَنَا. فَلَمَّا جَاءَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ذَكَّرَتْهُ ذٰلِكَ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «اِبْتَاعِيهَا فَأَعْتِقِيهَا فَإِنَّ الْوَلَاءَ لِمَنْ أَعْتَقَ»، ثُمَّ قَامَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ - وَقَالَ سُفْيَانُ مَرَّةً: فَصَعِدَ رَسُولُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ - فَقَالَ: «مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَشْتَرِطُونَ شُرُوطًا

[456] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ان کے پاس حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا آئیں اور بدلِ کتابت کے سلسلے میں ان سے سوال کیا۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم اگر چاہو تو میں تمھارے آقا کو بدلِ کتابت (یک مشت) ادا کر دوں لیکن تمھاری ولا کا حق میرے لیے ہوگا۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے آقاؤں نے (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے) کہا: اگر آپ چاہیں تو بقیہ رقم ادا کر کے اسے آزاد کرا لیں لیکن حق ولا ہمارا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ جب تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم اسے (بریرہ رضی اللہ عنہا کو) خرید کر آزاد کر دو، بلاشبہ ولا کا وہی حق دار ہے جو آزاد کرتا ہے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے منبر

---

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 2901. [2] فتح الباري: 711/1. [3] شرح ابن بطال: 104/2.

لَيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ: مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطًا لَيْسَ فِي كِتَابِ اللهِ فَلَيْسَ لَهُ وَإِنِ اشْتَرَطَ مِائَةَ مَرَّةٍ».

پر کھڑے ہو کر فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ معاملات میں ایسی شرطیں رکھتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، جو شخص بھی کوئی شرط لگائے جو کتاب اللہ میں ذکر شدہ شرائط کے مناسب نہیں ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی، خواہ وہ ایسی سو شرطیں لگا لے۔''

وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى عَنْ عَمْرَةَ أَنَّ بَرِيرَةَ وَلَمْ يَذْكُرْ: فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ. قَالَ عَلِيٌّ: قَالَ يَحْيٰى وَعَبْدُ الْوَهَّابِ، عَنْ يَحْيٰى، عَنْ عَمْرَةَ، نَحْوَهُ وَقَالَ جَعْفَرُ بْنُ عَوْنٍ، عَنْ يَحْيٰى قَالَ: سَمِعْتُ عَمْرَةَ قَالَتْ: سَمِعْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا. [انظر: ١٤٩٣، ٢١٥٥، ٢١٦٨، ٢٥٣٦، ٢٥٦٠، ٢٥٦١، ٢٥٦٣، ٢٥٦٤، ٢٥٦٥، ٢٥٧٨، ٢٧١٧، ٢٧٢٦، ٢٧٢٩، ٢٧٣٥، ٥٠٩٧، ٥٢٧٩، ٥٢٨٤، ٥٤٣٠، ٦٧١٧، ٦٧٥١، ٦٧٥٤، ٦٧٥٨، ٦٧٦٠]

اس روایت کو امام مالک نے یحییٰ بن سعید سے اور یحییٰ بن سعید نے حضرت عمرہ سے روایت کیا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے منبر پر چڑھنے کا ذکر نہیں ہے، نیز اس روایت کو علی بن عبداللہ نے یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالوہاب بن عبدالمجید سے، پھر ان دونوں نے یحییٰ بن سعید انصاری سے، انھوں نے عمرہ سے اسی طرح بیان کیا۔ اور جعفر بن عون نے اس روایت کو یحییٰ سے نقل کیا ہے، انھوں نے کہا: میں نے عمرہ سے سنا، انھوں نے اس روایت کو حضرت عائشہ ؓ سے سن کر بیان کیا۔

فوائد ومسائل: ① بریرہ ؓ انصار کے کسی قبیلے کی لونڈی تھی اور حضرت عائشہ ؓ کے ہاں اس کا آنا جانا تھا بلکہ فارغ اوقات میں آپ کی خدمت کیا کرتی تھی جیسا کہ واقعۂ افک سے معلوم ہوتا ہے۔ حضرت بریرہ ؓ کا، 9 اوقیہ چاندی کی ادائیگی پر اپنے مالکوں سے آزادی کا تحریری معاہدہ ہو گیا۔[1] جن میں چار اوقیہ انھوں نے یک مشت ادا کر دیے اور باقی پانچ اوقیہ سال میں ایک اوقیہ کے حساب سے پانچ سال میں ادا کرنے تھے۔[2] امام بخاری ؒ اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں برسر منبر خرید وفروخت کے مسائل کی تعلیم دی جا سکتی ہے، مسجد میں عقد بیع کا جواز ثابت کرنا قطعاً مقصود نہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شرح تراجم بخاری میں بیان کیا ہے، لیکن اس روایت میں رسول اللہ ﷺ نے برسر منبر جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان میں بیع وشرا کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے برسر منبر جو ارشادات ہیں وہ بیع وشرا اور عتق وولاء کے قضیے کے بعد بیان ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر اسی گزشتہ معاملے کی طرف اشارہ کر کے مسئلے کی وضاحت فرمائی ہے، لہٰذا منبر پر اس واقعے کی طرف اشارہ کرنا گویا منبر پر اسے بیان کرنے کے مترادف ہے۔ ② حدیث کے آخر میں امام بخاری ؒ نے اس کے متعدد طرق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ دراصل امام بخاری کے شیخ علی بن عبداللہ المدینی اس روایت کو اپنے چار شیوخ: حضرت سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالوہاب بن عبدالمجید اور جعفر بن عون سے بیان کرتے ہیں۔ یہ حضرات اپنے شیخ یحییٰ بن

---

① صحيح البخاري، المكاتب، حديث :2563. ② صحيح البخاري، المكاتب، حديث :2560.

سعید انصاری سے بیان کرتے ہیں، نیز اس ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت امام مالک کے طریق کا بھی حوالہ دیا ہے جو مرسل ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے منبر پر چڑھنے کا بھی ذکر نہیں ہے۔ اسی طریق کو آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے موصولاً بھی بیان کیا ہے۔[1] یحییٰ بن سعید قطان اور عبدالوہاب بن عبدالمجید کی سند بھی امام مالک کی طرح مرسل اور ذکر منبر کے بغیر ہے۔ جعفر بن عون کی سند اس لیے بیان کی ہے کہ اس میں یحییٰ بن سعید انصاری کے عمرہ سے سماع کی تصریح اور عمرہ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع کی بھی وضاحت موجود ہے۔ چونکہ حضرت سفیان بن عیینہ کی متصل روایت میں منبر کا تذکرہ تھا، اس لیے اسے اصل قرار دے کر متن میں لے لیا اور باقی اسناد کا بطور تائید حوالہ دے دیا گیا۔[2]

نوٹ: اس حدیث سے متعلق دیگر مباحث کتاب المکاتب میں بیان ہوں گے۔ باذن اللّٰہ تعالٰی.

(٧١) بَابُ التَّقَاضِي وَالْمُلَازَمَةِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 71- مسجد میں قرض دار سے قرض کا تقاضا کرنا اور اس کے پیچھے پڑنا

وضاحت: مسجد عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے، اس میں قرض دار سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ مسجد کے موضوع کے منافی ہے کیونکہ اس میں جھگڑا ہوتا ہے، آوازیں بلند ہوتی ہیں جو آداب مسجد کے خلاف ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک اگر قرض خواہ معمولی طور پر مقروض سے ادائیگی کا مطالبہ کرے یا اسے پکڑ کر بیٹھ جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

٤٥٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ قَالَ: أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ كَعْبٍ: أَنَّهُ تَقَاضَى ابْنَ أَبِي حَدْرَدٍ دَيْنًا كَانَ لَهُ عَلَيْهِ فِي الْمَسْجِدِ، فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهُمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمَا، حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهِ، فَنَادٰى: «يَا كَعْبُ!»، قَالَ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ! فَقَالَ: «ضَعْ مِنْ دَيْنِكَ هٰذَا»، وَأَوْمَأَ إِلَيْهِ أَيِ الشَّطْرَ. قَالَ: لَقَدْ فَعَلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! قَالَ: «قُمْ فَاقْضِهِ».

[انظر: ٤٧١، ٢٤١٨، ٢٤٢٤، ٢٧٠٦، ٢٧١٠]

[457] حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے مسجد میں ابن ابی حدرد سے اپنے قرض کا تقاضا کیا۔ اس پر ان دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے حجرے میں سنا۔ آپ باہر تشریف لائے اور حجرے کا پردہ اٹھا کر آواز دی: ''اے کعب!'' انھوں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا: ''تم اپنے قرض میں سے کچھ کم کر دو۔'' اور آپ نے نصف قرض چھوڑ دینے کا اشارہ فرمایا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، تب آپ نے ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اٹھو، اس کا قرض ادا کر دو۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان کے دو جز ہیں: * قرض کا تقاضا کرنا۔ * اس کے پیچھے پڑنا۔ اس

[1] صحيح البخاري، المكاتب، حديث: 2564. [2] فتح الباري: 713/1.

روایت میں تقاضا کرنے کا ذکر ہے، پیچھا کرنے اور گھیراؤ کرنے کا ذکر نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تقاضا اس وقت ہوتا ہے جب قرض دار کا گھیراؤ کر لیا جائے۔ پھر روایت کے عنوان سے گھیراؤ کرنے کا ثبوت خود بخود ہو رہا ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن ابی حدرد سے جو گفتگو کی یہ اس انداز سے ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے حجرے سے باہر آ کر معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر فیصلہ کرنا پڑا۔ اس سے صرف تقاضا ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے پڑنا اور اس کا گھیراؤ کرنا بھی ثابت ہو رہا ہے۔ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کے ایک طریق میں اس کی وضاحت فرمائی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت کعب بن مالک کا حضرت عبداللہ بن ابی حدرد کے ذمے کچھ قرض تھا، وہ ان سے ایک دن ملے اور ان کا گھیراؤ کر لیا۔[1] اس روایت سے پیچھا کرنا بھی ثابت ہو گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کی خوبیوں سے ہے کہ حدیث کے تمام طرق میں ان کا ذہن گھومتا رہتا ہے۔ فن حدیث میں کامل ہونے کی یہی علامت ہے۔ کیونکہ جب تک حدیث کے تمام متون اور طرق پر نظر نہ ہو، کوئی مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا۔ ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے طبرانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کے ذمے دو اوقیے چاندی تھی۔ ایک اوقیہ چاندی معاف ہونے کے بعد باقی اوقیہ کی فوری ادائیگی کو ضروری قرار دیا گیا، نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی ضرورت کے پیش نظر مسجد میں بآواز بلند گفتگو کرنا جائز ہے، البتہ بلاوجہ مسجد میں آواز بلند کرنا درست نہیں جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ خود اس کی وضاحت فرمائیں گے۔[2]

(٧٢) بَابُ كَنْسِ الْمَسْجِدِ وَالْتِقَاطِ الْخِرَقِ وَالْقَذَى وَالْعِيدَانِ

باب:72- مسجد سے چیتھڑے، کوڑا کرکٹ اور لکڑیاں اٹھانا اور اس کی صفائی کرنا

٤٥٨ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَجُلًا أَسْوَدَ أَوِ امْرَأَةً سَوْدَاءَ كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ، فَمَاتَ فَسَأَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْهُ؟ فَقَالُوا: مَاتَ. قَالَ: «أَفَلَا كُنْتُمْ آذَنْتُمُونِي بِهِ؟ دُلُّونِي عَلَى قَبْرِهِ» أَوْ قَالَ: «عَلَى قَبْرِهَا» فَأَتَى قَبْرَهُ فَصَلَّى عَلَيْهَا. [انظر: ٤٦٠، ١٣٣٧]

[458] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام مرد یا عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، وہ فوت ہو گیا تو نبی ﷺ نے لوگوں سے اس کی بابت پوچھا؟ انھوں نے کہا: وہ تو فوت ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''بھلا تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟ اچھا اب مجھے اس کی قبر بتاؤ۔'' چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور وہاں نماز جنازہ ادا کی۔

فوائد و مسائل: ① ایک عورت مسجد نبوی کی خدمت کیا کرتی تھی، ذکر کردہ روایت میں شک کا صیغہ استعمال ہوا ہے کہ وہ عورت تھی یا مرد تھا لیکن بعض روایات میں عورت کا تعین ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت حماد کہتے ہیں کہ میرے خیال کے مطابق وہ عورت تھی۔ (حدیث:460) پھر ابن خزیمہ کی روایت میں صراحت ہے کہ وہ عورت تھی۔ بیہقی میں اس کی کنیت ام محجن

[1] صحيح البخاري، الخصومات، حديث :2424. [2] فتح الباري : 714/1.

بتائی گئی ہے۔ ابن مندہ نے اس کا نام خرقاء لکھا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جس شخص نے اس کی وفات کے متعلق آپ کو مطلع کیا تھا وہ جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں ایسی چیزیں ذکر کی ہیں جن کی تفصیل حدیث میں نہیں ہے، البتہ [يَقُمُّ الْمَسْجِدَ] کے الفاظ ان تمام چیزوں کو شامل ہیں کیونکہ ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مسجد نبوی کا تمام کوڑا کرکٹ، یعنی چیتھڑے، لکڑی کا چورا، تنکے اور گردوغبار سب چیزوں کو جھاڑ دے کر مسجد سے باہر پھینکتی تھی۔ اس کے علاوہ امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ عنوان کے الفاظ سے ذکر کردہ حدیث کے دیگر طرق کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیح ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ وہ مسجد سے خس وخاشاک چننے میں خصوصی شغف رکھتی تھی۔ اور بیہقی میں ہے کہ وہ مسجد سے بوسیدہ کپڑے اور لکڑی کا چورا وغیرہ چنتی رہتی تھی۔ ان روایات میں ان تمام چیزوں کو بیان کیا گیا جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے قائم کردہ عنوان میں ذکر کی ہیں۔ گویا امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے ذوق کے مطابق عنوان بالا سے حدیث کے دیگر طرق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[2] ② قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کے متعلق ہم اپنے موقف کی وضاحت آئندہ کتاب الجنائز میں کریں گے۔ بإذن الله. البتہ اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ مسجد کی صفائی کرنا بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی قبر پر جنازہ پڑھ کر اس اہمیت کو اجاگر فرمایا کہ مسجد میں جھاڑو دینے کی خدمت کوئی معمولی خدمت نہیں۔

(٧٣) بَابُ تَحْرِيمِ تِجَارَةِ الْخَمْرِ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 73- مسجد میں تجارت شراب کی حرمت (کا اعلان)

٤٥٩ - حَدَّثَنَا عَبْدَانُ عَنْ أَبِي حَمْزَةَ، عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُسْلِمٍ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: لَمَّا أُنْزِلَتِ الْآيَاتُ فِي سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي الرِّبَا، خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى الْمَسْجِدِ فَقَرَأَهُنَّ عَلَى النَّاسِ، ثُمَّ حَرَّمَ تِجَارَةَ الْخَمْرِ.

[459] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جب حرمت سود کے متعلق سورۂ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں تو نبی ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور لوگوں کو وہ آیات پڑھ کر سنائیں۔ پھر آپ نے شراب کی تجارت کو بھی حرام کر دیا۔

[انظر: ٢٠٨٤، ٢٢٢٦، ٤٥٤٠، ٤٥٤١، ٤٥٤٢، ٤٥٤٣]

فوائد ومسائل: ① مسجدیں چونکہ عبادت اور ذکر الٰہی کے لیے بنائی جاتی ہیں، اس لیے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شراب، سود اور خنزیر جیسی گندی چیزوں کا ذکر مسجد کے تقدس کے منافی ہے۔ اس اشکال کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں امام بخاری رحمہ اللہ کہ ان چیزوں کا ذکر اگر شرعی احکام کے بیان کرنے کے لیے آئے تو جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، یعنی شراب جیسی حرام اور خبیث چیز کی حرمت کا مسئلہ مسجد میں بیان کیا جا سکتا ہے۔[3] شراب اور سود کا حکم ایک ساتھ اس لیے بیان کیا کہ سود کھانے والے اور شراب پینے والے یکساں طور پر شیطان کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ لیکن علامہ عینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقصد نہیں کیونکہ مسجد میں ان چیزوں کے تذکرے کا جواز ثابت کرنے میں کوئی فائدہ نہیں، بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تجارت شراب کی

1 فتح الباري: 715/1. ② فتح الباري: 715/1. ③ فتح الباري: 716/1.

حرمت کا اعلان مسجد میں کیا گیا اور یہی بات حدیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے تجارت شراب کی شناعت کے پیش نظر اس کی حرمت کے اعلان کے لیے مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ کو مناسب ہی خیال نہیں کیا، اس کے لیے مسجد نبوی کے منبر کا انتخاب کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی حرمت انتہائی قبیح اور اس کی تجارت نہایت قابل نفرت ہے۔[1] ② آیات ربا کا نزول رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے بالکل آخری زمانے میں ہوا جبکہ حرمتِ شراب کا حکم اس سے کافی عرصہ پہلے آچکا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ کے مسجد نبوی میں آیاتِ ربا پڑھ کر سنانے کے بعد تجارت شراب کی حرمت کا اعلان کرنے کی کیا وجہ ہے؟ علمائے حدیث اس کے کئی ایک جواب دیتے ہیں: * اگرچہ شراب کی حرمت پہلے آ چکی تھی تاہم آپ نے دوبارہ حرمت سود کے ساتھ بطور تاکید بیان فرمایا۔ * شراب کی حرمت کا حکم تو پہلے آ چکا تھا لیکن اس موقع پر اس کی تجارت کے متعلق بھی حکم امتناعی جاری کر دیا۔[2] لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ محل نظر ہے کیونکہ جب کسی چیز کی حرمت کا حکم آتا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا بھی منع کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک پسندیدہ توجیہ یہ ہے کہ سود اور شراب میں کافی مماثلت ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے حرمت ربا کے ساتھ تجارتِ شراب کی حرمت کا بھی بیان کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راوی نے اس وقت سنا ہو اور اپنے خیال کے مطابق اس نے بیان کر دیا۔ واللہ أعلم.

(٧٤) بَابُ الْخَدَمِ لِلْمَسْجِدِ

باب: 74- خدام مسجد کی تعیناتی کرنا

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ ﴿نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا﴾ [آل عمران: ٣٥] لِلْمَسْجِدِ يَخْدُمُهُ.

حضرت ابن عباس ؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمران کی بیوی کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے، انھوں نے کہا: ''(اے میرے رب!) جو بچہ میرے بطن میں ہے میں نے اس کے متعلق نذر مانی ہے کہ اسے تیرے لیے آزاد چھوڑ دوں۔'' حضرت ابن عباس ؓ نے (اس کی تفسیر کرتے ہوئے) فرمایا: اس نے مسجد کے لیے آزاد چھوڑ دینے کی نذر مانی تھی کہ وہ اس کی خدمت کیا کرے گا۔

وضاحت: امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ مسجد کے لیے خدام کا تقرر دوسرے مسلمانوں کو اس خدمت سے محروم کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا، وہ حضرات شوق سے خدمت مسجد بجا لائیں۔ خدام کی تعیناتی کا رواج امم سابقہ سے چلا آ رہا ہے جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا ہے، چنانچہ حضرت عمران کی بیوی نے نذر مانی تھی کہ ان کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہو گا اسے دنیا کے تمام کاموں سے آزاد کر کے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی، مگر لڑکا پیدا ہونے کے بجائے حضرت مریم پیدا ہوئیں تو انھیں ہی نذر پوری کرنے کے لیے وقف کر دیا گیا۔

① عمدة القاري: 507/3. ② فتح الباري: 716/1.

٤٦٠ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ وَاقِدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ ثَابِتٍ، عَنْ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ امْرَأَةً أَوْ رَجُلًا كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ - وَلَا أُرَاهُ إِلَّا امْرَأَةً - فَذَكَرَ حَدِيثَ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ صَلَّى عَلَى قَبْرِهِ. [راجع: ٤٥٨]

[460] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، ایک عورت ...... یا مرد...... مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتا تھا...... راویٔ حدیث ابو رافع کہتے ہیں کہ میرے خیال کے مطابق وہ عورت ہی تھی...... پھر انھوں نے نبی ﷺ کی حدیث نقل فرمائی کہ آپ نے اس کی قبر پر نماز پڑھی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد کی دیکھ بھال کے لیے خادم رکھنا سنت قدیمہ ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس ؓ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے۔ اسے ابو حاتم نے اپنی تفسیر میں موصولاً بیان کیا ہے۔ پیش کردہ روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مساجد کی خدمت کے لیے خادم کا تقرر جائز ہے جیسا کہ حدیث سے واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر کوئی انکار نہیں کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اگر دوسرے حضرات خدمت کرنا چاہیں تو ان کے لیے کوئی ممانعت نہیں، نیز اس خدمت کے لیے جس شخص کا تقرر ہوگا، وہ بھی تمام مسلمانوں کی طرف سے نائب کے طور پر کام کرے گا کیونکہ اہل محلّہ مل کر اس کی خدمت کریں گے۔ چونکہ یہ ضروریات سے ہے اس بنا پر اس خدمت کے عوض تنخواہ لینا بھی جائز ہے۔ یہ روایت تفصیلاً پہلے (458) گزر چکی ہے۔ ② اس حدیث سے خدمت مسجد کی عظمت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے باز پرس فرمانے پر یہ معذرت کی گئی کہ آرام کا وقت تھا، ہم لوگوں نے خیال کیا کہ آپ کو بیدار کرنے میں زحمت ہوگی، اس لیے آپ کو اطلاع نہیں دی گئی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رات تاریک تھی، اس لیے اس حادثے کو اہمیت نہیں دی گئی۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ان حضرات نے خادمہ کے معاملے کو معمولی خیال کیا کہ ایک بے سرو سامان مسجد کی خادمہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کا یہاں کوئی خویش و اقارب بھی نہیں ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی قبر پر جنازہ پڑھ کر اس کی عظمت و اہمیت کو اجاگر فرمایا کہ مسجد میں جھاڑو دینے کی خدمت کو معمولی کام نہیں خیال کرنا چاہیے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر پر جنازہ پڑھنے کے بعد فرمایا: ''ان قبروں میں اہل قبور پر تاریکی چھائی رہتی ہے، اللہ تعالیٰ ان پر میرے جنازہ پڑھنے کی وجہ سے قبروں کو ان کے لیے منور کر دیتا ہے۔''[1]

(٧٥) بَابُ الْأَسِيرِ أَوِ الْغَرِيمِ يُرْبَطُ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 75- قیدی یا قرض دار کو مسجد میں باندھنا

٤٦١ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: أَخْبَرَنَا رَوْحٌ وَّمُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

[461] حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: آپ نے فرمایا: ''گزشتہ رات اچانک ایک سرکش جن مجھ سے ٹکرا گیا، یا ایسا ہی کوئی اور کلمہ ارشاد

[1] صحیح مسلم، الجنائز، حدیث: 2215(956).

قَالَ: «إِنَّ عِفْرِيتًا مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ عَلَيَّ الْبَارِحَةَ -أَوْقَالَ: كَلِمَةً نَّحْوَهَا- لِيَقْطَعَ عَلَيَّ الصَّلَاةَ، فَأَمْكَنَنِيَ اللهُ مِنْهُ، فَأَرَدْتُّ أَنْ أَرْبِطَهُ إِلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ، حَتّٰى تُصْبِحُوا وَتَنْظُرُوا إِلَيْهِ كُلُّكُمْ، فَذَكَرْتُ قَوْلَ أَخِي سُلَيْمَانَ: ﴿رَبِّ ٱغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنۢبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِيٓ﴾» [ص: ٣٥]

فرمایا، تاکہ میری نماز میں خلل انداز ہو، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو دے دیا۔ میں نے چاہا کہ اسے مسجد میں کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ صبح کے وقت تم سب بھی اسے دیکھ سکو۔ پھر مجھے اپنے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کی وہ دعا یاد آ گئی جس میں انھوں نے عرض کیا تھا: ''اے میرے رب! مجھے معاف کر اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کے لیے سزاوار نہ ہو۔''

قَالَ رَوْحٌ: فَرَدَّهُ خَاسِئًا. [انظر: ١٢١٠، ٣٢٨٤، ٣٤٢٣، ٤٨٠٨]

(راویٔ حدیث) روح کہتے ہیں: پھر (یہ دعا یاد آنے کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے اس جن کو رسوا کر کے واپس کر دیا۔

فائدہ: صحیح بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ سرکش جن میرے سامنے آیا اور مجھ پر حملہ آور ہوا۔[1] صحیح مسلم میں ہے کہ اس نے آگ کا شعلہ میرے چہرے پر ڈالنے کی کوشش کی۔[2] مسند احمد میں ہے کہ میں نے اسے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا اور اتنی زور سے اس کا گلا دبایا کہ اس کا لعاب دہن میرے ہاتھوں پر گرا جس کی تراوٹ مجھے محسوس ہوئی۔[3] امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ کسی مقروض کو عبرت کے لیے یا کسی کافر کو مصلحت کے سبب مسجد کے ستون سے باندھنا جائز ہے اور اس سے مسجد کے تقدس کی پامالی نہیں ہوتی کیونکہ عہد رسالت میں اس طرح کے سب کام مسجد نبوی ہی میں انجام پاتے تھے۔ مقروض کو مسجد میں قید کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ مسلمان نماز کے اوقات میں جب اسے دیکھیں گے تو ممکن ہے کہ کسی کو اس پر رحم آ جائے اور قرض کی ادائیگی میں اس کا ہاتھ بٹائے اور وہ خود بھی اس ندامت کے پیش نظر اپنی خفت مٹانے کے لیے جلد از جلد قرض ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح کافر کو مسجد میں قید کرنے کی مصلحت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے معاملات کو بچشم خود دیکھے گا، ان کی عبادت اور دیگر خوبیوں سے واقف ہوگا، اسی طرح اسے اسلام کی صداقت قبول کرنے اور ایمان لانے میں مدد ملے گی۔ مختصر یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ اگر شرعی مصلحت کا تقاضا ہو تو مسجد میں مقروض اور غیر مسلم کو قید کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روایت میں اسیر کو مسجد میں قید کرنے کے جواز پر تو استدلال ہو سکتا ہے، البتہ مقروض کا اس میں ذکر نہیں ہے۔ اس کے متعلق علامہ عینی فرماتے ہیں کہ مقروض کو اسیر پر قیاس کیا جا سکتا ہے کیونکہ مقروض بھی قرض خواہ کے حق میں اسیر ہی ہوتا ہے، اس لیے اسے بھی روایت سے ثابت سمجھنا چاہیے۔[4]

نوٹ: اس حدیث سے متعلقہ دیگر مباحث ہم کتاب بدء الخلق (حدیث: 3284)، کتاب أحادیث الأنبیاء، (حدیث: 3423) اور کتاب التفسیر (حدیث: 4808) میں بیان کریں گے۔ بإذن اللہ تعالیٰ۔

---

[1] صحيح البخاري، العمل في الصلاة، حديث: 1210. [2] صحيح مسلم، المساجد، حديث: 1211(542). [3] مسند أحمد: 413/1. [4] عمدة القاري: 510/3.

(٧٦) بَابُ الْاِغْتِسَالِ إِذَا أَسْلَمَ، وَرَبْطِ الْأَسِيرِ أَيْضًا فِي الْمَسْجِدِ

باب: 76- کافر جب مسلمان ہو جائے تو اس کے غسل کرنے، نیز قیدی کو مسجد میں مقید کرنے کا بیان

وَكَانَ شُرَيْحٌ يَأْمُرُ الْغَرِيمَ أَنْ يُحْبَسَ إِلٰى سَارِيَةِ الْمَسْجِدِ.

قاضی شریح، قرض دار کے متعلق حکم دیتے تھے کہ اسے مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا جائے۔

وضاحت: اس عنوان کے دو جز ہیں: * اسلام لانے کے وقت غسل کرنا۔ * مسجد میں قیدی کو قید کرنا۔ ان میں سے پہلے جز کا ابواب مسجد سے کوئی تعلق نہیں اور دوسرا جز مکرر ہے کیونکہ اس سے پہلے باب میں اسے بیان کر دیا گیا ہے۔ ایسا کرنا امام بخاری رحمہ اللہ کی عادت کے خلاف ہے۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں کہ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں کوئی عنوان قائم ہی نہیں کیا، چنانچہ بخاری کے متعدد نسخوں میں عنوان کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ یہاں بیاض تھی۔ اس بیاض کو بعض لوگوں نے اپنی رائے سے پر کر دیا جیسا کہ علامہ اسماعیلی نے اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''مشرک کا مسجد میں داخل ہونا'' نیز بَابُ الْاِغْتِسَالِ إِذَا أَسْلَمَ کا تعلق ابواب مساجد سے جوڑنے کے لیے بھی تکلف سے کام لیا جائے گا کہ مشرک اگرچہ نجس اور ناپاک ہے اور اسلام لاتے وقت غسل کی تاکید اسی نجاست کی وجہ سے کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود کسی مصلحت کے پیش نظر اسے مسجد میں قیدی بنا کر رکھنا جائز اور درست ہے۔[1] لیکن ہمارے نزدیک امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں بیاض نہیں چھوڑی تھی بلکہ انھوں نے پہلے ربط الأسیر کا عنوان قائم کر کے جو روایت پیش کی تھی اس میں قیدی کو باندھنے کا صرف ارادہ ہی کیا تھا، عملی طور پر اسے باندھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے تحت ایک ایسی روایت پیش کی ہے جو قیدی کو مسجد میں باندھنے کے عنوان کو ثابت کرنے کے لیے نص صریح کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر اس روایت سے ایک نیا مسئلہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ غیر مسلم اگر اسلام قبول کرے تو اسے غسل بھی کرنا چاہیے، تو اسے بھی افادے کے طور پر بیان کر دیا۔ دراصل اس طرح کے عنوانات تنبیہ کے طور پر ہوتے ہیں کہ مذکورہ روایت عنوان سابق کے مضمون کے علاوہ دوسرے فوائد پر بھی مشتمل ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس طرح کے ابواب کو ''باب فی الباب'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی یہ باب پہلے باب کا ایک حصہ اور اس کا نتیجہ ہے اور اس باب سے ایک اور شاخ پھوٹ نکلی ہے۔ واللہ أعلم. قاضی شریح کے حکم کے مطابق قرض دار کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ یہ سزا برخاستگی عدالت تک کے لیے ہوتی۔ اگر اتنے عرصے میں وہ رقم کی ادائیگی کا بندوبست کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا بصورت دیگر اسے جیل میں بند کر دیا جاتا۔ مقصد یہ ہوتا کہ مسجد میں آنے جانے والوں کی کثرت ہوتی ہے، اس لیے اسے بہت شرمندگی اٹھانی پڑتی اور جلد از جلد رقم ادا کرنے کی کوئی صورت پیدا کر لیتا۔[2]

٤٦٢ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ: حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ أَبِي سَعِيدٍ؛ أَنَّهُ

[462] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے ایک گھڑ سوار دستہ نجد کی طرف روانہ

[1] فتح الباري: 719/1. [2] فتح الباري: 719/1.

سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ: بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْلًا قِبَلَ نَجْدٍ، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ مِّنْ بَنِي حَنِيفَةَ، يُقَالُ لَهُ: ثُمَامَةُ بْنُ أُثَالٍ، فَرَبَطُوهُ بِسَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ، فَخَرَجَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: «أَطْلِقُوا ثُمَامَةَ» فَانْطَلَقَ إِلَى نَخْلٍ قَرِيبٍ مِّنَ الْمَسْجِدِ فَاغْتَسَلَ، ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَقَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ. [انظر: ٤٦٩، ٢٤٢٢، ٢٤٢٣، ٤٣٧٢]

کیا۔ وہ بنوحنیفہ کے ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے جسے ثمامہ بن اُثال کہا جاتا تھا اور اسے انھوں نے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ پھر نبی ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''ثمامہ کو چھوڑ دو۔'' چنانچہ وہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے باغ میں گیا، وہاں غسل کیا، پھر مسجد میں آیا اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں، یعنی وہ مسلمان ہو گیا۔

فائدہ: ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ والی روایت کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ محرم 6 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی زیر سرکردگی تیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر مشتمل ایک دستہ علاقۂ نجد کی طرف روانہ فرمایا۔ انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مدینہ طیبہ کی طرف جارہے ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کا راستہ روک کر ان کے سردار ثمامہ بن اثال کو گرفتار کر لیا، پھر انھیں مدینہ منورہ لایا گیا اور مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ثمامہ سے پوچھا: ''اے ثمامہ! تیرا کیا خیال ہے؟'' وہ بولا: میرا خیال بہتر ہے۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو خون والے کو قتل کریں گے اور اگر آپ احسان کریں گے تو شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر آپ مال چاہیں تو جو آپ کہیں گے پیش کر دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ یہ جواب سن کر واپس ہو گئے۔ دوسرے دن پھر یہی سوال جواب ہوئے۔ تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو چھوڑ دیا جائے، چنانچہ اسے رہا کر دیا گیا۔ وہ فوراً مسجد کے قریب ایک باغ میں گیا، غسل کیا اور مسجد میں آ گیا، پھر کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پھر کہنے لگا: اے محمد (ﷺ)! اللہ کی قسم! مجھے تمام روئے زمین پر آپ سے زیادہ کسی سے دشمنی نہ تھی اور اب آپ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے آپ کے دین سے زیادہ کوئی دین برا معلوم نہ ہوتا تھا اور اب آپ کا دین مجھے سب سے زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اللہ کی قسم! میرے نزدیک آپ کے شہر سے برا کوئی شہر نہ تھا اور اب آپ کا شہر میرے نزدیک سب شہروں سے بڑھ کر پسندیدہ ہے۔ آپ کے سواروں نے جب مجھے گرفتار کیا تو میں عمرے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اب آپ اس کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے اسے مبارک باد دی اور اسے عمرے کا حکم دیا، چنانچہ وہ بغرض عمرہ مکہ مکرمہ چلا آیا تو کسی نے اس سے کہا کہ تو بے دین ہو گیا ہے؟ وہ بولا نہیں بلکہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ایمان لا کر مسلمان ہو گیا ہوں۔ اب تمھارے دین کی طرف رجوع نہیں کروں گا۔ اللہ کی قسم! اب تمھارے پاس یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی نہیں آئے گا، ہاں! اگر رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت فرما دیں گے تو الگ بات ہے۔[1] اس تفصیلی روایت سے امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ عنوان کے دونوں جز ثابت ہو گئے کہ کسی غیر مسلم کو مسجد میں محبوس کیا جا سکتا ہے اور اسلام لانے سے قبل غسل کرنے کا مسئلہ بھی ثابت ہو گیا۔

---

[1] صحيح البخاري، المغازي، حديث :4372.

(٧٧) بَابُ الْخَيْمَةِ فِي الْمَسْجِدِ لِلْمَرْضَى وَغَيْرِهِمْ

باب: 77- مسجد میں بیماروں اور دیگر ضرورت مندوں کے لیے خیمہ لگانا

٤٦٣ - حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيَى قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: أُصِيبَ سَعْدٌ يَوْمَ الْخَنْدَقِ فِي الْأَكْحَلِ، فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْمَةً فِي الْمَسْجِدِ لِيَعُودَهُ مِنْ قَرِيبٍ، فَلَمْ يَرُعْهُمْ - وَفِي الْمَسْجِدِ خَيْمَةٌ مِّنْ بَنِي غِفَارٍ - إِلَّا الدَّمُ يَسِيلُ إِلَيْهِمْ، فَقَالُوا: يَا أَهْلَ الْخَيْمَةِ! مَا هٰذَا الَّذِي يَأْتِينَا مِنْ قِبَلِكُمْ؟ فَإِذَا سَعْدٌ يَغْذُو جُرْحُهُ دَمًا، فَمَاتَ فِيهَا. [انظر: ٢٨١٣، ٣٩٠١، ٤١١٧، ٤١٢٢]

[463] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: جنگ خندق کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ ؓ کے ہاتھ کی رگ (ہفت اندام) میں تیر لگ گیا تو نبی ﷺ نے ان کے لیے مسجد میں ایک خیمہ لگا دیا تاکہ نزدیک سے ان کی عیادت کر لیا کریں اور مسجد میں بنو غفار کا خیمہ بھی تھا۔ پھر اچانک ان کی طرف خون بہہ کر آنے لگا تو لوگ اس سے خوفزدہ ہوئے، کہنے لگے: اے خیمے والو! یہ کیا ہے جو تمھاری طرف سے ہمارے پاس آ رہا ہے؟ دیکھا تو حضرت سعد ؓ کے زخم سے خون بہہ رہا تھا، چنانچہ وہ اسی زخم سے فوت ہو گئے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ احکام مسجد کے متعلق بہت توسع کا مسلک رکھتے ہیں۔ مذکورہ حدیث سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں زخمیوں، بیماروں اور دیگر ضرورت مندوں کے لیے خیمہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی ضرورت کے لیے مسجد کی خالی جگہ مناسب ہے۔ قائم کردہ عنوان کے دو اجزاء ہیں: * بیماروں کے لیے خیمہ * دیگر ضروریات کے لیے خیمہ۔ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کے لیے مسجد میں خیمہ لگانے کا حکم دیا تھا، نیز مسجد میں ایک دوسرا خیمہ بھی لگا ہوا تھا جس میں بنو غفار قبیلے سے تعلق رکھنے والی رفیدہ نامی ایک صحابیہ اپنے متعلقین کے ساتھ مقیم تھیں۔ اس سے عنوان کے دونوں جز ثابت ہو گئے۔ واضح رہے کہ حضرت سعد بن معاذ ؓ کا خیمہ مسجد نبوی میں لگایا گیا تھا کیونکہ بنو قریظہ نے جب حضرت سعد کو حکم بنانا منظور کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد ؓ کو بلانے کے لیے بھیجا، چنانچہ وہ گدھے پر سوار ہو کر تشریف لائے۔ جب ان کی سواری مسجد کے قریب آئی تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا: ''اپنے سردار کا استقبال کرو۔''[1] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد حضرت سعد ؓ کا قیام بنو قریظہ کے کسی محلے میں نہیں تھا بلکہ انھیں کہیں دور سے سواری پر آنا پڑا۔ یہ سب قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حضرت سعد ؓ کا خیمہ مسجد نبوی میں تھا۔ ② جب حضرت سعد بن معاذ ؓ کے زخم کا خون بند نہیں ہو رہا تھا تو انھوں نے اپنے رب کے حضور بایں الفاظ دعا فرمائی: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ مجھے اس قوم (مشرکین) سے جہاد کرنا سب سے زیادہ محبوب ہے جنھوں نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور انھیں وطن سے نکال دیا۔

1 صحيح البخاري، المغازي، حديث :4121.

اے اللہ! میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اب تو نے ہمارے اور ان مشرکین کے درمیان جنگ کو ختم کر دیا ہے، اگر قریش کی جنگ میں سے کوئی حصہ باقی ہو تو مجھے زندہ رکھ تاکہ میں ان سے تیری خاطر جہاد کروں اور اگر جنگ ختم ہوگئی ہے تو میرے زخم کا منہ کھول دے اور اسی سبب سے میری موت مقدر فرما دے۔"[1] اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا، چنانچہ وہ غزوۂ بنو قریظہ میں فیصلے کے وقت تک زندہ رہے، اس کے بعد اکحل کا وہ زخم کھل گیا جو وقتی طور پر بند ہوگیا تھا اور اسی زخم کے سبب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شہادت کی موت کا شرف میسر آیا۔ اس سے متعلقہ دیگر تفصیلات کتاب المغازی اور کتاب المناقب میں بیان ہوں گی۔ بإذن الله تعالىٰ.

(٧٨) بَابُ إِدْخَالِ الْبَعِيرِ فِي الْمَسْجِدِ لِلْعِلَّةِ

باب: 78 - ضرورت کے وقت اونٹ کو مسجد میں لانا

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: طَافَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى بَعِيرٍ.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نبی ﷺ نے اونٹ پر بیٹھ کر طواف کیا۔

وضاحت: اگر کوئی ضرورت یا مجبوری ہو تو اونٹ کو مسجد میں لایا جا سکتا ہے جبکہ مسجد کے گندا ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے لفظ علت استعمال فرمایا ہے، یعنی بیماری کی صورت ہو یا کوئی اور مجبوری ہو، مثلاً: اترنے کا موقع نہیں یا بیماری کی وجہ سے پیدل چلنا ممکن نہیں اور مسجد میں داخل ہونا بھی ضروری ہے، ایسی صورتوں میں سوار اپنی سواری سمیت مسجد میں آ سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے موصولاً بھی بیان فرمایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر طواف کیا۔[2] ابوداود کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ معظمہ آئے تو طبیعت ناساز تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوار ہو کر طواف کرنے کی وجہ بیماری تھی۔[3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سوار ہو کر طواف کرنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ لوگوں کو نظر آتے رہیں تاکہ ضرورت مند مسئلہ دریافت کرنے کے لیے فوری طور پر آپ کی طرف رجوع کر سکیں۔[4]

٤٦٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ نَوْفَلٍ، عَنْ عُرْوَةَ، عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أَبِي سَلَمَةَ، عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: شَكَوْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنِّي أَشْتَكِي، قَالَ: «طُوفِي مِنْ وَرَاءِ النَّاسِ وَأَنْتِ رَاكِبَةٌ» فَطُفْتُ وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي إِلَى جَنْبِ

[464] حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیماری کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا: "تو لوگوں کے پیچھے پیچھے سواری پر بیٹھ کر طواف کر لے۔" چنانچہ میں نے اسی طرح طواف کیا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے پہلو میں کھڑے نماز میں سورۂ "والطور" تلاوت فرما رہے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4122. [2] صحيح البخاري، الحج، حديث: 1607. [3] سنن أبي داود، المناسك، حديث: 1881. [4] فتح الباري: 721/1.

الْبَيْتِ، يَقْرَأُ بِالطُّورِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ. [انظر: ١٦١٩، ١٦٢٦، ١٦٣٣، ٤٨٥٣]

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد واضح ہے کہ اگر کسی ضرورت کی وجہ سے سواری کو مسجد میں لانا پڑے تو اس میں چنداں حرج نہیں ہے، اگرچہ عہد رسالت میں خانۂ کعبہ کے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں تھی، مسلمان کھلی زمین میں بیت اللہ کے چاروں طرف نمازیں پڑھا کرتے تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب تنگی محسوس کی تو توسیع فرما کر چاروں طرف دیواریں تعمیر کرا دیں۔[1] تاہم ہر طرف مکانات اور آبادی کی وجہ سے خانۂ کعبہ کے چاروں طرف مسجد حرام کی حدود متعین تھیں۔ بہرحال امام بخاری رحمہ اللہ کا مدعا ثابت ہے کہ مجبوری کی صورت میں سواری کو مسجد میں لایا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو آپ کی اجازت سے معلوم ہوتا ہے۔ ② شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے رسول اللہ ﷺ کے سواری پر طواف کرنے کی ایک توجیہ شرح تراجم بخاری میں لکھی ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا طواف کی حالت میں اونٹ پر سوار رہنا عمرۃ القضا کا واقعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین کی شرارت اور چالاکی کا خطرہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے سوار رہنے کی وجہ سے وہ آپ پر قابو نہ پا سکے۔"

(٧٩) بَابٌ:

باب: 79- بلاعنوان

٤٦٥ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ: حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ هِشَامٍ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ قَتَادَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا أَنَسٌ أَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ خَرَجَا مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ فِي لَيْلَةٍ مُّظْلِمَةٍ، وَمَعَهُمَا مِثْلُ الْمِصْبَاحَيْنِ يُضِيئَانِ بَيْنَ أَيْدِيهِمَا، فَلَمَّا افْتَرَقَا صَارَ مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا وَاحِدٌ، حَتّٰى أَتٰى أَهْلَهُ. [انظر: ٣٦٣٩، ٣٨٠٥]

[465] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے دو صحابہ آپ کے پاس سے اندھیری رات میں نکلے۔ ان دونوں کے ساتھ منور چراغ کی طرح کوئی چیز تھی جو ان کے سامنے روشنی دے رہی تھی۔ جب وہ دونوں علیحدہ ہو گئے تو ہر ایک کے ساتھ اسی طرح کا ایک چراغ ہو گیا حتی کہ وہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

فوائد ومسائل: ① صحیح بخاری کی ایک روایت میں وضاحت ہے کہ وہ دونوں اسید بن حضیر اور عباد بن بشر تھے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مقام پر بلاعنوان باب قائم کیا ہے اور علامہ ابن رشید کی یہ بات بھی یہاں نہیں چل سکتی کہ امام بخاری کا باب بلاعنوان باب سابق کی فصل ہوا کرتا ہے کیونکہ پہلے باب کے ساتھ اس حدیث کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ البتہ ابواب مساجد کے ساتھ اس قدر تعلق ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں صحابی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دیر تک انتظار صلاۃ کے لیے مسجد میں رکے رہے۔ چونکہ رات اندھیری تھی اور ان کے پاس روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا، واپسی پر انھیں پریشانی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو اپنی

1 صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث :3830. ② صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث :3805.

طرف سے روشنی مہیا کرنے کا اعزاز بخشا۔ اس بنا پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا جا سکتا ہے: ''اندھیری رات میں مسجد کی طرف آنے کی فضیلت'' اور اس حدیث سے اس عنوان کی تائید ہوتی ہے کہ جو لوگ اندھیرے میں نماز کے لیے مسجدوں کی طرف آئیں، انھیں قیامت کے دن نور تام ملنے کی بشارت دے دیں جیسا کہ ابوداود میں ہے۔[1] ان دو صحابہ کو دنیا میں روشنی ملی اور قیامت کے دن اس سے کہیں زیادہ نور نصیب ہو گا۔[2] ② علامہ عینی کو حسب عادت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توجیہ سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذکورہ حدیث اس عنوان پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ حدیث کے مطابق یہ دونوں حضرات اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس ہوئے ہیں۔ اس میں مسجد کی طرف جانے کا سرے سے کوئی تذکرہ نہیں۔ میرے نزدیک اچھی توجیہ یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں تھے اور نماز عشاء کے منتظر تھے اور جو کرامت انھیں حاصل ہوئی اس میں مسجد کا بھی دخل ہے، اس لیے ابواب مساجد سے ربط قائم کیا جا سکتا ہے، لہٰذا اس حیثیت سے مذکورہ حدیث کو یہاں لانا مناسب ٹھہرا۔[3] ③ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مذکورہ حدیث کا ابواب مساجد سے ایک اور ربط قائم کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دونوں صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دیر تک مسجد میں رہے۔ گویا مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ محو گفتگو رہے، اس لیے مذکورہ حدیث سے ایک نیا مضمون مستنبط ہوتا ہے کہ مسجد میں بات چیت اور گفتگو کرنے کی اجازت ہے۔[4] بہر حال مذکورہ حدیث کے مطابق جماعت میں شرکت اللہ کے ہاں ایک محبوب امر ہے۔ جو لوگ تاریکیوں سے بے پروا ہو کر جماعت کا اہتمام کریں گے تو قیامت کے دن یہ تاریکی نور تام سے بدل جائے گی، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء کی کرامتیں برحق ہیں لیکن ان کا ظہور اللہ کے اذن پر موقوف ہے۔ واللہ أعلم.

(٨٠) بَابُ الْخَوْخَةِ وَالْمَمَرِّ فِي الْمَسْجِدِ

باب: 80- مسجد میں کھڑکی رکھنا اور اس میں گزرگاہ بنانا

٤٦٦ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ: حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو النَّضْرِ عَنْ عُبَيْدِ بْنِ حُنَيْنٍ، عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيدٍ، عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: خَطَبَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ: «إِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللهِ» فَبَكَى أَبُو بَكْرٍ رَّضِيَ اللهُ عَنْهُ، فَقُلْتُ فِي نَفْسِي: مَا يُبْكِي هٰذَا الشَّيْخَ؟ إِنْ يَكُنِ اللهُ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللهِ، فَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ هُوَ

[466] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہے یا جو اللہ کے پاس ہے اسے اختیار کرے۔ تو اس نے وہ پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے۔'' یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: یہ بوڑھا کس لیے روتا ہے؟ بات تو صرف یہ ہے کہ اللہ نے اپنے ایک بندے کو دنیا یا آخرت دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرنے کا اختیار دیا ہے اور اس نے

① سنن أبي داود، الصلاة حديث: 561. ② فتح الباري: 722/1. ③ عمدة القاري: 521/3. ④ شرح تراجم بخاري.

الْعَبْدَ، وَكَانَ أَبُوبَكْرٍ أَعْلَمَنَا، فَقَالَ: «يَا أَبَابَكْرٍ! لَاتَبْكِ، إِنَّ أَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحْبَتِهِ وَمَالِهِ أَبُو بَكْرٍ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا مِّنْ أُمَّتِي لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ، وَلٰكِنْ أُخُوَّةُ الْإِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهُ، لَا يَبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ إِلَّا سُدَّ إِلَّا بَابُ أَبِي بَكْرٍ». [انظر: ٣٦٥٤، ٣٩٠٤]

آخرت کو پسند کیا ہے۔ (تو اس میں رونے کی کیا بات ہے)؟ مگر بعد میں یہ راز کھلا کہ بندے سے مراد خود رسول اللہ ﷺ تھے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر تم مت روؤ، میں لوگوں میں سے کسی کے مال اور صحبت کا اتنا زیر بار نہیں جتنا ابوبکر کا ہوں۔ اگر میں اپنی امت سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن اسلامی اخوت ومحبت ضرور ہے۔ دیکھو! مسجد میں ابوبکر کے دروازے کے سوا سب کے دروازے بند کر دیے جائیں۔''

٤٦٧ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا وَهْبُ بْنُ جَرِيرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي قَالَ: سَمِعْتُ يَعْلَى بْنَ حَكِيمٍ عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي مَرَضِهِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ عَاصِبًا رَأْسَهُ بِخِرْقَةٍ، فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «إِنَّهُ لَيْسَ مِنَ النَّاسِ أَحَدٌ أَمَنَّ عَلَيَّ فِي نَفْسِهِ وَمَالِهِ مِنْ أَبِي بَكْرِ بْنِ أَبِي قُحَافَةَ، وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِّنَ النَّاسِ خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا، وَلٰكِنْ خُلَّةُ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ، سُدُّوا عَنِّي كُلَّ خَوْخَةٍ فِي هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرَ خَوْخَةِ أَبِي بَكْرٍ». [انظر: ٣٦٥٦، ٣٦٥٧، ٦٧٣٨]

[467] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ اپنے مرض وفات میں ایک پٹی سے اپنے سر کو باندھے ہوئے باہر تشریف لائے اور منبر پر فروکش ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: ''اپنی جان اور مال کو مجھ پر ابوبکر سے زیادہ اور کوئی خرچ کرنے والا نہیں ہے۔ اور میں لوگوں میں سے اگر کوئی دلی دوست بناتا تو یقیناً ابوبکر کو بناتا لیکن اسلامی دوستی سب سے بڑھ کر ہے۔ (دیکھو!) میری طرف سے ہر وہ کھڑکی جو اس مسجد میں کھلتی ہے بند کر دو، صرف ابوبکر کی کھڑکی رہنے دو۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مسجد سے متصل مکان کی کھڑکی مسجد کی طرف کھول دی جائے تاکہ مسجد میں آنے جانے کی سہولت ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ مذکورہ روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم وفضل کے لیے یہ خصوصی اجازت ہے کہ وہ مسجد میں حاضری کی سہولت کے پیش نظر مکان کے عقبی جانب کوئی کھڑکی وغیرہ لگا لیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مکان مسجد سے متصل تھا اور اس کا اصل دروازہ مغربی جانب تھا لیکن اس کے عقبی جانب مسجد نبوی میں آنے کے لیے ایک کھڑکی تھی جس سے بوقت ضرورت مسجد میں آتے جاتے تھے۔ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے اپنے مکانات سے مسجد نبوی کی جانب کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ نبی ﷺ نے مرض وفات میں اللہ کے حکم سے ان تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کر

دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔ ② اس حدیث میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف بھی اشارہ تھا کہ انھیں خلافت کے زمانے میں نماز پڑھانے کے لیے آنے جانے میں سہولت رہے گی، چنانچہ ابن حبان نے اس روایت کی بایں الفاظ تشریح کی ہے: یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ آپ نے یہ کہہ کر کہ مسجد میں سے ابوبکر کے علاوہ تمام صحابہ کی کھڑکیاں بند کر دی جائیں، تمام لوگوں کی خلافت سے متعلق دلچسپی کو یکسر ختم کر دیا۔[1] حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: طبع سلیم رکھنے والوں کے لیے اس روایت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق بالکل واضح استدلال ہے۔ متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی تو آپ نے اسے دوبارہ آنے کے متعلق فرمایا۔ اس نے عرض کیا: اگر میں دوبارہ آؤں اور آپ دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں تو کس کے پاس جاؤں؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تم مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس چلے آنا۔''[2] ③ مسجد نبوی کی طرف دروازہ باقی رکھنے کی فضیلت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی منقول ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجد کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں لیکن حضرت علی کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔''[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کا دروازہ مسجد نبوی میں کھلتا تھا۔ امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ روافض نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے معارضے کے لیے اس روایت کو وضع کیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت پر کلام کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت سے متعلق یہ روایت متعدد طرق سے ثابت ہے اور کچھ روایات درجۂ حسن کی ہیں، اس لیے اسے موضوع قرار دینا درست نہیں، البتہ ان کے مابین تعارض کو اس طرح ختم کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک وقت کی بات نہیں، دو بار الگ الگ اوقات میں دروازے بند کرنے کے واقعات پیش آئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازے کا کھلا رہنا بہت پہلے کی بات ہے اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے گھر کا دروازہ ہی ایک تھا اور وہ مسجد میں کھلتا تھا، اس مجبوری کے پیش نظر جب پہلی بار دروازے بند کرائے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھلا رہا، دیگر دروازے بند کر دیے گئے، لیکن مسجد نبوی میں آتے وقت فاصلہ کم کرنے کے لیے کھڑکیاں باقی رکھی گئیں۔ پھر جب آپ وفات سے چند یوم پہلے مسجد میں تشریف لائے تو ان تمام کھڑکیوں کو بھی بند کر دیا گیا، صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کو کھلا رہنے کی اجازت دی گئی تاکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد نماز پڑھانے کی خدمت بجا لانے میں سہولت رہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق بھی واضح ہدایت ہو جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس تطبیق کو ابوبکر کلاباذی اور امام طحاوی کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے۔[4] ④ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آپ کے مرض وفات میں پیش آیا، چنانچہ آپ کی وفات سے چار دن پہلے جو جمعرات تھی اس کی صبح کو واقعۂ قرطاس پیش آیا کہ آپ کچھ تحریر کرانا چاہتے تھے لیکن لوگوں کے باہمی اختلاف اور شور و شغب کی وجہ سے آپ نے فرمایا: ''تم سب لوگ میرے پاس سے اٹھ جاؤ، پیغمبر کے سامنے باہمی اختلاف اور شور و شغب درست نہیں۔'' اس کے بعد آپ نے آرام فرمایا، پھر ظہر کے وقت جب

---

① فتح الباري: 19/7. ② صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3659. ③ مسند أحمد: 331/1. ④ فتح الباري: 20/7.

بیماری میں کچھ کمی محسوس ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ پانی کی سات مشکیں میرے سر پر ڈالو شاید کچھ سکون ہو اور بعض لوگوں کو کچھ وصیت کر سکوں۔ حکم کی تعمیل کی گئی تو قدرے سکون ہوا۔ پھر آپ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے، ظہر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد منبر پر فروکش ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ آپ کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔ واقعۂ قرطاس صبح کو پیش آیا اور اسی دن ظہر کے بعد آپ نے خطبہ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خطبے میں وہی مضمون تھا جو آپ تحریر فرمانا چاہتے تھے۔ (5) خلت سے مراد وہ تعلق ہے جو صرف اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایسے الفاظ استعمال فرمائے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر اور آپ کے درمیان یہ تعلق ممکن ہی نہیں۔ البتہ اسلامی اخوت اور دینی محبت کا اعلیٰ سے اعلیٰ جو درجہ ہو سکتا ہے وہ ابوبکر صدیق اور آپ کے درمیان قائم ہے، ان کے برابر نہ کسی کی مودت ہے اور نہ اخوت۔ ان الفاظ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جو منقبت بیان ہوئی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ پوری امت میں ان کے درجے کا کوئی نہیں ہے...... رضی اللہ عنہ...... واضح رہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مکان مسجد نبوی سے متصل اور باب السلام اور باب الرحمۃ کے درمیان واقع تھا، پھر آپ نے اس مکان کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت پر صرف کر دی لیکن اس کے بعد بھی وہ مکان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور رہا۔ اب وہاں مسجد نبوی کا ایک مستقل دروازہ "باب ابی بکر" کے نام سے تعمیر کر دیا گیا ہے اور اس کھڑکی کی جگہ هذه خوخة أبي بكر لکھ دیا گیا ہے۔

نوٹ: ان دونوں احادیث کے بقیہ فوائد "کتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ" میں تحریر کیے جائیں گے۔ بإذن الله تعالىٰ.

(٨١) بَابُ الْأَبْوَابِ وَالْغَلَقِ لِلْكَعْبَةِ وَالْمَسَاجِدِ

باب: 81- خانۂ کعبہ اور دیگر مساجد کے لیے دروازے بنانا اور چٹخنی لگانا

قَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ: وَقَالَ لِي عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ: قَالَ لِيَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ: يَا عَبْدَ الْمَلِكِ! لَوْ رَأَيْتَ مَسَاجِدَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَّأَبْوَابَهَا.

ابن جریج کا بیان ہے کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا: اے عبدالملک! اگر تم ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تعمیر کردہ مساجد اور ان کے دروازوں کو دیکھتے (تو تعجب کرتے)۔

وضاحت: ارشاد باری تعالیٰ ہے: "اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس بات سے منع کرے کہ وہاں اللہ کا نام لیا جائے۔"[1] اس آیت کا تقاضا ہے کہ مساجد کو ہمہ وقت کھلا رہنا چاہیے، جبکہ انتظامی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ نمازوں کے علاوہ دیگر اوقات میں انھیں بند کر دیا جائے، بصورت دیگر مسجد کا سامان محفوظ نہیں رہے گا اور نہ اس کی حرمت ہی باقی رہے گی کیونکہ کھلے دروازے سے انسان اور غیر انسان سب داخل ہو سکیں گے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں ثابت کیا ہے کہ مسجدوں میں دروازہ لگانا اور نمازوں کے علاوہ دیگر اوقات میں انھیں بند کر دینا دونوں جائز ہیں۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ

1 البقرة 2:114.

نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل پیش کیا ہے کہ انھوں نے جو مساجد بنوائی تھیں ان میں دروازے تھے۔ جب دروازے لگے تھے تو انھیں بوقت ضرورت بند بھی کیا جاتا ہوگا ورنہ ان کے لگانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

٤٦٨ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ وَقُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَا: حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدِمَ مَكَّةَ فَدَعَا عُثْمَانَ بْنَ طَلْحَةَ، فَفَتَحَ الْبَابَ، فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ وَبِلَالٌ، وَأُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ، وَعُثْمَانُ ابْنُ طَلْحَةَ، ثُمَّ أُغْلِقَ الْبَابُ، فَلَبِثَ فِيهِ سَاعَةً، ثُمَّ خَرَجُوا. قَالَ ابْنُ عُمَرَ: فَبَدَرْتُ فَسَأَلْتُ بِلَالًا، فَقَالَ: صَلَّى فِيهِ، فَقُلْتُ: فِي أَيٍّ؟ قَالَ: بَيْنَ الْأُسْطُوَانَتَيْنِ. قَالَ ابْنُ عُمَرَ: فَذَهَبَ عَلَيَّ أَنْ أَسْأَلَهُ كَمْ صَلَّى. [راجع: ٣٩٧]

[468] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ مکہ تشریف لائے تو آپ نے (چابی بردار) حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ انھوں نے بیت اللہ کا دروازہ کھولا۔ پھر نبی ﷺ، حضرت بلال، اسامہ بن زید اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم اندر گئے۔ بعد ازیں دروازہ بند کر لیا گیا۔ آپ وہاں تھوڑی دیر رہے، پھر سب باہر نکلے۔ خود ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میں جلد اٹھا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے جا کر پوچھا تو انھوں نے بتایا: آپ ﷺ نے کعبے کے اندر نماز پڑھی ہے۔ میں نے پوچھا: کس مقام پر؟ تو انھوں نے کہا: دونوں ستونوں کے درمیان۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: یہ بات پوچھنے سے رہ گئی کہ آپ نے کتنی رکعات پڑھی تھیں؟

فوائد ومسائل: ① فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ نے کعبے کے چابی بردار حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو بلایا، ان سے چابی طلب کی اور خانۂ کعبہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی۔ ہجوم کے پیش نظر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے قائم کردہ باب کے دو اجزاء ثابت ہو گئے کہ خانہ کعبہ میں دروازہ بھی تھا اور اسے بوقت ضرورت بند بھی کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ دور جاہلیت میں قریش کے دس خاندانوں کے درمیان عزت وشرافت کے کام تقسیم تھے جن میں پانی پلانے کی خدمت بنو ہاشم سے متعلق تھی اور بنو عبدالدار کے پاس خانۂ کعبہ کی چابی تھی اور اس کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ حضرت عثمان بن طلحہ بھی عبدالدار کی اولاد سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے چابی طلب کی تو انھوں نے اسے پیش کر دیا، خطبہ دیتے وقت چابی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ چابی ہمیں دی جائے تاکہ سقایۂ زمزم کے ساتھ کلید برداری کا شرف بھی حاصل ہو جائے لیکن آپ نے حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور فرمایا: ''اے آل ابی طلحہ! یہ چابی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمھارے پاس رہے گی۔ ظالم اور غاصب کے علاوہ اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔''[1] ② اس روایت میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بات نسیان کا شکار ہو گئی کہ آپ نے کتنی رکعات پڑھی تھیں؟ جبکہ حدیث نمبر: 397 میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ کو بتایا تھا کہ نبی ﷺ نے دو رکعت پڑھی تھیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے درمیان تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اشارے سے بتایا تھا، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نطق سے وضاحت کرنا بھول گئے تھے۔[2] واللہ أعلم.

① المعجم الكبير للطبراني: 120/11، فيه عبدالله بن مؤمل، قال ابن حجر: ضعيف الحديث. ② فتح الباري: 648/1.

(٨٢) بَابُ دُخُولِ الْمُشْرِكِ الْمَسْجِدَ

باب:82- مسجد میں مشرک کا داخل ہونا

وضاحت: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ ''مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا سال رواں کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب بھی نہ آنے پائیں۔''[1] اس آیت کا تقاضا ہے کہ مشرکین کو مساجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے مسلک میں بہت توسع ہے۔ ان کے نزدیک مشرکین کی نجاست ظاہری نہیں بلکہ اس سے اعتقاد کی خرابی اور خبث باطن مراد ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ بیت اللہ کا طواف یا حج وغیرہ نہیں کر سکیں گے۔ مطلق مسجد میں داخلے پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ حرم میں مشرکین کا کسی وقت بھی داخلہ جائز نہیں، لہٰذا حدود حرم کی تمام مساجد میں بھی داخلہ جائز نہیں ہوگا اور حکومت سعودیہ کا عمل بھی اسی پر ہے۔ یہ مسلک قرآن کریم کی نص کے زیادہ مناسب ہے۔

٤٦٩ - حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ؛ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُولُ: بَعَثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ خَيْلًا قِبَلَ نَجْدٍ، فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ مِّنْ بَنِي حَنِيفَةَ، يُقَالُ لَهُ: ثُمَامَةُ ابْنُ أُثَالٍ، فَرَبَطُوهُ بِسَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ. [راجع: ٤٦٢]

[469] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے چند سواروں کو نجد کی طرف روانہ فرمایا، وہ لوگ بنو حنیفہ کے ایک شخص ثمامہ بن اُثال کو پکڑ لائے اور مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔

فوائد ومسائل: ① یہ حدیث پہلے (462) گزر چکی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس سے مشرک کے مسجد میں داخل ہونے کا جواز ثابت کر رہے ہیں کہ ثمامہ بن اثال کو بحالت شرک مسجد میں ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور تین دن تک وہ مسجد میں محبوس رہے۔ اس سے مسجد میں مشرک کا قیام ثابت ہوا، جس میں دخول کا جواز بدرجۂ اَولیٰ ثابت ہوا۔ بعض اہل علم نے کہا کہ یہ عنوان مکرر ہے کیونکہ اس سے پہلے قیدی کو مسجد میں باندھنے کا مسئلہ آیا تھا جو دخول کو لازم ہے، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مذکورہ عنوان میں عمومیت ہے، یعنی اس میں مطلق داخل ہونے کا بیان ہے، قطع نظر اس کے کہ اسے باندھا جائے یا آزاد چھوڑا جائے، نیز باب سابق میں قیدی کے متعلق عموم ہے، کہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔[2] بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ہے کہ بوقت ضرورت کفار ومشرکین کو بھی آداب مساجد کی شرائط کے ساتھ مسجدوں میں داخلے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ واللہ أعلم.
② ابن بطال نے لکھا ہے کہ جب مشرکین مکہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مدینہ منورہ آئے تو انھوں نے مسجد نبوی ہی میں قیام کیا کیونکہ ان میں جبیر بن مطعم بھی تھے جو رسول اللہ ﷺ کی دوران جماعت میں سنی ہوئی قراءت کو بعد میں بیان کرتے تھے کہ آپ نے مغرب کی نماز میں سورۂ والطّور پڑھی تھی اور حضرت جبیر بن مطعم اس وقت مشرک تھے، لہٰذا مشرک کسی ضرورت

1 التوبة 9:28. 2 فتح الباري: 1/724.

کے پیش نظر مسجد میں داخل ہوسکتا ہے۔[1]

(٨٣) بَابُ رَفْعِ الصَّوْتِ فِي الْمَسْجِدِ

باب:83-مسجد میں آواز کا اونچا کرنا

٤٧٠ - حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى ابْنُ سَعِيدٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الْجُعَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ: حَدَّثَنِي يَزِيدُ بْنُ خُصَيْفَةَ عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ: كُنْتُ قَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ، فَحَصَبَنِي رَجُلٌ، فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَقَالَ: اذْهَبْ فَأْتِنِي بِهٰذَيْنِ، فَجِئْتُهُ بِهِمَا، فَقَالَ: مَنْ أَنْتُمَا؟ أَوْ مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا؟ قَالَا: مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ، قَالَ: لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا، تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ.

[470] حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے، انھوں نے کہا: میں مسجد نبوی میں کھڑا تھا کہ کسی نے مجھے کنکری ماری۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا: جاؤ اور ان دونوں آدمیوں کو بلا کر لاؤ، چنانچہ میں انھیں بلا کر لایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا: تم کس قبیلے سے ہو یا کس جگہ کے رہنے والے ہو؟ انھوں نے بتایا: ہم طائف کے رہنے والے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم مدینہ منورہ کے باشندے ہوتے تو میں تمھیں ضرور سزا دیتا۔ تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں اپنی آوازوں کو اتنا بلند کر رہے ہو!

٤٧١ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي يُونُسُ بْنُ يَزِيدَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: حَدَّثَنِي عَبْدُ اللهِ بْنُ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ؛ أَنَّ كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ تَقَاضَى ابْنَ أَبِي حَدْرَدٍ دَيْنًا كَانَ لَهُ عَلَيْهِ، فِي عَهْدِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُوَ فِي بَيْتِهِ، فَخَرَجَ إِلَيْهِمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهِ، وَنَادٰى: «[يَا] كَعْبُ بْنَ مَالِكٍ!» قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللهِ! فَأَشَارَ بِيَدِهِ أَنْ ضَعِ الشَّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ، قَالَ كَعْبٌ: قَدْ فَعَلْتُ يَارَسُولَ اللهِ! قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «قُمْ فَاقْضِهِ». [راجع: ٤٥٧]

[471] حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں، مسجد نبوی میں ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ان دونوں کی آوازیں اس قدر بلند ہوئیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان آوازوں کو اپنے حجرے میں سنا۔ پھر آپ نے اپنے حجرے کا پردہ اٹھایا اور باہر تشریف لائے۔ بعدازاں آواز دی اور فرمایا: ''اے کعب!'' حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنے قرض سے آدھا چھوڑ دو۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے (ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہ سے) فرمایا: ''جاؤ اور ان کا قرض ادا کرو۔''

---

[1] شرح ابن بطال: 118/2.

فوائد و مسائل: ① مذکورہ احادیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سندھی لکھتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے دونوں روایات کو ذکر کر کے تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر آواز کا بلند کرنا بلاضرورت ہو تو جائز نہیں اور اگر کسی ضرورت کے پیش نظر ہو تو جائز ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان مطلق طور پر ممانعت کی طرف ہو کیونکہ جس روایت میں آواز بلند کرنے پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انکار نہ کرنے کی بات معلوم ہو رہی ہے اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے فوراً مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ جھگڑا ختم کر دیا جس کی وجہ سے مسجد میں آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس طرز عمل سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے عمل کے ذریعے سے، یعنی مسئلہ ختم کرنے کے لیے فوری مداخلت فرما کر مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت واضح فرما دی۔ (حاشیہ سندھی: (93/1) لیکن ہمارے نزدیک علامہ سندھی کا پہلا احتمال زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ امام بخاری کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے میں تفصیل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس میں امام بخاری کے ذوق کی رعایت بھی ہے کہ وہ دونوں روایات جمع کر کے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہو اور اعتدال قائم رہے تو اس کی اجازت ہے اور اگر ضرورت نہ ہو یا آواز حد اعتدال سے اونچی ہو جائے اور شور و غوغا کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کی اجازت نہیں۔ آپ نے اس عنوان کے تحت دو روایات ذکر کی ہیں اور دونوں سے متضاد باتیں سمجھ میں آتی ہیں: پہلی روایت سے ممانعت معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آواز بلند کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی اور دوسری روایت سے اباحت معلوم ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے آواز بلند کرنے والوں کو اس بات پر تنبیہ نہیں فرمائی، بلکہ جلد از جلد معاملے کا فیصلہ فرما کر بات ختم کر دی۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلے میں تفصیل کی طرف مائل ہیں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، امام بخاری کے عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ مسجد میں آواز بلند کرنے کی کراہت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عمل اہل تقویٰ کے شایان شان نہیں۔ ② پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے سزا دینے میں درگزر فرمایا کیونکہ انھیں اس مسئلے کا علم نہیں تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا: میں تمھیں کوڑے مارنے کی سزا دیتا کہ تم لوگ رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں بڑی بے باکی سے بلاضرورت شور و غل کر رہے ہو۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کو مرفوع حدیث کا درجہ حاصل ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوڑوں کی سزا دینے پر آمادہ تھے۔ اس قسم کی سزا کی دھمکی صرف ایسے امر کی مخالفت پر دی جا سکتی ہے جو توقیفی ہو۔[1] ③ دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرض خواہ، مقروض کو جس قدر رعایت دے سکتا ہو اس سے بخل نہیں کرنا چاہیے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسودہ حالی تک مہلت دو۔ اور اگر (راس المال) صدقہ کر دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھ سکو۔''[2] مگر مقروض کا بھی فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے پورا قرض ادا کر کے خود کو اس بوجھ سے آزاد کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی دانستہ ٹال مٹول کو ظلم قرار دیا ہے، اس کی وجہ سے اس کی بے عزتی بلکہ اسے سزا دی جا سکتی ہے۔

---

[1] فتح الباري: 726/1. [2] البقرة 2:280.

(٨٤) بَابُ الْحِلَقِ وَالْجُلُوسِ فِي الْمَسْجِدِ

باب:84-مسجد میں بیٹھنا اور حلقے بنانا

وضاحت: عنوان میں دو چیزیں ہیں: حلقہ بنانا اور بیٹھنا۔ یہ دونوں باتیں الگ الگ بھی ہوسکتی ہیں کہ بیٹھنے کا ثبوت صراحت کے ساتھ اور حلقہ بنا کر بیٹھنے کا ثبوت دلالت سے ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں باتیں الگ الگ نہ ہوں بلکہ ایک ہی مضمون ہو اور امام بخاری رحمہ اللہ صرف حلقہ بنا کر بیٹھنے کا جواز بیان کرنا چاہتے ہوں کیونکہ بعض روایات میں حلقہ بنا کر بیٹھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان کے درمیان تطبیق کی صورت بیان کریں گے جیسا کہ ہم آئندہ اس کی وضاحت کریں گے۔

٤٧٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ نَّافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ: مَا تَرَى فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ؟ قَالَ: «مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خَشِيَ الصُّبْحَ صَلّٰى وَاحِدَةً، فَأَوْتَرَتْ لَهُ مَا صَلّٰى» وَإِنَّهُ كَانَ يَقُولُ: «اِجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا» فَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَ بِهِ. [انظر: ٤٧٣، ٩٩٠، ٩٩٣، ٩٩٥، ١١٣٧].

[472] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ ایک دفعہ منبر پر تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا: رات کی نماز کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: ''دو دو رکعت پڑھو، پھر جب (کسی کو) صبح ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت اور پڑھ لے، وہ سابقہ ساری نماز کو وتر کر دے گی۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: رات کی نماز کے آخر میں وتر پڑھا کرو، نبی ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔

٤٧٣ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ أَيُّوبَ، عَنْ نَّافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ يَخْطُبُ فَقَالَ: كَيْفَ صَلَاةُ اللَّيْلِ؟ قَالَ: «مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خَشِيتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ، تُوتِرْ مَا قَدْ صَلَّيْتَ».

[473] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ (اس وقت) آپ خطبہ دے رہے تھے۔ اس نے عرض کیا: رات کی نماز کس طرح ادا کی جائے؟ آپ نے فرمایا: ''دو دو رکعت۔ پھر جب تمھیں طلوع فجر کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت وتر پڑھ لو۔ وہ تمھاری پڑھی ہوئی سابقہ نماز کو طاق عدد میں تبدیل کر دے گی۔''

قَالَ الْوَلِيدُ بْنُ كَثِيرٍ: حَدَّثَنِي عُبَيْدُ اللهِ بْنُ عَبْدِ اللهِ؛ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُمْ أَنَّ رَجُلًا نَادَى النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ. [راجع: ٤٧٢]

ولید بن کثیر اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کیا کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کو آواز دی جبکہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔

٤٧٤ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ

[474] حضرت ابو واقد لیثی سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ

أَبَا مُرَّةَ مَوْلَى عَقِيلِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي وَاقِدٍ اللَّيْثِيِّ قَالَ: بَيْنَمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ فَأَقْبَلَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ، فَأَقْبَلَ اثْنَانِ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَذَهَبَ وَاحِدٌ، فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأَى فُرْجَةً فَجَلَسَ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَدْبَرَ ذَاهِبًا، فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَلَا أُخْبِرُكُمْ عَنِ الثَّلَاثَةِ؟ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللهِ فَآوَاهُ اللهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحْيَا فَاسْتَحْيَا اللهُ مِنْهُ، وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ فَأَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ». [راجع: ٦٦]

تین آدمی آئے۔ ان میں سے دو تو رسول اللہ ﷺ کے پاس (مسجد میں) آ گئے اور ایک واپس چلا گیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے حلقے میں کچھ خالی جگہ دیکھی اور وہاں بیٹھ گیا اور دوسرا تمام لوگوں کے پیچھے جا بیٹھا۔ رہا تیسرا، تو وہ واپس چلا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہو گئے تو فرمایا: ''میں تمھیں ان تینوں آدمیوں کے متعلق نہ بتاؤں؟ ان میں سے ایک نے اللہ کے قریب جگہ تلاش کی تو اللہ نے اسے جگہ عطا کر دی۔ دوسرا انسان اللہ سے شرما گیا تو اللہ نے بھی اس سے شرم کی۔ رہا تیسرا تو اس نے (اللہ تعالیٰ) سے روگردانی کی تو اللہ نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔''

فوائد ومسائل: ① علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کے ذکر اور حصول علم کے لیے مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھنا جائز ہے۔ ان تینوں احادیث میں صحابۂ کرام ؓ کا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر مسجد ہو کر آپ کی مجلس سے استفادہ کرنا مذکور ہے۔ اسی طرح کسی عالم سے استفادہ چونکہ اس کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھنے ہی سے ہوا کرتا ہے، لہٰذا امام بخاری ؒ کا عنوان ثابت ہو گیا۔ چونکہ اس قسم کے استفادات مسجد نبوی میں واقع ہوتے تھے، اس لیے اس عنوان کا تعلق احکام مساجد سے بھی ہو گیا۔[1] ② بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مسجد میں حلقہ بنانے پر اظہار ناگواری فرمایا تھا۔ حضرت جابر بن سمرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو صحابۂ کرام ؓ اس وقت حلقے بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: ''کیا بات ہے میں تمھیں الگ الگ ٹکڑوں میں دیکھ رہا ہوں؟'' اس روایت کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے، لیکن امام بخاری ؒ کی پیش کردہ مذکورہ روایات سے مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھنے کا جواز ثابت ہے۔ اور جن روایات سے اظہار ناگواری معلوم ہوتا ہے وہ ایسے حلقے ہیں جو بے ضرورت اور بلا فائدہ ہوں، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے حلقوں کو انتشار پسندی کی علامت قرار دیا ہے۔ ایک حلقہ بنانے سے دلوں کا اتفاق اور ان کا متحد ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن حلقہ بنا کر بیٹھنے میں اگر کوئی مصلحت ہو، جیسے تعلیم کے لیے دائرے کی صورت میں بیٹھنا تو اس کی اجازت ہے۔[2] ③ پہلی دونوں احادیث سے مسجد میں بیٹھنے کا جواز ثابت ہے جن میں آپ کے خطبہ دینے کا ذکر ہے اور صحابۂ کرام ؓ کا بیٹھ کر سننا ثابت ہے اور تیسری روایت میں عنوان کے دوسرے جز، یعنی حلقہ بنا کر بیٹھنے کا ذکر ہے۔ پہلی اور دوسری روایت سے بھی امام بخاری ؒ کا مدعا بایں طور ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور صحابۂ کرام ؓ آپ کے ارشادات سننے کے لیے آپ کے چاروں طرف یا سامنے کی سمت میں دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ وہ ہر طرف سے آپ کی طرف اپنا رخ کیے ہوئے بیٹھے تھے۔ گویا بیٹھنے کا ثبوت تو صراحت کے ساتھ

---

1 شرح ابن بطال: 120/2. 2 فتح الباري: 728/1.

ہے اور حلقہ بنا کر بیٹھنے کا ثبوت دلالت سے نکلتا ہے۔ تیسری روایت میں تو حلقہ بنا کر بیٹھنے کی صراحت ہے کیونکہ آپ کے پاس تین شخص آئے، ایک واپس چلا گیا اور بقیہ دو آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے جن میں سے ایک نے دیکھا کہ آپ کے پاس حلقے میں گنجائش ہے تو وہ حلقے میں آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے کو حیا دامن گیر ہوئی تو وہ مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کے صحابۂ کرام ؓ دائرہ اور حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، نیز تعلیم وغیرہ کے لیے مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھنا بھی ثابت ہوا۔ وھو المقصود۔ ④ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز وتر ایک رکعت بھی پڑھی جا سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وتر ہر مسلمان پر حق ہے، لہٰذا جو شخص پانچ رکعات پڑھنا چاہے تو پانچ رکعات وتر پڑھے، جو تین پڑھنا چاہے تو وہ تین پڑھے اور جو ایک رکعت پڑھنا چاہے وہ ایک پڑھ لے۔''[1] حضرت ابن عباس ؓ سے کہا گیا کہ امیر المومنین حضرت معاویہ ؓ نے ایک ہی وتر پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا: وہ صحابی ہیں۔ ایک روایت میں ہے: وہ فقیہ ہیں، یعنی انھوں نے درست کیا ہے۔[2] نماز وتر کے متعلق تفصیلی بحث کتاب الوتر، حدیث: 990 میں آئے گی۔ وہاں ہم ان کی تعداد اور پڑھنے کے متعلق طریق کار کو بیان کریں گے۔ باذن اللہ تعالیٰ۔

(٨٥) بَابُ الْاِسْتِلْقَاءِ فِي الْمَسْجِدِ [وَمَدِّ الرِّجْلِ]

باب: 85- مسجد میں چت لیٹنا اور پاؤں پھیلانا

٤٧٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، عَنْ عَمِّهِ أَنَّهُ رَأَى رَسُولَ اللهِ ﷺ مُسْتَلْقِيًا فِي الْمَسْجِدِ، وَاضِعًا إِحْدَى رِجْلَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى. وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ قَالَ: كَانَ عُمَرُ وَعُثْمَانُ يَفْعَلَانِ ذٰلِكَ. [انظر: ٥٩٦٩، ٦٢٨٧]

[475] حضرت عبداللہ بن زید انصاری ؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں چت لیٹے اور پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے دیکھا تھا۔ ابن شہاب زہری حضرت سعید بن میسّب سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان ؓ بھی ایسے کیا کرتے تھے۔

فوائد ومسائل: ① صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں عنوان کے ساتھ ''مد الرجل'' کے الفاظ ہیں بعض میں نہیں۔ ہمارے نسخے میں یہ الفاظ موجود ہیں، لہٰذا اس عنوان سے امام بخاری ؒ کا مقصود یہ مسئلہ بیان کرنا ہے کہ مسجد میں چت لیٹنا اور پاؤں پھیلانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے، سونے اور لیٹنے کی جگہ نہیں، نیز بعض احادیث میں اس کی ممانعت بھی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی چت نہ لیٹے، پھر یہ بھی نہ کرے کہ اپنا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھ لے۔''[3] تو اس ممانعت کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کا محمل اور محل اور ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب ستر عورت کا پوری طرح اہتمام نہ ہو سکے، مثلاً: کپڑا چھوٹا ہو اور اس طرح لیٹنے سے ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ بھی واضح رہے

---

① سنن أبي داود، الوتر، حديث: 1422. ② صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، حديث: 3765,3764. ③ صحيح مسلم، اللباس، حديث: 5503(2099).

کہ اس وقت عرب معاشرے میں تہبند استعمال کرنے کا رواج تھا، شلوار وغیرہ نہیں پہنی جاتی تھی، تاہم اگر کپڑا گنجائش دار ہے اور ستر کھلنے کا کوئی اندیشہ نہیں بلکہ ستر عورت کا پورا اہتمام کیا ہے تو اس طرح چت لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام لوگوں کی موجودگی میں اس طرح نہیں لیٹتے تھے بلکہ خاص استراحت کے وقت کبھی ایسا کیا ہوگا جبکہ عام لوگ وہاں موجود نہ ہوں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے سامنے جس وقار اور سنجیدگی کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے اس کی تفصیلات بھی احادیث میں موجود ہیں۔ رہا یہ احتمال کہ اس طرح لیٹنا رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت نہ ہو، تو اس کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا عمل بھی پیش کر دیا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح مسجد میں لیٹنا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی جائز ہے۔[1] امام حمیدی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے کہ ان کا عمل بھی ایسا تھا۔[2] ② شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ اس عنوان میں دو باتوں کا جواز پیش کیا جا رہا ہے: چت لیٹنا اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھ کر لیٹنا۔ دوسری احادیث میں اس کی ممانعت بھی آئی ہے، اس لیے تطبیق کے طور پر کہا جائے گا کہ ممانعت والی احادیث منسوخ ہیں یا ممانعت اس وقت ہے جب تہبند چھوٹا ہو اور اس سے ستر کھلنے کا اندیشہ ہو۔

(٨٦) بَابُ الْمَسْجِدِ يَكُونُ فِي الطَّرِيقِ مِنْ غَيْرِ ضَرَرٍ بِالنَّاسِ

باب: 86- راستے میں مسجد بنانا بشرطیکہ اس میں لوگوں کا کوئی نقصان نہ ہو

وَبِهِ قَالَ الْحَسَنُ وَأَيُّوبُ وَمَالِكٌ.

امام حسن بصری، ایوب سختیانی اور امام مالک بھی یہی کہتے ہیں۔

وضاحت: مسجد بنانے کی کئی ایک صورتیں ہیں، مثلاً: اپنی زمین میں مسجد بنانا، اس میں کوئی حرج نہیں، یا کسی اور کی زمین میں مسجد تعمیر کرنا، اس میں مالک کی اجازت لینا ضروری ہے، یا عوامی مشترکہ جگہ میں مسجد بنانا، مثلاً: راستے وغیرہ میں۔ اس کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ راستہ متاثر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی کو اعتراض نہ ہو کیونکہ عوامی حقوق میں یہی بات ہوتی ہے۔ جس طرح ہر انسان کو اس میں تصرف کا حق ہوتا ہے اسی طرح اس سے روکنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ ایسی جگہ پر مسجد بنائی جا سکتی ہے بشرطیکہ لوگوں کا حق طریق متاثر نہ ہو۔ بعض حضرات، مثلاً: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ممانعت مروی ہے۔ ان کے علاوہ ربیعۃ الرائے نے بھی ایسے عوامی مقامات پر مسجد بنانے سے منع کیا ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے مسئلے کی وضاحت فرما دی۔ چونکہ امام بخاری رحمہ اللہ تک ان تین حضرات کی رائے صراحت اور صحیح نقل کے ساتھ پہنچی تھی، اس لیے ان کا نام ذکر دیا۔ ویسے جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے۔[3]

٤٧٦ - حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا

[476] حضرت عائشہ زوجۂ نبی ﷺ سے روایت ہے،

---

[1] فتح الباري : 729/1. [2] عمدة القاري : 540/3. [3] فتح الباري : 729/1.

اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: لَمْ أَعْقِلْ أَبَوَيَّ إِلَّا وَهُمَا يَدِينَانِ الدِّينَ، وَلَمْ يَمُرَّ عَلَيْنَا يَوْمٌ إِلَّا يَأْتِينَا فِيهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ طَرَفَيِ النَّهَارِ بُكْرَةً وَّعَشِيَّةً، ثُمَّ بَدَا لِأَبِي بَكْرٍ فَابْتَنَى مَسْجِدًا بِفِنَاءِ دَارِهِ، فَكَانَ يُصَلِّي فِيهِ وَيَقْرَأُ الْقُرْآنَ، فَيَقِفُ عَلَيْهِ نِسَاءُ الْمُشْرِكِينَ وَأَبْنَاؤُهُمْ يَعْجَبُونَ مِنْهُ وَيَنْظُرُونَ إِلَيْهِ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ رَجُلًا بَكَّاءً لَا يَمْلِكُ عَيْنَيْهِ إِذَا قَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأَفْزَعَ ذٰلِكَ أَشْرَافَ قُرَيْشٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ. [انظر: ٢١٣٨، ٢٢٦٣، ٢٢٦٤، ٢٢٩٧، ٣٩٠٥، ٤٠٩٣، ٥٨٠٧، ٦٠٧٩]

انھوں نے فرمایا: جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اسی وقت سے میں نے یہ دیکھا کہ میرے والدین دین اسلام قبول کر چکے تھے۔ اور ہم پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں ہمارے ہاں رسول اللہ ﷺ دن کے دونوں حصوں میں، یعنی صبح وشام نہ آتے ہوں۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک بات آئی اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک کھلی جگہ میں مسجد بنالی جس میں وہ نماز پڑھتے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے۔ مشرکین کے بچے اور عورتیں آتے جاتے ان کے پاس کھڑے ہو جاتے۔ وہ حضرت ابوبکر کی حالت پر تعجب کرتے اور انھیں غور سے دیکھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بڑے رقیق القلب اور گریہ زاری کرنے والے انسان تھے، جب قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو انھیں اپنی آنکھوں پر کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل نے مشرکین قریش کے اشراف کو بڑی گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو مختصر بیان کیا ہے۔ آئندہ اس واقعے سے متعلقہ تفصیلات بیان ہوں گی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الکفالۃ، حدیث: 2297 اور کتاب المناقب، حدیث: 3905 میں تفصیلات بیان کی ہیں۔ ہم وہاں مفصل تشریح کریں گے۔ اس مقام پر امام بخاری کا مقصود صرف یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کے سامنے عوامی مقام پر مسجد تعمیر کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر انکار نہیں فرمایا کیونکہ اس مسجد سے لوگوں کے آنے جانے کا راستہ متاثر نہیں ہوا تھا۔ مشرکین کی عورتیں اور بچے وہاں سے گزرتے تھے۔ مشرکین کو بھی اس پر اعتراض نہ تھا، البتہ وہ اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گئے کہ مبادا ہماری عورتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرز عمل اور انداز قرآن خوانی سے مسحور ومتاثر ہو جائیں۔ اس کی تفاصیل آئندہ بیان ہوں گی۔ البتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے راستے میں مسجد بنانے اور رسول اللہ ﷺ کے انکار نہ کرنے سے یہ مسئلہ تو ثابت ہوا کہ پبلک مقامات پر مسجد بنائی جا سکتی ہے بشرطیکہ راستہ متاثر نہ ہوتا ہو۔ ② آج کل اس طرح کے تمام مقامات صوبائی یا مرکزی حکومت کی تحویل میں ہیں، لہٰذا ایسے مقامات پر مسجد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت وقت سے اس کی اجازت لی جائے، بصورت دیگر حکومت کو ایسی مسجد منہدم کرنے کا پورا پورا حق ہو گا۔ آج چونکہ فتن ومحن کا دور ہے، فرقہ واریت کا بھوت ذہنوں پر سوار ہے، لوگوں میں مروت ومساحت باقی نہیں رہی، لہٰذا ایسے مقامات پر مسجد بنانے سے پہلے مقامی حکومت سے اس جگہ کے متعلق مالکانہ حقوق لینا ضروری ہیں تاکہ فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ رہے اور امن وسکون کے ساتھ وہاں اللہ کی عبادت کی جا سکے۔

(٨٧) بَابُ الصَّلَاةِ فِي مَسْجِدِ السُّوقِ

باب: 87- بازار کی مسجد میں نماز پڑھنا

وَصَلَّى ابْنُ عَوْنٍ فِي مَسْجِدٍ فِي دَارٍ يُغْلَقُ عَلَيْهِمُ الْبَابُ.

حضرت ابن عون نے ایک ایسے گھر کی مسجد میں نماز پڑھی جس کے دروازے عام لوگوں پر بند کر دیے جاتے تھے۔

وضاحت: حدیث کے مطابق بازاروں کو شر البقاع، یعنی بدترین مقامات قرار دیا گیا ہے جب کہ مساجد کو خیر البقاع، یعنی بہترین مقامات کہا گیا ہے۔ اب اگر بازار میں مسجد بنالی جائے تو کیا وہ حصہ بہترین مقامات میں شمار ہو سکے گا؟ اور کیا ایسی مسجد میں نماز و جماعت کا ثواب دیگر مساجد کی طرح ہوگا؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان میں اسی شبہ کا ازالہ کیا ہے۔ بازار میں بلاضرورت جانا امر ممنوع ہے۔ ابن عون نے گھر کی ایسی مسجد میں نماز پڑھی جس کا دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ گویا وہاں صرف مخصوص لوگ آ سکتے تھے۔ دیگر حضرات کا آنا منع تھا لیکن اس مسجد میں بھی نماز جائز تھی۔ معلوم ہوا کہ جانے پر پابندی یا جانے کی ممانعت جواز نماز کے لیے مانع نہیں، نیز بازار میں اگر مسجد بن جائے تو وہ خیر البقاع (بہترین مقام) بن جاتا ہے۔[1]

٤٧٧ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو مُعَاوِيَةَ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «صَلَاةُ الْجَمِيعِ تَزِيدُ عَلَى صَلَاتِهِ فِي بَيْتِهِ وَصَلَاتِهِ فِي سُوقِهِ خَمْسًا وَّعِشْرِينَ دَرَجَةً، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ وَأَتَى الْمَسْجِدَ لَا يُرِيدُ إِلَّا الصَّلَاةَ لَمْ يَخْطُ خَطْوَةً إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ بِهَا دَرَجَةً وَّحَطَّ عَنْهُ خَطِيئَةً حَتَّى يَدْخُلَ الْمَسْجِدَ، وَإِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ كَانَ فِي صَلَاةٍ مَّا كَانَتْ تَحْبِسُهُ، وَتُصَلِّي عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ مَا دَامَ فِي مَجْلِسِهِ الَّذِي فِيهِ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ، مَا لَمْ يُؤْذِ يُحْدِثْ». [راجع: ١٧٦]

[477] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ”نماز باجماعت گھر اور بازار کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے، اس لیے کہ جب کوئی شخص اچھی طرح وضو کرے اور مسجد میں نماز ہی کے ارادے سے آئے تو مسجد میں پہنچنے تک جو قدم اٹھاتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ ایک درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے۔ اور جب وہ مسجد میں پہنچ جاتا ہے تو جب تک نماز کے لیے وہاں رہتا ہے، اسے برابر نماز کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ اور جب تک وہ اپنے اس مقام میں رہے جہاں نماز پڑھتا ہے تو فرشتے اس کے لیے یوں دعا کرتے ہیں: اے اللہ! اسے معاف کر دے۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما، بشرطیکہ ہوا خارج کر کے دوسروں کو تکلیف نہ دے۔“

فوائد ومسائل: ① مساجد کی دو اقسام ہیں: ایک تو اصطلاحی مساجد ہیں جن میں نماز پڑھنے کے متعلق اذن عام ہوتا ہے اور وہ تمام مسلمانوں کے لیے وقف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسری وہ مساجد ہوتی ہیں جو صرف لغوی طور پر مساجد کہلاتی ہیں جیسا کہ گھر میں مسجد بنالی جاتی ہے، یا بازار میں کسی دکان کے سامنے نماز پڑھنے کے لیے کوئی جگہ متعین کر لی جاتی ہے۔ جب بازار بند ہو گیا

[1] فتح الباري: 730/1.

تو اس کے ساتھ مسجد بھی بند ہو جاتی ہے۔ عہد نبوی میں بھی بازاروں کی مساجد اسی طرح ہوتی تھیں کیونکہ وہ بازار آبادی سے باہر ہوتے تھے۔ عارضی طور پر مسجد بنا لی جاتی، جب بازار ختم ہو جاتا تو مسجد بھی ختم ہو جاتی۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان میں تنہا اور باجماعت نماز کے ثواب کا فرق بیان کرنا چاہتے ہیں، یعنی باجماعت نماز میں بہ نسبت تنہا یا بازار میں نماز پڑھنے کے پچیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے۔ بازار کی مساجد میں نماز تو ہو جاتی ہے لیکن انسان باجماعت نماز کے اضافی ثواب سے محروم رہتا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: مسجد سوق سے مراد وہ جگہ ہے جسے بازار والے نماز پڑھنے کے لیے مقرر کریں۔ اس کے علاوہ محلے کی مسجد اور ہوتی ہے، اس کے لیے تو ہمیشہ مسجد کا حکم ہے، یعنی بازار کی مسجد میں نماز پڑھنے کا جواز ثابت کرتا ہے کہ وہاں نماز ہو جاتی ہے لیکن اس دور میں آبادی کے اندر بازار اور مارکیٹیں ہیں اور بعض مقامات میں کچھ دکاندار مل کر مسجد کے لیے جگہ خرید کر وہاں مسجد بنا لیتے ہیں، یعنی وہ اصطلاحی مسجد بناتے ہیں۔ اس میں باقاعدہ اذان اور جماعت بلکہ بعض میں جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ اگر کوئی بازار میں اس طرح کی مساجد میں نماز ادا کرے گا تو وہ پورے اضافی ثواب کا حق دار ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مسجد سوق کا عنوان اس لیے قائم کیا ہے کہ بازار شور و شغب، خرید و فروخت اور جھوٹی قسموں کی جگہ ہے اور اسے شر البقاع کہا گیا ہے، اس بنا پر وہم ہو سکتا ہے کہ شاید ایسے مقام پر نماز جائز نہ ہو، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔② ابن بطال کہتے ہیں: امام بخاری کو بازار کے متعلق آنے والی حدیث شر البقاع کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا وہاں نماز پڑھنا ناجائز ہو، اس لیے انھوں نے حدیث ابی ہریرہ بیان کر کے اس کا جواز ثابت کیا ہے کیونکہ اس میں بازار کے اندر نماز پڑھنے کا ثبوت ہے۔ اگر کوئی وہاں نماز پڑھتا ہے تو وہ ایسے ہی ہے جیسے گھر میں اکیلا نماز پڑھتا ہے۔ مزید برآں امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جب بازار میں انفرادی نماز کا جواز معلوم ہوا تو بازار میں مسجد شرعی تعمیر کرنے کا جواز بدرجۂ اَولیٰ معلوم ہو گیا۔① اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ شارح بخاری ابن بطال نے بھی مسجد سوق سے شرعی مسجد مراد نہیں لی بلکہ درجۂ اولیٰ (بدرجۂ اولی) میں لا کر بازار کی شرعی اور لغوی دونوں قسم کی مساجد میں نماز کا جواز ثابت کیا ہے۔ واللہ أعلم. بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اگر عذر ہو تو گھر یا بازار میں اکیلا نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی، البتہ اضافی ثواب نہیں ملے گا اور اگر مسجد شرعی محلے یا بازار میں ہو، وہاں نماز پڑھنے سے اضافی ثواب بھی ملے گا، لہٰذا بازار میں نماز پڑھنا صحیح ہے۔ اور بازار میں اگر مسجد شرعی ہو تو اس میں نماز پڑھنے کا ثواب بھی محلے کی مسجد کے ثواب کے برابر ہوگا۔

(٨٨) بَابُ تَشْبِيكِ الْأَصَابِعِ فِي الْمَسْجِدِ وَغَيْرِهِ

باب: 88- مسجد اور غیر مسجد میں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل کرنا

وضاحت: [تشبيك] ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈالنے کو کہتے ہیں جسے اردو میں انگلیوں کی قینچی یا ان کا جال بنانا کہا جاتا ہے۔ بعض روایات میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ان روایات کی صحت محل نظر

① شرح ابن بطال: 124/2.

ہے یا وہ دورانِ نماز میں ایسا کرنے پر محمول ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات ضرورت کے پیش نظر تمثیل کے لیے ایسا کیا ہے جیسا کہ امام بخاری کی درج ذیل پیش کردہ روایات سے واضح ہوتا ہے۔

٤٧٨ , ٤٧٩ - حَدَّثَنَا حَامِدُ بْنُ عُمَرَ عَنْ بِشْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَاصِمٌ قَالَ: حَدَّثَنَا وَاقِدٌ عَنْ أَبِيهِ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ - أَوِ ابْنِ عَمْرٍو - وَقَالَ شَبَّكَ النَّبِيُّ ﷺ أَصَابِعَهُ. [انظر: ٤٨٠]

[479,478] حضرت عبداللہ بن عمر یا عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے اپنی انگلیوں کو قینچی بنایا۔

٤٨٠ - وَقَالَ عَاصِمُ بْنُ عَلِيٍّ: حَدَّثَنَا عَاصِمُ ابْنُ مُحَمَّدٍ سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيثَ مِنْ أَبِي فَلَمْ أَحْفَظْهُ، فَقَوَّمَهُ لِي وَاقِدٌ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي وَهُوَ يَقُولُ: قَالَ عَبْدُ اللهِ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يَا عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرٍو! كَيْفَ بِكَ إِذَا بَقِيتَ فِي حُثَالَةٍ مِّنَ النَّاسِ». بِهٰذَا. [راجع: ٤٧٩]

[480] حضرت عاصم بن محمد کہتے ہیں: میں نے یہ حدیث اپنے والد محمد بن زید سے سنی، پھر وہ مجھے یاد نہ رہی تو (میرے بھائی) واقد بن محمد نے اسے اپنے والد سے ٹھیک ٹھیک اور صحیح طریقے پر بیان کیا۔ انھوں نے کہا: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عبداللہ بن عمرو! اس وقت تیرا کیا حال ہو گا جب تو کوڑے کرکٹ جیسے لوگوں کے درمیان باقی رہ جائے گا۔'' پھر یہ حدیث بیان کی۔

٤٨١ - حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ أَبِي بُرْدَةَ بْنِ عَبْدِاللهِ بْنِ أَبِي بُرْدَةَ، عَنْ جَدِّهِ، عَنْ أَبِي مُوسٰى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «إِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا» وَشَبَّكَ ﷺ أَصَابِعَهُ. [انظر: ٢٤٤٦، ٦٠٢٦]

[481] حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے، وہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے کہ اس کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو تقویت ملتی ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل فرمایا۔

٤٨٢ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ شُمَيْلٍ قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: صَلّٰى بِنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ إِحْدٰى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ، - قَالَ ابْنُ سِيرِينَ: قَدْ سَمَّاهَا أَبُو هُرَيْرَةَ، وَلٰكِنْ نَسِيتُ أَنَا - قَالَ: فَصَلّٰى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ، فَقَامَ إِلٰى خَشَبَةٍ مَّعْرُوضَةٍ فِي الْمَسْجِدِ، فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَأَنَّهُ غَضْبَانُ، وَوَضَعَ

[482] حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں زوال کے بعد کی نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھائی اور دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔ اس کے بعد مسجد میں گاڑھی ہوئی ایک لکڑی کی طرف گئے اور اس پر ٹیک لگا لی، گویا آپ ناراض ہوں اور اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ لیا اور اپنی انگلیوں کو ایک دوسری میں داخل فرمایا اور اپنا دایاں رخسار بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھ

يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ، وَوَضَعَ خَدَّهُ الْأَيْمَنَ عَلٰى ظَهْرِ كَفِّهِ الْيُسْرٰى، وَخَرَجَتِ السَّرَعَانُ مِنْ أَبْوَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالُوا: أَقَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟ وَفِي الْقَوْمِ أَبُو بَكْرٍ وَّعُمَرُ فَهَابَا أَنْ يُّكَلِّمَاهُ، وَفِي الْقَوْمِ رَجُلٌ فِي يَدَيْهِ طُولٌ يُّقَالُ لَهُ ذُو الْيَدَيْنِ، قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَنَسِيتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ؟ قَالَ: «لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ». فَقَالَ: «أَكَمَا يَقُولُ ذُو الْيَدَيْنِ؟» فَقَالُوا: نَعَمْ، فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى مَا تَرَكَ، ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ، ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُودِهِ أَوْ أَطْوَلَ، ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ وَكَبَّرَ. فَرُبَّمَا سَأَلُوهُ: ثُمَّ سَلَّمَ؟ فَيَقُولُ: نُبِّئْتُ أَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ: ثُمَّ سَلَّمَ. [انظر: ٧١٤، ٧١٥، ١٢٢٧، ١٢٢٩، ٦٠٥١، ٧٢٥٠]

لیا۔ جلد باز لوگ تو مسجد کے دروازوں سے نکل گئے اور مسجد میں حاضر لوگوں نے کہنا شروع کر دیا: کیا نماز کم ہوگئی ہے؟ ان لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، مگر ان دونوں نے آپ سے گفتگو کرنے سے ہیبت محسوس کی۔ ایک شخص جس کے ہاتھ کچھ لمبے تھے اور اسے ذوالیدین کہا جاتا تھا، کہنے لگا: اللہ کے رسول! کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز کم ہوگئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز ہی کم کی گئی ہے۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''کیا ذوالیدین صحیح کہتا ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ یہ سن کر آپ آگے بڑھے اور جتنی نماز رہ گئی تھی اسے ادا کیا، پھر سلام پھیرا۔ اس کے بعد آپ نے تکبیر کہی اور سجدۂ سہو کیا جو عام سجدے کی طرح یا اس سے کچھ لمبا تھا۔ پھر آپ نے سر اٹھایا اور اللہ اکبر کہا۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر دوسرا سجدہ کیا جو اپنے عام سجدوں کی سطح یا اس سے کچھ طویل تھا۔ پھر سر اٹھا کر اللہ اکبر کہا اور سلام پھیر دیا۔

فوائد ومسائل: ① پہلی حدیث میں واقد اپنے والد محمد بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن عمر یا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالا۔ اس روایت میں یہ شک تھا کہ ابن عمر سے بیان کی گئی ہے یا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس شک کو دور کرنے کے لیے، نیز تشبیک کی وجہ بتانے کے لیے دوسری روایت بیان کی کہ عاصم بن محمد نے یہ روایت اپنے والد محمد بن زید سے سنی لیکن وہ اسے یاد نہ رہی، پھر ان کے بھائی واقد بن محمد نے ٹھیک ٹھیک طریقے پر محمد بن زید ہی سے روایت بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عبداللہ! اس وقت تمھاری کیا حالت ہوگی جب تم ایسے لوگوں کے درمیان رہ جاؤ گے جو کوڑے کرکٹ اور بھوسے کی طرح ہوں گے؟'' اس روایت سے شک دور ہوگیا کہ اسے بیان کرنے والے عبداللہ بن عمر نہیں بلکہ عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں۔ پھر تشبیک کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مضمون سمجھانے کے لیے تمثیل کے طور پر انگلیوں کو انگلیوں میں ڈالا، چنانچہ یہ روایت امام حمیدی کی کتاب الجمع بین الصحیحین میں بایں اضافہ نقل ہوئی ہے کہ ان ردی اور بے کار لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ ان کے عہد و پیمان اور ان کی امانتیں تباہ ہو چکی ہوں گی اور وہ اس طرح ہو گئے ہوں گے، پھر آپ نے ''اس طرح'' کی وضاحت کے لیے اپنی انگلیوں کو قینچی بنایا۔[1] ② بعض روایات میں تشبیک کی ممانعت ہے۔ حضرت

① فتح الباري: 732/1.

کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی وضو کرتا ہے اور اسے اچھی طرح بناتا ہے، پھر مسجد کی طرف جانے کی نیت لے کر گھر سے نکلتا ہے تو وہ اپنی انگلیوں میں انگلیاں نہ ڈالے کیونکہ وہ نماز ہی میں ہے۔''[1] ابن ابی شیبہ میں مزید وضاحت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو تشبیک نہ کرے کیونکہ یہ عمل شیطان کے اثر سے ہوتا ہے۔'' لیکن اس کی سند میں ضعیف اور مجہول راوی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ عنوان اس لیے قائم کیا ہے کہ جن روایات میں تشبیک کی ممانعت ہے ان کی صحت محل نظر ہے یا وہ ممانعت حالت نماز پر محمول ہے، نیز اگر کسی صحیح مقصد کے پیش نظر کبھی ایسا کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک مقصد کی وضاحت کے لیے تشبیک فرمائی۔ امام بخاری نے ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے ثابت کیا کہ ایسا کرنا مطلق طور پر جائز ہے۔ پھر حدیث ابوہریرہ سے ثابت فرمایا کہ مسجد میں ایسا عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر ابن منیر نے کہا ہے کہ ان احادیث میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ منع کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ فضول اور بے کار طور پر ایسا کرنا منع ہے، اگر کسی حکمت کے پیش نظر ایسا کیا جائے تو جائز ہے، مثلاً: اپنے مدعا کی وضاحت کے لیے جیسا کہ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، یا تفہیم کے لیے تمثیل کے طور پر معنویات کو محسوسات میں تبدیل کرنے کے لیے ایسا کیا جائے جیسا کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو باہم شیر وشکر رہنے کے متعلق بیان فرمایا، پھر ہاتھوں کی قینچی بنا کر بتایا کہ مسلمان باہمی طور پر ایسے ملے جلے رہتے ہیں جس طرح عمارت کے پتھر ایک دوسرے کو اٹھائے رہتے ہیں، یا گہرے غور و خوض کی وجہ سے بے ساختہ ایسا ہو جائے جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، ایسے حالات میں تشبیک کی ممانعت نہیں ہے۔

نوٹ: حدیث ابوہریرہ سے متعلق دیگر مباحث اپنے مقام پر آئیں گے۔ بإذن الله تعالى.

(٨٩) بَابُ الْمَسَاجِدِ الَّتِي عَلَى طُرُقِ الْمَدِينَةِ وَالْمَوَاضِعِ الَّتِي صَلَّى فِيهَا النَّبِيُّ ﷺ

باب: 89- مدینے کے راستے میں واقع مساجد اور وہ مقامات جہاں نبی ﷺ نے نماز پڑھی

وضاحت: مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جانے کے لیے زمانۂ قدیم میں متعدد راستے تھے اور ان کی مسافت اتنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا سفر ہجرت سات دن میں طے ہوا۔ اسی طرح آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک کا سفر آٹھ دن میں طے فرمایا۔ ذیل کی روایات میں جن مقامات پر نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے یہ حجۃ الوداع کے سفر سے متعلق ہیں۔ اس سفر میں میں جن جن مقامات پر رسول اللہ ﷺ نے نمازیں پڑھی ہیں ان میں سے بعض مقامات پر مساجد شرعی تعمیر ہو چکی ہیں اور بعض مقامات پر مسجدیں تعمیر نہیں ہوئیں، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے عنوان میں دو الفاظ بیان کیے ہیں: المساجد اور المواضع۔ مساجد سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں بعد میں مساجد تعمیر ہو گئیں اور مواضع وہ مقامات ہیں جہاں مساجد تعمیر نہیں ہوئیں۔

٤٨٣ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ الْمُقَدَّمِيُّ

[483] حضرت موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں: میں نے حضرت

---

1. جامع الترمذي، الصلاة، حديث: 386.

قَالَ: حَدَّثَنَا فُضَيْلُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ قَالَ: رَأَيْتُ سَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَتَحَرّٰى أَمَاكِنَ مِنَ الطَّرِيقِ، فَيُصَلِّي فِيهَا، وَيُحَدِّثُ أَنَّ أَبَاهُ كَانَ يُصَلِّي فِيهَا، وَأَنَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي فِي تِلْكَ الْأَمْكِنَةِ.

سالم بن عبداللہ کو دیکھا کہ وہ (مکے سے مدینے کے) راستے پر بعض مخصوص مقامات کو تلاش کر کے وہاں نماز پڑھتے تھے اور بیان کرتے تھے کہ ان کے والد گرامی (ابن عمر رضی اللہ عنہما) ان مقامات پر نماز پڑھا کرتے تھے اور انھوں نے نبی ﷺ کو ان جگہوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

وَحَدَّثَنِي نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّي فِي تِلْكَ الْأَمْكِنَةِ، وَسَأَلْتُ سَالِمًا فَلَا أَعْلَمُهُ إِلَّا وَافَقَ نَافِعًا فِي الْأَمْكِنَةِ كُلِّهَا إِلَّا أَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِي مَسْجِدٍ بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ. [انظر: ١٥٣٥، ٢٣٣٦، ٧٣٤٥]

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں: مجھ سے حضرت نافع نے بھی بیان کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ان مقامات پر نماز پڑھتے تھے۔ اور میں نے اس سلسلے میں حضرت سالم سے معلوم کیا تو انھوں نے بھی وہی مقامات بتائے جن کی نشاندہی حضرت نافع نے کی تھی، البتہ شرف الروحاء کی مسجد کے متعلق دونوں کا کچھ اختلاف تھا۔

فوائد و مسائل: ① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر رسول اللہ ﷺ نے نمازیں پڑھیں، وہاں نماز کے لیے خاص طور پر اہتمام کرنا اور ان سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے۔ ویسے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اتباع سنت میں انتہائی شدت مشہور ہے، لیکن دوسری طرف ان کے والد گرامی سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہ ہے کہ اپنے کسی سفر میں انھوں نے دیکھا کہ لوگ ایک خاص جگہ پر نماز پڑھنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو آپ نے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں نماز پڑھی تھی۔ اس پر آپ نے فرمایا: اگر ان مقامات پر اتفاقاً نماز کا وقت ہو جائے تو پڑھ لے بصورت دیگر آگے چل کر جہاں وقت ہو وہاں پڑھے۔ اہل کتاب اسی لیے ہلاک ہوئے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کے آثار کو تلاش کر کے وہاں عبادت گاہیں بنائیں اور گرجے تعمیر کیے۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے باپ اور بیٹے کے طرز عمل میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ان عام لوگوں کی زیارت سے متعلق ہے جو ان مقامات کی نماز کے بغیر زیارت کو پسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے طرز عمل کو ناپسند فرمایا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ مبادا ایسے لوگ ان مقامات پر نماز پڑھنا واجب خیال کر لیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جیسے افراد سے اس طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے گھر میں اس لیے نماز پڑھی تھی تاکہ عتبان وہاں نماز پڑھا کریں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صالحین کے آثار سے تبرک لیا جا سکتا ہے۔[1] لیکن حافظ ابن حجر کی جلالت قدر کے باوجود ہمیں ان کے موقف سے اتفاق نہیں کیونکہ اس سے شرک و بدعت کا وہ چور دروازہ کھلتا ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے دور اندیش نے بند کرنا چاہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے اسی طرز عمل کو تو ناپسند کیا تھا کہ وہ اہتمام سے

① فتح الباري: 736/1.

آثار صالحین تلاش کر کے وہاں نماز پڑھتے تھے، چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو چیزیں اتفاقی طور پر رسول اللہ ﷺ نے کی ہیں اگر اتفاقی طور پر انھیں عمل میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں، یعنی سفر کر رہے ہیں اور اتفاق سے ایسی جگہ نماز کا وقت آجائے جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تو وہاں نماز پڑھ لی جائے لیکن اس کا باقاعدہ اہتمام کرنا درست نہیں۔'' حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین مساجد (بیت اللہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس) کے علاوہ کسی بھی جگہ کی طرف سفر (برائے تقرب الٰہی) نہ کیا جائے۔''[1] ② حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کہتے ہیں: زمانۂ جاہلیت میں لوگ متبرک مقامات کی ''زیارت'' کے لیے جاتے تھے۔ اس میں چونکہ عبادت غیر اللہ کا دروازہ کھلتا ہے، اس لیے بگاڑ کی اس جڑ کو بند کر دیا گیا۔ اور میرے نزدیک کسی ولی کی قبر اور اس کی عبادت کی جگہ بھی اس حدیث میں داخل ہیں، یعنی ان کی طرف تقربی سفر جائز نہیں۔[2] اس سے پہلے فتح الباری کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتباہ بھی نقل کیا گیا ہے۔[3] مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب اطلاع ملی کہ لوگ اس درخت کے نیچے تبرکاً ٹھہرتے ہیں جس کے نیچے رسول اللہ نے صحابۂ کرام سے بیعت لی تھی تو آپ نے اس درخت کو کاٹ دینے کا حکم صادر فرمایا۔[4] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سلسلے میں دیگر صحابہ کے مقابلے میں شدید الاتباع ہونے کی حیثیت سے یہ راستہ اپنایا ہے لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کبھی غار ثور، غار حراء یا بیعت العقبہ کے مقامات کی زیارت کے لیے سفر نہیں کیا، حالانکہ ان مقامات کے ساتھ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات وابستہ ہیں بلکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ روایت بھی ملتی ہے کہ قزعہ تابعی نے آپ سے کوہ طور پر جانے کی بابت سوال کیا تو آپ نے اسے وہاں جانے سے منع فرمایا اور کہا کہ صرف تین مساجد کی طرف بغرض ثواب سفر کرنا درست ہے۔[5] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے جس درخت کے نیچے بیعت رضوان کی تھی، آئندہ سال جب وہاں گئے تو وہ درخت ہم سے پوشیدہ کر دیا گیا حتی کہ ہم میں سے دو آدمی بھی اس کی تعیین کے متعلق متفق نہ ہو سکے۔ اس کا مخفی ہونا بھی ہمارے لیے اللہ کی رحمت تھی۔[6] حضرت میسب بن حزن رضی اللہ عنہ بھی اس کے گمنام ہونے کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے متفق ہیں۔[7] حضرت طارق بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں ایک سال حج کے لیے گیا تو میرا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو کسی جگہ اہتمام سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون سی مسجد ہے جس میں یہ لوگ اہتمام سے نماز پڑھ رہے ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ وہی درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت رضوان لی تھی۔ میں اسی وقت حضرت سعید بن میسب کے پاس آیا اور انھیں بتایا تو انھوں نے فرمایا کہ میرے باپ حضرت میسّب رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق جب ہم آئندہ سال مقام حدیبیہ میں آئے تو اس درخت کو بھول گئے تھے۔ کوشش بسیار کے باوجود اس کی تعیین سے قاصر رہے۔ پھر حضرت سعید بن میسّب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو اسے معلوم نہ کر سکے۔ اگر ان حضرات نے اس کا کھوج لگا لیا ہے تو یہ جانیں اور ان کا کام، ہمیں ان سے کیا واسطہ ہے۔[8] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ تھی کہ آئندہ کے لیے اس درخت کی خیر و برکت لوگوں کو کہیں آزمائش میں مبتلا نہ کر

1 صحيح البخاري، فضل الصلاة في مسجد مكة والمدينة، حديث :1189. 2 حجة الله البالغة : 192/1. ③ المصنف ابن أبي شيبة : 367/3. 4 فتح الباري : 558/7. ⑤ تحذير الساجد للألباني. 6 صحيح البخاري، الجهاد، حديث :2958.
7 صحيح البخاري، المغازي، حديث :4164. 8 صحيح البخاري، المغازي، حديث :4163.

دے۔ اگر وہ درخت باقی رہتا تو جاہل لوگ اس حد تک اس کی تعظیم کرتے کہ اس کے متعلق نفع نقصان پہنچانے کا عقیدہ بنا لیتے جیسا کہ آج کل متعدد مقامات کے متعلق اس قسم کے عقائد و نظریات کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔[1] اس کے علاوہ غیر نبی کو نبی پر کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے آثار کے متعلق خیر و برکت کا عقیدہ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ دیگر حضرات کے آثار کے متعلق کیا ثبوت ہے؟ ③ صحیح بات یہی ہے کہ حضرت عمر ؓ بڑے حساس قسم کے انسان تھے۔ انھوں نے آثار انبیاء کے تتبع سے اس بنا پر منع فرمایا تاکہ آئندہ کسی وقت انھیں شرک کا ذریعہ نہ بنا لیا جائے۔ وہ اپنے بیٹے سے اس معاملے میں زیادہ علم اور تجربہ رکھتے تھے۔ قصۂ عتبان بھی اس کے برعکس موقف کے لیے دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے گھر میں دعوت ہی اسی لیے دی تھی کہ آپ گھر کے کسی کونے میں نماز پڑھیں تاکہ وہ اسے مستقل جائے نماز قرار دے لیں۔ لیکن راستے میں جو اتفاقاً ایسے آثار اور واقعات ملتے ہیں ان کی طرف قصداً جانا اس واقعے سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ ہمارے نزدیک ایسا کرنا غیر مشروع ہے جیسا کہ حضرت عمر ؓ نے ان کے متعلق انتباہ فرمایا ہے کہ ایسا کرنا اہل کتاب کا طریقہ اور شرک کا ذریعہ ہے۔ واللّٰه أعلم. ④ حضرت ابن عمر ؓ ان مقامات پر بطور تبرک و اتباع نماز پڑھتے تھے۔ ویسے تو رسول اللہ ﷺ کا ہر قول، ہر فعل اور ہر نقش قدم ہمارے لیے باعث خیر و برکت ہے، مگر تبرکات انبیاء کے نام سے ہمارے معاشرے میں جو افراط و تفریط پائی جاتی ہے وہ بھی حد درجہ قابل مذمت ہے جیسا کہ بعض لوگ آپ کے پیشاب اور فضلات تک کو بھی بلا دلیل پاک کہتے ہیں۔ ⑤ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کے دو شاگرد ہیں: ایک ان کے صاحبزادے حضرت سالم اور دوسرے ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع۔ جس طرح حضرت سالم ان مقامات سے متعلقہ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایات بیان کرتے ہیں اسی طرح حضرت نافع بھی روایت کرتے ہیں۔ ان دونوں کے شاگرد حضرت موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ ان مقامات کے متعلق حضرت نافع نے بیان کیا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ وہاں نماز پڑھتے تھے۔ پھر میں نے اس سلسلے میں ان کے صاحبزادے حضرت سالم سے رابطہ کیا تو انھوں نے حضرت نافع کے بیان کے متعلق تفصیلات بیان کیں، مگر شرف الروحاء کی مسجد کے متعلق ان کے بیانات مختلف تھے۔ حضرت نافع نے تو اسے ذکر کیا لیکن حضرت سالم اس کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ واضح رہے کہ روحاء ایک جگہ کا نام ہے اور شرف کے معنی بلندی کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ روحاء سے متصل جو اونچی جگہ ہے، وہاں مسجد کی تعیین کے متعلق حضرت نافع اور حضرت سالم کے بیان میں اختلاف ہے۔ ⑥ آئندہ جن مقامات کی تعیین الفاظ و عبارت سے کی جائے گی ان میں سے بیشتر مقامات و مساجد لاپتہ ہو چکے ہیں۔ صحیح طور پر ان کا تعین تو دیکھنے والا ہی کر سکتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے ان کی نشاندہی بہت مشکل ہے۔ حضرت ابن عمر ؓ نے الفاظ کے ذریعے سے بھی ان مقامات کی نشاندہی کی تھی اور عملی طور پر بھی اپنے متعلقین کو مشاہدہ کرا دیا تھا۔ مکے سے مدینے تک اس سفر کی سات منازل ہیں۔ اب ہر منزل کی الگ وضاحت پیش خدمت ہے۔

٤٨٤ - حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: حَدَّثَنَا

[484] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہی سے روایت ہے کہ

① فتح الباري: 143/6.

أَنَسُ بْنُ عِيَاضٍ قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ، أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يَنْزِلُ بِذِي الْحُلَيْفَةِ حِينَ يَعْتَمِرُ وَفِي حَجَّتِهِ حِينَ حَجَّ تَحْتَ سَمُرَةٍ فِي مَوْضِعِ الْمَسْجِدِ الَّذِي بِذِي الْحُلَيْفَةِ، وَكَانَ إِذَا رَجَعَ مِنْ غَزْوٍ كَانَ فِي تِلْكَ الطَّرِيقِ، أَوْ فِي حَجٍّ أَوْ عُمْرَةٍ هَبَطَ مِنْ بَطْنِ وَادٍ، فَإِذَا ظَهَرَ مِنْ بَطْنِ وَادٍ، أَنَاخَ بِالْبَطْحَاءِ الَّتِي عَلَى شَفِيرِ الْوَادِي الشَّرْقِيَّةِ فَعَرَّسَ ثَمَّ حَتّٰى يُصْبِحَ، لَيْسَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الَّذِي بِحِجَارَةٍ وَّلَا عَلَى الْأَكَمَةِ الَّتِي عَلَيْهَا الْمَسْجِدُ، كَانَ ثَمَّ خَلِيجٌ يُّصَلِّي عَبْدُ اللهِ عِنْدَهُ، فِي بَطْنِهِ كُثُبٌ، كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ ثَمَّ يُصَلِّي، فَدَحَا فِيهِ السَّيْلُ بِالْبَطْحَاءِ حَتّٰى دَفَنَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ الَّذِي كَانَ عَبْدُ اللهِ يُصَلِّي فِيهِ.

[انظر: ١٥٣٢، ١٥٣٣، ١٧٩٩]

رسول اللہ ﷺ جب عمرے کے لیے جاتے، اسی طرح حجۃ الوداع میں جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو ذوالحلیفہ میں اس کیکر کے نیچے پڑاؤ کرتے جہاں اب مسجد ذوالحلیفہ ہے۔ اور جب آپ جہاد، حج یا عمرے سے (مدینے) واپس آتے اور اس راستے سے گزرتے تو وادئ عقیق کے نشیب میں اترتے۔ جب وہاں سے اوپر چڑھتے تو اپنی اونٹنی کو بطحاء میں بٹھاتے جو وادی کے مشرقی کنارے پر ہے اور آخر شب میں وہیں آرام فرماتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ یہ مقام اس مسجد کے پاس نہیں جو پتھروں سے بنی ہے اور نہ اس ٹیلے پر ہے جس پر مسجد ہے بلکہ اس جگہ ایک گہرا نالا تھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کے اندر کچھ (ریت کے) ٹیلے تھے، رسول اللہ ﷺ وہیں نماز پڑھتے تھے۔ (راوی کہتا ہے) لیکن اب نالے کی رو (پانی کے بہاؤ) نے وہاں کنکریاں بچھا دی ہیں اور اس مقام کو چھپا دیا ہے جہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نماز پڑھا کرتے تھے۔

فائدہ: اس باب کی احادیث میں جن مساجد کا ذکر ہے ان میں سے اکثر لا پتہ ہو چکی ہیں۔ وہ درخت اور نشانات بھی ختم ہو چکے ہیں جن کے ذریعے سے ان مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اب ان مساجد میں سے صرف ذوالحلیفہ اور روحاء کی مساجد رہ گئی ہیں جنھیں وہاں کے باشندے پہچانتے ہیں۔[1] پہلی منزل: رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تو ذوالحلیفہ آپ کی پہلی منزل ہوتی۔ ذوالحلیفہ، مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے بئر علی کہا جاتا ہے۔ اہل مدینہ کے لیے احرام حج کی میقات ہے۔ رسول اللہ ﷺ ذوالحلیفہ میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے نزول فرماتے تھے۔ اب اس مقام پر مسجد بن چکی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان کے مطابق ٹھیک اسی جگہ مسجد بنی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی، لیکن واپسی کے وقت نماز پڑھنے کی جگہ ایک دوسرا مقام تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان کے مطابق جہاں رسول اللہ ﷺ واپسی کے وقت نماز پڑھتے تھے وہاں ایک گہری وادی تھی جس کے اندر ریت کے تودے تھے۔ وہاں جو مسجدیں ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہوں کے علاوہ ہیں۔ ایک مسجد پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور دوسری ایک ٹیلے پر بنی ہوئی ہے۔

---

[1] فتح الباري: 738/1.

جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی وہ جگہ سنگریزوں سے چھپ گئی ہے۔ ایک مقام مدینہ منورہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے آخر شب قیام فرمایا تھا۔ وہاں مسجد معرس تعمیر ہو چکی ہے۔ اب صرف دو مساجد ہیں: مسجد ذوالحلیفہ اور مسجد معرس جو محفوظ ہیں۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

٤٨٥ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى حَيْثُ الْمَسْجِدُ الصَّغِيرُ الَّذِي دُونَ الْمَسْجِدِ الَّذِي بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ، وَقَدْ كَانَ عَبْدُ اللهِ يَعْلَمُ الْمَكَانَ الَّذِي كَانَ صَلّٰى فِيهِ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ: ثَمَّ عَنْ يَمِينِكَ حِينَ تَقُومُ فِي الْمَسْجِدِ تُصَلِّي، وَذٰلِكَ الْمَسْجِدُ عَلٰى حَافَةِ الطَّرِيقِ الْيُمْنٰى وَأَنْتَ ذَاهِبٌ إِلٰى مَكَّةَ، بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْمَسْجِدِ الْأَكْبَرِ رَمْيَةٌ بِحَجَرٍ أَوْ نَحْوُ ذٰلِكَ.

[485] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وہاں بھی نماز پڑھی جہاں اب چھوٹی سی مسجد ہے، اس مسجد کے قریب جو روحاء کی بلندی پر واقع ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس مقام کی نشاندہی کرتے تھے جہاں نبی ﷺ نے نماز ادا کی تھی اور کہتے تھے کہ جب تو مسجد میں نماز پڑھے تو وہ جگہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف پڑتی ہے۔ اور یہ (چھوٹی مسجد) مکے کو جاتے ہوئے راستے کے دائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس کے اور بڑی مسجد کے درمیان کم وبیش پتھر پھینکنے کی مسافت ہے۔

٤٨٦ - وَأَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُصَلِّي إِلَى الْعِرْقِ الَّذِي عِنْدَ مُنْصَرَفِ الرَّوْحَاءِ، وَذٰلِكَ الْعِرْقُ انْتِهَاءُ طَرَفِهِ عَلٰى حَافَةِ الطَّرِيقِ دُونَ الْمَسْجِدِ الَّذِي بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْمُنْصَرَفِ وَأَنْتَ ذَاهِبٌ إِلٰى مَكَّةَ، وَقَدِ ابْتُنِيَ ثَمَّ مَسْجِدٌ، فَلَمْ يَكُنْ عَبْدُ اللهِ يُصَلِّي فِي ذٰلِكَ الْمَسْجِدِ كَانَ يَتْرُكُهُ عَنْ يَسَارِهِ وَوَرَاءَهُ وَيُصَلِّي أَمَامَهُ إِلَى الْعِرْقِ نَفْسِهِ، وَكَانَ عَبْدُ اللهِ يَرُوحُ مِنَ الرَّوْحَاءِ فَلَا يُصَلِّي الظُّهْرَ حَتّٰى يَأْتِيَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ فَيُصَلِّي فِيهِ الظُّهْرَ، وَإِذَا أَقْبَلَ مِنْ مَكَّةَ فَإِنْ مَرَّ بِهِ قَبْلَ الصُّبْحِ بِسَاعَةٍ أَوْ مِنْ آخِرِ السَّحَرِ عَرَّسَ، حَتّٰى يُصَلِّيَ بِهَا الصُّبْحَ.

[486] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس چھوٹی سی پہاڑی کے پاس بھی نماز پڑھا کرتے تھے جو روحاء کے خاتمے پر ہے۔ اس پہاڑی کا سلسلہ راستے کے آخری کنارے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ مکے کو جاتے ہوئے اس مسجد کے قریب جو اس (پہاڑی) کے اور روحاء کے آخری حصے کے درمیان ہے، وہاں ایک اور مسجد بن گئی ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس مسجد میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ اسے اپنی بائیں طرف اور پیچھے چھوڑ دیتے اور اس کے آگے پہاڑی کے پاس نماز پڑھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما زوال آفتاب کے بعد روحاء سے چلتے، پھر ظہر کی نماز اسی جگہ پہنچ کر ادا کرتے۔ اور جب مکے سے واپس آتے تو صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے یا سحری کے آخری وقت وہاں پڑاؤ کرتے اور فجر کی نماز پڑھتے۔

فائدہ: دوسری منزل: دوسری منزل شرف الروحاء کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے وقت اس آبادی کا بالائی حصہ شرف الروحاء کہلاتا ہے اور آبادی سے نکلتے ہوئے جو حصہ آتا ہے اسے منصرف الروحاء کہا جاتا ہے۔ یہاں دو

مسجدیں ہیں: ایک تو اہل علاقہ کے لیے ہے جو بڑی ہے اور دوسری چھوٹی مسجد ہے۔ اس دوسری منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ ایک ہی تھی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مقام روحاء سے دوپہر ڈھلنے کے بعد چلتے، مگر ظہر اس جگہ آ کر پڑھتے۔ اسی طرح مکہ مکرمہ سے واپسی کے موقع پر اگر آخر شب ادھر سے گزرتے تو یہیں قیام کرتے اور فجر کی نماز اس جگہ ادا کرتے۔ روحاء میں یہ دونوں مساجد باقی ہیں اور انھیں اس علاقے کے لوگ جانتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان کے مطابق یہ چھوٹی مسجد بھی رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ پر تعمیر نہیں ہوئی۔

٤٨٧ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْزِلُ تَحْتَ سَرْحَةٍ ضَخْمَةٍ دُونَ الرُّوَيْثَةِ عَنْ يَّمِينِ الطَّرِيقِ وَوِجَاهَ الطَّرِيقِ فِي مَكَانٍ بَطْحٍ سَهْلٍ، حَتّٰى يُفْضِيَ مِنْ أَكَمَةٍ دُوَيْنَ بَرِيدِ الرُّوَيْثَةِ بِمِيلَيْنِ، وَقَدِ انْكَسَرَ أَعْلَاهَا فَانْثَنٰى فِي جَوْفِهَا وَهِيَ قَائِمَةٌ عَلٰى سَاقٍ وَّفِي سَاقِهَا كُثُبٌ كَثِيرَةٌ.

[487] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی ﷺ مقام رویثہ کے قریب راستے کی دائیں جانب کشادہ، نرم اور ہموار جگہ میں ایک بہت بڑے گھنے درخت کے نیچے اترتے یہاں تک کہ اس ٹیلے سے بھی آگے گزر جاتے جو رویثہ کے راستے سے دو میل کے قریب ہے۔ اس درخت کا بالائی حصہ ٹوٹ گیا ہے اور اب درمیان سے خمیدہ ہو کر اپنے تنے پر کھڑا ہے۔ اس کی جڑ میں بہت سے ریت کے ٹیلے ہیں۔

فائدہ: تیسری منزل: تیسری منزل رویثہ کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ یہ آبادی کا نام ہے جو مدینہ طیبہ سے 17 فرسخ، یعنی 51 میل کے فاصلے پر ہے۔[1] اس منزل میں رسول اللہ ﷺ نماز کہاں پڑھتے تھے؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان کے مطابق وہاں ایک بڑے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ نزول فرماتے تھے۔ وہ درخت اوپر سے ٹوٹ گیا ہے لیکن گرا نہیں، اپنے جوف اور خول میں مڑ کر ٹھہر گیا ہے اور اس کا تنا پوری طرح کھڑا ہے۔ اس تنے کے نیچے ریت کے تودے ہیں لیکن وہ درخت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے وقت ہی ٹوٹ گیا تھا، کتنے دن باقی رہا ہوگا! اب اس جگہ کو تلاش کر کے اس کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ واللہ أعلم.

٤٨٨ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِي طَرَفِ تَلْعَةٍ مِّنْ وَّرَاءِ الْعَرْجِ وَأَنْتَ ذَاهِبٌ إِلٰى هَضْبَةٍ، عِنْدَ ذٰلِكَ الْمَسْجِدِ قَبْرَانِ أَوْ ثَلَاثَةٌ، عَلَى الْقُبُورِ رَضْمٌ مِّنْ حِجَارَةٍ عَنْ يَّمِينِ الطَّرِيقِ عِنْدَ سَلِمَاتِ الطَّرِيقِ، بَيْنَ أُولٰئِكَ السَّلِمَاتِ كَانَ عَبْدُ اللهِ يَرُوحُ مِنَ الْعَرْجِ بَعْدَ أَنْ تَمِيلَ الشَّمْسُ بِالْهَاجِرَةِ فَيُصَلِّي الظُّهْرَ فِي ذٰلِكَ

[488] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اس ٹیلے کے کنارے پر بھی نماز پڑھی جہاں سے پانی اترتا ہے۔ یہ مقام ہضبہ کو جاتے ہوئے عرج کے پیچھے واقع ہے۔ اس مسجد کے پاس دو یا تین قبریں ہیں۔ ان پر اوپر تلے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ راستے سے دائیں جانب ان بڑے پتھروں کے پاس ہے جو راستے پر واقع ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دوپہر کو زوال کے بعد عرج سے

[1] فتح الباري: 737/1.

الْمَسْجِدِ.

ان بڑے پتھروں کے درمیان چلتے، پھر ظہر کی نماز اس مسجد میں ادا کرتے۔

فائدہ: چوتھی منزل: اس منزل کا عرج کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ عرج ایک آبادی کا نام ہے جو مقام رویثہ سے 14 میل کے فاصلے پر ہے۔ اس منزل کے جونشانات اور علامتیں ذکر کی گئی ہیں، ان سے آج اس جگہ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

٤٨٩ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَزَلَ عِنْدَ سَرَحَاتٍ عَنْ يَسَارِ الطَّرِيقِ فِي مَسِيلٍ دُونَ هَرْشَى، ذٰلِكَ الْمَسِيلُ لَاصِقٌ بِكُرَاعِ هَرْشَى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الطَّرِيقِ قَرِيبٌ مِّنْ غَلْوَةٍ. وَكَانَ عَبْدُ اللهِ يُصَلِّي إِلَى سَرْحَةٍ هِيَ أَقْرَبُ السَّرَحَاتِ إِلَى الطَّرِيقِ، وَهِيَ أَطْوَلُهُنَّ.

[489] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ ان بڑے درختوں کے پاس اترے جو راستے کے بائیں جانب ہرشیٰ پہاڑی کے پاس وادی میں ہیں۔ یہ وادی ہرشیٰ کے کنارے سے مل گئی ہے۔ وادی اور راستے کے درمیان ایک تیر پھینکنے کا فاصلہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس بڑے درخت کے پاس نماز پڑھتے جو وہاں تمام درختوں سے بڑا اور راستے کے زیادہ قریب تھا۔

فائدہ: پانچویں منزل: اس منزل کا ہرشیٰ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک پہاڑی کا نام ہے جو مکے کے راستے میں آتی ہے اور ایسی جگہ واقع ہے جہاں شام اور مدینے کے راستے ملتے ہیں۔ یہ مقام جحفہ کے قریب ہے۔ اس کی علامت کے طور پر چند درختوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو آج کل ناپید ہو چکے ہیں، لہٰذا ان علامتوں کے ذریعے سے اسے معلوم کرنا ممکن نہیں۔ [2]

٤٩٠ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْزِلُ فِي الْمَسِيلِ الَّذِي فِي أَدْنٰى مَرِّ الظَّهْرَانِ قِبَلَ الْمَدِينَةِ حِينَ يَهْبِطُ مِنَ الصَّفْرَاوَاتِ، يَنْزِلُ فِي بَطْنِ ذٰلِكَ الْمَسِيلِ عَنْ يَسَارِ الطَّرِيقِ وَأَنْتَ ذَاهِبٌ إِلَى مَكَّةَ، لَيْسَ بَيْنَ مَنْزِلِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَبَيْنَ الطَّرِيقِ إِلَّا رَمْيَةٌ بِحَجَرٍ.

[490] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ نبی ﷺ اس وادی میں پڑاؤ کرتے جو مرالظہران کے نشیب میں مقام صفراوات سے اترتے وقت مدینے کی جانب ہے۔ آپ اس وادی کے نشیب میں پڑاؤ کرتے جو مکہ جاتے ہوئے راستے کی بائیں جانب واقع ہے۔ آپ جہاں اترتے اس میں اور عام راستے کے درمیان ایک پتھر پھینکنے کا فاصلہ ہوتا۔

فائدہ: چھٹی منزل: یہ منزل مرالظہران کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ وہاں کے لوگ اس مقام کو بطن مرو کہتے ہیں۔ یہ ایک وادی ہے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ صرف 16 میل رہ جاتا ہے۔ اس جگہ جو پانی کی گزرگاہ ہے، وہاں رسول اللہ ﷺ نے قیام فرمایا تھا، نیز اس پانی کا بہاؤ مکے کی طرف نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہے۔

---

[1] فتح الباري: 737/1. [2] فتح الباري: 737/1.

٤٩١ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَنْزِلُ بِذِي طُوًى وَّيَبِيتُ حَتّٰى يُصْبِحَ يُصَلِّي الصُّبْحَ حِينَ يَقْدَمُ مَكَّةَ، وَمُصَلّٰى رَسُولِ اللهِ ﷺ ذٰلِكَ عَلٰى أَكَمَةٍ غَلِيظَةٍ لَيْسَ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِي بُنِيَ ثَمَّ وَلٰكِنْ أَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ عَلٰى أَكَمَةٍ غَلِيظَةٍ. [انظر: ١٧٦٧، ١٧٦٩]

[491] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا کہ نبی ﷺ مقام ذی طوی میں اترا کرتے اور رات یہیں گزارا کرتے تھے۔ صبح ہوتی تو نماز فجر یہیں پڑھ کر مکہ مکرمہ کو روانہ ہوتے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ ایک بڑے ٹیلے پر تھی۔ یہ وہ جگہ نہیں جہاں آج مسجد بنی ہوئی ہے بلکہ اس کے نشیب میں بڑا ٹیلا واقع ہے۔

٤٩٢ - وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ حَدَّثَهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اسْتَقْبَلَ فُرْضَتَيِ الْجَبَلِ الَّذِي بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَبَلِ الطَّوِيلِ نَحْوَ الْكَعْبَةِ، فَجَعَلَ الْمَسْجِدَ الَّذِي بُنِيَ ثَمَّ يَسَارَ الْمَسْجِدِ بِطَرَفِ الْأَكَمَةِ، وَمُصَلَّى النَّبِيِّ ﷺ أَسْفَلَ مِنْهُ عَلَى الْأَكَمَةِ السَّوْدَاءِ تَدَعُ مِنَ الْأَكَمَةِ عَشَرَةَ أَذْرُعٍ أَوْ نَحْوَهَا، ثُمَّ تُصَلِّي مُسْتَقْبِلَ الْفُرْضَتَيْنِ مِنَ الْجَبَلِ الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَ الْكَعْبَةِ.

[492] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا کہ نبی ﷺ نے اس پہاڑ کے دونوں دروں کا رخ کیا جو اس کے اور جبل طویل کے درمیان کعبے کی سمت میں ہے۔ آپ اس مسجد کو جو ٹیلے کے کنارے پر اب وہاں تعمیر ہوئی ہے، اپنی بائیں جانب کر لیتے۔ نبی ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ اس سے نیچے سیاہی مائل ٹیلے پر تھی۔ (اگر تو) ٹیلے سے کم و بیش دس ہاتھ چھوڑ کر وہاں نماز پڑھے تو تیرا رخ سیدھا پہاڑ کی دونوں گھاٹیوں کی طرف ہوگا، یعنی وہ پہاڑی جو تیرے اور بیت اللہ کے درمیان واقع ہے۔

فوائد ومسائل: ① ساتویں منزل: یہ منزل ذوطوی کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ذوطوی مکہ مکرمہ سے تین میل سے کچھ کم فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے سفر کی آخری منزل ہے۔ آپ یہاں قیام فرماتے، پھر نماز فجر پڑھ کر مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے۔ ان روایات میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک ان مقامات کی تفصیل بیان کی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے دوران سفر میں نمازیں ادا کی تھیں۔ زمانۂ قدیم ہی سے اکثر مقامات معدوم ہو چکے ہیں لیکن کچھ مقامات متعین ہیں اور وہاں مساجد بنا دی گئی ہیں۔ واللہ أعلم. ② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے علامہ بغوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جن مساجد میں رسول اللہ ﷺ سے نماز پڑھنا ثابت ہے ان میں سے کسی مسجد کے متعلق نماز پڑھنے کی نذر کر لی جائے تو وہ مساجد ثلاثہ کی طرح عمل کے لیے متعین ہو جائے گی، یعنی اس مسجد میں جا کر نماز ادا کرنا واجب ہو جائے گا۔[1] لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں کیونکہ حدیث کے خلاف ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح مکہ عطا فرمائی تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا: ”اگر تم یہیں مکے میں نماز پڑھ لو تو تمھاری نذر پوری ہو جائے گی۔“[2] ③ امام بخاری رحمہ اللہ

① فتح الباري: 738/1. ② سنن أبي داود، الأيمان والنذور، حديث: 3305.

نے یہاں ان مساجد کا ذکر کیا ہے جو مدینے سے مکہ جاتے ہوئے راستے میں آتی ہیں لیکن مدینہ منورہ میں متعدد مساجد ایسی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی چونکہ وہ امام بخاری رحمہ اللہ کی شرائط صحت پر پوری نہ اترتی تھیں، اس لیے ان کا ذکر نہیں کیا۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں: مسجد قباء، مسجد فتح، مسجد قبلتین، مسجد بنی قریظہ، مسجد شمس، مسجد اجابہ، مسجد مشربۂ ام ابراہیم اور مسجد بغلہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ بعض مساجد ایسی بھی ہیں جن کا آج نام ونشان تک نہیں۔ اب ان کا تذکرہ صرف کتابوں میں ملتا ہے۔[1]

① فتح الباري : 738/1.

سترے سے متعلق احکام و مسائل

صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں أبواب السترة کے الفاظ ہیں، اس بنا پر ہم سترے کی اہمیت وافادیت، وجوب وفرضیت اور ایرادات واشکالات، نیز اس سے متعلقہ دیگر مسائل کو یہاں تفصیل سے بیان کرتے ہیں، امید ہے کہ اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کو سمجھنے میں بھی آسانی رہے گی۔

سترہ اس اوٹ کو کہتے ہیں جسے نمازی اپنے سامنے سے گزرنے والوں سے نماز کی حفاظت کے لیے قائم کر لیتا ہے تاکہ کسی کے سامنے سے گزرنے سے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول نہ ہو، نیز یہ ربط خیال کے لیے ہوتا ہے تاکہ اس کا خشوع متاثر نہ ہو اور اس کی توجہ بھی منتشر نہ ہو بلکہ مناجات الٰہیہ سے بندے اور اللہ کے درمیان جو تعلق قائم ہوتا ہے، سترہ اس کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے کیونکہ نمازی اپنی نماز میں اللہ کے روبرو حاضر ہو کر اس سے مناجات کرتا ہے۔ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی نماز پڑھے تو اپنے سترے کے قریب ہو کر اسے ادا کرے، مبادا شیطان اس کی نماز کو خراب کر دے۔''[1]

نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو شریعت نے اس لیے شیطان کہا ہے کہ وہ اس طرح عبد اور مولیٰ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ شریعت نے اس مواجہت کو سترے کے ذریعے سے محصور کیا ہے تاکہ نمازی کے آگے سے گزرنے والوں کو پریشانی نہ ہو، چنانچہ انھیں حکم ہے کہ وہ سترے کے آگے سے گزریں، اندر سے نہ گزریں، اس کے متعلق سخت تنبیہ ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تو وہ یقیناً شیطان صفت انسان ہے جو عبد اور مولیٰ کے تعلق کو قطع کرنا چاہتا ہے۔ اگر نمازی اس سترے کا اہتمام نہ کرے تو وہ خود تعلقات الٰہیہ کو خراب کرنے کا باعث ہوگا اور اپنی نماز کے اجر وثواب کو کم کرنے کا ذمے دار ہوگا جبکہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی سترے کے بغیر نماز نہ پڑھے بلکہ سترے کے قریب ہو کر کھڑا ہو۔ اور کسی کو اپنے آگے سے نہ گزرنے دے۔ اگر کوئی (روکنے کے باوجود بزور) گزرنے کی کوشش کرے تو اسے سختی سے روکا جائے کیونکہ وہ شیطان ہے۔''[2] نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو شیطان اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ شخص مناجات کے تعلق کو ختم کر دیتا ہے جس طرح دو آدمی اپنے کسی

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث :695. [2] سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث :954.

پرائیویٹ معاملے میں سرگوشی کرتے ہیں، اگر کوئی تیسرا غیر متعلق آدمی درمیان میں آگھسے تو یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے ہماری بات کاٹ دی یا ختم کر دی، اسی طرح نمازی کی مناجات کا معاملہ ہے کہ اس کے آگے سے گزرنے والا مناجات کے تعلق کو ختم کر دیتا ہے۔

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو سترے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور بغیر سترے کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ آپ کا امر وجوب کے لیے اور نہی تحریم کے لیے ہے۔ ہاں! اگر کوئی قرینہ ہو تو امر کو وجوب کے بجائے استحباب اور نہی کو تحریم کے بجائے تنزیہہ پر محمول کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں، لہٰذا اس کا مطلب یہی ہے کہ نماز کے لیے سترہ بنانا واجب اور اس کے بغیر نماز ادا کرنا حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی سے بھی اسی موقف کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے سفر و حضر میں سترے کے ساتھ نماز پڑھنے پر ہمیشگی کی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ نماز عید کے لیے باہر نکلتے تو نماز کے وقت چھوٹے نیزے کو اپنے سامنے گاڑ دینے کا حکم دیتے، پھر آپ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے، دوسرے لوگ آپ کے پیچھے ہوتے، دوران سفر میں بھی آپ ایسا کرتے تھے۔ ①

حضرت عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ میں خود کو دیکھتی کہ چارپائی پر لیٹی ہوتی، رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے، میری چارپائی کو اپنے اور قبلے کے درمیان کر لیتے، پھر نماز پڑھتے، میں اس حالت میں آپ کے سامنے لیٹے رہنے کو ناپسند کرتی تو چارپائی کی پائنتی کی طرف سے کھسک کر لحاف سے نکل جاتی۔ ②

اگر رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہوتے تو مسجد کے کسی ستون کو آگے کرتے اور نماز پڑھتے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع ؓ مسجد نبوی کے مصحف کے قریب والے ستون کے پاس نماز پڑھتے اور فرماتے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ اس کے پاس قصداً نماز پڑھتے تھے۔ ③

دوران سفر میں اگر کوئی دیوار سامنے ہوتی تو اسے سترہ بنایا جاتا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، آپ نے اسے سترہ بنایا، دوران نماز میں بکری کا ایک بچہ آیا جو رسول اللہ ﷺ کے آگے سے گزرنے لگا، آپ اسے روکتے رہے حتی کہ آپ کا بطن مبارک دیوار کے ساتھ لگ گیا اور وہ بچہ آپ کے پیچھے سے گزر گیا۔ ④

صحابۂ کرام ؓ کے آثار سے بھی سترے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حضرت عمر ؓ نے کسی آدمی کو، جو دو ستونوں

① صحيح البخاري، الصلاة، حديث :494. ② صحيح البخاري، الصلاة، حديث :508. ③ صحيح البخاري، الصلاة، حديث :502. ④ سنن أبي داود، الصلاة، حديث :708.

کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا، ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا: اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ۔[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ پالان کو اپنے اور قبلے کے درمیان کرتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے۔[2] حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ مسجد حرام میں اپنی لاٹھی گاڑھ لیتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے۔[3]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ جمعے کے دن سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے کہ بنوابی معیط کے ایک نوجوان نے ان کے آگے سے گزرنا چاہا تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اسے روکا، جب وہ آگے گزرنے سے باز نہ آیا تو آپ نے اسے سینے پر مارا۔[4]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب مؤذن اذان دیتا تو کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جاتے اور جلدی جلدی ستونوں کی طرف بڑھتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور وہ، یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کر رہے ہوتے۔[5]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ستونوں کی طرف رخ اس لیے کرتے تھے تاکہ نماز کے لیے انھیں سترہ بنائیں کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھتے تھے۔[6]

ان آثار سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نماز پڑھتے وقت سترے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ مسجد کے اندر بھی سترے کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی نماز میں ستونوں کی طرف رخ کرتے، ظاہر ہے کہ یہ اہتمام مسجد میں ہوتا تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بذات خود بھی یہی عمل تھا جیسا کہ صحیح بخاری کے باب الصلاۃ إلی الأسطوانۃ میں ہے۔ پھر اہل علم کا اختلاف ہے کہ مسجد حرام میں سترہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ اگر مسجد کے اندر سترے کا تصور نہ ہوتا تو اس اختلاف کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو بیت اللہ کے اندر بھی سترے کا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کعبے کے اندر داخل ہوتے تو سیدھا منہ کر کے سامنے چلے جاتے اور کعبے کے دروازے کو پیٹھ کر کے آگے بڑھ جاتے حتی کہ وہ دیوار جو ان کے سامنے ہوتی تین ہاتھ کے قریب فاصلے پر رہ جاتی، وہاں نماز پڑھتے اور اس جگہ کا قصد کرتے جس کے متعلق حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا تھا کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی۔[7]

---

[1] صحيح البخاري، تعليقًا كتاب الصلاة، باب الصلاة إلى الأسطوانة(95). [2] المصنف لعبدالرزاق : 10/2، حديث :2274. [3] المصنف لابن أبي شيبة : 248/1. [4] صحيح البخاري، الصلاة، حديث :509. [5] صحيح البخاري، الصلاة، حديث :625. [6] فتح الباري :141/2. [7] صحيح البخاري، الصلاة، حديث :506.

اب ہم سترے کے متعلق دیگر مسائل کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں:

✵ سترے کی جسامت: کسی چیز کو سترہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اونچائی پالان کی پچھلی لکڑی کے برابر ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے نمازی کے سترے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''پالان کی پچھلی لکڑی کی طرح۔''[1] مؤخرة الرحل (پالان کی پچھلی لکڑی) کے متعلق امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ بازو کی ہڈی کے برابر ہوتی ہے اور وہ ہڈی ہاتھ کے $\frac{2}{3}$ کے برابر ہے۔ ویسے کسی بھی چیز کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا جائے تو سترے کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔[2] پالان کی لکڑی سے تشبیہ دینے سے مراد اس کی موٹائی نہیں بلکہ اونچائی ہے، یعنی سترہ تقریباً سوا فٹ اونچا ضرور ہونا چاہیے، ویسے اس کی موٹائی تیر کے برابر ہونی چاہیے جیسا کہ تیر کو سترہ بنانے کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سترے کے لیے زمین پر خط کھینچنا درست نہیں۔ جن احادیث میں خط کھینچنے کا ذکر ہے، وہ صحیح نہیں ہیں۔

✵ سترے کے قریب کھڑے ہونا: جب آدمی نماز پڑھے تو اسے سترے کے قریب کھڑا ہونا چاہیے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے سترے کے قریب کھڑا ہونا چاہیے تا کہ شیطان اس کی نماز نہ توڑ دے۔[3] بکری کے گزرنے اور تین ہاتھ کے فاصلے میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ نمازی اور سترے کے درمیان کم از فاصلہ بکری کے گزرنے جتنا اور زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ ہونا چاہیے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سجدے کی حالت میں بکری کے گزرنے جتنا اور قیام کی حالت میں تین ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔

جن چیزوں کے نمازی کے آگے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے: سترے کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ نمازی کے خشوع خضوع میں فرق نہ پڑے اور شیطان وسوسے ڈال کر نماز کا ثواب کم یا ضائع نہ کر دے۔ رسول اکرم ﷺ نے سترے کو شیطان سے بچاؤ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اگر نمازی کے آگے سترہ موجود ہو تو سترے سے ماوراء گزرنے والا کوئی بھی انسان یا حیوان انسان کے خشوع خضوع کو کم کرتا ہے نہ اس سے نماز ہی باطل ہوتی ہے۔ اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے۔ یہ بات بھی متفق علیہ ہے کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے کافی ہے، ہر شخص کو نماز باجماعت میں الگ سے سترہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے سترہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ سترہ نہ ہونے کی وجہ سے نماز کے خشوع خضوع اور ثواب میں کمی آ جاتی ہے، تاہم صحت نماز کے لیے سترہ شرط نہیں۔ حدیث ابوذر میں بیان ہوا ہے کہ اگر کسی نے سترہ قائم نہ کیا یا اس کے اور سترے کے درمیان سے عورت، گدھا یا کالا کتا گزر گیا تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اس

---

[1] صحيح مسلم، الصلاة، حديث:1113(500). [2] مسلم مع النووي : 195/1. [3] سنن أبي داود، الصلاة، حديث :695.

حدیث میں قطع صلاۃ کے مفہوم کے تعین میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے: ✵ اہل علم کے ایک گروہ نے قطع صلاۃ کے اس حکم کو منسوخ قرار دیا ہے اور حدیث [لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ] ''نماز کو کوئی چیز قطع نہیں کرتی۔''[1] کو اس کا ناسخ کہا ہے لیکن ان کا دعوائے نسخ بلا دلیل ہے جیسا کہ امام نووی اور ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] شیخ البانی رحمہ اللہ نے حدیث [لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ] کو ضعیف قرار دیا ہے اور قطع صلاۃ والی روایت کو صحیح قرار دیا ہے، لہٰذا نسخ تو تب ثابت ہوگا جب دونوں روایات کو صحیح تسلیم کریں۔ لیکن اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی نسخ کی بجائے دونوں حدیثوں کے مابین تطبیق اور جمع کی صورت نکالیں گے جیسا کہ معروف قاعدہ ہے کہ نصوص کے تعارض کی صورت میں اگر جمع ممکن ہو تو سب سے پہلے جمع کریں گے کہ مذکورہ حدیث کے منطوق کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم کہیں گے کہ ان تین چیزوں کا حصر ہے کہ ان سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور باقی سے خشوع خضوع میں فرق آ جاتا ہے۔ شیخ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ نے محلی ابن حزم (14/1) کے حاشیہ میں نسخ والا موقف اختیار کیا ہے لیکن جن روایات کو بنیاد بنایا ہے وہ ضعیف ہیں۔

✵ اہل علم کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ مذکورہ حدیث میں قطع سے نماز کا باطل ہونا مراد نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے کہ نماز کے خشوع خضوع میں کمی آ جاتی ہے اور نماز کی برکت ختم ہو جاتی ہے۔ ✵ اہل علم کے تیسرے گروہ نے حدیث کا ظاہری مفہوم مراد لیا کہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نماز کی برکت تو سترہ نہ ہونے کی صورت میں مرد کے گزرنے سے بھی ختم ہو جاتی ہے اور خشوع خضوع میں کمی آ جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو سختی سے روکنے اور اسے گناہ گار کہنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، لہٰذا ان تین چیزوں کا بطور خاص ذکر کرنا اپنے اندر ایک زائد مفہوم رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے گزرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور دیگر چیزوں کے گزرنے سے خشوع خضوع میں کمی آ جاتی ہے ورنہ یہ تحصیل حاصل ہوگی اور حصر بے معنی ہوگا جو رسول اللہ ﷺ سے ممکن نہیں۔ پھر اس موقف کی تائید سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جنھیں شیخ البانی رحمہ اللہ نے الصحیحہ میں ذکر کیا ہے، وہ الفاظ یہ ہیں: [تُعَادُ الصَّلَاةُ مِنْ مَمَرِّ الْحِمَارِ وَالْمَرْأَةِ وَالْكَلْبِ الْأَسْوَدِ] ''گدھے، عورت اور سیاہ فام کتے کے گزرنے سے نماز لوٹائی جائے۔''[3] یہی موقف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سیدنا انس، سیدنا ابوہریرہ، سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا ہے۔ تابعین میں سے حسن بصری، ابوالاحوص اور ائمہ میں سے امام احمد رحمہ اللہ اور متاخرین میں سے امام شوکانی اور شیخ البانی رحمہما اللہ ان مذکورہ تین چیزوں کے، نمازی کے آگے سے

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 719. [2] المجموع: 25/3. [3] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني: 959/7، حديث: 3323.

گزرنے پر نماز کے باطل ہونے کے قائل ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (أصل صفة صلاة النبي : 130/1، ومحلّٰی ابن حزم : 8/4، و فتاوٰی الدین الخالص : 581/3) یاد رہے! عورت سے مراد بالغ عورت ہے جیسا کہ دوسری روایت میں صراحت ہے۔ واللہ أعلم.

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھی تین چیزوں کے نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز کیوں باطل ہوتی ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ اور حکمت یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے انھی تین چیزوں کو خاص کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ تینوں چیزیں وجود شیطان اور اس کی فتنہ انگیزی کی زیادہ گمان کی جاتی ہیں۔ دوسری چیزوں کی بہ نسبت ان تینوں سے نماز کے فاسد ہونے کا زیادہ امکان ہے۔ امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے کہ عورت چھپانے کی چیز ہے، چنانچہ جب یہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے۔[1] اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عورت آتی ہے تو بصورت شیطان آتی ہے اور جب واپس جاتی ہے تب بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے۔[2] اور گدھے کی آواز کے متعلق وارد ہے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر آواز نکالتا ہے۔[3] اور جہاں تک کتے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو حدیث میں [اَلْكَلْبُ الْأَسْوَدُ شَيْطَانٌ] کی وضاحت موجود ہے۔ مطلق کتے کی خباثت بھی جانی پہچانی ہے کہ جہاں کتا ہوتا ہے وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔[4] اور جس شخص نے ایسا کتا پالا جس کی شرع میں اجازت نہیں تو اس نے ہر روز اپنے اجر و ثواب میں سے دو قیراط کی کمی کر لی۔[5]

سترے کے متعلق کچھ اشکالات و اعتراضات بھی پیش کیے جاتے ہیں، جو جوابات سمیت حسب ذیل ہیں:

* حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اور فضل ایک گدھی پر سوار ہو کر آئے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے جبکہ آپ میدان عرفہ میں فرض نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ کے اور ہمارے درمیان کوئی چیز بطور سترہ حائل نہ تھی۔[6]

(جواب) اس کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق راوی ضعیف ہے۔[7] امام ابن خزیمہ نے اس حدیث پر بحث کر کے خود اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[8] مسند بزار کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے آگے کوئی چیز بطور سترہ نہ تھی۔[9] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بایں

---

① جامع الترمذي، الرضاع، حديث : 1173. ② صحيح مسلم، النكاح، حديث : 3407(1403). ③ سنن أبي داود، الأدب، حديث : 5102. ④ صحيح مسلم، اللباس والزينة، حديث : 5514(2106). ⑤ صحيح البخاري، الذبائح والصيد، حديث 5482,5481,5480. ⑥ صحيح ابن خزيمة : 25/2. ⑦ تهذيب التهذيب : 376/2. ⑧ صحيح ابن خزيمة : 28/2. ⑨ فتح الباري : 226/1.

الفاظ نقل کیا ہے: آپ کے سامنے کوئی ایسی چیز سترہ نہ تھی جو ہمارے اور آپ کے درمیان حائل ہو۔[1] اس کی سند میں بھی عبدالکریم بن ابی المخارق ہے جس کے متعلق پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ جن حضرات نے اس کی تصحیح کی ہے انھوں نے اسے، یعنی عبدالکریم بن ابی المخارق کو عبدالکریم الجزری خیال کیا ہے۔ بفرض محال اگر یہ روایت ثابت بھی ہو جائے تو اس سے مطلق سترے کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ امام شوکانی لکھتے ہیں کہ حدیث مطلق طور پر سترے کی نفی نہیں کرتی بلکہ ایسے سترے کی نفی کرتی ہے جو لوگوں اور آپ کے درمیان حائل ہو، جیسے بلند دیوار وغیرہ جو دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے مانع ہو۔[2] محدث عراقی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔[3]

✸ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھلی فضا میں نماز پڑھی اور آپ کے سامنے کوئی چیز بطور سترہ نہ تھی۔[4]

(جواب) اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ نامی راوی ضعیف ہے۔[5] مکمل بحث کے لیے مرعاۃ المفاتیح:(504/2) اور مسند ابی یعلی:(15/3)، حدیث:2994 کا مطالعہ کریں۔

✸ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس آئے اور ہم اپنی کھیتی میں تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ نے صحرا میں نماز پڑھی۔ آپ کے سامنے سترہ نہیں تھا۔ ہماری گدھی اور کتیا آپ کے سامنے کھیل رہی تھیں تو آپ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔[6]

(جواب) اس روایت میں انقطاع ہے کیونکہ عباس بن عبیداللہ جو حضرت فضل رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے اپنے چچا حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کو نہیں پایا۔[7] البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے مقبول کہا ہے لیکن مقبول راوی کی روایت اس وقت قبول ہوتی ہے جب اس کی متابعت ہو، لیکن اس روایت کی کوئی متابعت نہیں ہے۔

✸ کثیر بن کثیر بن المطلب بن ابی وداعہ سے روایت ہے، انھوں نے اپنے کسی گھر والے سے سنا، وہ اس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ بنو سہم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے سامنے سے گزر رہے تھے، آپ کے اور کعبے کے درمیان کوئی سترہ نہ تھا۔[8]

(جواب) یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ کثیر نے یہ روایت اپنے باپ سے نہیں سنی بلکہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے سنی ہے اور اس کا نام نہیں لیا جیسا کہ سوال کرنے پر خود کثیر نے بتایا۔ وہ کہتے

---

[1] نیل الأوطار: 12/3. [2] نیل الأوطار: 12/3. [3] مرعاۃ المفاتیح: 499/3. [4] مسند أحمد: 224/1. [5] مجمع الزوائد: 66/2. [6] سنن أبي داود، الصلاۃ، حدیث: 718. [7] مرعاۃ المفاتیح: 504/2. [8] مسند أحمد: 399/6.

ہیں: میں نے یہ روایت اپنے باپ سے تو نہیں سنی لیکن اپنے کسی گھر والے سے سن کر اپنے دادا سے روایت کی ہے۔[1]
اس حدیث کے متعلق علامہ البانی مرحوم نے سیر حاصل بحث کی ہے۔[2]

✸ اس سلسلے میں صحیح بخاری کی ایک روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ منیٰ میں لوگوں کو دیوار کے بغیر نماز پڑھا رہے تھے۔[3]

اس روایت میں ''بغیر دیوار کے'' سے مراد بغیر سترہ ہے جیسا کہ امام شافعی اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ اس کا مکمل جواب ہم آئندہ حدیث بخاری کی تشریح کرتے ہوئے پیش کریں گے۔ اس مقام پر یہی کافی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ یا امام بیہقی رحمہ اللہ کے بیان کردہ معنی امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کے خلاف ہیں جس کی وضاحت آئندہ ہوگی۔ الغرض نماز کے لیے سترہ ضروری ہے، اس کے خلاف جو بھی روایات پیش کی جاتی ہیں وہ محدثین کے معیارِ صحت پر پوری نہیں اترتیں۔ واللہ المستعان.

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي : 273/2. [2] سلسلة الأحاديث الضعيفة : 326/2. [3] صحيح البخاري، الصلاة، حديث : 493.

أَبْوَابُ سُتْرَةِ الْمُصَلِّي

سترے سے متعلق احکام ومسائل

(٩٠) بَابٌ: سُتْرَةُ الْإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهُ

باب: 90- امام کا سترہ مقتدیوں کا بھی سترہ ہے

وضاحت: تراجم کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک اصول ہے کہ بعض اوقات اگر کوئی روایت دیگر کتب میں مروی ہو اور اس کا مضمون صحیح ہو تو اسے عنوان میں ذکر کر دیتے ہیں اور جن روایات کے مضامین صحیح نہ ہوں ان کی تردید فرماتے ہیں۔ مذکورہ بالا عنوان بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس کے الفاظ ایک مرفوع روایت کے الفاظ ہیں جسے امام طبرانی نے (المعجم الأوسط: 144/1، حدیث: 465) میں روایت کیا ہے لیکن سوید راوی کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف طور پر مذکورہ الفاظ مروی ہیں جسے امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف (18/2) میں بیان کیا ہے۔ بہر حال اس ضعیف روایت کا مضمون صحیح تھا، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی تائید میں روایات پیش کی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دوران جماعت میں ہر شخص کو الگ الگ سترہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ امام کے لیے جو سترہ قائم کیا گیا ہے وہی مقتدیوں کے لیے کافی ہوگا۔ البتہ مالکی حضرات کچھ تفصیل کرتے ہیں کہ مقتدیوں کا سترہ خود امام ہے اور امام کا سترہ وہ چیز ہے جو امام کے سامنے قائم کی جائے۔ یہ فرق اس صورت میں واضح ہوگا کہ اگر نماز سترے کے بغیر ہو رہی ہو اور کوئی امام کے آگے سے گزر جائے تو جو لوگ امام کے سترے ہی کو مقتدیوں کا سترہ قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک امام اور مقتدیوں کی نماز متاثر ہوگی اور جو لوگ خود امام کو مقتدی حضرات کے لیے سترہ کہتے ہیں ان کے نزدیک امام کے آگے سے گزرنا خود امام کے لیے ضرر رساں ہوگا، مقتدی حضرات کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک امام کا سترہ صرف امام ہی کا سترہ نہیں بلکہ مقتدیوں کا بھی سترہ ہے۔[1]

٤٩٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، عَنْ عُبَيْدِاللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ ابْنِ عُتْبَةَ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ قَالَ: أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلَى حِمَارٍ أَتَانٍ وَّأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي

[493] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں جوانی کے قریب پہنچا ہوا تھا جب گدھی پر سوار ہو کر نماز کے لیے آیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ منیٰ میں دیوار کے علاوہ (کسی اور سترے) کی طرف رخ کر کے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ میں نمازیوں کی صف کے ایک

[1] فتح الباري: 740/1.

بِالنَّاسِ بِمِنًى إِلَى غَيْرِ جِدَارٍ، فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ فَنَزَلْتُ، فَأَرْسَلْتُ الْأَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ، فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ أَحَدٌ. [راجع: ٧٦]

حصے کے سامنے سے گزرا اور اتر گیا۔ پھر میں نے گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود نماز کی صف میں شامل ہو گیا لیکن کسی نے مجھ پر اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ کیا۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے آگے دیوار کے علاوہ کوئی اور سترہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نماز میں کھڑے لوگوں کے سامنے سے گزرے تو کسی نے اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ سب سترے کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اس لیے کسی کے اعتراض کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نفئ جدار کا فائدہ تبھی ہے جب کسی دوسری چیز کا سترہ تسلیم کیا جائے بصورت دیگر یہ نفی لغو ٹھہرے گی، لیکن حافظ ابن حجر، جو تراجم سے احادیث کی مطابقت پیدا کرنے میں بڑے ماہر ہیں، اس مقام پر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال محل نظر ہے کیونکہ اس میں صراحت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سترے کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے بلکہ امام بیہقی نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''سترے کے بغیر نماز پڑھنے کا بیان۔'' اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ امام شافعی نے إلی غیر جدار کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سترے کے بغیر نماز پڑھ رہے تھے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے کہ ہم نے کتاب العلم میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام شافعی کے موقف کی تائید میں روایت بزار بھی ذکر کی تھی۔[1] مسند بزار کے حوالے سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مذکورہ روایت بایں الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے آگے کوئی چیز بطور سترہ نہ تھی۔[2] ② یہ سب باتیں اگرچہ بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو امام بخاری رحمہ اللہ کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں إلی غیر جدار کے الفاظ ہیں اور لفظ غیر ہمیشہ صفت کے لیے آتا ہے، اس لیے تقدیری عبارت یوں ہوگی: [يُصَلِّي بِالنَّاسِ بِالْمِنٰى إِلٰى شَيْئٍ غَيْرِ جِدَارٍ] یعنی رسول اللہ ﷺ منیٰ میں دیوار کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا رہے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کا عام معمول بھی یہی تھا کہ آپ جب کھلی فضا میں نماز پڑھاتے تو سترہ قائم فرما لیتے تھے، اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ کا معمولات نبوی کے مطابق وہی مفہوم مراد لینا بہتر ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے سمجھا ہے، نیز حضرت ابن عباس فرما رہے ہیں کہ میرے اس عمل پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ یہ بھی امام بخاری کی دلیل ہے کیونکہ جب سترہ قائم تھا تو کسی کے لیے اعتراض کا موقع ہی نہیں تھا۔ اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عینی لکھتے ہیں: ''اس حدیث کی عنوان سے بایں طور مطابقت ہے کہ إلی غیر جدار کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں سترہ تھا کیونکہ غیر کا لفظ ہمیشہ صفت کے لیے آتا ہے۔ تقدیری عبارت یوں ہو گی کہ ''دیوار کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف'' وہ چیز لاٹھی بھی ہو سکتی ہے، نیزہ بھی ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔''[3] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس حدیث کے متعلق شرح تراجم بخاری میں یوں رقم طراز ہیں: ''اس عنوان سے امام بخاری کی غرض یہ ہے کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ اگر کوئی امام کے سترے کی موجودگی میں مقتدیوں کے آگے سے گزر

① فتح الباري: 739/1. ② فتح الباري: 226/1. ③ عمدة القاري: 569/2.

جائے تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ اور امام بخاری ؒ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ امام شافعی کا إلى غير جدار کے معنی إلى غير سترة کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے سامنے دیوار کے علاوہ کوئی اور سترہ تھا اگرچہ وہ نیزہ یا برچھا وغیرہ ہو کیونکہ آپ کے احوال کے تتبع سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب نبی ﷺ صحرا وغیرہ میں نماز پڑھتے تو آپ کے سامنے نیزہ گاڑا جاتا تھا، اسی لیے حضرت ابن عباس ؓ کے استدلال میں اشکال پیدا ہوگیا ہے کیونکہ کسی شخص کے انکار نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز سترے کی طرف تھی اور قوم کا سترہ وہی ہوتا ہے جو امام کا سترہ ہو۔ اس حدیث کا ظاہری مفہوم یہی ہے، اسے خوب سمجھ لو۔ یہ توجیہ بھی ممکن ہے کہ امام شافعی کے قول إلى غير سترة سے مراد یہ ہو کہ دیوار کے سترے کے بغیر نماز پڑھی۔ اس سے مطلق سترے کی نفی نہیں۔ اس توجیہ سے امام شافعی اور دیگر محدثین ؒ کے موقف میں کوئی اختلاف نہیں رہتا۔“ واضح رہے کہ عربی زبان میں لفظ غیر اگرچہ نفئ محض کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن امام بخاری ؒ کے تصرف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں غیر بطور صفت استعمال ہوا ہے، اسی معنی کی بنیاد پر دیوار کی نفی کا فائدہ ظاہر ہوتا ہے اور اگر وہاں دیوار نہ تھی اور نہ کوئی دوسری چیز ہی، تو دیوار کی نفی کرنا لغو ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے مسند بزار کے حوالے سے جو حدیث بیان کی ہے، اس پر ہماری گزارشات پہلے گزر چکی ہیں۔

٤٩٤ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ عَنْ نَّافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيدِ أَمَرَ بِالْحَرْبَةِ فَتُوضَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَيُصَلِّي إِلَيْهَا وَالنَّاسُ وَرَاءَهُ، وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السَّفَرِ، فَمِنْ ثَمَّ اتَّخَذَهَا الْأُمَرَاءُ. [انظر: ٤٩٨، ٩٧٢، ٩٧٣]

[494] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عید کے دن (مدینے سے) باہر تشریف لے جاتے تو چھوٹا نیزہ گاڑنے کا حکم دیتے۔ جب اس کی تعمیل کر دی جاتی تو آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔ دوران سفر میں بھی آپ ایسا ہی کرتے تھے۔ (مسلمانوں کے) خلفاء نے بھی اسی وجہ سے برچھا ساتھ رکھنے کی عادت اپنالی ہے۔

فوائد و مسائل: ① اس روایت سے امام بخاری ؒ کا قائم کردہ عنوان اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عیدین کی نماز پڑھانے کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو نیزہ وغیرہ آپ کے ساتھ ہوتا اور آپ کے سامنے نصب کر دیا جاتا، پھر آپ نماز پڑھاتے، اسی سترے کو مقتدیوں کے لیے بھی کافی خیال کیا جاتا تھا کیونکہ مقتدیوں کے لیے الگ سترے کا ہونا کسی روایت سے ثابت نہیں، نیز یہ بھی تفصیل نہیں کہ نیزے کو صرف امام کے لیے سترہ مانا جائے، پھر امام کو قوم کے حق میں سترہ قرار دیا جائے۔ ② سعد القرظ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیزہ حضرت نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کو بطور ہدیہ بھیجا تھا جسے آپ نے اس طرح کی ضروریات کے لیے استعمال فرمایا جبکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیزہ حضرت زبیر بن عوام ؓ کو غزوۂ احد میں ایک مشرک سے ہاتھ لگا تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے ان سے لے لیا۔ حافظ ابن حجر ؒ نے ان دونوں روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے حضرت زبیر بن عوام ؓ والا نیزہ استعمال ہوتا تھا پھر نجاشی کا ہبہ کیا ہوا نیزہ استعمال ہونے

لگا۔[1] ③ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں نیزہ وغیرہ ساتھ رکھنے میں مختلف مصلحتیں تھیں جن میں ایک مصلحت یہ تھی کہ اسے کھلے میدان میں نماز کے وقت بطور سترہ استعمال کیا جاتا تھا، نیز بوقت ضرورت دشمن سے بچاؤ کے بھی کام آ سکتا ہے۔

٤٩٥ - حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَوْنِ بْنِ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى بِهِمْ بِالْبَطْحَاءِ - وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ - الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ. [راجع: ١٨٧]

[495] حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے وادی بطحاء میں لوگوں کو نماز پڑھائی اور آپ کے سامنے نیزہ گاڑ دیا گیا۔ آپ نے (سفر کی وجہ سے) ظہر کی دو رکعت ادا کیں، اسی طرح عصر کی بھی دو رکعات پڑھیں۔ آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے گزر رہے تھے۔

فوائد ومسائل: ① اس روایت میں واضح طور پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے نزدیک ایک میدانی علاقے وادئ بطحاء میں ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی اور سفر کی بنیاد پر ان میں قصر کی، نیز سترے کے طور پر آپ کے سامنے نیزہ گاڑ دیا گیا، چنانچہ دوران نماز میں سترے کے آگے سے عورتیں اور گدھے گزرتے رہے لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کی گئی۔ ② اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کے سترے ہی کو مقتدیوں کے لیے کافی خیال کر لیا گیا، ان کے لیے الگ سترے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ روایت میں ہے کہ آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے گزر رہے تھے۔ اس سے مراد آپ کے اور نیزے کے درمیان سے گزرنا نہیں بلکہ نیزے کے آگے سے گزرنا مراد ہے جیسا کہ صحیح بخاری ہی کی ایک روایت میں وضاحت ہے کہ میں نے لوگوں اور چوپاؤں کو دیکھا کہ وہ نیزے کے آگے سے گزر رہے تھے۔[2] صحیح بخاری ہی کی روایت میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ کے سامنے نیزہ نصب کیا، پھر نماز کے لیے تکبیر کہی۔[3]

(٩١) بَابٌ: قَدْرُ كَمْ يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ بَيْنَ الْمُصَلِّي وَالسُّتْرَةِ؟

باب: 91- نمازی اور سترے میں فاصلے کی مقدار

وضاحت: سترہ نصب کرنے کے دو فائدے ہیں: ✱ نماز کی حد متعین ہو جاتی ہے، یعنی نمازی سترے کے ذریعے سے یہ واضح کر دیتا ہے کہ میری نماز کا تعلق اتنے حصے سے ہے اگر کوئی اس کے درمیان سے گزرتا ہے تو وہ میرے اور میرے مولیٰ کے درمیان حائل ہونا چاہتا ہے۔ اس صورت میں میرا حق ہے کہ اسے کسی طرح بھی اپنے آگے سے نہ گزرنے دوں۔ ✱ گزرنے والوں کے لیے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ سترے کے باہر سے گزرنا چاہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس عنوان میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ فاصلہ کتنا ہونا چاہیے۔

٤٩٦ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ زُرَارَةَ قَالَ: أَخْبَرَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِيهِ، عَنْ سَهْلٍ

[496] حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جائے نماز اور دیوار کے درمیان اس قدر

① فتح الباري: 741/1. ② صحيح البخاري، اللباس، حديث: 5786. ③ صحيح البخاري، الأذان، حديث: 633.

قَالَ: كَانَ بَيْنَ مُصَلَّى رَسُولِ اللهِ ﷺ وَبَيْنَ الْجِدَارِ مَمَرُّ الشَّاةِ. [انظر: ٧٣٣٤]

فاصلہ تھا کہ بکری گزر سکتی تھی۔

٤٩٧ - حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ قَالَ: كَانَ جِدَارُ الْمَسْجِدِ عِنْدَ الْمِنْبَرِ مَا كَادَتِ الشَّاةُ تَجُوزُهَا.

[497] حضرت سلمہ بن اکوع ؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کی دیوار قبلہ، منبر سے اتنی قریب تھی کہ بمشکل بکری کے گزرنے کی گنجائش تھی۔

فوائد ومسائل: ① پہلی (سہل بن سعد کی) روایت میں دیوار سے مراد دیوار قبلہ ہے جیسا کہ ایک دوسری روایت میں حضرت سہل بن سعد فرماتے ہیں کہ دیوار قبلہ اور منبر کے درمیان بکری کے گزرنے کی جگہ ہوتی تھی۔[1] دوسری روایت مسند اسماعیلی میں ان الفاظ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں منبر اور دیوار قبلہ کے درمیان صرف اتنا فاصلہ تھا کہ بمشکل ایک بکری گزر سکتی تھی۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔[2] ② رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد میں محراب نہیں تھا۔ آپ منبر کے برابر بائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے۔ گویا منبر جتنی دور تک پھیلا ہوا تھا اتنی جگہ آپ کے سامنے کی جانب میں موجود تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اور دیوارِ قبلہ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہوتا جتنا منبر اور دیوار قبلہ کے درمیان ہوتا تھا۔ چونکہ دیوار قبلہ ہی سترہ تھی، اس لیے نمازی اور سترے کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے جتنا رسول اللہ ﷺ کے منبر اور دیوار قبلہ کے درمیان تھا اور وہ فاصلہ راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے بکری کا گزرنا بھی مشکل ہوتا تھا۔ بعض روایات میں اس فاصلے کی تعیین تین ہاتھ سے کی گئی ہے۔[3] اس کی تطبیق دو طرح سے ہے: * نمازی اور سترے کے درمیان کم از کم بکری گزرنے کی جگہ اور زیادہ سے زیادہ تین ہاتھ کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ * قیام وقعود کی حالت میں تین ہاتھ اور رکوع وسجود کی حالت میں بکری گزرنے کی جگہ جتنا فاصلہ ہونا چاہیے۔[4] ③ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نمازی کو سترے کے اتنا قریب کھڑا ہونا چاہیے کہ آسانی سے سجدہ کیا جا سکے۔ اسی طرح صفوں کے درمیان بھی اتنا فاصلہ ہونا چاہیے کہ پچھلی صف والے بآسانی سجدہ کر سکیں۔ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی سترے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو اس کے قریب ہو کر کھڑا ہونا چاہیے تاکہ شیطان اس کی نماز میں خلل انداز نہ ہو سکے۔''[5] ④ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ نمازی اس مقدار سے تجاوز نہ کرے تاکہ لوگوں پر راستے کو تنگ کرنے کی نوبت نہ آئے اور نہ وہ جگہ تنگ ہو جو قدم سے پیشانی رکھنے کی جگہ تک ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ٹھہرنے کی جگہ اور دیوار قبلہ کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ تھا، چنانچہ جب اتنا فاصلہ ہو تو جائے سجدہ اور دیوار قبلہ کے درمیان بکری گزرنے کا راستہ باقی رہتا ہے۔

(٩٢) بَابُ الصَّلَاةِ إِلَى الْحَرْبَةِ

باب: 92- نیزے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

---

① صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، حديث: 7334. ② فتح الباري: 743/1. ③ صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 506. ④ فتح الباري: 743/1. ⑤ سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 695، و فتح الباري: 743/1.

وضاحت: معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ آئندہ چند ابواب میں سترے کے متعلق توسع اور تعمیم کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سترہ خواہ لکڑی کا ہو یا لوہے کا، وہ درخت ہو یا جانور، انھیں سترہ بنایا جا سکتا ہے۔ گویا سترے کے متعلق نہ تو ذی روح یا بے جان ہونے کی قید ہے اور نہ کسی خاص مادے کا ہونا شرط ہے بلکہ ہر وہ چیز جو نمازی کی سامنے جہت میں روک کا کام دے سکے، مثلاً: کوئی درخت، ستون، جانور، چارپائی اور اس طرح کی دیگر اشیاء جن کی کم از کم اونچائی ایک ذراع اور موٹائی تیر کے برابر ہو، سترہ بننے کے قابل ہیں۔

٤٩٨ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ عُبَيْدِ اللهِ قَالَ: أَخْبَرَنِي نَافِعٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُرْكَزُ لَهُ الْحَرْبَةُ فَيُصَلِّي إِلَيْهَا.

[راجع: ٤٩٤]

[498] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کے لیے نیزہ گاڑ دیا جاتا تھا اور آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

فائدہ: حربہ اس نیزے کو کہتے ہیں جس کا پیکان نوک دار ہو۔ عام طور پر شارحین نے مقصد عنوان سے بحث نہیں کی۔ البتہ نماز میں بت پرستوں کی مشابہت سے اجتناب کرنا شریعت کا ایک اصول ہے۔ چونکہ ہتھیار ایک ایسی چیز ہے جس کی بعض فرقوں کے ہاں تعظیم کی جاتی ہے ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہوں کہ شریعت میں اس قسم کے تصوف کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ شریعت کی رو سے ہتھیاروں کو آگے نصب کر کے نماز پڑھی جا سکتی ہے، اس میں نہ کوئی تشبہ ہے اور نہ ان کی تعظیم ہی مقصود ہوتی ہے۔ واللہ أعلم.

(٩٣) بَابُ الصَّلَاةِ إِلَى الْعَنَزَةِ

باب: 93- چھوٹے نیزے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

٤٩٩ - حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا عَوْنُ بْنُ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ فَأُتِيَ بِوَضُوءٍ، فَتَوَضَّأَ فَصَلَّى بِنَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ، وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ، وَّالْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ يَمُرُّونَ مِنْ وَّرَائِهَا. [راجع: ١٨٧]

[499] حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ کے سامنے وضو کا پانی پیش کیا گیا، چنانچہ آپ نے وضو فرمایا اور ہمیں ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی جبکہ آپ کے سامنے چھوٹا نیزہ تھا، عورتیں اور گدھے نیزے کے آگے سے گزر رہے تھے۔

٥٠٠ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمِ بْنِ بَزِيعٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شَاذَانُ عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ عَطَاءِ بْنِ أَبِي مَيْمُونَةَ قَالَ: سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ

[500] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ جب رفع حاجت کے لیے نکلتے تو میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے چلتے۔ ہمارے پاس نوک

النَّبِيُّ ﷺ إِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهِ تَبِعْتُهُ أَنَا وَغُلَامٌ، وَمَعَنَا عُكَّازَةٌ أَوْ عَصًا أَوْ عَنَزَةٌ وَّمَعَنَا إِدَاوَةٌ، فَإِذَا فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهِ نَاوَلْنَاهُ الْإِدَاوَةَ. [راجع: ١٥٠]

دار لکڑی یا ڈنڈا یا چھوٹا نیزہ ہوتا اور ہم پانی کی چھاگل بھی ہمراہ لے جاتے۔ جب آپ اپنی حاجت سے فارغ ہو جاتے تو ہم آپ کو چھاگل دے دیتے۔

فائدہ: پہلی روایت تو عنوان کے مطابق ہے کہ رسول اللہ ﷺ چھوٹے نیزے کو سامنے کر کے اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے لیکن دوسری روایت میں عصا اور عنزہ کو ساتھ لے جانے کا تو ذکر ہے لیکن اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں ہے مگر چونکہ ان چیزوں کو ساتھ لے جانے کا ایک اہم فائدہ ان کا سترے کے طور پر استعمال بھی رہا ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے صرف اتنی مناسبت سے اپنا عنوان ثابت کر دیا، نیز روایت میں کلمۂ اَوْ شک کے لیے نہیں بلکہ تنویع کے لیے ہے۔ گویا راوی یہ کہنا چاہتا ہے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ساتھ ہوتی تھی، جس سے دیگر فوائد کے ساتھ ساتھ سترے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ واللہ أعلم.

(٩٤) بَابُ السُّتْرَةِ بِمَكَّةَ وَغَيْرِهَا

باب: 94- مکہ اور غیر مکہ میں سترے کا اہتمام

وضاحت: سترے کی حقیقت یہ ہے کہ نمازی اپنے لیے اس کے ذریعے سے حد بندی کرتا ہے کہ یہاں تک کی جگہ محفوظ ہے۔ اس جگہ اللہ کی رحمت کا نزول ہو رہا ہے اور یہی میری توجہ کا مرکز ہے۔ یہاں سے گزرنا درست نہیں۔ اس کا دوسرا فائدہ ربط خیال ہے، یعنی نمازی دوران نماز میں اس کے ذریعے سے اپنے خیالات کو منتشر ہونے سے محفوظ کر لیتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ سترے کی مذکورہ حقیقت کے پیش نظر سترے کے لیے مکہ اور غیر مکہ کی تفریق درست نہیں۔

٥٠١ - حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ: حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ، عَنْ أَبِي جُحَيْفَةَ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ، فَصَلَّى بِالْبَطْحَاءِ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ، وَنَصَبَ بَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةً وَّتَوَضَّأَ، فَجَعَلَ النَّاسُ يَتَمَسَّحُونَ بِوَضُوئِهِ. [راجع: ١٨٧]

[501] حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ نے بطحاء میں ظہر اور عصر کی دو رکعات پڑھائیں اور آپ نے دوران نماز میں اپنے سامنے ایک چھوٹا نیزہ کھڑا کر لیا۔ جب آپ نے وضو کیا تو لوگ آپ کے وضو کے پانی کو اپنے منہ پر ملنے لگے۔

فوائد و مسائل: ① ابن منیر نے کہا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بطور خاص مکے کا ذکر ایک مغالطے کو دور کرنے کے لیے کیا ہے کہ سترہ بمنزلہ قبلہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف منہ کرتے ہیں اور یہ مناسب نہیں کہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے علاوہ کوئی اور چیز قبلے کا مقام حاصل کرے، لہٰذا مکے میں سترے کی ضرورت نہیں، گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک مقام پر دو قبلے نہیں ہو سکتے کہ ایک قبلہ تو سترہ ہو اور دوسرا قبلہ خانہ کعبہ، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس وہم کو دور کرنا چاہتے ہیں کہ مکے میں بھی سترے کی ضرورت ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک تو امام بخاری رحمہ اللہ نے محدث عبدالرزاق کے ایک

باب کی تردید کی ہے جو انھوں نے اپنی مصنف میں قائم کیا ہے کہ مکے میں کوئی چیز نماز کو توڑ نہیں سکتی، لہٰذا وہاں سترے کی ضرورت نہیں۔ پھر انھوں نے حدیث ابن جریج ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سامنے کوئی سترہ نہیں تھا۔ لوگ آپ کے آگے سے گزر رہے تھے۔ اس روایت کو اصحاب السنن نے بھی بیان کیا ہے، اس کے راوی بھی ثقہ ہیں لیکن یہ روایت معلول ہے کیونکہ اس روایت کو کثیر اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں جبکہ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے نہیں سنا، بلکہ اپنے کسی گھر والے سے سنی ہے، وہ میرے دادا سے بیان کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس عنوان کے ذریعے سے مذکورہ روایت کے ضعف پر تنبیہ کی ہے اور بتایا ہے کہ مشروعیت سترہ کے متعلق مکہ اور غیر مکہ میں کوئی فرق نہیں اور اپنے استدلال میں حدیث ابی جحیفہ رضی اللہ عنہ پیش کی ہے۔ شوافع کا بھی یہی مشہور مسلک ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا مکہ اور غیر مکہ سب جگہ ممنوع ہے، البتہ بعض فقہاء نے طواف کرنے والوں کے لیے ضرورت کے پیش نظر گنجائش نکالی ہے کہ وہ نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں، دوسروں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔ بعض حنابلہ نے نمازی کے آگے سے گزرنے کو تمام مکہ میں جائز قرار دیا ہے۔[1] اس سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ مسجد حرام میں بھی نمازی کے آگے سے گزرنا صحیح نہیں اور وہاں بھی سترے کی پابندی ضروری ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی موقف کو پیش کیا ہے۔ ② شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ مؤلف نے یہ باب اس خیال کی تردید کے لیے قائم کیا ہے کہ اگر مسجد حرام میں سترے کی پابندی کرنی ہو تو اس سے لوگوں کو تنگی ہوگی کیونکہ وہاں سب لوگ عبادات میں مصروف ہوتے ہیں، کوئی نماز پڑھتا ہے تو کوئی طواف کرتا ہے، اس لیے وہاں سترے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن مؤلف نے اس عنوان سے اس خیال کی تردید فرمائی اور مکہ مکرمہ میں بھی سترے کی ضرورت کو بیان فرمایا۔

(95) بَابُ الصَّلَاةِ إِلَى الْأُسْطُوَانَةِ.

باب: 95- ستون کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

وَقَالَ عُمَرُ: اَلْمُصَلُّونَ أَحَقُّ بِالسَّوَارِي مِنَ الْمُتَحَدِّثِينَ إِلَيْهَا، وَرَأَى عُمَرُ رَجُلًا يُصَلِّي بَيْنَ أُسْطُوَانَتَيْنِ، فَأَدْنَاهُ إِلَى سَارِيَةٍ، فَقَالَ: صَلِّ إِلَيْهَا.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ باتیں کرنے والوں کی بہ نسبت نماز پڑھنے والے ستونوں کے زیادہ حق دار ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا تو اسے ایک ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔

وضاحت: امام بخاری رحمہ اللہ سترے کے متعلق توسع اور تعمیم کی وضاحت فرما رہے ہیں کہ سترے کے نام سے کوئی مستقل چیز بنانا ضروری نہیں جسے نماز کے وقت سامنے رکھا جائے بلکہ جو چیز بھی نمازی کے مرکز توجہ کی حد بندی اور اس کے ربط خیال کے لیے کام میں لائی جائے، وہی سترہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو ابن ابی شیبہ (359/3) اور امام حمیدی نے موصولاً بیان کیا ہے۔

[1] فتح الباري : 745/1.

ستونوں پر نمازیوں کا زیادہ حق ہے اگرچہ ضرورت کے پیش نظر تو ان کے پاس باتیں کرنے والے بھی بیٹھ سکتے ہیں اور ٹیک لگا سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد چونکہ عبادت کے لیے ہوتی ہے، اس لیے نماز پڑھنے والوں کو ستونوں کو استعمال کرنے کا زیادہ حق ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے لیکن بعض نسخوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا نام ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، چنانچہ ابن ابی شیبہ (358/3) میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت قرہ بن ایاس مزنی کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا تو ان کو گدی سے پکڑ کر ستون کے پاس کھڑا کر دیا۔ یہ اثر پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حدیث میں حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ ایک ستون کے پاس کوشش سے نماز پڑھتے، اس سے مراد اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ہے، نیز آئندہ روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اذان مغرب کے بعد کبار صحابہ ستونوں کا رخ کرتے، اس سے مراد بھی انھیں سترہ بنا کر نماز پڑھنا ہے۔[1]

٥٠٢ - حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي عُبَيْدٍ قَالَ: كُنْتُ آتِي مَعَ سَلَمَةَ بْنِ الْأَكْوَعِ فَيُصَلِّي عِنْدَ الْأُسْطُوَانَةِ الَّتِي عِنْدَ الْمُصْحَفِ، فَقُلْتُ: يَا أَبَا مُسْلِمٍ! أَرَاكَ تَتَحَرَّى الصَّلَاةَ عِنْدَ هٰذِهِ الْأُسْطُوَانَةِ؟ قَالَ: فَإِنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَتَحَرَّى الصَّلَاةَ عِنْدَهَا.

[502] حضرت یزید بن ابو عبید رحمہ اللہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے ساتھ (مسجد نبوی میں) آیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھتے جہاں مصحف شریف رکھا ہوتا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا: اے ابو مسلم! تم اس ستون کے قریب ہی نماز پڑھنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟ انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو دیکھا ہے کہ وہ بھی کوشش سے اس ستون کو سامنے کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔

٥٠٣ - حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ قَالَ: حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَامِرٍ، عَنْ أَنَسٍ قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ كِبَارَ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ يَبْتَدِرُونَ السَّوَارِيَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ.

وَزَادَ شُعْبَةُ، عَنْ عَمْرٍو، عَنْ أَنَسٍ: حَتّٰى يَخْرُجَ النَّبِيُّ ﷺ. [انظر: ٦٢٥]

[503] حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کے بڑے بڑے صحابۂ کرام کو دیکھا، وہ مغرب کی نماز کے وقت ستونوں کے سامنے جلدی چلے جاتے تھے۔

شعبہ نے اس روایت میں یہ اضافہ بیان کیا ہے: تا آنکہ نبی ﷺ (اپنے حجرے سے) باہر تشریف لاتے۔

فوائد و مسائل: ① ان دونوں روایات سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت سلمہ بن اکوع اور دیگر کبار صحابہ ستونوں کو بطور سترہ استعمال کرتے تھے۔ پہلی روایت میں ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے جس کے نزدیک قرآن مجید رکھا رہتا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ وہ صندوق کے پیچھے نماز پڑھتے۔ اس کا مطلب

① فتح الباري: 746/1.

یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا ایک نسخہ صندوق میں بند کر کے مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس رکھا رہتا تھا۔ اس ستون کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: مصحف شریف کے لیے ایک صندوق تھا جس میں وہ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت سے) رکھا جاتا تھا۔ چونکہ اس کے لیے ایک خاص جگہ مقرر تھی' اس لیے اس سے اسطوانہ کی تعیین کی گئی۔ اس ستون کے متعلق ہمارے بعض مشائخ نے ہمیں تحقیقی طور پر بتایا ہے کہ وہ روضۂ مکرمہ کے درمیان میں ہے اور اسطوانۂ مہاجرین کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں کہ اگر لوگ اس کو پہچان لیتے تو قرعہ اندازی کے ذریعے سے اس کا قرب تلاش کرتے۔ آپ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو راز کے طور پر بتایا تھا تو وہ اس کے پاس بکثرت نمازیں پڑھا کرتے تھے، پھر میں نے ابن نجار کی تاریخ مدینہ میں بھی یہی بات دیکھی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مہاجرین قریش اس ستون کے پاس جمع ہوا کرتے تھے اور اس سے پہلے محمد بن حسن نے بھی اخبار مدینہ میں ایسا ہی درج کیا ہے۔[1] ② مسجد نبوی میں ایک ایسا مقام ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ قرار دیا ہے۔ اس میں چند ایک ستون ہیں، مثلاً: ✿ اُسطوانۂ علم مصلیٰ نبوی۔ ✿ اُسطوانۂ عائشہ۔ ✿ اسطوانۂ توبہ۔ ✿ اسطوانۂ سریر۔ ✿ اسطوانۂ علی۔ ✿ اسطوانۂ وفود۔ ہم ذیل میں صرف دو ستونوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی روایت اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی مذکورہ وضاحت سے ہے: ✿ اسطوانۂ علم مصلیٰ نبوی: یہ ستون، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ستون سے متصل مغربی جانب ہے۔ صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث سلمہ میں اسی ستون کا ذکر ہے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ اسی کو تلاش کر کے اس کے پاس نماز پڑھتے تھے۔ جب ان سے وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو بھی اسی طرح اس جگہ کو تلاش کرتے اور اس جگہ نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہاں آخر دم تک نماز پڑھائی۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مصحف شریف جس صندوق میں رکھا گیا تھا جس کا مذکورہ حدیث میں ذکر ہے، وہ اس اسطوانے سے دائیں جانب تھا۔ ✿ اسطوانۂ عائشہ: یہ ستون، روضة من رياض الجنة کے درمیان ہے۔ اس پر سنہرے حروف میں اس کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کو اسطوانۂ مہاجرین، اسطوانۂ قرعہ اور اسطوانۂ مخلقہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تحویل قبلہ کے بعد چند روز تک اس کے پاس نماز پڑھائی تھی، پھر اپنے مصلی پر آخر وقت تک نماز پڑھاتے رہے۔ اور رسول اللہ ﷺ اس پر ٹیک لگا کر شمال کی طرف منہ کر کے بیٹھا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی تعیین کی تھی، اس لیے اسطوانۂ عائشہ کے نام سے مشہور ہوا۔

وضاحت: رسول اللہ ﷺ کا پہلا مصلیٰ مسجد نبوی کے شمال میں تھا جبکہ آپ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھائی۔ دوسرا مصلیٰ اسطوانۂ عائشہ کے پاس تھا جہاں آپ نے تحویل قبلہ کے بعد چند روز تک نماز پڑھائی۔ تیسرا مصلیٰ اسطوانۂ عائشہ سے متصل مغربی جانب اسطوانۂ علم مصلیٰ کے پاس تھا جو آخر عمر تک رہا۔ مصلیٰ منبر نبوی اور مصلیٰ نبوی کا درمیانی فاصلہ 14 ذراع اور ایک بالشت ہے۔[2] اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس ستون کے پاس مصحف شریف رکھا گیا تھا، وہ اسطوانۂ مہاجرین نہیں بلکہ اسطوانۂ علم مصلیٰ نبوی ہے۔ یہ بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بیان کردہ تحقیق کے خلاف ہے۔ واللّٰہ أعلم.

---

① فتح الباري: 446/1. ② وفاء الوفاء: 267/1.

(٩٦) بَابُ الصَّلَاةِ بَيْنَ السَّوَارِي فِي غَيْرِ جَمَاعَةٍ

باب: 96- اکیلے نمازی کا دوستونوں کے درمیان نماز پڑھنا

٥٠٤ - حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ: حَدَّثَنَا جُوَيْرِيَةُ عَنْ نَّافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ الْبَيْتَ وَأُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ، وَّعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ، وَبِلَالٌ فَأَطَالَ ثُمَّ خَرَجَ، كُنْتُ أَوَّلَ النَّاسِ دَخَلَ عَلَى أَثَرِهِ، فَسَأَلْتُ بِلَالًا: أَيْنَ صَلَّى؟ قَالَ: بَيْنَ الْعَمُودَيْنِ الْمُقَدَّمَيْنِ. [راجع: ٣٩٧]

[504] حضرت ابن عمر ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت عثمان بن طلحہ اور حضرت بلال ؓ خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور دیر تک اندر رہے، پھر باہر نکلے۔ میں پہلا شخص تھا جو آپ کے پیچھے وہاں پہنچا، پھر میں نے حضرت بلال ؓ سے پوچھا: آپ ﷺ نے کہاں نماز پڑھی؟ انھوں نے جواب دیا: اگلے دوستونوں کے درمیان۔

٥٠٥ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَّافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ دَخَلَ الْكَعْبَةَ وَأُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ وَّبِلَالٌ وَّعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ الْحَجَبِيُّ فَأَغْلَقَهَا عَلَيْهِ، وَمَكَثَ فِيهَا، فَسَأَلْتُ بِلَالًا حِينَ خَرَجَ: مَا صَنَعَ النَّبِيُّ ﷺ؟ قَالَ: جَعَلَ عَمُودًا عَنْ يَّسَارِهِ، وَعَمُودًا عَنْ يَّمِينِهِ، وَثَلَاثَةَ أَعْمِدَةٍ وَرَاءَهُ، وَكَانَ الْبَيْتُ يَوْمَئِذٍ عَلَى سِتَّةِ أَعْمِدَةٍ ثُمَّ صَلَّى.

[505] حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت اسامہ بن زید، حضرت بلال اور حضرت عثمان بن طلحہ حجبی ؓ خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے، پھر اندر سے حضرت عثمان نے دروازہ بند کر دیا اور آپ کعبے کے اندر ٹھہرے رہے۔ جب باہر تشریف لائے تو میں نے حضرت بلال ؓ سے پوچھا: نبی ﷺ نے (بیت اللہ کے اندر) کیا کام کیا؟ انھوں نے بتایا: آپ نے ایک ستون کو اپنی بائیں جانب اور ایک کو دائیں جانب اور تین ستونوں کو اپنے عقب میں کر لیا، اس وقت کعبے کی عمارت چھ ستونوں پر تھی، پھر آپ نے نماز پڑھی۔

وَقَالَ إِسْمَاعِيلُ: حَدَّثَنِي مَالِكٌ وَّقَالَ: عَمُودَيْنِ عَنْ يَّمِينِهِ. [راجع: ٣٩٧]

(امام بخاری ؒ کہتے ہیں: ہم سے) اسماعیل نے بیان کیا کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا: آپ نے دوستونوں کو اپنی دائیں جانب کیا تھا۔

فائدہ: عبدالحمید بن محمود بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک امیر کے پیچھے نماز پڑھی۔ لوگوں نے ہمیں مجبور کر دیا، اس بنا پر ہم نے دوستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضرت انس بن مالک ؓ نے فرمایا کہ ہم عہد رسالت میں اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔[1] اسی طرح قرہ بن ایاس مزنی روایت کرتے ہیں کہ عہد رسالت میں ہمیں ستونوں کے درمیان صف بنانے

[1] جامع الترمذي، الصلاة، حديث: 229.

سے منع کیا جاتا تھا اور اس سے سختی کے ساتھ روکا جاتا تھا۔[1] ان روایات سے معلوم ہوا کہ ستونوں کے درمیان نماز پڑھنا منع ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں غیر جماعة کی قید لگا کر واضح کر دیا کہ اس ممانعت کا تعلق نماز با جماعت سے ہے، اگر کوئی اکیلا پڑھتا ہے تو اس میں چنداں حرج نہیں۔ اس کے لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا عمل پیش کیا ہے کہ آپ نے بیت اللہ کے اندر دو ستونوں کے درمیان نماز ادا کی، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں: ''ستونوں کے درمیان اکیلا آدمی نماز پڑھ سکتا ہے، کراہت صرف بحالت جماعت ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے میں ہے۔''

(٩٧) بَابٌ:

باب: 97- بلا عنوان

٥٠٦ - **حَدَّثَنَا** إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو ضَمْرَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ كَانَ إِذَا دَخَلَ الْكَعْبَةَ مَشَى قِبَلَ وَجْهِهِ حِينَ يَدْخُلُ، وَجَعَلَ الْبَابَ قِبَلَ ظَهْرِهِ، فَمَشَى حَتَّى يَكُونَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِدَارِ الَّذِي قِبَلَ وَجْهِهِ قَرِيبًا مِّنْ ثَلَاثِ أَذْرُعٍ صَلَّى، يَتَوَخَّى الْمَكَانَ الَّذِي أَخْبَرَهُ بِهِ بِلَالٌ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلَّى فِيهِ قَالَ: وَلَيْسَ عَلَى أَحَدٍ بَأْسٌ أَنْ يُّصَلِّيَ فِي أَيِّ نَوَاحِي الْبَيْتِ شَاءَ. [راجع: ٣٩٧]

[506] حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بیت اللہ میں داخل ہوتے تو سامنے کی طرف بڑھتے چلے جاتے اور بیت اللہ کے دروازے کو اپنی پشت کی طرف کر لیتے۔ پھر آگے بڑھتے یہاں تک کہ جب ان کے اور سامنے والی دیوار کے درمیان تقریباً تین ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا تو نماز پڑھتے۔ اس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز پڑھنے کے لیے اس جگہ کا رخ کرتے جس کے متعلق انھیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اطلاع دی تھی کہ وہاں نبی ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ (حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وضاحت فرماتے ہیں کہ) ہم میں سے کسی کے لیے اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ بیت اللہ کے جس گوشے میں چاہے نماز پڑھے۔

فائدہ: ① یہ باب بلا ترجمہ ہے، گویا پہلے باب کا نتیجہ یا تکملہ ہے کیونکہ اگرچہ اس میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کی صراحت نہیں، تاہم اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار کعبہ سے تین ذراع کے فاصلے پر نماز پڑھی ہے اور یہ جگہ ستونوں کے درمیان واقع تھی۔[2] اس روایت پر کوئی جدید عنوان بھی قائم کیا جا سکتا ہے، مثلاً: ''بیت اللہ کے اندر جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔'' یہ مضمون حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ارشاد سے ثابت ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ شرح تراجم بخاری میں لکھتے ہیں کہ اس بلا عنوان باب کو پہلے باب کی فصل سمجھنا چاہیے۔ اس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو ستونوں کے درمیان کھڑے ہوئے، نیز آپ کے اور اس دیوار کے درمیان جس کی طرف آپ نے نماز کے لیے رخ کیا، تقریباً تین ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ واضح رہے کہ یہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے خود ہی وضاحت کر دی ہے کہ میں اس قسم کا تتبع واجب یا ضروری سمجھ کر

---

① سنن ابن ماجه، إقامة الصلوات، حديث: 1002. ② فتح الباري: 749/1.

نہیں کرتا بلکہ مستحب اور پسندیدہ سمجھ کر اختیار کرتا ہوں۔ یقیناً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ رائے انتہائی متوازن ہے کہ ایسے مباح امور کو لازمی اور واجب سمجھ کر نہ کیا جائے، باقی ان کا استحباب تو اپنی جگہ برقرار ہے۔

(٩٨) بَابُ الصَّلَاةِ إِلَى الرَّاحِلَةِ وَالْبَعِيرِ وَالشَّجَرِ وَالرَّحْلِ

باب: 98- سواری، اونٹ، درخت اور پالان کی طرف نماز پڑھنا

٥٠٧ - حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ أَبِي بَكْرٍ الْمُقَدَّمِيُّ الْبَصَرِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ نَافِعٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ كَانَ يُعَرِّضُ رَاحِلَتَهُ فَيُصَلِّي إِلَيْهَا، قُلْتُ: أَفَرَأَيْتَ إِذَا هَبَّتِ الرِّكَابُ؟ قَالَ: كَانَ يَأْخُذُ الرَّحْلَ فَيُعَدِّلُهُ فَيُصَلِّي إِلَى أَخَرَتِهِ - أَوْ قَالَ مُؤَخَّرِهِ - وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا يَفْعَلُهُ. [راجع: ٤٣٠]

[507] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی سواری کو چوڑائی میں بٹھا دیتے پھر اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ (نافع کہتے ہیں:) میں نے عرض کیا: اچھا یہ بتایئے کہ اگر سواری کے اونٹ اپنی جگہ سے اٹھ جاتے تو آپ کیا کرتے تھے؟ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس صورت میں آپ پالان کو اپنے سامنے کھڑا کر لیتے اور اس کی پچھلی لکڑی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل تھا۔

فوائد و مسائل: ① حیوان کو سترہ بنانے کے متعلق بعض ائمۂ کرام سے کراہت منقول ہے کہ سترے کا مقصد نماز کا تحفظ ہے لیکن حیوان پر کیا بھروسا کہ وہ کب اٹھ کر چل دے۔ لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک سترے کے معاملے میں نمازی کے لیے پورا توسع ہے۔ وہ ہر چیز کو سترہ بنا سکتا ہے۔ وہ چیز از قسم حیوان ہو یا غیر حیوان، انھوں نے عنوان میں چار چیزوں کا ذکر کر کے توسع کا اظہار فرما دیا، لیکن روایت میں سواری اور پالان کا ذکر ہے، درخت اور اونٹ کا ذکر نہیں۔ لیکن اونٹ اور اونٹنی تو ایک ہی جنس کے دو نام ہیں، جب سواری کی اونٹنی کو سترہ بنایا جا سکتا ہے تو اس سے اونٹ کا حکم بھی معلوم ہو گیا۔ رہا درخت کا معاملہ تو وہ اس طرح ثابت ہے کہ جب لکڑی کے پالان کو سترہ بنانا درست ہے تو اس سے لکڑی کی ہر جنس کا حکم معلوم ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی عادت کے مطابق عنوان میں ان روایات کی طرف اشارہ کر دیا ہو جن میں صراحت کے ساتھ اونٹ اور درخت کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر ہے، چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔[1] اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ بدر والی رات دیکھا کہ ہم میں سے ہر شخص سو گیا تھا، مگر رسول اللہ ﷺ ایک درخت کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے اور آپ صبح تک دعا میں مشغول رہے۔[2] ② حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ آپ اونٹ کو سترہ بنا کر نماز پڑھنے کو مکروہ خیال کرتے تھے، ہاں! اگر اس پر پالان ہوتا تو اس میں کوئی حرج خیال نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس پر پالان ہونے کی صورت میں وہ آرام اور سکون سے بیٹھا رہتا ہے جبکہ اس کے بغیر اس کے مستی میں آ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ فقہاء نے پالان کی پچھلی

---

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 692. [2] السنن الكبرىٰ للنسائي، أبواب السترة، حديث: 823.

لکڑی کو کم از کم سترے کی مقدار قرار دیا ہے، اس کی اونچائی ایک ذراع یا ⅔ ذراع ہوتی ہے لیکن مصنف عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ کے اونٹ پر جو پالان ہوتا تھا اس کی پچھلی لکڑی ایک ذراع کے برابر تھی۔[1]

(٩٩) بَابُ الصَّلَاةِ إِلَى السَّرِيرِ

باب: 99- چارپائی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

٥٠٨ - حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنِ الْأَسْوَدِ، عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: أَعَدَلْتُمُونَا بِالْكَلْبِ وَالْحِمَارِ؟ لَقَدْ رَأَيْتُنِي مُضْطَجِعَةً عَلَى السَّرِيرِ فَيَجِيءُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَتَوَسَّطُ السَّرِيرَ فَيُصَلِّي فَأَكْرَهُ أَنْ أَسْنَحَهُ فَأَنْسَلُّ مِنْ قِبَلِ رِجْلَيِ السَّرِيرِ حَتَّى أَنْسَلَّ مِنْ لِحَافِي. [راجع: ٣٨٢]

[508] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: تم لوگوں نے ہمیں کتوں اور گدھوں کے برابر کر دیا، حالانکہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ چارپائی پر لیٹی ہوتی، رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے اور چارپائی کو (اپنے اور قبلے کے) درمیان کر لیتے، پھر نماز پڑھ لیتے تھے۔ مجھے آپ کے سامنے ہونا برا معلوم ہوتا، اس لیے میں پائنتی کی طرف سے کھسک کر لحاف سے باہر ہو جاتی۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ سترے کے متعلق مزید توسع بیان کرتے ہیں کہ گھر کے استعمال کی چیزوں کو بھی سترہ بنایا جا سکتا ہے، خواہ وہ زمین میں نصب ہوں یا زمین سے اٹھی ہوئی ہوں، جیسے چارپائی وغیرہ کو درمیان میں لے کر نماز پڑھنا۔ روایت میں يَتَوَسَّطُ السَّرِيرَ کے الفاظ ہیں جن کے معنی ''چارپائی کے درمیان میں کھڑے ہونا'' ہیں، چنانچہ علامہ اسماعیلی نے اعتراض کیا کہ مذکورہ روایت قائم کردہ عنوان کے مطابق نہیں کیونکہ عنوان یہ ہے کہ چارپائی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا لیکن اس کے متبادر معنی یہ ہیں کہ چارپائی کے وسط میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا، پھر خود ہی اس کا جواب دیا ہے کہ امام بخاری ؒ نے خود اس سلسلے میں مسروق عن عائشہ کی روایت آئندہ بیان کی ہے جو اس عنوان کے مطابق ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: ''میں نے نبی ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ کے اور قبلے کے درمیان چارپائی پر تھی۔''[2] اس لیے امام بخاری کو مسروق عن عائشہ والی روایت یہاں بیان کرنی چاہیے تھی۔ علامہ کرمانی نے اصل اعتراض کا جواب بایں الفاظ دیا ہے کہ حروف جر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں، لہٰذا امام بخاری ؒ کے قائم کردہ عنوان میں [الصلاة إلى السرير] کے معنی [الصلاة على السرير] ہیں۔ صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں الصلاۃ علی السریر کے الفاظ بھی موجود ہیں۔[3] حافظ ابن حجر ؒ لکھتے ہیں کہ يَتَوَسَّطُ کے دو معنی ہیں: چارپائی پر اس کے وسط میں نماز پڑھنا اور چارپائی کو سامنے کر کے اس سے نیچے نماز پڑھنا۔ مسروق عن عائشہ کی روایت نے وضاحت کر دی کہ اس مقام پر دوسرے معنی مراد ہیں۔[4] ② دراصل جب تک کسی حدیث کے تمام طرق اور جملہ کلمات ماثورہ سامنے نہ ہوں، حدیث کا صحیح مفہوم متعین نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ حدیث کے متعلق بھی راقم کافی دن تذبذب کا شکار رہا کیونکہ بعض روایات میں حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے جنازے کی طرح لیٹی ہوتی جبکہ

① فتح الباري: 751/1. ② صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 511. ③ شرح الكرماني: 160/2. ④ فتح الباري: 751/1.

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاؤں کو سجدے کے وقت ہاتھ لگاتے تو میں انھیں سمیٹ لیتی۔ چارپائی سے نیچے اتر کر نماز پڑھنے کی صورت میں پاؤں کو ہاتھ لگانے اور پھر انھیں سمیٹنے کی قطعاً ضرورت نہیں، اس لیے جنازے کی طرح لیٹنا اور پاؤں سمیٹنا باہم متضاد ہیں۔ روایات کے تتبع سے معلوم ہوا کہ یہاں دو واقعات ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے: ✱ ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ ؓ چارپائی پر ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ نیچے اتر کر نماز پڑھتے۔ اس صورت میں حضرت عائشہ ؓ کا جنازے کی طرح لیٹنا صحیح ہے۔ اس میں پاؤں کو ہاتھ لگانے اور انھیں سمیٹنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، چنانچہ امام بخاری ؒ نے اس صورت کو اپنی صحیح میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے اور اس صورت کو حضرت عائشہ ؓ سے حضرت اسود، حضرت مسروق اور حضرت عروہ بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو، حدیث: 383, 384, 508, 511, 512, 514, 519, 997 اور 6276- ✱ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسی بستر پر نماز پڑھتے جہاں سیدہ عائشہ لیٹی ہوتی تھیں۔ اس صورت میں سجدے کے وقت آپ حضرت عائشہ ؓ کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے تو وہ انھیں سمیٹ لیتیں۔ اس صورت کو حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور حضرت قاسم، حضرت عائشہ ؓ سے بیان کرتے ہیں۔ نماز کی یہ کیفیت امام بخاری ؒ نے مندرجہ ذیل احادیث میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو حدیث: 382, 513, 519 اور 1209- واضح رہے کہ حضرت عائشہ ؓ کو اس حدیث، جس میں ہے کہ عورت، گدھا اور کتا اگر نمازی کے آگے سے گزر جائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے، کے اندازِ بیان اور طرز ادا کے متعلق شکایت ہے کہ اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت، گدھا اور کتا سب برابر ہیں، حالانکہ عورت اور دیگر دونوں چیزوں میں بہت فرق ہے۔ راوی کو بیان کرتے وقت اس فرق کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھا۔ ہم آئندہ اصل مقام پر اس کی وضاحت کریں گے۔ بإذن الله.

(۱۰۰) بَابٌ: يَرُدُّ الْمُصَلِّي مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ

باب: 100- نمازی کو چاہیے کہ وہ اپنے سامنے سے گزرنے والے کو روکے

وَرَدَّ ابْنُ عُمَرَ فِي التَّشَهُّدِ، وَفِي الْكَعْبَةِ وَقَالَ: إِنْ أَبَى إِلَّا أَنْ تُقَاتِلَهُ قَاتِلْهُ.

حضرت ابن عمر ؓ نے تشہد میں بیٹھے ہوئے اور بیت اللہ میں، گزرنے والے کو روکا اور فرمایا کہ اگر گزرنے والا لڑائی کے بغیر باز نہ آئے تو اس سے لڑنا چاہیے۔

وضاحت: نمازی کو چاہیے کہ وہ آگے سے گزرنے والے کو کسی صورت آگے سے گزرنے نہ دے۔ یہ حکم اول نماز اور آخر نماز میں برابر ہے اور کعبہ اور غیر کعبہ میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابن عمر ؓ کا اثر پیش کیا گیا ہے کہ آپ نے تشہد کی حالت میں بھی گزرنے والے کو روکا اور بیت اللہ کے اندر نماز ادا کرتے ہوئے بھی کسی کو آگے سے گزرنے نہیں دیا۔ حالت تشہد میں روکنے سے متعلق اثر کو مصنف ابن ابی شیبہ (149/2) اور مصنف عبدالرزاق (23/2) میں موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ اور ان میں وضاحت ہے کہ گزرنے والا عمرو بن دینار تھا جسے حضرت ابن عمر ؓ نے دوران تشہد میں روکا۔ اور بیت اللہ میں نماز پڑھتے وقت روکنے کی روایت کو امام بخاری ؒ کے استاد ابونعیم نے اپنی تالیف ''کتاب الصلاۃ'' میں موصولاً بیان کیا ہے جس

کے الفاظ یہ ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیت اللہ میں نماز پڑھتے وقت کسی کو اپنے آگے سے نہیں گزرنے دیتے تھے۔[1] اور روکنے پر باز نہ آنے والے سے لڑائی کرنے والے جملے کو امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف (20/2) میں موصولاً ذکر کیا ہے۔

٥٠٩ - حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ: حَدَّثَنَا يُونُسُ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ هِلَالٍ، عَنْ أَبِي صَالِحٍ أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ؛ ح: وَحَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ: حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ الْمُغِيرَةِ قَالَ: حَدَّثَنَا حُمَيْدُ بْنُ هِلَالٍ الْعَدَوِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبُو صَالِحٍ السَّمَّانُ قَالَ: رَأَيْتُ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ يُصَلِّي إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ، فَأَرَادَ شَابٌّ مِّنْ بَنِي أَبِي مُعَيْطٍ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَدَفَعَ أَبُو سَعِيدٍ فِي صَدْرِهِ فَنَظَرَ الشَّابُّ فَلَمْ يَجِدْ مَسَاغًا إِلَّا بَيْنَ يَدَيْهِ، فَعَادَ لِيَجْتَازَ فَدَفَعَهُ أَبُو سَعِيدٍ أَشَدَّ مِنَ الْأُولَى فَنَالَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ، ثُمَّ دَخَلَ عَلَى مَرْوَانَ فَشَكَا إِلَيْهِ مَا لَقِيَ مِنْ أَبِي سَعِيدٍ، وَدَخَلَ أَبُو سَعِيدٍ خَلْفَهُ عَلَى مَرْوَانَ، فَقَالَ: مَا لَكَ وَلِابْنِ أَخِيكَ يَا أَبَا سَعِيدٍ؟! قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ إِلَى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَأَرَادَ أَحَدٌ أَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ، فَإِنْ أَبَى فَلْيُقَاتِلْهُ فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ».

[انظر: ٣٢٧٤]

[509] ابو صالح سمان فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ جمعۃ المبارک کے دن کسی چیز کو لوگوں سے سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو معیط کے بیٹوں میں سے ایک نوجوان نے ان کے آگے سے گزرنے کی کوشش کی۔ حضرت ابو سعید نے اس کو سینے سے دھکیل کر روکنا چاہا۔ نوجوان نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن آگے سے گزرنے کے علاوہ اسے کوئی راستہ نہ ملا۔ وہ پھر اس طرف سے نکلنے کے لیے لوٹا تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے اسے پہلے سے زیادہ زور دار دھکا دیا۔ اس نے اس پر حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا۔ بعد ازاں وہ حضرت مروان کے پاس پہنچ گیا اور ابو سعید رضی اللہ عنہ سے جو معاملہ پیش آیا تھا اس کی شکایت کی۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بھی اس کے پیچھے مروان کے پاس پہنچ گئے۔ مروان نے کہا: اے ابو سعید! تمھارا اور تمھارے بھتیجے کا کیا معاملہ ہے؟ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے: ''تم میں سے کوئی اگر کسی چیز کو لوگوں سے سترہ بنا کر نماز پڑھے، پھر کوئی اس کے سامنے سے گزرنے کی کوشش کرے تو وہ (نمازی) اسے روکے۔ اگر وہ (گزرنے والا) نہ رکے تو اس سے لڑے کیونکہ وہ شیطان ہے۔''

فوائد ومسائل: ① امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک صورت معاملہ یوں ہے کہ اگر کوئی نمازی کے آگے سے گزر کر اس تعلق کو ختم کرنا چاہتا ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان نماز کی وجہ سے قائم ہوا ہے تو نمازی کے لیے اس تعلق کو قائم رکھنے کا پورا پورا حق ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے آگے سے گزرنے والے کو منع کرے، یعنی اسے نرمی سے متنبہ کرے۔ اگر باز نہ آئے تو سختی سے روکنے کی اجازت ہے۔ اگر وہ اشارہ نہ مانے تو دھکا دے کر اسے روکا جائے لیکن اس روکنے میں دھکم پیل اور مار پیٹ کی نوبت نہیں آنی

① فتح الباري : 752/1.

چاہیے کیونکہ ایسے اعمال نماز کے لیے باعث فساد ہیں۔ گزرنے والے کو روکنا تو نماز کی حفاظت کے لیے تھا، اگر اسے اس انداز سے روکا گیا کہ نماز ہی خراب ہوگئی تو ''گناہ لازم اور نیکی برباد'' والی صورت پیدا ہو جائے گی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک دوسرے مقام پر اس حدیث کو بیان کیا ہے تو مطلق طور پر روکنے کا بیان ہے، خواہ نمازی نے سترہ رکھا ہو یا اس کے بغیر نماز پڑھ رہا ہو۔ الفاظ یہ ہیں: نمازی کو چاہیے کہ وہ گزرنے والے کو روکے، اگر وہ نہ رکے تو اس کے ساتھ مزاحمت کرے۔ [1] حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اس نے ربط خیال اور تحفظ نماز کا بندوبست نہ کر کے خود کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، بالخصوص جبکہ وہ عام گزرگاہ میں نماز پڑھ رہا ہو۔ مصنف عبدالرزاق میں سترے اور غیر سترے والی نماز کا فرق بیان کیا گیا ہے، اس بنا پر اگر کوئی نمازی سترے کے بغیر نماز پڑھتا ہے یا سترہ رکھنے کے باوجود اس سے دور کھڑا ہوتا ہے تو ایسی حالت میں آگے سے گزرنا گناہ نہیں اور نہ گزرنے والے کو روکنا ہی جائز ہے، تاہم بہتر ہے کہ ایسی حالت میں بھی نمازی کے سامنے سے نہ گزرا جائے۔ [2] لیکن حافظ ابن حجر کی جلالت قدر کے باوجود ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں کیونکہ احادیث کے ظاہری مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ نمازی کے آگے سے کسی بھی حالت میں نہ گزرا جائے اور اگر کوئی گزرتا ہے تو اسے روکا جائے۔ ہاں! اگر گزرنے والا مجبور ہو کہ اسے اور کوئی راستہ نہیں ملتا اور وہ انتظار بھی نہیں کر سکتا تو امید ہے کہ اسے گناہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی نمازی سے اتنا دور ہے کہ اسے عرف میں اس کے آگے سے گزرنے والا نہیں کہا جا سکتا تو ایسی صورت میں بھی گزرنا جائز ہے، گویا وہ سترے کے پیچھے سے گزر رہا ہے۔ اس سلسلے میں امام ابن دقیق العید نے کچھ تفصیل بھی بیان کی ہے جسے ہم آئندہ بیان کریں گے۔ ② امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گزرنے والے کو روکنا ضروری نہیں بلکہ بہتر ہے کہ اسے روک کر اپنی نماز کا تحفظ کرے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں، لیکن اہل ظاہر نے اسے واجب کہا ہے۔ شاید امام نووی رحمہ اللہ ان کے اختلاف کو کسی خاطر میں نہیں لاتے یا انھوں نے اہل ظاہر کی کتب کا مطالعہ نہیں کیا۔ گزرنے والے کو شیطان اس لیے کہا گیا کہ وہ اللہ اور بندے کے درمیان حائل ہونے کی کوشش کرتا ہے تاکہ مناجات کے تعلق کو ختم کر دے جو شیطان کا کام ہے۔ [3] ③ رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنے آگے سے کسی کو نہ گزرنے دے۔ یہ حکم نماز کی حفاظت کے لیے ہے یا گزرنے والے کو گناہ سے بچانے کے لیے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ اہتمام گزرنے والے کو گناہ سے بچانے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اپنی نماز کے تحفظ کے لیے اسے اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کیونکہ نمازی کے لیے اپنی نماز کی حفاظت کرنا زیادہ ضروری ہے، دوسرے کو گناہوں سے باز رکھنا اپنی نماز کی حفاظت سے زیادہ اہم نہیں کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی کا نمازی کے آگے سے گزرنا اس قدر منحوس ہے کہ اس سے نصف اجر کی کمی ہو جاتی ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر نمازی کو پتہ چل جائے کہ اس کے آگے سے گزرنا کس قدر ثواب کی کمی کا باعث ہے تو کبھی سترے کے بغیر نماز نہ پڑھے۔ یہ دونوں آثار اگرچہ موقوف ہیں، تاہم انھیں مرفوع کہا جائے گا کیونکہ ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی، تاہم ان کا تقاضا ہے کہ نمازی کا یہ اہتمام اپنی نماز کی حفاظت کے لیے ہے، گزرنے والے کو گناہ سے بچانا اس سے مقصود نہیں۔ [4] ممکن ہے ہر دو مقاصد کے لیے نمازی کو پابند کیا گیا ہو کہ وہ سترہ رکھ کر نماز پڑھے اور گزرنے والے کو متنبہ کرے تاکہ اس کی نماز بھی محفوظ رہے اور گزرنے والا بھی گناہ سے بچ جائے۔ واللہ أعلم.

---

[1] صحیح البخاري، بدء الخلق، حدیث: 3274. [2] فتح الباري: 753/1. [3] فتح الباري: 754/1. [4] فتح الباري: 755/1.

(١٠١) بَابُ إِثْمِ الْمَارِّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي

باب: 101- نمازی کے آگے سے گزرنے والے پر گناہ

٥١٠ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ أَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيدٍ أَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ أَرْسَلَهُ إِلَى أَبِي جُهَيْمٍ يَسْأَلُهُ: مَاذَا سَمِعَ مِنْ رَّسُولِ اللهِ ﷺ فِي الْمَارِّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي، فَقَالَ أَبُوجُهَيْمٍ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْرًا لَّهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ».

قَالَ أَبُوالنَّضْرِ: لَاأَدْرِي قَالَ: أَرْبَعِينَ يَوْمًا أَوْ شَهْرًا أَوْ سَنَةً.

[510] حضرت بسر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید بن خالد نے انھیں حضرت ابوجہیم رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا کہ ان سے نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کے متعلق پوچھیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی بابت کیا سنا ہے؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والا یہ جانتا کہ اس پر کس قدر گناہ ہے تو آگے سے گزرنے کے بجائے وہاں چالیس تک کھڑے رہنے کو پسند کرتا۔''

(راویٔ حدیث) ابوالنضر نے کہا: مجھے یاد نہیں رہا کہ بسر بن سعید نے چالیس دن کہے یا مہینے یا سال۔

فوائد ومسائل: ① اس سے پہلی حدیث میں نمازی کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ سترہ قائم کرنے کے بعد آگے سے گزرنے والے کو پہلے نرمی پھر سختی سے منع کرے۔ اب گزرنے والے کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اس عمل کا نتیجہ انتہائی خطرناک ہے، اس لیے اگر اسے روکا جائے تو اسے نمازی کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے مجھے گناہ اور عذاب آخرت سے بچا لیا ہے۔ واضح رہے کہ اصل روایت میں کوئی ابہام نہیں بلکہ بسر بن سعید نے تو دن، مہینہ یا سال کی تعیین کی تھی لیکن آگے راوی کو یاد نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنا سخت گناہ ہے۔ اگر اس کی سنگینی کا گزرنے والے کو ادراک ہو جائے تو وہ مدتوں کھڑا رہنے کو گزرنے سے بہتر خیال کرے۔[1] ② صحیح بخاری کے بعض نسخوں میں [مِنَ الْإِثْمِ] کے الفاظ بھی ہیں لیکن دیگر معتبر کتب حدیث کی جملہ روایات اس اضافے کے بغیر ہی مروی ہیں، صرف مصنف ابن ابی شیبہ میں [مِنَ الْإِثْمِ] کے الفاظ ہیں۔ یہ بھی کسی راوی کی تفسیر ہے، حدیث کے الفاظ نہیں۔ ممکن ہے کہ بخاری کے حاشیے میں یہ الفاظ درج ہوں، پھر کسی نسخہ لکھنے والے نے انھیں متن کا حصہ بنا دیا ہو، نیز روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنگین گناہ اس شخص کو ملے گا جسے اس کا علم ہو، پھر جان بوجھ کر اس کا مرتکب ہو، اس کے علاوہ یہ وعید اس شخص کے حق میں ہے جو نمازی کے آگے سے گزرے۔ لیکن اگر کوئی نمازی کے آگے کھڑا ہو جائے یا بیٹھ جائے یا سو جائے تو ظاہر الفاظ کا تقاضا ہے کہ مذکورہ وعید ان حضرات کے لیے نہیں ہوگی، ہاں! اگر حکم امتناعی کی علت نمازی کی تشویش کو قرار دیا جائے تو پھر تمام صورتیں گزرنے والے کے معنی میں ہوں گی۔[2] ③ علامہ تقی الدین ابن دقیق العید نے گزرنے

① فتح الباري: 756/1. ② فتح الباري: 757/1.

والے اور نمازی کے حالات کے متعلق کچھ تفصیل بیان کی ہے جس کا خلاصہ ہدیۂ قارئین ہے: * نمازی عام گزرگاہ سے ہٹ کر اپنے سامنے سترے کا اہتمام کر کے نماز پڑھتا ہے اور گزرنے والے کے لیے متبادل راستہ موجود ہے لیکن وہ دانستہ طور پر نمازی کے آگے سے گزرتا ہے، اس صورت میں آگے سے گزرنے والا مجرم اور خطا کار ہے۔ * نمازی عام گزرگاہ پر سترے کا اہتمام کیے بغیر نماز شروع کر دیتا ہے، گزرنے والے کے لیے کوئی متبادل راستہ بھی نہیں اور کسی وجہ سے گزرنا بھی ضروری ہے، وہ انتظار نہیں کر سکتا تو اس صورت میں تمام تر ذمے داری نمازی پر عائد ہوتی ہے، گزرنے والا مجبور ہے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ * عام گزرگاہ پر سترے کے بغیر نماز شروع کر دیتا ہے۔ متبادل راستہ بھی موجود ہے لیکن گزرنے والا نمازی کے آگے سے گزرتا ہے تو جس طرح نمازی سترے کے بغیر نماز شروع کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہے، اسی طرح گزرنے والا بھی متبادل راستہ ہونے کے باوجود نمازی کے آگے سے گزرنے کی بنا پر مجرم ہے۔ * نمازی نے عام راستے سے ہٹ کر اور سترہ قائم کر کے نماز شروع کی لیکن گزرنے والے کے لیے کوئی اور متبادل راستہ موجود نہیں کیونکہ گزرگاہ پر بھی کوئی رُکاوٹ کھڑی ہے تو ایسی صورت میں نہ نمازی گناہ گار ہے اور نہ گزرنے والا مجرم ہے کیونکہ نمازی نے سترہ کر رکھا تھا اور گزرنے والے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا جس بنا پر وہ نمازی کے آگے سے گزرنے پر مجبور تھا۔[1] لیکن اس حدیث کے ظاہری مفہوم کا تقاضا ہے کہ مطلق طور پر نمازی کے آگے سے گزرنا منع ہے، خواہ گزرنے والے کو کوئی متبادل راستہ ملے یا نہ ملے۔ وہ انتظار کرے تا آنکہ نمازی اپنی نماز سے فارغ ہو جائے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والے واقعے سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔[2]

(١٠٢) بَابُ اسْتِقْبَالِ الرَّجُلِ الرَّجُلَ وَهُوَ يُصَلِّي

باب: 102- آدمی کا آدمی کی طرف رخ کرنا جب کہ وہ نماز پڑھ رہا ہو

وَكَرِهَ عُثْمَانُ أَنْ يُسْتَقْبَلَ الرَّجُلُ وَهُوَ يُصَلِّي، وَإِنَّمَا هٰذَا إِذَا اشْتَغَلَ بِهِ، فَأَمَّا إِذَا لَمْ يَشْتَغِلْ بِهِ فَقَدْ قَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ: مَا بَالَيْتُ، إِنَّ الرَّجُلَ لَا يَقْطَعُ صَلَاةَ الرَّجُلِ.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نمازی کی طرف رخ کر کے بیٹھنے کو ناپسند فرمایا۔ یہ اس صورت میں ہے جب نمازی کی توجہ سامنے والے کی طرف ہو جائے، لیکن اگر توجہ نہ ہو تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ ایک شخص دوسرے کی نماز کو نہیں توڑ سکتا۔

وضاحت: اس عنوان میں امام بخاری رحمہ اللہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی نمازی کی طرف رخ کر کے بیٹھ جائے یا کھڑا رہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس صورت کو مکروہ خیال کیا ہے لیکن حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس صورت میں کوئی حرج نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان دونوں متضاد طرز عمل میں مطابقت پیدا فرماتے ہیں کہ مذکورہ ارشادات درست اور دو الگ الگ حالات سے متعلق ہیں۔ اگر سامنے آنے سے جمعیت خاطر منتشر ہوتی ہو تو مکروہ ہے جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے اور اگر طبیعت میں انتشار پیدا نہ ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا جیسا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے

---

[1] فتح الباري: 757/1. [2] فتح الباري: 758/1.

فرمایا ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ فرماتے ہیں: مجھے حضرت عثمان ؓ کا طرز عمل کہیں نہیں ملا بلکہ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عمر ؓ کا ایک اثر ملا ہے کہ وہ اس قسم کی صورت استقبال پر زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ اور حضرت عثمان سے بھی ایک قول عدم کراہت کا ملا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ حضرت عمر ؓ کی جگہ غلطی سے حضرت عثمان ؓ ہو گیا ہو، یعنی عمر میں تصحیف ہوئی ہے اور وہ عمر کے بجائے عثمان بن گیا ہے۔[1] علامہ عینی نے حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت امام مالک سے مطلقاً کراہت کا موقف ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر ؓ کو سترے کے لیے اگر کوئی ستون نہ ملتا تو حضرت نافع سے کہتے کہ تم میری طرف اپنی پیٹھ کر دو تا کہ میں نماز پڑھ لوں،[2] یعنی حضرت ابن عمر ؓ نے ایسے انداز کو ناپسند کیا جس میں کسی آدمی کا رُخ نماز پڑھنے والے شخص کی طرف ہو کیونکہ اس صورت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ البتہ نمازی کی طرف پیٹھ کرنے یا ہونے میں ایسا خطرہ نہیں۔

٥١١ - حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ خَلِيلٍ: حَدَّثَنَا عَلِيُّ ابْنُ مُسْهِرٍ عَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ مُسْلِمٍ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهُ ذُكِرَ عِنْدَهَا مَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ فَقَالُوا: يَقْطَعُهَا الْكَلْبُ وَالْحِمَارُ وَالْمَرْأَةُ، قَالَتْ: لَقَدْ جَعَلْتُمُونَا كِلَابًا، لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي وَإِنِّي لَبَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ وَأَنَا مُضْطَجِعَةٌ عَلَى السَّرِيرِ فَتَكُونُ لِيَ الْحَاجَةُ وَأَكْرَهُ أَنْ أَسْتَقْبِلَهُ فَأَنْسَلُّ انْسِلَالًا.

[511] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، ان کے سامنے تذکرہ ہوا کہ نماز کو کیا چیز توڑ دیتی ہے، لوگوں نے کہا: کتے، گدھے اور عورت کے (نمازی کے) سامنے سے گزرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس پر حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: تم لوگوں نے ہم عورتوں کو تو کتوں کے برابر بنا دیا ہے، حالانکہ میں نے نبی ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ کے اور قبلے کے درمیان چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی، پھر اگر مجھے کوئی ضرورت ہوتی اور میں بحالت نماز آپ کے سامنے آنے کو ناپسند سمجھتی تو آہستہ سے کھسک کر نکل جاتی۔

وَعَنِ الْأَعْمَشِ، عَنْ إِبْرَاهِيمَ، عَنِ الْأَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ نَحْوَهُ. [راجع: ٣٨٢]

حضرت اعمش، ابراہیم عن الاسود کی سند کے ساتھ بھی حضرت عائشہ ؓ سے اسی طرح کی روایت کرتے ہیں۔

فوائد ومسائل: ① اس روایت کے مطابق سیدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے تو میں اس بات کو ناپسند کرتی کہ آپ کی طرف منہ کروں، اس لیے میں آہستہ سے کھسک کر پائنتی کی طرف آتی، پھر اٹھتی۔ حضرت عائشہ ؓ کی طرف سے استقبال اور مواجہت کا طریقہ چھوڑ کر آہستہ سے کھسک جانے کا طریقہ اختیار کرنا عنوان کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن یہاں ایک اشکال ہے کہ امام بخاری ؒ نے عنوان میں وضاحت کی ہے کہ اس کا دار و مدار انتشار طبیعت پر ہے۔ اگر دوسرے آدمی کے نمازی کی طرف رخ کرنے سے خیالات میں تکدر اور طبیعت میں انتشار پیدا ہو تو ایسا کرنا مکروہ ہے، بصورت دیگر مکروہ نہیں، جبکہ یہ وضاحت مذکورہ روایت میں نہیں ہے۔ لیکن روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ ؓ

① فتح الباري: 758/1. ② عمدة القاري: 596/1.

استقبال کے طریقے سے ہٹ کر آہستگی کے ساتھ کھسک جانے کے طریقے کو اسی لیے تو اختیار کرتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طبیعت میں انتشار کا باعث نہ ہو۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ ایسی باتوں سے مامون اور بے خوف تھے، تاہم حضرت عائشہ ؓ کا احتیاط فرمانا مذکورہ اشکال کو دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ ② آخر میں امام بخاری ؒ نے ایک اسنادی نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اس روایت کو علی بن مسہر نے امام اعمش سے دو سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے: * عن مسلم عن مسروق عن عائشہ جیسا کہ روایت کا متن ہے۔ * عن ابراہیم عن الاسود عن عائشہ، یہ روایت بالمعنی ہے جیسا کہ امام بخاری ؒ نے خود پہلے (حدیث نمبر: 508 میں) بیان کیا ہے۔[1]

(١٠٣) بَابُ الصَّلَاةِ خَلْفَ النَّائِمِ

باب: 103- سوئے ہوئے شخص کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

٥١٢ - حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا رَاقِدَةٌ مُعْتَرِضَةٌ عَلٰى فِرَاشِهِ، فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُوتِرَ أَيْقَظَنِي فَأَوْتَرْتُ. [راجع: ٣٨٢]

[512] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: نبی ﷺ نماز پڑھتے رہتے اور میں (آپ کے سامنے) بستر پر عرض کے بل سوئے رہتی۔ اور جب آپ وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے بیدار کر دیتے، چنانچہ میں بھی وتر پڑھ لیتی۔

فائدہ: حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سونے والے اور باتیں کرنے والے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[2] حضرت امام مالک ؒ سے بھی سونے والے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی کراہت منقول ہے۔ امام بخاری ؒ کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جن روایات میں اس طرح نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، وہ صحیح نہیں، چنانچہ امام ابوداود لکھتے ہیں کہ ابن عباس ؓ کی جس روایت میں سونے والے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے، اس کی تمام سندیں اور طرق ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر ؒ نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں جتنی بھی احادیث وارد ہیں سب کمزور ہیں۔ جن حضرات نے اس طرح نماز پڑھنے کو مکروہ کہا ہے وہ اس لیے کہ شاید سونے والا ایسی حرکت کرے جس سے نمازی کا خشوع خراب ہو۔[3] امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی قریب سو رہا ہو تو بذاتِ خود اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن اگر اس کے خراٹوں سے بے اطمینانی کی صورت پیدا ہو جائے یا کسی اور بات سے خشوع متأثر ہو تو اس صورت میں اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیے، لیکن اگر اس قسم کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو کسی قسم کی کراہت نہیں۔ واللہ أعلم.

---

1 فتح الباري: 759/1. 2 سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 694. 3 فتح الباري: 759/1.

(١٠٤) بَابُ التَّطَوُّعِ خَلْفَ الْمَرْأَةِ

باب: 104- عورت کی طرف رخ کر کے نفل نماز پڑھنا

٥١٣ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ أَبِي النَّضْرِ مَوْلَى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ، عَنْ أَبِي سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ، عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَرِجْلَايَ فِي قِبْلَتِهِ، فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِي فَقَبَضْتُ رِجْلَيَّ فَإِذَا قَامَ بَسَطْتُهُمَا، قَالَتْ: وَالْبُيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَّيْسَ فِيهَا مَصَابِيحُ.

[راجع: ٣٨٢]

[513] نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس طرح سویا کرتی تھی کہ میرے پاؤں آپ کے قبلے کی جگہ میں ہوتے۔ جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پاؤں کو چھوتے، میں انھیں سمیٹ لیتی۔ پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو میں انھیں پھیلا دیتی۔ حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

فوائد و مسائل: ① امام بخاری ؒ کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جس طرح نمازی کے سامنے مرد کے بیٹھے رہنے یا لیٹے رہنے سے نماز میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا اسی طرح اگر طبیعت میں کوئی انتشار یا نماز میں خضوع خشوع متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو عورت کے سامنے لیٹے رہنے یا بیٹھے رہنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اس عنوان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح فرض نماز پڑھنے کی اجازت نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرض نماز تو مسجد میں ادا کرتے تھے، گھر میں نوافل و سنن پڑھنے کا اہتمام ہوتا تھا، لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں۔ چونکہ حدیث تطوع نماز سے متعلق تھی، اس لیے باب میں اس کا ذکر کر دیا، البتہ فرض نماز پڑھنے کا بھی یہی حکم ہے۔[1] ② علامہ کرمانی نے لکھا ہے: عنوان کا تقاضا ہے کہ عورت کی پشت نمازی کی طرف ہو لیکن حدیث سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کیونکہ اس کے الفاظ میں عموم ہے۔ پھر انھوں نے خود ہی جواب دیا کہ سونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان قبلہ رخ ہو کر سوتا ہے اور حضرت عائشہ ؓ بھی اس پر عمل کرتی ہوں گی، اس بنا پر یہ حدیث عنوان کے مطابق ہے۔[2] اس کے متعلق حافظ ابن حجر ؒ کہتے ہیں کہ اس جواب میں تکلف ہے کیونکہ سنت پر عمل کرنا (قبلہ رخ سونا) تو نیند کے آغاز میں ہے، ہمیشہ اسی حالت پر رہنا ضروری نہیں۔ سوتے وقت انسان غیر شعوری طور پر کروٹ بدلتا رہتا ہے، اس لیے میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ عنوان میں ''خلف المرأة'' کے الفاظ ہیں، خلف ظہر المرأة کے الفاظ نہیں کہ ہمیں اس کی جواب دہی میں تکلف کرنا پڑے، لہٰذا عورت کا سامنے ہونا کافی ہے، خواہ وہ کسی حالت میں ہو۔[3] ③ حافظ ابن حجر ؒ نے تنبیہ کا عنوان دے کر لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اسی بستر پر نماز پڑھتے جس پر حضرت عائشہ ؓ سوئی ہوتیں۔ اس صورت میں آپ ﷺ ان کے پاؤں کو چھو دیتے تو وہ پیچھے کر لیتیں۔ اور جس میں ہے کہ آپ کے اور قبلے کے درمیان ہوتی تو وہ دوسرا واقعہ ہے جس میں

(1) فتح الباري: 760/1. (2) شرح الكرماني: 166/2. (3) فتح الباري: 760/1.

حضرت عائشہ ؓ چارپائی پر ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ نیچے نماز پڑھ رہے ہوتے۔ اس حالت میں پاؤں چھونے کی ضرورت نہیں۔ گویا یہ دو الگ الگ واقعات ہیں۔[1]

(۱۰۵) بَابُ مَنْ قَالَ: لَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَيْءٌ

باب: 105- جس نے یہ کہا کہ نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی

وضاحت: امام بخاری ؒ نے جن الفاظ کو عنوان قرار دیا ہے وہ امام زہری ؒ کا قول ہے۔ مؤطا امام مالک میں حضرت ابن عمر ؓ سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ سعید بن منصور نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی اور حضرت عثمان ؓ سے ان الفاظ کو بیان کیا ہے۔ دارقطنی میں یہ الفاظ بطور مرفوع حدیث کے مروی ہیں لیکن اس کی سند کمزور ہے۔ اس کے علاوہ ابوداود میں حضرت ابوسعید خدری ؓ، دارقطنی میں حضرت انس اور حضرت ابوامامہ ؓ اور طبرانی اوسط میں حضرت جابر ؓ سے یہ الفاظ مرفوعاً منقول ہیں لیکن ان تمام روایات کی اسناد کمزور ہیں۔[2]

٥١٤ - حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ: حَدَّثَنَا أَبِي قَالَ: حَدَّثَنَا الْأَعْمَشُ قَالَ: حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ عَنِ الْأَسْوَدِ، عَنْ عَائِشَةَ. قَالَ الْأَعْمَشُ: وَحَدَّثَنِي مُسْلِمٌ عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَائِشَةَ، ذُكِرَ عِنْدَهَا مَا يَقْطَعُ الصَّلَاةَ: الْكَلْبُ وَالْحِمَارُ وَالْمَرْأَةُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ: شَبَّهْتُمُونَا بِالْحُمُرِ وَالْكِلَابِ، وَاللهِ لَقَدْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي وَإِنِّي عَلَى السَّرِيرِ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ مُضْطَجِعَةٌ فَتَبْدُو لِيَ الْحَاجَةُ فَأَكْرَهُ أَنْ أَجْلِسَ، فَأُوذِيَ النَّبِيَّ ﷺ، فَأَنْسَلُّ مِنْ عِنْدِ رِجْلَيْهِ. [راجع: ٣٨٢]

[514] حضرت مسروق سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ ؓ کے سامنے چند چیزوں کا ذکر کیا گیا جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، یعنی کتا، گدھا اور عورت، تو حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: تم لوگوں نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں کے مشابہ قرار دے دیا ہے، جبکہ میں نے نبی ﷺ کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ کے اور قبلے کے درمیان چارپائی پر لیٹی رہتی تھی۔ پھر مجھے کوئی ضرورت پیش آتی اور میں آپ کے سامنے بیٹھنے کو پسند نہ کرتی، مبادا آپ کی اذیت یا ناگواری کا باعث بنوں تو آپ کی پائنتی کی طرف سے کھسک کر نکل جاتی۔

٥١٥ - حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ قَالَ: أَخْبَرَنَا يَعْقُوبُ ابْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ: حَدَّثَنِي ابْنُ أَخِي ابْنِ شِهَابٍ أَنَّهُ سَأَلَ عَمَّهُ عَنِ الصَّلَاةِ: يَقْطَعُهَا شَيْءٌ؟ فَقَالَ: لَا يَقْطَعُهَا شَيْءٌ، أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ: لَقَدْ

[515] حضرت ابن شہاب کے بھتیجے نے اپنے چچا (امام زہری) سے سوال کیا: نماز کو کوئی چیز توڑ دیتی ہے؟ انھوں نے فرمایا: نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی۔ مجھ سے عروہ بن زبیر نے بیان کیا کہ نبی ﷺ کی زوجۂ محترمہ عائشہ ؓ نے فرمایا: نبی ﷺ رات کو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جبکہ میں آپ کے اور

1 فتح الباري: 760/1. 2 فتح الباري: 760/1.

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَقُومُ فَيُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ وَإِنِّي لَمُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلٰى فِرَاشِ أَهْلِهِ. [راجع: ٣٨٢]

قبلے کے درمیان آپ کے گھر کے بستر پر عرض میں (جنازے کی طرح) لیٹی رہتی تھی۔

فائدہ: پیش کردہ روایات میں اختصار ہے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے قبل ازیں علی بن مسہر کے طریق سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ذکر ہوا کہ کون سی چیزیں نماز کی قاطع ہیں؟ تو لوگوں نے کہا: کتا، گدھا اور عورت۔ اس کے بعد آپ نے مذکورہ جواب دیا۔[1] صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خود سوال کیا کہ نماز کو کون سی چیز توڑتی ہے؟ تو حضرت عروہ بن زبیر نے جواب دیا: عورت اور گدھا۔[2] ایک روایت میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اے اہل عراق! تم نے ہمیں کتوں اور گدھوں کے برابر کر دیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اشارہ اس روایت کی طرف تھا جسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت، گدھا اور کتا نماز کو توڑ دیتا ہے۔'' ایک روایت میں سیاہ کتے کی قید ہے اور اسے آپ نے شیطان قرار دیا ہے۔[3] صحیح مسلم ہی میں حضرت ابوہریرہ سے یہی روایت مروی ہے لیکن وہاں مطلق کتے کا ذکر ہے، اس کے سیاہ ہونے کا ذکر نہیں ہے۔[4] سنن ابی داود میں عورت کے ساتھ حائضہ ہونے کا اضافہ ہے۔[5] ان روایات میں نماز کو توڑ دینے سے کیا مراد ہے؟ ہم اس سے قبل اس کی وضاحت کر آئے ہیں کہ اس کا راجح مفہوم نماز کا باطل ہو جانا اور نماز کا دوبارہ دہرایا جانا ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس سے خشوع خضوع کی کمی مراد لی ہے اور بعض حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو منسوخ کہتے ہیں، لیکن پہلے مفہوم کی تائید حدیث سے ہوتی ہے، اس لیے وہی مفہوم راجح ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اصل مضمون کے متعلق شکایت نہیں تھی کیونکہ وہ خود بھی نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھنے کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مضمون کے پیش نظر وہ کھسک جانے کا عمل کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو روایت بیان کرنے کے انداز اور لب و لہجے پر اعتراض تھا کہ بیان کرنے والوں نے عورت، گدھے اور کتے کو ایک ہی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اس کی تعبیر یوں بھی ہو سکتی تھی کہ کتے اور گدھے کے سامنے سے گزرنے پر نماز قطع ہو جاتی ہے، اسی طرح عورتوں کا بھی یہی حکم ہے، یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کتے، گدھے اور عورت کے مسئلے میں فرق کر رہی ہیں کہ خشوع صلاۃ کو ختم یا کمزور کرنے کے سلسلے میں کتے، گدھے اور عورت تینوں کو شیطان سے تعلق رکھنے کی بنا پر مؤثر مان لیا جائے تب بھی عورت کے متعلق عموم کی بات صحیح نہیں، مثلاً: کتے کے متعلق حدیث میں ہے کہ وہ شیطان ہے اور گدھے کے متعلق ہے کہ جب تم اس کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز نکالتا ہے، جبکہ عورت کا یہ معاملہ نہیں۔ بہرحال یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال تھا۔ اس خیال کی وجہ یہی قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مذکورہ حدیث [تُعَادُ الصَّلَاةُ مِنْ مَّمَرِّ الْحِمَارِ، وَالْمَرْأَةِ، وَالْكَلْبِ الْأَسْوَدِ][6] کا علم نہیں ہوگا جس میں گدھے، عورت اور سیاہ فام کتے، تینوں کے گزرنے پر نماز کو دہرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

---

(1) صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 511. (2) صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1142(512). (3) صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1137(510). (4) صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 1139(511). (5) سنن أبي داود، الصلاة، حديث: 703. (6) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم: 3323.

(١٠٦) بَابٌ: إِذَا حَمَلَ جَارِيَةً صَغِيرَةً عَلٰى عُنُقِهِ فِي الصَّلَاةِ

باب: 106- دوران نماز میں چھوٹی بچی کو گردن پر اٹھا لینا

٥١٦ - حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ: أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، عَنْ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَلِأَبِي الْعَاصِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا. [انظر: ٥٩٩٦]

[516] حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھائے ہوئے نماز پڑھ لیتے تھے جو آپ کی لخت جگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو العاص بن ربیعہ بن عبد شمس کی بیٹی تھی۔ جب آپ سجدہ کرتے تو اسے اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے اٹھا لیتے۔

فوائد ومسائل: ① ابن بطال شارح بخاری فرماتے ہیں کہ اس باب میں امام بخاری رحمہ اللہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب بچی کو کندھے پر اٹھا کر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تو عورت کے نمازی کے سامنے سے گزرنے پر کیا اشکال ہو سکتا ہے؟ کیونکہ محض گزرنا، کندھے پر اٹھانے سے کہیں معمولی بات ہے۔[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی نے بھی اسی استنباط کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے عنوان میں چھوٹی بچی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بڑی عورت کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔[2] ② اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دوران نماز میں بچے کو اٹھانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، نیز اس قدر تھوڑا عمل نماز کے منافی نہیں۔ یہ عمل بوقت ضرورت جائز تو ہے مگر دور حاضر میں علماء حضرات کو اس سے احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ جو چیزیں عام لوگوں کی نظروں میں قابل اعتراض ہوں انھیں عام طور پر بلاوجہ اختیار کر لینے سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ دراصل امام بخاری رحمہ اللہ احکام ومسائل میں وسعت کے پیش نظر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کبھی کبھار کسی خاص موقع پر اگر کسی نے اپنے کسی پیارے بچے کو دوران نماز میں کندھے پر بٹھا لیا تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی، لیکن احتیاط کا دامن کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

(١٠٧) بَابٌ: إِذَا صَلّٰى إِلٰى فِرَاشٍ فِيهِ حَائِضٌ

باب: 107- ایسے بستر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا جس پر حائضہ عورت لیٹی ہو

٥١٧ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ زُرَارَةَ قَالَ: أَخْبَرَنَا هُشَيْمٌ عَنِ الشَّيْبَانِيِّ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ قَالَ: أَخْبَرَتْنِي خَالَتِي مَيْمُونَةُ بِنْتُ

[517] حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: میرا بستر نبی ﷺ کی جائے نماز کے برابر میں ہوتا۔ بسا اوقات آپ کا کپڑا میرے بدن پر آ جاتا جبکہ

---

1 شرح ابن بطال: 144/2. 2 فتح الباري: 763/1.

الْحَارِثِ قَالَتْ: كَانَ فِرَاشِي حِيَالَ مُصَلَّى النَّبِيِّ ﷺ فَرُبَّمَا وَقَعَ ثَوْبُهُ عَلَيَّ وَأَنَا عَلَى فِرَاشِي. [راجع: ٣٣٣]

میں اپنے بستر پر ہوتی تھی۔

٥١٨ - حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبْدُالْوَاحِدِ بْنُ زِيَادٍ قَالَ: حَدَّثَنَا الشَّيْبَانِيُّ سُلَيْمَانُ: حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ شَدَّادٍ قَالَ: سَمِعْتُ مَيْمُونَةَ تَقُولُ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا إِلَى جَنْبِهِ نَائِمَةٌ فَإِذَا سَجَدَ أَصَابَنِي ثَوْبُهُ وَأَنَا حَائِضٌ. [راجع: ٣٣٣]

[518] حضرت میمونہ ؓ ہی سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں: نبی ﷺ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ میں آپ کے برابر سوئی ہوتی۔ جب آپ سجدے میں جاتے تو آپ کا کپڑا میرے جسم پر آ جاتا جبکہ میں بحالت حیض ہوتی تھی۔

فوائد ومسائل: ① اس سے پہلے بچی کا معاملہ تھا، پاکی اور ناپاکی کا ذکر نہیں تھا۔ اس باب میں بالغ عورت کا معاملہ ہے، وہ بھی بحالت حیض نمازی کے قریب ہی، یعنی اگر بالغ عورت اسی بستر پر ہو جس پر نمازی نماز پڑھ رہا ہے تو عورت سامنے ہو یا برابر، حالت حیض میں ہو یا حالت طہر میں، نمازی کی نماز میں کوئی نقصان نہیں آئے گا بلکہ اگر نمازی کے کپڑوں کا اتصال بھی عورت سے ہو جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔ علامہ ابن بطال لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اور سابقہ احادیث جن میں عورت کے نمازی اور قبلے کے درمیان لیٹنے کا ذکر ہے، اس بات کی دلیل ہیں کہ عورت نمازی کے سامنے بیٹھ سکتی ہے، مگر اس کا سامنے سے گزرنا تو کسی حدیث سے ثابت نہیں ہوتا، حالانکہ امام بخاری ؒ کا مقصد مُرور (گزرنے) کا غیر قاطع ہونا ثابت کرنا ہے۔[1] حافظ ابن حجر ؒ کہتے ہیں کہ امام بخاری ؒ کا یہ عنوان اس مقصد کے لیے نہیں ہے جو ابن بطال نے سمجھا ہے کیونکہ نمازی کے آگے لیٹنے کا مسئلہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے، اس مقام پر تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حائضہ عورت اگر نمازی کے پہلو میں ہو اور اس کا کپڑا بھی اسے چھو رہا ہو تب بھی اس کی نماز میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس میں یہ بیان نہیں ہے کہ حائضہ، نمازی اور اس کے قبلے کے درمیان ہو کیونکہ إلٰی فِرَاش کا مطلب صرف سامنے ہونا ہی نہیں بلکہ اگر دائیں یا بائیں ہو تو بھی لفظ إلٰی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ حضرت میمونہ ؓ رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھیں۔[2] ② پہلی روایت میں ''حیال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی مقابل اور سامنے کے ہیں لیکن دوسری روایت میں اس مضمون کو ادا کرنے کے لیے لفظ جنب آیا ہے جس کے معنی پہلو کے ہیں، اس لیے حیال کا مفہوم بھی بالکل مقابل یا سامنے ہونا ضروری نہیں بلکہ اگر ترچھی ہو کر لیٹی ہو اور کچھ حصہ سامنے ہو تو اس پر لفظ ''حیال'' صادق آتا ہے اور ''علی جنبہ'' بھی صادق آ جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت محاذات میں ہو یا برابر میں، حالت حیض میں ہو یا طہر میں، خواہ نمازی کا کپڑا اسے مس بھی کر رہا ہو، کسی بھی صورت میں نمازی کی نماز کے لیے نقصان دہ نہیں۔

① شرح ابن بطال: 145/2. ② فتح الباري: 766/1.

(۱۰۸) بَابٌ: هَلْ يَغْمِزُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ عِنْدَ السُّجُودِ لِكَيْ يَسْجُدَ؟

باب: 108- کیا یہ جائز ہے کہ نمازی اپنی بیوی کے پاؤں کو دباوے تاکہ وہ سجدہ کر سکے؟

٥١٩ - حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ قَالَ: حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ قَالَ: حَدَّثَنَا الْقَاسِمُ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: بِئْسَمَا عَدَلْتُمُونَا بِالْكَلْبِ وَالْحِمَارِ، لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا مُضْطَجِعَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَسْجُدَ غَمَزَ رِجْلَيَّ فَقَبَضْتُهُمَا. [راجع: ٣٨٢]

[519] حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: تم لوگوں نے بہت برا کیا کہ ہم عورتوں کو کتے اور گدھے کے برابر کر دیا۔ بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ کے اور قبلے کے درمیان لیٹی رہتی۔ جب آپ سجدہ کرنا چاہتے تو میرے پاؤں کو ٹٹول کر دبا دیتے اور میں انھیں سمیٹ لیتی۔

فوائد ومسائل: ① امام بخاری ؒ ان ابواب میں ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جنھوں نے عورت کے معاملے میں تشدد سے کام لیا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر امام بخاری ؒ کے مقصد کو بایں الفاظ واضح کرتے ہیں: ''پہلے باب میں آپ نے ثابت کیا تھا کہ نمازی کا کپڑا اگر دوران نماز میں عورت سے مس کرے تو اس کی نماز کے لیے نقصان دہ نہیں اور اس عنوان میں آپ نے مزید ترقی کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر خود نمازی، عورت کے بدن کو ہاتھ لگا دے تو بھی نماز کے لیے ضرر رساں نہیں۔''[1] ② پیش کردہ حدیث میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدے میں جاتے تو حضرت عائشہ ؓ کے پاؤں کو دبا دیتے۔ حضرت عائشہ ؓ اپنے پاؤں سمیٹ لیتیں تو آپ سجدہ کرتے۔ اگرچہ شوافع نے اسے کپڑے کے اوپر سے چھونے پر محمول کیا ہے، تاہم روایت میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس لیے امام بخاری ؒ اس مسئلے میں ان کے مؤید نہیں ہیں۔ ③ امام بخاری ؒ پر اس سلسلے میں اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب روایت میں عورت کے پاؤں کو چھونے کی صراحت موجود ہے تو آپ نے عنوان میں لفظ هَلْ کیوں استعمال کیا ہے؟ واضح رہے کہ امام بخاری ؒ کے اصول موضوعہ میں سے ہے کہ جس مسئلے میں اختلاف ہوتا ہے، وہاں عنوان میں لفظ هَلْ استعمال کر کے اس اختلاف کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ مَسِّ مرأة سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ چونکہ اس کے متعلق ائمۂ کرام کے مابین اختلاف تھا، اس لیے امام بخاری ؒ نے لفظ هَلْ سے مذکورہ عنوان کا آغاز فرمایا۔

(۱۰۹) بَابُ الْمَرْأَةِ تَطْرَحُ عَنِ الْمُصَلِّي شَيْئًا مِنَ الْأَذٰى

باب: 109- عورت کا نمازی کے بدن سے پلید چیزیں دور کرنا

[1] فتح الباري: 767/1.

٥٢٠ - حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ إِسْحَاقَ السُّورَمَارِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسٰى قَالَ: حَدَّثَنَا إِسْرَائِيلُ عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُونٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: بَيْنَمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ قَائِمٌ يُصَلِّي عِنْدَ الْكَعْبَةِ وَجَمْعٌ مِّنْ قُرَيْشٍ فِي مَجَالِسِهِمْ: إِذْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ: أَلَا تَنْظُرُونَ إِلٰى هٰذَا الْمُرَائِي؟ أَيُّكُمْ يَقُومُ إِلٰى جَزُورِ آلِ فُلَانٍ فَيَعْمِدُ إِلٰى فَرْثِهَا وَدَمِهَا وَسَلَاهَا فَيَجِيءُ بِهِ. ثُمَّ يُمْهِلُهُ حَتّٰى إِذَا سَجَدَ وَضَعَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ؟ فَانْبَعَثَ أَشْقَاهُمْ، فَلَمَّا سَجَدَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَضَعَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ، وَثَبَتَ النَّبِيُّ ﷺ سَاجِدًا فَضَحِكُوا حَتّٰى مَالَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ مِّنَ الضَّحِكِ، فَانْطَلَقَ مُنْطَلِقٌ إِلٰى فَاطِمَةَ وَهِيَ جُوَيْرِيَةٌ فَأَقْبَلَتْ تَسْعٰى، وَثَبَتَ النَّبِيُّ ﷺ سَاجِدًا حَتّٰى أَلْقَتْهُ عَنْهُ، وَأَقْبَلَتْ عَلَيْهِمْ تَسُبُّهُمْ، فَلَمَّا قَضٰى رَسُولُ اللهِ ﷺ الصَّلَاةَ قَالَ: «اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ، اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ» ثُمَّ سَمّٰى: «اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ، وَعُتْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيعَةَ، وَالْوَلِيدَ بْنِ عُتْبَةَ، وَأُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ، وَعُقْبَةَ بْنِ أَبِي مُعَيْطٍ، وَعُمَارَةَ بْنِ الْوَلِيدِ». قَالَ عَبْدُ اللهِ: فَوَاللهِ! لَقَدْ رَأَيْتُهُمْ صَرْعٰى يَوْمَ بَدْرٍ، ثُمَّ سُحِبُوا إِلَى الْقَلِيبِ قَلِيبِ بَدْرٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «وَأُتْبِعَ أَصْحَابُ الْقَلِيبِ لَعْنَةً». [راجع: ٢٤٠]

[520] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ خانۂ کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے اور کفار قریش کی ایک جماعت بھی وہاں مجلس لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا: کیا تم اس ریاکار کو نہیں دیکھتے؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو فلاں خاندان کی ذبح شدہ اونٹنی کے پاس جائے اور اس کے گوبر، خون اور بچہ دانی کو اٹھا کر لائے؟ پھر اس کا انتظار کرے، جب یہ سجدے میں جائے تو ان تمام چیزوں کو اس کے کندھوں کے درمیان رکھ دے؟ چنانچہ اس جماعت کا سب سے بڑا بدبخت اس کام کے لیے تیار ہوا اور اسے اٹھا لایا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ سجدے میں گئے تو اس نے سب کچھ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا۔ نبی ﷺ بحالت سجدہ ٹھہرے رہے اور کافر (رسول اللہ ﷺ کی) اس حالت پر بری طرح ہنستے رہے۔ اور وہ ہنسی کی وجہ سے ایک دوسرے پر گرتے جا رہے تھے۔ اندریں حالات کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت کم عمر بچی تھیں، چنانچہ وہ اطلاع پاتے ہی دوڑتی ہوئی آئیں۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت سجدے ہی کی حالت میں تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ تمام چیزیں رسول اللہ ﷺ کے کندھوں سے دور کر دیں، پھر کفار کی طرف رخ کر کے انھیں سخت برا بھلا کہا۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو آپ نے ان کے خلاف بایں الفاظ بددعا کی: ''اے اللہ! قریش کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اے اللہ! قریش کو اپنی گرفت میں لے لے۔'' پھر آپ نے نام بنام بایں الفاظ بددعا فرمائی:

''اے اللہ! عمرو بن ہشام (ابوجہل)، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط اور عمارہ بن ولید کو اپنی گرفت میں لے لے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے ان (نامزد) تمام لوگوں کو غزوۂ بدر والے دن مردہ حالت میں گرے پڑے دیکھا۔ پھر ان کی لاشوں کو کھینچ کر بدر کے گندے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے (ان کے متعلق) فرمایا: ''جو لوگ بدر کے کنویں میں ڈالے گئے ہیں ان پر اللہ کی لعنت مسلط کر دی گئی ہے۔''

فوائد ومسائل: ① ابن بطال شارح صحیح بخاری فرماتے ہیں کہ یہ عنوان بھی سابقہ عناوین سے ملتا جلتا ہے کہ عورت جب نمازی کی پشت پر سے کوئی چیز دور کرے گی تو جس جانب سے ہٹانے میں اسے آسانی ہوگی عورت کو اسی جانب جانا ہوگا، اس لیے کمر سے بوجھ ہٹانے کا مضمون سامنے سے گزرنے کے مضمون سے اگر زیادہ اہم نہیں تو اس سے کم بھی نہیں۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ ان ابواب میں ایک طرف تو عورت کے معاملے میں تشدد کی راہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب اسے چھونے میں کوئی مضائقہ نہیں، جب اتصال جسمانی سے بھی نماز ختم نہیں ہوتی تو اسے نماز کے لیے سترہ بنانے میں بدرجۂ اولیٰ نقصان دہ نہیں ہونا چاہیے۔ ② ابن بطال نے مزید فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار کے خلاف بددعا اس وقت فرمائی جب آپ ان سے راہ حق اختیار کرنے کے متعلق مایوس ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت بخشا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے: ﴿إِنَّا كَفَيْنَٰكَ ٱلْمُسْتَهْزِءِينَ﴾ ''ہم آپ کی طرف سے ٹھٹھا کرنے والوں کو کافی ہیں۔''[2] لیکن جن لوگوں کے متعلق قبول ہدایت کی امید تھی ان کے لیے آپ نے ہدایت قبول کرنے اور حق کی طرف لوٹنے کی دعا فرمائی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔[3] اگر قرائن سے کفار کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی حرکات شنیعہ سے باز آنے والے نہیں تو ان کے حق میں نام بنام بددعا کرنا جائز ہے کیونکہ مومن کا آخری ہتھیار دعا ہی ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور وہ سب کے سب بدر کی لڑائی میں ذلت کے ساتھ مارے گئے اور ہمیشہ کے لیے اللہ کی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ ③ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس روایت میں عمارہ بن ولید کو قلیب بدر والوں میں شمار کرنا وجہ اشکال بنا ہے کیونکہ اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ اس کی موت حبشہ میں ہوئی تھی جبکہ نجاشی، شاہ حبشہ نے اس کی غلط روش پر تنبیہ کرنے کے لیے ایک جادوگر کے ذریعے سے اس پر جادو کرایا تھا، جس کی بنا پر وہ وحشی جانوروں کی طرح گلی

---

[1] شرح ابن بطال: 146/2. [2] الحجر 15:95. [3] شرح ابن بطال: 167/2.

کوچوں میں دوڑتا اور مارا مارا پھرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بایں حالت ہی اسے موت آئی۔ اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان اشرار قریش میں سے اکثر کو بدر کے کنویں میں دیکھا ہوگا۔[1]

① فتح الباري : 457/1.